DAMAGE BOOK

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(بہاں)

ضیئے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین





"ہمایوں" بابت ماہِ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

تصاویر: ایک ترکی مسجد کا اندرونی منظر (رنگین)۔ (۲) مزدور کا عزم (رنگین)۔ (۳) نیا سال۔ (۴) زندگی۔ (۵) پانی کے قطرے۔ (۶) انعکاسِ نور۔ (۷) ترکی مجلسِ لسانی کا ایک نظارہ۔ (۸) ایک دیہاتی منظر۔

قیمت سالگرہ نمبر ۴

چندہ سالانہ ۶ؔ ششماہی ۳ؔ مع محصول

قیمت سالگرہ نمبر ۱۲ؔ

کلامِ ہمایوں

انتخاب از "سیرِ چمن"

بادل ہو، گُل ہو، باغ ہو، بلبل ہو شاخ پر — ہو حرزِ جان و راحتِ دل میری ایک شے

قدرت کی خوبیوں پہ ہمیشہ نظر رہے — بس زندگی کا لُطف ہمایوں اسی میں ہے

خوش باش اے چمن کہ مرا شاد کردۂ

ویرانہ بود خاطرم آباد کردۂ

اعجاز دیکھ تو سہی یاں کیا سماں ہے آج — نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ

اقبال تیری سحر بیانی کہاں ہے آج — ناظر کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دلکشِ ایں چار یارِ ما

پنجاب خوش نواست ہمایوں دیارِ ما

آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

نوشتہ کوہ مری
اگست ۱۹۰۷ء

بزمِ ہمایوں

۱۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو انجمن اُردو پنجاب کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر صاحب کی صدارت میں مینارڈ ہال لاہور میں "یومِ اُردو" منایا گیا۔ آنریبل سر سکندر حیات خاں وزیرِ اعظم پنجاب، راجہ نرندر ناتھ، ڈاکٹر بھٹناگر اور دُوسرے اصحاب نے اُردو کی حمایت میں تقریریں کیں۔ اُردو کے تحفظ و ترقی کے متعلق چار اہم قراردیں بھی منظور ہوئیں۔

اِس موقع پر سکرٹری انجمنِ اُردو پنجاب نے ذیل کا مقالہ پڑھا:-

یہ ہے ہندوستان کی نئی "قومی" زبان! اُپستھت شریمان!

آپ سمجھے اِس کا کیا مطلب ہے؟ اِس کا مطلب ہے "حاضر جناب!" یوپی کے بعض سکولوں میں اب لڑکے اُستاد کی ہدایت کے مطابق حاضری کے وقت اس طرح جواب دیتے ہیں۔ رسالۂ اُردو کے جنوری ۳۸ء کے پرچے میں یہ واقعہ درج ہے کہ ایک موقع پر جب کہ ایک ڈپٹی کلکٹر دیہات میں ایک سکول کا معائنہ کر رہے تھے اور وہاں چند کسان بھی موجود تھے تو حاضری شروع ہوئی اور "اُپستھت شریمان" کے ثقیل نعرے بلند ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی صاحب نے اِن حاضر کسانوں سے پوچھا کہ اس فقرے کا کیا مطلب سمجھے۔ جواب ملا "کچھ نہیں"۔ تین چار لڑکوں سے پوچھا، جواب نہ دے سکے۔ آخر میں ایک لڑکے نے بتایا کہ اس کا مطلب حاضر جناب ہے۔ اس پر دو ایک کسان کہنے لگے کہ اب سمجھ میں آیا۔ پھر ایک لڑکے سے کہا گیا کہ تم کو اپنی کتاب میں سے جو سبق سب سے زیادہ پسند ہے اُس کا خلاصہ اس طرح بیان کرو کہ یہ دیہاتی تمہارے گاؤں والے بھی سمجھ سکیں۔ لڑکا ایک قصہ اس طرح شروع کرتا ہے "بھارت ورش کے پرسدھ نگر پاٹلی پتر میں ایک راجہ تھا راجہ کے لئے بھی کوئی ثقیل ہندی لفظ تھا) اُس نے ایک سنگھ دیکھا" وغیرہ وغیرہ۔ ڈپٹی صاحب نے ایک کسان سے پوچھا کہ مطلب سمجھ میں آیا؟ اُس نے جواب دیا کچھ نہیں۔ لڑکے سے کہا کہ ایسی سیدھی بولی میں قصہ کہو کہ یہ لوگ سمجھ سکیں۔ اب لڑکے نے دوبارہ اس طرح شروع کیا "ہندوستان کے مشہور شہر پٹنہ میں ایک راجہ تھا۔ ایک دن جنگل میں اُس نے ایک شیر دیکھا" وغیرہ وغیرہ۔

غرض سینکڑوں الفاظ آپ کو ایسے ملیں گے جو فارسی زبان کے ہیں اور دیہاتی لوگوں وغیرہ کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں لیکن یہی الفاظ عام بول چال اور خصوصاً موجودہ ٹیکسٹ بک وغیرہ سے بہت بے دردی سے نکالے جا رہے ہیں مثلاً خوش (پرسن)، آدمی (پُرش یا منش)، حاکم (راتھہ)، شیر (سنگھ)، دوستی (مترتا) وغیرہ وغیرہ"

آخر یہ کیا جھگڑا ہے؛ سُنتے ہیں کہ ہندوستان کی قومی زبان کی گدی خالی ہے یا زبردستی خالی کی گئی ہے اور اُس کے لئے اُردو اور ہندی دو بہنوں میں تُو تُو مَیں مَیں ہو رہی ہے! یہ مناقشہ اُردو اور ہندی میں ہمیشہ سے نہ تھا۔ واقعات یوں ہیں کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں دفتری زبان فارسی تھی لیکن مُلک میں مختلف بولیاں تھیں۔ رفتہ رفتہ شمالی ہندوستان میں اور دکن میں مسلمان بادشاہوں کی رواداری اور ہندو مسلمانوں کے میل جول اور فارسی اور مختلف ملکی بولیوں کی ملاوٹ سے ایک زبان پیدا ہوئی جسے پہلے ہندی اور زبانِ ہندوستان اور پھر ہندوستانی اور اُردو پکارا گیا۔ اُس وقت ہندی اور اُردو ایک ہی زبان تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے نصفِ اول میں اُردو سب میں مقبول تھی چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جب اسے فارسی کی جگہ دفتری زبان قرار دیا گیا تو کوئی آواز اس کے خلاف بلند نہ ہوئی بلکہ فروری ۱۸۶۱ء میں بنگال بہار اور اُڑیسہ کے زمینداروں اور

دوسرے باشندوں نے وائسرائے کو ایک عرضداشت بھیجی جس میں یہ درخواست کی کہ جدید ہائی کورٹ میں کارروائی اُردو زبان میں ہونی چاہیئے۔ اس زمانے کے کئی واقعات منقول ہیں جب کہ ان صُوبوں کے ہندو تعلیم یافتہ اور اہلِ قلم جہاں کی زبان اُردو نہ تھی نیز انگریز مدبّر اور حاکم تک عام جلسوں میں اُردو تقریریں کرتے تھے

پھر کیا ہُوا کہ یہ اُردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوگیا؛ موجودہ ہندی کی تاریخ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کے ایک معلّم للّو لال جی نے اُردو کی بعض کتابیں لے کر اُن میں سے عربی فارسی لفظ چُن چُن کر الگ نکال دیئے اور اُن کی جگہ سنسکرت اور ہندی کے نامانوس لفظ جما دیئے اور یُوں موجودہ شُدھ ہندی کی بنا رکھی گئی۔

ہندی اُردو کا اختلاف سب سے پہلے علانیہ طور پر یوں ظاہر ہُوا کہ ۱۸۶۷ء میں صوبہ بہار میں وہاں کی گورنمنٹ نے سرکاری دفاتر میں بجائے اُردو کے کیتھی حروف جاری کردیئے۔ پھر صوبہ بہار کی دیکھا دیکھی ناگری حروف کے اجرا کی تحریک صوبہ متحدہ میں بھی شروع ہوئی اور اسی سال میں بنارس میں بعض سرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہُوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اُردو زبان اور فارسی خط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔" رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لئے کمیٹیاں مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں۔" چنانچہ پنڈت جواہر لال نے اپنے رسالے "زبان کا مسئلہ" میں لکھا ہے کہ اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر میں اُردو ہندی ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہوئیں۔ اس طرح کہ پہلے ہندوؤں میں اپنی قومیت کا شعور پیدا ہُوا اور وہ زیادہ شُدھ ہندی پر اور دیوناگری رسم الخط پر اصرار کرنے لگے اور پھر مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہُوا اور وہ اُردو کو اپنی چیز سمجھنے لگے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ زبانیں ایک دوسری سے دُور ہوتی گئیں اور رسم الخط کے جھگڑے نے طُول پکڑا لیکن آہستہ آہستہ بعض سمجھدار لوگوں نے اس مغائرت کو دُور کرنے اور اُردو ہندی کے مشترک عناصر پر زور دینے کی طرف توجہ کی۔

۱۸۶۷ء کے بعد اُردو ہندی کا جھگڑا ۱۹۰۰ء میں یوپی کے لفٹنٹ گورنر سر اینٹنی میکڈانل کے عہد میں پھر اُٹھا اور ہندی والوں کی شورش پر گورنمنٹ نے اپریل ۱۹۰۰ء میں ناگری حروف میں بھی درخواستیں لینے اور سمن اور اعلان جاری کرنے کا ریزولیوشن منظور کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُردو ہندی کی بحث سے صوبۂ متحدہ میں دونوں قوموں کے درمیان نفاق کی ایک خلیج قائم ہوگئی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ نواب محسن الملک نے اُردو کی تحریک میں نمایاں حصّہ لینا چاہا مگر لفٹنٹ گورنر نے اُن کو روک دیا۔ اسی روک تھام کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک سیاسی انجمن قائم کرنے کا خیال پیدا ہُوا۔ ۱۹۰۰ء سے ہندی تحریک کے علمبرداروں نے باقاعدہ طور پر اپنا کام شروع کیا اور ۱۹۱۰ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی بنا ڈالی گئی جس نے ہندی کی ترقی اور سارے ملک میں اُس کا پرچار کرنے میں بڑا کام کیا۔

۱۹۳۶ء میں اس تحریک نے ایک نیا چولا بدلا۔ گاندھی جی میدان میں اُتر آئے اور اُنہوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس میں ہندی یا ہندوستانی کا جھنڈا بلند کیا اور کہا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، وہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان اسے چاہیں تو رکھیں اور پھیلائیں۔

اِس پر کئی ہندوؤں نے بھی صدائے احتجاج بلند کی۔ بابو سندرلال جی نے گاندھی جی کو لکھا کہ اُردو اکثر ہندوؤں کے گھر کی زبان ہے اور وہ ہندی جسے گاندھی جی اور بعض ہندو لیڈر رائج کرنا چاہتے ہیں فقط ایک کتابی زبان ہے جو کہیں بولی سمجھی نہیں جاتی۔ پنڈت جواہر لال نے ڈاکٹر محمود کو لکھا کہ خود میری زبان اُردو ہے۔ سر سپرو نے انجمن بہار ادب کے جلسے میں ۲۸ فروری ۳۱ء کو فرمایا کہ "میں اخباروں میں زبان کے معاملے کے اختلاف کو بڑے افسوس سے دیکھتا ہوں مگر نہ تو اس کو ہندو سمجھتے ہیں اور نہ مسلمان"۔ "دراصل اُردو زبان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے متحد ہو سکیں۔" آگاہ

اتحاد کے جویا ہیں جس کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا تو آپ اُردو زبان کو ترقی دیں۔" "کیونکہ ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اُردو کی بقا پر ہے"

اِس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ شکر ہے کہ دونوں قوموں میں چند ایسے ہوش مند اور دُور اندیش اصحاب موجود ہیں جو اُردو کی مُلکی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر غایت درجہ اطمینان دہ ہے کہ حال ہی میں سر تیج بہادر سپرو نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کا صدر بننا قبول فرمالیا ہے۔ ۱۰ دسمبر کو الہ آباد میں یومِ اُردو کی تقریب پر سر سپرو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ زبان کے مسئلے کو سیاسی مسئلہ نہ بنانا چاہئے۔ اُردو مغلیہ دقتوں میں ضرورت کی بنا پر وجود میں آئی۔ اس کی نشو ونما میں ہندوؤں نے بھی معتدبہ حصّہ لیا۔ اُردو ہندو مسلمانوں دونوں کی مشترک چیز ہے، سو اگر ہندو اسے تباہ کریں گے تو وہ گویا اپنی ہی ایک چیز تباہ کریں گے۔ سر سپرو نے کہا کہ وہ "ہندوستانی" کے نئے لفظ کے معنی سمجھنے سے قاصر ہیں گو وہ عربی سنسکرت کے بڑے بڑے لفظوں کے استعمال کے بھی مخالف ہیں۔ اُنہوں نے تنبیہ کی کہ زبان کے جھگڑوں نے بعض بڑی بڑی سلطنتوں کو برباد کر دیا ہے، کسی قوم کی عزیز ترین متاع اُس کا کلچر اور زبان ہوتی ہے اور اگر یہ تباہ ہو جائیں تو قوم بھی ساتھ ہی تباہ ہو جاتی ہے۔ اُردو ہی ہے جو برسوں سے ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ بنی رہی ہے۔ اخیر میں آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ ظاہر کرنے میں ذرا بھی ندامت محسوس نہیں ہوتی کہ اُردو میری مادری زبان ہے میں اُردو کو ملیا میٹ ہوتے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اُردو کی ترقی کے لئے ہر کوشش کو میری تائید حاصل ہوگی!

اُردو کے لئے ۱۹۳۸ء ایک نہایت صبر آزما سال گزرا ہے۔ کانگرس نے اپنی ۱۹۳۱ء کی مشہور قرارداد کے ذریعے سے ہندوستانی کو ملک کی زبان قرار دیا تھا۔ ہندوستانی کے متعلق اب یہ تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو اُردو اور ناگری دونوں حروف میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن کانگرس کے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد جس زبان کو کانگرسی حکومتیں اپنے اثر سے پھیلانے اور تقویت دینے میں مدد دے رہی ہیں وہ یہی گاندھی جی کی ہندی اتھوا ہندوستانی ہے نہ کہ شمالی ہند میں بولی اور سمجھی جانے والی خالص ہندوستانی۔ اس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

سال کے شروع میں پہلے مدراس اور پھر بمبئی کے وزیر اعظم نے کہا کہ یہ امر اب مسلمہ ہے کہ ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہونی چاہئے۔ اڑیسہ اور بہار میں بھی حکومت کی طرف سے ہندی پر زور دیا جانے لگا۔ اِدھر یوپی میں سمپورن نند جی وزیرِ تعلیم نے ہندی کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ہندی میں سنسکرت کے لفظوں کی بہتات ہونی چاہئے تاکہ جنوبی ہندوستان کے باشندے اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔ ہندی ہندی کی اس پکار پر اپریل میں انجمن ترقی اُردو نے احتجاج کیا تو مولانا ابوالکلام کی گوشمالی پر یہ کانگرسی حکومتیں بجائے ہندی کے ہندوستانی کا لفظ استعمال کرنے لگیں۔

لیکن لفظی ہیر پھیر کے علاوہ عملی کارروائیاں بھی ہوئیں اور ابھی برابر جاری ہیں۔ یوپی کے مدرسوں کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ وہاں کے کئی ڈسٹرکٹ بورڈوں میں اور کونسل تک میں سنسکرت نما ہندی کے رائج کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، بہار میں ہزارہا مسلمان طلبہ ہندی پڑھنے پر مجبور ہیں۔ سی پی میں ودیا مندر سکیم کے سلسلے میں بعض اُردو مدارس کو بند کر دیا گیا اور صرف شدید احتجاج کے بعد تلافی کر دینے کا وعدہ کیا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہُوا کہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء کو کانگرس کمیٹی میں ڈاکٹر اشرف نے ہندوستانی کے متعلق ایک قرارداد پیش کی کہ چونکہ ہندی اُردو کے جھگڑے میں کانگرس کے رویے کو پسند نہیں کیا جا رہا اس لئے کانگرس اپنے ۱۹۳۱ء کے ریزولیوشن کو دُہرائے اور کانگرسیوں کو ہدایت کرے کہ وہ ہندی اُردو کی بحث سے الگ رہیں نیز ہندوستانی زبان کی تشکیل و ترقی کے لئے ایک ہندوستانی بورڈ مقرر کیا جائے، بدقسمتی سے یہ قرارداد نامنظور کی گئی۔ ایسی ہی باتوں کا اثر ہے کہ مدینہ اور ایشیا اور نگار اور کلیم تک کے مدیر جو کانگرس کے دلی مداح رہے ہیں اور آج تک مسلم لیگ کے سخت مخالف ہیں وہ کانگرس کی زبان کے متعلق اس قلابازی سے سخت بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں اور کانگرس

کو تنبیہ کر رہے ہیں کہ اگر اس کی روش نہ بدلی تو اس کا نتیجہ سیاسی طور پر ہندوستان کے لئے نہایت خطرناک ہوگا۔ اُردو ہندی میں ۱۹۲۸ء میں یہ کشمکش جاری رہی لیکن کچھ مشترک کوششیں بھی ہوئیں۔ پٹنہ میں "ہندوستانی کمیٹی" کا ایک جلسہ ۲۲ مارچ ۳۸ء کو منعقد ہوا جس میں مشترک زبان کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بیٹھی اور دوسرا جلسہ ۱۹ دسمبر ۳۸ء کو ہوا اس میں ہندوستانی زبان میں اصطلاحات بنانے کے اصولوں پر غور کیا گیا اور اس کے لئے تین سب کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی ہندوستانی ڈکشنری کے بعض حصے دیکھے اور پسند کئے گئے اور مصنفین اور مطابع سے ہندوستانی میں نئی کتابیں لکھوانے کی ہدایت کی گئی۔ ۲۰ ستمبر ۳۸ء کو یوپی کی گورنمنٹ نے ہندوستانی اکاڈمی کے متعلق جو بارہ سال سے قائم ہے ایک کمیٹی کا تقرر کیا جو یہ تحقیق کرے کہ اکاڈمی اُردو اور ہندی ادب کی ترقی اور ایک مشترک ہندوستانی زبان کی تشکیل کے لئے کس طرح اور کیا مفید کام کر سکتی ہے۔ دیکھئے ان کوششوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

اس وقت ہندوستان کی متحدہ قومیت کے لئے جو بات سخت خطرناک اور قابلِ اعتراض ہے، وہ یہ ہے کہ زبان جس کو رائج کرنے کی منظم کوشش کی جارہی ہے وہ ایسی جناتی زبان ہے جسے یوپی کے اکثر ہندو بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اگر ہندو بہ حیثیت ایک قوم کے ہندی پڑھنا چاہیں، اگر وہ ہندی میں اپنی قومی اور مذہبی روایات کا ذخیرہ بڑھانا چاہیں، اگر وہ ہندی ادب کو ترقی دینا چاہیں تو اس پر کسی معقول آدمی کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ جو باتیں قابلِ اعتراض ہیں وہ یہ ہیں۔ اوّل بعض اُن ہندوؤں کا اُردو کو چھوڑ دینا جن کی مادری زبان اُردو ہے یا جو اب تک اُردو میں پڑھتے لکھتے آئے ہیں اور جنہوں نے اُردو کے بعض بہترین مصنف اور شاعر پیدا کئے اور دوسرے ہندی میں سے تمام عربی و فارسی الفاظ کا اخراج اور ٹھس سنسکرت نما لفظوں کا دخل۔ یہ خود ہندی کے لئے بھی مفید نہیں۔ چنانچہ موجودہ ہندی کی حیثیت کے متعلق بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے اپریل ۳۶ء کے اجلاس میں جو خطبۂ صدارت پڑھا اُس کے بعض اقتباسات غور کے قابل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"جو ہندی آج کل کتابوں میں لکھی جاتی ہے وہ بہت تھوڑے ہی لوگوں کی مادری زبان ہے۔ ہندی اگر جیتی جاگتی زبان ہونا چاہتی ہے تو اُسے اپنے الفاظ کے ذخیرے کو بڑھانا چاہئے۔ بائی کاٹ کا اصول تو وہ کبھی اختیار نہیں کر سکتی۔" "ہندی میں جتنے فارسی اور عربی کے لفظوں کی کھپت ہوسکے گی اتنی وہ اور مضبوط زبان ہوسکے گی۔ ایک بہت چھوٹا اور پُر معنی لفظ "شرط" ہے۔ کسی کم ہندی جاننے والے کو اس کے سمجھنے میں کٹھنائی نہیں ہوتی ہے اور اس مطلب کو ادا کرنے والا دوسرا لفظ سنسکرت سے کھوج کر نکالا جائے تو وہ "مکھ مارجن دستر کھنڈ" جیسا لمبا نہ بھی ہو تو بھی سمجھنے میں تو اتنا ہی کٹھن ہوگا۔" اخیر میں لکھتے ہیں کہ "ہم اس چیز کو قبول نہیں سکتے کہ ہندی اور اُردو دونوں ہندوستانی ہیں اور رہیں گی۔ ایسی حالت میں ہندی جاننے والوں کو معمولی اُردو لفظوں کا اور اُردو جاننے والوں کو ہندی لفظوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ ان نصیحتوں پر عمل ان کے برعکس ہوا۔ ذرا دیکھئے وہ نئی ہندی کس قسم کی زبان ہے جسے ہندوستانی ہونے کا دعوےٰ ہے۔ گاندھی جی کی ہندی ہندوستانی جس سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا آغاز ہوا یوں ہے:۔

"اس سبھا کا سبھا پتیو مجھے دینے کے کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو وہی پرتیت ہوتا ہے ایک میرا ساہتیہ کا رسیہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔" "اگر ہم سارے ہندوستان کے ساہتیہ کے وشال کشیتر میں پرویش کریں تو کیا اس کی کچھ سیما مریادا ہونی چاہئے۔ میری درشٹی میں تو اوشیہ ہونی چاہئیے۔" "آج کل شرنگار رس ایشلیل ساہتیہ کی باڑھ سب پرانتوں میں آ رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا گاندھی جی جیسے زبردست رہنما اور محبِ وطن سے یہ توقع جائز نہیں کہ وہ اس قسم کی اکھڑ ہندوستانی کی اشاعت کی بجائے

کا نمونہ ملک کے سامنے پیش کریں؟ کیا بہتر نہ ہوتا کہ وہ "نو اجیون" کی جگہ ایک ہفتہ وار اخبار نکالتے جس میں صحیح ہندوستانی پہلو بہ پہلو اُردو اور ناگری حروف میں لکھی جاتی؟

کانگرس کے صدر بابو سوبھاش بوس نے فروری ۱۹۳۸ء کی کانگرس میں اپنا خطبہ جس ہندوستانی میں پڑھا اُسے بھی سُن لیجیے :۔

"سبھاپتی مہاشے اور مترو! آپ نے آگامی ورش کے لئے اکھل بھارت ورش راشٹریہ مہاسبھا کا ادھیکش نرواچت کر میرا جو سمان کیا ہے اُس کا مجھ پر بہت گہرا پربھاؤ پڑا ہے۔" مجھے اپنی نانا ترٹیوں کا اچھی طرح گیان ہے۔ اِس لئے میں آشا رکھتا اور پرارتھنا کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے سہیوگ اور ساہتیا سے اُس دایت پورن پد کو کسی انش میں نبھا سکوں جس کا بھار مجھے سونپا ہے۔"

دیکھیے جب کوئی لفظ واقعی ہندوستانی کا آجاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم گویا بے ہوشی سے ہوش میں آگئے۔ لطف یہ ہے کہ بیچارے صدر کے لئے یہ ہندی اتنی مشکل تھی کہ وہ خود صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور بقولِ مولوی عبدالحق ایک شخص پیچھے بیٹھا ہوا برابر لقمہ دیتا جارہا تھا۔

مدینہ جو ایک پکا کانگرسی اخبار ہے اس کے ایڈیٹر ہری پورہ کانگرس کے چشم دید واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وٹھل نگر میں جو تحریر بھی چاروں طرف نظر پڑتی تھی وہ یا تو ہندی میں ہوتی تھی یا گجراتی میں۔ اُردو رسم خط اِس فضا میں اس طرح مفقود تھا گویا ہندوستان میں اُس کے جاننے والے بستے ہی نہیں۔۔ مجھے سب سے زیادہ کوفت اُس وقت ہوئی جب نمائش گاہ میں داخل ہونے پر میں نے دیکھا کہ ہر چیز پر جو چٹ چسپاں ہے وہ صرف ہندی میں ہے۔" کانگرس کے اس دعوے پر شک کرنے کا مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ ہندی اور اُردو دونوں ایک ہی زبانیں ہیں صرف رسم الخط کا فرق ہے لیکن جب اُس کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے سوبھاش چندر بوس نے اپنا خطبہ ہندی میں پڑھا تو مجھے پہلی بار اپنے اس خیال کی غلطی کا احساس ہوا اس لئے کہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی میری فہم نارسا اس کے سمجھنے سے قاصر رہی۔" دوسرے تقریر کرنے والے اس طرح کی زبان استعمال کر رہے تھے "سبھاپتی مہاشے دیویو اور سجنو! آپ کے سامنے جو پرستاؤ رکھا ہے اور جس کے سمرتھن اور ورودھ میں ہماری بدھی مان اور ودوان نیتاؤں کے واکھیان آپ نے سنے ہیں اُس کے سمبندھ میں ایک دو شبد میں پرکٹ کرنا چاہتا ہوں۔" اس طرح پرشوتم داس ٹنڈن جی نے قومی تعلیم کی تجویز پیش کرتے ہوئے قومی تعلیم کو "راشٹریہ شکشا" کے نام سے یاد کیا۔

کانگرس میں ہندی کی اِس بھرمار کے علاوہ یہ ہوا کہ کانگرس ہی کی سبجکٹ کمیٹی کے پنڈال میں ۲۰ فروری کو راشٹر بھاشا کا اجلاس ہوا جس میں صدر کانگرس کا پیغام بھی سنایا گیا کہ سب ہندوستانیوں کو ہندی سیکھنی چاہیے۔

شری سمپورنانند جی کا "دیاکھیان" جو غالباً اگست کی کسی تاریخ کو ظہور میں آیا مشہور ہوچکا ہے صرف ایک آدھ فقرے پر اکتفا کی جاتی ہے "آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک وشیشتا ہے انتر راشٹریتا کے پرتی لوگوں کا آگرہ بہت وشیش اور ویاپک ہوگیا ہے" علیٰ ہذا القیاس۔

اس کے ساتھ ہی ایک یہ تحریک بھی جاری ہے کہ الفاظ کو اپنی اصلی ابتدائی شکل میں استعمال کرو یعنی پُرانے مُردے اُکھاڑو۔ پورن مل کی جگہ پورن مل، رام جتن کی جگہ رام رتن، ایسے ہی دُگدھ (دودھ)، گھرت (گھی)، پھانگن (پھاگن)، براہمن (برہمن)، پانیہ (پانی)۔

کیا یہ ہے مشترک ہندوستانی زبان؟ کیا یہ ہوگی ہندوستان کی قومی زبان؟ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ بھوک ہڑتال کو "مقاطعۂ جوع" کہا جائے یا اخبار کو "جریدہ" یا رسالہ کو "مجلہ" اور نہ ہم ایسی نظم کے دلدادہ ہیں ؎

سرِ شکِ سر بصحرا دادہ نورالعینِ دامن ہے　　دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے

ایسی دماغ شکن زبان خود اُردو کی ترقی اور بقا اور اشاعتِ علم اور عوام کی تعلیم کے لئے مضر ہے، مگر کم از کم سارے شمالی ہندوستان میں کتنے لوگ ہیں جو "حاضر جناب" نہ سمجھیں گے؟ اور کتنے ہیں جو "اُپستھت شریمان" سمجھیں گے۔ آپ نے دیکھا یو پی کے کسان بھی نہ سمجھے یہ کیا بلا ہے۔ پنڈت جواہر لال جی حقیقت سے واقف نہیں ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ اُردو شہروں کی زبان ہے اور ہندی دیہات کی۔ گاندھی جی اور سوبھاش بابو اور شری سمپورنانند جی کی زبان یقیناً دیہات کی زبان نہیں۔

کانگرس کے اخبار "ہندوستان" کے ۱۰ اور ۱۱ دسمبر ۳۸ء کے پرچوں میں دیہاتی شاعری کے چند نمونے دیئے گئے ہیں سنئے۔ ایک دیہاتی شاعر چھدا لال کہتا ہے ؎

۲۹ء بعد ہی ستر و گاندھی جی کرتے اعلان　　نمک بنا ؤ اب گھر گھر میں بھارت کے سب بیر جوان

اننت لال کہتا ہے ؎

ان ساہوکاروں کے بس مٹھی میں جان ہماری ہے　　اِن ہی کے لئے کرتے ہیں جو کچھ کھیتی کیاری ہے

علی الحساب سبھی لے جاویں جو ہو پیداواری ہے　　پھر ان کا سُود دیٹے نا رقم بنی رہی ساری ہے

سمپورنانند جی شاعر ہوتے تو "ساہوکار" "جان" "پیداوار" "سُود" "رقم" سب کو کان پکڑ کر باہر نکال دیتے اور بیچارے "علی الحساب" کو تو دیس نکالا دے کر عرب کے ساحل تک پہنچا دیتے۔

سید مطلبی فریدآبادی نے مارچ ۳۸ء کے کلیم میں شمالی ہند کی اس اصلی گنوار زبان پر جو مضمون لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ اس زبان کی سب سے نمایاں خصوصیت جو اُس کے روشن مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہے یہ ہے کہ اُس میں تمام وہ فارسی اور عربی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں جن کو ہندی ادب جان بوجھ کر ترک کر رہے ہیں۔ جو دیہاتی نظم کے نمونے اُنھوں نے درج کئے ہیں اُن میں سینکڑوں عربی فارسی کے الفاظ ہیں مثلاً باگ (باغ)۔ کھاک (خاک)، گلِ شبو، گلِ لالہ، بہار۔ جات (ذات)۔ جوال (احوال)۔ گل جار (گلزار)۔ کھبر (خبر)۔ کھلت (خلعت) تیگ (تیغ)۔ جردی (زردی)۔ ایج (اعزا) بیابان، وارث۔ بگیچہ وغیرہ وغیرہ۔

شاید یہ کہا جائے کہ یہ مسلمانوں کے عہد کا اثر ہے رفتہ رفتہ جاتا رہے گا۔ اثرات جو آتے ہیں وہ عموماً جاتے نہیں۔ ہاں اُن کو زبردستی اُکھیڑ پھینکنے کا ارادہ کر لیا جائے تو اَور بات ہے لیکن ہندوستان کا کون بہی خواہ ہوگا جو ان آئے ہوئے لفظوں کو جو ہماری مشترک زندگی کا اور ہمارے مشترک تمدن کا جز و بلکہ جزو بدن ہو چکے ہیں زور اور تشدد سے نکالنا چاہے۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش جو بڑے شد و مد سے شروع کر دی گئی ہے جاری ہی تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے نکلنے کے ساتھ اتحاد کا جنازہ بھی جلد ہی نکل جائے گا۔

سینکڑوں الفاظ اب عام ہو چکے ہیں لیکن اُن کی جگہ کیسے کیسے عجیب و غریب لفظ تراشے جا رہے ہیں: مدعی (جھگڑا ایلیھڑو)۔ مدعی علیہ (جھگڑا ادوجے)۔ ممالکِ متحدہ (جُبٹ پرانت)۔ ممالکِ متوسط (پرانت کوشل)۔ مسل (پوتھی)۔ صدر (سبھاپتی)۔ تجویز (پرستاؤ)۔ ترقی (اُنتی)۔ مقدمہ (ٹنٹا)۔ حاکم (ادھیکش)۔ مشہور (پرسدھ)۔ ضروری (آوشیک)۔ آزادی (سوتنترتا)۔ اصُول (سدھانت)۔ اعلان (گھوشن)۔ لیڈر (اگوا)۔

شاید کہا جائے کہ "ٹنٹا" یا "پوتھی" کوئی مشکل لفظ نہیں۔ مان لیا لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ "مقدمے" اور "مسل" کو بارہ پتھر باہر کیا جائے۔

سے جاہل دیہاتی کے نزدیک بھی اب مقدمے اور مسل کا ایک خاص مفہوم ہے۔ پھر کونسی قومی ضرورت آپڑی ہے کہ ہم ان کو غیر اور اجنبی سمجھ کر ملک بدر کردیں
غیر اور اجنبی کون ہوتے ہیں؛ عربی فارسی کے الفاظ؛ اور مسلمان؛ اب آپ انہیں کیسے غیر اور اجنبی کہہ سکتے ہیں۔ اگر یہ خود بھی ایسا دعویٰ کریں تو محض باطل ہوگا۔ یہ پہلے مسلمان اور پھر ہندوستانی ہوں تب بھی ہندوستانی ہی رہیں گے، عربی ایرانی نہیں نہ ہوسکتے ہیں۔ ان نام نہاد اجنبیوں میں سے کئی ایک کی شکل بدلی مزاج بدلا خیالات بدلے پھر بھی کہئے کیا یہ اجنبی ہی رہے؛ عربی میں "غم" تھا یہاں آیا تو "غم" ہوگیا۔ "ذرہ" کچھ اور تھا ہم نے اُس سے "ذرا" بنالیا۔ "فوق" کو ہم نے اپنی "بھڑک" کے ساتھ لگاکر "فوق البھڑک" کرلیا۔ ایسے ہی بخشنا خریدنا آزمانا وغیرہ بنے۔ صلوٰۃ اور چیز تھی صلواتیں سُنانا کچھ اَور ہوگیا۔ حور اور واح وغیرہ بھی بدلے۔ اسی طرح قدرتی تصرف سے گرم گرم اور دھڑم دھڑم ہوگیا۔ اس کے علاوہ برق سے برقانا، سُرخ سے سُرخانا اور سینکڑوں ہزاروں ایسے نئے لفظ آئے دن بنتے رہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جو یہاں آیا وہ یہاں کا ہوگیا۔ اصلی وطن تو ہندوستان کسی کا بھی نہ تھا۔ آریا آئے وہ ہندوستانی ہوگئے مسلمان آئے وہ ہندوستانی ہوگئے، اور اُردو تو خالص یہاں کی پیداوار ہے یہیں کا مرکب ہے۔ دو تہذیبوں کے اتحاد کا مظہر ہے دو قوموں کی یک جہتی کی تنہا یادگار ہے اِسے وہی تباہ کرے گا جو ہندوستان کو تباہ کرنا چاہے۔

سو آئیے سب ہندو مسلمان مل کر اس کی حفاظت کریں۔ سیاست کے اِس بے پناہ لڑائی کے زمانے میں ایک کونہ تو رہ جائے جہاں ہم تم دونوں مل سکیں بول سکیں ایک دوسرے کے جی کی سُن سکیں۔ یہیں کسی اَور زبان سے بَیر نہیں اور ہندی تو اُردو کی بہن ہے اس سے کیوں ہو لیکن ہمارا قومی وملکی فرض ہے کہ ہم اُردو کو جو ہندو مسلم ملاپ کی سچی نشانی ہے برقرار رکھیں اور اس کے رنگین رشتے سے بچھڑنے والے دلوں کو ایک دوسرے سے خوب مضبوط باندھ دیں۔

اُردو کی خوبیاں اظہر من الشمس ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک نشان ہے۔ اُس کے الفاظ کا ذخیرہ اور رسم خط دو بڑے تمدنوں کا مظہر ہیں اُس کے رسم خط میں مختصر نویسی کے سب فائدے موجود ہیں۔ وہ دُنیا میں بیسیوں اَور ملکوں اور قوموں کا رسم خط ہے۔ وہ خوشنما اور خوبصورت ہے۔ اُردو کا ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے اور اس میں اَور لفظ لینے کی حیرت انگیز قابلیت ہے۔ اُردو ایک طرف عربی فارسی سے استفادہ کرسکتی ہے دوسری طرف ہندی سے۔ سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو کا دعوےٰ ہے کہ جتنے ہندی محاورے اُردو میں موجود ہیں خود ہندی میں نہیں ہیں اور پھر اُردو میں فارسی ہندی ملاپ کی کیسی کیسی خوبصورت شکلیں ہیں: نیک چلن، کفن چور، زر پھینک، کاغذاب، پگڑی بدل، تپ دِک وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یاد رکھیئے بہتر سے بہتر چیز کم از کم بہتر سے بہتر انسانی چیز محض قائم رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُس کے لئے آگے بڑھنا لازم ہے سو اپنی زبان کو وسیع کیجئے۔ آج "کچھ اَور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے" اسی طرح ہوسکتی ہے کہ "کچھ اَور چاہئے وسعت مری زباں کے لئے" پر عمل ہو۔ جیسے عام زندگی میں ویسے ہی زبان کے معاملے میں بھی تنگ نظری اور تھڑ دلی سے ترقی رُک جاتی ہے جسے آگے بڑھنا ہو پھر وہ رُکا نہ رہے ورنہ پیچھے کو گر جائے گا یا گرادیا جائے گا۔

سو اُردو کو چاہئے کہ ہندی سے، ہندوستان کی دوسری زبانوں سے، انگریزی سے، عربی فارسی سے، ہر کہیں سے نئے الفاظ لے اس

معاملے میں خوب لوٹ مار کرے ہاں یہ ضروری ہے کہ نئے الفاظ ایسے ہوں جن کی کھپت آسانی سے زبان کے اندر ہو سکے یہ نہیں کہ جو سامنے آیا، اُسے پہلو میں جگہ دے دی۔ تمیز و انتخاب جیسا زندگی میں ویسا ہی زبان کے معاملے میں اشد ضروری ہے۔

ایسی اور دوسری اور ضروری اصلاحات اور تبدیلیوں کے لئے اور ہر طرح اُردو زبان کی حفاظت و ترقی کے لئے انفرادی نہیں بلکہ مسلسل اجتماعی اور منظّم کوشش لازم ہے۔

۱۹۳۸ء میں اُردو کی دُنیا میں خاصی چہل پہل رہی۔ سب سے زیادہ کام یقیناً انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کے اَن تھک سکرٹری نے کیا۔ سال کے شروع میں اُنہوں نے سندھ پراونشل اُردو کانفرنس کی صدارت کی اور وہاں اُردو کی اشاعت کے لئے انتظام کیا۔ اس کے بعد وُہ بمبئی، سی پی، بہار، یوپی، بنگال اور پھر دوبارہ بہار گئے۔ اور اِن سفروں میں اُنہوں نے سربرآوردہ لوگوں سے ملاقات کرنے اور انجمن کی شاخیں کھولنے میں اُردو کی بڑی خدمت سرانجام دی۔ خوشی کا مقام ہے کہ اب انجمن ترقیٔ اُردو کا دفتر دہلی میں منتقل ہو گیا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو انجمن کے صدر ہو گئے اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی بھی ادبی کاموں میں سیکرٹری کا ہاتھ بٹائیں گے۔ ۱۹۳۸ء میں الٰہ آباد، سندھ، بمبئی، بنگال، علی گڑھ میں انجمن کی صُوبجاتی شاخیں کھلیں اور پھر مختلف صُوبوں میں صُوبجاتی شاخوں کی چھوٹی شاخیں پھیلیں۔ مدراس میں انجمن ترقیٔ اُردو نے چند مدرسے قائم کئے۔

اِن کے علاوہ مُلک میں کئی اور اُردو انجمنیں کھُلیں۔ جن میں بہت سی انجمنیں اقبال کی یادگاریں قائم ہوئیں۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اُردو کے اس بے نظیر شاعر کی رحلت اُردو زبان کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُن کی وفات سے چند ماہ پہلے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو سارے ہندوستان میں "یومِ اقبال" منایا گیا اور مُلک کے طُول و عرض میں جا بجا اُن کی شاعری اور فلسفے پر سینکڑوں مقالے اور نظمیں پڑھی گئیں۔ اُن کے انتقال پر مُلک میں ایک کہرام مچ گیا، کوئی صاحبِ دل نہ تھا جس نے اس قومی صدمے کو محسوس نہ کیا ہو۔

یومِ اقبال کے علاوہ ۱۵ر فروری کو یومِ غالب اور ۸ر دسمبر کو انجمن بہارِ ادب لکھنؤ کی تحریک پر سارے ہندوستان میں "یومِ اُردو" منایا گیا۔ بدستورِ سابق کئی مشاعرے منعقد ہوئے جن میں لاہور، کراچی، لکھنؤ، مسوری اور شملہ کے آل انڈیا مشاعرے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جنوری ۱۹۳۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق مُلک میں اُردو کے ۵۷ روزانہ اخبارات، ۲۴۳ ہفتہ وار اور ۲۱۸ رسائل وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ اس تعداد کا نہ ہندی اخبارات و رسائل مقابلہ کر سکتے ہیں نہ کسی دوسری زبان کے۔ چنانچہ روزانہ اخبارات گجراتی میں ۱۸، ہندی میں ۲۰ اور بنگالی میں ۸ اور ہفتہ وار اخبارات بنگالی میں ۱۲۲، گجراتی میں صرف ۶۵ اور ہندی میں ۱۰۶ ہیں۔ اِن کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد تو بہت ہی کم ہے۔ اُردو کی یہ فوقیت اس حال میں قائم ہے جب کہ اُردو میں ابھی ٹائپ موجود نہیں ہے۔

یہ سب کچھ قابلِ اطمینان ضرور ہے لیکن اسے کافی ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔ آج مقابلے کا وقت ہے جد و جہد کا زمانہ ہے اب تھوڑی بہت فوقیت پر مطمئن رہنا نادانی ہے اور اب معمولی خوش گپیوں اور تھوڑی بہت انفرادی دَوڑ دُھوپ سے بھی کام نہ چلے گا۔ اُردو جس نے اپنی فطری دلکشی اور صلاحیت سے سارے ہندوستان کا دِل موہ لیا ہے آج اپنے مدّاحوں اور حامیوں سے مسلسل توجّہ اور مسلسل کوششوں کی طلبگار ہے۔

آج زمانہ عمل کا ثبوت چاہتا ہے۔ جو کوششیں ہو رہی ہیں، وہ جاری رہیں لیکن اُن کی رفتار بہت زیادہ تیز کر دی جائے۔ زبان کو اور زیادہ عام فہم بنایا جائے۔ اُس کی صحت و توسیع ہوتی رہے۔ رسم خط کی اصلاح کی جائے، ٹائپ کے مسئلے پر توجہ دی جائے۔ اُردو میں دُنیا کی زبانوں کا بہترین لٹریچر جمع کیا جائے اور اُس کے ادب کو نئے اُمید افزا اور حیات انگیز خیالات سے مالامال کیا جائے، جن میں دُور از کار تصورات کی بجائے فطری جذبات کی فراوانی ہو۔ اِس بات کی پُوری کوشش کی جائے کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اُردو کا شعبہ کھولا جائے۔ اور جہاں بھی اُردو رائج ہے وہاں اُسے ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ ملک میں جابجا گشتی کتب خانے قائم ہوں۔ آسانی سے اُردو سکھانے والی کتابیں شائع ہوں۔ اہلِ ملک کو متوجہ کیا جائے کہ وہ اپنے تجارتی کاروبار اور عام خط و کتابت اور تقریر و گفتگو میں اُردو کو ذریعۂ اظہار بنائیں۔ بالغوں کو مفت تعلیم دینے کے لئے رضاکاروں سے کام لیا جائے، اُردو کتابوں کے ارزاں ایڈیشن شائع کیے جائیں اور اُردو کی ترقی و ترویج کے لئے ہر شہر اور ہر قصبے میں انجمنیں قائم کی جائیں۔

یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ملک و قوم کا ہر بہی خواہ اپنے اپنے حلقے میں اُردو کی اشاعت کرے اور اُسے ہر دلعزیز بنائے اور اُدھر اُردو کے رہنما سر جوڑ کر بیٹھیں اور منظم ہو کر وہ کام کریں جس سے اُردو بغیر کسی سے لڑے بھڑے محض اپنی فطری صلاحیت اور اکتسابی خوبیوں کے باعث سارے ہندوستان کی مُلکی و قومی زبان بن جائے!

یہ ہے ملک و قوم کی صحیح خدمت!

بشیر احمد

جہاں نُما

۱۹۳۸ء کے اہم واقعات یہ تھے :-

۴ فروری : جرمنی کی تمام فوجوں کو ہٹلر اپنی کمان میں لے لیتا ہے

۷ " : جاپان اپنی بحری طاقت میں اضافہ کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

۱۸ " : ممالکِ متحدہ (امریکہ) کی طرف سے بھی ایک ایسا ہی اعلان ہوتا ہے۔

۱۹ " : ہری پورہ میں انڈین نیشنل کانگرس کا اکیاونواں اجلاس۔

۲ مارچ : رُوسی حکومت اپنے بعض مخالفین پر سازش کا مقدمہ چلاتی ہے۔

۱۱ " : جرمنی آسٹریا پر قبضہ کر لیتا ہے۔

۱۵ اپریل : انگلستان اور اطالیہ کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہوتا ہے۔

۱۶ " : آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس کلکتے میں منعقد ہوتا ہے۔

۲۱ " : علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات

۲۵ " : انگلستان اور آئرستان کے درمیان مفاہمت۔

۲۸ " : مہاتما گاندھی کی ملاقات مسٹر جناح سے۔

۶ مئی : ہٹلر کی ملاقات مسولینی سے

۲۱ " : جرمن فوجیں چیکوسلوویکیا کی سرحد پر

۲۶ " : ترکی اور انگلستان میں ایک معاہدہ

۵ جولائی : سپین میں عدمِ مداخلت کے متعلق دولِ عُظمیٰ کا سمجھوتا

۳۱ " : مانچوکواو کی سرحد پر رُوسی اور جاپانی فوجوں میں جھڑپ

۹ ستمبر : جرمنی چیکوسلوویکیا کی سرحد پر اپنی فوجیں جمع کرتا ہے
یورپ میں جنگ کا خطرہ

۱۵ " : چیمبرلین ہٹلر سے ملاقات کرتا ہے (برشٹس گاڈن میں)

۱۹ " : فرانس اور انگلستان کی تجاویز چیکوسلوویکیا کے لئے

۲۲ " : چیمبرلین پھر ہٹلر سے ملاقات کرتا ہے۔ (گوڈز برگ میں)

ہٹلر اپنے آخری مطالبات پیش کرتا ہے۔

۲۹ ستمبر : میونخ کے مقام پر انگلستان، فرانس، جرمنی اور اطالیہ کا سمجھوتا چیکوسلوویکیا کے متعلق۔

یکم اکتوبر : جرمن فوجیں سوڈیٹن لینڈ میں داخل ہوتی ہیں۔

۸ ؍ : فلسطین کے متعلق دُنیا کے مسلمانوں کی کانفرنس کا انعقاد

۱۴ ؍ : صدرِ کانگرس مسلم لیگ کی شرائطِ صلح رد کر دیتا ہے

۲۱ ؍ : کینٹن کے شہر پر جاپانیوں کا قبضہ

۲۸ ؍ : ہنکاؤ کے شہر پر جاپانیوں کا قبضہ

۲۹ ؍ : جمہوریۂ ترکیہ کی پندرھویں سالگرہ

۳۰ ؍ : جرمنی میں یہودیوں کی گرفتاریاں اور اُن کو شدید سزائیں

یکم نومبر : فلسطین میں عرب تین دن کی ہڑتال مناتے ہیں۔

۱۰ ؍ : غازی کمال اتاترک کی وفات

۱۱ ؍ : چیکوسلوویکیا میں سلوویک قوم اپنی خود اختیاری کا مطالبہ پیش کرتی ہے

برطانوی حکومت فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ ترک کر کے ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کرتی ہے۔

۱۴ ؍ : پیرس میں ایک جرمن سرکاری افسر کے قتل پر جرمنی کے یہودیوں پر ایک ارب مارک جرمانہ عائد کیا جاتا ہے

۳۰ ؍ : اطالوی پارلیمنٹ میں مظاہرہ کہ فرانس طونس کارسیکا اور وینس کے علاقے اطالیہ کو واپس دے دے

۶ دسمبر : فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ ترک کر دینے کے متعلق مفاہمت

۷ ؍ : جرمن اخبارات اپنی چھنی ہوئی نوآبادیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۱۱ ؍ : شہر میمل کے انتخابات میں نازیوں کی کامیابی

۲۶ ؍ : آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں

جنگ کے بعد پچھلے بیس سال میں یقیناً کبھی ایسا سیاسی انقلاب نہیں ہؤا جیسا ۱۹۳۸ء میں، گویا سیاست کی بساط ہی اُلٹ گئی۔ اِس **حیرت انگیز انقلاب** کا بانی مبانی جرمنی کا ہٹلر ہے جس نے مارچ میں خاموشی سے آسٹریا پر اور اکتوبر میں وجود دیگر بڑی سے بڑی طاقتوں کی مخالفت کے چیکوسلوویکیا کے ایک حصّے پر قبضہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج فرانس اور رُوس کا اتحاد عملاً ٹوٹ چکا ہے اور انگلستان اور فرانس کا اتحاد کمزور ہو چکا ہے مغرب کی جمہوریتیں جرمنی، اور اطالیہ اور جاپان کی فاشیت کے آگے سرنگوں معلوم ہوتی ہیں اور یورپ کے برِّ اعظم پر جہاں بھی فرانس کا اقتدار کم و بیش قائم تھا وہاں ۱۱ مارچ اور خصوصاً ۳۰ ستمبر ۳۸ء کے بعد اب صرف حضرتِ **ہٹلر** کی طاقت کا ڈنکا بج رہا ہے نہیں معلوم یہ عجیب و غریب صورتِ حال کب تک

رہے لیکن اس وقت تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ عظیم میں کامیابی کے بعد انگلستان اور خصوصاً فرانس نے جتنا اثر کم از کم یورپ میں حاصل کیا تھا وہ بہت کچھ ملیا میٹ ہوگیا ہے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ دنیا آمروں کی حکومت کو ایک عارضی سا سانحہ سمجھے ہوئے تھی، انگلستان اور فرانس کا خیال تھا کہ صرف ہماری جمہوری سرمایہ داری تہذیب کا سب سے کامیاب مظہر ثابت ہوکر رہے گی، اُدھر اشتراکیوں کو یقین تھا کہ روسی اشتراکیت کے آگے اب دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹھہر سکتی لیکن چند ہی مہینوں میں یہ زعم اور یہ دعوے سب کے سب باطل ہوکر رہ گئے۔ ہٹلر کے حواری گیبلز نے ۲۹ مئی کو دنیا کو سنا دیا کہ "جرمنی کا امن ایک مسلح امن ہے جس کی حفاظت کے لئے اُس کے ہاتھ میں ایک تیز تلوار ہے"۔ اپنے مقصد کی تکمیل میں ہٹلر نے جرمنی کے معاہدوں اور وعدوں کو اسی تلوار سے کاٹ کے رکھ دیا۔ ۱۹۱۹ء کے ورسائی کے معاہدے، ۱۹۲۵ء کے لوکارنو کے معاہدے اور ۱۹۲۸ء کے کیلاگ کے معاہدے غرض اس نے ہر معاہدے کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ۱۹۳۳ء میں اُس نے انجمنِ اقوام کی رکنیت ترک کردی، ۱۹۳۵ء میں ہوائی طاقت اور عام فوجی طاقت کو بڑھانا شروع کیا اور جرمن دریاؤں کو اپنے قبضے میں لیا۔ ۱۹۳۶ء میں رائین کے علاقے کی قلعہ بندی شروع کردی۔ ۱۹۳۷ء میں ہسپانوی بندرگاہ المیریا پر گولہ باری کی۔ ۱۹۳۵ء میں ہٹلر کہہ چکا تھا کہ مجھے آسٹریا کے داخلی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں لیکن ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو اُس نے بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے سارے آسٹریا پر قبضہ جما لیا۔ مئی میں اُس نے چیکوسلوویکیا کی سرحد پر جرمن فوجوں کی نقل و حرکت سے دھمکی دی اور پھر ستمبر میں سوڈیٹنوں کو شہ دے کر چند ہی روز میں اپنا مطالبہ صاف لفظوں میں پیش کردیا کہ یا سوڈیٹن لینڈ جرمنی کو دے دو یا لڑائی کے لئے تیار ہوجاؤ۔ فرانس کا چیکوسلوویکیا سے معاہدہ تھا اُدھر روس بھی اُس کا حلیف تھا۔ اِن دونوں نے کہا کہ ہم اپنے حلیف کا ساتھ دیں گے۔ برِاعظم پر اگر فرانس اپنے کمزور رفقا کی مدد کرنے سے پرہیز کرتا تو اُس کا اثر زائل ہونے کا اندیشہ تھا۔ لیکن اگر فرانس جنگ میں شریک ہوا تو انگلستان کا دیر تک علیحدہ رہنا بہت دشوار تھا۔ سو انگلستان جیسے لڑائی سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اور نقصان کا احتمال ہوسکتا ہے بیچ میں کود پڑا۔ چیمبرلین نے ہٹلر سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی، اُس نے اجازت دی۔ بے تابیوں کا خوب اندازہ کرکے اپنا نرخ بالا کیا، اپنے مطالبات بڑھائے اور جو بات شاید اُسے ایک بڑی جنگ سے بھی حاصل نہ ہوتی وُہ اُس نے آسٹریا کی طرح پھر بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے حاصل کرلی۔ کمزور دل فرانس انگلستان کا دامن پکڑے رہا انگلستان جیسے چیکوسلوویکیا کے نقصان میں کوئی خسارہ نہ تھا اس سازش میں جرمنی سے مل گیا۔ روس روٹھ کر الگ ہوگیا۔ انگلستان کے سرمایہ دار اور چاہتے ہی کیا تھے؟ ہٹلر نے کہا اب صرف نو آبادیوں کا سوال باقی رہ گیا ہے لیکن وہ بغیر لڑے بھڑے طے ہوسکتا ہے انگلستان نے سوچا زیادہ اصرار کے بعد دو ایک بُری بھلی نو آبادیاں لے کر جرمنی راضی ہوگیا تو سودا بُرا نہیں میری باقی سلطنت پر پھر بھی سورج ڈوبے گا نہیں۔ تین سال ہوئے جرمنی اور انگلستان میں بحری مفاہمت ہوچکی تھی، ابی سینیا کے جھگڑے کے بعد اس سال اطالیہ سے بھی دوستانہ معاہدہ ہوچکا تھا انگلستان کی قدامت پسند حکومت اور غالباً وہاں کے اکثر باشندوں نے بھی محض اپنے نفع کی بات سوچی اور دوسروں کی خاطر اپنے شہروں اور اپنے سارے ساز و سامان کو بمباری کی نذر کردینے میں کسی قسم کی خوبی نہ دیکھی۔ مزدوروں کے لیڈر اور بعض اور لوگ بہتیرا چلائے کہ ہٹلر کی آمریت کے آگے سر جھکانا جمہوری روایات کا خون کردینا ہے، اگر تمدن کو فاشیت کی دست برد سے محفوظ رکھنا ہے تو ایسے موقع پر ہٹلر کی شرائط پر صلح کے لئے راضی ہوجانا بلکہ زور دینا پرلے درجے کی کوتاہ بینی ہے لیکن انگلستان کے موجودہ حکمران جو خود نیم فاشی ملوکیت پسند سرمایہ دار ہیں ان خرافات کی طرف متوجہ نہ ہوئے، انہوں نے جس طاقتور کا پلڑا بھاری دیکھا اُسی کے ساتھ ہوگئے۔

انگلستان کی یہ پالیسی ممکن ہے عارضی طور پر اُس کے لئے فائدہ مند ثابت ہو لیکن یہ ظاہر ہے کہ اُس انگلستان کے لئے جو کبھی جمہوریت

کا مادہ ولیجا سمجھا جاتا تھا یہ شرمناک امر ہے کہ وہ ایسے حریت کُش آمروں کے سامنے اس طرح جُھک جائے۔

موجودہ صورتِ حالات کو سمجھنے کے لئے پچھلے بیس برس پر ایک سرسری نگاہ ڈالنی ضروری ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں ورسائی کے عہدنامے کی رُو سے اتحادیوں نے اوّل تو اپنے لئے دُنیا کے بہترین حصّوں پر قبضہ کرلیا۔ یورپ میں فرانس نے آلساس لورین لے لیا، یورپ سے باہر انگلستان نے جرمنی کی افریقی نوآبادیوں کو اپنے علاقے میں شامل کیا فلسطین اور عراق کو انگلستان نے اور شام کو فرانس نے اپنی حراست میں لیا دوسرے آسٹریا ہنگری کو پارہ پارہ کرکے اُس میں مختلف قومیتیں بنا دیں لیکن اِن نئی قومیتوں میں کئی قوموں کو یکجا کرکے اکثریت اور اقلیت کے جھگڑے پیدا کرنے کا اچھا خاصا سامان مہیا کردیا گیا مثلاً چیکوسلوویکیا میں اقلیتیں ۳۲ فی صدی اور پولینڈ میں ۳۰ فی صدی تھیں۔ چیکوسلوویکیا کی ایک اقلیت وہ سوڈیٹن جرمن تھے جن کے باعث ستمبر ۳۸ء میں جنگِ عظیم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ تیسرے اتحادیوں نے جرمنی اور اُس کے حلیفوں کو ایسا کمزور کردیا کہ اُن کا اندازہ تھا کہ یہ اب سَو سال تک سر نہ اُٹھا سکیں گے۔

لیکن زیادہ تشدد عموماً مظلوم میں غیرت کا مادہ پیدا کرکے اُسے بیدار کردیتا ہے۔ آسٹریا ہنگری تو پہلے ہی مختلف قوموں کا مجموعہ تھا جو الگ الگ ہوگئیں۔ اِس میں صرف آسٹروی جرمن تھے جو اس علیحدگی سے خوش نہ تھے۔ جرمنی میں علاوہ اُس پر ایک بہت بھاری تاوان عائد کرنے اور اُس سے اُس کی نوآبادیاں چھین لینے کے مشرقی پرشیا کو کاٹ کر الگ کردیا گیا اور بیچ میں سے پولینڈ کے لئے ڈین زگ کی بندرگاہ تک پہنچنے کا ایک رستہ نکالا گیا۔ غرض ہر طرح اُسے کمزور کردیا گیا۔ ترکی کے حصّے بخرے کرکے گویا اُسے نیم مُردہ کرکے اناطولیا کی وادیوں میں سسکنے کو چھوڑ دیا۔

سب سے پہلے تُرکی اُٹھا۔ اُس نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ یہ اتحادیوں کے لئے پہلی زبردست شکست تھی جس کا اعتراف اُنہیں لوزان کے عہدنامے میں (۱۹۲۳ء میں) کرنا پڑا۔ اتحادیوں نے (۲۵ء میں) لوکارنو کے عہدنامے (۲۸ء میں) کیلاگ والے معاہدے اور (۳۰ء میں) امریکہ انگلستان اور جاپان کے درمیان ایک بحری معاہدے کے ذریعے سے موجودہ مقبوضات کی بنا پر امن قائم رکھنے کا خوب بندوبست کیا لیکن محروم قومیں جو اب اندر ہی اندر طاقت پکڑ رہی تھیں ایسے پُر فریب امن کے تسلسل کی خواہاں نہ تھیں وہ دیکھ رہی تھیں کہ کب موقع ملے اور وہ بھی چھین جھپٹ کا سلسلہ شروع کردیں۔ جاپان نے ابتدا کی ستمبر ۱۹۳۱ء میں اُس نے منچوریا پر چھاپہ مارا۔ اتحادیوں نے ناپسندیدگی ظاہر کی تو مارچ ۳۳ء میں وہ لیگ سے علیحدہ ہوگیا اور اکتوبر میں جرمنی نے بھی لیگ کو چھوڑ دیا۔ جون ۱۹۳۴ء میں ہٹلر اور مسولینی ملے اور اُنہوں نے باہم مل کر اپنی طاقت بڑھانے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ اسی سال اگست میں ہٹلر چانسلر اور "فیورر" بن کر جرمنی کا مطلق العنان فرماں روا ہوگیا۔ آئندہ سال جنوری ۳۵ء میں فرانس نے اطالیہ کو خوش کرنے کے لئے ابی سینیا کے متعلق سمجھوتا کرلیا اور انگلستان نے بھی جون میں جرمنی سے ایک بحری معاہدہ کرلیا۔ یہ اتحادی کمزوری اور تفریق کی ابتدا تھی۔ اطالیہ نے اکتوبر میں ابی سینیا پر دھاوا بول دیا۔ آئندہ سال جرمنی نے رائین لینڈ میں اپنی فوجیں اُتار دیں اور ورسائی کی سب بندشوں کو توڑ کے رکھ دیا۔ یہاں تک کہ ۳۸ء میں اُس نے اُن علاقوں پر بھی ہاتھ صاف کیا جو جنگِ عظیم سے پہلے بھی اُس کی قلمرو میں شامل نہ تھے یعنی آسٹریا اور سوڈیٹن لینڈ۔ سُنتے ہیں کہ اب ہٹلر کا ارادہ ہے کہ جنوب مشرق کا رُخ کرتے ہوئے یورپ کی جنوب مشرقی ریاستوں پر اقتدار حاصل کرے اور جنوبی رُوس میں یوکرین کے زرخیز علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کرلے۔ یہ ہے جرمنیِ عظمےٰ کا تصوّر!

اس وقت اتحادیوں کی بُزدلی اور جرمنی اور اطالیہ کی جرأت اظہر من الشمس ہو چکی ہے۔ ہٹلر اور مسولینی نے جس دیدہ دلیری اور جیسی دھمکیوں اور طعن و تشنیع سے سیاسی حلقوں پر اپنا رُعب جمایا ہے اُس کی نظیر دورِ حاضر کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ وُہ جب چاہتے ہیں اپنے اخباروں کو اُکسا دیتے ہیں یا اور وہ بڑے سے بڑے انگریزوں اور فرانسیسوں کو خوب گالیاں دینے لگتے ہیں، اس کے علاوہ یہ خود بھی جا و بیجا باتیں کہنے سے نہیں ہچکچاتے۔ سیاسی اخلاق کو اُنھوں نے بالائے طاق رکھ دیا ہے اور انگریزوں فرانسیسوں سے کھُلم کھُلا کہا ہے کہ تم ساری دُنیا پر قبضہ کئے بیٹھے ہو۔ ہم بھی تم سے کسی طرح کم نہیں۔ کمزور قوموں اور پس ماندہ ملکوں کے متعلق جو رویّہ تم روا رکھتے تھے کل تک ہم روا رکھتے ہیں آج آسٹریا اور سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ کر کے ہٹلر نے صاف لفظوں میں کہا کہ جرمنی بھی فرانس اور انگلستان کی طرح کا ایک جمہوری ملک ہے اور میں نے ایک جمہوری رہنما بن کر ہی آسٹریا اور چیکوسلوویکیا کے دو آمروں کا خاتمہ کیا ہے اور مظلوم قوموں کو آزادی دلائی ہے۔ اُس نے کہا کہ برطانوی مدبّر جو مجھے استبداد کا طعنہ دیتے ہیں وہ پہلے اپنے گریبان میں آپ مُنہ ڈالیں اور دیکھیں کہ ہندوستان اور مصر اور فلسطین میں وہ خود کیا کچھ کر رہے ہیں؟ کیا فلسطین میں بجائے جمہوریت کے تشدد کی صُورت پیدا نہیں ہے؟

انگلستان کی سیاسی حیثیت عجیب ہے اور وہ ایک جمہوری ملک کہلاتا ہے دوسری طرف وہ سب سے بڑی سلطنت کا مالک ہے جس میں کئی رنگ رنگ کی محکوم قومیں ہیں۔ وہ جمہوری فرانس کا حلیف اور جمہوری امریکہ کا دوست ہے۔ اِن کا دعوےٰ ہے کہ آزادی دُنیا میں ہماری بدولت ہی زندہ ہے لیکن انگلستان کی سرمایہ داری اور ملوکیت اُسے اشتراکیت کی مخالفت اور فاشیت کی حمایت پر مجبور کرتی ہیں۔ اِسی لئے چیکوسلوویکیا کے معاملے میں رُوس اور فرانس کے الگ الگ رَوش اختیار کرنے پر وہ مطمئن ہوا اسی لئے باوجودیکہ جنرل فرانکو نے انگریزی جہازوں پر بم باری کی اور اطالیہ اور جرمنی آج تک کھُلے بندوں اُس کی مدد کر رہے ہیں، انگلستان نے سپین کی اشتراکی حکومت کا کبھی ساتھ نہیں دیا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے اُس کا خاتمہ ہو جائے۔ انگلستان کی مزدور پارٹی اکثر آزاد خیال مفکّر اور کئی دُوسرے لوگ اس حکمت عملی سے سخت ناراض ہیں، وہ اسے انگلستان کے حق میں سخت مضر سمجھتے ہیں لیکن انگلستان کی موجودہ حکومت کسی نہ کسی طرح آمروں سے سودا کرنے پر تُلی بیٹھی ہے۔

اصلی وجہ یہ ہے کہ انگلستان کی سلطنت اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ وہ اب فقط اُس کے تحفظ کو معراج کمال تصوّر کرتا ہے یہی حال فرانس کا ہے اور محض تحفظ کے طرزِ عمل میں کبھی وہ زور و قوت رُونما نہیں ہو سکتی جو جارحانہ عمل میں رُونما ہوتی ہے اِس کے برعکس جرمنی اطالیہ اور جاپان اپنی سلطنت کو بڑھانا چاہتے ہیں اِس لئے وہ آگے کو بڑھ رہے ہیں، وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہے ہیں وہ اِن خطروں ہی میں زندگی کا لُطف اُٹھا رہے ہیں۔ اُن کے پاس کیا کچھ ہے جس کے کھو جانے کا اُنہیں ڈر لگا ہے؟ وہ سیاسی دُنیا میں اپنی آبرو کھو چکے تھے کہ مسولینی اور ہٹلر آ دھمکے، اِنھوں نے اُن کو اُنہیں اُبھارا اُکسایا برانگیختہ کیا۔ اتحادی آرام کے خواہاں تھے، دُنیا جنگ سے تنگ آ چکی تھی آمروں نے اسے تاڑ لیا۔ وہ دلیر اور کائیاں تو تھے ہی، اُنھوں نے اپنی پالیسی کو ایسے ڈھنگ پر چلایا کہ قدم قدم پر اُنہیں کامیابی حاصل ہوئی۔

مسولینی اور ہٹلر عام انسانی ترقی کے علم بردار نہیں، اُنہیں صرف اپنے ملکوں کے اقتدار سے واسطہ ہے خواہ وہ کسی طرح حاصل ہو سکے اور اِس اقتدار میں اُن کی اپنی ناموری اور طاقت کی ذاتی ہوس کا جزو غالب ہے لیکن دوسری طرف دیکھو کہ انگلستان اور فرانس نے بھی محکوم قوموں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے جس طرح آج تک وُہ اپنی ملوکیت پر قائم ہیں۔ اُس میں کونسی جمہوریت کی روشنی جھلک رہی ہے اُس میں کون سا

نوعِ انسان کی خدمت کا جذبہ ٹپک رہا ہے ؛ اُنھوں نے لُوٹ مار شاید ذرا مہذب طریقے سے کی، اُدھر اطالیہ اور جرمنی نے ڈاکوؤں کی طرح لُوٹا اور کہا کہ دُنیا کے مال میں ہمارا بھی حصّہ ہے اور ہم اپنی طاقت سے اُسے حاصل کرنے آئے ہیں۔

انگریزوں نے جس طرح فلسطین کے دو ٹکڑے کر دیئے، جس طرح اُنھوں نے عربوں کو یہودی سرمایہ داری اور انگریزی ملوکیت کے نیچے پیس ڈالنے کا منصوبہ تیار کیا اور اس پر عمل بھی کیا دورِ حاضر میں اس کی بہت تھوڑی مثالیں ہیں۔ پھر جب عربوں نے اپنے جان و مال سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور مقابلہ کر دکھایا تو اُسی انگلستان نے اپنی پالیسی کو نرم کر دیا اور صُلح کا ہاتھ بڑھایا۔

اِس کا کیا اثر ہے ؛ اور اس کے معنی کیا ہیں ؛ اس کے معنی ہیں وُہ پُرانی کہاوت جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اور اس کا اثر یہ ہے کہ تہذیب روز بروز محض تشدّد کا دوسرا نام ہُوا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کس ذلیل حالت پر پہنچ گئی ہے اس کا اندازہ اُس ظلم و تعدی سے کرو جو جرمن حکومت یہودیوں پر کر رہی ہے۔ ایک یہودی غم و غصے میں آ کر ایک جرمن افسر کو بُری طرح ہلاک کر دیتا ہے اِس پر جرمن حکومت جرمنی کے سارے یہودیوں پر تاوان عاید کرتی ہے اور اُن سب پر مظالم کا ایک سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ ۲۸ نومبر کو یہاں تک ہُوا کہ یہودیوں کو حکم دیا گیا کہ فلاں روز تم باہر بازاروں میں مت نکلو۔ یہ ہے آج کل کی مہذب دُنیا۔ کچھ اسی قسم کے احکام مارشل لا کے دنوں میں ہم ہندوستانیوں پر بھی نافذ ہو چکے ہیں۔ اگر اس پر بھی دُنیا کا ضمیر بیدار نہ ہو تو پھر تہذیب کا واقعی خدا ہی حافظ ہے!

یہ نہیں کہ یورپ و امریکہ میں آزاد خیالی کا فی الواقع خاتمہ ہو چکا ہے لیکن موجودہ جمہوریت کا ڈھانچ کچھ اس قسم کا ہے اور اُس میں ایسی کمزوریاں پیدا ہو چکی ہیں کہ کہیں تو رائے عامہ کو ایک موم کی ناک کی طرح مخصوص تعلیم اور فضا اور پروپگینڈا کے زور سے حسبِ دلخواہ موڑ لیا جاتا ہے اور کہیں اُس کی امن پسندی کی روش سے فائدہ اُٹھا کر یا معاشی مفاد کی جھلک دکھا کر اُسے ذلّت کی راہ پر لے جایا جاتا ہے۔ نتیجہ یا اندھا دھند تقلید ہوتا ہے جیسا رُوس جرمنی اور اطالیہ میں ہو رہا ہے یا بے راہ روی اور عام مایوسی جیسا انگلستان فرانس اور ممالکِ متحدہ میں ظاہر ہے۔ اشتراکی اور فاشی ملک تو اپنے آمرین کی سیاسی رہنمائی کو دین و دُنیا کا ماحصل اور گویا خدا کا فرمودہ سمجھے ہوئے ہیں اور نام نہاد جمہوری ملک سرمایہ داری اور امن پسندی کے درمیان ڈانواڈول ہو رہے ہیں اور کوئی دلیرانہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے قاصر ہیں۔ آمری ملکوں میں انفرادی آزادی علانیہ طور پر کچل دی گئی ہے اور جمہوری ملکوں میں وہاں کی خارجی ملوکیت پرستی کے باعث اور داخلی معاملات میں ریاست کے وسیع اختیارات کی وجہ سے رعایا کی آزادی خطرے میں ہے۔ غرض اِس وقت دُنیا بھر میں **انفرادی آزادی** کا حال پتلا ہو رہا ہے!

رائے عامہ کی حالت کا اندازہ دو ایک واقعات سے کرو۔ ٹوکیو کی ۲۲ اکتوبر کی خبر ہے کہ چینی شہر کینٹن کی تسخیر پر جاپان میں بے حد خوشیاں منائی گئیں۔ باوجود بارش کے بے شمار لوگ عبادت گاہوں میں گئے، شام کو دکانوں میں کام کرنے والی دو ہزار لڑکیاں ایک جلوس کی صورت میں اپنے ہاتھوں میں لالٹینیں لئے شاہی محل کی طرف روانہ ہوئیں۔ اُدھر ایک کمزور دُشمن کے شہروں میں بے گناہ عورتوں بچوں پر بے تحاشا بم گرائے جا رہے ہیں اور اِدھر یہ نوجوان لڑکیاں اپنی قومیت کے جوش میں جلوس بن کر نکلی ہیں۔ کینٹن کی فتح پر جاپانیوں نے

۲۴۴۰۰۰ غیر مسلح چینیوں کو قتل کیا۔ اس پر بھی ٹیگور اور گاندھی کا دوست جاپانی شاعر نوگوچی ٹیگور کو لکھتا ہے کہ "جاپان کا چین پر حملہ محض ایشیائیوں کے لئے ایشیا کو مخصوص کرنا ہے اور محض تہذیب کی خدمت ہے بلکہ خود چین کے لئے مفید ثابت ہوگا" اس کے بعد حبِ وطن کے جذبے کو کون بے وقوف "نہ سراہے گا؟ بیچارا ٹیگور اس کے جواب میں انسانیت پر لکچر دیتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ہٹلر کے حملے کے وقت چیکوسلوویکیا کے مصنفین نے "دُنیا کے ضمیر" کو خطاب کرکے ایک زبردست اپیل کی تھی لیکن آج توپوں اور طیاروں کے سامنے عقلی اور رُوحانی اپیلوں کی شنوائی انسانیت کی عدالتِ عالیہ میں ممکن نہیں۔ طاقت زوروں پر ہے، بین الاقوامی سمجھوتے آج فقط کاغذ کے پرزے اور کہنے کی باتیں ہیں۔ اسی سے بےچینی پیدا ہوتی ہے اور بے چینی سے نفسا نفسی۔ لندن میں ستمبر کے اخیر میں لڑائی کی افواہ پر کئی لاکھ لندنی جن میں اکثر امیر لوگ تھے وہاں سے بھاگ نکلے بلکہ بعض تو امریکہ پہنچ گئے۔ امریکہ کا حال سُنو۔ ۳۱ اکتوبر کو وہاں ایچ جی ویلز کے ناول "دُنیاؤں کی جنگ" کو ریڈیو پر نشر کیا جا رہا تھا۔ سارے ملک میں ہزاروں لاکھوں نے یہ سمجھ لیا کہ واقعی جنگ چھڑ گئی ہے اور دُنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ چنانچہ کئی ریاستوں میں لوگ دُعا مانگنے کے لئے جمع ہو گئے۔ ایک عورت انڈیانا پولس کے گرجے میں چیختی چلاتی ہوئی داخل ہوئی کہ نیویارک تباہ ہو گیا، دُنیا کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے، اب تو بہتر ہے کہ ہم اپنے اپنے گھر جا کر مریں۔ ابھی ابھی ریڈیو پر یہ خبر آئی ہے" اسی ایچ جی ویلز نے ۱۸ دسمبر کو ہندوستان کے ساحل پر پہنچ کر ہمیں تنبیہ کی ہے کہ "عدم تشدد نباتاتی دُنیا کی پالیسی ہے اور موجودہ دورِ حیات میں قوت کا معقول استعمال ہونا چاہیئے" لیکن معقولیت کا تو یہاں رونا ہے۔ روزولٹ جمہوریۂ امریکہ کے صدر نے حال ہی میں کہا ہے کہ "مستقبل محض اتفاقات یا آدم بیزاری یا تقدیر پرستی پر مبنی نہیں بلکہ اُس اثباتی فعل پر منحصر ہوگا جو ہم یہاں امریکہ میں کر دکھائیں۔ اگلے چند برس میں جو امریکہ کرے گا یا نہ کر سکے گا اُس پر نوع انسان کی آنے والی صدیوں کی تاریخ کا انحصار ہوگا۔ ہم نہ صرف دُنیا کی سب سے طاقتور جمہوریت ہیں بلکہ دوسری جمہوری ریاستیں بھی رہنمائی کے لئے ہماری ہی طرف تک رہی ہیں"۔ اس کے پانچ روز بعد ۱۰ دسمبر کو سابق انگریز وزیر مسٹر ایڈن نے بھی امریکہ جا کر یہی کہا کہ سٹیٹ اور سوسائٹی کے متعلق انگریزی اور امریکی نقطۂ نگاہ بہت کچھ یکساں ہے اور وہی درست ہے اور اُسی سے نوعِ انسان کی ترقی ہوگی۔ اب اگر ہم مصمم ارادہ کر لیں گے کہ یہ خیالات زندہ رہیں تو وہ یقیناً زندہ رہیں گے اور اگر ہم نے یوں ارادہ نہ کیا تو وہ یقیناً فنا ہو جائیں گے" دُنیا ان پسندیدہ تقریروں کو کان دھر کے سُن چکی اب وہ دیکھ رہی ہے کہ اِن پر کچھ عمل بھی ہوتا ہے یا نہیں؟

اِس وقت سیاسی دُنیا کی حالت سخت خطرناک ہے۔ جرمنی اطالیہ اور جاپان انگلستان اور فرانس کی کمزور پالیسی سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ امریکہ دُور بیٹھا مغربی تہذیب اور جمہوریت کی حمایت میں تقریریں کر رہا ہے، رُوس الگ سمٹ کر اپنے بچاؤ کی تدابیر اختیار کر رہا ہے۔ سب اپنی فوجی طاقت بڑھا رہے ہیں اور سامانِ جنگ تیار کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں جرمنی کی کل تیس لاکھ فوج ہے، اطالیہ کی دس لاکھ، فرانس کی ۵۶ لاکھ، رُوس کی ایک کروڑ ۳۴ لاکھ، جرمنی کے پاس اوّل درجے کے ۳۵۶۸ ہوائی جہاز ہیں اٹلی کے پاس ۱۷۰۰، برطانیہ کے پاس ۲۰۰۰، فرانس کے پاس ۱۵۰۰، رُوس کے پاس ۴۰۰۰ لیکن افواہ یہ بھی ہے کہ جرمنی کے پاس کل ۴۰۰۰۰ ہوائی جہاز ہیں اور وہ ان میں ہر ماہ ایک ہزار نئے ہوائی جہازوں کا اضافہ کر سکتا ہے۔ اُدھر رُوس کو سب سے بڑی طاقت پکارا گیا ہے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رُوس کی اندرونی حالت مضبوط نہیں۔ یہ درست ہے کہ رُوسی اشتمالیت کے کم از کم دو مفید

نیتجے ہوئے ہیں۔ ایک اس اصول کا مسلم ہونا کہ ہر شخص کو اپنی روزی آپ کمانی چاہئے اور دوسرے جماعت کی طرف فرد کے فرض کا احساس لیکن اگر ٹرانسکی کی بات مانی جائے تو یہ ظاہر ہے کہ رُوس ابھی مساوات اور صحیح اشتمالیت سے بہت دُور پڑا ہے۔ کسی مزدور کی اُجرت ۱۰۰ رُوبل ہے کسی کی ۲،۰۰۰ رُوبل جس کے پاس زیادہ رُوبل ہوتے ہیں وہ بہت اشیا حاصل کر سکتا ہے۔ مارکسی کہتے ہیں کہ یہ ایک عہدِ تغیر کی باتیں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حکمرانوں کو استبداد سے روکنے والی کونسی چیز ہے؛ وہ اکثریت کی حکومت کہاں ہے جو لینن کا مطمحِ نظر تھی؟

جاپان کسی سے پیچھے نہیں۔ اگر جرمنی مغرب میں تفوق کے خواب دیکھ رہا ہے تو جاپان مشرق کی سب سے بڑی طاقت ہوا جاتا ہے۔ گزشتہ چند برس میں جاپان کی ترقی کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب ٹوکیو دُنیا کے شہروں میں تیسرے درجے پر ہے۔ لندن کی آبادی تقریباً ۸۰ لاکھ ہے نیویارک کی تقریباً ۷۰ لاکھ اور ٹوکیو کی ۶۲ لاکھ سے زیادہ۔ اس کے بعد ہے برلن ۴۲ لاکھ۔ پیرس کا درجہ نواں ہے اور اُس کی آبادی صرف ۳۰ لاکھ ہے۔ اس معاشی وسیاسی مقابلے کے زمانے میں یہ ہے بڑی قوموں کے مدوجزر کا نقشہ!

یہ ہے بڑی بڑی طاقتوں کی کشاکش۔ اِس حال میں چھوٹی طاقتوں کی حالت ظاہر ہے کیا ہو گی۔ جنوب مشرقی یورپ کی ریاستیں میونکھ کے سمجھوتے کے بعد فرانس سے دُور ہوئی جاتی ہیں اور جرمنی کے قریب آ رہی ہیں۔ باقی خاموش ہیں۔ ترکی کو کمال کی فہم وفراست نے ایک باوقار قوم بنا دیا ہے سب بڑی چھوٹی طاقتیں اُس سے معاہدے اور سمجھوتے کر رہی ہیں۔ اِدھر مشرق کے مسلمان ملکوں کے ساتھ اُس کا اتحاد ہے اُدھر بلقان کی ریاستوں کے ساتھ اُس کا میثاق ہے، وُہ فی الحقیقت اس وقت جنوب مغربی ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ کے تمام ممالک میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے اور اُن کی رہنمائی کر رہا ہے۔

چین کی پندرہ لاکھ فوج جاپان کی منظم طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکی اور بتدریج پسپا ہو رہی ہے۔ اپنی چینی فتوحات کی بدولت جاپان اب ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا ہے۔ یہ مستقبل ہی بنا سکتا ہے کہ اس کا انگلستان اور ہندوستان پر کیا اثر پڑے گا، فی الحال یہ دونوں مطمئن ہیں کہ ابھی چین کے ہضم کرنے میں جاپان کو ایک مدت درکار ہے۔

ہندوستان کی دستوری ترقی جاری ہے۔ کانگرس آٹھ صوبوں میں حکومت کر رہی ہے اور گو مسلمانوں کی اکثریت اُس سے سخت شاکی ہے اور کئی آزاد خیال سیاست دان اُس کی استبدادی روش سے نالاں ہیں، یہ ظاہر ہے کہ ملک میں اُس کے قدم خوب مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ انگریزوں کی افسریت کا رُعب روز بروز کم ہو رہا ہے۔ واردھا سکیم کے مطابق ایک نئے جبری تعلیمی نظام کی ابتدا ہونے والی ہے جس میں دستکاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور انفرادی صلاحیت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور جس کا مقصد متحدہ قومیت، کا استحکام اور اہمسا کے خیالات کی ترویج ہے۔ ملک کی صنعتی ترقی کے لئے ایک خاص کمیٹی کانگرس کی طرف سے مقرر کی گئی ہے جو ملک کی بڑی صنعتوں اور چھوٹی دستکاریوں کے فروغ کی تدابیر پر غور کر رہی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کے پڑھے لکھوں کی تعداد ۸ فی صدی ہے اور جہاں کے ۸۵ فی صدی باشندوں کو اُن کی ضروریات کے مطابق کھانا میسر نہیں ہوتا تعلیمی ومعاشی اصلاحات کی اہمیت ظاہر ہے۔ کانگرس ہی کے ایما سے ریاستوں میں شورش برپا ہے اور مرکز میں وفاقی حکومت کے قیام کے متعلق گورنمنٹ اور کانگرس میں رسّا کشی شروع ہو گئی ہے۔

مشہور انگریز مصنف جوڈ "ایک نئی مجنون دُنیا" کے عنوان سے لکھتا ہے کہ ہماری تہذیب ایک عجیب حالت میں ہے امن وامان، خوشحالی، فراوانی بہ گویا ہمارے قبضے میں ہیں اِس پر بھی ہم ایک دوسرے کی تباہی پر تُلے ہوئے ہیں۔ سائنس کی برکت سے انسان اپنے سارے دشمنوں پر فتح پا چکا ہے سوا صرف ایک کے اور وہ ہے ایک اُس کی اپنی فطرت۔ انسانی قوت میں اضافہ ہو چکا ہے لیکن انسانی عقلمندی جُوں کی تُوں اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ذرا اُس ہوائی جہاز کو دیکھو جو تمہارے سروں پر چکر لگا رہا ہے اُس کی تیاری میں کتنا دماغ صرف کیا گیا ہے اور وہ کس قدر سُود مند بنایا جا سکتا ہے لیکن غور کرو کہ آج وہ کیسے کیسے تباہ کن کاموں کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ مشینوں کو دیکھو، چاہئے تھا کہ وہ ہمیں تین چار گھنٹے روزانہ کے کام سے اِس قابل بنا دیتیں کہ ہم ایک نئی شائستگی کی بُنیاد ڈال سکتے، بجائے اس کے ہمیں ان سے بے روزگاری کی نعمت ملی اور ساتھ ہی ہم اُن کے غلام ہو کر رہ گئے۔ ہم میں صلاحیت موجود ہے کہ ہم گویا دُنیا کے مالک بن سکیں لیکن بجائے اس کے ہم تمام نوع انسان کو خودکشی کی صلائے عام دے رہے ہیں۔ ہماری حالت پہلے سے بُری نہ سہی لیکن کیا یہ ظاہر نہیں کہ موجودہ حالت کو بہتر بنانا اب ہمارے لئے لازم ہو گیا ہے؟

اَور مصنف بھی موجودہ حالت سے بیزار نظر آتے ہیں، برٹرنڈ رسل اپنی تازہ ترین تصنیف "طاقت" میں موجودہ اہلِ طاقت کی طاقتوں کا تجزیہ کر کے اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ تمدن کا منتہا و مقصد انسانی تعاون ہونا چاہئے جس کے معنی ہیں ایک ایسی شہریت جس میں انفرادی آزادی قائم رہے کیونکہ انفرادی آزادی زندگی کی سب سے بیش بہا شے ہے۔

حال کے دو اَور مشہور انگریز مصنف آلڈس ہکسلے اور جیرالڈ ہیرڈ اپنی نئی تصنیفات "مقصد اور ذرائع" اور "تیسرا اخلاق" میں جس نتیجے پہ پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ مادی چیزیں جو ہمیں نظر آتی اور محسوس ہوتی ہیں وہ کسی اور شے کا مظہر ہیں جو مادے سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ ہے طبیعی "عقلمندوں" کی دُنیا میں ایک نئی روحانی عقلمندی کا آغاز! کیا باوجود اشتراکیت کے دُنیا پھر مذہب کی طرف رجوع کیا چاہتی ہے؟

بشیر احمد

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مزدور کا عزم

اُٹھوں! تری دُنیا کے غریبوں کو جگا دُوں
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دُوں!
گرماؤں غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کُنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دُوں!
سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن مجھ کو نظر آئے مِٹا دُوں!
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دُوں!

وُہ بندۂ مزدور" جس کے بہت تلخ ہیں اوقات!" اُسے" انفس و آفاق میں" کوئی "آیات" نظر نہیں آتے! اُس کے لئے کلیسا" خرافات" ہے! اُس کے لئے جو کچھ ہے وہ" زیرِ سماوات"! اُس کا جدِ امجد آدمِ خاکی نہیں بلکہ حیوانات و نباتات! "عمارات"، "آلات"، "درخشندہ فلزّات"، "برق و بخارات"، "تعلیمِ مساوات" یہ ہیں اُس کی کرامات!" اُس کی" مدنیت کے فتوحات" یہ ہیں! بلکہ اب وہ خود ہے" خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات"

دُنیا" ظلمات" ہے اور وہ" روشنیٔ ظلمات"! اُسی کی تدبیر ہے" تقدیر کو" مات" کرنے والی! پھر وہ کاہے کو بنا رہے" منتظرِ روزِ مکافات"!

اُس کے دل میں" کانٹے کی طرح" کیوں کھٹکے کوئی بھی" بات"؟

اور اُس کے اندر کیوں" متلاطم ہوں خیالات"؟

اُسے کیا پڑی ہے کہ وہ پڑھے" حکیموں کے مقالات"

کہ وہ خود ہے" زندہ و پائندہ" "ذات"!

اور" مرگ" اُس کے لئے ہے ہی نہیں بلکہ وہ خود" مرگِ مفاجات" ہے ہزاروں لاکھوں سرمایہ داروں" کے لئے!" وہ مرد ہوں کہ عورتیں!" ——

اس تقریر میں عورتوں کا ذکر سُن کر بیچاری عورتیں ذرا چونکیں، بوڑھی ماں کی پیشانی پر بل پڑ گئے، جوان بیوی اُوپر کو دیکھنے لگی! —— اور چُپکے سے بولی" یا الٰہی خیر!"

بشیر احمد

نقل اور اصل

(ڈراما)

وقت: شام کے بعد مگر کھانے سے پہلے

پہلا ایکٹ

عرمان - میری باتیں، میری کہانیاں سب عکس ہیں ایک یاد کا۔

جلیلہ - رہنے دو یہ بیہودہ لن ترانیاں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ پھوہڑ بیوی کی بدمذاق طبیعت سے تمہارا قافیہ تنگ ہے اور تم گھر گھر حسن کی گداگری کرتے پھرتے ہو۔ اب اس گداگری کو کسی کی یادکا عکس کہہ دو، یا جیسے پہلے بکا کرتے تھے نیم بسمل کی روزانہ کچلی جانے والی آرزوؤں کی ناشنیدہ گونج کہہ دو۔ تم جیسے فقرے باز کے لئے نئی نئی ترکیبیں بائیں ہاتھ کا کرتب ہیں۔

عرمان - میری قابل رحم حالت، میری مجبور حسن پرستی کی اس سے زیادہ برہنہ تصویر ناممکن ہے۔ شکریہ!

جلیلہ - پھر وہی فقرے بازی! آخر عرمان تم کہاں کے انوکھے، کسی زابلستانِ تخیل کے رستم ہو کہ جہاں جاؤ کوئی شہزادی یا پری تم پر فریفتہ ہونے کے لئے تیار بیٹھی ہو۔ جسے بھی پیار کروگے وہ آخر توقع کرے گی کہ پیار کو نبھاؤ۔ کیا تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟

عرمان - کیا خطا مجھ سے ہوگئی کہ برسی پڑتی ہو؟

جلیلہ - اُف رے چالاک! میری بات کا جواب نہیں اور مجھ پر اُلٹا الزام!

عرمان - تو کیا آپ چاہتی ہیں کہ بازاری آدمیوں کی طرح میں سچ سچ دل کی حالت کہہ دوں؟

جلیلہ - ہاں ضرور کہئے اور خدا کے لئے اپنے آپ کو معمولی آدمیوں سے جنہیں آپ نخوت سے "بازاری" کہتے ہیں اس قدر بالاتر تصور نہ فرمائیے۔ معمولی انسانوں میں اور عرمان میں فرق صرف یہ ہے کہ معمولی انسان چوری کم کرتے ہیں اور جو چوری میں پکڑے جائیں تو دنیا بھر کو گالیاں نہیں دیتے۔

عرمان - میرے مذہب میں قلبی کیفیتوں کا گاجر مولی کی طرح ڈھیر لگا دینا بدترین کفر ہے۔ مگر جہاں اور ہر قسم کے کفر کا مرتکب ہوا ہوں آج سچ بولنے کے کفر سے اپنی ہونے والی قبر میں آگ جلاتا ہوں۔ پہلے حضور اپنے اور میرے تعلقات کو لیجئے۔

جلیلہ - ہاں ضرور کہئے۔ تمہاری زبان سے سُننا چاہتی ہوں کہ میری نسبت تمہارے دل میں کیا کیا بدگمانیاں ہیں۔

عرمان - خدا نہ کرے کہ بدگمانیاں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ باوجود شادی شدہ ہونے کے حضور نے صدقِ دل سے مجھ سے پیار کیا۔ اور

اس کا ثبوت یہ تھا کہ چند راز کی باتیں بھی مجھ سے کہہ دیں۔

جلیلہ۔ یہ درست ہے۔ واقعی یہ کمزوری مجھ میں ہے کہ جسے چاہوں اُسے کھایا پیا سب کچھ بتا دوں مگر کیا تم ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں پیار کرنے میں کوئی ایسی حرکت مجھ سے ہوئی جس سے پاک دامن سے پاک دامن بھی شرما سکے ؟

عُرمان۔ ہرگز نہیں مگر سوال یہ تو نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ اگر میرا تمہارا راز جو اب تک کسی کو معلوم نہیں کھل جائے تو لوگ کیا کہیں اور کیا سمجھیں ؟

جلیلہ ــــــ لوگوں کے نزدیک سچی اور پاک محبت بھی غلط ہے اور گناہ ہے۔ جو اُن کے منہ میں آئے گا وہ بکیں گے مگر اُن کے زہر اُگلنے سے کیا غرض ؟

عُرمان۔ یہی تو غرض ہے۔ اگر عورتوں میں ایک جلیلہ ہو سکتی ہو تو کیا جلیلہ جیسا مردِ مردوں میں ناممکن ہے۔ میرا دعوے یہ ہے کہ میں نے ہرگز کبھی کسی خاتون کو دھوکا نہیں دیا۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ جسے چاہوں اُسے دھوکا دوں۔ چنانچہ میں نے کبھی کسی خاتون سے کسی ایسے فعل کی توقع نہیں کی جو خود اس کے اپنے اخلاقی معیار سے قابلِ اعتراض ہو۔ جو نیک ہیں رہا ہے ان کی نیکی میرے نزدیک نہایت ذلیل قسم کی نیکی ہو) ہمیشہ مجھ سے اپنے خیال کے مطابق نیک رہنے میں مدد حاصل کرتی رہی ہیں۔

جلیلہ۔ کیا جو تم کہہ رہے ہو واقعی سچ ہے ؟

عُرمان۔ قطعی لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے۔

جلیلہ۔ دُنیا کا خیال تو بالکل اس کے برعکس ہے۔ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ تم پُھسلاتے رہتے ہو اور جہاں دیکھا کہ دال نہیں گلتی تو تم نیکی کے مُبلّغ بن جاتے ہو۔ بلکہ اجازت دو تو صاف کہہ دوں۔

عُرمان۔ ضرور کہئے۔

جلیلہ۔ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ تم خیالات میں وہ انقلاب پیدا کرتے ہو کہ سیاہ سفید اور سفید سیاہ معلوم ہونے لگے۔ میں تم سے بچ گئی مگر تم ایک خطرناک جادُوگر ہو۔

عُرمان۔ (ہنس کر) چونکہ سچ بولنے کا وعدہ کر چکا ہوں اس لئے سچ ہی بولوں گا۔ پہلے تو یہ سُن لو کہ اس وقت کی ہماری بحث میں اور معمولی میاں بیوی کی جھڑپ میں سرِ مُو تفاوت نہیں۔

جلیلہ۔ (مسکرا کر) مجھے بھی یہ شبہ ہوا تھا۔

عُرمان۔ حسین مَیں نہیں، زردار مَیں نہیں۔ گویا دو بڑے جادو میرے قبضۂ قدرت سے باہر ہیں۔ رہ گیا صداقت کا جادو۔ وہ مجھ میں ضرور ہے۔ کیا دُنیا کو خوش کرنے کے لئے فریبی بن جاؤں ؟ کیا یہ اپنا ایمان کر لوں کہ حسین عورت بجائے خود ایک عیب گناہ ہے ؟

جلیلہ۔ یہ کون تم سے توقع کرتا ہے؟

عرمان۔ بات نہ کاٹو اگر مجھے صداقت پر قائم رہنا ہے تو یہ لازمی ہے کہ دادِ حُسن دُوں۔ میری نیازمندی کا قدمِ اولیں یہ ہے کہ جہاں حسین عورت مجھ سے ملی پہلے سے زیادہ حسین ہوئی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے کہ جو مرد عورتوں کو حسین تر بنا دیتا ہے اُس کی طرف اُن کا دل کھنچتا ہے۔ میں پہلے انتخاب کرتا ہوں۔ جن کی نسبت مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ حسین ہونے کے معاملے میں ذہین ہیں میں اُن سے زیادہ تپاک سے ملتا ہوں۔ بیسیوں ایسی ہیں جو حسین ہیں مگر میں اُن کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا اور محض اس وجہ سے کہ وہ باوجود خوش شکل ہونے کے جانانہ بننے کے معاملے میں کوڑ مغز ہیں۔

جلیلہ۔ بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہو!

عرمان۔ اسی عامیانہ اعتراض سے ڈرتے ہوئے میں کبھی دِل کی بات نہیں کہتا۔

جلیلہ۔ بھول گئی۔ کہتے جاؤ۔

عرمان۔ بس کہہ چکا جو کہنا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حسینوں کو چاہتا ہوں مگر اس لئے نہیں کہ وہ حسین ہیں بلکہ اس لئے کہ اُن میں شانِ حُسن دوبالا ہو۔

جلیلہ۔ (اندازِ دلربائی سے) کیا تم سے مِل کر جلیلہ زیادہ حسین ہوگئی ہے؟ (پردہ گرتا ہے)

دُوسرا ایکٹ

عرمان اور جلیلہ کا گھر

وقت: دس بجے رات۔

جلیلہ۔ عرمان مجھے تو یہ ڈراما خاک پسند نہیں آنے گا۔ بھلا یہ بھی کوئی ابتدائی Rehearsal کا طریقہ ہے کہ مجھے اپنی تقریروں کی سلپ مِل گئی، تمہیں اپنی تقریروں کے پرچے مِل گئے اور ہمیں قصّے کا کوئی علم نہیں یونہی طوطے کی طرح پڑھتے چلے گئے۔ غضب یہ کہ پارٹ میں نام وہی جو ہمارے اصلی ہیں اور مجھے کسی اَور کی بیوی بنا دیا! تمہیں کہیں کا خدائی خوار عاشق زار! یہ لکھا کس نے؟

عرمان۔ لکھنے والے کا تو پتہ نہیں مگر کلب میں یہ طے ہُوا کہ دیکھیں کہ نامعلوم پارٹ کا اثر ایکٹر اور ایکٹرس کے بُشرے پر کیا ہوتا ہے؟ مجھے بھی پتہ نہ تھا کہ نام ہمارے ہی رکھے جائیں گے مگر تم کسی اَور کی بیوی بنادی جاؤ گی۔ خدا جانے ان لوگوں نے ہمارے acting پر کیا کیا نوٹ لئے۔

جلیلہ۔ Acting کیا ہم نے خاک کیا؟ میں تو یونہی فقرے بولتی چلی گئی اور جوں جوں تم وہاں اپنا نرالا فلسفہ چھانٹتے گئے میرا جی جلتا گیا۔ اور دیکھو تو کمبخت لکھنے والے نے مجھے کیسے فقرے دیئے؟ کسی اَور کی بیوی بنا کر مجھ سے یہ کہلوایا کہ تمہیں چاہتی ہوں۔

عرمان (شرارت سے) تو کیا میں ایسا بُرا ہوں کہ تم اگر کسی اَور کی منکوحہ ہوتیں تو کبھی میری طرف پیار کی نگاہوں سے دیکھتیں؟

جلیلہ - بڑے بے شرم ہو - بیاہی عورتیں اپنے میاں کے سوا کسی اور کو کبھی دیکھتی ہیں ؟

عرمان - سچ پوچھو تو پہلے ہی جملے سے بے انتہا گھبرایا - بولتے ہی دل میں سوچنے لگا کہ گھر پہنچا تو جلیلہ کہے گی بڑے چھٹے ہوئے شہدے ہو کہ تمہاری سب باتیں سب کہانیاں کسی کی یاد کا عکس ہیں -

جلیلہ - خیال تو مجھے بھی گزرا تھا کہ دیکھو یہ حضرت کس چٹخارے سے کسی کی یاد میں محو ہیں مگر عرمان یہ تو بتاؤ کہ کیا واقعی ایسے مرد ہوتے ہیں جن سے مل کر عورت کا حسن دوبالا ہو جائے یا یہ یونہی ناٹک کے فقرے ہیں ؟

عرمان - یونہی بکواس نہیں ہے - اس کی تہ میں یہ بات ہے کہ ہر عورت خوشامد آمیز تعریف بالخصوص اپنی خوبصورتی کی تعریف سن کر پسندیدہ ہونے کی کوشش کرتی ہے - مردوں کا بھی غالباً یہی حال ہے -

جلیلہ - یونہی بیچاری عورتوں کو بدنام کرتے ہو - یہاں کون کسی کے حسن کی داد دیتا ہے کہ عورتیں اس پر مائل ہوں ؟ انگلستان میں شاید یہ ہو -

عرمان - کیوں اب تو ہندوستان میں عورتوں مردوں کا کافی کھلا ملنا جلنا ہے - کہیں کہیں عشق و محبت کی شادیاں بھی ہوئی ہیں بلکہ عشق و محبت کی ایک آدھ طلاق بھی سننے میں آئی ہے -

جلیلہ - ان چڑیلوں کا تو نام نہ لو مگر یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ ناٹک نہ ہوتا اصلی مکالمہ ہوتا تو اس قصے کا انجام کیا ہوتا ؟ کیا وہ قصے والی جلیلہ اس قصے والے عرفان کے ہتھے چڑھ جاتی ؟

عرمان - یہ تو تمہیں بتاؤ -

جلیلہ - میں تو سچ کہتی ہوں کہ اس مردے نے ایسے فریب سے من موہنی باتیں شروع کیں تھیں یعنی صداقت اور دادِ حسن اور اُلا اور بلا کہ مجھے تو ذرا بھی تعجب نہ ہوا اگر اصلی زندگی میں وہ عرمان (تم نہیں) اس نقلی جلیلہ کو لے کر چلتا بنے - یہی تو بھاگ نسنے کی گھاتیں ہوں گی!

عرمان - نہیں کسی ماہرِ فن کے ہاتھ میں اس قصہ کا انجام یوں نہ ہوتا - اس قصے کی جلیلہ ایک رقیب ناپسند خاتون ہیں -

جلیلہ - سبحان اللہ - تو کیا مجھے رقیب پسند خاتون تم نے تصور کیا ہے ؟

عرمان - لاحول ولا - تمہارا کیا مذکور ؟ میں تو اس فرضی قصے کو لے رہا ہوں - وہ جلیلہ چاہنے والے کو اسیری میں رکھنا چاہتی ہے - صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کی یاد والے ابتدائی جملے نے اسے آگ سی لگا دی اور وہ اس قصہ والے عرمان سے جسے وہ کلیۃً محض اپنا سمجھتی تھی اس لئے الجھ پڑی کہ اس نے کسی اور کی یاد کا ذکر چھیڑ دیا -

جلیلہ - الجھ نہ پڑتی تو اور کیا کرتی ؟ جس کے لئے بدنام ہونے کا ڈر ہو وہی جب دغاباز ثابت ہو تو پتھر کا کلیجہ کہاں سے لاتی -

عرمان - سین لکھنے والے کی یہی تو استادی ہے کہ بظاہر بے وفائی کرنے والی بیوی کو وفا کا بڑا حامی ثابت کیا ہے -

جلیلہ - کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ وہ نقلی عرمان اگر اس نقلی جلیلہ سے پوری وفا کا مدعی بنتا تو وہ نقلی جلیلہ اپنے اصلی شوہر سے ضرور الگ ہو جاتی ؟ یا یہ مطلب ہے کہ وہ نقلی عرمان باوجود سچی محبت رکھنے کے جان بوجھ کر جھوٹ موٹ بے وفائی کا اظہار کرتا ہے کہ اس نقلی جلیلہ کے شوہر کا گھر نہ اجڑے -

عرمان۔ ماہرِ فن کے ہاتھ میں تو یہ قصہ واقعی یونہی چلتا کہ عرمان عارضی طور پر دانستہ جلیلہ کی آنکھوں میں بُرا بنتا تاکہ جلیلہ اور اس کے شوہر میں ہنرگی نہ ہو۔ جلیلہ کی سچی اور پاک محبت کی دُگو وہ ایک جلنے کڑھنے والی جلیلہ ہے، اس سے زیادہ عزت وہ نہیں کرسکتا کہ خود غلط فہمی کا شکار بنے اور اپنی معشوقہ کی نگاہوں میں ذلیل ہو مگر اسے بدنامی سے بچالے۔

جلیلہ۔ میں تو یہ نہیں مانتی۔ تم خواہ مخواہ اس مرد کا پارٹ لے رہے ہو۔ میرے خیال میں تو وہ جلیلہ یا خودکشی کرلیتی یا اس لڑکی کا پتہ چلاتی جس کی یاد میں عرمان صاحب کے قصے کہانیاں ہیں۔

عرمان۔ پتہ چلا کر کیا کرتی۔

جلیلہ۔ اس کے کان بھرتی کہ عرمان کی گھاتوں میں نہ آنا ہرجائی ہے۔

عرمان۔ میں ہرگز نہیں مانتا کہ کوئی ماہرِ فن اس قسم کا قصہ لکھے بلکہ یہ ہوتا کہ عرمان اس لڑکی کے ساتھ بھی انتہائی نیکی کرتا اور واقعی قابل شوہر تلاش کرکے اس کا عقد کرادیتا۔

جلیلہ۔ ناممکن ہے کہ اس قسم کا مرد کوئی ہو یعنی اپنی بیوی سے بیزار بھی ہو ایک چھوڑ دو دو اسے چاہنے والیاں بھی مل جائیں اور یہ حضرت محض حُسن پرستی کی دُھن میں نیکی پر نیکی کرتے چلے جائیں۔

عرمان۔ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما لکھنے والے کا منشا یہ تھا کہ ہمارے ملک کی سچی محبت کا بہترین نمونہ پیش کرے۔

جلیلہ۔ سچی محبت نہ خاک دھول۔ عرمان اپنے گھر خوش نہیں جلیلہ اپنے گھر خوش نہیں اور سچی اور پاک محبت کا راگ الاپا جارہا ہے۔

عرمان۔ مصنف کا در پردہ یہی تو ایما معلوم ہوتا ہے کہ بغیر شادی کے بھی سچی محبت ہوسکتی ہے۔ عام ہندوستانی بیویوں کا تصور تو اس قدر محدود ہے کہ وہ خیال بھی نہیں کرسکتیں کہ کوئی اور عورت بغیر بد ہونے کے ان کے میاں کو پیار کی نگاہوں سے دیکھ سکتی ہے۔ یہی حال عام ہندوستانی شوہروں کا ہے۔ لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔

جلیلہ۔ محض باتیں بنارہے ہو۔ تم اگر کسی لڑکی کو چاہتے تو کیا اس کے لئے قابل شوہر کی تلاش کرکے عقد کرادیتے؟

عرمان۔ ضرور مگر تم مجھے اس عرمان سے کیوں خلط ملط کررہی ہو اور کیوں اسی جلیلہ سے اپنے آپ کو ملاتی ہو۔ تم بیس دفعہ کالج میں اور اس کے بعد ایکٹ کرچکی ہو۔ اس ایک سین کا اس قدر تمہارے دماغ پر اثر کیوں ہے؟

جلیلہ۔ کاش مجھے پتہ ہوتا کہ یہ قصہ ختم کس طرح ہوتا ہے؟

عرمان۔ مصنف کا پتہ چلا تو اس سے پوچھوں گا۔ لو بھئی اب سوتے ہیں۔ (چلا جاتا ہے)

جلیلہ۔ ہاں تم آرام کرو۔ مجھے تو آج نیند نہیں آرہی (ایک طرف جاکر دبی زبان سے) میں بھی دل سے عہد کرتی ہوں کہ تمہاری اس چاہیتی کو تلاش کر نکالوں گی۔

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

(عرمان اور جلیلہ کا گھر ——— وقت ساڑھے دس بجے رات)

(جلیلہ سامنے کا دروازہ بند کرتی ہوتی ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دیتی ہے۔ دروازہ بند کر کے ٹیلیفون کی طرف بڑھتی ہے۔)

جلیلہ (اپنے آپ سے) اس وقت کسے باتوں کی سُوجھی ہے ؟ (ٹیلیفون اُٹھاتی ہے) ہیلو جی میں ہوں جلیلہ۔ آپ کو میرا اور عرمان کا acting پسند آیا۔ آپ کہاں تھیں ؟۔ یہ تو یونہی آپ مجھے بنا رہی ہیں۔ عرمان تو سونے چلے گئے۔ کیا فرمایا کہ آپ بنا نہیں رہیں بلکہ ایک بڑی ماہر فن آپ کے ہمراہ تھیں۔ وہ کون ؟ میں نہیں جانتی۔ جی ابھی تو سو نہیں رہی۔ آیئے ضرور آیئے۔ کیا عرمان کو اطلاع کردوں ؟ شوق سے تشریف لایئے۔ ایک منٹ کا تو رستہ ہے۔ ضرور انہیں ساتھ لایئے۔ مجھے ہرگز تکلیف نہیں (ٹیلیفون بند کر دیتی ہے۔ عرمان کے کمرے کی طرف جاتی ہے پھر کچھ رُک جاتی ہے۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی ہے۔)

جلیلہ۔ ماہر فن کون ذات شریف ہیں اور اسے عرمان سے کیا دلچسپی ہے ؟۔ یہ ری ہرسل (Rehearsal) کیا ہُوا کہ دل میں بے چینی پیدا ہو گئی !

(عرمان کے کمرے کی طرف جاتی ہے۔ پھر رُک جاتی ہے۔)

جلیلہ۔ میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے ؟ بیسیوں دفعہ ہمارے دوست اس وقت آئے۔ آدھی رات بلکہ صبح تک دھما چوکڑی مچا کی، مجھے کبھی شبہ نہیں ہُوا۔ آج کیا بات ہے ؟۔ یہ نو وارد کون ہے ؟ شکر ہے کہ میرا لباس اچھا ہے۔

(عرمان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہتی ہے۔)

جلیلہ۔ عرمان ! خدیجہ اور اس کی کوئی سہیلی آ رہی ہیں۔ سونا ذرا ملتوی کردو۔

(موٹر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ چوکیدار باہر کی بجلی کی روشنی کرتا ہے۔ جلیلہ دروازہ کھولتی ہے۔ خدیجہ اور ایک خاتون کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔ موٹر کے واپس جانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

جلیلہ۔ ہیلو خدیجہ۔

خدیجہ۔ ان سے ملئے۔ مس یادی۔ یہ ہیں جلیلہ۔ جلیلہ یادی نے پیرس اور لندن میں (acting) کا مطالعہ کیا ہے اور انہی کا خیال تھا کہ وہ acting کس کام کا جس میں ہر ایکٹر اور ایکٹرس کو معلوم ہو کہ قصہ کا انجام کیا ہے۔ یہ تو اس ایکٹنگ acting کی قائل ہیں جو بلا ارادہ اور بے ساختہ ہو۔ عرمان کو اور تمہیں ری ہرسل (Rehearsal) میں دیکھ کر بہت ہی تم دونوں کی تعریف کرتی تھیں۔

جلیلہ۔ تعریف کی کیا بات تھی ؟۔ گھر آتے ہی عرمان کو پہلی بات مجھ سے یہ کہنی پڑی کہ acting کا تو اس میں موقع ہی نہ تھا۔

یادی۔ کیا میں آپ کو بے تکلف جلیلہ کہہ لُوں؛

جلیلہ۔ ضرور

یادی۔ تو جلیلہ معاف کریں اگر مَیں کہوں کہ آپ کا خیال بہت ہی پرانا رنگ لیے ہوئے ہے، یا آپ محض کسرِ نفسی کے دقیانوسی فیشن سے مجبور ہو کر اپنی بے قدری کر رہی ہیں۔ سٹیج کے ایکٹر مصنوعی جذبات کو اصلی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیا تخیل یہ ہے کہ قدرتی جذبات کو پیدا ہوتا ہؤا دیکھ کر لُطف اُٹھائیں۔ اس قدر مجھے لُطف آیا کہ آپ ایک مرد سے (جو پرایا نہ تھا) پرائی بن کر اچھی خاصی طرح اظہارِ عشق کر رہی تھیں۔

جلیلہ۔ اس میں لطف کی کیا بات تھی؛

مس یاد۔ بڑے لطف کی بات اور وہ یہ کہ باوجود شادی شدہ ہونے کے عورت کا لطیف ترین پہلو ابھی آپ میں پوری آب وتاب سے زندہ ہے۔

جلیلہ۔ وہ کیا پہلو ہے؛

مس یاد۔ یہ کہ جھُوٹ کو جھُوٹ جانتے ہوئے آپ اپنے بہترین دوست یعنی شوہر پر شبہ کرتی جاتی تھیں اور وہ محض اس لئے کہ وہ کسی اَور کے لکھے ہوئے جُملے بول رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ عورت عورت نہیں جو اپنے مرد پر جا وبےجا شبہ نہ کرے۔ نادلوں کی بھولی بھالی عورتیں سب محض فریب ہیں۔ حسین اور ذہین عورت کبھی بھولی ہو نہیں سکتی۔ جانتے ہوئے انجان بن جائے تو بن جائے، ورنہ یہ ممکن نہیں کہ عورت مرد پر سے بخوشی اپنا قبضہ ہٹا لے۔ مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا، اگر آپ کو مجھ پر شبہ ہو کہ عرمان کی اور میری شاید کوئی سازش ہے۔

جلیلہ۔ سچ پوچھو تو مجھے تو ضرور شُبہ ہؤا۔ اور مَیں تو صاف کہتی ہوں کہ تمہاری شکل ایسی مرد فریب ہے کہ شاید ہی کوئی تمہارا شکار ہونے سے بچے۔

یادی۔ باور کیجئے کہ عرمان مجھے بہت ہی کم جانتے ہیں۔ آج کل کے فیشن کے مطابق لڑکے لڑکیوں کو ڈارلنگ تو ضرور کہتے ہی رہتے ہیں اور عرمان نے مجھے بھی ڈارلنگ دو ایک دفعہ کہا ہوگا مگر وہ اس لئے کہ وہ میری کہیں اَور شادی کرانے کی فکر میں ہیں۔ ہے نا خدیجہ!

{ جلیلہ کو عرمان کا جملہ یاد آتا ہے کہ اس ڈراما کا
کیا انجام ہوگا اور دل میں پیچ وتاب کھاتی ہے }

خدیجہ۔ عرمان کیا ساری دُنیا بھر کے لونڈے تمہاری شادی کی فکر میں ہیں اور وہ اس لئے کہ تم کسی ایک کے گلے کا ہار ہو تو باقیوں کی جان عذاب سے چھُٹے۔ تم جہاں جاتی ہو آفتِ جان ہو۔

یادی ۔ اور جو میں شادی کے بعد اس سے بھی زیادہ قابلِ پرستش نظر آئی تو پھر یہ لونڈے کیا کریں گے ؟

خدیجہ ۔ کریں گے کیا ؛ تمہارے ساتھ پارٹیوں میں جائیں گے ۔ سینما دیکھیں گے مگر یہ تو ان کو اطمینان ہو گا کہ یہ بجلی ایک دفعہ گر چکی بار بار نہ گرے گی ۔

یادی ۔ کس قدر تم میری تعریف کر رہی ہو ۔ ایمان سے اگر سمجھدار نہ ہوتی تو اس خوشامد سے دماغ پھر جاتا ہے ۔

(اتنے میں عرمان داخل ہوتا ہے ۔)

عرمان ۔ ہیلو خدیجہ ! ہیلو یادی ڈارلنگ ۔ یہ تم دو آفتیں آدھی رات کو کیوں نازل ہوئی ہو ؟

یادی ۔ (چلبلے پن سے) پوچھنے آئی ہوں کہ تم میری شادی کس سے کرا رہے ہو ؟ مجھے تو تمہارے کنوارے دوستوں میں ایک بھی پسند نہیں اور تمہارے اس دقیانوسی شہر کی دقیانوسی بیویاں شوہروں کو ولایتی انگور کی طرح پٹاری میں بند کر کے رکھتی ہیں ۔ جلیلہ نے مجھے دیکھنے سے پہلے ہی مجھ پر شبہ کر لیا ۔

عرمان ۔ بالکل سفید جھوٹ ۔ جلیلہ شکی مزاج ہرگز نہیں ۔ تم سمجھتی ہو کہ تمہیں ایک فیشن کی پُتلی ہو ۔ جلیلہ تم سے سوا میل آگے ہے ۔ آج ریہرسل (Rehearsal) میں اس کا ایکٹنگ (acting) دیکھا ہوتا تو ہرگز تم یہ بات نہ کہتیں مجھے کسی اور کی یاد میں مبتلا دیکھ کر بھی پیشانی پر بل نہ لائی ۔

خدیجہ اور یادی دل ہی دل میں گویا یہ کہتی ہیں :۔

"مرد بھی کس قدر اندھے ہوتے ہیں !"

جلیلہ ۔ تم لوگ یُونہی بک بک کرتے رہو گے یا کچھ کھاؤ گے بھی ۔ یہ لو چاکولیٹ ۔ کافی ابھی آ رہی ہے ۔

عرمان ۔ خدا کے لئے یادی کو چاکولیٹ نہ دینا ۔ صبح تک کھاتی چلی جائے گی ۔

جلیلہ ۔ تم ان کی اس عادت سے کب سے واقف ہو ؟

عرمان ۔ برسوں سے ۔ اس کے چاکولیٹ سے تنگ آ کر تو میں دیوالہ کی درخواست دینے والا تھا ۔ شکر ہے کہ شادی . . . . . .

{ یادی جلدی سے اپنے ہاتھوں سے عرمان کا منہ بند کر دیتی ہے اور اسے فقرہ پورا نہیں کرنے دیتی ۔ }

یادی ۔ چاکولیٹ ساتھ لے لو اور چلو دریا کی سیر کو چلیں کشتی چلائیں ۔ نا نہ کرو جلیلہ ۔ ضرور چلو ۔ کسی اور کو بھی ساتھ لے لیں ۔

جلیلہ ۔ مجھے تو نیند آ نہیں رہی ۔ عرمان سے پوچھو ۔

یادی ۔ عرمان سے پوچھنے کی کیا بات ہے ۔ مزے سے کشتی چلائیں گے ، گائیں گے اور تھک تھکا کے واپس آ جائیں گے ۔ زندگی

گھروں میں ضائع کرنے کے لئے نہیں ہوتی ۔ کیا ہی مزہ ہو کہ کشتی اُلٹ جائے اور مجھے کوئی ڈوبنے سے بچائے!

خدیجہ ۔ تمہارے پاگل پن کی کوئی حد بھی ہے؟

عرمان ۔ پاگل بنا رہی ہے ۔ سینکڑوں ہزاروں سے اچھا تیرتی ہے ۔ انسان نہیں مچھلی ہے ۔ میں موٹر نکالتا ہوں ۔

(یہ کہہ کر عرمان باہر چلا جاتا ہے ۔ جلیلہ دل میں تو پیچ و تاب کھا رہی ہے
مگر بظاہر خندہ پیشانی سے کہتی ہے ۔)

جلیلہ ۔ یادی! کوئی مزے کی بات سناؤ ۔

یادی ۔ جلیلہ، تمہیں ایسی بات بتاؤں کہ حیران رہ جاؤ ۔

جلیلہ اور خدیجہ ۔ (دونوں ایک زبان سے) ضرور

یادی ۔ تقریباً دو سال کا ذکر ہے کہ مصر کے ایک گاؤں میں چند ہندوستانی لڑکے اور لڑکیاں قاہرہ کے تقریباً دس میل جنوب کی طرف ایک گاؤں میں دو دن کی تفریحی سیر کے لئے گئے ۔ شام کے بعد گاؤں والوں سے کہا کہ کوئی دیہاتی کھیل دکھلائیں ۔ ایک پونڈ اُجرت مقرر ہوئی ۔ ہم کل دس تھے ۔ ہمارے ساتھی لڑکے ایسے گانٹھ کے پکے نکلے کہ ہم لڑکیوں سے بھی دو دو شلنگ رکھوا لئے ۔ کھانے کے بعد ان قبطیوں نے ایک کھیل کیا ۔ مصیبت یہ ہوئی کہ عربی سمجھنے والا ہم میں صرف ایک تھا ۔ دیہاتی گانے کا تو لطف آیا مگر قبطیوں کی عربی کا مکالمہ ہم خاک نہ سمجھے ۔ جو عربی سمجھنے والا تھا وہ بے انتہا محو ہو کر سنتا رہا اور جب ہم اس سے کچھ پوچھتے تو سخت چیں بجبیں ہوتا ۔ آخر کہنے لگا کہ دوسرے دن اُردو میں لکھ کر ہم سب سے وہی تماشا کرائے گا ۔ اس سے ہم سب خوش ہو گئے ۔

دوسرے دن ہم نے وہی تماشا اُسی گاؤں میں اُردو میں کیا ۔ غضب یہ ہوا کہ اس تماشے میں نکاح بھی پڑھا جاتا تھا ۔ نکاح والے سین کے لئے گاؤں کے نکاح خوان کو بلوانے کا بندوبست تھا ۔ چنانچہ جب یہ سین آیا تو نکاح خوان صاحب اپنا رجسٹر نکاح لے کر موجود ہو گئے ۔ لڑکی سے نام پوچھا، اس کے مُنہ سے بیساختہ اپنا اصلی نام نکل گیا ۔ پھر لڑکی کے باپ کا نام پوچھا ۔ بہت گھبرائی مگر کھیل کھیل میں بھی کسی اَور کی بیٹی کیسے بنتی؛ باپ کا نام بھی بیچاری نے اصلی بتا دیا ۔ لڑکے سے پوچھا تو اس نے بھی اپنا اور باپ کا نام صحیح صحیح بتا دیا ۔ نکاح خوان صاحب ایجاب قبول کرا کے رجسٹر میں دستخط دونوں کے لے چلتے بنے ۔ اس وقت تو کسی کو خیال نہ آیا دوسرے دن نکاح خوان صاحب کو تلاش کیا کہ وہ دستخط شدہ ورق اس سے لے لیں ۔ گاؤں میں تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ قاہرہ گیا ہے ۔ شام کو پھر دریافت کیا تو نکاح خوان صاحب فرمانے لگے کہ مصری قانون کے مطابق وہ اصل ورق برٹش کونسل کو دے آیا ہے ۔ باقی پارٹی تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی مگر اس لڑکی کا حال نہ پوچھو ۔ اس لڑکے نے بہت یقین دلایا کہ وہ اصل ورق ضرور رشوت دے کر حاصل کریگا ۔ مگر آج تک تو پتہ چلا نہیں کہ وہ نقلی نکاح جو ہنسی ہنسی میں اصلی ہو گیا قائم ہے یا فسخ ہو گیا ۔

جلیلہ اور خدیجہ ۔ بھئی واقعی عجیب بات ہے ۔
یادی ۔ اس معاملہ میں حقیقت میں جو عجیب بات ہے وہ باقی ہے ۔
جلیلہ اور خدیجہ ۔ (تعجب سے اُچھل کر) وہ کیا ؟
مس یاد ۔ تم دونوں تو جانتی ہو کہ ہندوستانی عورت آزاد ہو کر بھی وفا کی پُتلی ہی رہتی ہے ۔ چنانچہ یہ مس صاحبہ بھی اس خبط میں مبتلا ہیں کہ قبول کر لیا سو کر لیا ۔ اب اور کسی کو اُسی زبان سے کیا کہے ۔ دوست اور سہیلیاں سب کہتے ہیں کہ پاگل پن کو چھوڑو ۔ بہت وہم ہے تو اس لڑکے سے طلاق لے لو اور اپنا گھر آباد کرو مگر وہ خبطن اسی دُھن میں ہے کہ جب تک وہ کاغذ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے چاک نہ کر لوں گی کسی اور کا پیغام نہ سنوں گی ۔
خدیجہ ۔ یادی تم اُسے چاہو خبطن کہو مجھے تو وہ لڑکی ملے تو اس کے پاؤں دھو کر پی لوں ۔ کیا اس لڑکی کا عزم ہوگا ! میرا بھائی ہوتا تو میں اس کے لئے دُنیا بھر کی خاک چھان کر بھی ایسی دُلہن تلاش کرتی ۔
جلیلہ ۔ مَیں بھی ۔ یادی خدا کے لئے مجھے اس کا نام بتا دو ۔
مس یاد ۔ تعجب ہے کہ آپ کو اس قسم کی حماقت میں اتنی دلچسپی ہے ۔
جلیلہ ۔ (بہت اصرار سے) تمہیں میری قسم ہے ضرور نام بتاؤ ۔
خدیجہ ۔ ضرور بتایئے ۔
جلیلہ ۔ (بے انتہا اضطراب سے) بتا بھی دو نا ۔
مس یاد ۔ وہ احمق لڑکی میں ہوں ۔

(چند سیکنڈ کے لئے سناٹا سا چھا جاتا ہے ۔ اور اس وقفہ کے بعد جلیلہ مری سی آواز سے بولتی ہے)

جلیلہ ۔ اور لڑکا کون تھا ؟
مس یاد ۔ عرمان ۔

فلک پیما

فنِ لطیف

پیغامبرِ عشق کبھی شعر کبھی چنگ
اور حسن کا حامل ہے کبھی رنگ کبھی سنگ
دُنیائے لطافت میں ہے پیکارِ ہم آہنگ
اظہارِ حقیقت پہ ہے لفظوں کی قبا تنگ

فطرت نے تھا اِدراک سے جو راز چھپایا
وُہ تُو نے بتایا

تجھ سے ہی لبِ دردِ نہاں پر ہے تبسّم
آسُودہ کنارے کی طرح شورِ تلاطُم
ہنگامۂ ہستی کو بناتا ہے ترنّم
کثرت کی کشاکش خَمِ وحدت میں ہوئی گُم

جس ذات کی خلوت میں زماں ہے نہ مکاں ہے
وُہ تجھ پہ عیاں ہے

ہے ساز میں اعراض کے یہ ذات کی آواز
یا نفیِ حقیقت میں ہے اثبات کی آواز
ہے فطرتِ ساکت کی مناجات کی آواز
جو بات کہ بے صوت ہے اُس بات کی آواز

یہ دِل کی شریعت ہے یہ دِل کی ہے طریقت

افشائے حقیقت

ہر راگ سے ہے آئینۂ زیر و بم ہستی
آئینے میں لیکن نہ بلندی ہے نہ پستی
بیہوشی میں بھی محرمِ اسرار ہے مستی
روحوں کو غذا دیتی ہے یہ مادہ پرستی

جو ذوقِ کشاکش ہے ہر اک ذرّے میں بیتاب
ہے تجھ میں سکوں یاب

تیرے حرمِ ناز میں بے پردہ رخِ بود
جو دہر میں مفقود ہے وہ تجھ میں ہے موجود
ہے تیری کرامت جو زیاں کو بھی کرے سود
تو باغِ براہیم، جہاں آتشِ نمرود

افسوں سے ترے قطرۂ خونِ سرِ مژگاں
ہے غیرتِ مرجاں

سمجھے گا یہاں کون، ہے کیا نیک ہے بد کیا
اس گتھی کے سلجھانے میں حیراں ہے خرد کیا
اس زندگی و مرگ میں کیا جزر ہے مد کیا
ہستی ہے ابد کوش، ہے اس کی کوئی حد کیا

کچھ حسن ہے کچھ عشق ہے اس راز سے آگاہ
ہے راست یہی راہ

خلیفہ عبدالحکیم

علامہ اقبالؒ سے ایک ملاقات

دُنیا میں بہت سے ایسے خوش قسمت حضرات ہیں جنہیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُنھوں نے ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم سے ملاقات کا فخر حاصل کیا۔ اور جب سے علامہ موصوف نے رحلت فرمائی ہے کئی حضرات نے اپنی اپنی ملاقات کا حال مختلف رسائل میں شائع بھی کرا دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ملاقات کا فخر حاصل کرنا معمولی شرف نہیں اور اس پر اگر ناز بھی کیا جائے تو بجا ہے۔ اس لئے اگر میں بھی ایک ایسی ملاقات کا حال بیان کرنے کی جرأت کروں تو اُمید ہے کہ یہ میری جسارت بیجا نہ سمجھی جائے گی۔ ممکن ہے کہ مَیں یہ جرأت ہی نہ کرتا لیکن گذشتہ ایام میں جس قدر اس موضوع پر بیانات شائع ہوئے ہیں مَیں نے اُن سے اندازہ کیا ہے کہ علامہ مرحوم کو صرف ایک ہی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان بیانات کے ملاحظہ کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات ہمیشہ کسی ایسے انسان سے کی جاتی رہی ہے۔ جو کبھی تو رو دیتا ہے، کبھی غصہ میں آ جاتا ہے اور کبھی چہرہ پر ایسا جلال پیدا کر لیتا ہے کہ وہاں بیٹھتے ہوئے بھی ڈر لگے۔ برخلاف اس کے جب مجھے شرفِ ملاقات حاصل ہوا تو مَیں نے یوں محسوس کیا کہ علامہ موصوف سے بڑھ کر زندہ دل، خوش خُلق اور حاضر جواب شاید ہی کوئی اور شخص ہو۔

- چار یا پانچ سال کا ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم تعلیمی مشورہ دینے کے لئے افغانستان تشریف لے گئے تھے۔ واپسی پر ممدوح براہ قندھار کوئٹہ تشریف لائے۔ کوئٹہ سے لاہور جاتے ہوئے گاڑی سبوی جنکشن سے گزرتی ہے۔ مَیں بھی اُن دنوں سبوی میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جس دن ڈاکٹر صاحب مرحوم لاہور واپس تشریف لے جا رہے تھے میں بھی اتفاقاً چند احباب کے ساتھ سٹیشن پر موجود تھا۔ اگرچہ اُس دن سے پہلے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زیارت کبھی نصیب نہ ہوئی تھی لیکن چونکہ متعدد بار آپ کی تصویر دیکھی ہوئی تھی اس لئے مَیں نے فوراً پہچان لیا اور احباب سے کہا کہ آج کی گاڑی سے ڈاکٹر اقبال لاہور تشریف لے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہم سب اُس گاڑی کے پاس چلے گئے جس میں ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارے اجتماع کی طرف دیکھا۔ ہم سب نے ادب سے سلام عرض کیا اور خاموش کھڑے رہے۔ ہمیں دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے استفسار فرمایا کہ بھائی کیا دیکھ رہے ہو۔ ہم نے عرض کی کہ جناب آپ کی زیارت سے مشرف ہونے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ فرمانے لگے تو پھر اگر اچھی طرح زیارت کرنے کا شوق ہو تو میرے پاس آ کر میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ یہ فرما کر آپ مُسکرانے لگے اور ہم یہ دیکھ کر کہ دُنیا کا یہ مشہور و معروف بزرگ جس کا کلام چار دانگ عالم میں اپنی فضیلت کا ڈنکا بجا رہا ہے اس قدر

بے تکلفی سے گفتگو کر رہا ہے، حیران ہو گئے۔ ہم نے عرض کی کہ جناب چونکہ ہم کافی تعداد میں ہیں اور گاڑی کا ڈبا مختصر سا ہے اس لئے ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم باہر پلیٹ فارم ہی پر کھڑے رہیں۔ فرمایا۔ اچھا یوں ہی سہی تو پھر مَیں بھی باہر آپ کے پاس چلا آتا ہوں۔ لیکن ہم نے پھر مؤدبانہ عرض کی کہ نہیں جناب آپ گاڑی میں تشریف رکھیئے اور ہم گاڑی کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔ اس کے بعد ہم لوگ سب خاموش ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب حقہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہماری خاموشی کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ مَیں تو خاموش زیارت کا قایل نہیں ہوں۔ اور اگر آپ لوگ یوں ہی خاموش کھڑے ہوئے صرف میرے منہ کی طرف دیکھنا پسند کرتے ہیں، تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ مَیں اپنے حقہ ہی سے گفتگو کرتا رہوں۔ اتنا فرماتے ہی آپ حقہ پینے لگ گئے۔ مَیں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ادب کی وجہ سے جرأت نہیں ہوتی کہ جناب سے کلام کرنے کی گستاخی کر سکیں۔ فرمانے لگے کہ آپ لوگوں کا ایک نمایندہ کمرہ میں آ کر دیکھ لے کہ مَیں بھی آپ ہی کی طرح محض ایک آدمی ہوں۔ اور میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس سے آپ کو کوئی خوف ہو۔ آپ کی اس خوش اخلاقی نے ہمیں جرأت دلائی اور ہم نے گزارش کی کہ آپ صوبۂ بلوچستان میں سے گزر رہے ہیں، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمانے لگے۔ گاڑی میں بیٹھ کر مَیں کیا اندازہ کر سکتا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس علاقہ میں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، اور وُہ بھی ایسے کہ ان پر کوئی درخت یا سبزی نہیں۔ ہم نے جواباً عرض کی کہ جناب ہمارے خیال میں جب خداوند تعالےٰ نے دُنیا بنائی تو اس کے بنانے کے بعد جو ملبہ بچ گیا وُہ اس علاقہ میں پھنکوا دیا۔ اس لئے ان پہاڑوں پر سبزہ نہیں ہے۔ یہ سُن کر آپ بھی ہنس پڑے اور ہم سب بھی۔

کچھ دیر تک علاّمۂ ممدوح مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے۔ اس اثنا میں گاڑی نے چلنے کی تیاری کر لی۔ ممدوح ہم میں سے ہر ایک سے نہایت ہی خندہ پیشانی سے ملے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ کافی دیر تک علاّمۂ موصوف گاڑی سے سر باہر نکالے ہوئے مسکراتے رہے اور ہم دیکھ رہے تھے کہ اُس گاڑی میں ایک انسان سادہ لباس میں ملبوس، حقہ پیتا ہؤا اور مسکراتا ہؤا جا رہا ہے اور یہی ہے ہندوستان کا مایۂ ناز فرزند، مشرق کا شاعرِ اعظم اور دُنیا کا عظیم الشان مفکرّ اقبال!

مجھے افسوس ہے کہ بوجوہ چند مَیں وہ تمام گفتگو اس وقت پیش نہیں کر سکتا جو اُس روز ہمارے مابین ہوئی۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک نے یہی محسوس کیا کہ اگرچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم مذاقیہ لہجہ میں گفتگو فرماتے رہے تاہم اُن کے ہر لفظ سے صاف مترشح ہوتا تھا کہ اُن کے دل میں ہندوستان اور اسلام کے لئے بے انتہا محبت اور درد موجود ہے۔

اکبر حسین رضوی

غم

غم ہے ترا، تیری یادگار، اس دل میں
آتا جاتا ہے بار بار، اس دِل میں
غم آ کے، تری یاد دِلاتا ہے مجھے
چُپکے سے تری طرف بُلاتا ہے مجھے
ہر ٹیس میں اِک نیا مزہ پاتا ہوں
ہر آہ کے ساتھ ہُو بھی کہہ جاتا ہُوں

رُباعی

غم کے پردہ میں تُو نظر آتا ہے
جلتی ہوئی شاخ میں ثمر آتا ہے
ہے زخمِ جگر میں تری ہنستی صُورت
ہر چوٹ کے ساتھ تُو اُبھر آتا ہے
ہے حال مرا بُرا، بہت اچھا ہے
جب تُو ہے شریکِ غم، تو پھر غم کیا ہے
یہ درد تو خضرِ رہنما ہے میرا
از پا اُفتادگی، عصا ہے میرا
غم رہبرِ گمرہاں ہے مَیں مانتا ہُوں
غم میں مری بہتری ہے مَیں جانتا ہُوں
ہے رنج کی تہ میں گنج پہچانتا ہوں
ہے عُسر کے ساتھ یُسر، مَیں جانتا ہُوں
لیکن اس دل میں صبر کی تاب نہیں
اس گوہرِ جاں میں ضبط کی آب نہیں
کس طرح دلِ نرم پہ پتھر رکھوں
سونے کی چھُری سینے میں کیونکر رکھوں
تیز ایسی کہ سینے سے لگائے نہ بنے
وہ سنگِ گراں ہے کہ اُٹھائے نہ بنے
دِل میں تری یادگار کیونکر رکھوں
کس طرح، رگِ گلو پہ خنجر رکھوں

اِک چرکے ہیں شورِ الاماں اُٹھتا ہے ہر سانس کے ساتھ اِک دُھواں اُٹھتا ہے
جل جل کے جگر میں خون گھٹ جاتا ہے کھنچتی ہیں رگیں، دماغ پھٹ جاتا ہے
غم کے پیرائے میں اجل آتی ہے اِک پھونک میں شمعِ عقل بجھ جاتی ہے
غم کی شدّت سے، دِل پگھل جاتا ہے صبر و طاقت کا منکا ڈھل جاتا ہے
تکلیف میں رحم کون فرماتا ہے آنسو بھی تو آنکھ میں نہیں آتا ہے
آنکھوں کے تلے اندھیرا آ جاتا ہے جب غم آتا ہے، دم نکل جاتا ہے
تکلیف میں ڈالتا ہے کیوں غم دے کر اپریشن کر، کلوروفارم دے کر
غم کے ہمرہ، سکون بھی سمجھا دے ہر ظاہر کا بطون بھی سمجھا دے

رُباعی

اے حجلہ نشیں! ذرا اُٹھا دے پردے داماںِ نظر تجلّیوں سے بھر دے
ہر ذرّہ میں شانِ کبریائی دیکھوں اس چھوٹی سی آنکھ کو کلاں بیں کر دے
رازِ حکمت سے سینہ بھر دے پہلے اسرار سے باخبر تو کر دے پہلے

رُباعی

خواہش یہ نہیں کہ دردِ رخصت ہو جائے یہ فکر نہیں کہ دُور زحمت ہو جائے
اے رب مجھے صبر دے۔ اگر یہ بھی نہیں پھر صبر ہی سے صبر عنایت ہو جائے
مَیں یہ نہیں کہتا کہ نہ دے غم مجھ کو دے رنج کے ساتھ قلبِ محکم مجھ کو
مولا! مجھے تکلیف میں لذّت مِل جائے حکمت کی ہوا سے غنچۂ دِل کھِل جائے

جواب

لاعلمی کے باعث ہے وجودِ تکلیف
ہے تنگئ دل، وجہِ نمودِ تکلیف

ہے درد و الم، تری حماقت کا ثمر
تکلیف ہے یہ تری جہالت کا ثمر

افسوس، تُو اپنے فرض کو بھول گیا
نادان ہوائے نفس سے پھُول گیا

کب تُو نے تلاشِ علم کی مردِ خدا
کب تُو نے کہا تھا "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً"

ہاں فلسفۂ غم کو سمجھ لے پہلے
اس معنئ مبہم کو سمجھ لے پہلے

بینا ہے تو دیکھ غم میں غم کی صُورت
ہے قالبِ مَوت میں اِرم کی صُورت

غم کے اندر، سرُور کا پودا ہے
خاکی گملے میں نوُر کا پودا ہے

رُباعی

ہے رحمتِ حق پشت و پناہِ مغموم
آغوشِ خدا ہے خواب گاہِ مغموم

گر عرش کو زلزلہ ہو، حیرت کیا ہے
اللہ ہے منتہائے آہِ مغموم

رُباعی

زُلفِ پیچاں کی لہر میں ناگ بھی ہے
دُودِ آہِ غریب میں آگ بھی ہے

ہے دل شکنِ ستار مضراب کی ضرب
ہر چوٹ کے ساتھ ساتھ اک راگ بھی ہے

رُباعی

اس جسم کی کیچلی میں، اِک ناگ بھی ہے
آوازِ شکستہ دل میں اک راگ بھی ہے

بیکار نہیں بنا ہے اِک تنکا بھی
خاموش دیا سلائی میں آگ بھی ہے

رُباعی

دلبر، دلِ بیقرار میں پنہاں ہے — آئینہ اسی غبار میں پنہاں ہے
ہے شاہدِ نُور پردۂ ظلمت میں — بجلی بجلی کے تار میں پنہاں ہے

تُو خاصِ رموزِ حق کا گنجینہ ہے — اسرار سے لبریز ترا سینہ ہے
مرآۃِ جمالِ پاک ہے روحِ لطیف — یہ جسم ترا رُوح کا آئینہ ہے

یہ سنگِ نشاں ہے منزلِ وحدت کا — پیدا نہ ہوا کوئی بھی اس صُورت کا
انسان جسے کہتے ہیں دُنیا والے — قدِ آدم ہے آئینہ قدرت کا

نُورِ رُخِ دلستاں، بدل اندر جُو — دُرِّ مکنوں، بدیدہا ے تر جُو
در قالبِ خاک ہست صد جلوۂ پاک — اے تیرہ دروں شرر بخاکستر جُو

میدانِ عمل میں، گامزن ہے حرکت — خورشیدِ سکوں کی اک کرن ہے حرکت
ہوتی نہیں ابتدا بساکن امجد — ہے جان امثالِ حرف، تن ہے حرکت

دلبر دلِ مضطر میں نظر آئے گا — یہ زخمِ جگر رنگ کبھی لائے گا

ممکن ہے کہ درد ہی دوا ہو جائے
دل خون تو ہو مشک بھی ہو جائے گا

رباعی

سرمایۂ زندگی ہے کھونے کے لئے
سب جاگ رہے ہیں صرف سونے کے لئے
بے وجہ نہیں ہے سکرۃ الموت امجد
پیتے ہیں شراب مست ہونے کے لئے
کی جاتی ہے گدگدی ہنسانے کے لئے
ڈھاتے ہیں مکاں نیا بنانے کے لئے
ہے گرچہ گرانبار، حمل کی صورت
دھو دیتی ہے غم آج کا کل کی صورت
غم آئینۂ جاں کے لئے صیقل ہے
یہ رنج نہیں "مسرتِ مجمل" ہے
تفصیل ہے رنج کی خوشی کی صورت
ہے دل شکنی میں دل کشی کی صورت

رباعی

ہر قطرۂ اشک را بگو ہر گیرند
ایں دیدۂ تر بجامِ کوثر گیرند
کس، چیزِ شکستہ را نہ گیرد بایہیچ
امّا دل شکستہ گراں تر گیرند

رباعی

جز سوز و گداز اے دلِ سوزاں مطلب
جمعیتِ دل، دلِ پریشاں مطلب
خود درد، دوائے علتِ بے دردی است
چوں درد نصیبِ تست، درماں مطلب

امجد حسین امجد

قسمت کا فیصلہ

(ایک ڈراما)

اماں ــــــــ ایک بیوہ
حشمت علی ــــــــ اس کا بڑا لڑکا - عمر بائیس سال
عظمت علی ــــــــ " منجھلا لڑکا - عمر بیس سال
زینت النسا ــــــــ اس کی لڑکی - عمر اٹھارہ سال
رحمت علی ــــــــ اس کا چھوٹا لڑکا - عمر پندرہ سال
ساس ــــــــ لڑکوں کی دادی
وقت ــــــــ آجکل
جگہ ــــــــ سارا کنبہ ایک ہی کمرہ میں جمع ہے۔

حشمت۔ مجھے تو یہ حیرانی ہے کہ اسے جرأت کیسے ہوئی؟

دادی۔ بیٹا مجھے تو یہاں اُس کا آنا جانا ہی پسند نہ تھا۔

اماں۔ (ساس سے) اماں آپ یہ تو نہ کہئیے آپ کو تو میرے ہر رشتہ دار سے نفرت ہے۔

دادی۔ (جو مفلر بُن رہی ہے) بیٹی یہ تو تمہاری زیادتی ہے مجھے فقط تمہارے بھائی کا کنبہ بُرا لگتا ہے۔ تمہارے چچا کے خاندان سے مجھے کبھی نفرت نہیں ہوئی۔

اماں۔ (طنزاً) معلوم نہیں وہ آپ کو کیسے پسند آ گئے۔

دادی۔ (طنز کی پروا نہ کرتے ہوئے) جو اچھے ہوتے ہیں، سبھی کو اچھے لگتے ہیں۔

حشمت۔ دادی اماں اس تکرار سے فائدہ - آپ اس مسئلہ کے متعلق رائے دیجئیے۔

دادی۔ تو بیٹا زینت کے سامنے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

عظمت۔ کیوں زینت کے بیٹھنے میں کیا حرج ہے؟

اماں۔ عظمت اماں ٹھیک کہتی ہیں - تمہاری آزاد خیالی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ (زینت سے) زینت تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمہیں ابھی بُلا لیتے ہیں۔

(زینت کچھ حیران، کچھ خوف زدہ، چلی جاتی ہے)

حشمت۔ وکالت اس کی نہیں چلتی، پیسہ اس کے پاس نہیں - ہم کیسے اسے رشتہ دے دیں۔

ماں۔ ابھی تم کہہ رہے تھے، اُسے جرأت کیسے ہوئی؟ اور اب کہتے ہو انکار کی وجہ کچھ اور ہے۔

حشمت۔ اماں آپ کو تو اُس میں کوئی بُرائی نظر نہیں آئیگی۔ آپ کے بھائی کا لڑکا ہے۔

اماں۔ تو میں کیا گناہ کرتی ہوں۔ اس میں بُرائی تم بتاؤ کونسی ہے؟

عظمت۔ پیشتر اس کے کہ آپ سب اُس کی بُرائیوں پر بحث کریں۔ میرا خیال ہے کہ ان چھوٹے صاحب کو بھی یہاں سے بھیج دیں۔

رحمت۔ کیوں چھوٹے صاحب آپ کو کیا کہتے ہیں؟

عظمت۔ (جس کے لہجہ میں اکثر طنز چھپی ہوئی ہوتی ہے) مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ ماشاء اللہ جوان ہیں۔ پندرہ سال کی عمر ہے۔ انٹرنس میں پڑھتے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کچھ پیچیدہ ہے۔

رحمت۔ تو کیا حرج ہے، میں بھی سُن لُوں گا آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

حشمت۔ عظمت چھوڑو بھی۔ آخر ہم کونسی پوشیدہ بات کر رہے ہیں۔

دادی۔ بچوں کا ایسی باتوں میں دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔

اماں۔ (چونکہ ساس نے رائے اور دی ہے) چلو رہنے دو۔ آخر رحمت بالکل چھوٹا بھی تو نہیں۔

حشمت۔ (جس کا مزاج ذرا تیز ہے جھلّا کر) اچھا! اچھا!! رہنے دو۔ اب آپ یہ بتایئے کہ جواب کیا دینا چاہئے۔

دادی۔ بیٹا اگر میری مانو تو مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔

اماں۔ تو آپ کو اور کونسا رشتہ پسند ہے؟

عظمت۔ پہلے آپ جھگڑ لیں۔ بعد میں ہم غور کر لیں گے۔ وقت اپنا ہے۔

حشمت۔ دادی اماں پسند تو مجھے بھی نہیں۔ مگر اماں کا بھائی ہے؟

اماں۔ خیر اس بات کو تو رہنے دو کہ وہ میرا کیا ہوتا ہے یہ بتاؤ اس میں نقص کیا ہے؟

عظمت۔ نقص تو کچھ نہیں۔ فقط سُنا ہے آوارہ ہے۔

اماں۔ آوارہ؟ یہ تم کیسے کہتے ہو؟

عظمت۔ اپنی زبان سے۔

حشمت۔ عظمت بھئی سیدھی بات کرو۔ آوارہ تم نے کس طرح کہا؟

عظمت۔ (مسکرا کر) بھائی جان آپ تجاہل سے کیوں کام لے رہے ہیں؟ آپ کو بھی تو سب کچھ معلوم ہے۔

اماں۔ خدا کے لئے مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ کونسا خون کیا ہے اُس نے؟

حشمت۔ اماں یہ خون کی بات نہیں۔ فقط خون کرنا ہی تو بُری بات نہیں۔

اماں۔ تو اُس میں اور کونسے عیب ہیں۔ ابھی تو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تم سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔

عظمت۔ رب! آپ کچھ مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔

اماں۔ تمہارے متعلق تو میں کچھ نہیں کہتی۔ تمہاری تو بات ہی کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

حشمت۔ اماں ان جھگڑوں کو رہنے دو۔ اس بات کا فیصلہ کرو۔

اماں۔ (کسی قدر تلخی سے) حشمت تم تو بات ہی نہیں کرنے دیتے۔

حشمت۔ تو آپ بھی تو توجہ نہیں دیتیں۔

اماں ۔ میں کیا توجہ دوں ؛ مجھے تو لپسند ہے ۔
دادی ۔ تمہیں کیوں پسند نہ ہو ؟
اماں ۔ (ساس سے) آپ کو تو اُن سے ناحق کا بغض ہے ۔
عظمت ۔ چلئے دادی اماں اب آپ کی باری ہے ۔
دادی ۔ (مسکرا کر ۔ پیار کے لہجے میں) نہ بابا میں تمہاری اماں کی باتوں میں دخل نہیں دیتی ۔
(ظاہر ہے کہ عظمت دادی کا سب سے چاہیتا پوتا ہے)
عظمت ۔ چلو دادی اماں تو اس مسئلہ سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں ۔
حشمت ۔ کیا عجیب گھر ہے ! میں گھنٹہ بھر سے جیتا رہا ہوں اور کام کی بات کوئی کرتا ہی نہیں ۔ سب بے معنی باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں ۔
عظمت ۔ تو پھر آپ ماشاء اللہ اس گھر کی ناک ہیں ۔ سیاہ و سفید کے مالک ہیں ۔ اب قلم چلا دیجئے ۔
حشمت ۔ (جو عظمت کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے اس کی باتوں سے ناراض نہیں ہوتا) ذرا تم بھی ایک لمحہ کے لئے اگر چپ ہو جاؤ ۔ تو کچھ چین ملے ۔
عظمت ۔ میری طرف سے تسلی رکھئے ۔ کہئے تو میں ابھی آپ کو باہر بھیج دیتا ہوں ۔
دادی ۔ (مفلر بُنتے ہوئے بغیر سر اُٹھائے) بیٹا تم نہیں ہو ۔
حشمت ۔ اماں آپ نے جو کہا ہے ، وہ ہے تو ٹھیک اور ہم ایسے احسان فراموش بھی نہیں ۔ دماغ بھی محسن کا اچھا ہے اور ہمارے مقدمہ میں اس کا مشورہ بہت مفید ثابت ہوا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ مقدمہ جیتا ہی اسی نے ہے ۔

اماں ۔ تمہارے تایا کے لڑکے تو تمہیں دس ہزار ہی دے کر علیحدہ کرتے تھے ۔
عظمت ۔ یہ تو ظاہر ہی ہے ۔ اس کے دہرانے سے میاں محسن کی خوبیاں نہیں بڑھ سکتیں ۔
اماں ۔ تو وہ کونسا شرابی کبابی ہے ؟
حشمت ۔ شراب کباب کا تو ہمیں پتہ نہیں ۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اُس کا کسی عیسائی عورت سے دوستانہ رہا ہے ۔
اماں ۔ میں تو نہیں مانتی ۔ اُس کی آنکھ میں تو اتنی حیا ہے جتنی کسی میں ہو ہی نہیں سکتی ۔
عظمت ۔ بھائی جان ! یہ اشارہ غالباً آپ کی طرف ہے ۔
اماں ۔ میرا اشارہ وشارہ کسی کی طرف نہیں اور نہ میں اس کام سے مقابلہ ہی کرتی ہوں ۔ اگرچہ عظمت کے متعلق مجھے کبھی یقین نہیں ہوا مگر یہ تو میں نہیں مانتی کہ وہ آوارہ ہے ۔
عظمت ۔ آوارہ ۔ شاید آپ یہ مطلب لیتی ہیں کہ وہ بلا مطلب بازاروں میں گھومتا رہتا ہے ۔ ایسی آوارگی اُس میں نہیں ۔ وہ تو مطلب بغیر کوئی کام نہیں کرتا ۔
اماں ۔ عظمت تم صاف بات کیا کرو ۔
عظمت ۔ اس سے زیادہ "شفاف" اور کیا بات ہو سکتی ہے
اماں ۔ تو تم کہتے کیا ہو ؟
حشمت ۔ یہ کہتا ہے کہ جہاں کہیں جاتا ہے کسی گھات میں جاتا ہے ۔
اماں ۔ ہمارے ہاں وہ کس گھات پر آیا تھا ۔
عظمت ۔ ظاہر ہے ۔

اماں۔ مجھ پر تو کچھ ظاہر نہیں۔

حشمت۔ عظمت کہتا ہے اس کے آنے کا نتیجہ ظاہر ہے
یہ پیغام جو اُس کی والدہ لے کر آئی تھی، یہ سب اُسی کا
کام ہے۔

اماں۔ یہاں تو اُسے زینت سے مَیں نے کبھی بات نہیں
کرتے دیکھا۔

رحمت۔ کون کہتا ہے؟

عظمت۔ ارے! تم یہیں ہو؟

حشمت۔ کیا مطلب ہے تمہارا رحمت؟

اماں۔ اس کا کیا مطلب ہوگا؟ (رحمت سے) تُو بڑوں
کی باتوں میں دخل نہ دِیا کر۔

عظمت۔ اماں ذرا انصاف تو کرو۔ ہمارے چھوٹے صاحب
اتنی دیر سے چُپ بیٹھے ہیں، اب کچھ کہنے کو ہیں۔ ہاں
صاحب کہیئے۔

رحمت۔ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔

عظمت۔ نا صاحب مذاق کیسا؟ آپ فرمایئے۔

حشمت۔ تم اپنی چالاکیاں رہنے دو۔ اس بیچارے کو
بات تو کرنے دو۔

عظمت۔ مَیں تو اِس عتاب تلے پِس گیا ہوں!

اماں کیوں رحمت کیا کہتے ہو تم؟ اُس نے زینت سے
کبھی بات کی تھی؟

رحمت۔ کچھ نہیں۔

حشمت۔ کچھ نہیں کیا؟

رحمت۔ جی یونہی میرے مُنہ سے یہ بات نکل گئی تھی مَیں
اب جاتا ہوں۔ مجھے کام ہے۔ (اُٹھتا ہے)

عظمت۔ حضرت یہ ظلم تو نہ کیجیے۔ ہم میں تو اتنی تاب
نہیں۔ جس بے اختیاری سے آپ نے "کون کہتا ہے"
کہا تھا، وہ لہجہ نہ تو کچھ ایسا شائستہ تھا اور نہ بےمطلب

اماں۔ عظمت تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ کیسی زبان
بولتے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

عظمت۔ ان چھوٹے میاں کی تو سمجھ میں آگیا ہے۔ آپ
اُن سے مطلب پوچھیے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان صاحب
نے محسن اور زینت کو کہیں باتیں کرتے دیکھا ہے اور
اب یہ کسی وجہ سے اس بات کو چھپانا چاہتے ہیں۔

رحمت۔ وجہ تو ایسی کوئی نہیں۔ فقط آپا زینت نے کہا تھا
کسی سے نہ کہیو۔

حشمت۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا بکتے ہو؟

رحمت۔ اللہ کی قسم سچ کہتا ہوں۔

دادی۔ (اپنے متین لہجہ میں بغیر غصہ کے) بیٹا تیری قسمیں
کھانے کی عادت نہ گئی۔

رحمت۔ تو دادی اماں سچ کہتا ہوں۔ میں نے تو انہیں
کئی دفعہ چھُپ چھُپ کر باتیں کرتے پکڑا ہے۔

اماں۔ (جنہیں یہ سُن کر پہلے تو ایک دھچکا لگا تھا) رحمت
کو بیہودہ باتیں کرنے کی عادت ہے۔

عظمت۔ اس میں بیہودگی تو کوئی نہیں۔ جہاں تک
میری عقل کام کرتی ہے، میں سمجھتا ہوں یہ معاملہ قدرے
گہرا ہے۔

اماں۔ گہرا خاک ہے۔ اوّل تو مَیں مانتی نہیں، رحمت

کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔ دُوسرے اگر اُس نے زینت سے بات کر بھی لی تو کیا حرج ہے۔

حشمت۔ (ذرا گرم ہوکر) مگر یوں چھُپ چھُپ کر! مجھے تو بہت غصّہ ہے اور خاصکر زینت پر۔

عظمت۔ مگر اس بیچاری نے تو رحمت سے منّت کی تھی کہ کسی سے نہ کہیو۔

اماں۔ تو اب کیا اپنی بہن پر حرف رکھتے ہو۔

حشمت۔ (ذرا غصّے سے) حرف ورف تو مجھے معلوم نہیں مگر خفیہ طور پر ملنا شرافت نہیں اور نہ شریف زادیاں ایسا کرتی ہی ہیں۔

عظمت۔ سب کے متعلق تو یہ کلیہ قائم نہ کیجیئے۔ آپ کو دُنیا کا کیا علم۔

حشمت۔ اگر نہیں تو نہ سہی۔ میں ایسے علم سے باز آیا۔ کسی اَور کا کوئی کیا اعتبار کرے۔ زینت سے کون توقع کرسکتا تھا کہ وُہ اس بدمعاش سے ملنا شروع کردیگی۔

اماں۔ حشمت تم بہت جلدی گرم ہوجاتے ہو۔ ذرا زینت سے پُوچھ تو لو۔

عظمت۔ ہاں زینت سے ضرور پُوچھو، وہ آپ کو ٹھیک بتائے گی۔

اماں۔ کیوں اسے کیا انکار ہوگا؟

حشمت۔ وہ کیا بتائے گی ہمیں۔ اگر ایسا ہی پاک صاف معاملہ تھا تو رحمت کو کیوں تاکید کی کہ کسی کو نہ بتائے۔

عظمت۔ اسی ناراضی سے ڈرتے ہوئے جو آپ ظاہر کررہے ہیں۔ یہ بھی تو نہ فرض کرلیجیئے کہ اس کی تہ میں ضرور ہی کوئی نازیبا بات چھپی ہوئی ہے۔

حشمت۔ اَور نازیبا بات کیا ہوسکتی ہے؛ تم تو فقط منطق چھانٹ سکتے ہو۔

عظمت۔ کم از کم میں جلد بازی اور بدگمانی کا شکار تو نہیں ہوتا۔

حشمت۔ وہ چھُپ چھُپ کر ملتے تھے اور تم اسے بدگمانی سمجھتے ہو۔ کیا معلوم کب ملتے تھے۔ کیوں رحمت دن کو تم نے دیکھا تھا یا رات کو؛

اماں۔ شرم کر حشمت شرم کر۔ اپنی بہن کے متعلق یہ سوال کرتا ہے۔

حشمت۔ اب آپ مجھے قصُوروار ٹھہرائیں گی؛

اماں۔ میں تو کسی کو قصوروار نہیں ٹھہراتی۔ میں تو خیال ہی نہیں کرسکتی کہ زینت کوئی ناشائستہ حرکت کر سکتی ہے۔

حشمت۔ اَور محسن؛

اماں۔ معلوم نہیں تم سب کو کیا ہوگیا ہے۔ ایک اس بات پر کہ کہیں ایک آدھ دفعہ محسن نے زینت سے بات کرلی، تم نے طُوفان مچا دیا ہے۔ اور رحمت کی باتوں پر اعتبار کرکے جس نے ساری عمر میں کبھی سچ نہیں بولا۔

رحمت۔ اماں خدا کی قسم مَیں جھُوٹ نہیں بولتی میں نے دو دفعہ انہیں باتیں کرتے دیکھا ہے۔ اَور ایک دفعہ . . . . . (رُک جاتا ہے)

عظمت۔ کیوں رُک کیوں گئے تُم؛

رحمت ۔ کچھ نہیں، آپ پھر کہیں گے میں جھوٹ بولتا ہوں
میں نہیں بتاتا۔

حشمت ۔ بچوں کی سی باتیں نہ کرو ۔ یہ معاملہ کوئی ایسا
ویسا نہیں۔

رحمت ۔ آپ ہی کہیں گے میں جھوٹ بولتا ہوں۔

عظمت ۔ ارے میاں اب بتاتے بھی ہو۔

دادی ۔ (مفلر بُنتے ہوئے) کیوں اس بیچارے کے گرد
ہوئے ہو تم ؟

عظمت ۔ ذرا پُوچھئے نا اِن سے ۔

حشمت ۔ عظمت بھئی تم بہت تنگ کرتے ہو ۔ یہ کوئی مذاق
تو ہے نہیں ۔ کبھی تو خیال کیا کرو۔

عظمت ۔ بھائی جان تو میں کیا کہتا ہوں ۔ آپ رحمت
سے کیا پُوچھ رہے ہیں ؟ یہ کوئی بجھارت تو ہے نہیں،
میں کہتا ہوں محسن کا بازو زینت کی کمر کے گِرد ہوگا۔

اماں ۔ } (ایک وقت) توبہ توبہ !
حشمت ۔ } (ایک وقت) بے شرم !

دادی ۔ عظمت بیٹا، ہر بات میں مذاق نہیں کیا کرتے۔

عظمت ۔ تو رحمت سے پُوچھ لو۔

رحمت ۔ آپ کو کس نے بتایا ؟

عظمت ۔ (سب کی طرف دیکھتے ہوئے) دیکھا آپ نے ؟

اماں ۔ لعنت ہے تجھ پر، بہن پر بہتان لگاتا ہے ۔ بے حیا!

حشمت ۔ (رحمت سے) اگر یہ صحیح ہے تو خیر اور اگر تم
جھوٹ بولتے ہو تو تم سا پاجی اور خبیث شخص دُنیا میں اَور
کوئی نہ ہوگا ۔

عظمت ۔ تبھی وہ کہتا تھا مجھ سے نہ پُوچھو۔

حشمت ۔ تو تمہیں اس کی بات کا یقین ہے ؟

عظمت ۔ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے ؟

اماں ۔ شرم تمہارے پاس نہیں پھٹکی۔

عظمت ۔ اگر آپ کو مجھے بے شرم کہنے میں لُطف آتا ہے
تو شوق سے کہیئے، ورنہ میری تو سمجھ میں نہیں آتا آپ
کس بات پر اتنی چراغ پا ہو رہی ہیں۔

حشمت ۔ بکو نہیں ۔

اماں ۔ عظمت تم سے تو خدا کی پناہ ہے ۔ بہن کی عزت
کا سوال ہے اور تمہیں مذاق سُوجھ رہے ہیں۔

عظمت ۔ کون پاگل مذاق کر رہا ہے ۔ میں تو کہتا ہوں
کہ اگر زینت اُس سے چھُپ چھُپ کر ملتی تھی تو کوئی
عجب نہیں اگر کسی وقت اُس نے زینت کی کمر میں
ہاتھ ڈال دیا ہو۔

حشمت ۔ (غصہ سے لال ہو کر) حرامزادہ کہیں کا ۔ اَور
پھر اُس کی ماں رشتہ مانگتی ہے !

دادی ۔ محسن نے ہی کہا ہوگا ۔ میں تو پہلے ہی سے کہتی
ہوں کہ مجھے اس کے لچھّن پسند نہیں ۔ شریف گھروں
میں آ کر مُونچھوں پر تاؤ دیتے رہنا کوئی شرافت نہیں۔

عظمت ۔ دادی اماں اس کی تو کوئی ایسی بڑی مُونچھیں
نہیں ۔

دادی ۔ یہی تو میں بھی کہتی ہوں ۔ چھوٹی چھوٹی مُونچھیں
اَور پھر انہیں مروڑتے رہنا ! مجھے تو لگتا ہی بدمعاش ہے۔

اماں (اپنی ساس سے) اماں اب آپ کی بھی بن آئی ہے

مونچھوں پر تاؤ دینا کونسا گناہ ہے۔

دادی۔ جیسے وُہ تاؤ دیتا تھا اس طرح تاؤ دینا ثواب بھی نہیں۔ مَیں نے تو خود اُسے زینت کو گھورتے دیکھا ہے۔

عظمت۔ دادی اماں آپ کی تو نظر ہی کمزور ہے۔

حشمت۔ چلو اس جھگڑے کو جانے دو۔ تمہیں کیوں غیر متعلق باتیں کرنے میں مزا آتا ہے؟

عظمت۔ بھائی میرے، میرا مطلب فقط یہ تھا کہ جتنا اس کا قصور ہے یعنی اگر اس کا کوئی قصور ہے تو، اسے اُسی قدر بُرا کہنا چاہئے۔ زیادہ نہیں۔

حشمت۔ اگر اس کا کوئی قصور ہے! اور کیا کسی کو قتل کر دیتا؟

عظمت۔ آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ وہ ہمارے ہاں ہمارے بُلانے سے آیا کرتا تھا۔ اور دو دو تین تین گھنٹے ہمارے ساتھ مِل کر مقدمہ کی اُونچ نیچ پر بحث کیا کرتا تھا۔

حشمت۔ اس سے تو وہ مردود آتا ہی نہیں تو اچھا تھا۔

اماں۔ تو نقصان بھی پندرہ ہزار کا ہمیں کو ہوتا۔

حشمت۔ وہ کوئی ہمارا اَن داتا تو نہیں۔

دادی۔ مقدمہ کے بغیر بھی روپیہ مِل ہی جاتا۔

اماں۔ (ساس سے) اماں یہ تو آپ نہ کہئے۔ وہ بھی تو آپ کے پوتے ہیں۔ مگر فقط اس لئے کہ آپ ہمارے پاس رہنا پسند کرتی ہیں، مقدمہ کے دَوران میں ایک دفعہ بھی آپ سے مِلنے آئے؟ دو سال ہو گئے ہیں۔

دادی۔ پھر بھی اِن کا حق وہ کیسے لے سکتے تھے۔

اماں۔ لے ہی لیا تھا، اَور کیسے لے لیتے۔

دادی۔ چلو اب تو مِل گیا۔

اماں۔ تو محسن جسے اب سبھی بُرا کہہ رہے ہیں، اسی کی مدد سے مِلا۔

حشمت۔ ہم اسے اِس لئے تو نہیں بُرا کہہ رہے کہ اُس نے ہمیں مقدمہ میں مدد دی، ہم یہ پُوچھ رہے ہیں کہ وُہ یہاں آتا ہمیں مشورہ دینے کو تھا یا زینت سے چھُپ چھُپ کر مِلنے کے لئے؟

عظمت۔ کیا معلوم وہ آتا ہی اسی لئے ہو۔

حشمت۔ اگر مجھے یقین ہو جائے تو اس کی گردن مروڑ دُوں۔

اماں۔ احسان کا بدلہ ایسے ہی دینا چاہئے۔

حشمت۔ تو آپ کا مطلب ہے کہ ہم اُسے زینت دے دیں۔

اماں۔ تو اُس میں کونسے کیڑے پڑے ہیں؟

حشمت۔ میری نظر میں تو وُہ کوڑھیوں سے بدتر ہے۔

عظمت۔ (مسکرا کر) شاباش! واقعی آپ کی دانشمندی اور اصابتِ رائے کا میں قائل ہو گیا ہوں۔

حشمت۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ زینت درپردہ یہ کچھ کر رہی ہے۔

عظمت۔ تو آپ پر یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ سوائے دو ایک دفعہ ملنے اور مختصر سی باتیں کرنے کے اُنہوں نے اَور کچھ بھی کیا ہو؟

حشمت۔ محسن سبھی کچھ کر سکتا ہے۔

عظمت۔ تو گویا آپ بغیر ثبوت لئے زینت پر بہت

بھاری الزام لگا رہے ہیں۔

حشمت۔ (جھلا کر) تُو افلاطون بن کر کہاں سے آیا ہے؟ کسی کو بات ہی نہیں کرنے دیتا۔

عظمت۔ (اپنے اسی متین طنزیہ لہجے میں) میں تو فقط یہ کہتا ہوں کہ آپ حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے اور اگر زینت سے کچھ دریافت کرنا ہے تو اُسے بُلا کر پُوچھ لیجئے اور رشتہ منظور نہیں تو انکار کر دیجئے۔

حشمت۔ اور وہ کہتا پھرے کہ میں زینت کی بغل میں ہاتھ دینے دیئے پھرا کرتا تھا۔

عظمت۔ آپ کا تخیل ضرور قابلِ تعریف ہے

حشمت۔ خیر کچھ بھی ہو۔ اب عزت اسی میں ہے کہ اس بات کو یہیں دبا دیا جائے مگر اس خبیث کو کم از کم نفی میں جواب نہ دینا چاہیئے۔

اماں۔ (فیصلہ کُن لہجے میں) تم سب کا تو دماغ پھر گیا ہے میں تو نہیں مانتی کہ محسن کا ارادہ فاسد تھا۔ سگی پھوپھی کے گھر میں اور زینت کے ساتھ! تم تو پاگل ہو، جو زینت کے خلاف ایسی باتیں کرتے ہو۔ میں کیا اندھی ہوں؟ جس نے کبھی زینت کو اِدھر اُدھر ملنے نہیں دیا۔

حشمت۔ تو اُس سے باتیں کیسے کرتی رہی۔

اماں۔ اگر تم رحمت کو سچا سمجھتے ہو۔

رحمت۔ قرآن کی قسم ....

دادی۔ رحمت تو پھر قسمیں کھاتا ہے۔

حشمت۔ اچھا! اچھا!! اچھا!!! اب کچھ فیصلہ کرو۔ اماں آپ کی کیا رائے ہے؟

اماں۔ میری تو رائے ہے ہاں کر لو۔ محسن بُرا لڑکا نہیں فقط محنت نہیں کرتا۔ اسی لئے اس کی وکالت نہیں چلتی۔ شادی ہو جائے گی تو ذمہ داری محسوس کریگا۔

دادی۔ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اماں۔ (ساس سے) اپنے تایا کے لڑکوں سے تو کوئی نہ ملا۔

دادی۔ (جس کی یہ دلی خواہش ہوا کرتی تھی) مقدمہ نہ پڑتا تو رشتہ وہاں ہو ہی جاتا۔

حشمت۔ یہ تو فضول بحث ہے۔ اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو ہاں کر دو۔

عظمت۔ اعتراض تو مجھے بھی اب کوئی نہیں۔ یہی خیال تھا کہ وہ لڑکیوں کے پیچھے بھاگا پھرتا ہے۔ اب اگر اسے زینت سے واقعی محبت ہو گئی ہے تو فبہا۔

حشمت۔ اُونہہ! محبت!!

عظمت۔ کم از کم زینت کو تو کچھ خیال ضرور ہے۔

حشمت۔ شریف زادیوں کو ایسے خیال نہیں ہوا کرتے۔

سیّد فیاض محمود

روحِ انسان

("ذکر[1] و فکر" کا ایک ورق)

پا سکو شاید سمندر کی بھی تم گہرائیاں — کر سکو طے عالمِ امکاں کی بھی پہنائیاں

گِن سکو شاید شعاعیں مہرِ عالمتاب کی — ڈھونڈ لو ممکن ہے راہیں انجم و مہتاب کی

کھول لو ممکن ہے گتھی گردشِ ایام کی — جان لو شاید حقیقت دورِ صبح و شام کی

پھول باغِ آسماں سے چن سکو ممکن ہے یہ — نغمۂ ناہید بھی تم سن سکو ممکن ہے یہ

چیر کر موجیں فلک کے اِس یمِ زخّار کی — دیکھ لو ممکن ہے دُنیا چرخ کے اُس پار کی

رُوحِ انساں ہے مگر وہ بحرِ ناپیدا کنار — جس کی تہ ناپید ہے موجیں ہیں جسکی بیشمار

کوئی پا سکتا نہیں گہرائیاں انسان کی — عقل کے بس کی نہیں پہنائیاں انسان کی

گو فلک سے بھی پرے انسان کی پرواز ہے
ابتدا سے آج تک یہ خود سراسر راز ہے

آثر صہبائی

[1] حضرت آثر صہبائی نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اُن کا مجموعۂ کلام زیرِ ترتیب ہے اور مستقبل قریب میں "ذکر و فکر" کے نام سے شائع ہونے والا ہے۔

جبر

لکھی ہے سرِ صبح ستاروں کے لہو سے / شب نے کسی ناکامِ تمنّا کی کہانی

دریا کے دھڑکتے ہوئے دل کا ہے فسانہ / موجوں کی کشاکش میں حبابوں کی روانی

دن رات کی اس گردشِ پیہم کے اثر سے / ہر روز شفق کرتی ہے خونابہ فشانی

اک دل بھی نہیں فطرتِ مجبور سے آزاد / مجروحِ غمِ دہر ہے ماما ہو کہ رانی

شبنم کی تمنّا کا جنازہ ہے جنازہ / پھولوں کی جبینوں سے ڈھلکتا ہوا پانی

اک کیفیتِ غم ہی کو کہتے ہیں مسرّت / احساس کا دھوکا ہے غمِ عشرتِ فانی

اک آن میں پامالِ ستمہائے خزاں ہے / کلیوں کا لڑکپن ہو کہ پھولوں کی جوانی

کونین میں ہے جبرِ مسلسل کی خدائی

اے قادرِ خلّاق! دُہائی ہے دُہائی

ماہر القادری

"بے رنگ و بُو"

سکھ دُکاندار نے جو آٹا لُون تیل بیچتا تھا، آہستہ سے کہا "میرے مکان میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے، آپ خود چل کر دیکھ لیجئے اگر آپ کو پسند آئے تو کرایہ پر لے لیجئے، کرایہ بھی کم ہے، صرف نَو روپیہ ماہانہ، میں خود آپ کے ساتھ گلی میں چلتا ہوں"۔

سکھ دُکاندار نے سائیکلوں کی دُکان کے مستری کو آواز دی "او رحمو! او رحمو! ذرا میری دُکان کا خیال رکھنا"۔

"کوئی فکر نہ کرو سردار صاحب"

سکھ دُکاندار جہاں رہتا تھا وہ چھوٹا سا مکان تھا، ایک ہی منزل، ایک ہی نہانے کا کمرہ، سیڑھیوں کے قریب ایک چھوٹا سا تنگ کمرہ خالی تھا، اور اُس کے ساتھ ہی اندر کی طرف کُھلتا ہؤا ایک چھوٹا سا آنگن۔

"بس، اس چھوٹی سی جگہ کے لئے نَو روپیہ ماہانہ کرایہ"

سکھ دُکاندار نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا "تو اَور کیا، ہم بھی نَو روپیہ ہی دیتے ہیں، بجلی، پانی کے نل کا کرایہ مِلا کر بارہ روپیہ ہو جاتے ہیں، مہینہ بھر میں بمشکل تیس پینتیس روپیہ کماتا ہوں، بارہ روپیہ مالک مکان کو دے دیتا ہوں، آٹھ دس روپیہ حکیم صاحب کی نذر کرتا ہوں، آپ جانتے ہیں، بیوی بچوں والے گھر میں آٹھ دس روپلے کچھ زیادہ نہیں، باقی...... باقی...... مشکل سے گزر ہوتی ہے"۔

سکھ دُکاندار کی زرد رُو بیوی الگنی پر دُھلے ہوئے فراک لٹکانے کو نکلی، ایک بچہ اُس کی دھوتی کا گوشہ پکڑے روئے جاتا تھا ایک بچہ وہ گود میں اُٹھائے تھی جو اپنے ننھے ہاتھوں میں کھانڈ کے بتاشے پکڑے ہوئے تھا، ایک بچہ اُس کے پیٹ میں تھا۔

سکھ دُکاندار نے کھانستے ہوئے کہا "تو یہ گھر —— آپ —— آپ کو پسند نہیں؟"

"جگہ تو اچھی ہے، لیکن ذرا —— اس کمرے میں اندھیرا بہت ہے"۔

سکھ دُکاندار کی کھانسی تیز تر ہوتی گئی، آخر رُک رُک کر بولا "ہاں... اندھیرا... اندھیرا، نَو روپلے ماہانہ میں اندھیرا نہ ملے گا تو اَور کیا روشنی مِل سکتی ہے؟"

× × × × × × × × × ×

یہ گلی پکی تھی، صاف ستھری، سہ منزلہ مکان، دُہرے دروازے، مچھروں اور مکھیوں کو روکنے کے لئے جگہ جگہ قہقہوں کی آوازیں، گراموفون کے ریکارڈ، ہارمونیم کی صدائیں، ایک مکان دیکھا، بہت بڑا مکان، سرخ سیمنٹ کا فرش، تین چار کرایہ دار پہلے ہی سے رہتے تھے، صرف ایک حصہ جو دو کمروں پر مشتمل تھا خالی تھا، کرایہ پندرہ روپے۔

مجھ سے کسی نے کہا، "مالک مکان عقب کی گلی میں رہتے ہیں، آپ اُن سے معاملہ طے کر لیجئے۔"
عقب کی گلی کے آخری کونے پر جنوب کی طرف اُن کا مکان تھا، گھنٹی بجائی تو ہنستے ہوئے باہر نکلے۔
"نمستے!"
"جی، نمستے، آپ اس (ہاتھ سے اشارہ کر کے) کمرے میں تشریف رکھیئے، میں ابھی کھانا ختم کر کے آتا ہوں، بس میں ایک منٹ میں آجاؤں گا، مجھے دفتر بھی جانا ہے۔"
دُوسرے کمرے میں ایک تنگ پرُانی وضع کے صُوفے پر جس پر نیلی چھینٹ کا غلاف چڑھا ہؤا تھا، بابو صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔
"مجھے زکام ہے، معاف کیجئے گا میں اُٹھ نہیں سکتی،" مالکہ مکان نے لیٹے لیٹے اور کشمیری شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔
میں نے مُسکرا کر کہا "کوئی ہرج نہیں، مجھے بھی زکام ہے۔"
ہم دونوں ہنسنے لگے، بابو صاحب کمرے میں داخل ہوئے، ہمیں ہنستے دیکھ کر اُن کے مُنہ کی مُسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔
"آپ نے مکان دیکھ لیا، پسند ہے؟" اُن کے لہجہ میں خفیف سی درشتی تھی۔
"دیکھ لیا! پسند ہے!"
"کرایہ ہر مہینہ ہم پیشگی لے لیتے ہیں"
"اچھی عادت ہے"
لیکن "بابو صاحب" میری بات پر ہنسے نہیں۔ بولے "کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اکیلے تو نہ ہوں گے، آپ کے ساتھ عورتیں ہوں گی؟ اور بچے بھی، دیکھئے نا، یہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔"
وہ ان دو فقروں میں اپنی معاشرت کی پُوری داستان کہہ گیا۔ "یہاں" جس مرد کے پاس عورت نہیں، اُس کی نہ تو عزت ہو سکتی ہے اور نہ اُسے کوئی مکان کرایہ پر مِل سکتا ہے، اور جس عورت کے پاس بچے نہیں، اُس کا خاوند دُوسرا بیاہ کر لیتا ہے، اور اگر دُوسری عورت بھی بچے نہ جنے، تو تیسرا بیاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
میں نے انکار میں سر ہلایا۔
بابو نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "معاف کیجئے گا، یہ بہو بیٹیوں والا محلہ ہے۔"
بابُو کی بیوی نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا، میں کمرے سے باہر نکل آیا، دروازے کے قریب ایک جوان لڑکی بغل میں کتابیں لئے کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر اُس کے گال تمتما گئے، اُونچی آواز میں بولی "وے منڈُو، جلدی کر، کالج دیر ہو گئی!"
"آیا بی بی جی" نوکر ہنستا ہؤا سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا، کوئی سولہ سترہ برس کا ہو گا، بھیگی بھیگی مسیں، سڈول اعضاء۔

* * * * * * * * * * * *

یہاں نئے مکان بن رہے تھے، ابھی بہت سی جگہ خالی تھی، یہاں ریت اُڑ رہی تھی، اور شور مچاتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر مٹی پھینک رہے تھے ننھی ننھی لڑکیاں ریت پر بطخوں کی طرح چلنے کی کوشش کر رہی تھیں، یا ایک لمبی رسی پر کودنے کی کوشش میں مشغول تھیں، بھنے ہوئے چنے بیچنے والا یاس انگیز نگاہوں سے بچوں کی طرف دیکھتا ہوا گزر رہا تھا، اس ریتلے میدان سے پرے اور سامنے ایک مکان پر موٹے حروف میں لکھا تھا "کرایہ کے لئے خالی ہے"۔

دروازہ کھلا تھا، ایک چھوٹا سا دالان، اس کے آگے کھلا آنگن جس میں پانی کے نل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بدصورت فربہ اندام عورت نہا رہی تھی، بغیر کسی جھجک کے بولی "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں"؟

میں نے دل میں کہا "اور کیا تمہیں دیکھنے آیا ہوں؟"

جیسے اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو، بولی "اچھا آپ ذرا دالان میں ٹھہریئے۔ میں بھی آتی ہوں"۔

وہ ایک سفید دھوتی پہنے ہوئے آئی، یہ سونے کا کمرہ، یہ بیٹھک، یہ ایک اور کمرہ، یہ بھی ایک کمرہ ہے، یہ رسوئی ہے، ذرا ناصاف ہے، لیکن کل تک بالکل ––– ڈسرپلاکر ہو جائے گی۔ کرایہ بیس روپے، ہم پیشگی لیتے ہیں، اچھے کرایہ داروں کو دیتے ہیں، دوسری منزل میں ایک "ائے صاحب کے گھر والے" رہتے ہیں، ان کی تین لڑکیاں ہیں، کالج میں پڑھتی ہیں، تیسری منزل میں ایک پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی اور بچے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے پوچھا "اور تیسری منزل سے اوپر؟"

وہ حیران ہو کر بولی "تیسری منزل سے اوپر؟ ––– اس سے اوپر چھت ہے، سونے کے لئے کھلی جگہ، اور ایک طرف رفع حاجات کے لئے تین کمرے"

"ہوں!" میں نے کچن کے فرش کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ فرش ذرا ناصاف ہے، کل تک ––– ڈسرپلاکر ––– " پھر میری طرف دیکھ کر بولی، آپ شادی شدہ ہیں نا؟"

"نہیں، لیکن میرے ساتھ میری خالہ ہونگی، اور خالہ کی لڑکی، اور خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں"

"اوہ، اچھا ––– پھر تو ٹھیک ہے، لیکن کرایہ پیشگی دینا ہوگا، کم از کم ایک دو مہینوں کے لئے، اور کئی کرایہ دار بغیر کرایہ دئے رخصت ہو جاتے ہیں"۔

"ہاں، بہن، تمہیں ابھی پچھلے مہینہ ہی آٹھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا"

اب یہ ایک نوجوان عورت چپکے سے کہیں سے نکل آئی تھی، اچھے نقش تھے، لیکن چہرہ کچھ اُترا ہوا، کچھ اُداس سا، بڑی بڑی آنکھیں، لیکن ملول، رنجیدہ، لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیکن پھیکی، تاسف انگیز، گویا کہہ رہی تھی؛ اس سے کیا فائدہ؛ وہ دن بھر دفتر میں کلرکی کرتے ہیں، اور میں لبوں پر سرخی لگا کر برتن مانجتی ہوں، آخر اس زندگی سے کیا فائدہ، وہ شام کو تھکے ماندے آتے ہیں، اور پھر دفتر کے کام میں مشغول ہو

جاتے ہیں، اور رات کو ـــــ رات کو میرے لبوں کی سُرخی دیکھتا ہی کون ہے ؛ ہائے، یہ زندگی کس قدر پھیکی اور بے مزہ ہے۔

"یہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں"، مالکِ مکان نے مجھے بتایا۔ " ان کے ـــــ بجلی کے دفتر میں نوکر ہیں"

مَیں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "جی، بہت اچھا، نمستے، جی"

کلرک کی بیوی نے خوش ہو کر کہا " آپ ـــــ یہ مکان کرایہ پر لے رہے ہیں"

"جی، سوچ رہا ہوں، میرے ساتھ خالہ ہوں گی، خالہ کی لڑکی، خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں۔ اور . . . . "

"تو ہرج کیا ہے ؛" اُس نے خود بخود ہنستے ہوئے کہا، "ہم سب بہنیں مِل جُل کر گزارا کر لیں گی۔ گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے نا، اور پھر یہ بڑا اچھا مکان ہے"۔ اُس نے کچن کے فرش کو پاؤں سے بجاتے ہوئے کہا

"یہ فرش ذرا ناصاف ہے"، بدصورت فربہ اندام عورت ایک کل کی طرح بول اُٹھی ۔ "کل تک دُھلا کر ـــــ"

میں آہستہ آہستہ باہر دالان کی طرف مڑنے لگا، نوجوان عورت کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم یہ مکان لے لیتے، مجھے تمہاری محبت تو درکار نہ تھی، اور میں اس قسم کی باتوں کو پسند بھی نہیں کرتی، لیکن یُونہی دل بہلا رہتا، وہ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں، صبح سے لے کر شام تک، تم کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیا کرتے اور میرے لبوں کی سُرخی چمک اُٹھتی، کیا ہی اچھا ہوتا، افسوس یہ زندگی کتنی پھیکی اور بے رنگ و بُو ہے"

"میں کل تک آپ کو پتہ دوں گا، نمستے"

"نمستے!" دونوں عورتوں نے کہا

× × × × × × × × × ×

ریتیلے میدان میں ایک گوری رنگت کا مزدور لکڑیاں چیر رہا تھا، کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ، مجھے گزرتے دیکھ کر رُک گیا۔

"سلام صاحب"

"سلام! کہاں کے رہنے والے ہو، کشمیری ہو"

"نہیں صاحب، گلّو کا گدّی ہوں"

گورا رنگ، تنے ہوئے پٹھے، مَیلی نکر، پھٹی ہوئی قمیص، کشادہ چھاتی اور ہاتھ میں ایک مضبوط کلہاڑی۔

"گلّو، گلّو ؛"

"جی سرکار"

"بیوی ہے ؛"

گدّی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "جی سرکار"۔ بیوی کے نام پر ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، کیا ہُوا اگر وہ غلام ہے کم از کم

اُس کا ایک غلام اور تو ہے!

گدی اپنی خوش قسمتی پر نازاں مسکرا رہا تھا، اُس کے بڑے بڑے میلے دانت سُرخ مسوڑھوں میں نقلی طور پر جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"بچّے بھی ہوں گے؟"

"جی سرکار ایک لڑکا ہے، ننھا سا (ہاتھ سے اشارہ کر کے) اتنا سا"

"انہیں بھی ساتھ لائے ہو؟"

گدی کی مسکراہٹ جیسے کسی نے پاؤں تلے مسل دی ہو اُس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا، بولا "صاحب کوئی کام دیجئے ہیں لکڑیاں خوب چیرتا ہوں"۔

"ایک من کا کیا لیتے ہو؟"

"ایک آنہ"

"ایک آنہ؛ صرف ایک آنہ؛ ارے —— صرف ایک آنہ؟ آدھے دن کی کمائی"

"سرکار لوگ ایک آنہ بھی نہیں دیتے"۔

"تم واپس کُلّو کب جاؤ گے؟"

لکڑی چیرنے والا ریت پر بیٹھ گیا اور حقہ پینے لگا، شاید وُہ دھوئیں کے حلقوں میں کُلّو کے سرسبز مرغزار، برفانی چوٹیاں، کالی سلیٹ کی چھتوں والے گاؤں اور اپنی بیوی اور ننھے بچّے کی تصاویر دیکھ رہا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا، لکڑ ہارے نے یاس انگیز لہجہ میں کہا،

"صاحب، کوئی کام بتایئے"۔

× × × × × × × ×

شام کو میں پھر اپنے سرائے نما ہوٹل کے دروازے پر واپس پہنچ گیا، قیدخانے کی طرح تنگ کمروں کی قطاریں، بھُنی ہوئی پیاز کی بُو، بڑے سے آنگن میں بے ترتیبی سے بچھے ہوئے بنچ، آٹھ دس لڑکوں کے مجمع میں راج ہنس چلا چلا کر کہہ رہا تھا "ہم انقلاب چاہتے ہیں، انقلاب، بورژوا عمومی انقلاب اور پھر اشتراکی انقلاب، اور پھر خالص سو فیصدی مارکسی انقلاب، ہم ایک نئے تمدن، ایک نئی تہذیب، ایک نئی معاشرت کی بنا پر ایک نئے انسان کی تخلیق چاہتے ہیں، ہم . . . ." بیچارہ راج ہنس

مطبخ کا ملازم میرے قریب سے گزر گیا۔

میں پکارا "او دینے! آج کیا پکا ہے؟"

"ساگ، دال، اور کانشی پھل"

۹۷ نمبر میں رہنے والا برہمن لڑکا رام نام کی دھوتی پہنے باتھ روم میں نہانے جا رہا تھا شفیع اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا "نیا راگ ہے ساز بدلے گئے" زور زور سے گا رہا تھا، میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بستر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

راج ہنس اپنی پتلی آواز میں ابھی تک چلا رہا تھا "ہم اس استعماری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے، اسے پیس کر دھر دیں گے، اس کے پرخچے . . . . . ."

بھیا لال کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے اُداس لہجہ میں پوچھا "تم نے مکان لے لیا؟ اب تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؛ اپنے سب رفیقوں کو!"

مَیں نے جواب دیا "میرے لئے یہ سرائے ہی بہتر ہے۔"

ـــــــــــــــ کرشن چندر

ایک التجا

مَیں اس عظیم الشان شاہراہ پر
تمہارا ہاتھ پکڑ کر
تم سے التجا کرتا ہوں کہ میری محبت کو نہ ٹھکراؤ
اور دوستی کے پرانے رشتے کو مت توڑو

ـــــــــــــــ

مَیں اس شاہراہ پر
پژمردہ اور نڈھال ـــــ تمہارے پاؤں پڑتا ہوں
مجھے حقارت کی نظر سے نہ دیکھو
تمہاری محبت میرے دل سے نہیں نکل سکتی

ـــــــــــــــ

شی کنگ
(چینی)

حمید نظامی

برساتی ندی

آزاد مسافر ہوں مَیں دُور سے آتی ہُوں ۔ ہو دُور تھکن جس سے وُہ راگ سُناتی ہُوں
بیٹھے ہوئے بےحِس کو ساتھ اپنے چلاتی ہُوں ۔ رستے کی رُکاوٹ کو ساتھ اپنے بہاتی ہُوں
آندھی کے تھپیڑوں کو سہتی ہوئی آئی ہُوں
پستی و بلندی پر بہتی ہوئی آئی ہُوں

گردش بھی بہت دیکھی چکر بھی بہت کھایا ۔ سمٹی کبھی تنگی میں دامن کبھی پھیلایا
رُخ پھیر لیا اُس سے جو سخت نظر آیا ۔ ہموار زمینوں میں رفتار کو نرمایا
صبر اور سہولت سے اُونچوں کو گرایا ہے
مغرور چٹانوں کو موجوں میں بہایا ہے

اِس عالمِ ہستی میں رکھا ہے قدم جب سے ۔ جتنے بھی معاون ہیں مِل جُل کے رہی سب سے
آتی ہوں اِسی رستے بہتی ہوں اِسی ڈھب سے ۔ خود علم نہیں مجھ کو آمد ہے مری کب سے
چلتے ہوئے دیکھے ہیں ہر دَور کے پیمانے
سب یاد کہاں اب وہ گزرے ہوئے افسانے

اُٹھتی ہوں سمندر سے اُڑتی ہُوں ہواؤں میں ۔ گھبرا کے حرارت سے چھپتی ہوں گھٹاؤں میں
لپٹی ہوئی پھرتی ہوں بادل کی رداؤں میں ۔ اُتری ہوں پہاڑوں کی سرسبز فضاؤں میں
بکھرے ہوئے قطروں کو محنت سے سمیٹا ہے
رفتار کی خوبی سے دامن کو لپیٹا ہے

پیدا ہے بہت دِن سے اِک جوشِ جنوں سر میں ۔ تسکین کہاں جب تک پہنچے نہ قدم گھر میں
پُوری ہُوئی جو فرقت لکھی تھی مقدر میں ۔ آرام سے سوؤں گی اب جا کے سمندر میں
پھر اگلے برس آکر رُوداد سناؤں گی
سُوکھے ہوئے سبزے کو قُم کہہ کے جِلاؤں گی

سیفی نوگانوی

عُود بتّی

مَیں ہُوں اِک ادنیٰ سی تیلی جس کی کچھ قیمت نہیں — پھُول کی جیسی مری نکہت نہیں صُورت نہیں
مجُھ میں وُہ پاکیزگی وُہ خوبی و نزہت نہیں — میری نکہت کو شمیمِ گُل سے کچھ نسبت نہیں

کاہ کی مانند ہوں میری بھی کوئی شان ہے
پھُول کی کیا کہیئے وُہ تو رنگ و بُو کی جان ہے

کون سی رنگینیاں ہیں جو اُسے حاصل نہیں — کونسی آنکھیں ہیں جو اُس کی طرف مائل نہیں
اُس سے بڑھ کر کوئی شے بہرِ نشاطِ دل نہیں — اُس سے بہتر چیز کوئی دید کے قابل نہیں

نُورِ اختر، حُسنِ اخگر، آبِ گوہر اَور ہے
کہہ رہا رنگ خود، لطفِ گُلِ تر اَور ہے

حُسنِ زنگار رنگ پر اُس کے ہے اِک عالم نثار — کرتا ہے اپنی طراوت اُس پہ ہر موسم نثار
چُومتی ہیں اُس کا مُنہ کرنیں، صبا ہر دم نثار — روز و شب ہوتے ہیں اُس پر گوہرِ شبنم نثار

صُبح ہوتے ہی نسیم آ کر سجاتی ہے اُسے
شام ہوتے ہی شفق غازہ لگاتی ہے اُسے

شان اُس کی ہے میانِ گلستاں کچھ اَور ہی — زُلفِ خُوباں میں دکھاتا ہے سماں کچھ اَور ہی
سیج پر پاتی ہے راحت اُس سے جاں کچھ اَور ہی — قبر پر ہے اُس سے کیفیت عیاں کچھ اَور ہی

آشکارا اُس سے ہے نیرنگِ عالم ہر جگہ

کام آتا ہے وہ بہرِ شادی و غم ہر جگہ

مجھ سے بھی خالی نہیں کوئی شبستاں کوئی گھر   مثلِ گُل ہر جشن میں میرا بھی ہوتا ہے گزر

رکھتا ہے ربط و محبت مجھ سے بھی ہر اک بشر   رب کو خوش کر دیتی ہے میری بھی خوشبو پھیل کر

سچ تو یہ ہے مشک بیزی ختم مجھ پر ہوگئی

میں جہاں روشن ہوئی محفل معطّر ہوگئی

ختم ہو قرآن کا یا ہو کسی کی فاتحہ   منعقد ہو مجلسِ میلاد یا بزمِ عزا

عقد کی محفل ہو یا جلسہ ہو کوئی عیش کا   زینت و رونق مجھی سے پاتی ہے ہر اِک سبھا

دُور دِیہاں سے مرے ظاہر عجب جلوے ہوئے

دَیر و مسجد ہیں مجھی سے رات دِن مہکے ہوئے

رات کو یا دوپہر کے وقت یا پچھلے پہر   چلتی ہو ٹھنڈی ہوا ساکت ہوں صحن و بام و در

آ رہی ہو نیند تجھ کو ہو ترا تکیے پہ سر   اور اُس دم جل رہی ہو عُود بتّی میز پر

دیکھ تو اُس وقت کیا ملتی ہے لذّت رُوح کو

کیسی دِل کو ہوتی ہے تسکین فرحت رُوح کو

پھر بھی کہتی ہوں، کُجا مَیں اور گُلِ رعنا کُجا   ہاں مگر اِک بات ہے سُنیئے توجہ سے ذرا

غُنچے ہنس کے کھل کے پہنچاتے ہیں خوشبو جا بجا   مَیں فقط جل جل کے جی خوش کرتی ہوں انسان کا

یُوں ہی گر انسان بھی مصروفِ دِل سوزی رہے

غیر ممکن ہے کہ پھر تکلیف میں کوئی رہے

میر سعادت حسین نجیب
حیدرآبادی

ادبِ عرب

اپنے دشمنوں سے

تم جذبات سے مغلوب کیوں ہو رہے ہو؟
تم کیوں اپنے قبیلے کو غلط راہ پر چلانا چاہتے ہو؟
تم اس ہولناک جنگ کو دوبارہ شروع کرنے پر کیوں مُصر ہو؟
جسے عرصہ ہُوا ہم بالکل بھُلا چکے ہیں!
یہ نہ سمجھو کہ صرف تمہیں غیظ و غضب کا مظاہرہ کر سکتے ہو
ہم بھی ایسا کرنے پر قادر ہیں
کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم تمہاری زیادتیوں کو خاموشی سے برداشت کرلیں گے؟
ہرگز نہیں! واللہ ہر جرم کا پورا پورا انتقام لیا جائے گا۔
پھر کیوں جذبات سے مغلوب ہو رہے ہو؟
کیوں قبائے امن کو پارہ پارہ کرنے پر تُلے بیٹھے ہو؟
سوچو!! احتیاط سے کام لو!!!
ہم اب بھی اپنے دشمنوں سے دوستی کے طلبگار نہیں۔
نہ ہمیں تم سے کسی نیکی کی توقع ہے۔
اللہ گواہ ہے کہ ہمیں تم سے قطعاً کوئی محبت نہیں
اور نہ ہمیں تم سے یہ گِلہ ہے کہ تم ہم سے کیوں نفرت کرتے ہو
ہر شخص کے احساسات جداگانہ ہیں
کوئی اپنے بھائی سے نفرت کرتا ہے کوئی محبت
خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہماری قسمت میں یہی لکھا
کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہیں۔

(فضل ابن العباس)

لیلیٰ سے

لیلیٰ! جب کبھی میں تم پر نگاہ ڈالتا ہوں
تو میرے متغیر رخسارے زرد ہوجاتے ہیں
اور اے حسین دوشیزہ! تمہارے چہرہ پر
سُرخی کی ایک لہر دَوڑ جاتی ہے

لیلیٰ! تمہیں اِس کا سبب بتاؤں
کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؛
خون کی جوئے رواں میرے دِل کو چھوڑ کر
تمہارے چہرے کا نقاب بن جاتی ہے

(خلیفہ رضی باللہ عباسی)

مئے رنگیں

کیا تُم میری کوتاہیوں کو کبھی معاف نہیں کرسکتے؛
کیا میں محض اس لئے تمہارے غضب کا شکار رہوں گا
کہ میں آبِ انگور کے دو گھونٹ پی چکا ہوں؛
تمہیں ہرگز یہ اُمید نہ رکھنی چاہئے
کہ تم اِس طرح مجھے شراب سے باز رکھ سکوگے۔
بلکہ اب تو مجھے ایک اَور عذر ہاتھ آگیا ہے۔
اَور اب میں ضرور پیوں گا۔
جامِ شراب کو ہاتھ میں لیتے وقت بے حد مسرّت ہوتی ہے۔
اسی طرح تمہیں غصہ میں دیکھنا بھی بڑا مسرت بخش منظر ہے
پہلے اپنے دل کے خوش کرنے کو پیوں گا
اور پھر صرف تمہیں غصہ دلانے کے لئے!

(یزید بن معاویہ)

حمید نظامی

منظور کے نام

آہ اے منظور! میرے دوست! کیا کرتا ہے تُو — لوگ آوارہ مجھے کہتے ہیں اَور ڈرتا ہے تُو

بادۂ گلگوں سے مَیں کرتا ہوں تجدیدِ حیات — اَور بسر کرتا ہے بے چینی سے تُو بستر پہ رات

جھُومتا ہوں مَیں نظر پڑتی ہے جس دم جام پر — تُو لہُو روتا ہے راتوں کو مرے انجام پر

جب ترے آگے مجھے کہتے ہیں رُسوائے شباب — کِس لئے لیتا ہے کروٹ تیری آنکھوں میں حجاب

ہَیں جوانی کو جلا دیتا ہُوں بہتی آگ سے — آہ کیوں سینے پہ تیرے لوٹتے ہیں ناگ سے

جب کسی ساقی کے پہلُو میں مجھے پاتا ہے تُو — بات کیا ہے کِس لئے کچھ سہم سا جاتا ہے تُو

آہ میرے دل کے کاشانے کے دیرینہ مکیں!
کیا سبب ہے کیوں مری راحت تجھے بھاتی نہیں؟

اِس غلام آباد میں کچھ روز جینے کے لئے — دوست! ہر خود دار ہے مجبور پینے کے لئے

جب کڑکتی ہیں فضا میں بجلیاں آلام کی — دیکھنا پڑتی ہے صُورت بادۂ گلفام کی

جب مصائب چُوسنے لگتے ہیں انساں کا لہُو — دَوڑتے ہیں پُرسشِ احوال کو جام و سبُو

قیصریّت کھیلنے لگتی ہے جب جذبات سے — دُخترِ رز روک دیتی ہے گلابی ہات سے

گِھر کے چھا جاتا ہے جب بادل غم و افکار کا — کام دیتی ہے شرابِ ارغواں غمخوار کا

زندگی سے جب بشر مایوس آتا ہے نظر — چھیڑتی ہے مَے شرابی راگ دِل کے ساز پر

زندگی اِک بار ہے اَے دوست! پینے دے مجھے
جب تلک زندہ ہُوں مَیں جینے دے مجھے

الطاف مشہدی

لندن کی ایک سیر

میں کچھ پریشان اور بے ربط سے خیالات بھیج رہا ہوں - یہ شائع ہونے کے لئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ میرے ایک خط کا حصہ ہیں جو میں نے اپنی بیگم کے نام لکھا تھا - نسیم رضوانی

کمرے میں اس قدر حبس کہ دم گھٹنے لگے - لیکن باہر پنجاب کے میدانوں کی سی گرمی نہیں - طبیعت کچھ بے چین اور ذہن پریشان - چائے پی اور سیر کے لئے نکل کھڑا ہوا - لوگ شہر سے باہر ہمارے مکان کے سامنے کے وسیع میدان اور جنگل میں سیر کرنے کے لئے آتے ہیں میں نے شہر کا رُخ کر لیا - جب طبیعت پریشان ہو تو ذہن کی نبض اُلٹی چلتی ہے - پٹنی ہل (یہ سڑک کا نام ہے کسی چٹان یا پہاڑی کا نام نہیں) کو طے کر کے ہائی اسٹریٹ میں پہنچا - بازار کی دو رویہ دُکانیں جمعرات کی وجہ سے دن کے نصفِ آخر کے لئے بند ہو چکی تھیں لیکن بازار میں بسوں ٹیکسیوں موٹر کاروں کا شور اور ہجوم بدستور تھا - پیومنٹ (بازار کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے پختہ راستے کو کہتے ہیں) پر ہجوم کاروباری دن سے بھی زیادہ تھا - لوگ فرصت کے اوقات میں بند دکانوں کی شیشہ دار کھڑکیوں سے جھانک کر اپنے مطلب کی چیزیں کسی موقع پر خریدنے کے لئے پسند کر رہے تھے (یہاں ہر ایک دُکان میں جس قدر چیزیں ہوتی ہیں اُن کا ایک ایک نمونہ دُکان کے سامنے کی کھڑکی میں رکھ دیتے ہیں - اس کھڑکی کے باہر کی طرف شفاف شیشہ لگا ہوتا ہے جس میں سے جھانک کر آپ چیز پسند کرتے ہیں اور اس کی قیمت جو اُس کے اُوپر ایک لیبل پر لگی ہوتی ہے پڑھ لیتے ہیں - دُکانیں بند ہوں تو بھی چیزیں نظر آتی رہتی ہیں بلکہ رات کو ان کھڑکیوں میں روشنی کر دی جاتی ہے) - میں بھی چند دُکانوں کے سامنے غیر ارادی طور پر رُکا اور چند چیزوں کی قیمت پڑھ کر آگے بڑھ گیا - ہائی سٹریٹ کے آخری سرے پر سنیما کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے - "یہ لوگ" بیشتر لڑکیوں پر مشتمل تھے، جو اپنے رفقا، رشتہ داروں یا دوستوں کا انتظار کر رہی تھیں اور اُن کے آنے پر سنیما کے اندر جا رہی تھیں سنیما سے ذرا آگے بازار ختم ہو جاتا ہے اور دریائے ٹیمز کا پُل آ جاتا ہے - اس پُل کو پٹنی برج (Putney Bridge) کہتے ہیں ٹیمز لندن کے شہر کے درمیان سے گزر رہا ہے اور شہر کے اندر اس پر تقریباً بارہ پُل ہیں - پٹنی برج آخری سے پہلا پُل ہے - میں بازار سے گزرتا ہوا پُل پر پہنچ گیا - اس وقت سُورج دفعتہً غروب ہو گیا اور خنک ہوا چلنے لگی - پُل کے دوسری طرف بشپس پارک (Bishop's Park) ہے - پُل سے نیچے اُتر کر میں باغ میں داخل ہو گیا - یہ باغ کئی فرلانگ تک دریا کے کنارے کنارے چلا جاتا ہے - چوڑائی میں کم ہے - جہاں تک باغ جاتا ہے دریا کے کنارے بہت اُونچے بند کے اُوپر ہموار سڑک بنی ہوئی ہے - اس سڑک پر دریا کی جانب آہنی کٹہرا حادثات کو روکنے کے لئے لگا ہوا ہے، کٹہرے پر جا بجا (Life Buoys) لائف بائے لکڑی کے ڈبوں میں لٹکے ہوئے ہیں تاکہ اگر کوئی آدمی دریا میں گر پڑے تو لائف بائے پھینک کر اُس کی جان بچا لی جائے -

باغ میں پہنچتے ہی بارش کے بڑے بڑے قطرے گرنے شروع ہو گئے - باغ میں سیر کرنے والے سب لوگ جلد جلد دروازے کی طرف بڑھنے

لگے کیونکہ وہاں زمین دوز گاڑی کے ایک پُل کے نیچے بارش سے پناہ مِل سکتی تھی۔ آناً فاناً سارا باغ خالی ہو گیا۔ مائیں بچوں کو سنبھالتی ہوئی تیزی سے پل کی طرف جا رہی تھیں۔ باپ کھانے کی ٹوکریاں، پھل کے لفافے اور ہینڈ بیگ، ہاتھ میں پکڑے ہوئے یا بغل میں دبائے ہوئے قدم بڑھا رہے تھے۔ یہاں چھٹی کے دن یا وقت لوگ اپنا کھانا وغیرہ لے کر بال بچوں کو ساتھ لئے قریب کے باغ میں چلے جاتے ہیں اور وہاں اخبار پڑھتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں، بچوں کو کھلاتے ہیں اور پھر کچھ دیر دھوپ میں سستا کر گھر چلے جاتے ہیں، میں بارش کے زیادہ ہونے کے باوجود آگے بڑھتا گیا۔ اتنے میں شدت سے بجلی کڑکنے لگی۔ لندن میں پہلی مرتبہ بجلی کی کڑک سُنی گئی۔ باغ میں طرح طرح کے پھول باغبانوں نے چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں مختلف طور پر لگا رکھے تھے۔ رنگوں کا ہجوم اور دلکش امتزاج پھول لگانے والوں کے حُسنِ ذوق کا گواہ تھا لیکن ہندوستانی مذاق کو ایک بات سے ضرور کوفت ہوتی ہے کہ صدہا پھولوں کے باوجود ذرا سی بُو بھی ہوا میں موجود نہ تھی۔ ہمارے ہاں جنگل میں بھی زرد رو پھول کسی نہ کسی طرح کی خوشبو سے ہوا کو مہکا دیتے ہیں لیکن یہاں یہ چیز مفقود ہے اور جب یہ خیال ذہن میں آیا تو معاً انار کا پھول اور اُس کے ساتھ یہ مصرع یاد آ گیا۔

ع در رنگِ آشنائی بُوئے وفا ندارد

لیکن اِس حقیقت کا اطلاق نہ صرف یہاں کے پھولوں پر کیا جا سکتا ہے بلکہ یہاں کے لوگوں پر بھی۔ کس طرح ایک دوسرے سے کھچے کھچے الگ الگ پھر رہے ہیں۔ کسی کو کسی سے غرض نہیں کئی سو آدمی بارش سے بھاگ کر پُل کے نیچے جمع ہیں لیکن مجمع پر موت کی سی خاموشی طاری ہے، کوئی کسی کو پہچانتا نہیں۔ کوئی کسی کو جانتا نہیں۔ اِن لوگوں میں کس قدر روح شکن سرد مہری اور بے مروّتی ہے۔ یہ دُنیا کس قدر تنہا اور تنہائی پسند ہے۔ برسوں ایک جگہ گھومتے رہو۔ برسوں ایک آدمی سے ملتے رہو لیکن سب کچھ روزِ اوّل کی طرح اجنبی ہوگا۔ بعض دفعہ بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے متین اور خاموش چہرے دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہتا ہے کہ ہندوستانیوں کی طرح ہر ایک مسافر سے ایک سانس میں یہ سوال پوچھ ڈالوں:۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کیوں جا رہے ہو؟"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"تم کیا کرتے (کرتی) ہو؟"

"کہاں رہتی (رہتے) ہو؟"

"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"باپ کیا کرتا ہے؟"

"ماں زندہ ہے؟"

"شادی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"کتنے بچے ہیں؟"

"کیا کرتے ہیں ؟"

"بڑے لڑکے کی شادی ابھی کی ہے یا نہیں ؟"

"اُس کے کتنے بچے ہیں ؟"

وعلیٰ ہذا القیاس ۔ ۔ ۔

پھر دوسرے لوگوں کو بالکل خاموش دیکھ کر ہمت ہی نہیں پڑتی ۔ اور اپنے سوالات جی ہی جی میں دُہرا کر خاموش ہو جاتا ہوں کبھی یہ خیال آتا ہے کہ بہت سے سوال تو اِن لوگوں سے پوچھے ہی نہیں جا سکتے ۔ مثلاً

"بالائی آمدنی کیا ہے ؟ گزارہ ہو جاتا ہے یا نہیں ؟"

(کیونکہ یہاں بالائی آمدنی ہوتی ہی نہیں)

"لڑکی کی شادی کی ہے یا نہیں ؟"

(کیونکہ یہاں ہر ایک لڑکی خود شادی کرتی ہے)

اور اسی طرح کے کئی اور ہندوستانی سوال پوچھنے کا یہاں موقع ہی نہیں ملتا ۔

باغ کی وہ طویل روش ختم ہو گئی جس پر میں چل رہا تھا ، اور اب میں دریا کے بند کے اوپر والی سڑک پر پہنچ گیا تھا ۔ یہاں سڑک پر جا بجا ڈیک چیئرز اور بنچ پڑے تھے ۔ میں ایک ڈیک چیئر پر دراز ہو گیا ۔ ساتھ والے بنچ پر ٹوپی اُتار کر رکھدی ۔ سامنے دریا کا وہ کنارہ نظر آ رہا تھا جہاں سے آکسفرڈ اور کیمبرج کی کشتیوں کی سالانہ دوڑ گرمیوں کے آغاز میں ہوتی ہے ۔ اُس وقت یہ کنارہ بالکل بے رونق تھا ۔ کبھی کبھی کوئی موٹر تیزی سے گزر جاتی ۔ کنارے کے ساتھ ساتھ کئی دُخانی کشتیاں بندھی ہوئی تھیں جو ہوا اور پانی کی جنبش سے ہچکولے کھا رہی تھیں ۔ سورج کے بادلوں کے پیچھے چلے جانے کی وجہ سے فضا تاریک سے تاریک تر ہوتی جا رہی تھی ۔ ایک مہیب سا سایہ لندن پر پھیلتا جا رہا تھا ۔ بجلی پھر زور سے کوندی اور میرے مقابل کی تمام عمارات ایک ثانیے کے لئے روشن ہو کر پھر تاریک ہو گئیں ۔ میرے سر کے اُوپر سڑک کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے درخت ہوا کی شدت سے جھک جھک کر زمین تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھے ۔ خزاں کو لبیک کہنے والے خشک پتے سڑک پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ گھوم رہے تھے ۔ بجلی کڑک رہی تھی لیکن ہندوستان کے بادلوں کی طرح یہاں کے بادل آسمان پر متحرک نہ تھے ۔ آسمان کے چہرے پر ایک غم انگیز خشونت تھی جس کو دیکھ کر مجھے باغ کے پھول پھر یاد آ گئے ۔ یہاں کی ہر ایک چیز پر تصنع کا رنگ غالب ہے ۔ پھولوں میں خوشبو نہیں ۔ بارش ہوتی ہے لیکن بادل اُمنڈ اُمنڈ کر نہیں آتے ۔ لڑکیاں بن سنور کر دلکش لباس سے لوگوں کا دل لبھانے میں مصروف رہتی ہیں لیکن ان کا نقطۂ نظر صرف تاجرانہ ہے ۔ انسان نہایت متین اور با تمیز ہیں لیکن دلی تپاک سے آشنا تک نہیں ۔ ہر طرف خوشی کی لہر نظر آتی ہے لیکن یہاں کے ہنگامے کے ساز کے سب اندرونی تار اُس سوز سے لبریز ہیں جو دُنیا کے سامنے نہیں آ سکتا ۔ ان لوگوں کے ہونٹوں پر ہر وقت تبسم ہے لیکن انہیں اس قدر مسرت کبھی مہیا نہیں ہوتی کہ یہ بے اختیار

ہو کر قہقہے لگا سکیں۔

بارش کے جو چند قطرے پڑ رہے تھے وہ تھم گئے۔ بجلی کی کڑک ختم ہو گئی، دریا میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ چند بار برداری کی کشتیاں یکے بعد دیگرے چوڑی کشتیوں (Tugs) پر سامان لادے ہوئے گزریں۔ اُن کی تیزی سے حرکت کرنے والے پنکھوں سے ایک دلچسپ اور لطیف سا شور کچھ عرصے تک مجھے سُنائی دیتا اور پھر اُن کے دُور چلے جانے سے دریا پر خاموشی چھا جاتی۔ اِن کشتیوں کے بعد مسافروں والی موٹر لانچ گزری۔ اِس کشتی پر سیر کرنے والے لوگ دریا کی سیر کر رہے تھے۔ کوئی شخص کتاب پڑھ رہا تھا، کوئی لڑکی اُون سے کچھ بُن رہی تھی اور کچھ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ہوئے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اِن لوگوں کی عجیب زندگی ہے۔ مسرت جہاں سے بھی اُچک سکیں، اُچک لیتے ہیں۔ آج آدھے دن کی تعطیل ہے تو دریا کی سیر کو چل نکلے۔ دریا ہے کہ ہماری نہروں کے برابر بھی پُرشور نہیں۔ سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح ہموار بہہ رہا ہے۔ اس کے سینے پر کروڑوں پونڈ کی بار برداری کا کاروبار ہفتے میں ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ذرا جوش میں نہیں آتا۔ ہمارے ہاں دریا ہیں تو جوش میں آ کر ہزاروں گاؤں بہا لے جاتے ہیں۔ ہماری رعایا پرور حکومت کے ماتھے پر شکن تک نہیں پڑتی۔ کل ہی اخبار میں درج تھا کہ دس ہزار گاؤں ایک دریا بہا کر لے گیا ہے اور مظلوم ہندوستانی ریلوے کی گاڑیوں میں بادو باراں سے پناہ لینے کے لئے سٹیشنوں پر آ گئے ہیں۔ دریا پر جوش نہ ہو تو بھی ہم کب اُن سے کام لیتے ہیں۔ راوی لاہور سے بالکل قریب ہے لیکن آج تک راوی کا کوئی پختہ گھاٹ نہیں بن سکا۔ یہاں دریا کے دونوں طرف میلوں تک لمبا گھاٹ بنا ہوا ہے۔ بلکہ شہر کے جتنے حصے میں سے دریا بہہ رہا ہے وہاں گھاٹ ہی گھاٹ ہے۔ تاجرانہ کاروبار کے علاوہ ہزاروں طرح کی دلچسپیوں کے سامان اِس ایک دریا سے لندن والوں نے بہم پہنچائے ہیں۔ جگہ جگہ سیر کرنے والوں کے لئے کشتیاں ہیں۔ نہانے کے لئے مختلف جگہوں پر گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔

(London Casino) لندن کیسینو ایسی عشرت گاہ ہے جہاں سرِ شام ہنگامہ شروع ہو کر صبح تک ختم نہیں ہوتا۔ یہ عشرت گاہ دریا کے کنارے بنائی گئی ہے جہاں لوگ رقص کرنے، تماشے دیکھنے اور شراب پینے کے لئے جاتے ہیں۔ الغرض ہم لوگوں نے ممکن فائدے بھی اپنے دریاؤں سے حاصل نہیں کئے۔

اب شام کی تاریکی بڑھ رہی تھی۔ پُل کے اُوپر کی سُرخ بتّیاں کشتیوں کی ہدایت کے لئے روشن ہو چکی تھیں۔ میں دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا باغ سے باہر نکل آیا۔ پُل پر آ کر یہ خیال آیا کہ ہندوستانی اگر یہ سب کچھ کرنا بھی چاہیں تو روپیہ کہاں سے لائیں۔ وہ سالانہ دس لاکھ پونڈ تو صرف "ٹامیوں" کو اپنے ملک کی حفاظت کے لئے دیتے ہیں۔ وہ یہ سامانِ عشرت کہاں سے مہیا کریں۔ اور اگر ٹامیوں کو روپیہ نہ دیں تو ملک کی حفاظت کون کرے۔

بہر حال اِن خیالات سے پریشانی ہوتی ہے، اور سیر کا لطف جاتا رہتا ہے۔ لہٰذا اِن پر غور نہ کرنا چاہئے۔

(لندن ۱۱ اگست ۱۹۳۸ء)

محمد باقر

تقاضائے فطرت

حافظ کے فلسفہ پر ایماں نہیں ہمارا
مقصد بظاہر اس کا ہے گرچہ پیارا پیارا

ہے مادی ترقی فی الحال رُوح پرور
ارواح ہی کا ہم کو کافی نہیں سہارا

چھ سو برس اُدھر کی دُہرائے کون باتیں
ہے دُشمنِ قدامت احساس جدت آرا

جب سے کہ ہوچکا ہے بے نُور "دیدۂ دل"
کرتے ہیں "چشم سر" سے ماحول کا نظارا

پی کر شراب عرفاں پہلے بھی مست تھے ہم
بدمست کردیا ہے شمپین نے دوبارا

دیتی نہیں ہے فطرت درسِ عدو نوازی
عاقل ہے وہ جو سمجھے فطرت کا ہر اشارا

دیکھیں گے اب عدو کو ہم بھی عدو سمجھ کر
چمکے گا اب ہماری قسمت کا بھی ستارا

وُہ بندگی بھی رخصت بے چارگی بھی رخصت
ممکن نہیں کہ ہو اب دُشمن سے بھائی چارا

چادر مشین گن کی اوڑھی نہ جاسکے گی
دامانِ عہد و پیماں کردیں گے پارہ پارا

کھویا ہے پہلے جو کچھ پائیں گے اُس سے بڑھکر
ہوگا مُفیدِ ملت بے شُبہ وُہ خسارا

مجبورِ فطرت انساں مختار فطرۃً ہے
حافظ کی رہ سے اب ہم کرتے ہیں کچھ کنارا

بادوستاں تلطف ـــــ اس میں ہے کیا تکلف
بادُشمناں مدارا ـــــ یہ تو نہیں گوارا

علی منظور

اَوراقِ پارینہ

بہادر شاہ ظفرؒ کا خط لارڈ کرزن کے نام

سنہ ۱۹۰۳ء کے اخیر میں انجمنِ حمایت اسلام لاہور کے ایک سفیر مولوی عبدالسلام صاحب رنگون گئے۔ اور وہاں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؒ کے مزار کی خستہ حالت دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے عالمِ خیال میں بہادر شاہ ظفرؒ کی طرف سے لارڈ کرزن کے نام جو اُس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے ایک نہایت دردناک خط لکھا۔

یہ خط "زمیندار" مورخہ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کے اخیر میں ایڈیٹر صاحب نے شہنشاہ مرحوم سے مخاطب ہو کر یہ دلچسپ درس آموز نوٹ لکھا تھا:-

"جہاں پناہ، بادشاہ سلامت! حضور جہاں ہیں چپکے پڑے رہیں۔ کہیں ہز ایکسیلنسی لارڈ کرزن کو آپ کی درخواست کی خبر نہ پہنچ جائے!" (ح-۵)

خط یہ ہے:-

"پیارے کرزن!

مجھے اس بات کا گلہ نہیں کہ مجھ سے سلطنت چھن گئی۔ کیونکہ مجھے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اس بات پر کامل یقین ہے کہ خداوند کریم کسی قوم کو برباد نہیں کرتا جب تک وُہ اپنے ہاتھوں سے خود برباد نہ ہو۔ ہم نے اپنی حالت کو خراب کیا۔ رعایا کی خبرگیری سے غافل ہوئے عیش و عشرت میں پڑ گئے ہم میں حکمرانی کے جوہر نہ رہے۔ اس لئے مناسب تھا کہ ہمارے بجائے کسی اور کو ہند کی حکومت دی جائے۔ پس اس کا مستحق سوائے تمہارے اور کون تھا۔ کیونکہ تم لوگوں میں انصاف کا مادہ ابھی تک موجود ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تمہارا عمل بجا آیا۔ باستحقاق آیا۔ برمحل آیا۔

"پیارے کرزن! تم اس وقت میری جگہ ہندوستان کے حکمران ہو اس لئے میری شکایت تمہارے سوا اور کس سے ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنی اولاد سے شکایت ہوتی اگر ان میں اختیار ہوتا۔ مگر اُن میں علاوہ دسترس کے اتنا احساس بھی نہیں ہے۔

"میں نے جو جو مصائب سہے تم کو یاد ہوں گے۔ غدر کے حالات میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان سب معاملات میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ مگر جو بات ہونی تھی وہ ہو گئی۔ اب اُس کا دُہرانا گڑے مُردے اُکھاڑنا ہے۔

"مجھے گلہ اس بات کا ہے کہ میرے مرنے کے بعد بھی مجھ سے بہتر سلوک نہ کیا گیا۔ میری قبر کا نشان تک باقی نہیں معمولی مقابر پر بھی ایک

پتھر لگا رہتا ہے مگر میری قبر کا یہ حال ہے کہ پتہ ہی نہیں ۔ اس وقت میری قبر ایک کوٹھی کے احاطے میں ہے ۔ کرایہ دار نے عین میری قبر پر ٹینس کھیلنے کا میدان بنایا ہے ۔ بیری کا درخت جو میرا غمگسار ہے ۔ میرے دفن کرنے کے وقت سے اب تک بوڑھا ہو چلا ہے ۔ مجھے یہ خیال نہیں کہ کیوں نہ میرا نشان رہے ؛ میں تو مر چکا ۔ مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ اگر میرا نشان ہوتا تو کسی وقت میری بدنصیب اولاد ضرور دیکھنے کو آتی جس سے میری روح کو کچھ تسکین ہوتی ۔

"جب تم وائسرائے ہو کر آئے تو مجھے ایک قسم کی خوشی ہوئی تھی ۔ کیونکہ تم کو پرانی عمارات کے قائم رکھنے اور گزشتہ سلاطین کے مقابر کے درست کرنے کا خصوصاً شوق ہے ۔

"پیارے کرزن ! ایک عرصہ تو میں اس انتظار میں تھا کہ تم برما آؤ گے تو مجھے ضرور دیکھو گے ۔ اور جب دیکھو گے تو میرا اس حالت میں رہنا ہرگز پسند نہ کرو گے ، مگر خلافِ اُمید واقعہ ہوا ۔ تم ۱۹۰۱ء میں یہاں آئے ۔ برما کی سیر کی ۔ مگر بھولے سے بھی اتنا خیال نہ آیا کہ مجھ کو دیکھو ۔

"پھر دھوم دھام سے دربار دہلی کی تیاری شروع ہوئی ۔ میرا خیال تھا کہ جب تم دہلی کی شان و شوکت دیکھو گے اور گزشتہ واقعات یاد کرو گے تو ضرور ہے کہ تمہارا خیال میری طرف ہو ۔ کیونکہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ میں اس تخت کا مالک تھا ۔

"پیارے کرزن ! دربار ہو گیا ۔ اور بڑی دھوم دھام سے ہوا ۔ مگر مجھ بدنصیب کا کسی کو خیال نہ آیا ۔ اب تمہارے جانے کی خبر سُن کر مجھے رنج ہوا تھا کہ معلوم نہیں آئندہ وائسرائے ایسے خیال کا ہو یا نہ ۔ یہ سُن کر کہ تم اور بھی دو سال رہو گے ۔ اُمید قائم ہوئی ۔ کیا تعجب ہے کہ مجھ بدنصیب پر توجہ ہو !

"پیارے کرزن ! تم جا رہے تھے ۔ جاتے جاتے تم کو دو سال اور مل گئے ۔ تم اپنی یادگار میں میری قبر درست کرا دو ۔ اور اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے گرداگرد ایک جنگلہ دس بیس روپے کے خرچ سے بنوا دو ۔ تاکہ میرا نشان قائم رہے اور تمہارا نام باقی !"

تمہارا ترقی خواہ

بہادر شاہ ظفر سابق شاہِ دہلی ۔ حال وارد قبر ۔ رنگون

(زمیندار ۔ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء)

حفیظ ہوشیارپوری

احمد نے فخریہ لہجہ میں کہا "پویا خوب چلتا ہے۔"

گاڑی اور لاری میں بیٹھے بیٹھے میرے اعضا شل ہو رہے تھے۔ مَیں نے گھوڑے کو تھپکی دی اور پویا پر ڈال دیا۔ واقعی بڑا سبک عنان گھوڑا تھا۔ میں نے آگے نکل کر ادھر اُدھر دلی مسرت اور اطمینان کی نگاہ ڈالی۔ چاروں طرف گیہوں اور چنے کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ پودوں کا رنگ اب پیلا پڑ گیا تھا اور بالیں دانوں سے بھر گئی تھیں۔ نیلے آسمان کے کنارے جھک کر پہاڑ کی چوٹیوں کو چوم رہے تھے۔ دُور کسی کیکر کی ٹہنیوں سے ایک اُداس فاختہ کی کو کو سنائی دے رہی تھی۔ ان مناظر سے متاثر ہو کر مَیں نے باگ کھینچ لی۔ گھوڑا ایکدم ٹھہر گیا اور اٹھلا اٹھلا کر قدم اُٹھانے لگا۔ راستہ میں کسانوں نے ہل جوت رکھے تھے۔ اینٹوں کے آوے کے پاس ایک چرواہا لکڑی کی ٹیک لگا کر کھڑا پنجابی کا کوئی گیت الاپ رہا تھا۔ دیہاتی عورتیں سر پر روٹی اور چھاچھ کے برتن اُٹھائے کھیتوں کی طرف جا رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد خیر پور کا گاؤں دکھائی دینے لگا۔ درختوں کے جھنڈ میں کسانوں کے کچے مکانوں کی دیواریں نظر پڑنے لگیں۔ مغرب کی جانب خانقاہ کے پاس چھوٹے چھوٹے میلے کچیلے خیمے لگے ہوئے تھے جو خانہ بدوشوں کے معلوم ہوتے تھے۔ قریب جا کر میں نے رومال سے ہاتھوں اور چہرے سے گرد جھاڑی اور بڑی تمکنت سے دُرست ہو کر بیٹھا۔ جب مجھے خالہ صاحبہ کے باغیچے کے گھنے پیڑ دکھائی دیئے تو میرے دل میں مسرت کی لہر دَوڑ گئی۔ مَیں ایک سال کے بعد خالہ صاحبہ سے ملنے کے لئے آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ننھا مبارک مجھے دیکھ کر بھاگا بھاگا آئے گا اور میری ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ خالہ صاحبہ کیسے اشتیاق کے ساتھ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ انہی خیالات میں مستغرق مَیں خانقاہ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ یکایک بائیں طرف ایک جھاڑی میں سے ایک بڑا خوفناک کتا بھونکتا ہوا میری طرف لپکا۔ گھوڑا اسے دیکھ کر بھڑکا اور لوکھلا کر سرپٹ ایک پگڈنڈی پر بھاگا۔ بدحواسی کے عالم میں میری پگڑی زمین پر گر پڑی اور مَیں بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچا۔ دہشت اور گھبراہٹ سے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بڑی کوشش سے گھوڑے کو چمکار کر اور دلاسا دے کر سنبھالا اور واپس موڑا مجھے اس کتے کے مالک پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ ایسے خطرناک جانور کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ جب واپس راستے پر پہنچا تو دیکھا کہ سر سے پاؤں تک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی ایک خانہ بدوش عورت کھڑی کتے کو ڈانٹ رہی تھی۔ مَیں قریب آیا تو اُس نے ہاتھ بڑھا کر پگڑی مجھے دی۔ میں نے پگڑی تھامتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی پیشانی اور ٹھوڑی چادر سے چھپا رکھی تھی مگر اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آغازِ شباب کی شوخی جھلک رہی تھی۔ میں نے ذرا سختی سے کہا "یہ کتا کس کا ہے؟"

ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ وہ میری زبان نہ سمجھ سکے گی مگر اس نے نہایت سادگی اور بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھا اور جواب دیا "میرا ہے۔"

ان الفاظ میں ایسا لوچ اور بیساختہ پن تھا کہ مَیں اپنے درشت لہجہ پر پچھتانے لگا اور مسکرا کر کہا "اسے باندھ کر رکھا کرو نا!"

وہ کچھ جواب دینا چاہتی تھی مگر مجھے متبسم دیکھ کر محجوب سی ہو گئی اور جلدی سے واپس چلی گئی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ دُور جا کر میں نے واپس مڑ کر دیکھا، وہ اپنے ریوڑ کی طرف جا رہی تھی۔ سیاہ چادر سے اس کا گورا گورا ہاتھ نمایاں ہو رہا تھا۔ مَیں گلی کے نکڑ پر نمودار ہوا تو مبارک نے مجھے دیکھ لیا اور "بھائی جان! بھائی جان!" چلاتا ہوا میری طرف دوڑا۔ وہ گیارہ سال کا خوبصورت اور تندرست لڑکا تھا۔ مَیں گھوڑے سے اُترا اور اُسے گلے لگا کر

خوب کھینچا۔ گھوڑے کو ایک ہمسائے دیہاتی کے سپرد کر کے جو مجھے دیکھ کر باہر نکل آیا تھا، ہم گھر چلے گئے۔

صبح کو عادت کے موافق میری آنکھ بہت سویرے کھل گئی۔ گھر والے ابھی پڑے سوتے تھے۔ مَیں سیر کی خاطر باہر نکل آیا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے فرحت بخش جھونکے دل میں اُمنگیں پیدا کرتے تھے۔ مَیں باغیچہ کے کنویں کے پاس سے گزرتا ہُوا پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ گاؤں پر خاموشی محیط تھی۔ ہاں گنوار عورتوں کے چکی پیسنے اور چھاچھ بلونے کی مسلسل اور ہم آہنگ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں کُتّے بھونکنے لگتے تھے۔ میں زیادہ دُور تک نہیں گیا۔ واپس آیا تو شفق کی سُرخی نمودار ہوگئی تھی۔ راستہ میں مجھے کسان ملے جو بیلوں کو لئے کھیتوں پر جا رہے تھے۔ بعض باسی روٹی کے ٹکڑوں پر مکھن رکھے ہوئے تھے اور اُسے بڑی رغبت سے کھا رہے تھے۔ جب کوئی بَیل راستہ سے اِدھر اُدھر مڑنے لگتا تو وہ لپک کر اس کے پیچھے بھاگتے اور چلا چلا کر گالیاں دیتے۔ ہمارے دروازے سے تین دیہاتی عورتیں سروں پر پانی سے بھرے ہوئے گھڑے اُٹھائے باہر نکلیں اور باتیں کرتی ہوئی اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ میں جلدی جلدی قدم اُٹھاتا اندر داخل ہُوا اور درختوں کے درمیان سے ہو کر اپنے کمرے کو جانے لگا۔ راستہ میں چنبیلی کا ایک گھنا اور سرسبز پودا پھولوں سے لدا کھڑا تھا۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس کے قریب جا کر سر سے ٹوپی اُتاری اور پھول توڑ توڑ کر اس میں ڈالنے لگا۔ مَیں اسی شغل میں مصروف تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہی کل والی خانہ بدوش لڑکی کندھے پر مشکیزہ لٹکائے کنویں کی طرف آ رہی تھی۔ اُسے میرے پاس سے ہو کر گزرنا تھا۔ پہلے تو مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اس کو دیکھ کر میرے دِل میں اس سے باتیں کرنے کی ناقابلِ ضبط خواہش پیدا ہوئی۔ میں حیران تھا کہ پہلے اُسے کس طرح مخاطب کروں مگر جب میرے سامنے سے گزرنے لگی تو بے اختیار میرے مُنہ سے نکل گیا "تم لوگ کب سے یہاں آئے ہو؟"

میرا خیال تھا کہ وُہ چپ چاپ گزر جائے گی مگر ذرا آگے بڑھ کر وُہ ٹھہر گئی اور معصومانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر جواب دیا "تین دن سے"

مَیں نے پُرشوق لہجہ میں پُوچھا "کتنا عرصہ یہاں ٹھہرو گے؟"

اُس نے اپنے مخصوص اختصار کے ساتھ جواب دیا "خبر نہیں"

اُس کی آواز بڑی شیریں تھی۔ میں نے گفتگو کے سلسلے کو طُول دینے کے لئے کہا "تمہارا وطن کہاں ہے؟"

اُس نے کنویں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "غزنیں"

دورانِ گفتگو میں میری نگاہیں برابر اس کے چہرے پر گڑی رہیں۔ پہلے تو وہ مجھ سے آنکھیں ملا کر باتیں کرتی رہی مگر پھر اس کے چہرے پر اضطراب کی علامات نمایاں ہوگئیں۔ مَیں نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا:

"تم ہر سال اس ملک میں چلے آتے ہو؟"

اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں"

مَیں نے پوچھا "اپنا وطن کیوں چھوڑ آئے ہو؟"

جواب دینے کے لئے اُس نے سر اُٹھایا مگر مجھ سے آنکھیں ملتے ہی گھبرا کر پیچھے ہٹی اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا جب وُہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو وہاں سے ہٹ کر ایک جامن کے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا تاکہ اُسے واپس گزرتے ہوئے دیکھ سکوں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وُہ پشت پر مشکیزہ اُٹھائے ہوئے واپس آتی دکھائی دی۔ بوجھ سے اس کا سر جھک گیا تھا اِس لئے وُہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھی باہر چلی گئی۔

~~~~~

سارا دن مبارک کے ساتھ ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ کبھی وقت مطالعہ کے لئے کوئی کتاب اُٹھا لیتا مگر بغیر ایک سطر پڑھے پھر رکھ دیتا۔ یہاں کی فضا ہی کچھ ایسی نشیلی تھی کہ بس ہر وقت گھاس پر لیٹ کر نیلگوں آسمان کی طرف دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ شہر میں بھاگتے دوڑتے ہی دن گزر جاتا ہے مگر دیہات میں ایک ایک لمحہ سے لُطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ یہاں وقت کی برق رفتار بھی سُست پڑ جاتی ہے یہاں اس جگہ آنے پر دل ہی دل میں مسرور ہو رہا تھا۔ مبارک کی صُحبت میں اپنے تمام مصنوعی وقار اور وضعداری کو بھول گیا۔ بچوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتا، درختوں میں آنکھ مچولی کھیلتا اور خوب زور زور سے قہقہے لگاتا۔ میری آمد کی خبر سن کر آج خالو کے چھوٹے بھائی جعفر صاحب آئے۔ دیر تک بیٹھے رہے جاتے جاتے کہہ گئے کہ پرسوں دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں ہوگا۔

شام کے قریب میں ٹہلتا ہوا پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ دُھوپ پیلی پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی گھاٹیوں میں گیدڑوں کے چلّانے کی آوازیں آتی تھیں۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر گاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ دن بھر چرنے کے بعد تھکے ہوئے چارپائے سر جھکائے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ خانہ بدوش پٹھانوں نے خیموں کے سامنے آگ جلا رکھی تھی جس کا دھواں ہوا ساکن ہونے کے باعث سیدھا آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ چند عورتیں گرم سلوں پر روٹیاں پکا رہی تھیں۔ ایک آدمی اونٹوں کو بٹھا کر اُن کے گھٹنے باندھ رہا تھا اور وُہ بلبلا رہے تھے۔ میں دیر تک اس ڈیرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ جب واپس آنے کے لئے اُٹھا تو آسمان پر ستارے ٹمٹمانے لگے تھے۔

میں گھر پہنچ کر کھانا کھاتے ہی بستر پر دراز ہوگیا۔ مگر کوشش کے باوجود آدھی رات تک نیند نہ آئی۔ آنکھیں خشک ہوگئی تھیں۔ کئی دفعہ اپنے آپ کو یقین دِلایا کہ سو رہا ہوں۔ ایک بار مَیں نے اپنے آپ کو چنبیلی کے پودے کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہی صبیح چہرے والی لڑکی میری طرف آ رہی تھی۔ مَیں دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا مگر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں سمجھا خواب دیکھ رہا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہُوا کہ میں جاگ رہا تھا اور میری آنکھیں چھت پر لگی تھیں۔ باہر تیز ہوا درختوں میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔

~~~~~

مَیں بیدار ہُوا تو صبح کا نورانی دھندلکا کمرے میں پھیلا ہُوا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ آسمان پر بادل چھایا ہُوا تھا جس کے کناروں پر شفق نے گلابی گوٹ لگا رکھی تھی۔ میں جلدی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ سیر کا وقت گزر چکا تھا اِس لئے درختوں کی قطاروں کے درمیان راستہ پر ٹہلنے لگا۔ خلافِ معمول کم سونے کے باعث میری آنکھوں میں ابھی نیند کا خمار باقی تھا اور طبیعت پریشان

تھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ ایک دفعہ یونہی میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو مجھے سیاہ چادر کی جھلک دکھائی دی۔ وہ آرہی تھی۔

وہ ایک سادہ مزاج صحرانورد لڑکی تھی مگر میں نے اس سے کہنے کے لئے دل میں بڑے شاعرانہ اور تعشق آمیز جملے سوچ رکھے تھے۔ رات کا بیشتر حصہ انہی خیالات میں کٹا تھا کہ صبح اس سے لباس کے متعلق کوئی ایسا مزاحیہ فقرہ کہوں گا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑے گی یا اس کے حسن کی تعریف ایسے لطیف پیرائے میں کروں گا کہ وہ میرے الفاظ میں محبت کی بو پالے گی۔ اس کو متبسم دیکھنے کے تصور میں میں پہروں خود مسکراتا رہا جب قریب آکر اس نے انداز بیگانگی سے میری طرف دیکھا تو میری زبان بند ہوگئی۔ میں اپنی جگہ بُت بنا آرزو اور شوق کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا جیسے ایک مسحور چڑیا ناگ کی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ وہ میرے سامنے سے گزر چلی تھی کہ میں بغیر سوچے سمجھے بول اُٹھا:-

"بات تو سنو" وہ اپنی جگہ ٹھہر گئی۔ اس کے چہرے پر نرمی اور ملائمت کے آثار تھے۔

میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا "زلیخا"

میں نے جوشیلے لہجہ میں کہا "زلیخا! تم سچ مچ زلیخا ہو!" یہ سُن کر اس کے رخسارے تمتما اُٹھے اور اس نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں۔ میں نے اسے گھبراہٹ سے نجات دلانے کے لئے پوچھا "تم پہلے بھی قافلہ کے ساتھ آیا کرتی تھیں" وہ خود میرے پچھلے فقرے کو بھلا دینا چاہتی تھی اس نے مجھ سے آنکھیں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہاں"

اس کے گلاب کی پتی کی طرح نازک ہونٹ اور نم آلود مست آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے رات کے مرتب کئے ہوئے فقرے یاد آنے لگے۔ میں نے اس کی نیم باز آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم جانتی ہو کہ یہاں ہر صبح ایک شخص تمہارے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے"۔

اس نے ایک نظر میرے چہرے کی طرف دیکھا جو یقیناً اس وقت زرد اور اُداس تھا۔ میں نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔ "کیا تمہیں بھی کبھی اس کا خیال آیا ہے" یہ سُن کر وہ بغیر جواب دیئے آگے بڑھ گئی۔ میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا کہ اس کو میری باتیں ضرور ناگوار گزری ہوں گی۔ میں اُمید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ واپس بھی آگئی اور سامنے دیکھتی ہوئی گزر گئی۔ میں بد دل سا ہو کر گھر کی طرف جانے لگا تھا کہ وہ دروازے کے پاس جا کر ٹھہری اور مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ میری نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھپٹ کر باہر نکل گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر کیوں دیکھا تھا۔ شاید وہ میرے الفاظ سے متاثر ہوگئی تھی یا تعجب کر رہی تھی کہ یہ شخص دیوانوں کی طرح میری طرف کیوں گھور گھور کر دیکھتا ہے۔

آسمان پر چاروں طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی مگر آج مجھے جعفر صاحب کے ہاں کھانے پر پہنچنا از بس ضروری تھا۔ اُن کا گاؤں وہاں سے کم و بیش تین میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے کہا بھی کہ آدمی بھیج کر اطلاع دے دوں کہ آج موسم خراب ہے پھر کسی دن حاضر ہوں گا مگر خالہ صاحبہ نے کہا کہ اس تعلق کے رشتہ دار بہت حساس ہوتے ہیں اگر تم وقت مقررہ پر نہ پہنچے تو اُن کو بڑا رنج ہوگا۔ یہ سُن کر میں نے گھوڑے

پر زین کسوائی اور احمد کو ساتھ لے کر چل دیا۔ ہر طرف ایک پُر اسرار سکوت چھایا ہوا تھا جس میں رہٹ کی رُوں رُوں اور ہوا کی سرسراہٹ گھُل مل گئی تھی۔ خانقاہ کے پاس پٹھانوں کی بکریاں جھاڑیوں کے ساتھ لگی ہوئی پتے کھا رہی تھیں۔ دو خانہ بدوش عورتیں کیکر کے ایک پُرانے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی رسّیاں بٹ رہی تھیں۔ راستہ میں ہمارے ایک پڑوسی نے ہل جوت رکھا تھا۔ اس کا بھائی کھیت کے کونے پہ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ہم پگڈنڈیوں پر اِدھر اُدھر مڑتے ہوئے دوپہر کو چک خالق جا پہنچے۔ جعفر صاحب اپنے مکان کے سامنے سرس کے ایک درخت تلے کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے اور اندر لے گئے۔ کھانا تیار تھا۔ کہنے لگے "ہم دیہات کے رہنے والے آپ کی کیا تواضع کر سکتے ہیں؟ جو کچھ یہاں میسر ہو سکتا تھا حاضر کر دیا ہے"۔ میں نے کہا "صاحب! ہم آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ شہر میں خالص دُودھ اور گھی دو چیزیں نایاب ہو گئی ہیں"۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ گفتگو محض رسمی تھی، ورنہ کھانے کا بڑا پُر تکلف انتظام کیا گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے احمد کو واپس بھیج دیا کیونکہ اسے گائے بھینسوں کے لئے چارے کا انتظام کرنا تھا۔ میں تقریباً دو گھنٹے اُن کے پاس بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ رخصت ہونے کے لئے اُٹھا تو اُنھوں نے بڑا اصرار کیا کہ آج رات یہیں بسر کیجئے۔ بادل چھا رہا ہے بارش ہونے لگی تو راستے میں تکلیف ہو گی۔ مگر میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور گھوڑے کا رُخ پھیر لیا۔ ڈیڑھ میل بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ دفعتہً پہاڑ پر اس زور سے بادل گرجا کہ میرا دل دہل گیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو بادلوں کے تاریک ٹکڑے درختوں کی چوٹیوں پر جھکے پڑتے تھے۔ جلد ہی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ میں نے گھبرا کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سرپٹ ڈال دیا۔ میرا خیال تھا کہ اسی بوندا باندی میں گھر پہنچ جاؤں گا مگر خانقاہ سے آدھ میل کے فاصلے پر ہوں گا کہ مینہ کی چادر نے جو پہاڑ کی طرف سے بڑھتی چلی آ رہی تھی مجھے لپیٹ لیا۔ پہلے سامنے کا گاؤں اور پھر پاس کے درخت بھی نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ بڑی دھواں دھار بارش ہونے لگی۔ گھوڑا پگڈنڈی سے بھٹک کر کئی دفعہ نرم زمین میں کھب کھب گیا۔ یہ دیکھ کر میں نے باگ کھینچ لی تاکہ گھوڑا کہیں خندق میں نہ کھا جائے۔ میرے کپڑے پانی میں شرابور ہو رہے تھے اور مینہ کی بوچھاڑ مُنہ پر طمانچے لگا رہی تھی مگر میں نے عزم کر لیا تھا کہ گھر جا کر ہی دم لُوں گا۔ اتنے میں پھر بادل گرجا اور کڑکے کے ساتھ ہی اولے پڑنے لگے۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ خوف و دہشت سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بائیں طرف کیکر کا ایک بلند اور گھنا درخت نظر آیا۔ میں نے گھوڑا دوڑا کر اس کے نیچے پناہ لی مگر اس بھاگ دوڑ میں ایک موٹا سا اولہ اس زور سے میرے داہنے کان پر لگا کہ اس جگہ سخت جلن ہونے لگی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ تنے سے ٹیک لگا کر وہ خانہ بدوش لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ درخت کے نیچے پندرہ بیس بکریاں ایک دوسری کے ساتھ مل کر کھڑی ہوئی کانپ رہی تھیں۔ زلیخا نے اپنی بھیگی ہوئی چادر خوب احتیاط سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ مجھے اس حالت میں آتے ہوئے دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا "تم یہاں کہاں"

اُس نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر طوفان انگیز بارش کی طرف دیکھا جس کے چھینٹے درخت کے گنجان ہونے کے باوجود ہم تک پہنچ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے سے اُتر کر لگام کو ایک ٹہنی میں اڑس دیا اور سمٹ سمٹا کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ سردی کی وجہ سے اس کا سارا بدن کپکپا رہا تھا اور چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کے نازک گالوں پر بارش کے قطرے آبدار موتیوں کی طرح لڑھک رہے تھے۔ سُرمئیں آنکھوں پر اضطراری

کیفیت نمایاں تھی۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑنے کے لئے کہا۔

"تم کانپ رہی ہو"

اس نے آہستہ سے جواب دیا "سردی جو ہے"

بارش کا پانی پتوں میں سے ہو کر ہم پر ٹپک رہا تھا جس سے ہمارے اردگرد چھوٹے چھوٹے تالاب بن گئے تھے۔ میں نے اپنی اچکن اُتاری اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے سر پر اوٹ کر دی۔ ایسا کرنے سے پہلے تو وہ جھجک کر وہاں سے ہٹنے لگی مگر پھر میرا عندیہ پا کر وہیں کھڑی رہی۔ اس وقت میں نے اس کے لبوں پر ہلکے تبسم کی جھلک دیکھی جس سے میری رگ رگ میں سرخوشی کی لہر دوڑ گئی۔ محبت کا سوتا جو اب تک میرے دل میں آہستہ آہستہ برس رہا تھا یکلخت پھوٹ پڑا اور مجھے اپنی رَو میں بہا لے گیا۔

مینہ ابھی تک پوری تندی کے ساتھ برس رہا تھا۔ پانی میرے کپڑوں میں سے ہو کر جسم تک پہنچ گیا تھا مگر میں ہاتھ پھیلائے ہوئے اپنی جگہ ایک عقیدت مند پجاری کی طرح ساکت و صامت کھڑا تھا اور وہ نگاہیں نیچی کئے میرے قدموں میں دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا "زلیخا آج صبح پانی لینے کنوئیں پر کیوں نہ آئیں؟"

وُہ اس سوال پر کچھ جھینپ سی گئی اور بغیر میری طرف دیکھے کہا "یُونہی"

مجھے معلوم تھا کہ وہ صحیح جواب دینے سے گریز کر رہی ہے۔ میں نے محبت آمیز لہجہ میں کہا "مجھ سے رُوٹھ گئی تھیں"

اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "میں تو نہیں رُوٹھی"

میں دیر تک خاموش کھڑا اس جواب کی سادگی سے لُطف اُٹھاتا رہا!

اسی اثنا میں مینہ تھم گیا اور بادل کھُل کر مغرب کی طرف اُڑنے لگے۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ پٹھان اپنے خیموں کی اُکھڑی ہوئی طنابوں کو جھک کر باندھ رہے تھے۔ میں نے گھوڑا کھولا اور سوار ہو گیا۔ زلیخا اپنی بکریوں کو ہنکانے لگی۔ میں جانے لگا تو اس نے متبسم ہو کر میری طرف دیکھا اور دوسری جانب چلی گئی۔

کھیت پانی سے لبریز ہو گئے تھے، کہیں کہیں گیہوں کے پودے نیچے جھک گئے تھے۔ درختوں سے کوّے اور طوطے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑ رہے تھے۔ میں نے گھر پہنچ کر لباس تبدیل کیا۔ خالہ صاحبہ نے میری سرگزشت سُن کر فکرمندی سے کہا۔

"توبہ اللہ! کیسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گئے تھے"۔

مگر میرے نزدیک اس ناگہانی مصیبت کا تصور اتنا ہولناک نہیں تھا۔

بارش میں بھیگنے سے میرے جسم کو سردی لگ گئی تھی۔ رات کو شدت کا بخار چڑھا، ساتھ ہی درد سر کی شکایت بھی ہو گئی۔ خالہ صاحبہ نے مادرانہ شفقت اور توجہ کے ساتھ میری تیمارداری کی۔ دوسرے دن گھبرا کر کہنے لگیں کہ تمہارے ابا کو تار دیتے ہیں۔ مگر میں نے کہا معمولی بات ہے،

بخار زور سے کر ٹوٹ جائے گا۔ تین دن تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ خدا خدا کر کے تیسرے دن شام کو پسینہ آ کر بخار اُتر گیا اور درد سر میں بھی افاقہ محسوس ہونے لگا۔ میں تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دو دِن خالہ صاحبہ نے باہر نکلنے سے باز رکھا۔ میرا دل زلیخا کو دیکھنے کے لئے سخت بے قرار ہو رہا تھا۔ اتنے دن اس کی صورت میری آنکھوں کے سامنے جھلملاتی رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں خیال کر رہا تھا کہ وہ اتنے دن مجھے حسب معمول باغیچہ میں نہ دیکھ کر کیا کہتی ہو گی۔ یا شاید وُہ مجھے بھول ہی گئی ہو۔ ایک صبح میں چپ چاپ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں ابھی کنویں سے ذرا فاصلے ہی پر تھا کہ وفورِ مسرت سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ مشکیزہ کندھے پر اُٹھائے انار کے درخت کے پیچھے سے نکلی اور دروازے کی طرف جانے لگی۔ میں نے آواز دی "زلیخا!"

اپنا نام سُن کر اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور مجھے دیکھ کر وہیں ٹھہر گئی۔ میں قریب پہنچا تو اس نے کہا "اب اچھے ہو"

میں نے متعجب ہو کر کہا "تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں بیمار رہا ہوں۔"

اس نے محجوبانہ انداز سے جواب دیا "میں نے تمہارے چھوٹے بھائی سے پوچھا تھا۔"

میں بے اختیار ہنس پڑا "اہا! تو تم میرے متعلق دریافت کرتی رہی ہو۔ تم کیسی اچھی ہو زلیخا"

اس نے شرم سے سر جھکا لیا مگر اس کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ دوسرے لمحہ میں مجھے احساس ہوا کہ وُہ پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اُٹھائے کھڑی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کہا "تم بوجھ اُٹھائے کھڑی ہو، تھک جاؤ گی۔"

اُس نے بے پروائی سے کہا "کیا ہوا پھر۔"

یہ سُن کر خبر نہیں مجھے کیا ہو گیا۔ میں بیخود ہو کر آگے بڑھا اور جھک کر اس کا مُنہ چوم لیا۔ وہ شعلے کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ اس کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا اور آنکھیں وحشت سے کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر کچھ کہوں وہ جا چکی تھی۔

اس واقعہ کے دو دن بعد تک میں نے اُسے کہیں نہ دیکھا۔ میں اپنی ازخود رفتگی اور ناشائستگی پر دل ہی دل میں پشیمان ہو رہا تھا مجھے معلوم تھا کہ اب وُہ کنویں پر کبھی نہ آئے گی۔ پھر بھی میں ہر صبح چنبیلی کے پودے کے پاس کھڑا ہو کر اس کا انتظار کیا کرتا جب کافی دن نکل آتا تو واپس چلا جاتا۔ سارا دن باغیچے کی دیوار کے پاس اِدھر اُدھر چکّر لگایا کرتا اور خانہ بدوشوں کے خیموں کی طرف دیکھتا رہتا مگر سب عورتوں کے لباس ایک جیسے تھے اس لئے زلیخا کو پہچاننا محال تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میری تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا گھونسلا ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔ اپنے جذبہ کی بیچارگی کے احساس سے میری ٹانگوں میں چلنے کی سکت بھی باقی نہ رہی تھی۔ میں اُس آدمی کی طرح بدحواس ہو رہا تھا جس نے کوئی قیمتی چیز گم کر دی ہو اور پھر سوچ رہا ہو کہ کس جگہ رکھی تھی۔ ایک شام کو میں سیر کے لئے باہر نکل گیا اور بہت دیر بعد واپس آیا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں دروازے میں قدم رکھنے لگا تھا کہ دیوار کے ساتھ لگا ہوا ایک سایہ میری طرف بڑھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "کون ہے؟"

ایک مترنم آواز آئی "مَیں ہوں زلیخا"

جذبات کے ہجوم سے میرے گلے میں پھندا اٹک گیا۔ میں نے بمشکل اپنی آواز سنبھال کر کہا "زلیخا اتنے دن کہاں رہیں"

اس نے کچھ دیر خاموش رہ کر جواب دیا "یہیں تھی"

مَیں نے منت کے لہجے سے کہا "اس دن مجھ سے بڑی غلطی ہوئی تھی۔ کیا تم اِسے بھول جاؤ گی؟"

مگر وُہ خاموش کھڑی رہی۔ اندھیرے میں مجھے گہری سانس لینے کی آواز آئی۔ شاید وہ ہوا کی سرسراہٹ ہو۔ میں نے پہلو بدل کر کہا "اس وقت اِدھر کیسے آئیں"

اس نے زیرِ لب کہا "یونہی" اس کی آواز بھاری تھی۔

مَیں نے پوچھا "کیا تمہیں معلوم تھا کہ مَیں اس وقت یہاں آؤں گا"

اس نے آہستہ سے جواب دیا "میں نے تمہیں پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا"

میں کچھ کہنے کو تھا کہ احمد کی آواز سنائی دی۔ وُہ مجھے بلا رہا تھا۔ زلیخا جو سر جھکائے اپنی جگہ بےحس و حرکت کھڑی تھی چونک پڑی،

اُس نے ایک قدم میری طرف بڑھا کر کہا "خدا حافظ"

میں نے جلدی سے کہا "کل اسی جگہ آنا" مگر وہ پیچھے ہٹی اور اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

صبح میری آنکھ تو سویرے ہی کُھل گئی تھی مگر میں دیر تک بستر پر لیٹا رہا۔ یہاں تک کہ سُورج نکل آیا اور اس کی سُرخ کرنیں برآمدے کی منڈیر پر کانپنے لگیں۔

میں کپڑے سنبھال کر اُٹھا ہی تھا کہ مبارک دوڑتا ہوا میری طرف آیا اور آتے ہی چلّا کر کہنے لگا۔

"بھائی جان! وہ لٹیرے یہاں سے چلے گئے ہیں"

مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا "کون؟"

اس نے تیزی سے سانس لیتے ہوئے کہا:

"اجی وہ لمبے کُرتوں والے پٹھان جو یہاں ڈیرا جمائے بیٹھے تھے۔ وہ! جنھوں نے ہماری ہمسائی برکت کی دو مرغیاں چُرالی تھیں!"

سیّد علی عبّاس

جگنوؤں کی بارش

برسات کی رات تھی اندھیری — کچھ نیند اُچٹ گئی تھی میری
پانی جو برس کے کُھل گیا تھا — دُنیا کا غُبار دُھل گیا تھا
تاریک تھی رات، پر سُہانی، — جیسے بھٹکی ہُوئی جوانی
اِتنے میں جو رَو چلی ہوا کی — قسمت ہی چمک گئی فضا کی
ہونے لگی جگنوؤں کی بارش — فطرت کے جمال کی تراوش
آتش افروز بام و در تھے — لیکن یہ شرار بے ضرر تھے
ہر جانب نُور منتشر تھا — گھر کیا تھا مطلعِ سحر تھا
آنگن میں تپاں تھے برق پارے — رخشاں تھے زمیں پہ ستارے
دروازے پہ، کھڑکیوں پہ جُگنو — دالان میں، سیڑھیوں پہ جُگنو
تھا نُور سے رشکِ طُور گلشن — ہر نخل تھا مثلِ نخلِ اَیمن
پیپل بھی چنار بن رہا تھا — ہر شاخ سے نُور چھن رہا تھا
مَیں اس منظر میں کھو گیا تھا — ہر رونگٹا آنکھ ہو گیا تھا
روشن تھی کائناتِ پہلو — دل میں بھی چمک رہے تھے جگنو

. . . .

مُدّت اس حادثے کو گزری — بھولی نہیں رات جگنوؤں کی
برسات کی رُت میں اب بھی اکثر
آنکھیں یہی ڈھونڈتی ہیں منظر

سکندر علی وجد

شررؔ کی شاعری

مرحوم مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کو بحیثیت ایک ناول نگار، نثر نویس اور مؤرخ کے تو ایک دُنیا جانتی ہے۔ اور شاید ہی ادبِ اُردو کا کوئی دِلدادہ ایسا نکلے جو مولانا کے کارناموں سے ناواقف ہو۔ چنانچہ باوجود نصف صدی گزر جانے کے آج بھی ان کی تصانیف خصوصاً اُن کے ناول بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں، لیکن یہ امر بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ مرحوم شاعر بھی تھے۔ اس میدان میں اُنہیں شہرت نصیب نہ ہونے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک تو مولانا نے شاعری پر اپنی پوری توجہات کبھی مرکوز نہیں کیں اور زیادہ تر نثر نویسی ہی سے خدمتِ زبان کا کام لیا۔ وہ پُرگو نہیں تھے۔ ساری عمر میں اُنہوں نے صرف چند نظمیں کہیں۔ دوسرے وُہ مروجہ اصنافِ شعر سے قطعاً دل برداشتہ تھے۔ غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے لیکن مولانا اسے ادبی و شعری ترقی کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے کبھی اس میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اور محض شاعر کہلانے کے لئے "تک بند" بننا پسند نہیں کیا۔ یہی نہیں۔ بلکہ اُردو شاعری کو ردیف و قافیہ کی مضر قیود سے آزاد کرانے کے لئے وُہ اپنی تمام کوششیں بروئے کار لائے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ ان ظاہری اور لفظی پابندیوں نے اُردو شاعری کی معنوی ترقی کی راہیں جو مسدود کر دی ہیں وہ کسی طرح وا ہو جائیں۔ اور ہمارے شعرا ان بیرونی قیود سے آزاد ہو کر اپنے فکر و تخیل کو کھُلی پرواز دے سکیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اُنہوں نے انگریزی شاعری کی چند اصناف مثلاً نظمِ معریٰ (BLANK VERSE)، نظمِ آزاد (FREE VERSE)، سٹینزا (STANZA) وغیرہ کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ خود بھی ان میں طبع آزمائی کی۔ اور دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ اُردو شاعری میں ردیف و قافیہ کے خلاف بغاوت کے اولین علم بردار شررؔ اور نظم طباطبائی ہی تھے۔ اس مقبولِ عام چیز کے خلاف جہاد کرنے کا نتیجہ وہی ہوا جو عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ یعنی ہر طرف سے اُن پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ بجائے اس کے کہ اس ادبی مہم میں اُن کی ہمنوائی کی جاتی، الٹا اُن کی حوصلہ شکنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ چنانچہ جب ایک طویل جدوجہد کے بعد بھی اُنہوں نے اپنی کوششوں کو بار آور ہوتے نہ دیکھا۔ اور اپنی آواز کو محض صدا بصحرا پایا۔ تو آخر بادلِ ناخواستہ انہیں اصلاح کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ از بسکہ انہوں نے شعر کی ایک ایسی صنف میں طبع آزمائی کی تھی جو اُردو دان طبقہ کے لئے بالکل نئی اور غیر معروف تھی۔ اور جسے ان کا مذاق قبول نہیں کرتا تھا۔ اس لئے شررؔ کا جو تھوڑا بہت کلام تھا بھی وُہ شہرت نہ حاصل کر سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں ان کے شاعر ہونے کا علم تک بھی ہے۔

مولانا کی شاعری کی کُل کائنات چند مقفےٰ نظموں، دو ایک مختصر ناٹکوں اور (نظمِ معریٰ میں) ایک طویل مگر نامکمل ڈرامے پر مشتمل ہے۔ غزل اور دیگر اصنافِ شعر جن سے اُردو دان طبقہ بالعموم واقف ہے ان کے یہاں سرے سے غائب ہیں۔ اس کی وجہ (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) ردیف قافیہ سے ان کی طبعی نامناسبت ہے۔ جو چند مقفےٰ نظمیں اُنہوں نے لکھی بھی ہیں وُہ نہایت عامیانہ درجہ کی ہیں۔ ان میں کوئی خاص خوبی، کوئی جدت، کوئی امتیازی شان نہیں، وہی فرسودہ مضامین ہیں (مثلاً شبِ وصل، شبِ غم وغیرہ) اور وہی پامال طرز۔ البتہ بیان میں سادگی اور سلاست ہے اور لفظی

تعقید اور مشکل الفاظ سے گریز ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

رات کا منظر :۔

آئی رات ہوئی اندھیاری — چرخ پہ تاروں نے کی گلکاری
کیسی رات مبارک ساری — اچھی اچھی پیاری پیاری
اب پازیب بڑھاتے ہونگے
تھوڑی دیر میں آتے ہونگے — (شبِ وصل)

صبح کی آمد :۔

میکشو! وقتِ صبوحی آیا — مہ وشو! جاؤ نہانے گنگا
برہمنو! لو دَیر کا رستا — طائرو! نکلو چھوڑو بسیرا
واعظ! رات فنا ہوتی ہے
دیکھو نماز قضا ہوتی ہے — (شبِ غم)

طُوفان :۔

بسیروں پہ چڑیاں سمیٹے ہیں بازُو — گھنی جھاڑیوں میں دبکتے ہیں آہُو
درختوں میں جا جا کے چھپتے ہیں جگنُو — اُلجھتے ہی جاتے ہیں ظلمت کے گیسُو
درختوں کے پتّے ہیں کیا کھڑکھڑاتے
زمیں پر ہیں کیا ٹہنے پھٹ پھٹ کے آتے — (زمانہ اور اِسلام)

مولانا کی صحیح شاعرانہ عظمت اور اُن کے اجتہادی رُتبہ کا پتہ اُن کی مقفیٰ نظموں سے نہیں بلکہ اُن کے نظم معرّیٰ میں لکھے ہوئے ناٹکوں سے چلتا ہے۔ اُنہوں نے اُردو میں غیر مقفیٰ نظم کو رواج دینے کی کوشش کی اور اگرچہ فطرۃً غیر شاعر ہونے نیز معاصرین کی مخالفت، گوناگوں مشکلات اور صحافتی مصروفیات کے باعث ان کی سعی مشکور نہ ہوسکی، تاہم اُنہوں نے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا۔ "اُردو شاعری میں شرر کو اگر کوئی جگہ مِل سکتی ہے تو وہ اُن کی غیر مقفیٰ نظموں کی بدولت ہے[1]"۔ اُنہوں نے شیکسپیر کے ناٹکوں کی طرز پر ایک طویل ڈراما نظم معرّیٰ میں اپنے رسالہ " دلگداز" کے ذریعہ سے اُردو داں پبلک کے سامنے پیش کرنا شروع کیا تھا۔ اُردو کی یہ اوّلیں طویل غیر مقفّیٰ نظم تھی، اور اب تک آخری بھی! شرر نے اس کو اتنی محنت سے لکھنا شروع کیا تھا کہ" ان کے اس نومولود ڈرامے کو انگریزی کی معتبر نظموں کے سامنے فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے[1]۔ لیکن افسوس کہ بوجہ صحافتی مصروفیات کے وہ اس کے چھ سے زیادہ سین نہ پیش کر سکے۔ تاہم جس قدر حصّہ اس کا موجود ہے اسے پڑھنے سے یہ

[1] جدید اُردو شاعری مصنفہ عبدالقادر سروری (عثمانیہ)

معلوم ہوتا ہے کہ شرر کسی غیر زبان کا اتباع نہیں کر رہے۔ بلکہ اس صنفِ شعر پر کامل قدرت حاصل کرکے خود اپنی زبان میں ایک نئی صنفِ شعر کی طرح ڈال رہے ہیں۔" ملاحظہ ہوں چند اقتباسات:۔

عشق پُر اندوہ و پُر آلام عشق
ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی؟ کہسار سے
بہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں۔ اور آندھیاں
خاک اُڑاتی پھرتی ہیں۔ اور تُو اے آسماں
ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں
اور تارے گویا انگارے ہیں جن پر لوٹتی
ہے نظر میری مری اُمیدوں کو لے کر عجب
بیقراری اور بے تابی کے ساتھ

سین ۵

صبح اب ہونے کو ہے۔
دیکھنے جھونکے نسیمِ صبح کے وُہ آپ کی
زلف برہم کر رہے ہیں۔ اور تاروں کے چراغ
جھلملاتے ہیں فلک پر۔ اور سیہ چادر یہ شب
کی سرکتی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو چڑیاں اُٹھیں
اور جگا دیں رادرق کو۔

سین ۲

آؤ دنیا تجھ میں کیا کیا لُطف ہیں! کس شان سے
دیکھ سُورج ڈوبتا ہے۔ اور کرنیں کس طرح
پانی پر افشاں چھڑکتی ہیں۔ ادھر اس کوہسار
کو کیا طلائی کپڑے سورج نے پہنائے ہیں۔ جہاں
گھاس کی وہ ننھی ننھی پتّیاں اس دُھوپ میں
جگنوؤں کے مثل تاباں ہیں۔ وہاں اس بیل نے

کیا طلائی جھالریں منقش کی لٹکائی ہیں۔
پھول بھی ہر رنگ کے اس جا کھلے ہیں۔ اور وہ
دیکھ کلیاں مسکراتی ہیں عجب انداز سے۔
دیکھ کر یہ لطف چڑیاں خوش ہیں۔ اور کس
جوش سے سب چہچہا اٹھتی ہیں۔ کیسی شاد ہیں!
جس کو دیکھو خوش ہے۔ لیکن آہ! اِک میں ہوں کہ دل
کو قرار آتا نہیں —— الجھن ہے، بیتابی ہے، اور
ہر گھڑی اِک درد ہے۔

سین ۴

مولانا نے دو ایک مختصر ناٹک بھی لکھے تھے۔ ان میں سے ایک سے ذیل کا اقتباس مولانا کی شاعری کے بہترین نمونوں اور شہ پاروں میں سے ایک ہے:۔

نورِ ایماں! مرے دل کے ملکوتی مہماں
ساکنِ سینۂ پر داغ و انیس حرماں
مرحمت کر تو ہمیں اپنی دوائے تسکیں
دے وہ پر جن سے اڑے قلب بسوئے افلاک
خاک کی تیرہ کثافت سے ہوں یہ آنکھیں صاف
اور آزاد غم و درد سے ہو جائیں حزیں!

شرر کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگیٔ بیان ہے۔ وہ مفہوم کو الفاظ کے ہیر پھیر میں نہیں چھپاتے۔ نہ مشکل اور گراں الفاظ سے ناظر کو مرعوب کرنے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ دو طرح کے الفاظ پر قدرت رکھنے کے باوجود انہیں سادہ اور آسان الفاظ مرغوب ہیں، ان کے پسندیدہ موضوع مناظرِ قدرت، فطری جذبات اور تاریخ ہیں۔ اگرچہ کردار نگاری میں وہ کامیاب نہیں رہے لیکن منظر کشی اور فضا پیدا کرنے میں اُن کی اُستادی مسلمہ ہے۔ ان کے ہاں (نثر میں بالخصوص) انگریزی الفاظ کا حد سے بڑھا ہوا استعمال اگرچہ کہیں کہیں کھٹکتا ہے لیکن غیر زبانوں کے کئی خوبصورت مناسب الفاظ اُردو لغت میں داخل کرنے کے لئے اُردو زبان ان کی ممنونِ احسان ہے۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ مولانا کو شاعری میں اپنے جوہر دکھانے کا آزادانہ موقع نہیں دیا گیا جس کے باعث وہ اس میدان میں اپنے لئے کوئی ممتاز جگہ نہیں پیدا کر سکے۔ تاہم نظمِ معریٰ کے اولیں رواج دہندہ کی حیثیت سے اُردو ادب میں اُن کا نام زندۂ جاوید رہے گا۔

عبدالعزیز قریشی

اُتار

ماں :- "ناس پیٹے اجا ئیا اظلمی کہیں کے۔ مر گئے تیرے ہاتھ میں گھر کا خرچ ہوتا تو میں جانتی ہوں تو گھر بھر کو فاقوں سکھا سکھا کے مار ڈالتا، مٹے تیری تو حقیقت جب ہی کھلے گی جب کالے سر کی پرائے گھر سے آکے تجھے ناک چنے چبوائے گی۔ دیکھو موئے کا دیدہ! کیسا میری بچی کو بھر بھر مُنہ کہتا ہے کہ "چھ چھ وقت ڈھونستی ہے، کال کی ماری ہو گئی ہے کہ مر جائے گی"۔ قربان کرتی تجھ بھیا کو جو بہن کو کوسے کاٹے، ہر وقت تیہے میں بھرا رہتا ہے۔ جب دیکھو اپنے آپے کو کھائے لیتا ہے۔ آدمی کسی وقت تو انسان کی صُورت ہو۔

کبھی تُو تو بچہ ہوا ہی نہ تھا۔ نہ تُو نے کبھی کئی وقت کھایا، نہ روز پیسے لئے، نہ گھر کا ناج بھر بھر کے باہر نندا بنئے کی دُکان پر میٹھی کھیلوں اور چنے بتاشوں میں بہایا، نہ کبھی بیچارے نے مچان سے اُچک اُچک کے بھیلیوں میں سے گُڑ توڑ توڑ کے کھایا۔ اپنے دن تو سب بھُول گیا مرگیا!

بیٹا :- "اماں! تم نے تو گھر سر پہ اُٹھا لیا۔ مَیں تو اس وجہ سے کہتا تھا کہ بار بار کا بچے کا مُنہ جھٹالنا اچھا نہیں ہوتا۔ جمیلہ کا اَور بھی پیٹ خراب ہو جائے گا، میں کوئی کھانے کو منع کرتا ہوں۔ اس کی آنکھیں ہی دیکھ لو کیسی خراب ہو رہی ہیں، کپڑے کتنے لیر لیر ہو رہے ہیں۔ کیا اس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ پچھلے ہی ہفتے میں تکون نائن کی لڑکی سی کر دے گئی ہے۔ اگر تم اس کے بدن سے تیل کی مالش کر دیا کر وا ور دن میں ایک آدھ مرتبہ نہلا دیا کرو تو کیا یہی جمیلہ جس کا پیٹ ہی پیٹ نظر آرہا ہے تندرست نہ ہو جائے گی؟

ہمارے پروفیسر کے بچے تو جب دیکھو صاف ستھرے اور تندرست ہی ملیں گے۔

اور اماں! اگر بچپن میں میری عادتیں خراب تھیں تو کیا اب اور بھائی بہنوں کی بھی ایسی ہی ہو جانا اچھا ہے! رہے بھائی رہاب کے بھیجے ہوئے روپے۔ اگر تم اُن پر خفا ہو تو اُن کی کوڑی کوڑی کا مجھ سے حساب لے لو۔

چار روپے کے گیہوں اور دالیں آگئیں۔ چار روپے نندلال کی اُچاپت کے دے آیا۔ دو روپے یہ بچے ہیں۔ سو تم مجھ سے اب لے لو۔ اماں! تم تو بعض وقت مجھے اتنا ذلیل سمجھنے لگتی ہو کہ جیسے مَیں تمہارا بیٹا ہی نہیں ہوں اماں!"

ماں :- "چل دُور ہو! ہو گی کوئی ماں زادی تیری اماں۔ میں کہاں ہوں۔ تو بیٹا ہوتا تو یوں اُوپر ہی اُوپر روپے گانٹھ باندھ کے مجھے ترساتا۔ آپ ہی آپ خود مختار ہو جاتا۔ کچھ تو سوچتا کہ کوئی تو میرا مرا جیتا سَر دھرا ہے۔ ارے بیٹے تیری تو کیا اصل ہے، میں نے اِسی گھر کے خرچ کے لئے اُس کی وقعت بھی نیفے کی جوں سے کبھی زیادہ نہ جانی جس کے پلّو سے مَیّا بُرانے باندھا ہے۔ جہاں گھر کے کاموں میں مینگ مینخ نکالی اور میں نے دو بولوں میں وہیں چُپ کر دیا۔"

بیٹا :- "اماں! اس میں سَر دھرے اور بے سَر دھرے کی کیا بات ہے۔ دُکان سے تم نے میرے ہاتھ سے سامان منگایا۔ میں مرد ذات، باہر نکلنے بیٹھنے والا ٹھہرا۔ آخر مانگتا تو وہ مجھ ہی سے نا۔ میں نے کہا آخر دینے اور اوّل دینے، لاؤ اس کا حساب بھی لگے ہاتھوں بے باق کرتا

جاؤں، اور یہ ہے گیہوں اور دالیں وہ، تم نے مجھ سے منگائی ہی تھیں۔"

ماں۔" بڑا آیا کہیں کا بے باق کرنے والا، کہیں کسی دن اماں کا لگے ہاتھوں حساب بے باق مت کر دیجیو۔

اچھا اور کیوں رے دیدوں پھوٹے! میں کہتی تھی کہ کون تجھ بدتمیز کے منہ لگے۔ ذرا یہ تو بتا کہ یہ جو تو کھڑی دالیں اور آٹے کی جگہ گیہوں اپنے خصمانے سے لاد لایا ہے وہ کیا گھوڑے کھائیں گے؟"

بیٹا۔" اماں، تم تو جانے کیسی باتیں کرتی ہو۔ آخر ممانی کے یہاں بھی تو گیہوں اور کھڑی دالیں ہی آتی ہیں۔"

ماں۔" ممانی! ممانی! کیا نہ کہوں تیری ممانی کو، دنیا بھر کی چماری بے ڈھنگی، سارے جہان کی خسیس، کنجوس مکھی چوس، ذرا ذرا سی چیز پہ جان دے۔ دانے دانے پہ دم نکلے۔ نہ گھر کے آدمی کو دیکھ سکے نہ باہر والے کو۔ مہمان تک کو ایک وقت کے کھلانے میں سسکتی ہے۔ اور تو اور اولاد تک کو تو دیکھ نہیں سکتی۔

کل ہی کی بات ہے کہ ساس اور نندیں آگئیں تو خدا اور خدا کا حبیب جانے کیسے دل میں رحم آگیا کہ ان کے لئے دل غنی کر ڈالا چار کھانے پکا ڈالے۔ چاول پکا لئے، شامی کباب تلے، دو طرح کا گوشت بھی تیار کیا، حلوا بنایا، مگر نگوڑی نے نندوں کو باورچی خانے میں قدم نہ مارنے دیا کہ کہیں کوئی میوہ کا دانہ منہ میں نہ ڈال لے یا آدھا پورا کباب نہ چکھ لے۔ دن بھر چولھے میں ماماؤں کی طرح سر دیئے رہی بیچاری نے اماں باوا کے ہاں کچھ دیکھا ہوتا تو جانتی کہ دل کیسے کہتے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ اور تو اور کھانا کھلانے کا وقت آیا تو بڑی بڑی گہری رکابیوں میں اکٹھا اکٹھا سالن نکالا اور خالی ایک ایک کابی اور چمچہ ہر ایک کے سامنے رکھ دیا کہ جتنا کھانا ہو نکالتی جاؤ کھاتی جاؤ"

بیٹا۔" یہ تو ان بیچاری نے اچھا کیا یا برا؟ اس سے تو کھانا خراب اور جھوٹا ہونے سے بچ گیا۔ یہ تو مل کر کھانا کھانے کی بہت اچھی ترکیب ہے۔ اور تمہیں کیا خبر کہ انہوں نے مہمانوں سے کام نہ لینے کی وجہ سے ہی نندوں کو کام نہ کرنے دیا ہو۔"

ماں۔" ہاں! ہاں! تو تو ممانی کی سی ہی کہے گا۔ ممانی آنکھوں میں بہت کھب گئی ہیں۔ ہم بہت برے ہیں۔ وہی ہے کہ باوا سے بیر پوتے سے سگائی، ماں بری ماں کی بھاوج اچھی۔ غضب ہے، ہمارا جنا اور ہمیں کو برا کہے۔ لوگو یہ چودھویں صدی ہے چودھویں"

بیٹا" تمہیں آج تو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ جو منہ میں آرہا ہے وہ کہہ رہی ہو۔ بھلا تھی گیہوں اور دال کی بات اور لے بیٹھیں ان کا رونا۔"

ماں۔" ہاں ہاں! بیٹے صد رحمت ہے تمہارے دم کو۔ اگر ابھی سے ہمارے منہ کے نکمان نہ کروگے تو آگے کو چل کے باپ دادا کا نام کیسے اچھالو گے۔

گیہوں دال، گیہوں دال۔ کیا کروں میں منے اس اناج کا۔ کیا چولھے میں جھونکوں تیرے بس میں ہو تو اپنے میں کیا باپ کے راج میں ہی کٹوا اور پسوا لے کیونکہ اپنے یہ دین کرانے کو تو ہم نے تجھے اتنا بڑا کیا ہی تھا۔"

بیٹا۔" اماں! میں خدانخواستہ تم سے دلنے اور پیسنے کو کب کہتا ہوں۔ وہ کلیا پسنہاری آخر کس دن کام آئے گی۔ جو جب دیکھو اپنے باپ کا سا پاندان کھولے پان ہی بیٹھی چباتی رہتی ہے۔"

ماں۔ "اور دالیں کون، تو دَلنے بیٹھے گا"

بیٹا۔ "اماں تم تو عورت ہو کر عجب باتیں کرتی ہو۔ اُسی کلیا سے دلوانا۔ ممانی تو میں دیکھتا ہوں، ایسے ہی دلواتی اور پسواتی ہیں مزدوری دے دیتی ہیں تو بھی بازار کے بھاؤ دونوں چیزیں سستی بیٹھتی ہیں اور پھر خالص آٹا عمدہ اور بنے چھٹکے گیہوں کا کھانے کو ملتا ہے، اور اماں ایک بات یہ بھی ہے کہ مجھے دو دو پیسہ کی بازار سے اُدھار لانے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔"

ماں "ہاں، دیکھ تو اب آیا ڈھنگ پہ۔ جب سے اتنے پھل کیوں کھیل رہا تھا۔ سیدھے یہی کیوں نہیں کہتا کہ اب بازار سے سودا لانے میں میری شان گھٹتی ہے۔ شیخی کا مُنہ کالا، دیا دیس نکالا۔ تجھے کیا کہوں میں تجھے۔ کیا باوا نے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کپٹ کے تجھے پڑھنے کے لئے پردیس میں اسی لئے بھیجا تھا کہ گھر کے کام کاج کو ہاتھ نہ لگائے۔ اماں کا عیب تو اب نکالے۔ بہن کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکے۔ ہمیں نئے نئے سبق پڑھائے۔ کل سے پڑھنے کیا چلا گیا ہے کہ کسی کو خطرے تلے ہی نہیں لاتا۔ ارے تری کیا صورت ہے جو پڑھ جائے۔ نہ تیرے باپ نے پڑھا اور نہ تو پڑھے۔ وُہ تو یہ کہو کہ میں بھلے کو اس گھر میں آگئی کہ دِلدر پار ہو گئے۔ ڈاکیہ گیری مل گئی۔ بڑے بڑوں کے پوتوں کو ہم نے جوتیاں چٹخاتے دیکھا ہے۔ وہ شیخ جی کا نے رائیف۔ اے، پاس کیسا در در کی خاک چھانتا پھرا اور خوشامد درآمد ہی میں نوکری کی عمر نکل گئی۔ اُسے قاضی کے فتن ہی کو دیکھ لے، اِنٹس لانٹرنیس تک پڑھ کے بھی نوکری ملی تو بیس رُپلی کی ڈاک منشی گیری کی۔ ڈاک خانے کا کرایہ بھی اُسی میں دوات قلم کا خرچ بھی اپنا، صندوق میز اور اللہ جانے کیا کیا الا بلا بھی اپنی گانٹھ کی۔ میں تو کہتی ہوں بڑی بھاگوان ہے وُہ ماں جس نے ایسی گھڑ بیٹی جنی جو میاں کی اتنی سی ہی کمائی میں گھر اُجاگر رکھتی ہے۔ آج تیرا باوا میرے مقدر ہی سے اتنے مزدِ تنے لُوۓ ایک کم تیس روپلے پاتا ہے۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔ خاندان میں، تیرے پڑھا لکھا ہی کون تھا۔ دادا کھیتی کراتے کراتے قبرستان میں جا سوئے۔ ایک چچا نے جو ہوش سنبھالا سو خلافت خلافت چِلّا چِلّا کے سر اُٹھایا۔ آخر کو گاندھی گردی میں پکڑا گیا اور ہتھکڑیاں جھنجھنیاں پہنیں۔ دُوسرے چچا ایسے مسجد کے مُلّا بنے کہ بیوی بچّوں کو ساری عمر کبھی گُت کا لتا تک نصیب نہ ہوا . . . ."

بڑی بیٹی۔ "اماں! باہر بھیا کے دوست بیٹھے ہیں ذرا . . . . ."

ماں۔ "چپ رہ ری مُردار! ہم نے تجھ سے ہزار دفعہ کہہ دیا کہ خبردار جو تو گنواری . . . . ."

بیٹا۔ "میں دونوں چیزیں پھیرے آتا ہوں۔ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں اماں!"

(زبان کی اُتار اور پھوہڑ ماں کا گھر خدا ہی سنبھالے تو بھلا ہی سنبھل جائے۔ بیٹے اور بیٹی کا کیا قابو ہے!!)

الف۔ ر۔ سُہاوری

پہاڑ کا انتقام

"بتی بابا آٹھ بج چکے ہیں اور آپ کے کھانے کا وقت ہو چکا!"

رَدما نے محویت کے عالم میں آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور جواب میں محض سر ہلا دیا۔ اُس کی آیا بڑے صبر و سکون کے ساتھ انتظار کرتی رہی۔ اس نے پھر ایک مرتبہ احتجاج آمیز لہجے میں کہا "ردما بابا اب بہت دیر ہو چکی ہے"۔

لڑکی نے کتابیں پٹختے ہوئے جواب دیا "کانشی تم مجھے بار بار کیوں تنگ کرتی ہو؟" لیکن آیا کے چہرے پر عذرخواہی کے آثار دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"مجھے افسوس ہے کانشی! مَیں بھول گئی تھی! کیا وُہ تمہارا انتظار کر رہا ہے؟"

دونوں لڑکیوں کی عمر میں کچھ بہت زیادہ فرق نہ تھا لیکن افلاس و نکبت کی زندگی گزارنے سے نیپالن ذرا عمر میں بڑی معلوم ہوتی تھی، رَدما جانتی تھی کہ کانشی کی ابھی تازہ تازہ شادی ہوئی ہے اور اُس کا شوہر ہر روز رات کے وقت، باہر تاریکی میں، اس کی راہ تکتا رہتا ہے تاکہ اُسے حفاظت کے ساتھ گھر تک لے جائے۔

یہ لڑکی کی تفریح کا سامان بن گیا۔ اس کا معصوم دل اس سے تسکین پاتا اور وہ ہمیشہ اپنی خادمہ سے اس کے متعلق سوال کرتی رہتی۔

کانشی کا مُنہ شرم کے مارے سُرخ ہو گیا اور کہنے لگی "ردما بابا آپ اکثر بہت بے معنی باتیں کرتی رہتی ہیں! سچ ہے نا؟" اور اسے پیار کرتی ہوئی کھانے کے کمرے کو لے گئی۔ کھانا کھاتے وقت وُہ لڑکی کے پاس کھڑی اسے اپنے گھر کے قِصّے سُناتی رہی۔ اُس کی نرم و شیریں آواز سے رَدما کا تھکا ہُوا دماغ آرام پانے لگا، حتیٰ کہ پڈنگ کا آخری لقمہ کھاتے وقت اس پر غنودگی طاری تھی۔ بستر پر دراز ہوتے ہوئے رَدما نے نیم خوابی کی حالت میں کہا "کانشی مجھے برکھارُت اور ہواؤں کا راگ گا کر سناؤ!"

کانشی نے مدھم سُروں میں عجیب و غریب الفاظ سے مرکب ایک ایسا لطیف نغمہ گایا جس کے سُروں سے یہ کیفیت پیدا ہو رہی تھی کہ گویا صنوبر کے بلند و بالا درختوں کے درمیان ہوا سرسرا رہی ہے، آسمان پر برسات کا پہلا بادل مست ہاتھی کی طرح بڑھا چلا آ رہا ہے۔ چھم چھم مینہ برس رہا ہے اور بلندیوں سے برف گر رہی ہے۔ رَدما کی نرم سانس بتدریج گہری نیند کی خبر لانے لگی اور کانشی جان گئی کہ اس کا دن بھر کا کام ختم ہو گیا۔ اس نے اپنا چھاتا سنبھالا اور تاریک رات کی ٹھنڈی فضا میں تیزی سے باہر نکل آئی۔

بہادر نے درختوں کے گھنے سائے میں سے قدم اُٹھاتے ہوئے کہا "تمہیں آج دیر ہو گئی!"

"نہیں، بہت دیر نہیں ہوئی! میں بے بس تھی۔ جب تک لڑکی سو نہ جاتی میں اسے تنہا چھوڑ کر نہ آ سکتی تھی!"

اس نے بے صبری کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے کہا "یہ لوگ دوسروں کے جذبات کا پاس کیوں نہیں کرتے؟"

"اوہ! اگر وہ بڑی پیاری بچی ہے اور مجھ سے سہیلیوں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ اسے بُرا نہ کہو۔ وُہ اپنا سبق یاد کر رہی تھی۔"

اس نے اپنے ایک ہاتھ سے اپنا دوسرا بازو مروڑا اور کہا "بہرحال اب تم یہاں آگئی ہو۔ لیکن مجھے ہر رات کس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ میں یہاں کھڑا حیران ہو کر قیاس آرائیاں کرتا رہتا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی، اور دونوں جھومتے ہوئے، بازار کے راستے پر ہو کے چل دیئے۔ راستے میں وہ چائے کی ایک چھوٹی سی دکان پر جو ایک سرائے میں واقع تھی، کچھ دیر کے لئے ٹھہر گئے۔ چائے خانہ میں روشنی کا انتظام بڑے حسنِ مذاق سے کیا گیا تھا۔ ایک نیپالی بوڑھا اُس کا نگرانِ کار تھا۔ وہ ہنسوں کے اِس جوڑے سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے مُنہ سے کچھ کہے بغیر ان دونوں کے سامنے چائے کی ایک ایک پیالی رکھ دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ ہائے دراز کی عقل و دانش اس کے چہرے کی جھرّیوں میں بل کھائے بیٹھی ہے۔ وہ متاسف ہو کر اُن کے شاداں و فرحاں چہروں کا مطالعہ کر رہا تھا اور شاید اس راز سے آشنا تھا کہ یہ فرحت و شادمانی عارضی اور چند روزہ ہے۔

گھر کو اُٹھ چلنے سے پہلے وہ ایک سگریٹ سُلگا رہے تھے کہ اتنے میں ایک اجنبی نے دُکان میں داخل ہو کر چائے کی فرمائش کی۔ سرائے کے بُوڑھے پاسبان نے اپنی مسلسل اور طویل مہرِ خاموشی کو توڑتے ہوئے، نووارد سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ اس نے اُن کو بتایا کہ مَیں ایک سیاح اور تاجر ہوں، میں نے دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کیا ہے اور دُور دراز مقامات دیکھے ہیں۔ اس نے بہادری کے ولولہ انگیز کارنامے، عجیب و غریب سرزمینوں کی دلچسپ داستانیں، دولت و ثروت کے افسانے اور تباہی و غارتگری کے واقعات اس دلکشی سے بیان کئے کہ لڑکا اور لڑکی وہاں سے اُٹھ کر جانے کی ہمت نہ کر سکے۔

جُونہی وُہ اپنی جھونپڑی کے قریب پہنچے، انہوں نے بازار ہی میں سے مسرت بھری آوازوں کو اپنا پُرتپاک استقبال کرتے ہوئے سُنا، وُہ اپنے گھر کو پہچان کر باہمدگر اور بھی قریب ہو کر چمٹ گئے۔ کسی ناقابلِ ضبط ہراس نے کانشی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وُہ بہادر سے مخاطب ہو کر بولی:

"مجھے بتاؤ کہ تم مجھے کبھی تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ کہو، کیا تُم ایسا کرو گے؟"

"میں کہاں جا سکتا ہوں، یہ تمہیں کیا وہم ہو گیا؟" اُس نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا "کیا مَیں اس تاجر کی طرح پہاڑوں کی چوٹیوں پر آوارہ پھروں گا، لیکن یہ تو بڑی دلچسپ زندگی ہوگی"۔ اور اس کی آنکھیں چمکنے لگ گئیں۔ "میں اکثر اس خیال پر حیران سا رہ جاتا ہوں کہ ان پہاڑوں کے پیچھے کیا کچھ چھُپا ہے!"

"نہیں نہیں، میں پیچھے رہنا پسند نہ کروں گی۔ تم ایک لمحہ کے لئے بھی میرے پاس سے نہ جاؤ گے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اسے اور بھی قریب کھینچ لیا اور دروازے کی کنڈی کھولتے ہوئے ہنس پڑی۔

لیکن گاہے گاہے وہ تاجر کی کہانیوں کے خواب دیکھتا رہا۔ وہ بڑی بیتابی کے ساتھ برف سے ڈھکی ہوئی ان پہاڑیوں کی جانب دیکھتا جو بڑی متانت سے اپنے رازہائے پسِ پردہ کو سربستہ کئے ہوئے چپ کھڑی تھیں۔ اس کا دل وہاں پہنچنے کے لئے بیقرار تھا — انسانی فراست کی رسائی سے دور جہاں وقت کا پہیہ بھی دہشت کے مارے ساکن و غیر متحرک تھا۔ اس نے اپنی خواہش کے اظہار کے لئے کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا نہیں بلکہ

اسے دبانے کی کوشش کی، کیونکہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔

بہار کی ایک رات وُہ کانشی کو ہمراہ لئے ہوئے حسبِ معمول بازار سے گزر رہا تھا۔ وُہ اسے دن بھر کے کاروبار کے متعلق باتیں سُنا رہی تھی لیکن بہادر غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔

چائے خانہ پر آ کر وُہ رُک گئے۔ دِن بھر کے کام سے اُکتائی ہوئی کانشی کی طبیعت میں چائے کی فرحت بخش پیالی نے تازگی پیدا کر دی۔ جہاندیدہ بڈھے نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ اُن پر بھی "وہ" حالت وارد ہو چکی تھی —— "وہ" حالت جو لڑکے کو خلافِ معمول سنجیدہ اور غمگین بنائے ہوئے تھی۔ اُس نے سر پر معلق شمشیرِ برہنہ سے بےخبر لڑکی کے ساتھ اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔ لڑکی نے بھی اس کی مبہم اور پنہاں ہمدردی کو محسوس کیا اور شگفتہ ہو کر اُس پر مسکرانے لگی۔

سرائے کے بوڑھے پاسبان کے دل سے یہ معمولی سا واقعہ کبھی فراموش نہ ہُوا۔ اس کے تنہائی کے اوقات میں اس تبسم کی یاد اس شعلے کی مانند تھی جو لمحہ بھر کے لئے چمک کر بجھ جاتا ہے اور تاریکی کو اور بھی زیادہ ہولناک بنا جاتا ہے۔

بہادر نے اپنی بیوی کو بتایا کہ مَیں نے اپنے والدین سے وعدہ کر رکھا ہے کہ گھر پہنچنے سے پہلے اُن سے مِل کر جاؤں گا۔ قریب پہنچتے ہی اُنہوں نے آوازیں سُنیں اور ایک کھلے ہوئے دروازے میں نظر ڈالی۔ صحن کے اندر آگ بہت بڑے پیمانے پر جل رہی ہے، بہت سے لوگ اس کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے، حقہ پی رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ بہادر اور کانشی اس آگ کی روشنی اور لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر حواس باختہ سے ہو گئے۔ اُنہیں بہت دیر تک ایک اجنبی کی موجودگی کا علم نہ ہُوا۔ وہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ بہادر خاموش اور متفکر تھا، کیونکہ وہ اپنے سینے کے ہنگامۂ خاموش کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وُہ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کانشی اپنی ساس کے روزمرہ اور عامیانہ سوالات کا ملائم اور احترام آمیز لہجے میں جواب دے رہی تھی۔

دوسرے لوگ اجنبی کی باتوں کو بڑے غور سے سُن رہے تھے، رفتہ رفتہ اُس نے ان کی توجہ کو بھی اپنی جانب منعطف کر لیا۔ لڑکا اور لڑکی یکساں ان باتوں میں گہری دلچسپی لے رہے تھے لیکن دونوں کی دلچسپی مختلف نوعیت کی تھی۔ وہ اپنے اندر ایک بہت بڑے انقلاب کا شور سُن رہا تھا، جو اسے انگاروں پر لوٹا رہا تھا۔ اور وہ کوئی بات سمجھے بغیر ہی یہ جان چکی تھی کہ آج کی یہ مجلس اس کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے نوجوان اور بوڑھے چہروں کو روشن کر رہے تھے۔۔ بچے اپنی ماؤں کی گود میں تقاضائے خواب سے جماہیاں لے رہے تھے۔ دو تین تو بڑی گہری نیند میں زمین پر سو رہے تھے۔ اُن کے گرد آلود چہرے روشنی کے اندر گلاب کی مانند دمک رہے تھے۔ آگ کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ بہادر کی آنکھیں جوشِ مردانگی اور عزمِ راسخ سے چمک رہی ہیں اور کانشی کا چہرہ مُرجھاتا چلا جاتا ہے۔ بےعلم اور گنوار نوجوان دروازے کے قریب بیٹھے اجنبی کے الفاظ کو اس طرح دُہرا رہے تھے گویا وُہ انہیں نگل رہے ہیں جذبات سے بھری ہوئی ایک پُراسرار خاموشی سب پر طاری تھی اور بہادر بننے کا شوق ساری مجلس کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔

"جونہی ہم اپنی منزلِ اوّل پر پہنچے، پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں بلندی سے ہماری جانب دیکھ رہی تھیں۔ ہر طرف ایک سکوتِ مسلسل کا عالم طاری تھا۔ ہر چیز برف کی مانند بےحِس تھی۔ بلندیوں میں ایک نشہ آور سی کیفیت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ اپنی طرف بُلاتی ہیں اور

راہرو کو آگے ہی آگے بڑھے جانے کا پیغام دیتی ہیں۔ راستے کی تمام رکاوٹیں اپنی دشواری کو اس آواز کے آگے فنا کر دیتی ہیں۔ آخر ان چوٹیوں کے ماورا کیا چھپا ہے؛ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس ایک سوال کے جواب ہی پر زندگی کا انحصار ہے"۔ اجنبی نے اپنی تقریر کو جاری رکھا "صاحب لوگ اپنی گذشتہ ناکامیوں سے مایوس نہیں ہوئے۔ وہ موسم کی آئندہ کیفیت کا بہتر اندازہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اب کی مرتبہ انہوں نے پہلے سے زیادہ سامان اور آدمی ہمراہ لیکر کوشش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ کنچن جنگا کی چوٹی پر اپنا جھنڈا لہرانے کی توقع رکھتے ہیں اور ان کے نام پر میں تم نوجوانوں سے پوچھتا ہوں کہ تم میں سے کون کون اس معرکۂ عظیم میں حصہ لینا چاہتا ہے؛ کون ہے وہ بہادر جسے عزت اور شہرت حاصل کرنے کی آرزو ہے؛ آگے بڑھ آئے!"

ابھی یہ جملہ ختم بھی ہونے نہ پایا تھا کہ بہادر اپنی صف کو چیرتا ہوا آگے نکل آیا "میں تمہارے ساتھ جاؤں گا، عزت و شہرت کے لالچ سے نہیں محض اپنی طبعی جوانمردی اور بہادری کے مطالبہ سے مجبور ہو کر! اور اس آرزو کی تسکین کے لئے جو مجھے ان پہاڑوں کی طرف کھینچے لئے چلی جاتی ہے"۔ اس نے بھری مجلس میں اعلان کیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کالنشی کے لبوں سے یہ الفاظ شعلے کی طرح ابھرے "نہیں، نہیں! تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے! میں تمہیں ایسا نہ کرنے دوں گی؟"

وہ اس کے ہاتھوں سے لپٹ گئی۔ اس کا سربند اس کشمکش میں اس کے سر سے گر پڑا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نہایت دلسوز التجا نہاں تھی لیکن لڑکے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جادو زدہ سا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نگاہیں دور پہاڑوں کے ماورا کسی نامعلوم چیز کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ اب وہ ایک ایسے شخص کی طرح تھا جس نے اپنے آپ کو کھو کر پا لیا ہو۔

"میں ضرور جاؤں گا میری پیاری بیوی میں ضرور جاؤں گا! تم منع نہ کرو! اگر تم مجھے یہاں روک لوگی تو تم میرا دل توڑ دوگی!"

لڑکی نے کہا۔ "اب تمہاری مجھ سے محبت کہاں گئی؛ میری خبرگیری کون کرے گا؟"

"میرے والدین ہیں، تمہارا بھائی ہے، سب یہاں موجود ہیں۔ خود میں بھی واپس آؤں گا۔ اس وقت تم کو مجھ پر ناز ہوگا۔ اس وقت میں وہ بہادر ہوں گا جس نے کنچن جنگا کی مہم سر کرنے میں حصہ لیا۔

وہ رونے لگی اور توہم پرست نیپالی عورتوں نے مکروہ آواز کو روکنے کے لئے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ اس کی ماں احتجاج کے طور پر چیخ اٹھی۔ صرف اجنبی مسکرا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک مسحور کن تبسم رقصاں تھا۔ کالنشی اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر لبوں تک سفید پڑ گئی اور اس نے کہا:

"اگر تمہارے دل میں خدا کی محبت ہے تو ایسی باتیں نہ کرو! تم اتنے ناخدا ترس کیسے ہو سکتے ہو؛ تم ایک فانی انسان ہو کر بھی دیوتاؤں کی بستی کو فتح کرنے کی جرأت کرتے ہو! کیا تم نے دیکھا نہیں کہ یہ صاحب لوگ جو ہمارے دھرم کا مذاق اڑاتے ہیں، کتنی مرتبہ ناکام و نامراد واپس لوٹ چکے ہیں؛ ہر مرتبہ وہ اپنی اس ہٹ کو پورا کرنے کے لئے کتنے ہی انسانوں کی بھینٹ چڑھا کر ان راستوں کا "محصول" ادا کرتے ہیں! وہ ان

باتوں پر اعتقاد رکھیں یا نہ رکھیں، کیونکہ وہ تو سرے سے ہیں ہی لامذہب لیکن تم اے میرے شوہر! اس ضد کو پورا کرنے پر کیسے اصرار کر سکتے ہو؟
بہادر اس کے دلائل پر کان نہ دھرتے ہوئے بے پروائی سے خاموش رہا۔
غضبناک ہو کر لڑکی نے اجنبی کی طرف رجوع کیا:۔
"تم کون ہو؛ تم کون ایسی بری روح ہو جو میرے خاوند کو اغوا کرنے آئے ہو؛ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؛ اس بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کو دیکھو، تم اُن سے اُن کا بیٹا چھیننے لئے جا رہے ہو! مجھے دیکھو میں ابھی جوان ہوں، اور تم مجھے بیوہ بنائے جا رہے ہو! ہم اپنے آپ کو تمہارے رحم پر چھوڑتے ہیں۔ دیا کرو!
اجنبی مسکرا دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ بہادر نے اپنی بیوی کی باتوں کا جواب دیا — ایسے لہجے میں جس کی اس سے کبھی توقع نہ تھی۔
"بس، اب چپ رہ عورت! کیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے پاؤں کی زنجیر بنی رہے گی؟"
خوفزدہ لڑکی ڈگمگا کر گرنے ہی کو تھی کہ اس کی ساس نے خاموشی سے اس کو اپنے بازوؤں پر تھام لیا۔ دو شکستہ دل عورتیں! وہ بے دست و پا اپاہجوں کی طرح رونے لگیں۔ معتبر باپ نے سر جھکا لیا۔ اس کی جہاں دیدہ آنکھیں آنسوؤں کے دھندلکے میں سے مستقبل کی تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ اسے نوجوان کے اندھے جوش کا اٹل انجام معلوم تھا۔ یہ تقدیر کا لکھا تھا جو کسی طرح بھی مٹ نہیں سکتا۔

بہادر کوہساروں کے راز معلوم کرنے کے لئے گھر سے چل دیا۔ کانشی بدستور رزوما کی آیا بنی رہی۔ جب وہ روزمرہ کے کاروبار سے فراغت پا کر واپس لوٹتی تو مقررہ مقام کے پاس پہنچ کر اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی اور وہ آہ بھر کے رہ جاتی۔ یہ اس کی قوت برداشت سے باہر تھا کہ وہ راستے میں چائے پینے کے لئے کچھ دیر توقف کرے۔ سرائے کا محافظ ہر روز ایک خفیف اور افسردہ سا تبسم اس کی جانب سے قبول کرتا۔ بڑھاپا نہیں دیکھ سکتا کہ جوانی کو کوئی چشم زخم پہنچے۔ چنانچہ اسے اس تبدیلی سے بہت نفرت تھی۔ کانشی اپنے شوہر کے گھرانے ہی میں ایک خدمتگذار اور سعادت مند بیٹی بن کر رہا کی۔ اس نے چھپ چھپا کر پرانشجت کی رسمیں ادا کیں تاکہ پہاڑوں کی روح کو اس بات پر آمادہ کر سکے کہ اس کے شوہر پر مہربان رہیں۔
وہ اکثر ملول و غمگیں ہو کر بغیر کسی رنج اور غصے کے "دوشیزۂ برف" کی طرف دیکھتی جس نے اس کے محبوب کو گرفتار کر لیا تھا۔ کنچن جنگا بڑی بے رحمی کے ساتھ چمک رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی دعاؤں کو نفرت سے ٹھکرا رہی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا، جیسا کہ ہر ایک نیپالی کو معلوم ہے کہ دیوتاؤں کی فرودگاہ میں قدم رکھ کر کوئی بھی انسان زندہ واپس نہیں آ سکتا۔
ایک رات موسم گرما کی تیز ہوا جھونپڑیوں کے اوپر منڈلاتی رہی لیکن کانشی کے سینے میں باہر کے اس طوفان سے بڑا ہنگامہ برپا تھا۔ اسے نیند نہ آئی اور وہ رات بھر مکانوں کی چھتوں پر مینہ برسنے کی صدا سنتی رہی۔ طوفان بالآخر تھم گیا اور بیمار کے چہرے کا سا بیرنگ دھندلکا نمودار ہوا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک فرط حیرت و حسرت سے کھلی کی کھلی تھیں۔ دھند اور کہر کے غبار میں سے اس نے دیکھا کہ دور فاصلے پر ہیولے سے

رنگ کا ایک نقاب پہاڑ کی اس فلک بوس چوٹی کو انسانی نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے سہمے ہوئے دل میں ایسا محسوس کیا کہ گویا ایک نئی اور ناقابلِ عبور دیوار اس کے اور بہادر کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ بالکل بے حس اور بظاہر مطمئن، وہ اپنے کام پر گئی اور روزمرہ فرائض کو ایسے انجام دیتی رہی جیسے اس کے پاؤں کے ساتھ سیسہ بندھا ہوا ہو۔

دوسرے ہی روز اس سانحۂ جانگداز کی خبر آگئی کہ دو آدمیوں کے علاوہ مہم کے تمام افراد برف کے ایک پھسلتے ہوئے تودے کے نیچے دب کر مر گئے۔ کانشی کام کے لئے آئی تو ناشتے کی میز پر اس نے تو ماکے باپ کو اپنی بیوی سے یہ کہتے ہوئے سُنا "یہ حادثہ بہت ہی خوفناک ہے۔ اتنی جانیں ضائع ہوئیں، تمام قلی مارے گئے۔ یہ واقعہ ہر سال پیش آتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کوشش سے ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔"

کانشی انگریزی سمجھتی تھی۔ وہ اپنے آقا کی باتوں کو سراسیمہ ہو کر سنتی رہی "یہ ان کے ناموں کی فہرست ہے، ددیو رو ہیں زندہ بچ گئے ہیں لیکن اگر وقت پر امداد نہ پہنچی تو وہ بھی یقیناً زندہ درگور ہو جائیں گے اور قلی تو سب کے سب مارے گئے۔ گور بن، پائے سنگھ، بہادر سنگھ........" کانشی نے اس سے زیادہ کچھ نہ سُنا، کسی چیز کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی اور نیپالی لڑکی فرش پر بیہوش پڑی تھی۔

کئی روز کے بعد کانشی کو صرف اس قدر ہوش آیا کہ اس نے اپنے ماحول کو پہچاننا شروع کیا۔ اس کو صرف یہی بات یاد تھی کہ پہاڑوں نے اپنا محصول وصول کر لیا تھا، اور ایک فانی ہستی نے اپنی ضد اور نادانی کی قیمت ادا کر دی تھی۔ دیوتاؤں کو ایک معمولی عورت کے ٹوٹے ہوئے دل کی پروا کیوں ہوتی! اُنہوں نے ایک آدمی کو اُس کی اس گستاخی کی سزا دی تھی کہ اس نے ناقابلِ تسخیر بلندیوں پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لڑکی تنہائی کے احساس سے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اپنے شوہر کے بوڑھے والدین سے آنکھیں ملا سکے۔ اُنہوں نے اپنا بیٹا اس کے اعتماد پر چھوڑا تھا، مگر وہ اس کو نبھانے میں ناکام رہی۔

چاندنی رات جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ مگر اس دلربائی کے ساتھ ساتھ اس میں ظلم اور قہر و غضب کی بھی ایک صفت مستور تھی۔ وحشی نگاہ کانشی ننگے سر اپنے کمزور اور نازک سینے پر انگیا پہنے، اپنی کمر کے گرد ساڑھی لپیٹ کر، دبے پاؤں رات کی وسعت میں باہر نکل گئی۔ وہ اپنے دل میں نفرت کا ایک بے پناہ جذبہ اور تمام کائنات سے بیزاری کا ایک گہرا احساس لئے کر کوہستان کی طرف چل کھڑی ہوئی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ اب پہلے سے بھی زیادہ ساکت و صامت ہے اور فانی ہاتھوں کی آلودگی سے اب اور بھی محفوظ ہو گیا ہے۔ کہر کا ایک نیلا سا پردہ اس کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے انسانی جرأت و قوت کو ہمت آزمائی کی دعوت دے رہا تھا۔ اشک آلود آنکھوں کے ساتھ لڑکی نے اس کو دیکھا ـــــ اس خوفناک دیو کو دیکھا جس نے اس کے شوہر سے گستاخی کا "محصول" زبردستی حاصل کیا تھا۔ اس کے اندر کوئی سرکشی کا جذبہ نہ تھا۔ اس کے خیال میں انسان کو اس کے تکبر کا مناسب بدلہ ملا تھا لیکن خود اس کے لئے ساری دُنیا ویران تھی کیونکہ خدا کی اس وسیع کائنات میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اسے مصیبتیں جھیلنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا حالانکہ وہ بے قصور تھی۔

قریب ہی ایک آبشار گر کر نعرہ ہائے مسرت بلند کرتی ہوئی بہتی چلی جا رہی تھی۔ یہ کس منزل کو جا رہی تھی؟ اس نے اس کی کائی سے بھری ہوئی گہرائیوں کو دیکھا اور پھر اپنے سامنے کے برفستان کی طرف نظر اُٹھائی۔ یہ سلسلہ فطرت کی عظمت و برتری کا پیکر بن کر بڑی متانت سے اپنی جگہ قائم تھا۔

لڑکی نے درد بھرے لہجے میں کہا "میں نے کیا قصور کیا ہے؟ مجھ سے کونسا ایسا گناہ سرزد ہوا ہے؟ مجھے یہ دُکھوں اور تکلیفوں سے بھری ہوئی زندگی بسر کرنے کے لئے کیوں زندہ رکھا گیا ہے؟ جب میں نے تمہیں رخصت کیا تو اے بہادر تم نے وعدہ کیا تھا کہ میرے پاس جلدی واپس لوٹ آؤ گے۔ کیا تم بھول گئے؟ کیا تمہارے وعدے جھوٹے تھے؟ حالانکہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے حسن و محبت کا خزانہ بنا کر اپنے ساتھ رکھنے کی قسم کھائی تھی!"

اس نے خاموش پہاڑیوں، تاریک وادیوں اور پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں سے سوال کیا۔ وُہ ان مناظر کو غور سے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہیں کہر کے پردوں کو چیرتی ہوئی پار نکل گئیں۔ اچانک اسے اپنا شوہر نظر آیا۔ وہ خرم و شاداں تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس نے اُسے اشارے سے اپنے پاس بُلایا۔ کانشی نے فرطِ خوف سے اس خلا کی طرف اشارہ کیا جو ان دونوں کے مابین حائل تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے سامنے دھندلے نیلے رنگ کا ایک پُل دُوسری جانب پہنچنے کے لئے راستہ بنا رہا ہے۔ ناشاد و نامراد لڑکی کو آج کئی روز کے بعد مسرت نصیب ہوئی۔

اس نے چیختے ہوئے کہا "ٹھہرو! مَیں آ رہی ہوں!" اور اس موہوم پُل کی طرف بڑھی۔

کیا یہ ایک انسانی جسم کے وادی میں گرنے کی آواز تھی؟ کیا پہاڑیوں میں کوئی گونج پیدا ہوئی؟ کیا موتی بکھیرنے والی آبشار نے اسے محبت سے اپنے دامن میں لے لیا تھا؟ کسی کو کبھی اس کی خبر نہ ہوئی۔ پُراسرار پہاڑیوں نے اپنے راز کو بڑی حفاظت سے چھپائے رکھا۔

(ترجمہ) عبدالحمید

نفسیاتِ سرما

ہوئی سرد خورشید کی انجمن
برودت سے تفسیدہ دل ہیں مگن

زمیں سرد کون و مکاں سرد ہیں
شعاعوں کی سرگرمیاں سرد ہیں

ڈھلا جوں ہی سورج کہ دن کٹ گیا
بڑا دن ٹھٹھرتے ہوئے گھٹ گیا

سحر گرم چادر میں لپٹی ہوئی
در و بام سے دھوپ چپٹی ہوئی

جنوبی ہواؤں سے ہو کر خجل
لرزتا ہے بحرِ شمالی کا دِل

ہوئی سرد اُونی لباسوں کی خُو
دوشالوں کی جاتی رہی آبرُو

فضا میں ہیں نشتر عجب قسم کے
کھڑے ہو گئے رونگٹے جسم کے

مزاجوں کو سردی ملی حسبِ ظرف
جو دریا میں پانی وہ حوضوں میں برف

ہوا گوش و بینی میں بھرتی ہوئی
پلٹتی ہے دل سے گزرتی ہوئی

زکام اور اس پر یہ چھینکوں کا زور
ابھی ایک پھر ایک پھر ایک اور

تنفس رواں بھاپ کی موج پر
تکلّم گراں۔ گھگھیاں اوج پر

دل و جاں پہ جاڑا سا چڑھتا ہوا
انگیٹھی پہ ہر ہاتھ بڑھتا ہوا

لطافت سی چھائی ہوئی آگ پر
جوانی سی آئی ہوئی آگ پر

تساہل پہ چستی ہوئی فتحیاب
ضعیفی کی رگ رگ میں دوڑا شباب

جلی برف سے گرمیوں کی بہار
"خیابانِ سرما" پہ آیا نکھار

وہ باغوں میں نارنگیوں کی چمک
کہ زاہد کی نیت بھی جائے بھٹک

لبِ تشنہ کامی پہ آئی تری
سرِ بزم رقصاں ہے "قہوہ پری"

تموّل لحافوں میں آرام سے
پڑی اوس مزدور پر شام سے

شاد عارفی

اُردو اور ہندو

(یہ مقالہ ۱۸ دسمبر ۱۹۳۸ئہ کو "انجمنِ اُردو پنجاب" کے اجلاس میں بتقریبِ "یومِ اُردو" پڑھا گیا)

جنابِ صدر، خواتین وحضرات! یہ ہندوستان کی بدقسمتی ہے کہ اس ملک کی زبان بھی جماعتی ہنگامہ آرائی اور مذہبی فرقہ پروری کا بازیچہ بن گئی ہے اور اُردو کے اُس "نئے شوالے" کو چھوڑ کر جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوشش نے ایک ہزار سال میں تعمیر کیا بعض لوگ اپنا ڈیڑھ اینٹ کا "مندر" الگ بنانا چاہتے ہیں۔ اب سے پہلے اُردو کو مٹانے کی دُھن صرف "فرقہ پرست" اصحاب تک محدود تھی اور ملک کے روشن خیال اور اتحاد پسند رہنما اس سے بےتعلق تھے۔ کئی سال ہوئے جب نیشنل یونیورسٹی کے کانووکیشن میں مہاتما گاندھی نے ہمیں بی۔ اے کے ڈپلومے عطا کئے اور اُس کے بعد ہمیں شرفِ ملاقات بخشا تو بعض ہندو طلبہ نے اُردو رسم الخط کا ذکر کرتے ہوئے اپنی اس دقت کا اظہار کیا کہ اس میں بعض سنسکرت الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اُنہوں نے کہا کہ اُردو میں ہم رامائن تو لکھ سکتے ہیں لیکن "رامائنڑ" نہیں لکھ سکتے جو اس کا صحیح سنسکرت تلفظ ہے۔ اُس وقت مہاتما جی نے اِس کے جواب میں ہندی کی طرف رجوع کرنے کی تلقین نہ کی تھی بلکہ یہ نکتہ سُجھایا تھا کہ ن کے نقطے کے نیچے ایک اور نقطہ ڈال کر رامائن بنا لیجئے۔ یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔

لیکن اب حالات بدل چکے ہیں اور وہ اُردو جس میں گیتا رامائن اور مہابھارت کے تراجم بھی ہیں اور قرآن کے تراجم بھی۔ اب صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان بن گئی ہے، چنانچہ وہی مہاتما گاندھی اب یوں فرماتے ہیں:۔

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

صحیح صورتِ حالات سے ناواقف مذہبی ذہنیت کا یہ رنگ دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو بھی حیران رہ گئے اور انہوں نے ڈاکٹر محمود کے نام ایک طویل خط میں اُردو کے متعلق بعض ہندوؤں کے طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے حسبِ ذیل الفاظ سپردِ قلم فرمائے :۔

"عجیب بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بجانے کتنی چیزیں ہیں جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ زبان کا مسئلہ بھی مذہبی مسئلہ بن گیا ہے اور بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ میں بصد ادب عرض کروں گا کہ میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ میں اُردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جسے بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کے اس بیان کے بعد غالباً اس امر کے لئے مزید شہادت کی ضرورت نہیں کہ اُردو ہندوؤں کی بھی ویسی ہی زبان ہے جیسی مسلمانوں کی۔ لیکن میں یہاں ایک اور ہندو عالم کی تحریر کا خلاصہ بھی پیش کرتا ہوں جس سے واضح ہو جائے گا کہ اُردو اگر مسلمانوں کی "مذہبی زبان"

ہے تو ہندوؤں کی مذہبی زبان بھی ہے اور اس کے حروف بقول مہاتما جی کے صرف "قرآن کے حروف" ہی نہیں "گیتا" "رامائن" اور مہابھارت وغیرہ کے حروف بھی ہیں۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی "اُردو ہماری زبان" کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

"ہندوؤں میں مذہبی تبلیغ کا خیال دو ہزار سال بعد دوبارہ پیدا ہوا اور انہوں نے اُردو زبان کو دھرم پرچار کے سلسلے میں اختیار کیا۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے اول برسوں میں اچھوت ادھار اور شُدھی کی تبلیغ باشدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا مگر ۱۸۱۹ء میں شریمد بھاگوت کا دسواں اسکندیعنی باب اُردو کی ایک ضخیم مثنوی "آئینۂ مستور" کی صُورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اُردو میں لکھتا ہے۔ سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اُردو کو اَوراد و وظائف سے زیادہ احتیاط سے کیئے کہ مذہبی اور ملی تقریبوں سے خارج نہیں کیا۔ شکت چالیسی ایک اُردو کتاب ہے اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفے یا مناجات کی طرح پڑھتے دیکھا ہے۔"

یہ غور کرنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے۔ اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں لیکن جب تک اُردو سے کام نہیں لیا گیا اپنی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی۔ اس سلسلے میں وہ تمام لوگ اُردو دُنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم، شیو پران، گنیش پران اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نولکشور کے مطبع میں چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں، اور ہندوؤں میں اُن کے مذہب کی تلقین اور روایاتِ ملی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں۔ ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور چھٹوں شاستر اور سُمرتیاں اُردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں اور آج تک اُن کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریا سماج کے لٹریچر کا ہے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی شہادتوں کے بعد یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو ہندوؤں کی بھی ویسی ہی معاشری اور مذہبی زبان ہے جیسی مسلمانوں کی اور یہی سب سے بڑی دلیل ہے اس کے قومی زبان ہونے کی۔ ایک نوجوان ہندو شاعر منوہر لعل صاحب ہادی غالباً انہیں جذبات سے متاثر ہو کر اپنی ایک نظم میں اُردو سے یوں خطاب کرتے ہیں۔

اے زبانِ مادرِ ہندوستاں اُردو زباں — اے کہ تیری مدح میں ہندی ہیں سب رطب اللساں

تو ہی ہندی، ہندوی ہندوستانی بھی تو ہی — مسلم و ہندو کی وحدت کا ہے تو واحد نشاں

اشتراک و جذبۂ قومی سے ہے تیرا وجود — تو ہی گنج مشترک ہے تو ہی ہے قومی زباں

تجھ سے غداری ہے غداری وطن اور قوم سے

جو ترا دشمن ہے وہ ہے دشمنِ ہندوستاں

جو لوگ اس قومی زبان سے اعراض کر رہے ہیں، وہ فی الحقیقت نادانستہ طور پر وطن اور قوم سے دشمنی کر رہے ہیں۔ کوئی

انصاف پسند شخص اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس میں ہندو بھی ہمیشہ سے برابر کے شریک رہے ہیں اور اگر اس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے عربی اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں تو ہندی الاصل زبانوں کے الفاظ اس سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔ یہ بات اعداد و شمار سے بھی ثابت ہو سکتی ہے :

پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم نے فرہنگِ آصفیہ کے حوالے سے اُردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا حسبِ ذیل نقشہ پیش کیا ہے :-

ہندی (جس کے ساتھ پنجابی اور پوربی کے بعض الفاظ بھی شامل ہیں)	۲۱۶۴۴
اُردو یعنی وہ الفاظ جو غیر زبانوں سے ہندی کے ساتھ مل کر بنے	۱۷۵۰۵
عربی	۷۵۸۴
فارسی	۶۰۴۱
سنسکرت	۵۵۴
انگریزی	۵۰۰
مختلف	۱۸۱
	۵۴۰۰۹

یہ کُل الفاظ چوّن ہزار ہیں جن میں سے صرف تیرہ ہزار الفاظ عربی اور فارسی زبانوں کے ہیں اور یہ بھی کبھی مسلمان حکمرانوں نے جبراً ہندوستانی زبان میں داخل نہیں کئے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور اتحادِ عمل سے خود بخود ہندوستانیوں نے اپنی زبان میں داخل کر لئے۔ کیا ایسی زبان جس کے الفاظ کا تین چوتھائی حصہ ہندوستانی الفاظ پر اور ملا جلا کر صرف ایک چوتھائی حصہ عربی و فارسی الفاظ پر مشتمل ہو محض مسلمانوں کی مذہبی زبان کہلا سکتی ہے ؟ مسلمانوں کی مذہبی زبان تو عربی ہے اور تمام دُنیا اس سے واقف ہے۔

اُردو کے متعلق مذکورۂ بالا داخلی شہادتوں کے بعد میں چند خارجی شہادتیں بھی پیش کرتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اُردو کے بارے میں غیر جانب دار لوگوں کی کیا رائے ہے :-

مشہور لغت نویس انگریز فاضل ڈاکٹر فیلن لکھتا ہے کہ :-

جب پٹھانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اقتضائے وقت کے بموجب دو اجنبی قوموں کے درمیان معاملات سمجھنے کے لئے ایک نئی اور مرکب زبان کی بنیاد پڑی تو ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط اور روزانہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی جسے دکنی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (ماخوذ از دکن میں اُردو)

یہی دکنی بعد میں ارتقائی منازل طے کر کے اُردو کے سانچے میں ڈھلی۔

فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی لکھتا ہے:۔

"اردو کی ہندوستان بھر میں وہی حیثیت ہے جو فرنچ کی یورپ میں۔ یہی زبان ملک میں بکثرت رائج اور عدالتوں اور منڈیوں میں مستعمل ہے۔"

سر جارج کیمپبل نے لکھا ہے:۔

"میرے نزدیک یہ بہت مناسب ہے کہ تمام سرکاری سکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کی حیثیت سے جاری کر دی جائے اور مقامی زبان بھی بشرط ضرورت رکھی جائے۔ انگریزی کو ہندوستان کی عام زبان بنانا محال ہے، لہٰذا ہندوستانی کو یہ درجہ ملنا چاہئے۔ اردو ہندوستان کی لنگوا فرینکا کہی جانے کی مستحق ہے۔"

(ماخوذ از تاریخ ادب اردو سکسینہ)

ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کی ان تصریحات کے باوجود بعض لوگ محض مذہبی جذبات کی پاسداری کے لئے ایک ایسی زبان رائج کرنا چاہتے ہیں جو کسی طرح تمام ہندوستانی قوم کی نمائندہ زبان نہیں کہلا سکتی۔ چنانچہ اسی سال اردو کے گھر صوبجات متحدہ کے وزیر تعلیم نے ہندو دیارتھیوں کو یہ اپدیش دیا کہ "ہندی اتھوا ہندستانی" میں سنسکرت کے شبدوں کی اتنی بھرمار کر دو کہ ہمارے جنوبی ہند کے ہموطن بھی اُسے آسانی سے سیکھ سکیں"۔ دوسرے دن فرماں بردار طلبہ نے وزیر صاحب کو سنسکرت زبان میں ایک سپاسنامہ پیش کیا، جس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں سنسکرت اچھی طرح نہیں جانتا اس لئے ہندی میں جواب دوں گا۔ وزیر صاحب کی "ہندی اتھوا ہندستانی" ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ وہ کس زبان کو ملک کی عام زبان بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور بزعم خود سمجھتے ہیں کہ اُن کے ہموطن اسے "آسانی" سے سیکھ سکیں گے:۔

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک لِشتا ہے کہ شکشن شستیک کے پرت لوگوں کا آگرہ بہت وِشد اور بیاپک ہو گیا ہے۔ یہ بات ادھکانش بیتے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس شیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا انُبھو کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے جس مانسک اور بدھارتاک پرستھتی میں پائے جاتے ہیں اور ہماری استھت کا جو سماجک راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشیو بیاپی پرگت کو ہمارے نمکرنش بندھیہ ایک لشبس روپ میں استھت اور ایک وشیش بھارتیہ شمیہ بنا دیا ہے۔"

معلوم نہیں میں نے کیا لکھا ہے۔ شاید دس لاکھ میں سے ایک مسلمان بھی اس زبان کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہ زبان مسلمانوں کے لئے ایسی ہی ہے جیسی ہندوؤں کے لئے مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی۔ حالانکہ اردو کو مسلمانوں کی مذہبی زبان کہتے ہیں حالانکہ اردو کروڑ ہا

ہندوؤں کی مادری یا اختیاری زبان ہے۔ از برائے خدا مہاتما جی بتائیں کہ صوبجاتِ متحدہ کے وزیرِ تعلیم جس زبان کو رائج کرنا چاہتے ہیں کیا وہ فی الحقیقت ہندوؤں کی مذہبی زبان نہیں؟ اور کیا اس سے کروڑوں ہندو بھی اسی طرح ناواقف نہیں جس طرح کروڑوں مسلمان عربی سے ناواقف ہیں؟ پھر یہ ایک عظیم اکثریت کی سمجھ میں نہ آنے والی زبان کس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے؟

اگر اُردو زبان سے فارسی اور عربی کے وہ آسان الفاظ بھی خارج کر دیئے جائیں جو اَن پڑھ ہندوؤں اور اَن پڑھ مسلمانوں کی زبانوں پر بھی جاری ہیں تو بھی جو زبان باقی رہ جاتی ہے وہ وزیر صاحب کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اور ہر شخص اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مولانا ابوالقاسم حیدر آبادی نے اس قسم کی زبان میں مہاتما گاندھی کے نام دو تین کھلے خط شائع کرائے تھے جن کا حجم ہمالیہ کے تقریباً ایک سو صفحات کے برابر تھا۔ مولانا نے مہاتما گاندھی کے پاس خاطر سے یہ کوشش کی تھی کہ اُن کی تحریر میں عربی و فارسی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ نمونہ ملاحظہ فرمایئے:-

"آج کل مسلمان اور ہندو تو ایسے ہو گئے ہیں جیسے توے سے روٹی اُلٹ جاتی ہے۔ بات بات پر آپے سے باہر! یوں ہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اُٹھے۔ پھر کیا تھا۔ جھم جھاج بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو یہ آپس میں گتھ گئے۔ سمجھ والے لوگ اجڈوں کی گتھم گتھا الگ ہو کے دیکھنے لگے آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔ یہ سنتے سنتے کان جھنا گئے۔ آج یہاں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کل وہاں لاٹھی چلی۔ پرسوں اُس جگہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔" وغیرہ

مولانا نے ہزاروں الفاظ پر مشتمل خطوط اسی زبان میں لکھے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ عربی فارسی سے ضرور ہی الگ رہنا چاہتے ہیں اُن کو بھی اُردو اپنے وسیع دامن میں بہ آسانی پناہ دے سکتی ہے۔ کیا یہاں کوئی ایسا ہندوستانی موجود ہے جو اُوپر کے الفاظ کا مفہوم نہ سمجھ سکا ہو؟ اگر کوئی مسلمان عربی اور فارسی کو ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان بنانے کے خواب دیکھ رہا ہے تو وہ کان کھول کر سن لے کہ وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ ایسے ہی وہ ہندو بھی اچھی طرح سن لیں جو سنسکرت اور "آدھنِک کال" والی ہندی کو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترک زبان بنانا چاہتے ہیں کہ اُن کی یہ کوشش کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ مشکلات کا حل اُردو زبان ہی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے جسے ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے اشتراکِ عمل نے پالا پوسا اور پروان چڑھایا ہے۔ اکبر نے برسوں پہلے کیا خوب کہا تھا:-

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں	اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرءالقیس بنیں	پنڈت جی بالمیک ہونے کے نہیں

حامد علی خاں

محفلِ ادب

ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ

ایک آواز

ہم ایک عرصے سے یہ شور سُن رہے ہیں کہ ہندوستان کو اس چیز سے بچاؤ اُس چیز سے بچاؤ، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو اُن لوگوں سے بچانا چاہئے جو اس قسم کا شور پیدا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ شور پیدا کرنے کے فن میں ماہر ہیں اس میں کوئی شک نہیں مگر ان کے دل اخلاص سے خالی ہیں۔ رات کو کسی جلسے میں گرماگرم تقریر کرنے کے بعد جب یہ لوگ اپنے پُرتکلف بستروں میں سوتے ہیں تو ان کے دماغ بالکل خالی ہوتے ہیں۔ ان کی راتوں کا خفیف ترین حصہ بھی کبھی اس خیال میں نہیں گزرا کہ ہندوستان کس مرض میں مبتلا ہے۔ دراصل وہ اپنے مرض کے علاج معالجے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ انہیں اپنے وطن کے مرض کے بارے میں غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

یہ لوگ جو اپنے گھروں کا نظام درست نہیں کر سکتے، یہ لوگ جن کا کیرکٹر بے حد پست ہوتا ہے ــــ سیاست کے میدان میں اپنے وطن کا نظام ٹھیک کرنے اور لوگوں کو اخلاقیات کا سبق دینے کے لئے نکلتے ہیں ــــ کس قدر مضحکہ خیز چیز ہے!

یہ لوگ جن کو عرفِ عام میں لیڈر کہا جاتا ہے سیاست اور مذہب کو ایک لنگڑا، لولا اور زخمی آدمی تصور کرتے ہیں جس کی نمائش سے ہمارے یہاں عام طور پر گداگر بھیک مانگتے ہیں سیاست اور مذہب کی لاش ہمارے یہ نام نہاد لیڈر اپنے کاندھوں پر اُٹھائے پھرتے ہیں اور سیدھے سادے لوگوں کو جو ہر وہ بات مان لینے کے عادی ہوتے ہیں جو اُونچے سُروں میں کہی جائے۔ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اس لاش کو از سرِ نو زندگی بخش رہے ہیں۔

مذہب جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ہمیشہ ایک جیسا رہیگا، مذہب کی رُوح ایک ٹھوس حقیقت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی، مذہب ایک ایسی سخت چٹان ہے جس پر سمندر کی خشمناک سے خشمناک لہریں بھی اثر نہیں کر سکتیں۔ یہ لیڈر جب جلسوں میں آنسو بہا بہا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ مذہب خطرے میں ہے تو اس میں کوئی صداقت نہیں ہوتی۔ مذہب خطرے میں نہیں ہے۔ مذہب ایسی چیز ہی نہیں کہ وُہ خطرے میں پڑ سکے۔ اگر کسی بات کا خطرہ ہے تو وہ ان لیڈروں کو ہے جو اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے مذہب کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔

ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ، جو ملک کی فضا کو بگاڑ رہے ہیں اور عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے یہ تمام نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک لمبی دوڑ ہے سرمائے کے پیچھے اِن کے سانس میں آپ ریاکاری اور دغابازی کا تعفن محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کا ایمان تین دمڑی کا پیسہ ہے!

لمبے لمبے جلوس نکال کر منوں بھاری ہاروں کے نیچے دب کر چوراہوں پر طول طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر، ہماری قوم کے نام نہاد راہ نما اپنے لئے ایک ایسا راستہ بناتے ہیں جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے۔

یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں، مگر کیا اُنہوں نے آج تک بیکاری کا حل پیش کیا ہے؟ — یہ لوگ مذہب، مذہب چلاتے ہیں مگر کیا انہوں نے خود کبھی مذہب کے احکام کی پیروی کی ہے؟ — یہ لوگ جو خیرات میں دیئے ہوئے مکانوں میں رہتے ہیں اور چندوں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں، جو مستعار سانسوں سے جیتے ہیں جن کی رُوح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ پیر شل ہیں، وُہ ملک و ملّت کی راہبری کیسے کرسکتے ہیں؟

ہندوستان کو بیشمار لیڈروں کی ضرورت نہیں جو نئے سے نیا راگ الاپتے رہیں۔ ہمارے وطن کو صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا سا اخلاص رکھتا ہو جس کے سینے میں اتا ترک کا سا ہیجانہ جذبہ ہو — جو برہنہ پا اور گرسنہ شکم آگے بڑھے اور وطن کے بے لگام گھوڑے کے مُنہ میں باگیں ڈال کر اسے آزادی کے میدان کی طرف مردانہ وار لے جائے۔ یاد رکھیے وطن کی خدمت شکم سیر لوگ کبھی نہ کرسکیں گے وزنی معدے کے ساتھ جو شخص وطن یا مذہب کی خدمت کے لئے آگے بڑھے اُسے لات مار کر باہر نکال دیجئے حریر و پرنیاں میں لپٹے ہوئے آدمی ان لوگوں کی قیادت نہیں کرسکتے جو سخت زمین پر سونے کے عادی ہیں اور جن کے بدن نرم و نازک پوشاک سے ہمیشہ ناآشنا رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ریشمی کپڑے پہن کر آپ کو غربت کا سدِّ باب بتانے کی جرات کرے تو اس کو اُٹھا کر وہیں پھینک دیجئے جہاں سے نکل کر وُہ آپ لوگوں میں آیا تھا۔ یہ لیڈر کھٹمل ہیں جو وطن کی کھاٹ میں چُولوں کے اندر گھسے ہوئے ہیں، ان کو نفرت کے اُبلتے ہوئے پانی کے ذریعے سے باہر نکال دینا چاہئے۔ یہ لیڈر جلسوں میں سرمائے اور سرمایہ داروں کے خلاف زہر اُگلتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ خود سرمایہ اکٹھا کرسکیں کیا یہ سرمایہ داروں سے بدتر نہیں؟ — یہ چوروں کے چور ہیں، رہزنوں کے رہزن — اب وقت آگیا ہے کہ عوام ان پر اپنی بے اعتمادی ظاہر کردیں۔

ضرورت ہے کہ پھٹی ہوئی قمیصوں والے نوجوان اُٹھیں اور عزم و خشم کو اپنی چوڑی چھاتیوں میں لے کر ان نام نہاد لیڈروں کو اُس بلند مقام پر سے اُٹھا کر نیچے پھینک دیں جہاں یہ ہماری اجازت کے بغیر چڑھ بیٹھے ہیں۔ ان کو ہمارے ساتھ ہم غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا کوئی حق حاصل نہیں — یاد رکھئے غربت لعنت نہیں ہے۔ جو لوگ اسے لعنت ظاہر کرتے ہیں، وہ خود ملعون ہیں، وہ غریب ان امیر سے لاکھ درجے بہتر ہے جو اپنی کشتی خود اپنے ہاتھوں سے کھیتا ہے — اپنی کشتی کے کھویا خود آپ بنیے، اپنا نفع نقصان خود آپ سمجھئے اور پھر ان لیڈروں، ان نام نہاد رہنماؤں کا تماشا دیکھئے کہ وہ زندگی کے وسیع سمندر میں اپنی زندگی کا وزنی جہاز کس طرح چلاتے ہیں۔

(س۔ ح) "مصوّر" بمبئی

باون سال پُرانی قومی نظم

گذشتہ جنوری میں جب مجھے اٹاوہ جانے کا اتفاق ہوا تو میرے ایک محترم ہندو دوست نے حضرت اشہری مرحوم کی ذیل کی قومی نظم سنائی۔ یہ نظم ۱۸۸۶ء میں لکھی گئی تھی اور غالباً اُردو زبان میں اس رنگ کی پہلی قومی نظم ہے جس میں برطانوی سامراج کے ہاتھوں ہندوستان کی صنعت و حرفت کی بربادی کا ذکر کیا گیا ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس قسم کے خیالات جن میں ہندوستان کی سابقہ عظمت اور موجودہ تباہی کا ذکر ہو حد درجہ باغیانہ سمجھے جاتے تھے۔ اُس زمانہ کے حالات آج کل کے زمانہ سے بالکل مختلف تھے۔ جس زمانہ میں یہ نظم لکھی گئی اس سے ایک سال قبل کانگریس کی بنیاد مسٹر ہیوم اور سر ولیم ویڈربرن کے ہاتھوں رکھی جاچکی تھی۔ مگر اس زمانہ کی کانگریس بھی سولہ آنہ جی حضوریوں اور سرکار پرستوں کی جماعت تھی۔ حضرت علامہ اقبال مرحوم کی مشہور نظم "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" اس نظم کے بہت عرصہ بعد لکھی گئی تھی۔

اشہری مرحوم اپنے زمانہ کے بہت بلند پایہ آدمیوں میں سے تھے۔ آپ سرسید علیہ الرحمۃ کے ہمعصر اور نواب محسن الملک کے قریبی عزیزوں میں سے تھے اپنی زندگی میں بیس سے زائد کتابیں لکھیں مگر ان میں سے اکثر کے طبع ہونے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ رشتۂ حیات منقطع ہوگیا۔ پورا نام سید امجد علی اور وطن اٹاوہ تھا۔

کافی عرصہ ... والیِ بھوپال کی ملازمت میں بھی رہے اور نہایت قدرومنزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اولادِ نرینہ کوئی نہیں چھوڑی ہاں ایک صاحبزادی ان کی یادگار ہیں جو تاحال بقیدِ حیات ہیں اور بہ عالمِ ضعیفی اپنی زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہی ہیں۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اشہری مرحوم کے نام سے واقف ہوں۔ میرے والد صاحب قبلہ مغفور ان کا کچھ کلام زبانی سنایا کرتے ہیں اس کے علاوہ مرحوم کی بعض تصانیف بھی نثر اور نظم دونوں میری نظر سے گزری ہیں، جن سے ان کی قادرالکلامی، زورِ قلم اور ندرتِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ اتفاقِ زمانہ ہے کہ آپ نے زمانہ کا ایسا بلند پایہ شاعر اور یکتائے روزگار ادیب ملک میں شہرتِ دوام اور مقبولیتِ عوام حاصل نہ کر سکا۔ سچ کہا ہے ؎

"ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

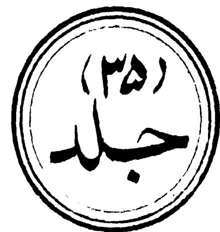
اشہری مرحوم کی یہ تاریخی اور قومی نظم اس زمانہ میں کسی کتاب یا رسالہ میں ضرور چھپی ہوگی مگر میری نظر سے نہیں گزری۔ علم دوست حضرات کے لئے یہ نظم کئی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہے۔ اردو زبان میں اس نظم سے پرانی کوئی اور قومی نظم غالباً نہیں ملے گی اور اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں وطنیت سے متعلق قومی شاعری کی ابتدا اشہری مرحوم کی اس نظم سے ہوتی ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی نظم بہت بلند پایہ ہے مختلف لفظی اور معنوی رعایتوں کو نظم میں اس طرح جمع کر دیا ہے کہ ہر شعر بجائے خود صنائع و بدائع کا مکمل نمونہ بن گیا ہے اور شاعر کی قادرالکلامی پر دلالت کرتا ہے نظمِ مذکور کے جس قدر اشعار مجھے دستیاب ہو سکے وہ ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

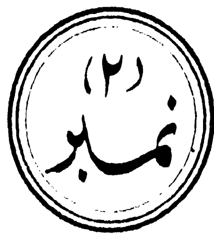
ہر ملک تھا جہاں میں افسانہ خواں ہمارا — ہوتا نہ تھا بت اُدھر چرچا کہاں ہمارا
لہراتے تھے جہاں میں فوجوں کے اپنے پرچم — چلتا تھا سب کے آگے طبل و نشاں ہمارا
پشمینہ، سوت ریشم، مشہور تھا یہاں کا — اب اُن کے بدلے باقی ہے تار جاں ہمارا
کمخواب کے عوض میں سونا تھا ہم کو ملتا — سستا سمجھ کے لیتے سوداگراں ہمارا
کشمیر کے دوشالے دُنیا میں فرد نکلے — تھا صنعتوں کا شاید پہلے جہاں ہمارا
پتھر کی صنعتوں میں یہ ملک تھا نمونہ — ملتا کہیں کہیں ہے پچھلا نشاں ہمارا
ہے زعفراں ہمارا پھولوں سے بڑھ کے اب بھی — فصلِ بہار دیکھے رنگِ خزاں ہمارا
سونے کی کانیں اس میں قسمت جگا رہی ہیں — لیکن سُلا رہا ہے خوابِ گراں ہمارا
گر صنعتیں یہاں کی پھر زندہ ہوں تو دیکھو — جی جائے پھر جہاں میں یہ نیم جاں ہمارا
جبتک جہاز اپنے ہر سُو رواں نہ ہونگے — ہرگز نہ ہوگا اُونچا اُلٹا نشاں ہمارا
اُٹھے اسی زمیں سے، جینا اسی زمیں پر — ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا
مُردے ہوئے تو کیا ہے، تم پھر جلا لو ہم کو — مرنے سے بھی ہے آساں جینا یہاں ہمارا
اے اشہری جہاں میں ہم خاک ہو چکے ہیں — اکسیر اب بنائے کشتہ جہاں ہمارا

(محمد شفیع علوی)

"دین و دُنیا"

فہرستِ مضامین





"ہمایوں" بابت ماہ فروری ۱۹۳۹ء

تصویر:- جدید ترکی کے ایک نسوانی مدرسے میں سائنس کی تعلیم

چندہ سالانہ صہ، ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

اگرچہ کانگرس نے جب سے وہ بڑی بن گئی ہے" بڑے دنوں" کی سرپرستی چھوڑ دی ہے پھر بھی بڑے دنوں کی چہل پہل قائم ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اتنے دنوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں اور ریل کے کرائے میں تخفیف ہو جاتی ہے جس پر غریب الوطن تو گھروں کا رخ کرتے ہیں اور گھر میں بیٹھے ہوئے لوگ منہ اُٹھا کر جدھر جی میں آئے چل دیتے ہیں تاکہ اس ارزانی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی جیب خالی کریں۔

کانگرس نہیں لیکن اَور بیسیوں انجمنیں کانفرنسیں سبھائیں اپنے سالانہ جلسے بڑے دنوں میں منعقد کرتی ہیں۔ میں نے بھی اس دفعہ اس سیر تماشے سے لطف اُٹھایا۔

پہلے لاہور میں انجمن حمایت اسلام کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جلسہ ۲۳ دسمبر ۱۹۳۸ء کو شروع ہوا اور چار روز تک بڑی شان و شوکت سے جاری رہا۔ حسبِ معمول تقریریں کی گئیں اور نظمیں پڑھی گئیں لیکن ان کے علاوہ سکاؤٹ مظاہرہ مشاعرہ مناظرہ وغیرہ بھی منعقد ہوئے۔ ۲۶ دسمبر کو پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا چھبیسواں اجلاس ہوا۔ اُن چالیس بیالیس ہزار اشخاص کے اجتماع کا نظارہ جو وہاں جمع ہوئے میں نے بھی اپنی آنکھوں دیکھا۔

موجودہ ہندوستان میں بڑے بڑے مجمعوں کا آغاز بلاشبہ کانگرس کی طرف سے ہوا۔ اس کے بعد کچھ اُس سے متاثر ہو کر اور زیادہ تر ملکی و غیر ملکی نئے حالات کے اثر سے ایک عام بیداری ہندوستان کی قوموں میں پیدا ہو گئی۔

پٹنہ میں مسلمانوں کی بیداری کا یہ منظر حیرت افزا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ ایک بڑا مجمع تھا۔ بڑے مجمعے تو میلوں ٹھیلوں میں اور میچوں گھڑ دوڑوں میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں لیکن جو چیز غیر متوقع تھی وہ لیگ کے اجلاس میں باوجود اس جمِ غفیر کے خاموشی باقاعدگی اور بالخصوص لوگوں کا ہمہ تن متوجہ ہونا تھا ورنہ مسلمانوں کے جلسے اکثر صرف جوش کا مظاہرہ ہوا کرتے تھے۔ حاضرین اس طرح گویا دم بخود تھے اس طرح سٹیج کی طرف دیکھتے اور تقریروں کو سنتے تھے اُن کی نگاہوں میں ایک ایسا تجسس تھا وُہ یوں ہمہ تن گوش تھے جیسے اُن کے دل اور اُن کی نظریں ایک خاص مرکز کی طرف کھچی چلی جاتی ہیں۔ عوام کی یہ حالت ایسی تھی کہ خواص بھی اس سے متاثر تھے اور اس تاثر میں غالباً اُن میں سے کئی محسوس کرتے تھے کہ اب ہم پر ایک عام ذمہ داری کی جگہ عوام کے متعلق ایک خاص ذمہ داری عاید ہو گئی ہے۔ ایسے وقتوں میں "ایک قوم" کی سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے اُس کی قومیت آزمائش کی آگ میں ڈالی جاتی ہے اور زمانہ دیکھتا ہے کہ وہ جل کے راکھ ہو گئی ہے یا کندن بن کے چمکنے لگی ہے؟

مسلمانوں کی تنظیم ہندوستان کے لئے ایک مبارک فال ہے۔ مدت ہوئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندو بھائی ترقی کے میدان میں اُترے اُنیسویں صدی کے اخیر میں کانگرس نے اُن کو جمع کیا، جنگِ عظیم کے بعد گاندھی جی نے اُن میں ایک نئی رُوح پھونکی، وُہ صدیوں کے بعد جاگے اُٹھے اَور صحیح معنوں میں زندہ ہوئے۔ کچھ اُنہیں دیکھ کر کچھ مسلمان ملکوں کی بیداری سے اور کچھ دُنیا کی عام حالت سے متاثر ہو کر ہندوستان کے غافل

مسلمانوں میں بھی جنبش کے آثار نظر آنے لگے۔ ہندو مسلمان ایک ہی ملک کے باشندے ہیں لیکن پھر بھی جیسا کہ خود کانگرس کی عقلمندی اعتراف کر چکی ہے اِن دونوں کا کلچر ایک حد تک جُدا جُدا ہے۔ لہٰذا ملک کی ترقی کا تقاضا ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ترقی کریں اپنے اپنے کلچر کو فروغ دے کر اپنی اپنی جماعت میں زندگی پیدا کریں۔ اِس جُداگانہ قومی تنظیم سے ہمیں ڈرنا اور گھبرانا نہ چاہئیے، صرف یہ کوشش کرنی چاہئیے کہ اس جُداگانہ تنظیم میں اُن کے رہنما پُرخلوص اور دُوراندیش ہوں جو مشکل اوقات میں اپنی قوم کی کشتی کے ہوشیار ملّاح ثابت ہوں اور مناسب وقت پر ہمسایہ قوم سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

یہ تو ہے جُداگانہ تنظیم کی کہانی لیکن اِس کے ساتھ ہی ساتھ ایک مشترک تنظیم بھی ہے اور ہونی چاہئیے۔ پٹنہ سے رخصت ہو کر میں چند روز الہ آباد میں ٹھہرا۔ وہاں سر تیج بہادر سپرو سے ملاقات ہوئی اور ہندو مسلمانوں کے مشترک کلچر پر بات چیت ہوئی۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے اُردو کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اُردو ہندی کے متعلق جو سیاسی جھگڑے ہو رہے ہیں مجھے اُن سے سروکار نہیں، نہ میں کانگرس کا ممبر ہوں نہ مسلم لیگ سے مجھے غرض ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ زبان کے معاملے میں مَیں ہر طرح اُردو کا حامی اور مددگار رہوں کیونکہ اُردو ہمارے مشترک قومی تمدن کا سب سے صحیح نمونہ ہے۔ فرمانے لگے کہ زبان کے معاملے میں اگر پچیس کروڑ آدمی بھی ایک طرف ہو جائیں گے تو مَیں اُردو والوں کا ساتھ دُوں گا۔ پھر زبان کی نوعیت کا ذکر ہؤا۔ کہا کہ نہ میں بڑے بڑے عربی الفاظ کا دلدادہ نہ بھاری بھرکم سنسکرت الفاظ کا۔ ایک مزے کی بات اُنہوں نے سنائی کہ میرے پاس چند ہندو مسلمان نوجوان آگئے اور دَورانِ گفتگو میں شکایت کرنے لگے کہ آپ کی زبان مصنوعی ہے جو دیہاتی لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ میں نے کہا ہاں مجھ سے غلطی ہوئی کہ آپ سے کہا "تشریف لائیے" شاید بہتر ہوتا کہ میں "بیٹھ رے سالے" کہتا۔

سر سپرو کا خیال ہے کہ نئی ہندی ہندوستانی کی تحریک زبان اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے خطرناک ہے۔ اُردو سب کی زبان ہے اور اُس کی صحیح شکل وہ ہے جو شمالی ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

لیکن آج کل تو ایک طوفانِ بےتمیزی برپا ہے، ہر شے فرقہ داری کا رنگ اختیار کر رہی ہے، بیچاری اُردو کا مُنہ بھی کالا کیا جا رہا ہے، بلکہ اُس سے اُس کا نام بھی چھینا جا رہا ہے۔ اس زبردستی کے عمل میں ضروری ہے کہ ٹھنڈے دِل سے سوچنے والے اپنی اس قومی زبان کی حفاظت کریں اور اُس کی ترقی میں حصّہ لیں۔

چند روز ہوئے مولانا عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو لاہور تشریف لائے۔ اسی سلسلے میں ۲۷ جنوری کو میرے ہاں ایک مختصر سی اُردو چائے پارٹی میں پنجاب کے بعض اُدبا کے درمیان تبادلۂ خیالات ہؤا۔ سیاسی سرگرمی والو! کبھی کبھی ہم ادب کے پیاسے باہم مِل بیٹھیں تو کیا حرج ہے؟

بشیر احمد

جہاں نما

ہندوستان کی موجودہ ضروریات

ڈاکٹر جے سی گھوش صدر شعبۂ کیمیا ڈھاکہ یونیورسٹی نے "انڈین سائنس کانگریس" کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیا کہ ہندوستان کو اب سیاسی ہنگامہ آرائیوں، جوشیلی تقریروں اور جماعتی مخاصمتوں کو چھوڑ کر اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی تجاویز پر عمل کرنا چاہیئے۔

اسی خیال کا اظہار ہندوستان کے مختلف صوبوں کے وزرائے تجارت کی کانفرنس کی اس قرارداد سے ہوتا ہے کہ "افلاس، بے روزگاری، تحفظِ ملک اور اقتصادی ترقی کے عقدوں کا حل صنعتی کارخانوں کے قیام کے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

یہ ملک اس قدر غریب ہے کہ جب تک اس کی مالی حالت بہتر نہ ہو یہ اپنی حفاظت کا بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کو ایک زبردست بحری اور ہوائی بیڑے کی ضرورت ہے لیکن روپے کے بغیر نہ جہاز بن سکتے ہیں نہ طیارے۔ ہندوستان ہر سال فوجی مصارف کا رونا روتا ہے۔ دراصل فوجی مصارف غیر ضروری نہیں بلکہ ہندوستان غریب ہے اور اس بوجھ کے اٹھانے کے قابل نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دے کر ملکی حفاظت کے لئے اس سے بہتر سامان مہیا کریں کیونکہ دُنیا کے حالات روز بروز اس سُرعت سے تبدیل ہو رہے ہیں کہ کسی کو معلوم نہیں کل کیا ہوگا۔

اگر "انڈین نیشنل کانگریس" واقعی سوراج حاصل کرنا چاہتی ہے تو اُسے بقولِ صدر "سائنس کانگریس" "ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے اور قومی دولت کے بڑھانے کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔" اگر وہ اس ایک بات میں کامیاب ہوگئی تو ہندوستان بہت جلد حقیقی طور پر آزاد اور دشمنوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔

ہمیں "شہنشاہیت" کو مٹانے پر زیادہ زور صرف کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ تخریب کے بجائے تعمیر بہرحال ہمارے لئے بہتر رہے گی۔ ہمیں پہاڑ کے ساتھ ٹکر مارنے سے پہلے خود پہاڑ کی طرح مضبوط بن جانے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان تعمیری طریقوں پر عمل کرنے کے بغیر نہ مضبوط ہو سکتا ہے نہ حقیقی طور پر آزاد۔

مہاتما گاندھی کے بعض پیرو مشینوں اور کارخانوں کے مخالف ہیں۔ اُن کے لئے پنڈت جواہر لعل نہرو کے یہ الفاظ شاید مفید ثابت ہوں "یورپ کے سائنٹیفک کلچر اور ہمارے کلچر میں ایک فطری آویزش سی نظر آتی ہے۔ اگر مغربی ثقافت سیاسی فاتح کے رُوپ میں نہ آتی تو اس قسم کی کوئی آویزش نہ ہوتی۔ ثقافت کو سیاسی تعصبات سے بالاتر رہنا چاہیئے۔ مَیں نے سپین میں سائنس کا ناجائز استعمال دیکھا ہے۔ ہندوستان کو اپنی رُوحانی ثقافت اور مغرب کی مشینی تہذیب کے ملاپ سے ایک ایسی صُورت پیدا کر دینی چاہیئے کہ سپین کے مظالم کی نوعیت کے ہنگاموں کا امکان باقی نہ رہے۔"

مسٹر سبھاش چندر بوس صدر "انڈین نیشنل کانگریس" نے "آل انڈیا سٹوڈنٹس کانفرنس" کو حال ہی میں یہ پیغام دیا تھا کہ "ہم اب آزادی کی منزل

کے قریب پہنچ گئے ہیں جس طرح ہمارے لئے آزادی حاصل کرنے کا خیال اہم ہے آئندہ نسل کے لئے آزادی کو برقرار رکھنے کا خیال اہم ہوگا لیکن یاد رکھئے کہ آزادی صرف رواداری اور باہمی اتحاد کی حکمتِ عملی سے قائم رہ سکتی ہے۔"

اگر مُسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتا ہو جائے تو اس قسم کی رواداراُنہ فضا بہت جلد پیدا ہو سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں آزادی کی منزل قریب تر آسکتی ہے۔

اب ملک کی قیادت مجنون غیر مآل اندیش اور خود غرض "محبانِ وطن" کے ہاتھ میں نہیں رہنی چاہیئے جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے قوم کے سیاسی اور مذہبی جذبات سے کھیلتے ہیں اور قوم کو نقصان پہنچا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ اب جنگجویانہ آوازے کسنے کی ضرورت نہیں نہ نفرت اور عداوت کے گیت گانے کا موقع ہے۔

ایران میں اصلاحات کا دَور دورہ اور مُلّاؤں کا خاتمہ

ڈبلیو لنڈن کلف نے "ایشیا" میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں ایران کی اُن اصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے جو رضا شاہ کے عہد میں نافذ ہوئی ہیں۔ ایرانی زبان کو یکساں بنانے کے لئے زبردست کوشش جاری ہے۔ اِس مقصد کے لئے ایک لسانی ادارہ قائم کیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً ایسے الفاظ کی فہرست شائع کرتا رہتا ہے جو زبان سے خارج کر دینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ عموماً عرب، ترکی اور روس کے نووارد ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ اِن الفاظ کو خارج کر کے اُن کے لئے خالص ایرانی مرادفات شائع کر دیتا ہے۔

فارسی رسم الخط کی خاص طور پر قدر افزائی کی جا رہی ہے، مثلاً رومن رسم الخط کے مقابلے میں فارسی رسم الخط میں لکھے ہوئے تار کم اُجرت میں جاتے ہیں جن خطوں کے پتے رومن رسم الخط کے بجائے فارسی میں لکھے ہوں وُہ مقابلتہً جلد پہنچا دیئے جاتے ہیں۔

غیر ملکیوں کے لئے سرکاری دستاویزیں بھی فارسی ہی میں لکھی جاتی ہیں البتہ "فرنگیوں" کی آسانی کے لئے ایک فرانسیسی ترجمہ بھی مہیا کر دیا جاتا ہے۔

مذہبی اور معاشری اصلاح کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے چنانچہ ملّاؤں کا قریب قریب خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ آج سے دس سال پہلے تک مُلّا تمام مذہبی اور بیشتر تمدّنی معاملات پر حاوی تھے۔ تمام سلطنت ملّاؤں سے پامال ہو چکی تھی۔ لیکن اب مُلّاؤں کے بڑے بڑے عماموں اور چوغوں کا جلوہ ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتا۔ کہتے ہیں پورے اصفہان میں اب صرف سات مُلّا باقی ہیں۔ لیکن جن مُلّاؤں کو سلطنت کی طرف سے باقی رہنے کا حق حاصل ہے اُن کا اثر و اقتدار بھی بہت محدُود کر دیا گیا ہے اور سیاسیات میں دخل دینے سے تو وہ قطعاً روک دیئے گئے ہیں۔

ملّاؤں نے دوسری اصلاحات کی طرح لباس کی اصلاح کو روکنے کی بھی بہت کوشش کی۔ بالخصوص مشہد کے ملّاؤں نے عمامے کے قائم رکھنے پر بہت زور دیا۔ لیکن حکومت اس نکتہ سے خوب واقف تھی کہ عمامے اور ہیٹ کا مسئلہ دراصل حکومت اور ملّاؤں کے اقتدار

کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ مُلّا قید کر دیئے گئے اور ۱۹۳۶ئہ میں یہ اصلاح عام طور پر رائج ہو گئی۔

اس کامیابی نے حکومت کو موقع دیا کہ زنانہ لباس کی طرف بھی توجہ کرے۔ مُلک کی نوجوان لڑکیوں کے دلوں میں پُرانی قیود سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک زبردست جذبہ پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ اس باب میں حکومت کو دشواری پیش نہ آئی اور ضروری اصلاحات آسانی سے رائج ہو گئیں۔

اِن اصلاحات کے نتائج بالخصوص خانگی زندگی کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

تعدّدِ ازدواج کی رسم نظری طور ہی پر نہیں عملی طور پر بھی تقریباً بالکل مِٹ گئی ہے، کیونکہ معیارِ زندگی کے بلند ہو جانے کے ساتھ مصارف اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اب ایک شخص دوسری بیوی کی عشرت پر ایک ریڈیو یا ایک موٹر کار کو ترجیح دے سکتا ہے

شادی اور طلاق کے معاملات میں مُلّاؤں کے بجائے دیوانی عدالتوں کے اقتدار سے یہ فائدہ ہُوا ہے کہ طلاق پہلے کی طرح مضحکہ انگیز طور پر آسان نہیں رہی اور وقتی جذبے کے ماتحت "عارضی نکاح" (متعہ) کرنے کی رسم بھی مِٹتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مُلّاؤں کے مقابلہ میں عدالتوں کو "مرد عورت کے حقوق کی مساوات" کے مسئلے سے زیادہ ہمدردی ہے۔

قوم کی زندگی پر ان اصلاحات کا عام اثر بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایرانیوں میں ایک نئی خودداری اور اس کے ساتھ اعتمادِ نفس پیدا ہو گیا ہے۔

سر رادھا کرشنا کا اِنتباہ

بنارس ہندو یونیورسٹی کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے سر رادھا کرشنا نے یہ اعلان کیا کہ اگر سلطنتِ برطانیہ نے مناسب وقت کے اندر ہندوستانیوں کو اس قابل نہ بنا دیا کہ وہ اپنے مُلک پر خود حکومت کر سکیں تو وہ اُس تباہی سے نہ بچ سکے گی جو دُوسری ایسی ہی عظیم الشان اور مستحکم سلطنتوں کے حصّے میں آتی رہی ہے۔

مشرقِ اقصےٰ میں ابھی سے ہندوستان کے امن و امان کے لئے ایک بہت بڑا زلزلہ پرورش پا رہا ہے اور سیام اور برما میں اس کے جھٹکے محسوس بھی ہونے لگے ہیں۔ جرمنی اس کوشش میں ہے کہ ایشیائے کوچک، عراق، ایران اور افغانستان کے راستے سرحدِ ہندوستان تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا لے۔ دُنیا کی اس خطرناک صُورتِ حالات میں جب تین بڑی سلطنتیں طاقت کے استعمال پر تُلی ہوئی ہیں، انگلستان کے لئے لازم ہے کہ وہ محض قول سے نہیں بلکہ عمل سے دکھا دے کہ وہ جمہوریت اور آزادی کے اعتقاد پر ثابت قدم ہے اور یوں آزاد سلطنتوں کی ایک ایسی متحدہ طاقت پیدا کرے جو اس اعتقاد کی حفاظت کے لئے کام آ سکے۔ برطانیہ کا اپنا مفاد، اور بین الاقوامی اخلاق اور انصاف اس بات کا متقاضی ہے کہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دے دی جائے۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی فیڈریشن قائم کی جائے جس کی بنا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر نہ ہو بلکہ جو ہندوستان کی مختلف جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکے اور جو صوبوں اور ریاستوں کے درمیان

نہایت استوار تعلقات پیدا کردے۔

چین میں جاپان کے مظالم

مادام چیانگ کائی شک نے چین میں جاپانی نوجوں کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے "سان فرانسسکو کرانیکل میگزین" میں لکھا ہے کہ جہاں جہاں جاپانیوں نے قدم رکھا ہے اُنہوں نے تباہی و بربادی پھیلا دی ہے۔ اُنہوں نے زمین کی چھاتی پر اور ہمارے سینوں اور دلوں پر ایسے گہرے زخم لگائے ہیں جن کا اندمال ممکن نہیں۔ اُنہوں نے قدیم شہروں اَور دیہاتوں کے مردوں عورتوں اَور بچوں کو یکساں اپنے مظالم کا نشانہ بنایا ہے اور اُن کی حالت غولِ بیابانی سے بدتر کردی ہے۔ اتنا ظلم اور جبر اس نیلگوں آسمان کے نیچے کبھی نہیں ہُوا ہوگا۔ لیکن اس "مہذّب" دَور میں کوئی ایسا بین الاقوامی قانون نہیں جو ہمیں بچا سکے کوئی ایسی قوم نہیں جو جاپان سے ان بے جا مظالم کے لئے احتساب کرے۔

بہت سے جاپانی سپاہی بھی اپنے فوجی حاکموں کے مظالم کے دل سے حامی نہیں ہیں نہ سب کے سب رضا کارانہ طور پر یہ ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ اس باب میں خود جنرل چیانگ کائی شک کی شہادت موجود ہے:

"اس وحشیانہ طریقِ جنگ میں حصّہ لینے کے مقابلے میں بعض جاپانی سپاہیوں نے خودکشی کو ترجیح دی۔ کبھی اُنہوں نے ایک دُوسرے کو ہلاک کر دیا۔ کبھی گلے میں پھندا ڈال کر لٹک گئے اَور ان کی جیبوں میں سے اکثر ایسے خطوط برآمد ہوئے جن میں اُنہوں نے جاپانی فوج کے نام اپنا "آخری پیغام" چھوڑا تھا۔"

حامد علی خاں

تصویر

"جدید ترکی کے ایک نسوانی مدرسے میں سائنس کی تعلیم"۔ یہ تصویر اَور ٹرکی کے متعلق بعض اَور تصویریں جو آئندہ چھپیں گی ہمیں محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ منشی فاضل کی عنایت سے حاصل ہوئی ہیں۔ محترمہ موصوفہ ٹرکی اور یورپ کا سفر کر چکی ہیں اور اب لاہور کے ایک نسوانی دارالعلوم کی پرنسپل ہیں۔ ان تصاویر کے لئے ہم محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"ہمایوں"

ڈاکٹر بھٹناگر کا پیغام حکومتِ پنجاب کے نام

"تعصب اور فرقہ بندی کو مٹانے کے لئے اُردو کو ترقّی و توسیع دی جائے"

۸ اردسمبر ۱۹۳۸ئ کو انجمن اُردو پنجاب کے زیرِ اہتمام "یومِ اُردو" منانے کے لئے لاہور میں جو پُر رونق جلسہ ہُوا اس کی صدارت کے فرائض مشہور فاضل سائنسدان ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر بالقابہٖ صدر شعبۂ کیمیا پنجاب یونیورسٹی نے انجام دیئے۔ اس اجلاس میں حکومتِ پنجاب کے صدرِ اعظم سر سکندر حیات خاں اور دوسرے اکابر بھی رونق افروز تھے۔ ذیل میں ڈاکٹر صاحب کا نکتہ آموز اور ہنگامہ خیز خطبۂ صدارت درج کیا جاتا ہے۔

حضرات۔ میاں بشیر احمد صاحب سکرٹری انجمن اُردو پنجاب اُن زبردست ہستیوں میں سے ہیں جو باوجود اپنی صحت اور قدو قامت کے اچھے اچھے گراں ڈیل اور قوی انسانوں کو اپنی دلفریب اور شیریں گفتار سے ایک لحہ میں ڈھا کر اپنا مطیع بنا سکتے ہیں۔ اگر اس امر کی صداقت پر کسی کو یقین نہ ہو تو اُن کو آپ بیتی سناتا ہوں۔ دو ہفتہ ہوئے کہ میرے دفتر کے دروازے پر کھٹکھٹانے کی خفیف سی آواز سُنائی پڑی۔ ابھی مشکل سے نو بجے ہوں گے۔ میں نے عرض کی کہ تشریف لے آئیے دیکھتا کیا ہوں کہ میاں صاحب تشریف لائے ہیں تعظیم سے میرا سر جُھک گیا مصافحہ کرنے کے بعد میں نے آنحضرت کی تشریف آوری سے جو مسرت مجھے نصیب ہوئی اُس کا شکریہ ادا کیا۔ میاں صاحب فرمانے لگے کہ آپ ہی نہاری تلاش میں صبح سے سرگرداں ہوں۔ پہلے گالف روڈ پر گیا۔ وہاں سے پتہ لگا کہ آپ ۳۶ جیل روڈ پر مقیم ہیں وہاں سے خبر ملی کہ آپ اپنی نئی کوٹھی میں تشریف لے گئے ہیں وہاں پہنچا تو معلوم ہُوا کہ آپ ساڑھے آٹھ بجے سے پیشتر ہی اپنے تجربہ گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر کار آپ کو یہاں آپکڑا۔ کام یہ ہے کہ ۸ اردسمبر کو یومِ اُردو منانا قرار پایا ہے اور آپ کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہوں گے۔ میں نے بہت عذر پیش کئے، بہت سمجھایا کہ یہ عزت کسی بزرگ اور باوقار اہلِ قلم کو ملنی چاہئے مگر آپ نے دو چار منٹ میں ہی مجھے قائل کر دیا اور میں نے میاں صاحب کے حکم کی تعمیل کرنا منظور کر لیا۔

میاں صاحب کا سب سے زبردست داؤ پیچ جو اس کشمکش میں کارگر ثابت ہُوا وہ یہ تھا کہ یومِ اُردو میں ہر قوم و ملت کے افراد کی شرکت لازمی ہے کیونکہ عوام النّاس میں یہ خیال زور پکڑتا جا رہا ہے کہ ہنود اُردو اور ہندوستانی کی نسبت ہندی کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ میری غیرت یہ گوارا نہ کر سکی کہ جس زبان کے خوشہ چینیوں میں پنڈت دیا شنکر نسیم، منشی ہرگوپال تفتہ، منشی بالمکند بے صبر، منشی بنواری لال شُعلہ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی بہاری لال مشتاق، لالہ تلوک چند محروم اور درگا پرشاد نادر جیسی معزز ہستیاں ہوں اُس کی ترقی اور بہبودی کے لئے جو جلسہ آج ہونا قرار پایا ہے اُس میں شریک نہ ہوں۔

قوم کی زبان بنانا اور اسے ہر پہلو سے ترقی دینا ایک شخص یا ایک جرگہ یا ایک جماعت کا کام نہیں اس کے لئے ہر فردِ بشر اور ہر جماعت اور ہر ملّت کی مجموعی کوششیں درکار ہیں۔ اُردو کی ترقی صرف بے اصُول توسیع سے نہیں ہو سکتی۔ اُردو کو ہندوستانی کہے جانے پر جو اصرار ہے اُس سے ہمیں کیا انکار ہے اُردو تو ہندوستانی کے سوا اَور کچھ ہے ہی نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ ہندوستانی کی توسیع کے لئے اُس میں تامل، تیلگو، گجراتی، بنگالی اور سنسکرت اور انگریزی کے بے شمار الفاظ ٹھونسے جائیں زیادتی ہے کم از کم میں اس قسم کی اُردو کی توسیع کو اُردو کا خاتمہ تصوّر کرتا ہوں۔ ابھی چند روز ہوئے کہ ایک صوبہ کی لیجسلیٹو کونسل میں ایک تقریر اس نئی زبان میں ہوئی۔ حاضرین کی دلچسپی کے لئے اس تقریر کے چند فقرے پیش کرتا ہوں:۔

"مسٹر پریزیڈنٹ۔ میں اس موشن پر سپیچ دینے کی آگیا کا ادھکاری ہوں۔ سرکار کی اُدر سے چاہے اس کی اپوزیشن ہو چاہے سپورٹ ہو آئی اینڈ مائی پارٹی اس تحریک کی اگھور اپوزیشن کرے گی۔ ہمارے کنٹری کا ہر چائلڈ اور ہر ینگ مین ہماری سائیڈ پر ہے اور ہمیں پرفیکٹ لشواس ہے کہ اوور وہیلنگ مجورٹی سے ہمیں پورن سکسیس ہو گی۔"

ہر زبان کی بہبودی اور ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی توسیع میں زبان کی تہذیب اور تدوین بھی شامل ہو۔ اس کی علمی استطاعت میں اگر الفاظ اور محاورات کا اضافہ ہو تو باعثِ فخر ہے مگر ایسا نہ ہونا چاہئے کہ اس اضافہ سے زبان کی فصاحت و بلاغت، شیرینی اور ترنّم اور وہ خوبیاں جو پہلے سے اُس میں موجود ہیں زائل ہو جائیں۔ نہ صرف تحریر بلکہ تقریر بھی ان طوفان خیز اور انقلاب آمیز اصلاحوں کے بارِگراں کی متحمل نہیں جو بعض رہبرانِ ملک بغیر سوچے سمجھے ہماری زبان میں داخل کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ زبان کا حُسن اس میں ہے کہ اُس کی زیبائش اور آرائش کے لئے اَیسے موتی استعمال کئے جائیں جو برتنے کے بعد اصلی پائے گئے ہوں۔ اگر خال خال محاورات نئے ہوں تو وہ سونے پر سہاگے کا کام دے سکتے ہیں مگر غیر ملکی غازہ سے کسی من موہنی صُورت کو سُرخ و سپید مٹی کی مورت بنانا کونسی صنّاعی ہے۔

یہ امر ثبوت کا محتاج نہیں کہ اُردو کسی خاص مذہب اور ملّت سے تعلّق نہیں رکھتی اور ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے صرف یہ زبان ہی ہے جو دراصل ہندو مسلم اتحاد کی زندہ نشانی ہے اور اس کی توسیع اور حفاظت ہمارا قومی فرض ہے۔ اس کام میں پنجاب، دکن، دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ مل کر ممتاز اور نمایاں حصّہ لے سکتا ہے۔ اس میں عالم فاضل سیاستدان، تاجر، سیاح کھلاڑی مؤرخ سائنسدان غرضیکہ ملک کے ہر فرد کی شرکت لازمی اور مفید ہے۔ بقولِ کیفی ؂

صاحبِ علم و فن و فہم و ادب ہیں درکار باغِ اُردوئے معلّٰی میں تب آئے گی بہار

میرا یقین ہے کہ ہندوؤں کی یہ شکایت کہ اُردو فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت سے از حد ثقیل ہوتی جاتی ہے اور مسلمانوں کا یہ گلہ کہ ہندوستانی ہندی اور سنسکرت کی آمیزش سے ذلیل ہوتی جا رہی ہے۔ واقعی بجا ہے۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ اُن صوبوں اور حکومتوں سے بیزار ہو جائیں جو یہ رنگ پیدا کرنے کی گنہگار رہیں۔ جب زبانیں بڑھتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں تو اس قسم کی دِقّتیں ضرور پیش

آتی ہیں مگر انشا پرداز اور نقاد رفتہ رفتہ ان مسئلوں کو حل کر لیتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشکل یہ ہے کہ ابھی تک اُردو کی ترقی میں طبقۂ نسواں نے جو در اصل زبان کی حفاظت کرتا ہے اور جس کے دامنِ عاطفت میں تہذیب پرورش پاتی ہے کوئی حصّہ نہیں لیا۔ اگر ہندوستان میں مرد اور عورت خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں زندگی کے تمام مراحل میں ہمرکاب ہو جائیں تو یہ دقّت جو اس وقت قطعی لاعلاج دکھائی پڑتی ہے آسانی سے رفع ہو سکتی ہے۔ نہ تو مسلمانوں کے گھروں میں ایسی ثقیل اُردو بولی جاتی ہے کہ اُس کے سمجھنے کے لئے مولانا ظفر علی کو تشریف آوری کی تکلیف اُٹھانی پڑے اور نہ ہندو گھرانوں کی مستورات اس قسم کی ہندی بولتی ہیں جو سنسکرت الفاظ سے بھرپور ہو اور پنڈت جی کی مدد کے بغیر معمولی ہندوستانی اُسے سمجھ بھی نہ سکے۔ زمانہ بصورتِ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اس لئے ہر ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ خواہ ابھی اُسے نوکریوں میں انگریزوں کے برابر تنخواہ ملے یا نہ ملے۔ خواہ اُس کو پیشیوں اور حرفتوں میں ابھی وہ آسانیاں بہم نہ ہوں جو اور قوموں کو ہیں خواہ اُسے سوراج ملے یا نہ ملے پہلے یہ کوشش کرے کہ ہماری ملکی زبان ایک ہو جائے۔ اگر یہ ہو گیا تو اور مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی۔ اس وقت پنجاب کی حکومت کی باگ ڈور اہلِ پنجاب کے ہاتھ میں ہے۔ پنجاب کو اُردو سے گہرا تعلق ہے۔ اُردو کے گلدستۂ سخن میں مناظرِ قدرت کی رنگینیوں کی آمیزش کی ایجاد اس شہر لاہور ہی میں ہوئی۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ پنجاب اُن خطّوں میں سے ہے جنہیں اُردو سے خصوصیت ہے۔ اُردو کی ترقی و توسیع حکومتِ پنجاب کا فرضِ اولیں ہے۔ اگر پنجاب کو تعصب اور فرقہ بندی کے مرض سے نجات دلانا حکومت کا مقصد ہے تو اس مقدس ارادہ میں کامیابی کی صورت تب ہی ہو سکتی ہے جب اس صوبہ میں اُردو ملکی زبان قرار دی جائے۔ پنجاب کو تمدنی اور ملکی ترقی کے لحاظ سے بہت اُونچا رُتبہ حاصل نہیں۔ مگر اس صوبہ کا وقار اس میں ہے کہ ہندوستان کی ملکی زبان یعنی اُردو کی سب سے اعلیٰ خدمات انجام دینے کا سہرا اس کے سر ہو اور ہر پنجابی فخر سے کہہ سکے کہ آزاد ہندوستان میں بیاہیانہ شان صنعت اور حرفت، زراعت اور دولت خواہ کسی صوبہ کی کمائی ہوئی ہو لیکن ہندوستان کی ملکی زبان یعنی اُردو کم از کم پنجاب کی مرہونِ منّت ہے، کاش کہ حکومتِ پنجاب آزادی کی جنگ کے بعد فخر سے کہہ سکے کہ ہم نے ملک کو ایک زبان دے کر آزادی کے سب سے مشکل اور دقیق مسئلوں کو حل کیا ہے۔ حکومت اکثر اوقات اقتصادی اثرات سے ڈر کر اُن دُور اندیشیوں سے بے بہرہ ہو جاتی ہے جو اصلی آزادی کی طرف لے جاتی ہیں۔ مگر مجھے یقینِ کامل ہے کہ یہ حکومت زبان کے بارے میں اپنے اہم فرائض ادا کرے گی۔ ؎

کیوں نہ اُمیدِ رہبری ہو مجھے
خضر کا رہنما سکندر رہے

ایس۔ ایس۔ بھٹناگر

اجنتا

دکن میں اجنتا کے قدیم مندر جو پہاڑوں میں پتھر کی عظیم الشان چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں فنِ تعمیر، سنگتراشی اور بُت سازی کے نادرِ روزگار نمونے ہیں۔ "ہمایوں"

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہُنر برسوں
جہاں گُھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنّتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وُہ خوابوں کی بستی ہے

شرابِ شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وُہ لطف آتا ہے دُعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُر سکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقشِ حسن و عشق کی گھاتیں
پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن، جان لیوا چاندنی راتیں
فضا میں گونجتی رہتی ہیں ہر دم دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکا نوجوانی کا

سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی

مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا

یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مِل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا

چٹانوں پہ بنایا نقش دل کی بیقراری کا
سکھایا گُر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی

جگرداروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے

اداؤں سے عیاں ہی لذتِ دردِ جگر دی ہے
کھلیں گے راز، اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے راز کہتی ہیں

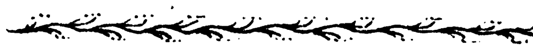
کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا
جنہیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا
قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر
خوشامد اہلِ دنیا کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر
جئے بھی کام کی خاطر، مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائینگے شاہوں کے

سکندر علی وجد



منتر

ننھا رام، ننھا تو تھا لیکن شرارتوں کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ وُہ چہرے سے بے حد بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا۔ کوئی خط یا نقش ایسا نہیں تھا جو شوخی کا پتہ دے۔ اُس کے جسم کا ہر عضو بھدّے پن کی حد تک موٹا تھا۔ جب وہ چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فٹ بال لُڑھک رہا ہے۔ عمر بمشکل آٹھ برس کی ہو گی مگر بلا کا ذہین اور چالاک تھا لیکن اُس کی ذہانت اور چالاکی کا پتا اُس کے سراپا سے لگانا بہت مشکل تھا۔ مسٹر شنکر اچاریہ ایم اے، ایل ایل بی، رام کے پتا کہا کرتے تھے کہ "مُنہ میں رام رام اور بغل میں چھری" والی مثال اِس رام ہی کے لئے بنائی گئی تھی۔ رام کے مُنہ سے رام رام تو کسی نے سُنا نہیں تھا مگر اُس کی بغل میں چُھری کے بجائے ایک چھوٹی سی چھڑی ضرور ہوا کرتی تھی جس سے وُہ کبھی کبھی ڈگلس فیئر بینکس یعنی بغدادی چور کی تیغ زنی کی نقل کیا کرتا تھا۔

جب رام کی ماں یعنی مسز راما شنکر اچاریہ اُس کو کان سے پکڑ کر اُس کے باپ کے سامنے لائیں تو وُہ بالکل خاموش تھا۔ آنکھیں خشک تھیں، اُس کا ایک کان جو اُس کی ماں کے ہاتھ میں تھا دوسرے کان سے بڑا معلوم ہوتا تھا، وہ مُسکرا رہا تھا۔ مگر اِس مسکراہٹ میں بلا کا بھولا پن تھا۔ اُس کی ماں کا چہرہ غصّے سے تمتمایا ہُوا تھا، مگر اُس کے چہرے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وُہ اپنی ماں سے کھیل رہا ہے اور وہ اپنے کان کو ماں کے ہاتھ میں دے کر ایک خاص قسم کا لُطف اُٹھا رہا ہے جس کو وُہ دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

جب رام، مسٹر شنکر اچاریہ کے سامنے لایا گیا، تو وہ آرام کرسی پر جم کر بیٹھ گئے کہ اُس نالائق کے کان کھینچیں، حالانکہ وہ اُس کے کان کھینچ کھینچ کر کانی سے زیادہ لمبے کر چکے تھے اور اُس کی شرارتوں میں کوئی فرق نہ آنے پایا تھا۔ وہ عدالت میں قانون کے زور پر بہت کچھ کر لیتے تھے، مگر یہاں اس چھوٹے سے لونڈے کے سامنے اُن کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔

ایک مرتبہ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے کسی شرارت پر اُس کو پرمیشور کے نام سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا "دیکھ رام، تُو اچھا لڑکا بن جا، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ پرمیشور تجھ سے خفا ہو جائیں گے۔"

رام نے جواب دیا تھا "آپ بھی تو خفا ہو جایا کرتے ہیں اور مَیں آپ کو منا لیا کرتا ہوں" اور پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُس نے یہ پُوچھا تھا "باپو جی، یہ پرمیشور کون ہیں؟"

مسٹر شنکر اچاریہ نے اُسے سمجھانے کے لئے جواب دیا تھا "بھگوان، اور کون ——— ہم سب سے بڑے"

"اس مکان جتنے؟"

"اس سے بھی بڑے ___ دیکھ اب تو کوئی شرارت نہ کیجیو، ورنہ وہ تجھے مار ڈالیں گے!" مسٹر شنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے پر ہیبت طاری کرنے کے لئے پرمیشور کو اس سے بھی زیادہ ڈراؤنی شکل میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال کر لیا تھا کہ اب رام سُدھر جائیگا اور کوئی شرارت نہ کرے گا مگر رام جو اس وقت خاموش بیٹھا تھا اپنے ذہن کی ترازو میں پرمیشور کو تول رہا تھا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد جب اُس نے بڑے بھولے پن سے کہا تھا "باپو جی! ___ میں بھاگوں گا نہیں ___ آپ مجھے پرمیشور دکھلائیے!" تو مسٹر راما شنکر اچاریہ کی ساری قانون دانی اور وکالت دھری کی دھری رہ گئی۔

کسی مقدمے کا حوالہ دینا ہوتا تو وہ اس کا فائل نکال کر دکھا دیتے یا اگر کوئی اُن سے تعزیراتِ ہند کی کسی دفعہ کے متعلق سوال کرتا تو وہ اپنی میز پر سے وہ موٹی کتاب اُٹھا کر کھولنا شروع کر دیتے جس کی جلد پر اُن کے اس لڑکے نے چاقو سے بیل بوٹے بنائے رکھے تھے، مگر وہ پرمیشور کو پکڑ کر کہاں سے لاتے جس کے متعلق اُنہیں خود اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا ہے، کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

جس طرح اُن کو یہ معلوم تھا کہ دفعہ ۳۷۹ چوری کے فعل پر عاید ہوتی ہے، اسی طرح اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ مارنے اور پیدا کرنے والے کو پرمیشور کہتے ہیں، اور جس طرح اُن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جس قانون کے ماہر بنے ہوئے ہیں، اُس کی اصلیت کیا ہے، ٹھیک اُسی طرح اُن کو پرمیشور کی اصلیت معلوم نہ تھی۔ وہ ایم اے، ایل ایل بی تھے مگر یہ ڈگری اُنہوں نے ایسی اُلجھنوں میں پھنسنے کے لئے نہیں بلکہ دولت کمانے کے لئے حاصل کی تھی۔

وہ رام کو پرمیشور نہ دکھا سکے اور نہ اُس کو کوئی معقول جواب ہی دے سکے۔ اس لئے کہ یہ سوال ہی کچھ اس طرح اچانک طور پر کیا گیا تھا کہ اُن کا دماغ بالکل خالی ہو گیا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے تھے "جا، رام، جا، میرا دماغ نہ چاٹ، مجھے بہت کام کرنا ہے!"

اس وقت انہیں کام واقعی بہت کرنا تھا مگر وہ پرانی شکستوں کو بھول کر فوراً ہی اس نئے مقدمے کا فیصلہ کر دینا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے رام کی طرف غصے سے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنی دھرم پتنی سے کہا "آج اس نے کون سی نئی شرارت کی ہے ___ مجھے جلدی بتاؤ، میں آج اسے ڈبل سزا دوں گا!"

مسز اچاریہ نے رام کا کان چھوڑ دیا اور کہا "اس مُوئے نے تو زندگی وبال کر رکھی ہے، جب دیکھو ناچنا، تھرکنا، کودنا ___ نہ آئے کی شرم نہ گئے کا لحاظ ___ صبح سے مجھے ستا رہا ہے، کئی بار پیٹ چکی ہوں مگر یہ اپنی شرارتوں سے باز ہی نہیں آتا۔ نعمت خانے میں سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کھا گیا ہے۔ اب میں سلاد میں اس کا سر ڈالوں"۔

یہ سُن کر مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ رام کے خلاف کوئی سنگین الزام ہوگا مگر یہ سُن کر کہ اُس نے نعمت خانے سے صرف دو کچے ٹماٹر نکال کر کھائے ہیں، انہیں سخت نا اُمیدی ہوئی۔ رام کو جھڑکنے اور کوسنے کے لئے اُن کی سب تیاری ایکا ایکی سرد پڑ گئی۔ اُنہوں نے ایسا محسوس کیا کہ اُن کا سینہ ایک دم خالی ہو گیا ہے، جیسے ایک مرتبہ اُن کی موٹر کے پہیئے کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔

ٹماٹر کھانا کوئی جُرم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ابھی کل ہی مسٹر راما شنکر اچاریہ کے ایک دوست نے جو جرمنی سے طب کی اعلیٰ سند لے کر آئے تھے۔ اُن سے کہا تھا کہ اپنے بچّوں کو کھانے کے ساتھ کچے ٹماٹر ضرور دیا کیجئے کیونکہ اُن میں کثرت سے وٹامنز ہوتی ہیں۔ مگر اب چونکہ وُہ رام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے اور اُن کی بیوی کی بھی یہی خواہش تھی، اس لئے انہوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ایک قانونی نقطہ سوچا اور اس انکشاف پر دل ہی دل میں خوش ہو کر اپنے بیٹے سے کہا "میرے نزدیک آ اور جو کچھ میں تجھ سے پُوچھوں سچ سچ بتا۔"

مسز راما شنکر اچاریہ چلی گئیں اور رام خاموشی سے اپنے باپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے پوچھا "تُو نے نعمت خانے سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کیوں کھائے"

رام نے جواب دیا " دو کہاں تھے —— ماتا جی تو جھوٹ بولتی ہیں"

"تُو ہی بتا کتنے تھے؟"

"ڈیڑھ —— ایک اور آدھا" رام نے یہ الفاظ انگلیوں سے آدھے کا نشان بنا کر کہے "دوسرے آدھے سے ماتا جی نے دوپہر کو چٹنی بنائی تھی۔"

"چلو تو، ڈیڑھ ہی سہی، پر تُو نے یہ وہاں سے اُٹھائے کیوں؟"

رام نے جواب دیا "کھانے کے لئے"

"ٹھیک ہے، مگر تُو نے چوری کی۔" مسٹر راما شنکر اچاریہ نے قانونی نقطے کو پیش کیا۔

"چوری! —— بابو جی، میں نے کوئی چوری نہیں کی، ٹماٹر کھائے ہیں، مگر یہ چوری کیسے ہوئی۔" یہ کہتا ہوا وہ فرش پر بیٹھ گیا اور غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چوری تھی —— دُوسرے کی چیز کو اُس کی اجازت کے بغیر اُٹھا لینا چوری ہوتی ہے۔" مسٹر راما شنکر نے یوں اپنے بچّے کو سمجھایا اور خیال کیا کہ وُہ اُن کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔

رام نے فوراً ہی کہا "مگر ٹماٹر تو ہمارے اپنے تھے —— میری ماتا جی کے!"

مسٹر راما شنکر اچاریہ سٹپٹا گئے مگر فوراً ہی اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی "تیری ماتا جی کے تھے —— ٹھیک ہے پر وُہ تیرے تو نہ ہوئے، جو چیز اُن کی ہے، وہ تیری کیسے ہو سکتی ہے —— دیکھ سامنے میز پر جو تیرا کھلونا پڑا ہے، اُٹھا لا، میں تجھے اچھی طرح سمجھاتا ہوں۔"

رام اُٹھا اور دوڑ کر لکڑی کا گھوڑا اُٹھا لایا اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیا "یہ لیجئے"

مسٹر راما شنکر اچاریہ بولے "ہاں، تو دیکھ، یہ گھوڑا تیرا ہے نا؟"

"جی ہاں"

"اب اگر میں اِسے تیری اجازت کے بغیر اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لوں تو یہ چوری ہوگی"۔ پھر مسٹر راماشنکر اچاریہ نے مزید وضاحت سے کام لیتے ہوئے کہا "اور میں چور"

"نہیں پتا جی، آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں، میں آپ کو چور نہیں کہوں گا ــــ میرے پاس کھیلنے کے لئے ہاتھی جو ہے ــــ کیا آپ نے ابھی تک دیکھا نہیں ــــ کل ہی منشی دادا نے لاکے دیا ہے ــــ ٹھیریئے، میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ تالیاں بجاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا اور مسٹر راماشنکر اچاریہ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

دوسرے روز مسٹر راماشنکر اچاریہ کو ایک خاص کام سے پُونا جانا پڑا۔ اُن کی بڑی بہن وہیں رہتی تھی۔ ایک عرصے سے وہ چھوٹے رآم کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، چنانچہ ایک پنتھ دو کاج کے پیشِ نظر مسٹر راماشنکر اچاریہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے، مگر اس شرط پر کہ وُہ راستے میں کوئی شرارت نہ کرے۔ ننھا رآم اس شرط پر بوری بندر اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک قائم رہ سکا، اُدھر دکن کوئین چلی اور اِدھر رآم کے ننھے سے سینے میں شرارتیں مچلنا شروع ہوگئیں۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی چوڑی سیٹ پر بیٹھے اپنے ساتھ والے مسافر کا اخبار دیکھ رہے تھے اور سیٹ کے آخری حصّے پر رآم کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا اور ہوا کا دباؤ دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اُسے لے اُڑے تو کتنا مزا آئے۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے اپنی عینک کے گوشوں میں سے رام کی طرف دیکھا اور اُسکو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا۔

"تُو چین بھی لینے دیگا یا نہیں ــــ آرام سے بیٹھ جا" یہ کہتے ہوئے اُن کی نظر رام کی نئی ٹوپی پر پڑی جو اُس کے سر پر چمک رہی تھی۔

"اُسے اُتار کر رکھ نالائق، ہوا سے اُڑ جائے گی"۔

اُنہوں نے رام کے سر پر سے ٹوپی اُتار کر اُس کی گود میں رکھ دی۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد ٹوپی پھر رآم کے سر پر تھی اور وہ کھڑکی کے باہر سر نکالے دوڑتے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی یہ بھاگ دوڑ رآم کے ذہن میں آنکھ مچولی کے دلچسپ کھیل کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔

ہوا کے جھونکے سے اخبار دوہرا ہوگیا اور مسٹر راماشنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے کے سر کو پھر کھڑکی کے باہر پایا۔ غصّے میں اُنہوں نے اُس کا بازو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا "اگر تُو یہاں سے، ایک انچ بھی ہلا تو تیری خیر نہیں"۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے ٹوپی اُتار کر اُس کی ٹانگوں پر رکھ دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اُنہوں نے اخبار اُٹھایا اور وُہ ابھی اُس میں وہ سطر ہی ڈھونڈ رہے تھے جہاں سے اُنہوں نے پڑھنا چھوڑا تھا کہ رآم نے کھڑکی کے پاس سرک کر باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ٹوپی اُس کے سر پر تھی یہ دیکھ کر مسٹر شنکر اچاریہ کو سخت غصّہ آیا۔ اُن کا ہاتھ

ٹھبو کی چیل کی طرح ٹوپی کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں وہ اُن کی سیٹ کے نیچے تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ رام کو سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مڑ کر اُس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، مگر اُن کے ہاتھ خالی نظر آئے، اِسی پریشانی میں اُس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، تو اُسے ریل کی پٹڑی پر بہت پیچھے ایک خاکی کاغذ کا ٹکڑا اُڑتا نظر آیا ـــ اُس نے خیال کیا کہ یہ میری ٹوپی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اُس کے دِل کو ایک دھکّا سا لگا۔ باپ کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا

"باپو جی ـــ میری ٹوپی!"

مسٹر راماشنکر اچاریہ خاموش رہے۔

"ہائے میری ٹوپی" رآم کی آواز بلند ہوئی۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ کچھ نہ بولے۔

رام نے رونی آواز میں کہا "میری ٹوپی!" اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہا "گرا دی ہو گی تُو نے ـــ اب روتا کیوں ہے؟" اس پر رام کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تیرنے لگ گئے۔

"پر دھکّا تو آپ ہی نے دیا تھا" اُس نے اتنا کہا اور رونے لگ گیا۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے ذرا ڈانٹ بتائی تو رآم نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے اُسے چُپ کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ رآم کا رونا صرف ٹوپی ہی بند کرا سکتی تھی۔ چنانچہ مسٹر راماشنکر اچاریہ نے تھک ہار کر اُس سے کہا۔ "ٹوپی واپس آجائے گی مگر شرط یہ ہے کہ تُو اُسے پہنے گا نہیں!"

رام کی آنکھوں میں آنسو فوراً خشک ہو گئے، جیسے تپی ہوئی ریت میں بارش کے قطرے جذب ہو جائیں۔ وہ سرک کر آگے بڑھ آیا۔

"اُسے واپس لائیے!"

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے کہا "ایسے تھوڑی واپس آجائے گی ـــ منتر پڑھنا پڑے گا۔"

کمپارٹمنٹ میں سب مسافر باپ بیٹے کی گفتگو سُن رہے تھے۔

"منتر ـــ!" یہ کہتے ہوئے رآم کو فوراً ہی وہ قصہ یاد آ گیا جس میں ایک لڑکے نے منتر کے ذریعے سے دوسروں کی چیزیں غائب کرنا شروع کر دی تھیں "پڑھیے پتا جی!"

یہ کہہ کر وُہ خوب غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا گویا منتر پڑھتے وقت مسٹر راماشنکر اچاریہ کے گنجے سر پر سینگ اُگ آئیں گے۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے اُس منتر کے بول یاد کرتے ہوئے جو اُنہوں نے بچپن میں "اندر جال کمل" سے زبانی یاد کیا تھا کہا "تو پھر

شرارت تو نہ کرے گا۔"

"نہیں باپوجی" رام نے جو منتر کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا، اپنے باپ سے شرارت نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ کو منتر کے بول یاد آگئے اور اُنہوں نے دِل ہی دِل میں اپنے حافظے کی داد دے کر اپنے لڑکے سے کہا "لے اب تو آنکھیں بند کرلے۔"

رام نے آنکھیں بند کرلیں اور مسٹر راماشنکر اچاریہ نے منتر پڑھنا شروع کیا۔

" اونگ نما کا میشری، مد مدیش اُونما دے بھرینگ پر اسواہ " مسٹر راماشنکر کا ایک ہاتھ سیٹ کے نیچے گیا اور "سواہ" کے ساتھ ہی رام کی ٹوپی اُس کی گدگدی رانوں پر آگری۔

رام نے آنکھیں کھول دیں ــــ ٹوپی اُس کی چپٹی ناک کے نیچے پڑی تھی اور مسٹر راماشنکر اچاریہ کی نکیلی ناک کا بانسہ عینک کی سُنہری گرفت کے نیچے تھرتھرا رہا تھا ــــ عدالت میں مقدمہ جیتنے کے بعد اُن پر یہی کیفیت طاری ہُوا کرتی تھی۔

" ٹوپی آگئی " رام نے صرف اس قدر کہا اور چُپ ہو رہا اور مسٹر راماشنکر اچاریہ، رام کو خاموش بیٹھنے کا حکم دے کر اخبار پڑھنے میں معروف ہو گئے۔ ایک خبر کافی دلچسپ وراخباری زبان میں بے حد "سنسنی خیز" تھی۔ چنانچہ وہ منتر وغیرہ سب کچھ بھول کر اُس میں کھو گئے۔

دکن کوئین بجلی کے پروں پر پوری تیزی سے اُڑ رہی تھی۔ اس کے آہنی پہیوں کی یک آہنگ گڑگڑاہٹ، اخبار کی سنسنی پیدا کرنے والی خبر کی ہر سطر کو صوتی مدد بخش رہی تھی۔ مسٹر راماشنکر اچاریہ یہ سطر پڑھ رہے تھے۔

"عدالت میں سناٹا چھایا ہُوا تھا، صرف ٹائپ ایسٹر کی ٹک ٹک سُنائی دیتی تھی۔ ملزم ایکا ایکی چلّایا ــــ " باپوجی۔"

عین اس وقت رام نے اپنے باپ کو زور سے آواز دی "باپوجی" اور مسٹر راماشنکر اچاریہ کو یوں معلوم ہُوا کہ زیرِ نظر سطر کے آخری الفاظ کاغذ پر اُچھل پڑے ہیں۔

رام کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے ذرا تیزی سے کہا "کیا ہے؟" اور عینک کے ایک گوشے میں سے ٹوپی کو سیٹ پر پڑا دیکھ کر اپنا اطمینان کرلیا۔

رام آگے سرک آیا اور کہنے لگا " باپوجی، وہی منتر پڑھیئے!"

"کیوں؟" یہ کہتے ہوئے مسٹر راماشنکر اچاریہ نے رام کی ٹوپی کی طرف غور سے دیکھا جو سیٹ کے کونے میں پڑی تھی۔

"آپ کے کاغذ جو یہاں پڑے تھے، میں نے باہر پھینک دیئے ہیں!"

رام نے اس کے آگے کچھ اَور بھی کہا مگر مسٹر راماشنکر اچاریہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ اُٹھ کر اُنہوں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا، مگر ریل کی پٹڑی کے ساتھ تتلیوں کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے کاغذی پُرزوں کے سوا اُور کچھ نظر نہ آیا۔

"تونے وہ کاغذ پھینک دیئے ہیں جو یہاں پڑے تھے۔" اُنہوں نے اپنے داہنے ہاتھ سے سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رام نے اثبات میں سر ہلا دیا "آپ ہی منتر پڑھیئے نا!"

مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایسا کوئی منتر یاد نہ تھا جو سچ مچ کی کھوئی ہوئی چیزوں کو واپس لاسکے۔ وُہ سخت پریشان تھے۔ وہ کاغذات جو اُن کے بیٹے نے پھینک دیئے تھے، ایک نئے مقدمے کی مثل تھی جس میں چالیس ہزار کی مالیت کے قانونی کاغذات پڑے تھے ــــ مسٹر راما شنکر اچاریہ ایم اے ایل ایل بی کی بازی اُن کی اپنی چال ہی سے مات ہوگئی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر اُن کے قانونی دماغ میں کاغذات کے بارے میں سینکڑوں خیالات آئے۔ ظاہر ہے کہ مسٹر راما شنکر اچاریہ کے مؤکل کا نقصان اُن کا اپنا نقصان تھا مگر اب وہ کیا کرسکتے تھے ــــ صرف یہ کہ اگلے سٹیشن پر اتر کر ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیں اور دس پندرہ میل تک اُن کاغذوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ ملیں نہ ملیں، یہ اُن کی قسمت۔

ایک لمحے کے اندر اندر سینکڑوں باتیں سوچنے کے بعد آخر میں اُنہوں نے اپنے دِل سے فیصلہ کرلیا کہ اگر تلاش پر بھی کاغذات نہ ملے تو وہ مؤکل کے سامنے سرے سے انکار ہی کردیں گے کہ اُس نے اُن کو کبھی کاغذات دیئے تھے۔ اخلاقی اور قانونی طور پر یہ سراسر ناجائز تھا مگر اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس تسلی بخش خیال کے باوجود مسٹر راما شنکر اچاریہ کے حلق میں تلخی پیدا ہورہی تھی، ایکا ایکی اُن کے دِل میں آئی کہ کاغذوں کی طرح وہ رام کو بھی اُٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیں مگر اس خواہش کو سینے ہی میں دبا کر اُنہوں نے اُس کی طرف دیکھا۔

رام کے ہونٹوں پر ایک عجیب و غریب تبسم منجمد سا ہورہا تھا۔

اُس نے ہولے سے کہا "باپوجی، منتر پڑھیئے۔"

"آرام سے بیٹھا رہ، ورنہ یاد رکھ گلا گھونٹ دوں گا ــــ" مسٹر راما شنکر اچاریہ بھنّا گئے۔

اُس مسافر کے لبوں پر جو غور سے باپ بیٹے کی گفتگو سُن رہا تھا، ایک معنی خیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

رام آگے سرک آیا "باپوجی، آپ آنکھیں بند کرلیجئے، میں منتر پڑھتا ہوں۔"

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے آنکھیں بند نہ کیں، لیکن رام نے منتر پڑھنا شروع کردیا۔

"اونگ میانگ شیانگ ــــ لدمداگا۔۔۔ فردوما۔۔۔ سواہ" اور سواہ کے ساتھ ہی مسٹر راما شنکر اچاریہ کی گوشت بھری رانوں پر کاغذوں کا ایک پُلندہ آگرا۔

اُن کی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے زور سے کانپا۔

رام کی چپٹی ناک کے گول اور لال لال نتھنے بھی کانپ رہے تھے!

× × × × × × × × × × × ×

سعادت حسن منٹو

ایک فرمائشی غزل

خواب میں اُن کو جا کے دیکھ لیا | اُن کو اُن سے چھُپا کے دیکھ لیا
میری دیوانگی کا کیا کہنا | رُخ سے پردہ اُٹھا کے دیکھ لیا
نہ چھُپے میری آنکھ سے نہ چھُپے | تم نے خود کو چھُپا کے دیکھ لیا
میرے دل سے کبھی نکل نہ سکے | تم نے دامن چھُڑا کے دیکھ لیا
تُم سے ملنے کی آرزُو نہ گئی | خاک میں بھی مِلا کے دیکھ لیا
نہ رکھا تم نے ایک دن بھی قدم | ہم نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا
اَور بھی دُور ہو گئے مجھ سے | دستِ کوتہ بڑھا کے دیکھ لیا
اِنفعالِ گناہ کم نہ ہُوا | قبر میں مُنہ چھُپا کے دیکھ لیا
نہ لگا، جی کِسی جگہ نہ لگا | ہر جگہ، جی لگا کے دیکھ لیا
اے غضب، غم یہاں بھی آ پہنچا | محل اُونچے بنا کے دیکھ لیا
حاصلِ عمر کا پتہ نہ چلا | عمر ساری گنوا کے دیکھ لیا

خاک حاصِل ہُوا نہ اَے **امجد**
ہر طرف خاک اُڑا کے دیکھ لیا

سید احمد حسین امجد حیدرآبادی

نئی دُنیا

بدل گئی وُہ پرانی دُنیا جدھر نظر کی جہاں نیا ہے
نیا زمانہ نئے ہیں بندے زمیں نئی آسماں نیا ہے

نئے ہیں غنچے نئی ہیں کلیاں نئے شجر گلستاں نیا ہے
نئی ہے فصلِ بہارِ گلشن چمن میں رنگِ خزاں نیا ہے

نئی ہیں صیاد کی نگاہیں نیا بچھایا ہے دام اُس نے
نئے ہیں صحنِ چمن کے طائر قفس نیا آشیاں نیا ہے

نیا ہی دشت اور نئی ہی وادی نیا ہی جادہ نئی ہی منزل
نیا ہے رستہ دکھانیوالا جرس نیا کارواں نیا ہے

نئے ہیں یہ ساکنانِ دُنیا نئی طرح کے ہیں ان کے مسکن
نرالی ہے بود و باش اِن کی مکیں نئے ہیں مکاں نیا ہے

نئی مساجد نئے منادر نئے مؤذن نئے پُجاری
خدا نیا ہے دُعا نئی ہے جبیں نئی آستاں نیا ہے

نئی ہے محفل نیا ہے ساقی نیا سبو اور نئی صُراحی
نیا ہے بادہ نئے ہیں میخوار اور پیرِ مغاں نیا ہے

نئے طریقے نئے سلیقے نئے قوانین ہیں ادب کے
نیا زمانہ نئی روش ہے نئی ہیں باتیں سماں نیا ہے

کہاں ہیں عہدِ کہن کے قصّے کہاں ہیں وُہ تذکرے پُرانے
نئی زباں ہے نئے فسانے جہاں کا طرزِ بیاں نیا ہے

کہاں وُہ دِن اور کہاں وُہ راتیں کہاں ہیں اب وُہ پُرانی باتیں
نئے ہیں لیل و نہار ناشادؔ اور دورِ زماں نیا ہے

رام پرشاد ناشادؔ

ہندوستانی موسیقی

پکے راگ اور کچے راگ کے الحاق کے متعلق چند تجاویز

(یہ مضمون، ۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو میوزک کانفرنس الٰہ آباد میں پڑھا گیا)

جو مضمون میرے سپرد ہوا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ کلاسیکل میوزک اور لائٹ میوزک میں کس طرح سے الحاق پیدا کیا جاسکتا ہے اور وہ کونسا طریقہ ہے جس سے یہ ایک دوسرے کے قریب آجائیں یعنی ہم مستند موسیقی اور غیر مستند موسیقی یا عام اصطلاح کے مطابق پکے راگ اور کچے راگ دونوں سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

شاید آپ کو اس امر سے اتفاق ہوگا کہ یہ مضمون اپنے اندر ایک دشواری رکھتا ہے اور بالخصوص آج کل اس کے متعلق کوئی آخری اور حتمی فیصلہ کرنا دِقت طلب ہے۔

جہاں ڈراما اور ریڈیو کی ترقی نے اس فن کو پھیلایا اور پبلک کو مستفید ہونے کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں وہیں ہر کس و ناکس کو خود فروشی کا موقع بھی دے دیا ہے نیز ناواقفانِ فن اور عطائی حضرات نے اسے اپنے پروپگنڈے اور نام و نمود کا ذریعہ سمجھا ہے اور چونکہ ان دونوں شعبہ ہائے تفریح کے مخاطب کثرت سے عوام ہیں اس لئے یہ غیر مستند چیزیں سُنا کر اُن کے غیر تربیت یافتہ اور پست ذہنوں سے خراجِ تحسین وصُول کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

وہ حضرات جو مستند موسیقی کے دلدادہ ہیں اور بزرگوں کی اس امانت کو نہایت دیانت داری کے ساتھ سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں لوگوں کی اس کج روی کو دیکھ کر انہیں قلق ہوتا ہے۔ موسیقی کے وہ اصُول و قواعد جو اساتذہ اور ماہرینِ فن نے باندھے ہیں جب غیر ذمہ دار اور برخود غلط حضرات کی طرف سے اُن کی پائمالی ہوتی ہے تو انہیں ناگوار ہوتا ہے اور وہ کسی طرح بھی اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ اس مقدس فن کی اس بے دردی سے توہین کی جائے۔

دوسری طرف وُہ لوگ ہیں جو اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں۔ جنہوں نے اس فن کو کسی باکمال استاد سے حاصل نہیں کیا۔ اس کی مشق و مہارت میں عرق ریزی اور جانفشانی سے کام نہیں لیا بلکہ وہ محض مذاقِ فطری اور طبیعت کے رجحان پر بھروسا کئے ہوئے ہیں وہ کبھی پکے راگوں کو پسند نہیں کرتے اور اُن کی طبیعت ہمیشہ کچے راگ رگنیوں کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جب وُہ ایسی چیزیں سنتے ہیں جن کے سمجھنے میں انہیں دِقت

ہوتی ہے، اور وہ داد نہیں دے سکتے تو شکایت کرتے ہیں اور بعض دفعہ تمسخر بھی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس تضحیک و تمسخر میں حق بجانب ہیں اس لئے کہ ع۔ فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اُوست

نیز عوام سے دقیق نکاتِ فن پرکھنے کی اُمید کرنا ایک ایسا خیال ہے جس کا واقعیت سے بہت کم تعلق ہے۔

ہندوستان میں لائٹ میوزک یعنی غیر مستند موسیقی کو پھیلانے میں سب سے زیادہ حصّہ ڈرامے نے لے لیا ہے اور جیسا کہ معلوم ہے، ہندوستانی ڈراما کو قدیم اسلوب سے نکال کر یورپین سانچہ میں ڈھالنے والے سب سے پہلے پارسی حضرات ہیں۔ اس قوم کی تاجرانہ نگاہ نے فرانسیسی opera کی وضع پر دکان سجائی۔ فرانسیسی ڈراما کی یہ خصوصیت تھی کہ اکثر مطالب کو نظم میں گا کر ادا کیا جاتا تھا چنانچہ قدیم ہندوستانی ڈراما میں بھی یہ فرانسیسی خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اسٹیج پر بادشاہ سے لے کر غلام اور ایک جہاں تماشہ سے لے کر عام دُنیا دار تک ہر شخص گاتا ہُوا نظر آتا ہے۔ پھر جیسا کہ مَیں نے اُوپر بیان کیا کہ ڈراما کے مخاطب اکثر عوام ہوتے ہیں اگر اُن کے سامنے یہ نظمیں پکّے راگوں میں ادا کی جائیں تو وہ بجائے محظوظ ہونے کے بے لطفی محسوس کرتے۔ نیز شاید تمثیلی مواقع اور مصالح کے لحاظ سے ہر چیز کو پکّے راگوں میں ادا کرنے کا وقت بھی نہ ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ بعض دفعہ اداکار کی حرکات و سکنات میں فرق پڑ کر اظہارِ مطلب بھی پورے طور پر نہ ہو سکتا۔ اس لئے ایک ایسی موسیقی ایجاد ہوگئی جس میں مشرقی مذاق کے ساتھ یورپین انداز کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہمارے ڈراما کی جائے پیدائش بمبئی ہے اور پارسی حضرات کے ہاتھوں میں پرورش پائی ہے۔ خود بمبئی کو ایک ساحلی مقام ہونے کی وجہ سے کوئی معیاری مشرقی شہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیز پارسی حضرات بھی یورپین تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انہیں اکثر مشرقی موسیقی کی گہرائیوں سے بے خبری ہے۔

لہٰذا ڈراما میں وہی چیز آگئی جسے ہم لائٹ میوزک کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسان قدرتاً نقل کا دلدادہ ہے اس لئے برقی سُرعتِ رفتار کے ساتھ "لائٹ میوزک" تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسی کوشش کریں کہ لائٹ میوزک کو نیست و نابود کردیں یا کلاسیکل میوزک کی وقعت کم کر دی جائے اور اسے عوام کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا جائے؛

نہیں ایسا نہیں اپنی اپنی جگہ دونوں کی ضرورت ہے اگر ہم کلاسیکل میوزک کی جگہ عام چیزوں پر زور دیں تو ہمارے اس مقدس فن کا درجہ گر جائے گا اس لئے کہ علاوہ اُس مسرتِ قلبی اور سرورِ طبع کے جسے صرف وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جنہوں نے اس بحرِ عمیق میں غوطہ زنی کی ہے ہماری موسیقی ایک قدیم تہذیب کی یادگار ہے اور ہمارے آباؤ اجداد کے اعلیٰ تخیل اور بلند معیارِ زندگی کی بولتی چالتی تصویر ہے یہ ہماری نگاہوں کے سامنے اس زمانہ کا سماں باندھ دیتی ہے جبکہ اطرافِ عالم میں بربریت اور وحشت کا دَور دَورہ تھا آج کے مہذب ممالک میں تہذیب کا چراغ نہ جلا تھا اور ہندوستان کے حکما نکتہ سنج موسیقی سے جذبِ روحانی، صفائے باطن اور تزکیہ نفس کا کام لے رہے تھے۔ وہ راگ اور راگنیوں سے من کے مندر میں معرفت کا چراغ جلاتے تھے۔ سُر اور تال سے رُوح کی سوتی ہوئی قوتیں جاگ اُٹھتی تھیں۔ سنا ہے سے تو جہ ہٹ

کہ صرف پرمیشر سے دھیان لگ جاتا تھا اور وہ ہر چیز سے خالی الذہن ہو کر صرف ایشور کی بھگتی میں لگ جاتے تھے آتما کی شانتی اور رُوحانی حالت کو بلند کرنے میں ہندوستانی موسیقی کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔

یہ مسلّم امر ہے کہ ہر ایجاد کی کوئی نہ کوئی غرض وغایت ہوتی ہے جہاں تک اس فن کا تعلّق ہے اس کے اسبابِ اختراع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حکمائے ہند نجوم سماوی کو مدرک بالذات، ذی روح، صاحبِ نفسِ ناطقہ اور اس عالم میں متصرف اور مؤثر مانتے تھے اور جو تغیرات وحوادث مثلاً سعادت ونحوست یا فتح وشکست، غلبہ واسیری اور رہائی ان پر وارد ہوتے تھے ان کو ستاروں کے اثرات پر محمول کرتے تھے۔ جب اُن کے دل میں یہ اعتقاد راسخ ہو گیا تو اُنہوں نے ایک ایسی چیز کی ضرورت محسوس کی جو آڑے وقت میں اُن کی ڈھارس بندھائے اور اچھے وقت میں فرحت وسرور کا ذریعہ ہو۔ چنانچہ اُنہوں نے تاثیراتِ سماوی پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے برت، خیرات، ترکِ دنیا، ترکِ لذات اور ایشور کی بھگتی کو ذریعہ قرار دیا۔ وہ خدا کے حضور میں نہایت تضرّع، زاری، توبہ واستغفار اور عجز وانکسار کے ساتھ دُعائیں اور مناجات کرتے تھے۔ ایشور ان کی دعاؤں کو سنتا تھا اور اُن کے سر سے بلاؤں کو ٹال دیتا تھا۔ عبادت کے وقت یہ مناجاتیں ایک خاص لحن میں گائی جاتی تھیں۔ اس لحن کی تاثیر سے ان کی آتما کو شکتی اور شانتی، اُن کی رُوح کو تسلّی، اطمینان اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ اور اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ ہماری موسیقی اطمینانِ قلب کا سرچشمہ ہے۔ یہ توجہ کو ظاہر سے باطن کی طرف پھیر دیتی ہے اور انسان ماسوی اللہ سے بے خبر ہو کر اُس سرچشمۂ وحدت میں فنا ہو جاتا ہے جو تمام کائنات کا منبع اور موجودات کا نقطۂ اوّل ہے۔ اہلِ باطن اور صوفیا اس کو غذائے روحانی اور انجلائے باطن کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ہمارے سادھوؤں کی عبادت کا ایک اعلیٰ جزو ہے۔ کسی راگ کے بول تانیں اور لَے سُن کر انسان کی رُوح اپنے مرکزِ اعلیٰ کی طرف پرواز کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال ہمارے قدما رفتہ رفتہ موسیقی کو مختلف کاموں میں استعمال کرنے لگے۔ جنگ میں قوتِ شجاعت کو اُبھارنے کے لئے ایک خاص قسم کا راگ جسے "مشجّع" کہتے ہیں گایا جانے لگا۔ پھر راگوں کی تاثیر سے بیماریوں کو دُور کرنے لگے اور شفاخانوں میں شغل کے لئے گانے لگے۔ غم واندوہ کو مسرّت وشادمانی سے بدلنے کے لئے علیحدہ راگ ترتیب دیئے گئے۔ غرض ہر موسم ہر وقت اور ہر موقع کے لحاظ سے بہت سے راگ اور راگنیاں پیدا ہو گئیں۔ پھر ہر راگ اور راگنی کا ایک خاص سماں باندھا گیا اور اُن کے اوصاف کو محسوس صُورت میں بیان کرنے کے لئے مصوّروں نے تصویریں بنائیں۔

اس مقام پر میرا روئے سخن خاص طور سے اُن حضرات کی طرف ہے جن کو اس فنِ لطیف کی محافظت کا دعوےٰ ہے اور جن کو خزائنۂ الٰہی سے یہ نعمت تفویض ہوئی ہے کہ وہ اپنے فرائض کو نہ بھُولیں اور جس غرض کے لئے یہ فن معرضِ وجود میں آیا تھا اُسے اس کے مرکز سے نہ ہٹنے دیں۔

ہماری موسیقی محض کھیل تماشوں کے لئے نہیں بلکہ یہ ایک مستقل سائنس ہے۔ اس میں خدا پرستوں کے لئے رُوحانی تسلّی، بیماروں کے لئے شفا، متلاشیانِ مسرّت کے لئے خوشی، ٹوٹے ہوئے دِلوں کے لئے اطمینان اور تھکے ماندے لوگوں کے لئے دماغی راحت کا

سامان موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسی مقدس چیز کو محض لہو ولعب کی مجالس اور عیاشی کے لئے استعمال کریں یا ہمارا انتہائی مقصد کسی سرمایہ دار کو خوش کر کے چند روپے وصول کرنا ہو۔ ضرورت ہے کہ اس فن کو فن ہی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اور اس کے لئے اپنے وطن کے علوم وفنون سے محبت کے علاوہ تمام قوم کے مجموعی تعاون کی بھی ضرورت ہے۔ اس کو اس کی علتِ غائی تک پہنچانے کے لئے تمام قوموں کو حصّہ لینا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے اختراع وایجاد کا سہرا ہنود کے سر ہے مگر مسلمانوں نے اس میں جو اضافہ کیا اور اس کی نشوونما میں جو حصّہ لیا وہ بھی کچھ کم نہیں۔

چنانچہ مسلمان اپنے دورِ حکومت میں ہمیشہ اس فن کی ترقی میں مصروف رہے۔ دکن کی ریاستوں اور سلطنتِ مغلیہ نے ہمیشہ اہلِ فن کی قدر اور سرپرستی کی۔ غالباً ہم سب کو اپنے ملک کی مایۂ ناز شخصیت امیر خسرو کا نام یاد ہوگا۔ بہار راگ اور بسنت کے موجد وہی ہیں۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہیں نے نکالا۔ ابراہیم عادل شاہ والئ بیجاپور ایک ماہر موسیقی داں تھا۔ اس کے زمانہ میں اس فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ خود اُس نے نورس نامہ تحریر کیا جس کا مقدمہ سہ نثر ظہوری مشہور ومعروف کتاب ہے دربارِ اکبری کے پروردہ امامِ فن تان سین کا نام تو ہر شخص کی زبان پر ہے ہی۔ سلطان حسین جونپوری نے اسے پندرھویں صدی میں کافی ترقی دی۔

غرض ہندوستان کی تمام قوموں میں اس کے ماہر گزرے ہیں اور یہ جلسہ خود اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ ہم سب ہندوستانی اس فن کو خاص اپنی ملک سمجھ کر عزیز رکھتے ہیں۔

لیکن ہر شخص اتنا خوش نصیب نہیں کہ اس بلند پایہ پر پہنچ سکے اور اس امر کا مدعی ہو سکے کہ میں نے اس بحرِ ناپیدا کنار کو عبور کر لیا ہے۔

معزز سامعین!

بات اس قدر دلچسپ تھی کہ میں کہتے کہتے اس کی وسعتوں میں کھو گیا اور ع

کہاں نکل گیا آیا تھا میں کہاں کے لئے

بہر حال موسیقی ایسی چیز ہے کہ ہر انسان کو اس سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور ہوتا ہے چنانچہ مثل مشہور ہے کہ گانا اور رونا کون نہیں جانتا۔ اپنی دلبستگی اور وقت گزارنے کے لئے ہر شخص گاتا ہے۔ مزدور اپنے احساسِ محنت کو کم اور راہ رو مسافت کی خستگی کو رفع کرنے کے لئے گاتے ہیں۔ صرف افرادِ انسانی ہی نہیں بلکہ پرندے بھی گاتے ہیں اور جانور بھی سمجھتے ہیں۔ عرب کی حدی خوانی مشہور ہے اگلے زمانہ میں گوالے دُودھ دوہتے وقت ایک خاص راگ گاتے تھے جس سے جانور مطیع ہو جاتا تھا۔ سری کرشن جی کی بانسری کی آواز سے جنگل کے جانور آپ کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

ایک بچہ بھی گاتا ہے لیکن ہم اُس سے کسی باقاعدگی یا دلفریب تانوں کی اُمید نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہمیں عوام سے بھی

کسی فنی مہارت اور اصولِ موسیقی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ وُہ اپنا شوق پورا کرنے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اپنی طبعی اُپج سے گاتے ہیں۔ اور موجودہ زمانہ میں فلم اور ناٹک والوں کو چونکہ زیادہ تر انہیں لوگوں کو مخاطب کرنا ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی بلند معیار سے گر کر انہی عام چیزوں کو پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے "کلاسیکل میوزک" سکھائیں تاکہ پکے راگ ان کی رگ رگ میں رچ جائیں اور وہ کبھی غیر معیاری چیزوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہوں۔ جب پبلک کا مذاق بدل جائے گا تو ناٹک والے خود بخود اپنی روش بدل دیں گے۔

عوام کے ذوقِ نغمہ سنجی کو ہم ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جب ایک بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اُستاد اُسے اسکول کے علمی ماحول سے مانوس کرتا ہے پھر اُس کو ابجد پڑھائی جاتی ہے پھر وُہ قانونی جماعتوں میں ترقی کرتا ہے اور رفتہ رفتہ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرتا ہے۔

یہی حال موسیقی کا بھی ہے، لوگوں کا ہلکے راگ گانا ان کا علمی ماحول اور ابجد خوانی ہے انہیں اس منزل سے گزرنا بھی ضروری ہے لیکن ہمیں اس منزل میں قیام کرنا موزوں نہیں۔ بلکہ اس ذوق سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو کلاسیکل میوزک کی طرف متوجہ کر دیا جائے اگر ایک بچہ لائٹ میوزک کے گانوں کو آسانی سے یاد کر لیتا ہے تو اوّل اوّل مشق و مہارت کے لئے یاد کر لینے دینا چاہئے اور پھر اُسے آگے بڑھانا چاہئے۔

اس امر کے لئے ضروری ہے کہ جگہ جگہ بلند پایہ اسکول کھولے جائیں، یونیورسٹیاں موسیقی کو اپنے نصاب میں داخل کریں اور اس فن کو علمی حیثیت سے علم سینہ نہیں بلکہ علم سفینہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ الہ آباد اور لکھنؤ نے اسکول کھول کر اور بنارس یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں داخل کر کے اس فن کی جو خدمت انجام دی ہے وُہ اس کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اِن مقامات کی تعلیم کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں اور جو طالب علم یہاں سے نکلتے ہیں اُنہوں نے کافی امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ مختصر یہ کہ جب پبلک کا مذاق بلند ہو جائے گا تو لائٹ میوزک اور بے راہ روی کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

لیکن زمانہ کا تقاضا ہے کہ کلاسیکل میوزک کا مرتبہ برقرار رکھنے کے لئے ضرورتِ وقت کے مطابق اس میں بھی کچھ ترمیم کی جائے۔ ایک وقت تھا کہ ضروریاتِ زندگی بہت مختصر تھیں اور جتنی تھیں وُہ آسانی سے پُوری ہو جاتی تھیں لہٰذا لوگوں کو کافی فرصت تھی۔ گویئے اطمینان سے گاتے تھے اور شائقین بے فکری سے سنتے تھے لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور سامعین کے پاس وقت کی بڑی قلت ہے، لہٰذا مصلحتِ وقت اب یہ اجازت نہیں دیتی کہ گویئے بہت دیر تک اپنے ساز درست کریں اور پھر گھنٹوں ایک ہی راگ کو الاپتے ہیں اس لئے اب موسیقی کو مقبولِ عام بنانے کے لئے ضروری ہے کہ راگ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ تمہید میں وقت ضائع نہ ہو۔ سرگمیں جو اس کی بڑھت

کو دکھاتی ہیں انہیں کوزہ میں بند کیا جائے اور الاپ کو کم کیا جائے۔ البتہ گویّے اپنی نجی مشق میں اس گرامر کو اچھی طرح استعمال کریں۔

نیز ہماری موسیقی میں ایک خاص کمی تحریر کی ہے جیسا کہ میں نے بالائی سطور میں اشارہ کیا ہے اس مضمون کو تحریر میں لانے کی ضرورت ہے تاکہ حادثاتِ زمانہ سے یہ فن محو نہ ہو جائے۔

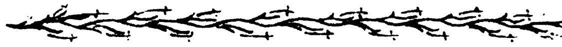
اگرچہ یہ علم اب تک سینہ بسینہ چلا آتا ہے لیکن انسان میں نسیان کا مادہ موجود ہے اور وہ بسا اوقات نہایت قیمتی باتیں بھی بھول جاتا ہے۔ ٹھاکر نواب علی مرحوم اور بھات کھنڈے صاحب بمبئی نے اسے تحریر کرنے کی کوشش کی ہے اور ہم اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس مقام پر غور طلب امر یہ ہے کہ ہم تحریرِ موسیقی کے لئے کونسا طریقہ اختیار کریں اس وقت ہمارے سامنے دو طریقے ہیں ایرانی اور انگریزی۔ پُونے کی ایک سوسائٹی مغربی طریقہ پر کتابیں طبع کرتی ہے لیکن اس طریقہ سے سیکھنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔ لیکن مشق سے سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ آدمی دونوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں بڑا فرق ہے مگر بعض باتیں ایک دوسرے کی معاون بھی ہو سکتی ہیں۔ مجھے اپنی رائے پر اصرار نہیں ہاں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ اہلِ فن دونوں طریقوں کا مطالعہ کریں جس کو بہتر سمجھیں اختیار کریں۔

مضمون بہت طویل ہو گیا۔ بس آخر میں صرف ایک بات کہہ کر آپ حضرات سے رخصت ہوتا ہوں اور وُہ یہ کہ ہم اہلِ مشرق اپنے بزرگوں کی میراث میں کچھ اضافہ کرنے کے عادی نہیں ہیں اور ان کی تحقیق کو اتنا کامل سمجھتے ہیں کہ اس میں نقطہ لگانا بھی گناہ خیال کیا جاتا ہے حالانکہ تجربہ شاہد ہے کہ ہر فن میں ترقیات کی گنجائش ہے۔

اساتذۂ موسیقی سے میری درخواست ہے کہ انہی راگ راگنیوں پر قناعت نہ کریں جو قدماء چھوڑ گئے ہیں بلکہ ان میں اضافہ کریں اور ان کے نئے نئے استعمالات معلوم کریں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ آج کل جب کہ ہر سائنس ترقی کر رہی ہے یہ فنِ لطیف رُو بہ تنزّل ہے اور ہم اس کی اہمیّت کو کھوتے جا رہے ہیں۔ اگر زمانۂ اکبری میں تان سین پیدا ہوا تو اسی مٹی سے دوبارہ ایسے باکمال پیدا کیوں نہیں ہو سکتے۔ فقط

کے ایل رلیا رام



تُو اَور مَیں

(اپنے عزیز دوست عبدالرحمٰن کے نام معنون کرتا ہوں جن کے اشعارِ منثور نے اس نظم کا پس منظر قائم کیا۔)

وقت نے تیرے خیالات بدل ڈالے ہیں
اب ترا حُسن سرِ بام نہیں میرے لئے
اب کوئی وصل کا پیغام نہیں میرے لئے
عشقِ رفتہ کے تصوّر سے پشیماں ہے تُو
اپنے اُس گزرے ہوئے عہد پہ حیراں ہے تُو
آہ! جن آنکھوں میں دیکھی تھی محبت مَیں نے
اُنہیں آنکھوں میں چھُپی دیکھی ہے نفرت مَیں نے
اب ترے ہونٹ نہیں میرے لئے آبِ حیات
اب اُنہیں ہونٹوں پہ ہے میرے لئے لفظِ ممات
یہ دُعا ہے تری مَیں جلد فنا ہو جاؤں
اِس جوانی ہی میں دُنیا سے جُدا ہو جاؤں
تاکہ مِٹ جائے ترے "اوّلیں رُومان" کی یاد
اَور ماضی کی خلش سے ہو ترا دل آزاد
ہے مگر میرے خیالات کا انداز وہی
میرے نغمے ہیں وہی اور مرا ساز وہی
مرے لب پر یہ دُعائیں ہیں کہ تُو زندہ رہے
اَور ترے ساتھ ترا حُسن بھی پائندہ رہے
تاکہ محفوظ رہے میری محبت کا نشاں
مرے گزرے ہوئے لمحاتِ مسرت کا نشاں

عطاءُاللہ سجّاد

آرزو

آرزو، جلوۂ آئینۂ نادانی ہے
آرزو، غازۂ رُخسارِ پشیمانی ہے
آرزو سجدہ گزارِ صنمِ فانی ہے

جمع ہوتے ہیں بہت خوابِ پریشاں اِس سے
چاک ہوتا ہے محبّت کا گریباں اِس سے
غیرتِ عشق، ازل سے ہے گریزاں اِس سے

ہر نفَس کو ہوَس آلُود بنا دیتی ہے
عالمِ زیست کو محدُود بنا دیتی ہے
آرزو غیر کو معبُود بنا دیتی ہے

آرزو، داغ ہے دامانِ محبّت کے لئے
آرزو، ننگ ہے مردانِ محبّت کے لئے
آرزو کفر ہے ایمانِ محبّت کے لئے

ناشناسِ دلِ محبوب، اگر ہے تو یہی،
حائلِ منزلِ محبوب، اگر ہے تو یہی،
بالیقیں غافلِ محبوب، اگر ہے تو یہی

مسکنِ برقِ وفا سوز ہے خرمن اس کا
گوشۂ عشرتِ فانی ہے نشیمن اس کا
دُور کچھ دستِ ہوس سے نہیں دامن اس کا

عشق خورشیدِ جہاں تاب ہے، خود تاب ہے یہ
عشق بے خواب، خرابِ ہوسِ خواب ہے یہ
عشق اسباب شکن، بندۂ اسباب ہے یہ

عشق آزاد، یہ وابستۂ دامِ جذبات
عشق خوددار، یہ خود رفتۂ جامِ جذبات
عشق جذبات پہ غالب، یہ غلامِ جذبات

عشق محجوب، یہ رسوا سرِ بازارِ جہاں،

عشق آزادِ دو عالم، یہ گرفتارِ جہاں
عشق مسجودِ جہاں ہے یہ پرستارِ جہاں

عشق بیزارِ طلب، اور طلب آموز ہے یہ
عشق تمکینِ جنوں، اَور خرد افروز ہے یہ
عشق ہے سوزِ خودی، اور خودی سوز ہے یہ

یہ وُہ جذبہ ہے جو پستی سے بہت دُور نہیں
یہ وُہ شعلہ ہے، کہ جس میں اثرِ نُور نہیں
شورِ منصورؒ ہے لیکن دلِ منصُورؒ نہیں

آرزو، شمعِ ہوس ظلمتِ ایوانِ حیات
آرزو، شعلہ زنِ پاکئ دامانِ حیات
آرزُو، مرگ ہے اے محرمِ عرفانِ حیات

روشِ صدیقی

معصوم قاتل

(۱)

سیّد عرفان علی صاحب دہلوی، ایک مشہور خاندان کے فرد تھے۔ ان کی والدہ انہیں چھوٹا سا چھوڑ کر سدھار گئی تھیں، شفیق والد نے پالا پوسا، اُردو فارسی خود پڑھائی، پھر انگریزی تعلیم کی غرض سے سرکاری اسکول میں داخل کر دیا۔ خداداد ذہانت کے علاوہ سیّد صاحب کو دلی شوق تھا، ہر درجے میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہوتے دسویں جماعت تک پہنچ گئے۔

عین اس وقت کہ امتحان کی تیاری میں مشغول تھے، بڑے میر صاحب علیل ہوئے، چھت سے آنکھیں لگ گئیں، سیّد صاحب نے خوب خوب حقِ فرزندی ادا کیا، دوادوش میں دقیقہ نہ اُٹھا رکھا، تیمارداری میں راتیں کالی کیں اور ان پریشانیوں کے باوجود امتحان میں بھی بیٹھے۔ اِدھر کامیابی کا مژدہ آیا، اُدھر اُسی روز اُن کے سر سے والدِ ماجد کا سایہ اُٹھ گیا۔ اس سانحہ سے سیّد صاحب کا کچھ ایسا دل ٹوٹا، وہ جی اُچاٹ ہوا، تعلیم و تعلم کا سلسلہ توڑ گوشہ نشین ہو گئے۔

خدا بخشے بڑے میر صاحب مرحوم اُن کی شادی تو اپنی زندگی ہی میں کر گئے تھے، اب خسر صاحب کو جو داماد کی افسردہ خاطری کا حال معلوم ہوا، تو بہت کڑھے، دل دہی کے خیال سے لڑکی کی رخصت کر دی۔

اُس نیک بی بی نے بھی خاوند کی خدمت گزاری میں کسر نہ اُٹھا رکھی، کٹھ پُتلی کی طرح اشاروں پر چلتی کہ میاں کا جی بہلا رہے۔

سیّد صاحب کو اتنی میراث پہنچی تھی، کہ بلا منّتِ غیرے تا زلیست گزر بسر کر سکتے تھے، تاہم عزیز و اقارب دوست احباب نے سمجھایا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں، جدّوجہد کا ہی نام زندگی ہے، بیکاری میں ہزار فتنے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، انسان کو کچھ نہ کچھ شغل ضرور چاہئے!

رفتہ رفتہ سیّد صاحب کسی قدر راہ پر آئے، نکمّے پن سے طبیعت گھبرانے لگی، اُن کے خسر صاحب کسی وقت ریاست دھولپور میں سپرنٹنڈنٹ رہ چکے تھے، ایک بار جو پنشن لینے گئے، اُنہیں پولیس میں بھرتی کراتے آئے۔

پڑھے لکھے ذی ہوش آدمی، اس پر بڑے بڑوں کی سفارش، رنگروٹی کی میعاد ختم ہوتے ہی، پہرہ چوکی کے بجائے انہیں شہر کی کوتوالی میں کارِ تحریر پر لگا دیا گیا۔

بیشک پولیس بدنام ہے اور واقعی پولیس والے کرتے بھی ظلم زیادتی ہیں، لیکن پانچوں اُنگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں، ہمارے

یہ مضمون ۳ جنوری ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو پشاور سے نشر ہوا اور اب حسبِ اجازت سٹیشن ڈائرکٹر صاحب شائع ہو رہا ہے۔ — راقم

سید صاحب ایک تربیت یافتہ نیک فطرت انسان تھے۔ اپنی دیانت داری، مستعدی اور کارگزاریوں کے باعث بہت جلد سب انسپکٹری تک ترقی کر گئے۔

اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد، وہ جس جس حلقہ میں رہے کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا، نہایت تن دہی و جانفشانی سے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے، سنگین جرائم کا کھوج لگایا، عجیب عجیب وارداتیں پکڑیں، چوری ڈکیتی کا قلع قمع کیا، پیچیدہ معاملات سلجھائے، اور رشوت کے نام پھوٹی کوڑی کے روادار نہ ہوئے۔

اُن کی ترقّی کو بمشکل دو ہی سال گزرے ہوں گے، نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے صدر مقام سے ایک ایسے تھانہ میں ان کا تبادلہ کر دیا، جو پختہ سڑک اور ریلوے اسٹیشن سے فاصلہ پر تھا، اُنہوں نے سوچا کہ نئی جگہ ہے نہ جانے کیا اُفتاد پڑے، کیسی کیسی دِقّتیں پیش آئیں اس واسطے ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر اپنی اہلیہ اور بچے کو خسر صاحب کے پاس دہلی چھوڑ آئے۔

(۲)

اس تھانہ میں پہنچے تو یہاں بھی اُن کی مقبولیت شروع ہو گئی، سید صاحب کے برتاؤ سے وہاں کے لوگ باگ بہت خوش ہوئے جا بجا چرچا ہونے لگا، کہ بھئی اب کا تھانہ دار تو بہت اچھا آیا ہے، چراغ لے کر ڈھونڈو تو ایسا شریف آدمی نہ ملے گا۔

کسی کے یہاں کوئی تقریب ہوتی سید صاحب ضرور مدعو کئے جاتے، ایک بار کسی شادی میں بلائے گئے۔ وہاں اُسی نواح کی ایک طوائف "حسنو" کا مجرا ہوا، ویسے تھی تو وہ کہنے کو دیہاتی، مگر بلا کی مردم شناس، نہایت تیز طرار، اپنے فن میں طاق، پوری پوری مشاق، خوب ناچی گائی، وہ وہ بُرت بھاؤ کیا، محفل پر چھا گئی۔ اس وقت نہ جانے حسنو کی کون سی ادا سید صاحب کو بھا گئی، آپ لٹو ہی تو ہو گئے۔ اُس کا اتا پتہ لے لیا، اور اس تقریب کے بعد کبھی کبھار اس کے گھر آنے جانے لگے۔

اس آمد و رفت سے خلا ملا بڑھتا گیا، کچھ ایسی میزان پٹی حسنو بان اپنے کُنبہ قبیلے سمیت اُسی قصبہ میں آ بسی، پھر تو وہ پینگیں بڑھیں وہ پینگیں بڑھیں سو حیلے حوالوں سے سید صاحب نے اُس کو خانہ نشین کر لیا۔

اب تو حسنو کے متعلقین بڑے سٹ پٹائے، لگے واویلا کرنے، ہائی تہائی مچاتے پھرے، کیسے کیسے پھن پیٹے، کن کن ذریعوں سے کیا کیا کوششیں کیں، ایک نہ چلی، آخر رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔

اِدھر ذات برادری کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑیں، اُدھر حسنو نے آہستہ آہستہ سید صاحب پر رنگ چڑھانا شروع کیا، کچھ ایسے ڈھرّے پر ڈالا، مزاج ہی بدل دیا، مانا کہ اپنی فطرت کے خلاف اُنہوں نے رشوت ستانی کا بازار تو گرم نہیں کیا تاہم موقع موقع سے ڈالی نذرانے کی صورت میں کچھ نہ کچھ ضرور قبول کرنے لگے۔

اس زرخیز علاقہ میں اُوپر کی آمدنی یعنی دستِ غیب کی کمائی کی گنجائش تھی، تھوڑے ہی عرصہ میں حسنو کے پاس نقرئی طلائی زیورات

کے چہرے جُڑ ہوگئے، کچھ وقت گزرنے کے بعد تیج تہوار پر اس کے متعلقین سلام کے بہانہ آنے جانے لگے، پھر کبھی کبھی سید صاحب سے اجازت لے کر حسنو اُنہیں کچھ نقد و جنس دے دیا کرتی تھی، رفتہ رفتہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اس کو اپنی اماں اور ماموں وغیرہ کے پاس آنے کا موقع بھی ملنے لگا۔

مطلب یہ کہ سید صاحب اچھی طرح حسنو کے قابو میں آگئے، جو ہتھے چڑھتا ہضم کر لیتی، شروع شروع میں اُنہوں نے بیوی بچے کے لئے ایک آدھ منی آرڈر کیا تھا، پھر تو وہ آنکھوں پر ٹھیکری رکھی، ایسا کانوں میں تیل ڈالا، خطوں کا جواب دینا بھول گئے گویا دُنیا میں ان کا کوئی ہے ہی نہیں، بس حسنو ہی سب کچھ ہے۔

اسی حال میں پانچ سال گزر گئے، سید صاحب نے گھر بار کی سُدھ نہ لی، کتنی ہی چٹھیاں نکل گئیں، آدمی آئے، خط و کتابت ہوئی، اُن کے کان پر جُوں نہ رینگی۔

ایک دن گھر کے لفافہ میں اُن کے بچہ کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ٹیڑھا بھدا لنگا سا پرچہ نکلا، بیوی کا خط تو اُنہوں نے یوں ہی رہنے دیا، بچّہ کا پرچہ دیکھنے لگے، اس پرچہ میں دو تین ٹوٹے پھوٹے فقروں کے بعد تحریر تھا:۔

"ابّا جان! آج ایک لڑکے کے باپ نے مجھے ناحق مارا ہے ...... اُس وقت سے کئی دفعہ پھوٹ پھوٹ کر رو یا ہوں ...... کہ میرے ابا یہاں نہیں ہیں ...... اب آپ کب تک آئیں گے ... جلدی سے آجایئے ...."

چھاتی پر دھکا لگا، اور جیسے سچ مچ کلیجہ پاش پاش ہوگیا ...... روتے روتے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹنے لگیں۔

سُورج ڈھل چکا تھا، تھوڑی دیر اُداس اُداس رہے پھر تھانہ سے اُٹھ کر نڈھال بے حال گھر چلے آئے۔

آج پہلا دن تھا کہ حسنو اُنہیں بارِ خاطر معلوم ہوئی، اس کی ہر بات ناگوار گزرنے لگی، صُورت سے جی بیزار ہو رہا تھا، پہلے تو وہ خاک نہ سمجھی، پھر ان کے میلے تیوروں سے تاڑ گئی کہ ہاں کچھ دال میں کالا ہے، لگی چاپلوسی کی باتیں کرنے، سید صاحب نے مطلق پروا نہ کی۔ ایسے گم سم ہوئے، حسنو کو آدھی بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

(۳)

رات کا کھانا کھانے بیٹھے تو نوالہ اٹکنے لگا، آخر دستر خوان سے اُٹھ کر پلنگ پر جا پڑے، حسنو آئی اور ہمدردانہ لہجہ میں ٹھنک ٹھنک کر کہنے لگی:۔

"اے صدقے کیسا مزاج ہے آپ کا؟"

سید صاحب نے بُری طرح جھڑک دیا:۔

"اِس وقت بولنے کو جی نہیں چاہتا، طبیعت ٹھیک نہیں ہے ہماری ...... جاؤ سو رہو!"

اصل بھید تو وُہ جانیں یا خدا اُنھوں نے کسی کو بتایا نہیں، ہاں حسّو کی زبانی اتنا ضرور معلوم ہُوا تھا، کہ اُس رات سید صاحب نے ہاتھ پیر سمیٹتے اور کراہ کراہ کر سویرا کر دیا۔

اِس واقعہ کے چار دن بعد تک وہ کھوئے کھوئے سے رہے، پانچویں روز کانسٹبل نے دروازے پر آواز دی، دوڑے دوڑے گئے اور اُلٹے قدموں واپس آکر مسکراتے ہوئے کہا:۔

"حسّو! ذرا تم اپنے گھر چلی جاؤ! . . . . جب بُلاؤں تب آنا!!"

اُس نے پُوچھا "کیا بات ہے؟"

جواب دیا "کچھ نہیں، تم چلی جاؤ . . . . فوراً . . . . . جاؤ . . . جاؤ . . . چلی جاؤ . . . . ابھی جاؤ!"

کیونکہ وہ ہمیشہ اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی کر دیا کرتے تھے، اس واسطے اس نے پُوچھا:۔

"کس کے ساتھ جاؤں؟"

بولے:۔ "اس وقت آدمی وادمی کوئی نہیں، اکیلی ہی چلی جاؤ . . . . ہائیں ہائیں . . . . کیوں دیر لگا رہی ہو . . . . جاؤ . . . . بس کہہ دیا جاؤ!"

پھر سیّد صاحب جلد جلد صافہ باندھنے لگے، اور حسّو مایوس ہوکر ایک بدحواسی کے سے عالم میں جُوتیاں سٹر سٹر کرتی دروازے سے باہر ہوگئی۔

(۴)

حسّو کو گھر پہنچے کوئی دس پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے، معلوم ہُوا سیّد صاحب کے بیوی بچّے دہلی سے آگئے، ہاں ہاں یُوں کہو، ضرور اُنھوں نے خط وکتابت کی ہوگی، جب ہی تو، ورنہ کل تیسرے پہر بیل گاڑی اور دو چوکیدار ریلوے اسٹیشن پر کیوں بھیجتے۔

جس گھر میں سیّد صاحب اور حسّو نظر آیا کرتے تھے، اب وہی گھر اُن کے بیوی بچّے اور تیرہ چودہ سالہ چھوٹے سالے کی آمد سے گویا سوتے سوتے جاگ اُٹھا، ایک عجیب چہل پہل ہوگئی۔

پچھلی رات ریلوے سٹیشن سے گاڑی ہنکی تھی، کوئی لو ساڑھے نو بجے تک یہ لوگ ساتھ خیریت کے یہاں پہنچ گئے، بیوی دلّی سے اپنے ساتھ گھر کی ماما نوکرنی لیتی آئی تھیں، سبزی ترکاری کے سوائے گھر میں اَور سامان موجود ہی تھا، پکانے ریندھنے کی تیاری ہونے لگی۔ جیسے کوئی بہت بڑا قصور ہوا ہو، اس وقت سیّد صاحب کی بیوی سے نظر نہ ملتی تھی، مارے خجالت کے سر نیچا ہُوا جاتا تھا، جب ہی تو کھُل کر بات نہ کر سکے، یُوں ہی دو ایک اُکھڑے اُکھڑے سے فقرے کہہ کر مردانی نشست میں چلے آئے، چوکیدار کو سودا سلف کے لئے بھیجا، اور آپ نشستگاہ کے گاؤتکیہ سے ٹک کر خاموش بیٹھ گئے۔

ابھی کچھ سوچنے نہ پائے تھے، خوشنما سرپوش سے ڈھنکا ہُوا ایک طشت ہاتھوں پر رکھے ہوئے اُن کا بچہ آیا اور شہری تہذیب کے مطابق آداب بجالایا۔

سرپوش اُٹھا کر جو دیکھتے ہیں، تو گھنٹے والے کا حلوا سوہن، چیٹے کی مٹھائی، سنگترے، سیب، پٹاری کے انگور وغیرہ بڑے سلیقہ سے چُنے ہوئے تھے، دیہات کے ویرانوں اور گنواروں کی صُحبت سے سید صاحب کا جی اُکتا گیا تھا، سالہا سال بعد دِلّی کی معاشرت جھلکی، آہ! بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں، تخیلات کا طُوفان اُٹھا، حواس قابُو میں نہ رہے، اپنے نُورِ دیدہ کو نظر فریب زرق برق پوشاک میں دیکھ کر آپ پھُولے نہ سماتے تھے، بیقرار ہو کر اُسے چھاتی سے چمٹا لیا، اس طرح پیار کرنے لگے، جیسے ابھی دو ڈھائی سال کا ہی ہے حالانکہ وہ وقت پانچ برس پیچھے جا چُکا تھا۔

کہاں وہ سرد مہری، ہزار ہزار کوششوں کے باوجود پروا نہ کی کہ ہمارا کوئی ہے، کہاں یہ حال گویا زندگی بھر کی شفقت ابھی ابھی ختم کر دیں گے، کبھی اپنے ہاتھ سے بچے کو مٹھائی کھِلانے لگتے تھے، کبھی پیار کر کر کے نہالوں نہال ہوئے جاتے تھے۔

(۵)

سیّد صاحب نے بچّے کے خوب خوب تماشے کئے، اس کھیل میں وُہ ایسی بے صبری سے کام لے رہے تھے جیسے وقت غنیمت ہے، پھر بھلا ایسا موقع کاہے کو آنے لگا۔

میز پر ایک بھرا بھرایا مزل لوڈنگ پستول رکھا تھا، اُس طرف جو نظر گئی تو سید صاحب کو خیال آیا، بچّوں کے گھر میں بڑی احتیاط چاہئے، یا تو اِسے چلا کر خالی کر دیں، یا خیر ٹوپی ہی اُتار لیں۔

بچے سے کہا:۔

"بیٹا! ذرا وہ تو اُٹھا لا، دیکھ سنبھل کر لائیو، ہاں!"

جب وہ لے آیا، تو پوچھا:۔

"کیوں بیٹا! یہ کیا ہے؟"

جو رے بھوروں کا پلا بچہ، جس نے بسم اللہ کے گُنبد سے قدم نہ نکالا تھا، اُسے دِلّی کے گھروں میں بھلا پستول کہاں دکھائی دیتا، بھولے پن سے بولا:۔

"خبر نہیں!"

سید صاحب نے کہا:۔

"اچھا بیٹا! بیٹھ جا!!"

انقلابِ فرانس کا ایک منظر

میری آنتوانت کی زندگی کے آخری لمحے!

خورشیدِ خاوری کرۂ ارض کو منوّر کرنے کے لئے کشمکش میں مصروف تھا۔ صبح کے چار بجے تھے اور فرانس کی بدقسمت ملکہ میری آنتوانت کی زندگی کا آخری دن شروع ہو رہا تھا۔ وہ قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں انتہائی سکون کے ساتھ موت کے انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھی قید خانے کے محافظ نے ملکہ کے حکم پر کاغذ قلم اور دوات پیش کی اور اُس نے مندرجۂ ذیل خط اپنی بہن کے نام لکھا:۔

۱۵ اکتوبر ۱۷۹۳ء ۴½ بجے صبح

میری پیاری بہن!

"مَیں تمہیں آج آخری مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے سزائے موت دی جا رہی ہے اور مَیں کچھ عرصہ میں تمہارے بھائی سے جا ملوں گی۔ مجھے اُمید ہے کہ میں بھی موت کے وقت اُسی کی طرح ثابت قدم رہوں گی۔ میرے بیٹے کو اپنے باپ کے آخری الفاظ کبھی نہ بھولنے چاہئیں، اور میں انہیں آج پھر دُہراتی ہوں کہ وہ ہماری موت کے انتقام کی کبھی کوشش نہ کرے۔ مَیں خدا سے خلوصِ دل کے ساتھ اپنے گناہوں کی جو زندگی میں مجھ سے سرزد ہوئے معافی مانگتی ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ وُہ اپنی رحیمی کے صدقے مجھے بخش دے گا۔ میرے یکیس اور یتیم بچوں کو میری طرف سے پیار کرنا۔ اُن سے ہمیشہ کی جُدائی کا خیال میرے دِل کو پارہ پارہ کئے دیتا ہے۔ الوداع۔ ہمیشہ کے لئے الوداع!"

خط ختم کرنے کے بعد ملکہ نے خط کو ہر جگہ بوسہ دیا شاید اس خیال سے کہ الفاظ کے ساتھ اُس کے ہونٹوں کی گرمی اور آنسوؤں کی نمی بھی اُس کے پیارے بچوں تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد ملکہ نے دُعا کی اور چند گھنٹے آرام کیا۔ بیدار ہونے پر مادام بالٹ کی بیٹی نے اُسے کپڑے پہنائے اور بالوں میں کنگھی کی۔ ملکہ نے سیاہ لبادہ جو وہ اپنے خاوند کی موت کے وقت سے پہنے ہوئے تھی اُتار دیا اور اس کے بجائے سفید پہن لیا۔ صرف ایک سیاہ فیتہ جو اُس کی ٹوپی بندھا ہُوا تھا دُنیا کو اُس کے ماتم کی اور اُس کے دِل کو اُس کی بیوگی کی یاد دلا رہا تھا۔

موسمِ خزاں کی ٹھنڈی اور زردی مائل دھند دریائے سین پر چھائی ہوئی تھی جس سے سورج کی چند شعاعیں نہایت مشکل سے گزر کر پیرس کی سر بفلک عمارات پر پڑ رہی تھیں۔ شہر کے مکانات کی تمام کھڑکیاں اور چھتیں تماشائیوں سے بھری تھیں۔ گیارہ بجے جلاد چند سپاہیوں کے ساتھ قید خانے میں داخل ہُوا۔ ملکہ کے چہرے پر کسی قسم کی کمزوری اور خوف کے آثار نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے

اُسے بحیثیت ایک ملکہ کے مرنے کی طاقت بخش دی ہے۔ زنداں کی سیڑھیوں سے اُتر کر اُس کی نظر قیدیوں کی اُس گاڑی پر پڑی جس کی طرف سپاہیوں کے قدم اُٹھ رہے تھے۔ وُہ کچھ جھجکی۔ شاید اُلٹے پاؤں واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فرانس کے لوگ اپنی نفرت کو کسی حد تک چھپالیں گے اور اُس کے لئے بھی مقتل میں لے جانے کے لئے ایسی ہی بند گاڑی مہیا کریں گے جیسی اُس کے خاوند کے لئے کی گئی تھی۔ لیکن اپنے جذبات کو دبا کر اُس نے تسلیم خم کر دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اُس کے ہاتھ چونکہ بندھے ہوئے تھے اس لئے ملکہ کو گاڑی کے ہچکولوں کی وجہ سے اپنا توازن برقرار رکھنے میں بڑی دقت ہوئی لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے شاہی وقار کو کم نہ ہونے دیا۔ جہاں جہاں سے گاڑی گزرتی رہی لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم ٹھٹھوں اور چیخ پکار سے اُس کا استقبال کرتا رہا۔ لیکن اتنے بڑے ہجوم میں بعض اشخاص ایسے بھی تھے جن کی نظروں میں اگرچہ رحم کی جھلک نہیں تھی لیکن مایوسی ضرور تھی۔ ملکہ کی نظر بار بار مکانوں کی اوپر والی چھتوں تک جاتی جہاں جمہوریت کے سہ رنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ٹلریز کے باغ کے دروازے کے سامنے گاڑی کچھ عرصہ کے لئے ٹھہر گئی۔ میری آنتوانت نے اپنے پُرانے محل کو حسرت بھری اور اشک آلود آنکھوں سے دیکھا اور گزشتہ زندگی کا تمام نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ پہیوں کے اور دو تین چکر پورے کرنے کے بعد گاڑی گلوٹین تک پہنچ گئی۔ جلّاد اور پادری کے سہارے وہ گاڑی سے اُتری اور گلوٹین کی سیڑھی پر چڑھ گئی۔

ملکہ نے دوزانو ہو کر دُعا مانگی اور کہا الوداع میرے پیارے بچّو میں تمہارے باپ کے پاس جا رہی ہوں۔ جلّاد نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلوٹین کو نیچا کیا اور آناً فاناً ملکہ کا سر دھڑ سے الگ جا پڑا۔ جلّاد کے نائب نے سر کو بالوں سے پکڑ کر چاروں طرف گھمایا اور فضا "جمہوریت زندہ باد" کے نعروں سے گونج اُٹھی۔

(ترجمہ) محمد شفیع

وہ کب آتی ہے

وُہ اُس وقت نہیں آتی جب دوپہر کے سُورج کی چمک میں پھُول جگمگاتے ہیں

دن بہت زیادہ روشن ہوتا ہے

اور اُس وقت بھی نہیں آتی جب کام اور کھیل کُود کے بعد آدمی سستاتا ہے

لیکن جب رات کو ہار پر چھاؤنی ڈالتی ہے اور سمندر کی جانب سے پُرشور طوفانی آوازیں آتی ہیں

وہ ستاروں کی روشنی میں، شمع کی روشنی میں، اور خوابوں کی روشنی میں میرے پاس آتی ہے

ہربرٹ ٹرنچ

غزل

دم بخود ہے عقل ذرّے میں بیاباں دیکھ کر
ناخدا در کار ہے قطرے میں طوفاں دیکھ کر

بعدِ منزل کا تصور کر کے تھک جاتا ہوں میں
پست ہو جاتی ہے ہمت بارِ عصیاں دیکھ کر

لوگ کہتے تھے مجھے وحشی نہ آتا تھا یقیں
سر نگوں ہونا پڑا چاکِ گریباں دیکھ کر

خوش ہوئے اہلِ چمن آئی زمانے میں بہار
رو دیئے ہم اپنی بربادی کا ساماں دیکھ کر

مے نہ ہو بدنام میخانے کی رسوائی نہ ہو
مے عطا کر میرے ساقی ظرفِ رنداں دیکھ کر

کشتگانِ ناز میں شاید ترا محسن بھی ہے
چلنے والے چل ذرا گورِ غریباں دیکھ کر

محسن اعظم گڈھی

غزل

ترا برہمن تری یاد میں ترے در پہ سر بسجود ہے
اُسے شوقِ سجدہ ضرور ہے، نہ قیام ہے نہ قعود ہے

ترے ہجر میں شبِ دوسرا کبھی آہ ہے۔ کبھی ہے فغاں
یہی میرا تجھ پہ سلام ہے۔ یہی میرا تجھ پہ درود ہے

نہ کوئی بھی مجھ کو سمجھ سکا، نہ کسی پہ حال مرا کھلا
مگر ایک دیکھتی آنکھ ہے وہی ایک چشمِ حسود ہے

مرے بننے میں جو بگاڑ ہے وہی ایک پھول سی آڑ ہے
اُسے کس طرح سے مٹاؤں میں وہی میری اصلِ وجود ہے

یہ گلوں کا صبح کو جھولنا وہ شفق کا شام کو پھولنا
یہ زمیں پہ شانِ نزول ہے وہ فلک پہ رنگِ صعود ہے

آغا شاعر قزلباش دہلوی

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

بمبئی کی آزاد فضا میں چھ سال رہنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ شاہد میں جہاں اور بہت سی بُرائیاں پیدا ہوئیں وہیں اُسے شراب نوشی کا چسکا بھی بُری طرح پڑ گیا، اس میں شک نہیں کہ اس کی تجارت دِن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی لیکن یہ دخترِ رز اس کی بربادی کا سامان کر رہی تھی، آج بھی حسبِ معمول ہمارا نوجوان دوست شام کا کھانا کھا کر اپنے چند کاغذات کا پلندہ بغل میں دبائے باہر جانے کے لئے تیار ہُوا، آج غالباً پہلی بار اس کی بیوی نے اس سے یہ سوال کیا کہ جب تم اور گلباز دونوں دوست ہو اور یہ تجارتی معاملہ جس کے لئے تم روزانہ اس کے یہاں جاتے ہو، جتنا ضروری تمہارے لئے ہے اتنا ہی ضروری اس کے لئے ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ تمہارے گھر ایک دفعہ بھی نہ آئے اور تم روز دوڑ دوڑ کر اس کے پاس جاؤ، کیا نفع ہوگا تو صرف تمہیں لوگے گلباز اس میں شریک نہ ہوگا، شاہد نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر لیا اور نہایت دانشمندی سے برجستہ جواب دیا کہ گلباز تو بخوشی یہاں آئے لیکن میں خود ایسے شخص کو اپنے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، یقیناً شاہد کا یہ جواب مسز شاہد کے لئے بہت ہی تعجب انگیز تھا، چنانچہ اس نے حیرت سے پوچھا "کیوں، وہ کیسا آدمی ہے ؟"

شاہد۔ وُہ بہت ہی بدتمیز آدمی ہے اور کریہہ الصورت تو ایسا ہے کہ آدمی کو فوراً قے آ جائے، باتیں ایسی بیہودہ کرتا ہے کہ عورتیں شرم سے مُنہ چھُپا لیتی ہیں۔

مسز شاہد۔ افسوس! پھر بھی تمہیں ایسے لوگوں سے مِلنا پڑتا ہے۔

شاہد۔ (ایک لمبی سانس لے کر) کیا کیا جائے، کاروبار کی مجبوریاں بہت سخت ہوتی ہیں،

مسز شاہد۔ ٹھیک ہے، خیر جاؤ . . . لیکن ہاں دیکھنا ذرا جہاں تک ممکن ہو جلدی واپس آنا،

شاہد۔ مَیں کوشش تو کروں گا جلد آنے کی لیکن اس بدبخت کو بے خوابی کی بیماری ہے اور وہ اس قدر بے حس واقع ہُوا ہے کہ دوسروں کے آرام و تکلیف کا مطلق خیال نہیں کرتا، بہر حال جہاں تک ممکن ہو گا مَیں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔

شاہد اپنی عیاری پر یا بقول اپنے حکمت و دانش پر نازاں اور متبسم فوراً گھر سے روانہ ہو گیا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد وُہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا، وُہ منزلِ مقصود کیا تھی، ایک ہوٹل جس میں شراب خانہ بھی تھا،

شاہد کے تمام دوست شرابی اور جواری تھے، اور وہ خود بھی پرلے درجے کا شرابی، جواری اور اوباش ہو گیا تھا، وہ طرح طرح کے بہانوں سے رات گھر سے باہر گزارتا، اپنے دوستوں کے ساتھ شراب پیتا اور جوا کھیلتا، لیکن یہ بہانے آخر کب تک چل سکتے تھے اس کی بیوی حقیقت سے آگاہ ہو گئی اس لئے اس کا گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو یہ پٹی پڑھائی کہ وہ اور ایک دُوسرا تاجر گلباز خان دونوں مل کر ایک تجارتی کمپنی بہت بڑے پیمانے پر قایم کر رہے ہیں اور اس کمپنی کے معاملات سلجھانے اور شرائط وغیرہ طے کرنے کے لئے اس کو گلباز کے پاس جانا ضروری ہوتا ہے، شاہد اپنی اس چال میں کامیاب ہو گیا۔

ہوٹل کے میکدہ میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جام چڑھانے لگا، اس کے ایک ساتھی نے نہایت افسردگی کے ساتھ کہا "یار، دُنیا میں بیوی سے بڑھ کر کوئی لعنت نہیں، آج نہ جانے کن مشکلوں سے یہاں آسکا ہوں لیکن کل تو یقیناً گھر میں قید رہنا ہی پڑے گا کیونکہ میری سراپا حماقت بیوی نے محض مجھے پریشان کرنے کی غرض سے کل رات کو ایک دعوت کا بندوبست کیا ہے"۔ شاہد نے یہ سُن کر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا "اگر بیوی کے چنگل سے خلاصی پانا چاہتے ہو تو گلباز خان نامی ایک شخص سے ملاقات پیدا کرو"۔ اس پر اس کے کئی دوست بیک آواز چلّا اُٹھے کہ بھئی یہ گلباز خان کون ہے؛

شاہد نے ایک اور بلند قہقہہ لگایا اور بولا "سنو، گلباز خان ایک پچاس برس کا بوڑھا فرتوت ہے ایسا کریہہ الصورت کہ آدمی اسے دیکھ کر کھانا نہ کھا سکے، بڑا ہی بے ہودہ، بدتمیز، غیر مہذب اور ناشائستہ آدمی ہے"۔ اس کے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ صاف صاف بتاؤ یہ گلباز خان کون ہے؛

شاہد۔ اچھا تم لوگ مصر ہو تو سنو، گلباز خان ایک بہت بڑا رئیس اور تاجر ہے، ایک بہت ہی کامیاب فرم کا مالک ہے، میں اس سے روزانہ رات کے وقت ملنے جاتا ہوں اور تجارتی معاملات پر بحث کیا کرتا ہوں"۔

ایک دوست نے ہنس کر کہا "کیا واقعی اس نام کا کوئی شخص دُنیا میں ہے یا یہ محض تمہاری تخیّل آرائی ہے؛"

شاہد نے ایک فاتحانہ تبسّم کے ساتھ جواب دیا "تم لوگ عجیب احمق ہو، اتنی صاف بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، ارے میں نے گلباز کو اپنے دماغ سے پیدا کر لیا ہے اور اپنی بیوی سے یہ کہہ کر کہ گلباز خان میرا شریکِ کار ہے اور اس سے تجارتی معاملات میں گفتگو کرنی ہے، روز یہاں آجاتا ہوں، تم لوگ بھی یہی کر سکتے ہو"

یہ سُن کر شاہد کے تمام دوستوں نے قہقہہ لگایا اور اس کی فراست و دانائی کی داد دی، لیکن یہ کسی نے خیال نہ کیا کہ وہاں پاس ہی ایک نوجوان اپنا مُنہ اخبار سے چھپائے ہوئے بیٹھا ہے، اس نوجوان نے بھی شاہد کی "دانشمندی و ندرت" کی یہ دلچسپ داستان سُنی اور دانت پیس کر دل ہی دل میں کہنے لگا "اس خبیث نے مجھے اپنے دفتر سے صرف اتنی سی بات پر نکال دیا کہ میں نے ایک گلاس شراب کا اس کی بوتل سے پی لیا تھا، مردُود کہیں کا، خود تو بیوی کو دھوکا دیتا ہے اور شراب پیتا ہے اور دوسروں پر یہ دار و گیر!"

اس نوجوان کا نام آفتاب تھا اور وہ شاہد کے دفتر میں کلرک تھا، تقریباً دو ماہ ہوئے تھے کہ شاہد نے اسے علیحدہ کر دیا تھا اور اسی وقت سے وہ بے چارہ بے روزگار تھا مفلسی بڑی ہی بُری چیز ہوتی ہے، آفتاب اپنی زندگی سے تنگ آ گیا تھا، دفعتًہ اس کے دماغ میں ایک بات آئی اور ہونٹوں پر ایک تبسم جس میں حقارت تھی، اور اُس نے یہ طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو میں اس ترکیب پر ضرور عمل کروں گا۔

(۲)

دوسرے دِن شام کو چار بجے آفتاب شاہد کے مکان پر گیا، وُہ جانتا تھا کہ اس وقت شاہد گھر پر نہیں رہتا اور واقعہ بھی یہی تھا۔ اس نے ملازم سے کہا "میرا نام گلباز خاں ہے، میں اپنے دوست شاہد کو ایک ضروری پیغام دینے آیا ہوں"

ملازم نے مسز شاہد کو جا کر یہ خبر دی، مسز شاہد پہلے تو کچھ سہم سی گئی کیونکہ شاہد نے گلباز کی ہئیت اور اس کی بدتمیزی کے متعلق پہلے ہی اس کے کان بھر دیئے تھے لیکن چُونکہ وہ اپنے شوہر کے اکثر دوستوں کے سامنے بے پردہ آنے کی عادی تھی اِس لئے وُہ اُس کے نئے دوست اَور شریک کار سے ملنے کے لئے ڈرتے ڈرتے ملاقات کے کمرے میں آئی۔ اس یقین کے ساتھ کہ کسی بہت ہی کریہہ الصورت شخص کو دیکھے گی لیکن جب اس کی نظر آفتاب پر پڑی تو وُہ حیران ہو گئی، اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان نہایت شائستہ و مہذّب سامنے کھڑا ہے۔ اس نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اَور اپنی حیرت و استعجاب کو دُور کرتے ہُوئے پوچھا۔

"آپ مسٹر گلباز خاں ہیں؟"

آفتاب۔ جی ہاں، معاف کیجئے گا آپ کو تکلیف دی، میں مسٹر شاہد کو ایک ضروری پیغام دینے آیا تھا۔

مسز شاہد۔ کیا آپ ہی مسٹر گلباز خاں ہیں؟ میرے شوہر کے کاروبار میں شریک۔

آفتاب۔ جی ہاں، مَیں نے ان کے دفتر میں فون کیا تھا لیکن وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، چونکہ مَیں بمبئی سے باہر جا رہا ہوں اس لئے مناسب سمجھا کہ ذرا مِل لُوں تو ٹھیک ہے۔

مسز شاہد کو اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ وُہ شخص واقعی گل باز خاں ہے۔ چنانچہ اُس نے پھر پُوچھا "کیا آپ مسٹر گلباز خاں کے صاحبزادے ہیں؟"

آفتاب۔ معزز خاتون، مَیں خود گلباز ہوں، میرے والد کو انتقال کیئے تو عرصہ گزرا۔

مسز شاہد۔ تو آپ وہی مسٹر گلباز خاں ہیں جن سے تجارتی معاملات میں گفتگو کرنے کے لئے میرے شوہر روز رات کو جایا کرتے ہیں؟

آفتاب۔ جی ہاں، میں ہی وہ شخص ہوں، اور میں بیحد نادم ہوں کہ شاہد صاحب کو روز میری وجہ سے تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے، مگر کیا کیا جائے کاروباری معاملات کچھ ایسے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ آدمی بے بس ہو جاتا ہے، اُمید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھیں گی۔

مسز شاہد۔ مگر حیرت ہے کہ آپ آج تک ہمارے یہاں کبھی تشریف نہ لائے، میں تو یہ سمجھی تھی کہ شاید آپ کبھی نہ آئیں گے، خیر خُدا کا شکر ہے

کہ آج آپ آ گئے، ہاں "وہ" یہ بھی کہتے تھے کہ آپ بہت عدیم الفرصت رہا کرتے ہیں۔

آفتاب۔ جی ہاں، یہ حقیقت ہے، کیونکہ تجارتی معاملات . . . . .

مسز شاہد۔ لیکن یہ ہمارے لئے عین مسرت کا باعث ہوگا اگر آپ کسی روز یہاں کھانا تناول فرمائیں،

آفتاب۔ محترم خاتون، آپ کی دعوت رد کرنا میں خلافِ تہذیب سمجھتا ہوں، میں انشاء اللہ ضرور کسی دن آؤں گا، لیکن ابھی تو آپ • مسٹر شاہد سے یہ کہہ دیجئے گا کہ میں ایک ہفتہ کے لئے بمبئی سے باہر جا رہا ہوں۔ لہٰذا ایک ہفتہ تک مجھ سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔

مسز شاہد۔ خیر یہ تو میں کہہ دوں گی، لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ ہماری دعوت کب قبول فرماتے ہیں۔

آفتاب۔ آج بدھ ہے، انشاء اللہ آیندہ بدھ کو حاضر ہوں گا۔

(۳)

جب شاہد رات کے کھانے سے فارغ ہو چکا تو مسز شاہد نے کہا "کیا آج بھی تمہیں گلباز خاں کے پاس جانا ہے ؟"

شاہد۔ ہاں، اس سے تو مفر نہیں، وہ غریب میرے انتظار ہی میں ہوگا۔

مسز شاہد نے ایک لمحہ سکوت کے بعد پوچھا "تم نے گلباز کی عمر کتنی بتائی تھی ؟"

شاہد۔ پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔

مسز شاہد۔ کیا واقعی وہ بہت بدصورت ہیں ؟

شاہد۔ اجی بالکل بندر معلوم ہوتا ہے۔

مسز شاہد نے چمک کر کہا "ہوں! تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔"

شاہد۔ (حیرت سے) کیا کیا، تم کیا کہہ رہی ہو ؟

مسز شاہد۔ (نہایت غصہ سے) تم جھوٹے ہو، میں گلباز کو دیکھ چکی ہوں۔

شاہد۔ تم کیا بک رہی ہو ؟

مسز شاہد۔ میں بک رہی ہوں ؛ میں کہتی ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے گلباز کو دیکھا ہے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اتنا ناپاک جھوٹ کیوں بولتے رہے ہو ؟

شاہد۔ (حیرانی و خفت کے ساتھ) تو تم گلباز کو دیکھ چکی ہو ؟

مسز شاہد۔ ہاں، آج چار بجے میں نے انہیں دیکھا ہے، وہ خود آئے تھے اور کہہ گئے ہیں کہ میں ایک ہفتہ کے لئے بمبئی سے باہر جا رہا ہوں، اس دوران میں تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی، میں نے آیندہ بدھ کو رات کے کھانے پر بھی ان کو مدعو کیا ہے۔

شاہد کی حالت حیرت و استعجاب سے بری ہو رہی تھی، وُہ چلّا کر کہنے لگا "تم نے دعوت دی ہے، گلباز کو، کیسے، ذرا سوچو تو سہی، تم کیا کہہ رہی ہو،
مسز شاہد۔ ہاں ہاں، بس زیادہ نہ بنو، تمہارا بھرم کھُل چکا ہے، آخر تم کو اتنا ناپاک جھوٹ بولنے کی کیا پڑی تھی، کیا تمہیں گلباز کی خوبصورتی اور جوانی پر رشک آتا ہے۔

شاہد۔ رشک! ہاں شاید . . . . . . خیر . . . . . رشک تو مردوں کی ایک عام بیماری ہے،

مسز شاہد۔ (دانت پیس کر) تو کیا تم نے مجھے ایسی ویسی عورت سمجھ لیا ہے، اہوں!

شاہد نے اب خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا، چنانچہ مسز شاہد اسے بڑی دیر تک صلواتیں سُناتی رہی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا، آخر کار چند لمحوں کے بعد بولا "پیاری آج دفتر میں کام بہت تھا، میں تھک کر بالکل چُور ہو گیا ہوں اور سویرے ہی سو جانا چاہتا ہوں، مذاق نہ کرو، سچ سچ بتا دو کہ تم نے کسے مدعو کیا ہے،

مسز شاہد نے نہایت متانت و سنجیدگی سے جواب دیا "مسٹر گلباز کو، میں قسمیہ کہتی ہوں کہ میں نے مسٹر گلباز کو مدعو کیا ہے، تم واقعی بہت تھکے ہوئے ہو، اس وقت تمہارا دماغ بھی درست نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم سو جاؤ۔

(۳)

شاہد کے یہ چند روز بڑی تشویش میں گزرے، آخر بدھ کا فیصلہ کُن دن آ ہی گیا اور ملازم نے مسٹر گلباز خان کے آنے کی خبر دی، شاہد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ حیرت و پریشانی سے آنے والے کی راہ تکنے لگا، دفعتہً کیا دیکھتا ہے کہ آفتاب اس کے دفتر کا سابق کلرک سامنے کھڑا ہے۔ آفتاب نے بڑی ہی بے تکلفی سے دوستانہ طریق پر شاہد کو سلام کیا اور کہنے لگا "مسز شاہد کا ممنون ہوں کہ انہوں نے آج مجھ کو مدعو فرمایا، مگر بھئی شاہد آج ہی دوپہر کو سفر سے لوٹا ہوں"

شاہد نے بمشکل حواس درست کر کے کہا "مسٹر گلباز، مزاج تو بخیر ہا، اُمید ہے کہ تمہارا یہ سفر بھی خوشگوار اور مفید ثابت ہوا ہوگا"

شاہد کے حیرت و استعجاب کی انتہا نہ تھی، اس کے ہوش و حواس سچ تو یہ ہے کہ ٹھکانے نہ تھے، وُہ حیران تھا کہ آخر یہ کیا معمّا ہے۔ اس کمبخت کو یہ راز کیسے معلوم ہو گیا، غرض کھانا کھا لینے کے بعد مسز شاہد یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں کہ تم دونوں اپنی کاروباری باتیں کرو۔

تنہائی پا کر شاہد نے آفتاب سے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے، تم نے ایسا کیوں کیا؟"

آفتاب ۔ آپ نے چند روز ہوتے ہیں، شراب خانہ میں گلباز خان کی نسبت جو کچھ کہا تھا، وُہ میں نے سُن لیا تھا اور سوچا کہ میں گلباز خان بن کر آپ کی مدد کیوں نہ کروں۔

شاہد نے لال پیلے ہو کر اور آنکھیں نکال کر کہا "لیکن میں تمہیں ابھی پولیس کے حوالہ کرتا ہوں"

آفتاب ۔ جی نہیں، آپ یہ نہیں کر سکتے، میں آپ کے ساتھ بحیثیت گلباز خاں کے کھانا کھا چکا ہوں، اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھئے

کہ اگر آپ مجھ کو پولیس کے حوالے کر دیں گے تو میں آپ کو مسز شاہد کے حوالے کر دُوں گا۔

شاہد نے دانت پیس کر کہا "بدمعاش! تُو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

آفتاب نے نہایت متانت سے جواب دیا "جب سے آپ نے مجھے دفتر سے جواب دیا سوائے پریشانی کے اور کچھ نصیب نہیں میں چاہتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً آپ کے دسترخوان پر کھانا کھاتا رہوں، آپ کو گلباز خاں کی ضرورت ہے تاکہ آپ رات کو باہر رہ سکیں، مَیں آپ کو اس کا موقع بہم پہنچاتا رہوں گا، اور اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو پھر میں گلباز خاں ہونے کی حیثیت سے آپ کی بیوی کو خبر دُوں گا کہ میں ہمیشہ کے لئے کسی دوسرے شہر کو منتقل ہوا جاتا ہوں۔"

شاہد نے دانت پیس کر آفتاب کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا اور پھر کچھ دیر کمرے میں کامل سکوت رہا۔

آفتاب ۔ دیکھئے اگر آپ میری صرف ایک شرط منظور کر لیں تو میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

شاہد نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا "تمہاری شرط کیا ہے، بولو۔"

آفتاب ۔ مجھے پھر سابق عہدے پر بحال کر دیجئے۔

شاہد ۔ مجھے منظور ہے بشرطیکہ تم پھر کبھی میری یا میری بیوی کی دعوت پر یہاں آنا منظور نہ کرو۔

آفتاب نے وعدہ کر لیا اور وُہ دوسرے دن پھر شاہد کے دفتر میں کام کرنے لگا۔

(ماخوذ از انگریزی) **عبدالرزاق قریشی**

مَیں نے کیا دیکھا

مَیں نے دیکھا تصوّر میں

لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے مردویوں کو

جنّت کے مرغزاروں میں

خوفزدہ حوروں کے پیچھے

خوشی سے چھلانگیں لگاتے، اکڑ کتے، شور مچاتے

مہدی علی خاں

میرا گاؤں

رہوں گا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں
عمیق گھاٹیوں میں اُونچے کوہساروں میں

یہ کچے مٹّی کے گھر، یہ غریب رشتہ دار
یہ ٹیڑھی سیدھی سی بوسیدہ چھپّروں کی قطار

یہ تنگ گلیوں میں جمگھٹ حسین لڑکوں کے
یہ جال کھیتیوں میں اُونچی نیچی سڑکوں کے

یہ مُنہ اندھیرے ہی بیلوں کی گھنٹیوں کی صدا
یہ صبح صبح گھروں سے دُھواں سا اُٹھتا ہوا

یہ چھت پہ بیٹھی ہوئی بھولی بھالی دوشیزہ
یہ بانکا ترچھا سا اک نوجوان جاتا ہوا

یہ اُونچے اُونچے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں
اُفق پہ بکھرے ہوئے بے شمار ننھے گاؤں

یہ سرد راتوں میں چوپال پر بھڑکتی آگ
یہ ہیر رانجھا کی اُلفت کے ہلکے پھلکے راگ

یہ پتھروں پہ تھرکتا ہوا حسیں نالا
کنارے بیٹھا ہوا کھیتیوں کا رکھوالا

مقابلے پہ کبڈّی کے نوجوانوں میں
شکست و فتح کا اظہار چند گانوں میں

یہ سیدھے سادے عقیدے، یہ بھولے بھالے خیال
ہوس سے پاک جوانی ہوس سے پاک جمال

مرے ندیم! سُوئے شہر میں نہ جاؤں گا
انہیں حسین فضاؤں میں گھر بناؤں گا

احمد ندیم قاسمی بی۔اے

قانون کے ناخدا

(۱)

"او ٹانگے والے! ہردیالپور چلو گے؟"

احمد کی اُمیدوں کے کھیت یکایک لہلہا اُٹھے —— "جی ہاں! جی ہاں! ضرور جاؤں گا! آیئے، بیٹھئے!" —— یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ٹانگے کو آہستہ آہستہ دوچار قدم آگے بڑھایا، اس وقت وُہ خوشی سے بے خود ہُوا جاتا تھا۔ دو دن سے اس کی بیوی گھر پر بیمار تھی، اور آج اس کی دوا کے لئے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس وقت صبح ہی صبح سواری مِل جانے کے سبب سے وُہ بہت مسرور ہُوا۔

"لیکن کرایہ آٹھ آنے ہی دُوں گا، منظور ہے؟"

"جی ہاں! جی ہاں! آیئے! جو خوشی ہو دے دیجیئے گا"

اس کے کرایہ دار نے ابھی پائدان پر قدم رکھا ہی تھا کہ احمد کے کانوں میں ایک گرجتی ہوئی آواز پڑی۔

"ابے او ٹانگہ والے! اِدھر آنا! داروغہ جی تھانے بُلاتے ہیں!" —— بیچارے احمد کی اُمیدوں کی عمارت یکایک منہدم ہو گئی جیسے کسی شدید زلزلے نے اُس کو بُری طرح مسمار کر دیا ہو۔

"لیکن مَیں تو سواری لے کر جا رہا ہوں"۔

تھانے کے سپاہی نے کہا "سواری کا بچّہ! اِدھر آ . . . باتیں بناتا ہے، داروغہ جی کو خود ایک جگہ جانا ہے"

احمد کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اُسے دُنیا ویران نظر آنے لگی۔ اپنے کرایہ دار کو اُس نے مایُوسانہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ ٹانگے کو تھانے کی طرف لے گیا جو وہاں سے چند ہی قدم پر تھا۔

(۲)

احمد نے داروغہ جی سے پوچھا "کہاں جانا ہے ماں باپ؟"

داروغہ جی نے قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہا "جہاں جاؤں گا دیکھ ہی لے گا، ابھی سے کیوں مرا جاتا ہے . . . بدمعاش کہیں کا!"

اس کے بعد پہلے وہ خود اور پھر ان کے چار موٹے تنومند رفقاء یکے بعد دیگرے ٹانگے پر آ ڈٹے!

قانون کی رو سے احمد کو چار سے زیادہ آدمی بٹھانے کی اجازت نہ تھی لیکن اس وقت وہ کس کو منع کرتا، کس طرح منع کرتا۔ داروغہ جی

تو قانون کے ناخدا تھے۔ اُن کو کیونکر روکا جا سکتا تھا۔

"چل! نرسنگھ پور جائیں گے!"

"نرسنگھ پور!! یہاں سے پُورے چار میل، خدا کی پناہ!" احمد دل ہی دل میں کڑھتا ہُوا روانہ ہو گیا۔

راستہ میں اُسے اپنی بیمار بیوی اور بھُوکے بچوں کا اندوہناک خیال ستانے لگا۔ "اگر میں آج کچھ بھی نہ کما سکا تو میری بیوی دوا کے بغیر مر جائے گی۔ میرے بھُوکے بچے بلبلا بلبلا کر نڈھال ہو جائیں گے۔" وُہ ان تصورات میں ڈوبا ہُوا چلتا رہا، چلتا رہا، یہاں تک کہ نرسنگھ پور آ گیا۔

ایک گھر کے پاس ٹانگہ رُوک کر داروغہ جی نے کڑک کر پوچھا "شیام سُندر بابو کہاں ہیں؟"

ایک ملازم نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا "لوہانی پور گئے ہیں سرکار!"

"آئیں گے کس وقت؟"

"شام تک"

"اُف! اب تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا!" اس کے بعد داروغہ جی نے سرگوشیوں میں اپنے ساتھیوں سے کچھ باتیں کیں اور پھر بولے "اچھا میں وہیں جا کر اس وقت اُن سے مِل لیتا ہوں"۔

اُنہوں نے احمد سے کہا "لوہانی پور چلو!" اس انداز سے، جیسے وُہ اُن کا زر خرید غلام تھا۔

"لوہانی پور!! یہاں سے شمال کی جانب پھر پُورے نو میل! معاذ اللہ!"— لیکن احمد کی مجال تھی کہ وہ زبان سے ایک لفظ بھی کہتا۔ اگر وہ ذرا زبان ہلاتا تو اُسے ٹانگے کے لائسنس سے بلاشبہ دست بردار ہو جانا پڑتا۔

پُورے ڈیڑھ گھنٹے میں وہ دس بجے لوہانی پور پہنچے۔

شیام سندر بابُو گھر میں سامنے ہی بیٹھے تھے۔

داروغہ جی احمد کو یہ ہدایت دیتے ہوئے کہ "یہیں ٹھہرو ہم آتے ہیں" گھر میں داخل ہو گئے۔

احمد اُسی جگہ ایک پیپل کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ ایک گھنٹے بعد اُسے نیند آ گئی۔

"ابے اُٹھ! بارہ بج گئے اور پڑا ہوا ہے، کاہل کہیں کا!" احمد آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھ بیٹھا، سامنے داروغہ جی کھڑے دانت پیس رہے تھے۔ خدا خدا کر کے واپس تھانے پہنچے۔ اُترنے سے قبل داروغہ جی نے اپنے رفقا میں سے ایک سے پوچھا جو تھانہ کا جمعدار تھا۔

"گھوڑا تو اس کا اچھا ہے، اسی پر کیوں نہیں کل کلیان پور چلتے؟"

جمعدار صاحب نے جب ہاں میں ہاں ملائی تو داروغہ جی بولے:۔ "کل اسی وقت ٹانگہ لے آنا۔ ایک جگہ جانا ہے، خیال رکھنا۔ ایک

منٹ کی دیر بھی نہ ہونے پائے ورنہ جانتا ہے۔ . . . . !"

داروغہ جی نے اپنی گول گول غضبناک آنکھوں سے خستہ حال احمد کو گھورا اور تھانے میں داخل ہو گئے۔

(۳)

گھر سے نکلے ہوئے چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ لیکن احمد کی جیب میں داروغہ جی کی عنایت سے پھوٹی کوڑی بھی موجود نہ تھی۔ اُس نے سوچا کہ گھر جا کر ایک بار اپنی بیمار بیوی کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے لیکن پھر خیال کیا کہ بغیر دو چار آنے کمائے وہاں جانے سے کیا حاصل! پیسے ہوں گے تو اُس کے لئے دوا بھی خرید سکوں گا، بال بچوں کے لئے کھانے کی چیزیں بھی مہیا کر سکوں گا لیکن یوں میں اُن کے کس کام آ سکتا ہوں۔ یہی سوچ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ ایک آدھ گھنٹہ اَور قسمت آزمائی کر کے گھر جاؤں گا۔

جہاں ٹانگوں کے ٹھہرنے کی جگہ بنی ہوئی تھی، وہاں پندرہ بیس ٹانگے والے پہلے سے جمع تھے۔ احمد نے بھی اپنا ٹانگہ وہیں لا کر کھڑا کر دیا اور قسمت کے فیصلہ کا انتظار کرنے لگا۔

"بڑا بازار چلئے! دو آنے فی آدمی! . . . . . دو آنے . . . . . دو آنے!"

سیکنڈ منٹ بنے اور منٹ گھنٹے لیکن احمد کو ایک سوار بھی نہ ملا۔ بیسیوں آئے، بیسیوں گئے، کتنے ان میں سے بڑے بازار جانے والے بھی تھے لیکن احمد کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، اس کو ایک آدمی بھی نہ مل سکا، انتہائی مایوسی و افسردگی کے ساتھ احمد نے اپنے گھر کی راہ لی۔

(۴)

"ایک گھونٹ پانی!" یہ الفاظ احمد کی بیوی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہے۔ وُہ اس وقت بخار سے تپتی جا رہی تھی۔

ایک طرف ایک مَیلی پُرانی صُراحی پڑی تھی جس کا اُوپر کا حصّہ کبھی کا ٹوٹ چُکا تھا۔ احمد چٹائی پر سے اُٹھا اور ایک مٹی کے پیالے میں پانی انڈیل کر بیوی کو پلایا۔

"اُف! . . . . درد . . . . سے . . . . سر . . . . پھٹا . . . جاتا . . . ہے!"۔۔۔ احمد نے یہ شکستہ الفاظ سُنے، اُس نے اپنی رفیقہ کا زرد چہرہ اور دھنسی ہوئی آنکھیں دیکھیں جن کے گرد نقاہت سے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اَور اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

وُہ مجبور تھا! ایک مفلس قلاش! جس کے پاس کھانے تک کو ایک پائی نہ ہو وہ دوا کہاں سے خرید سکتا ہے۔ اتنے میں اُس کے دونوں بچے باہر سے آ گئے۔ ایک گیارہ سال کا تھا اور دوسرا پانچ سال کا!

بڑے نے کہا "بابا دکاندار چیزیں اُدھار نہیں دیتا۔ کہتا ہے، تیرا باپ وعدہ خلاف ہے، پہلے کل کے پیسے مانگ۔ لا تو پھر تجھے آٹا چاول اُدھار دُوں گا۔"

چھوٹے نے کہا "کل تہوار ہے باوا، میرے لئے پٹاخے نہیں لائے، محلّہ کے سبھی لڑکے پٹاخے چلا رہے ہیں"۔
احمد نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "ہمارے لئے تہوار نہیں بیٹا! تہوار اُن کے لئے ہے جن کے پاس پیسے ہوں"۔

(۵)

احمد خود دُکاندار کے پاس گیا لیکن اُس نے اُدھار دینے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ اب اُس کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اُمیدِ موہوم کے سہارے، پھر ایک بار قسمت آزمائی کے لئے چل پڑے۔ چنانچہ غروبِ آفتاب سے کچھ قبل ہی وہ تانگہ لے کر بازار پہنچ گیا اور اِرد گرد کا چکر لگانے لگا۔ اُس کی نظروں کے سامنے دُوسرے ٹانگہ والوں کو سواری مِل ہی تھی لیکن اس کی اپنی قسمت پر جیسے نحوست کی مُہر ثبت ہو چکی تھی، دو گھنٹے کی مسلسل جد وجہد کے باوجود بھی ایک شخص تک اس کے پاس نہیں پھٹکا۔
آخر مایوسی کے ساتھ دن کی طرح وہ پھر گھر کی جانب روانہ ہُوا۔ راستہ میں ایک سڑک ذرا سنسان ملتی تھی۔ ابھی احمد اُس سڑک کی طرف مُڑا بھی نہیں تھا کہ اُس کے کانوں میں آواز آئی۔
"او ٹانگہ والے! دھرم سالہ چلو گے؟"
احمد نے دُور ہی سے ٹانگہ روک کر کہا "آیئے! آیئے!!"
جب وہ قریب پہنچ گئے تو اُس نے روشنی میں دیکھا کہ وہ تعداد میں پانچ ہیں، چار جوان مرد اور ایک کمسن بچّہ!
"لیکن چار سے زیادہ کی تو اجازت نہیں سرکار!"
"اجازت! ارے رات کے وقت تم کو کون دیکھتا ہے، چلو، چلو، آٹھ آنے دوں گا"۔
"آٹھ آنے!" ـــ احمد کی آنکھیں مسرّت سے چمکنے لگیں۔
"صبح سے تو ایک پائی بھی نہیں کمائی . . . . اس وقت اپنے ہاتھ سے آئی ہوئی سواری نکل جانے دوں تو پھر بھُوکے بچے کہاں سے کھائیں گے . . . . اس کے علاوہ رات کے وقت آخر دیکھتا ہی کون ہے اور خدانخواستہ ایسا ہُوا بھی تو کیا ہرج ہے، یہ تو ایک نرا بچّہ ہے!" ـــ یہ سوچ کر احمد کو کچھ اطمینان سا ہو گیا اور وُہ اُن کو بٹھا کر دھرم سالہ کی طرف چل پڑا۔
اس وقت اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ سڑک پر ٹانگہ چلا آرہا تھا لیکن اُس کے دل میں چاندی کے اُس چمکتے ہوئے ٹکڑے کا تصوّر تھا، جس سے وہ عنقریب اپنی بیمار بیوی کے لئے دوا، اپنے بچوں کے لئے پٹاخے اور گھر بھر کے لئے کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے والا تھا۔

انہیں خیالات میں مستغرق وُہ چلا جا رہا تھا، چلا جا رہا تھا اور دُنیا اُس وقت اُسے ایک میٹھا خواب معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن دفعتہً ایک بجلی کے کھمبے کے پاس سے اُس کے کانوں میں ایک کرخت آواز آئی، جس نے اُس کے خوابوں کا قصرِ رنگیں متزلزل کر دیا۔

"ٹانگہ روک کہاں بھاگا جاتا ہے' ظالم' کہیں کا!"

اب جو احمد نے نظر اُوپر اُٹھائی تو دیکھا وہی دارو غہ جی جن کے لئے اُس نے دن کے چھ قیمتی گھنٹے ضائع کئے تھے، کھمبے سے لگے کھڑے تھے۔

"پانچ آدمی بٹھالیا! . . . . بیرحم کہیں کا، جیسے جانتا ہی نہیں کہ اس گھوڑے میں بھی جان ہے۔"

احمد کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا "اگر میں اس سواری کو قبول نہ کرتا تو کتنی جانیں جاتیں"۔۔۔ لیکن داروغہ جی سے کچھ کہنے کی اُسے ہمّت نہ ہوئی۔

دن کے وقت جب مسلسل چھ گھنٹوں تک ڈھائی ڈھائی مَن کے پانچ چوبے بیٹھے رہے تو گھوڑے کے لئے ہمدردی نہ ہوئی لیکن اس وقت ایک بچّے کے زاید ہو جانے سے گھوڑے کی زندگی مَوت کے بھنور میں آپھنسی تھی۔

"ٹانگے کا نمبر کتنا ہے؟"

"دو . . . سو . . . . تیرہ"

داروغہ جی نے نمبر کو اپنی نوٹ بُک میں لکھ کر کہا۔۔۔۔ "اس بیرحمی کے لئے تجھے دس روپے جرمانہ کیا گیا۔"

(۶)

احمد نے فرطِ غم سے اپنی گردن جھکالی۔۔۔۔ اور دُنیا اُسے پہلے سے بھی زیادہ تاریک نظر آنے لگی۔

جمیل احمد کندھاپوری
بی۔اے

اپنے خیمے دُور لیکن اپنے دل نزدیک رکھو

(عربی ضرب المثل)

اپنے لبوں کی یوں پاسبانی کرو گویا وہ محل کے دروازے ہیں اور بادشاہ اندر ہے

(ایڈون آرنلڈ)

چینی شاعری کا ایک ورق

دوست کی جُدائی میں

وینگ شیانگ ۲۰۰ قبل مسیح کا ایک چینی شاعر ہے۔ شی کنگ، وینگ شیانگ کا دوست تھا اور ان کی دوستی اتنی مشہور تھی کہ لوگ انہیں "دوستارے" کہا کرتے تھے۔ کسی بات پر دونوں دوستوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور شی کنگ اپنے دوست کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ شاعر نے اُس کی جُدائی میں بےشمار پاکیزہ نظمیں کہیں۔ تحقیقات کے باوجود اس امر کا پتہ نہیں مل سکا کہ شی کنگ پر ان نالہ ہائے فراق کا کیا اثر ہوا اور وہ واپس آیا یا نہیں؛ ذیل میں ہم چند نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں :-

(۱)

میری آنکھیں تمہیں ڈھونڈتی ہیں
لیکن نہیں پاتیں
میرے کان تمہارے شیریں نغمے
سننے کو ترستے ہیں
لیکن نہیں سُن سکتے
میری زبان تم سے
کچھ کہنا چاہتی ہے
لیکن الفاظ جنبشِ لب سے پہلے
مر جاتے ہیں
کیونکہ انہیں سننے والا موجود نہیں!
لیکن
شی کنگ!
میرا دل نہیں مانتا
کہ تم نے
واقعی مجھے چھوڑ دیا ہے!

(۲)

شی کنگ!
کیا سُورج اپنی روشنی کھو چکا ہے؟
اگر ایسا نہیں
تو پھر تم مجھے
نظر کیوں نہیں آتے؟

(۳)

زندگی کا رستہ
بہت کٹھن ہے
میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں

دوست!
تم بھی مجھے چھوڑ گئے
اب میں منزل پر کیسے پہنچوں گا؟

(۴)

شی کنگ!
آسمان ہنستا ہے
کیونکہ میں
تمہاری جدائی میں
رو رہا ہوں

(۵)

لوگ کہتے ہیں
کہ تم اب واپس نہیں آؤ گے
لیکن میں اگر تمہارا انتظار نہ کروں
تو اپنی نگاہوں میں
مجرم سمجھا جاؤں گا

(۶)

یہ پہاڑ
کتنے دشوار گزار ہیں!
اور تم بھی
مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے

(۷)

شی کنگ!
مجھے یقین تھا کہ سورج سرد ہو سکتا ہے
لیکن تمہاری پاک محبت
اپنی گرمی نہیں کھو سکتی
مگر تم نے مجھے ٹھکرا کر
یہ ثابت کر دیا
کہ محبت کی کامرانی کے سوا
اس ناپاک دنیا میں
سب کچھ ہو سکتا ہے!

(۸)

میں دنیا کی ہر مصیبت
برداشت کر سکتا ہوں
بلکہ میں تو آفتوں کا
انتظار کرتا رہتا ہوں
کیونکہ مصیبتیں میری روح کی غذا ہیں
لیکن
شی کنگ!
مجھ سے تمہاری بے اعتنائی
برداشت نہیں ہو سکتی

(۹)

ابھی
ایک امید باقی ہے
اور
وہ تمہاری واپسی کی!

حمید نظامی

ہندو اور اُردو زبان

"ہندو لیڈر قوم پرستی کی آڑ میں ملک سے غداری نہ کریں"

(ملک دوارکا ناتھ)

جناب مدیر صاحب رسالہ "ہمایوں" لاہور

تسلیم۔ گذشتہ اتوار بتاریخ ۸ اردسمبر میری بھی صلاح تھی کہ میں یوم اُردو میں مندرجہ بالا مضمون کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن بہت سی مصروفیات کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا اس لئے چند سطور یہاں لکھنا چاہتا ہوں۔ "دوارکا ناتھ"

یہ بات آج کل بہت سنی جاتی ہے کہ اُردو مسلمانوں کی مذہبی اور قومی زبان ہے۔ ہندوؤں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات نہ صرف اَن پڑھ طبقہ کہتا ہے بلکہ بڑے بڑے لیڈر جن پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے متفق ہیں۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ کسی زبان کا کسی قوم کے ساتھ تعلق ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کے افراد کی اکثریت کا اندازہ لگایا جائے کہ آیا وُہ اس زبان کو مندرجہ ذیل امُور میں استعمال کرتی ہے یا نہیں۔

(۱) بول چال (۲) تحریرات (۳) مذہبی ضروریات (۴) پریس (۵) ذریعہ تعلیم

جہاں تک بول چال کا تعلق ہے ہندوؤں کا کافی حصّہ اسے استعمال کرتا ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ زبان زیادہ تر مشرقی پنجاب، دہلی، صوبجاتِ متحدہ، بہار، صوبجات متوسّط، مغربی بنگال اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ وُہ علاقے ہیں جہاں ہندوؤں کی زبردست اکثریت ہے اور مسلمان بڑی تھوڑی اقلیت میں ہیں۔ اگر یہ زبان مسلمانوں کی ہوتی تو اس کا بول چال کے معاملے میں وہی حال ہوتا جو عربی کا ہے۔

جہاں تک تحریر کا تعلق ہے اس میں بھی ہندو اصحاب کی تعداد ماضی و حال میں مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس وقت بھی سر سپرو، علامہ برج موہن کیفی، اسد رشن جیسے اصحاب اور بہت سے ہندو شعراء اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ ہندوؤں کی اکثر و بیشتر کتابیں اسی زبان میں ہیں۔ منشی پریم چند پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اس زبان میں مختصر افسانہ نویسی کی بنیاد ڈالی۔

جہاں تک مذہبی کاموں کا تعلق ہے ہندوؤں کے تمام کام اسی زبان کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ مسلمان اصحاب تو اپنی نماز عبادت عربی میں کرتے ہیں لیکن لکھو کھا ہندو روزانہ گیتا، رامائن بھاگوت کا پاٹھ اسی زبان کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی تمام مذہبی

کتابوں کا ترجمہ اس زبان میں ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کی اس سے آدھی کتابوں کا ترجمہ بھی نہیں ہوا۔ ہندوؤں کے تمام جلسوں میں چاہے وہ آریہ سماج کے ہوں یا ساتن دھرم کے اسی زبان کے ذریعے سے تقریریں اور نظمیں ہوتی ہیں۔ ایشور کی پرارتھنا وغیرہ بھی اُردو میں ہوتی ہے۔

پریس کے بارے میں اتنا لکھنا کافی ہے کہ ہندوؤں کا چیدہ چیدہ پریس اُردو میں ہے۔ پرتاپ، ملاپ، ویر بھارت اور دیگر ہندو اخبارات کی اشاعت مسلمان اخباروں سے کئی گُنا زیادہ ہے۔ ہزاروں قسم کے رسالے چاہے وہ سیاسی ہوں یا مذہبی، اقتصادی ہوں یا معاشری ہمارے اسی زبان میں نکلتے ہیں۔ جہاں تک ذریعۂ تعلیم کا تعلق ہے پنجاب کے تمام، دہلی اور یو پی کے اکثر ہندو سکولوں کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ حیدر آباد میں ہندوؤں کی آبادی ۹۰ فیصدی ہے۔ وہاں بھی یہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندو اس کے دشمن کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگر مسلمان دُشمن ہوں تو خیر سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو ہندوستان کو چھوڑ کر عرب اور ایران کے خواب دیکھتا ہے ممکن ہے کہ کل تک عربی کا مطالبہ کرے۔ لیکن شکر ہے خُدا کا کہ کوئی فرقہ پرست سے فرقہ پرست مسلمان بھی یہ مطالبہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا مصر، فلسطین، سوڈان اور دیگر ممالک کے مسلمان بڑے ترقی یافتہ تصور کئے جاتے ہیں مگر ان سب کی زبان عربی ہے۔ ہندوستانی مسلمان اس بات میں سب سے افضل ہیں کہ باوجود تعداد میں آٹھ کروڑ ہونے کے ان کو عربی، فارسی سے ذرا دلچسپی نہیں۔ ان کا ان زبانوں میں کوئی پریس نہیں۔ حالانکہ دُنیا کے تمام مسلمانوں نے جن کو ہم بڑا قوم پرست سمجھتے ہیں عربی کو اپنی زبان بنا رکھا ہے۔

مسلمانوں کا اُردو سے ویسے بھی کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ جہاں جہاں ان کی آبادی ہے وہاں تو اُردو بہت کم ہے۔ مسلمانوں کی زیادہ آبادی صُوبہ سرحد، مغربی و وسطی پنجاب، سندھ، مشرقی بنگال میں ہے۔ سرحد کی زبان پشتو ہے۔ پنجاب کی پنجابی، سندھ کی سندھی، بنگال کی بنگالی ہے۔ مسلمانوں کا بہت کم طبقہ اس زبان کو استعمال کرتا ہے۔ اس لئے اُن لیڈروں سے جو قوم پرستی کی آڑ میں اس کی مخالفت کرتے ہیں عرض ہے کہ اس زبان پر رحم کھائیں۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ غداری کے مرتکب نہ ہوں۔ اُردو کی بنیاد ہندو مُسلم اتحاد پر رکھی گئی ہے۔ اس اتحاد کی دیوار کو ڈھانے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو کچھ بھی ہندو مسلمانوں میں میل ملاپ ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔ اور ہمارے دیش میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

ملک دوارکا ناتھ

لاہور

غزل

نہایت مختصر۔ انجامِ شاخِ آشیاں ہوگا
چمن پر ایک ہلکی سی چمک ہوگی، دھواں ہوگا

چمن ہے چاندنی راتیں ہیں، میں ہوں اور تنہائی
وہ ایسے میں چلے آئیں۔ مگر۔ ایسا کہاں ہوگا

زمیں اُسکی، زماں اُسکا، مکیں اُسکے، مکاں اُسکا
کہیں سجدے کرے کوئی اُسی کا آستاں ہوگا

ترے کوچے میں آکر ہم تو آپے میں نہیں رہتے
پہنچ جائے جو تیری خلوتوں میں وہ کہاں ہوگا

لبِ بام آپ، ہیں کوچے میں۔ گھبرائی ہوئی باتیں
ہمیں اس حال میں جو دیکھ لے گا۔ بدگماں ہوگا

وہ رخصت ہو چکا، ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر گھر میں
اِدھر ہوگا، اُدھر ہوگا، یہاں ہوگا، وہاں ہوگا

محبت اُس بُتِ بیداد فن کی کام آئے گی
جسے تم راہزن سمجھے ہو، میرِ کارواں ہوگا

کھُلا دیتی ہے فکرِ شعر ترا اے شاد شاعر کو
بڑھے گی شعر کی طاقت یہ جتنا ناتواں ہوگا

شاد عارفی

کٹھور

دھرتی پر پربت کے دھبتے، دھرتی پر دریا کے جال،
گہری جھیلیں، چھوٹے ٹیلے، ندی نالے، باؤلی تال،
کالے، ڈرانے والے جنگل، صاف، چمکتے سے میدان،
لیکن من کا بالک اُلٹا، ہٹ کرتا جائے ہر آن،
(انوکھا لاڈلا۔ کھیلن کو مانگے چندرمان!)

سندر سانولی، دُبلی پتلی گودی لیں، کاندھے سے لگائیں
میٹھی رسیلی، ہلکی ہلکی صدا میں لوری ۔ گیت سُنائیں
لیکن روئے، روئے مچلے، مچل مچل کر ہو ہلکان
میرے من کا بالک اُلٹا، ہٹ کرتا جائے ہر آن
(انوکھا لاڈلا۔ کھیلن کو مانگے چندرمان!)

چُن چُن کلیاں، صاف اور اُجلی، نرم چمکتی سیج بچھائیں
گلے لگائیں، چُومیں چاٹیں، سونا زوں سے ساتھ سُلائیں
سوئے نہ سونے دے اوروں کو، جاگے، جگائے رکھے ہر آن
میرے من کا بالک اُلٹا ہٹ کرتا جائے نادان
(انوکھا لاڈلا۔ کھیلن کو مانگے چندرمان!)

میراجی

راز و نیاز

ترے گیسوؤں کو پریشان کر کے
تجھے رشکِ سُنبل بنایا ہے مَیں نے

ترے رُخ پہ چھڑکا ہے خونِ تمنّا
ترے رُخ کا غازہ بنایا ہے مَیں نے

تڑپتی ہوئی بجلیوں کی چمک میں
تجھے مُسکرانا سکھایا ہے مَیں نے

جبیں پر تری سُرخ ٹیکا لگا کر
ستاروں کو نیچا دکھایا ہے مَیں نے

سُنا کر تجھے سامری کے فسانے
ان آنکھوں کو جادُو سکھایا ہے مَیں نے

اگر میں بنا ہوں محبت کا دریا
تجھے ماہِ تاباں بنایا ہے مَیں نے

تری سادگی سے پریشان ہو کر
تجھے شوخ و رنگیں بنایا ہے مَیں نے

وہ ساون، وہ جھولا، وہ بے باک پینگیں
تجھے کیسا کیسا ڈرایا ہے مَیں نے

جھلکنے لگے تیری آنکھوں میں موتی
یہاں تک تجھے گُدگُدایا ہے مَیں نے

ترے شوخ ہونٹوں کی موجوں سے اکثر
محبت کا طوفاں اُٹھایا ہے مَیں نے

تری جھُوٹی خفگی کا تھا علم مجھ کو
مگر تجھ کو سچ مُچ منایا ہے مَیں نے

تجھے بے وفائی کا الزام دے کر
وفاؤں کو اپنی جتایا ہے مَیں نے

ترے حُسن پر نکتہ چینی بھی کی ہے
تجھے بے سبب بھی کُڑھایا ہے مَیں نے

ستا کر، جلا کر، رُلا کر، ہنسا کر
تجھے مدّتوں آزمایا ہے مَیں نے

معین احسن جذبی

سیلِ نشاط

پھر ہاتھ میں ہے زلفِ سیہ فام اِن دِنوں
پھر آ رہے ہیں راہ پہ ایام اِن دِنوں

پھر انجمن میں ہے لبِ زہرہ ترانہ سنج
پھر زمزمہ طراز ہے بہرام اِن دِنوں

پھر گوش و ہوش غرقِ سرود و نشاط ہیں
پھر رُوبرو ہیں چنگ و مے و جام اِن دِنوں

پھر ہر سخن نویدِ مسرّت ہے سر بسر
پھر ہر نظر ہے لُطف کا پیغام اِن دِنوں

پھر مہربان حسنِ تغافل شعار ہے
پھر کامراں ہے عاشقِ ناکام اِن دِنوں

پھر لُوٹتا ہوں گیسو و رُخسار کی بہار
پھر دلفریب ہیں سحر و شام اِن دِنوں

پھر ہے بغل میں جلوہ نما وہ سکونِ جاں
پھر گمشدہ ہیں کلفت و آلام اِن دِنوں

پھر اُس کے جلوہ سے در و دیوار مست ہیں
پھر جنّتِ نگہ ہے لبِ بام اِن دِنوں

پھر سُن رہا ہوں غیب کے پیغام اے نظیرؔ
پھر کھل گیا دریچۂ الہام اِن دِنوں

اصغر حسین خاں نظیرؔ لودھیانوی

محفلِ ادب

ملکۂ وکٹوریا کی داستانِ عشق

(ملکۂ وکٹوریا اور جنرل یوروف کی پرائیویٹ ڈائری کے اوراق)

بادشاہ بھی عام انسانوں کی طرح دل رکھتے ہیں لیکن سیاسی مصلحتیں ان کے عشق کو کس طرح پامال کر دیتی ہیں اس کا اندازہ ملکۂ وکٹوریا اور ولیعہد رُوس کی مندرجہ ذیل داستانِ محبت سے ہو سکتا ہے

۱۸۳۹ء کے موسمِ بہار میں ولی عہدِ روس، الگزینڈر (جو بعد میں الیگزینڈر دوم کے نام سے زار بنا) لندن میں وارد ہُوا اور ملکۂ وکٹوریا کا مہمان ہُوا۔ ملکہ کی عمر اس وقت بیس سال کی تھی۔ ملکہ نہایت حسین تھی۔ ولی عہدِ روس اکیس برس کا تھا اور مردانہ حُسن کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، نہایت خوش مزاج تھا۔ رُوسی زبان کے علاوہ فرانسیسی، انگریزی، جرمن زبانیں بھی بڑی مہارت سے بولتا تھا۔ شرمیلا تھا اور اعلےٰ تربیت یافتہ۔

مہمان اور میزبان دونوں نوجوان تھے اور غیر شادی شدہ، دونوں عصمت و عفت کے جوہروں سے آراستہ تھے اور معصوم دل رکھتے تھے۔ پہلی ہی نظر میں دونوں کو محسوس ہُوا کہ ایک دوسرے کی طرف کھنچے جا رہے ہیں مگر سمجھ نہ سکے کہ اس کشش کا سبب کیا ہے۔

ملکہ نے پہلی ملاقات کے بعد ہی یہ سطریں اپنی ڈائری میں لکھی ہیں جن سے اُس کی معصومیت اور دِلی جذبات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"سنیچر ۴ مئی ۱۸۳۹ء ـــ آج ساڑھے بارہ بجے دوپہر کو میں اپنے دفتر گئی تاکہ ولی عہدِ روس کا خیر مقدم کروں جس کا لارڈ پال مرسٹن نے مجھ سے تعارف کرایا۔ ولی عہد کے ساتھ کونٹ اورلوف اور کونٹ یوزوروی بورگو تھے۔

"میں نے شہزادے کو اپنے قریب بٹھایا، یہ مجھے بلند قد سرو قامت معلوم ہُوا۔ حسین چہرہ ہے، خوبصورت پیشانی ہے۔ اگرچہ مجموعی طور پر کامل حُسن کا مالک کہا نہیں جا سکتا۔ اُس کی آنکھیں نیلی اور بڑی ہیں، ناک پتلی ہے، مُنہ نظر فریب ہے جس پر جادو بھری مسکراہٹ نمودار تھی۔

"پھر میں شاہزادہ کو بڑے ایوان میں لے گئی جہاں اُس نے اپنے مصاحبوں سے میرا تعارف کرایا۔ پھر میرے بازو میں ہاتھ دے کر مجھے میری جگہ پر لے آیا۔ میں بیچ میں بیٹھی، ایک طرف شاہزادہ تھا دوسری طرف پرنس ہنری۔ . . .

"میں نے شاہزادہ کو بہت لطیف اور شرمیلا پایا۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک وہ یہاں رہے گا مجھے بڑی خوشی نصیب ہوگی۔ گمان غالب ہے کہ نیکی سادگی خوش مزاجی شاہزادے کے فطری اوصاف ہیں۔ وہ مجھ سے صرف ایک ہی برس عمر میں بڑا ہے۔

"واقعی شہزادہ بہت لطیف ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی طرف بے اختیار کھنچی جاتی ہوں۔ وہ بہت خوش اخلاق اور سادہ مزاج ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں زبردست کشش ہے۔"

اس ملاقات کے دو دن بعد حسنِ اتفاق سے یا خفیہ تدبیروں کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا کہ ملکہ اپنے گھوڑے پر سوار تفریح کر رہی تھی۔ راستے میں شہزادہ مل گیا۔ وہ بھی گھوڑے پر سوار تھا دونوں بہت دُور تک گھوڑے دوڑاتے چلے گئے پھر نہایت ہی مسرور لوٹے۔

اس واقعہ کا ذکر جنرل سرگ یورف سچ نے اپنی ڈائری میں اس طرح کیا ہے :۔

"منگل ، مئی ـــــ ولی عہد نے آج مجھ سے اُس سیر کا ذکر کیا جو اُس نے ملکہ وکٹوریا کے ساتھ کی تھی۔ گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اسی تمنا میں رہتا ہے کہ ملکہ سے بار بار ملتا رہے۔ میں نے آج زار کو مفصل رپورٹ لکھ بھیجی ہے۔ رپورٹ میں ولی عہد کی خیریت کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں لوگ کہہ رہے ہیں کہ لارڈ ملبورن کی وزارت جلد ہی مستعفی ہونے والی ہے"

دو دن کے بعد جنرل کی پریشانی بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے شاگرد ولی عہد کو ملکہ کی طرف زیادہ مائل دیکھتا ہے، مگر اس پاک جذبہ کو بھی سیاسی عینک سے دیکھتا ہے چنانچہ لکھتا ہے :۔

" ۹ مئی ـــــ کل شام ہم شاہی محل میں جلسہ رقص میں شریک ہونے کے لئے مدعو ہیں، ولی عہد ہر وقت مجھ سے ملکہ اور اس کے حسن ہی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ کبھی اس تذکرے سے اُکتاتا نہیں، شاید ملکہ کے حسن اور اچھے برتاوے نے شاہزادہ کا دل بالکل ہی موہ لیا ہے لیکن اس میں تعجب کی بھی بات کیا ہے؛ ملکہ واقعی نہایت حسین ہے ہمیں ان دونوں کی گہری دوستی سے فائدہ اُٹھا کر انگلستان اور روس کے تعلقات کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا چاہئے۔ میری رائے میں موجودہ موقع سے بہتر کوئی اور موقع کبھی اس مقصد کے لئے پیش نہیں آئے گا۔ کیا عجب ہے نوجوان شاہزادہ کا حسنِ معاشرت وُہ اچھے نتائج پیدا کر دے جو اس کے والد زار کی حکمتِ عملی سے پیدا نہیں ہو سکے!"

رقص کا جلسہ ہوا، اور ملکہ نے ولی عہد روس کے ساتھ رقص کیا۔ اس جلسے میں دونوں زیادہ بے تکلف ہو گئے۔ جنرل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

"۱۱ مئی ۱۸۳۹ء ـــــ کل کا جلسہ بہت شاندار اور بہت ہی پُرلطف تھا۔ ولی عہد کا رقص زیادہ تر ملکہ ہی کے ساتھ رہا۔ جب وہ ملکہ سے ملتا ہے تو بے حد خوش ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ملکہ کو بھی ولی عہد سے مل کر نہایت مسرت ہوتی ہے۔ بلکہ خود ملکہ کے چہرے سے انتہائی انبساط ٹپکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ دونوں نمونے کے زن و شوہر بن سکتے ہیں۔ چار بجے صبح ہم جلسے سے واپس ہوئے۔ راستے میں ہماری گاڑی کے گھوڑے بدک گئے مگر ولی عہد کو ذرا خبر نہ ہوئی کیونکہ وہ اپنے خیالات میں غرق تھا!"

ملکۂ وکٹوریا اپنے روزنامچہ میں لکھتی ہیں :۔

"۱۰ مئی ۱۸۳۹ء ـــــ دس بجے رات کو میں بڑے ایوان میں داخل ہوئی جہاں درباری صف بستہ تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ میں آ کر جلسے کا افتتاح کروں۔ ولی عہد فوراً میرے پاس چلا آیا۔

"میں نے ولی عہد کے ساتھ رقص شروع کر کے جلسے کا افتتاح کیا ایک بجے رات کو ہم نے کھانا کھایا اور پھر ناچ میں مشغول ہو گئے۔ میں ولی عہد کے ساتھ کھڑکی پر گئی جہاں سے اسکاٹ لینڈ کی دو ناچنے والیوں کے رقص کا نظارہ کیا۔ ولی عہد بھی اس رقص سے بہت محظوظ ہوا۔ ساڑھے چار بجے

میں اپنی خوابگاہ میں نہایت ہی مسرور واپس آئی۔"

ولی عہد اگرچہ کم عمر تھا مگر سلطنت کا وارث تھا۔ اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ جذبات کے دھارے میں اس طرح بہنے کا نتیجہ کیا ہو گا کئی روز اُس نے اپنی عقل کو دل پر فتح دلانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اور مجبور ہو کر اپنے اتالیق جنرل سے سب کچھ کہہ دیا۔

جنرل لکھتا ہے:۔

"اتوار ۱۲ مئی —— ابھی ابھی میں ولی عہد کے پاس سے آیا ہوں معلوم ہوتا ہے میری عقل، دماغ سے اُڑ جاتی ہے۔ ولیعہد کا مُنہ فق تھا حواس بگڑے ہوئے تھے۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اسی حال میں اُس نے مجھے بتایا کہ ملکہ سے محبت کرتا ہے اور ملکہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔

"اُف ہولناک! خوفناک جذباتی طوفان کا مجھے سامنا کرنا ہے، میں کس قدر پریشان ہوں مجھے اس پورے معاملہ پر بے حد حیرت ہے کیونکہ دونوں کی ملاقات پر ابھی آٹھ دن بھی نہیں گزرے۔

"مَیں نے ولی عہد پر اپنے دلی خطرے ظاہر نہیں کئے بلکہ غور کرنے کے لئے مناسب مہلت طلب کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میں نے بہت اچھا کیا کیونکہ اپنے اصلی خیالات اگر فوراً پیش کر دیتا تو ولی عہد کی نہ جانے کیا حالت ہوتی۔"

دوسرے دن ولی عہد کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ جنرل لکھتا ہے:۔

"پیر ۱۳ مئی —— ولی عہد نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ شام کے اوقات اس کے ساتھ گزارا کروں، وہ بہت دیر تک تیوری چڑھائے چُپ سنائے میں بیٹھا رہا۔ پھر دفعتہً کھڑا ہو گیا اور کمرے میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اس طرح ٹہلنے لگا جیسے متوالا ہے۔ پھر آ کر میرے قریب بیٹھ گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے تیز لہجہ میں کہنے لگا، جیسا میں نے اُس سے کبھی سُنا نہیں تھا۔

"جنرل، مجھے ملکہ دکٹوریا سے محبت ہو گئی ہے۔ میں یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ ملکہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں تم سے اعتراف کرتا ہوں کہ عمر میں پہلی مرتبہ مجھے وہ عورت نظر آئی ہے جس کی طرف میرا دل بے اختیار کھنچ گیا ہے مجھے ایسی محبت ہو گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، ملکہ کے بغیر مَیں کیونکر زندہ رہ سکوں گا! ہاں میں ملکہ پر فریفتہ ہو گیا ہوں اور نا ممکن ہے کہ زندگی بھر کسی اور عورت سے محبت کر سکوں!"

"ولی عہد اسی طرح دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس کی گفتگو سے میرے دل کو سخت چوٹ لگی، بہت ترس آیا، لیکن میں نے دل کڑا کر کے اُسے بتایا کہ ملکہ سے جو ربط پیدا ہوا ہے اُس کا نتیجہ شادی کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا۔ مگر شادی کی صورت صرف یہی ہے کہ ولی عہد اپنے وطنی فرض فدے ار کرے اور روس کے تاج و تخت سے دست بردار ہو جائے مگر یہ ایسی بات ہے جسے نہ ولی عہد کا ضمیر گوارا کر سکتا ہے نہ کوئی ذی عقل اُسے اس بات کا مشورہ دے سکتا ہے!

"ولی عہد میری بات سُن کر قائل تو ہوا، مگر اس قدر افسردہ رہا کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ مجھ سے ایسی حالت سے جُدا ہوا کہ میری

آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں سخت حیرت میں ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، زار کو خبر دوں یا مزید حالات کا انتظار کروں، بڑے پس وپیش میں ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ زار کو جب اپنے ولی عہد کا یہ قصّہ معلوم ہوگا تو کس قدر برہم ہوگا!"

دو دن کے بعد ولی عہد کی حالت ایسی ہوگئی کہ جنرل کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہوگیا۔ اُس نے لکھا ہے:-

"بدھ ۱۵ مئی — ولی عہد کی کیفیت مجھے نہایت پریشان کر رہی ہے خود اُس نے مجھ سے کہا کہ موجودہ پوزیشن کا برداشت کرنا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ عشق جنون کی صُورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ مَیں اس نوجوان شہزادے کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتا ہوں، یہی سبب ہے کہ اس کی تکلیف دیکھ کر میرا دِل پھٹتا ہے غم اُسے کھائے جاتا ہے، اور مجھ سے یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ لندن کو جلد از جلد خیر باد کہہ دی جائے مَیں اسی بات کی کوشش کروں گا۔"

"جمعرات ۱۶ مئی — ۳۰ ماہِ حال کو یہاں سے واپسی طے ہوگئی ہے، مگر ولی عہد چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مُدّت یہاں رہے۔ مَیں اس کی خواہش کا بڑی مضبوطی سے مقابلہ کروں گا۔

"شاہزادہ مجھے بار بار یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اگر وُہ ملکہ کو شادی کا پیغام دے گا تو وہ فوراً قبول کرلے گی۔ اس کی دِلی آرزو ہے کہ ملکہ اس کی زوجیت میں آجائے لیکن افسوس یہ کیونکر ممکن ہے! کیا ملکہ منظور کرے گی کہ اپنے تخت سے دستبردار ہوکر سینٹ پیٹرز برگ جائے! یا پھر ولی عہد کو اپنے تخت سے محروم ہوکر لندن میں رہنا ہوگا؟ اگر یہ ممکن ہے نہ وہ تو پھر کیا شوہر یورپ کے ایک سرے پر رہے گا اور بیوی یورپ کے دوسرے سرے پر؟ یہ سب باتیں محال ہیں۔ خدایا، اس مشکل میں میری مدد کر۔ شاہزادے کی بھلائی کے سوا میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں، خدایا دستگیری فرما، اور اس بھنور سے شاہزادے کو اور مجھے نکال لے۔ میرا فرض بالکل صاف ظاہر ہے۔ میری ذمہ داری میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ ولی عہد کہہ چکا ہے کہ صرف مجھی کو اپنا دوست اور معتمد علیہ یقین کرتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس خاص معاملہ میں شاہزادے کی خوشی مَیں پوری نہیں کرسکتا۔ اس کی خواہش احمقانہ ہے میں ہرگز اس کی تائید نہیں کرسکتا۔ مَیں مجبور ہوں کہ نہایت استقلال سے اپنا فرض انجام دوں اور مَیں یہی کرتا رہوں گا چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

اب جنرل نے طے کیا کہ فیصلہ کُن ضرب لگا کر اس قصّے کا خاتمہ کردینا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ خود ملکہ پر بھی اُس کے ارکانِ دولت اور دوستوں کے ذریعہ دباؤ ڈالا جائے چنانچہ جنرل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:-

"۲۲ مئی — آج میں نے ملکہ کی خاص سہیلی لیڈی ..... سے طویل گفتگو کی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ملکہ بھی اُس سے اقرار کرچکی ہے کہ وہ گرینڈ ڈیوک (ولی عہد) سے نہایت گہری محبّت کرنے لگی ہے، ملکہ نے کہا کہ عمر بھر میں اُس نے یہ پہلا نوجوان دیکھا ہے جس نے اس کا دِل موہ لیا ہے حتیٰ کہ اب وہ اس سے جُدائی میں کسی قسم کی مسرت کا احساس بھی نہیں کرسکتی! لیڈی ..... نے کہا ملکہ نہایت خوش ہوگی اگر شاہزادہ شادی کا پیام دے گا۔ بلکہ ملکہ بڑی بے چینی سے اُس گھڑی کا انتظار کر رہی ہے جب ولی عہد اپنی زبان پر شادی کا لفظ لائے گا!

"میری طرح لیڈی ۔ ۔ ۔ ۔ کو موجودہ صُورتِ حال خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ وُہ اُن پیچیدگیوں کے تصور ہی سے کانپ جاتی ہے جو شاہزادے کی اس رغبتِ رشتہ سے پیدا ہوں گی، لیڈی ۔ ۔ ۔ ۔ نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ اگر شاہزادہ ایسی حرکت کرے گا تو اپنے آپ کو، زار کو اور روسی سلطنت کو انتہائی نازک پوزیشن میں ڈال دے گا۔ وہ ایک ایسی غیر معمولی حالت پیدا کر دے گا جس کا تدارک کوئی انسان بھی کر نہیں سکے گا۔ لیڈی ۔ ۔ ۔ ۔ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وُہ بھی بڑی مستعدی سے اس خطرناک صُورتِ حال کو دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی"

ملکہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:۔

"۷ مئی ـــــ آج کا دن نہایت دلفریب ہے۔ آسمان کھلا ہوا ہے اور سُورج چمک رہا ہے۔ کون انسان ہے جو اس نظارہ سے مسرور نہیں، لیکن مجھے ذرا خوشی نہیں۔ میرا دِل تنگ ہے عجیب قسم کی افسردگی مجھ پر چھا گئی ہے۔

"میں کھڑکی پر کھڑی تھی کہ گرینڈ ڈیوک (ولی عہد) کو آتے دیکھا سات بجے شام کا وقت تھا۔ اُس نے مجھے سلام کیا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کھانے کا وقت آ گیا۔ ہم دسترخوان پر گئے جہاں ولی عہد کے مصاحب و دیگر درباری موجود تھے۔

"پھر ناچ شروع ہُوا۔ میں نے ولی عہد کے ساتھ رقص کیا۔ واقعی شاہزادے کے ساتھ ناچنے میں بڑا ہی لُطف آتا ہے، وہ بہت ماہر ہے اور اُس کے ساتھ رقص کرنے والی کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ اُسے اُڑائے لئے جا رہا ہے۔ بہت ہی دلچسپ اور نیک مزاج نوجوان ہے۔ اُس کے دِل کے خیالات اُس کی پیشانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آخر کار وزیرِ اعظم لارڈ ملبورن سے میری طویل گفتگو ہوئی۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ کھیل کُود میرے لئے بہت مفید ہے۔ طبیعت کی افسردگی اس سے دُور ہو جاتی ہے۔ وزیرِ اعظم مُسکرایا مگر اس مُسکراہٹ میں ہزاروں خفگیاں چھپی ہوئی تھیں۔ پھر کہنے لگا:۔

"لیکن بعد میں آپ کو بڑی کوفت اُٹھانا پڑے گی۔ آپ کو اپنی تندرستی کا خیال رکھنا چاہئے۔ اس طرح کی محنتیں آپ کے حق میں مضر ہیں۔ آپ کو شکایت ہے کہ دِل گھبراتا ہے اور اس کی وجہ آپ اُس ذہنی انتشار کو قرار دیتی ہیں جو چند ہفتے سے آپ کو لاحق ہے۔ آپ کو لوگوں سے بیزاری ہو گئی ہے۔ ہم میں کوئی نہیں جو اس بیزاری کو محسوس نہ کر رہا ہو۔ کیا آپ کو اندیشہ نہیں کہ سرکاری کاموں سے بھی آپ کو بیزاری پیدا ہو جائے، اور اس طرح آپ ایک بہُت ہی بُرا نمونہ پیش کریں؟"

"میں نے وزیرِ اعظم کو بہت سمجھانا چاہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میرے دِل کی حالت کچھ بھی ہو، مگر میں اپنے سرکاری فرائض پُوری مستعدی سے انجام دیتی رہوں گی، مگر وزیرِ اعظم نے میری ایک نہ سُنی اور کہنے لگا:۔

"پچھلے چند ہفتوں سے آپ کی زندگی غیر فطری ہے، اسی قدر نہیں بلکہ آپ جیسی نوجوان خاتون کے حق میں غیر معقول بھی ہے۔ میں آپ سے انتہائی دوستی اور اخلاص سے گفتگو کر رہا ہوں، میری درخواست ہے کہ آپ اپنی تندرستی اور جوانی کا زیادہ اہتمام رکھیں، آپ کے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے، آئندہ زندگی میں تمام معقول آرزوئیں اور ممکن تمنّائیں پوری ہو سکتی ہیں، لیکن بعض مسرتیں ناممکن ہوتی ہیں۔ قدرتی طور پر نہ ہوں تو

بھی حالات اُنہیں ناممکن الحصول بنا دیتے ہیں، پھر کیا سبب ہے کہ آپ ناممکن آرزوئیں پرورش کر کے اپنے دل کو پریشانی میں مبتلا کرتی ہیں؟"

"میں نے کہا، لیکن کیا ملکہ بھی انسان نہیں ہوتی؟ کیا ملکہ کو بھی حق نہیں ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح مسرت حاصل کرے؟"

وزیرِ اعظم نے اپنا بھاری سر جھکا لیا، پھر دیر کے بعد اُٹھایا اور مجھے بغور دیکھ کر کہنے لگا:۔

"یقیناً آپ بادشاہ لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں مگر سب انسانوں جیسے انسان نہیں کیونکہ آپ لوگوں کا ایک اعلیٰ مشن ہوتا ہے اور اس مشن میں آپ کی شخصیت کو اس قدر فنا ہو جانا چاہئے کہ آپ انسان نہیں صرف بادشاہ ہی رہ جائیں۔ یہ قربانی ممکن نہیں جب تک بادشاہ اپنے مشن کی بلندی تک بلند نہ ہو جائے اور اس راہ میں اپنے بہت سے ذاتی خیالات اور بہت سی خواہشیں قربان نہ کر ڈالے۔ بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے تو حقیقت میں اس قربانی کی دستاویز پر اپنی مہر ثبت کر دیتا ہے۔ اپنے اس عہد سے بادشاہ کسی حال میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ تخت سے دستبردار ہو کر بھی نہیں کیونکہ اگر وہ تخت سے دستبردار ہوتا ہے تو بدعہدی کی ذلّت کے ساتھ فرض سے بھاگنے کی ذلّت کا بھی مستحق بن جاتا ہے!"

"اس بوڑھے مدبّر کی یہ گفتگو سُن کر جو اُس کے ٹھوس عقیدوں پر مبنی ہے میں بےبس ہو کر اُن آنسوؤں کے چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئی جو دیر سے میری آنکھوں میں ڈبڈبا رہے تھے۔ اُس نے میرے رُخسار پر آنسو دیکھے تو انتہائی شفقت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کا بوسہ لیا اور کہنے لگا:۔

"علیا حضرت، تو اب ہم میں بات پختہ ہو گئی، آج رات میں اطمینان سے سو سکوں گا!"

آخر جُدائی کا وقت آ ہی گیا۔ ملکہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:۔

"۲۹ مئی ۔۔۔ میں اپنی خوابگاہ کے متصل کمرے میں گئی۔ گرینڈ ڈیوک لارڈ پامرسٹن کے ساتھ آیا تا کہ مجھ سے رخصت ہو، اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس دبانے میں اس کی روح کی تمام گرمی سمٹ آئی تھی۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا، اور آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگا "بیگم میری آواز بند ہوئی جاتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اپنے احساس کو ظاہر کروں!" پھر اُس نے میرا، میری رعایا کا اور میری قوم کا اُس استقبال کے لئے شکریہ ادا کیا جسے اُس نے نہایت شاندار اور مؤثر بتایا۔ اُس نے کہا اس استقبال نے انگلستان اور رُوس کے تعلقات ہمیشہ سے زیادہ مضبوط کر دیئے ہیں، اور یہ کہ وہ پہلے ہی موقع پر پھر انگلستان آنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے بعد اُس نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ میں نے بھی دونوں ہاتھ پھیلا دیئے، اُس کا سر اپنے مُنہ کے قریب کیا اور دونوں رخساروں کا بوسہ لیا۔ اُس نے مجھ سے ایسا معانقہ کیا جس میں محبت اور بھائی چارے کے جذبات نمایاں تھے۔ اُس لمحہ میرا احساس بہت ہی عجیب تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک دوست کی رُوح مجھ سے چھینی جا رہی ہے نہ کہ ایک لطیف مہمان رخصت ہو رہا ہے۔ اس مہذب نوجوان کو رخصت کرتے ہوئے مجھے گہرا غم محسوس ہوا ایسا خیال ہوا کہ واقعی میں اس سے محبت کرتی ہوں یا کم سے کم اس کی طرف گہرا میلان رکھتی ہوں!"

اب دیکھئے جنرل، ولی عہد کی حالت کس طرح بیان کرتا ہے:۔

"۳۰ مئی ۱۸۳۹ء ۔۔ کل ہم نے ملکہ وکٹوریا سے وداع کی اجازت چاہی۔ رخصت کے بعد جب خلوت میں ولی عہد سے میری ملاقات ہوئی تو بیچارہ نوجوان بے اختیار ہو گیا۔ مجھ سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ پھر مجھ سے کہنے لگا "اس جُدائی کو عمر بھر بھول نہیں سکتا میں نے وکٹوریا سے معانقہ کیا۔ اُس نے بھی مجھ سے معانقہ کیا۔ اس نے میرے رُخسار پر جو بوسہ ثبت کیا ہے بہترین یادگار ہے۔ یہ بوسہ قبر میں بھی میرے ساتھ جائے گا!"

"میں نے شاہزادے کو سمجھانا چاہا مگر وہ اس طرح رو رہا تھا کہ میری کوئی بات بھی سُن نہ سکا۔ آخر میں نے زور سے اُس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔
"آقا، آپ بادشاہ ہیں، اور بادشاہ کے لئے روا نہیں کہ اپنی رعایا کے سامنے روئے۔"

شاہزادے نے روتے ہوئے جواب دیا" دوست معاف کرو۔ مجھ پر ایسی مصیبت ٹوٹی ہے کہ میں برداشت ہی نہیں کرسکتا!"

میں نے کڑے لہجے میں کہا" میرے آقا، بادشاہ بنیے!"

" یہ سُن کر شاہزادہ پھر مجھ سے لپٹ گیا اور بڑے ہی جوش سے مگر روتے ہوئے اُس نے کہا" مہربان، کیا تمہارے لئے انسان ہونا آسان نہیں ہے؟"

"پھر وہ مجھے چھوڑ کر بستر پر جا گرا اور روتے ہوئے کہنے لگا" اگر بادشاہی یہی ہے تو وائے بادشاہوں کی مصیبت!"

"دین و دُنیا"

اورنگ زیب اور تانا شاہ

" اچھا تو نماز ہو رہی ہے!" تانا شاہ نے کہا اور ساتھ ہی اُس کا چہرہ غصے سے تمتا گیا۔

" مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دُور اندیشی سے یقیناً بعید ہے!! کیا اورنگ زیب جیسا دُور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کرسکتا ہے، نہیں ہرگز نہیں۔ ایک صریح تحقیر ہے، دیکھنا! ہے کوئی یہاں اچھا نشانہ باز؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پُر جوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ کر ٹکراتی ہیں اور ہر ہر دفعہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بن کر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اِس وقت آفتاب کی تمازت میں کافی کمی ہو گئی ہے اور مغلیہ لشکر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب ابھی ابھی نماز کے لئے صف بستہ کھڑے ہوئے ہیں۔ چند لمحے گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

" خُوب! شاباش!! نام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک اَور شخص امامت کے لئے آگے بڑھ رہا ہے .... ہاں چھوڑنا نہیں، کوئی امام نہ بچے ...... اِس کو کہتے ہیں انتقامِ تحقیر!!"

شاہی حکم بجلی بن کر دُوسرے امام پر گرتا ہے اور وُہ بھی دکنی گولنداز کا نشانہ ہو جاتا ہے۔

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذرِ اجل ہو جانے کے بعد امامت کے لئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اِس سرے سے اُس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے لیکن ابھی چند لمحے بھی گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے، اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تانا شاہ لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

" ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؛ دِکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اِس وقت امام ہے!!"

(سید محی الدین قادری زور)

"سب رس"

چند مغربی کہاوتیں

اچھا درخت جوں جوں پرانا ہوتا ہے زیادہ سایہ دار ہوتا ہے۔

جس کے پاس زیادہ دولت ہوتی ہے وہ بھی اتنا ہی غمگین ہوتا ہے جتنا وہ شخص جس کے پاس روپیہ بہت کم ہوتا ہے۔

رشتہ داروں کے ساتھ کھاؤ پیو مگر معاملہ نہ کرو۔

ایک لمحہ کا صبر بعض دفعہ دس سال کے آرام کا سبب ہوتا ہے۔

ادنیٰ خاندان میں بہترین ہونا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ اعلےٰ خاندان میں بدترین ہو۔

نادہند سے ایک تنکا بھی مل جانا اچھا ہے۔

بہرے آدمی کا دروازہ کھٹکھٹانا یا نہ کھٹکھٹانا دونوں برابر ہیں۔

نیکی بہت جلد پرانی ہوجاتی ہے۔

دیوالیہ ساہوکار اپنے پرانے حسابات تلاش کرتا ہے۔

بھیڑیے کی سردیوں میں پرورش کروگے تو گرمیوں میں تم کو کھالے گا۔

فائدہ سے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا نقصان سے رنج ہوتا ہے۔

جسم کا مرض دماغ کی جہالت سے بہتر ہے۔

مینڈک کو طیش آیا لیکن تالاب کو خبر بھی نہیں ہوئی۔

انسان کو اس کی فکر نہ کرنی چاہیئے کہ وہ کہاں پیدا ہوا تھا بلکہ اس کی فکر چاہیئے کہ وہ کہاں رہ سکتا ہے۔

اونٹ شکر ڈھوتا ہے لیکن کانٹے کھاتا ہے۔

اگر میری داڑھی میں آگ لگے دوسرے اُس جگہ سے سگار سلگائیں۔

گھوڑا اُسی کا ہے جو اس پر سوار ہے۔ تلوار اُسی کی ہے جس کے میان میں ہے اور پل اُسی کا ہے جو اس پر چل رہا ہے۔

بیوقوفوں سے پتھر کا تذکرہ نہ کرو۔ کہیں وہ تمہیں مار نہ دیں۔

جو شخص صبح کو نہیں ہنستا وہ دوپہر کو بھی نہیں ہنستا۔

چرواہا چاہے امیر ہی کیوں نہ ہوجائے اُسے بھیڑوں ہی کی بو آتی ہے۔

دیوار کے کان ہوتے ہیں اور میدان کی آنکھیں۔

بعض اوقات ایک لمحہ میں وہ ہوسکتا ہے جو ایک سال میں نہیں ہوسکتا۔

لوگ آپس میں بھائی ہوتے ہیں لیکن اُن کی جیبیں آپس میں بہنیں نہیں ہوتیں۔

عزّت کا پھول قبر پر کھلتا ہے۔

محبت کی وجہ سے وقت گزر جاتا ہے اور وقت کی وجہ سے محبّت گزر جاتی ہے۔

آدمی شادی کے بعد جانا جاتا ہے۔

مصائب کو بھول جانا چاہیئے۔

سید عبدالحی بی اے ایل ایل بی

"عصمت"

مطبوعات

طلسمِ خیال۔ یہ "ہمایوں" کے جادو طراز افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم اے کے تیرہ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے جو مکتبۂ اُردو لاہور نے نفیس جلد اور نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مسٹر کرشن چندر سے ناظرینِ "ہمایوں" خوب واقف ہیں۔ وُہ اُردو کے چند بہترین نئے رنگ کے افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں ایک ممتاز جگہ کے مالک ہیں۔ اُن کی زبان اور اندازِ بیان دلکش اور روح پرور ہے۔ اُن کے الفاظ نوکِ قلم سے ٹپک کر تصویریں بن جاتے ہیں اور ان تصویروں میں حرکت ہی نہیں آواز بھی ہوتی ہے۔ ان کی بیباک نفسیاتی تحلیل اور پُرخلوص جذباتی مصوری نے افسانے اور شعر کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں۔ عہر کی حقیر رقم اس کتاب کی قدر و قیمت کے مقابلے میں کچھ نہیں۔

ادبی دُنیا کا سالنامہ۔ سالناموں کے میدان میں "ادبی دُنیا" اس سال اپنے سب حریفوں یا حلیفوں سے بازی لے گیا ہے۔ سالنامۂ ۱۹۳۹ء بڑی تقطیع کے پونے تین سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ مضامین نظموں افسانوں اور ڈراموں کی یہ کثرت ہے کہ فہرستِ مضامین کو دیکھ کر ہوش ٹھکانے نہیں رہتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موج در موج حروف کا ایک طوفان برپا ہے۔ مولانا صلاح الدین صاحب بی اے مدیرِ ادبی دنیا کی ادبی اور کاروباری خوش سلیقگی ہر ہر صفحہ سے نمایاں ہے۔ ہندوستان بھر کا کوئی اچھا شاعر، افسانہ نویس، ڈراما نگار، عالم یا ادیب اُن کی مدیرانہ "ہل من مزید" کے سامنے تسلیم خم کرنے سے نہیں بچ سکا۔ اگر کوئی ادیب اس طویل و عریض فہرستِ مضامین میں غایب ہے تو وُہ بڑا ہی اڑیل ہوگا۔ رنگین اور یک رنگ تصاویر کی کثرت بھی "حساب کتاب" کی قید سے فارغ نظر آتی ہے۔ ان کے گننے کے لئے بہت وقت درکار ہے اسلئے فی الحال صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ تصویریں بے شمار ہیں اور اس کثرت کے ساتھ حسنِ ذوق کا پتا بھی دیتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک وسط درجے کا کاروباری آدمی اگر عہر میں ادبی دُنیا کا یہ سالنامہ خرید لے تو وُہ سال بھر کے لئے کسی اور رسالہ کی خریداری کی زحمت سے بچ سکتا ہے۔ اب تک جتنے مضامین راقم کی نظر سے گزرے ہیں، وہ دلچسپ نکتہ آموز اور صحیح ذوقِ ادب کے آئینہ دار ہیں۔ خود ایڈیٹر صاحب کا ایک ڈراما "سنت تکارام" نظم و نثر پر اُن کی حیرت انگیز قدرت کا گواہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب دلکش اور لطیف اشعار بھی نثر کی طرح برداشتہ قلم اور بے تکان لکھتے چلے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا ملکہ ہے جو بہت کم اُدبا کو حاصل ہوتا ہے۔

ادبی محاسن کے علاوہ ایک قابلِ توجہ چیز اس سالنامے کے بے شمار اور تو بر تو خوبصورت زر افشاں اشتہارات ہیں۔ اُردو کے کسی موجودہ یا گزشتہ اخبار یا رسالے میں ہم نے کبھی اس کثرت سے اعلےٰ درجے کے اشتہارات نہیں دیکھے۔ اس کامیابی پر ادبی دُنیا کے حریف ہی نہیں بلکہ حلیف بھی اگر رشک کھائیں تو بے چارے حق بجانب ہیں۔

پانچ روپے بھیج کر اگر آپ ادبی دُنیا کے خریدار بن جائیں تو یہ سالنامہ آپ کو بلا قیمت مل جائے گا۔

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کے متعلق
معاصرین کی رائیں

"دین و دنیا" دہلی

معاصر "ہمایوں" نے اس سال بھی حسب معمول نہایت خوشنما سالگرہ نمبر شائع کیا ہے۔ ہمایوں اس وقت اپنے اعلیٰ مضامین کے اعتبار سے تمام ادبی رسائل میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ ہمایوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے تمام مضامین معیاری اور بلند پایہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ خاص نمبر بھی بہترین اور اعلےٰ مضامین کا مجموعہ ہے۔

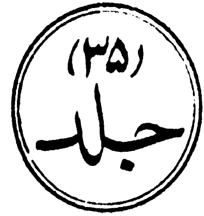
اس خاص نمبر میں تقریباً تین تیس مضامین ہیں جو سب کے سب نہایت اعلیٰ معیار کے مضامین ہیں رسالہ میں تصاویر بھی دی گئی ہیں لیکن تصاویر پر مغربی رنگ غالب ہے ضخامت تقریباً سو صفحات۔ اس خاص نمبر کی قیمت بارہ آنے۔

"تہذیب نسواں" لاہور

جنوری ۱۹۳۹ء کا "ہمایوں" سالگرہ نمبر ہے جس کی بزم ادب میں ہندوستان کے بہت سے مقتدر اہلِ قلم شریک ہیں۔ شروع میں میاں بشیر احمد صاحب نے "جہاں نما" کے عنوان کے تحت دُنیا بھر کے وُہ تمام اہم واقعات درج کئے ہیں۔ جو ۱۹۳۸ء میں پیش آئے۔ یہ مضمون معلومات کے لحاظ سے بہت مفید ہے اور اس میں مضمون نگار نے جامعیت اور اور اختصار کو یکجا کر دیا ہے۔

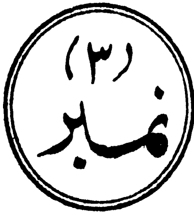
خان بہادر میاں عبد العزیز صاحب "فلک پیما" ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، پروفیسر فیاض محمود، مسٹر کرشن چندر، حضرت نشتر جالندھری اور مولانا حامد علی خاں کے مضامینِ نظم و نثر بہت خوب ہیں۔

ایک سہ رنگی اور سات سادہ تصویریں ہیں۔ سرورق بھی مصور ہے۔ تمام تصویریں بہت پاکیزہ ہیں اور ایڈیٹر کے "ذوقِ حسن" اور "حسنِ ذوق" کی آئینہ دار۔ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ ہیں۔ ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ قیمت بارہ آنے۔



فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ مارچ ۱۹۳۹ء



تصویر: خوبصورتی

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ر

"بزمِ ہمایوں"

میرے ایک دوست نے جنہیں اہلِ ہمایوں خوب جانتے ہیں اور جو آسمان پر پرواز کرتے ہوئے بھی زمین والوں پر نظرِ عنایت رکھتے ہیں تھوڑا عرصہ ہوا میری ایک "مُدیرانہ درخواست" کے جواب میں اپنے ایک خط میں لکھا :-

"خوش رہو۔ تمہاری ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُس بُڈھے سے جو روز میرے سُوٹ پہنتا ہے میری اچھی نکٹائیاں گلے میں باندھتا ہے اور میری پُرانی ڈائریاں دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ یہ میرے کارنامے ہیں مجھے ہر قسم کی غلطی کی توقع ہے۔ یہ غلطی خدا کرے کہ تمہارا کہنا مان لے تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ اگر مجھے شباب میں یہ علم ہوتا کہ اپنا قیمتی وقت اِس قسم کے ناآشنا بُڈھے کے لئے برباد کر رہا ہوں تو کبھی اپنے کام میں اتنی محنت نہ کرتا۔ خود اپنے لئے ایک عجیب الخلقت stranger بن رہا ہوں۔

"ہمایونیت" بہت اچھی چیز ہے، اسے ضرور نبھاؤ۔ یہ بھی ایک قسم کی وفا ہے جو ناروا نہیں مگر کبھی کبھی اپنے آپ کو یعنی اُس بشیر کو جو آج کل "ندائے لیگ" اور "نذیرِ اُردو" ہے اُن نگاہوں سے بھی دیکھ لیا کرو جو آج سے دس سال پہلے فدائے حقیقت بشیر کی تھیں۔ اُس زمانے میں تم Truth کے سرگرم متلاشی تھے اور Truth کا علم تم چاہتے تھے کہ آزادی سے لہرائے۔ آج کل کا مصلحتوں کا شکار بشیر اُس Truth کے رضا کار بشیر سے بہت دُور ہے۔ تمہارے میرے سمیت سب انسان یُونہی بھٹکتے رہتے ہیں۔ ہم سب کا حقیقی خدا تغیّر ہے۔ آج کچھ کل کچھ۔ خدا گیا قوم آئی۔ قوم گئی ذاتی وقار و وجاہت کی دُھن سمائی :-

آئینِ جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

کچھ اُداس سا ہو رہا ہوں۔ کوئی چلی کٹی نئی Nonsense لکھ کر دل خوش کروں گا۔"

تمہارا ع

اس کے جواب میں مَیں نے لکھا کہ آپ کے اس خط نے مجھے بھی کچھ اُداس سا کر دیا۔ اپنی سرگرمیوں میں تھوڑی دیر کے لئے سوچ بچار پر مجبور کر دیا۔

اس کے جواب میں وُہ پھر لکھتے ہیں :-

"پہلے خط میں جو تم نے لکھا کہ میرے فقرے نے اُداس کر دیا سو بات یہ ہے کہ اگر تم حق پرستی چھوڑ کر مصلحت پرستی اختیار کرو اور میں حُسن پرستی چھوڑ کر زر پرستی اپنا شعار کروں تو زندگی کچھ بے معنی سی ہو جاتی ہے، ورنہ مجھے تو ہر بات پر ہنسنا ہے۔ معنی کی کوئی قید نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وُہ جو بہت محنت سے بے انتہا شوق سے بعض گہرائیوں کا مطالعہ کر چکا ہوں وہ Intellectual honesty پر مجبور کرتا ہے۔ ہر وقت

کی ہنسی بھی sense of humour ہنسی نہیں رہتی۔ اِسی لئے اپنے پُرانے بشیر کو یاد کر کے وُہ فقرہ تمہیں لکھ دیا۔ تم راستی چھوڑ دو میں وفا چھوڑ دُوں تو پھر یہ دُنیا واقعی ایک بھیانک دوزخ ہے۔ سمجھے!" تمہارا ع

میری "مدیرانہ درخواست" "ہمایوں" کے نصب العین کے متعلق تھی جو "ہمایوں" کے سب سے بڑے مقالہ نگار کی خدمت میں پیش کی گئی۔ "ہمایوں" کی دُنیا میں سب سے بڑا خود ہمایوں ہے اور "ہمایونیت" کا نبھاؤ اُس کے اِدارے اور اُس کے مقالہ نگاروں کے فرائض میں پہلا خوشگوار فرض ہے۔

میرے عزیز دوست نے جو حقیقت اور مصلحت کی عقلی و اخلاقی بحث چھیڑ دی ہے وُہ ہر پُرخلوص انسان کے لئے مشعلِ راہ ہو سکتی ہے اپنے متعلق میں اُن کی خدمت میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میری موجودہ روش "مصلحت" پر مبنی نہیں بلکہ مجھے اب حقیقت یہی نظر آتی ہے۔ خالص مصلحت پر شاید وُہ لوگ چلتے ہیں جنہیں سیاست دان کہا جاتا ہے اور ہر چند کہ قومی فرائض کا تھوڑا سا احساس مجھے گھسیٹ کر نظری سیاست کے میدان میں لانا چاہتا ہے میں اب بھی عملی سیاست سے گھبراتا ہوں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملی سیاست سے گھبرانا صرف بُزدِل ادیبوں کا کام ہے۔ آج کل تو ہر شے سیاسی ہے۔ ہماری اُردو جس کے حروف میں اس وقت لکھ رہا ہوں اور پڑھنے والے پڑھ رہے ہیں وُہ بھی اب ایک سیاسی شے بن گئی ہے۔ ہندوستانِ سیاست نشان میں تو شاید وہ ہوا بھی جس میں ہم لوگ آج کل سانس لے رہے ہیں سرتاسر سیاسی ہو چکی ہے پھر سیاست اور ادب یا سیاست اور حقیقت کی حدیں کیونکر ایک دوسری سے الگ الگ رہیں۔

ہمیں نہیں معلوم حقیقت کیا شئے ہے۔ زمانہ یا "تقدیر" جن حالات کو بھی ہمارے سامنے لائے اُن پر اپنی تدبیروں سے اثر ڈالنا، یہ ہے ہماری زندگی۔ کوئی اَور یہ اثر ڈالتا ہے یا ہم، حقیقت کچھ ہو ہم تو یہی سمجھتے ہیں یہ سمجھنے پر مجبور ہیں یہی سمجھنے کے حق دار ہیں کہ جب ہم کچھ کرتے ہیں تو ہمیں ہیں جو اسے کرتے ہیں اور ہزار مجبوریوں میں رہ کر بھی جب تک زندہ ہیں کچھ نہ کچھ خود کرنے پر مجبور ہیں۔

قوم کی خدمت یا اُردو کی خدمت میرے لئے مصلحت نہیں حقیقت کا ایک رنگ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے اور یہی بات ہے جو کبھی کبھی سوچ بچار پر مجبور کر دیتی ہے کہ اگر اِن چھوٹے چھوٹے مگر میرے لئے اہم کاموں کے کرنے میں مَیں حق پرستی یا راستی سے دُور جا پڑوں تو وُہ نہ اُس قوم و مذہب کی خدمت ہو گی جو حق کے عَلَم بردار ہیں اور نہ اُس زبان کی جو مختلف ملّتوں اور قوموں کے میل جول سے بنی اور پھولی پھلی!

بشیر احمد

جہاں نما

یورپ کے امن کی بنیادیں

سر نارمن اینجل نے اپنے ایک مضمون میں اقوامِ عالم کے سامنے وہ مسئلہ پیش کیا ہے جسے یا تو یورپ کو حل کرنا پڑے گا یا خود تباہ ہو جانا پڑیگا۔ یورپی ممالک کے کروڑوں باشندے صلح و امن چاہتے ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ ہر وقت جنگ کا دھڑکا لگا رہتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ آمر، سرمایہ دار، اور اسلحہ ساز تاجر یورپی اقوام کو اُن کی مرضی کے خلاف جنگ پر مجبور کر رہے ہیں تو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ایک آمر یا چند سرمایہ دار اور اسلحہ ساز کیونکر کروڑوں آدمیوں کو اُن کی مرضی کے خلاف جنگ پر مجبور کر سکتے ہیں۔ طاقت کثرت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ پھر وہ کیونکر ایک، یا ایک درجن یا دس درجن آدمیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن سکتی ہے؛ اصل سبب یہ ہے کہ خود اکثریت کے دماغ پر بعض خیالات اور تصورات کا قبضہ ہو جاتا ہے ـــ دُوسرے ممالک کو فتح کرنے کا شوق اور اُس کے فواید پر یقین، قوم پرستی، حُبِ وطن بعض خاص نسلوں، قوموں، فرقوں یا جماعتوں کے خلاف مذہبی، نسلی، قومی یا جماعتی تعصب۔ یہ وُہ خیالات ہیں جن سے فایدہ اُٹھا کر ایک قلیل جماعت یا ایک فرد ایک قوم کی قوم کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ جنگ کے حامی، یا وہ چند لوگ، جو جنگ میں اپنا فایدہ سمجھتے ہیں عوام کے انہیں خیالات کے طفیل اپنا کام نکالتے ہیں۔ اگر وہ لوگ ایک پوری قوم کو اپنے مقاصد کا بازیچہ بنا سکتے ہیں تو اس کا باعث یہ نہیں کہ وہ قوم سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اور اسے کسی طرح مجبور کر سکتے ہیں بلکہ قوم خود اپنے تعصبات اور توہمات کے صدقے میں انہیں یہ طاقت بہم پہنچاتی ہے۔

اگر لوگوں کے دل و دماغ پر اس قسم کے خیالات کا قبضہ نہ ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ چند غرض مند لوگ ایک پوری قوم کو اپنا آلۂ کار بنا سکتے مثال کے طور پر عمارات کی تعمیر کا کاروبار کرنے والوں کو لیجئے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ یہ لوگ عوام کو بڑے بڑے شہروں مثلاً لنڈن، برنگھم یا بمبئی وغیرہ کو جلا کر راکھ کر دینے پر آمادہ کر سکتے تو اینٹ چُونے لوہے، سیمنٹ، شیشے اور لکڑی وغیرہ کی تجارت کو بے انتہا نفع ہوتا۔ لیکن اینٹ چُونے، لکڑی، لوہے وغیرہ کے تاجر یا سرمایہ دار لنڈن برنگھم یا بمبئی کے لوگوں کو یہ آتشیں کھیل کھیلنے پر آمادہ نہیں کر سکتے۔ سرمایہ دار یہاں ناکام رہتے ہیں لیکن جب بموں اور توپوں کے ذریعہ سے یہ کام کرنے کو کہا جائے تو اسلحہ ساز سرمایہ دار کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آخر دونوں صُورتوں میں اس تفاوت کی وجہ کیا ہے حالانکہ سرمایہ دار کا مالی فائدہ دونوں ہی حالتوں میں یکساں ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقلیت اکثریت کے دِلی عقاید اور خیالات کی تہ تک پہنچ کر اُن سے کام لیتی ہے۔ اکثریت کے خیالات ہی سے اُس کی تباہی کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔

جب ہٹلر میدانِ سیاسیات میں آیا اس وقت اس کے صرف دس چیلے تھے اور اگر اسے عوام کے بعض خاص جذبات کو اُبھار کر اُن سے

فائدہ حاصل کرنے کا ملکہ حاصل نہ ہوتا تو اس کے عقیدتمندوں کی اس تعداد میں کوئی بھی اضافہ نہ ہوتا۔ عوام کے یہ جذبات جن سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، کیا ہیں ــــ فسادپسندی، دشمنی، نفرت، قوم پرستی سے متعلق خودغرضانہ مقاصد۔ جو لوگ اِن جذبات سے مغلوب ہوجاتے ہیں، انہیں یہ ہوش بھی نہیں رہتا کہ انہیں کوئی کدھر ہانکے لئے جارہا ہے اور وہ کیسی کیسی اور کس کس چیز کی قربانی کر رہے ہیں۔

تمام محرکات اور جذبات سے گہرا جذبہ حفاظتِ نفس کا ہے کیونکہ اس کے بغیر زندہ چیزیں عالمِ وجود میں باقی نہیں رہ سکتیں۔ اگر غایرنظر سے دیکھا جائے تو یورپ کی قومیں ہلاکت کے جس راستے پر چل نکلی ہیں اس کے اختیار کرنے کی علتِ اصلی بھی یہی حفاظتِ نفس کا جذبہ ہے، اگرچہ بظاہر یہ قول خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اگر بدلے ہوئے بیرونی حالات کے عقلی مشاہدے کے بغیر ہم حفاظتِ نفس کے جذبے کی اطاعت کرنے لگیں تو بعض اوقات ہم سیدھے ہلاکت کے غار میں جاسکتے ہیں۔ اگر کسی جہاز کے ٹکرا کر ناکارہ ہوجانے پر لوگ اندھادھند کشتیوں میں کودنا شروع کردیں اور کسی ضبط اور نظام کی پیروی نہ کریں تو اگرچہ اس اندھادھند دوڑ کا محرک حفاظتِ نفس ہی کا جذبہ ہوگا لیکن ہلاکت منہ کھولے ہماری منتظر کھڑی ہوگی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔

دُنیا کی سب قومیں حفاظتِ نفس کے طریقے اختیار کررہی ہیں لیکن جب تمام قومیں یہ طریقے اختیار کرلیں گی تو کوئی قوم بھی محفوظ نہ رہے گی۔

حفاظتِ نفس کے یہ طریقے کیا ہیں؛ ہر بڑی طاقت دل میں کہتی ہے۔ اگر مجھے محفوظ رہنا ہے تو مجھے ہر دُوسری حریف طاقت سے زیادہ قوی بننا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس صُورت میں کمزور کو کبھی پناہ نہیں مل سکتی۔ اگر طاقت کی زیادتی حفاظت کی شرط قرار دی جائے تو کمزور کا محفوظ رہنا ناممکن ہوگا۔

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ یہ طریقہ حقوق اور اصُولِ اخلاق کی ہر حد کو توڑنے والا ہے کیونکہ طاقتور کمزور کو محض اپنی قوت کے بل پر زندہ رہنے کے حق سے محروم قرار دیتا ہے۔

طاقت کی اس مسابقت کی کوئی حد نہیں قرار پاسکتی۔ اگر یہ حالت قائم رہی تو رفتہ رفتہ یورپ تہذیب و تمدن کی تمام دُوسری ضروریات کو پسِ پُشت ڈال کر سامانِ جنگ کے جمع کرنے کی ہوس میں یا تو خودکشی کرلے گا یا پھر دَورِ بربریت کو پیچھے کی طرف لوٹا لے گا۔

یورپ و امریکا کے مصارفِ جنگ

جنگِ عظیم کے بعد یورپ اور امریکا کے مصارفِ جنگ میں بے انتہا اضافہ ہوگیا ہے۔ کروڑوں اور اربوں روپے ہر سال آلاتِ تباہی کے خریدنے پر صرف ہو رہے ہیں۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اس اسراف کے بعد تعلیم، صنعت و حرفت، غریبوں کی امداد، اور فلاحِ بنی نوعِ انسان کے دیگر ذرائع کے لئے کس قدر رقم بچتی ہوگی۔ اس کے علاوہ جب ہر قوم جنگ کے مہیب ساز و سامان کے ساتھ

ہر دوسری قوم کے سر کے لئے ایک تیغِ کشیدہ بنی ہوئی ہے تو اس حالت میں انسانی تہذیب کس قدر ترقی کر سکتی ہے۔ کیا درندگی کا یہ سامان انسان کے اعلےٰ اخلاق کی تہذیب میں کسی قسم کی مدد دے سکتا ہے۔ ذیل کے نقشے کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی تہذیب بقولِ اقبال اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرنے والی ہے۔

ملک	۱۹۱۳ء کے جنگی مصارف	موجودہ مالی سال کے جنگی مصارف
برطانیہ	۳۸۵,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر	۸۷۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر
فرانس	۳۰۷,۰۰۰,۰۰۰ 〃	۶۵۳,۰۰۰,۰۰۰ 〃
جرمنی	۲۸۱,۰۰۰,۰۰۰ 〃	۱,۵۶۰,۰۰۰,۰۰۰ 〃
اٹلی	۱۹۵,۰۰۰,۰۰۰ 〃	۲۹۱,۰۰۰,۰۰۰ 〃
ریاست ہائے متحدہ امریکا	۲۴۵,۰۰۰,۰۰۰ 〃	۹۶۲,۰۰۰,۰۰۰ 〃

دُنیا میں یہودیوں کی تقسیم

ہٹلر نے جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے اُس کے جوش و خروش کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید جرمنی کا چپہ چپہ یہودیوں سے پٹا پڑا ہوگا لیکن " ورلڈ یوتھ " کے ایک مضمون سے معلوم ہُوا ہے کہ جرمنی کے موجودہ حدود میں کل ۷۵۰۰۰۰ یہودی ہیں جو آبادی کے ایک فیصدی حصے سے کچھ ہی زیادہ ہوں گے۔

وارسا کی مجلسِ یہود کے بیان کے مطابق دُنیا میں یہودیوں کی کُل تعداد ۱۶۲۵۰۰۰۰ ہے۔ اس میں سے ۲/۳ حصہ ایسے ملکوں میں آباد ہے جہاں اس سے مساوات کا سلوک کیا جاتا ہے۔ باقی ایک ثلث میں سے کچھ تو پہلے ہی دوسروں کے زیرِ عتاب ہیں اور کچھ عنقریب اس عتاب کا شکار ہونے والے ہیں۔

مساوات کا سلوک کرنے والوں میں سے سب سے پہلا درجہ امریکا کا ہے۔ یہاں یہودیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ امریکا میں تقریباً ۴۵۰۰۰۰۰ یہودی آباد ہیں۔

اس کے بعد سوویٹ رُوس کا درجہ ہے یہاں ۳۰۸۰۰۰۰ یہودی رہتے ہیں۔ اِن کو بھی دوسرے سوویٹ شہریوں ہی کی طرح حقوق حاصل ہیں۔ البتہ دوسرے تمام مذاہب کی طرح یہودیوں کا مذہب بھی روسیوں کے منظم نیم سرکاری " مذہب شکن " پروپیگنڈے سے بچا ہُوا نہیں۔

چیکوسلوویکیا میں جو اب جرمنوں کے قبضے میں آگیا ہے ۳۵۷,۰۰۰ یہودی بستے ہیں۔ جرمنوں کے قبضے سے پہلے یہاں انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ لیکن اب صُورتِ حالات بدل گئی ہے۔

ریاست ہائے بلقان میں یہودیوں کی مجموعی تعداد ۱۸۶۰۰۰ ہے لیکن یہاں بھی ان پر کم و بیش سختی ہی روا رکھی جاتی ہے۔

پولینڈ میں یہودی کُل آبادی میں دس فیصدی ہیں اور ہنگری اور رومانیا میں پانچ پانچ فیصدی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آبادی کے اتنے بڑے حصّے کو تباہ کرنا اقتصادی خودکشی کے مرادف ہے۔

اٹلی بھی یہودیوں کی مخالفت میں دُوسروں سے پیچھے نہیں حالانکہ یہاں اُن کی تعداد برائے نام ہے۔ ۴۵۰۰۰۰۰۰ کی کُل آبادی میں صرف ۴۷۰۰۰ یہودی ہیں۔ مسولینی کی مخالفتِ یہود اقتصادی یا نسلی اساس پر مبنی نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں غالباً جرمنی کی سیاسی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال پنہاں ہے۔

جاپان کی حالت اَور زیادہ عجیب ہے۔ جاپان کی کُل آبادی ۷۰۰۰۰۰۰۰ ہے اَور اس میں یہودیوں کی کل تعداد ۱۰۰۰ سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جاپان میں یہود کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے۔

"ورلڈ یوتھ" کے مضمون نگار نے یہودیوں کی مخالفت کے اسباب کی عِلّت کی تشریح یوں کی ہے:۔

"جب لوگ بھُوکے ہوں اَور وُہ ہر طرف سے قانون اَور قواعد کی زنجیروں میں بھی جکڑے ہُوئے ہوں۔ جب حرکت اَور گفتگو پر ہزاروں پابندیاں عاید ہوں اَور جب مستقبل میں امن اَور خوش حالی کی کوئی صُورت نظر نہ آتی ہو تو انسان کے دِل میں نفرت، ناخوشی اور تعدّی کے زبردست جذبات کو تحریک ہوتی ہے۔

اِن حالات میں نزلہ عموماً کسی عضوِ ضعیف پر گرتا ہے۔ کوئی کمزور اقلیت قربانی کا بکرا بنا لی جاتی ہے۔ جرمنی میں آجکل یہودی دوہرا کام دے رہے ہیں۔ قربانی کے بکرے کے طور پر وہ نفرت سے بھرے ہوئے بھوکے عوام کو اپنے جذباتِ غیظ و غضب کے فرو کرنے کا موقع دے رہے ہیں اَور ایک خاص مذہب کا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے وُہ یہ موقع بھی بہم پہنچاتے ہیں کہ مذہبی فرض کے پردے میں ہر قسم کی ضمیر کُشی جائز قرار دے دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وائنا اَور جرمنی میں پُرجوش عوام جب یہودیوں پر حملہ کرتے ہیں تو عموماً رومن کیتھولک پادری بھی اس جوش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

فلسطین میں انگریزی حکمتِ عملی نے یہودیوں کے ساتھ نادان دوستوں کا سا سلوک کیا ہے۔ وُہ عربوں کے وطن میں سرمایہ دار اور سُود خوار یہود کو جبراً آباد کر کے نہ صرف عربوں کو یہودیوں کا دشمن بنا رہے ہیں بلکہ اپنے خلاف بھی نفرت کے جذبات پیدا کر رہے ہیں۔ یہودیوں کو عربوں کا ناخواندہ مہمان بنانا کسی طرح قرینِ انصاف یا قرینِ عقل و دانش نہیں۔

حامد علی خاں

حلقۂ جنوں

جسے دیکھوں، اُسے اپنی طرح دیوانہ کرتا ہوں
خرد کا نام سُن کر ہاتھ مَیں کانوں پہ دھرتا ہوں

جنوں پنہاں جنوں ظاہر جنوں اوّل جنوں آخر
اِسی اِک حرف سے پیدا میں سو افسانہ کرتا ہوں

ہلاتی ہے زمین و آسماں کو خود سری میری
گراں، خود فطرتِ خلّاق کے دِل پر گزرتا ہوں

نہ پروا ہے سفینوں کی، نہ منّت ناخداؤں کی
نہنگ آسا ہر اِک طوفاں کی موجوں میں اُترتا ہوں

مرا نقش اَے اجل! کیا لوحِ ہستی سی مٹاتی ہے
کہیں ہر بار روحِ "کُن فکاں" بن کر اُبھرتا ہوں

عدم کا کلبۂ تاریک بھی مجھ سے فروزاں ہے
فنا کے ہاتھ سے شمعِ بقا کا گُل کترتا ہوں

بنایا تُو نے یارب ایک کُن سے پیکرِ خاکی
میں اس خاکے میں لیکن جانے کیا کیا رنگ بھرتا ہوں

نگار آرائے فطرت ہے مری خاکِ پریشاں بھی
رُخِ ہستی پہ بن کر غازہ، مَیں ہر سُو نکھرتا ہوں

سیہ روزی سی اور مجھ سی ہے شستہ زلف و عارض کا
کہ بگڑے جس قدر تقدیر، اُتنا ہی سنورتا ہوں

مجھے کیا ساقیانِ بزمِ عشرت کی ہوا داری؛
ابھی مَیں خونِ دِل سے پے بہ پے پیمانہ بھرتا ہوں

حامد علی خان

خواب اور واقعات

خواہشوں کا یقینات پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہمارے بہت سے یقینات جن سے ہمیں روزمرہ کی زندگی میں مدد ملتی ہے حقیقت میں خواہش کی مختلف شکلیں ہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ واقعہ سے ٹکرانے کی وجہ سے کہیں کہیں ان کا جھول دُور کر دیا گیا ہے۔ انسان اصل میں ایک خواب دیکھنے والی مخلوق ہے، وُہ کبھی کبھار دُنیائے خارجی کی مداخلت سے ذرا کی ذرا جاگ جاتا ہے لیکن بہت جلد پھر سے اُونگھنے لگتا ہے فرائڈ نے کہا ہے کہ رات کے خواب ہماری خواہشوں کی زندہ تکمیل ہیں اور ہم یہی بات بیداری کے خوابوں یعنی یقینات وغیرہ کے متعلق کہہ سکتے ہیں یوں ہمارے یقینات اصلاً غیر عقلی ہیں۔ اور اس بات کو ہم تین طریقوں پر ثابت کر سکتے ہیں۔ (۱) پہلا طریقہ تحلیل نفسی کا ہے اس میں مجنونوں اور ہسٹیریا کے مریضوں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور یہ واضح کیا جاتا ہے کہ ان میں اور صحت مند انسانوں میں فی الاصل اختلاف کس قدر کم ہے۔ (۲) دُوسرا طریقہ فلسفہ تشکیک کا ہے، اس میں ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے یقینات کی عقلی شہادتیں کس قدر کمزور اور کس قدر بودی ہیں۔ (۳) تیسرا اور آخری طریقہ عام انسانی مشاہدہ کا ہے اور میں یہاں اسی آخری طریقہ کو اختیار کرتا ہوں۔

غیر متمدن انسان ہر چند بیشتر مظاہر کو سمجھتا نہیں ہے سمجھ سکتا نہیں ہے تاہم ان کے متعلق یقینات رکھتا ضرور ہے اور اس کے یہ یقینات اتنے محکم، اتنے قوی ہوتے ہیں کہ اس کے جُملہ اہم افعال انہی کے زیرِ اثر صادر ہوتے ہیں۔ وُہ یہ باور کرتا ہے کہ اگر سپاہی یا شیر کا گوشت کھا لیا جائے تو جوانمردی اور شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر سردار کا نام زبان پر لایا جائے تو مَوت فوراً واقع ہوتی ہے (اپنے اس آخری یقین کے تحت وُہ ان تمام الفاظ کو بدل دیتا ہے جن میں اس کے سردار کا نام ایک جزو کی حیثیت سے واقع ہوتا ہے) پھر جب وہ شکار اور ماہی گیری سے گزر کر کاشتکاری کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور غذا کی فراہمی میں موسم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے تو وُہ یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ منتروں کے جپنے سے یا ٹونے ٹوٹکوں سے بارش ہوتی ہے اور آگ جلانے سے سُورج چمکتا ہے۔ مزید بریں وُہ یہ بھی مانتا ہے کہ جب کسی کو مار ڈالا جاتا ہے تو اس کا خون یا بھُوت انتقام کے لئے قاتل کا پیچھا کرتا ہے لیکن اس بھُوت کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اگر قاتل اپنے میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر لے مثلاً اپنے مُنہ کو سُرخ رنگ لے یا ماتمی لباس پہن لے[1]۔ اس یقین کا پہلا جزو واضح طور پر ان اشخاص کی دماغی پیداوار ہے جو قتل سے ڈرتے ہیں اور دوسرا جزو ان کی جنہوں نے قتل کیا۔

لیکن غیر عقلی یقینات صرف غیر متمدن انسانوں سے مخصوص نہیں، نوع انسان کی بڑی اکثریت ایسی مذہبی رائیں رکھتی ہے جو ہماری

---

[1] فریزر کی کتاب "عہد نامہ عتیق میں متداول روایات" اس خصوص میں لائق مطالعہ ہے۔

مذہبی رایوں سے قطعاً مختلف ہیں اور بنا بریں بے بنیاد ہیں۔ مدبّروں کے علاوہ جنہیں سیاسیات سے گہرا شغف ہوتا ہے وہ بیشتر مسائل کے متعلق جذباتی یقینیات رکھتے ہیں۔ اور ایسے یقینیات ایک غیر جانب دار شخص کی نظر میں یکسر غیر عقلی ہیں۔ کسی الیکشن میں رضا کارانہ حصّہ لینے والے ہمیشہ یہ باور کرتے اور کراتے ہیں کہ جیت انہی کو نصیب ہوگی حالانکہ دو میں سے ایک نہ ایک فریق کا آخر میں ہار جانا بالکل ضروری ہے، ۱۹۱۴ء کے نصفِ آخر میں پوری جرمن قوم یہ سمجھتی تھی کہ فتح ان کی ہے لیکن یہ خواب واقعہ کی مداخلت سے ٹوٹ گیا۔ پھر بھی کسی طرح اگر یہ ہو سکے کہ جملہ غیر جرمن مؤرخ آئندہ سو سال میں جنگِ عظیم کے متعلق کچھ نہ لکھیں تو خواب پھر سے شروع ہو جائے گا۔ ابتدائی فتوحات کی یاد تازہ ہوگی اور آخری حادثہ بھلا دیا جائے گا۔

شائستگی یا خوش خلقی عبارت ہے اس رویہ سے کہ ہم اپنے مخاطب کے ان یقینیات کا احترام کریں جو وہ اپنی ذات یا جماعت کے اوصاف کے متعلق اپنے قلب و دماغ میں رکھتا ہے۔ یوں ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ دل پسند یقینیات کا ایک جھنڈ ہر وقت متحرک رہتا ہے جیسے بعض جانوروں کے ساتھ ان کی مکھیاں لگی پھرتی ہیں ان یقینیات میں سے بعض شخصی ہوتے ہیں بعض خاندانی بعض جماعتی بعض قومی یا نسلی اور بعض نوعی یا جنسی۔ شخصی یقینیات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فرد کے ذاتی کردار سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً یہ بتلاتے ہیں کہ وہ کن محاسن اور اوصاف کا مالک ہے اس کے احباب اس سے کتنی محبّت رکھتے ہیں اور اس کے شناسا اس کی کس قدر عزت کرتے ہیں خاندانی یقینیات فرد کے خاندان سے نسبت رکھتے ہیں مثلاً یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا باپ کس قدر بلند شخصیت کا انسان تھا کتنا راست باز اور آن بان کا تھا اور اپنے بچّوں کی تربیت اس نے کیتنی جانفشانی سے کی۔ علیٰ ہٰذا یہ کہ اس کی اپنی اولاد کتنی ذہین، ہوشیار اور اطاعت شعار ہے حالانکہ دنیا جہان کے بچّے انتہائی غبی، کھلاڑی اور شوخ ہیں۔ جماعتی یقینیات فرد کی سوسائٹی سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً یہ واضح کرتے ہیں کہ اس کی سوسائٹی بمقابلہ اور اشخاص کی سوسائٹیوں کے کس قدر ذہین یا متین یا خلیق ہے۔ قومی یا نسلی یقینیات فرد کی قوم یا نسل سے علاقہ رکھتے ہیں، ہر شخص اپنی قوم کے بارے میں بہت سے خوش آئند خیالات رکھتا ہے، آخر میں نوعی یقینیات کا درجہ ہے جو پوری نوعِ انسان سے تعلق رکھتے ہیں وہ عام طور پر انسان کو موجوداتِ کائنات سے بلند و برتر ٹھہراتے ہیں مثلاً یہ کہتے ہیں کہ انسان حیوانِ ناطق ہے، خدا کا نائب یا مثنیٰ[1] ہے، مسجودِ ملائک اور مقصودِ خلایق ہے۔ حیوانات میں ذی روح صرف وہی ہے اور کائنات کی غایت الغایات اسی کی صلاح و فلاح ہے اور ہم انہی نوعی یقینیات کی وجہ سے ہر ظالمانہ یا غیر فطری حرکت کو حیوانی حرکت کہتے ہیں حالانکہ وہ واضح طور پر انسانی ہوتی ہے۔

اس طرح مرغوب یقینیات کا ایک مکمل نظام مرتب ہے اور اگر ہمیں کسی کے ساتھ اپنے خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے منظور ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس کے ان تمام یقینیات کا احترام کریں لہٰذا ہم کسی کے منہ پر وہ نہیں کہہ سکتے جو اس کی پیٹھ پیچھے کہہ سکتے ہیں یعنی یہ کہ شائستگی ایک ناگوار دو روئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھائیوں میں والدین کے متعلق اور دوستوں میں سوسائٹی کے متعلق شعوری شائستگی ضروری

---

[1] تکوین ۱ : ۲۷ (مترجم)

نہیں سمجھی جاتی۔

لیکن دُنیا ناشائستگی کو مذموم خیال کرتی ہے۔ حالانکہ اساطیر شکنی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی شے نہیں ہمارے جبلّی یقینیات کی درستی دو طرح ممکن ہے۔ (۱) یہ کہ معروضی واقعہ سے ربط پیدا کیا جائے مثلاً اگر ہمیں بام مچھلی پر سانپ کا شبہ ہو تو وُہ اس کے کھلنے پر دُور ہو جائے گا، یا اگر کسی کڑوی لکڑی کو ہم میٹھا سمجھتے ہیں تو اس کے چکھنے پر حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اور (۲) یہ کہ اپنے اور دوسرے انسانوں کے مخالف یقینیات کا موازنہ کیا جائے مثلاً اگر ایک جماعت گائے کے گوشت کو حلال اور سُور کے گوشت کو حرام جانتی ہے اور دوسری اس ترتیب کو بالکل اُلٹ دیتی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ اصل میں دونوں حرام نہیں۔ خاکساری شائستگی کی چھوٹی بہن ہے اور وُہ نام ہے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو مخاطب اور اس کے متعلقین سے کمتر سمجھنے یا ظاہر کرنے کا۔ آپ کے ملنے والوں میں سے اگر کوئی آپ کے "مزاج گرامی" کے متعلق دریافت کرے تو آپ یقیناً اسے "بندہ" اور "حضور" اور "دعا" کی اصطلاحوں میں جواب دیں گے یہی فرق متعلقین میں بھی پیدا ہو جاتا ہے مخاطب کا لڑکا ہمیشہ "صاحبزادہ" ہوتا ہے اور متکلم کا ہمیشہ "خادم زادہ"۔ لیکن یہ چیز شان اور اطمینان کی زندگی چاہتی ہے اور تجارت و سیاست کا موجُودہ تیز رَو زمانہ اس کے لئے قطعاً سازگار نہیں کیونکہ انسانی تعلقات بڑی سُرعت کے ساتھ وسیع ہوتے چلے ہیں اور یہ چیز اساطیر کے حق میں از بس مہلک ہے شخصی خوابوں کو بھائی بند توڑ دیتے ہیں خاندانی خوابوں کو مدرسہ کے ساتھی جماعتی خوابوں کو سیاسی توڑ جوڑ اور قومی خوابوں کو جنگ اور تجارت۔ انسانی خوابوں کو البتہ کوئی شے نہیں توڑ سکتی کیونکہ ہم انسانیت کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یوں نوعی اساطیر کو بننے، بڑھنے اور پھیلنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ تاہم اس قسم کے مغالطوں کی جزئی تصحیح سائنس سے ممکن ہے لیکن یہ تصحیح بہر حال جزئی ہے نہ کم نہ زیادہ۔ اور ہمیں اس کے بارے میں مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہئے کیونکہ سائنس خود یقین محدود ہے اور بغیر کسی اعتقاد کے ممکن نہیں۔

فلکیات کہتی ہے کہ کائنات بے حد و بے انتہا وسیع ہے ماؤنٹ وِلسن سے لے کر رصد گاہ نظامیہ تک کی دُوربینیں جو کچھ ہمیں بتلاتی ہیں وہ ایک بڑی حقیقت[1] کا ایک حقیر جزو ہے۔ پھر یہ حقیر جزو خود اس قدر بے پایاں ہے کہ ہمارا تخیل اس کے احاطہ سے عاجز ہے مرئی کائنات میں

---

[1] قطعی طور پر تو ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ "بڑی حقیقت" ہے آخر کتنی بڑی تاہم چند تخمینے یہاں ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ ماؤنٹ ولسن کی دُوربین بحالات موجودہ دُنیا کی سب سے بڑی دُوربین ہے اس سے اکابر راصدین نے تقریباً ۲۰ لاکھ سُدام (Nebulae) کا مشاہدہ کیا ہے اور خیال ہے کہ پوری فضا ان سے ایک ارب گُنا زیادہ سُدام کو محیط ہے اب یہ جاننا چاہئے کہ ہر مرغولہ دار سدیم میں ہمارے سُورج جیسے کم و بیش ایک ارب ستارے ہیں یوں اگر آپ پہلے ۲۰ لاکھ کو ایک ارب سے ضرب دیں اور پھر حاصل ضرب کو ایک ارب سے اور ضرب دیں تو حاصل جو کچھ ہو گا وُہ پوری کائنات کے ستاروں کا ایک خام اندازہ ہو گا ان اعداد و شمار کو قریب الفہم بنانے کے لئے سر جیمز جینز نے اپنی مشہور تصنیف "پُر اسرار کائنات" میں ایک اچھی تشبیہ استعمال کی ہے وہ کہتے ہیں کہ دُنیا بھر کے سمندروں اور دریاؤں کے کنارے جتنی ریت ہے اتنے ستارے کائنات میں ہیں اور ہمارا سُورج انہی میں کا ایک ذرہ ہے اب یہ بتلانے کی تو غالباً کوئی ضرورت نہیں کہ (دیکھو حاشیہ صفحہ آئندہ

کہکشاں کی حیثیت ایک بغایت ننھے سے ریزہ کی ہے اور ہمارا نظام شمسی اس ننھے سے ریزہ کے اندر ایک لاانتہا چھوٹا سا ذرّہ ہے۔ اب نظامِ شمسی کے مقابلہ میں ہمارے سیارہ کی چونکہ خاص وقعت یا اہمیت نہیں لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک لاانتہا چھوٹے سے ذرّہ کا ایک خوردبینی نقطہ ہے۔ اس خردبینی نقطہ کے اُوپر ہلواں کاربن اور پانی کی ننھی ننھی سی گانٹھیں جو پیچیدہ ساخت اور کسی قدر غیر معمولی طبیعی اور کیمیائی خواص اپنے میں رکھتی ہیں، چند سال تک اِدھر اُدھر رینگتی پھرتی ہیں۔ اور پھر ان عناصر میں تحلیل ہو جاتی ہیں جن سے وُہ مرکب ہیں۔ جتنے عرصہ تک یہ گانٹھیں زندہ رہتی ہیں مسلسل اس کوشش میں لگی رہتی ہیں کہ خود توفساد اور تحلیل سے زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں لیکن اپنی ہی نوع کے اور افراد کے لئے ان کی رفتار تیز تر کر دیں۔ طبیعی حوادث اور امراض سے جو اموات ہوتی ہیں ان پر دلی افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن جب انسان خود اس قسم کی تباہیاں اپنی نوع پر نازل کرتا ہے تو بہت خوش ہوتا ہے اور مقدس عمارتوں میں جا کر خدا کے شکریے ادا کرتا ہے۔ نظامِ شمسی کی زندگی کے مقابلہ میں انسان کی زندگی کا طبیعی امتداد ہر چند نہایت مختصر اور قلیل ہے لیکن توقع ہے کہ اس کی شمع حیات اس سے بہت پہلے گل ہو جائے گی کیونکہ وہ اس پر مستقل رفتار سے پھونکیں مارے جا رہا ہے۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ زندگی کا یہ خارجی زاویۂ نظر انتہائی خطرناک ہے کیونکہ وُہ ہم سے ہماری فطری توانائی سلب کر لیتا ہے اور بقائے انسانی کا انحصار تمام تر اسی پر ہے لہٰذا ہمارے غمخوار ہم سے براہِ ہمدردی یہ فرماتے ہیں کہ اگر ہمیں اس خوفناک انجام سے بچنا منظور ہے تو ضرور ہے کہ ہم اپنی آنکھیں حقیقت کی طرف سے بند کر لیں اور دو خوابوں کے دامن میں پناہ لیں -(۱) مذہب، اور (۲) فلسفہ۔ وجہ یہ کہ یہ دُنیا جو حقیقت کی تیز روشنی میں از بس مکروہ، غیر اہم اور متناقض معلوم ہوتی ہے ان خوابوں میں نہایت حسین، پُر معنی اور متوافق بن جاتی ہے، پھر ابتدائی سدیم کا ارتقا بھی انسان پر منتہی ٹھہرتا ہے، مطلب یہ کہ انسان کوئی ذلیل یا ردّی مخلوق نہیں۔ بلکہ بر سبب ارتقا کی معراج ہونے کے یدِ فطرت کا نقطۂ ارتکاز ہے یعنی اشرف المخلوقات لیکن یہ ایک جھوٹا نسلی غرور ہے۔ ہیملٹ شیکسپیر کا ایک نہایت مشہور ڈراما ہے اور اس سے آپ کو ناآشنا سمجھنے کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں تاہم مجھے یقین ہے کہ "پہلے ملاح" کا پارٹ شاید ہی آپ کے ذہن میں ہو کیونکہ وہ مشتمل صرف چند الفاظ پر ہے "خدا آپ کو سمجھے جناب!" اب انسانوں کی ایک جماعت اگر زندگی بھر یہی پارٹ ادا کرتی رہے تو کیا وُہ ادبی تنقید کے ایسے اسالیب ایجاد نہیں کرلے گی جن کی رو سے گنتی کے یہی چند الفاظ پورے ڈرامے کی جان ہوں گے؟ کیا وُہ اپنے میں سے ہر اس شخص کو جو یہ کہے کہ ممکن ہے دُوسرے کردار بھی مساوی طور پر اہم ہوں سخت سے سخت سزا نہیں دے گی؟ یقیناً! اور ٹھیک یہی حالت ہماری

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) سُورج ہماری زمین سے دس لاکھ گُنا بڑا ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ اتنے ستارے گنجان طور پر آباد ہیں برعکس اس کے قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ فضا کے بڑے بڑے رقبے قریب قریب خالی پڑے ہیں اسی لئے قیاس کیا گیا ہے کہ روشنی جو فی ثانیہ (سکنڈ) ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار سے چلتی ہے اور کرۂ ارض کا احاطہ ایک ثانیہ کے ساتویں حصّہ میں کرتی ہے فضا کی پوری وسعتوں کو ایک کھرب یعنی ایک لاکھ ملین سال میں طے کرے گی۔

"مترجم"

ہے، کائنات کے ذرّے میں ہمارا پارٹ "پہلے ملاح" کے پارٹ سے کہیں کم ہے لیکن چونکہ ہم ڈرامے کے اختتام تک زندہ نہیں رہ سکتے لہٰذا اس کے کرداروں یا پلاٹ کے متعلق بہت کم علم رکھتے ہیں۔

جب کبھی ہم نوعِ انسان کے متعلق غور کرتے ہیں تو پہلے اپنے آپ کو اس کا نمائندہ مقرر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری رائے اس کے متعلق کتنی عمدہ نہ ہو گی۔ چنانچہ ہم اس کی بقار کے بدل وجان متمنّی ہوتے ہیں۔ عبدالوہاب ایک غیر مقلّد پنساری ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ وُہ چونکہ صراطِ مستقیم پر گرٹ چلا جا رہا ہے لہٰذا مرنے کے بعد بے پُوچھے جنّت میں جائے گا جہاں حور و غلمان کوثر و تسنیم اس کے منتظر ہیں۔ لیکن اپنے مقلّد حریف غلام احمد کے متعلق جو عموماً گھی میں تیل ملا دیا کرتا ہے، کم تولتا ہے، حیات النبیؐ کا قایل ہے اور کبھی نماز نہیں پڑھتا اس کی رائے ہے کہ وُہ ایک منٹ زندہ رہنے کے قابل نہیں لیکن چونکہ وُہ ہے اور یہ کائنات کی اچھائی کی دلیل ہے لہٰذا ایک دوزخ اس نے اس کے لئے تراشا جس میں آتشیں اژدہے، زقوم، اور اسی قسم کی دیگر نادر و نایاب چیزیں مہیا ہیں۔ غلام احمد سے پوچھئے تو وُہ اس نظام میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں پیدا کرتا سوائے اپنی جگہ عبدالوہاب کو دینے اور اس کی جگہ خود لینے کے۔ یوں عمومی مسرّت بھی منتج ہوتی ہے۔ انسان کی کائناتی اہمیت بھی برقرار رہتی ہے اور اس کی درندگی بھی جاری رہتی ہے۔

کوپرنیکس سے پہلے کائنات واضح طور پر انسی مرکزی (Anthropo-Centric) تھی، افلاک زمین کے گرد حرکت کرتے تھے اور زمین پر انسان کی حکومت تھی لیکن جب زمین خود سیارہ بن گئی تو انسان بھی اپنے رتبۂ بلند سے معزول ہوا لہٰذا ضرورت لاحق ہوئی ایک ایسی مابعد الطبیعیات کی جو سائنس کے نقصانات کا ازالہ کرے اس بارِ امانت کو تصوریئین نے اُٹھایا جو کہتے ہیں کہ مادّہ نمودِ بے بود ہے اور حقیقتِ عظمیٰ ذہن یا رُوح ہے، یوں فرد اور کائنات جب متحد الاصل قرار پائے تو ہیگل نے یہ کہا کہ کائنات اس کے زمانہ کی پُروشیائی مملکت کے نمونہ پر ہے اور بریڈلے وغیرہ نے یہ کہ وہ دو الیوانی سرمایہ دارعمومیت کے مماثل ہے، ان نظریوں کی تائید میں یہ لوگ جو دلائل پیش کرتے ہیں وُہ اتنے پُرفریب ہیں کہ نظر عموماً تہ کی انسانی خواہشوں تک نفوذ نہیں کر سکتی تاہم مبصّر نگاہیں ان مغالطوں پر سے جو ان دلیلوں میں مضمر ہیں اصل حقیقت کو جان جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کوئی توجیہہ پیش کرتا ہے تو اپنی موافقت میں زیادہ غلطیاں کرتا ہے اور یہی غلطیاں اس کی شخصیت کے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کیونکہ ان سے ان کی خواہشوں کا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اور فلسفہ اگر غلط بھی ہوں تو ان سے فائدہ ہی ہے نقصان تو نہیں لہٰذا کیوں نہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے لیکن گزارش ہے کہ ان سے فائدہ ہی کیا ہے جو تسکین وہ ہمیں جہدِ زندگی میں عطا کرتے ہیں کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ ہم اس کی کیا قیمت ادا کرتے ہیں، یہ فلاکت، یہ مصیبت، یہ نکبت جو نوعِ انسان پر طاری ہے لا علاج نہیں لیکن مذہب اور فلسفہ دونوں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں انہیں مطیعانہ انگیز کرنا چاہیئے کیونکہ شر بے حقیقت ہے اور عدمِ مقاومت کی یہ غلامانہ ذہنیت ہی ان کا سب سے بڑا کھوٹ ہے۔ زندگی کی مصیبتیں کچھ تو طبیعی اسباب کا نتیجہ ہیں اور کچھ انسانوں کی باہمی عداوت کا۔ گذشتہ زمانہ میں جنگیں اور مسابقتیں ناگزیر

اس لئے معین کہ انسان کو فطرت پر قابو نہ تھا اور غذا کی فراہمی ضروری تھی۔ لیکن آج حالت اور ہے، سائنس نے ہمیں تو لئے فطرت پر غلبہ عطا کرنا شروع کیا ہے اور اگر جملہ انسان باہمی تسخیر کے جنون سے باز آکر بالکل فطرت کی تسخیر کے در پے ہو جائیں تو یہ دُنیا جو زندوں کا دوزخ بنی ہوئی ہے واقعی بہشتِ بریں ہو جائے۔ یاد رکھئے کہ انسان کا حقیقی مجد و شرف صرف اس میں ہے کہ وُہ اپنی تمام توانائیوں کو سائنٹیفک قوت کے حصول کے لئے وقف کر دے ورنہ فطرت کی مدد سے ہم جنسوں کے خون سے ہولی کھیلنا تو اسے پھر وہیں پہنچا دے گا جہاں سے وُہ اُبھرا ہے ——— نری حیوانیت!

اس کے ماسوا جو مسرت کہ بے بنیاد یقینیات سے حاصل ہو وہ نہ زیادہ شریفانہ ہے اور نہ زیادہ شاندار۔ دُنیا میں ہماری جو حیثیت ہے وہ ہمارے غلط یقینیات سے بدلتی نہیں ایک شخص اگر خود کو قیصرِ ہند باور کرے تو اس سے اس کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے لہٰذا اپنی اصلیت کے بے جھجک ادراک و اظہار میں کوئی ذلت نہیں برعکس اس کے اس میں ایک بے پایاں عظمت ایک قوی مسرت ہے۔ ایک ایسی عظمت اور مسرت جو جھوٹے شیخی بازوں کو میسّر نہیں اور پھر وہ شخص جو اپنی چھٹائی کو چھپاتا ہے خوف کے پنجۂ آہنیں سے آزاد نہیں اور خوف انسان کو ذلیل اور ظالم بنا دیتا ہے۔

(ترجمہ) ——— **مرزا محبوب بیگ**

اگر ہر آدمی ایک اَور آدمی کی اصلاح کرے

اگر ہر آدمی ایک اَور آدمی کی اصلاح کرے
تو تمام بنی آدم کی اصلاح ہو جائے۔

بقائے حق

"ذکر و فکر" کا ایک ورق

تو حق پرست اگر ہے تو کیا خطر ہے تجھے
بغیر حق کے ہر اک چیز نقش فانی ہے

ہے ایک خواب پریشاں زمانِ رنج و الم
اور ایک خواب دلِ افروز شادمانی ہے

نہیں ثبات کسی شے کو دارِ فانی میں،
گریز پا ہے بہار اور خزاں بھی فانی ہے

ہے ایک لمحے کا آزار آرزو کی شکست
برنگ موجِ صبا لطف کامرانی ہے

حیات و موت پہ بھی کوئی اختیار نہیں
اک اتفاقی ہے اور ایک ناگہانی ہے

یہ زندگی کہ ہے مجموعۂ نشاط و الم
قرار اسے بھی نہیں، یہ بھی آنی جانی ہے

مگر جو روح رہے حق سے ہمکنار اثر
وہ سر بلند ہے، زندہ ہے، جاودانی ہے

اثر صہبائی

وہ دونوں

اٹھارہ سال کی ملازمت ہوئی تھی، اولاد نہ ہونے کے سبب دونوں میاں بیوی بڑے ملول رہتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ سادھو، فقیر، جوگی اور طبیب، عامل اور مُلّا جب کبھی انہیں یقین دلا دیتے کہ ان کے عمل یا ٹوٹکے یا دوا سے یقیناً اولاد ہو گی تو اُمید کی دبی سی شعاع ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی دُھندلی چمک پیدا کر دیتی تھی، مگر جب کوئی اثر نہ ہوتا تو گہرے اور ٹھنڈے سانس ہی ان کی رفاقت کرتے تھے۔

پولیس کے سب انسپکٹر کا کوارٹر ہوتا ہی کتنا بڑا ہے، تاہم رات کے سناٹے میں اور دن کی دوپہر میں وہ گویا انہیں ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا، مکان کی حیثیت سے زیادہ فرنیچر تھا، اور سب انسپکٹر سلیم نے اس کی فراہمی میں بڑی جدوجہد کی تھی، چنانچہ جس پولیس تھانے میں وہ تعینات رہے، لکڑی کے ٹھیکیداروں اور فرنیچر سازوں سے ان کے روابط بہت گہرے ہی رہے، اور اسی لئے دو کے بجائے چار صوفے، چھ کی جگہ دس کرسیاں، بہترین ساخت کے پلنگ، شیشے دار الماریاں، عمدہ قسم اور جدید وضع کی متعدد میزیں، کتابیں رکھنے کے شلف موجود تھے۔ جنہیں ان کی بیگم صفیہ جہان نے اپنی خوش سلیقگی کی بدولت نہایت اچھی حالت میں رکھا تھا۔ ان کے مقابلے میں اگر تمام ملک کے سب انسپکٹروں کے کوارٹروں کا مشاہدہ کیا جاتا، تو بالیقین کسی دُوسرے سب انسپکٹر کا کوارٹر بہمہ وجوہ اس شان کا نہ قرار دیا جاتا۔ قرینہ اور نفاست صفیہ جہان پر ختم تھے، ان کے پاس ہارمونیم بھی تھا جسے صفیہ جہان نہایت عمدگی سے بجا لیتی تھیں، اور ان کا ترنم بدرجۂ غایت پُرسوز، پُرکیف، اور پُراثر ہوتا تھا۔ صفیہ نے گانا کسی سے نہیں سیکھا تھا، بلکہ وُہ جو گراموفون ان کے پاس تھا اور اس کے جو چار پانچ پسندیدہ ریکارڈ ماہ بماہ خریدے جاتے تھے، انہیں بار بار بجا کر صفیہ ان کی موسیقی اور گانے کی اصل کے مطابق نقل کر لیتی تھی۔

کوارٹر کے علاوہ جسمانی آرائش کا بھی ان دونوں کو بڑا شوق تھا۔ سنگھار میز کے قریب پہنچ کر نہ جانے کیوں ان دونوں کے مُنہ پر الگ الگ ہوائیاں اُڑنے لگتی تھیں، لیکن وہ بالوں کو یورپ کے اعلےٰ سے اعلےٰ تیلوں سے تر کر کے برش اور کنگھا ضرور کرتے تھے۔ کریم، اسنو اور غازہ ضرور استعمال ہوتا تھا۔ خضاب چونکہ نزلہ پیدا کرتا ہے لہٰذا اس سے دونوں پرہیز کرتے تھے۔ البتہ جب کبھی سیاہ بالوں میں کہیں وہ نقرئی تار جو زمانہ اپنی کہنگی کی یادگار کے طور پر عطا کرتا ہے انہیں نظر آ جاتے تو وہ خاصی کوشش سے انہیں اُکھاڑ لیتے اور بار بار دیکھتے، منٹوں ہاتھ میں لئے رہتے، مگر ایک دُوسرے کو نہ بتاتے، اور نہ کسی اَور کو بتاتے تھے، البتہ جس طرح خار کی چُبھن سی محسوس ہوتی رہتی ہے، ان نقرئی تاروں کا نمایاں ہونا انہیں بہت متأثر کرتا تھا۔

تمام دُنیا جانتی تھی کہ ان کی زندگی بڑی مطمئن ہے، نہ ان کے ساتھ لڑکے بالوں کا جنجال ہے، نہ کسی بچے کے بلکنے کی دردانگیز صدائیں ان کے گھر سے آتی تھیں، نہ کسی بچے کے پالنے پوسنے، پہنانے اُڑھانے، پڑھانے لکھانے کی دردِ سری اور ذمّہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ وہ دو نفر ہیں۔ تنخواہ معقول ہے، نہ انہیں کوئی اندیشہ ہے نہ غم ہے۔ وُہ بھی اپنا دل سمجھانے کے لئے یہی کہتے تھے کہ ہمیں کوئی غم اور کوئی فکر نہیں ہے۔ مگر اُن کا دل سمجھتا تھا یا نہیں، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔

ہر سال جب دو ماہ کی رُخصت لے کر وُہ دونوں وطن جاتے تو صدہا قسم کی سوغاتیں لے جاتے تھے کیونکہ اپنے اپنے عزیز و اقارب کو تحفتہً کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ اس وقت البتہ صفیہ جہاں کی صُورت پر تاریکی چھا جاتی تھی، کیونکہ وہ دیکھتی اس کی سہیلی فرحت کے چار لڑکے ہیں۔ اس کے سامنے کی لڑکیاں جوان ہو کر بیاہی گئی ہیں، اور ان کی گود میں بچے کھیل رہے ہیں۔ ان بچوں کو پیار کرتے وقت اس کا کلیجہ بھر آنے لگتا تھا۔ دِل تڑپتا تھا، اور آنکھیں بند کر کے اکثر وُہ عالمِ تصوّر میں کھو جاتی تھی۔ اسے یہی خواب نظر آتے تھے کہ اس کی گود میں بڑی بڑی چمکدار آنکھوں والا خوبصورت بچہ ہے، یا اس کے پہلو میں سنہری بالوں والی حسین لڑکی سو رہی ہے۔ مگر جب اُٹھ کر دیکھتی تو وہاں کوئی نہ سویا ہوتا۔ وُہ دائیوں کو اپنا پیٹ بہت دکھایا کرتی تھی۔ مگر جب لیڈی ڈاکٹر مس فیلن نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ اب تمہیں اولاد ہونے کی آس نہ رکھنی چاہئے، تو اس دن وہ ہمیشہ سے زیادہ اُداس ہوئی۔ اور کسی طرح اس کا جی نہ بہلا، وہی زمانہ تھا جب اس کے شوہر کی ملازمت کے اٹھارہ سال رو بہ اختتام تھے۔

اگر سلیم کی بجائے کوئی دوسرا سب انسپکٹر ہوتا جسے اولاد کی آرزو بھی ہوتی تو وہ فی الفور دوسری شادی کر لیتا، اور احباب و اقارب کے مشورے کو نہ ٹھکراتا۔ لیکن سلیم نے ہمیشہ صفیہ کے نازک دِل کا پاس کیا، اسے صفیہ سے بہت اُنس تھا، اور وُہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل کو صدمہ پہنچائے۔ خود صفیہ نے اکثر تذکرۃً سلیم کو ترغیب دی تھی کہ اولاد کی خاطر ایک شادی اَور کر لے۔ مگر سلیم نے اسے مذاق پر محمول کیا اور اگر سنجیدگی کی روشنی میں دیکھا بھی تو انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ "صفیہ! میں اولاد نہیں چاہتا۔ میں تو بس تمہیں چاہتا ہوں"۔ سلیم کے یہ فقرے نہ جانے کونسے اثر میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے جو صفیہ کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ وہ سنتے ہی اپنا سر اس کی آغوش میں دے دیتی اور سسکیاں بھرنے لگتی تھی۔

جس دن سے مس فیلن نے اپنا طبّی فیصلہ صادر کیا ہے، صفیہ کی اور خود سلیم کی طبیعت میں زبردست انقلاب پیدا ہو گیا ہے گو اپنے فرائضِ منصبی میں وہ کوتاہی نہیں کرتا، لیکن ایک خاص جذبۂ رحم اور انسانیت اس کی ہر کارروائی میں شامل رہنے لگی ہے۔ جن سزایابوں کی جانچ کے لئے وہ دَورے پر جاتا تھا، جنہیں سخت سست کہتا تھا، سخت سلوک روا رکھتا تھا، انہیں اب کچھ نہیں کہتا۔ قلب ماہیت کی انتہا ہو گئی تھی چنانچہ چوراُمن کی اندھی ماں کے ہاں سے کسی نے دس سیر اناج جو چکی پیس کر اس نے جمع کر رکھا تھا چوری کر لیا تھا۔ اس کی رپورٹ درج کرنے کے بعد دس سیر اناج کی قیمت سلیم نے اپنی جیب سے ادا کر دی۔

اُمید النقب زن کی بیوی کو بلا کر پوچھا کہ آخر کیوں تیرا شوہر دس مرتبہ سزا پانے کے باوجود نقب زنی سے تائب نہیں ہوتا؟ اور جب اس نے بتایا کہ سرکار! چھ لڑکے لڑکیاں ہیں، گزر نہیں ہوتا۔ نقب نہ لگائے تو کیا کرے" سلیم نے اسی وقت اپنی تنخواہ سے پانچ روپے ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور اُمیدا کو بلا کر عہد لے لیا کہ اب نقب زنی نہیں کرے گا۔ پولیس لائن کے ہر سپاہی اور ہیڈ کانسٹبل کے گھر جا کر خود سلیم ان کی تکالیف کی نسبت استفسار کیا کرتا اور ہفتے کے بازار کے دن کسی کے ہاں سبزی، کسی کے ہاں گڑ، کسی کے ہاں اناج بھجوا دیتا۔ کیونکہ قلیل تنخواہیں ہونے کے باعث ان بیچاروں کو اکثر چیزیں بہم نہیں پہنچتی تھیں، اور اسی لئے وہ دیہات میں جا کر رعایا کو تنگ کرتے تھے۔

جس سلیم نے ہزاروں جرم کرنے والوں کو ذرا ذرا سی خلاف ورزیٔ قانون کے عوض مجسٹریٹ کی روبکاری میں پیش کئے بغیر دم نہ لیا تھا وُہی سلیم اب اتنا بدل چکا تھا کہ عزت داروں کی عزت کا پاس رکھنے لگا اور حتی المقدور ان کے خفیف جرائم کو روزنامچے تک میں درج کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ قتل کے مقدمات میں اب اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ پیارے نائی کے قتل میں جتنے آدمی ماخوذ تھے، انہیں محض شک کا فائدہ بہم پہنچانے کے لئے سلیم نے جھوٹی شہادت نہیں بنائی اور سشن جج نے تمام ملزموں کو بری کر دیا۔

صفیہ جہاں کی حالت بھی بدل گئی تھی۔ اسے غریبوں کے بچوں سے بڑی محبت تھی، بالخصوص خوبصورت بچے اسے بہت بھاتے تھے چنانچہ مٹھائی، کھلونے، اور خوبصورت اور دلفریب کپڑوں کے تھان اس کے پاس ہمیشہ موجود رہتے تھے، وہ بچوں کو کھلونے مٹھائیاں تقسیم کرتی رہتی، اور انہیں کپڑے بنوا دیتی تھی۔

اکثر غریب عورتیں اس کے پاس اپنے بچوں کو گود میں لئے ہوئے آتیں تو صفیہ کو ان کے مَیلے پھٹے چیتھڑوں سے کوئی گھن نہیں آتی تھی۔ وُہ خود صابون سے بچے کا مُنہ دُھلاتی، ناک صاف کرتی، تیل لگاتی، کنگھی کرتی، اور نئے فراک اور نئی شلواریں پہنا کر انہیں گود میں لئے پھرتی اور خوش ہوتی تھی۔

صفیہ نے اپنے دالان میں رسی کا ایک جھولا بھی ڈال لیا تھا، جس میں کسی ننھے بچے کو لے کر بیٹھتی اور "سوجا بھیا بالے بیر۔ تیری بلائیں لوں جمنا کے تیر" ایسی پُرسوز لے سے گاتی کہ سُننے والوں سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ مٹھن حلوائی کی عورت اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تھانیدارن صاحبہ میرے بچے کو گود میں لے کر جھولا جھلاتی ہوئی یہ لوری سُناتی ہیں تو بھگوان کی قسم میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

منڈوا اور جبل پور کے درمیان جو بیجا ڈانڈی پولیس اسٹیشن ہاؤس ہے وہاں آج کل انسپکٹر سلیم تعینات ہیں۔ دو مرتبہ حلقہ انسپکٹری کا موقع دیا گیا لیکن سلیم نے اپنی بیوی کے مشورے سے افسران بالا کو لکھ دیا کہ وُہ حلقہ انسپکٹر بننے کا تمنائی نہیں ہے۔ اسے انسپکٹر ہی رہنا منظور ہے بیس سال ہو چکے ہیں اور پانچ سال ملازمت کر کے وہ پنشن لے لے گا۔ اور پنشن بھی بیجا ڈانڈی ہی سے لے گا۔ اسی لئے یہاں سے وہ اپنا تبادلہ بھی نہیں چاہتا۔ ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔ البتہ موٹر لاریاں چلتی ہیں۔ بسیں آتی ہیں اور اتنی ہی جاتی ہیں۔ بیجا ڈانڈی ان سب کے

دم لینے کی جگہ ہے۔

برسات کے دن تھے، مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی، بائیس گھنٹے گزر چکے تھے لیکن پانی نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ گاؤں کے کنارے جو بائی ندی بہتی ہے، اس کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ تھانے سے چند فرلانگ آگے اسی ندی پر متوسط درجے کا پُل بنا ہُوا تھا۔ طغیانی کے باعث وُہ پُل غرقاب تھا، اور اس پر تقریباً دس فُٹ پانی بہہ رہا تھا۔ تھانہ اور سب انسپکٹر کا کوارٹر اور پولیس لائن ٹیکری پر واقع ہیں۔ صفیہ جہاں اپنے کوارٹر میں سے بیٹھ کر دُور تک کا نظارہ کر سکتی تھی۔ پہلی موٹر لاری جو جبل پور جانے والی تھی، بیجاڈانڈی میں ذرا ٹھہر کر جب آگے بڑھی تو پُل تہِ آب دیکھا اس لئے واپس لَوٹ کر تھانے کے سامنے کھڑا ہونا پڑا۔ پہاڑی ندی کے خیال سے لاری والوں کا اندازہ تھا کہ بائی ایک دو گھنٹے میں اُتر جائے گی۔ اسی لئے وہ منتظر رہے۔

شام ہوتے ہوتے بائیس لاریاں آکر رُک گئیں۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، مسافر ٹھٹھر رہے تھے، اندھیرا ہوتا آرہا تھا، صفیہ جہاں اپنے کوارٹر میں سے سڑک کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ سلیم کو بُلا بھیجا۔ پھر دونوں کے مشورے سے پولیس کا سپاہی تمام لاری والوں کو بُلانے کے لئے گیا۔ کُل چار سَو سواریاں تھیں۔ ان میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، مرد بھی تھے، بچے بھی تھے، تھوڑی دیر میں تمام پولیس تھانہ، اور جب وہاں جگہ نہ رہی تو اسکول مسافروں سے بھر گیا۔ موٹروں کے ڈرائیور، کلینر اور کنڈکٹر تک صفیہ جہاں اور انسپکٹر سلیم کے مہمان بنے، دو بوری چاول، ایک بوری گیہوں کا آٹا، ایک ٹین گھی، بکرے، دالیں اور دیگر لوازم دو گھنٹے میں تمام مسافروں کے لئے مہیا کر دیئے گئے۔ مسلمان مسافر خود سلیم اور صفیہ جہاں کے زیرِ اہتمام مہمانی کر رہے تھے۔ تمام نقاب پوش خواتین صفیہ جہاں کے کوارٹر میں تھیں۔ دُودھ، چائے سے بھی تواضع کی گئی، اور اس طرح چار سَو مسافر رات کی سردی اور بارش سے محفوظ رہے۔

عورتیں جس وقت صفیہ جہاں سے دوسرے دن جُدا ہو رہی تھیں تو ایسی اشکبار ہو رہی تھیں گویا وُہ ان کی بڑی عزیز و قریب ہو۔

دوسرے دن آٹھ بجے تمام لاریاں جبل پور روانہ ہو گئیں۔ ہر شخص کی زبان پر اپنے معزز میزبان انسپکٹر سلیم اور صفیہ جہاں کے لئے عقیدت اور خلوص سے بھرے ہوئے کلمات تھے۔

\+ + + + + + + + + + + + + + +

اس واقعے کے بعد سلیم کو جتنی مرتبہ جبل پور جانے کا اتفاق ہوتا رہا انہیں بڑی حیرت ہوتی، کیونکہ لوگ زبردستی آکر ملتے، معانقہ کرتے، خیریت پُوچھتے، جبرًا اپنے گھر لے جاتے، ہوٹل میں لے جاتے، پنواڑی کی دُکان پر لے جا کر پان کھِلاتے، اور سگریٹ پلاتے تھے، اگر سلیم ان سے کہتے کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا تو وہ لوگ معذرت کر کے کہتے تھے کہ ہم تو آپ کو پہچانتے ہیں۔ آپ نے فلاں فلاں وقت ہمیں بڑی مدد دی تھی آپ نے ہمیں آسرا دیا تھا، آپ نے ہمیں کھلایا پلایا تھا۔

\+ + + + + + + + + + + + + + +

گوربخش سنگھ حوالدار متذکرہ واقعے سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کے زیور فروخت کرکے آنے جانے والوں کے لئے بیجاڈانڈی میں بانس کی دیوار اور گھاس کے چھپر کا ایک مسافر خانہ بنوایا جو اب تک اس کی حوصلہ مندی اور خدمتِ خلق کے جذبات کی یاد دلا رہا ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن جانے کی بجائے وہ دونوں اسی جگہ آباد ہوگئے۔ ہرچند عزیزوں نے ترغیب دلائی کہ وہ پٹنہ میں آجائیں شہری زندگی بسر کریں، اپنوں میں رہیں، لیکن صفیہ جہاں کی مرضی کے خلاف سلیم کہاں جاسکتے تھے۔ ناگا پہاڑ کے دامن میں، بالٹی ندی کے کنارے چھوٹا گاؤں میں ان دونوں نے اپنا کچا گھر بنوایا، اور گونڈوں کے بیچ میں اپنی زندگی کے دن گزارنے لگے۔

اطراف کی تمام آبادیوں کے لئے وہ مایۂ صد ہزار پرستش تھے۔ کیونکہ ہومیوپیتھک دواؤں کا بڑا بکس ان کے پاس تھا۔ وہ دونوں ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی کہلاتے تھے۔ ڈاکٹر بوڑھے مریضوں کی ہانپی (دم کشی) کھانسی، امراضِ چشم کا علاج کرتے تھے اور ڈاکٹرنی عورتوں اور بچوں کو دوا دیتی تھیں۔ دو بیلوں کے مختصر چھکڑے میں بیٹھ کر وہ دونوں گاؤں گاؤں کا گشت لگاتے۔ کسی سے ایک حبہ نہ لیتے بلکہ اکثر اوقات اپنے پاس سے غربا کو کھانے پینے کے واسطے دام دیتے تھے۔ برسات کی اندھیری رات میں جب سارا عالم سائیں سائیں کررہا ہو کسی مصیبت زدہ کی خفیف آواز سنتے ہی وہ دونوں بسترِ استراحت کو خیرباد کہہ کر چھکڑا جت کر، دواؤں کا بکس اپنے ہمراہ لے کر فوراً روانہ ہوجاتے تھے۔

اس دُنیا میں اُن کے لئے بس ایک کام باقی رہ گیا تھا، اور وہ تھا غریبوں کی دستگیری۔ اور اسی کام، اسی مشن، اسی نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر وہ اپنے بڑھاپے کے ایام پورے کررہے تھے۔ ان کے اکثر رشتہ دار ملنے آئے، سہیلیاں آئیں، بھائی بند آئے اور وہ کسی کی تحریک سے متاثر نہ ہوئے۔ جب وہ دونوں اکیلے رہتے تو ضرور بحث کرتے تھے کہ تمام رشتہ داروں کی غایت سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ جب مرجائیں ان کا مال اسباب اپنے قبضے میں کرلیں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی جو وہ دونوں عزمِ صمیم کرچکے تھے کہ ہم دیس نہیں جائیں گے۔ برادری میں نہیں رہیں گے بلکہ اسی سرزمین میں دفن ہوں گے۔

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن جب کبھی تاریک اور بھیانک رات کے سناٹے میں صفیہ جہاں کو خوش آئند خواب نظر آجاتا کہ کوئی نہایت خوشرو بچہ اس کی گود میں کھیل رہا ہے، اور وہ چونک کر اُٹھ بیٹھتی، تو اس کی رُوح پلنگ پر اِدھر اُدھر کسی حسین، سنہری بالوں والے بچے کو ٹٹولنے لگتی تھی۔ اور لاریب اس وقت صفیہ کا معصوم دل، بچوں کا سا معصوم دل، کیسا تھوڑا تھوڑا ہوتا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شاید اس کی آنکھوں کا تجسس، رُوح کی فریاد، قلب کا حزن، اور ذہن کی مایوسی کا سچا تجربہ انہی بیچاریوں کو ہوگا جن کی گود اولاد کی نعمتِ عظمےٰ سے خالی ہوگی۔

حسن عزیز جاوید

غزل

بیمارِ شبِ غم کی اللہ رے! توانائی
اِک ہُوک اُٹھی دِل سے، اور عرش کو چھُو آئی

کچھ تجھ کو خبر بھی ہے او محوِ خود آرائی
آنکھیں ہی نہیں تنہا، دِل بھی ہے تماشائی

ہر چیز محبت میں بے تاب نظر آئی
تتلی بھی ہے آوارہ شبنم بھی ہے ہرجائی

جب اُٹھ نہ سکا اُس سے جورِ غمِ تنہائی
بُو پھُول کے سینہ سے گھبرا کے نکل آئی

ساقی کی نگاہوں کا انداز ارے توبہ!
مے جام میں لیتی ہے انگڑائی پہ انگڑائی

اس عشق و محبت کے دستور کو کیا کہئیے!
جینا بھی ہے رُسوائی، مرنا بھی ہے رُسوائی

ڈُوبی ہوئی نظریں کیوں اُبھری چلی آتی ہیں
اِک بھُولنے والے کو شاید مری یاد آئی

کیا ظلم ہے یہ دُنیا، قاتل اُسے کہتی ہے
جو موت کے پردے میں کرتا ہے مسیحائی

ماہر مجھے مطلب کیا احساسِ مسرت سے
آنے کو مرے لب پر سو بار ہنسی آئی

ماہر القادری

پردے

(لندن سے ایک خط)

حمید نے ٹیلیفون کیا۔ پلیڈیم (Palladium) میں ورائٹی شو (Variety Show) نہایت عمدہ ہے اور میں نے دو نشستیں ساڑھے سات شلنگ کی آج کی رات کے لئے محفوظ کرا لی ہیں۔ آٹھ بجے سے پہلے ریجنٹ پیلس ہوٹل میں میرے کمرے میں پہنچ جانا۔ وہاں سے اکٹھے شو پر چلیں گے۔ میں نے کہنے کو تو ہاں کہہ دی لیکن بعد میں کچھ متذبذب ہو گیا۔ لندن کے اوپیرا، بیلے (ballet) اور تھیٹر سے ڈیڑھ سال میں مجھے اتنا ہی اُنس پیدا ہوا ہے جتنا انگریزی طرز پر پکے ہوئے گوشت سے۔ بہرحال وعدہ کرنے کے بعد نبھانا ایک فرض سا ہو جاتا ہے ورنہ حمید جیسے مغرب پسند دوست فوراً آوازہ کس دیتے ہیں "آخر ہندوستانی ہی ہونا"۔

پٹنی سے پکیڈلی (Piccadilly) پہنچنے تک زمین دوز گاڑی پر بھی (جو بالعموم ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے) تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں ذرا جلدی ہی پٹنی سے چل دیا تاکہ حمید کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ لیکن میرے پہنچنے سے قبل آپ ریجنٹ پیلس کے لاؤنج میں چکر لگا رہے تھے۔ میں نے کہا "ابھی ساڑھے سات ہوئے ہیں اور تم کمرے سے بھاگ آئے ہو"۔ کہنے لگا "یہاں ذرا دلِ بہلانے کا سامان زیادہ ہے۔ ایک ہنگامہ ہے۔ مُلک مُلک کے لوگ ہوٹل کے قہوہ خانے میں آ رہے ہیں۔ طرح طرح کی زبانیں بولتے ہیں۔ نوعمر، جوان، بوڑھی عورتیں سب طرح طرح کے لباس پہنے آ رہی ہیں۔ وہاں کمرے میں بیٹھ کر کیا کرتا۔ اب تُم آ گئے ہو چلو دونوں مِل کر چائے کا ایک ایک پیالہ پئیں"۔ میں نے کہا "بھئی میں اِس قہوہ خانے کے آرکسٹروں (Orchestra) کے شور سے بہت گھبراتا ہوں۔ جب تک قہوہ خانے میں بیٹھے رہو یہ بے ہنگم آوازوں سے مغز چاٹتے رہتے ہیں۔ نہ کسی کی سُنتے ہیں نہ کبھی کو کسی کی سُننے دیتے ہیں۔ چلو پکیڈلی میں چند منٹ سیر کریں۔ پھر شو کا وقت ہو جائے گا"۔ حمید نے حسبِ معمول خندۂ زیرلب سے کہا "بائی تم بہت اَن میوزیکل (Unmusical) ہو۔ خیر چلو باہر ہی چلتے ہیں"۔

حمید ایک جست لگا کر شیشے کے گھومتے ہوئے دروازے کے ایک رخنے میں داخل ہو گیا، معاً میں بھی اُسی خانے میں داخل ہو گیا اور بولا "حمید یہ گھومنے والا دروازہ پُرلطف چیز ہے"۔ حمید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا "ارے تم بھی یہیں گھس آئے، یہ تو صرف ایک آدمی کے لئے ہے، دُوسرے میں آئے ہوتے، لوگ کیا کہیں گے"۔ اتنے میں ہم دونوں ہنستے ہُوئے دروازے سے باہر پہنچ گئے اور میں نے کہا "حمید تم لوگوں کی پروا مت کرو، یہاں کے لوگ اس قدر شقی القلب ہیں کہ سڑک پر سر کے بل سارا

دن چلتے رہو تو ایک متنفس لندن بھر میں تم سے نہیں پُوچھے گا کہ تم پر کیا آفت پڑی ہے جو اس مصیبت میں گرفتار ہو، اس پر حسبِ معمول حمید صاحب کی افرنج پرست رگِ حمیّت جوش میں آ گئی۔ کہنے لگے "اس سے شقاوت کو کیا تعلق ہے۔ تم تو یُوں ہی ان لوگوں کو کوستے رہتے ہو اور نہایت illogical (غیر منطقی) ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم یہ حماقت کیوں کرو گے کہ سر کے بل چلنا شروع کر دو گے۔ پھر اگر تم سے یہ لوگ تعرّض نہیں کریں گے تو اچھی بات ہے نا۔ یہاں ہر ایک کو اپنے کام سے کام ہے۔ یہ انڈینز کی طرح ایک دُوسرے کے کام میں خواہ مخواہ دخل نہیں دیتے تو اچھا کرتے ہیں۔ اور یہ جو تم ان پر شقاوت کا الزام لگاتے ہو یہ بالکل غلط ہے، تم دیکھتے نہیں اس قوم نے ملکی اَور قومی مفاد کے لئے کتنے عظیم الشّان ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ بیکاری کو رفع کرنے کی کامل سعی کرتے ہیں۔ یہاں کوئی بھیک منگا نہیں۔ غربا کی مدد کرتے ہیں۔ جس آدمی کی ملازمت چھوٹ جائے اُسے قومی ادارہ ملازمت ملنے تک کم از کم سترہ شلنگ ہفتے کے حساب سے بغیر کسی احسان کے دیتا ہے۔ بُوڑھوں کو ممنون کرنے کے بغیر اور بغیر کسی ملازمت کے پنشن ملتی رہتی ہے۔ یہ ابھی تم نے بھی پڑھا ہو گا کہ صرف ایک اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے لاوارث بچوں کو لوگوں سے روپیہ جمع کر کے بیس ہزار پونڈ کے تحفے کرسمس پر بھیجے ہیں۔ ڈاکٹر برنارڈو کے مکان میں سالانہ کم از کم ۴۵ ہزار لاوارث بچوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ یہاں کے سب شفاخانے حکومت سے مدد لینے کے بغیر صرف لوگوں کی خیرات پر چل رہے ہیں۔ لارڈ نفیلڈ کو دیکھو لاکھوں پونڈ خیرات میں دے چکا ہے اور ابھی اُس نے کئی ہزار آئرن لنگز (لوہے کے پھیپھڑے)، انفنٹائیل گنٹھیے (Infantile paralysis) کے مریضوں کو بچانے کے لئے مفت دینے کا وعدہ کیا ہے اور تمہیں یہ بھی علم ہے کہ ایک آلے پر ہزار پونڈ کی لاگت اس صورت میں آئے گی جبکہ وُہ خود اپنی فیکٹری میں اِسے تیار کرے گا۔ اپنے ملک کو چھوڑ کر چیکوسلوویکیا کی آفت میں لندن کے لارڈ میئر نے لوگوں سے چالیس ہزار پونڈ جمع کر کے وہاں کے لوگوں کو دے دیئے۔ ابھی کل کی بات ہے پھر بنک آو انگلینڈ نے دس ملین پونڈ کا قرضہ اُس مُلک کو دیا ہے۔ . . . . ."

سست رفتار موٹروں، ٹیکسیوں اور بسوں کے انجنوں کے شور اور سڑک پر چلنے والے تیز رفتار مرد و زن کے ہنگامے کے درمیان حمید کی آواز مجھے سُنائی دے رہی تھی۔ وُہ کئی دفعہ باہوں میں باہیں ڈال کر چلنے والے جوڑوں سے ٹکرایا بھی لیکن ان سے "I am sorry" کہہ کر پھر اپنی تقریر میں محو ہو جاتا۔ دفعتہً میں نے اُس کے بازو کو ایک جھٹکا دیا اور کہا "یہ دیکھو۔"

پکیڈلی کے بازار بلکہ چوک میں یُوں تو سارا دن اِس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ پَیدل چلنے والوں کا کھوے سے کھوا چھلتا ہے لیکن شام کے بعد رات کے بارہ بجے تک یہ اپنی عشرت گاہوں اور دلچسپیوں سے متمتع ہونے والے انسانوں سے چیونٹیوں کے بِل کی طرح پُر ہوتا ہے۔ ہر چہار طرف طویل و عریض دیواروں پر تماشا گاہوں اور مصنوعات کے بجلی سے منوّر حروف میں اشتہارات سے زمین کا چپہ چپہ روشن ہوتا ہے۔ اس وقت اس علاقے میں بیشتر مرد دُم دار کوٹوں (Tail-coats) اور بیشتر عورتیں زمین بوس سایوں میں جلدی جلدی حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ یعنی یہ مرد و زن رقص گاہوں کو جا رہے ہوتے ہیں۔ نوّے فیصدی موٹروں کے "مکین" اِسی طرح

ملبوس ہوتے ہیں۔ الغرض تموّل، عشرت اور جوانی کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے اور مجھ جیسے ہندوستانی کو بھی سطوتِ برطانوی سے مرعوب ہونے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

حمید نے جھنجھلا کر کہا "کیا ہے؟"

میں نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا [آپ کا مغالطہ دُور کرنے کے لئے گلی کا عرض درج کرنا ضروری ہے۔ یہاں تین فٹ چوڑی گزرگاہ کو بھی گلی (Street) کہتے ہیں] گلی کے ناکے پر ایک سپاہی کھڑا ہوا تھا جو وقتاً فوقتاً اُس گلی میں داخل ہونے والی موٹر کے لئے اس ہجوم کو چند ثانیوں کے لئے منتشر کر دیتا جو وہاں تماشائیوں کی حیثیت سے جمع تھا۔ ان تماشائیوں کے درمیان چھ یا سات آدمیوں کا ایک گروہ بے سُرے حرکتوں سے راہروؤں کو محظوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی کوئی آدمی اپنی پتلون گلے میں ڈال لیتا۔ کبھی اُن میں سے ایک ہاتھوں پر چلنا شروع کر دیتا اور کبھی ایک ٹوٹی ہوئی بانسری اور ڈگڈگی بجانے لگتا اور باقی گانے یا ناچنے لگتے۔ دو آدمی بوسیدہ سوراخ دار ٹوپیوں کو اُلٹا کر تماشائیوں کے سامنے خاموشی سے بار بار گزر رہے تھے اور ان ٹوپیوں میں لوگ تانبے کے سکّے یعنی پنس ڈال رہے تھے۔

میں نے کہا "حمید ان لوگوں کو تمہاری منطقی اصطلاح میں کس لفظ سے پکارا جاتا ہے؟"

"تو تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ یہاں بھی فقیر ہیں؟"

"مَیں یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا بلکہ حقیقت ہے کہ یہاں بھی غریب اور فقیر ہیں، اور جیسے یہاں کے لوگ اپنے دیگر عیوب پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہیں ویسے ہی اُنہوں نے اپنے سماج کے اس گھناؤنے رُخ کو ڈھانپ رکھا ہے۔ لندن کے Slums (غربا کے مکان) کا چرچا سارے جہان میں ہے لیکن یہاں کی امارت نے خندۂ استہزا سے زیادہ اُس طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ کیا تم نے جا بجا پھٹے پُرانے کپڑوں میں لوگوں کو دیا سلائیاں بیچتے، ٹوٹے ہوئے ساز اور عجیب الخلقت ارگن بجاتے نہیں دیکھا؛ ان کے پاس جو پھٹی ہوئی ٹوپی فرش پر رکھی رہتی ہے کیا اُس کا "چہرہ" دستِ گدا سے زیادہ کشادہ نہیں ہوتا۔ یہ دو دو لاکھ پونڈ کی موٹروں میں سواری کرنے والے امیر اور چیکوسلوویکیا کو چالیس ہزار پونڈ خیرات دینے والے ہمدردِ بنی نوعِ انسان ان ٹوپیوں کو کبھی نہیں دیکھتے۔ ہندوستان کی ہر ایک تدبیرِ ترقی پر اُس کی فلاکت کا عذر پیش کرنے والے خداوندانِ سیاست کی ہمدردانہ نگاہیں اپنی مملکت کے ایک اہم جزو کی طرف کبھی نہیں اُٹھتیں...."

حمید نے بیتابانہ مجھے روک دیا "لو اب خاموش ہو جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ یہی کہ جہاں برطانوی شہنشاہیت کو صرفِ زر سے فائدہ پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے وہیں برطانوی روپیہ صرف کرتے ہیں اور کہیں نہیں۔ لیکن تمہاری منطق ذرا ٹیڑھی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ تم مجھے کبھی قایل نہیں کر سکے۔ پھر اس بحث سے فائدہ۔ لو چلو اندر چلیں۔ اب شو میں پانچ منٹ باقی ہیں۔"

تماشاگاہ میں اوّلیں منظر اندھیری رات میں ایک رقص تھا۔ چند رقاص لڑکے اور لڑکیاں نہایت چُست بلکہ جسم سے پیوست ریشمیں لباس پہنے ہوئے پردے کے سامنے آ کر رقص کرنے لگے۔ ناچنے والوں اور والیوں کو تماشائی منظر پر روشنی نہ ہونے کی وجہ سے صرف مبہم

طور پر دیکھ سکتے تھے لیکن اُن کے قدموں کی طرف سے جب روشنی اُن کے جسم پر پڑتی تو اُن کے سیاہ سیاہ سائے اصلی حجم سے بڑے ہو کر سفید پردے پر پڑتے اور رقص کی تمام حرکات کے علاوہ اعضا کے باریک ترین خم اور اُبھار نمایاں طور پر نظر آتے۔ رقص ختم ہونے پر لوگوں نے تالیوں سے ہال سر پر اُٹھا لیا اور رقاص اندھیرے ہی میں آداب عرض کر کے رُخصت ہو گئے۔

میں نے کہا "حمید دوست اِن ناچنے والوں کو ہمیں ایک نظر روشنی میں دیکھنے تو دیا ہوتا۔"

حمید مجھ سے بہت بیباکی سے پیش آتا ہے "تُم بھی عجیب گدھے ہو۔ دیکھتے نہیں اُن کے جسم پر لباس چپکا ہُوا تھا۔ اگر روشنی ہوتو وہ بالکل برہنہ نظر آئیں۔ اِسی لئے تو تاریکی کا پردہ استعمال کیا گیا ہے۔"

میں خاموش ہو گیا کیونکہ حمید سے بحث کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن خود یہ سوچ رہا تھا کہ اِس مُلک میں ہر سُو لطیف پردے کی مدد سے کیسے کیسے کام لئے جاتے ہیں۔ سیاست، علم، تمدّن، معاشرت اور زندگی کے ہر شعبے میں حقیقت پر لطیف پردے چڑھا کر حقیر سے حقیر چیز کو اعلےٰ ترین شکل دے کر دُنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوستان اِس لئے آزاد نہیں کیا جا سکتا کہ وُہ ابھی تک اپنے آپ پر حکومت کرنے کے قابل نہیں۔ فلسطین کو ابھی تک ایک Mandatory کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں کے عرب اپنا بار اُٹھانے کے اہل نہیں۔ فلسطین میں یہودیوں کی آبادی کو اس لئے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ عربوں کی بہ نسبت یہودی زیادہ جفاکش ہے اور وہاں کی زمین کو بہتر بنا سکتا ہے۔ ہٹلر ظالم ہے کیونکہ وُہ اپنے مُلک کو بہتر بنانے کے لئے وہاں سے یہودیوں کو نکال رہا ہے۔ مسولینی . . . .

"جانتے ہو یہ لڑکا سویڈلیش (Swedish) ہے جو اس ڈرامے میں حرامزادے کا پارٹ کر رہا ہے۔ حمید نے میرا شیرازۂ خیال بکھیر کر رکھ دیا۔

اب ہمارے سامنے ایک مختصر سا ڈراما پیش کیا گیا جس میں ایک عورت کئی سال کے بعد جنگِ عظیم کے اپنے اُن شیدائیوں کے گلے پڑ جاتی ہے جو جنگ کے دَوران میں بموں سے بچنے کے لئے ایک گاؤں میں اُس کے ہاں مقیم ہوئے تھے اور نہ جانے کس کی عنایت سے اُس کے ایک لڑکا پیدا ہو گیا تھا۔ اِس لڑکے کو ملازمت کی ضرورت ہے اور یہ عورت اپنے قدیم شیدائیوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے جن کی تعداد تین ہے اور جو حُسنِ اتفاق سے ایک ہی کاروبار میں شریک ہیں۔ اِن میں سے ایک لندن میں اشیائے برآمد کی تجارت کرتا ہے، دُوسرا اُس کا مہتمم ہے اور تیسرا ہندوستانی شاخ کا مہتمم ہے۔ جس وقت یہ عورت لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر اِن تینوں سے بیک وقت ملاقات کرتی ہے، تو تینوں دوست گھبرا جاتے ہیں اور پہلی دفعہ اُنہیں پتہ چلتا ہے کہ گو ایامِ جوانی میں لڑکے کی ماں ہر ایک سے اظہارِ تعشق کرتی تھی لیکن حقیقت میں اُسے کسی سے بھی عشق نہ تھا۔ تینوں اپنی شکل آئینے میں دیکھ کر اور لڑکے سے مشابہت نہ پا کر اُس کا باپ بننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تینوں شادی شُدہ ہیں۔ عورت اُن کی بیویوں کو راز بتا دینے کی دھمکی دیتی ہے، لیکن ایک اَور لکھپتی کی بدولت تینوں کی گلو خلاصی ہو جاتی ہے۔ جو خود بھی ایک رات اس عورت کے ہاں ٹھہرا تھا۔ اور لڑکے کا باپ بننے پر رضامند ہے۔

میں نے کہا "حمید، یہ قصّہ ہندوستان میں کیسے سٹیج پر لایا جائے؟"

کہنے لگا "بس تمہارا تو ہندوستان کسی وقت بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ تو ایک لطیفہ ہے۔ اِس کو اخلاقی معیار پر جانچنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جو کہنا چاہتے تھے پردے سے کہہ بھی گئے لیکن کیا مجال جو ایک لفظ بھی بیہودہ زبان سے نکلا ہو یا ایک لغو حرکت بھی کی ہو۔ اِس سے زیادہ تُم اَور کیا چاہتے ہو؟"

مَیں پھر خاموش ہوگیا۔ سیاسی حقایق پر جو پردے ڈالے جاتے ہیں اُن سے میرا ذہن معاشرتی پردوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ سفید اِن فرنگی نے اپنے مُلک میں اُس قباحت کا مکمل انسداد کردیا ہے جسے ہندوستان میں عشوہ فروشوں کا بازار کہا جاتا ہے اور اِس پیشہ کی ترویج دینے والے یا والی کو شدید سے شدید سزا دی جاتی ہے لیکن اِس کے ساتھ ہی ہر سال دارالعوام میں اُن ہزاروں بچّوں کی تعداد بھی گنی جاتی ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک واقفکار سے پُوچھا یہ دو متضاد حقیقتیں کس طرح صحیح ہیں۔ کہنے لگے اُن مظلوم عورتوں کو نہیں دیکھا جو جسم و جان کا رابطہ قائم کرنے کے لئے ہر شام مختلف کونوں پر کھڑی ہوئی اجنبیوں کی منتظر رہتی ہیں۔ اِس سے اور تعجّب ہُوا اور پُوچھا تو کیا قانون کی گرفت اُن پر نہیں ہوتی۔ کہنے لگے ہوتی ہے لیکن وُہ اپنے تعلقات پر دوستی کا پردہ ڈال لیتی ہیں اور مرد و زن کی رفاقت پر اِس سرزمین میں کوئی گرفت نہیں . . . .

حمید نے جھنجھوڑ کر پوچھا "اُونگھ رہے ہو؟"

"نہیں تو"

"تو پھر تالی کیوں نہیں بجاتے۔ اِس جنوبی امریکی عورت نے کتنا اچھا رمبا (Rumba) ڈانس کیا ہے اور تم خدا جانے کہاں تھے۔"

مَیں نے بھی تالی بجائی اَور پردہ گرنے پر ہم دونوں باہر نکل آئے۔

راستے میں حمید تماشے پر تبصرہ کرتا رہا۔ میرے خاموشی سے سننے پر کچھ جھنجلا گیا اور بولا "پھر اُسی طرف کو لَوٹ گئے ہو جہاں سے ابھی واپس آئے تھے۔ تُم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ یہ باتیں زیادہ قابلِ غور نہیں۔ جب اپنی قسمت نہیں بدلتی تو دوسروں کی باتوں پر کیوں غور کیا جائے۔ چین اور جاپان میں جنگ جاری ہے ہوتی رہے۔ ہسپانیہ کی جنگ کبھی تھم ہی جائے گی۔ اٹلی نے حبشہ لے لیا۔ جرمنی نے چیکوسلوواکیا سے ٹکڑا کاٹ لیا۔ آسٹریا کو ہڑپ کرگیا۔ اپنی بلا سے۔ اب اِٹلی فرانس سے ٹیونس اور کارسیکا لے لے گا تو ہمارا کیا بگڑے گا۔ انگریزوں سے جنوبی افریقہ چھِن گیا تو ہمارا کیا نقصان ہوگا۔ ہمیں اصلاحات سے قبل بھی چھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اب بھی اُس میں معمولی سالانہ ترقی کے سوا اَور کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وزیروں کی تنخواہ کم ہوگئی ہے تو ہماری تنخواہ تو زیادہ نہیں ہوئی۔ پھر ہم اصلاحات کو کیا جانیں۔ تم یہ سیاسی جھگڑے تہ کر رکھو۔ لو السلام علیکم۔ پھر ہفتے کو ملیں گے۔"

مَیں سرزمینِ یورپ کی امارت و فلاکت اور عشرت و بیچینی کے متضاد مناظر پر غور کرتا ہُوا کھویا کھویا گھر واپس آگیا +

محمّد باقر ملک

بہار

لمبے سائے سمٹ گئے گلشن میں
بیدار ہوئی ہے رُوح سُوکھے تن میں
کونپل نے نکل کے یہ سُنایا پیغام
جاگو جاگو بہار آئی بن میں

پتّوں کے سُبک دباؤ سے نیم جُھکے
سب اہلِ چمن برائے تعظیم جُھکے
یوں آمدِ گُل پہ جُھک گئی ہیں شاخیں
جیسے کوئی شوخ بہرِ تسلیم جُھکے

پھُولوں کا ہے ہر طرف زمیں پر سایا
خالی جو جگہ تھی اُس پہ سبزہ چھایا
کیا حال کہوں چمن کی آبادی کا
ہر شاخ پہ اِن دنوں نشیمن پایا

کلیوں نے چٹک چٹک کے آنکھیں کھولیں
شاخوں میں لٹک لٹک کے چڑیاں بولیں
خاموش ہوئیں قریب کھٹکا سُن کر
جب ایک اُڑی تو اور پیچھے ہولیں

دوچار بہم بگڑ کے اُچھلے پھُولے
دوچار نے ٹہنیوں پہ کھائے جھُولے
کوّے بھی مِلے جُلے ہیں کوئل کے ساتھ
سب جوشِ بہار میں ہیں سُدھ بُدھ بھُولے

سیفی نوگانوی

زندگی

مئی کی تپتی دوپہر میں تینوں شہر کے باہر، بہت دُور، مال کو پار کر کے لارنس روڈ پر چُپ چاپ چلے جا رہے تھے ۔۔۔ شیلا کی ماں، شیلا اور اُس کا خاوند!

شیلا کی ماں سوچ رہی تھی ۔۔۔ سنسار میں کِس کے دن ایک جیسے رہے جو ہمارے رہتے، چڑھنا گِرنا یہ تو اِنسان کے ساتھ ہی لگا ہے۔ اور پھر اِنسان چڑھنے گِرنے والا کون؟ یہ تو وہ خالقِ دو عالم، وہی آسمان کی نامعلوم بلندیوں میں بسنے والا زبردست کِھلاڑی ہے جو چاہتا ہے تو اپنے کھلونوں کو کمال کی چوٹی پر پہنچا دیتا ہے، چاہتا ہے تو زوال کی گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے۔ پھر دُکھ کیسا؛

اور یہ سوچ سوچ کر گویا وُہ اپنے من کو تسلی دیتی چلی جا رہی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اکثر وہ اپنے دُکھی دِل میں اُٹھتے ہوئے جذبات کو دبانے کی کوشش کیا کرتی تھی، پر دِل نہ مانتا تھا۔ اور اب بھی جب اس چلچلاتی دُھوپ میں سر کا پسینہ پاؤں کے راستے بہہ رہا تھا، اور سامنے کٹھن منزل باقی تھی ۔۔۔ اس کے دِل میں کئی طرح کے خیالات اُٹھ رہے تھے۔ کھلاڑی کو سُکھ دُکھ کا کھیل دیکھنا ہے تو شوق سے دیکھے۔ پر دُکھ کے بعد سُکھ دے کر بھی تو وُہ یہ کھیل دیکھ سکتا ہے، پہلے سُکھ دینے کے بعد پھر دُکھ کے کولہو میں پیس ڈالنا، کتنی بڑی سزا ہے، کتنی عبرتناک سزا! ۔۔۔ ایسا کرنے کے بجائے وُہ انسان کو اُٹھا ہی کیوں نہیں لیتا؛ لیکن۔ نہیں، جیسے اُسے اپنے سوال کا جواب مِل جاتا۔ اگر وُہ انسان کو سنسار کی سٹیج سے اُٹھا لے تو گذشتہ زندگی میں اُس نے جو گناہ کئے ہیں ان کی سزا کون پائے؛ کئی بار انتہائے غم سے تنگ آکر اُس نے موت کو بُلایا تھا۔ لیکن جب تک پچھلے جنم کے گناہوں کا بیسواں حِصّہ بھی باقی ہے۔ کوئی نہیں مر سکتا۔ تو پھر اسی کو کیسے موت آ جاتی . . . . . . پانچ بچوں کو جنم دے کر اس نے شمشان کی ٹھنڈی گود میں جا سُلایا۔ بڑھا چڑھا کاروبار اپنے سامنے برباد ہوتے دیکھا۔ جن رِشتے داروں کو خون پلا کر پالا تھا اِن کے ڈنک سہے اور بے گھر بے در ہونے کے بعد خاوند کی یہ اندوہناک حالت! شیلا کی ماں نے ایک سرد آہ کھینچی ۔۔ جانے قسمت میں ابھی کِتنا دُکھ لکھا ہے؛ کون کون سے گناہوں کا پھل بھوگنا باقی ہے؛

× × × × × × × × × ×

ایک بنگلے کی دیوار کے سائے میں شیلا کی ماں رُکی۔ میلے دوپٹے کے دامن سے گردن پر بہتے ہوئے پسینے کو ہوا کرتے ہوئے اُس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ شیلا اور اُس کا خاوند بھی اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ کچھ لمحوں تک تینوں چُپ چاپ اپنے خیالات میں محو کھڑے رہے۔ اور پھر کچھ دیر بعد چُپ چاپ چل پڑے۔

شیلا کو ماں پر غصّہ تھا۔ بہت غصّہ تھا۔ باپ کی ایسی بُری حالت ہو اور لڑکی کو خبر تک نہ دی جائے! بچپن کے مسرّت انگیز دن، اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے والد کی شفقت بھری گود اور میٹھی باتوں کی یاد آئی۔ بھوگپور میں اُس کے پتا کا اینٹوں کا بھٹّہ تھا۔ خوب چلتا تھا۔ اور اُسی کی بدولت گاؤں میں اُن کی خاصی عزّت تھی۔ اِن دِنوں وُہ بہت چھوٹی تھی ___ اتنے بچّوں کے بعد ترس ترس کر حاصل کی ہوئی اکلوتی لڑکی ___ اس کے پتا اسے گود میں اُٹھائے پھرتے تھے۔ تب بھوگپور کے برساتی نالے پر ریلوے کا پُل ابھی نہیں بنا تھا۔ برسات کے دِنوں میں جب پہاڑوں پر بارش ہوتی تو گویا اپنی کھوئی جوانی پاکر یہ برساتی نالہ اپنی مست البیلی چال سے بہنے لگتا اور جب جوش میں آتا تو ریلوے لائن کو بہالے جاتا۔ تب اس کے جنوں انگیز رقص کو دیکھ کر شیلا مسرّت کے پروں پر جھُولنے لگتی۔ جب بھی لائن بہہ جاتی وُہ اپنے پتا کو وہاں لے چلنے پر مجبور کر دیتی اور بڑے اشتیاق سے دیکھتی کہ کس طرح مسافر اُس پار کھڑی ہوئی گاڑی سے اُتر کر سر پر گٹھڑیاں اُٹھائے، دھوتیاں یا پاجامے سنبھالتے ہوئے گروہ در گروہ اس طرف کھڑی گاڑی پر سوار ہوتے ہیں۔

دوپہر کو بڑ کے بوڑھے گھنے پیڑ کے سائے میں وُہ حساب کتاب دیکھ رہے ہوتے۔ وُہ کھیلتی کھیلتی آجاتی۔ ان کے رجسٹر اُٹھا کر پھینک دیتی۔ ان کی گود میں آبیٹھتی۔ اَور مچل جاتی کہ ٹھنڈی ہوا میں شیشم کے گھنے درختوں کے نیچے اس کے ساتھ کھیلا جائے۔ اس کے پتا چُپ چاپ لمبی سڑک پر درختوں کے ٹھنڈے سائے میں اس کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ اُن کے مُنہ پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ کھیلا کرتی اور وُہ ہنس کر کہا کرتے۔ صرف یہی فقرہ ___ تم بہت تنگ کرتی ہو شیلو!

اِس کے بعد اگرچہ حالات آہستہ آہستہ بگڑتے گئے۔ بڑے بھائی اور ماموں کے لڑکوں کی خود غرضی اور بیوفائی سے اگرچہ کئی بار اُنہیں اپنا کام بند کر کے دیس بدیس کی ٹھوکریں کھانی پڑیں، پر شیلا کے پاس اُنہوں نے غم کا سایہ تک نہ آنے دیا۔ اسے یاد تھا جب وُہ مدرسے جاتی تھی تو اس کے پاس اتنے گہنے ہوتے تھے جتنے نئی بیاہی دُلہنوں کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ اِسے وہ دِن بھی یاد تھا جب اس کی شادی کے وقت کافی روپیہ نہ ہونے پر اس کے والد نے اپنا چلتا چلاتا بھٹہ اپنے بھائی کے پاس فروخت کر دیا۔ اور اس بڑھاپے کی حالت میں بھی بیکاری کے بھیانک اژدہا کا شکار ہونا منظور کیا۔

وُہی اس کے پتا جب اتنے بیمار ہوئے کہ ہوش و حواس تک کھو بیٹھے تو اسے خبر تک نہ دی گئی۔ وُہ اپنے خاوند کے ساتھ لاہور کی دلچسپیوں کا لُطف اُٹھاتی رہی، اور اس کے پتا ___ سوچتے سوچتے اُس کا گلا گھٹنے لگا۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ہڈیوں کا پنجر جسم، تقریباً اندھی آنکھیں، میلے کپڑے اور گھِسی ہوئی ایڑی کا جُوتا لئے گویا مصیبتوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی، اپنے آپ میں کھوئی چلی جارہی تھی۔

شیلا نے پوچھا ___ ماں اب اُنہیں ہوش ہے کیا؟

ماں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ___ ہاں، پہلی بار جب میں آئی تھی تو اُنہیں آدمیوں کی پہچان تھی!

شیلا نے پھر پوچھا ___ اور ماں ان سے کام تو نہیں لیا جاتا؟

—— نہیں بچی ۔ وہ کام کرتے ہی نہیں ۔ چوکیدار ہی اس دن کہہ رہا تھا کہ اَور تو سب کام کرتے ہیں لیکن پنڈت کچھ نہیں کرتے سارا سارا دن پُوجا پاٹھ میں محو رہتے ہیں ۔

"اور ماں ان کی صحت کیسی ہے ؟"

"پہلے سے تو اچھی ہی معلوم ہوئی بیٹی ! "

× × × × × × × × × ×

ایک بنگلے کے پھاٹک کے پاس ایک درخت پر خوبصورت بیل چڑھی ہوئی تھی ۔ اور اس میں چھوٹے چھوٹے سُرخ پھول لگے تھے۔ شیلا کی ماں نے کہا —— مجھ سے نہیں چلا جاتا ۔ اب میں تو کچھ دیر یہیں بیٹھوں گی ، یہ کہتے ہوئے اپنے داماد اور لڑکی کا جواب سُنے بغیر وُہ اُس طرف بڑھی ۔ شیلا کا خاوند جگت رام سُوٹ اور ہیٹ میں ملبوس تھا ۔ شیلا بھی خوبصورت ریشمی ساری پہنے تھی ۔ اس لئے وُہ تو کھڑے رہے ۔ پر ماں کو تو کوئی ایسی جھجک نہ تھی ۔ ہاتھ کا برتن زمین پر رکھ کر وہیں گرم دُھول پر وُہ بیٹھ گئی ۔

جگت رام نے ایک دبی نگاہ سے اپنی ساس کی طرف دیکھا ۔ گرد سے اٹے ہُوئے رُوکھے خشک بال ، ڈھیلے لٹکتے ہوئے پھٹے پُرانے جھریاں اور کثرتِ غم سے مُرجھایا ہُوا چہرہ ۔ ایک سرد آہ کو اس نے زبردستی روک لیا اور اس کے تصوّر کی آنکھوں کے سامنے سے گزشتہ کئی برس لمحوں کی طرح گزر گئے ۔

شادی سے پہلے سُسرال کے متعلق وہاں کے محبّت بھرے ماحول کے متعلق اس نے تصور کے کتنے محل بنائے تھے —— ساس کا ماں سے بھی زیادہ گہرا کھُلا پریم ، اپنے داماد کی تعریف کرتے وقت غرور سے کھلا ہُوا چہرہ ، کھاتے کھِلاتے وقت کے اصرار ، میٹھی جھڑکیاں اور طعنے ، تصوّر کے کس مسرّت انگیز ماحول میں وُہ بسا کرتا تھا ۔ لیکن کتنی جلدی وہ محل منہدم ہو گئے ۔ شادی کے دِن ہی اس نے محسوس کیا تھا جیسے ماحول کچھ ناسازگار سا ہے ۔ گویا کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور ہے ۔ شادی میں برات کو خوب کھِلایا پلایا گیا تھا ۔ جہیز بھی کم نہ دیا گیا تھا ۔ دوسرے سلوک میں بھی کسی طرح کی کمی نہ آنے دی گئی تھی ۔ پھر بھی اُس نے محسوس کیا تھا جیسے یہ سب خوشی تکلّف کے پردے میں ڈھکی ہوئی ہے ۔ ساس کو اُس نے دیکھا ۔ دبی دبی ، گھُٹی گھُٹی ، ڈری ڈری ۔ اور خُسر کو اس نے پایا گُپ چُپ ، متین ، کھویا کھویا سا ۔ بس ایک بار جب لڑکی کے وِداع ہونے کا وقت آیا اور شیلا رو کر اپنے والد کے گلے سے چمٹ گئی ۔ اس وقت اس سنجیدہ متین شخص کے چہرے پر بھی اس نے ایک مایوس ہنسی دیکھی تھی اور سُنا تھا —— اَیں بچپن نہ کرو ۔ بس بس ۔ چلو اب بیٹھو تانگے میں !

سوچتے سوچتے جگت رام کے دل کی گہرائیوں سے ایک لمبا سانس نکل گیا ۔ اس کی ساس اُٹھ کھڑی ہوئی اور تینوں چلنے لگے ۔ لارنس روڈ ختم ہو گئی اور جیل روڈ آ گئی ۔ تینوں خاموشی سے اس پر ہو لئے ۔ جگت رام پھر ماضی کے اُوراق میں کھو گیا ۔

شادی کے بعد وُہ ایک دو بار سُسرال گیا تھا ۔ تو اگرچہ اس کی بہت خاطر تواضع کی گئی ، لیکن خلوص کی اس نے کمی ہی محسوس کی ۔

اور آخر ایک دن اسے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ شیلا نے ہاتھ جوڑ کر بھرے ہوئے دِل سے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اور درخواست کی کہ میرے ماں باپ کو معاف کر دو۔ اپنے باپ کے اچھے دِنوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس نے اُنہیں بتایا کہ اُن کے پاس جو کچھ تھا اُنہوں نے شادی میں لگا دیا۔ اور اب ان کے پاس نہ مکان اپنا ہے نہ دُکان اور بھٹہ پر بھی اب اُن کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے وُہ اب اس سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔

جانے کیوں؛ جگت رام کو اپنے سُسر سے کچھ ہمدردی سی رہی تھی۔ ان کے چہرے پر کچھ ایسا درد۔ کچھ ایسا سوز، کچھ ایسا غم تھا کہ جب اُس نے محسوس کیا کہ اس کے جانے سے اُنہیں کچھ تکلیف ہوتی ہے تو اُس نے سُسرال آنا جانا کم کر دیا۔ بلکہ شیلا کو بھی اس نے زیادہ تر لاہور ہی میں رکھا۔ پہلے تو وہ کبھی کبھی سُسرال جاتا بھی، لیکن اب ایک سال سے وُہ اُدھر گیا ہی نہ تھا۔ آخر ایک دِن اچانک اُس نے شیلا سے سُنا کہ اُس کا سُسر پاگل ہو گیا ہے اور لاہور کے پاگل خانے میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ اور اس کی ساس ایک سیٹھ کے گھر رسوئی کا کام کر کے زندگی کے دِن گزار رہی ہے۔

اسے یاد ہے۔ وہ حیران سا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی اُمیدوں کے محل مسمار ہو گئے تھے، لیکن ان کے کھنڈر تک مِٹ جائیں گے۔ یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔

شیلا کی ایک بچپن کی سہیلی لاہور ہی میں رہتی تھی۔ وُہ اپنے میکے ہو کر آئی تو شیلا بھی اپنے ماں باپ کی خبر لینے اس کے پاس پہنچی تبھی اسے یہ سب کچھ معلوم ہُوا۔ ناک بھوں سکیڑتے ہوئے اس کی سہیلی نے کہا ــــ "تم بھی شیلو خوب ہو۔ وہاں تمہارا باپ پاگل ہو گیا ہے پاگل خانے میں داخل کرا دیا گیا اور تم خبر تک لینے نہیں گئیں۔ سلطان پور میں تو کائیں کائیں ہو رہی ہے۔"

اسی دن شیلا نے جگت رام سے مِنّت کہا تھا ــــ "مجھے میری ماں سے مِلا دو۔ میں اِس سے سب حال پوچھنا چاہتی ہوں۔" اور اسی شام ذرا اندھیرا ہوتے ہی جگت رام اسے لے کر سیٹھ کے یہاں پہنچا تھا۔ شیلا کی ماں سے ملاقات ہونے پر دونوں نے اس سے اصرار کیا تھا کہ وُہ نوکری چھوڑ کر ان کے ساتھ رہے۔ آخر داماد اور بیٹے میں فرق ہی کیا ہے۔ لیکن وُہ نہ مانی اور جب اس نے بتایا کہ بھائی کے ہاتھوں بے عزت ہونے پر اُنہوں نے کچھ یونہی بکنا شروع کر دیا تھا۔ شاید ہاتھ بھی اُٹھایا تھا۔ جس پر ظالم بھائی نے اُنہیں پاگل مشہور کر دیا اور پاگل خانے میں داخل کرا دیا۔ نہیں تو کوئی ایسے پاگل تو وہ نہیں ہیں، تو دونوں کے دِل کو کچھ تشفی ہوئی تھی۔

گلی کی مدھم روشنی میں دیوار کے سائے میں وُہ تینوں کھڑے تھے، تب یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر اُنہیں ہوش ہُوا تو ڈاکٹر سے مِل کر اُنہیں پاگل خانے سے نکلوا لیا جائے۔ اور ایک علیٰحدہ مکان لے کر اُنہیں وہاں رکھا جائے اور شیلا کی ماں بھی وہاں رہے۔ یہ بات وہ مان بھی گئی یہی وجہ تھی کہ آج اس تپتی دوپہر میں وہ پاگل خانے کو جا رہے تھے۔

جگت رام نے ایک لمبا سانس لیا۔ اپنی ساس کے خلاف، ساس کے خلاف کیا پُرانے رسم و رواج کے خلاف اِس کے دِل میں نفرت

کا سمندر موجزن ہو گیا۔ اس کی ساس تانگے پر چلنے کے لئے تیار نہ ہوئی تھی۔ شاید اُس کے پاس کرایہ دینے کے لئے پیسے نہ تھے۔ اور یا تھے تو وہ سب اس نے اپنے خاوند کے لئے باداموں کی گریاں اور دودھ لینے میں صرف کر دیئے تھے اور چونکہ لڑکی کا پیسہ لینا ٹھہرا پاپ، اس لئے اِس قیامت کی دُھوپ میں وُہ تین میل چل کر آئے تھے۔

+ + + + + + + + + + + + +

پاگل خانے سے باہر چھوٹے سے باغیچے میں وُہ تینوں بیٹھ گئے۔

ابھی پھاٹک کھُلنے میں دیر تھی اور ڈاکٹر — جس سے جگت رام مِلنا چاہتا تھا ابھی نہیں آیا تھا۔ اس لئے تینوں کے لئے کچھ دیر تک انتظار کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

یہاں گھنے درختوں کے نیچے کچھ ٹھنڈک تھی۔ اور ہوا بھی کچھ میٹھی میٹھی سی چلنے لگی تھی۔ ماں نے باداموں کی پوٹلی ایک طرف اور دودھ کا برتن دوسری طرف رکھ دیا اور گھاس پر لیٹ گئی۔ چُپ چاپ آم کے درختوں پر آئے ہوئے بُور کو دیکھتے دیکھتے اس کا تصور پر لگا کر اُڑ چلا — سُکھ کے بعد دُکھ اور دُکھ کے بعد سُکھ ہے تو اتنا دُکھ سہنے کے بعد سُکھ کے دِن ضرور آئیں گے۔ ہفتہ میں دوبار اُسے اپنے خاوند سے ملنے کی اجازت ہوتی اور اس اثنا میں نوکری کر کے جو بچا سکتی، اس کے بادام لے، گریاں نکال، دُودھ اور مصری لے کر کڑی دُھوپ میں پیدل اتنی لمبی مسافت، تپتی سڑکیں پار کر کے پاگل خانہ آتی اور بڑی محبت اور عقیدت سے بادام کھلا کر دُودھ پلاتی تھی۔ غذا کی کمی اور رشتہ داروں کے مظالم ہی سے اس کے خاوند کا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے۔ اس بات کا اسے یقین تھا جسے ہمیشہ دُودھ، بالائی، دہی اور لسی ملے۔ اسے اِتنے دن فاقوں سے رہنا پڑے۔ اور پھر بے عزتی! وُہ اُنہیں پاؤ پاؤ بھر باداموں کی گریاں کھلا جاتی، پھر مصری مِلا کر دُودھ پلاتی اور پھر وہ تصور ہی میں خیال کرتی کہ آخر میرا خاوند اچھا ہو جائے گا۔ اور اس اثنا میں کچھ روپیہ جمع کر کے میں ایک چھوٹی موٹی دُکان کھول چُکی ہوں گی اور زندگی کے جو کچھ دن باقی ہیں آرام سے گزر جائیں گے۔

گھاس پر لیٹی ہوئی شیلا۔ سامنے لوہے کے اُونچے مہیب پھاٹک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باہر ایک سکھ سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ نہ جانے اس کے اندر کتنی اَن گنت کوٹھڑیاں ہیں اور نہ جانے اُن میں سے کس کوٹھڑی میں اُس کا باپ پاگل بنا کر بند کر دیا گیا ہے۔ نہ جانے کس طرح اس گرمی میں اپنی کوٹھڑی میں لیٹا ہُوا وُہ بیتے دِنوں کی یاد کر رہا ہے۔ اسے ضرور ہی اپنی لڑکی کی یاد آتی ہو گی، اور وُہ ضرور اسے خود غرض اور سنگدل سمجھتا ہو گا — اِدھر اسے ان سب باتوں کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ شیلا کا جی بھر آیا اور وُہ آنچل سے اپنا مُنہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

دونوں ہاتھ گھاس پر ٹکائے پیچھے کی طرف جُھکا ہُوا جگت رام دِل ہی دِل میں اس مکالمہ کو دُہرا رہا تھا۔ جو ابھی کچھ دیر بعد اسے پاگل خانے کے ڈاکٹر سے کرنا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس سفارشی چٹھی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو وجہ بتانی ہو گی کہ کیوں پنڈت کو پاگل خانے سے نکال کر گھر لے جانا ضروری ہے۔ کئی طرح کے دلائل اس نے اپنے دِل میں سوچ لئے تھے۔ اور انگریزی کے کچھ چُست فقرے وُہ

اپنے من میں دوہرا رہا تھا۔

چار بجے بڑا پھاٹک کھلا۔ اور پاگلوں کی ایک ٹولی، موٹے کھُردرے، کپڑے کی لمبی ڈھیلی قمیصیں اور ٹخنوں سے اُونچے تنگ پاجامے پہنے ہوئے نکلی، کوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ کوئی ہوا ہی میں قتلِ عام مچا رہا تھا۔ کوئی یوں ہی ہنستا جا رہا تھا۔ ان کے ساتھ جو سنتری تھا اس نے اُن سے ایک جگہ سے پھولوں کے گملے اُٹھانے کو کہا۔

سب نے گملے اُٹھا لئے۔ اور وُہ سنتری اُنہیں لے کر شاید کہیں دُوسری جگہ رکھوانے کے لئے چلا گیا۔ اسی طرح دُوسری ٹولی نکلی اور گملوں کو پانی دینے لگی۔ سب پاگل تھے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی سدھے ہوئے جانور کی طرح سب کام کئے جاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے شیلا بے چین ہوگئی۔ اس کا دِل جیسے اُچھل کر اس کے حلق میں آگیا۔ میرے باپ کو بھی ضرور کام کرنا پڑتا ہوگا۔ اور یہ ظالم سنتری نہ جانے کس طرح مار مار کر ان پاگلوں کو کام میں لگاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وحشی جانوروں کو، جو دماغ سے کام نہیں لے سکتے لیکن پھر بھی ڈنڈے کی مار سے سب کام سیکھ لیتے ہیں۔ میں اپنے باپ کو ایک لمحے کے لئے بھی یہاں نہ رہنے دُوں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کسی گہرے سوچ میں منہمک آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے خاوند سے کہا —— سنتری سے کہو ہمیں اُن سے مِلا دے۔

× × × × × × × × × ×

اس کا خاوند کچھ چونک کر اُٹھا۔ اپنا کالر اور ٹائی درست کرتا ہُوا وُہ پھاٹک پر گیا۔ سنتری سے اپنا تعارف کرایا۔ درخواست کی کہ ہمیں پنڈت جمنا داس سے ملاقات کرنی ہے، اور یہ کہتے ہوئے الگ لے جا کر ایک روپیہ بھی اس نے سنتری کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

چار جمنا داس اُس وقت پاگل خانے میں تھے۔ سنتری نے فہرست دیکھ کر چوکیدار سے کہا کہ سلطانپور والے جمنا داس کو بُلا لائے۔ اس اثنا میں کئی دوسرے پاگلوں کے رشتہ دار بھی آگئے تھے۔ اور سنتری ان کی درخواست کے مطابق فہرست دیکھ دیکھ کر پاگلوں کو بُلا رہا تھا۔ بڑے پھاٹک کے باہر سے ملاقات کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن اِن کو اس نے پھاٹک کے اندر داخل کر لیا۔ جگت رام اور شیلا ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ماں زمین پر ہی بیٹھی۔ دفعتہً ایک چوکیدار کے ساتھ اُنہوں نے پنڈت کو آتے ہوئے دیکھا۔

شیلا کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔

نزدیک آجانے پر شیلا نے دیکھا کہ دُوسرے پاگلوں کی طرح اس کے پِتا کے گلے میں بھی موٹی کھُردری قمیص اور کمر میں پاجامہ ہے اس کا جی بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

چوکیدار نے کہا —— بیٹھ جاؤ۔ اور ایک سِدھے ہوئے مسکین جانور کی طرح پنڈت دیوار کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد چوکیدار کی طرف اور پھر ان تینوں کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔

جگت رام نے دیکھا کہ اس کا سُسر پہلے سے آدھا بھی نہیں رہا ہے۔ اس کے دانتوں پر پیلے رنگ کا میل جما ہے۔ اس کے چہرے

پر زردی چھا رہی ہے اور جب شیلا کی ماں نے پوٹلی کھول کر بادام کی گریوں کی پڑیا اسے دی تو جگت رام نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ کانپ رہا ہے

سب گریاں ایک دو پھنکوں ہی میں پنڈت نے چبا ڈالیں۔ اب شیلا کی ماں دودھ میں مصری گھولنے لگی۔

لیکن شیلا کو اتنی تاب کہاں۔ اس نے ماں سے پوچھا — ماں یہ ہمیں پہچانتے نہیں ؟

اپنی کمزور نیم اندھی آنکھوں سے اپنے خاوند کو دیکھ کر شیلا کی ماں نے کہا — کیوں نہیں ! اور پھر سر کا دوپٹہ ذرا نیچا کرتے ہوئے شیلا کی طرف اشارہ کر کے اس نے خاوند سے پوچھا — کیوں اِس کو پہچانتے نہیں ؟

پنڈت نے ہنستے ہوئے کہا " پہچانتا کیوں نہیں ؟ "

" بھلا کون ہے یہ ؟ "

" میری بیوی اور کون ؟ "

شیلا نے ساری کے آنچل سے مُنہ ڈھانپ لیا اور جگت رام نے اُس کی سسکیاں سُنیں۔

شیلا کی ماں نے اپنے داماد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " بھلا یہ کون ہیں ؟ "

" ہمارے بھائی ہی تو ہیں " یہ کہہ کر پنڈت نے سب کی طرف اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہو — کیا تم لوگوں نے مجھے پاگل سمجھ لیا ہے۔

رُوانسی سی ہو کر شیلا کی ماں نے پوچھا — " کیا مجھے بھی نہیں پہچانتے ؟ "

" واہ ! " شیلا کے پتا نے ایک قہقہہ لگایا — " اپنی ماں کو بھی نہ پہچانوں گا " اور یہ کہہ کر اور پھر زور سے ہنس کر اُس نے دُودھ کا برتن شیلا کی ماں کے ہاتھ سے چھین لیا اور غٹ غٹ پینے لگا۔

اوپندر ناتھ اشک

کیا بنانا تھا مصور کو بنا کیا آخر

اپنی بگڑی ہوئی تصویر پہ حیراں ہوں میں

"عالمِ صغیر"

سحر کا نور، دن کی روشنی، راتوں کی تاریکی
مہک پھولوں کی، شاخوں کی لچک، گلشن کی رنگینی

نزاکت کاہ کی، تنگی دہن کی، آنکھ کا جادو
دلِ صحرا کی وسعت، عزمِ کوہ، افلاک کی دوری

مسافر کی غریبی، جوشِ طوفاں، سختیِ منزل
تلاطم موج کا، ساحل کا استقلال ـ یکرنگی

محبّت کی کشاکش، شرمِ دُنیا، خوف عقبیٰ کا
درازی زلف کی، شانہ کی اُلجھن، دل کی بیتابی

لڑکپن، نوجوانی، عہدِ پیری، موت کی گھڑیاں
دلِ بیدردِ گلچیں، لحنِ بلبل، رقصِ طاؤسی

مزے تخییل کے، لطفِ تصوّر، خواب کی لذّت
نباتِ حُسن کی شیرینی، زہرِ عشق کی تلخی

تفوّق رنگ کا، فخرِ وطن، احساسِ قومیّت
برہنہ پائیِ مزدور، تاجِ فرقِ سلطانی

قدامت ہند کی، تہذیب مصر، ایجادِ امریکہ
عرب کا دین، تخییلِ عجم، یورپ کی پالیسی

ہوا کا زور، پانی کی روانی، آگ کی تابش
عقیلؔ انساں بنا کر، ایک "مُشتِ خاک" میں بھر دی

سیّد عقیل احمد جعفری

بہادر شاہ اور کرزن

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر ۱۹۳۹ء میں "اوراقِ پارینہ" کے عنوان سے ایک فرضی خط شایع ہوا ہے جس میں مصنف (مولوی عبدالسلام صاحب رفیقی) نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ مرحوم کے مزار کی خستہ حالت سے متاثر ہوکر بادشاہِ مرحوم کی طرف سے لارڈ کرزن سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کی قبر پر کوئی چھوٹی سی عمارت یا کم ازکم ایک جنگلہ بنوادیں تاکہ مرورِ زمانہ سے اس کا نشان بالکل نہ مٹ جائے۔

ہر حساس فرد کی یہ خواہش کہ اس کی قوم کے نشانات باقی رہیں بالکل بجا ہے اور اس لحاظ سے مولوی صاحب کی درخواست نہایت معقول تھی لیکن میرے خیال میں اس کا لہجہ قابلِ اعتراض ہے۔ اگر ہم یہ امر مدِنظر رکھیں کہ مولوی صاحب نے درخواست اپنی طرف سے نہیں بلکہ ایک بادشاہ کی طرف کی ہے تو ہمیں لازماً یہ پوچھنا پڑے گا کہ اس بادشاہ میں احساسِ خودداری کس قدر تھا تاکہ ہم یہ اندازہ کرسکیں کہ وہ ایک نائب بادشاہ (وائسرائے) کو خطاب کرتے وقت کیا لہجہ اختیار کرتا۔

بہادر شاہ مرحوم گو نام کا بادشاہ تھا، اور دُنیاوی طاقت اس کے پاس بہت کم تھی لیکن تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ اسے اپنی خاندانی وجاہت شاہانہ حیثیت اور ذاتی مرتبہ کا پورا احساس تھا۔ اس دعوے کے ثبوت میں دو واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے بادشاہِ مرحوم کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے، جو اُس وقت تقریباً دو تہائی ہندوستان کی مالک تھی، بے حد کوشش کی کہ بادشاہ طیب خاطر لال قلعے کو چھوڑ کر دہلی شہر سے باہر کہیں سکونت اختیار کرلے، لیکن غیور بادشاہ اپنی بے بسی اور تنگ دستی کے باوجود اپنی بات پر قائم رہا اور جب تک ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اُسے مجبور نہیں کیا، اُس نے اپنی آبائی و موروثی اقامت گاہ کو نہیں چھوڑا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب لارڈ ڈولزلی نے (جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عظمت اور طاقتور وائسرائوں میں تھا) پنجاب کی طرف سفر کرتے ہوئے بادشاہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو بادشاہ نے بخوشی اس درخواست کو قبول کیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگادی کہ پہلے کے دستور کے موافق دربار میں وائسرائے کی کرسی بادشاہ کے تخت سے نیچی رکھی جائے گی۔ اس وقت تک چونکہ بادشاہ کی طاقت بتدریج کم اور کمپنی کا دبدبہ بہت بڑھ چکا تھا اس لئے ولزلی نے اس شرط کو منظور نہ کیا، اور دونوں کی مُلاقات نہ ہوسکی۔ ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس غیور بادشاہ نے اپنی قیدِ حیات میں دوسرے کے سامنے گردن خم نہ کی وہ اب جب کہ وہ قیدِ حیات و قیدِ فرنگ دونوں سے چھوٹ چکا ہے کس طرح کسی غیر کے آگے اس عاجزانہ طور پر منت اور خوشامد کرے گا اور اپنی خودداری اور غیرت کو خاک میں ملاتے ہوئے اپنے سے کم مرتبہ شخص کے سامنے گڑگڑائے گا۔

نذیر احمد

جوگن

وُہ دُور اک خستہ جھونپڑے میں دِیے کی لَو تھرتھرا رہی ہے
کسی کے دِھیمے سُروں میں گانے کی مست آواز آ رہی ہے
وُہ دیکھو اک الگنی پہ دو چار مَیلے کپڑے لٹک رہے ہیں
وُہ ایک ننھّی سی مُورتی کرشن کی کھڑی مُسکرا رہی ہے
الاؤ کے پاس ایک جوگن ستار کو گود میں اُٹھائے
بڑی نزاکت سے اپنی آنکھوں سے بکھری زُلفیں ہٹا رہی ہے
کمال کی بےخودی ہے رُخ پر، غضب کی تیزی ہے اُنگلیوں میں
وُہ گا رہی ہے کہ آسماں پر کوئی پری اُڑتی جا رہی ہے
وُہ مدھ بھرے گیت گا کے اپنے سپاہی سوامی کی بےرُخی کے
ہوا کو بدمست کر رہی ہے، فضا کو جھُولا جھُلا رہی ہے
کبھی بھنوؤں کو سکیڑتی ہے، شکایتیں کر رہی ہے گویا
کبھی تصوّر میں اپنے پیتم سے اپنا چہرہ چھُپا رہی ہے
غرض یونہی رس بھرے ترانوں سے دم بخود ہو رہی ہے جوگن
گذشتہ لمحوں کی دُکھ بھری یاد اپنے دل سے بُھلا رہی ہے
وُہ اُس کی آنکھیں اُفق سے اُس پار گڑ گئیں ایک نوجواں پر
وُہ فرطِ حیرت سے کانپ کر اپنی اُنگلیوں کو چبا رہی ہے
مگر اُسے کیا خیال آیا کہ کرشن کی مُورتی پہ جُھک کر
وُہ ایک اندازِ بےخودی میں وطن کا نعرہ لگا رہی ہے

احمد ندیم قاسمی

اگر مَیں بادشاہ ہوتا

اُس نے کہا: "اگر مَیں بادشاہ ہوتا،

اُور تم ایک غریب بھکارن،

تو مَیں تمہیں اپنے قوی ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیتا اُور تمہارے

سر پر تاج رکھ کر تمہیں ملکہ بناتا،

لوگوں کو ایک عظیم الشّان بادشاہ کی دُلہن کے متعلق گمان بھی نہ ہو سکتا،

یا وُہ بھُول جاتے،

کہ یہ کبھی محض ایک غریب بھکارن تھی۔"

اُس نے جواب دیا: "اگر مَیں ملکہ ہوتی،

اُور تم ایک بے پروا رمتے جوگی،

جو پھرتے پھراتے میرے خوبصورت دربار میں آ نکلتے،

تو مَیں تمہیں تخت پر بٹھا دیتی،

اُور تم کو وہاں کا سب سے بڑا بادشاہ سمجھ کر،

فرطِ عقیدت سے تمہارے سامنے گھٹنوں کے بل جھُک جاتی،

اُور ایک کنیز بن کر عمر بھر تمہاری خدمت گزار رہتی۔"

الزبتھ برلینڈ

ترجمہ از حامد علی خاں

اُردو ہندی اَور ہندو مسلمان

ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے دو بڑے علمبردار ہندو مسلمان ہیں اور چھوٹے چھوٹے تو بہت ہیں۔ آج جب کہ تمام دُنیا ایک بڑی اقتصادی جنگ میں مصروف ہے۔ قدرتی طور پر ہندوستان میں بھی یہ کشمکش جاری ہے لیکن یہاں محض جرمنی اور اٹلی کی طرح نسلی اور روس کی طرح جماعتی کشمکش نہیں بلکہ اس مُلک میں اِس جنگ کے دو پہلو ہیں:۔

(۱) ہندوستان اَور برطانوی ملوکیت کے درمیان۔

(۲) آپس میں یعنی مذہبی جدوجہد یا فرقہ وارانہ کشمکش کے پردے میں۔

اب تک لوگ صرف "مذہب خطرہ میں ہے" سُنتے تھے اَور اس کے عادی ہو چکے تھے کہ اب نیا شگوفہ "تمدن وتہذیب خطرہ میں ہے" اس چمن میں کھلا ہے اور اس کے لئے جنگ کا محاذ زبان کو بنایا گیا ہے۔

متحدہ قومیت کا تقاضا ہے کہ تمام ہندوستانیوں کی ایک زبان، ایک معاشرت اور ایک تہذیب ہو تاکہ آپس میں اظہارِ خیال وکاروبار میں آسانی ہو، لیکن سب سے پیشتر ہماری ترقی کے لئے ایک عام زبان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ضرورت کوئی نئی نہیں۔ ہندوستان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں یہ ضرورت ہمیشہ سے محسوس کی جاتی تھی۔ اسی احساس کا نتیجہ یہ زبان ہے جو میں آپ سے مخاطب ہونے کے لئے استعمال کر رہا ہوں۔ اس کا ادبی ذخیرہ بھی محتاج بیان نہیں۔

اُردو یا ہندوستانی ہمارے یعنی ہندوستانیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کی تاریخ سو پچاس سال نہیں۔ بلکہ صدہا سال پُرانی ہے البتہ اس نے مختلف زمانوں میں اپنا حلیہ، جُون یا نام ضرور بدلا ہے۔

ہندوستان کے اصلی باشندے کول، دراوڑ اور بھیل تھے۔ ان کی زبان سنسکرت سے مختلف تھی۔ آریہ جب ہندوستان میں آئے تو سنسکرت کو اپنے ساتھ لائے۔ وہ اس زبان کو عوام کے اثر سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس کا استعمال خواص کے لئے مخصوص رکھا گیا، اور اس کو دیو بانی کہنے لگے۔ عوام کے لئے پراکرت یعنی (غیر مصنوعی) وجود میں آئی۔ اس امر کی تصدیق کالی داس کی شکنتلا سے ہوتی ہے۔ اس میں بادشاہ امراء، وزراء، اور پنڈت سنسکرت بولتے ہیں اور دیگر لوگ پراکرت، اس پراکرت کی ملک کے مختلف حصّوں میں گیارہ مختلف شکلیں ہو گئیں۔ مثلاً مگدھی جس کی موجودہ شکلیں بہاری، بنگالی، اڑیا اور آسامی ہیں (۲) آدنتی جس کی موجودہ شکلیں راجستھانی اور پہاڑی ہیں۔ (۳) اردھ مگدھی جو آج مشرقی ہندی کہلاتی ہیں، ان کے علاوہ پراکرت کی مختلف شکلیں جو اس وقت ہمارے مُلک میں رائج ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔ کشمیری، کوہستانی،

مغربی پنجابی، سندھی، گجراتی اور مرہٹی۔

ساتویں صدی عیسوی سے پہلے مسلمانوں کے تجارتی تعلقات ساحلِ ملیبار سے ہوئے۔ ان کی زبان عربی و فارسی تھی۔ فارسی کی اصل وُہی تھی جو سنسکرت کی ہے۔ مگر وقت کے گزرنے سے ان میں مشابہت بہت کم رہ گئی۔ جب فارسی ہندوستان میں آئی تو وہ سنسکرت پر تو اپنا اثر نہ ڈال سکی کیونکہ اُسے دیوبانی ہونے کی حیثیت سے بڑی حفاظت کے ساتھ پاک وصاف رکھا جاتا تھا۔ البتہ پراکرت فارسی کے اثر سے نہ بچ سکی اور عربی و فارسی کے الفاظ رفتہ رفتہ اس میں جذب ہوتے رہے۔

باقاعدہ ہندی ادب کی جو شروع میں محض مدحیہ شاعری پر مشتمل تھا، بنیاد اس زمانہ میں پڑی جب پرتھوی راج اور دُوسرے راجپوت سردار مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے۔ ہندی شاعری کا سب سے قدیم سرمایہ وہ قصائد ہیں جو ان راجپوت سرداروں کے درباری شعراء نے ان کی مدح میں لکھے۔ مسلمانوں نے نہ صرف ہندی کی نشو و نما اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا، بلکہ ہندی ادب کے سب سے ابتدائی زمانہ میں بھی مسلمان شعراء کی تعداد ہندوؤں سے کچھ کم نہ تھی۔ چنانچہ ۷۰۰ء سے لے کر ۱۱۵۰ء تک ہندی شعراء میں صرف ۶ نام ممتاز ہیں: پشیہ یا پنڈا، کدار، انانیداس، قطب علی، اکرم فیض اور مسعود۔ ان میں سے آدھے مسلمان ہیں۔

اس کے بعد پراکرت کچھ بدلنی شروع ہوئی اور ۱۱۵۰ء سے ۱۴۰۰ء تک (اڑھائی سَو سال میں) اس زبان میں کافی تغیّر واقع ہوگیا۔ اس زمانہ کے مشہور شعراء چاند باردی، سارنگ دھر، امیر خسرو، بھوپتی اور مُلّا داؤد ہیں۔

پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے اثر سے ہندوؤں میں ایک نئی مذہبی تحریک پیدا ہوئی جس کے علمبردار راما نند، کبیر اور نانک ہیں۔ اس تحریک نے ہندی ادب پر گہرا اثر ڈالا ہے کیونکہ "بھگتی مارگ" کے اکثر رہنماؤں نے شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور شاعری کے ذریعہ ہی اپنا پیغام عوام تک پہنچایا۔ اِن مذہبی شعراء میں راما نند کے سب سے مشہور چیلے کبیر کا نام جو ایک مسلمان جُلاہا تھا نہایت ممتاز ہے۔ ۱۴۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک (ڈیڑھ سَو سال) کے عرصہ میں کبیر اور نانک کے علاوہ ان شعراء کے نام سننے میں آتے ہیں، ولبھ آچاریہ، میرا بائی، ودیاپتی، اور ملک محمد جائسی۔ ملک محمد جائسی کی نظم "پدماوتی" میں (جس پر کہ علاؤالدین اور پدمنی کے مشہور قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے) فارسی کے کافی الفاظ اور محاورے شامل ہیں۔ یہ نظم دراصل فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی۔ اِس لحاظ سے اسے فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی سب سے قدیم اُردو نظم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مغلوں سے پہلے ہندی شاعری کی تمام کائنات بھاٹوں کے چند گیت درباری شعراء کی کچھ مدحیہ نظمیں اور کبیر اور اس کے ہم عصر شعراء کا مذہبی کلام تھا۔ ہندی شاعری کے عروج کا زمانہ مغلوں کے عروج کا زمانہ ہے اگرچہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی لیکن تمدّنی اور درباری زبان فارسی تھی۔ اکثر ہندوؤں کو جو دربار سے وابستہ تھے یہ زبان سیکھنی پڑی۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہندی شاعری پر بالواسطہ بہت اثر پڑا۔ ہندی شاعری میں رعنائی آگئی۔ اور اس کا معیار بھی قدرے بلند ہوگیا، عروض پر بھی اس کا تھوڑا بہت اثر ہُوا۔

مغلوں کی سرپرستی میں ہندی کو جو فروغ حاصل ہُوا، خود ہندو بادشاہوں کے عہد میں اس کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہ ہُوا تھا۔ اکبر خود ہندی کا شاعر تھا اور اس لئے ہندی شعراء کی نہایت فیاضی کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ فیضی نہ صرف فارسی کا شاعر تھا بلکہ اس نے ہندی میں بھی شعر کہے ہیں۔ اکبر کے وزراء میں سے بہترین ہندی شاعر بیرم خاں کا بیٹا عبدالرحیم خاں خاناں تھا۔ وہ سنسکرت کا عالم تھا اور نہ صرف خود شاعر تھا بلکہ بہت سے ہندی شعراء بخصوصاً گنگ کوی کا سرپرست تھا۔ "نیتی" یعنی اخلاق پر اس نے ہندی میں جو نظمیں کہی ہیں۔ وُہ نہائت بلند پایہ ہیں اور آج بھی انہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ "رحیم ستسا" اس کی مشہور کتاب ہے جو نظم میں لکھی گئی ہے۔

جہانگیر بھی ہندی شعراء کا بڑا سرپرست تھا۔

شاہجہان کے عہد میں ہندی نے بہت ترقی کی اور اس زمانے کے مشہور شعراء سندر بھوشن ترپاٹھی، مانی رام ترپاٹھی اور بہاری لال چوبے ہیں۔

دارا شکوہ کو ہندو مذہب، ہندو فلسفہ اور ہندی و سنسکرت سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ وُہ بہت سے ہندی شعراء کا سرپرست تھا۔ مسلمانوں کا ہندی سے یہ تعلق اورنگ زیب کے عہد میں بھی نہ صرف جاری رہا بلکہ زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ ۱۵۵۰ء سے ۱۸۰۰ء تک ہندی میں بے شمار شاعر پیدا ہوئے۔ تلسی داس اور سور داس اس زمانے کے چوٹی کے شاعر ہیں۔ لیکن مسلمان اس دور میں ہندو بھائیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ عالم، مبارک علی، نظیر، نور محمد اور صوفی شعراء مثلاً دریا صاحب بہاری، دریا صاحب میواڑی، بلھے شاہ اور یاری صاحب کا نام اس امر کی ضمانت ہے کہ ہندی پر مسلمانوں کا حق اگر ہندوؤں سے زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں۔

مسلمانوں کے زوال کے بعد انگریز ہندوستان میں آئے۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب اس مُلک میں خود مسلمانوں کی بقا خطرہ میں تھی۔ اِس لئے مسلمان ہندی ادب کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ البتہ انفرادی طور پر مسلمان شعراء آج تک ہندی میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ ہمارے زمانے میں مقبول احمد پوری کا نام قابلِ ذکر ہے جو علامہ اقبالؒ کی پیامِ مشرق کا ہندی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اِس دَور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی سرپرستی میں یورپین افسروں کے لئے ہندی نثر میں کتابیں لکھوائیں۔ لیکن اس دَوران میں اُردو بتدریج ترقی کرتے ہوئے عوام کی زبان بن چکی تھی، اور لوگ بلا قید مذہب و ملّت اُردو کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ اگرچہ اُردو نے اپنا بیشتر سرمایہ ہندی سے لیا، مگر ہندی کی حیثیت بطور ایک علیحدہ زبان کے عوام کی زبان کے بجائے ایک محدود طبقہ کی ادبی زبان کی رہ گئی تھی۔ جس طرح آریوں کے زمانے میں امراء، عمائد اور پنڈتوں کی زبان سنسکرت اور عوام کی زبان پراکرت تھی۔ اسی طرح مسلمان امراء وغیرہ کی زبان تو فارسی ہی تھی۔ لیکن ہندو و مسلمان عوام کی زبان اُردو تھی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کو باقاعدہ طور پر اُردو کا نام کب دیا گیا۔ اس سوال کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا، کافی عرصہ تک یہ زبان ہندی ہی کہلاتی رہی۔ اس کی تاریخ شاہد ہے کہ پہلی بار اُردو کا لفظ بطور زبانِ اُردو مصحفی (۱۷۵۰ء۔۱۸۲۴ء) نے اپنی نظموں میں استعمال کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُنیسویں صدی کی ابتدا تک یہ زبان ہندی ہی کے نام سے موسوم رہی کیونکہ ۱۷۹۰ء میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے اُردو ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں یہ نہیں لکھا کہ میں قرآن مجید کا ترجمہ اُردو یا ریختہ میں کر رہا ہوں، بلکہ اُردو یا ریختہ کے بجائے ہندی کا لفظ

استعمال کیا ہے۔ بہرحال انیسویں صدی کے اوائل میں اُردو کے لفظ کو قبول عام حاصل ہوگیا تھا۔

مسلمانوں نے ہندی کی تعمیر و ترقی میں جو نمایاں حصّہ لیا۔ وہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں نے بھی اُردو کے لئے کچھ کم کام نہیں کیا۔ اردو کے سب سے ابتدائی دَور میں ہندو شعراء نے اس زبان میں جو آئندہ چل کر ملک کی مشترکہ زبان ہونے والی تھی، طبع آزمائی کی، اُردو سے ہندوؤں کا یہ تعلق آج تک برابر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں چند ہندو شعراء اور اُدباء کے نام لینا کچھ ناموزوں نہ ہوگا۔ چندو لال شاداں (۱۷۶۶ء – ۱۸۴۵ء) نہ صرف اُردو شعراء کے سرپرست تھے بلکہ خود اُنہوں نے اُردو میں دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ اُردو اور ہندوؤں کا یہ تعلق کچھ اس زبان کے ابتدائی زمانہ تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہندو شعراء ہمیشہ اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ منشی شنکر دیال فرحت، منشی رام سہائے تمنّا اور کئی دُوسرے ہندو شعراء نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم وغیرہ مذہبی کتابیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ بہت سے اُپنشد سارے کے سارے شاستر اور سمرتیاں اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ تو مذہبی کتابوں کا حال ہُوا۔ اب عام لٹریچر کا قصّہ سنئے لالہ جی لال جی اور منشی نہال چند لاہوری اُردو کے پُرانے محسنوں میں سے ہیں۔ پروفیسر رام چند دہلوی نے اُردو میں ریاضی پر کافی کتابیں لکھی ہیں۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی، داغ کے سرپرست اور اُردو کے شاعر تھے۔ اسی طرح دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، پیارے لال، درگا سہائے سرور، سری رام، چکبست اور پریم چند کی ادبی خدمات بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ اُردو ہندی کے مسئلہ کو خواہ مخواہ ایک فرقہ وارانہ مسئلہ بنا لیا گیا ہے، ہندو قوم میں سر سپرو، دیا نرائن نگم، کیفی اور محروم ایسے واجب الاحترام بزرگ موجود ہیں جن پر اُردو زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

اُردو ہندو مسلمانوں کی باہمی اور صدیوں کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہی ایک زبان ہے جو ہندوستان میں بلا تمیز مذہب و ملّت ہر شخص کی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اگر قانونِ قدرت *Survival of the fittest* بقائے اصلح صحیح ہے تو اُردو ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہندوستان میں ہر انقلاب کے بعد زندہ نکل آئی ہے۔ اس نے بہت سے خزاں و بہار دیکھے ہیں، اس کو کسی خاص مذہب یا فرقہ سے منسوب کرنا صریحاً ناانصافی ہے۔

ہمارے سامنے آج یہ سوال پیش ہے کہ آیا اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے یا تمام ہندوستانیوں کی؟ اور کیا اسے واقعی یہ درجۂ امتیاز حاصل ہو سکتا ہے کہ اسے ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار دے دیا جائے؟ اس مسئلہ پر غور کرنے والے حضرات تین قسموں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) ہندو فرقہ پرست

(۲) مسلمان فرقہ پرست

(۳) ہندوستانی

اِن تینوں کو سمجھنے کے لئے آپ کو انہی کی طرح سوچنا پڑے گا۔

فرقہ پرست ہندو یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان آریہ ورت ہے جہاں صرف ہندوؤں ہی کو رہنے کا حق حاصل ہے، اس لئے تمام ہندوستانیوں کو ہمارا مذہب ہماری تہذیب اور ہماری زبان اختیار کر لینی چاہئے۔ ہم سے اختلاف رکھنے والے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں۔ ورنہ ان کی ایک ایک چیز فنا کر دی جائے گی۔ جرمنی سے یہودیوں کے اخراج نے اُسے ایک بڑی خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ اپنی بھولی ہوئی کہانیاں پھر یاد کر رہا ہے، جو سبق فراموش کئے جا چکے تھے پھر دُہرائے جا رہے ہیں، ان میں شاید ہندی کا پرچار بھی شامل ہے، ہندی بھی وہ ہندی نہیں جو اُردو سے صرف رسم الخط کے اعتبار سے مختلف ہے۔ بلکہ وُہ پراکرت جو مسلمانوں کے اثر سے ملیچھ نہ ہو یعنی اس میں عربی و فارسی کے عام فہم اور رائج الوقت الفاظ بھی نہ ہوں، اور یہ ناگری حروف میں لکھی جاتی ہو۔ مثلاً صوبہ متحدہ کی بجائے جُٹ پرانت، اعلان کی بجائے گھوشن، مدعی کی بجائے جھگڑا اپیلدو کی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس قسم کی کوئی زبان ہندوستان میں کبھی نہ تھی۔ اسے اب بنایا جا رہا ہے اُردو پرست پر بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی پروردہ ہے۔ اور فارسی رسم الخط میں کیوں لکھی جاتی ہے۔ وہ لوگ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ زبان جتنی مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ خود اُن کی۔ کیونکہ اگر اس میں سے ہندی (یعنی وہ زبان جو مغلوں سے پہلے ہندوستان میں بولتے تھے) کا ڈھانچہ نکال دیا جائے تو یہ ساری عمارت زمین پر ڈھیر ہو جائے گی۔ اس کی نہ کوئی صورت ہوگی نہ ترتیب، صرف عربی، فارسی، ترکی انگریزی زبانوں کے الفاظ ہوں گے جن کو آپس میں ملانے کا کوئی ذریعہ نہ ہوگا۔

فرقہ پرست ہندو کے ان دعاوی اور تنگ نظرانہ خیالات کے باوجود *Survival of the fittest* بقائے اصلح کے قانونِ فطرت کے مطابق عام ہندو اُردو ہی کو اپنی زبان سمجھتے اور بطور ایک مشترکہ زبان کے استعمال کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ خود ہندو فرقہ پرست کا طرزِ عمل اپنے عام بھائیوں سے کچھ مختلف نہیں پنجاب سے بڑھ کر فرقہ پرستی کا گڑھ اور کہاں ہوگا۔ پنجاب کے اخبارات سے زیادہ فرقہ پرستی کا حامی اور کون ہوگا لیکن ذرا یہ اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے۔ پنجاب میں ان اخبارات کی اشاعت جو ہندی میں چھپتے ہیں اُردو کے مقابلہ پر ۱۰ فیصدی سے بھی کم ہے:۔

پرتاپ	۲۲ ہزار
ملاپ	۲۰ ہزار
ویر بھارت	۵ ہزار
احسان	۵ ہزار
زمیندار	۶ ہزار
انقلاب	۳ ہزار
کُل[1]	۶۱ ہزار

اس کے مقابلہ پر پنجاب سے صرف ایک اخبار "ہندی ملاپ" نکلتا ہے۔ جس کی اشاعت ۶ ہزار ہے۔ ہندی میں ایک اور روزانہ اخبار "شکتی"

---

[1] ہم جانتے ہیں کہ ان اخبارات کی اصل تعداد اشاعت اس نقشہ سے مختلف ہے، لیکن ہم نے وہی تعداد درج کرنا مناسب سمجھا ہے جس کا دعویٰ یہ اخبارات خود کرتے ہیں۔ راقم

بھی نکالا گیا تھا۔ لیکن وہ ہندو پبلک کی "ہندی نوازی" کے ہاتھوں چند ماہ سسک سسک کر ختم ہو گیا، اور لطف یہ ہے کہ پنجاب کے اخبار بینوں میں مسلمانوں کی تعداد صرف بیس فیصدی ہے۔

پنجاب کے فرقہ پرست ہندو اخبار نویس اگر دیانت داری کے ساتھ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ہندی ہی ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے تو وہ ایک ہفتہ کے لئے اپنے اخبار ہندی بحروفِ ناگری میں نکال دیکھیں، پبلک کا رجحان انہیں خود بخود بتا دے گا کہ ہندی و اُردو دونوں زبانوں میں سے کونسی زبان میں ہندوستان کی قومی زبان ہونے کی صلاحیت ہے۔

دوسری طرف مسلمان فرقہ پرست ہے، اس کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی ہے۔ اس کو اُردو سے کوئی بیر نہیں کیونکہ موجودہ حالات میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے کے لئے یہاں کی زبان استعمال کرنی ہوگی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اقتصادی کشمکش کی وجہ سے رواداری کو فراموش کر کے بلا ضرورت اس میں عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ ٹھونستا ہے، تاکہ جتنا بھی اس کی مذہبی و تمدنی زبانوں کا اثر پڑ سکے پڑے۔ اگر اس سوال پر تعصب کی عینک اُتار کر ایک فرقہ پرست ہندو یا مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک محبِ وطن ہندوستانی کی طرح غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُردو میں ہندی سے کہیں زیادہ ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ بنگال، بہار، بمبئی، وسطِ ہند بلکہ برما تک میں اُردو سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ ان صوبوں کی اپنی اپنی مقامی زبانیں ہیں اور ان میں تھوڑا یا بہت ادبی ذخیرہ بھی موجود ہے لیکن ایک مشترکہ زبان کا کام اُردو ہی سے لیا جاتا ہے۔

نئی نسل کا رجحان واضح اور غیر مبہم طور پر اُردو کے حق میں ہے۔ اس کا ثبوت گورنمنٹ کالج لاہور اور ایف سی کالج لاہور میں اُردو اور ہندی پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کے موازنہ سے لگایا جا سکتا ہے:-

ایف سی کالج لاہور	اُردو	ہندی	پنجابی
سالِ اوّل	۱۸۷	۸۰	۱۴
سالِ دوم	۱۸۰	۴۸	۱۵
سالِ سوم	۱۴۱	۶۰	۲۳
سالِ چہارم	۱۲۵	۴۲	۲۱
	۶۳۳	۲۳۰	۷۳
	۶۷٪	۲۴٫۵٪	۸٪

اِس کالج میں مسلمان طلبہ کی تعداد صرف ۲۱ فیصدی ہے حالانکہ ۶۷ فیصدی طلبہ اُردو پڑھتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور	اُردو	ہندی	پنجابی
سالِ اوّل	۱۴۱	۴۱	۱۸
سالِ دوم	۱۱۰	۴۲	۲۱

	اُردو	ہندی	پنجابی
سالِ سوم	۹۰	۲۱	۷
سالِ چہارم	۶۹	۲۵	۹
	۴۱۰	۱۲۹	۵۵
	۶۹%	۲۱.۷%	۹.۳%

اس کالج میں مسلمان لڑکوں کی تعداد صرف ۴۰ فیصدی ہے۔ اسی طرح آئی سی ایس اور پی سی ایس اور دوسرے تمام مقابلہ کے امتحانوں میں جہاں ملکی زبانوں کو بطور لازمی یا اختیاری زبان کے لینا پڑتا ہے۔ تقریباً ۷۰ فیصدی طلبہ اُردو لیتے ہیں۔

یہ اعداد و شمار زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اُردو ہندی کا مسئلہ قطعاً ایک فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں اور اُردو کو مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی سرپرستی حاصل ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے واجب الاحترام سیاسی راہنما گاندھی جی جنہیں اس گتھی کو سُلجھانا چاہئے تھا فرقہ پرستی کی اس آگ کو اپنے دامن سے نادانستہ طور پر ہوا دے رہے ہیں، اس کی وجہ بقول ایک نہایت نامور دار کانگرسی راہنما کے یہ ہے کہ گاندھی جی نہ اُردو کے ادیب ہیں نہ ہندی کے۔ وُہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندی اصل ہندوستانی بحروفِ ناگری بھی کوئی زبان ہے اور وہ ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے حالانکہ ہندوستان میں اس قسم کی کسی زبان کا وجود نہیں پایا جاتا۔ گاندھی جی کی شہ سے فرقہ پرست ہندوؤں نے یہ موقع غنیمت سمجھا کہ اپنا یہ دعویٰ کہ ہندی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے، زیادہ شد و مد کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس پر قدرتی سوال یہ ہُوا کہ رسم الخط کیا ہو؛ جواب ملا کہ ناگری۔ شاید اس وقت وُہ یہ بھُول گیا کہ اُردو ہندو مسلمانوں کے درمیان زبان کے مسئلہ کا ایک قدرتی اور ناطق فیصلہ ہے۔ اگر ہندو اس سے پیچھے ہٹیں گے تو شاید مسلمانوں کو یہ کہنے میں عار نہ ہو کہ اُردو ہندی یا ہندوستانی کوئی بھی ہماری زبان نہیں ہے، ہماری زبان فارسی یا عربی ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے فارسی ابھی مُردہ نہیں ہوئی۔ اب تک پُرانے خاندانوں میں خط وکتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ فارسی کرۂ ارض کی زندہ زبانوں میں سے ہے۔ ہندوستان کے ہمسایہ مسلمان ممالک افغانستان ایران عراق میں فارسی کا استعمال ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ اگر مسلمان فارسی اور ہندو مسلمانوں سے پیشتر کی ہندی یعنی پراکرت کا استعمال کرنے لگیں تو ہندوستان کی ترقی کو کتنا بڑا دھکا پہنچے گا گھڑی کی سوئیاں پیچھے کرنا عقلمندی نہیں، فارسی اور پراکرت کے امتزاج کا نتیجہ پھر اُردو ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال ہندو مسلمان کا نہیں کیونکہ اس کے لئے دو دعویٰ دار ہونے ضروری ہیں، ایک اُردو کو محض اپنا بتائے اور دوسرا اس دعوے کو غلط کہے مگر یہاں فرقہ پرست ہندو کہتا ہے کہ اُردو ہماری نہیں، اور مسلمان یہ نہیں کہتے کہ اُردو صرف ہماری زبان ہے کیونکہ ان کی تمدنی زبان فارسی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ جھگڑا ان خودغرض اور فرقہ پرست لوگوں کا پیدا کردہ ہے جو یہ جان گئے ہیں کہ "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ بلند کر کے عوام کو زیادہ دیر تک دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اِس لئے اُنہوں نے ابھی سے "تہذیب و تمدن خطرہ میں" کا شور مچانا شروع کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ہندو سرمایہ دار اس تحریک کی نہایت دریا دلی سے امداد کر رہے ہیں۔ رجعت پسند سرمایہ دار یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان کی ترقی کچھ دن اور رُک جائے۔ گرے ہوئے دانے چگ لوں ہچوڑی ہوئی ہڈی کو حکومتِ برطانیہ کے سایہ میں کچھ دن اور چچوڑتا رہوں۔

اگر ان خود غرض لوگوں کی یہ چال کامیاب ہو گئی۔ تو یہ ہندو مسلم اتحاد کے کفن کا آخری ٹانکا ہوگا۔

خواجہ شبیر حسن

رباعیات

خدا

ہر ذرّے میں ہے جلوہ نما حسن کا جمال
ممکن نہیں حسنِ ہستیٔ اکمل کو زوال
ہر رنگ میں ہر شان میں یکتا ہے جو
ہے قید میں بے جہت، بے نزول اُس کی مثال

رسولِ کریم

کونین کا سردار ہوا مکّے کا یتیم
اک ساکنِ صحرا ہوا عرش مقیم
کیا شان ہے کیا شان ہے اللہ اللہ
پایا ہے لقب نبی و رسولِ کریم

محبوبِ خدا

طالب ہیں ترے اہلِ مراد، مطلوب ہے تو
ہاں خوب ہے اکمل، تو ہی مقصود ہے تو
صورت تری اجمل، تری سیرت ہے نکو
ہر شان میں اللہ کا محبوب ہے تو

قرآنِ کریم

فطرت کا ہر اک راز نہاں اس سے عیاں
سن کر اسے حیرت میں ہیں فصیحانِ جہاں
محبوبِ زباں کیوں نہ ہو قرآنِ کریم
اللہ کا کلام اور محمد کی زباں

کعبہ

معمار تھے کعبے کی عمارت کے خلیل
کعبے کو ہی اقطار بنا خود رب جلیل
دنیا میں ہے اسلام کا مرکز کعبہ
یہ نکتہ ہے کعبے کی فضیلت پہ دلیل

مسلم

جو رب کے لئے جیتا ہے وہی مسلم ہے
اللہ سے جو ڈرتا ہے وہی مسلم ہے
باطل کو جو ٹھکراتا ہے مسلم ہے
جو دین پہ مرتا ہے وہی مسلم ہے

پیغامِ عمل

کیوں مجھ کو نہ پیغامِ عمل خوش آئے
کیوں دل کو نہ یہ نغمۂ تسبیح بھائے
وہ جس نے یہ پیغامِ عمل سن رکھا ہے
لے کر جسے دنیا میں پیغمبر آئے

تعلیمِ نسواں

دولت کو نہ تقسیم سے محروم کرو
ملت کو نہ تنظیم سے محروم کرو
کر جاؤ یہ ہو مرد ہو یا ہو مرد
عورت کو نہ تعلیم سے محروم کرو

امر چند قیس جالندھری

تاش کا کھیل

"بعض لوگوں میں یہ مرض ہوتا ہے کہ موقع و محل دیکھے بغیر وہ ہر جگہ تاش کے شعبدے دکھانے شروع کر دیتے ہیں۔
اس مکالمہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایسے حضرات سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

کھیل کے ختم ہوتے ہی "شعبدہ باز" دوست تاش ہاتھ میں لے کر فرماتے ہیں "آپ نے کبھی تاش کا کوئی کھیل دیکھا ہے؟ میں آپ کو ایک دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں۔ ایک پتہ کھینچ لیجئے گا"

"شکریہ! مجھے معاف رکھیئے۔"

"کیا حرج ہے۔ کھینچئے تو کوئی سا پتہ۔ اور میں بتا دوں گا کہ آپ نے کونسا پتہ کھینچا ہے۔"

"کیسے بتا دیں گے آپ؟"

"مذاق نہ کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ جو پتہ کھینچیں گے میں بتا دوں گا کہ آپ نے یہ پتہ کھینچا ہے۔"

"جون سا میں چاہوں؟"

"ہاں"

"کسی رنگ کا؟"

"ہاں کسی رنگ کا"

"چھوٹے بڑے کی تو کوئی تمیز نہیں؟"

"بالکل نہیں"

"بہت اچھا۔ میں چڑیا کا اکا کھینچتا ہوں"

"لاحول ولا۔ میں نے کہا تاش میں سے کوئی سا پتہ کھینچئے۔"

"اوہو! میں تاش میں سے نکال لوں یہ مطلب ہے نا آپ کا۔ اب سمجھا میں"

"تاش مجھے دے دیجئے گا — بہت اچھا میں نے ایک پتہ نکال لیا ہے۔"

"کھینچ لیا ہے آپ نے؟"

"جی ہاں - یہ پان کا غلام ہے - کیا آپ جانتے تھے ؟"

"آپ نے مجھے کیوں بتادیا ؛ اس طرح تو سب لُطف غارت ہوجاتا ہے - اب پھر کوشش کیجئے - کھینچیے کا ایک پتّہ ۔"

"بہت خوب ، مَیں نے نکال لیا ہے ۔"

"بہتر - اسے دوبارہ تاش میں رکھ دیجئے ــــ شکریہ ۔" (پتّوں کو ملایا جاتا ہے ۔)

"لیجئے (ذرا فاتحانہ انداز سے) یہی ہے نا آپ کا پتّہ ؟"

"معلوم نہیں - مَیں نے تو اچھی طرح دیکھا ہی نہ تھا ۔"

"اچھی طرح دیکھا ہی نہ تھا - عجیب آدمی ہیں آپ بھی - پتّے کو اچھی طرح دیکھئے اَور یہ بات یاد رکھیئے کہ کون سا پتّہ آپ نے کھینچا تھا ۔"

"اب سمجھا - آپ کا مطلب ہے کہ میں اسے پشت کے بجائے دوسری طرف سے دیکھوں ۔"

"جی ہاں ـــ اب کھینچیے پھر"

"بہت خوب - مَیں نے نکال لیا ہے ۔"

(پتّوں کو ملایا جاتا ہے)

"مگر یہ تو بتائیے کہ آپ نے اپنا پتّہ دوبارہ تاش میں رکھ تو دیا تھا ؟"

"نہیں تو - یہ دیکھئے - میرے پاس ہے ۔"

"خدا کے لئے میری بات غور سے سنئے ــــ ایک پتّہ نکال لیجئے ــــ کوئی سا ــــ اُسے غور سے دیکھئے ــــ یاد رکھیئے کہ کون سا پتّہ ہے ــــ پھر اسے دوبارہ تاش میں رکھ دیجئے ــــ سمجھے آپ :"

"جی ہاں - اب میں سب کچھ جان گیا ہوں - مجھے صرف اس بات پر تعجب آتا ہے کہ آپ یہ کیسے بتادیں گے ــــ جادُوگر ہیں آپ شاید ؟"

(تاش کو ملایا جا رہا ہے)

"یہ رہا آپ کا پتّہ ــــ یہی ہے نا ؟"

(صاف انکار کر دیجئے)

"نہیں یہ میرا پتّہ نہیں ہے ۔"

(اگرچہ یہ سفید جھوٹ ہے - لیکن خدا آپ کو معاف کر دے گا ۔)

"یہ آپ کا پتہ نہیں ؟ کیا کہا آپ نے — غضب خدا کا — یہ کھیل میں کوئی سو دفعہ کامیابی کے ساتھ دکھا چکا ہوں۔ میں نے ابا کو دکھایا۔ اماں کو دکھایا — میں ہر مہمان کو یہ کھیل دکھایا کرتا ہوں۔ دوبارہ کھینچئے ایک پتہ"

(پتوں کو ملایا جا رہا ہے)

"لیجئے یہ ہے آپ کا پتہ"

"ہرگز نہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ میرا پتہ نہیں۔ لیکن ایک دفعہ اور قسمت آزمائیے۔ شاید اب آپ بتا سکیں"

"— معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ جوش میں آ گئے ہیں — دراصل یہ میری حماقت ہے — اب ذرا آرام کرسی پر آدھ گھنٹے تک خاموشی سے بیٹھئے۔ ذرا حواس درست ہو جائیں تو پھر دوبارہ کوشش کیجئے گا"

× × × × × × ×

× × × × ×

"رات بہت گزر گئی ہے اور آپ کو گھر پہنچنا ہے۔ ورنہ کھیل واقعی بڑا عجیب تھا۔ اچھا خدا حافظ"

(لی کاک) حمید نظامی

ہم نے آج کیا کیا ہے ؟

آئندہ ہم بہت کچھ کریں گے

لیکن ہم نے آج کیا کیا ہے ؟

آئندہ ہم خزانے بخش دیں گے۔

لیکن ہم نے آج کیا دیا ہے ؟

(نکسن واٹرمین) حامد علی خاں

غزل

بُتانِ دَیر سے شکوا نہیں ہے — جو سُنتا ہے وُہی سُنتا نہیں ہے

کہاں ہیں شاکیٔ انجامِ اُلفت — یہاں آغاز ہی اچھا نہیں ہے

مِرے ذوقِ پرستش کے مخالف — مرا سجدہ ترا سجدا نہیں ہے

ہمارے دل میں موزوں ہے ترا غم — جہاں جو چیز ہے بے جا نہیں ہے

مناظر کی سِکئے جاتا ہوں پُوجا — خدا کو آنکھ سے دیکھا نہیں ہے

یہ اندازِ تحمل آفریں کیا ؟ — کبھی پردا کبھی پردا نہیں ہے

نہیں جاتے وہ میرے سامنے سے — سمجھتے ہیں ابھی دیکھا نہیں ہے

مری آنکھیں، مِرا منشا، مِرا دِل — نہیں وہ باوفا۔ اچھا! نہیں ہے

تڑپ دِل کی کہاں تک چھُپ سکے گی، — زمانہ دیکھنے والا نہیں ہے

تجھے اَے شادؔ خود داری مبارک
مگر دُنیا کا یہ شیوا نہیں ہے

شادؔ عارفی

دھڑکن

میرے رشتے کے بھائیوں کی ماشاءاللہ ایک پوری فوج ہے لیکن رشید بھائی کی شخصیت اب تک میرے ذہن پر کچھ اس قدر چھائی رہی ہے کہ خالاؤں اور چچاؤں کے لڑکوں کے متعلق میں نے اس سے زیادہ سوچنے کی کوشش کبھی نہیں کی کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں اور انہیں سلام کرنا ضروری ہے۔

رشید بھائی منزور بچپن ہی سے ہمارے گھر آتے جاتے ہوں گے لیکن میں نے جب انہیں عام رشتہ داروں سے ایک علیحدہ صورت میں دیکھا اُس وقت میری عمر بھی گیارہ بارہ سال کی ہوگی۔ اس کی وجہ کوئی خاص واقعہ نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس سے پہلے مجھے اُن کی خاص توجہ کا احساس نہ ہو سکا ہو۔ ہمارے گھروں میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں تھا اس لئے قدرتی طور پر ہم لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا بہت زیادہ تھا۔ جن دنوں کا میں ذکر کر رہی ہوں اُسنا کرتی تھی کہ رشید بھائی بی اے میں پڑھتے ہیں۔ وہ جب کبھی چھٹیوں میں گھر آتے تو ہم لوگوں سے ملنے کے لئے اکثر آیا کرتے۔ میں شاید آج بھی ٹھیک طور پر یہ نہ بتا سکوں کہ ہمارے اور اُن کے درمیان خون کا رشتہ کس حد تک ہے۔ البتہ اُنہوں نے ایک دفعہ ہنسی ہنسی میں آپا سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنے شجرۂ نسب پر دو تین دفعہ ضرب اور تقسیم کا عمل کریں تو ہمارے خاندان کے ساتھ اپنی رشتہ داری ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ آپا اس بات پر بہت ہنسی تھی۔

اصل میں آپا رشید بھائی کی باتوں پر ہنستی بھی بہت زیادہ تھی۔ وہ دونوں جب کبھی آپس میں باتیں کرنا شروع کر دیتے تو اُس وقت تک نہ تھمتے جب تک امی آپا کو باورچی خانہ میں نہ بُلا لیتیں یا اباجان اچانک وارد ہو کر سلسلۂ گفتگو کو توڑ نہ دیتے۔ ایسے موقعوں پر آپا کمرے سے اس طرح کھسک جاتی جیسے بلی دودھ کا کٹورا ختم کرنے کے بعد گھر والوں کی نظریں بچاتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ اباجان رشید بھائی سے اکثر لاہور کی مسموم فضا اور کالج کے لڑکوں کی آوارگی کا ذکر واعظانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔ ایسی باتیں سُن سُن کر مجھے بھی خیال ہونے لگا تھا کہ کالج کے لڑکے پرلے درجے کے فضول خرچ لامذہب اور گستاخ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچا کرتی کہ کالج اتنا ہی بُرا ہے تو رشید بھائی کو وہاں کیوں بھیجا گیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ بھی اُن لڑکوں کی فہرست میں نہ آ جائیں جو اباجان کی کتابِ اخلاق کی رو سے مجرم تھے اور اس طرح اُن کے ہمارے ہاں آنے جانے میں کوئی رُکاوٹ پیدا ہو جائے لیکن سوچ بچار کے بعد میرا دل فیصلہ دیتا کہ رشید بھائی ایسے لڑکوں سے بالکل مختلف ہیں۔

ہمارے گھر میں ہر وقت اُن کی نیکی کا چرچا رہتا تھا اور اباجان قبلہ خود کہا کرتے کہ رشید آج کل کے لڑکوں سے بہت مختلف ہے۔

یہ کہانی آل انڈیا ریڈیو سٹیشن لاہور سے ۲۶ دسمبر کو نشر کی گئی تھی اور اب سٹیشن ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے شائع کرائی جاتی ہے (راقم)

اور مَیں تو سمجھتی تھی کہ رشید بھائی میں جو محبت اور شفقت موجود ہے وُہ دُنیا کے کسی اَور انسان میں نہ ہو گی ۔ لاہور سے وہ میرے لئے نئے نئے تحفے لاتے، اُن کی فیاضی کی بدولت میری الماری میں مختلف قسم کی کتابیں، تصویروں کے کارڈ اور بہت سی دُوسری چیزیں جمع ہو گئی تھیں ۔ میں جب اِن چیزوں سے کھیلتی یا کتابیں پڑھتی تو اُن کا خیال خود بخود میرے دماغ میں آموجود ہوتا ۔ اُن کے آنے کی خبر میرے لئے عید کی خوشی سے زیادہ ہوتی اَور عید کا انتظار بھی مَیں اِس لئے شوق سے کیا کرتی کہ اُس دن اُن سے ملنا در تحفے حاصل کرنے کی اُمید ہوتی تھی ۔ لاہور سے تحفے لاتے وقت رشید بھائی آپا کو نظر انداز نہیں کیا کرتے تھے ۔ وہ اُس کے لئے کتابیں، لکھنے کے سُنہری ورق، خوبصورت قلم، بال باندھنے کے ریشمی فیتے اور ایسی ہی کئی چیزیں لایا کرتے تھے ۔ لیکن یہ تحفے اُنہوں نے امی یا اباجان کی موجودگی میں آپا کو کبھی نہیں دیئے ۔ وُہ یہ چیزیں گھر کے لوگوں سے اس طرح چھپا چھپا کر دیتے گویا چوری کر کے لائے ہوں ۔ مجھ سے ایسی باتوں کے اخفا کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ کئی بار ایسا ہُوا کہ میں رشید بھائی کے ہاں گئی، اَور اُنہوں نے چُپکے سے کوئی چیز مجھے آپا کے لئے دی اور ساتھ ہی تاکید کر دی کہ اماں جان کو معلوم نہ ہو ۔ مَیں اس کام کو کسی طرح ایک مہم سے کم نہ سمجھتی اَور یہ محسوس کر کے بے حد مسرور ہوتی کہ مَیں ایسے اہم امور سرانجام دینے کے قابل سمجھی جا رہی ہوں ۔ مَیں نہیں جانتی کہ آپا کی سہیلیاں رشید بھائی کو کیسے جانتی تھیں ۔ وُہ جب کبھی ہمارے ہاں آتیں تو بات بات میں اُن کا نام لینے کی کوشش کرتیں ۔ آپا کبھی ایک کھسیانی ہنسی ہنستی اور کبھی چڑنے لگتی ۔ پہلے پہل تو مَیں آپا کے اِس طرزِ عمل پر حیران تھی ۔ آخر رشید بھائی کے نام سے چڑنے کی کیا وجہ تھی؟ لیکن بعد میں مجھے اِس چھیڑ میں خود ایک لُطف آنے لگا ۔ کبھی کبھی آپا کی کوئی سہیلی اس سے زبردستی چابی چھین کر اُس کی الماری کھولتی اور کوئی چیز اُٹھا کر کہتی :

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خاص لاہور کے انارکلی بازار سے خریدی گئی ہے۔"

اس پر تمام سہیلیاں قہقہہ لگاتیں ۔ مَیں بھی ایک رازدارانہ ہنسی ہنستی ہوئے کچھ کہنا چاہتی لیکن آپا کی گھُرکی مجھے خاموش کرا دیتی ۔

رشید بھائی کبھی تعطیل کے دِنوں میں ہمارے گھر آتے تو تھے ہی لیکن ان دنوں آپا بھی اُن کی بڑی بہن عابدہ باجی کے لئے بہت اُداس ہو جاتی اور اُس کی ملاقات کے لئے ہفتہ میں دو تین بار ضرور جاتی ۔ مَیں وقت کے اِن تعینات سے بے نیاز تھی ۔ میرا تو وہاں تقریباً روز کا پھیرا تھا ۔ رشید بھائی مجھ سے بہت محبت کا اظہار کرتے اور مَیں اپنے کھیلوں میں اُن کی شرکت کو اس طرح قبول کرتی جیسے وُہ میرے ہم عمر ہوں ۔ جب مَیں اُن کے گھر جاتی تو وُہ مجھ سے آپا کے متعلق بہت سی باتیں پُوچھتے "تمہاری آپا کیا کر رہی ہیں؟ ہمارے گھر کب آئیں گی ۔ تمہاری اُمی مجھ سے اِس بات پر ناراض تو نہیں کہ میں تمہاری آپا سے بہت باتیں کرتا ہوں؟ آپا سے کہنا ہمارے گھر کیوں نہیں آتیں؟ کیا امی نے منع کیا ہے؟ یا وہ خود ناراض ہیں؟" اِس قسم کی باتیں مَیں روز سُنتی اور سوتے وقت سرگوشیوں میں آپا کے کانوں میں اُگل دیتی ۔ یہ ساری باتیں سُننے اور دُہرانے میں مجھے ایک لطف آتا ۔ یہ پیغام رسانی رشید بھائی کے دورانِ قیام میں میری روز کی عادت سی ہو گئی تھی ۔ جس دن وہ آپا کے متعلق سوالات نہ کرتے اور مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ پوچھتے تو میں سمجھتی کہ وُہ مجھ سے ناراض ہیں ۔

کالج کی چھٹیوں کے دَوران میں رشید بھائی کے ہاں بڑی پُرلطف محفلیں قائم ہوتیں ۔ عابدہ باجی، رشید بھائی، آپا اَور مَیں مل کر بیت بازی

کیا کرتے تھے۔ مَیں تو خیر اُس وقت "وُہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ" کی قسم کے شعروں سے زیادہ نہ جانتی تھی لیکن عابدہ باجی، رشید بھائی اور آپا دُنیا کے تمام شعروں کا ذخیرہ ختم کر ڈالتے۔ کبھی کبھی رشید بھائی کوئی شعر پڑھ کر آپا کی طرف اشارہ کر دیتے۔ اس پر آپا جھینپ سی جاتی اور عابدہ باجی بناوٹی غصہ کے انداز میں اُن کی طرف دیکھ کر کہتی "بے شرم"۔ وُہ ایسی جھڑکیوں کا جواب ہنسی سے دیتے۔

ہمارے ملنے جلنے والوں اور اکثر رشتہ داروں میں یہ خیال عام تھا کہ رشید بھائی کی شادی آپا سے ہوگی۔ میں اس رائے کو ایک مسلمہ امر کی طرح قبول کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جوشِ مسرت میں ایک دفعہ میں نے اس خیال کا اظہار رشید بھائی اور آپا کے سامنے بھی کر دیا تھا اور اس جُرم کی پاداش میں آپا نے ایک چانٹا لگایا تھا۔ لیکن میں حیران تھی کہ خود امی یا خالہ (رشید بھائی کی اماں) نے اس بات کا تذکرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ خالہ اپنی ہونے والی بہو کے متعلق ایسے خواب دیکھ رہی ہوں جن کے دھند لکے میں آپا نسرین کی جیتی جاگتی شخصیت گم ہوگئی ہو اور ادھر امی نے اِس معاملے میں سبقت کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

کچھ عرصہ کے بعد آپا کی شادی میرے ماموں کے لڑکے نصیر سے قرار پائی۔ مَیں اُس وقت عُمر کی چودہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ آزادی کے دِن جا چکے تھے۔ رشید بھائی کے ہاں روز کا آنا جانا چھوٹ چکا تھا اور اب میرے لئے ضروری تھا کہ باہر نکلنے سے پہلے اپنے آپ کو بُرقع کے غلاف میں لپیٹ لُوں۔ شادی کے دِن رشید بھائی چپکے سے میرے پاس آئے۔ اُنہوں نے جیب سے گلاب کا ایک پھُول نکال کر اُس کی تمام پتیوں کو زمین پر پھینک دیا اور پھُول کی عریاں شاخ جس پر کانٹوں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا تھا میرے ہاتھ میں دے کر کہا:

"یہ نسرین کے لئے میری طرف سے شادی کا تحفہ ہے"

مَیں نے اُن کی طرف حیرت سے دیکھا لیکن اُن کے چہرے پر کچھ ایسی سنجیدگی تھی کہ مَیں کچھ نہ کہہ سکی۔

آپا کی رخصتی کے بعد ایک بے پناہ اُداسی مجھ پر طاری ہوگئی۔ مَیں محسوس کرنے لگی کہ میری زندگی گلاب کے اُس بے برگ ڈنٹھل کی طرح رہ گئی ہے جو بھائی رشید نے آپا کو دیا تھا۔ رشید بھائی نے میرے بچپن سے جو جگہ میرے دل و دماغ میں حاصل کرلی تھی اُسے دُنیا کی کوئی اَور شخصیت پُر نہیں کرسکتی تھی۔ مَیں اب سِن شعور کو پہنچ چکی تھی اور ماضی کی پُرلطف صحبتیں، بے ضرر سازشیں اور دبے دبے مذاق مجھے ایک نئے رنگ میں نظر آنے لگے۔ یہ خیال کرکے میرے دِل میں ایک گُدگُدی سی ہوتی کہ پچھلے چند سالوں میں ہم محبت کا کھیل کھیل رہے تھے۔ رشید بھائی، آپا اور مَیں۔ اگرچہ مَیں بے جانے بُوجھے اُن کی ہمجولی بن گئی تھی۔ اب مَیں اس بات کا اندازہ کرنے کے قابل تھی کہ آپا کی شادی سے رشید بھائی پر کیا بیتی ہوگی۔ مجھے اُن سے سخت ہمدردی تھی اور ہمدردی کا یہ احساس میرے دِل کی گہرائیوں میں ایک خاموش آہ بن کر رہ گیا تھا۔ مَیں سوچتی تھی ایک کھلاڑی چلا جائے تو کھیل بند نہیں ہوجاتا۔ آپا چلی گئی۔ مَیں اور رشید بھائی باقی تھے۔ کیا یہ کھیل پھر جاری نہیں ہوسکتا۔ لیکن پہل کون کرے؟

رشید بھائی اب طالب علم سے پروفیسر بن چکے تھے۔ اگرچہ اب ہمارے ہاں اُن کا آنا جانا اِتنا عام نہیں تھا تاہم چھٹیوں میں جب وہ

گھر آتے تو کبھی کبھار ہمارے ہاں بھی آ نکلتے۔ اب میں اُنہیں بچپن کی سی شوخی کے ساتھ نہیں مِل سکتی تھی۔ خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اُن کی آواز سُن کر میرا دِل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میری پیشانی پر پسینہ آ گیا ہے۔ اُنہیں سلام کہنے سے پہلے اب مجھے اپنی ہچکچاہٹ اور بُزدلی پر اپنے آپ کو بہت مُلامت کرنا پڑتی۔ جب وہ کہتے "جمیلہ اچھی تو ہو؟" تو جواب میرے گلے میں مچھلی کے کانٹے کی طرح اٹک جاتا۔ اُنہوں نے میرے متعلق اپنا پُرانا مربیانہ انداز نہیں بدلا تھا۔ اُن کے نزدیک مَیں ابھی تک بچی ہی تھی۔ "کیا پڑھتی ہو؟" "کون اخبار منگواتی ہو؟" "کشیدہ کاری نے تمہاری نظر کو خراب تو نہیں کر دیا؟" "تمہاری ہیڈ مسٹرس مِس جانسن ہیں۔ مَیں اُنہیں جانتا ہوں" وغیرہ وغیرہ مَیں جو بچپن میں اُن سے تڑاق پڑاق باتیں کرتی تھی اب ان باتوں کو سُن سُن کر خواہ مخواہ زمین میں گڑی جاتی تھی اور ایسے شرماتی تھی گویا اماں مجھ سے دولہا کے انتخاب میں رائے لے رہی ہوں۔ کئی بار تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہونٹ تو ہلے ہیں لیکن ان تک آواز نہیں پہنچ سکی۔ مَیں تو جیسے انہیں دیکھ کر ہوش کھو بیٹھتی تھی۔ جب وہ سامنے کے کمرے میں کُرسی پر بیٹھ جاتے تو نجانے مجھے کیوں یہ خیال ہونے لگتا کہ وہ میری طرف ہی تک رہے ہیں اور اس خیال سے سراسیمہ ہو کر مَیں صحن میں جابجا ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

اپنی انتہائی خواہش کے باوجود میں محبت کے کھیل میں ابتدا نہ کر سکی، اور بھائی رشید تو تھک کر مایوس ہو چکے تھے۔ اُن کا شادی سے انکار اِس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ اور مجھے تو اُنہوں نے شاید کبھی کھلاڑی سمجھا ہی نہیں۔ آپا اب بھی اُن کے شادی سے انکار پر لمبی لمبی بحثیں کر سکتی ہے لیکن میری زبان میں تو تالا لگ گیا ہے۔ مَیں اِس وقت دو بچوں کی ماں ہُوں۔ جب کبھی میکے آتی ہوں تو رشید بھائی کے ہاں ضرور جاتی ہوں لیکن اب بھی جب اُن سے سامنا ہوتا ہے تو میرے الفاظ حلق میں اٹک جاتے ہیں اور میرے دِل کی دھڑکنیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

عطاء اللہ سجّاد

ایک رومن کے آخری الفاظ

لیویا اپنی اور میری ہنسی خوشی گزری ہوئی بیاہی زندگی کو یاد رکھنا۔

(آگسٹس سیزر مرتے ہوئے)

حامد علی خان

غزل

کیا عشق کو ترک ہم کریں گے ایسا نہ تری قسم کریں گے

برباد دلِ خراب غم کو تُو نے نہ کیا تو ہم کریں گے

وابستہ جنوں کے سلسلے کو اُس زلف سے خم بہ خم کریں گے

افسردہ فضائے زندگی کو اِک عالمِ کیف و کم کریں گے

جاتا ہے نگاہِ یاس پر کیوں تیغ اُٹھنے دے سر بھی خم کریں گے

ہر دل میں تری جھلک دکھا کر ہر جام کو جامِ جم کریں گے

اک شام فراقؔ صبح کر لیں

ہستی کو تو کیا عدم کریں گے

فراقؔ گورکھپوری

یوکی - اونا

(یعنی "حسینۂ برف" کی ایک جاپانی کہانی)

جاپان کے ایک گاؤں میں دو لکڑہارے رہتے تھے ــــ موساکو اور مینوکیچی ۔ موساکو بڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کے شاگرد مینوکیچی کی عمر ابھی اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی ۔ روزانہ وہ دونوں اکٹھے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک جنگل کو جایا کرتے تھے ۔ جنگل کے راستے میں ایک بڑا دریا پڑتا تھا اور پار جانے والوں کے لئے گھاٹ پر ایک کشتی موجود رہتی تھی ۔ جہاں گھاٹ تھا وہاں کئی دفعہ پُل بھی بنایا جا چکا تھا لیکن ہر بار اسے طوفان بہا لے گیا ۔ دراصل جب دریا چڑھتا تو اس جگہ پانی کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا کہ کوئی چھوٹا موٹا پُل اس کا مقابلہ کر ہی نہ سکتا تھا ۔

ایک بڑی کڑکڑاتی سرد شام کا ذکر ہے کہ موساکو اور مینوکیچی جب گھر کو پلٹے تو راستے میں اُنہیں برف کے ایک سخت خوفناک طوفان نے آلیا ۔ گھاٹ پر پہنچ کر اُنہیں معلوم ہوا کہ ملاح کشتی کو دوسرے کنارے چھوڑ کر جا چکا ہے ۔ یہ تیر کر پار اُترنے کا دن نہ تھا ۔ اس لئے لکڑہاروں نے ملاح کی جھونپڑی کو غنیمت سمجھ کر اُسی میں پناہ لی ۔ جھونپڑی میں کوئی آتش دان نہ تھا ۔ نہ کوئی اور ایسی جگہ تھی جہاں آگ جل سکتی ۔ یہ پھوس کی ایک بہت تنگ جھونپڑی تھی جس میں صرف ایک ہی دروازہ تھا ۔ اس کے علاوہ اور کوئی کھڑکی بھی نہ تھی ۔ موساکو اور مینوکیچی نے دروازہ بند کیا اور اپنی پیال کی برساتیاں اوڑھ کر لیٹ گئے ۔ پہلے پہلے تو اُنہیں زیادہ سردی بھی محسوس نہ ہوئی اور اُنہوں نے خیال کیا کہ طوفان جلد تھم جائے گا ۔

بوڑھے لکڑہارے کی آنکھ فوراً ہی لگ گئی ۔ لیکن نوعمر مینوکیچی کو کسی طرح نیند نہ آتی تھی ۔ وہ دیر تک ہوا کی ہولناک سائیں سائیں اور دروازے پر برف کے تڑاق پڑاق پڑنے کی آواز سُنتا رہا ۔ دریا ایک عفریت کی طرح ڈکرا رہا تھا ۔ اور جھونپڑی کسی طوفان میں گھری ہوئی کشتی کی طرح چرچراتی اور جھکولے کھاتی تھی ۔ طوفان کا زور دم بدم بڑھتا جاتا تھا اور ہوا سرد سے سرد تر ہوتی جاتی تھی ۔ مینوکیچی جاڑے کی شدت سے پیال کی برساتی میں گھاس کی پتّی کی طرح تھرتھرا رہا تھا ۔ لیکن آخر نیند غالب آ ہی گئی اور وہ بھی سو گیا ۔

چہرے پر برف کی بوچھاڑ پڑنے سے اُس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ جھونپڑی کا دروازہ کھلا ہے ۔ "برف کے اُجالے" (یوکی اکاری) میں اُسے جھونپڑی کے اندر ایک عورت نظر آئی ۔ وہ موساکو پر جھکی ہوئی اس کے چہرے پر پھونکیں مار رہی تھی ــــ یہ پھونکیں چمکتے ہوئے سفید دھوئیں کی طرح معلوم ہوتی تھیں ۔ اسی وقت دفعتہً وہ مینوکیچی کی طرف متوجہ ہوئی اور آ کر اس پر بھی جُھک گئی ۔ مینوکیچی نے

شور مچانا چاہا لیکن اُس کے گلے سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ اب سفید عورت اور زیادہ جُھک کر اس کے جسم سے قریب تر ہوگئی۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ مینوکیچی کو تقریباً چھُو گیا اور اسے معلوم ہُوا کہ وُہ بہت خوبصورت ہے لیکن اُس کی آنکھیں دیکھ کر لڑکے پر خوف طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تک وُہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اِس کے بعد اُس نے مسکرا کر دھیمی آواز میں کہا "ارادہ تو یہی تھا کہ تم سے بھی وُہی سلوک کروں جو تمہارے ساتھی سے کیا ہے، لیکن تم اتنے نوعمر ہو کہ مجھے بے اختیار تمہاری حالت پر رحم آتا ہے۔ مینوکیچی تم بہت خوبصورت لڑکے ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گی، لیکن آج رات جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس کا ذکر کسی سے، یہاں تک کہ اپنی ماں سے بھی، نہ کرنا۔ اگر تم نے کسی کے سامنے میرے متعلق ایک حرف بھی مُنہ سے نکالا تو مجھے معلوم ہو جائے گا اور میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔ . . . . . جو کچھ میں نے کہا ہے اچھی طرح یاد رکھنا۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ اب مینوکیچی کی طاقت عود کر آئی تھی، اُس نے اُٹھ کر باہر جھانکا لیکن وُہ عورت کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ برف نہایت تندی کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہو رہی تھی۔ مینوکیچی نے دروازہ بند کر کے احتیاطاً اس کی پُشت پر بہت سے بھاری کندے جما دیئے۔ پھر اس نے اپنے متحیر دل میں سوچا کہ دروازہ شاید ہوا سے کھُل گیا ہوگا اور مجھے اندر داخل ہوتی ہوئی برف کے اُجالے پر خواب میں ایک سفید عورت کے پیکر کا دھوکا ہُوا ہوگا۔ لیکن وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کے بعد اُس نے موساکو کو پکارا لیکن اس کو خاموش پا کر وہ ڈر گیا۔ پھر اندھیرے میں ہاتھ سے ٹٹول کر اس نے موساکو کے چہرے کو چھُوا تو وہ یخ کی طرح سرد تھا۔ موساکو مر چکا تھا. . . . .

پَو پھٹنے کے وقت طوفان فرو ہو گیا۔ سُورج نکلا تو کچھ دیر بعد ملّاح اپنی جھونپڑی کی طرف آیا اور اس نے دیکھا کہ مینوکیچی موساکو کی اینٹھی ہوئی لاش کے پاس بے ہوش پڑا ہے۔ اس نے لڑکے کی تیمارداری بہت اچھی طرح کی اور وُہ جلد ہی ہوش میں آ گیا۔ لیکن اس خوفناک رات کی سردی کے اثرات نے بعد میں اُسے ایک عرصے تک بیمار رکھا۔ بوڑھے لکڑہارے کی موت سے وُہ بہت خوفزدہ تھا لیکن اُس نے سفید لباس میں ملبوس عورت کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔

اچھا ہوتے ہی مینوکیچی دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ہر روز صبح کے وقت وُہ اکیلا جنگل کو جاتا اور رات کے قریب لکڑی کے گٹھے لئے ہوئے واپس آتا۔ لکڑی بیچنے میں اس کی ماں اسے مدد دیتی تھی۔

دُوسرے سال موسم سرما میں ایک شام جب وہ گھر کو واپس آ رہا تھا تو اسے اپنے سامنے سڑک پر جاتی ہوئی ایک لڑکی نظر آئی تھوڑی دیر میں یہ اُس کے قریب جا پہنچا۔ وُہ چھریرے بدن کی ایک بہت خوبصورت اور کشیدہ قامت لڑکی تھی۔ اس نے مینوکیچی کے سلام کا جواب ایسی آواز میں دیا جو کانوں کے لئے کسی گانے والے پرندے کی آواز کی طرح خوش آئند تھی۔ مینوکیچی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ لڑکی نے اپنا نام اوُیُوکی[1] بتایا اور کہا کہ میرے ماں باپ مر گئے ہیں اور اب میں یِیڈو جا رہی ہوں

[1] جاپان میں بہت سے ناموں کی نسبت برف سے ہوتی ہے۔

جہاں میرے کچھ غریب رشتہ دار ہیں۔ اُن کی مدد سے میں کوئی ملازمت تلاش کر دُں گی۔ مینوکیچی اس عجیب لڑکی کے حُسن سے مسحور ہو گیا اور جتنا وُہ اُس کو دیکھتا وُہ اُسے اُور زیادہ حسین معلوم ہوتی۔ اُس نے لڑکی سے پوچھا کیا تمہاری منگنی ہو چکی ہے تو اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "نہیں مَیں ابھی آزاد ہوں"۔ پھر لڑکی نے بھی مینوکیچی سے پوچھا کہ کیا تم بیاہے جا چکے ہو یا کہیں تمہاری نسبت ٹھہر چکی ہے۔ اُس نے جواب دیا "اگرچہ ایک بیوہ ماں کے علاوہ مجھ پر کسی اُور کے مصارف کی ذمہ داری نہیں لیکن چُونکہ مَیں اب تک نوعمر سمجھا جاتا ہوں اِس لئے ابھی ایک "بھوانی" کے انتخاب کا سوال چھڑا ہی نہیں . . . . . ." ان معلومات کے بعد دونوں دیر تک خاموش چلتے رہے لیکن وُہ جو مثل مشہور ہے کہ محبت میں آنکھیں بھی زبان بن جاتی ہیں، گاؤں پہنچنے سے پہلے پہلے وُہ ایک دُوسرے کو بہت چاہنے لگے اُور مینوکیچی نے او۔یوکی کو کچھ دیر کے لئے اپنے گھر میں ٹھہرنے اور سستانے کی دعوت دی۔ تھوڑی سی حجاب آمیز ہچکچاہٹ کے بعد وُہ اس کے ساتھ ہو لی۔ مینوکیچی کی ماں نے بھی بڑے تپاک سے اُس کی آؤ بھگت کی اُور اُسے گرم گرم کھانا کھلایا۔ لڑکی کے اطوار اس قدر شائستہ تھے کہ اُس نے مینوکیچی کی ماں کو یک بیک رجھا لیا اور اُس نے اِس سے ییڈو کا سفر کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دینے کو کہا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوُا کہ یوکی ییڈو قطعاً گئی ہی نہیں "اُور آخر" بھوانی" بن کر وہیں رہنے سہنے لگی۔

او۔یوکی بہت اچھی بہو ثابت ہوئی۔ پانچ سال بعد جب مینوکیچی کی ماں کی موت واقع ہوئی تو اس کے آخری الفاظ اپنے بیٹے کی بی بی کی تعریف اُور محبت میں ڈُوبے ہوئے تھے۔ او۔یوکی کے بطن سے مینوکیچی کے دس بچے پیدا ہوئے، لڑکے اُور لڑکیاں ــــــ یہ سب کے سب بہت خوبصورت اُور گورے چِٹّے تھے۔

گاؤں کے لوگ او۔یوکی کو بڑے تعجب کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وُہ اُن سے بالکل مختلف تھی۔ اکثر کسان عورتیں بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں، لیکن او۔یوکی دس بچوں کی ماں بن جانے کے بعد بھی ویسی ہی حسین رہی جیسی اُس دِن جب وہ پہلے پہل گاؤں میں آئی تھی۔

ایک رات جب بچے سو چکے تھے اُور او۔یوکی ایک کاغذی فانوس کی روشنی میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی، مینوکیچی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔

"تم سینے میں مشغول ہو اُور مجھے تمہارے چہرے پر روشنی دیکھ کر اُس زمانے کی ایک عجیب بات یاد آ رہی ہے جب میری عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ اُن دنوں مَیں نے تمہیں سی ایک خوبصورت عورت کو دیکھا تھا ــــ حقیقت تو یہ ہے کہ وُہ تم سے بہت ہی مشابہ تھی . . . . ."

آنکھ اُٹھائے بغیر او۔یوکی نے جواب دیا:۔

"مجھے بتاؤ، تم نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟"

اِس پر مینوکیپی نے اُسے ملاح کی جھونپڑی کی ہولناک رات اور اُس سفید عورت کا قصّہ سُنایا جو اُس پر جھُک کر مسکراتی اور سرگوشیاں کرتی رہی تھی اور پھر موساکو کی خاموش مَوت کا تذکرہ بھی کیا۔ یہ تمام واقعہ بیان کر چکنے کے بعد اُس نے کہا:۔

"سوتے یا جاگتے وُہی ایک موقع تھا جب میں نے تم سی کوئی اَور خوبصورت ہستی دیکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان نہ تھی، اور میں اُس سے ڈر گیا تھا ـــــ بے انتہا ڈر گیا تھا ـــــ لیکن وہ نہایت سفید تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اب تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا "برف کی دیوی" کو دیکھ لیا تھا۔

او۔یوکی نے سینا چھوڑ کر کپڑا پرے پھینک دیا اور مینوکیپی کے قریب جا کر اُس پر جھُک گئی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُور چیخ چیخ کر کہنے لگی:۔

"وُہ میں ہی تھی ـــــ میں ـــــ میں! وُہ یوکی تھی۔ اَور میں نے تمہیں اُس وقت بتا یا تھا کہ اگر تم نے میرے متعلق کبھی ایک حرف بھی زبان سے نکالا تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی! . . . . . . اگر مجھے اِن سوتے ہوئے بچّوں کا خیال نہ ہوتا، تو میں تمہیں اِسی وقت مار ڈالتی۔ اب اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو ان کا ہر طرح خیال رکھنا کیونکہ اگر تم نے انہیں کبھی شکایت کا موقع دیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا . . . . "

ابھی اُس کی چیخیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ اُس کی آواز بتدریج باریک ہوتے ہوتے ہَوا کی سرسراہٹ کی طرح رہ گئی۔ پھر وہ ایک چمکتی ہوئی سفید دُھند میں تحلیل ہو کر چکّر کھاتی ہوئی چھت کی کڑیوں تک پہنچی اَور تھرتھراتی ہوئی دُودکش کے راستے سے باہر نکل گئی . . . . . اِس کے بعد وُہ کبھی نظر نہ آئی۔

(لیفکاڈیو ہرن) حامد علی خاں

شکست کی عظمت

کیا ہم نہ کہتے تھے کہ فتح بڑی شاندار ہوتی ہے۔

اور اِس میں کوئی شک بھی نہیں

لیکن اب مجھے یوں معلوم ہوتا ہے

کہ جب کوئی چارہ نہ رہے

تو شکست بھی شاندار ہو جاتی ہے۔

(والٹ وٹمین) حامد علی خاں

محفل ادب

ترکستان کی مشکبو حسینہ

چین کی تاریخ میں شہنشاہ چن لنگ اور ترکستان کی مسلمان حسینہ سیانگ فی کی داستانِ عاشقی بہت مشہور ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک رومانیت اور اثرانگیزی کا تعلق ہے دُنیا کی تاریخوں میں ایسے واقعات کم دستیاب ہوں گے۔

سیانگ فی کا اصلی نام سلیمہ تھا اور وُہ مشرقی ترکستان میں علاقہ زنگاریہ کے سردار خواجہ خاں کی بیوی تھی۔ سلیمہ غیر معمولی طور پر حسین تھی، اور اس کے پسینے سے کچھ ایسی خاص قسم کی بھینی بھینی مہک آتی تھی کہ لوگ اسے "سیانگ فی" یعنی مشکبو کہتے تھے۔ اس کا یہ لقب اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ اس کا اصلی نام ہی بھول گئے۔

چن لنگ شہنشاہِ چین نے پکین میں تین ہزار میل کے فاصلہ پر بیٹھ کر متعدد سیاحوں اور سوداگروں سے سیانگ فی کے حسنِ خداداد کی اس قدر شہرت سُنی تھی کہ وُہ اس پر نادیدہ عاشق تھا۔ اس نے سیانگ فی کو حاصل کرنے کی دو ایک مرتبہ کوشش بھی کی۔ لیکن ناکام رہا۔ ۱۷۵۸ء میں سیانگ فی کے شوہر خواجہ خان نے حکومتِ چین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے بھائی بُرہان الدین خاں کی مدد سے چینی فوجوں کو مار مار کر زنگاریہ سے نکال دیا۔ بغاوت نے جب زیادہ طول کھینچا اور اس کے شعلے ترکستان کے دوسرے حصّوں میں بھی بھڑکنے لگے تو شہنشاہِ چین نے اپنے بچپن کے دوست اور معتمد خاص چاؤ ہوئی کو زنگاریہ پر پوری قوت کے ساتھ فوج کشی کا حکم دیا۔ اور اس سے یہ کہہ دیا کہ وہ سیانگ فی کو حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے۔

چاؤ ہوئی نے چار لاکھ سے زیادہ فوج لے کر کاشغر، یارقند اور ختن پر بیک وقت حملہ کیا۔ خواجہ خان نے پامردی سے تقریباً دو سال تک مقابلہ کیا لیکن انجام میں اسے شکست ہوئی اور وُہ اپنے بھائی اور بیوی کے ساتھ بدخشاں کی طرف بھاگا۔

سلطانِ بدخشاں نے جو خود سیانگ فی کے عاشقوں میں تھا خواجہ خاں سے شرمناک بدعہدی کی۔ جب وہ برہان الدین خاں اور سیانگ فی کے ساتھ سلطان کے پایۂ تخت میں داخل ہُوا تو سلطان نے دھوکا دے کر سیانگ فی کو اپنی حرم سرا میں قید کر دیا اور فاتح حکومتِ چین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دونوں پناہ گزین بھائیوں کے سرقلم کرکے چاؤ ہوئی کے پاس بھیج دیئے۔

چاؤ ہوئی نے شہنشاہِ چین کے حکم کے مطابق سلطانِ بدخشاں سے سیانگ فی کو طلب کیا اور بصورتِ دیگر فوج کشی کی دھمکی دی۔ سلطان نے ڈر کر سیانگ فی کو چار مسلمان کنیزوں کے ساتھ چاؤ ہوئی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

فروری ۱۷۶۰ء میں چاؤ ہوئی اپنی خوبصورت قیدی کو لے کر پیکن روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے سیانگ فی کے آرام و آسائش کا غیر معمولی طور پر خیال رکھا۔ اس کے سفر کے لئے پانچ بڑی بڑی گاڑیاں مہیا کی گئی تھیں جن کے پہیوں پر مندہ چڑھایا گیا تھا۔ گاڑیبانوں کو گاڑیاں آہستہ چلانے کا حکم تھا اور زنگاریہ کی جنگ میں جو مسلمان گرفتار ہوئے تھے ان کی جان بخشی کر کے انہیں مصاحبوں کی حیثیت سے سیانگ فی کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔

اس آرام و آسائش کے باوجود ترکستان کی مشکبو حسینہ نے راستہ میں فرطِ غم سے تین دِن تک کچھ کھایا پیا نہیں۔ روتے روتے اس کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے اور اس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی۔ چاؤ ہوئی نے اسے بہت کچھ سمجھایا اور یقین دلایا کہ سلطانِ بدخشاں نے اس کے شوہر کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ زندہ اور چینی فوجوں کی حراست میں ہے۔ اور شہنشاہِ چین اس کی خطا معاف کر کے اسے پائیہ تخت ہکسو واپس آنے کی اجازت دے دیگا۔ علاوہ بریں چاؤ ہوئی نے سیانگ فی کی کنیزوں سے بیش قرار انعامات کا وعدہ کیا کہ وُہ اس کا دِل بہلانے کی کوشِش کریں۔ سیانگ فی اسی طرح مختلف حیلہ طرازیوں کا نشانہ بنتی ہوئی چھ ماہ بعد پیکن (موجودہ پیپنگ) پہنچی جہاں لوکاؤ چاؤ کے مشہور پُل پر (جس کا موجودہ نام مارکو پولو کا پُل ہے) چن لنگ شہنشاہِ چین اُس کے استقبال کے لئے موجُود تھا۔

چن لنگ شہنشاہِ چین نے چاؤ ہوئی کی شاندار خدمات سے خوش ہو کر جاگیر و نقد انعامات کے علاوہ پیکن میں گھوڑے پر سوار ہو کر گزرنے کا وہ شرف عطا کر دیا جو اب تک شہزادوں کے لئے مخصوص تھا اور "سو کو رنگ کو" کے شاہی میوزیم میں اس کی روغنی تصویر آویزاں کی گئی۔ سیانگ فی نہایت عزت کے ساتھ "یوان منگ یوان" کے شاہی محل میں ٹھہرائی گئی۔ اس کے کھانے پینے کا انتظام چند معزز ترین مسلمان امیروں کے سپرد کیا گیا تھا۔ دُوسرے دِن ترکستان کی وُہ مشکبو حسینہ جس کے عشق کی چنگاریاں کئی سال سے شہنشاہِ چین کے دِل میں بھڑک رہی تھیں خدمت شاہی میں پیش کی گئی اور چن لنگ اس کے حُسنِ خداداد کو دیکھ کر بالکل مسحور ہو گیا۔ سیانگ اس کے سامنے نیچی نظریں کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطرے ضرور تھے لیکن چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ خواجہ سراؤں نے جو اسے لے کر خدمت شاہی میں حاضر ہوئے تھے اس سے آداب بجا لانے کے لئے کہا۔ لیکن سیانگ فی ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے گھور کر بدستور خاموش کھڑی رہی۔ شہنشاہ نے خواجہ سراؤں سے روک کر کہا "یہ خاتون غیر ملک سے آئی ہے، آدابِ دربار سے واقف نہیں۔ لہٰذا اس سے تعرض نہ کرنا۔"

اس کے بعد شہنشاہ نے اسے دلاسا دے کر چند بیش قیمت زیورات اور جواہرات دینا چاہے لیکن سیانگ فی نے بادشاہ کی ایک بات کا بھی جواب نہ دیا اور شاہی عطیہ کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا۔ شہنشاہ نے خواجہ سراؤں کو اسے واپس لے جانے کا حکم دیا۔ اور سیانگ فی بادشاہ کو سلام کئے بغیر ان کے ساتھ چلی گئی۔ شہنشاہِ چین ترکستان کی مظلوم حسینہ کے اس جلال و تمکنت سے بھی بہت متاثر ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ یہ زخم خوردہ شیرنی بآسانی رام ہونے والی نہیں۔ دو تین دن بعد اس نے پھر سیانگ فی کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ لیکن سیانگ فی کے اندازِ خودداری میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

آخر میں بادشاہ نے اپنے ایک معتمد خاص ہوشین پر جو عقل و ذہانت کے لئے مشہور تھا اپنا راز ظاہر کر کے مشورہ طلب کیا۔ ہوشین نے بہت غور و فکر کے بعد جواب دیا۔" جہاں پناہ! ترکستان کی شہزادی مغرور اور ضدی عورت ہے۔ اس مزاج کے لوگوں کو کبھی ڈرا دھمکا کر قبضہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مار تو محبت اور صرف محبت ہے۔ آپ سیانگ فی کی دلجوئی و دلنوازی کیجئے اور اس کے لئے ایسا پُرمحبت ماحول پیدا کر دیجئے کہ اسے اجنبیت بالکل محسوس نہ ہو"۔

بادشاہ نے پوچھا۔" یہ کس طرح ممکن ہے؟"

ہوشین نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔" آپ اس کے وطن عکسو کے طرز پر ایک چھوٹا سا شہر تعمیر کرا دیجئے۔ جاؤ ہوئی اور بعض دُوسرے چینی سردار کئی سال تک زنگاریہ میں رہے ہیں، ان سے نقشہ تیار کرا لیجئے۔ یہاں ترکستان کے مسلمان قیدی کافی تعداد میں موجود ہیں ان سے معماری کا کام لیجئے۔ علاوہ بریں شہزادی کا سارا عملہ مسلمان ہو اور اس میں زیادہ تر اسی کی قوم کے آدمی ترک ہوں۔ بس سیانگ فی کو یہ معلوم ہو کہ گویا وہ اپنے وطن ہی میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس طرح وُہ رفتہ رفتہ آپ سے مانوس ہو جائے گی"۔

شہنشاہ چن لنگ نے اس تجویز کو پسند کر کے پیکن کے قریب ہی عکسو کے طرز پر ایک چھوٹے سے نئے اسلامی شہر کی تعمیر کا حکم دیا۔ جس میں مسجدوں کے گنبد تھے۔ منارے تھے مخصوص ترکستانی انداز کے بازار اور باغات تھے۔

اس دَوران میں شہنشاہِ چین نے سیانگ فی سے ملاقات کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ اس نے ترکستانی حسینہ کے لئے یوان منگ یوان کے مشہور تاریخی محل میں جسے یورپ کے کاریگروں نے بنایا تھا ایک نیا حصّہ بصرف کثیر تعمیر کرایا جس کے اُوپر ایک بڑا مدوّر شیشہ لگایا گیا تھا جو چینی کاریگری کا حیرت انگیز شاہکار تھا۔ یہ شیشہ دُور سے بالکل چاند کی طرح نظر آتا تھا اور اس کی ہلکی روشنی گرد و نواح میں ایک میل تک پہنچتی تھی۔ اس کی خوابگاہ کی چھت میں ہزاروں جواہرات نصب کئے گئے تھے جو رات میں ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ شہنشاہِ چین کی خدمت میں جو نادر اور بیش قیمت تحفہ آتا تھا وُہ سیانگ فی کے پاس بھیج دیتا تھا۔ اس کا دِل بہلانے کے لئے تین سَو بہت خوبصورت اور بہترین گانے والی لڑکیاں جمع کی گئی تھیں جن میں سَو لڑکیاں چین کی تھیں۔ سَو لڑکیاں ترکستان اور کوہ قاف کے اسلامی علاقوں کی اور سَو لڑکیاں یورپین ممالک کی۔ غرض سیانگ فی کی دلجوئی و دل نوازی پر بیدریغ روپیہ صرف ہو رہا تھا لیکن سیانگ فی اس کے قبضہ میں نہ آتی تھی۔

شہنشاہِ چین کے دِل پر اب تمام و کمال سیانگ فی کی حکومت تھی۔ اسے اپنی ملکہ کی ذرا بھی پروا باقی نہ رہی تھی۔ جنوبی چین کی ایک بہت ہی حسین عورت کئی سال سے اس کے دِل پر راج کر رہی تھی اور شہنشاہ نے اسے" ین فی" (محبوبۂ سیمیں بدن) کا خطاب عطا کیا تھا۔ لیکن اب اس کی محبّت بھی شہنشاہ کے دِل سے زائل ہو گئی تھی۔ وُہ تھا اور دن رات سیانگ فی کے رُخِ زیبا کا تصوّر۔ نازنینانِ حرم سے اس کی ان بے اعتنائیوں اور سیانگ فی پر بیدریغ زر پاشیوں پر محل میں ہلچل برپا ہو گئی۔ بیگمات اور کنیزوں نے شہنشاہ کی والدہ ملکہ نیو ہولو کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے ساری داستان سُنائی اور اس سے امداد طلب کی۔ شہنشاہِ چین اپنی ماں کی غیر معمولی عزت کرتا تھا۔ اس کی ماں کو سُن کر

صدمہ تو بہت ہوا اور یہ بات اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کہ اس کا بیٹا جو مذہبی اعتبار سے دیوتاؤں کا فرزند تھا ایک مسلمان عورت کے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار ہو، لیکن وہ کر کیا سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ چن لنگ ضدی بہت ہے۔ اگر اسے زیادہ مجبور کیا گیا تو وہ اس کی بات نہ مانے گا اور اس طرح اس کے وقار پر ضربِ شدید پہنچے گی۔ تاہم عقلمند ملکہ نیوہولو نے محل کی عورتوں کو تسلی دے کر ان سے وعدۂ امداد کیا اور یہ سوچنے لگی کہ کس طریقہ سے شہنشاہِ چین کو سیانگ فی کے دامِ محبت سے نجات دلائی جائے۔

اس دوران میں پکین کے قریب مکسو کے طرز پر جدید اسلامی شہر بن کر تیار ہو گیا۔ شہنشاہ چن لنگ نے سیانگ فی کو یہ جگہ دکھانے کے لئے شہر پناہ کے قریب ایک بہت بلند منار تعمیر کرایا اور سیانگ فی کو نمازِ فجر کے وقت وہاں لے گیا۔ سیانگ فی نے دیکھتے ہوئے سپیدۂ سحری کی ہلکی ہلکی روشنی میں ایک نیا حیرت انگیز نظارہ دیکھا۔ ترکی طرز کے مکانات جن میں رنگین فانوسوں کی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ مسجدوں کے شاندار گنبد اور منارے ۔۔۔ یہ خواب ہے یا عالمِ بیداری۔ دفعتہً مؤذن نے چین کی طویل تاریخ میں پہلی مرتبہ پکین کے مقدس شہر سے اس قدر قریب اذان دی۔ سیانگ فی متحیر ہو کر شہنشاہ کی طرف دیکھنے لگی۔ چن لنگ کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور سیانگ فی کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ مؤذن خالص حجازی لہجہ میں اذان دیتا رہا۔ سیانگ فی کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہو گئے۔ جس وقت مؤذن کی زبان سے نکلا ۔۔۔ "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔۔۔" سیانگ فی ضبط نہ کر سکی اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔

دو دن تک سیانگ فی کی حالت بہت خراب رہی اور شہنشاہِ چین کسی وقت بھی اس کے پاس سے نہ ہٹتا تھا۔ اس کے بعد سے سیانگ فی کا معمول ہو گیا کہ وہ تصویرِ حیرت بنی ہوئی اس نئے اسلامی شہر کو دیکھتی رہتی تھی اور ہر وقت اسلامی ماحول میں گھرے رہنے اور شہنشاہِ چین کی مذہبی رواداری کے حیرت انگیز مظاہرے سے اس کی وحشت بہت کچھ کم ہو گئی تھی۔

اس موقع پر عام چینی روایت یہ ہے کہ سیانگ فی شہنشاہِ چین کی تمام نوازشوں کے باوجود اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کی جانب ذرا بھی متوجہ نہیں ہوئی۔ لیکن بعض مؤرخوں کا بیان ہے کہ خود اپنے ہم مذہب سلطان بدخشاں کا یہ شرمناک اور وحشیانہ طرزِ عمل دیکھنے کے بعد کہ اس نے سیانگ فی کو اپنے محل میں قید کر کے اس کی عصمت پر ڈاکہ ڈالنا چاہا اور اس کے شوہر کو پناہ دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا، جب چین کے عظیم الاقتدار شہنشاہ کی یہ حیرت انگیز اولوالعزمی اور رواداری دیکھی کہ وہ سیانگ فی کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا نہیں چاہتا، ہر طرح کی قدرت رکھنے کے باوجود ہر وقت اس کی دلجوئی کرتا رہتا ہے، وہ صرف ایشیا کا سب سے بڑا حکمران ہی نہیں بلکہ اپنی رعایا کا مذہبی پیشوا بھی ہے۔ لیکن ایک مسلمان عورت کی مذہبی آزادی اسے اس قدر عزیز ہے کہ اس نے اس کے لئے ایک اسلامی شہر تعمیر کرا دیا ہے، جہاں ترکستان کے ہزاروں باشندوں کو بسا کر چینیوں کے برابر حقوق عطا کئے گئے ہیں اور وہ سیانگ فی کے قدموں پر اپنی سلطنت بھی قربان کر دینا چاہتا ہے تو وہ بہت متأثر ہو کر چن لنگ کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی اور کئی مؤرخوں کا بیان ہے کہ شہنشاہ چن لنگ نے پوشیدہ طریق پر مذہب اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

شہنشاہ چن لنگ کو اب ایک منٹ کے لئے بھی سیانگ فی کی مفارقت ناگوار تھی۔ امورِ سلطنت سے وُہ بالکل غافل ہو گیا تھا۔ پہلے تو پیکن کے باہر اسلامی شہر کی تعمیر ہوئی تھی۔ اب اس نے بصرفِ کثیر قسطنطنیہ سے انجنیئر بُلا کر خاص اپنے پایہ تخت میں سیانگ فی کے لئے خاص ترکی طرز پر ایک بہت بڑا حمام خانہ بنوایا جس کے گنبد اور کھنڈر وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔ ممکن تھا کہ رعایا امورِ سلطنت سے شہنشاہ کی بے توجہی کو گوارا کر لیتی لیکن ان کے مذہبی جذبات خاص پایہ تخت کے اندر اسلامی اثرات کی روز افزوں ترقی برداشت نہ کر سکے۔ رعایا میں بے چینی بڑھنے لگی اور خود خاندانِ شاہی کے افراد کسی طرح بھی یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ قدیم مقدس روایات کے بالکل خلاف شہنشاہِ چین کی دل کی ملکہ کوئی غیر مانچو عورت بن سکے اور پھر وُہ بھی مسلمان!

چن لنگ کو معلوم تھا کہ رعایا اور خاندانِ شاہی کے افراد سیانگ فی کے تشنۂ خون ہو رہے ہیں لہٰذا اس نے مشکبو حسینہ کی حفاظت کا زبردست انتظام کر دیا تھا اور اس کے محل کے گرد تین ہزار ترک سپاہیوں کا دستہ متعین کیا گیا تھا۔ علاوہ بریں وہ جہاں کہیں بھی جاتا تھا سیانگ کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

اس طرح چھ سال گزر گئے۔ شہنشاہ کی والدہ ملکہ نیوہولو عرصہ سے موقع کے انتظار میں تھی۔ اتفاق سے کئی سال بعد چین کا وُہ عظیم الشان تیوہار آ گیا جس میں شہنشاہ کو پیکن سے باہر جا کر شاہی مندر میں تین دن تک پُوجا پاٹ کے مراسم انجام دینا تھے۔ سارے ملک میں یہ تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ شہنشاہ قوم کے روحانی پیشوا اور دیوتاؤں کے فرزند ہونے کی حیثیت سے شاہی مندر کے ایک حجرہ میں دو دن تک معتکف رہتا تھا۔ اور تیسرے دن تمام عمائدِ سلطنت کی موجودگی میں قربانی کر کے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے دعا مانگتا تھا۔ بادشاہ اس رسم کو انجام دینے کے لئے مجبور تھا اور اس موقع پر سیانگ فی ایک راسخ الاعتقاد مسلمان عورت کبھی بھی اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ شہنشاہ چن لنگ اپنی تُرک محبوبہ کی حفاظت کا پُورا انتظام کر کے شاہی مندر چلا گیا۔ ملکہ نیوہولو کو یہ موقع اچھا مل گیا۔ شہنشاہ کے جاتے ہی اس نے سیانگ فی اور اس کے ساتھ کی تیس چالیس مسلمان عورتوں کو اپنے محل میں طلب کیا۔ چینی روایات کے مطابق ماں کے حکم کی خلاف ورزی غیر ممکن تھی۔ سیانگ فی حاضر ہوئی لیکن اس کے محافظ دستہ کے دِل میں فوراً شبہ پیدا ہو گیا اور کئی تُرک سپاہی شہنشاہ کو اطلاع کرنے کے لئے بھاگے۔

شہنشاہ چن لنگ کی والدہ نے سیانگ فی کی صُورت دیکھتے ہی حقارت سے پُوچھا "کیا تو مسلمان ہے؟"

سیانگ فی نے جواب دیا "خدا کا شکر ہے کہ مَیں مسلمان ہوں"

"پھر تُو نے شہنشاہِ چین کے مقدس دیوتائی محل میں قدم رکھنے کی جرأت کس طرح کی؟"

"مَیں خود نہیں آئی بلکہ گرفتار کر کے لائی گئی ہوں۔"

والدۂ شہنشاہ نے مشتعل ہو کر کہا "گستاخ مجھ سے زبان لڑاتی ہے۔ تیرا صرف یہی گناہ نہیں کہ تُو نے اپنے ناپاک قدموں سے

چین کے مقدس اژدہے کے محل کو نجس کیا بلکہ تُو نے میرے بیٹے پر جادُو کر دیا ہے اور تُو چین کی عظیم الشان سلطنت کو تباہ کرنا چاہتی ہے —
بتا تیرے پاس ان الزامات کا کیا جواب ہے ؟"

سیانگ فی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا " ملکۂ عالم! میری کوئی خطا نہیں ہے۔ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں آج اپنے وطن جانے کے لئے تیار ہوں "۔

" ہاں تجھے وطن جانے دوں۔ تُو وہاں بیٹھ کر میرے بیٹے پر جادُو کرے گی۔ تو ساحرہ ہے "۔

" میں ساحرہ نہیں ہوں۔ جادُو میرے مذہب میں کفر ہے "۔

" تیری یہ جرأت کہ تُو میری بات کی تردید کرے —— ؟"

ملکہ نیوہولو نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ سیانگ فی کے ساتھ کی مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے پچاس پچاس تازیانے مارے جائیں، اور پھر سیانگ فی سے یہ کہہ کر۔ " خبردار اپنے باطل مذہب کا نام میرے سامنے مت لینا " اس نے حضرت پیغمبر صاحب کی شان میں گستاخیاں شروع کر دیں۔

سیانگ فی اب ضبط نہ کر سکی، اسلامی غیرت جوش میں آئی۔ ترکی خون رگوں میں کھولنے لگا۔ عشقِ رسول میں سر کٹا دینے کا بے پناہ جذبہ چند روزہ زندگی کی خواہش پر غالب آ گیا۔ سیانگ فی یا تو ملکہ کے سامنے دست بستہ ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی یا اس نے ایک مرتبہ بے تاب ہو کر کمر پر ہاتھ ڈالا۔ مگر اس کا خنجر تو پہلے ہی محلسرا کی کنیزوں نے لے لیا تھا — زخم خوردہ شیرنی کی طرح بھر کر بولی " چپ! ملعون کافرہ! اگر میں بجانِ خنجر سے تیرے گستاخانہ کلموں کا جواب نہیں دے سکتی تو میرے ہاتھوں میں تیرا گلا گھونٹ دینے کی طاقت ضرور ہے "۔ ملکہ نے خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ دوسرے کمرے میں سیانگ فی کا گلا گھونٹ کر اسی وقت ہلاک کر دیا جائے۔

سیانگ فی کے محافظ دستہ کے سپاہیوں نے جب شہنشاہ کو خبر دی کہ وہ ملکہ نیوہولو کے محل میں طلب کی گئی ہے تو شہنشاہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ صدیوں کے رواج کے خلاف وہ اسی طرح مذہبی پوشاک پہنے ہوئے مندر سے باہر نکل آیا۔ اور گھوڑے کو سرپٹ محل کی طرف دوڑایا۔ ادھر ملکہ نیوہولو نے سیانگ فی کے لئے فرمانِ مرگ صادر کیا ادھر کسی نے خبر دی کہ شہنشاہ شہر میں داخل ہو گیا — دیوتاؤں کا فرزند قربانی کئے بغیر مندر سے باہر نکل آیا — ! ملکہ نیوہولو نے حکم دیا کہ محل کا پھاٹک بند کر دیا جائے شہنشاہ دیر تک دیوانہ وار چلاتا رہا۔ اس کے بعد پھاٹک کھلا۔ شہنشاہ بحالِ پریشاں اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا " سیانگ فی کہاں ہے؟" ملکہ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ ایک کمرہ کی جانب اشارہ کر دیا۔ شہنشاہ دوڑ کر اس کمرہ میں داخل ہوا۔ وہاں سیانگ فی کی لاش پڑی تھی اور اس کے گلے میں اب بھی وہ سفید ریشمی رومال تھا جس کے ذریعہ اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ شہنشاہِ چین اس کی لاش پر بیہوش ہو کر گر پڑا۔ سیانگ فی کا جنازہ اس شان و شوکت کے ساتھ اُٹھایا گیا کہ چین کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسلامی مراسم کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ چین کے مشہور مقدس عالم اور سیانگ فی کے مرشد ما حِن سو ئی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اسے تنگ لنگ کے عالیشان مقبرہ میں دفن کیا گیا جو شہنشاہ نے خود اپنے لئے تعمیر کیا تھا۔ ماں کی عزت چین کی مذہبی روایات میں شامل ہے۔ شہنشاہ ملکہ نیوہولو سے انتقام نہیں لے سکتا تھا لیکن اس غم میں وہ گھُل گھُل کر کانٹا ہو گیا چن لنگ، سیانگ فی کے بعد کئی سال تک زندہ رہا لیکن اس نے تمام عمر اپنی ماں کی صورت نہ دیکھی اور سلطنت کو ٹھکرا کر فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ اس کا بیشتر وقت یا تو سیانگ فی کے مقبرہ میں گزرتا تھا یا پیکن کے باہر اس اسلامی شہر میں جو اس نے سیانگ فی کے لئے تعمیر کیا تھا۔

" ریاست "

مطبوعات

حقیقتِ جاپان ۔ یہ شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی بی۔اے، بی ٹی (علیگ) کا سفرنامۂ جاپان ہے جو دو حصّوں میں منقسم ہے۔ حصّۂ اوّل عام سیاحت سے متعلق ہے اور حصّۂ دوم جاپان کے تمدّن و معاشرت وغیرہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے کا حجم ۱۶۶ صفحات ہے اور دوسرے حصّے میں سوا دو سَو صفحات ہیں۔ دونوں حصّے نہایت دلچسپ اور مفید معلومات پر مشتمل ہیں۔ کتاب میں بہت سی تصویریں بھی ہیں جنہوں نے اس کو اَور دلچسپ بنا دیا ہے۔ اُردو میں بہت کم سفرنامے اس خوبی سے لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی نے شائع کی ہے (انجمن اب اورنگ آباد دکن سے دہلی آگئی ہے) اور کتاب دہلی ہی کے پتے سے مل سکتی ہے قیمت مجلد ؎، غیر مجلد ؎۔

ریاست ۔ یہ افلاطون کی مشہور کتاب کا سلیس اور دلآویز ترجمہ ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے نہایت قابلیت سے کیا ہے۔ اُردو پڑھنے والوں کو انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی کا ممنون ہونا چاہئے کہ اُس نے یہ کتاب شائع کرکے اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ کتاب کا حجم ۷۸۴ صفحات ہے اور قیمت مجلد پانچ روپے ہے۔ کاغذ اور کتابت نہایت نفیس اور جلد خوش وضع اور مضبوط ہے۔ اصل کتاب اس قدر گراں پایہ اور مشہور ہے کہ اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

چند ہم عصر ۔ اس کتاب میں اپنے معاصرین کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو کے ۱۴ مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ امیر مینائی، مرزا حیرت، سیّد محمود، مولوی چراغ علی، مولوی محمد عزیز مرزا، سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، حکیم امتیاز الدین، مولانا وحید الدین سلیم، نور خاں، محسن الملک، مولانا محمد علی، گرامی اور حالی اِن مضامین کا موضوع ہیں۔ اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کتابوں ہی کے نقاد نہیں انسانوں کے بھی بہترین نقاد ہیں۔ ان اکابر کے حالات کے سلسلے میں بہت سی دلچسپ اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کتاب ختم کئے بغیر چھوڑی نہیں جاتی۔ پتہ: انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی۔

تذکرۂ گلزارِ ابراہیم ۔ یہ اُردو شعراء کا ایک نایاب تذکرہ ہے جس کے مؤلف مرزا علی لطف ہیں۔ قلمی نسخہ اتفاق سے مہتمم کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے ہاتھ لگ گیا جنہوں نے پہلے پہل اس کو شائع کیا۔ یہ کتاب بہت مستند اور قابلِ قدر ہے۔ اصل فارسی کے ساتھ اُردو ترجمہ کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ اُردو کے ۳۲۰ مشہور اور غیر مشہور شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے اور بہ اعتبار حروفِ تہجی مرتب کیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر محی الدین صاحب زور کے پُراز معلومات دیباچے بھی شامل ہیں۔ حجم ۲۹۶ صفحات۔ قیمت ؎۔ جلد، کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ پتہ:

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی +

ترانۂ وطن۔ حضرتِ صدق جائسی نے سترو بیت پر مشتمل حیدر آباد کا ایک قومی ترانہ لکھا ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جس میں دکنیوں کو بہت خوبی سے اتحاد، حُبِ وطن اور وفاداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ہم ایک دیس والے ہم ایک بھیس والے — ایک آبرو ہماری ایک آسرا ہمارا

اصل ایک ہی ہے، شاخیں دَیر و حرم میں اس کی — دونوں سے آشنا ہے ذوقِ دُعا ہمارا

راہِ وفا ہے ٹیڑھی ثابت قدم رہیں ہم — مالک سے سُرخرو ہو جوشِ وفا ہمارا

قیمت ۱ر۔ پتہ:۔ مسعود دکن پریس۔ کالی کمان۔ گلزار حوض۔ حیدر آباد (دکن)۔

کارنامۂ غم۔ مولانا احسن مارہروی نے ۵۶ صفحے کا یہ ماتمی رسالہ شہادت سیّد الشہداء کی یاد میں شائع فرمایا ہے۔ اس میں رُباعیاں خمسے اور سلام جمع کیے گئے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی کی قابلیت تعارف کی محتاج نہیں۔ جو کچھ لکھا ہے، خوب لکھا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

وُہ ذات جو ہر ذات سے بالذات سوا ہے — افسوس وہی موردِ صد کرب و بلا ہے

تھے راکبِ دوشِ نبوی شبّر و شبّیر — یہ رتبۂ معراج نما کس کو ملا ہے

شہیدِ معرکۂ کربلا سلام علیک — امام و پیشرو اتقیا سلام علیک

تو زینتِ کعبۂ مقصود ما سلام علیک — مقربِ حرمِ کبریا سلام علیک

سوارِ دوشِ رسولِ خدا سلام علیک

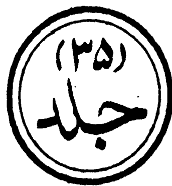
آنکھیں غمِ شبیر میں تر ہیں دونوں — ہم پہلوئے درد، دل جگر ہیں دونوں

عاشورہ و چہلم کی عزاداری سے — یک رنگ محرم و صفر ہیں دونوں

قیمت فی جلد ۸ر پتہ: حضرتِ احسن مارہروی۔ مارہرہ، ضلع ایٹہ (یو۔پی)



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ اپریل ۱۹۳۹ء

تصویر:۔ قیدی

چندہ سالانہ صہ۔ ششماہی سے (مع محصول)   قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

مدیرِ "ہمایوں" کی قومی و ملی مصروفیتوں نے آج پھر مجھے اس صفحے کی طرف لوٹا دیا ہے۔ مدتیں گزریں اس صفحہ سے میری کچھ کاروباری انداز کی شناسائی سی تھی لیکن اب ایک طویل جدائی کے بعد اتنی اجنبیت پیدا ہو گئی ہے کہ یہاں آکر کوشش کے باوجود بھی قلم میں جنبش پیدا نہیں ہوتی، اور پھر کوئی آپ سے باتیں بھی کیا کرے، آپ سنتے تھوڑا ہی ہیں ؛

"بزمِ ہمایوں" میں اب عموماً اُردو کا تذکرہ رہتا ہے۔ میں اُردو کے متعلق آپ کو کیا نئی خبر سناؤں۔ اتحاد پسند ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ چیخ پکار اور نالہ و فریاد کے باوجود اُردو کا "حقہ پانی بند" کرنے کی مہم برابر جاری ہے۔ فرقہ پرستوں اور مذہبی تعصب کے علمبرداروں کا تو ذکر ہی کیا ہے، خود کانگریسی عمائد کی حد سے بڑھی ہوئی سنسکرت نوازی میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ چنانچہ تریپوری کانگریس کی تقریروں میں جو "ہندوستانی" استعمال کی گئی وہ بھی "اچھوت" قسم ہی کی تھی۔

مغربی اقتدار نے ہندوستان میں ابتدا سے "پھوٹ ڈال اور حکومت کر" کے جس سنہرے اُصول پر عمل شروع کیا تھا، در اصل اب وہ رنگ لا رہا ہے۔ صدیوں کے اتحاد و اشتراکِ عمل سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو متحدہ تہذیب و تمدن پیدا کیا تھا غیر ملکی حاکموں کے مصالح نے اُسے ہمارے ہی ہاتھوں ملیامیٹ کرا دینا ضروری سمجھا۔ اسی سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قومی زبان (اُردو یا ہندوستانی) پر ہاتھ صاف کرنے کا تیر بہدف نسخہ بھی تجویز ہوا۔ ہندوؤں کو اطلاع دی گئی کہ تمہاری قومی زبان سنسکرت ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کا گڑا مُردہ اُکھاڑو اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر دیوں کے زمانے کی طرف ایک اُلٹی زقند لگاؤ، خدا تمہارا بیڑا پار لگائے گا۔

پھوٹ کا یہ بیج خوب پھلا پھولا۔ فرقہ پرست یا دھرم سیوک ہندوؤں نے اُردو زبان سے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے پیدا ہوئی تھی اور اب اُن کو روز بروز ایک دوسرے کے قریب تر لا رہی تھی، بے اعتنائی برتنی شروع کر دی۔ سنسکرت کی مدد سے ایک نئی زبان ہندی کے نام سے وضع کی گئی اور ہندوؤں سے کہا گیا کہ تم اور ہو، مسلمان اور، میں اور تمہاری زبان یہ ہے۔ اب سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لعل نہرو، علامہ کیفی دتاتریا اور ڈاکٹر بھگوان داس جیسے مقتدر اکابر کی تو بر تو فہمائشوں کے باوجود بھی ہمارے اچھوتائی بھائی کسی طرح بدیشی جادوگر کا پڑھایا ہوا سبق نہیں بھولتے اور قومی اتحاد کی جڑ پر اندھا دھند "بھن بھن" کلہاڑے چلائے جا رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ بعض مہاپُرش یہ بھول کر کہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ قرآن اُردو زبان میں نازل ہوا تھا اور اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ لہٰذا اُردو کو دُور ہی سے سلام !

اُردو کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے۔ اُردو والے اخوت اور اتحاد کا ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں لیکن اُن کے بھائی حقارت سے اچھوا اچھوا کرتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتے ہیں۔ خون کے یوں سفید ہو جانے میں اگرچہ "حکمراں کی ساحری" کا دخل بھی ہے لیکن اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو والے عموماً مفلس، غیر منظم اور کمزور ہیں، کنگال کی بات کون پوچھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عام ہندوستانیوں کے مقابلے میں اب بھی "اچھوا ہندوستانیوں" کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں لیکن اول تو وہ بڑے مالدار اور منظم ہیں۔ دوسرے انہیں عام ہندو بھائیوں میں غلط قسم کے مذہبی تعصبات پیدا کرنے کا موقع بھی حاصل ہے اور یوں وہ اہلِ ملک کی اکثریت پر ڈورے ڈال کر اپنا اُلّو سیدھا کر سکتے ہیں۔

لیکن آخر یہ "اچھوائی ہوئی" ذہنیت کیونکر بدلی جا سکتی ہے ؟

اُردو والے ہندو اور مسلمان اگر اُردو کو زندہ رکھنا اپنے ملک کے لئے مفید سمجھتے ہیں اور انہیں یہ اندازہ ہے کہ ایک متحدہ قومیت کی تشکیل کے لئے یہ زبان کتنی ناگزیر ہے تو محض باتوں سے یا رونے جھینکنے سے کچھ نہ ہوگا۔ کامیابی کے لئے ایثار کی ضرورت ہے، تنظیم کی ضرورت ہے اور قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم بالکل ہیچ ہو چکے ہیں اور ہیچ رہیں گے۔ طاقتور کو کیا ضرورت ہے کہ ناتواں سے بات کرنے کے ذریعہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے یا اُسے بلا ضرورت برقرار رہنے دے۔

قوت پیدا کرو۔ تمہاری زبان خود بخود قوی ہو جائے گی۔

حامد علی خاں

جہاں نما

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

حال ہی میں لندن سے ایک انگریزی کتاب "ہندوستان کی موجودہ حالت"[1] کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۲۶ پر حسب ذیل عبارت نظر آتی ہے:۔

" انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں جیسی ایک مفتوح حاکم قوم سے توقع ہو سکتی ہے، مسلمانوں کو انگریزوں سے خاص عناد تھا! ۱۸۲۱ء کے " ایشیاٹک جرنل" میں "کرناٹکس" کے نام سے ایک مضمون نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ " ہندوستان میں ہماری حکومت کا عمل (Divide - et - impera) پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے مقولے پر ہونا چاہئیے" یہی خیال لیفٹننٹ کرنل جان کوک نے جو مراد آباد کا کماں دار تھا ظاہر کیا ہے۔ کوک کا قول ہے کہ " ہمیں لازم ہے کہ مختلف اقوام و مذاہب کے درمیان جو علیحدگی ہے اُسے پُوری طرح قائم رکھیں اور انہیں ایک دُوسرے میں ضم کرنے کی کوشش نہ کریں" وہ اور الفنسٹن دونوں ۱۴ مئی ۱۸۵۸ء کی ایک یادداشت میں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے مقولے پر اتفاق کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندو کی پیٹھ ٹھونکنے میں اپنا فائدہ دیکھتا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں لارڈ ال بن برا لکھتا ہے" میں اس حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) فطری طور پر ہماری مخالف ہے۔ اس لئے ہماری صحیح حکمت عملی یہ ہونی چاہئیے کہ ہم ہندو کو خوش کریں" اس کے بعد سومنات کے مندر کے دروازے کھولنے کے سلسلہ میں وہ پھر کہتا ہے: " بخلاف اس کے ہندو خوش ہیں۔ مجھے یہ سخت نادانی معلوم ہوتی ہے کہ جب ہمیں آبادی کے ۱/۱۰ حصے کی دشمنی کا پورا یقین ہے تو ہم آبادی کی ۹/۱۰[2] اکثریت کو خوش کر کے اس کی امداد و حمایت حاصل نہ کریں"

اس موقع پر میجر بی۔ ڈی۔ باسو کی کتاب "ہندوستان میں عیسائی حکومت کا استحکام"[3] سے ذیل کے اقتباس کا اندراج بے محل نہ ہوگا:۔

کابل اور غزنیں کی تسخیر کے بعد ۴ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو لارڈ ال بن برا شملہ سے ڈیوک آف ویلنگٹن کو لکھتا ہے: "مسلمان کابل کی مہم میں ہماری ناکامی کا جتنا خواہشمند تھا اس کا اندازہ مجھے اُس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ مجھے یہاں بعض ایسے حالات معلوم نہ ہوئے جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ جذبات اُن لوگوں کے دلوں میں بھی موجزن تھے جن کا مفاد قطعی طور پر ہمیں سے وابستہ ہے..... اس کے برعکس ہندو خوش ہیں"

---

[1] The Present Condition of India by Leonard M. Schiff

[2] ہندوستان کے جن حصوں پر اُن دنوں انگریز قابض تھے اُن میں آبادی کا یہی تناسب تھا۔

[3] The Consolidation of Christian Power in India by B.D. Basu (1927) P.P. 35-36

باسو کی اسی کتاب کے ۷۴ - ۵ صفحات پر ذیل کی عبارت نظر آتی ہے :-

" اگرچہ اُن دنوں انگریزی حکومت کی حکمتِ عملی اسی قسم کی تھی لیکن وُہ علانیہ طور پر اس کا اظہار نہ کرتی تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے یہ پردہ بھی اُٹھا دیا اور متعدد انگریز افسروں نے ایسے خیالات کا اظہار علانیہ طور پر کیا۔ اُن دنوں صرف غیر ذمہ دار انگریز اخبار نویس ہی ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف، ایک مذہب کو دُوسرے مذہب کے خلاف اور ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے خلاف اُبھارنے کی تبلیغ نہیں کر رہے تھے بلکہ لیفٹیننٹ کرنل کوک جیسے ذمہ دار افسر بھی ایسے ہی خیالات کی اشاعت میں مصروف تھے۔"

کوک کے جن خیالات کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اُن کے متعلق ایک اقتباس ہم اُوپر درج کر چکے ہیں۔

انگلستان کے لئے یہ حکمتِ عملی اب تک مفید ثابت ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ تعلقات پر اس حکمتِ عملی کا کیا اثر پڑے گا؟ اس کا جواب مستقبل دے گا۔ البتہ اہلِ ہندوستان کو ضرور یہ غور کرنا چاہئے کہ اُن کے لئے اس باب میں انگریزی حکومت کا آلۂ کار بنا رہنا کب تک اور کہاں تک مفید ہے؟

چھکڑے کے دیس میں رولز رائس طرزِ حکومت

ہندوستان کا افلاس ضرب المثل کی طرح مشہور ہے لیکن یہاں کی حکومت کے عہدہ داروں کی تنخواہیں اتنی بیش قرار ہیں کہ دُنیا میں کہیں اُن کی مثال نہیں مِل سکتی۔ ہندوستانی افسروں کی تنخواہوں کے مقابلے کے لئے پہلے ایک ایشیائی ملک جاپان کو لیجئے :-

جاپان کے وزیرِ اعظم کی تنخواہ ۶۲۲ روپے ماہوار ہے۔ لیکن ہندوستان کے غیر کانگریسی صوبوں کے وزرائے اعظم کی تنخواہیں تین ہزار سے چار ہزار روپے ماہوار تک ہیں۔ کانگریسی وزراء نے اپنے لئے رضاکارانہ طور پر کچھ کم تنخواہیں مقرر کی ہیں۔

وزیرِ اعظم کے علاوہ دوسرے جاپانی وزراء کی تنخواہ کا معیار ۴۴۰ روپے اور سکرٹریوں کا ۲۷۵ روپے ماہانہ ہے۔ ہندوستان میں اوڑیسہ کا چیف سکرٹری ۲۱۵۰ روپے اور بنگال کا چیف سکرٹری ۳۳۳۵ روپے ماہوار لیتا ہے۔

کوریا (جاپان) کے گورنر جنرل کو ۴۴۰ روپے ماہوار ملتے ہیں، اور پنجاب کے گورنر کی تنخواہ ۸۳۳۳ روپے ماہوار ہے۔ ایک جاپانی اعلےٰ عہدہ دار کی تنخواہ ۲۴۴ روپے تک ہو سکتی ہے لیکن بمبئی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ۱۱۵۰ روپے ماہوار ملتے ہیں۔ -- جاپان کی شہنشاہانہ اقتدار پسندی کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جہاں تک تحقیق ہوئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں رشوت اور بدعملی کا بازار کسی دوسری جگہ سے زیادہ گرم نہیں۔

اب یورپی ممالک کی مثالیں لیجئے۔ پولینڈ ہندوستان کے صوبۂ بہار سے بہت زیادہ مال دار ہے اور اس کی آبادی نسبتہً کم ہے۔

لیکن پولینڈ کے صدر جمہوریہ کی ماہوار تنخواہ ۱۵۶۰ روپے مقرر ہے اور بہار کا گورنر ۸۳۳۳ روپے ماہوار تنخواہ وصول کرتا ہے۔ ہندوستان میں تو بعض ڈپٹی کمشنر بھی صدر جمہوریہ پولینڈ سے زیادہ تنخواہیں لیتے ہیں۔ پولینڈ میں کُل تیرہ افسر ایسے ہیں جنہیں ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن بہار میں اَیسے افسروں کی تعداد جنہیں ایک ہزار سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے ۱۵۶ ہے۔

اب امریکا کو لیجئے۔ دولت مندی میں امریکا سے ہندوستان کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ ہندوستان کے مقابلہ میں امریکا کی آمدنی فی کس ۲۲ گنا سے بھی زیادہ ہے اور معیارِ زیست بے انتہا بُلند ہے۔ اگر افسروں کی تنخواہیں عوام کی آمدنی کے تناسب سے مقرر کی جائیں تو ہندوستانی افسروں کی تنخواہیں امریکائی افسروں کی تنخواہوں کا تقریباً ۱/۲۲ واں حِصّہ مقرر ہونی چاہئیں۔ حالت یہ ہے کہ امریکا کے تربیت یافتہ مزدور ۱۹۳۵-۳۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق تین سَو سے چار سو پچاس روپے ماہوار تک تنخواہ طلب کر سکتے ہیں۔ ممالکِ متحدہ امریکا کی آبادی ہندوستان سے کم ہے لیکن آمدنی دس گُنا زیادہ ہے۔ صدر جمہوریۂ امریکا جیسی عظیم الشّان شخصیت کا مقابلہ وائسرائے ہند سے بے جا نہ ہوگا۔ صدر امریکا کا مشاہرہ ۱۷۰۶۲ روپے ہے لیکن ہندوستان کے وائسرائے کا درماہہ ۲۱۳۳۳ روپے ہے۔ امریکا کے ایک وزیرِ کابینہ کا ماہانہ ۳۴۱۲ روپے ہوتا ہے لیکن وائسرائے کی کونسل کے ممبر ۶۶۶۷ روپے ماہوار لیتے ہیں۔

نیویارک کی ریاست کے گورنر کی تنخواہ ۵۶۸۷ روپے کے برابر ہے۔ لیکن صوبۂ متوسط (ہند) کا گورنر ۶۰۰۰ روپے لیتا ہے۔ جنوبی ڈاکوٹا کے گورنر کو ۶۲۲ روپے ملتے ہیں لیکن دہلی کا چیف کمشنر ۳۰۰۰ روپے ماہوار لیتا ہے۔ امریکا میں چیف جسٹس کی تنخواہ ۴۵۵۰ روپے ہوتی ہے لیکن بنگال کے چیف جسٹس کے ۶۰۰۰ روپے ماہوار مقرر ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی مدِّنظر رکھنی چاہئے کہ ہندوستان کے وائسرائے کو تنخواہ کے علاوہ اَور بھی بہت سے وظائف اَور الاؤنس ملتے ہیں۔

اب انگلستان کو لیجئے۔ ہندوستان اَور انگلستان کی آبادی میں علی الترتیب ۱۰۰ اَور ۱۲ کی نسبت ہے۔ لیکن ہندوستان کی ۱۹۳۶-۳۷ء کی آمدنی کے مقابلے میں انگلستان کی آمدنی ۷،۳۱ فیصدی زیادہ ہے۔ اب یہ طرفہ تماشا دیکھئے کہ وزیرِ اعظم انگلستان کی تنخواہ وائسرائے سے آدھی ہے۔ وائسرائے ہندوستان کی آمدنی کے ہر ہزار روپے میں سے ایک روپیہ لیتا ہے۔ لیکن انگلستان کا وزیرِ اعظم ہر سَو ہزار (یعنی لاکھ) روپے میں سے ایک روپیہ لیتا ہے۔ گویا ملک کی آمدنی کے لحاظ سے وائسرائے کی تنخواہ وزیرِ اعظم انگلستان سے دس گنا زیادہ ہے۔

ایک برطانی سول افسر کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۳۳۳۳ روپے ہوتی ہے (لیکن اتنی تنخواہ بہت کم لوگوں کو ملتی ہے) اکثر افسر ۷۷۷ سے ۱۰۰۰ روپے ماہوار تک پر مطمئن ہوتے ہیں۔ وزرائے کابینہ کی ماہانہ تنخواہ ۵۵۵۵ روپے ہوتی ہے۔ اس کا مقابلہ ہندوستان کی تنخواہوں سے کیجئے جن میں سے بعض کے متعلق اُوپر اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں۔

دراصل انگریزوں نے ابتدا میں ہندوستان کے انگریز افسروں کو زیادہ سے زیادہ جلبِ زر کا موقع دینے کے لئے تنخواہوں کے

یہ معیار مقرر کئے تھے ۔ اب ان عہدوں پر پچاس فیصدی ہندوستانی آئی سی ۔ ایس والے قابض ہو گئے ہیں ۔ لیکن جب تک ہندوستان میں برطانی شہنشاہیت کا اقتدار ہے ، غالباً عوام کے روپے کے اس مُسرفانہ استعمال پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے گی ۔

ہندوستان میں کتابوں پر ڈاک کا محصول

آزاد اور مہذب ممالک میں یہ دستور ہے کہ عوام پر تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع آسان سے آسان تر کئے جاتے ہیں ۔ ہندوستان کی حالت قدرتاً اس کے برعکس ہے ۔ یہاں کتابوں کا محصول اب پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے ۔ آج سے پچیس سال پہلے کتابوں کا قیمت طلب پارسل رجسٹری کئے بغیر بھیجا جاسکتا تھا اور ڈاک کا عام محصول بھی کم تھا ۔ اب یہ قاعدہ بن چکا ہے کہ کوئی وی ۔ پی پارسل رجسٹرڈ ہوئے بغیر نہیں جا سکتا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اب ایک آنے کی کتاب بھی وی ۔ پی کے ذریعہ سے منگائے تو اسے رجسٹری اور ڈاک کا خرچ تقریباً ساڑھے تین آنے اور اس کے علاوہ دو آنے منی آرڈر کی فیس ادا کرنی پڑتی ہے ۔ گویا ایک آنے کی کتاب قیمت طلب پارسل کے ذریعہ سے ساڑھے چھ آنے میں پڑتی ہے ۔ یہ طریقہ علم و فضل کی اشاعت میں جس قدر ممد و معاون ہے ظاہر ہے ۔ لیکن ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے ۔ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے ، کوئی کس کس بات کی شکایت کرے ۔

حال ہی میں پریزیڈنٹ رُوزولٹ نے اپنے ایک اعلان سے امریکا میں کتابوں کا محصول بہت گھٹا دیا ہے ۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ امریکا ہندوستان کے مقابلے میں بے انتہا دولت مند ہے ۔ لیکن اس کے باوجود کتابوں پر ڈیڑھ سینٹ فی پاؤنڈ (۴۰ تولہ) کے حساب سے محصول عاید کیا گیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۴۰ تولے وزنی کتاب یا کتابوں پر صرف تین پیسے محصول لگتا ہے ۔ یہ محصول اس لئے کم کیا گیا ہے کہ لوگوں کو علم کے ذرائع تک پہنچنے میں سہولت حاصل ہو ۔ امریکا میں سو فیصدی آدمی تعلیم یافتہ ہیں ۔ اس کی دولتمندی کا کوئی اندازہ نہیں ۔ لیکن وہاں عوام کی تعلیمی سہولت کا اس قدر خیال رکھا گیا ہے کہ یہ محصول وہاں کے حالات کے مطابق محض برائے نام ہے ۔ مفلس ہندوستان میں اگرچہ ۹۰ فیصدی لوگ اَن پڑھ ہیں ، لیکن یہاں کتابوں کے محصول کی شرح یہ ہے کہ پہلے پانچ تولوں یا اس سے کم پر تین پیسے اور اس کے بعد ہر دُوسرے پانچ تولوں (یا اُن کے کسی حصے پر) دو پیسے کے حساب سے ٹکٹ لگتے ہیں ۔ رجسٹری اور منی آرڈر کے خرچ کے علاوہ ہندوستان میں ایک پاؤنڈ (۴۰ تولہ) وزنی کتابوں پر سوا چار آنے محصول ادا کرنا پڑتا ہے حالانکہ متموّل امریکا میں اسی وزن کی کتابوں کا محصول تین پیسے ہوگا ۔

یہ ہیں ایک غریب ملک میں "امیر" حکومت کی برکتیں !

ہندوستانی مال برطانیہ میں اور برطانی مال ہندوستان میں

گزشتہ دنوں مسٹر ہربرٹ ولیمز نے پارلیمنٹ کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ چند سال سے انگلستان میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال کی درآمد بڑھ رہی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مسٹر ولیمز نے پارلیمنٹ سے درخواست کی کہ وہ اس بات کا یقین دلائے کہ قوانینِ تجارت میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر دی جائے گی کہ انگلستان میں ایسی ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر مناسب پابندیاں عاید ہو جائیں جن میں ہندوستان اور انگلستان کے تجارتی مقابلے کا امکان ہو۔

بورڈ آف ٹریڈ کے پارلیمنٹری سکرٹری مسٹر رونالڈ کراس نے اس درخواست کے جواب میں مسٹر ولیمز کو یقین دلایا کہ کوئی فیصلہ کرتے وقت اس مسئلہ کو زیرِ نظر رکھا جائے گا ......

کیا ہندوستان میں برطانیہ کے کسی قسم کے مال کی درآمد پر بھی کوئی پابندی عائد ہے یا ہو سکتی ہے یا اس کے متعلق کوئی دُور کا امکان بھی موجود ہے؟ اس کے علاوہ کیا کوئی ایسا قانون بھی بن سکتا ہے کہ برطانی اَور غیر ملکی باشندے ہندوستان میں کارخانے قائم نہ کر سکیں؛ کیا ہندوستان کی مقابلۃً نوآموز اور کم سرمائے والی تجارت بیرونی مہارت، تجربہ اور عظیم الشان سرمائے کا مقابلہ کر سکے گی؟

علمِ کیمیا اور تہذیب کا مستقبل

پروفیسر ہیرلڈ سی اُرے نے جو نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں، اوٹاوا میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ "کیمسٹری تہذیب کو فنا کر دینے پر بھی قادر ہو سکتی ہے اور بنی نوعِ انسان کو ایسے بیش بہا فوائد بھی پہنچا سکتی ہے جن کا انسان کو اب تک وہم و گمان بھی نہیں"، اس کے بعد اُنہوں نے اہلِ مجلس کو اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی کہ علمِ کیمیا کا استعمال اس طریق سے ہونا چاہئے کہ اس کا نتیجہ انسان کی فلاح و بہبود ہو۔ اُنہوں نے سائنس دانوں کو اِنتباہ کرتے ہوئے کہا کہ "کیمسٹری ہماری یورپین تہذیب کو تباہ کر سکتی ہے اور شاید تباہ کر دے گی۔ میرے خیال میں یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ اس کے ذریعہ سے ہماری تہذیب قطعاً نیست و نابود بھی ہو سکتی ہے۔"

پان

انڈین میڈیکل جرنل میں پان کھانے کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں پان کھانے کی عادت کو غذائی نقطۂ نظر سے سراہا گیا ہے اور لکھا ہے کہ پان کے پتوں میں کیروٹین اور کیلسیم کے اجزا کی کثرت ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پان میں کیلسیم کے اجزا دُودھ سے بھی زیادہ بتائے گئے ہیں۔ پان میں چونا لگانے کی رسم بھی مفید بتائی گئی ہے اور لکھا ہے کہ چونا کیلسیم کو جزوِ بدن بننے میں مدد دیتا ہے کیونکہ یہ پان کے معدے میں جانے سے پہلے اس کے تمام آرگینک ایسڈ کا رسُوب بنا دیتا ہے۔

فروغِ جادہ

جہاں تیری طرف صبحِ ازل سے جادہ پیما ہے
کہ ہر ذرہ تری طلعت کے پرتو کو ترستا ہے

مری حیرت کا ساماں کرنے والے یہ غضب کیا ہے
نظر پڑتی ہے جس شئے پر طلسمِ حیرت افزا ہے

تصور تک نہیں ہے نیستی کا قلبِ ہستی میں
عدم بھی اس کا خاکا اک جہانِ منتظر کا ہے

بحسبِ ظرف ہے ذوقِ نظر گلزارِ ہستی میں
یہاں بلبل نے گل کو اور ہم نے تجھ کو دیکھا ہے

ہے پیدائی تری آئینہ تیرے دل کی حالت کا
کہ ہر ذرے کے دل میں اک جہانِ ناشکیبا ہے

مری سوکھی ہوئی کھیتی پہ نیسانِ کرم تیرا
برستا ہے تو ابرِ گوہریں بن کر برستا ہے

عدم کے اس طرف کیا کام دردِ نا امیدی کا
قنوط اے نکتہ چیں اک غمزۂ امیدِ بیجا ہے

نہیں ہے راہ رو کو شکوۂ دشواریِ منزل
یہاں ہر ہر قدم پر صاف نقشِ جادہ پیدا ہے

فسونِ قُم باذنی پھونکتا ہے ہر نفس تجھ پر
حیاتِ خود نگر بیگانۂ نازِ مسیحا ہے

حامد علی خاں



قیدلی

اقبال کے چند بُنیادی تصوّرات

(اس مضمون میں تقریبًا تمام اقتباسات علامہ مرحوم کی ہنگامہ خیز تصنیف "جاوید نامہ" سے لئے گئے ہیں - اس لئے جاوید نامہ کے متعلق چند تصریحی الفاظ ضروری ہیں - "جاوید نامہ" میں اقبال حضرت پیرِ رومؒ کی رہنمائی میں تمام افلاک کی سیر کرتا ہے - اور مختلف افلاک پر مختلف ارواحِ جلیلہ سے ملاقات کرتا ہے - انہیں ملاقاتوں میں اقبال زندگی اور کائنات کے متعلق اِن ارواحِ جلیلہ سے سوالات پوچھتا ہے اور ان سے اپنے سوالات کا حل چاہتا ہے -)

اثر صہبائی

اقبال کی شاعری ایک بحرِ زخّار ہے اور اس کی چھوٹی بڑی موجیں بے شمار ہیں - اقبال کہیں تو ایک مناظر پرست شاعر ہے کہیں سیاسیات میں زندگی کی رُوح پھُونک رہا ہے، کہیں مادرِ وطن کی بے بسی پر خُون کے آنسو رو رہا ہے، کہیں اسلامی دُنیا اس کے تمام تخیلات اور جذبات کا مرکز بنی ہوئی ہے اور لوگ اسے "شاعرِ اسلام" کے لقب سے پکار اُٹھتے ہیں - لیکن ان تمام مقامات اور منازل سے آگے اور ان سے کہیں زیادہ عالمگیر اور بلند وہ مقام اور منزل ہے جہاں وُہ ایک خالص شاعر اور مفکر کی طرح خدا اور انسان کے تعلقات پر غور کرتا ہے، اِس زندگی کے ارتقاء کا مطالعہ کرتا ہے جو کائنات کے پیکر میں ایک بے قرار موج کی طرح تڑپ رہی ہے - انسانیت کے بلند ترین مدارج اور مقامات کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے - اور انسان اور دُنیا کو ایک نہایت ہی ولولہ انگیز اور حیات بخش پیغام سُناتا ہے - ذیل کی سطور میں اقبال کی شاعری کے اسی پہلُو کے چند بنیادی تصورات پیش کیے جاتے ہیں:-

برہما اور مایا، خدا اور دُنیا اور حقیقت اور مجاز کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ابتدائے آفرینش سے یہ سوال انسانی غور و فکر کا مرکز بنا ہُوا ہے لیکن آج تک اس کا خاطر خواہ حل نہیں ہو سکا - وحدت سے کثرت کیونکر نمودار ہوئی؟ خدا یعنی خالص حق اور نیکی سے آدم اور شیطان کیونکر وجود میں آ گئے؟ کسی نے کہا کہ خدا عین اسی طرح جذبۂ تخلیق سے مغلوب ہُوا جس طرح خود انسان مغلوب ہو جاتا ہے اور یہ دُنیا معرضِ ظہور میں آ ئی، کسی نے کہا کہ خدا تنہا تھا، تنہائی سے گھبرا کر اپنا دِل بہلانے کے لئے مخلوقات کا تماشا کھڑا کر دیا، کسی نے کہا کہ خدا نے انسان کو اپنی صُورت پر پیدا کیا اور دوسرے نے کہا کہ شاید انسان نے خدا کو اپنی صُورت پر پیدا کیا ہے - غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں اور جتنے دماغ اتنے نظریئے، بات جہاں تھی وہیں رہی - اقبال نے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے - خدا سے وُہ یہی سوال پوچھتا ہے اور خدا کی زبانی اس کا جواب یوں پیش کرتا ہے :-

کلکِ حق از نقشہائے خوب و زشت   ہر چہ ما را سازگار آمد نوشت

آفریدن؛ جستجوئے دلبرے	وانمودن خویش را بر دیگرے

یہ بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں اور چونکہ اس کا تسلی بخش جواب آج تک کسی سے بن نہیں آیا اس لئے اگر اقبال بھی اس کا قطعی اور مسکت جواب دینے سے قاصر رہا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

برہما اور مایا، خدا اور مخلوقات کی گتھی کو جہاں ہے وہیں رہنے دیجئے، اور صرف اس دُنیا کا مطالعہ فرمائیے جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ عالمِ جمادات بے حس وحرکت اور بے صوت ونغمہ نظر آتا ہے۔ پتھر کو کسی نے جہاں رکھا وہیں پڑا رہا، کسی نے لڑھکا دیا تو لڑھک گیا۔ خاموش اور بے حس ہے۔ لیکن یہ بھی زندگی کا ایک مقام ہے۔ طبیعی (Physicists) کہتے ہیں کہ جس کو تم بے حس وحرکت اور بے صوت ونغمہ پتھر کا ٹکڑا سمجھتے ہو اس میں لاتعداد الیکٹران Electrons اور پروٹان Protons ہیں جو ایک ازلی اور ابدی رقص وسرود میں مصروف ہیں۔ عالمِ نباتات میں حسیات اور نشوونما کا ظہور ہے۔ چھوٹا سا بیج پھوٹتا ہے اور ایک درخت کی عظیم الشان صورت اختیار کرتا ہے لیکن اس ذوقِ نمو کے باوجود درخت زمین میں گڑا ہوا ہے اور اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر چل پھر نہیں سکتا۔ عالمِ حیوانات میں یہ ذوقِ نمو ذوقِ رفتار اور لذتِ آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن حیوان ان سب چیزوں کے باوجود اس غور وفکر اور تدبیرِ مستقبل سے محروم ہے جو عالمِ مخلوقات میں صرف انسان کے حصہ میں آئی ہے۔ لیکن عام انسان اِن تمام صفات کے ہوتے ہوئے اس ذوق وسرور، اس عرفانِ حقیقت اور اس روحانی زندگی سے ناآشنا ہے جس کو صرف مردانِ خدا حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو یہی سلسلۂ ارتقاء ہے۔

آغازِ تخلیق کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:۔

زندگی از لذتِ غیب وحضور	بست نقشِ ایں جہانِ نزد و دُور
آنچناں تارِ نفس از ہم گسیخت	رنگِ حیرت خانۂ ایام ریخت
ہر کجا از ذوق وشوقِ خود گری	نعرۂ "من دیگرم تُو دیگری"
ماہ واختر را خرام آموختند	صد چراغ اندر فضا افروختند
از اُفق صبحِ نخستیں سر کشید	عالمِ نوزادہ را در بر کشید
مُلکِ آدم خاکدانے بود وبس	دشتِ اُو بے کاروانے بود وبس
نے سرودِ طائراں در شاخسار	نے رمِ آہو میانِ مرغزار
بے تجلّی ہائے جاں بحر وبرش	دُود پیچاں طیلسانِ پیکرش

یہ تو ہے دُنیا کا آغاز، اس کے بعد "زندگی" نمودار ہوتی ہے۔ اقبال کے ہاں اس کی تصویر بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

روزہا روشن زغوغائے حیات	نے ازاں نُورے کہ بینی در جہات

نورِ صبح از آفتابِ داغدار | نورِ جاں پاک از غبارِ روزگار
نورِ جاں بے جادہ ہا اندر سفر | از شعاعِ مہر و مہ سیّار تر
عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند | عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند

حیاتیتین *Biologists* کا سلسلۂ ارتقاء تو تخلیقِ آدم پر آ کر رُک جاتا ہے۔ لیکن دیگر روحانیتین *Spritualists* کی طرح اقبال اس سے آگے جاتا ہے۔ ہر ایک انسان کا سینہ عرفانِ حقیقی سے منوّر نہیں۔ ہر ایک دِل تجلّیاتِ رُوحانی کا مرکز نہیں۔ ہر ایک وجود کو حُسنِ ازل کے وصال کی لذت کا احساس نہیں۔ چنانچہ انسان میں جب یہ رُوح کی بیداری یا حیاتِ نَو پیدا ہوتی ہے تو اس کا مقام عام انسان سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ مقام جو صرف مردانِ حق کو حاصل ہوتا ہے۔

اقبال کے ہاں اس رُوحانی بیداری کا ذکر یوں آیا ہے:۔

از طریقِ زادن اے مردِ نکو! | آمدی اندر جہانِ چار سُو
ہم بروں جستن بزادن می تواں | بندہا از خود کشادن می تواں
لیکن ایں زادن نہ از آب و گِل است | داند آں مرد کہ اُو صاحب دِل است
آں ز مجبوری است ایں از اختیار | آں نہاں در پردہا ایں آشکار
آں سکون و سَیر اندر کائنات | ایں سراپا سَیر بیروں از حیات
زادنِ طفل از شکستِ اشکم است | زادنِ مرد از شکستِ عالم است

جانِ بیدارے چو زاید در بدن
لرزہ ہا اُفتد دریں دَیرِ کُہن

ہر ایک پیکرِ خاک میں یہ "زادنِ رُوح" عمل میں نہیں آتا۔ اس سے قبل "زندگی" نے صرف اس قدر ترقی کی تھی کہ زندہ چیزیں کائنات کے اندر اندر دَوڑ پھر سکتی تھیں۔ لیکن اس "زادنِ رُوح" یا "حیاتِ نَو" کے بعد یہی "زندگی"، "وقت" اور "جہت" کی قیود کو توڑ کر ان سے بہت آگے اور بہت بلند پرواز کرتی ہے۔

مہاتما گوتم بُدھ نے اس روحانی پرواز کا آخری مقام "نروان" قرار دیا ہے۔ "نرواں" سے مُراد خدا اور انسان کا باہمی انجذاب یا وصال ہے۔ اقبال کی منزلِ مقصود اس کا پیہم سفر ہے۔ وہ کہیں بھی ٹھہرنا یا رُکنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ اس ابدی جستجو ہی کو وُہ اپنی منزل قرار دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ بھی خود ہی بتاتا ہے:۔

زانکہ آیاتِ خدا لا انتہا است | اے مسافر! جادہ را پایاں کجا است!

اس کا ذوقِ پرواز غیر محدود پہنائیاں اور غیر مختتم بلندیاں چاہتا ہے :-

در بیابانِ طلب دیوانہ شو | یعنی ابراہیمؑ ایں بُت خانہ شو
چوں زمین و آسماں را طے کُنی | ایں جہان و آں جہاں را طے کُنی
از خدا ہفت آسماں دیگر طلب | صد زمان و صد مکاں دیگر طلب
گر نجاتِ ما فراغ از جستجو است | گور خوشتر از بہشتِ رنگ و بُو است

اے مسافر! جاں بمیرد از مقام
زندہ تر گردد ز پروازِ مدام

اسی مضمون کو غزل کے ایک شعر میں یُوں بیان کیا ہے :-

زجوئے کہکشاں بگذر، ز نیلِ آسماں بگذر | بمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ زندگی جمُود کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے کس قدر بے تاب ہے۔ سلسلۂ ارتقا پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجِ حیات کی روانی میں بے شمار رُکاوٹیں ہیں لیکن وُہ ان تمام رُکاوٹوں پر غالب آنے کے لئے ہر لمحہ بے قرار اور کوشاں ہے۔ عالمِ جمادات سے لے کر عالمِ حیوانات تک انہیں رُکاوٹوں کا نام "مادہ" (Matter) ہے۔ لیکن انسان میں یہی 'مادہ' باطل اور شر کی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ وُہی مَوجِ حیات یعنی 'حرکت' انسانی وجُود میں آ کر 'حق' اور 'نیکی' سے موسوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس رُوحانی ارتقا میں ہمیں خیر و شر، حق و باطل، عدل و ظلم، محبّت و عداوت، عقل و عشق اور اہرمن و یزداں کے درمیان ایک پیہم کشمکش نظر آتی ہے۔ مردِ حق اِن طاغوتی قوتوں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا ہے :-

مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ | بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

اور آخر کار اِن سب پر غالب آتا ہے۔ اس رُوحانی جنگ کا فلسفہ اقبال نے یُوں بیان کیا ہے۔

حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ سے اقبال پُوچھتا ہے :-

از تو خواہم سرِّ یزداں را کلید | طاعت از ما جُست و شیطاں آفرید
زشت و ناخوش را چناں آراستن | در عمل از ما نکوئی خواستن
از تو پُرسم ایں فسوں سازی کہ چہ! | با قمارِ بد نشیں بازی کہ چہ!
مشتِ خاک و ایں سپہرِ گرد گرد | خود بگو می زیبدش کارے کہ کرد!

یہی سوال بہت سے اَور شعراء اور مفکرین نے بھی اُٹھایا ہے۔ حضرت خواجہ حافظ شیرازی کا اندازِ بیان غالباً سب سے زیادہ بلیغ ہے :-

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ   بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش!

حضرت شاہ ہمدان رح اس نکتہ کا حل یوں پیش فرماتے ہیں :۔

بزم بادیواست آدم را وبال   رزم بادیواست آدم را جمال

خویش را بر اہرمن باید زدن   تو ہمہ تیغ، آں ہمہ سنگِ فسن!

تیز ترشو تا فتد ضربِ تو سخت   ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

گویا شیطان کا وجود محض ایک سنگِ راہ ہے جو آدم اور یزداں کے درمیان حائل ہے۔ لیکن اگر 'موجِ حیات' یا 'حسنِ عمل' میں کافی طاقت ہے تو اس پتھر یعنی جمود و تعطّل کو توڑ سکتی ہے۔ وہی سنگ جو ہماری راہ میں حائل ہے شمشیرِ عمل کے لئے محض سنگِ فساں ہے یعنی طاغوتی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے ہماری ملکوتی قوتیں اَور بھی تیز ہو جاتی ہیں۔ اس حق و باطل کی جنگ میں کامیاب ہونے کے لئے ہمیں رہنمائی کی حاجت ہے اور اقبال "عشق" کو بہترین رہنما قرار دیتا ہے۔ "عشق" سے مُراد وہ جذبۂ ملکوتی ہے جو ہمیں حق اور نیکی کی حمایت کے لئے اُبھارتا ہے اور اس کے مقابل میں 'عقلِ حیلہ گر' یا 'علمِ کتابی' ایک رُکاوٹ بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ 'منطقی عقل' تاویلوں سے کام لیتی ہے۔ مادی منفعت اور مضرت دکھا دکھا کر ہمیں 'کارِ حق' سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ اس قسم کا 'علم' اور اس قسم کی 'عقل' گویا اسی جمود و تعطّل کی دُوسری صُورت ہے جو ہمیں سلسلۂ ارتقا کی ابتدا میں ٹھوس مادّے (Matter) کی صُورت میں نظر آتا ہے۔

'عقل' و 'عشق' کا موازنہ ملاحظہ فرمائیے :۔

علم در اندیشہ می گیرد مقام   عشق را کاشانہ قلبِ لاینام

علم تا از عشق برخوردار نیست   جُز تماشا خانۂ افکار نیست

ایں تماشا خانہ سحرِ سامری است   علم بے رُوح القدس افسوں گری است

علم غور و فکر ہے اور عشق جذبۂ عمل جو شام و سحر بیدار رہتا ہے، زندگی کی حقیقت عمل ہے اس لئے جوہرِ زندگی عشق یعنی حُسنِ عمل ہے نہ کہ علم ؎

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق   عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ایک اَور مقام پر یہی موازنہ یوں پیش کیا گیا ہے :؎

عقل اُورا سوئے جلوت می کشد   عشق اُورا سوئے خلوت می کشد

چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست   لیکن اُورا جرأتِ رندانہ نیست

عقل در کوہے شگافے می کند   یا بگردِ اُو طوافے می کند

کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود | دل سریع السیر چوں ماہے بود
عشق شبخونے زدن بر لامکاں | گور را نادیدہ رفتن از جہاں

گویا انسانی فطرت یا ضمیر کے اندر جو جنگ برپا ہے وہ حقیقت میں حق و باطل اور خیر و شر کی جنگ ہے اور اس جنگ میں 'عشق' یعنی حُسنِ عمل ہی مردِ حق کی تیغ و سپر ہے۔

یہیں سے 'مردِ حق' کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ مردِ حق وُہ انسان ہوگا جو باطل اور شر پر غالب رہے گا جس کی ملکوتی قوتیں طاغوتی قوتوں کو سرنگوں کر دیں گی، جس کے وجود میں حق اور نیکی کا ابدی نور درخشاں ہوگا اور باطل کی تاریکیاں اس نُور کے اندر گم ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس انسان کو 'مردِ کامل'، پیغمبر، اُوتار یا نائبِ خدا کہا جائے تو بجا ہے۔ چنانچہ اقبال نے جہاں جہاں مردِ حق کے اُوصاف بیان کئے ہیں وہاں اس نے ان اوصاف کو کسی نہ کسی پیغمبر بالخصوص پیغمبرِ عرب کی ذات میں متشکل پایا ہے۔

"وقت" اپنی عالمگیری بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ صرف مردِ حق میرے طلسم سے آزاد ہے:-

در طلسمِ من اسیر است ایں جہاں | از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں
لی مع اللہ ہر کرا در دِل نشست | آں جواں مردے طلسمِ من شکست
گر تو خواہی من نباشم درمیاں | لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

یہ ایک حدیثِ پاک (لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ) کی طرف اشارہ ہے۔ گویا مردِ حق "وقت" کے طلسم سے آزاد ہے اور اس کے ثبوت میں پیغمبرِ عرب کی ذاتِ گرامی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اُور مقام پر 'مردِ حق' اور 'آمرِ قاہر' Dictator میں فرق بیان کرتے ہوئے حضرت کلیم اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے:-

دبدبہ قلندری، طنطنۂ سکندری | آں ہمہ جذبۂ کلیم، ایں ہمہ سحرِ سامری
آں بنگاہ می کُشد، ایں بہ سپاہ می کُشد | آں ہمہ صلح و آشتی ایں ہمہ جنگ و داوری
ہر دو جہاں کشا ستند، ہر دو دوام خواستند | ایں بہ دلیلِ قاہری آں بہ دلیلِ دلبری

ضربِ قلندری بیار، سدِ سکندری شکن
رسمِ کلیم تازہ کُن رونقِ ساحری شکن

'مردِ حق' کے اُوصاف کیا ہیں:-

طبعِ روشن مردِ حق را آبرو ست | خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اُو ست
خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است | مزدِ خدمت خواستن سوداگری است

دیگر

مردِ حق از آسماں اُفتد چو برق | ہیزمِ اُو شہر و دشت و غرب و شرق
ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات | اُو شریکِ اہتمامِ کائنات
اُو کلیمؑ اُو مسیحؑ و اُو خلیلؑ | اُو محمدؐ اُو کتاب و جبرئیلؑ
آفتابِ کائناتِ اہلِ دل | از شعاعِ اُو حیاتِ اہلِ دل
اوّل اندر نارِ خود سوزد ترا | باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ با سوزِ اُو زندہ دلیم | ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم

مردانِ حق کے متعلق اقبال نے بہت سے مقامات پر لکھا ہے لیکن ہم اس مضمون کو ذیل کے اقتباس پر ختم کردیں گے۔ اس اقتباس سے معلوم ہوگا کہ حق، جو کائنات کے اندر ایک جوہر کی طرح ہے وُہ مختلف انسانی صُورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور یہی وہ انسان ہیں جو مردانِ حق کہلاتے ہیں۔

اقبال (زندہ رود) اور منصورِ حلاج کی گفتگو ملاحظہ فرمایئے:۔

حلاج:۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو | آنکہ از خاکش بروید آرزُو
یا ز نُورِ مصطفےٰ اُو را بہاست | یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

زندہ رود:۔

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطاست | سرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفےٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجُود! | آنکہ آید گاہے گاہے در وجُود

حلاّج:۔

پیشِ اُو گیتی جبیں فرسودہ است | خویش را خود "عبدہٗ" فرمودہ است
"عبدہٗ" از فہمِ تو بالاتر است | زانکہ اُو ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ اُو نے عرب، نے اعجم است | آدم است و ہم ز آدم اقدم است
"عبدہٗ" صُورت گرِ تقدیر ہا | اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر | ما سراپا انتظار اُو منتظر

کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود | دل سریع السیر چوں ماہے بود
عشق شبخونے زدن بر لا مکاں | گور را نادیدہ رفتن از جہاں

گویا انسانی فطرت یا ضمیر کے اندر جو جنگ برپا ہے وہ حقیقت میں حق و باطل اور خیر و شر کی جنگ ہے اور اس جنگ میں 'عشق' یعنی حُسنِ عمل ہی مردِ حق کی تیغ و سپر ہے۔

یہیں سے 'مردِ حق' کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ مردِ حق وُہ انسان ہوگا جو باطل اور شر پر غالب رہے گا جس کی ملکوتی قوتیں طاغوتی قوتوں کو سرنگوں کر دیں گی، جس کے وجود میں حق اور نیکی کا ابدی نور درخشاں ہوگا اور باطل کی تاریکیاں اس نُور کے اندر گم ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس انسان کو 'مردِ کامل'، پیغمبر، اُوتار یا نائب خدا کہا جائے تو بجا ہے۔ چنانچہ اقبال نے جہاں جہاں مردِ حق کے اُوصاف بیان کئے ہیں وہاں اس نے ان اوصاف کو کسی نہ کسی پیغمبر بالخصوص پیغمبرِ عرب کی ذات میں متشکل پایا ہے۔

"وقت" اپنی عالمگیری بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ صرف مردِ حق میرے طلسم سے آزاد ہے:—

در طلسم من اسیر است ایں جہاں | از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں
لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست | آں جواں مردے طلسمِ من شکست
گر تو خواہی من نباشم درمیاں | لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

یہ ایک حدیثِ پاک (لِی مَعَ اللہِ وَقْتٌ) کی طرف اشارہ ہے۔ گویا مردِ حق "وقت" کے طلسم سے آزاد ہے اور اس کے ثبوت میں پیغمبرِ عرب کی ذاتِ گرامی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اُور مقام پر 'مردِ حق' اور 'آمرِ قاہر' Dictator میں فرق بیان کرتے ہوئے حضرت کلیم اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے:—

دبدبہ قلندری، طنطنہ سکندری | آں ہمہ جذبہ کلیمؑ، ایں ہمہ سحرِ سامری
آں بنگاہ می کُشد، ایں بہ سپاہ می کُشد | آں ہمہ صلح و آشتی ایں ہمہ جنگ و داوری
ہر دو جہاں کشاستند، ہر دو دوام خواستند | ایں بہ دلیلِ قاہری، آں بہ دلیلِ دلبری

ضربِ قلندری بیار، سدِ سکندری شکن
رسمِ کلیمؑ تازہ کُن رَونقِ ساحری شکن

مُردِ حق کے اُوصاف کیا ہیں:—

طبعِ روشن مردِ حق را آبرُو ست | خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اُوست
خدمت از رسمِ و رہِ پیغمبری است | مُزدِ خدمت خواستن سوداگری است

دیگر

مردِ حق از آسماں اُفتد چو برق — ہیزمِ اُو شہر و دشت و غرب و شرق
ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات — اُو شریکِ اہتمامِ کائنات
اُو کلیمؑ اُو مسیحؑ و اُو خلیلؑ — اُو محمدؐ اُو کتاب و جبرئیلؑ
آفتابِ کائناتِ اہلِ دل — از شعاعِ اُو حیاتِ اہلِ دل
اوّل اندر نارِ خود سوزد ترا — باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ با سوزِ اُو زندہ دلیم — ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم

مردانِ حق کے متعلق اقبال نے بہت سے مقامات پر لکھا ہے لیکن ہم اس مضمون کو ذیل کے اقتباس پر ختم کردیں گے۔ اس اقتباس سے معلوم ہوگا کہ حق، جو کائنات کے اندر ایک جوہر کی طرح ہے وُہ مختلف انسانی صُورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور یہی وہ انسان ہیں جو مردانِ حق کہلاتے ہیں۔

اقبال (زندہ رود) اور منصورؒ حلاج کی گفتگو ملاحظہ فرمایئے:۔

حلاج:۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو — آنکہ از خاکش بروید آرزُو
یا ز نُورِ مصطفےٰ اُو را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

زندہ رود:۔

از تو پرسم گرچہ پُرسیدن خطاست — سرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفےٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجُود! — آنکہ آید گاہے گاہے در وجُود

حلاج:۔

پیشِ اُو گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود "عبدہٗ" فرمودہ است
"عبدہٗ" از فہمِ تو بالاتر است — زانکہ اُو ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ اُو نے عرب، نے اعجم است — آدم است و ہم ز آدم اقدم است
"عبدہٗ" صُورت گرِ تقدیر ہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار اُو منتظر

عبدۂ دہر است دہر از عبدۂ است ما ہمہ رنگیم، اُو بے رنگ و بُو است
عبدۂ با ابتدا بے انتہا است عبدۂ را صبح و شام ما کجا است!
کس ز سرِّ عبدۂ آگاہ نیست عبدۂ جُز سرِّ اِلّا اللہ نیست
لَا اِلٰہ تیغ و دمِ اُو عَبۡدُہٗ فاش ترخواہی بگو "ھُو" عَبۡدُہٗ

اس اقتباس سے مردِ حق کا مفہوم بالکل روشن ہوگیا۔ وُہ آدم بھی ہے اور جوہر بھی، انسان بھی ہے اور خُدا بھی، وُہ کائنات کے اندر بھی ہے اور اس سے بالا بھی، بلکہ وہ رُوحِ کائنات ہے ع فاش ترخواہی، بگو "ھُو" عبدہٗ ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صوفی عالمِ مستی میں اَنَا الحق پکار اُٹھتا ہے اور یوگی اہم برہم اُوسمہ (میں ہی برہما ہوں) کا نعرہ لگاتا ہے۔ یہ تمام اشعار سرورِ کائنات محمدِؐ عربی کی شان میں ہیں۔ اقبال جب مردِ حق کا مکمل ترین تصوّر کسی انسانی صُورت میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو پیغمبرِ عرب فداہ امّی وابی کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتا۔

'حق' جب فرد میں ظاہر ہوتا ہے تو مردِ حق کا وجُود ظہور میں آتا ہے، یہی 'حق' جب اجتماعی رنگ میں ظاہر ہوگا تو "حکومتِ الٰہی" قائم ہوگی، جو جنگ فرد کے اندر خیر و شر کی صُورت میں برپا ہے وُہی جنگ عالمگیر پیمانہ پر دُنیا میں جاری ہے۔ مردِ حق کے وجود میں باطل مغلوب ہو جاتا ہے اور حق ہی حق کارفرما ہوتا ہے۔ اسی طرح جب عالمگیر پیمانہ پر باطل کو سرنگوں کر دیا جائے گا تو تمام عالم میں حق ہی حق کارفرما ہو جائے گا۔ یہی ہے "حکومتِ الٰہی" یا "خدا کی بادشاہت"۔

حق کے انفرادی اور اجتماعی حُسن کی تصویر ملاحظہ فرمائیے:۔

عشق در خلوت کلیم اللّٰہی است چوں بجلوت می خرامد شاہی است
گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا است خلوت آغاز است و جلوت انتہا است

راہِ حق با کارواں رفتن خوش است
ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است

"حکومتِ الٰہی" کی بُنیادی خصوصیتوں کا ذکر اقبال نے یوں کیا ہے:۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام نے غلام اُو را نہ اُو کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سُود ہمہ   در نگاہش سُود و بہبودِ ہمہ
غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود   زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیرِ گردوں آمری از قاہری است
آمری از ماسوی اللہ کافری است

سطورِ بالا سے اقبال کے بنیادی فلسفیانہ تصورات کی کچھ جھلک نظر آ گئی ہو گی۔ وہ شاعرِ زندگی ہے، زندگی ایک پیہم کشمکش ہے یہ جنگ ہر لمحہ اور ہر لحظہ برپا ہے۔ ابتدا میں یہ کشمکش جمود اور حرکت کے درمیان ہے۔ انسان میں یہی جنگ نئی اصطلاحات اختیار کرتی ہے اور معرکۂ حق و باطل کہلاتی ہے۔ حق کی انفرادی فتح کی صورت میں مردِ حق ظاہر ہوتا ہے اور حق کی عالمگیر فتح سے حکومتِ الٰہی ظہور میں آتی ہے۔ حکومتِ الٰہی کا تصور یقیناً ایک شاندار اور زریں تصور ہے۔ اور شاید اس بغض و عداوت ظلم و ستم اور جبر و قہر کی دُنیا میں اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اربابِ حق یہ خواب دیکھتے چلے آ رہے ہیں، اس کی تعبیر معلوم نہیں کوئی ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو ابھی اس کے پُورا ہونے کے لئے کتنی صدیاں درکار ہیں۔ بہرحال ایسے خواب دیکھنے والے انسانوں کی ابھی اس دُنیا کو ضرورت ہے اور اس خواب کی کوئی تعبیر ہو یا نہ ہو یہ خواب فی نفسہٖ نہایت ہمّت افزا اور رُوح پرور ہے۔ اس اہرمنی دُنیا کی گھناؤنی تاریکیوں میں اسی خواب سے کچھ رنگ اور نُور ہے۔ اقبال دُنیا کے شکریے کا مستحق ہے کہ اس نے اپنی جادو نوائی سے اس خواب کو تازہ کیا اور ہماری بے کیف، باطل اور افسردہ زندگیوں میں پھر ایک بار حق و صداقت کی روح پھونکی۔ انسانی رُوح کو اس نے بلند ترین مقامات پر پہنچانے کی کوشش کی اور ہماری رائے میں تمام انسانی علوم و فنون کا بہترین مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو اس کی حقیقی عظمت سے آگاہ کیا جائے اور اس کی ملکوتی قوتوں کو بیدار کر کے بروئے کار لایا جائے ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اثر صہبائی

قطعہ

ناشنیدہ فغاں ہے اب ہستی   فرصتِ رائیگاں ہے اب ہستی
کس کو انور پڑی ہے جینے کی   تہمتِ ناکساں ہے اب ہستی

(لطیف انور گورداسپوری)

تہذیب

(علامہ اقبال کی نظر میں)

انساں کہ رُخ زغازۂ تہذیب برفروخت — خاکِ سیاہِ خویش چو آئینہ وا نمود

پوشید پنجہ را تہِ دستانۂ حریر — افسونِ قلم شُد و تیغ از کمر کشود

ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت — رقصید گرد او بنوا ہائے چنگ و عود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید — جز یَسْفِكُ الدِّمَاءَ و خَصِيمٌ مُّبِينٌ نبود

ترجمہ :- (سلیس ہندی میں)

وُہ اِنساں جس نے تہذیب کے رنگ روپ سے شکل بنائی — اپنے جنم کی کالی مٹّی آئینہ کر کے کھول دکھائی

چھُپا لیا اپنا چنگل ریشم کے سُہانے دستانے میں — منتر قلم کے جَپنے لگا تلوار کمر سے کھول گرائی

اس پاپی مایا لوبھی نے جگت شانتی کا ڈھونگ رچایا[2] — اُسی کے چاروں طرف ناچ کے اس نے اپنے من کی گائی

عالمگیر لڑائی[3] نے اس پردے کو جب پھاڑ کے پھینکا — تب یہ خاک کا خُونی پُتلا جانی دُشمن دیا دکھائی

سید مقبول حسین
احمد پوری

[1] کلام مجید کے الفاظ ہیں یعنی "جو خونریزی کرے گا" اور "کھلا ہُوا دشمن ہے"۔ فرشتوں نے پیدائشِ عالم کے وقت خدا کی بارگاہ میں معذرت پیش کی تھی کہ کیا تُو دُنیا میں انسان کو خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد اور خونریزی برپا کرے گا؟"

[2] محاورہ ہے۔ یعنی خود غرضی کرنے لگا ۔ [3] جنگِ عظیم ۔

خونی ناچ

دوسرے دن عید تھی اور میں پانچ دن کی رخصت لے کر گھر آ رہا تھا، ایک ٹرنک اور ایک گٹھڑی جس میں گوجرانوالے کے سرخ مالٹے اور کچھ بچوں کے لئے کھلونے بندھے تھے بس یہ مختصر سا سامان تھا، جسے میں نے لاہور اترتے ہی کرایہ کے سالم تانگے پر لدوا لیا اور خوشی خوشی گھر چلا۔ کل عید بھی تھی اور پھر خالہ اور خالہ کی لڑکی رفعت بھی آئی ہوگی۔ رفعت کی بڑی بڑی آنکھوں کی ملامت اور اس کے محجوب سے لبوں کی مسکراہٹ بار بار گویا آنکھوں کے آگے آ کر کہہ رہی تھی "اوہ، بھائی جان، اور آپ بھی آگئے، اب شودھنا کا خونی ناچ دیکھنے میں خوب لطف آئے گا" جب سے میں نے گوجرانوالہ میں شودھنا کے رقص کے متعلق اخبار میں مضامین پڑھے تھے۔ پس میں سوچ رہا تھا کہ عید ہوگی اور رفعت اور میں اور شودھنا کا خونی ناچ، رفعت، رفعت، کتنا خوبصورت نام ہے، میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا، اس نام کو سن کر طبیعت چاہتی ہے، کہ آدمی اپنا نام یکسر بدل ڈالے بھلا صابر بھی کوئی نام ہے، نام ہو عارف، عتیق، محبوب، کچھ ہو لیکن صابر، صابر۔۔۔ یہ نام تو ایسا ہے جیسا کسی چمڑا بیچنے والے دکاندار کا، یکایک میونسپلٹی کی سڑک کے ایک گڑھے نے تانگے کو وہ ہچکولا دیا، کہ گھوڑا گرتے گرتے بچا، اور مجھے تو گویا دن کو تارے نظر آگئے، اب تانگے والے کے منہ سے ایسی نئی "بطرز جدید" قسم کی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میں رشک و حیرت سے اس کے منہ کی طرف تکتا رہ گیا، میں نے سوچا کیا روانی ہے، زبان میں کس قدر لوچ ہے کیسی لچھے دار تشبیہیں، کاش یہ تانگے والا ادیب ہوتا۔ شاہ عالمی سے لے کر لوہاری دروازے تک میونسپل باغ کے لکڑی کے جنگلے پر پرانے گرم کوٹ لٹکے ہوئے تھے اور ہر دس قدم کے فاصلے پر دو تین کابلی پٹھان فٹ ہاتھ پکڑے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن وہ اس وقت گرم کوٹ نہیں بیچ رہے تھے بلکہ تانگے والے کے منہ سے لاہور میونسپلٹی کے متعلق تعریفی کلمات اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ سینما کے مندر کے قریب تانگے والے کو ذرا رک جانا پڑا، یہاں بہت بھیڑ تھی، بہت سے لوگ جمع تھے اور دو چار پولیس کے آدمی بھی، ایک حادثہ ہو گیا تھا، شرط بدکر بھاگنے والے دو تانگے آپس میں ٹکرا گئے تھے اور ایک مزدور جو بستر اٹھائے ہوئے آگے دوڑا جا رہا تھا، ان دو تانگوں کے بیچ میں آ کر گھن کی طرح پس گیا تھا، اس کی خون میں لتھڑی لتھڑی لاش سڑک پر پڑی تھی اور بستر کا مالک اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے تانگے والوں کی بدمعاشی کا، گاڑی سے لیٹ ہو جانے کا اور بستر کے لہو سے لت پت ہو جانے کا بلند اور کرخت آواز میں ذکر کر رہا تھا۔ لمبی لمبی مونچھوں کو سائیکل کے ہینڈل کی طرح موڑ کر رکھنے کا شوقین سپاہی ہنٹر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا "یہ سب ان تانگے والوں کی بدمعاشی ہے"۔

دوسرا سپاہی بولا "اپنا نام لکھاؤ، لالہ جی"۔

مجمع میں مختلف آوازیں اٹھ رہی تھیں، "اوہو، اوہو، چ، چچ، چچ، مر گیا بیچارہ" "گھوڑے بھی زخمی ہو گئے ہیں" "کمبخت تانگے والوں کو کوئی چوٹ نہیں آئی!" "مگر دیکھئے اس تانگے والے کا تو کم سے کم سو روپیہ کا نقصان ہو گیا" "اف! ...."

تانگے اور موٹریں، لاریاں اور چھکڑے جمع ہو گئے، دیکھتے دیکھتے شاہ عالمی تک راستہ بند ہو گیا آخر مشکل سے میرے تانگے والے نے بڑ کے درخت کے قریب "ہٹو مہربان، لالہ جی ایک طرف، خان صاحب، منشی جی، سائیں جی، او مائی، بچ جا" کہہ کر راستہ نکالا، اور پھر گھوڑے کو جو چابک کھایا تو لوہاری کے چوک میں پہنچ گیا، خوانچے والوں کی صدائیں، انارکلی کے اندر گزرتے ہوئے تانگوں میں دلفریب ساریوں کی جھلک، "یہ لاہور ہے" اور سینما والوں کی اشتہاری

گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاص پروگرام، ریجنٹ میں "نورِ اسلام" میٹرو میں "بانکی الفت"، الفنسٹن میں "شاہی لٹیرا"، راکسی میں "شان قلندر"، پربھات میں "شودھنا کا ناچ"۔

شودھنا کا ناچ اور رفعت!

بھاٹی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا: "مجھے یہیں اُترنا ہے"۔ ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اٹھایا اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا، تانگے والے نے چار آنے لے کر گھوڑے کا رُخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا، اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔ مزدور بولا "اسباب اُٹھاؤں؟ جی؟"

"اُٹھاؤ، ذیلدار روڈ پر لے چلو، یہاں سے قریب تو ہے، ایک آنہ دیں گے"۔

کچھ جواب دیئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے بستر اور گٹھڑی اُٹھا لی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھا "ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو؟"

"جی نہیں، نیا نیا آیا ہوں"۔ اُس کا لہجہ نہایت خوشگوار اور دیہاتی تھا، شہری تصنع سے بالکل پاک۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ملتان سے"

"خاص ملتان سے؟"

"جی نہیں، ملتان کے نزدیک پاروال گاؤں ہے، وہاں سے آیا ہوں، پہلے لائل پور گیا تھا، پھر ادھر لاہور آ گیا ہوں"

"کیا لائل پور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی؟"

"مزدوری تو — ملتی تھی، مگر...... بات یہ ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی...... ہم چار بھائی ہیں، میرے تین بڑے بھائی بیاہے ہوئے ہیں، مگر میں کنوارا ہوں، دو بڑے بھائی تو پاروال میں کاشت کرتے ہیں، زمین تھوڑی ہے، گزارا نہیں ہوتا۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری کے لئے ملتان سے لائلپور منڈی آئے تھے، اور ایک دن جب ہم گھنٹہ گھر کے قریب بستا رہے تھے، ہمیں ایک بابو ملا، اُس نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی، ہم سے پوچھنے لگا "مزدوری کرو گے؟" ہم نے کہا "کریں گے"، بولا "یہاں کیا لیتے ہو؟" ہم نے کہا "آٹھ آنے روزانہ"، کہنے لگا "میں بارہ آنے روزانہ دوں گا لیکن تمہیں ملکوال میرے ساتھ چلنا پڑے گا"۔ ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملکوال چلے گئے۔ وہاں سے وہ بابو ہمیں سدھووال لے گیا، راستے میں ہمیں تسلی دیتا گیا کہ بڑا آسان کام ہے، بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا، ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی، لیکن سوچا، اس میں کیا ہے، کریں گے، سدھووال جا کر اُس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال تھما دی اور ریلوے لائن پر لے گیا، اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ نیو میں کھودنی ہے، اور جتنے فٹ روز زمین کھودو گے اُس کے حساب تمہیں پیسے ملیں گے۔ اس حساب سے ہمیں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے، اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے، ایسی سخت مٹی تھی وہ، آخر ایک دن ہم رات کو دونوں بھائی بھاگ نکلے۔ اُس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا، وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا، اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا، پھر ہم یہاں آ گئے، یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں، وہاں بارہ بجے تک چار چار آنے ہو جاتے ہیں، پھر ہم دن بھر اِدھر اُدھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں، بہت ہوا تو کسی دن آٹھ نو آنے بن گئے، لیکن عام طور پر پانچ، چھ آنے سے زیادہ روزانہ کمائی نہیں ہوتی"۔

میں نے پوچھا "تم رات کو رہتے کہاں ہو ؟"

"جی ، داتا کے دربار میں"

"وہاں جگہ ہے ؟"

مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے ، اور پھر ہم انہیں خوش بھی کر دیتے ہیں"۔

"اچھا !"

"جی"

اب میرا گھر سامنے آ گیا تھا ، ننھا عبید سامنے مٹی میں کھیل رہا تھا ، اس نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اپنی توتلی آواز میں چلا اٹھا "بھائی جان ! آ دئے" اور یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔

دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گٹھڑی فرش پر رکھ دی اور ایک طرف کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا ، اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے ، اور پُر مسرت نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ننھا عبید اور منجھلا بھائی ، اماں ، خالہ اور رفعت ، رفعت کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔

منجھلے بھائی بولے "ہم تو صبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے"۔

اماں بولیں "رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا ؟"

رفعت نے ہنستے ہنستے کہا "بھائی جان ! ہم تو آج ہی شودھنا کا ناچ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں !"

مزدور کونے میں سے بولا "مجھے پیسے جلد دیجئے ، میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا ، وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کے ساتھ بستر اٹھا کر گیا ہے اور اب واپس آ کر داتا جی کے دربار انتظار کر رہا ہوگا"۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا "کچھ انعام بھی مل جائے ، کل عید ہے بابو جی !"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر یکایک میرا ہاتھ رک گیا۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا ، میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے۔ رفعت کی مسکراہٹ یکایک پھیلتی ہوئی ساری فضا میں خوفناک حلقے بناتی ہوئی دکھائی دی۔ شودھنا کے رقصاں پاؤں میں بندھے گھنگرو یکایک زور زور سے چیخنے لگے ، ساری کائنات لرز رہی تھی ، انارکلی میں گزرتے ہوئے تانگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے یکایک فضا میں لڑھکنے لگے ، اب چاروں طرف خون ہی خون تھا ، اور دو پتھرائی ہوئی آنکھیں اس میں سے باہر جھانک رہی تھیں ، اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے بھنبھنانے کی گونج کے ساتھ کہہ رہا تھا "اے ہے ، چ چ چ بے چارہ مر گیا . . . . . "

کرشن چندر

تتلیاں

چینی اور جاپانی زندگی اور ادب میں تتلیوں کو جو اعتقادی اور جمالیاتی اہمیت حاصل ہے اُس کا سرسری سا اندازہ لیفکاڈیو ہرن کے اس مقالہ سے ہوسکتا ہے:۔

کاش میں بھی اُس چینی مصنف کا ہم قسمت ہونے کی اُمید کرسکتا جو جاپانی ادب میں ردسان کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اُس سے دو ایسی دوشیزہ روحوں، دو آسمانی سہیلیوں کو محبت تھی جو ہر دسویں دن اُس سے ملنے کے لئے آتیں اور اُسے تتلیوں کی پُراسرار کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ کاش میں بھی ایسی کہانیاں سُن سکتا! لیکن میں کبھی چینی زبان نہ پڑھ سکوں گا بلکہ مجھے جاپانی زبان بھی اچھی طرح نہیں آتی اور وُہ چند جاپانی نظمیں جن کا ترجمہ میں نے نہایت مشکل سے کیا ہے، تتلیوں کی چینی کہانیاں کے حوالوں سے اس قدر بھری ہوئی ہیں کہ میری حالت اُس پیاسے اپاہج کی سی ہوجاتی ہے جس کے سامنے دریا موجیں مار رہا ہو لیکن وہ کنارے تک پہنچنے کے لئے ترستا رہے۔ . . . . اور یہ بات تو یقینی ہے کہ کوئی دوشیزہ رُوح کبھی مجھ سے شکی آدمی کے پاس آنے کی جرأت ہی نہ کرے گی۔

مگر میں اُس چینی دوشیزہ کی پوری کہانی سننا چاہتا ہوں جو اس قدر حسین اور شمیم انگیز تھی کہ تتلیوں نے اُسے پھول سمجھ لیا اور اُن کے جھنڈ کے جھنڈ اس کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔ اِسی طرح میں شہنشاہ جینسو یامنگ ہوانگ کی اُن تتلیوں کے متعلق کچھ اور سُننا چاہتا ہوں جو اُس کے لئے حسین عورتوں میں سے محبوبہ کا انتخاب کیا کرتی تھیں۔ . . . . یہ شہنشاہ اپنے جنت نظیر باغ میں عیش و نشاط کی محفلیں برپا کیا کرتا تھا جہاں جادو نظر لڑکیاں ساقی گری کے لئے موجود ہوتی تھیں۔ اِن محفلوں میں تتلیاں پنجروں میں سے کھلی چھوڑ دی جاتیں اور وہ چھوٹتے ہی محفل کی حسین ترین دوشیزہ کی طرف لپکتیں چنانچہ یہی لڑکی شہنشاہ کی توجہ اور لطف و کرم کا مرکز بن جاتی۔ . . . . میں اُس چینی مصنف کے تجربے کے متعلق بھی کچھ اور معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں جو جاپانی ادب میں سوشو کے نام سے مشہور ہے۔ وُہ ایک دفعہ خواب میں تتلی بن گیا تھا اور اُس کی تمام حسیات بھی ایک تتلی کی حسیات بن گئی تھیں۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ اثنائے خواب میں اُس کی رُوح تتلی بن کر اِدھر اُدھر چکر لگاتی رہی تھی۔ حالت یہ ہوئی کہ بیدار ہونے پر اس کے دماغ میں تتلی کی زندگی کی یاد اور اس کی حسیات اتنی وضاحت کے ساتھ محفوظ رہ گئیں کہ وُہ انسانی طور طریقوں سے بیگانہ ہوگیا۔ . . . . میں چین کے سرکاری کاغذات میں اُن تحریروں کے مضمون سے بھی واقف ہونا چاہتا ہوں۔ جن میں مختلف تتلیاں کسی شہنشاہ اور اُس کے ملازمین کی روحیں قرار دی گئی ہیں۔

شاعری کے کچھ حصّے کو چھوڑ کر تتلیوں کے متعلق بیشتر جاپانی ادب کا سرچشمہ چینی ہے۔ بلکہ تتلیوں کے متعلق وہ قدیم قومی جمالیاتی حس بھی جس کے خوشگوار مظاہر ہیں جاپانی مصوری، موسیقی اور رسم و رواج میں نظر آتے ہیں، شاید پہلے پہل چینی اثرات کے ماتحت ہی پیدا ہوئی ہو۔ اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قدیم جاپانی شاعروں اور مصوروں نے عموماً اس قسم کے پیشہ ورانہ نام منتخب کئے: چوٗمو

(تتلی کا خواب) اِیچو (اکیلی تتلی)۔ آج کل بھی بعض رقاصہ لڑکیوں کے ایسے نام موجود ہیں مثلاً چوہانا (تتلی پھول) چوکیچی (تتلی کی قسمت والی) چوزسیوکی (تتلی کی مدد والی)۔

پیشہ ورانہ ناموں کے علاوہ عام لوگوں کے نام بھی کوچو اور چو وغیرہ (یعنی تتلی) رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے ناموں سے عموماً عورتیں ہی موسوم کی جاتی ہیں۔ مٹسو کے علاقے میں اب تک یہ پرانی رسم موجود ہے کہ گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی کو ٹیکونا (تتلی) کہتے ہیں۔ قدیم ادبیات میں یہ لفظ خوبصورت عورت کے لئے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔

ممکن ہے جاپان کے بعض عجیب وغریب پرانے اعتقادات کا سرچشمہ بھی چین ہی ہو۔ لیکن یہ اعتقادات خود چین سے بھی زیادہ قدیم ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے دلچسپ ترین عقیدہ یہ ہے کہ زندہ آدمی کی روح بھی کبھی کبھی تتلی کے روپ میں اِدھر اُدھر آوارہ اُڑتے پھرنے کی عادی ہے۔ اس عقیدے سے متعدد خوشگوار توہمات پیدا کئے گئے ہیں مثلاً اگر کوئی تتلی کسی کے مہمان خانے میں داخل ہو کر چلمن کے پیچھے بیٹھ جائے تو اس سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ اس کی محبوبہ ملنے کے لئے آرہی ہے۔

تتلی کا کسی شخص کی روح ہونا اُس سے ڈرنے کی دلیل نہیں لیکن بعض موقعوں پر تتلیوں نے فی الواقع خوف بھی پھیلا دیا ہے۔ جاپانی تاریخ میں اس قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ جب تیرا نوماسو کا ڈو خفیہ طور پر اپنی مشہور بغاوت کی تیاری میں مصروف تھا کیوتو پر تتلیوں نے اس قدر ہجوم کیا کہ لوگ اسے آئندہ عذاب کی علامت سمجھ کر خائف ہوگئے۔ شاید ان تتلیوں کے متعلق یہ خیال کیا گیا کہ یہ اُن ہزارہا لوگوں کی روحیں ہیں جو اس جنگ میں موت کے گھاٹ اُتر جائیں گے اور کسی پُراسرار الہام کے ذریعہ سے اپنی موت کی خبر پاکر ان میں اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔

غرض کہ جاپانی عقیدے کے مطابق تتلی کسی زندہ یا مُردہ آدمی کی روح ہو سکتی ہے۔ روحوں کی یہ عادت بھی سمجھی جاتی ہے کہ وہ جسم سے آخری مرتبہ رخصت ہونے سے پہلے تتلی کا روپ بھر کر اطلاع دینے کے لئے آتی ہیں۔ اس لئے جب کوئی تتلی گھر میں داخل ہو تو اُس سے مہربانی کا سلوک کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس عقیدے اور اس کے متعلقہ توہمات کا حوالہ اکثر عام ڈراموں میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹونڈے ڈیرو کوچوزکا نزوشی (کوچو کا اُڑتا بال پن) لیجئے۔ کوچو ایک خوبصورت عورت ہے جو جھوٹی تہمتوں اور بدسلوکیوں سے تنگ آکر خودکشی کر لیتی ہے۔ اس ظلم کا بدلہ لینے والا عرصے تک ان تہمتوں کے تراشنے والے کا سراغ لگانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ آخر کار [illegible] کے بالوں کا پن تتلی کا روپ اختیار کر کے اُس کا رہنما بن جاتا ہے اور ظالم کی کمین گاہ پر منڈلا کر انتقام کے کام کو آسان کر دیتا ہے۔

× × × × × × × × ×

شادی والے گھروں میں جوڑی جوڑی کاغذی تتلیاں نظر آتی ہیں۔ اُن سے کوئی پُراسرار عقیدہ وابستہ نہیں۔ وہ محض ازدواجی محبت اور اس خواہش کی علامت کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں کہ نیا بیاہا جوڑا اپنی زندگی دو ایسی تتلیوں کی طرح ہنستے کھیلتے گزارے جو کسی خوبصورت باغ میں اپنے ہلکے پھلکے پروں سے اُڑ رہی ہوں، کبھی اُڑتے اُڑتے دور اوپر چلی جائیں، کبھی چکر کھاتی ہوئی نیچے آ جائیں، لیکن

کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں ۔

جاپانی شاعروں نے تتلی کے متعلق کثرت سے طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں چند منتخب اشعار کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:۔

(۱)

سوتے ہوئے بھی
کھیل ہی کے خواب دیکھتی ہے
آہ گھاس کی تتلی[۱] !

---

(۲)

جاگ جاگ!
مَیں تجھے اپنی رفیقہ بنالوں گا
او سوتی ہوئی تتلی[۲] !

---

(۳)

آہ پنجرے میں پڑے ہوئے پرندے!
تیری پُرحسرت نگاہیں!
اُور تتلیوں سے تیرا رشک!

---

(۴)

ہوا بند ہے

---

[۱] جب تتلی آرام کر رہی ہو، اس وقت بھی اس کے پر وقتاً فوقتاً ہلتے نظر آتے ہیں اور یُوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُڑنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

[۲] بہار میں جوشِ مسرت کا اظہار مقصود ہے۔

لیکن تتلیوں کے پھڑپھڑاتے پروں نے
اپنی ہوا باندھ رکھی ہے

---

(۵)

پھول کی پتّی جھڑ کر
دوبارہ شاخ کی طرف پرواز کر گئی
ارے یہ تو تتلی تھی!

---

(۶)

ایک دوشیزہ چلی جا رہی ہے،
تتلی کبھی اُس کے آگے ہو جاتی ہے،
کبھی پیچھے۔

---

(۷)

اری تتلی!
تو اُس کے پیچھے جا رہی ہے،
جس نے پھول چُرائے۔

---

(۸)

تتلیاں سب کی سب،
یوں معلوم ہوتی ہیں
کہ اِن کا سن پندرہ یا سولہ برس کا ہے۔

---

(۹)

تتلی اِس طرح کھیل رہی ہے!
گویا اِس دُنیا میں
دُشمنی اَور کینے کا نام ہی نہیں

---

(۱۰)

تتلی یُوں اِدھر اُدھر اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے
گویا اِس دُنیا میں
اسے اَور کسی چیز کی خواہش ہی نہیں

---

(۱۱)

تم نے کہا ایک دُوسرے کے ساتھ خوش رہیں؛
ہاں اگر کسی آئندہ جنم میں ہم خیاباں کی تتلیاں بن جائیں
تو ہم میں موافقت پیدا ہو سکتی ہے[1]۔

---

(۱۲)

کاش وُہ دِن کبھی نہ گزرتے
اَور میرا دِل ہمیشہ
تتلیوں کے پیچھے دوڑنے کی خوشی محسوس کرنے کے قابل رہتا!

حامد علی خاں

---

[1] مشہور شاعر اِستا نے اپنی بی بی کو طلاق دینے کے موقع پر یہ شعر کہے تھے۔

ہندوستان کی قومی زبان

(ہندی یا ہندوستانی)

اُردو ہندی کا جھگڑا یوں تو اُنیسویں صدی کے اواخر ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ مگر اب کچھ عرصہ سے یہ مسئلہ ایک ہنگامہ خیز معکرہ بن گیا ہے۔ اُردو کو پسند کرنے والے طبقے کی طرف سے اُردو کے حق میں اور ہندی کے پجاریوں کی طرف سے ہندی کی حمایت میں دلیلیں دی جا رہی ہیں۔ مضامین پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ دونوں طرف سے اپنی اپنی زبان کو قومی زبان ثابت کیا جا رہا ہے۔ اور ہندوستانی قومیت کی بہت بڑی دماغی قوت کو جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں صرف کی جا سکتی تھی، اس باہمی نزاع پر ضائع کیا جا رہا ہے۔

کسی ملک کی قومی زبان کا مسئلہ اس وقت تک پیچیدہ رہتا ہے۔ جب تک اس کے تاریخی پس منظر کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔ ہندوستان کی تاریخ کی گذشتہ سات آٹھ صدیوں پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ جب مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں تمام ہندوستان کے باشندوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ مِل بیٹھنے اور باہمی رسم و راہ کو بڑھانے کی ضرورت پڑی تو ان کے میل جول سے ایک زبان پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کے باشندوں کی زبان ہونے کے سبب سے اس زبان کا نام ہندی یا ہندوستانی رکھا گیا۔ اور چونکہ مختلف مذاہب اور قوموں کے لوگوں کا اختلاط سب سے زیادہ شاہی افواج میں ہوتا تھا اور وہاں ہی سے زبان پیدا ہو کر پھیل رہی تھی۔ اس لئے اس زبان کو اُردو بھی کہا جانے لگا۔

مختصر تر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اُردو یا ہندوستانی بارھویں صدی سے لے کر سترھویں اٹھارھویں صدی عیسوی تک کے ہندو مسلمانوں کے مِل بیٹھنے، دو مختلف معاشرتوں، مختلف مذہبوں اور مختلف تمدّنوں کے باہم شیر و شکر ہونے کی زندہ یادگار اور ہندو اور مسلمان اہلِ قلم کی کوششوں سے لگایا اور سینچا ہُوا تناور درخت ہے۔

انجمن اُردو پنجاب کے فاضل صدر پنڈت برجموہن کیفی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے۔ یہ تنظیم سلطان اور رعایا۔ حاکم اور محکوم، افسری اور ماتحتی کی لم سے مبرّا ہے۔ وُہ ایک مبارک ثمر تھا۔ اس ادبی کلپ برکش اور طوبیٰ کے پیوند کا جو قدرت نے ہندوستان کی سرزمین میں بھیجے۔ یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا۔ رواداری نے اس کو تہذیب و تمدّن کے امرت سے سینچا اور شائستگی نے اس کی ضروری شاخ تراشی کی۔ حسنِ سلیقہ اور شعورِ نفسیاتی نے موافق ہوا مہیا کی۔ تب یہ قلمی پودا (اُردو) پروان چڑھا اور پھلا پھولا۔" (بحوالہ "ادبی دُنیا" نومبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۴۶۸)

اسی طرح سر تیج بہادر سپرو نے انجمن بہارِ ادب کے ایک جلسے میں فرمایا۔ کہ

"اُردو ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے"۔ (اُردو اپریل ۳۸ء)

اس حقیقت سے کسی صاحب علم و بصیرت کو انکار نہیں کہ اُردو یا ہندوستانی ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ اور اس کی تشکیل میں دونوں قوموں کی روایات کا برابر کا حصّہ ہے۔ انگریزوں کے راج سے پہلے ہندوستان کی دفتری زبان تو فارسی تھی۔ مگر ہندو اور مسلمان عوام جو زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ وُہ یہی اُردو یا ہندوستانی تھی۔ اور اُنیسویں صدی کے ربع آخر سے قبل ہندوستانیوں کے ذہن میں کوئی افتراق انگیز رجحان موجود نہ تھا۔ ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے ایک زبان پیدا ہو گئی تھی۔ جسے ہندوستانیوں کی اکثریت بولتی اور سمجھتی تھی۔ ہندو اور مسلم یکساں اس کی آبیاری کرتے تھے۔ اس زمانے کے ہندو اہلِ قلم میں سے لچھمی نرائن شفیق، ٹیک چند بہار۔ لالہ مادھورام، دیا شنکر نسیم اور پنڈت نوبت رائے کے اسما، ان ہندوستانیوں کے ذہن سے فراموش نہیں ہو سکتے جن کو ہندوستان کی قومی زبان سے ذرا بھی محبت ہے۔

مسلمانوں کی حکومت کے اختتام پر انگریزی حکومت کے ابتدائی دَور میں کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج محض اس لئے کھولا گیا کہ فارسی کو ترک کر کے ہندوستان کی قومی اُور وطنی زبان میں لٹریچر پیدا کیا جائے۔ اس کام کے لئے ہندوستان بھر کے ہندو مسلم اہلِ قلم حضرات کو چُن لیا گیا، اور ایک غیر ملکی حکومت کی سرپرستی میں جس زبان کو ملکی زبان قرار دے کر اس میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا گیا وُہ کسی پر مخفی نہیں۔

یورپ سے جو بہت سی نعمتیں ہندوستانیوں پر نازل ہُوئیں۔ ان میں ایک "قومیت کا تصوّر" بھی ہے۔ اس تصوّر سے ہندوستان کے باشندے بہت متاثر ہوئے۔ مغربی خیالات اور مغربی ممالک کے واقعات کی رَو نے اس تصوّر کو تقویت بخشی۔ یہاں تک کہ اُنیسویں صدی کے اواخر ہی میں ہندوستان میں ایک نیشنل جماعت کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اور ۱۸۸۵ء میں اس کی تشکیل بھی عمل میں آگئی۔

برادرانِ وطن یعنی ہندوؤں میں اس سے قبل علیحدہ قومیت کا تصوّر موجود نہ تھا۔ اس تصوّر کے پیدا ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ بعض ہندو لیڈروں نے ہندو عوام کو اپنے پراچین اور ویدک تمدّن کی طرف توجّہ دلائی اور قوم کے تنِ مُردہ میں زندگی پیدا کرنے کے لئے اس کا احیا ضروری بتایا۔ چونکہ تہذیب و تمدّن کے مسائل میں زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اِس لئے اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے سامنے ہندی کو لا کھڑا کیا گیا۔ اور اسی وقت سے یہ جھگڑا پیدا ہو گیا۔

اُردو یا ہندوستانی کی تخلیق و تشکیل کا دُھندلا سا تاریخی پس منظر تو آپ نے دیکھ لیا اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہی ہو سکتی ہے اور ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ہنگامہ کیوں برپا ہے؟ جواب صاف

ہے کہ محض تعصب اور غلط تعصب کی وجہ سے ایک ایسی زبان کے مقابلے میں جو ہندو مسلمانوں اور دیگر ہندوستانی قوموں کے اتحاد اور یگانگت کی یادگار ہے، "ہندی" کو لاکر کھڑا کیا جا رہا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو جیسے فاضل سے پوچھئے۔ تو وُہ فرماتے ہیں کہ

"اُردو زبان پر اس سے زیادہ کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ اس کو مسلمانوں سے منسوب کر کے چھوڑ دیا جائے۔ اُردو دراصل ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے۔ اُردو زبان کا بڑا کام یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں سہولت دے تاکہ باہمی یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا اور قائم ہو سکے اور ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اُردو کی بقا پر ہے۔" (اُردو۔ اپریل ۱۹۳۸ء)

مگر ہم حیران رہ جاتے ہیں جب ہمیں ایک دوسری آواز سنائی دیتی ہے کہ

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ آواز خواہ کتنے ہی بڑے اور عظیم الشان آدمی کی ہو مگر حقیقت سے بہت دُور ہے۔ اس سے ناجائز تعصب کی بُو آ رہی ہے۔ اور اس کو بلند کرنے والا ہندوستان کی آزادی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کا بہی خواہ نہیں کہلا سکتا۔

معاملہ بالکل صاف تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان وہی ہے۔ جو ہندو مسلمانوں کے ہزار سالہ اتحاد و اختلاط کی یادگار ہے۔ مگر اس صاف معاملے کو ٹیڑھا اس طرح بنایا گیا کہ پہلے تو کہا گیا کہ بعض پرانے مصنفین اور غیر ملکی مستشرقین نے ہندوستان کی قومی زبان "اُردو" کو نہیں قرار دیا بلکہ ان کے نزدیک ہندوستان کی قومی زبان کا نام "ہندوستانی" ہے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ یہ تو اسی اُردو کا دُوسرا نام ہے تو ایک اَور بیخ نکالی گئی اور وُہ یہ کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندی یعنی ہندُوستانی ہے۔ پہلے تو اس ہندی یعنی ہندوستانی کی اُپج پر اعتراض ہوئے مگر جب رواداری کو کام میں لاتے ہوئے اسے بھی برداشت کر لیا گیا۔ تو ایک قدم اَور آگے بڑھایا گیا۔ اور "یعنی" کو اُڑا کر ہندوستان کی قومی زبان کا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" تجویز کیا گیا۔

اس کے بعد یہ بحث چلی کہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں چونکہ ہندوستانی زبان میں عربی اور فارسی کے بہت سے غیر مانوس الفاظ آ گئے ہیں۔ اس لئے ان کو نکال کر زبان کو پوتر کر دیا جائے۔ ان متعصبانہ کوششوں کا نتیجہ اچھا کس طرح نکل سکتا تھا۔ ہُوا یہ کہ صدیوں کے گلے ملے ہوئے ہندو مسلمان ایک دُوسرے سے دُور ہونے لگے۔ اور آج ہندوستان کو ہر کام میں محض اس لئے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے باشندوں میں کسی امر پر بھی اتفاق رائے موجود نہیں۔ اور اس ملک کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے سے دُور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

اُردو کی ہمہ گیری اور ہندوستان کی قومی زبان ہونے کی اہلیت کا اعتراف تو مخالفین کے قلب و دماغ بھی کرتے ہیں۔ مگر چونکہ پراچین

اور ویدک تہذیب کے احیا کا جن بھی سوار ہے۔ اس لئے اُردو کی مخالفت کے لئے طرح طرح کے حیلے اور بہانے تلاش کئے جاتے ہیں۔
ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگرس کے اس اعلان کے بعد کہ :-

"ہندوستان کی قومی زبان وہ صاف و سلیس اُردو ہے، جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے"

اگر علی الاعلان مخالفت نہیں ہو سکتی تو غیر مانوس اور مانوس الفاظ کی آڑ میں ہندوستانی کو مٹانے کی ناپاک کوشش کی جاتی ہے حالانکہ مانوس اور غیر مانوس الفاظ کا سوال ہی سرے سے نیک نیتی پر مبنی نہیں۔ پھر خدا جانے کسی لفظ کے مانوس یا غیر مانوس ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ بظاہر زبان سے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ نکال کر زبان کو پاکیزہ بنانے کے معصوم ارادے بہت خوش آئند ہیں۔ مگر عملاً ستم یہ ڈھایا جا رہا ہے کہ وہ الفاظ جو صدیوں سے زیر استعمال ہیں اور جن کو ہندوستان کا بچہ بچہ سمجھتا ہے غیر مانوس قرار دے کر خارج کئے جا رہے ہیں۔ صوبہ متحدہ غیر مانوس نام تھا اس کی جگہ "جُبُٹ صوبہ" کا مانوس نام وضع کیا گیا ہے ضمنی سوال کی جگہ "دم سوال"۔ لیکن کی جگہ پرنتو اور کیول جیسے مانوس الفاظ نے لے لی ہے۔ فرض۔ ادبی۔ عادت۔ وقت۔ زندگی۔ اُمید۔ قوت۔ تعلیم۔ تعلق۔ ہزار۔ فائدہ۔ ترقی۔ مشق۔ ذریعہ۔ مضمون۔ حفاظت۔ شور و غل۔ قاعدہ۔ طلوع ہونا۔ طرزِ حکومت اور اور بہت سے ایسے الفاظ ہیں جنہیں ہر ہندوستانی خواہ ہندو ہو خواہ مسلم، سمجھتا اور روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتا ہے۔ مگر ان سب کو غیر مانوس قرار دے کر ان کی جگہ کرتویہ، ساہتیہ، سوبھاؤ، سمئے، جیون، آشا، شکتی، شکشا، سمبندھ، انیکتا، ہتوں، وردھی، ابھیاس، دورا، دشے، رکچھا، نشچئے، کلاہل، ویاکرن، اُدّے، راج نیتی جیسے مانوس الفاظ منتخب ہو گئے ہیں جنہیں سمجھنے والوں کی تعداد ہندوستان سے باہر تو خیر خود ہندوستان میں دس بیس لاکھ آدمیوں سے زیادہ نہ ہو گی۔

یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آئیے مستقبل کے آزاد ہندوستان کی مزعومہ قومی زبان کے ایک دو مستند نمونے دیکھ لیجئے، کیونکہ الفاظ کی تبدیلیوں کی ان مثالوں پر کہا جا سکتا ہے کہ ایسے الفاظ تو صرف وہی لوگ لکھتے ہیں جو ہندوستانی میں سنسکرت اور ہندی کے ہندوستانی عنصر کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کی بلند عمارت کو تعمیر کرنے والے معماروں کے انداز بھی چھپے نہیں۔

صوبہ یوپی اُردو کی جنم بھومی کہلاتا اور ہمیشہ سے اُردو کا مرکز رہا ہے۔ آج کل اس صوبہ کی حکومت خوش قسمتی سے آزادیٔ ہند کی علمبردار جماعت کانگرس کے ہاتھ میں ہے۔ جو چیز مثلاً قانون یا زبان، اس صوبہ کی قومی حکومت پیش کرے گی ظاہر ہے کہ وہی قومی کہلائے گی اس صوبہ کی وزارتِ تعلیم کا قلمدان شری سپورنانند جی کو تفویض کیا گیا ہے۔ اگر آج ہندوستان آزاد ہو جائے تو زبان اور تعلیم کے مسائل یہی تعلیم کے ماہرین مل کر حل کریں گے جن کے سپرد آج تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ وزیرِ موصوف زبان کے متعلق کانگرس کے فیصلہ سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے ہندوستان میں بسنے والی قوموں میں جس قدر اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس سے موصوف آگاہ ہوں گے مگر بایں ہمہ موصوف کا طرزِ عمل یہ ہے کہ پچھلے دنوں اُنہوں نے ایک تقریر کی۔ اس تقریر کو یوپی کی حکومت

کے محکمۂ اطلاعات نے جس عبارت میں شائع کیا۔ وُہ یہ تھی:۔

"تکشا سنگھٹن بھرتِ کے سمکش سنکیت پرانت کے شکشا سچیو مانئے شری سمپورنا نندجی کا دیاکھیان (پرکاش وبھاگ سنکیت پرانتئے گورنمنٹ)

"ادھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں۔ اس کی یہ بھی ایک لپشتا ہے کہ شکشنز وشمیا کے پرت لوگوں کا آگرہ بہت وشدھ اور بیاپک ہوگیا ہے۔ یہ بات ادھکا نش سبئے سنسار رگھشٹ ہوتی ہے۔ اور نرن سار ہم اپنے دیس میں بھی اس لشیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کا ان بھون کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس ہاسنک اور بدھارتک پرتھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھمت کا جو سماجک راج نیتک اور ارتھک ادھار ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجون سے جو سنسکرت پائی ہے، اس سے وشیو دیاپی پرگت کو ہمارے سنماکش سندیہہ ایک لشیسنس روپ میں اپشتھت کیا ہے اور ایک بھارتئے سمیہ بنا دیا ہے۔"

بقول فاضل مدیر "نگار" لکھنؤ یہ جناتی زبان سُن کر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ اور مسلمان تو مسلمان ہندو پبلک بھی پچاس فی صدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اسی طرح بھارت ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور کی صدارت کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ وہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

"اس سبھا کا سبھا تپیتو دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کا رسنہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دولش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو۔ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا شیو اکنیتر بڑھا دیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے لے کر کھنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے، اسے ایک مانتے ہیں۔ اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں۔ تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا۔ شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں۔ اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی سیوا کیوں نہ کریں۔"

(جامعہ مئی ۳۶ء)

اس سے بڑھ کر قابلِ غور گاندھی جی کا وُہ خیال ہے جو ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۷ء میں ہریجن کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں گاندھی جی نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ:۔

"ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہئے۔"

آج بدقسمتی سے ہندوستان غلام ہے اور ایک مدت سے ان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے۔ مگر اب یہ غلامی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم جس دَور میں سے گزر رہے ہیں اسے بقول پنڈت جواہر لال نہرو برطانوی شہنشاہیت کی شام کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

سو جب تک ہم غلام ہیں آپ کا جو جی چاہے کیجئے۔ ہندوستان میں بسنے والی دو بڑی قوموں کے درمیان تشتت و افتراق کی خلیج کو وسیع کرتے چلے جائیے۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں۔ بلکہ اُلٹی آپ کی پیٹھ ٹھونکی جائے گی۔ مگر آخر کار ہندوستان آزاد ہوگا۔ اور اسے آزاد ممالک کی طرح دُنیا کی دُوسری حکومتوں سے تعلقات پیدا کرنے ہوں گے۔ اس وقت ہندوستان میں بسنے والوں کو جو ہندوستان کو دُوسرے آزاد ممالک کے دوش بدوش کھڑا دیکھنا چاہیں گے، معلوم ہوگا کہ یہ خیال کس قدر خطرناک اور ہندوستان کو آزادی کی دوڑ میں پیچھے رکھنے والا تھا کہ :-

"ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہئے۔"

اب جب کہ یہ مسئلہ ایک ہنگامے اور منظم جنگ کی صُورت اختیار کر کے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں رُکاوٹ پیدا کر رہا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور حق و انصاف کا جو تقاضا ہو وہی فیصلہ کر کے اس روز روز کے جھگڑے کو ختم کر دیں۔ انڈین نیشنل کانگرس چونکہ ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت ہے اور ہندوستان کی آزادی کا انحصار اسی جماعت کی قربانیوں سے وابستہ ہے اس لئے اس جھگڑے کو سلجھانے اور عملی طور پر اسے دُور کر دینے کا فرض بھی اسی جماعت پر عائد ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے تو کسی کو مجالِ انکار نہیں کہ کسی ملک کی قومی زبان وہی ہو سکتی ہے :-

(۱) جسے اس ملک کے زیادہ سے زیادہ باشندے بولتے اور سمجھتے ہوں۔

(۲) جس زبان کو غیر ممالک کے لوگ اس ملک کی قومی زبان سمجھتے ہوں۔

(۳) جو بین الاقوامی تعلقات کے نبھانے میں ملک کے کام آسکے۔

(۴) کسی ایسے رسم الخط میں لکھی جاتی ہو جو اگر ساری دُنیا میں رائج نہ ہو۔ تو کم از کم جس ملک کی وُہ زبان ہو، اس کے اردگرد کے ممالک تو اس کے رسم الخط سے شناسا ہوں تاکہ حکومتوں میں باہمی تعلقات پیدا کرنے اور قائم رکھنے میں سہولت ہو۔

یوں تو ہندوستان میں بنگالی، مدراسی، ملیالم، گجراتی، سندھی، بھاشا اور پنجابی بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں سے بعض بجائے خود نہایت نہایت اعلیٰ درجے کی زبانیں ہیں مگر جو زبان مندرجۂ بالا خصوصیات کی حامل ہو سکتی ہے وہ صرف اُردو یا ہندوستانی ہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کے ۳۵ کروڑ باشندے سارے کے سارے نہ اُردو بولتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ مگر جو زبان ہندوستان کے ہر حصے اور کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہندوستانی اکثریت کی زبان ہے۔ وُہ بھی اُردو یا ہندوستانی ہے۔

غیر ممالک کے باشندے بھی اسی اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان سمجھتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جب فارسی زبان کو ترک کر کے ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان میں کتابیں ترجمہ کرنے کا سوال پیدا ہؤا تو غیر ملکی حکومت کے نمائندوں نے اسی اُردو یا ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا۔ فورٹ ولیم کالج سے اُردو میں تو بے شمار کتابیں طبع ہو کر نکلیں۔ مگر اس زمانے میں سارے ہندوستان بھر سے ہندی کی چند مذہبی کتابوں کے سوا کوئی کتاب شائع نہ ہوئی۔

علاوہ ازیں ایک ہندوستانی کو خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ جب ہندوستان سے باہر ہندوستان کی ملکی زبان میں گفتگو کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو وہی زبان استعمال کرتا ہے جسے اُردو یا ہندوستانی کہا جاتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے اور ان کو نباہنے کی صلاحیت اُردو میں ہندوستان کی دیگر تمام مروجہ زبانوں سے زیادہ ہے اس کی تو تشکیل ہی دُنیا کی بہت سی زبانوں کے امتزاج سے ہوئی ہے۔ اگر اس میں ایک طرف غیر ملکی زبانوں عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی کے الفاظ موجود ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کی صوبجاتی زبانوں بنگالی، ہندی، سنسکرت اور پنجابی کے الفاظ سے بھی اس کا دامن خالی نہیں اس کے مقابلے میں سنسکرت آمیز ہندی صدیوں سے متروک ہو چکی ہے اور گو اب اسے پھیلانے اور قومی زبان بنانے کی سرتوڑ کوششیں کی جا رہی ہیں مگر ابھی تک ہندوستان کے کسی حصّے میں بولی اور سمجھی نہیں جاتی۔ اس کی مثال تو ایک ایسی زبان کی سی ہے جس میں کبھی کبھار کوئی کتاب تو شائع ہو جاتی ہو مگر کہیں روزمرہ کی گفتگو میں استعمال نہ کی جاتی ہو۔

اُردو زبان جیسی وسیع اور اکثریت کی زبان کو مٹا کر اس کی جگہ ایک مٹی ہوئی زبان کو زندہ کرنے کے معنی تو یہ ہوں گے کہ ہندوستان تہذیب و تمدن کے لحاظ سے کئی سَو سال پیچھے جا پڑے گا۔ اور نامعلوم عرصہ تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے گا۔

پچھلے دنوں راشٹر پتی مسٹر سوبھاش چندر بوس پنجاب آئے تو اُنھوں نے اپنی تقریروں میں جگہ جگہ یہی فرمایا کہ ہندوستان کو برطانوی حکومت کی موجودہ مشکلات اور کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر جلد از جلد آزادی حاصل کرنی چاہئے اور چونکہ بہت جلد آزادی کا حصول یقینی ہے اس لئے نہ صرف آزادی حاصل کرنی چاہئے بلکہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد آزادی کی رکھشا کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

راشٹر پتی کی دُور رس نگاہیں مستقبل میں کتنی دُور اور کس قدر صحیح منزل تک پہنچ گئی ہیں۔ اے کاش سوبھاش چندر بوس اور آزادی ہندوستان کے دوسرے علم برداروں کو یہ بھی سُوجھتا کہ آزاد ہندوستان کو اسی دُنیا میں رہنا ہو گا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ آپ ہندوستان کو آزادی دلا کر اِرد گرد کے حالات اور بین الاقوامی واقعات سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں۔ اس زمانے میں تو کرۂ ارض کے کونے کونے کے واقعات کا اثر دُنیا کے تمام ممالک پر پڑتا ہے، اس لئے آزاد ہندوستان کے لئے ضروری ہو گا کہ وُہ تمام دُنیا اور کم از کم ایشیائی حکومتوں سے باہمی تعلقات پیدا کرے، ان سے تجارتی، اقتصادی اور جنگی معاہدے کرے۔ سو اگر یہ سب کچھ لابدی ہے تو ہندوستان کی قومی زبان کا مسئلہ دوسرے مسائل سے اہم اور سب سے پہلے حل ہونے کا محتاج ہے۔ اس سے تو کسی کو مجالِ انکار نہیں کہ جو زبان شری سمپورنانند جی وزیر تعلیمات صوبہ یوپی ہندوستان کی قومی زبان بنانا چاہتے ہیں وُہ ملکی اور قومی ضروریات کو پُورا نہ کر سکے گی اور نہ صرف بیرونی ممالک کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں ہارج ہو گی بلکہ اسے سمجھنے کے لئے تو خود ہندوستان کے ۳۵ کروڑ باشندوں میں سے چونتیس کروڑ پچاس لاکھ باشندوں کو از سرِ نو زبان کی تعلیم حاصل کرنی پڑے گی۔

اسی طرح رسم الخط کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے وسیع و عریض ملک میں مختلف صوبوں میں دیوناگری اور

بعض دوسرے رسم الخط رائج کئے جائیں مگر جو رسم الخط مستقبل کے آزاد ہندوستان کی قومی زبان کا ہو سکتا ہے وہ فارسی رسم الخط ہی ہے۔ یہ رسم الخط ہندوستان کے اردگرد کے تمام ممالک میں رائج ہے اور ہندی رسم الخط تو خود ہندوستان میں بھی بہت کم رائج ہے۔

رسم الخط کو دیوناگری میں بدلنے کے حق میں عام طور پر دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کی تمام اقوام نے انگریزی کی تحصیل کی، جو نہ صرف الگ زبان تھی بلکہ اس کا رسم الخط بھی جدا تھا۔ دوسرے یہ کہ ترکوں نے اپنا عربی رسم الخط بدل کر لاطینی رسم الخط رائج کر دیا۔ یہ دلیلیں بظاہر تو وزن دار ہیں مگر ان پر ذرا سی غور کرنے سے اصل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ انگریزی زبان کی تحصیل اور انگریزی رسم الخط کی ترویج تو غلامی کی لعنتوں میں ایک لعنت تھی۔ آزاد ہندوستان کی عمارت تعمیر کرتے ہوئے غلامی کے زمانے کے واقعات کو جو حکومت کی تلوار کے سائے میں بروئے کار آئے تھے پیش کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اسی طرح ترکوں کی مثال بھی صریحاً دھوکا ہے۔ اول تو ترکوں کے حالات ہم سے مختلف ہیں، وُہ چاروں طرف سے ایسی قوموں اور حکومتوں میں گھرے ہوئے ہیں جن میں سے اکثر کا رسم الخط لاطینی ہے۔ ان کے ساتھ روابط قائم کرنے اور حکومت کو مضبوط بنانے کے لئے پبلک کو ان ممالک کے حالات سے خبردار رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ملک میں وہی رسم الخط رائج کیا جائے جو اُن کی ملکی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔ مگر ہندوستان کے حالات تو اس کے بالکل خلاف ہیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی حالت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی قومی زبان کا رسم الخط دیوناگری ہو بھی تو اسے بدل کر نستعلیق کر دیا جائے، کیونکہ دیوناگری رسم الخط سے بیرونی دُنیا قطعاً ناآشنا ہے۔

دُنیا کی تمام قومیں ترقی کے میدان میں انتہائی سُرعت اور ثابت قدمی کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہیں، مگر غریب ہندوستان ابھی تک باہمی جھگڑوں کے باعث غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے اور اس کی غلامی نہ صرف اپنے لئے بلکہ دُنیا کے اور کئی ممالک کے لئے مصیبت کا مُوجب ہو رہی ہے۔ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وُہ باہمی جھگڑوں کو چھوڑ کر ملک کے مستقبل کو شاندار بنانے میں سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے صحیح اور مضبوط قدم صرف اسی وقت اُٹھایا جا سکے گا جس وقت ہندوستان کی تمام قومیں اور بالخصوص ہندو مسلمان متحد و یکجان ہو کر جنگِ آزادی میں حصہ لیں گے۔ ہندو مسلمانوں میں اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کا یہ نسخہ صحیح نہیں کہ ان کے گذشتہ اتحاد و یگانگی کی جو نشانیاں باقی ہیں ان کو بھی مٹا دیا جائے۔ بلکہ صحیح نسخہ یہ ہے کہ گذشتہ پانچ سات صدیوں کے اتحاد کی یادگاروں کو قائم رکھ کر مضبوط کیا جائے۔ اُردو زبان ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے اور بقول سر تیج بہادر سپرو "ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اُردو زبان کی بقا پر ہے"۔ اس لئے ہر وُہ فرزندِ وطن جو وطن کا سچا بہی خواہ ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتا ہے اُردو کی بقا اور ترقی کی کوشش کرے۔ کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا انحصار محض ہندو مسلم اتحاد پر ہے اور اس اتحاد کا انحصار اُردو زبان کی بقا پر +

محمد فاضل

اُردُو

یہ جو اُردو زبان ہے پیارے
جانِ ہندوستان ہے پیارے

فقرہ فقرہ ہے اِس کا سحرِ حلال
یہ وُہ جادُو بیان ہے پیارے

اِس کی تخئیل کی بلندی سے
پست ہر آسمان ہے پیارے

داد رُوح القدس نے دی جس کی
وُہ ہماری زبان ہے پیارے

کیوں چلاتے ہو اس پہ کُند چھُری
یہ ابھی نوجوان ہے پیارے

کتنے جوکھوں سے یہ جوان ہوئی
یہ بڑی داستان ہے پیارے

عربی، پارسی ہو یا ہندی،
ایک ہی خاندان ہے پیارے

لگ گئی ہے کسی کی اس کو نظر
مجھ کو ایسا گمان ہے پیارے

کیوں کرے ورنہ باغ کو برباد
وُہ جو خُود باغبان ہے پیارے

جان سے بھی عزیز ہے اُردو
کیونکہ مُلکی زبان ہے پیارے

اِس سے ہندوستاں کی عزّت ہے
اِس سے بھارت کی شان ہے پیارے

کشفی مُلتانی

جوار بھاٹا

افراد: پہلا مسافر: پاگل خانہ سے بھاگا ہؤا قیدی
دُوسرا مسافر: خورشید ایک نوجوان
ریلوے گارڈ - اسٹیشن ماسٹر

منظر:- ریل گاڑی کا فسٹ کلاس کا ڈبہ

(چلتی گاڑی کا شور سُنائی دے رہا ہے -)

مسافر: کھڑکی بند کرنے میں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا!

خورشید -(خوشی سے) ضرور!

مسافر -(کھڑکی بند کرتے ہوئے) شکریہ! معاف کیجئے - میں ایک عرصہ سے تنہائی کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو گیا ہوں اس لئے میں نے کھڑکی بند کرنے کی اجازت چاہی -

خورشید - جی ہاں!

مسافر - بالکل گوشۂ تنہائی - درونِ خانہ

خورشید - کیوں؟ خرابیٔ صحت کے باعث؟

مسافر - نہیں - ویسے تو میں بالکل تندرست ہوں -

خورشید - شاید آپ احتیاط برتتے ہوئے ٹھنڈی ہوا سے بچنا چاہتے ہوں گے -

مسافر - نہیں جناب - بات ذرا عجیب سی ہے - بالکل عجیب - اور شاید آپ اُسے پسند کریں گے -

خورشید - کیوں نہیں -

مسافر - ایک غلطی کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا — ایک عرصے کی بات ہے - ابھی وائرلیس کا رواج عام نہ تھا - اس وقت مجھے اس سائنس میں دلچسپی تھی — بہت دلچسپی، قصہ کوتاہ مجھے لوگ دیوانہ سمجھنے لگے -

خورشید - توبہ! توبہ! لوگ بھی پاگل تھے -

مسافر - آپ تو مجھے پاگل نہیں سمجھتے -

خورشید۔ ہرگز نہیں جناب،

مسافر۔ تو خیر، لوگوں کا یہی خیال تھا۔ اگر اُن کو صرف یہی فکر ہوتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ مگر میرا دماغ خود وائرلیس تھا جس سے وہ اور بھی متردد ہوئے۔

خورشید۔ وائرلیس دماغ ؛

مسافر۔ جی ہاں وائرلیس دماغ، بلکہ کان بھی وائرلیس۔ میں بہت زیادہ حسّاس ہوں۔ لکڑی کے ایک ڈبے میں سے آپ ہندوستان میں بیٹھے لندن کی خبریں سُن سکتے ہیں۔ مگر انجان کے لئے یہ ایک وہم ہے۔ انسانی دماغ بہت نازک اور حساس ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے۔

خورشید۔ یہ کیسے ممکن ہے ؛

مسافر۔ کیوں نہیں، ہماری آواز کرۂ ہوائی میں تیرتی پھرتی ہے۔ موجودہ سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم اِن آوازوں کو پکڑ سکتے ہیں اسی نظریہ کا نتیجہ وائرلیس ہے۔ جتنا حسّاس یہ آلہ ہوگا۔ اتنی صاف آوازیں ہم سُن سکیں گے۔ میرا دعوےٰ اور تجربہ ہے کہ چونکہ میرا دماغ بہت زیادہ حسّاس ہے، اس لئے میں اِن آوازوں کو سُن سکتا ہوں۔

خورشید۔ حیرت انگیز اور عجیب بات ہے۔

مسافر۔ بُرا ہو تعصب کا، لوگوں نے اس پر غور کرنے کے بجائے مجھے دیوانہ سمجھا۔ میری باتوں کو مجذوب کی بڑ جانا۔ مجھ پر جبر کیا گیا۔ اور۔

خورشید۔ اس سے آپ کو بہت دُکھ ہُوا ہوگا۔

مسافر۔ دُکھ! دُکھ کی بھی ایک کہی۔

خورشید۔ اور شاید اُنہوں نے آپ کو پاگل خانے بھیج دیا؛

مسافر۔ جی!

خورشید۔ اَور پھر رہا کردیا ؛

مسافر۔ نہیں۔

خورشید۔ تو ؛

مسافر۔ مگر آخر کار میں آزاد ہو ہی گیا۔

خورشید۔ شکر ہے۔ اب آئندہ کیا ارادہ ہے ؛

مسافر۔ ارادہ ؛ بس یہی کہ اپنے وائرلیس دماغ کی تربیت کروں گا۔

خورشید۔ ضرور۔ مگر زیادہ تر کونسا ریڈیو سٹیشن آپ پکڑ سکتے ہیں ؛

مسافر۔ ریڈیو سٹیشن کونسا ہوتا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر آوازیں نہایت صاف سُنتا ہوں۔

خورشید۔ آپ کیا سُنتے ہیں؟

مسافر۔ آوازیں

خورشید۔ آوازیں؟

مسافر۔ صرف آوازیں!

خورشید۔ بالکل عجیب بات کہی آپ نے،

مسافر۔ واقعی؟

خورشید۔ عجیب اور دلچسپ۔

مسافر۔ میں اس وقت بھی ایک آواز سُن رہا ہوں۔

خورشید۔ اس وقت؟ مَیں قطعاً آواز تو نہیں کر رہا؟

مسافر۔ نہیں۔ آواز بالکل صاف سنائی دے رہی ہے۔

خورشید۔ آپ کے خیال میں کونسا سٹیشن ہوگا؟

مسافر۔ سٹیشن؟ کوئی معمولی سٹیشن نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک دیوتا کی آواز ہے۔ جو اکثر مجھ سے باتیں کرتا ہے۔

خورشید۔ (حیران ہوکر) دیوتا؟

مسافر۔ جی دیوتا! ہمالیہ کی چوٹی سے بول رہا ہے۔

خورشید۔ ہمالیہ کا دیوتا۔ اس کا مجسمہ کمرے کی آرائش کا کام تو خوب دے سکتا ہے۔

مسافر۔ خوفناک دیوتا۔

خورشید۔ خوفناک! دیوتا!

مسافر۔ مگر ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

خورشید۔ آخر دیوتا ہے ــــ کیا وُہ بولتے ہیں؟ اور کرۂ ہوائی پر بھی اُن کا تصرف ہوتا ہے؟

مسافر۔ ضرور

خورشید۔ آپ اس کی آواز اس وقت بھی سُن رہے ہیں؟

مسافر۔ اس کی آواز بالکل صاف سُنائی دے رہی ہے۔

خورشید۔ بالکل غیر معمولی سی بات،

مسافر۔ اور اس نے ابھی حکم دیا ہے۔ کہ ــــ

خورشید۔ حکم، کیا؟

مسافر۔ ہاں! فوری حکم

خورشید۔ اُونہہ!

مسافر۔ دیوتا کہتا ہے کہ میں تمہیں قتل کردوں۔

خورشید۔ مجھے قتل کردیں؟

مسافر۔ ہاں آپ کو قتل کردوں! دیوتا خونی قربانی چاہتا ہے۔

خورشید۔ مگر ــــ

مسافر۔ دیوتا کا حکم اٹل ہوتا ہے۔

خورشید۔ دیکھئے مذاق ختم کیجئے۔ یہ ریل گاڑی ہے (اُٹھ کر گاڑی ٹھہرانے کی زنجیر کی طرف بڑھتا ہے)

مسافر۔ بیٹھ جاؤ۔ اگر اس طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو ــــ

خورشید۔ کیا آپ مذاق کر رہے ہیں؟

مسافر۔ مذاق، کیسا مذاق؟

خورشید۔ آپ سنجیدہ ہیں؟

مسافر۔ بالکل ــــ (جیب سے چاقو نکالتا ہے)

خورشید۔ اوہو!

مسافر۔ دیوتا کا حکم اٹل ہے۔

(خورشید کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا ساتھی خوفناک قسم کا پاگل ہے۔)

خورشید۔ دیوتا کا حکم تو اٹل ہے مگر ــــ آپ کا وائرلیس دماغ صحیح سے ٹھیک تو ہے۔ بعض دفعہ اچھے اچھے ریڈیو سٹ کرہ فضائی کی دوسری آواز بھی پکڑنے لگتے ہیں۔

مسافر۔ مگر میرا دماغ ایسا نہیں۔

خورشید۔ ہوگا، دیوتا بعض دفعہ ملکوتی زبان بولتے ہیں۔ اُن کی بات میں کوئی خاص رمز ہوتی ہے۔ شاید آپ مطلب ہی نہ سمجھے ہوں۔

مسافر۔ ایسا نہیں ہے۔

خورشید۔ ہمالیہ میں ایک دیوتا میرا بھی آشنا ہے۔ شاید وُہ آپ کے دیوتا کا بھی آشنا ہوگا۔ وہ بعض اوقات مجھ سے مذاق کیا کرتا ہے۔ اور شاید ـــــ

مسافر۔ مگر میرے دیوتا کا حکم تو مذاق نہیں ہے۔

خورشید۔ ہو تو سکتا ہے۔ آیئے ہم اس کا امتحان کرلیں۔

مسافر۔ امتحان؟ کیسا امتحان؟ اس کا حکم اٹل ہے۔

خورشید۔ ہوگا، ہوگا! آپ ذرا چاقو کو اُدھر رکھ دیجئے تو مَیں آپ کو بتا سکوں گا۔ کہ ـــــ

مسافر۔ کیا؟

خورشید۔ آپ تین بار دیوتا سے سوال کیجئے۔ اگر وُہ تین بار یہی حکم دے تو مَیں حاضر ہوں۔ ورنہ ـــــ

مسافر۔ تین بار سوال کروں؟ کیوں

خورشید۔ میرا دماغ بھی وائرلیس ہے۔

مسافر۔ ہاں!

خورشید۔ بالکل! مَیں نے ہمالیہ کے سینکڑوں دیوتاؤں سے باتیں کی ہیں یقین جانئے نصف سے زیادہ دیوتا مسخرے ہوتے ہیں۔

مسافر۔ مگر میرا دیوتا تو ایسا نہیں۔

خورشید۔ اس بات کا ثبوت؟ ہاں اگر وہ تین بار کہہ دے۔ تو

مسافر۔ اس کی حکم عدولی شاید اُسے اَور غضبناک بنا دے۔

خورشید۔ دیوتا کو غضب ناک نہ ہونے دیجئے ـــــ احتیاط پھر بھی لازمی ہے۔

مسافر۔ وُہ غصے میں دُنیا کو تباہ کر دے گا۔

خورشید۔ دیوتاؤں کا حکم ماننا ہی پڑتا ہے۔

مسافر۔ اَور مجھے ماننا ہی ہوگا ـــــ

خورشید۔ دیکھئے، آپ کہتے ہیں کہ آپ کا دیوتا جو کہتا ہے۔ وہ ٹھیک ہوتا ہے، مگر مَیں کہتا ہوں کہ ہمالیہ کے دیوتا جو بات تین بار دُہرائیں۔ وُہ ٹھیک ہوتی ہے۔ اور اٹل۔ ہم میں سے کون سچا ہے اس کا فیصلہ اگلے سٹیشن پر ہم گارڈ سے کرالیں گے۔ وہ ضرور جانتا ہوگا کہ ـــــ

مسافر۔ مجھے جو احکام ہیں، تیسرے کو اس میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔

خورشید۔ بالکل بجا اور درست، آپ اپنی مرضی کیجئے، میں تو صرف چاہتا تھا کہ آپ ذرا اپنے دیوتا کے اصلی مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

مسافر۔ میرا دیوتا قربانی مانگتا ہے۔ یہی اس کی مرضی ہے۔ دیوتاؤں کی خوراک صرف قربانی ہوتی ہے۔

خورشید۔ قربانی دینا اُن کی عادتیں بگاڑنے کے مترادف ہے گویا۔

مسافر۔ قربانی دینا ہی ہوگی۔

خورشید۔ پھل پھول، سبزی کی بھینٹ دیوتا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مسافر۔ میرا دیوتا خون چاہتا ہے۔

خورشید۔ نہیں صاحب ایسا نہ کیجئے، دیکھئے، دیکھئے ـــــ

(گاڑی کا شور آہستہ آہستہ مدھم ہوتا جا رہا ہے)

آپ جلد بازی کریں گے تو پھر لوگ آپ کو پاگل خانے بھجوا دیں گے۔ ریلوے سٹیشن آ گیا ہے۔ اگر آپ نے اپنے وائرلیس دماغ کا کہا کیا تو آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ اب رُک جائیے۔ یہ لوگ تو آپ کے وائرلیس دماغ کے قائل نہیں۔ کہیں پھر آپ کو دُکھ نہ دیں۔ گاڑی ذرا چلنے دیجئے پھر دیوتاؤں کا ذکر چھیڑیں گے ـــــ

مسافر۔ خوب! درست فرمایا آپ نے، میں ایسا ہی کروں گا، مگر سنئے اگر آپ نے میرے متعلق ایک لفظ بھی زبان سے نکالا، تو یہ چاقو آپ کے سینے سے پار ہوگا۔

خورشید۔ اس کا یقین رکھئے ـــــ میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔

مسافر۔ پھر کہتا ہوں ـــــ (چاقو دکھاتا ہے)

خورشید۔ صاحب! میں قسم کھاتا ہوں کہ ـــــ

مسافر۔ اگر تم نے کہنا چاہا تو تم زمین پر تڑپ رہے ہوگے۔ میرا کیا، میں پھر اُسی "پُرسکون" مقام پر بھیج دیا جاؤں گا۔ جہاں سے ابھی آ رہا ہوں ـــــ باغ، باغیچہ، رصدگاہ کا پُرلطف کمرہ، مگر تم جہنم میں جا چکے ہوگے۔

خورشید۔ صاحب یقین رکھئے۔ میں قسم کھاتا ہوں ـــــ

مسافر۔ اگر تم خاموش رہے تو گویا ۵ منٹ کی اَور زندگی مل گئی ـ سمجھے (چاقو دکھاتا ہے)

خورشید۔ شکریہ! خوب

مسافر۔ ۵ منٹ کی زندگی

خورشید۔ آپ کا احسان۔

(گاڑی پلیٹ فارم پر رُکتی ہے)

مسافر۔ لوگ اس طرف آرہے ہیں، اگر تم نے اُن سے کہہ دیا ---- کیا نام، کہ میں پاگل ہوں۔ تو جانتے ہو اس کا انجام؟

خورشید۔ جی ہاں، خوب جانتا ہوں مگر میں نے تو قسم ----

مسافر۔ ٹھیک! ٹھیک! تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم اس چاقو کی قسم کھاؤ۔ تاکہ تمہاری قسم کا یہ شاہد رہے۔

خورشید۔ ضرور، ضرور، کتنا خوبصورت چاقو ہے۔

مسافر۔ خوبصورت، اور کافی بڑا۔

گارڈ۔ (دروازہ کھول کر ڈبے میں جھانکتا ہے) جنٹلمن معاف کیجئے، لاہور کے پاگل خانہ سے ایک خطرناک دیوانہ بھاگا ہوا ہے۔ ہمیں اُس کی تلاش ہے۔

مسافر۔ ہم نے تو اُسے نہیں دیکھا (خورشید کی طرف دیکھتا ہے)

خورشید۔ بالکل نہیں جناب!

گارڈ۔ کسی سیٹ (seat) کے نیچے تو نہیں۔

مسافر۔ یہ بھاگا ہوا پاگل کوئی زیادہ خطرناک ہے؟

گارڈ۔ اطلاع تو یہی ہے۔

مسافر۔ اچھا ہوا کہ میں ساتھ چاقو لیتا آیا۔ دیکھئے نا، یہ چاقو ایک نادر چیز ہے اگر وُہ پاگل کہیں سے ٹپک پڑا تو اس کی خوب خبر لوں گا۔

گارڈ۔ بشرطیکہ وہ آپ پر حملہ کرے، ورنہ خواہ مخواہ چاقو کا استعمال ----

مسافر۔ چاقو ---- یہ ایک نادر تحفہ ہے، پُرانی یادگار

گارڈ۔ چاقو، پُرانی یادگار!

مسافر۔ صاحب، میں ذرا ڈرتا بہت ہوں۔ اس لئے میں حفاظتِ ذاتی کے لئے یہ چاقو ہمیشہ پاس رکھتا ہوں۔

گارڈ۔ بہتر ہے (سیٹوں کے نیچے دیکھتا ہے) یہاں تو وُہ نہیں ہے۔

مسافر۔ شکریہ (خورشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مسٹر، چاقو کی ہم دونوں کو ضرورت ہے۔

خورشید۔ جی، بالکل

گارڈ۔ کسی دُوسرے ڈبہ میں ہوگا۔ ہمیں لاہور سے تار ملا ہے کہ اُسے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوتے دیکھا گیا ہے ----

مسافر۔ اس کا حلیہ؟

گارڈ۔ تار میں تو نہیں لکھا۔ مگر دیوانے کو کون نہیں پہچان لیتا ----

مسافر۔ کیوں نہیں۔

خورشید۔ (گارڈ سے) جناب ذرا ٹھہریئے، ہم دونوں کو آپ کی صحبت سے لطف آرہا ہے۔

گارڈ۔ اس ذرہ نوازی کا شکریہ، ہم ڈرائنگ روم میں نہیں ہیں۔ یہ امرتسر کا ریلوے سٹیشن ہے۔ اور مجھے گاڑی اسٹارٹ (Start) کرنی ہے۔

خورشید۔ نگرانِ سیٹوں کا ایک دفعہ اور جائزہ لے لیجیے، شاید دُہ مِل جائے ـــــ میرے ساتھی کو ڈر محسوس ہو رہا ہے۔

گارڈ۔ ڈرنے کی کیا بات ہے ـــــ مجھے دُوسرے ڈبے بھی تلاش کرنے ہیں۔

(سٹیشن ماسٹر داخل ہوتا ہے)

سٹیشن ماسٹر۔ (گارڈ سے) او۔ کے مسٹر گارڈ۔

خورشید۔ (خود بخود) او۔ کے یقین جانئے میرا ساتھی بالکل فرزانہ ہے۔ یہ میرے دوست بھی ہیں۔

سٹیشن ماسٹر۔ مگر مسٹر تمہارا کیا حال ہے (مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے) تم کچھ گھبرائے سے ہو۔

خورشید۔ گھبرایا سا ہوں، میں؟

سٹیشن ماسٹر۔ (گھورتا ہے) جی ہاں! حضور کچھ گھبرائے سے ہیں۔

خورشید۔ جی میں دیوانہ ہوں ـــــ لاہور سے بھاگا ہُوا۔ پاگل خانہ، خوبصورت باغ، عالیشان عمارت، اس کی پُر لطف رصدگاہ۔ پھولوں کی کیاریاں، مگر وہ دار وغہ ـــــ

سٹیشن ماسٹر۔ (خورشید کے لباس کو دیکھ کر) صاحب آپ ہمیں دیوانہ بنا رہے ہیں۔

خورشید۔ (دیوانہ وار قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ دیوانے ـــ آپ سے مذاق ـــ سٹیشن ماسٹر، بھلا میں ایسا کر سکتا ہوں۔

سٹیشن ماسٹر۔ آپ کا نام؟ خورشید۔ میں چاند کا شہزادہ ہوں۔

سٹیشن ماسٹر۔ یعنی؟

خورشید۔ میں چاند کا شہزادہ تھا۔ وہاں بغاوت ہوگئی، باغیوں نے مجھے باہر پھینک دیا۔ میں ایک ٹی ٹرے (Tea-Tray) میں گرا۔ آپ نے دیکھی ہوگی، ٹی ٹرے، خادم نے اُٹھا کر مجھے اس ڈبے میں دھکیل دیا،

سٹیشن ماسٹر۔ (گارڈ سے) حضرت آخر مل ہی گئے، چاند کے شہزادے۔

گارڈ۔ مسٹر ذرا باہر تشریف لائیے، ٹی ٹرے میں بٹھا کر آپ کو چاند میں واپس بھیج دیا جائے۔ وہاں کی رعایا منتظر ہے۔ اور تخت خالی ـــــ

خورشید۔ اور میرا تاج! گارڈ۔ اور آپ کا محل

خورشید (مسافر سے) دوست الوداع ـــ مسافر۔ دیکھئے مجھے بھی ـــــ

خورشید۔ ٹی ڑے دو کا بوجھ نہیں سہار سکے گی۔ سٹیشن ماسٹر۔ مسٹر شہزادہ چلئے۔

مسافر۔ سنئے تو، انہیں نہ لے جایئے۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔

سٹیشن ماسٹر۔ کیسی ضرورت؟

مسافر۔ میں اکیلا سفر نہیں کر سکتا، میرا دل کمزور ہے۔ ڈر لگتا ہے مجھے،

سٹیشن ماسٹر۔ مگر یہ تو پاگل ہے۔ خورشید۔ بالکل پاگل۔

مسافر۔ یہ تو میرے دوست ہیں، بالکل فرزانہ۔

خورشید۔ میں چاند کا شہزادہ ہوں۔ مجھے چاندنگری جانا ہے ابھی ——— جلدی کرو ——— میری سواری ڑے ———

مسافر۔ یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں انہیں ایک عرصہ سے جانتا ہوں ———

خورشید۔ میں ایک مہک ہوں۔ جسے جو سُونگھتا ہے والہ و شیدا ہو جاتا ہے ——— چاند کی روشنی مجھ سے پیدا ہوتی ہے۔ چاندنی رات کا سکون میرا سایہ ہے، چاند کا شہزادہ ———

(خورشید کو ڈبے سے باہر نکال دیا جاتا ہے سٹیشن ماسٹر اور خورشید پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ سیٹی کی آواز، گاڑی حرکت کرتی ہے۔ گارڈ اپنے کمرے میں کھڑا جھنڈی ہلا رہا ہے۔ جب اس کا ڈبہ خورشید کے سامنے سے گزرتا ہے۔ تو وہ زور سے چلاتا ہے "چاند کے شہزادے آداب عرض"۔)

سٹیشن ماسٹر۔ اب ذرا آرام سے تشریف لے چلئے۔ خورشید۔ ایک بات تو سنئے ———

سٹیشن ماسٹر۔ (سختی سے) کہئے۔

خورشید۔ (گاڑی کی طرف تک رہا ہے) چند لمحے اور ٹھہر جایئے۔ ذرا گاڑی دُور نکل جائے۔

سٹیشن ماسٹر۔ (حیران ہو کر) کیوں؟ خورشید۔ (ایک اطمینان کا سانس لے کر) خدایا!

سٹیشن ماسٹر۔ (تشویش سے) ہیں! مسٹر خیر تو ہے۔ خورشید۔ جان بچی لاکھوں پائے، میرا ساتھی ہی بھاگا ہوا پاگل تھا۔

سٹیشن ماسٹر۔ آپ کا ساتھی؟

خورشید۔ جی ہاں! وہ حضرت میرے سینے میں اپنا چاقو گھونپنے کے لئے تیار بیٹھے تھے ——— فوراً اگلے سٹیشن پر فون کر دیجئے۔ اور میرے سامان کے لئے بھی۔

سٹیشن ماسٹر۔ مگر آپ نے یہ سوانگ ———

خورشید۔ جان کس طرح بچتی؟

(دُور سے گاڑی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔)

شیر محمد اختر

غزل

نام بدنام ہے ناحق شبِ تنہائی کا
وُہ بھی اِک رُخ ہے تری انجمن آرائی کا

آچلا ہے مجھے کچُھ وعدۂ فردا کا یقیں
دل پہ الزام نہ آجائے شکیبائی کا

اب نہ کانٹوں ہی سے کچُھ لاگ نہ پھُولوں سے لگاؤ
ہم نے دیکھا ہے تماشا تری رعنائی کا

دونوں عالم سے گزر کر بھی زمانہ گزرا
کچُھ ٹھکانا بھی ہے اِس بادیہ پیمائی کا

خود ہی بیتابِ تجلّی ہے ازل سے کوئی
دیکھنے کے لئے پردہ ہے تمنّائی کا

لگ گئی بھیڑ یہ دیوانہ جدھر سے گزرا
ایک عالم کو ہے سودا ترے سودائی کا

پھر اُسی کافرِ بے مہر کے در پر فانؔی
لے چلا شوق مجھے ناصیہ فرسائی کا

فانؔی بدایونی

فردوسی کا شاہنامہ

ایشیا کے شاعروں میں فردوسی، کتابوں میں شاہنامہ اور سُورماؤں میں رستم شہرت کے آسمان پر سُورج کی طرح چمک رہے ہیں۔ فردوسی اسّی برس جیا، ۳۵ برس میں اس نے شاہنامہ پورا کیا۔ میں اس قلیل وقت میں اس دریا کو کوزے میں کیسے بند کروں؟

یونان کو اپنے شاعر ہومر اور اس کی کتاب الیڈ پر ناز ہے، پُرانے ہندوستان کے سورماؤں کے کارنامے مہابھارت میں ثبت ہیں اس لئے ہندوستانیوں کو مہابھارت پر فخر ہے تو ایرانیوں کو شاہنامہ اور اس کے مصنّف فردوسی پر کیوں فخر نہ ہو؟

دُنیا کے تمام مشہور آدمیوں اور بڑے کارناموں کی طرح شاہنامہ اور اس کا مصنف بھی افسانوں اور من گھڑت کہانیوں کے پردوں میں چھپا ہؤا ہے، کلکتہ کے "بلیک ہول" سے اسکول کا ہر بچہ واقف ہے، مگر جاننے والوں پر روشن ہے کہ اس ساری کہانی میں سچائی کی ایک بھی کرن نہیں، اسی طرح یہ بات مشہور ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ گویا محمود سے فی بیت ایک اشرفی کے ٹھیکے پر لکھا تھا۔

دُنیا کا کوئی ادبی شاہکار اُجرت پر نہیں لکھا گیا اور کسی قوم پرست نے اپنے جذبات قوم پرستی کی تجارت نہیں کی اور کسی قوم کے مصلح نے اپنی قوم کو زندہ کرنے کی قیمت کسی غیر سے نہیں مانگی، اس لئے فردوسی جیسے غیور، قوم پرور عظمتِ ایران کے افسانہ گو، قومی فخر کے متوالے، قوم کو زندہ کرنے کی دُھن میں آسمان و زمین سے لڑنے والے اور اہلِ ایران اور شاہانِ ایران کے سوا دُوسرے کسی کو خاطر میں نہ لانے والے کے متعلق جس کا دعوٰی اور سچا دعوٰی یہ تھا کہ ع عجم زندہ کردم بدیں پارسی، یہ خیال بھی کہ اگر اُس کو انعام کا لالچ نہ ہوتا تو وُہ شاہنامہ نہ لکھتا ہمیں گوارا نہیں۔ اور ہمیں فردوسی اور اس کا بلند کیرکٹر اتنا عزیز ہے کہ ہم ان باتوں کو فرض بھی نہیں کر سکتے۔ یوں بھی محمود کی بادشاہت ۳۱ برس رہی، اور شاہنامہ ۳۵ برس میں لکھا گیا، نتیجہ خود آپ نکال لیجئے۔

غور کیجئے خود دار فردوسی کو جب معلوم ہؤا کہ کوئی وزیر اس سے اس لئے ناراض ہے کہ وُہ اس کے گھر پر سلام کو کیوں حاضر نہیں ہوتا تو فردوسی نے کہلا بھیجا کہ غلامی میری فطرت میں نہیں اور نہ مجھے مال اور عہدہ کا لالچ ہے، پھر میں جو بادشاہ کے دربار میں بھی نہیں جاتا وزیر کے در پر کیسے جانا پسند کروں گا۔ ؎

من بندہ کز مبادیٔ فطرت نبودہ ام	مائل بہ مال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سُوئے درِ وزیر چرا ملتفت شوم	چوں فارغم ز بارگہِ بادشاہ نیز

؎ یہ مضمون حسب اجازت آل انڈیا ریڈیو بمبئی شائع کرایا گیا۔ (شہاب)

بادشاہ خود باکمال اور اہلِ کمال کا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں جہاں مختلف خیال و مذاہب کے فاضل دربار کی زینت تھے وہاں فردوسی کی بھی کرسی کسی سے پیچھے اور کسی سے نیچے نہ ہوتی تھی۔

محمود جو ایک ایک قابلِ داد بات کے صلہ میں لاکھوں روپے دے دیا کرتا تھا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے کہ اسے کسی قسم کا بخل ساٹھ ہزار دینار فردوسی کو عطا کرنے سے روک دیتا، ہاں فردوسی دربار سے جُدا ہوگیا مگر جیسا کہ پہلے شاہی درباروں اور آج کی سیاست میں یہ تماشا عام ہے کہ حالات کے بدلنے سے کل کے سردار آج برسرِ دار نظر آیا کرتے ہیں، فردوسی کو بھی کچھ ایسے ہی حالات کی بنا پر دربارِ محمود سے الگ ہونا پڑا، مگر فردوسی کا ظرف دیکھو کہ غزنین سے جاتے وقت مسجد کی دیوار پر ذیل کے دو شعر لکھ گیا ؎

خجستہ درگہِ محمود غزنوی دریاست — چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست

چہ غوطہ ہا زدم و اندرو ندیدم دُر — گناہِ بختِ من ست ایں گناہ دریا نیست

اگر یہ واقعہ بھی تذکرہ نویسوں کی گپ نہیں تو ماننا پڑے گا کہ محمود بخیل نہ تھا، فردوسی اہلِ کمال اور اپنے وطن کا پجاری تھا مالی منفعت جو اسے حاصل ہوتی یا جس کی اسے توقع تھی اس سے ضرور محروم رہا، مگر حالات نے سخاوتِ محمود کے دریا کو اتھاہ بنا دیا۔ فردوسی کی جبلی بلند نظری نے اسے محمود کا بخل نہیں بلکہ اُسے صرف اپنی قسمت کی نارسائی ٹھہرایا، اور یہی اس کے کمال کے شایان تھا،

افسوس ہے کہ تذکرہ نویسوں نے گرمیٔ محفل کے لئے جو چاہا لکھ مارا، مگر اس میں ان کا بھی قصور نہیں کہ انسانی کمزوریوں میں سے یہ بھی ہے کہ اچھی بات کی پروا نہیں کی جاتی اور بُری باتوں کو لوگ لے اُڑا کرتے ہیں۔ داغ ؎

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں تو پروا نہ کریں — لوگ کرتے ہیں بُری بات کا چرچا کیسا

شاہنامہ کے مضامین چار قسم کے ہیں:۔

اوّل: زمانۂ تاریخ سے پہلے کے افسانے۔

دوم۔ ظہورِ اسلام سے پہلے کے شاہانِ ایران کے حالات

سوم: قدیم ایران کے رسم و رواج، قومی معاشرت اور ملکی قوانین وغیرہ۔

چہارم: الٰہیات و حکمت و اخلاق وغیرہ کے مسائل۔

شاہنامہ لکھنے سے فردوسی کا مقصد اہلِ ایران کو ان کی گزشتہ بڑائی یاد دلا کر پستی سے اُٹھانا اور پہلے عروج پر پہنچانا تھا۔ اسے ایرانیوں میں یہ یقین پیدا کرنا تھا کہ وہ خدا کی زمین پر تاج دارائی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، باجگزاری کے لئے نہیں، وُہ ایران کے سوا کسی اَور ملک یا قوم کے افراد میں کوئی خوبی علمی یا نسبی یا اخلاقی نہیں پاتا اور اسی لئے ایرانیوں پر حکومت کرنے کا کسی کو اہل نہیں مانتا۔ جب بھی ایرانیوں اور غیر ایرانیوں میں جنگ چھڑی تو اس نے ایران کے مخالفوں میں کوئی نہ کوئی خامی نکال دی حتٰے کہ اگر کسی ایرانی شہزادے سے کسی پہلی

سب سے ناراض ہے تو اس کی شہزادگی میں بھی کوئی بیچارہ بات کہہ گیا۔

شاہ نامہ میں ایسے بادشاہ بھی نظر آتے ہیں جو گمنامی سے نکل کر شاہی خاندانوں کے بانی اور تختِ ایرانی کی زیب وزینت بنے تھے اگرچہ لوگ ان کے بادشاہ ہونے سے پہلے کسی کو خانہ بدوش اور کسی کو روپوش اور کسی کو چرواہا دیکھتے رہے تھے لیکن جب انقلابِ روزگار ان کو گمنامی سے نکال کر تخت پر لے آیا اور شاہی تاج ان کے سر پر رکھا گیا تو قدیم افسانوں کی مدد سے فردوسی کے قومی افتخار نے ان کو کسی نہ کسی قدیم نامدار اور مشہور بادشاہ کی نسل میں ثابت کر دیا۔ خیر اپنوں کو شہزادے کہنا تو کچھ بُرا نہیں، مگر بعض جگہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ایران کے بیرونی فاتحوں کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے اپنے ہی کسی بادشاہ کی نسل سے بے تکلف کہہ دیا یا اس سے کوئی خاص رشتہ پیدا کر لیا۔ بحث امکانات سے نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ فردوسی اپنے خیال کو ہر حال میں درست ہی ثابت کرتا چلا جاتا ہے۔

شاہ نامہ میں بہت سی خلافِ عقل باتیں اور سینکڑوں سال زندہ رہنے والے انسانوں، دیووں اور بھوتوں کے حالات وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے، مگر اس میں فردوسی کا کچھ گناہ نہیں، کیونکہ فردوسی سے پہلے کا ادب ایسی ہی باتیں بیان کرتا تھا۔ فردوسی نے ان کو جوں کا توں نقل کر دیا، تنقید نہیں کی، ہم چاہیں تو تاویل سے کچھ کا کچھ بنا دیں۔ ہمارے بعض ادیبوں نے کوشش کی ہے کہ ان افسانوں کو حقیقت کا لباس پہنا دیں جس میں بعض جگہ ان کو کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔

ایران کے اسلام سے پہلے کے بادشاہوں کے حالات کے بیان میں فردوسی نے ہر جگہ اپنا کمال اور اپنی اُستادی کے جوہر دکھائے ہیں اور وطن دوستی کا مظاہرہ کیا ہے، یہ نہیں کہ ان بادشاہوں کی کمزوریوں سے چشم پوشی کی ہو، نہیں موقع بموقع بے تکلف ان کی غلطیاں بھی ظاہر کی ہیں، مگر خوبیاں اس طرح اُجاگر کرتا ہے کہ برائیوں کی طرف پڑھنے والے کا دھیان نہیں جاتا۔ اگر جاتا ہے تو اکثر معاف کر دینے میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔

شاہ نامہ میں ایرانی رسم و رواج، ایرانی درباروں کی شان و شوکت، رعیت کا حال، فوجوں کی دھوم دھام، پہلوانوں کے ڈیل ڈول اور ان کے کرتب، خواتینِ ایران کے طور طریق، ہر طبقہ کے لوگوں کے لباس کی وضع قطع، میدانِ جنگ کا نقشہ، فوجوں کی ترکیب، میدان میں امیر و وزیر، پہلوانوں اور سرداروں کے خیموں کا رنگ ڈھنگ اور ترتیب، ان کے ہتھیاروں کے نام اور ہتھیاروں کی چمک دمک، سربازوں اور سورماؤں کے نعرے اور رجز، ان کی فخریہ بات چیت، دشمن کے سامنے ان کی صف آرائی، لڑنے کا ڈھنگ، کہیں دست بدست اور کہیں گتھ کر، کہیں ایک کی ایک سے پکڑ اور کشتی، ہتھیاروں کا استعمال، کھانے پینے کا سامان، عام مجلسوں اور درباروں میں شراب کی ریل پیل وغیرہ باتیں اس طرح بیان کی ہیں کہ پڑھنے والے کو عالمِ خیال میں ہزاروں برس کے واقعات کی تصویریں زندہ ہو کر چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہیں۔

ایک بادشاہ کی لڑکی مجبور ہو کر رستم کے پاس مدد مانگنے جاتی ہے، سوال بہر حال سوال ہے، مگر شہزادی کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ سائلانہ التجاؤں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہی ہے کہ ؎

منیژہ منم دختِ افراسیاب ... برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

ملکی معاملات میں مشورہ کے لئے لیڈروں کی مجلس آراستہ ہے، ؎

پئے مشورت مجلس آراستند ... نشستند و گفتند و برخاستند

مشورہ کی مجلس کا انداز دیکھ چکے، جنگ کے میدان میں ایرانی ہیرو کی سپہ گری کا تماشا دیکھئے۔ سامنے دشمنوں کا ٹڈی دل کھڑا ہے، اکیلا پہلوان رن میں کود پڑتا ہے، اس کے سارے ہتھیار بیک وقت قضا کا کام کرنے لگتے ہیں، وُہ بجلی کی سی تیزی سے پرّوں کے پرّے صاف کرتا چلا جاتا ہے ؎

برید و درید و شکست و ببست ... یلاں را سر و سینہ و پا و دست

گھمسان کا رن پڑا، دونوں طرف کے یودھا دو پہاڑوں کی طرح آپس میں ٹکرا رہے ہیں، لوہے سے لوہا بجتا ہے گھوڑے بجلی بنے ہوئے ہیں، جہاں ٹاپ پڑتی ہے، غبار کا بادل اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، ایسا نظر آتا ہے کہ زمین کا ایک طبق اُڑکر آسمان پر پہنچ گیا ؎

ز سم ستوراں دراں پہن دشت ... زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

فریدون ایرانی بادشاہوں میں اپنی خوبیوں کے سبب سے بادشاہی کا نمونہ مانا گیا ہے، فردوسی جانتا ہے کہ وہ جنگلوں سے آیا اور جمشید کے تخت پر بٹھایا گیا تھا، ایرانی بادشاہوں کو مشورہ دیتا ہے کہ فریدون کے کمالات فریدون تک ہی محدود نہ تھے۔ اگر فریدونی صفات تم پیدا کرو گے تو تم بھی فریدون بن جاؤ گے ؎

فریدونِ فرخ فرشتہ نبود ... ز مشک و ز عنبر سرشتہ نبود

ز داد و دہش یافت آں نیکوئی ... تو داد و دہش کن فریدوں توئی

فردوسی ایرانی قوم کو حکمران قوم دیکھنا چاہتا ہے، مگر ایک فرد کے لئے غذا، لباس اور بستر کے سوا اور کسی چیز کی تمنا کو حرص خیال کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شاہنامہ جنگ نامہ ہے اور اس کے ہر لفظ میں نعرۂ جنگ گونج رہا ہے، لیکن اس کے سُورما محبت و شوق کے جذباتِ لطیف سے خالی نہیں، اس لئے بہادروں کی پریم کہانیاں بھی جا بجا اس میں پائی جاتی ہیں، مگر جیسے یہ سُورما ہیں ویسی ہی ان کی محبوبائیں بھی ہیں۔ مرد صحت و تندرستی کا پیکر ہیں، عورتیں نسوانیت کی مورت اور زندگی پوری جوانی کے ساتھ ان کی نس نس میں دوڑ رہی ہے۔ شاہنامہ کے ہیرو محبت میں سچے اور عورتیں وفا کی دیویاں ہیں۔

فردوسی کی یہ خصوصیت ہے کہ وُہ ہر واقعہ اور موقعہ کی اتنی تفصیل بیان کرتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس کی تیز نگاہ سے اوجھل نہیں رہتی، اس کی زبان مطالب ظاہر کرنے پر قادر ہے، لفظوں کی اس کے پاس کمی نہیں، جہاں جس لفظ کی ضرورت ہوتی ہے، ہیرے کی کنی کی طرح اُٹھاتا اور وہیں بٹھا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کہیں اس کا بیان دبتا ہوا نظر نہیں آتا، اور فردوسی لفظوں سے تنگ اور قلم سے

مصور کے برش کا کام لیتا ہے اور پڑھنے والے کو شاہ نامہ کے صفحات پر آج کی زبان میں سینما کا تماشا نظر آجاتا ہے۔

دیکھو رستم کا دادا زال، رودابہ کو چاہتا ہے، اس سے ملنے کے لئے جاتا ہے، مگر محبوبۂ دلبند قلعہ بند ہے، رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں، لیکن دل کو دل سے راہ ہے، رودابہ کا دل زال کی آمد کا پتہ دیتا ہے، وُہ دیوار پر آتی اور سچ مچ زال کو نیچے کھڑا پاتی ہے تو اپنی چوٹی کھول کر دیوار کے نیچے لہرا دیتی ہے کہ اس سے زال کمند کا کام لے۔ زال اس ادا کو دیکھتا، فدا ہوتا، زلف کو آنکھوں سے لگاتا اور بوسہ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ فردوسی نے اس واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے مگر اس تصویر کو اُس زمانہ میں جب کہ بی کلو بھی سر کے چار بالوں کو پہاڑ کی طرح بھاری سمجھ رہی ہوں۔ اگر پسند نہ کیا جائے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

خواہ دوسروں کی زبان ہی سے سہی مگر جس وقت فردوسی اپنی قوم اور ملک کے مخالفوں کے خلاف بولتا ہے تو اس کی زبان سے بول نہیں آگ کے شعلے نکلنے لگتے ہیں، مثلاً ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار　　عدو[1] را بجائے رسیداست کار

کہ تختِ کیاں را کند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

فردوسی کا مقصد پورا ہوگیا، اس نے فرزندانِ ایران کو ایسا بنا دیا کہ ان کا لباس ہزار بدل جائے مگر ان کی ایرانیت نہیں بدلتی۔

شاہ نامہ کی قبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ اس کے افراد سے اس طرح آشنا ہیں گویا وہ آج کل کے لوگ ہیں۔ نوشیرواں سے آج تک ایران میں بہت سے بادشاہ ہوئے، ان میں اُیسے بھی تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی شہرت کتابوں میں بند ہے، لیکن شاہ نامہ کے جمشید، فریدون، نوشیرواں، رستم وغیرہ کے نام بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، صرف ایرانیوں کا مذکور نہیں، عام مسلمان بھی ان کو قبل اسلام نہیں بعد اسلام کے افراد خیال کرتے ہیں، ثبوت میں رستم علی جمشید علی احمد سہراب وغیرہ نام آپ کے سامنے ہیں، مہابھارت کا ارجن صرف ہندوستان کا ہیرو ہے مگر شاہ نامہ کا ہیرو رستم گویا ساری دُنیا کا ہیرو ہے، آج بھی رستم زماں کا خطاب اس پہلوان کو دیا گیا ہے جو فنِ کشتی میں، کہ یہی قدیم ایران میں جنگ کا ایک طریق تھا، اپنا حریف نہیں رکھتا، بادشاہوں کے دربار میں شاہ نامہ پڑھا جاتا تھا اور سردانا وزیر اس کے ذریعہ سے بادشاہوں کو ملک داری سکھایا کرتے تھے، ایران میں شاہ نامہ خوانوں کی ایک جماعت تھی جو عام جلسوں، دوستوں کے جمگھٹوں میں قومی افتخار کی یہ داستانیں بڑے مؤثر لہجہ میں سنایا کرتے تھے۔

دُنیا کی متفرق زبانوں میں اس کے ترجمے ہوچکے ہیں، ہماری ہندوستانی زبان بھی اس کے منظوم ترجمہ سے محروم نہیں۔

خلاصہ یہ کہ شاہ نامہ قدیم ایران کی شان و شوکت کا مرقع ہے، جسے فردوسی نے آج سے ہزار سال پہلے خونِ جگر سے لکھا تھا، فردوسی زندہ ہے، شاہ نامہ زندہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایران کی وُہ روح زندہ ہے جو فردوسی نے شاہ نامہ کے ترانوں سے ایرانیوں میں پیدا کی تھی *

مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی

[1] اصل میں "عرب" کا لفظ ہے، میں نے اُسے ترک کر دیا ہے۔ شہاب

غزل

تُم سے نظر مِلا کر دیوانہ ہو گیا میں
کچھ راز بن گیا کچھ افسانہ ہو گیا میں

یہ سوچ کر کہ شاید پروانہ وار آؤ
افسردہ سا چراغِ غمخانہ ہو گیا میں

ہاں! اب اُٹھا رہے ہو دیوانہ وار نظریں
جب تم سے تنگ آ کر دیوانہ ہو گیا میں

اب تو مِری خموشی سب کہہ چکی ہے تم سے
اب تو سُنا سُنایا افسانہ ہو گیا میں

اِک بار اور دیکھا حسرت سے اُس کی جانب
پھر رفتہ رفتہ اُس سے بیگانہ ہو گیا میں

ہٹ کر غموں سے اکثر ٹھکرا دیا غموں کو
اکثر غموں سے گُھٹ کر دیوانہ ہو گیا میں

ہے کال آنسوؤں کا کیوں چشمِ غم میں جذبی
کس رندِ تشنہ لب کا پیمانہ ہو گیا میں

معین احسن جذبی

سٹریٹ فورڈ[ا] کا غنڈا

(ایک ایکٹ کی طربیہ تمثیل)

تمہید: مشہور فلاسفر فرانسس بیکن ملکۂ الزبتھ کے "لارڈ کیپر" کا لڑکا ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء کو یارک ہاؤس میں پیدا ہوا۔ لڑکپن ہی میں وہ محنت کش اور قابل تھا۔ ملکہ الزبتھ اُسے پیار سے ننھا لارڈ کیپر کہا کرتی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں وہ ٹرینیٹی (Trinity) کالج کیمبرج میں حصولِ تعلیم کے لئے داخل ہوا۔ اُس وقت مغربی علوم اور خصوصاً علمِ منطق پر ارسطو کے خیالات کا غلبہ تھا۔ بیکن نے اس طرزِ تعلیم کے خلاف آواز بلند کی۔ اُس نے کہا کہ ارسطو کی تعلیم درست اور نادرست میں امتیاز نہیں کر سکتی اور نہ اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ کتاب "نووم آرگنیم" جس کا ہماری تمثیل میں ذکر ہے، اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی تھی۔ یہی وہ خیالات تھے جن کی وجہ سے بیکن کا فلسفہ ارسطو کے فلسفے سے ممتاز رہا۔

کالج چھوڑ کر اُس نے فرانس میں سکونت اختیار کر لی لیکن والد کی وفات کی وجہ سے دو سال بعد فرانس کو چھوڑ کر گھر کو لوٹنا پڑا۔ ۱۵۲۶ء میں وہ وکیل بن گیا اور جلد ہی پارلیمنٹ میں جگہ بھی حاصل کر لی۔ اب اُس نے ارل آف ایسیکس کے ذریعہ اٹرنی جنرل (سرکاری وکیل) بننے کی کوشش کی لیکن ابتداءً اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ہمیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ بیکن کی زندگی کا واحد مقصد فلسفہ تھا اور اُس نے قانونی پیشہ صرف روپیہ کمانے کی خاطر اختیار کیا۔ فلاسفر کی حیثیت سے وہ معزز ترین انسان تھا لیکن قانونی پیشہ اختیار کرنے والے آدمی کی حیثیت سے اُسے اکثر کمینہ کہا جاتا ہے۔ جیمز اوّل کے عہد میں وہ "نائٹ" بنایا گیا۔ ازاں بعد سولیسیٹر جنرل (سرکاری وکیل کا نائب) اور اس کے بعد اٹرنی جنرل (سرکاری وکیل) بن گیا۔ اور لارڈ ویرولم کا خطاب حاصل کیا۔ جلد ہی ترقی کر کے لارڈ چانسلر بن گیا۔ جب وہ لارڈ چانسلر تھا تو اس پر رشوت لینے کا الزام لگایا گیا۔ اُس نے اپنا جرم تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ میں نے رشوت تو لی ہے لیکن انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس پر اُسے جرمانہ اور قید کی سزا ہوئی لیکن چند روز کے بعد ہی شاہی حکم سے سزا معاف ہو گئی۔ بقیہ زندگی اس نے مطالعہ اور تصنیف میں صرف کی اس کی وفات ۲۶ اپریل ۱۶۲۶ء کو ہوئی۔

ذیل کی تمثیل اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ بیکن اٹرنی جنرل (سرکاری وکیل) تھا۔ یہ تمثیل اس بے بنیاد خیال کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کا اصل مصنف بیکن تھا۔ اس نظریہ پر آج تک بہت مباحثہ ہو چکا ہے اور فی الحقیقت اس نظریہ کے حامیوں

[ا] Stratford شیکسپیئر کے پیدا ہونے کی جگہ۔

نے اسے درست ثابت کرنے میں کمال کر دکھایا ہے۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھنے سے یہ نظریہ بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تمثیل اسی نظریہ پر ایک طنز ہے۔

افضل

بیکن اپنی لائبریری میں بیٹھا لکھنے میں مصروف ہے۔

(ذرا ہاتھ پھیلا کر) پبلک اس ڈرامے کی بہت تعریف کرے گی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ڈرامے میں نے ہی ـــــ یہ فضول خیال ہے ہاں یہ ڈراما بہت اچھا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے اسے بھی دینا پڑے گا۔ (دروازہ پر دستک)

(بیکن فوراً مسودہ میز کے نیچے چھپا دیتا ہے۔ بیگم فرانسس بیکن اندر داخل ہوتی ہے۔)

بیگم۔ اس دخل اندازی کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ کیا لکھ رہے تھے آپ؟

بیکن۔ یُونہی ایک مقالہ۔

بیگم۔ لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ میں اب مقالہ کبھی نہیں لکھوں گا۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ مقالہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بیکن۔ درست ہے لیکن یہ مقالہ تو غیر معمولی ہے۔ یہ عقل، عزت، ادب، نیکی اور گناہ ایسے عنوانات پر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ اس میں فلسفیانہ رنگ نمایاں ہوگا۔ اس کا عنوان ہے "نووم آرگینم[۵]"

بیگم۔ کیا؟

بیکن۔ "نووم آرگینم"

بیگم۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہوگا!

بیکن۔ نہیں لاطینی کا۔

بیگم۔ کاش آپ اپنے مقالات کا عنوان عام فہم زبان میں رکھا کریں۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ ایسا صرف اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ آپ لاطینی بھی جانتے ہیں۔ لاطینی تو اب کوئی نہیں لکھتا۔ آخر اس میں خُوبی ہی کیا ہے؟

بیکن۔ صرف عنوان نہیں بلکہ تمام مقالہ ہی لاطینی زبان میں ہے۔

بیگم۔ اُونہہ! میں تو اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکوں گی۔

بیکن۔ تمہیں پڑھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

بیگم۔ (ذرا طیش میں آکر) مجھے یقین ہے کہ جو کچھ تم لکھتے ہو میں اُسے سمجھ سکتی ہوں۔

بیکن۔ یہ نہ سمجھ سکو گی۔ اچھا، میں تمہارے لئے اس کا عام زبان میں ترجمہ بھی کر دُوں گا۔

---

۵ Novum Organum / بیکن کا لاطینی میں لکھا ہوا مقالہ جس میں اُس نے وسعتِ علم پر بحث کی ہے۔

بیگم۔ وعدہ کرتے ہو

بیکن۔ ہاں

بیگم۔ (کچھ وقفہ کے بعد) اس کا موضوع کیا ہے۔

بیکن۔ کچھ کہہ نہیں سکتا —— یہی، اِدھر اُدھر کی باتیں۔

بیگم۔ چھپاتے کیوں ہو مجھ سے؟

بیکن۔ نہیں نہیں، مجھے چھپانے کی ضرورت؟ پھر تم سے! تم تو میرے متعلق سب کچھ جانتی ہو۔

(دروازہ پر دستک)

بیکن۔ اندر آجاؤ۔ (نوکر اندر آتا ہے۔)

نوکر۔ ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے حضور!

بیکن۔ نام نہیں بتایا اُس نے؟

نوکر۔ شاید شیکسپیر بتایا تھا۔

بیگم۔ فرانسس! یہ کون ہو سکتا ہے؟ (نوکر سے) اُس نے کوئی کام بھی بتایا؟

نوکر۔ حضور کہتا تھا کہ بڑا ضروری کام ہے۔ کچھ کُتّے کا ذکر کرتا تھا۔

بیگم۔ کُتا؟ فرانسس میرا خیال ہے کہ تم کُتا نہیں خریدو گے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ہم نے ایک دفعہ کُتا رکھا تھا لیکن اُس نے ہمیں بہت تنگ کیا۔ میں نے تو قسم کھا لی تھی کہ کبھی کُتا نہیں رکھوں گی۔

بیکن۔ نہیں نہیں، نوکر غلط سمجھا ہو گا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور کس لئے آیا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان کچھ لین دین کا تعلق ہے۔ اب تم جاؤ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

بیگم۔ مجھے بھی سُن لینے دیجئے۔

بیکن۔ کوئی ضرورت تو نہیں۔ آدمی ذرا گنوار سا ہے۔

بیگم۔ میں نے کہا نہ تھا کہ تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہو۔ اچھا میں جاتی ہوں لیکن دس منٹ میں واپس آجاؤں گی۔

(بیگم چلی جاتی ہے اور بیکن کمرہ میں ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔ نوکر دوبارہ اندر آتا ہے۔)

نوکر۔ مسٹر شیکسپیر آگئے ہیں حضور!

(شیکسپیر اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ شراب کے نشہ میں بدمست ہے)

بیکن ۔ کیا حال ہے مسٹر شیکسپیئر ؛

شیکسپیئر ۔ اچھا ہوں ۔ اور آپ کا جناب ؛ مَیں یُونہی ذرا سٹریٹ فورڈ سے باہر نکلا تو میں نے کہا کہ چلو جناب کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرلیں۔

بیکن ۔ کیا حال ہے تمہارے کھیتوں کا ؛

شیکسپیئر ۔ کوئی خاص بُرا نہیں ۔ میرے ہمسائے بہت شریر ہیں میں مصائب میں مبتلا ہوں اِس لئے آپ سے کچھ روپے لینے آیا ہوں ۔

بیکن ۔ عزیز دوست یہ ناممکن ہے ۔ ابھی چھ ماہ بھی ہونے نہیں پائے کہ مَیں نے تمہیں پانچ ہزار روپے دیئے تھے ۔ ڈراموں سے آمدنی بھی تو کم ہوتی ہے ۔ اس حالت میں تمہارا روپے طلب کرنا فضول ہے اور میرے خیال میں تو تم مجھ سے بھی امیر ہو ۔

شیکسپیئر ۔ سنیئے صاحب ! میں نے کہہ تو دیا ہے کہ مَیں مشکلات میں گرفتار ہوں اور مجھے اپنی عزت برقرار رکھنی ہے ۔

بیکن ۔ اور مجھے اپنی !

شیکسپیئر ۔ افسوس کہ مَیں آپ کی مشکلات کے حل میں مدد نہیں دے سکتا ۔ ہر انسان خودغرض واقع ہُوا ہے لہٰذا پہلے مجھے اپنی ضروریات پُوری کرنی ہوں گی ۔

بیکن ۔ ناممکن ۔ ایک پائی نہیں ملے گی ۔

شیکسپیئر ۔ مَیں روپے لُوں گا اور ضرور لُوں گا ۔ سات ہزار روپے ۔

بیکن ۔ میں تمہیں پہلے کی طرح مقررہ اوقات پر مقررہ رقم دینے کو تیار ہوں لیکن اس طرح وقت بے وقت طلب کرنے پر تو میں ایک پائی بھی نہیں دُوں گا ۔

شیکسپیئر ۔ میں سٹریٹ فورڈ سے چل کر صرف اِس لئے آیا ہوں کہ آپ سے روپے لوں اور لے کر ہی ٹلوں گا ۔

بیکن ۔ تو تم بیست سالہ تعلّقات کے بعد اپنا معاہدہ توڑ دو گے ؛ تمہیں ضرور انتظار کرنا پڑے گا ۔ مَیں نے ایک اور ڈراما بھی لکھا ہے اور شاید یہ ڈراما آخری . . . .

شیکسپیئر ۔ آخری ؛ کیا آپ کا یہی خیال ہے ؛

بیکن ۔ نہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ آخری ہوگا ۔ میں کچھ لکھے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں ۔ حقیقی شاعر ایسا کبھی نہیں کرسکتا ۔ مَیں اسے چند ہی روز میں اختتام کو پہنچا دوں گا ۔ دو ماہ کے عرصہ تک گلوب تھیئٹر[1] میں اس کی نمائش بھی ہوگی ۔ اس میں تمہارا حصّہ کافی ہوگا ۔ اس ڈرامے کا نام "طُوفان" ہے ۔ یہ میری تصنیفات میں سے بہترین تصنیف ہوگی ۔

شیکسپیئر ۔ نام تو بہت اچھا ہے ۔ یہ ڈراما حزنیہ ہوگا یا طربیہ ؛

---

[1] وہ تھیئٹر جہاں شیکسپیئر کے ڈراموں کی نمائش ہُوا کرتی تھی ۔

بیکن ۔ اس کا انجام نہایت خوشگوار ہوگا ۔ ہاں تو تم کچھ انتظار کرسکو گے ؛

شیکسپیئر ۔ اچھا کچھ کم دے دیجئے ۔ لیکن دیجئے ضرور ۔ دیکھئے مجھے دیر ہوتی ہے جلدی کیجئے ۔

بیکن ۔ بھائی عقل کے ناخن لو ۔ یہ ناممکن ہے ، ذرا سوچو تو کہ میں نے تمہارے لئے کیا کچھ کیا ہے ۔ تم ایک جاہل اور گنوار لڑکے تھے ۔ میں نے تمہیں معزز بنا دیا ہے ۔ تم ایک ذرہ کی مانند تھے لیکن میں نے تمہیں آفتاب بنا دیا ہے ۔ تمہارا مستقبل نہایت شاندار ہے ۔ پھر بھی تم یہاں آکر مجھے بدنام کرتے ہو ۔

شیکسپیئر ۔ دیکھئے حضرت ! میں ایسے سخت الفاظ کی تاب نہیں لا سکتا ۔

بیکن ۔ نہیں ، میرا یہ خیال نہ تھا کہ میں تمہیں برا بھلا کہوں ۔ لیکن کیا یہ بے وقوفی کی انتہا نہیں کہ تم اس بطخ کو مار رہے ہو جو سونے کے انڈے دیتی ہے ؛ علاوہ ازیں تمہارا تمام فخر خاک میں مل جائے گا ۔ مستقبل کی دنیا تمہیں عظیم الشان ڈراموں کے مصنف کی حیثیت سے یاد کریگی ۔ تمہارے لئے یہی کافی نہیں ؛

شیکسپیئر ۔ خیر عظیم الشان ڈراموں سے مجھے کوئی سروکار نہیں ۔ اگر یہ ڈرامے فی الواقع عظیم الشان ہی ہیں تو آپ اپنا نام کیوں نہیں ظاہر کرتے ؛

بیکن ۔ ہاں میں نام ظاہر کرنے کا خواہشمند نہیں ۔

شیکسپیئر ۔ بجا فرمایا جناب نے ۔ ڈراموں کی اشاعت کے لئے آپ کو کسی شخص کی ضرورت تھی ۔ آپ نے میری خدمات طلب کیں اور میں تیار ہو گیا ۔ کیا مجھے اُن کی قیمت دینی نہیں پڑتی ؛ ہر فضول اور لایعنی بات جو آپ لکھیں مجھے قبول کرنی پڑتی ہے " موت خواب کے مانند ہے " ہیملٹ میں یہ کیا لایعنی تحریر تھی ؛ کیا آپ گوارا کرسکتے ہیں کہ عوام اور بچے آپ کو دہریہ سمجھ کر سٹریٹ فورڈ کی گلیوں میں آپ کے پیچھے پیچھے آوازے کستے پھریں ۔ حیران ہوں کہ آپ کو خود ایسی بے معنی اور خلافِ عقل باتیں لکھنے سے شرم کیوں نہیں آتی ۔ مجھے یہ سب بے عزتی گوارا کرنی پڑتی ہے لہٰذا میں تنخواہ کا حقدار ہوں ۔ مجھ پر آپ کا کوئی احسان نہیں ۔

بیکن ۔ او بے حیا تجھے یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی ۔ اپنے محسن کو بدنام کرنا چاہتے ہو ۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے ۔ (نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی پر ہاتھ رکھتا ہے ۔)

شیکسپیئر ۔ بہت اچھا جناب ۔ آج دوپہر تک تمام لندن کے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ڈرامے آپ ہی نے لکھے ہیں ۔ میں آپ کو ہر ممکن نرمی دکھا چکا ہوں ۔ اچھا ——— خدا حافظ ! (دروازہ کی طرف جاتا ہے ۔)

بیکن ۔ خدا کے لئے واپس آجاؤ مسٹر شیکسپیئر ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں ۔

شیکسپیئر ۔ تو کہیں سے حاصل کر لیجئے ۔

اسی وقت تو یہ ممکن نہیں ۔

شیکسپیئر۔ اچھا، اگر آپ وعدہ کریں۔ تو میں ابھی جانے کی بجائے دوپہر کو چلا جاؤں گا۔

بیکن۔ حیران ہوں کہ کیا کروں۔ تم نہیں جانتے کہ میری طبیعت کتنی شکستہ ہو گئی ہے۔

شیکسپیئر۔ اچھا میں تمام معاملہ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔ خدا حافظ! بیکن۔ خدا حافظ

شیکسپیئر۔ خیال رکھیئے گا سات ہزار روپے۔ ورنہ تمام بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

(شیکسپیئر باہر جاتا ہے۔ اور بیکن سر پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ بیگم فرانسس بیکن اندر داخل ہوتی ہے)

بیگم۔ فرانسس، فرانسس! (بیکن اُسی حالت میں بیٹھا رہتا ہے) کیا کرتے ہو فرانسس، اُٹھو بھی۔

بیکن۔ تنگ مت کرو بیگم۔ تم نہیں جانتی ہو کہ آج کیا ہوا۔ آہ! میں تباہ ہو گیا ہوں۔

بیگم۔ یہ کیا مجذوبوں کی سی بڑ مار رہے ہو اور تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟

بیکن۔ مجھے اکیلا یہیں پڑا رہنے دو تو بہتر ہے۔

بیگم۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا۔ میں تمہیں اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔

بیکن۔ میں تو برباد ہو گیا ہوں بیگم! (آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

بیگم۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ فرانسس! اب تو تمہیں کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

بیکن۔ (چونک کر) ہیں! تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟ کیا اُس جاہل نے یہ بات مشہور کر دی ہے۔

بیگم۔ کیا عرض کروں فرانسس! مجھے آج یہ سُن کر سخت صدمہ ہوا ہے کہ میرا شوہر ایک معزز اٹرنی جنرل نہیں بلکہ اُس نے تمام عمر یہ ہزلیات جو ڈراموں کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں، لکھتے گزار دی۔

بیکن۔ بیگم، بیگم! میرے لئے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟

بیگم۔ میں دروازے کے پیچھے کھڑی تمہاری سب گفتگو سُن رہی تھی۔

بیکن۔ لیکن بیگم! اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر یہ احسان فراموش شخص نہ مانا تو پھر کیا ہو گا۔ آہ! میں اس مشکل کو کس طرح حل کر سکتا ہوں، خودکشی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

بیگم۔ اب تو تمہیں کچھ انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ کتنے روپے طلب کرتا ہے وہ؟ بیکن۔ پانچ ہزار

بیگم۔ میرا تو خیال ہے کہ اُس نے سات ہزار کہے تھے۔

بیکن۔ ہاں اتنے ہی کہے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پانچ ہزار ہی پر راضی ہو جائے گا۔ لیکن میرے پاس تو پانچ روپے بھی نہیں۔ ہمارا تو قرض ہی بہت زیادہ ہے۔ کاش گھر کا خرچ ہی کم ہوتا۔ بیگم۔ بالکل ٹھیک۔ تمام الزام میرے سر ہی تھوپ دو۔

بیکن۔ پیاری! میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں تباہ حال ہو رہا ہوں اور دُنیا میں کوئی ایسا فرد نہیں جو مجھے پانچ ہزار روپے اُدھار دے سکے۔ ہر شخص کو معلوم

ہے کہ میں حد سے زیادہ مقروض ہوں۔

بیگم۔ فرانسس تم اٹرنی جنرل ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی اہم مقدمات نہیں ؟

بیکن۔ ہیں تو سہی۔ ہر وقت ہی ہوتے ہیں اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں اُن کو خوب نبھاتا ہوں۔

بیگم۔ فخر کو چھوڑو۔ کیا تمہارے پاس کسی امیر کا مقدمہ نہیں ؟ **بیکن۔** ہے کیوں نہیں ؟

بیگم۔ خوب ! **بیکن۔** پھر ؟

بیگم۔ خدا جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے، کوئی بات سمجھتے ہی نہیں۔ اچھا صاف صاف کہتی ہوں کہ کیا کبھی کسی نے تمہیں رقم پیش نہیں کی ؟

بیکن۔ تمہارا مطلب ہے رشوت ؟

بیگم۔ مجھے خوب یاد ہے فرانسس کہ ایک دفعہ تم نے کہا تھا کہ اگر ہم گلاب کے پھول کا نام تبدیل کر دیں تو اُس کی خوشبو اتنی ہی خوشگوار ہو گی جتنی کہ موجودہ صُورت میں ہے۔ اچھا تم جو چاہو اسے کہہ لو۔ کیا تم رشوت نہیں لے سکتے ؟ **بیکن۔** ہرگز نہیں . . . . . .

بیگم۔ تو پھر تم اپنی بے عزتی گوارا کر لوگے ؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا نام ان ڈراموں کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ظاہر ہو جائے ؟ ہاں تو تمہارے ہاتھ میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو تمہیں پانچ ہزار روپے دے سکے ؟

بیکن۔ شاید ——— ہاں ہاں وہ ! **بیگم۔** خوب ! اُس کا نام کیا ہے ؟

بیکن۔ کئی ہیں۔ مثلاً ایک رابنسن ہے۔ اُس کے پاس بے شمار روپیہ ہے۔ ابھی کل ہی اس نے رشوت دینے کی کوشش کی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں اشارۃً اُس کا ذکر کیا تھا۔

بیگم۔ اچھا تو جب کل تم اُس سے کچہری میں ملو تو اُسی وقت پانچ ہزار روپے لے لینا۔

بیکن۔ نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔

بیگم۔ اگر تم سے یہ نہ ہو سکے گا تو مجھے بھی دوبارہ دیکھنے کی اُمید منقطع کر دو۔

بیکن۔ اچھا، اچھا بیگم۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میرے لئے یہ کتنا مشکل ہوگا۔

بیگم۔ میں یہ جاننا چاہتی بھی نہیں۔ (جاتے وقت) بہتر ہوگا کہ تم کچھ زیادہ ہی لے لینا۔ بقیہ رقم سے میں اپنی ضروریات پوری کرونگی۔

(بیگم چلی جاتی ہے)

بیکن۔ (کمرہ میں ٹہلتے ہوئے) جو ہونا ہے وُہ ہو کر ہی رہے گا۔ اگر آج میرا نام ظاہر نہیں ہوگا تو سو دو سو سال بعد ایسا ہو جائیگا۔ صبر ! ——— نہیں بیگم یہ نہیں مانے گی۔ حیران ہوں کہ ان حالات میں کیا کروں۔ آج چھٹی ہے مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بہتر ہوگا کہ میں یہ ڈراما ختم کر دوں۔ آہ میں نے شاعری شروع ہی کیوں کی۔ اب یہ سلسلہ منقطع ہونے کی بھی اُمید نہیں۔ ہاں جب وہ رُوسیاہ مر جائے گا تب یہ ممکن ہو سکتا ہے۔

(پردہ)

مترجمہ
افضل

بہار

اُٹھ دیکھ، کہ گلشن میں بہار آئی ہوئی ہے
ایک ایک کلی حُسن پہ اترائی ہوئی ہے

اے سروِ خراماں روشِ باغ کی جانب
پھولوں کی نظر صبح سے للچائی ہوئی ہے

گنجینہ بنا ہے چمنستاں زرِ گُل سے
اور دولتِ قاروں مرے ہاتھ آئی ہوئی ہے

ندی کے کناروں پہ چمکتا ہُوا ریتا
چاندی کی ہوائی ہے کہ بُرکائی ہوئی ہے

یا باغ کے اِس دامنِ رنگیں کے سرے پر
مُقیش کی اِک گوٹ سی لہرائی ہوئی ہے

کاجل کی پہاڑی سے بہے دودھ کے دھارے
بگلوں پہ سیہ فام گھٹا چھائی ہوئی ہے

اِس غنچہ کو چھیڑا، کبھی اُس گُل کو جھنجوڑا
ہر موجِ ہوا، باؤلی، ہرجائی ہوئی ہے

گردوں پہ کماں کی ہے یہ رنگین سی چوڑی
یا کوئی پری تالبِ بام آئی ہوئی ہے

اے حُسنِ نظر باز ترے تیر سے ہر سُو
دل تا بہ جگر زندگی برمائی ہوئی ہے

حامد علی خاں

نام بتلاتا ہوں۔" وہ سوچتا بھی جاتا تھا اور کاہو بھی کھاتا جاتا تھا۔

"آگیا یاد نام اُس کا۔ ہالینڈ کا اُڑنے والا آدمی (The Flying man of Holland)۔"

"اُڑنے والا ڈچ مین؟ (The Flying Duchman?)"

"ہاں، ہاں، شور، میرا خیال ہے یہاں شور بہت ہے میری بیوی کہتی ہے یہ حد سے زیادہ جرمن ہے، اور مجھے اُس سے اتفاق ہے کیونکہ وُہ موسیقی میں بہت درک رکھتی ہے۔ تو آپ ویگنر کے متعلق مجھ سے متفق ہوئے نا؟"

"میں ویگنر کا بہت شائق ہوں"

"تو بس ٹھیک ہی ہے، کیا آپ کے پاس اپنے گھوڑے بھی ہیں؟"

"نہیں"۔

"میرے ایک بھائی کو گھوڑوں کا بڑا شوق ہے۔ گھُڑدوڑ میں وُہ بہت خوش رہتا ہے۔ قاہرہ کی تمام گھڑدوڑوں میں میرا بھائی اپنے گھوڑوں سمیت شامل ہوتا ہے، اُس نے بہت سی انعامی تھیلیاں جیتی ہیں۔ اُس نے ایک انگریز لارڈ سے گھوڑا خریدا، ماں اور باپ کی طرف سے اُس کا گھوڑا ایک اعلےٰ شجرہ رکھتا ہے۔ اگر آپ قاہرہ جائیں تو اپنے بھائی کے نام آپ کو تعارفی خط دوں گا۔"

"شکریہ، مگر میں تو ابھی قاہرہ سے آرہا ہوں۔"

"اوہو یہ بات ہے، مگر آپ کچھ کھا نہیں رہے ہیں!"

"شکریہ! میں اصل میں ——"

"وُہ آپ سے کچھ نہیں لیں گے، بل مَیں چکاؤں گا"

"میں یہ نہیں سوچ رہا تھا، لیکن ——"

"بے شک، ایسا ہی ہے، آپ کی پارلیمنٹ کا کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے، مہربانی آپ کی"۔

"آپ تو قدامت پسند ہی ہوں گے؟"

"قطعی طور پر نہیں"۔

"پارلیمنٹ میں جوشیلے لوگوں کی شمولیت کچھ اچھی بات نہیں، قدامت پسند ہی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں ساری تاریخ اُن کی پُشت ہے، یہ جوشیلے لوگ سب جگہ تباہی مچا رہے ہیں اور تجارت کا تو اُنہوں نے خانہ ہی خراب کر دیا ہے۔ جب لبل کا پلڑا بہت بھاری ہو تو کچھ کام نہیں ہو سکتا۔ مسٹر بالوینڈر (Mr. Balwind) ..... کیا وُہ ایک قابلِ اعتماد شخص نہیں؛ مَیں تو اس میں

سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں دیکھتا ـــــ عوام اُسے چاہتے ہیں، ہے نا؟

"کچھ غیر ہر دلعزیز بھی نہیں"

"انگریز قوم کا دِل درست ہے، میرے دِل میں انگریز قوم کے لئے بہت عزت کا احساس ہے ـــ میں یہ کچھ اس لئے نہیں کہتا کہ آپ انگریز ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ میری سمجھ مجھے ایسا بتاتی ہے۔ میری بیوی کی بہن نے مرنے سے پیشتر ایک انگریز سے شادی کی تھی۔ آہ! آپ شاید میری بیوی کی فوٹوگراف کی تصویر دیکھنا پسند کریں گے؟"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے ایک قیمتی اور شوخ رنگ رومال نکالا، اپنی اُنگلیاں اُس سے پونچھیں، پھر اپنا بڑا سا بٹوہ نکالا۔ اور اُس میں سے ایک کسی قدر فربہی لئے مسکراتی ہوئی خاتون کا فوٹو۔

اُس نے فخر سے کہا "میری بیوی! اور جب کہ میں اُسے دیکھ رہا تھا اور دِل ہی دِل میں اُس کی تعریف کر رہا تھا، اُس نے تائید کے طور پر اتنا اور اضافہ کیا، مسز ابراہام میندوزا!"

میں نے کہا "نہایت عمدہ تصویر ہے" اور یہ تھا بھی ٹھیک۔

"آہ! آپ اُس کے مداح ہیں، ہر شخص کو اُس سے محبت ہے۔ لیکن آج اُس سے مجھے ایک عظیم غم ملا ہے۔ میرا خیال ہے وہ مجھ سے ناراض ہے لیکن اِس میں میرا قصور نہیں۔ مَیں نہیں جانتا آیا کوئی اور آدمی ہے جو اُس کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں برباد ہوگیا، مر مِٹا، نہ رہا، میں اُس آدمی کو گولی مار دوں گا مگر میرا خاندان اسے پسند نہ کرے گا۔ مَیں اپنے خاندان کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسٹر میندوزا کے ساتھ کافی ملاقات ہو چکی۔ اور اپنی پیالی بیندے تک خالی کر کے میں نے کہا "تو آپ کا غم مجھے اُمید ہے جلد رفع ہو جائے گا۔ ہاں تو اب مجھے چلنا چاہئے۔ شب بخیر۔"

وہ جھٹ اپنے ریشمی رومال سے مُنہ پُونچھ، کھانے کو پرے ہٹا، کھڑا ہو گیا اور بولا:۔

"مَیں تھوڑی دُور آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔" مَیں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

بہرو مجھے بِل دینے ہی کو تھا کہ مسٹر میندوزا نے اُسے اُس کے ہاتھ سے اُچک لیا اور فصیح ترین عربی زبان میں کہنے لگا، "خچر کہیں کا، مادر زاد احمق باپ کا بیٹا، اندھی بھیڑ، مریل گدھوں کا بھائی، جنوں سوار ٹرٹر کرنے والا وحشی، میرے بجائے میرے گاہکوں کو بِل دیتا ہے تو! کیا مجھے تیرا کام تجھے سکھانا ہی ہوگا۔ اناڑی نائی کہیں کا۔"

میں ایک عظیم مسرت کے ساتھ گالیوں کی اس بوچھاڑ کو سنتا رہا۔ بہرہ بھی چپ چاپ کھڑا سُنتا گیا گویا کچھ نہیں سمجھا۔ تا آنکہ اُسے "نائی" کہا گیا۔ اس لفظ سے ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بہت سٹپٹا گیا۔

بہرے نے اپنی بیہری فرانسیسی میں کہا "تو کیا میں منیجر سے جناب کی رپورٹ کروں، جناب نے اِس شریف آدمی کی موجودگی میں مجھے

گالیاں دیں اور میری اہانت کی، کہنے کو تو جناب مجھے "نائی" کہہ سکتے ہیں مگر جناب یہ توہین ہے۔"

میں نے کہا "مسٹر مینڈوزا! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، مگر آپ براہِ کرم میرا بِل ہرگز ادا نہ فرمائیے۔"

"جانے بھی دیں آپ، اور کسی وقت آپ میرا بِل ادا کر دیجئے گا۔"

اُس نے اپنا بھی اور میرا بھی بِل چکا دیا اور جیسا کہ اُس نے ابھی ابھی مجھے پُرزور طور پر آگاہ کیا تھا وہ کچھ گز میرے ساتھ چلا، یہانتک کہ ہم اُس کی موٹر کار تک آن پہنچے۔

اُس نے پوچھا "کون ہوٹل میں ٹھہرے ہیں آپ؟"

"یقیناً آپ کو مجھے میرے ہوٹل تک پہنچانے کا خیال بھی نہ کرنا چاہیے۔"

"آپ بیٹھئے تو، آپ بہت ہمدرد واقع ہوئے ہیں، آپ نے مجھے بہت سے ایسے افسوسناک اقدامات سے بچا لیا ہے جو شاید اگر میں آپ سے نہ ملتا تو کر ہی گزرتا، آپ میرے دِل کو غم سے آزاد کر رہے ہیں۔"

درحالیکہ میرے بُشرے سے ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا، میں اُس کی موٹر کار میں بیٹھ گیا۔

. . . .

اپنے ہوٹل کے دروازے پر مَیں نے اُس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر آپ کبھی لندن آئے تو مجھے آپ سے مِل کر خوشی ہوگی۔ مگر مَیں نے اُسے اپنا پتہ نہیں دیا۔

اُس نے کہا "ذرا سُنیئے تو، وُہ موٹر گاڑی جس میں آپ یہاں آئے ہیں میں نے آٹھ سَو پونڈ میں خریدی تھی۔ میں اُسے صرف پانسو پونڈ میں ہی آپ کو دے ڈالوں گا، آپ سے سَودا نہیں کروں گا۔ لیکن میں غم میں مبتلا ہوں، اگر اس گاڑی کے مجھے پانسو پونڈ ہی مِل جائیں، تو میں اپنا وقت اور روپیہ اپنی بیوی کا سُراغ لگانے میں صرف کر سکوں گا۔ اور اُسے واپس اپنے پاس لاؤں گا ــــــ یہ ایک خوبصورت گاڑی ہے، صرف پانسو پونڈ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(ای۔ ڈی۔ گوسے ٹین)

(انگریزی سے ترجمہ)

نند کشور جھنگن ایم، اے

*

سوال

یہ سندرتا اتنے دِلوں تک کس پردے میں چھُپی ہوئی تھی ؛
آج آکاش بنا ہے سُندر، سُندر چاند، ستارے سُندر،
سُندر پتے، پھُول اور ڈالی، اور پھلواری، سارے سُندر!
سُندر پنچھی کے رس والے، میٹھے میٹھے پیارے نغمے،
آج صدائیں ندی کی، ہیں مست انوکھے نیارے نغمے!
رات سُہانی اَور اندھیری، پیتم کے نینوں کا کاجل،
رُوپ کی برکھا لے آئیں گے سُکھ سیجوں پر پریم کے بادل
آج بدل کر رُوپ منوہر دُنیا ہے مستی میں ناچی،
یہ سُندرتا اتنے دِلوں تک کس پردے میں چھُپی ہوئی تھی ؛
پریم کے میٹھے میٹھے رس والے جذبوں سے بوجھل جوبن!
تیر نگاہیں ہونٹ کماں سے، اَور زلفوں کی زہری ناگن!
سانس کسی خوشبُو کی لہریں، نرم، اچھوتی، ہلکی ہلکی!
سُورگ سے آئی بھُو کی لہریں گرم، سُہانی، بھینی بھینی!
پریم کا پنچھی ڈر سے جھجکتا، رُکتا رُکتا، چھُپتا پھرتا!
پریم شکاری بیباکی سے ہنستا ہنستا آگے بڑھتا!
سُکھ کی متوالی برساتیں سب جنموں کے گہرے بندھن!
پریمی اور پریتم کی باتیں اَور اِندر کے سُورگ کا آنگن!
یہ سُندرتا اتنے دِلوں تک کس پردے میں چھُپی ہوئی تھی ؛

میرا جی

محفلِ ادب

مرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل

فصیح الملک، خدائے سخن، نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل، وہ متبرک روحانی تحفہ جو اب تک مرزا غالب کے کسی دیوان یا ضمیمہ میں شائع نہیں ہوا اور جو امیر الامراء نواب یار محمد خاں صاحب مرحوم کے کتب خانہ قدیم سے بذریعہ خاص حاصل کر کے "دین و دُنیا" میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(جوہر قریشی بھوپال)

بھولے سے کاش وہ اِدھر آئیں تو شام ہو (۹) — کیا لطف ہو جو ابلقِ دَوراں بھی رام ہو

تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو — ساقی کی چشمِ مست ہو اور دَورِ جام ہو

بیتاب ہوں بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں — اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو

کیا شرم ہے، حریم ہے، محرم ہے رازدار — میں سربکف ہوں تیغ ادا بے نیام ہو

میں چھیڑنے کو کاش اُسے گھُور لوں کہیں — پھر شوخ دیدہ برسرِ صد انتقام ہو

وہ دن کہاں کہ حرفِ تمنّا ہو لب شناس — ناکام بد نصیب کبھی شاد کام ہو

گھُس مل کے چشمِ شوق قدمبوس ہی سہی — وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں پر اژدہام ہو

اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اُٹھوں — مجھ پر جو چشمِ ساقیِ بیت الحرام ہو

پیرانہ سال غالبِ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دِن قیام ہو

"دین و دُنیا"

کیا شہنشاہ اکبر رُوپ متی پر عاشق تھا؟

مالوہ کی ایک حسینہ روپ متی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے زمانہ کی سب سے حسین عورت تھی۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ شاہانِ بازاری کے طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ بعض مؤرخوں نے اُس حسینہ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر بھی اس پر بُری طرح مٹا ہوا تھا چنانچہ

اکبر نے ادہم خاں کو اسی لئے مالوہ کو فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا تاکہ وہ حاکم مالوہ سے روپ متی جیسی حسین عورت کو چھین سکے۔ یہ واقعات کس حد تک صحیح ہیں اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل مضمون سے ہو سکتا ہے :-

رُوپ متی مالوہ کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن وُہ اس بلا کی حسین تھی کہ اس زمانہ میں جس شخص کی بھی نظر رُوپ متی پر پڑ جاتی تھی وہ تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا تھا۔

روپ متی حسین ہی نہیں تھی بلکہ وہ نہایت ہی طبّاع اور ذہین بھی تھی، ہندی زبان کی وہ ایک نہایت ہی اچھی شاعرہ تھی، وہ ہندی اشعار نہایت نازک مضمون میں ادا کرتی تھی، اور مشکل مضمون کو اِس آسانی کے ساتھ نظم کر دیتی تھی کہ سننے والے حیرت کرتے تھے۔ ان خصائل سے لوگ نادیدہ اس کے فریفتہ ہو جاتے تھے۔ فرمانروائے مالوہ جس کا نام باز بہادر تھا روپ متی پر فریفتہ تھا اور اُس نے صدہا تدبیروں سے اُسے رام کیا تھا۔ ۹۷۶ھ اور بقول بعض مؤرخین ۹۶۹ھ میں اور غالباً یہی صحیح بھی ہے جب جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے ادہم خاں کو برفاقت پیر محمد خاں مالوہ کی تسخیر کے لئے روانہ کیا تو باز بہادر فرمانروائے مالوہ جو عیاشی اور عیش و عشرت کے فراہم کرنے میں مشہور تھا، روپ متی کے ساتھ خلوت نشاط میں مشغول تھا۔ اگرچہ بادشاہ کی بحر امواج فوج کی آمد کی خبر سب طرف منتشر ہو چکی تھی اور بدقسمت باز بہادر کو تحقیق ہو چکا تھا کہ شاہی فوجیں عنقریب مالوہ پر حملہ آور ہونے والی ہیں۔ مگر اُسے روپ متی کے عشق نے اس قدر اندھا اور مدہوش کر دیا تھا کہ دین و دُنیا کی خبر نہ تھی، وہ خوابِ غفلت میں یہاں تک پڑا رہا کہ شاہی فوجیں آفتِ ناگہانی کی طرح سر پر ٹوٹ پڑیں اور بیدار ہؤا تو ایسے وقت کہ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ صبح کی پَو پھٹی تھی کہ شاہی لشکر شہر میں درّانہ گھس آیا اور قتلِ عام شروع کر دیا۔ باز بہادر کو خبر ہوئی تو وہ گھبرا کر اُٹھا اور کوئی تدبیر بنائے نہ بن پڑی یہاں تک کہ اپنی بہت سی ناموسوں اور رُوپ متی کو شاہی لشکر کے ہاتھوں میں چھوڑ کر تنہا گھر سے نکل گیا، اور بیجانگر یا بیجا گڑھ کے جنگلوں کی طرف بحالت بے سر و سامانی فرار ہو گیا۔

ادہم خاں بغیر لڑے بھڑے تمام خزانوں اور گھوڑوں اور ہاتھیوں اور اسباب تجمّل پر قابض ہو گیا اور بہت سی پری تمثال اور زہرہ جبیں عورتیں لوٹ میں آئیں، ادہم خاں نے جب رُوپ متی کے حُسن کی تعریف سُنی تو اُس کی ملاقات کی رغبت ظاہر کی۔

پری جمال رُوپ متی جیسے حُسن و جمال کے لئے مشہور تھی ویسے ہی باز بہادر کی سچی پرستار بھی تھی۔ اس نے اوّل اوّل بہت سے اس قسم کے عذر اور حیلے اُٹھائے جن سے ادہم خاں اپنے ارادہ سے باز آجائے لیکن چونکہ اُس کے دِل پر رُوپ متی کے عشق کا تیرِ کاری لگ چکا تھا اور نادیدہ اُس کے عشق میں گھائل اور بسمل ہو چکا تھا اس لئے حکماً رُوپ متی کو ملاقات کرنے کے لئے مجبور کیا۔ رُوپ متی نے اس پر بھی اس کی اطاعت نہ مانی۔ حتے الامکان اس کے دفعیہ کی کوشش کرتی رہی لیکن جب ادہم خاں کا اصرار اور بیجا اصرار حد درجہ کو پہنچ گیا اور رُوپ متی کو یقین ہو گیا کہ ادہم خاں اپنے اس ارادے سے باز آنے والا نہیں تو اُس نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا اور قطعی فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو مگر میں تو اُس کے پاس ہرگز نہ جاؤں گی۔ یہ ٹھان کر اُس نے نہایت عجز و انکسار سے ایک روز کی مُہلت مانگی اور ادہم خاں سے کہلا بھیجا۔

کہ براہِ عنایت کل تک مجھے مہلت دیں تاکہ میں آپ سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں ۔ بیوقوف ادہم خاں عورت کے فریب میں آگیا اور کل کے وعدہ پر مطمئن ہو کر جوشِ مسرت میں پھُولا نہیں سمایا۔

دوسرا روز ہُوا تو پری تمثال رُوپ متی نے غسل کیا، عمدہ اور شاہانہ لباس زیبِ جسم کئے۔ سونے کے جڑاؤ زیورات اور گرانبہا جواہر بدن پر سجائے، غرضکہ زیب و زینت اور امکانی آرائش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ملاقات کا جو وقت مقرر ہُوا تھا اُس سے کچھ پیشتر نازک ادا رُوپ متی ایک بڑے کمرے میں جو نہایت آراستہ اور سامانِ عشرت سے پُر تھا نہایت نرم قالین پر تکیہ لگا کر بیٹھ گئی اور ایک ملازم کو ادہم خاں کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ رُوپ متی آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں، تشریف لائیے اور جلد تشریف لائیے۔

ادہم خاں پہلے ہی سے منتظرِ وقت تھا، ملازم کے پہنچتے ہی اور اجازت کا مژدہ سنتے ہی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا، اور جوشِ مسرت کو دبائے ہوئے رُوپ متی کے محل میں پہنچا۔ باغیچہ کی سیر کرتا ہُوا اور ایک ایک مکان کو دیکھتا ہُوا رُوپ متی کے کمرے میں آیا۔ دیکھا تو ایک حُسن کی دیوی نُور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نہایت زیب و زینت اور جاہ و جلال سے ایک بیش قیمت مسند پر تکیہ لگائے بیٹھی ہے اور بڑی آن بان اور شان و شوکت سے بیٹھی ہے، یہ سامان دیکھ کر ادہم خاں اپنی خوش قسمتی پر نہایت نازاں ہُوا اور بڑی خوشی اور مسرت کے ساتھ آگے بڑھا، اس کی یہ مسرت اصل میں عارضی اور تھوڑی دیر کی تھی، قریب جا کر بیٹھا، اور دیکھا تو رُوپ متی کو مردہ پایا۔ رُوپ متی جس مسند پر تکیہ لگائے بیٹھی تھی اس کے کنارے ایک بلوری گلاس رکھا تھا اور اس پر ایک لکھا ہُوا کاغذ ڈھکا تھا۔ گلاس میں تھوڑا سا پانی تھا جس میں زہرِ ہلاہل گھُلا ہُوا تھا۔ کاغذ پر رُوپ متی کے ہاتھ کے یہ فقرے لکھے ہوئے موجود تھے۔ شریف لوگ اپنی عصمت اور آبرو کو کبھی برباد نہیں کیا کرتے، اور عصمت کے پیچھے جان پر کھیل جایا کرتے ہیں، مَیں نے صرف اپنے شوہر کے ننگ و ناموس رکھنے کی غرض سے اپنی جان اور کیسی جان جس کی تلافی ہزار جانیں بھی نہیں کر سکتیں نہایت مایوسی اور نا اُمیدی کی حالت میں دے دی۔ ادہم خاں ان فقروں سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ اپنی بیہودہ کارروائی پر نہایت نادم و پشیمان ہُوا۔ رُوپ متی کے اس مایوسانہ حالت میں جان دینے پر سخت افسوس کیا اور اپنے نفس کو ملامت کرتا ہُوا اس کمرے سے باہر آیا۔

صاحب صحائف الاخبار اسی کتاب کی تیسری جلد میں ۹۶۶ھ کے واقعہ پر ریمارک کرتا ہُوا لکھتا ہے:۔ رُوپ متی ایک بازاری مغنیہ عورت تھی جو حُسن و جمال اور نزاکت و لطافتِ طبع میں اعلےٰ درجہ کی شہرت رکھتی تھی، اور قطع نظر حسن و جمال کے فنِ موسیقی اور دلربائی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی۔ جلال الدین محمد اکبر شاہ نے اسے بہتیرا رام کرنا چاہا، اور نئی نئی تدبیروں سے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی تکلیف دی، مگر چونکہ وہ اپنے وطن کے ایک بڑے امیر کبیر اور عیش پسند شخص سے رابطۂ محبت اور علاقۂ مودت رکھتی تھی اور دونوں شخصوں میں سے ایک دوسرے کا عاشق تھا۔ اس لئے وُہ حالتِ مجبوری میں زہرِ ہلاہل کا ساغر مُنہ سے لگا کر ہمیشہ کے لئے زمین میں چھپ گئی اور جلال الدین محمد اکبر کے ہاتھ میں اپنی عزت دینے کے خوف سے ہمیشہ کے لئے دُنیا سے مفارقت کر گئی۔

مگر جن لوگوں کو تاریخ سے دلچسپی ہے وُہ صحائف الاخبار کی اس خبر کا صحیح اور ٹھیک اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس درجہ کی خبر ہے اور مصنف صحائف الاخبار نے کہاں تک سچائی اور دیانت سے کام لیا ہے۔ تاریخ میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ جلال الدین محمد اکبر نے ایک ایسی بزاری اور مغنیہ عورت کی کبھی خواہش کی ہو، بلکہ جہاں تک دیکھا جاتا ہے اور اس واقعۂ خاص کے متعلق تاریخی اوراق کو اُلٹ پلٹ کیا جاتا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو روپ متی کے مالوہ میں ہونے کی خبر تک نہ تھی، اور اُس کے حُسن وخوبی کی خبر سے اس کے کان آشنا تک نہ تھے۔ افسوس ہے کہ لوگ ایک ایسی بے سروپا بات کو جس کی کچھ اصل نہ ہو ایک عظیم الشان بادشاہ کی طرف منسوب کرنے میں ذرا مضائقہ نہیں کرتے اور جو جی میں آتا ہے بے دھڑک لکھ مارتے ہیں۔

"دین ودُنیا"

مشینیں

کیا کبھی آپ ایک ایسی دُنیا کا تصور کر سکتے ہیں جس میں کوئی مشین نہ ہو۔ یعنی کوئی ایسا آلہ نہ ہو جس سے انسان اپنی محنت بچا سکے؟ مجھے اندیشہ ہے کہ تہذیب وتمدن کے موجودہ مرحلے پر پہنچ کر آپ ایسی دُنیا کا تصور بھی کرنے سے عاجز رہ گئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ انسان جس دن سے اس سیارے پر آباد ہُوا ہے اسی دن سے مشین کا محتاج ہے۔ جب دُنیا بالکل جنگل بیابان تھی اور انسان اس میں جانوروں کی طرح پھرا کرتا تھا۔ اس وقت بھی جب اسے زمین کھودنے کی ضرورت پڑی ہوگی۔ تو اس نے محض اپنے ناخنوں سے کام نہ لیا ہوگا، بلکہ کسی نکیلی لکڑی سے ضرور مدد لی ہوگی۔ جانوروں کو زمین کھودنے کی ضرورت پڑتی ہے تو وُہ صرف اپنے پنجوں سے مٹی کو کریدتے ہیں اور بڑی محنت سے گڑھا بنایا کرتے ہیں لیکن انسان وحشت کی ابتدائی منزل میں بھی اتنی عقل ضرور رکھتا ہوگا کہ زمین کھودنے میں کسی درخت کی نکیلی ٹہنی یا کسی نکیلے پتھر سے مدد لی جا سکتی ہے۔ بس اُسی دن فطرت نے اس کے کان میں پھُونک دیا ہوگا کہ ہر کام میں ہاتھ کی محنت بچانے کے لئے کسی نہ کسی معاون چیز سے مدد لینا ضروری ہے۔

آج کی تقریر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں زمانۂ وحشت سے لے کر اس وقت تک مشین کی تاریخ بیان کروں۔ کیونکہ اگر میں اس چکر میں پڑ گیا۔ تو خدا جانے کتنی غیر دلچسپ تفصیلات بیان کرنی پڑیں۔ اور سُننے والے اُکتا کر ریڈیو بند کر دینے پر مجبور ہو جائیں۔ زمین کھودنے کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ بعض مذہبی کتابوں سے بھی سُراغ ملتا ہے کہ انسان کی سب سے پہلی "میکانکی کوشش" یہی تھی۔ جب قابیل اپنے بھائی ہابیل کو بے جان کر چکا۔ تو اس فکر میں غلطاں ہُوا کہ اب اس لوتھ کو کیا کروں جو نہ ہلتی جُلتی ہے۔ نہ بولتی چالتی ہے۔ بڑے باوا نے دیکھ لیا تو وہ کیا کہیں گے؟ اور میں کیا جواب دوں گا؟ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک جیتا جاگتا کوّا ایک مرے ہوئے کوّے کی لاش کو گھسیٹ کر لایا۔ اس کے بعد چونچ اور پنجوں سے زمین کھودنے لگا جب چھوٹا سا گڑھا کھُد گیا تو اس نے مردہ کوّے کی لاش کو اس گڑھے میں رکھ کر اُوپر سے مٹی ڈال دی۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر کائیں کائیں کرتا ہُوا اُڑ گیا۔ یہ دیکھ کر قابیل کی سمجھ میں

بات آگئی، اس نے جھٹ ایک گڑھا کھودا۔ اور اپنے بھائی کی لاش کو اس میں رکھ کر دفن کر دیا۔ زمین کھودتے وقت اس نے اپنے پنجوں کے سوا اور جس چیز سے بھی کام لیا ہوگا۔ وہ اس دُنیا کی پہلی مشین تھی۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی، انسان کی محنت بچانے والی مشینیں خود بخود بنتی چلی گئیں۔ پتھر کا زمانہ آیا پھر لوہے کا زمانہ آیا۔ یہاں تک کہ تمدن شروع ہؤا اور اپنے ساتھ بڑا ساز و سامان لے آیا۔ جس طرح آج ہم نئی نئی مشینوں کی ایجاد پر حیران ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب ابتدائی زمانے میں کسی نے اناج پیسنے کے لئے چکّی بنائی ہوگی۔ تو دُنیا دیکھ کر دنگ رہ گئی ہوگی کہ واہ رے تیرے کمال کے قربان۔ پتھر پر اناج کے دانے رکھ کر اس پر دُوسرا پتھر مار مار کر ان کا چُورا بنایا کرتے تھے تو بڑی مصیبت ہوتی تھی۔ اب کتنا مزا ہے۔ دانوں کی مٹھی بھر کر ڈال دی، ہتھے کو پکڑ کر چار پانچ چکّر دیئے اور لے لو! وہ آٹا نکل آیا۔

خیر اس قصّے کو چھوڑیئے، یہ میرے آپ کے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ان کا کیا ذکر۔ لیکن غور کیجئے کہ جو مشینیں ہم نے دیہات اور قصبوں میں اپنے بچپن کے زمانے میں دیکھی تھیں اور جو اب تک بھی موجود ہیں ان میں اور نئی مشینوں میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ باربرداری کے چھکڑے، چیں چیں کرتے ہوئے گڈے۔ چرخہ، ڈھینکلی، دھان کوٹنے کا جندر، خراس، پن چکّی، پَون چکّی، کولھو، رہٹ، کپاس کا بیلنا، دُھنیئے کی ڈھچک ڈھیں، کھدر بُننے کی کھڈی، دہی بلونے کی متھنی، یعنی ایک غیر مہذب اور غیر شائستہ گنوار دیہاتی کے ہاں بھی اتنی زیادہ مشینیں موجود ہیں، اور ان کا مقصد وہی ہے، جو آج کل کی گرانبار اور عظیم الشان مشینوں کا ہے، یعنی انسان کی محنت کو بچانا، اور تھوڑے وقت میں زیادہ کام کر لینا۔

یہ تمام مشینیں سَو فیصدی سودیشی تھیں، لیکن جب بدیشی راج آیا تو اپنے ساتھ بیسیوں اَور مشینیں لے آیا۔ مثلاً کپڑا سینے کی مشین، سوتیاں بنانے کی مشین، آیس کریم جمانے کی مشین، گوشت کا قیمہ کرنے کی مشین۔ پھلوں سے رس نچوڑنے کی مشین، جُرابیں بُننے کی مشین، کڑھائی اور زردوزی کی مشین، بال کاٹنے کی مشین، سیب چھیلنے اَور تراشنے کی مشین، دُودھ سے مکھن نکالنے کی مشین، زمین سے پانی نکالنے کا پمپ، گھڑیاں اور کلاک، غرض سینکڑوں ایسی مشینیں نکل آئیں جن سے بے شمار کام آسان ہوگئے۔ مثلاً جس قمیص کو ہاتھ سے سینے میں پُورا دن صرف ہوتا تھا۔ وُہ سینے کی مشین سے ایک گھنٹے میں تیار ہونے لگی۔ جتنی سوتیاں انگلیوں کی پوروں سے بٹ بٹ کر صبح سے شام تک تیار ہوتی تھیں۔ اتنی سوتیاں مشین کے ایک ہی گھمان میں چند منٹ کے اندر نکلنے لگیں۔

یہ تو گھریلو ضرورت کی مشینیں تھیں۔ جب چھاپے خانے قائم ہوئے تو بے شمار اور مشینیں نکل آئیں۔ چھاپنے کاٹنے کی مشین، سینے اور ٹانکے لگانے کی مشین۔ سوراخوں کی قطار بنانے والی مشین، جیسے چک بُک میں یا ڈاک کے ٹکٹوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ کاغذ کو لکیر دار بنانے کی مشین اب تک ان تمام مشینوں کو ہاتھ سے چلایا جاتا تھا۔ لیکن بھاپ کی طاقت اور بجلی کی طاقت نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔ آٹے کی مشین، چاول نکالنے کی مشین، ریل کا انجن، کرین، کپڑا بُننے کی مشین، کھانڈ بنانے کی مشین۔ دیا سلائی بنانے کی مشین، کپاس

اونٹنے کی مشین اور روئی دھننے کی مشین، سوڈاواٹر کی مشین، مرغی کے انڈوں سے چوزے نکالنے کی مشین، گراموفون یعنی گانے کی مشین ٹیلیفون یعنی باتیں کرنے کی مشین، ٹیلیگراف یعنی تار دینے کی مشین، سر کے بال دھونے اور سکھانے کی مشین۔ اور تو اور مشین گن یعنی بہت سے انسانوں کو ایک دم خدا گنج پہنچانے کی مشین، موٹرکار، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، بجلی کے زور سے چلنے والی لفٹ، پنکھے، ہیٹر، استریاں اور پچاس ہزار اور مشینیں اور میں ریڈیو مشین تو بھول ہی گیا۔

اب ذرا خیال تو فرمائیے۔ کیا ہماری زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا ہے جس میں مشین موجود نہ ہو۔ مشین کے بنے ہوئے اور مشین کے سلے ہوئے کپڑے پہن کر گھر سے نکلئے تو دروازے پر ایک مشین کھڑی ہے، جسے گاڑی یا موٹر کہتے ہیں۔ اس میں سوار ہو کر ریلوے سٹیشن پہنچیے ٹکٹ بابو کی خدمت میں مشین کے بنے ہوئے روپے پیش کیجئے۔ وہ مشین کا چھپا ہوا ٹکٹ الماری سے نکال کر تاریخ چھاپنے والی مشین میں غڑپ سے داخل کر کے آپ کے سامنے ڈال دے گا۔ ٹکٹ لے کر آپ مشین کے بنے ہوئے بوٹ سے رپ رپ کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچیے۔ جو مشین کے سیمنٹ سے بنا ہوا ہے۔ اس کے بعد ریل گاڑی میں سوار ہو جائیے، جو شروع سے لے کر آخر تک مشین ہے۔ اگر آپ کوشش کیجئے کہ اپنی زندگی کا کوئی لمحہ مشین کی مدد کے بغیر بسر کر لیں، تو میرا خیال ہے کہ یہ قریب قریب ناممکن ہے۔

ہاں ریلوے سٹیشن کی ایک اور مشین کا تو میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ سٹیشن کی ڈیوڑھی میں ایک اونچا سا لیٹر بکس کی شکل کا دیو کھڑا ہے اس کے منہ میں اکنی ڈال کر ہتی کھینچیے، تو جھٹ سے ایک پلیٹ فارم ٹکٹ نکل آئے گا۔

اب تازہ مشینوں کا قصہ سن لیجیے۔ آج کل بعض اخباروں کے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر مشینیں لگ گئی ہیں۔ دنیا بھر کی خبریں تار پر آتی ہیں۔ اور خود بخود کاغذ پر چھپتی چلی جاتی ہیں۔ اس مشین کو نہ چلانے کی ضرورت ہے، نہ تار وصول کرنے والے کی۔ ایڈیٹر صاحب اس مشین کو اپنے کمرے میں بند کر کے کہیں چلے جائیں تو جب واپس آئیں گے تاروں کا ڈھیر لگا ہوا ہوگا۔ مشین برابر چل رہی ہوگی اور تار وصول کر رہی ہوگی۔

اگر آپ کہیں جا رہے ہیں، اور اپنے سیکرٹری کو جو ابھی دفتر میں نہیں آیا، ساری ڈاک کے جواب لکھوانا چاہتے ہیں تو ڈکٹوگراف کو سامنے رکھ کر تمام چٹھیوں کے جواب بکتے چلے جائیے آپ کے تمام جواب ہو بہو اس مشین میں بھر جائیں گے۔ اب آپ تشریف لے جائیے سیکرٹری صاحب آ کر اس ڈکٹوگراف کو گراموفون کی طرح چلا کر آپ کے ہر ارشاد کی تعمیل کر دیں گے، اور آپ کو واپسی پر تمام خطوط کے جواب تیار ملیں گے۔ دستخط کر دیجئے اور ڈاک میں ڈال دیجئے۔

ایک نئی مشین "ڈکٹوفون" کے نام سے نکلی ہے۔ وہ آپ کی میز پر رکھی ہے۔ دفتر کے دس الگ الگ کمروں میں آپ کے کارکن بیٹھے ہیں۔ آپ جس سے چاہیں وہیں بیٹھے بیٹھے بات کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو سب کے ساتھ باتیں کر سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ کو یا آپ کے کارکنوں کو اپنی جگہ سے اٹھ کر کہیں آنے جانے کی ضرورت ہرگز نہ پڑے گی۔

اخباروں میں آئے دن طرح طرح کی مشینوں کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ ایک صاحب نے "مقیاس المحبت" بنایا ہے یعنی ایسی مشین جس سے محبت

ناپی جاسکے گی۔ پُرانے مذاق کی لڑکیاں کانچ کی چوڑیوں کو توڑ کر اس کے ریزوں سے سہیلیوں کی باہمی محبت کا اندازہ کیا کرتی تھیں۔ اب یہ معاملہ بھی مشین کے سپرد ہو گیا۔ اس سے چاہنے والوں اور چاہنے والیوں کی دلوں کی محبت کا پتہ چلایا جا سکے گا، ایک اور مشین بن گئی ہے وہ جس شخص کے لگا دی جائے گی وہ جھوٹ نہ بول سکے گا۔ سچی بات خود بخود اس کے مُنہ سے نکلتی جائے گی۔ اس سے چوروں اور ڈاکوؤں سے اقرارِ جُرم کرانا بہت سہل ہو جائے گا۔

ایک اور مشین آنے والی ہے جسے 'ٹیلی وژن' کہتے ہیں، اب تک تو ریڈیو پر گانے اور بولنے والوں کی آوازیں ہی سُنائی دیتی ہیں، یہ مشین آ گئی تو ان کی صورتیں بھی نظر آیا کریں گی، اور گانے والیاں صرف اپنے گلے ہی سے نہیں بلکہ نرت بھاؤ سے بھی آپ لوگوں کا دل لبھایا کریں گی۔

پچھلے دنوں چارلی چپلن کی ایک فلم دیکھی جس میں مشینوں کے اس طوفان پر طنز کی گئی تھی۔ اور ایک کھانا کھانے کی مشین کا خاکہ اُڑایا گیا تھا جو بجلی کی طاقت سے چلتی تھی۔ ایک بے حد مصروف آدمی اپنے دفتر میں بیٹھا ہے، کام کی کثرت ہے، اپنی کرسی سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر جا نہیں سکتا۔ کھانا کھانے کا وقت آ جاتا ہے۔ کھانا کھلانے والی مشین لا کر اس کی کرسی کے پاس لگا دی جاتی ہے۔ یہ مشین لقمہ تیار کر کے اس شخص کے مُنہ تک لاتی ہے اور وہ اس لقمہ کو کھا لیتا ہے، پھر دوسرا لقمہ آتا ہے اور ٹیلیفون کی گھنٹی سے اس شخص کی توجہ بٹ جاتی ہے مشین تو آخر مشین ہی ہے۔ وُہ لقمہ وہیں پھینک کر تیسرا لقمہ لینے کے لئے دُوسری طرف مُڑ جاتی ہے اور یہ شخص دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس مشین کی تیز رفتاری اور اس شخص کی بدحواسی اس قدر مزے کی تھی کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بَل پڑ پڑ گئے۔

بلاشبہ ہمارا زمانہ "مشین کا زمانہ" ہے۔ ہزارہا قسم کے کارخانے چل رہے ہیں، اور دُنیا جہان کی چیزیں اُن میں سے بن بن کر نکلتی چلی آتی ہیں، دُنیا میں کروڑوں انسان بیکار اور بے روزگار پھر رہے ہیں۔ اس لئے مشینوں نے انسانی محنت کو بہت بڑی حد تک بچا دیا ہے۔ پُرانے زمانے میں جو کام ایک ہزار آدمی ایک سال میں کرتے تھے۔ اُسے آج کل کی مشینیں صرف ایک آدھ آدمی کی مدد سے صرف ایک دن میں کر ڈالتی ہیں۔ اس میں شک نہیں، مشینوں کی وجہ سے ہر انسان کو اس کی ضرورت کی چیزیں کم قیمت پر اور آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اور انسان پہلے کی نسبت زیادہ آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن جن کروڑوں انسانوں کو مشینوں نے بیکار کر دیا ہے۔ وُہ تو دل سے چاہتے ہیں کہ خدا اِن سب مشینوں کو تباہ کر دے تاکہ ان کے پیٹ میں ٹکڑا پڑ سکے۔ لیکن ان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دُنیا ترقی کے راستے پر دوڑتی چلی جاتی ہے۔ اور کوئی طاقت اس کی رفتار کو روک نہیں سکتی۔ مشینوں کے ساتھ ہی ساتھ آدمی بھی مشین ہی بن رہے ہیں۔ میرا دل خواہ آپ سے کتنی ہی باتیں کرنے کو چاہے لیکن نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ مشین کا حکم آ گیا ہے کہ پندرہ منٹ پورے ہو گئے۔

(رسالک) (بشکریہ سٹیشن ڈائرکٹر صاحب لاہور ریڈیو) "شاہزادہ"

مطبوعات

اُردو کے سَو شعر: مکتبۂ جامعہ دہلی نے "اُردو کے سَو شعر" کے نام سے پانچ چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع کئے ہیں۔ ان سب مجموعوں کے مرتب محمود علی خاں صاحب جامعی ہیں۔ پہلا مجموعہ مختلف شعرائے متقدمین کے سَو منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ دُوسرے مجموعے میں متوسطین کے سَو اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ دو مجموعوں کا تعلق متأخرین اور دورِ حاضر کے شعراء سے ہے۔ آخری مجموعے میں قدیم و جدید شعراء کے ایسے اشعار جمع کئے گئے ہیں جو ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔

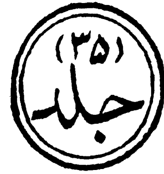
عوام کو اپنے ادباء سے روشناس کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے لیکن اس قسم کے مجموعوں کی قیمت اور بھی کم ہونی چاہیئے تاکہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے۔ ہر مجموعے کی قیمت ۴/ ہے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی سے طلب فرمایئے۔

انیسِ نسواں: شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر ایٹ لا جو کبھی مخزن کے ایڈیٹر تھے اور جنہوں نے پہلے پہل دہلی سے عصمت جاری کیا تھا پھر میدانِ صحافت میں آئے ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء سے اُنہوں نے انیسِ نسواں کے نام سے ایک بلند پایہ رسالہ جاری کیا ہے جس کا اہم ترین مقصد مسلمان عورتوں کی مذہبی و معاشرتی اصلاح ہے۔ وُہ لکھتے ہیں:۔

"یہ خوشی کی بات ہے کہ تعلیم نسواں کی ترقی جو آج نظر آرہی ہے ۱۹۰۸ء میں نہ تھی جب میں نے رسالہ "عصمت" دہلی سے جاری کیا تھا۔ مگر یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ نسوانی ترقی کی موجودہ روش کچھ پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھی جارہی۔ یہ ترقی کی اصلی شاہراہ سے دُور ہوتی جارہی ہے۔ . . . . مغرب خود اپنی موجودہ تہذیب سے مطمئن نہیں اور اس لامذہبیت سے بیزار ہے۔ مادہ پرست یورپ اب حیران ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کیا مُسلم خاتون اس تہذیب کی تقلید کرنا چاہتی ہے جس نے مذہب کو کھلونا اور نمائشی چیز بنا رکھا ہے۔ کیا مُسلم خاتون اس معاشرت کو معراجِ ترقی سمجھنا چاہتی ہے جس نے بے غیرتی اور بے حیائی میں کمال پیدا کر لیا ہے۔ جس کے نزدیک حرام و حلال میں کوئی تمیز نہیں رہی۔ کیا مسلم خاتون اس معاشرت کی نقال بننا چاہتی ہے جو گھر کی دلآویزی کو برباد کرکے ہوٹلوں اور فلم گھروں کو آباد کر رہی ہے۔ کیا مسلم خاتون اُس معاشرت کو اختیار کرنا چاہتی ہے جو آئے دن نئے سے نیا حیاسوز لباس اختراع کرتی ہے اور عورت کے جوہرِ نسائیت اور شرافت کو غارت کر رہی ہے۔"

اس اقتباس سے "انیسِ نسواں" کی حکمتِ عملی پر پوری طرح روشنی پڑ جاتی ہے۔ اس وقت تک تین پرچے ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ ترتیبِ مضامین بہت اچھی ہے اور مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔ نئے مضامین کے ساتھ بعض پرانے مضامین کے اقتباس بھی نظر آتے ہیں۔ آنریبل سر عبدالقادر بھی اس پرچے کے مضمون نگار ہیں۔ عورتوں کے لئے یہ رسالہ نہایت مفید ہے اور ان کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ بیگم محمد اکرام رسالے کی جائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ رسالے کی ظاہری صورت بھی اچھی ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے ہے لیکن ایک سستا ایڈیشن بھی چھپتا ہے۔ جس کا چندہ تین روپے ہے۔ فی پرچہ ۸ ر و ۴ ر
خواتین کو یہ پرچہ ضرور خریدنا چاہئے۔ دفتر رسالہ "انیس نسواں" دہلی سے طلب فرمائیے۔

ہونہار:۔ یہ بچوں کا ایک ہفتہ وار اخبار ہے جس کے ایڈیٹر میاں عبدالمجید بھٹی ہیں۔ یہ پرچہ ظاہری اور معنوی اعتبار سے بچوں کے مشہور اخبار "پھول" کے انداز کا ہے۔ میاں صاحب بچوں کے بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ یہ پرچہ غالباً چھ سات سال سے جاری ہے اور بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ا ر۔ دفتر رسالہ "ہونہار" ریلوے روڈ۔ لاہور سے طلب کریں۔



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ مئی ۱۹۳۹ء

تصاویر: (۱) عالمِ خیال (۲) علامۂ اقبال رح کا ایک کارڈ

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) فی پرچہ ۸/

تصحیح: گذشتہ مہینے نظم فروغِ جادہ میں یہ مصرع کتابت کے سہو سے غلط چھپا ہے ع عدم بھی اِس مرغ کا اِک جہانِ منتظر کا ہے ۔ اس کی تصحیح کرلی جائے۔

بزمِ ہمایوں

آج کل سیاست زندگی کے ہر شعبے پر بُری طرح چھائی ہوئی ہے۔ معاشرت زبان ادب مذہب سب سیاسی ہو گئے ہیں تنظیم کا بول بالا ہے یعنی جہاں پہلے ایک شخص دُوسرے کو ایک تھپڑ رسید کرتا تھا اب ہزاروں لاکھوں شخص جمع ہو کر ایک دُوسرے کو "متحدہ" گالیاں دیتے اور ایک دُوسرے پر "متحدہ" گولیاں برساتے ہیں۔

ایک قوم کو دوسری کی خوبیاں کم اور مدھم اور بُرائیاں زیادہ اور بھیانک ہو کر نظر آتی ہیں۔

اپنے اپنے کلچر کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے اپنی اپنی خالص قومی زبان کا پرچار کیا جا رہا ہے، اپنی اپنی فضا پیدا کی جا رہی ہے اپنے اپنے تہذیبی مشن کا جھنڈا بلند کیا جا رہا ہے اور اُسے انسانیت کے لئے باعثِ رحمت اور مُوجبِ امن کہا جا رہا ہے۔

اِس حال میں جبری بھرتی کی طرح ہر قوم اپنے اپنے حلقے میں جمع ہو رہی ہے کہ کب حکم ہو اور وُہ ایک دُوسرے پر ٹُوٹ پڑیں ظاہر ہے کہ یہ صُورتِ حال کسی ہوش مند اِنسان کے لئے باعثِ تسکین نہیں ہو سکتی۔

اِس ضمن میں میرے عزیز دوست میں اور مجھ میں جو تبادلۂ خیالات آج کل کی سیاسیات کے متعلق ہُوا اُس سے متاثر ہو کر لدھیانہ سے میرے ایک پروفیسر دوست نے حال میں مجھے ایک خط لکھا ہے جو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:۔

"مارچ کے 'ہمایوں' کی 'بزمِ ہمایوں' تین چار مرتبہ پہلے پڑھ چکا ہوں اور ابھی پھر اُسے پڑھا۔ نہ تو مجھ میں آپ کے عزیز دوست (جو کہ مجھے بھی عزیز تر ہیں) ایسی فلک پروازیوں کی ہمت، نہ آپ کی سی حقیقت دوزیوں کی مجھ میں اہلیت (یہ 'حقیقت دوزی' میں نے "آب دوز" کشتی کے وزن پر گھڑ لیا ہے۔ غالباً غلط ہے اور بے معنی) البتہ 'بزمِ ہمایوں' کو بار بار پڑھ کر یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ دونوں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس سے انکار مشکل ہے۔ وہ سیاست کے اُس بدنما پہلو کو رُونما کرنا چاہتے ہیں جو کہ مصلحتِ وقت، دروغ گوئی، مکر و فریب، بے انصافی و بے رحمی ایسی خباثتوں سے داغدار ہے۔ اور آپ سیاست کے اس دلپذیر اور اعلےٰ آئیڈیل کو اپنے اور دوسروں کے سامنے پیش کر رہے ہیں جس کا ظاہر و باطن راستی و عالمگیر محبت و اخلاق پر مبنی ہے۔ موجودہ سیاسی دُنیا اور سیاسی دُنیا والے اپنے عمل سے آپ کے بزرگ دوست کے نظریہ کو ثابت کرتے ہیں۔ کیا ہے جو یہ انسانی درندے نہیں کر رہے اور نہیں کرنا چاہتے؟

دِکھلاوے کے اصُولوں اور چکنی چپُڑی باتوں کی آڑ میں شاید ہی کوئی رذالت ہو جسے یہ روا نہ رکھتے ہوں؛ یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن میری روح اس گھٹا ٹوپ سیاسی اندھیرے میں بھی محض متلاشی ہی نہیں بلکہ اُس اُمید افزا سیاست کی کہیں کہیں جھلک بھی دیکھتی ہے جو آپ کی زندگی کا شعار ہے۔ دل و زبان میں عمل وخیال میں فرق کیوں ہو؛ "تغیّر" ہو لیکن اس کی بنیاد دفع الوقتی اور جھوٹ کیوں ہو؛ اختلاف ہو لیکن کینہ وتعصب پر مبنی کیوں ہو؛ نہیں۔ ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ سچ اور حقیقت کے حامی بھی میدانِ جنگ میں اُترنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن وہاں بھی اُن کا دامن ظلم وتعدّی، بے جا کشت وخون، بے پناہ کمزوروں کی غارت گری سے کبھی آلودہ نہیں ہوسکتا۔ یہ اسلحہ سازیوں کی سرتوڑ دوڑ، یہ زورِ بازو کی بے پناہ نمائش، یہ مکروفن، یہ حیلہ سازیاں فی الواقع دلیل ہیں بودے پن اور کمزوری کی۔ دلیل ہیں خود اعتمادی کے فقدان کی لیکن یہ سب کچھ مِٹ کر رہے گا۔ اور وہ سچی اخلاقی سیاست جس کا ذکر آپ نے "بزمِ ہمایوں" میں کیا ہے باوجود موجودہ ظاہری کمزوری کے زندہ رہے گی، بڑھے گی، پھلے پھُولے گی، اور اس "شیطانیت" سے بھرپور تہذیب کے کھنڈرات پر انسانی تہذیب کی عالیشان اور پُختہ عمارت کھڑی کردے گی۔ کیا یہ سب کچھ میں کسی جنوں میں بک رہا ہوں؟ کیا یہ ایک خوابِ پریشاں ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں؛ کیا یہ محض ایک خیال کی بے حقیقت دُنیا ہے اور اصل وہی ہے جس کا مکروہ منظر دُنیا کے ہر گوشہ میں نظر آرہا ہے؛ میری روح اور جسم کا ہر رونگٹا تو ان سوالوں کا جواب نفی میں دیتا ہے، آگے آپ جانیئے اور آپ کے عزیز دوست۔

"ہندوستان کی تفرقہ خیز زمین میں ہندو مسلم، کانگریس لیگ، ہندی اُردو کے تفرقات کیا کچھ کم تھے کہ اب مسلمانوں کے مختلف گروہ بھی ایک دوسرے سے پہلے سے بھی زیادہ برسرِپیکار نظر آتے ہیں۔ یہ شیعہ سُنّی کا جھگڑا کس قدر قبیح اور شرمناک ہے۔ یہ سب اُس نبیؐ کے پیرو کہلاتے ہیں جو بدترین اور بداخلاق کافر سے بھی اس بُردباری اور حلیمی سے پیش آتے تھے کہ آج بھی آنحضرت صلعم کے یہ اوصافِ حمیدہ ہر انصاف پسند شخص سے بلا امتیازِ مذہب وملّت خراجِ تحسین وصُول کرتے ہیں۔ کیا اسلام ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ دو؛ کیا رحمۃٌ للعلمین کی زندگی ہمارے سامنے یہی نمونہ پیش کرتی ہے؛ کیا کسی بُرے آدمی کو بھی سربازار بھلا بُرا کہنا شریف انسان کے شایانِ شان ہے؛ کسی کی تعریف کرنا بُرا نہیں لیکن اس دکھلاوے کی تعریف سے کیا حاصل جس سے کسی دوسرے بھائی کے دل کو چوٹ لگے؛ دو بُرائیاں کبھی ایک نیکی کے مترادف نہیں ہوسکتیں۔ کتنی قحط الرجالی ہے اس اُمّتِ مرحومہ میں؛ یو۔ پی تو ایک طرف، تمام ہندوستان بھر میں ایک ایسی ہستی

مسلمانوں میں موجود نہیں جو محض خدا واسطہ، ہر قربانی و ایثار کرکے ان لکھنؤ کے دونوں گروہوں پر واضح کر دے کہ ان کا یہ رویہ کسی طور بھی ان کی دنیاوی یا دینی فلاح و بہبود کا موجب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ دونوں اغیار کی مضحکہ خیزی کے سامان مہیا کر رہے ہیں۔ مجھے اس تمام معاملہ میں پرلے درجہ کی جذباتی مشکلات کا پورا احساس ہے لیکن ساتھ ہی میرا پکا ایمان ہے کہ ایک بے لوث، ایثار و محبت سے بھرا ہوا، حق بات کہنے والا اور محض حق سے ڈرنے والا مسلمان ضرور اس دردناک گتھی کو سلجھا سکتا ہے۔ لیکن ابھی ہم میں شاید ایسا مسلمان پیدا نہیں ہوا۔ ہوگا ضرور، ہو کر رہے گا ضرور کیسی شرمناک ہے یہ بات کہ ہم اس یا کسی اور معاملہ کے تصفیہ کے لئے دوسروں کے دست نگر ہوں۔ میرے ایک نہایت نیک دوست کی رائے ہے کہ اس بدترین جہالت اور موت کی سی غفلت سے بیدار ہونے کے لئے ہمیں ایک مسولینی یا ہٹلر کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انہیں یہ کہتے ہوئے درد محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی قوم کی حالت کو قریب قریب لاعلاج تصور کرتے ہوئے ایسا علاج پیش کرتے ہیں۔ لیکن میں اس امید پر جیتا ہوں کہ ایک اپنی فاتح عالم محبت کے سیلاب کے سامنے سب رکاوٹوں کو بہا لے جانے والا، اپنی خودی سے باخبر، دوسروں کے دروازہ سے بے نیاز، ایک محمد کے نقش قدم پر چلنے والا یعنی

ایک سچا مسلمان

اگر آج ہم میں موجود ہو تو پھر جلد ہی دنیا "رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کی شان کا نظارہ دیکھ لے۔

"ان حروف سے کسی کی دل شکنی ہرگز مقصود نہیں۔ میں کسی پر اعتراض نہیں کر رہا محض اپنی روح کی کمزوریوں کی جھلک اپنے عام دوسرے بھائیوں میں بھی دیکھ رہا ہوں۔"

آپ کا راہ گم کردہ
لیکن لَا تَقْنَطُوا .... پر ایمان رکھنے والا
سعادت

ہر مسلم اور غیر مسلم ان خیالات سے متفق ہوگا۔

بشیر احمد

جہاں نما

جدید ایشیا کا پشتیبان

"نیو ایشیا" کی پہلی اشاعت میں کمال اتاترک کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر سبھاش چندر بوس نے انہیں ایشیائے جدید کا دیوتا اور پشتیبان کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ایسی سوانحعمریاں بہت کم ہونگی جنہوں نے میرے دل میں ٹرکی کے اس عظیم الشان فرزند کی سوانحعمری کی طرح عقیدت و احترام اور ولولہ پیدا کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ مہذب دُنیا میں کوئی ایسا مرد یا عورت نہیں جو اس عظیم الشان آدمی کی یاد میں اپنا سر فرطِ عقیدت سے جھکا نہ دے۔ آج سے چار سال پہلے جب میں بخارسٹ سے استنبول کی طرف روانہ ہُوا تو میرے دِل میں ایک یاتری کی طرح عقیدت کے جذبات موجزن تھے۔ میں اپنی آنکھوں سے ٹرکی میں اس عظیم الشان انسان کے مصلحانہ کارناموں کے نتائج دیکھنے کیلئے بیقرار تھا۔ استنبول کے گنبدوں، میناروں، شاخ زریں کے حسن اور باسفورس کے دلکش نظارے سے میں اتنا متاثر نہ ہُوا جتنا استنبول کے بازاروں میں آزادی یافتہ عورتوں اور مردوں کو اِدھر اُدھر چلتے پھرتے دیکھ کر۔

ہوائی جہاز سے اُترتے ہی جو پہلی بات مجھے نظر آئی وہ یہ تھی کہ استنبول کی عورتیں اور مرد بھی ویسے ہی تھے جیسے بخارسٹ، وائنا یا صوفیا کے۔ ٹرکی کی عورتیں اس اطمینان اور وضع داری کے ساتھ پھرتی ہوئی نظر آتی تھیں کہ انہیں دیکھ کر آدمی پر یہ اثر پڑتا تھا کہ یہ صدیوں سے اسی آزادی کی خوگر ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ آزادی جنگِ عظیم کے بعد ہی حاصل ہوئی ہے۔ چونکہ ٹرکی نے رومن رسم الخط اختیار کر لیا ہے اس لئے مجھے وہاں کے بازاروں کے نام اور دُکانوں کے تختوں کی عبارت پڑھنے میں کوئی دِقت محسوس نہ ہوئی۔

ہم سب کمال اتاترک کی عظمت سے کم و بیش واقف ہیں۔ وہ تاریخ میں صرف ٹرکی کے ایک عظیم الشان فرزند ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس صدی کے ایک عظیم الشان انسان کی حیثیت سے بھی زندہ رہے گا۔ اُس نے مغربی حکومتوں کے استبداد سے اپنے ملک کو آزادی دلائی۔ اس کے علاوہ ٹرکی کو قدامت پرستانہ طرزِ حکومت سے نجات دلا کر ایک نئی ترقی یافتہ حکومت بنا دیا۔ پھر یہ سب کچھ اس سُرعت سے ہو گیا کہ ہم اسے تاریخِ جدید میں ایک معجزے کی حیثیت دے سکتے ہیں۔ اُس کی انقلابی روح کی عظمت صرف میدانِ جنگ ہی کی رہینِ منت نہیں بلکہ قوم کی نشأۃ الثانیہ کے لئے اس نے جو تعمیری کام کیا ہے وہ بھی بے مثال ہے۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے

کہ اُس نے ایک ہی جماعت کے ساتھ حکومت کا کام چلانے کی کوشش کی۔ "یک جماعتی" کا یہ طریقہ اب مغربی حکومتوں میں عام ہے۔ روس، جرمنی اور اِٹلی میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یک جماعتی حکومت کا طریق اچھا ہے یا بُرا، یہ ایک دُوسرا سوال ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ مصطفےٰ کمال نے اپنے مُلک میں اس کا تجربہ کیا اور اگر نتائج سے کسی چیز کے متعلق فیصلہ کیا جاسکتا ہے تو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مطلق العنان آمریت اور یک جماعتی نظامِ حکومت کی مبرہن قباحتوں کے باوجود جدید ٹرکی کو اس سے بے اندازہ فائدہ پہنچا ہے۔

مصطفےٰ کمال صرف ایک بڑا جرنیل ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک بڑا مصلح بھی تھا۔ قومی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی طرف اُس نے توجہ نہ کی ہو۔ ۱۹۳۴ء میں جب مَیں وائنا میں تھا تو مجھے یاد ہے کہ کمال نے وہاں کے ایک بہت بڑے موسیقی دان کو ترکی موسیقی کے فن کی تہذیب و تجدید کے لئے اپنے مُلک میں بُلایا تھا۔

میری رائے میں کمال کی زندگی اور اُس کے کارنامے نہ صرف اُس کے اہلِ ملک کے دلوں میں بلکہ دوسری قوموں کے لوگوں کے دلوں میں بھی جوشِ عمل اور حُبِ وطن کا جذبہ پیدا کرتے رہیں گے۔ اُس ٹرکی میں جسے مصطفےٰ کمال نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے، تمام قوموں اور بالخصوص ایشیائی قوموں کے لئے ایک سبق ہے۔

آریائی ثقافت کی بنیادیں

آنریبل مسٹر کے ایم منشی نے دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں آریائی ثقافت کی حسبِ ذیل امتیازی بُنیادیں قرار دی ہیں:۔

آریائی ثقافت (کلچر) کی پہلی بنیاد "ایسی خاندانی زندگی" ہے جو نہایت زبردست آباپرستانہ روایات پر مبنی ہو۔ اس کے قدرتی تقاضے کے طور پر عورت کی پاکدامنی لازمی سمجھی جاتی ہے تاکہ نہ صرف نسل بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ثقافت کی پاکیزگی قائم رہے۔

اس نظام کو جسے معاشری ارتقاء نے پیدا کیا ہے آریائی ثقافت نے خاص اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس کا تقاضا ہے کہ:۔

(ا) باپ کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے نہ صرف خود اُسی کا احترام ملحوظ رکھا جائے بلکہ دیدوں اور پرانوں کے زمانے کے "حاملِ صفاتِ ربّانی" مورثِ اعلےٰ تک تمام آباؤ اجداد کی جذباتی طور پر پرستش کی جائے۔ اس کے علاوہ تین متصلہ پشتوں تک اولادِ ذکور میں اشتراکِ مفاد بھی باپ کے احترام کا ضامن بنایا گیا ہے اور:

(ب) ماں اور باپ (یعنی بیوی اور شوہر) کے رشتے کو قطعی اور ناقابلِ انفکاک حیثیت دی گئی ہے۔

بعض قدیم ممالک مثلاً یونان و روما میں بھی پہلے نظریہ کی پیروی کی گئی لیکن ہندوستان میں ان دونوں نظریوں کو یکساں اہمیت

حاصل رہی ہے۔ چنانچہ مذہبی رسموں، تہواروں، عقاید اور قوانین کی تشکیل میں اُنہیں بڑا دخل رہا ہے۔

آریائی ثقافت کی دوسری اہم بنیاد ایک اس قسم کی معاشرہ ہے جو مختلف انسانوں کی ایسی ناقابلِ افتراق اور باہم محتاج جماعتوں پر مشتمل ہو جن کی تقسیم اپنے فرائض کے لحاظ سے عمل میں آئی ہو۔

(ا) اُونچی عقل اور تخیّل کی مالک جماعتیں۔

(ب) تنظیم و تحفّظ کے کام کی اہل جماعتیں۔

(ج) دولت پیدا کرنے اور تقسیم کرنے والی جماعتیں۔

(د) معاشرہ کی ضروری خدمات انجام دینے والی جماعتیں۔

معاشرہ کی تنظیم کا خیال جغرافیائی حدود سے بے نیاز تھا۔ ہر شخص کے متعلق خیال تھا کہ وہ اپنا سوادھرم یعنی قدرتی میلان اور منصب لے کر پیدا ہوا ہے۔

یہ ہے ورن آشرم کا تصوّر۔ چاروں جماعتیں کیا تھیں۔ ایک ہم آہنگ کل کے باہم محتاج اجزا۔ معاشرہ چاروں جماعتوں کے ایک ایسے اشتراک کا نام تھا جو دھرم کے احکام کے مطابق معاشرہ کے اس الہامی نظام کو قائم رکھ سکے۔

آریائی تہذیب کی تیسری بنیاد آریا ورت کے تقدّس پر غیر متزلزل ایمان ہے جس میں قدما کا غیر فانی احترام بھی شامل ہے تاکہ آریا ورت ایک "ابدی کُل" بن کر زندہ رہے۔

ویدوں پر اعتقاد کے ذریعہ سے تاریخی تسلسل کا ایک قوی احساس پیدا کیا گیا ہے۔ وید انسانی ذہن کی ہر تخلیق کے اوّلیں محرّک قرار دیئے گئے ہیں اور اُنہوں نے ہر دَور اور ہر نسل کے لوگوں کے لئے زندگی اور تاریخ کے اتحاد کا ایک زندۂ جاوید مرقع پیش کیا ہے۔

اِس غرض کے لئے آریاورت کے ساتھ سنسکرت کو بھی ملانا پڑتا ہے جو صرف ایک کامل اور ترقی یافتہ زبان ہی نہیں بلکہ آریاؤں کے ثقافتی تصوّرات کا ایک جیتا جاگتا مظہر بھی ہے۔ ہمیں نظم و نثر کے غیر فانی نمونوں میں ایک آریا ورت ہر مہذب آریائی گھرانے کی زندگی اور رُوح کے جال میں گُتھا ہُوا نظر آتا ہے۔

مِسز چیمبرلین

مِسز نیول چیمبرلین ایسی بیویوں کی صف میں ایک ممتاز جگہ کی مستحق ہے جن کی مدد اور حوصلہ افزائی سے اُن کے شوہر

زندگی میں کامیابی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچے ہیں۔ حال ہی میں ایک تقریر کرتے ہوئے وزیرِ اعظم نے ان الفاظ میں اپنی بی بی کو خراجِ تحسین ادا کیا :-

"کسی سیاست دان پر اُس کی رفیقۂ حیات کے اتنے احسانات نہیں جتنے مجھ پر ہیں۔ میری بی بی کو میری کامیابیوں پر دلی مسرت ہوتی ہے۔ وُہ مایوسی کے وقت میری حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اور ضرورت کے وقت اپنے مشوروں سے میری رہنمائی کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے خطرات سے متنبہ کرتی ہے اور کبھی ایسا موقع نہیں آنے دیتی کہ مَیں سیاسیات میں انسانیت کے جوہر کو بھول جاؤں۔ وہ میرے ہر راز کی محرم رہی ہے اور اُس نے کبھی کوئی راز افشا نہیں کیا۔"

ہندوستانی لنگوا فرینکا

پادری سی الیف اینڈرُوز نے ہریجن میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں اُنہوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان سے باہر رہنے والے ہندوستانیوں میں ہندوستانی زبان بہترین لنگوا فرینکا کا کام دیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گھر میں بولی جانے والی مادری زبان کے علاوہ صرف ایک اَور ایسی زبان ہے جو اپنی مختلف صُورتوں اور تحریفات کے ساتھ ایک لنگوا فرینکا کے طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔ اس زبان کو ہم ہندوستانی کہہ سکتے ہیں بشرطیکہ یہ ایسی صُورت میں استعمال ہو کہ کوئی شخص اسے خالص ہندی یا خالص اُردو نہ کہہ سکے۔ حالانکہ یہ انہیں دونوں زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے۔ اس زبان میں بہ طور لنگوا فرینکا کے بے شمار انگریزی الفاظ بھی شامل ہو گئے تھے۔ جب میں پہلے پہل فجی گیا تو وہاں زبان کی یہی حالت تھی۔ لیکن آریا سماج کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ اب وہاں کی ہندوستانی خالص اور قواعدِ زبان کے مطابق ہو گئی ہے۔

برٹش گیانا اور ٹرینیڈاڈ میں بنیادی زبان ہندی رہی ہے کیونکہ اکثر آبادکار یو۔ پی سے گئے ہیں اور ہندو ہیں۔ ٹرینیڈاڈ میں ہندی کی تعلیم کا انتظام اچھا ہے لیکن برٹش گیانا میں اس کا کوئی انتظام نہیں۔ وہاں مادری زبان کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ برٹش گیانا میں ہندوستانی زبان کے معلّموں کو اس کام کے لئے جانا چاہیئے۔"

حامد علی خاں

منتخبات

شعر گفتن گرچہ دُر سُفتن بود — لیک فہمیدن بہ از گفتن بود

مکرم و محترم حضرتِ حامد! تسلیم

قدر دانیٔ "فہمِ سخن" کا شکریہ! بزمِ "ہمایوں" سے طویل غیر حاضری کی معذرت کے ساتھ مندرجۂ ذیل انتخاب پیش کرتا ہوں:-

دلدادگانِ شعر و ادب کو مژدہ کہ میں "ہمایوں" میں اپنے انوکھے انتخابات کا سلسلہ از سرِ نو شروع کر رہا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ یہ دلچسپ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ اور اس سلسلے کا ہر انتخاب اپنی طرز میں لاجواب ہوگا۔

گذشتہ انتخابات کے متعلق خاکسار کو متعدد اصحاب کے تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ ان کرمفرماؤں کی خدمت میں بہت بہت شکریے کے بعد گزارش ہے کہ یہ سب خدا کی دین ہے۔ ورنہ میں کیا ہوں بقولِ داغ ع "شوق ہے دادِ خدا۔ ذوق ہے امدادِ خدا"

خاکِ پائے ادیباں رحل

میری بیاض

حسبِ حال

(۱)

ہر چند نہیں کوئی نکما مجھ سے — پھر بھی لیتی ہے کام دُنیا مجھ سے

ہوں صُورتِ حرفِ ربطِ مہمل، لیکن — جُملے کو ہے احتیاجِ معنے مجھ سے

ثاقب بدایونی

(۲)

ماموں، ملا ہوں اور خطر میں ہوں میں — منزل میں پہنچ کے رہگذر میں ہوں میں

ہوں رشتۂ تسبیح کا دانہ گویا
اپنے گھر میں ہوں اور سفر میں ہوں میں

عبدالباری آسی

حفیظ (ہوشیارپوری) کو نصیحت

حفیظ! اِک عمر اِس دُھن میں پڑا ہے خونِ دل پینا
بڑی مشکل سے دُنیا میں سخن کی دھوم ہوتی ہے

حفیظ جونپوری مرحوم

حفیظ! اس سینہ کاوی سے تمہیں حاصل یہی ہوگا
کہ حاصل کچھ نہ ہوگا شاعرِ رنگیں بیاں ہوکر

حفیظ جالندھری

راحل کی تمنّا

جنّت نظر آئے گی ہر اِک منزلِ دُشوار
ہمراہ ہو تُو اور سفر روئے زمیں ہو

حامد علی خاں

ہمراہ ہو تم، کاش کبھی ختم نہ ہو راہ!
صد حیف اگر طے سفرِ ہر دو جہاں ہو!!

حامد علی خاں

کچکول

شائستہ پاسخ

لگ گئی چُپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

داغ

میری خاموشی کا باعث پُوچھئے مجھ سے نہ کچھ
یہ حقیقت اپنی چشمِ سُرمگیں سے پُوچھئے
داغ

لگ گئی چُپ حالیؔ رنجور کو
حال اُس کا کس سے پُوچھا چاہیئے
حالی

کر دیا چُپ واقعاتِ دہر نے
ورنہ تھی ہم میں بھی گویائی بہت
حالی

دو آتشہ

(از میخانۂ اقبال)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
"بانگ درا"

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں
"زبورِ عجم"

بگو اقبال را اے باغباں رخت از چمن بندد
کہ ایں جادو نوا ما را ز گل بیگانہ می سازد
"پیامِ مشرق"

اقبال کی نوا سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو
"ضربِ کلیم"

راحل ہوشیار پوری

قطرہ و دریا

چھا گئی وادی و کہسار پہ خاموشیٔ شام
عشرتِ گوش بنا نغمہ سے دریا کا خرام

دامنِ چرخ سے اب تک تھی شفق لالہ فروش
رگِ خورشید سے تھا غربِ فلک خوں آشام

دُور اُفق پر تھا کہیں موج زن اِک چشمۂ نور
جس کے اِک گھونٹ سے سرشار ہوا ماہِ تمام

لے گیا ساحلِ دریا پہ مجھے ذوقِ نظر
پرتوِ نور سے تھا ایک جہاں آئینہ فام

لبِ دریائے رواں مست ہوا جاتا تھا
میرے دریائے خیالات کی موجوں کا خرام

اسی عالم میں کہ بیدار نہ تھا میں گویا
مجھ سے قطرے تھے مخاطب بہ زبانِ الہام:

"تُو نے پایا نہیں سرچشمۂ ہستی کا سراغ
"ہم کو دریا میں فنا ہو کے مِلا عیشِ دوام
"یہی انجام ہے قطرے کا یہی ہے آغاز
ہے ابھی بے خبر آغاز سے تیرا انجام"

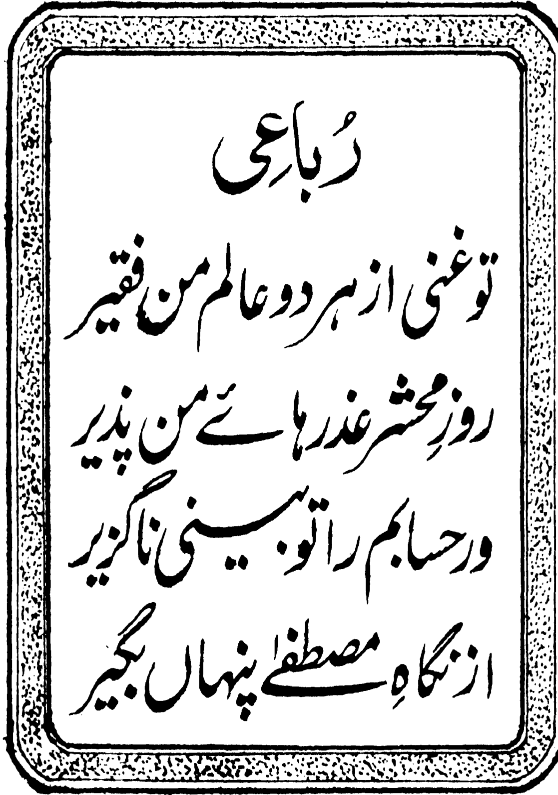
حامد علی خاں

علامۂ اقبالؒ کی شعر بخشی

جنابِ مدیر "ہمایوں"

حکیم الامت علامۂ مرحوم کے ایک خط کی عکسی تصویر اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اس خط میں علامۂ مرحوم کی ایک رباعی بھی ہے جو ان کے طبع شدہ مجموعۂ کلام میں موجود نہیں۔ اس قسم کی ایک اور رُباعی البتہ آپ نے کہی ہے جو ارمغاں کے صفحہ ۲۳ پر درج ہے۔ اس رُباعی سے ایک دلچسپ داستان وابستہ ہے۔ جو میں ذیل میں لکھ رہا ہوں:۔

"یہ رُباعی مولوی محمد ابراہیم صاحب پی۔سی۔ایس حال سب جج گوجرانوالہ نے محمد رمضان صاحب ایم۔اے متوطن ڈیرہ غازی خاں کے سامنے پڑھی۔ محمد رمضان صاحب صوفی منش آدمی ہیں۔ رباعی کا اثر اُن کے دل پر گہرا ہوا۔ رباعی سُن کر آپ گرے اور چوٹ کھائی جس سے آپ بیہوش ہو گئے۔ آپ علامۂ مرحوم کے در دولت پر حاضر ہوئے اور التجا کی کہ رُباعی مجھے بخش دی جائے۔ نیز یہ بھی کہا کہ میں وصیت کرونگا کہ رباعی مرنے کے بعد میرے ماتھے پر لکھ دی جائے زیادہ اصرار کرنے پر علامۂ مرحوم نے کمال فیاضی سے رباعی بخش دی اور وُہ بھی اس طرح کہ اپنے کلام میں چھپنے بھی نہ دی۔



اس رباعی کی عکسی تصویر جج صاحب مذکور کے قبضے میں ہے۔ میں نے وُہ رباعی عاریتاً لے کر اس کی تصویر کھنچوائی ہے اور آپ کو بغرض اشاعت بھیج رہا ہوں۔ یہ رباعی علامۂ مرحوم کے کرم کی زندہ مثال ہے۔

آپ کا مخلص ایم۔ آئی۔ ملک ایم ایس سی

معتمد مجلسِ اُردو گوجرانوالہ

سفید تتلی

تتلیوں کے متعلق اکثر جاپانی کہانیوں کا ماخذ چین ہے لیکن آج میں ایک ایسی کہانی سناتا ہوں جو غالباً باہر سے نہیں آئی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشرقِ اقصےٰ "رومانی محبت" کے تصوّر سے محروم ہے لیکن یہ کہانی اس خیال کو باطل ثابت کردے گی۔

دارالسلطنت کے مضافات میں سوزنجی کے قبرستان کے پیچھے مدت سے ایک چھوٹی سی الگ تھلگ عمارت کھڑی تھی۔ اس میں ایک بوڑھا آدمی ٹاکاہاما نامی رہتا تھا۔ آس پاس کے لوگ یوں تو اُس کے پسندیدہ اطوار کے باعث اُس کی بہت عزت کرتے تھے لیکن اس کے باوجود تقریباً ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اُس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔ جب تک کوئی شخص بھکشو نہ بن جائے دوسروں کو اس سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ شادی کرکے ایک کنبے کی پرورش کرے گا۔ لیکن ٹاکاہاما نہ تو مذہبی مبلّغ بنا اور نہ شادی کرنے پر آمادہ ہوسکا۔ یوں بھی کبھی کسی عورت سے اُس کی محبت کا کوئی قصّہ نہیں سُنا گیا تھا اور اُسے بالکل تنہا رہتے ہوئے بھی پچاس برس سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔

ایک سال موسمِ گرما میں جب وُہ بیمار ہُوا تو اُس کے دل نے گواہی دی کہ اب میری زندگی کا چراغ گُل ہونے کو ہے۔ اُس وقت اُس نے اپنی بیوہ بھاوج اور اُس کے اکلوتے بیٹے کو بُلا بھیجا۔ لڑکے کی عُمر بیس سال کے قریب تھی اور ٹاکاہاما کو اُس سے بہت اُنس تھا۔ وہ دونوں فوراً اُس کے پاس چلے آئے اور اُنہوں نے بوڑھے کی زندگی کے آخری دنوں میں اُسے تسکین دینے کے لئے کوئی ممکن کوشش اُٹھا نہ رکھی۔

ایک نہایت گرم سہ پہر کو جب بیوہ اور اُس کا بیٹا ٹاکاہاما کے بستر کے قریب بیٹھے تھے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اُسی وقت ایک بہت بڑی سفید تتلی کمرے میں داخل ہوئی اور مریض کے تکیے پر آبیٹھی۔ بھتیجے نے اُسے پنکھے سے اُڑا دیا لیکن تتلی فوراً واپس آکر پھر تکیے پر بیٹھ گئی۔ جب دو چار مرتبہ لڑکے کی کوشش اکارت گئی تو وہ تتلی کو بھگانے کے لئے اُس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ گھر سے نکل کر باغ میں اور باغ سے گزر کر ایک دروازے کی راہ سے وہ پاس کے قبرستان میں جا پہنچا۔ تتلی برابر اُس کے سامنے اس طرح اُڑتی رہی گویا وہاں سے جانا نہیں چاہتی۔ اُس کا طرزِ عمل ایسا عجیب تھا کہ لڑکے کو شُبہ ہونے لگا کہ یہ تتلی نہیں کوئی بد روح ہے چنانچہ وہ پھر اُس کے پیچھے دَوڑا اور قبرستان کے اندر دُور تک چلا گیا۔ اُس وقت تتلی ایک خوش وضع قبر کے مقابل اُڑ رہی تھی۔ یہ ایک عورت کی قبر تھی۔ یہاں پہنچ کر تتلی یکایک پُراسرار طور پر غائب ہوگئی اور لڑکا دیر تک بیکار اُس کی تلاش کرتا رہا۔ آخر مایوس ہوجانے کے بعد اُس نے قبر کے کتبے کا معاینہ شروع کیا۔ اُس پر ایک نامانوس خاندانی نام کے ساتھ عورت کا ذاتی نام اکیکو لکھا تھا۔ عبارت کے پڑھنے سے معلوم ہُوا کہ اکیکو اٹھارہ برس کی عمر میں مری تھی اور یہ قبر پچاس برس قبل بنائی گئی تھی۔ اگرچہ اب اس پر کائی

جم رہی تھی لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت اچھی طرح نگہداشت ہوتی رہی ہے۔ اس پر تازہ پھول پڑے تھے اور پانی کا حوض بھی تازہ تازہ بھرا گیا تھا۔

بیمار کے کمرے میں واپس پہنچنے پر نوجوان کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ اُس کے چچا کا انتقال ہو چکا ہے۔ مرنے والے نے بہت اطمینان کی حالت میں جان دی تھی اور اُس کے چہرے پر اب تک مسکراہٹ کے آثار نظر آرہے تھے۔

جب لڑکے نے اپنی ماں سے قبرستان کا واقعہ بیان کیا تو وہ بولی "اوہو تو پھر وُہ ضرور اکیکو ہو گی"۔

لڑکے نے کہا" اماں لیکن اکیکو تھی کون ؟"

بیوہ نے جواب دیا" جن دنوں تمہارے مرحوم چچا جوان تھے، اُن کی نسبت ایک ہمسائے کی خوبصورت لڑکی اکیکو سے ٹھہری تھی۔ شادی کی تاریخ سے کچھ دن پہلے اکیکو مر گئی، تمہارے چچا کو اپنی منگیتر کی موت سے سخت صدمہ پہنچا اور اُس کے دفن ہو چکنے کے بعد اُنہوں نے قسم کھائی کہ میں اب کبھی شادی نہ کروں گا۔ چنانچہ اکیکو کی قبر کے نزدیک رہنے کے لئے اُنہوں نے قبرستان کے پاس ہی یہ چھوٹا سا مکان بنا لیا۔ اس واقعے کو پچاس برس سے اُوپر مدت گزر چکی ہے، ان پچاس برسوں کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب تمہارے چچا نے جاڑے اور گرمی میں یکساں، قبر پر جا کر دُعا نہ مانگی ہو، وہاں جھاڑو نہ دی ہو اور قبر پر پھول نہ چڑھائے ہوں۔ تمہارے چچا اس واقعے کے متعلق کسی قسم کا ذکر نہیں سُننا چاہتے تھے اور نہ خود اُنہوں نے کبھی اس کی طرف اشارہ کیا تھا ..... سو آخرکار اکیکو اُن کے خیر مقدم کو آگئی: وہ سفید تتلی اُسی کی رُوح تھی "۔

(ترجمہ از" کوانڈان") ــــــــ **حامد علی خاں**

اطمینان

آہ سادہ لوح تتلی
کوئی تجھے پکڑنے کے درپے بھی ہو
لیکن تُو مضطرب نظر نہیں آتی۔

روح

گلابی پھول پر
ایک سفید تتلی بیٹھی ہے
خدا جانے یہ کس کی رُوح ہے؟

(جاپانی اشعار)

سکوتِ گورستاں

نظارہ کر چکا جب مَیں خزاں دیدہ گلستاں کا
لیا تنہا وہاں سے راستہ شہرِ خموشاں کا

یہاں آکر وہاں کا ڈھب بُھلا دینا پڑا مجھ کو
ادب ملحوظ ہے آسودگانِ خاک کا مجھ کو

اسی عالم میں یاد اپنے کئی احباب کی آئی
بڑھا احساسِ غم اتنا کہ کھو دی تابِ گویائی

کیا تھا جن عزیزوں کو سپردِ خاک خود مَیں نے
غضب ہے، مرقد اُن کے بھی تو پہچانے نہیں جاتے

یہ دن کا وقت، سناٹا یہاں ہے رات کا اب بھی!
اندھیرا ہی ہے مشہودات پر چھایا ہُوا اب بھی!

نظر دیتی نہیں کام آہ غم کی حد بتاؤں کیا
مَیں ان سوئے ہوؤں کو دردِ دل اپنا سناؤں کیا

سکوتِ آمود مرقد رنگ اپنا یہ جماتے ہیں
کہ ہنس مکھ پھول بھی یاں آکے ہنسنا بھول جاتے ہیں

نظر آؤں نہ ایسے انقلابوں پر بھی حیراں میں؟
یہ میرے ساتھ ہنسنے بولنے والوں کی قبریں ہیں!!

اگر مانع نہ ہوتی پاسِ عبرت کی ہم آغوشی
مجھے آمادۂ فریاد کر دیتی یہ خاموشی

علی منظور حیدر آبادی

تشکیک کی اہمیت

ایک اصول میں آپ کی ہمدردانہ توجہ کے لئے یہاں پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جب تک کسی قضیہ کو صحیح باور کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو تب تک اس کا یقین نہ کیا جائے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ اسے تخریبی اصول نہ قرار دیں کیونکہ بظاہر سادہ اور معقول ہوتے ہوئے یہ ایک ایسا اصول ہے کہ اگر کبھی غلط طور سے اس پر عمل کیا جائے تو ہمارے سیاسی اور عمرانی نظامات (جنہیں بحالات موجودہ بے عیب ہونے کا دعوےٰ ہے) یکسر بدل جائیں اور پھر یہ بلند بانگ لیڈر، یہ لمبی داڑھی والے مُرشد، یہ بڑی توند والے مولوی، یہ کرایہ سے لکھنے والے ادیب اور یہ ستاروں کو انسانوں سے ملانے والے نجومی جن کی زندگیاں عوام کی غیر عقلی اُمیدوں پر تیر ہوتی ہیں بھوکوں مرنے لگیں، لیکن اس کے باوجود مجھے اپنے اصُول پر اصرار ہے۔

لیکن میں کوئی انتہا پسند مشکک نہیں پر ہو کے جیسا جو فلسفہ تشکیک کا مؤسسِ اولیں ہے اور جس کا خیال تھا کہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عمل کا ایک طریقہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ معقول یا حکیمانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس اصُول کو اُس نے عمر بھر نباہا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ اوائل عمر میں سرِ شام چہل قدمی کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا اُستاد جس کے روبرو اُس نے فلسفہ کے لئے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا ایک گڑھے میں بے طرح پھنسا ہُوا ہے اور کسی طور نکل نہیں سکتا۔ صورت حال پر اس نے انہماک آمیز سنجیدگی کے ساتھ کچھ دیر غور کیا اور پھر یہ کہتے ہوئے چل کھڑا ہُوا کہ یہ باور کرنے کی کوئی کافی وجہ موجود نہیں کہ بوڑھے آدمی کو نکالنا نہ نکالنے کے مقابلہ میں کوئی اچھا کام ہے۔ دوسروں نے جو اتنے مشکک نہ تھے بیچارے کی جان بچائی اور پر ہو کو بہت سخت سُست کہا لیکن اُستاد آخر پر ہو کا اُستاد تھا وہ کیسے اپنے اصُول کی توہین گوارا کر سکتا اس نے سب کے سامنے شاگرد کے کردار کی استقامت کو سراہا۔

لیکن مجھ میں اتنی رُستمانہ بسالت نہیں اور اسی لئے اعتدال مجھے زیادہ عزیز ہے چنانچہ میں فہم عامہ کے جملہ معمولی یقینیات کو نظری نہیں تو عملی اعتبار سے تو ضرور مانتا ہوں پھر مجھے سائنس کا ہر مسلمہ نتیجہ قبول و منظور ہے کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ اس سے ہمارے اعمال کے لئے معمولی اساس بہم پہنچتی ہے۔ اگر مجھ سے کہا جائے کہ فلاں تاریخ کو چاند گہن ہوگا تو میں ضرور یہ دیکھوں گا کہ وُہ واقع ہو رہا ہے یا نہیں پر ہو کا رویّہ اس سے بالکل مختلف ہوتا اور اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ میری تشکیک معتدل ہے۔

محققین (یعنی وہ محترم ہستیاں جو انسان اور فطرت کا بڑی کاوش کے ساتھ مطالعہ کر رہی ہیں) بعض امُور پر باہم کُلّی اتفاق رکھتے ہیں اور بعض پر نہیں جن پر انہیں کُلّی اتفاق ہوتا ہے ان کے بارے میں بھی وُہ بلا شُبہ غلطی پر ہو سکتے ہیں مثلاً تجاذب کے انحراف نو

کی قدر کے متعلق آئن سٹائن کے نظریہ کو آج بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے لیکن پینتیس چالیس سال اُدھر کوئی یہی خیال ظاہر کرتا تو ماہرین کرام نہایت سختی سے اس کا رد کرتے بایں ہمہ ماہروں کی متفقہ آرار کا ماننا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان کی صحت بمقابلہ عدم صحت کے زیادہ اغلب ہوتی ہے۔ یوں میں جس تشکیک کی یہاں وکالت کر رہا ہوں اس کا لبِّ لباب یہ ہے (۱) کہ جب تمام ماہر کسی چیز کو بالاتفاق تسلیم کرتے ہوں تو لازم ہے کہ مخالف رائے کو یقینی نہ باور کیا جائے۔ (۲) یہ کہ جب ان کا آپس میں اختلاف ہو تو غیر ماہر کی رائے کو ہرگز سند کا درجہ نہ ملے اور (۳) یہ کہ جب وہ یہ کہتے ہوں کہ کسی ایجابی رائے کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں تو عوام کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ خاموش رہیں کوئی رائے قائم نہ کریں۔

یہ اصول جو دیکھنے میں بہت معمولی نظر آتے ہیں ایک دُور رس انقلاب برپا کر سکتے ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے۔ انہیں آزمایا جائے۔

لوگ عام طور پر جن آراء کے لئے لڑتے جھگڑتے اور جور و جبر کرتے ہیں وہ تمام اُوپر کی تین قسموں میں سے ایک نہ ایک کے تحت آجاتی ہیں۔ جب کسی رائے کی تائید میں معقول وجوہ موجود رہتی ہیں تو پھر عوام باہم لڑتے نہیں بلکہ صرف ان وجوہ کو پیش کر دیتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں لیکن وہ آرار جو پُرجوش طریقے سے مانی جاتی ہیں اپنے پیچھے کبھی کوئی قوی دلیل نہیں رکھتیں۔ اصل میں جوش علامت ہے معقولیت کے فقدان کی یعنی جو رائے جتنی جوشیلی ہوگی اتنی ہی کم معقول ہوگی۔ سیاسی اور مذہبی رائیں عموماً جذباتی اور جوشیلی ہوتی ہیں، اور اسی لئے جمہور اپنی مخالف آرار کے پُرجوش وُکلار سے اتنی نفرت نہیں کرتے جتنی کہ وہ متشککین سے کرتے ہیں کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ عملی زندگی تحکمیت کی طالب ہے اور اگر ہم ضرورت سے زیادہ معقول پسند بن جائیں تو عمرانی نظام کا قیام محال ہو جائے۔ میں اس کے عکس کا قایل ہوں اور یہاں یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ کیوں ہوں۔

اشتراکیت کے خلاف بیشتر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی فطرت کے منافی ہے اور جو کسی اشتراکی سے اس بارے میں آپ رائے لیں تو وُہ اس قول کی بڑے شد و مد سے نفی کرے گا لیکن ان میں سے کوئی خیال حکیمانہ نہیں۔ مرحوم ڈاکٹر ایورز غالباً وُہ پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع سے ایک اصولی انداز میں بحث کی ہے۔ اس نے اپنے ایک خطبہ میں جو اس کی کتاب نفسیات اور سیاسیات میں شریک ہے۔ پہلے تو چند انسیاتی حقائق پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اشتراکیت میلے نیشیا میں انسانی فطرت کے منافی نہیں اور پھر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ انسانی فطرت یورپ میں ویسی ہی ہے جیسی کہ وہ میلے نیشیا میں ہے لہذا یہ پتہ چلانے کے لئے کہ کہیں اشتراکیت اس کے منافی تو نہیں یہ ضروری ہے کہ ہم اسے آزما کر دیکھیں۔ یہاں یہ بتلانا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ ایورز اپنے اس استاج کی بنا پر یہ چاہتا تھا کہ لیبر پارٹی (حزب عمّال) کی طرف سے بحیثیت اُمیدوار کے کھڑا ہو لیکن یہ بالکل یقینی تھا کہ وُہ اپنی حکیمانی ذہنیت کی بدولت اس حدت و جوش کے اظہار سے قاصر رہتا جو سیاسی بحث آرائیوں کی خاص خصوصیت ہے۔ میدانِ سیاست کے شہسواروں کو ایسی باتیں قطعاً پسند نہیں ہوتیں جو ہیجان یا جوش نہیں پیدا کرتیں اور عوام بھی ایسی ہی

رائیوں کو وقعت اور ترجیح دیتے ہیں جو یہ باور کراتی ہوں کہ خراب حالیاں دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہیں لہٰذا وہ بالکل بے تعلق امور کی تائید یا تردید میں باہم دست و گریباں ہوا کرتے ہیں اور ان چند اشخاص کی کوئی نہیں سُنتا جو معقول پسند ہیں کیونکہ انہیں جذبات سے اپیل کرنا یا کھیلنا مناسب نہیں دکھائی دیتا۔

اس سے زیادہ پُرپیچ مسئلہ شادی بیاہ کا ہے۔ ہر مُلک کی آبادی کا بڑا حصّہ یہ سمجھتا ہے کہ جو طریقہ شادی کا اس میں رائج ہے وہی جائز اور مستند ہے اور باقی تمام طریقے جو دُنیا میں پائے جاتے ہیں یکسر غیر صحیح بلکہ حرام ہیں۔ اب جو لوگ ان غیر صحیح طریقوں کی حمایت کرتے ہیں وہ اصل میں اپنی بے راہی پر پردہ ڈالتے ہیں۔ ہندوؤں میں طلاق اور بیواؤں کا نکاحِ ثانی ناجائز ہے، کاتھولکی ممالک میں آخر الذکر کی تو اجازت ہے مگر اول الذکر کی سختی سے مذمّت کی جاتی ہے اور اس جوش میں ازدواجی بے وفائی تک کو انگیز کر لیا جاتا ہے، امریکہ میں طلاق سستی ہے مگر غیر ازدواجی تعلّقات کی سختی سے ممانعت ہے۔ مسلمانوں میں آوارگی بدترین گناہ ہے لیکن طلاق مہنگی ہے۔ ہندو اور مسلمان رسم چند زنی (تعددِ ازواج) کے قائل ہیں جسے مغرب میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تمام معارض اور متناقض آرا، انتہائی قوّت وشدّت کے ساتھ مانی جاتی ہیں اور جو کوئی ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وُہ بدترین عقوبت کا سزاوار شمار کیا جاتا ہے لیکن ان ممالک میں سے کسی کے باشندوں نے بھی آج تک یہ ثابت نہیں کیا کہ جو طریقہ شادی بیاہ کا ان کے ہاں رائج ہے وہ بمقابلہ دیگر رواجات کے انسانی مسرّت میں کچھ مزید اضافہ کرتا ہے۔

اب اگر آپ شادی کے موضوع پر کوئی عالمانہ کتاب (مثلاً ایڈورڈ ویسٹر مارک کی تصنیف ازدواجِ انسانی کی تاریخ) ملاحظہ کریں تو معلوم ہو کہ دُنیا میں ہر قسم کا رواج موجود ہے اور ان میں سے بعض رواجات تو ایسے ہیں کہ محض اُن کے تصوّر سے گھن آتی ہے مثلاً چند شوئی کا رواج یعنی ایک عورت کا وقتِ واحد میں کئی شوہر کرنا جو جنوبی ہند کے بعض قبائل اور تبّت میں پایا جاتا ہے تاہم سیّاحوں کا بیان ہے کہ وہاں ازدواجی زندگی ویسی ہی خوشگوار، پُرلطف اور ہم آہنگ ہے جیسی کہ وہ یک زنی یا چند زنی ممالک میں ہے بنا بریں میرا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ بے لاگ اشخاص کو آسانی کے ساتھ تشکیک کامل میں مبتلا کر سکتا ہے کیونکہ یقین کے ساتھ تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شادی کا ایک رواج دُوسرے کی بہ نسبت بہتر یا بدتر ہے۔ نکاح کے ان تمام رواجوں میں کوئی شے مشترک نہیں سوائے اس کے کہ ہر قومی یا مقامی ضابطہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ظلم اور تعصب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ گناہ ایک جغرافیائی چیز ہے، آپ اس سے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تصوّر ہی سرے سے پُر فریب ہے اور یہ کہ اس کی سزا میں جو بیدردی اور سفّاکی برتی جاتی ہے وُہ بالکل غیر ضروری ہے لیکن یہ استنتاج بہتوں کے مُنہ کا مزا کڑوا کر دے گا کیونکہ مستند ماہرانِ اخلاق فرماتے ہیں کہ نیک نیتی کے ساتھ جور وستم کرنا ایک پسندیدہ فعل ہے اور اسی لیے اُنہوں نے متعدد دوزخ آباد کیے۔

مشتبہ امُور کے متعلق تیز و تُند یقینیات کی غالباً سب سے سخت مثال قوم پرستی ہے۔ آج اگر کوئی شخص انصاف اور اصُول کے ساتھ جنگِ عظیم کی تاریخ مرتّب کرے تو وُہ ایسے خیالات اس میں درج کرے گا جو اگر دَورانِ جنگ میں ظاہر کئے جاتے تو یقیناً ہر جگہ واجب التعزیر قرار پاتے۔ دُنیا میں کوئی مُلک ایسا نہیں جہاں کے باشندے اپنے متعلق کھری کھری باتیں کُشادہ پیشانی کے ساتھ سُن سکتے ہوں معمولی حالات میں حق بات کا اظہار صرف ایک ناشائستہ حرکت شمار ہوتا ہے لیکن حرب وضرب کے زمانے میں وُہ جرم بن جاتا ہے۔ لوگ پُر تشدد یقینیات کے متناقض نظامات ترتیب دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح ہیں حالانکہ ان کی لغویت صرف اس سے آشکار ہے کہ ان کے قایل ہمیشہ ایک ہی قوم و ملک کے افراد ہوتے ہیں نظر بریں جب عامۃ النّاس سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان معاملات میں عقل سے کیوں نہ رجوع کیا جائے تو وہ غرورِ عقل پر ہنستے ہیں اور ایک ایسے لہجے میں جس سے کھوکھلا پن صاف ٹپکا پڑتا ہے یہ کہتے ہیں کہ اساطیر جنگوں کی فتح میں مدد دیتے ہیں یعنی یہ کہ معقول پسند قوم قتل ہو جائے گی قتل نہیں کرے گی۔ اس پر اگر یہ کہا جائے کہ ایسی قوم لڑنے ہی کیوں چلی وُہ تو ایسے طریقے معلوم کرلے گی جن سے جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا تو جواب گالی کی صُورت میں ملتا ہے جو لاجوابی کا ایک مکروہ مظہر ہے۔

اب اگر کوئی یہ پُوچھے کہ معتدل تشکیک کی اشاعت سے ہوگا کیا؟ تو میں عرض کروں گا جی کچھ نہیں صرف انسانی معاملات میں بصیرت پیدا ہوگی، جذبات سے انسانی حوادث پیدا ہوتے ہیں اور انسانی حوادث سے اساطیر۔ جس شخص کی کبھی انتہائی تذلیل ہو چکی ہو وہ آگے چل کر بطور تلافی کے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ قیصرِ ہند ہے اور جملہ شاہانہ تعظیم وتکریم کا مستحق لیکن یہ مغالطہ چونکہ بدقسمتی سے شخصی ہوتا ہے اور لوگوں کی ہمدردی اسے حاصل نہیں ہوتی لہٰذا ہز امپیریل مجسٹی کو پولیس والے پاگل خانہ پہنچا آتے ہیں لیکن بجائے ذاتی عظمت کا راگ الاپنے کے اگر وُہ اپنی قوم یا مِلّت کی بزرگی کا مدّعی ہو تو لوگ جوق در جوق اس کے زیرِ علم جمع ہونے لگتے ہیں اور وُہ یوں سیاسی یا مذہبی لیڈر بن جاتا ہے حالانکہ ایک غیر جانبدار اجنبی کے لئے اس کے دعوے وَیسے ہی مہمل ہوتے ہیں جیسے کہ پاگلوں کے۔ واقعے میں افراد اور اقوام کے جنونوں میں کوئی فرق نہیں دونوں سے لڑنا خطرناک ہے۔ پہلی صُورت میں شخصی مضرت کا ڈر ہے اور دُوسری صُورت میں جنگِ عالمگیر کا لہٰذا لوگ ان سے گھبراتے ہیں۔

ہمارے کردار میں تعقّل کا حصّہ کتنا ہوتا ہے اس کی تشخیص کے لئے ہمیں امُورِ ذیل پر غور کرنا چاہئے۔ (۱) یہ کہ یقینیات کس حد تک اعمال کی علّت ہوتے ہیں؛ اور (۲) یہ کہ وُہ کہاں تک مکمّل شہادت سے ماخوذ ہو سکتے یا ہو سکتے ہیں؟ آئیے اِن پر اسی ترتیب سے نظر کریں۔

۱۔ یقینیات کس حد تک اعمال کی علّت ہوتے ہیں؛ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر نظری طور پر بحث یہاں بیکار ہے لہٰذا میں حیاتِ روزمرہ سے ایک گرم مثال پیش کرتا ہوں۔ زید متوسّط طبقہ کا ایک عملی انسان ہے وہ روزانہ سویرے اُٹھتا ہے مُنہ ہاتھ

دھوتا ہے ناشتہ کرتا ہے اور دفتر جاتا ہے، یہ تمام کام وُہ یقین کی مداخلت کے بغیر محض عادت کی بنا پر انجام دیتا ہے لیکن ماضی میں ایک وقت ایسا تھا جب کہ اس نے یہ عادتیں اختیار کیں اور یہ وقت وُہ تھا جب اس نے اپنے لئے ایک سررشتہ منتخب کیا، غالباً اُس وقت اسے یہ یقین تھا کہ جو سررشتہ اس نے پسند کیا ہے وُہ اس کے لئے سب سے موزوں ہے، یوُں ذریعۂ معاش کے انتخاب میں عموماً یقین کو بڑا دخل ہوتا ہے اور اسی لئے بے خوف وخطر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنی باتیں اس پسند سے بالطبع لازم آتی ہیں ان سب میں یقین بالواسطہ کارفرما ہوتا ہے۔

اب اگر ہمارا دوست کوئی منشی کوئی ادنیٰ عہدہ دار ہے تو اس کے تقریباً جملہ افعال عادت پر مبنی ہونگے یعنی ان میں فعلی ارادہ یا یقین کی کوئی علامت موجود نہ ہوگی۔ یہاں آپ یہ فرما سکتے ہیں کہ تختہ جات کی خانہ پُری میں اسے جن حسابی اُصُولوں سے مدد لینی پڑتی ہے ان پر وہ واقعتہً یقین رکھتا ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ یہ ایک کھلی غلطی ہے کیونکہ یہ حسابی اصُول کرکٹ یا ٹینس کے اصُولوں کی طرح اس کے جسم کی عادات ہیں جنہیں اس نے بچپن میں اس لئے اختیار کیا کہ ان سے مولوی صاحب یا پنڈت جی خوش ہوتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تمام تعلیم اسی قسم کی ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مکتب کی یا ابتدائی تعلیم بیشتر ایسی ہی ہوتی ہے۔

لیکن اگر وُہ کوئی اعلیٰ افسر ہے تو دن بھر میں اسے کئی مشکل فیصلے کرنے ہوتے ہیں جن میں یقینیات کا واضح حصہ ہوتا ہے، یوں اس کا کردار چونکہ عادات سے زیادہ یقینیات کے زیر اثر ہوتا ہے لہٰذا اس کا رتبہ بھی منشی سے بڑا ہوتا ہے اور وہ مشاہرہ بھی منشی سے زیادہ پاتا ہے۔

سرکاری زندگی کی طرح خانگی زندگی میں بھی یقینیات اعمال کی اس وقت علّت ہوتے ہیں جبکہ مواقع اہم ہوں مثلاً شادی کرنی ہو یا بچّوں کو مکتب میں بٹھانا ہو یا بیوی یا لڑکی کا چال چلن مشتبہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ ورنہ عام حالات میں تو زید کا برتاؤ اپنی بیوی اور بچّوں کے ساتھ عادت پر مبنی ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ شادی یا شُبہ کے مواقع پر زید کا کردار جبلّی بھی ہو سکتا ہے لیکن یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ جبلّت ہمیشہ یقین کی وجہ سے حرکت میں آتی ہے، یوں یقین ہر تبعی چیز کی علّتِ اوّلیں ہے۔

پس یقینیات اگرچہ واضح طور سے ہمارے اعمال کے ایک چھوٹے سے جزو کے ذمہ دار ہوتے ہیں لیکن یہ بظاہر چھوٹا سا جزو دراصل اہم اس قدر ہوتا ہے کہ ہماری زندگیاں بنتی اور بگڑتی اِسی سے ہیں اور بالخصوص ہمارے سیاسی اور مذہبی اعمال کی کٹھ پُتلیاں تو یکسر یقینیات کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔

۲۔ اب دُوسرے تنقیح طلب امر کو لیجئے جو صرف دو اجزا پر مشتمل ہے (ا) یہ کہ یقینیات فی الواقع شہادت پر کہاں تک مبنی ہوتے ہیں اور (ب) یہ کہ انہیں کہاں تک ہونا چاہئے یا وُہ کہاں تک ہو سکتے ہیں۔

(ا) یقینیات عام طور سے شہادت پر بہت کم مبنی ہوتے ہیں ہرچند آپ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے یقینیات مبنی شہادت پر ہیں لیکن اصل

میں وُہ نہیں ہوتے۔ انسان بیمہ کے معاملات میں کتنا محتاط اور معقول ہوسکتا ہے ظاہر ہے لیکن دیوالیوں کے حالات کا اگر آپ گہری نظر سے مطالعہ کریں تو بربادی کی وجہ ہمیشہ کسی نہ کسی جذباتی عنصر ہی کو پائیں گے۔ سیاسی اسرار تو کبھی شہادت پر مبنی نہیں ہوتیں، سول سروس والے البتہ اس کلیہ سے مستثنےٰ ہیں لیکن زبان ان کی بند ہے۔

فراست کو تعلق ہماری فطرت کے غیر شعوری حصہ سے ہے، وُہ زندگی اُور کاروبار میں کامیابی کے لئے بے حد ضروری ہے اور اگرچہ اخلاقی نقطۂ نظر سے کوئی بلند صفت نہیں کیونکہ ہمیشہ خود غرض ہوتی ہے تاہم اس کی وجہ سے انسان بہت سے مہیب جرائم سے بچ جاتا ہے۔ اگر یہ صفت جرمنوں میں ہوتی تو وُہ ہرگز تحت البحری مہم وسیع پیمانہ پر آغاز نہ کرتے اگر وہ فرانسیسیوں میں ہوتی تو رُوہر Rohr میں ان کا رویّہ بالکل مختلف ہوتا اور اگر وُہ نپولین میں ہوتی تو ایمائنز (Amiens) کے معاہدہ کے بعد وُہ کبھی تلوار نہ اُٹھاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب لوگ اپنی اغراض کا صحیح اندازہ کرکے اقدام کرتے ہیں تو اَوروں کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ وُہ اس وقت پہنچاتے ہیں جب کہ اپنی اغراض کے متعلق غلط رائے قائم کرتے ہیں اور کوئی غلط طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں۔ یوں وُہ چیز جو انسان کو اپنی اغراض کے متعلق بہتر رائے قائم کرنے میں مدد دے حقیقت میں اچھی ہے۔ بعض سوداگر مذہبی یا اخلاقی وجوہ کی بنا پر یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ ہر گاہک سے الگ الگ معاملہ کریں لہٰذا وُہ ایک نرخ مقرر کئے دیتے ہیں جس میں منافع کم سے کم ملحوظ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اِن کی اغراض کے صریحًا خلاف ہے لیکن ان کی اس طرز سے چونکہ خریداروں کو سہولت بہم پہنچتی ہے لہٰذا وہ ان کی طرف ڈھل پڑتے ہیں اُور بہت جلد اُنہیں متموّل بنا دیتے ہیں۔ فراست کہتے اسی کو ہیں لیکن ہر شخص فریس نہیں ہوتا۔ ہمارا عدیم الشعور بہت خبیث بہت بدباطن ہے لہٰذا جو لوگ مذہبی یا اخلاقی وجوہ کی بنا پر عمدًا اپنے مفاد کے خلاف جاتے ہیں اصل میں اپنے مفاد کی طرف بڑھتے ہیں، ان کے بعد وُہ لوگ ہیں جو اپنی اغراض کے بارے میں ایک معقول رویّہ اختیار کرنے اور جذبات کے اثر کو ممکن حد تک کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سب سے آخر میں نمبر اُن کا ہے جن میں خباثت فراست سے بے حد متجاوز ہے اور جو دوسروں کی تباہی کے ایسے طریقے سوچتے ہیں جن سے وُہ خود تباہ ہوجاتے ہیں۔ دُنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اسی قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔

غالبًا آپ یہ خیال کریں گے کہ میں اپنے موضوع سے کچھ ہٹ گیا لیکن میں کہوں گا کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا اس لئے کہ مجھے یہ بتانا تھا کہ شعوری عقل اور غیر شعوری عقل یعنی فراست میں بیّن فرق ہے۔ تعلیم کے مروّجہ اسالیب کو عدیم الشعور پر کوئی دسترس نہیں، لہٰذا فراست سکھائی نہیں جاسکتی۔ اخلاق کا بھی یہی حال ہے۔ میں نے بہتیرے خطیبوں اور واعظوں کو گلے کی رگیں پھُلا پھُلا کر اور داڑھیوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر پند و نصیحت کرتے دیکھا ہے لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کی مسلسل سمع خراشی کا حاضرین پر کوئی خوشگوار اثر مترتب ہُوا ہو۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ترقی کے غیر عقلی ذرائع سے ہاتھ اُٹھا کر صرف عقلی ذرائع پر اپنی توجہ مرکوز کردیں۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ افراد کو نیک یا فریس ہونے کی تعلیم کیسے دی جاسکتی ہے لیکن یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہیں یہ سکھایا جاسکتا ہے کہ انسان معقول کیسے

ہو سکتا ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ سرِ باب ہیں مروّجہ تعلیمی روایات اور آرا کو اُلٹ دیا جائے۔ اس کے بعد یہ ہو سکتا ہے کہ ہم بعض غدود کو سلیقہ سے استعمال کر کے اور ان کے افرازات کو حسبِ مرضی روک کر یا اُکسا کر نیکی پیدا کر لیں لیکن بحالاتِ موجودہ نیکی سے زیادہ آسان معقولیت پیدا کرنا ہے۔

(ب) لیکن سوال یہ ہے کہ معقولیت ممکن یا مستحسن کہاں تک ہے؛ میرا خیال ہے کہ عقل کی حدود متعین ہیں اور یہ کہ زندگی کے بعض نہایت اہم شعبے اس کی دراندازی سے برباد ہو جاتے ہیں۔ لائب نز کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے پچپن سال کی عمر میں ایک خاتون سے شادی کی درخواست کی جس نے غور کے لئے کچھ مُہلت چاہی۔ اِس مُہلت نے خود لائب نز کو سوچنے کی مُہلت دی اور اس نے اپنی درخواست واپس لے لی، ہر چند اس کا یہ طرزِ عمل حد درجہ معقول تھا لیکن اسے مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔

شاعر، عاشق اور پاگل خیال پرستی کے تین مختلف مظاہر ہیں، اور ہم میں سے ہر فرد چونکہ لازماً خیال پرست ہے لہٰذا مدارج کے فروق کے ساتھ شاعر بھی ہے، عاشق بھی ہے اور پاگل بھی ہے لیکن شاعر اور عاشق کی خیال پرستیاں مضر نہیں، برعکس اس کے پاگل یکسر زحمت اور زیاں ہے، بنا بریں ضرور ہے کہ ہم اپنے میں کے شاعر اور عاشق کو تو برقرار رکھیں لیکن پاگل کو ختم کر دیں۔ آپ سینما اور تھیٹر تو ضرور جاتے ہوں گے لہٰذا دردناک اور الم انگیز مناظر یقیناً آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ ایسی صُورت میں آپ نے خود بھی اپنی آنکھوں کو اور اپنے ساتھیوں کی آنکھوں کو نمناک پایا ہوگا؛ یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ تمثیل نگار اس وقت اپنے میں کے شاعر اور عاشق سے اپیل کرتا ہے لیکن اِدھر کھیل ختم ہُوا اور آپ تھیٹر سے باہر نکلے اور اُدھر پاگل جو اِس اثنا میں نیند میں مصروف ہوتا ہے آنکھیں مَل کر بیدار ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے ہی واقعات آئے دِن یا تو ہم ہوتے دیکھتے ہیں یا پھر خود ان میں حصّہ لیتے ہیں اور کوئی افسوس محسوس نہیں کرتے۔ تھیٹر میں دردمند اور نیک دِل انسان دم بھر میں پہلے کی طرح حیوان بن جاتا ہے۔

لیکن کیا ہم اپنے میں کے شاعر اور عاشق کو برقرار رکھ کر پاگل کو ختم کر بھی سکتے ہیں؛ میں کہوں گا کہ ہاں، کیونکہ مجھے یہ علم ہے کہ ہماری جبلّی یا فطری توانائی کی نکاس معقول افعال میں نہیں بلکہ محبّت اور نفرت میں ہوتی ہے۔ محبت ہمیں اپنی اور اپنے بال بچّوں کی ذوات سے ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ہم ان کی صیانت اور بقا چاہتے ہیں اور نفرت ہمیں اپنے دشمنوں سے ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ہم ان کی تباہی و بربادی کے متمنّی ہوتے ہیں۔ محبّت سے فنونِ لطیفہ پیدا ہوتے ہیں اور نفرت سے مسابقت، وطن پرستی اور جنگ، لیکن جدید صنعتی تہذیب اور اس کے رواجی اخلاق نے محبّت کو تو متعفّن، محدود اور مقیّد کر دیا اور نفرت کو پوری طرح پُھولنے پھلنے کی اجازت دی۔ یوں ان چیزوں پر قیود اور بندشیں عاید کی گئی ہیں جنہیں آزاد اور خلّاق ہونا چاہیئے اور حسد، ظلم، بغض، تشدّد اور عناد کو کھلے بندوں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن معقول پسند تہذیب اور اس کے حقیقی اخلاق کا فعل اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ ہم جن سے محبّت کرتے ہیں ان کے ساتھ اپنے برتاؤ کو بے خوف و خطر جبلّت کے سپرد کر سکتے ہیں۔ البتہ جن سے ہمیں نفرت ہوتی ہے ان کے ساتھ ہمارا

سلوک عقل پر مبنی ہونا چاہئے۔ آج کل ہم جن سے نفرت کرتے ہیں وُہ یا تو ایسی جماعتیں ہیں جو ہم سے بالکل الگ تھلگ رہتی ہیں یا پھر اجنبی اقوام۔ ہر صورت میں ہم ان کے متعلق نظری طور پر رائیں قائم کرتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری نفرت آمیز حرکات علل یا اسی قبیل کے دیگر بلند محرکات کا نتیجہ ہیں۔ تشکیک ان مغالطوں کو دُور کر سکتی ہے اور بنا بریں ایک ایسے اخلاق کی تعمیر میں مدد دے سکتی ہے جو بغض و عناد کی بجائے "جیو اور جینے دو" کی مرنجاں مرنج پالیسی پر مبنی ہوگا۔ اس احساس پر مبنی ہوگا کہ اگر ہم اپنے ہم جنسوں سے بُغض و حسد چھوڑ دیں تو وُہ بجائے دُشمن ہونے کے ہمارے بھائی ہمارے قوتِ بازو ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی خیالی اُمید نہیں۔ یہ آج متحقق ہو سکتی ہے، بشرطیکہ جملہ انسان ایک دُوسرے کے درپئے آزار رہنے کی بجائے ذاتی مسرت کی تلاش کریں۔ آج ہماری دُنیا رواجی اخلاق کی کڑی اصُول پرستی سے جہنم زار بنی ہوئی ہے لیکن وہی فردوس بن سکتی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم ایسے معاشروں کی تخلیق کریں جو جدید اخلاق کے پابند ہوں۔

(ترجمہ) مرزا محبوب بیگ

انجن

نالے کرتا ہے، آہ بھرتا ہے | کیا یہ انجن کسی پہ مرتا ہے؟
آگ سینے میں ہے دبائے ہوئے | رازِ اُلفت ہے کیا چھپائے ہوئے؟
طیش میں ہے کہ خوف کھاتا ہے | یوں لرزتا ہُوا جو جاتا ہے

رُوسیاہی رقیب کی سی ہے
بے نیازی حبیب کی سی ہے

ظفر اعظمی

شبانِ عہدِ موسیٰؑ

ایک چرواہا کسی جنگل میں تھا
یا مہِ کامل کوئی بادل میں تھا

یادِ مولیٰ میں ہمیشہ مست تھا
آسماں جس کی زمیں پر پست تھا

یاد کرتے کرتے تھک جاتا تھا جب
چیخ اُٹھتا درد سے با صد تعب

سر اُٹھا کر اپنا سُوئے آسماں
عرض کرتا "اے خدائے دوجہاں

"تُو مری کُٹیا میں کیوں آتا نہیں
کیا مِرا جنگل تجھے بھاتا نہیں

"آ، اُتر آ، عرش سے گھر میں مرے
پاؤں دھو دھو کر پیوں گا مَیں ترے

"کپڑے دھو دھو کر تجھے پہناؤں گا
مَیں تجھے پہلے کِھلا کر کھاؤں گا

"بھیک، در در مانگوں گا تیرے لئے
مَیں ہُوں تیرا، اور تُو میرے لئے

"تیرے قدموں پہ گروں گا رات دن
مَیں ترے صدقے پھروں گا رات دِن

"مَیں تری زُلفیں سنواروں تار تار
کنگھی بالوں میں کروں گا بار بار

"رات دن جھولا جھلاؤں گا ترا
صبح اُٹھ کر مُنہ دُھلاؤں گا ترا

"بانسری اپنی سناؤں گا تجھے
زخمِ دِل اپنا بتاؤں گا تجھے

"میں کہوں گا" اے مرے دلدار سُن قصۂ مہجورِ دل افگار سُن!

"بشنو از نے، چوں حکایت می کند

"وز جُدائی ہا شکایت می کند"

کرتا تھا چرواہا یُوں ہی شور و شر حضرتِ موسیٰؑ بھی جا نکلے اُدھر

سُن کے چرواہے کی یہ لاف و گزاف کُفر اور الحاد تھا جو صاف صاف

حضرتِ مُوسیٰؑ کو غصّہ آ گیا ڈانٹ کر بولے کہ "ہیں، بکتا ہے کیا؛

"کُفر سے تُو نے جہاں کو بھر دیا نُورِ مطلق کو مجسّم کر دیا

"کِس قدر کم بخت تُو بے باک ہے خاک ہے ایسی سمجھ پر خاک ہے

"کِس قدر نادان اور بھولا ہے تُو رب کو بھی اپنی طرح سمجھا ہے تُو

"جب ترے ایماں میں یہ اندھیر ہے کُفر نازل ہونے میں کیا دیر ہے

"تُو ضرور اس کُفر کا پھل پائے گا

غیرتِ حق سے ابھی جل جائے گا"

سُن کے چرواہا یہ مُوسیٰ کا عتاب ہو گیا دِل سوختہ مثلِ کباب

موم کی صُورت پگھل کر رہ گیا طُور کے مانند جل کر رہ گیا

طائرِ سدرہ کا شہپر جل گیا ۔۔۔ یا پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا
اپنی نادانی سے وُہ شرما گیا ۔۔۔ ایک سناٹا سا اُس پر چھا گیا

چُپ ہوُا ایسا، کہ گویا کھو گیا
وُہ خدا کے خوف سے بُت ہو گیا

کر چکے موسیٰ جب اس کو دل حزیں ۔۔۔ وحی آئی حضرتِ حق سے وہیں
"آہ، تیری گفتگو نے کیا کیا ۔۔۔ کیا کیا موسیٰ یہ تُو نے کیا کیا
"ابنِ عمراں! آہ تُو نے کیا کیا ۔۔۔ کر دیا بندے کو مالک سے جُدا
"تجھ کو بھیجا جوڑنے کے واسطے ۔۔۔ تُو نہیں تھا توڑنے کے واسطے
"ہوشیاروں کا طریقہ اَور ہے ۔۔۔ دل جلوں کا اَور ہی کچھ طور ہے
"لفظ و صُورت سے نہیں ہی ہم کو کام ۔۔۔ ہم تو دِل کو دیکھتے ہیں لاکلام
"دِل شکستہ دِل سے ہم کو کام ہے ۔۔۔ ٹُوٹ کر بھرتا ہے' یہ وُہ جام ہے

"دِل جلوں کے دِل میں رہتا ہے خُدا
ہاں اسی منزل میں رہتا ہے خُدا"

(ترجمہ) احمد حسین امجد

گلاب کا پھول

"تو عطیہ تم نمائش دیکھنے کشمیر نہ جاؤ گی؟ میں محض تمہیں لینے کے لئے یہاں آئی تھی۔"

عطیہ نے اپنے لمبے سیاہ بال جو اُس کے ملیح گالوں پر بکھر رہے تھے درست کرتے ہوئے کہا "نہیں خالہ"

اس کی خالہ نے خفگی کے لہجہ میں کہا "خدا معلوم تمہیں مری کی کونسی ادا پسند ہے، دِن رات بادِل چھائے رہتے ہیں جب دیکھو رم جھم مینہ برس رہا ہے۔ کمرے میں بیٹھے ہوں تو بھی کھڑکیوں اور دروازوں سے ابر کے تاریک ٹکڑے اندر گھس آتے ہیں اور ہر چیز کو بھگو دیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ کشمیر کے سرور انگیز مناظر اور صحت بخش آب و ہوا پر تم یہاں کی نم آلود پہاڑیوں کو کیوں ترجیح دیتی ہو؟"

عطیہ نے سنجیدہ انداز سے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اِس لئے کہ یہاں مجھے خلوت میسّر ہے۔ میں چمنستان کی رنگینیوں اور محفل کی دلچسپیوں کی بہ نسبت اپنے کمرے کی تنہائی میں زیادہ خوش رہتی ہوں۔ آپ میرے ظاہری حالات اور اندرونی جذبات کو جانتے ہوئے بھی کیوں بار بار مجھے دُنیا کے ہنگاموں میں شرکت کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سچی خوشی دِل کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور جب وہی مجروح ہو جائے تو اس کو لالہ زاروں اور گلبنوں میں تلاش کرنا بے سُود ہے۔"

معزز خاتون نے ایک نظر اُس کے خوبصورت مگر اُداس چہرے کی طرف دیکھا اور پھر شفقت بھرے لہجہ میں کہا "بیٹی عطیہ میں تمہاری مصیبت اور تمہارے غم و الم سے بخوبی واقف ہوں مگر ساتھ ہی یہ خیال میرے لئے سخت ذہنی تکلیف کا باعث ہے کہ اُس کمبخت کی یاد میں جو دو سال ہوئے تمہیں اپنی نئی دُلہن کی محبت میں فراموش کر چکا تم زندگی کے بہترین ایام اس طرح سوگوار بن کر کاٹ دو۔ اُس نے کس سرد مہری اور بے اعتنائی سے تمہاری محبت کو ٹھکرا دیا اور تمہارے ارمانوں بھرے دِل کو شباب کی گوناگوں مسرتوں سے محروم کر دیا۔ تم بھی اُسے بھول جاؤ۔ گزرے ہوئے زمانہ کے تصوّر میں اپنے مستقبل کو تباہ و برباد کر لینا نادانوں کا شیوہ ہے۔"

عطیہ نے کچھ دیر سکوت کے بعد جواب میں کہا "مگر میری زندگی ماضی ہی کا دُوسرا نام تو ہے۔ حال یا مستقبل کے الفاظ تو اس عورت کے نزدیک بامعنی ہو سکتے ہیں جو اُس کی محبت کی دولت سے مالا مال ہے۔ شاید وُہ اس کی مستحق ہو گی، مجھ سے زیادہ حسین اور چاہنے والی ہو گی۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

اس کی خالہ نے اپنا غصّہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہو گی ۔۔۔ مگر تم سے بڑی ہوں اور مرد کی فطرت کو زیادہ

اچھی طرح جانتی ہوں۔ حامد جیسے متلون مزاج اور خود پسند شخص کے دِل میں کسی کی محبّت گھر نہیں کر سکتی۔ وہ صرف اپنے آپ سے محبّت کر سکتا ہے اور حُسن کو بھی فاتحانہ نگاہوں سے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ تم دیکھ لوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یکلخت دروازہ کھُلا اور ایک فربہ اندام عورت ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

عطیہ نے مستفسرانہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے فاطمہ ؟"

خادمہ نے جواب دیا "حضور ثریا بیگم آپ کو یاد کر رہی ہیں، صبح سے اُن کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ہے"۔

"اُن سے کہو مَیں ابھی آئی"۔

یہ کہہ کر عطیہ باہر جانے کے ارادے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی خالہ نے پوچھا "یہ ثریا بیگم کون ہے ؟"

عطیہ نے دروازے کے پاس ٹھیرتے ہوئے جواب دیا "اس کے مفصّل حالات سے مَیں خود ناواقف ہوں۔ باتوں سے اِتنا معلوم ہُوا کہ لاہور کی رہنے والی ہے اور ہمارے شہر میں بیاہی ہوئی ہے۔ یہاں آئے بیس پچیس دِن ہوئے ہوں گے۔ اِسی کوٹھی کی دوسری منزل میں مقیم ہے۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ پہلی ہی ملاقات سے میرے دل کو موہ لیا۔ افسوس کہ بیچاری دِق کے مرض میں"

"آہ !" بے اختیار اس کی خالہ کے مُنہ سے نکلا

عطیہ مغموم آواز میں کہنے لگی "مَیں اس کو دیکھ کر اپنا غم بھُول جاتی ہوں۔ چہرہ ایسا خوبصورت کہ چاند بھی شرما جائے، بدن گُل کی طرح نازک، عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی مگر دیکھئے قبر کے کنارے کھڑی جھانک رہی ہے۔ خدا نے دُنیا میں کیسی کیسی عمر پیدا کی ہیں!" یہ کہتے ہوئے عطیہ کی آواز بھرا گئی۔

پھر خالہ سے یہ کہہ کر کہ "آپ آرام فرمائیں میں پندرہ بیس منٹ میں آجاؤں گی" باہر نکل گئی۔

عطیہ سیڑھیوں کے اُوپر پہنچی تھی کہ اُسے ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلتا ہُوا دِکھائی دیا۔ جب وہ قریب آیا تو اُس نے لب کو چھپاتے ہوئے پوچھا "کہیئے ڈاکٹر صاحب مریضہ کی حالت کیسی ہے ؟"

ڈاکٹر نے افسوس سے سر ہلا کر کہا "پھیپھڑے بالکل ماؤف ہو چکے ہیں، بڑھتی ہوئی جسمانی کمزوری بڑی حد تک تشویشناک ہے۔ مگر اُن کے سامنے یہ بات نہ کہئیے گا"۔

یہ سُن کر عطیہ دھک سے رہ گئی، لپک کر آگے بڑھی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

ثریا سامنے پلنگ پر دروازے کی طرف مُنہ کئے لیٹی تھی۔ اس کی بڑی بڑی نمناک آنکھوں میں یاس کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ رُخساروں کی دہکتی ہوئی سُرخی بے رونق اور زرد چہرے کی وحشت میں اضافہ کر رہی تھی، پاس ہی ایک میز پر دواؤں کی

مذ دچھوٹی بڑی شیشیاں رکھی تھیں ۔ فاطمہ پائینتی کی طرف بیٹھی اس کے پاؤں دبا رہی تھی ۔ عطیہ نے اندر قدم رکھا تھا کہ اُسے ہلکی دردناک
ھانسی جو ہر لحہ اسے روح کو جسم سے نوچتی ہوئی محسوس ہوتی تھی شروع ہوگئی ، وُہ کھانستے کھانستے بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھی مگر نقاہت سے مجبور ہو
پھر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں ۔ عطیہ ایک آرام کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہو بیٹھی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے
.ردی کی آواز میں کہنے لگی " ثریا ! مَیں آگئی ہوں "

ثریا نے آنکھیں کھول کر محبت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر اُس کے ہاتھ کو اپنے چھوٹے سے نازک ہاتھ میں لے
دباتے ہوئے کہا " آپا اب مجھ میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں رہی ، تم دن میں دو ایک بار آکر مُنہ دکھا جایا کرو ، اپنے آپ کو تنہا دیکھ
میرا دِل ڈوب جاتا ہے "

عطیہ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا " ثریا پیاری مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تُم اتنی کمزور ہوگئی ہو ، ورنہ ایک منٹ
لئے بھی تمہارے پاس سے نہ ہٹتی ، کل شام کو میری خالہ راولپنڈی سے آئی تھیں اب تک اُن کے پاس بیٹھی رہی "

ثریا نے جلدی سے پوچھا " آپ کی خالہ راولپنڈی کے کس محلے میں رہتی ہیں ؟"

عطیہ نے جواب دیا " مریڑحسن میں "

مریڑحسن میں ؟ " ثریا کی دھندلی آنکھیں خاص انداز سے چمکنے لگیں ۔ اس نے اشتیاق سے پوچھا " کیا وہ ملک محمد اکبر صاحب
حامد علی کو جانتی ہیں ؟"

طیہ کا رنگ فق ہوگیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " جانتی ہوں گی مگر
کیوں پوچھتی ہو ؟ "

نے لجاتے ہوئے کہا " وُہ میرے شوہر ہیں ، میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وُہ گھر میں ہیں یا کہیں .... ہائیں
ہوگیا " یہ الفاظ دفعتًہ اس کے مُنہ سے انتہائی تعجب کی حالت میں نکلے ۔

عطیہ کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی تھی ، اس کی کھلی کھلی آنکھیں جن میں جنون ایسی کیفیت رُونما ہوگئی تھی ثریا کے چہرے
ی تھیں ، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں ۔ ثریا ایک لمحہ کے لئے خوفزدہ ہو کر رہ گئی ۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر عطیہ کو
و سے پکڑ کر جھنجھوڑنا چاہا مگر وہ بجلی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی اور چیخ کر کہنے لگی ۔ " مجھے مت چھو "

اس سے پہلے کہ ثریا اور فاطمہ ہوش میں آئیں وُہ جا چکی تھی ۔

رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی ۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی تھیں ، مُوسلادھار بارش ہورہی تھی ، اچانک زور سے بادل

گرجا۔ کڑکے کی آواز نے عطیہ کو جو آتشدان کے سامنے ایک صوفے پر شال میں لپٹی لپٹائی سرنگوں بیٹھی تھی چونکا دیا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دو تین لکڑیاں انگیٹھی میں ڈال دیں۔ کچھ دیر کے بعد شعلے بھڑک اُٹھے اور اُن کے عجیب و غریب عکس عطیہ کے چہرے پر کانپنے لگے۔ اس کے تکلیف دہ خیالات پھر ہجوم کر آئے اور آنکھیں خود بخود نیم وا ہو گئیں۔

"اُس نے مجھے حامد کی محبت سے محروم کیا۔ میری مسرتوں کے چشمہ میں زہر ملا دیا۔ میری تمناؤں کو بے رحمی سے پاؤں کے نیچے مَسل دیا۔ کیسا راحت پرور تھا وہ زمانہ۔ ہماری دُنیا ایک دوسرے کے گرد آباد تھی۔ مَیں اس کی پرستش کرتی تھی، وہ مجھ پر فدا ہوتا تھا۔ ہم ساتھ مل کر کھیلے تھے، ہماری محبت نے بچپن کی معصوم گود میں پرورش پائی تھی اور شباب کے ساتھ تقویت پکڑی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ تا دمِ مرگ ہم ایک دُوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔ مَیں نادان تھی اُس مُنحسی صُورت والی لڑکی نے خبر نہیں اس پر کیا پڑھا کہ وہ یک دم مجھ سے بیزار ہو گیا۔ دو سال ہونے کو آئے میں نے اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ میرا خُدا یا میرا دِل جانتا ہے کہ میں نے یہ مُدّت ایک ایک دِن ایک ایک رات کس مصیبت میں کاٹی ہے۔ اپنی ختم نہ ہونے والی تنہائی میں مَیں نے کس جانکاہی اور استقلال سے اپنی بار بار بھڑک اُٹھنے والی آرزوؤں اور پیہم مضطرب رہنے والے ارمانوں کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔ کس حسرت کے ساتھ اپنے سُلگتے ہوئے جذبات کو آنسوؤں سے بُجھاتی رہی ہوں۔ آہ! وُہ اس زمانے میں اُس بے وفا کی محبت توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ میں نے کتنی دفعہ اس کو اپنے تصوّر میں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا خیال میرے نزدیک کس قدر نفرت انگیز تھا اور اب اس کی صُورت کیسی . . . . ."

یہ سوچتے ہوئے عطیہ کی آنکھوں کے سامنے ایک افسردہ بے نُور چہرہ جس پر مُوت کی زردی کھنڈ رہی تھی جھلملانے لگا۔ خوف و دہشت سے اس کا جسم کپکپانے لگا۔ ثریّا کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے ذہن سے غم و غصّہ کے تمام خیالات بجھ ہو گئے اور اُس کے پہلو میں فطری ہمدردی کا احساس بیدار ہو گیا۔

اس نے اپنے دِل میں کہا "کیا وُہ مجھ سے زیادہ بدنصیب نہیں ہے؛ وہ دنیا میں چند دن کی مہمان ہے۔ اس جوانی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو کر رہ جائے گی۔ میں اپنی بدنصیبی کی ذمہ داری اس کے سر کیوں تھوپوں، اس معاملے میں وُہ بالکل بے قصور ہے۔ خالص بچی تھی ہیں، حامد ایک خود غرض اور سنگدل آدمی ہے۔ اس نے کس طرح اس بھولی بھالی لڑکی کو اپنی سچی محبت کے افسانے سُنا سُنا کر فریب دیا ہوگا۔ اور کیا عجب ہے کہ وہ بھی میری طرح اس ظالم کے تغافل کا شکار ہو گئی ہو۔ بیماری کی حالت میں کیوں اُسے یہاں اکیلا بھیج دیا اور بعد میں خبر تک نہ لی۔ یقیناً وُہ ثریّا سے اُکتا چکا ہوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محبوب بیوی کے قریب ہو جائے اور شوہر یوں بے پروائی اختیار کرلے۔ میں نے بارہا ثریّا کو سرد آہیں بھرتے دیکھا ہے۔ اس کی بے اعتنائی کا خیال بیچاری کے کمزور دل کو پیسے ڈالتا ہوگا۔ یہاں وہ کیسی بے یار و مددگار ہے، میرے ساتھ دِل بہلایا کرتی تھی۔ میرے

سلوک سے اسے کتنی رُوحانی اذیت پہنچی ہوگی"۔ اس نے بلند آواز سے کہا "خدایا مجھے معاف کر!"

صبح سویرے عطیہ اپنی خالہ کو رخصت کر کے سیدھی ثریا کے کمرے میں گئی۔ وُہ رضائی اوڑھے بستر پر بیٹھی دوا پی رہی تھی عطیہ بڑھ کر اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور اس کی حیرت زدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رقّت بھری آواز میں کہنے لگی "ثریا مجھے ضُعفِ قلب کی شکایت ہے، کل مرض کا دَورہ ہوگیا تھا۔ مَیں اپنے حواس میں نہ تھی"۔

یہ سُن کر ثریا کے مغموم چہرے پر تبسم کی لہر پیدا ہوگئی۔ اس نے پیار سے عطیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپا تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔ میں نے ساری رات پریشانی میں کاٹی اور اِس سوچ میں غرق رہی کہ وہ کونسا نازیبا کلمہ میرے مُنہ سے نکل گیا تھا جس نے تمہیں اس درجہ برافروختہ کردیا۔ مجھے سب سے زیادہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ شاید اب تم میرے پاس نہ آؤگی۔ شکر ہے تم آگئیں۔ تمہیں دیکھ کر اس واقعہ کی تلخی کو بھول گئی ہوں"۔

عطیہ نے گفتگو کا موضوع بدلنے کے لئے کہا "تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

ثریا نے سرد دلی کے لہجہ میں جواب دیا "بس زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں۔ مَیں نے آج ڈاکٹر کے چہرے پر اپنی تقدیر کا فیصلہ دیکھ لیا ہے۔ چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہی ہوں خبر نہیں کب بُجھ جاؤں گی۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی دلدل میں دھنسی جارہی ہوں، کاش . . . . . مگر عطیہ آپا کیا آپ کی خالہ یہیں ہیں؟"

عطیہ نے جواب دیا "وہ آج صبح چلی گئیں"۔

ثریا نے غمگین آواز میں کہا "افسوس، مجھے مل کر جاتیں تو کیا اچھا ہوتا"

"اُن کے متعلق کچھ کام تھا؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"اُن کے ہاتھ ایک پیام دینا تھا"

"کس کی طرف؟"

ثریا نے ہچکچاتے ہوئے کہا "حامد کو"۔ کل دوپہر کا واقعہ نامحسوس طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔

عطیہ بظاہر مطمئن انداز سے بولی "مگر تم خط کیوں نہیں لکھتیں، تار کیوں نہیں دیتیں؟"

ثریا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "خط؟ تار؟ کئی خط لکھ چکی ہوں۔ پرسوں تار بھی دیا تھا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ کیا اتنی

جلدی وہ مجھے ...... نہیں نہیں وہ گھر میں نہیں ہے۔ کسی ضروری کام کو باہر گیا ہوگا۔"

عطیہ نے غصّہ سے کانپتے ہوئے زیرِ لب کہا "بے رحم"

ثریا نے کچھ دیر سکوت کے بعد پوچھا "آپا! آج جُون کی اُنتیسویں ہے نا؟"

"ہاں تو"

"آپ کو ایک نرالی بات بتاؤں؟"

"ضرور"

ثریا مسکرا کر بولی "حامد ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اپنے عہدِ محبت کی تجدید کے لئے مجھے کوئی خوبصورت پھول عموماً سفید گلاب کا پھول دیا کرتا ہے۔ اگر میں اُس کے پاس نہ ہوں تو ڈاک میں بھیج دیتا ہے۔ وُہ پھول کو گیلی مٹی میں لگا کر اس احتیاط سے پارسل کرتا ہے کہ مجھے ملنے پر بالکل تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا وُہ اپنے کاموں میں اس قدر مشغول ہوگا کہ اس دفعہ مجھے پھول بھی نہیں بھیجے گا؟"

عطیہ نے بے اختیار کہنا چاہا "بیشک" مگر اپنی سہیلی کے پُر اعتماد چہرے کی طرف دیکھ کر چُپ ہو رہی۔

آج ثریا کی طبیعت قدرے بحال تھی۔ وُہ کھڑکی کے سامنے تکیئے سے ٹیک لگا کر بیٹھی سُورج کے طلوع ہونے کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ عطیہ نے ہر چند اُسے منع کیا کہ سرد ہوا تمہارے لئے مضر ثابت ہوگی مگر ثریا نے یہ کہہ کر اُسے خاموش کر دیا کہ شاید اس کے بعد مجھے فطری حُسن کی یہ زریں تصویر دیکھنے کا موقع نہ ملے۔ کئی دن کی لگاتار بارش کے بعد بادل چھٹ گئے تھے، آسمان صاف تھا۔ ایک نیلگوں پہاڑی کے گرد دُھنی ہوئی رُوئی کے گالوں کی طرح ہلکی پھلکی بدلیاں اس سفید باریک نقاب کی یاد دلاتی تھیں جو کسی کی سرمگیں آنکھوں کی سیاہی کو چھپانے میں ناکام ثابت ہو رہا ہو۔ آفتاب پہاڑ کے پیچھے سے اُبھر رہا تھا، پہلے اس کا ایک زرد کنارہ نمودار ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ وُہ ایک آتشیں گولے کی طرح چکّر لیتا ہوا سامنے آ گیا۔ ثریا کی جو محویت کے عالم میں دیر سے اُفق پر نظریں جمائے بیٹھی تھی آنکھیں چُندھیا گئیں۔ اتنے میں تیز ہوا کا ایک یخ بستہ جھونکا اندر گھُس آیا۔

عطیہ نے پُکار کر کہا "فاطمہ کھڑکی بند کر دو۔ یہ ہوا تو اچھے بھلے آدمی کو بیمار کر دے گی۔"

ثریا نے عطیہ کی طرف مڑ کر دیکھا اور حسرتناک لہجہ میں کہا "دُنیا کیسی دلکش ہے آپا۔ سفید براق برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں جن کو نیلا آسمان جھُک کر چوم رہا ہو۔ جھیل کے گہرے تاریک پانی میں چاند کا کانپتا ہوا روپہلی عکس، گلابی جاڑوں میں دھوپ کا راحت پرور لمس، سبزہ زاروں میں بل کھا کر بہتی ہوئی ندی کا مستانہ خرام اور سب سے بڑھ کر محبت کرنے والی آنکھوں کی غرق کر دینے والی اتھاہ گہرائیاں! خدایا کیا مَیں اِس دُنیا کو چھوڑ کر کیڑے مکوڑوں کی بستی میں چلی جاؤں گی۔"

عطیہ اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئی اور دیر تک بُت بنی بیٹھی ان فقرات پر غور کرتی رہی - پھر ثریا کا حرماں نصیب دل بہلانے کے لیے کہنے لگی " ثریا میری جان! حوصلہ کرو تم تھوڑے دنوں میں اچھی ہو جاؤ گی - ہاں تو کل سہ پہر کو تمہارا پھول آ جانا چاہیئے "

ثریا نے اپنا جھکا ہؤا سر اُٹھا کر عقیدت کے لہجہ میں کہا " ضرور آئے گا - حامد بیچارا خبر نہیں کن تفکرات میں پھنسا ہؤا ہے، ورنہ آپا تم دیکھتیں کہ وہ کس تن دہی سے میری تیمارداری کرتا - ایک لمحہ کے لئے بھی میری نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتا اور میرے فکر میں اپنی جان کھو دیتا "

یہ کہہ کر ثریا نے گھبرائی ہوئی نظروں سے عطیہ کی طرف دیکھا جیسے اس کو اپنے الفاظ پر پورا پورا یقین نہیں ہے اور دل کی اُلجھن ہٹانے کے لئے اپنی سہیلی کی تائید کی محتاج ہے -

" تمہارا شوہر واقعی تم سے بڑی محبت کرتا ہوگا " عطیہ بمشکل یہ الفاظ کہہ سکی -

ثریا نے ہنستے ہوئے مسرت اور شکرگزاری کی آواز میں کہا " بے حد میری پیاری عطیہ "

بیٹھے بیٹھے کسی خیال کے آنے سے عطیہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہتے ہوئے کہ میں ابھی آتی ہوں باہر نکل گئی - سیڑھیوں سے اُتر کر سیدھی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور اندر جا کر زور سے ایک صوفے پر گر پڑی -

اس نے اپنے دل میں کہا " میں اُسے جانتی ہوں وہ اِس دفعہ کبھی پھول نہ بھیجے گا " پھر سوچ سوچ کر اپنے ملازم کو بلایا اور کہا " لوہن جی کے باغیچہ سے سفید گلاب کا ایک پھول لے آؤ اور دیکھو بازار سے پارسل کا ایک چوبی بکس بھی لیتے آنا "

دن کے تین بجے کا وقت تھا - ثریا نیم بیہوشی کی حالت میں بستر پر چت لیٹی ہوئی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھی - ڈاکٹر میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا پھرتی سے کوئی دوا بنانے میں مشغول تھا - عطیہ پلنگ کے پاس کھڑی کھوئی کھوئی نظروں سے ثریا کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی - شدتِ گریہ سے اِس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں - معاً دروازہ کھلا اور فاطمہ ایک پارسل لئے ہوئے اندر داخل ہوئی - عطیہ نے جھپٹ کر پارسل اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور ثریا کے سامنے ہاتھ بڑھا کر کہا " دیکھو پیاری ثریا تمہارا پھول آ گیا "

یہ سُن کر ثریا نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی مگر ہل بھی نہ سکی -

وہ بڑی مشکل سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہہ سکی " ابھی اُس نے مجھے نہیں بھلایا " عطیہ نے جھٹ پارسل کو جو اس نے کل بڑی احتیاط سے بند کیا تھا توڑ پھوڑ کر گلاب کا پھول نکالا اور بڑھ کر ثریا کے ہاتھ میں دے دیا -

ڈاکٹر کے مُنہ سے نکلا " اوہو! "

ثریا نے ایک نظر بھر کر پھول کی طرف دیکھا تھا کہ اس کی سانس اکھڑ گئی اور وہ دو چار ہچکیوں ہی میں ختم ہو گئی - اس وقت اس کے مردہ لبوں پر عجیب نامعلوم مسکراہٹ جم کر رہ گئی تھی -

عطیہ نے جھک کر لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا -

سیّد عباس علی بی اے جلالپوری

بسنت کی ایک رات

یہ مہکتے گلستاں یہ کھیت میں سرسوں کے پھول
جھیل کے شاداب ساحل پر سبک سا اک ببول

یہ کھجوریں سرد میداں ہیں قطار اندر قطار
یہ پہاڑی ندیاں یہ رُوح پرور آبشار

یہ مہکتی سی ہواؤں میں جوانی کی اُمنگ
یہ چٹانوں میں پہاڑی ندیوں کا جلترنگ

ندیوں سے گھوم کر یہ ندیاں ملتی ہوئی
یہ کلی کی طرح دُنیا کی جبیں کھلتی ہوئی

لو وُہ نکلا چاند ہر سُو رنگ دوڑاتا ہُوا
جھیل پر اِک نُور کی چادر سی پھیلاتا ہُوا

جگمگاتے سے ستارے چرخ پر سب چھٹکے ہوئے
چاند کے آغوش میں مرعوب سے جھکے ہوئے

چاندنی میں دُور تک دُھندلے سے پھیکے سے پہاڑ
نیند سے بوجھل سے افسوں آفریں رنگین تاڑ

اِک طرف میدان میں خاموشیاں سوتی ہوئی
اِک طرف جنگل میں کچھ سرگوشیاں ہوتی ہوئی

یہ گھنے پتوں پہ وقفِ رقص کرنیں چاند کی
یہ ہواؤں میں ملی سی سوہنی کی راگنی

یہ چٹانوں سے ہوائیں آ کے ٹکراتی ہوئی
لوٹتی ، مُڑتی ، مچلتی ، جھومتی ، گاتی ہُوئی

راستے یہ جوئباروں کی طرح مڑتے ہُوئے
چاند کی کرنوں میں چاندی کے ورق اُڑتے ہوئے

طلعتِ مہتاب میں اُڑتے ہوئے پیہم چکور
وادیوں کے پیچ و خم میں گونجتے رنگین مور

کون یہ مجھ کو سناتا ہے کہانی دُکھ بھری
اِس گھنے جنگل میں چھیڑی ہے یہ کس نے بانسری

پنکھڑی کی نرمیوں پر کس نے پتھر رکھ دیا
کون ہے جس نے دُکھے دِل پر یہ نشتر رکھ دیا

پھر بنا لوں ہار اِک اشکوں کے موتی رول کے
چاہتا ہوں مَیں کہ رولوں آج پھر دِل کھول کے

آنسوؤں میں دِل کی دُنیا کو ڈبونے کے لئے
ہے کوئی اس وقت میرے ساتھ رونے کے لئے

جلال ملیح آبادی

ردِّ عمل کا علمبردار جرمنی[1]

ردِّ عمل کا علمبردار جرمنی جنگِ عظیم کے اٹھارہ سال بعد آج پھر دُنیا سے اپنا لوہا منوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پانچ سال ہوئے کہ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر جرمنی کا آمرِ مطلق بنا تھا۔ اِس پانچ سال کے عرصے میں وہاں ایک انقلابِ عظیم رونما ہو چکا ہے۔ ہٹلر نے جنگِ عظیم کے "ظالمانہ معاہدے" یعنی عہدنامہ ورسائی کی تمام دفعات کو ایک ایک کر کے ٹھکرا دیا ہے۔ رائین لینڈ، آسٹریا، چیکوسلوویکیا پر اس کا قبضہ ہو چکا ہے، جرمن یہودیوں پر نازیوں کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اسپین میں نازیوں اور فسطائیوں کی مدد سے جنرل فرانکو فتحیاب ہو چکا ہے۔ جرمنی کا ہر شعبۂ حیات ایک زبردست جنگ کی تیاری میں مصروف ہے اور اس کے ہر شہری کو مکھن کی بجائے تُوپوں کی ضرورت ہے، نازی علانیہ طور سے بین الاقوامی قوانینِ اخلاق کو توڑ رہے ہیں اور یورپ کی جمہوریتوں کو دعوتِ جنگ دے رہے ہیں۔ دُنیا ایک ہونے والی جنگِ عظیم کی ہیبت سے کانپ رہی ہے ؎

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

ظاہر ہے کہ یہ شعلہ آشامی جس کے مظاہرے آج جرمن قوم کر رہی ہے قدرت کے کسی اَن بوجھے ارادہ کی کرشمہ سازی نہیں ہے، بلکہ کچھ تاریخی اسباب یقیناً ایسے ہوں گے جو اس کا باعث ہوئے۔ آیئے دیکھیں وہ کیا تھے۔

اُنیسویں صدی شروع ہو چکی تھی۔ برطانیہ صنعت و حرفت کی ترقی اور نو آبادیوں کی لُوٹ میں یورپ کی ساری قوموں سے پیش پیش تھا۔ فرانس بھی اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دے رہا تھا اور ہندوستان میں انگریزوں سے شکست کھا لینے کے بعد افریقہ اور ایشیا میں نئی نوآبادیاں ڈھونڈ رہا تھا مگر جرمنی میں ترقی کی رفتار ابھی تک بہت سُست تھی، یہاں جاگیرداری نظام کا دَور دورہ تھا۔ سارا ملک بہت سی ریاستوں میں بٹا ہُوا تھا جو آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ مدتِ دراز سے ان کی یہ کشمکش یونہی جاری تھی کہ ۱۸۴۸ء میں جرمنی میں ایک انقلاب رُونما ہُوا جس نے اس کے اس جاگیرداری نظام کا قلع قمع کر کے سرمایہ داری نظام کے لئے راستہ صاف کیا اَور پھر تھوڑے ہی عرصے میں اس مُلک نے وُہ حیرت انگیز ترقی کی کہ جس کی مثال تاریخ نے

---

[1] اس مضمون کو لکھتے وقت یہ دو کتابیں بہت مفید ثابت ہوئیں:۔

(1) Out Line of History by H. G. Wells.

(2) Germany Puts the Clock Back by Edgar Mowrer

اس سے پہلے کبھی پیش نہ کی تھی۔ ۱۸۶۴ء میں پروشیا اور آسٹریا کے درمیان لڑائی ہوئی، پروشیا کو فتح حاصل ہوئی اور اس فتح کے بعد اس نے کچھ جرمن ریاستوں کو ملا کر شمالی جرمنی کا ایک وفاق بنایا اور خود اُس کی اسمبلی کا صدر بن بیٹھا۔ مگر فرانس کو پروشیا کا آسٹریا پر فتح پانا اور پھر وفاق کے ذریعے سے طاقت ور ہو کر اُس کے لئے مستقل خطرہ بن جانا کب گوارا ہو سکتا تھا۔ یہ اُسے کچلنے کے مواقع تلاش کرنے لگا اور جب ۱۸۷۰ء میں اسپین کے تخت کے وارث کے متعلق کچھ جھگڑا پیدا ہُوا تو فرانس نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر پروشیا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا، دونوں میں خوب جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں تمام جرمن ریاستوں نے پروشیا کا ساتھ دیا اور وہ فرانس کے مقابلے میں فتحیاب ہو گیا۔ اس فتح کے بعد تمام جرمن ریاستیں قطعی طور پر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئیں اور پروشیا کا بادشاہ ولیم اوّل شہنشاہِ جرمنی بن گیا۔ اُنیسویں صدی کے ختم ہونے تک یہ متحدہ جرمنی بہت طاقتور ہو گیا اور اسے اپنی طاقت اور قوت پر اتنا غرور ہُوا کہ اس نے برطانیہ فرانس اور رُوس جیسی بڑی بڑی سلطنتوں کو بھی خاطر میں لانا چھوڑ دیا اور بے خوف ہو کر ان کی نو آبادیوں اور حلقہ ہائے اقتدار میں دخل اندازی کرنے لگا۔ برطانیہ، فرانس اور روس نے بھی جرمنی کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ذرا سا بہانہ ملتے ہی طرفین جنگ کے آتش کدے میں کود پڑے۔ جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور چار سال تک اقوامِ یورپ نے خوب جی بھر کر آہن و آتش اور انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو امن کا سفید پرچم پھر لہرایا گیا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا اور وہاں ۹ نومبر کو ایک انقلاب رُونما ہو چکا تھا۔ قیامِ امن کے چند مہینے بعد معاہدہ ورسائی ہُوا جس کی رُو سے جرمنی کے سارے مقبوضات اتحادیوں نے ضبط کر لئے اور اس نے تاوانِ جنگ دینے کا وعدہ کیا۔ انقلاب کے بعد قیصر ولیم ثانی تخت سے دستبردار ہو گیا اور جرمنی میں ایک جمہوریت قائم ہو گئی جس کا نام ویمر ریپبلک رکھا گیا۔ اور جس کا پہلا صدر فریڈرک ابرٹ تھا۔ اس جمہوریہ کی عنانِ حکومت جرمنی کے متوسط طبقے کی ایک جماعت کے ہاتھوں میں آئی۔ اس کا نام اشتراکی جمہوری جماعت تھا۔ اس کے ممبر کہنے کو تو اشتراکی تھے مگر دراصل تھے وہ سب کے سب لبرل اور بعض باتوں میں تو رجعت پرستوں سے بھی دو چار قدم آگے ہی بڑھے ہوئے تھے۔ ان حضرات نے شاہی کا تو خاتمہ کر دیا مگر دوسری مستقل اغراض رکھنے والی جماعتوں یعنی سرمایہ داروں، جاگیرداروں وغیرہم کے حقوق کو برقرار رکھا اور ان غریب عوام کا کچھ بھی خیال نہ کیا جو انقلاب کو کامیاب بنا کر انہیں برسرِ اقتدار لائے تھے اور اب چاہتے تھے کہ ان مستقل اغراض رکھنے والی جماعتوں سے اپنے جائز حقوق حاصل کریں۔ ان کے اس طرزِ عمل کے خلاف عوام میں پھر شورش ہوئی اور جرمن مزدوروں نے جرمن انتہا پسند جماعت جس کا نام اسپارٹاکس لیگ (Spartacus League) تھا اور جرمن انڈی پنڈنٹ جماعت کی قیادت میں پُرزور مظاہرے کئے اور احتجاج کے طور پر ایک اسپارٹاکس ہفتہ منایا۔ مگر اربابِ جمہوریہ نے اب بھی ان کی ایک نہ سُنی اور اُلٹا سرمایہ داروں اور دوسری ترقی دشمن جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کر کے انہیں کچل دیا۔

۱۹۲۱ء میں عوام نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پھر شورش کرنی چاہی مگر ناکام رہے۔

۱۹۲۳ء میں جرمنی میں مقدارِ زر کے بڑھ جانے کا واقعہ پیش آیا جو ہٹلر کے عروج کا باعث ثابت ہؤا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جرمنی نے جیسا کہ میں اُوپر لکھ چکا ہوں جنگِ عظیم میں شکست کھا کر اتحادیوں کو تاوانِ جنگ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر جب ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک اُس نے ایک پیسہ بھی ادا نہ کیا تو فرانس اور بلجیم کی فوجوں نے اس تاوان کو وصول کرنے کے لئے جرمنی کے علاقے روہر (Ruhr) پر جو اپنی معدنیات کی وجہ سے بہت مشہور ہے قبضہ کر لیا۔ اب کیا تھا۔ اربابِ جمہوریۂ ویمر اور روہر (Ruhr) کے جرمنوں میں اس کے خلاف بہت بے چینی پیدا ہوئی اور ان جرمنوں نے احتجاج کے طور پر مقاومتِ بے مزاحمت (Passive Resistance) کی تحریک شروع کر دی اور اپنے ان اجنبی آقاؤں کو محاصل وغیرہ دینے سے انکار کر دیا۔ جمہوریہ نے بھی چپکے چپکے ان کی خوب مدد کی اور جب ان کی مقاومتِ بے مزاحمت کی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے زیادہ سرمایہ کی ضرورت پیش آئی تو نوٹ زیادہ تعداد میں چھاپ دیئے یعنی ملک میں زر کی مقدار بڑھا دی۔ زر کی مقدار بڑھتے ہی چیزوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ چیزوں کی قیمتیں بڑھتے ہی کسانوں اور سرمایہ داروں کی آمدنیاں بھی زیادہ ہوگئیں۔ سرمایہ داروں کی آمدنی کا تھوڑا سا حصہ مزدوروں کو بھی ملا اور ان کی مزدوریاں بھی زیادہ ہوگئیں اور وہ خوشحال نظر آنے لگے مگر جرمن متوسط طبقہ پر غربت چھاگئی اور وحشت سی برسنے لگی۔

متوسط طبقہ جیسا کہ میں پہلے بھی اپنے ایک مضمون[1] میں عرض کر چکا ہوں عموماً دفتر کے کلرکوں، ماہر کاریگروں، ڈاکٹروں، افسانہ نویسوں وغیرہم پر مشتمل ہوتا ہے، ان حضرات کی تنخواہیں عموماً کم اور مقرر ہوتی ہیں اور اس لئے زر کے اُتار چڑھاؤ سے بھی بے نیاز ہوتی ہیں یعنی نہ زر کی مقدار بڑھ جانے سے بڑھتی ہیں اور نہ اس کے کم ہونے سے گھٹتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تنخواہیں کم ہونے کی وجہ سے اُس معیارِ زندگی کے لئے جو ان اشخاص کا ہوتا ہے ناکافی ہوتی ہیں اور مہینے کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ پھر جب چیزوں کی قیمتیں بڑھ جائیں اور ان کی آمدنی وہی رہے تو لازمی طور سے یہ بیچارے اپنا خرچ پورا کرنے کے لئے یا تو تھوڑی بہت جو جمع پونجی ہوتی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یا قرض لیتے ہیں اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر فاقہ کرتے ہیں۔ جرمنی میں بھی یہی ہؤا کہ لوگ بھوکے مرنے لگے۔

مثل مشہور ہے مرتا کیا نہ کرتا۔ جرمنی میں بھی ردِ عمل کا آغاز ہونے ہی والا تھا کہ جمہوریہ زر کو پھر اس کی اصل حالت پر واپس لے آئی اور ردِ عمل ذرا دب گیا۔ زر کے اپنی اصل حالت پر واپس آجانے سے اتنا تو ضرور ہو گیا کہ متوسط طبقے کی تباہی کی رفتار رُک گئی مگر جو روپیہ ایک بار اس کے افراد کے ہاتھوں سے جا چکا تھا وہ کیونکر واپس آسکتا تھا اور جو لوگ ایک بار غریب ہو چکے تھے۔ دوبارہ کس طرح خوشحال بن سکتے تھے۔ یہی وُہ وقت تھا جب ترقی دشمن ہٹلر جرمنی کے سیاسی اُفق پر نمودار ہؤا۔ وہ ایک زبردست مقرر

[1] "جمہوریۂ ہسپانیہ اور خانہ جنگی" ہمایوں ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء

تھا اور متوسّط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وُہ جیسا مجمع دیکھتا تھا ویسی ہی تقریر کرتا تھا۔ عوام کے مجمع میں اُنہیں ایک اور انقلاب کی آمد کی خبر دیتا تھا جس کے بعد مزدور سرمایہ دار کے پھندے سے آزاد ہو جائیں گے اور کسانوں کو بڑی بڑی اراضی کاشت مِل جائیں گی۔ مگر جب وُہ سرمایہ داروں کے جلسوں میں جاتا تو ان سے یہ وعدہ کیا کرتا کہ برسرِ اقتدار آتے ہی وہ انہیں مزدوروں پر لادستی کے پورے پورے مواقع بہم پہنچائے گا (اور دراصل مزدوروں ہی کو تباہ کرنا اس کا اصل مقصد تھا جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہُوا) وہ بے کاروں کو ملازمتیں دینے کے وعدے کیا کرتا تھا۔ مگر اس کی تقریروں کا ایک مشترک پہلو بھی تھا یعنی جمہوریۂ ویمر کی مذمت۔ وہ اُس کو بالشویک رپبلک کہا کرتا تھا۔ وہ اس کا جانی دشمن تھا اور ہر موقع پر وہ جرمنوں کو اس بالشویک رپبلک اور اس کے ساتھ ہی جرمن اشتراکیوں اور سُتمالیوں کو تباہ کر دینے کی ترغیب دیتا تھا کیونکہ (بقول ہٹلر) "اس کے کارکنوں نے ۱۹۱۸ء میں انقلاب برپا کر کے جرمنی کو جنگِ عظیم میں شکست دلوائی تھی اور معاہدۂ ورسائی کو قبول کر کے جرمن جیسی باوقار اور عظیم الشان روایات کی حامل قوم کو ذلیل کیا تھا۔" وُہ عوام کے جذبۂ وطن پرستی کو اُبھارتا تھا اور انہیں اپنی طرف بلاتا تھا تاکہ وہ اس کے ساتھ مل کر جمہوریہ کو تباہ کر دیں اور اپنے وطن عزیز کو اس لعنت سے پاک کر دیں۔ عوام بھی رفتہ رفتہ اس کے دامِ فریب میں آ رہے تھے خصوصاً ۱۹۲۹ء کی کساد بازاری کے بعد اس کا یہ وعدہ کہ برسرِ اقتدار آتے ہی وہ ہر جرمن کو روٹی دے گا انہیں بہت بھاتا تھا اور وُہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ مگر سب سے پہلے جو لوگ ہٹلر کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے وُہ اس کے اپنے متوسّط طبقے کے لوگ اور سرمایہ دار تھے۔

مقدارِ زر کے بڑھ جانے سے چونکہ متوسّط طبقے کو بہت نقصان پہنچا تھا اور وہ رپبلک سے نالاں تھا اس لئے اس کے افراد ہٹلر کی آواز سنتے ہی ہزاروں کی تعداد میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں ہٹلر نے بادامی پوش اور سیاہ پوش رضا کاروں کے دو دستے بنائے اور انہیں میں سے اپنے مشیر کار بھی منتخب کئے اور اپنی ایک جماعت بنائی جس کا نام پہلے تو "جرمن انتہا پسند آزاد جماعت" رکھا مگر ۱۹۲۸ء میں اس نام کو بدل دیا اور اس کی بجائے اس کا نام "قومی اشتراکی مزدور جماعت" رکھا (جو بعد میں نازی کہلائے) سرمایہ داروں نے بھی دُور اندیشی سے کام لے کر ہٹلر سے اظہارِ عقیدت کیا کیونکہ وُہ خوب جانتے تھے کہ جس موقع پر جمہوریہ مزدوروں کے خلاف ان کے مفاد کی ان کے حسبِ منشا نگرانی کرنے میں ناکام رہے گی وہاں ہٹلر اور اس کے رضا کار بہت مفید ثابت ہوں گے۔

اِدھر تو ہٹلر عوام کو سبز باغ دکھا کر اپنا ہم خیال بنا رہا تھا اور اُدھر جرمنی کے اشتراکی لیڈر جن کا یہ فرض تھا کہ عوام کو ہٹلر کی ترقّی دشمنی سے آگاہ کرتے اور انہیں اس کے دامِ فریب سے بچاتے اور اس کے خلاف رائے عامہ کی تنظیم کرتے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سب اشتراکی جمہوری جماعت کے ممبر تھے جو اُس وقت برسرِ اقتدار تھی۔ اس لئے وہ تو کسی طرح یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ عوام منظم ہو جائیں کیونکہ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے مظاہروں نے عوام کی تنظیم کے خطرات کو ان پر خوب ظاہر کر دیا تھا اور وہ خوب

جانتے تھے کہ عوام منظم ہو کر سب سے پہلے اُن کے خلاف شورش برپا کریں گے۔ دراصل ادھر تو وہ عوام کی انقلابی طاقت سے سہمے ہوئے تھے اور اُدھر ہٹلر سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔

الغرض ہٹلر کی تقریر اور تنظیم کا سلسلہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک جاری رہا اور جرمن پارلیمنٹ (Reichstag) کے ہر نئے انتخاب میں اُس کے کامیاب اُمیدواروں کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء کا وہ تاریخی سال چڑھا جس کے شروع ہوتے ہی تمام دُنیا میں کساد بازاری پھیل گئی۔ جرمنی میں بھی قدرتی طور پر اس کا بہت بُرا اثر پڑا۔ سینکڑوں کارخانے بند ہو گئے۔ ہزاروں مزدور بے کار ہو گئے۔ عوام میں بیروزگاری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں میں کش مکش ہونے لگی۔ سرمایہ دار چاہتے تھے کہ حکومت کی مشینری پر ان کا قابو اور بھی زیادہ ہو جائے تاکہ وُہ اپنے آپ کو تباہی سے بچانے کے لئے اور اپنے مفاد کی حفاظت اور ترقی کے لئے جو چاہیں کریں اور مزدور چاہتے تھے کہ عنانِ حکومت ان کے قبضے میں آجائے تاکہ وہ بے روزگاری کا شکار ہونے سے بچ جائیں مگر سرمایہ دار مزدوروں سے کہیں زیادہ شاطر اور منظم تھے اس لئے وہ بازی لے گئے۔ وہ ہٹلر کی بڑے زور شور سے امداد کرنے لگے اور اس نے اپنے زورِ خطابت اور سرمایہ داروں کی دولت کے ذریعے سے پروپیگنڈا کر کے عوام کو اس بات کا پُورا پُورا یقین دلا دیا کہ جرمنی میں اس سے زیادہ ان کا اور کوئی خیر خواہ نہیں ہے اور اب وہ قطعی طور سے اس کے دام فریب میں آ گئے اور پھر ۱۹۳۰ء میں جب جرمن پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہُوا تو انہوں نے نازیوں کو خوب رائیں دیں اور تقریباً ۵۸۰ ممبروں کی پارلیمنٹ میں ان کے ۱۰۷ نمائندے منتخب ہو گئے۔ پارلیمنٹ میں اتنی بڑی تعداد میں پہنچ جانے کے بعد نازیوں نے اب جمہوریہ کو اور بھی ستانا شروع کیا اور نوبت یہاں تک آئی کہ جمہوریہ کے چانسلر برُوننگ (Brüning) نے پریشان ہو کر اسی سال پارلیمنٹ کو توڑ دیا اور ملک پر جمہوریہ کے پریزیڈنٹ ہنڈن برگ سے اجازت لے کر ہنگامی قوانین کے ذریعے سے حکومت کرنے لگا اور دو سال تک اسی طرح حکومت کرتا رہا مگر ۱۹۳۲ء میں ہنڈن برگ برُوننگ سے ناراض ہو گیا اور اسے چانسلری کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے مستعفی ہونے کے بعد جرمن پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہُوا جس میں نازیوں کے ۲۳۰ نمائندے منتخب ہوئے۔ ہنڈن برگ اور بروننگ کے اس جھگڑے کی کہانی بہت طویل ہے اور اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء تک بروننگ کے بعد اور ہٹلر سے پہلے جرمنی کے دو چانسلر اور ہوئے اور انہیں بھی یکے بعد دیگرے ہنڈن برگ نے برخاست کر دیا اور پھر جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کو جرمن چانسلر کے عہدے پر فائز کر دیا۔

ہٹلر نے چانسلر بنتے ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ جرمنی کے تمام اشتمالی اور اشتراکی لیڈروں کو قید کر لیا اور ان میں سے اکثر کو بعد میں مروا دیا۔ اس کے بعد جرمن پارلیمنٹ کی عمارت کو آگ لگوا دی تاکہ جمہوریہ کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

---

[۱] ۱۹۲۵ء میں جمہوریہ ویمر کا پہلا صدر فریڈرک ایبرٹ مر گیا۔ اس کی موت کے بعد فیلڈ مارشل پال فان ہنڈن برگ اس کا دوسرا صدر منتخب ہُوا۔

۱۹۳۴ء میں ہنڈن برگ مرگیا اور ہٹلر جرمنی کا آمرِ مطلق بن بیٹھا۔

آمریت کے چہرے سے نقاب اُٹھا۔ مزدور سبھائیں غائب ہونے لگیں۔ اشتراکی جماعتیں کچل دی گئیں۔ امداد باہمی کی انجمنیں اپنے قبضے میں کر لی گئیں۔ مطبع کی آزادی ختم ہوگئی۔ مزدوروں کی ہڑتالیں ممنوع قرار پائیں۔ حکومت پر نکتہ چینی کرنے والے جیلوں اور اجتماعی کیمپوں میں روپوش ہونے لگے اور کہا گیا کہ "انقلاب" رونما ہوچکا ہے۔ مگر اللہ اکبر انقلاب کے بعد بھی وہی "مستقل حقوق" برقرار رہے، جو اس سے پہلے تھے اور اگر کوئی تبدیلی ہوئی تو بس یہ کہ شہری آزادی پر سخت پابندیاں عائد کردی گئیں کوئی شہری آزاد شہری نہ رہا۔ خواہ اس کا نظریہ زندگی کچھ بھی ہو مگر اب تو اسے انہیں لوگوں کو زندہ باد کہنا ہوگا جنہوں نے اسے غلامی کی زنجیریں پہنائی تھیں[1]۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر دو بڑی بڑی جمہوریتوں یعنی برطانیہ اور فرانس نے جمہوریۂ ویمر کا تباہ ہونا اور اس کے بعد معاہدہ ورسائی اور اسی قسم کے دوسرے معاہدوں کا جو جنگِ عظیم کے بعد جرمنی سے کئے گئے تھے منسوخ ہونا کیونکر گوارا کیا؟ اس کی سب سے بڑی وجہ تو ان کی باہمی دشمنی تھی۔ ان کے افریقی اور ایشیائی مقبوضات عموماً پاس پاس ہیں اور یورپ سے ان مقبوضات کو جانے والے راستے بحیرۂ روم میں سے ہوکر گزرتے ہیں جس پر اس زمانے میں برطانیہ کا اقتدار تھا اور فرانسیسی مقبوضات اس کے رحم وکرم پر تھے۔ یہ جب چاہتا فرانس اور اس کے ان مقبوضات کے درمیان سلسلۂ آمدورفت بند کرسکتا تھا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر فرانس کی یہ کوشش تھی کہ وہ بھی بحیرۂ روم میں اقتدار حاصل کرے۔ اور اُدھر برطانیہ کی یہ خواہش تھی کہ جرمنی اتنا مضبوط اور طاقتور بن جائے کہ فرانس ہمیشہ اس کی طاقت سے خائف رہے اور اپنی حفاظت کے خیال میں پھنس کر بحیرۂ روم میں اقتدار حاصل کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں جمہوریتیں جرمنی کے خلاف کوئی متحدہ قدم نہ اُٹھا سکیں۔ اس کے علاوہ چند اور وجوہ بھی تھیں جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) عالمگیر کساد بازاری جس نے برطانیہ اور فرانس کو اپنے اقتصادی جھگڑوں میں اُلجھائے رکھا اور انہیں جرمن سیاسیات کی جانب متوجہ نہ ہونے دیا۔

(۲) اِن ممالک کے باشندوں کا جذبۂ امن پرستی جو جنگِ عظیم کی ہولناک بربادی کے بعد بہت ہی زیادہ امن پسند ہوگئے تھے اور اب ہر طرح لڑائی سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

(۳) نازیوں کا مسلسل یہ پروپیگنڈا کرتے رہنا کہ وہ جرمنی میں "سرخ خطرے" کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں ملک خود بھی "سرخ خطرے" سے خوف زدہ ہوگئے تھے اِس لئے انہوں نے جرمنی میں نازیوں کے ظلم واستبداد کو خوشی سے برداشت کیا۔

(۴) اوّل جمہوریۂ ویمر اور پھر ہٹلر کا یہ پروپیگنڈا کہ معاہدۂ ورسائی جرمن قوم کے لئے زہرِ ہلاہل تھا بہت کامیاب ثابت ہوا اور جب ہٹلر نے اس معاہدے کو توڑ دیا تو یہ دونوں جمہوریتیں خاموش رہیں۔

ہٹلر نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اب تک جو کچھ کیا اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

---

[1] ماخوذ از Liberty in the Modern State از J. Harold Laski

(۱) ۱۹۳۳ء میں جمعیت اقوام کو چھوڑ دیا۔

(۲) ۱۹۳۴ء میں آسٹریا کے نازیوں نے جرمن نازیوں کے اُکسانے سے آسٹریا میں غدر برپا کر کے اسے جرمنی میں شامل کرنا چاہا اور یہاں کے چانسلر ڈاکٹر ڈولفس کو گولی سے ہلاک کر دیا مگر اٹلی نے جرمن نازیوں کی ان ریشہ دوانیوں سے شدید اختلاف ظاہر کیا اور مسولینی نے ان کی مخالفت کر کے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔

(۳) ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے سار کے علاقے پر (جو جنگِ عظیم سے پہلے جرمنی کا ایک جزو تھا مگر جسے معاہدۂ ورسائی کی رُو سے جرمنی سے علیحدہ کر کے یہ آزادی دے دی گئی تھی کہ اس کے باشندے پندرہ سال کے بعد Plebiscite کے ذریعے سے یہ بتائیں کہ وہ جرمنی میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں) اپنا دباؤ ڈال کر یہاں Plebiscite کرایا اور یہاں کے نازیوں کو امداد دے کر عوام سے اپنے حق میں رائیں دلائیں اور اسے جرمنی میں شامل کر لیا۔

(۴) اسی سال اس نے جرمنی میں جبری بھرتی کا اعلان کر کے معاہدۂ ورسائی کو ٹھکرا دیا۔

(۵) اور اسی سال اینگلو جرمن معاہدہ ہوا جس میں برطانیہ نے جرمنی کو ۱۰۰ : ۳۵ کے تناسب سے بحری بیڑا بنانے کی اجازت دے دی یعنی اگر برطانیہ سو جنگی بحری جہاز بنا لے تو جرمنی پینتیس بنا سکتا ہے۔ اس معاہدے سے فرانس کی طاقت کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ اس سے جرمنی کو تقریباً فرانس کے برابر بحری بیڑا بنانے کا حق مل گیا۔

(۶) ۱۹۳۶ء میں ہٹلر نے رائین لینڈ پر جس میں معاہدۂ لوکارنو (۱۹۲۵ء) کی رو سے کوئی فوج رکھنے کی اجازت نہ تھی، اپنا فوجی قبضہ کر کے اس معاہدے کو بھی چاک کر دیا۔

(۷) اسی سال اسپین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں اٹلی اور جرمنی نے خوب شرکت کی۔ فرانس اور برطانیہ نے معاہدۂ عدمِ مداخلت کا نفاذ کر کے جمہوریۂ ہسپانیہ کو ممالکِ غیر سے امداد لینے کے جائز حق سے محروم کر دیا مگر اٹلی اور جرمنی جنرل فرانکو کی امداد کرتے رہے یہاں تک کہ ان کی امداد سے وہ جمہوریۂ ہسپانیہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

(۸) اور پھر اسی سال اٹلی، جرمنی اور جاپان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں انہوں نے سوویٹ رُوس کے خلاف اتحادِ عمل کرنے کا عہد کیا۔

(۹) اپریل ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔ مسولینی نے اس کا ساتھ دیا کیونکہ ہٹلر نے اس سے اسپین کی خانہ جنگی میں اشتراکِ عمل کیا تھا اور پھر آڑے وقت اس کی امداد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

(۱۰) ستمبر ۱۹۳۸ء۔ جرمنی اٹلی برطانیہ اور فرانس کے درمیان معاہدۂ میونک ہوا جس کے مطابق ہٹلر نے سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ کر لیا، کیونکہ برطانیہ اور فرانس نے چیکوسلوویکیا کی جمہوریت کو امداد دینے سے انکار کر دیا تھا۔

(۱۱) نومبر ۱۹۳۸ء میں جرمنی کے فرانسیسی سفیر فان راتھ کو پیرس میں پولینڈ کے ایک یہودی نے گولی سے زخمی کر دیا اور بعد میں وہ مر گیا

اس کی موت کے بعد نازیوں نے جرمن یہودیوں کو خوب قتل کیا اور ان کے خلاف نئے نئے تعزیری قوانین پاس کردیئے۔

(۱۲) ۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے چیکوسلوویکیا کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔

(۱۳) ۲۳ مارچ ۱۹۳۹ء۔ لتھونیا نے (Memel) کا علاقہ ہٹلر کے سپرد کردیا۔

(۱۴) ۲۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو رومانیا اور جرمنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں رومانیا نے جرمن سرمایہ داروں کو اپنے ملک کی معدنی کانوں اور تیل کے چشموں سے استفادہ کرنے کی اجازت دے دی۔

آج ہر شخص یہ معلوم کرنے کا خواہشمند ہے کہ آئندہ ہٹلر کس علاقے پر ہاتھ صاف کرے گا۔ اس کے متعلق یورپی مصنفوں اور اخباروں نے مندرجہ ذیل دو تجاویز کا سراغ لگایا ہے۔

(۱) گورنگ کی تجویز۔ جس کے مطابق جرمنی رومانیا پولینڈ اور ہنگری میں سے فوجیں گزار کر سوویٹ روس کے علاقے اوکرین پر حملہ آور ہوگا۔

(۲) مغربی حملے کی تجویز جس کے مطابق جرمن فوجیں بلجیم اور سوئٹزرلینڈ میں سے گزر کر فرانس پر حملہ آور ہونگی۔

مگر ان حملوں کا دارومدار برطانیہ اور فرانس اور سوویٹ روس کے طرزِ عمل پر ہے۔ اگر انہوں نے متحدہ ہوکر جرمنی پر یہ واضح کردیا کہ آئندہ وہ اس کی کسی جارحانہ پیش قدمی کو برداشت نہ کریں گے تو لڑائی رُک جائے گی۔ کیونکہ جرمنی اکیلا تو کیا اٹلی اور جاپان کے ساتھ مِل کر بھی ان کے مقابلے میں فتحیاب نہیں ہوسکتا۔ جرمنی اور اٹلی اور جاپان کے پاس ایسے مقبوضات کی کمی ہے جہاں سے یہ اشیاءِ خوردنی اور اشیاءِ خام جن پر آج کل ایک طویل جنگ کی فتح و شکست کا دارومدار ہے حاصل کرسکیں۔ اس کے برخلاف برطانیہ فرانس اور رُوس ایسے علاقوں سے مالامال ہیں۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر جنرل گورنگ نے اپنی چار سالہ "خودکفالتی" اسکیم تیار کی تھی جس پر آج کل جرمنی میں عمل ہورہا ہے۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو چیزیں جرمنی کو ممالکِ غیر سے منگوانی پڑتی ہیں اور جن کی درآمد جنگ شروع ہونے پر رُک جائے گی انہیں یا تو اپنے ملک کے اندر کیمیائی طریقوں سے بنالیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان کا استعمال ترک کردیا جائے۔ آج جرمنی میں حکومت کی طرف سے رعایا کو ہر مہینے یہ ہدایات ملتی ہیں کہ انہیں کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا اور کیا پہننا ہے اور کیا نہیں پہننا۔ مگر باوجود اتنی کوشش کے یہ ملک ابھی تک "خودکفالتی" نہیں بنا اور نہ آئندہ ہی اس کی کوئی اُمید کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ جرمنی کے اقتصادی نظام میں بھی زبردست زلزلہ آچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہٹلر ایک ایسی جنگ کی تیاری میں سرگرم ہے جس کی حکمتِ عملی فریقِ مخالف کو اچانک آدبوچ لینے اور بیشتر اس کے کہ وہ اپنی قوتوں کو منظم کرکے بروئے کار لائے اسے شکست دے دینے پر مبنی ہو (ہٹلر نے آج تک مختلف علاقوں پر جو قبضہ کیا ہے اس میں بھی کم و بیش اس کی یہی حکمتِ عملی رہی ہے) تاکہ لڑائی طول نہ پکڑے اور اسے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اگر برطانیہ اور فرانس اور سوویٹ روس نے اسے یہ خوب واضح کردیا کہ وُہ اس کے مقابلے کے لئے ہر وقت تیار ہیں جیسا کہ آجکل اُن کے علامات سے ظاہر ہورہا ہے تو ہٹلر کبھی نہ لڑے گا اور اس کا استبدادی نظامِ حکومت جس کی بنیاد ہی غارت گری پر استوار ہے خود بخود تباہ ہوجائے گا اور اگر وُہ پھر دُگدا میں پڑ گئے تو ایک عالمگیر جنگ کا شروع ہونا اور جدید تہذیب و تمدن کا تہ و بالا ہونا ناگزیر ہے۔

عبدالحفیظ خان انبالوی

تخیلات

استعجاب!

افلاک کا یہ مستقل اور نیلگوں سکوت ہے
کن رمزوں کا بار خدا! پردہ دار ہے

روزِ ازل سے جس کے تعاقب میں ہے خزاں
کس دورِ پُرنشاط کی یارب بہار ہے

استفسار

رات جب ملتی ہے دن سے ہوتی ہے رنگیں شفق
کیوں ہے یہ شے نظارہ گاہ پہ پڑتی ہے بے سبب
پھر دیر تک نہ ملنا زندگی اور موت کا
کیا نہیں ہوگا کسی صورت کا کشش دلفریب

مسرت!

اے میرے خواب! مسرت!
آگئی ہیں سامنے تیری حسنِ خیال کی وہ موج
ضبط جب نہ کرسکا کسی گُل کا ضمیر ترشیں
گُل وہ بار بار
آتی ہے لوٹ لوٹ کے گلشن خواب میں
اے میرے خواب میں

حسین!

حسنِ معکوس حسین!
مجھے کہتے ہیں نہیں
تم نہ شرماؤ نہیں یاد
جانتا ہوں میں نہیں
سے آتا ہوں میں
صرف منظر کو یوں نظر سے آتا ہوں میں
کیونکہ خود سے آنکھیں تمہاری ہیں حسیں

سعید احمد اعجاز

زلزلے

ڈاکٹر شاکر محمدی کے ہاں سر عبدالقادر، دارا، شرر، حسن عبداللہ اور مَیں شام کے کھانے پر مدعو تھے۔ ڈاکٹر صاحب تو بڑودہ کے رہنے والے ہیں اور اُسی طرف کی ہندوستانی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لیکن بیگم محمدی غالباً جرمن ہیں (گو مَیں نے کبھی یہاں کے رواج کے مطابق تحقیق نہیں کی) بہرحال مجھے یہ کہنا مقصود ہے کہ ڈاکٹر محمدی کے ہاں ہندوستانی اور بدیشی ملے جُلے کھانوں کی پُرتکلف دعوت کا دلچسپ پہلو یہ ہوتا ہے کہ کھانے سے قبل اور بعد میزبانوں اور مہمانوں کے مختصر مجمع میں حالاتِ حاضرہ پر بہت دلچسپ گفتگو ہوتی ہے۔ اس گفتگو میں رسمی تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر سب حضرات تمدنی، سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی مسائل پر اظہارِ خیالات کرتے ہیں۔ چنانچہ کیسے عید الاضحیٰ کا ذکر چھڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی لندن کے ایک ہندوستانی سوشل کلب کا نام کسی صاحب نے لے دیا۔ یہ کلب دراصل اس خیال سے جاری کیا گیا تھا کہ وہ بلا تفریقِ مذہب ہندوستانیوں کے تمام تہواروں پر لندنی ہندوستانیوں کو ایک جگہ جمع کیا کرے تاکہ ہندوستانیوں میں مذہبی مغائرت کی وجہ سے جو افتراق پیدا ہو گیا ہے وہ کم از کم لندن کی فضا میں تو نظر نہ آئے مقصد نیک تھا چنانچہ کچھ ہندوستانی ہر مذہب و ملت کے اس کلب کے ممبر ہو گئے اور بہت سے تہوار منانے کے موقعوں پر کلب میں شرکت کرتے۔ یہاں کے رواج کے مطابق تہوار منانے کا دستور بھی لندنی ہی منتخب کیا گیا۔ چنانچہ تہوار کو مذہبی شکل دینے کے بجائے تہوار کا اہم حصہ ایک پُرتکلف کھانے پر مشتمل ہوتا ہے اور دعوتی رُقعہ جو آپ کو پہنچتا ہے اُس کے ایک کونے میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ ساڑھے سات شلنگ جو اس دعوت کے لئے آپ کو کارکنوں کی نذر کرنے ہوں گے اُس میں ناچ کے دام بھی شامل ہیں۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے دیگر مذاہب مذہبی تہواروں کے اس طرح منانے کو کس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے لیکن سر عبدالقادر عید الاضحےٰ کے دعوتی رقعے پر ناچ کی جبری شرکت پر کچھ کھٹکے اور اُنھوں نے ڈاکٹر محمدی سے کہا کہ وہ کلب کے منتظمین تک یہ بات پہنچا دیں کہ کم از کم عید کے دعوتی رقعے پر ناچ کا ذکر نہ آنا چاہیئے۔ ہاں جنہیں اس وقت ناچ سُوجھے وہ ناچنے لگیں۔ یہاں کون پوچھتا ہے اور اقبال مرحوم تو چل دیئے جواب یہ کہہ کر طعنہ زن ہوں گے کہ

چہ گویم رقص تو چون است و چوں نیست ؞ حشیش است! ایں نشاط اندرونی نیست

بہ تقلیدِ فرنگی پائے کوبی ؞ بہ رگہائے تو آں طغیانِ خوں نیست

حسن عبداللہ کھانے سے چند منٹ بعد ہم سب کے اصرار کے باوجود یہ کہہ کر چل دیئے کہ اُن کی لینڈ لیڈی (مالکہ مکان) گیارہ بجے دروازے کو قفل لگا دیتی ہے، لہٰذا وہ اس سے قبل مکان پر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتے

ہوئے مراجعت پر حسن عبداللہ کا ذکر پھر گاڑی میں آ گیا۔ شتر نے کہا، ابھی نووارد ہیں۔ جبھی لندن کی لینڈ لیڈی سے اِس قدر خائف ہیں اس پر کچھ لے دے ہوئی۔ مَیں نے کہا نووارد ہونے کے علاوہ کچھ اپنی وضع کے آپ ہی آدمی ہیں۔ متدیّن مزاج ہیں اور تدیّن کے اظہار میں کہیں بھی باک سے کام نہیں لیتے۔ یونیورسٹی میں آتے ہیں تو ایک صندوقچے میں مصلّے بھر لاتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا اُس میں کیا ہوتا ہے، میں ایک دن یونیورسٹی سے پڑھا کر باہر نکل رہا تھا کہ آپ سے مٹھ بھیڑ ہو گئی، دیکھا تو غیر معمولی طور پر بڑا صندوق اٹھائے کالج کی طرف بڑھ رہے ہیں، میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا "بستر بھی ساتھ اُٹھا لانے ہوتے"۔ اس پر آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے مجھے بتایا کہ صندوق کی غیر معمولی جسامت کی علت جائے نماز کا حجم ہے۔ لیکن عبداللہ صاحب کی لندنی زندگی کے ایک اَور نہایت دلچسپ واقعے سے احباب اور بھی زیادہ محظوظ ہوئے۔

عبداللہ صاحب لندن میں حسبِ ضرورت گاہ وبے گاہ نماز پڑھنے کے عادی تو ہیں ہی، برٹش میوزیم کی محراب بہت وسیع ہے اور چونکہ وہاں آنے جانے والوں کا ہجوم نہیں ہوتا اسلئے جب آپ نے وہاں سجدے کئے تو اس سے زیادہ چرچا نہ ہُوا کہ چند بیوقوف فرنگی مرد و زن چند منٹ تک آپ کو تعجب کی نگاہوں سے گھُورا کئے اور یہ جب مصلّے کو صندوق میں بند کر کے چل دیئے تو اُنہوں نے بھی اپنی اپنی راہ لی۔ لیکن وکٹوریا سٹیشن پر تو عبداللہ صاحب کو نماز کی بدولت ایک اچھا خاصہ حادثہ پیش آ گیا۔ وکٹوریا سٹیشن کے تیس کے قریب پلیٹ فارم ہیں اور ان سے ملحقہ میدان بہت وسیع ہے لیکن سٹیشن بہرحال سٹیشن ہے اَور دُنیا کے بڑے سٹیشنوں میں سے ایک اس لئے یہ میدان ہر وقت مسافروں سے اٹا رہتا ہے اور لوگوں کے سُرعت سے حرکت کرنے کے باوجود کبھی خالی نہیں ہوتا۔ نماز کا وقت تھا عبداللہ صاحب نے بلاتکلف سٹیشن کے احاطے میں مصلّے بچھا کر اپنے آپ کو بارگاہِ ایزدی میں پیش کر دیا۔ ایک سڑی فرنگی کچھ دیر تک آپ کو گھُورا کیا اور پھر خدا جانے کیا سمجھ کر ایک سپاہی کو بُلا لایا جس نے بُلانے والے فرنگی کی رائے کو صحیح سمجھ کر عبداللہ صاحب کو اپنی جگہ سے ہٹنے پر مجبور کیا۔ آپ وکیل ہیں اور آپ نے مدلل طور پر اپنے رکوع و سجود کی وضاحت کرنی چاہی لیکن سپاہی کم بخت بدھب تھا اُس نے کوئی عذر قبول نہ کیا۔ عبداللہ صاحب نے بتیرا کہا :-

ہر مُلک مُلکِ ما است کہ مُلکِ خدائے ماست

لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے اس دَورِ انحطاط میں فرنگی سپاہی اُن کی تہذیب و تمدن اور بالخصوص مذہب کے بکھیڑے میں کیوں پڑتا۔ چاروناچار عبداللہ صاحب کو شکست تسلیم کرنی پڑی۔ گو بعد میں اِن کی شکایت کے جواب میں افسرانِ حکومت نے اِن سے دست بستہ معافی مانگ لی

میرے اِس واقعے کو بیان کرنے پر شیخ صاحب کو ایک دلچسپ لطیفہ یاد آیا۔ کہنے لگے کہ علی گڑھ کالج کمیٹی کے ایک نہایت متدیّن رُکن جب ایک دفعہ کالج کا معائنہ کرنے کے لئے آئے تو آپ نے اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں مذہبی استفسارات سے کالج کی فضا میں تہلکہ مچا دیا۔ کبھی پوچھتے کتنے لڑکے نماز پڑھتے ہیں۔ کبھی کہتے اساتذہ نمازی ہیں یا نہیں۔ نماز پڑھنے کا اہتمام باقاعدہ کیا

جاتا ہے یا نہیں۔ وعلےٰ ہذا القیاس۔ نماز کے علاوہ اُنہوں نے کالج کے دیگر اُمور کی طرف قطعاً التفات نہ کیا۔ چنانچہ جب حبیب الرحمٰن خاں شروانی ایک مجلس میں اِن حضرات کا تعارف طلبہ سے کرانے کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ نے فرمایا "حضرات حبب سے ...... صاحب کالج میں تشریف لائے ہیں آپ نے کالج میں مذہبی زلزلہ برپا کر رکھا ہے ......"

احباب نے شیخ صاحب کی یاد ایام پر قہقہہ لگایا۔ گاڑی واٹرلو اسٹیشن پر رُکی اور میں سب کو شب بخیر کہہ کر گھر چلا آیا۔ کہیں دو بجے کے بعد بستر پر لیٹا۔ اور ابھی جی بھر کر سو بھی نہ پایا تھا کہ نو بجے مکان کی گھنٹی بجی۔ معلوم ہُوا کہ ٹیلیفون آیا ہے اور ملازمہ پکار رہی ہے، آنکھیں ملتا ہُوا ٹیلیفون پر پہنچا تو سُنا کہ اکبری صاحب نے ارلز کورٹ (EARLS COURT) کے لئے شام کو پانچ نشستیں محفوظ کرالی ہیں۔ اور اکبری، علیا (یہ مصری لڑکی ہے) خان، میری اور مجھے شام کو وہاں جانا ہوگا۔ باقی سب کو اطلاع مل چکی تھی اور میری شرکت لازمی تھی۔ دوپہر کا کھانا ختم کیا تو سب میرے ہاں آ گئے۔

باتوں باتوں میں مَیں نے رات کے شیخ صاحب کے زلزلے والے لطیفے کا ذکر کیا۔ اکبری کہنے لگے "آپ نے آج کا اخبار دیکھا ؟ ایران میں زلزلے کی وجہ سے تیس ہزار آدمی آناً فاناً فنا ہو گئے ہیں۔ اور چونکہ تار اور ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اس لئے تباہی کی مفصل روداد بھی باہر کی دُنیا تک نہیں پہنچ سکتی۔" میری اور علیا نے اس خبر کو سُن کر بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہنے لگیں کہ ہمیں اخبار سے تفصیل پڑھ کر سناؤ۔ میں نے خبر سُنانے کے لئے اخبار اُٹھایا تو خان کہنے لگے "دور ت چھوڑو، تم ان جھگڑوں میں کیوں پڑتے ہو۔ ہم پر آئے دن زلزلے آتے رہتے ہیں اور ہماری کوئی بات تک نہیں پوچھتا۔ کیا ہُوا اگر ایران میں تیس ہزار آدمی مر گئے۔ ہماری طرف تو دیکھو ہم کئی کروڑ ہیں اور زلزلے آنے کے باوجود مر نہیں سکتے۔ بلکہ سسکتے رہنے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ ہم مظلوم زیادہ ہیں یا ایران والے لوگ ؟"

ہم سب کچھ متحیر ہو کر اور کچھ مزاحیہ انداز میں خان کی طرف دیکھ رہے تھے، وہ بالعموم خاموش رہتا ہے لیکن اپنی فطری معصومیت کے ساتھ جب تصنّع کے بغیر باتیں کرنے پر آتا ہے تو بعض دفعہ پتے کی باتیں کہہ جاتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اپنے حواس پر قابو پائیں یا لڑکیاں اُس سے اُس کے بیان کی تفصیل پوچھیں خان نے میرے ہاتھ سے ڈیلی ٹیلیگراف لے کر تہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ اس پر سب نے قہقہہ لگایا اور میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "اچھا تم دوسروں کے زلزلوں کی خبر نہیں سننا چاہتے تو اپنے زلزلے کی سناؤ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان دنوں ہندوستان میں تو کوئی شدید یا نقصان دِہ زلزلہ نہیں آیا اور بہار میں زلزلہ آیا تھا تو تمہیں اُس سے کیا نقصان پہنچا تھا۔ تم تو پنجاب میں تھے۔"

اب خان کو پھر چُپ لگ گئی۔ ہم سب منتظر ہیں کہ وُہ کچھ کہے لیکن وُہ نہایت متانت سے سگریٹ مُنہ میں دبائے ہُوئے چھت کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میری نے کہا "خان کچھ کہو نا"۔ اس پر خان نے کروٹ لی۔ آپ کا ڈیل ڈول ماشاءاللہ اس طرح کا ہے کہ

جب وہ کرسی پر کروٹ بدلتے ہیں تو مجھے معاً اُس ہلمین (Hill man) موڑ کا خیال آتا ہے جو اپنی سبک رفتاری اور کم جسامت کے باوجود لندن کے کسی بھیڑ بھاڑ والے چوک سے ہشتکل پہلو والی گلی کی طرف مڑ رہی ہو، کیونکہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے وہ کرسی میں پھنسے پھنسے ہی رہتے ہیں۔ میری کے استفسار پر خان کچھ چونکے اور کہنے لگے "تم بے حس لوگوں سے اگر میں اپنے زلزلوں کی روداد بیان بھی کروں تو تم میرے جذبات کی تہ تک کیسے پہنچ سکتے ہو؟"

میں نے کہا "آخر کچھ کہو تو"

اس پر خان نے کوٹ کے دونوں پلّوں کو پیٹ پر کھینچتے ہوئے کہا " اچھا تم سننا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جس دن سے غلام آباد ہند میں پیدا ہوئے ہیں اُس دن سے جھٹکے محسوس کر رہے ہیں۔ کوئٹے اور بہار کے زلزلے کو بھول جاؤ اُس سے صرف ارضی جھٹکے محسوس ہوئے تھے جس سے ہزاروں جانیں تلف ہوگئیں۔ لیکن ہماری زندگی اس لحاظ سے اُن ناگہانی موت مرنے والوں سے بدتر ہے کہ ہمارے جسم، ہماری رُوح، ہمارے ضمیر، ہمارے ایمان اور ہماری حسیات کو آئے دن جھٹکے لگتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس بات پر قادر نہیں کہ جسم و رُوح کے تعلق کو منقطع کر سکیں۔ ہندوستان میں زندہ رہنے کے لیے زندہ رہنے کی خواہش کی اس قدر پرورش کرنی پڑتی ہے کہ ہماری زندگی کی تمام آرزوئیں، اُمنگیں اور حوصلے صرف ایک اسی خواہش کی نذر ہو جاتے ہیں اور جب مرنے کے دن قریب ہوتے ہیں اور اپنی زندگی کا محاسبہ کرتے ہیں تو ننانوے فیصدی حالات میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہم کوشش کرنے کے باوجود اپنی خواہش میں کامیاب نہیں ہو سکے یعنی ہم نے زندگی بسر نہیں کی محض عالمِ وجود میں رہے ہیں (گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی، میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ خان نے دراصل کہا تھا (We could not live but we had been existing)۔ اور اِس موجودات میں رہنے کے لئے ہمیں ہندوستان میں ہر لمحہ اس قدر شدید جھٹکے محسوس ہوتے ہیں کہ ہمارے ضمیر، خودداری اور استقلال کی دیواریں ہل ہل کر پاش پاش ہو جاتی ہیں (مجھ سے مخاطب ہو کر) تم ہی کہو ہندوستانی زندگی کے کون سے شعبے میں تم دو قدم بھی آزادی سے اپنے ضمیر، مذہب یا ایمان کی ہدایت کے مطابق اُٹھا سکتے ہو۔ ہر لحظہ تمہارے قدم ڈگمگاتے رہتے ہیں۔ کہو یہ بیچارگی بدتر ہے یا ارضی زلزلے؟"

خان دفعتہً پھر خاموش ہوگیا۔ ہم سب مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری بڑی شریر ہے یکایک اُسے کچھ سوجھی اور کہنے لگی۔

" اچھا خان یہ تو ہندوستان کی بات ہے۔ اب تو تم ایک سال سے انگلستان میں ہو، کہو یہاں تو زلزلے نہیں آتے یا ابھی تک ہندوستان کے زلزلوں کے خواب تمہیں یہاں بھی پریشان کرتے ہیں"۔

اِن الفاظ نے خان کی طبیعت پر تازیانے کا کام دیا۔ بولے " میری تم سے میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ تم مجھ سے نہ اُلجھا کرو پھر

میرے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو تم منہ بسور کے کہہ دو گی " You are very rude "

لیکن خان کو چھیڑنے میں میری کو خاص لطف آتا ہے، کہنے لگی "نہیں میں ایسے تو نہیں کہوں گی لیکن بُرا نہ ماننا مجھے ہندوستانی زلزلوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم ہندوستان کو فی الحال بھول جاؤ اور یہ کہو کہ یہاں بھی تمہیں جھٹکے لگے ہیں یا نہیں؟"

اب خان کرسی کی پشت کے ساتھ تن کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے تم آج کچھ مجھ سے سُننا چاہتی ہو تو سُنو۔ جیسا تم نے کہا ہے میں ہندوستانی زلزلوں کو بھول لینے کی کوشش تو کرتا ہوں لیکن تمہارا مُبارک ملک مجھے یہ بھولنے نہیں دیتا۔ سب سے پہلا شدید ذہنی جھٹکا جو یہاں آ کر محسوس ہُوا تھا وہ میں آج تک نہیں بھولا۔ رہنے کے لئے کمرہ تلاش کرنا بجائے خود ایک تکلیف دِہ امر تھا لیکن اس پر جب یہ علم ہُوا کہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علم کو ہر ایک فرنگی گھر میں ناجنس سمجھ کر قیام کی اجازت نہیں ملتی تو قیام و طعام کا انتظام اور بھی دشوار ہو گیا۔ ہر گلی کوچے میں جا بجا Board and Apartment (قیام و طعام) کی تختیاں مختلف مکانوں کی کھڑکیوں پر لگی ہوئی تھیں لیکن جب میں مکان کی گھنٹی بجا کر مالکۂ مکان سے ملتا تو دروازے پر کھڑے ہوئے جو جواب مجھے ملے اُن میں سے چند یہ تھے:۔

"مجھے بہت افسوس ہے کمرہ رُک گیا ہے"

"میرے پاس دو آدمیوں کے لئے بڑا کمرہ ہے ایک آدمی کے لئے نہیں"

"تم ذرا پہلے آتے تو میں کچھ انتظام کر سکتی تھی۔ مجھے نہایت افسوس ہے"

"یہ بورڈ تو مستقل طور پر لگا رہتا ہے ویسے آج کل میرے پاس کوئی کمرہ خالی نہیں"

"تم اگر ایک بستر میں ایک اور لڑکے کے ساتھ سو سکو تو انتظام ہو سکتا ہے"

"میرے ہاں کھانے کا کوئی انتظام نہیں اور غسل خانہ بھی نہیں ہے"

بسوں، زمین دوز گاڑیوں اور ٹریموں پر گشت کرنے کے بعد جب مختلف عورتوں سے یہ جواب ملتے تو بہت ذہنی کوفت ہوتی لیکن ایک دن تو ستم ہی ہو گیا۔ ایک لینڈ لیڈی نے میری صُورت دیکھتے ہی کہا:۔

"تم ہندوستانی معلوم ہوتے ہو میرے ہاں رنگدار (یعنی کالے) آدمیوں کے لئے کوئی کمرہ نہیں"

اس جواب سے میرے دل و دماغ کو ایسا جھٹکا لگا کہ میرا خون کھولنے لگا۔ میں لینڈ لیڈی کی صاف گوئی کی داد دینے کے لئے تُل رہا تھا کہ اُس نے دروازہ بند کر لیا اور میں اپنا سا مُنہ لے کر ہوٹل میں چلا آیا۔

خان کے اس بیان سے ہمارا تبسم رفتہ رفتہ ہمارے ہونٹوں سے رفع ہو گیا اور اب میری کے چہرے پر کچھ سنجیدگی اور کچھ ناراضی کے آثار نظر آنے لگے۔ خان کے خاموش ہونے پر میری نے چند ثانیے تأمل کرتے ہوئے کہا۔

"خان جو کچھ تم نے کہا ہے۔ وہ بالکل دُرست ہے اور مجھے نہایت افسوس ہے کہ ہمارے مُلک میں تم سے ایسا سلوک ہُوا ہے لیکن بعض دفعہ لوگوں کے سابقہ تجربات اُنہیں اِس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وُہ دوسروں سے ایسا سلوک کریں۔ مثال کے طور پر ہمارے ہمسایوں میں ایک عورت نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ کبھی رنگدار آدمیوں کو اپنے مکان میں ٹھہرنے نہ دیگی۔ لیکن اگر تمہیں اِس کی وجہ معلوم ہو تو میرا خیال ہے تم اُسے کبھی ملعون نہ کرو۔ . . . . . ."

خان نے میری کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے وجہ معلوم ہے۔ تُم یہی کہنا چاہتی ہو کہ ہندوستانی لڑکے جو تمہارے مکانوں میں رہتے ہیں وُہ شریفانہ زندگی بسر نہیں کرتے یعنی لڑکیوں کے پیچھے بھٹکتے پھرتے ہیں اور لینڈ لیڈی تنگ آکر اُنہیں جواب دے دیتی ہے اور اِسی لئے تمہاری ہمسائی نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وُہ کسی ہندوستانی کو اپنے پاس ٹھہرنے نہ دیگی لیکن تم ہندوستانی لڑکوں پر گرفت کرنے کے لئے تو فوراً تیار ہو جاتی ہو اور اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو بُھول جاتی ہو جن کی حالت ہم سے کہیں بدتر ہے۔ ہم میں سے تو پھر بھی پانچ فیصدی شریف لڑکے مِل جائیں گے لیکن تمہارے ہاں تو دونوں لڑکے اور لڑکیاں مِلا کر بھی پانچ فیصدی نہیں بنتے۔ اور یہ جو رنگ کا اعتراض ہے یہ بھی لغو اعتراض ہے۔ تم لوگوں کو چینیوں، جاپانیوں، روسیوں، یہاں تک کہ امریکہ کے حبشیوں سے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں اور اُن کے لئے تمہارے گھر اور تمہارے بازو آغوشِ مادر کی طرح وا رہتے ہیں۔ لیکن جہاں ہندوستانی کا نام آیا تم نے رنگ کا امتیاز پیدا کر کے آنکھیں پھیر لیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اَور کیا ہے کہ تم ہم پر حاکم ہو اور ہمیں اپنا غلام سمجھتے ہو . . . . . ."

خان کف در دہان ہو رہا تھا کہ میری نے اُسے روک دیا "خان تُم نے مجھے بات تو ختم کرنے نہیں دی اور خود ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور واہی تباہی بکنے لگے۔ سنا تھا پٹھان اکھّڑ مزاج ہوتے ہیں اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ لوگوں نے جو رائے تمہارے متعلق قائم کی ہے وُہ غلط نہیں۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ کسی کو بات بھی نہ کرنے دی جائے۔ کِس کا فر نے تم سے لڑکیوں یا رنگ کے امتیاز کا ذکر بھی کیا تھا جو تم نے اس بحث کو اِس قدر طُول دیا ہے میں تو صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ ہماری ہمسائی نے ذاتی تلخ تجربے کی بنا پر فیصلہ کیا تھا کہ وُہ آیندہ ہندوستانیوں کو اپنے مکان میں نہیں رہنے دے گی اور اُسے جو تجربہ ہُوا تھا وُہ یہ تھا کہ گول میز کانفرنس کے دنوں میں اُس نے کانفرنس کے چند ہندوستانی اراکین کو اپنے ہاں رہنے کے لئے کچھ کمرے دیئے۔ گول میز کانفرنس کی چار دانگِ عالم میں شہرت تھی اور ہندوستان سے جو تمہارے نمائندے اس میں شامل ہوئے تھے وہ یقیناً نہایت معزز آدمی تھے اور بہت سے خطاب یافتہ بھی تھے۔ لیکن جب اِس عورت کے مہمان اُس کے گھر سے رُخصت ہوئے تو اُسے یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہُوا کہ اُس کے کمروں کے فرش پر جا بجا سُرخ نشان پڑے ہوئے تھے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہُوا کہ ہندوستانی پان کے پتّوں میں کوئی رنگدار چیز مِلا کر چباتے ہیں، اور پھر اُسے تھوک دیتے ہیں اور یہ اُسی تھوک کے نشان تھے۔ اُس بیچاری نے لکڑی کے فرش سے اِن نشانات کو مٹانے کے لئے لاکھ جتن کئے لیکن نشان رفع نہ ہوئے۔ مجبوراً فرش اُکھڑوا کر نئے لگوانے پڑے۔ تمہیں معلوم ہے ہمارے ہاں سب فرش لکڑی کے ہوتے ہیں)

اور لکڑی یہاں کس قدر گراں ہے۔ ان مہمانوں کی بدولت بیچاری کے تین سو پونڈ فرش بدلنے پر صرف ہو گئے۔ اب تم ہی کہو جب تمہارے شرفا کی یہ حالت ہو تو عام آدمیوں کے متعلق ہم لوگ جو اندازہ قائم کرتے ہیں وہ کہاں تک غلط ہے؟"

اس پر خان پھر چہکنے اور کہنے لگے "یہی تو فرنگی کی سیاست ہے جس نے گدھوں پر پالان ڈالنے کے بجائے زربفت و کمخاب لاد دی ہے۔ گول میز کانفرنس کس نے منعقد کی تھی؟ تم نے۔ ہندوستانی نمائندے جن کو تم شرفاء کا لقب دے رہی ہو کس نے منتخب کئے تھے؟ تم نے۔ یہ شرفا کس کے بنائے ہوئے ہیں؟ تمہارے۔ اب اگر ان شرفا سے تمہیں کوئی گلہ ہے تو اپنے آپ کو کوسو۔ یہ ضروری نہیں کہ تمہارے بنائے ہوئے شرفا یا تمہارے منتخب کردہ کانفرنس کے نمائندوں میں لازمی طور پر انسانیت بھی ہو۔ شائستگی کا جوہر ایسی اکسیر نہیں جو فرنگی کے دیئے ہوئے خطابات کا جزو لاینفک ہو۔ ورنہ تمہیں کانفرنس کے معزز شرفاء کا گلہ کرنے کا موقع نہ ملتا۔"

اتنے میں ملازمہ نے چائے کی اطلاع دی۔ میں نے کہا "لو خان آؤ، یہ دلچسپ بحث پھر شروع کریں گے۔ اب ذرا چائے سے دو دو ہاتھ کرلو۔" اس پر سب چائے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خان نے میز پر بیٹھتے ہی بے تکلف سینڈوچ کھانی شروع کر دی اور اُس کے بعد چائے دانی کی طرف چائے لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا لیکن میری نے روک دیا۔ کہنے لگی "خان تم کتنے بدتمیز ہو۔ ایک بس سے لندن میں ہو لیکن ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ میز پر بیٹھے ہوئے پیالوں میں چائے ڈالنے کا فخر صرف لیڈی کو حاصل ہوتا ہے۔ ٹھہرو میں ابھی چائے بنا کر تمہیں دیتی ہوں۔"

خان نے کہا "تمہارے یہاں دُنیا اُلٹی گھومتی ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ تمہارے ہاں کیا رواج ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اہلِ خانہ مہمانوں کی تواضع میں مصروف رہتا ہے اور بے تکلف احباب کا مجمع ہو تو سب اپنا اپنا خیال رکھتے ہیں لیکن اگر تم ہی چائے بنانے کی صعوبت برداشت کرنا چاہتی ہو تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ ہمیں تو کھانے اور پینے سے غرض ہے۔"

میری نے کہا "خان اصل میں ہندوستان اور انگلستان کے زلزلوں نے مل جل کر تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ورنہ اللہ میاں نے تمہیں اچھا خاصا انسان بنایا تھا۔"

اس پر ایک قہقہہ لگا۔ اب میری پھر شوخ ہو گئی اور خان سے کہنے لگی "اب تک تو تم ذہنی زلزلے کا ذکر کرتے رہے ہو یہ کہو کبھی جذباتی زلزلے کا بھی حادثہ پیش آیا؟"

اس پر سب نے خان کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ اس وقت ہمہ تن ایک کیک کو غارت کرنے میں مصروف تھا۔ کہنے لگا "چائے کے بعد وہ بھی سُن لینا۔ فی الحال چائے تو آرام سے پینے دو۔"

چائے ختم ہوتے ہی اکبری نے میری کے استفسار کا اعادہ کر دیا اور خان صاحب یوں گویا ہوئے "یہی گذشتہ بدھ کا ذکر ہے کہ ایک دوست کی ترغیب سے میں پرنس آف ویلز تھیئٹر میں چلا گیا تھا۔ یہاں دل و دماغ کو بہلانے کے موقعوں سے تو کالج، سینما، کلب، ہوٹل میں اور

سرِراہ ہر جگہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اُن ہنگامی جھٹکوں کو سہنے کی تو عادت ہو گئی ہے۔ لیکن اِس تھئیٹر میں تو جذبات کی دُنیا زیر وزبر ہو گئی۔ ہم تماشا گاہ میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک قتالۂ عالم چند رقعے لے کر سٹیج پر آئی جو اُسے مختلف لوگوں نے اپنے مسائلِ محبت کے حل کرنے کے لئے لکھے تھے اس نے اِن رقعوں کو پڑھا اور اُن کا جواب دیا۔ پھر تماشائیوں سے پوچھا کہ اگر وُہ کوئی سوال کرنا چاہیں تو وُہ اُس کا جواب دے گی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں بھی عقبی کرسیوں سے پکارا "تم کسی سے محبت کر سکتی ہو؟" جانتے ہو اُس نے کیا جواب دیا کہنے لگی "حالات پر منحصر ہے لیکن میرے محبوب کا رنگ سفید ہونا چاہئیے"۔ اِس پر میں اِس قدر خفیف ہُوا کہ اُس کے بعد جو برہنہ اور نیم برہنہ لڑکیاں رقص کرنے کے لئے آتی رہیں تو میری آنکھوں کے سامنے ایک دُھندلا سا پردہ پڑا رہا۔ رضی میرے ساتھ تھا۔ اُس نے میری کیفیت کو بھانپ لیا اور وقفے میں مجھے اُٹھا کر ایسے ہی تھئیٹر کی نچلی منزل میں لے گیا۔ بانات سے منڈھی ہوئی سیڑھیوں سے گزرتے ہوئے میں نے اس سے کئی بار پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو لیکن وُہ میرا بازو پکڑے ہوئے نیچے اُترتا گیا۔ اور ایک ہال میں مجھے دھکیل کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا "یہ منظر کچھ آسودگی کا باعث ہوگا"۔ اِس ہال میں ایک دیوار کے ساتھ چند نیم برہنہ لڑکیوں کا آرکسٹرا تھا جو ناچ کی گت پر ساز بجا رہی تھیں اور اُن کے بالمقابل دُوسری دیوار کے ساتھ پندرہ سولہ نہایت حسین اور کمسن لڑکیاں ناچ کے سائے (جو صرف نام کے سائے ہوتے ہیں) پہنے ہُوئے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں اور اُن کے سامنے ایک تختے پر لکھا ہُوا تھا "ناچ کے لئے شرکا"۔ باقی دو دیواروں کے ساتھ ساتھ چھوٹی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے چند تماشائی شراب نوشی میں مصروف تھے اور ہال کا وسطی حصّہ ناچ کے لئے خالی پڑا ہوا تھا۔ رضی نے پوچھا "ناچوگے، دقفہ صرف پندرہ منٹ کا ہے۔ دو ناچ ناچ سکتے ہو۔ کہو کون سی پسند ہے؟" میں نے کہا "بھائی میں تو ناچنا نہیں جانتا اور یُوں بھی اس زلزلے کے بعد کسے ہوش ہے کہ انتخاب کی جرأت کر سکے۔ اور یہ تو کہو اِس کے دام کیا ہونگے؟" رضی کہنے لگا "داموں کی فکر مت کرو۔ یہ سب مفت ہے۔ اس تماشا گاہ میں آنے والوں کو رفیقۂ رقص مفت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ لو اب وقت مت ضائع کرو۔ کوئی پسند ہے تو اُسے ساتھ لے لو۔ مَیں تو اِس نیلے رنگ کے سائے والی کے ساتھ ناچونگا" یہ کہہ کر رضی آگے بڑھ گئے، اور ہم خدا جانے کیا کیا سوچتے رہے۔ تماشا گاہ سے باہر نکلے تو کئی گھنٹوں تک سٹیج، آرکسٹرا، شرکا، رقص اور پھر سٹیج باری باری آنکھوں کے سامنے گردش کرتے رہے"۔

خان کے خاموش ہونے پر میری خان کو داد دینے پر آمادہ ہو رہی تھی کہ اکبری نے کہا "اب وقت ہو گیا ہے۔ گھر سے نکلنا چاہئیے ورنہ ارلز کورٹ کے شو پر وقت پر نہیں پہنچ سکیں گے"۔

اس پر ہم سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ارلز کورٹ اولمپیا کے بعد لندن میں دُوسرا بڑا ہال ہے جس کی وسعت پر ہماری نمائش گاہوں کے میدانوں کو بھی رشک آئے۔ گزشتہ سال اولمپیا میں سرکس اور کئی دیگر نمائشیں تو دیکھی ہی تھیں لیکن جب گھڑ دوڑ اور مکانات کی نمائشیں دیکھیں تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اسی ہال میں گھڑ دوڑ کا میدان بنایا گیا تھا اور نمائش کے لئے درجنوں مکانات دو دو تین تین منزلوں

کے تیار کیئے گئے تھے ۔ اور اس سال ارلز کورٹ تو اولمپیا سے بھی بازی لے گیا ۔ دُنیا میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی ہال کے اندر مصنوعی برف کے مناظر حقیقی مناظر کی طرح بنائے گئے ہوں اور اُن پر برف کے کھیلوں یعنی سِینگ اور سکیٹنگ کا انتظام کیا گیا ہو ۔ اس نمائش کا پہلا حِصّہ مختلف طرح کے ناچوں پر مشتمل تھا ۔ ہمارے نشستوں پر بیٹھتے ہی پروگرام شروع ہو گیا ۔ سَو کے قریب لڑکیاں مختلف ملکوں کے لباس بدل بدل کر اُن ملکوں کے ناچ لکڑی کے تختوں پر دکھا کر تماشائیوں سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہیں ۔ رقص کے ساتھ ساتھ اُن ملکوں کی موسیقی بھی ہم آہنگی کے لئے آرکسٹرا سے سنائی دے رہی تھی اور حاضرین "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" سے بیک وقت محظوظ ہو رہے تھے ۔ اتنے میں لاؤڈ سپیکر سے نصف وقت کا اعلان کیا گیا اور ہزار ہا تماشائیوں کی سرگوشیوں سے ہال میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی سی گونج پیدا ہو گئی ۔ بچوں اور لڑکیوں نے جیبوں سے چاکلیٹ نکال کر کھانے شروع کر دیئے ۔ کچھ لوگ شراب نوشی کے لئے بار (Bar) کی طرف چل دیئے ۔ باقیوں نے سگرٹ سُلگا لئے ۔

خان نے بھی ایک نیم انگڑائی لے کر جیب کو ٹٹولا ۔ اور کچھ کھوئے کھوئے سگرٹ کی ڈبیا نکال کر سگرٹ علیؔا اور میری کی طرف بڑھائے جنہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیئے ۔ اکبری نے چاکلیٹ کا ڈبا کھولا اور ہماری طرف بڑھا دیا ۔ خان کی غیر معمولی بیخودی ہم سب کے لئے دلچسپی کا باعث بن رہی تھی ۔ ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہے تھے کہ میری نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا

"خان کہو تماشا کیسا رہا ؟"

خان نے لا اُبالیانہ انداز میں جواب دیا "اچھا تھا"

"صرف اچھا ہی تھا یا کچھ اَور بھی تھا ۔ معلوم ہوتا ہے تم تو کسی اَور عالم میں پہنچ گئے ہو ، کہو یہاں سے کتنی دُور ہو ؟"

"میں یہاں ہی ہوں ۔ کچھ ایسے ہی سوچ رہا تھا ۔"

"ہم بھی سُنیں کیا سوچ رہے تھے ۔"

"یہی کہ تمہارے تمام تماشوں میں لڑکیاں یا تو بدن سے چپکے ہوئے چُست لباس پہن کر آتی ہیں اور یا برہنہ یا نیم برہنہ ہی آ جاتی ہیں لیکن مرد بیچارے عام لباس سے بھی زیادہ ڈھیلے ڈھالے اور پُورے کپڑے پہن کر سٹیج پر آتے ہیں اور لباس کے رواج میں یہ ناانصافی تماشا گاہوں تک ہی محدود نہیں بلکہ باہر کی دُنیا میں بھی مردوں پر بہت ظلم ہوتا ہے ۔ اب موسمِ گرما کے لباسوں ہی کو دیکھ لو تم خود گرمیوں میں جب اپنے لباس کی قطع و برید ہر طرف سے شروع کرتی ہو تو ساحلِ بحر پر پہنچ کر تمہارے لباس اِس حد تک رہ جاتے ہیں کہ اُنہیں خواہ اُونی یا ریشمی دھاگوں سے موسوم کر لیں اور خواہ Beach Clothes (ساحلی لباس) کہہ لیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن مردوں کے لئے گرمیوں میں ٹھنڈے سُوٹ تک کا رواج نہیں ۔ گرمی سے جان نکل رہی ہو لیکن اُن بیچاروں کو ٹائی ، کالر اور کم از کم فلالین کی پتلون پہننی ہوتی ہے ۔"

میری بولی "تو تم اس کی وجہ پوچھنا چاہتے ہو؟"

خان نے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نہیں میں وجہ تو نہیں پوچھنا چاہتا ایسے ہی حیران ہو رہا تھا۔ لیکن اگر تم وجہ بیان کر دو تو یہ حیرانی بھی رفع ہو جائے گی۔"

میری نے کہا "اس میں حیران ہونے کی بات ہی کونسی ہے۔ عورت بہرحال صنفِ نازک ہے اور اگر وہ اپنی آسائش کے لئے موسم کے مطابق لباس تبدیل کرتی رہتی ہے یا نئے نئے فیشن ایجاد کرتی ہے تو اس پر اظہارِ تعجب کی کیا ضرورت ہے اور اگر مرد بھی نیم برہنہ ہو کر سڑکوں پر چلنا شروع کر دیں تو سوائے اس کے کہ اپنے ہم جنسوں کی نظروں کو مجروح کریں اور تو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

اکبری نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "گستاخی معاف نہ صرف یہ کہ لوگوں کی نظروں کو مجروح کریں بلکہ پولیس والے انہیں فوراً پکڑ لیں۔"

اس پر ایک قہقہہ لگا اور ہم پھر تماشے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تماشائیوں کے وسط میں جس جگہ ہال میں لکڑی کا فرش لگا ہوا تھا اور جس پر تماشے کے نصفِ اول میں لڑکیاں رقص کرتی رہی تھیں وہ سارا فرش منٹوں میں ہٹا دیا گیا۔ اور اس کے نیچے اب برف کا فرش نظر آ رہا تھا تماشائیوں کے سامنے کی دیوار کپڑے کی تھی، وہ بھی کلوں کی مدد سے ہٹا دی گئی اور لکڑی کے دیگر پردے بھی کھسکتے ہوئے تماشائیوں کی نظر سے گم ہو گئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو ہم کوہ ایلپس کی کسی وادی میں ہیں۔ ہر چہار طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ پہاڑوں کی اونچی نیچی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں، جابجا دیودار کے درخت اُگے تھے۔ یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے دامن میں برف میں دبی ہوئی ایک کٹیا بھی نظر آ رہی تھی اور یہ سب کچھ ارلز کورٹ کے ہال میں مصنوعی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ ان پہاڑیوں کے وسط میں ایک نسبتہً ہموار برف کی ڈھالواں سڑک تیار کی گئی تھی جس پر کرتب دکھانے والوں کو کرتب دکھانے تھے۔ سب سے پہلے ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ایک سوئٹانی نے پہاڑی گیت گایا جس کو سن کر ہمیں ہندوستانی چرواہوں کی یاد آ گئی۔ اس کے بعد انگلستان، جرمنی، امریکہ، فرانس بلجیم اور سوئٹزرلینڈ کے چند لڑکوں اور لڑکیوں نے برف پر پھسلنے اور دوڑنے کے پُرلطف اور خوفناک کرتب دکھائے۔ یہ سب لوگ (SKIS) شی پہنے ہوئے تھے جو ایک قسم کی تین فٹ سے لے کر چھ فٹ لمبی اور دس انچ چوڑی لکڑی ہوتی ہے اور اس کا اگلا سرا چکوالی جوتی کی طرح اوپر کو اٹھا ہوا اور اندر کو مڑا ہوتا ہے۔ اس طرح کی دو لکڑیوں کے وسط میں پاؤں رکھ کر باندھ دیئے جاتے ہیں اور سہارا لینے کے لئے دونوں ہاتھوں میں ایسے عصا پکڑے جاتے ہیں جن کے ٹیک لینے والے سرے نہایت تیز ہوتے ہیں تاکہ برف میں گڑ جائیں لیکن سرے سے دو چار انچ اوپر ایک دھات کا گول چکر سا لگا ہوتا ہے جو تیز سرے کو برف میں گہرا نہیں جانے دیتا ان عصاؤں سے ٹیک لینے کے علاوہ سرعت سے برف پر پھسلنے کے وقت توازن قایم رکھنے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔

گیارہ بجے تماشا ختم ہوا تو گھر کو لوٹے۔ راستے میں میری نے خاص طور پر خاں سے پوچھا "کہو خان لطف آیا؟"

"ہاں بہت لطف آیا۔"

"دیکھو اُن لوگوں نے لاکھوں پونڈ صرف یہ پہاڑ بنانے اور اُن پر برف جمانے میں صرف کر دیئے ہوں گے۔ اب بھی اگر تمہیں لطف نہ آتا تو کیا ہوتا۔"

خان نے دبی زبان سے کہا "لاکھوں پونڈ خرچ کئے ہیں تو کون سے اپنی گرہ سے کئے ہیں۔ یہ بھی ہماری ہی جیب کاٹ کر روپیہ جمع کرتے ہیں"

میری نے پوچھا "'ہماری' سے تمہاری کیا مُراد ہے؟"

"یہی ہندوستانیوں کی"

خان کے اس قول پر میری پھر مشتعل ہوگئی۔ کہنے لگی "خان تم بعض دفعہ نہایت لایعنی باتیں کرتے ہو۔ وُہ پانچ ہزار انگریز تماشائی تو تمہیں نظر نہیں آئے جو ہال میں بیٹھے ہوئے تھے، اور یہ دو ہندوستانی جو آج وہاں گئے تھے اُن کی جیبیں کٹ جانے کا تمہیں بہت افسوس ہے تم کتنے ناانصاف ہو۔ خدا جانے تم نے عقل کہاں کھودی ہے۔"

خان نے نہایت متانت سے جواب دیا "میری اس پر بگڑنے کی کون سی وجہ ہے؛ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ آج کی رات میں ارلز کورٹ والوں نے ہندوستانیوں کو لُوٹ لیا ہے، میری مُراد تو یہ تھی کہ تمہاری قوم کے تموّل کا انحصار بیشتر ہندوستانیوں کی جیبیں کاٹنے پر ہے۔ اور نہیں تو کم ازکم گذشتہ ڈیڑھ سَو سال سے تو تم ہمیں لُوٹ رہے ہو۔"

اِس پر میری اَور بھی برافروختہ ہوگئی، بولی "کیا لغو باتیں کرتے ہو۔ ہم ہندوستان میں ڈاکے تو نہیں ڈالتے۔ ابھی چند دن ہوئے تمہارے ہائی کمشنر ہی نے ایک لکچر میں کہا تھا کہ انگریز ہر اُس دانے کی قیمت ادا کرتا ہے جو وُہ ہندوستان سے باہر لے جاتا ہے"۔

اب خان بھی جوش میں آ گئے۔ کہنے لگے "ہاں ہائی کمشنر کا بیان حرف بحرف درست ہے لیکن اخبار میں اُس پارٹی کا حال بھی پڑھا تھا جو وائسرائے کی آمد پر اُسے لندن میں دی گئی تھی۔ مہمانوں کی فہرست میں کم و بیش ایک ہزار مرد و عورتوں کے نام شائع ہوتے تھے۔ سیوائے (SAVOY) ہوٹل کا ٹھیکا تھا۔ شراب و نقل کے لئے سیوائے نے کم ازکم ایک گنی فی کس وصُول کیا ہوگا۔ دیگر مصارف الگ تھے۔ یہ جو ہندوستانی روپے کی غیر مرئی درآمد اور ہندوستانی روپے کا غیر مرئی استعمال لندن میں ہوتا ہے، یہ اگر تمہارے تموّل و ثروت میں اضافہ نہیں کرتا تو کم ازکم ہمارے فاقوں میں تو ضرور اضافہ کرتا ہے۔ اِس پر اگر تُم مجھے ناانصاف اور لغو گو کہتی ہو تو تمہاری خوشی۔ عقل خداداد چیز ہے اور اگر فطرت نے تمہیں یہ عطیہ ودیعت کرنے میں بُخل سے کام لیا ہے تو مجھے تُم سے کوئی گِلہ نہیں۔"

اِس پر میری کو ایسی چپ لگی کہ اُس کی وجہ سے سارا راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا اور گڈ نائٹ کہہ کر ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

محمّد باقر

کشمیر

رفعتوں میں ہمسرِ چرخِ کہن میرا وطن
نزہتوں میں غیرتِ صحنِ چمن میرا وطن
فصلِ گُل میں رُوکشِ باغِ عدن میرا وطن
مرز بومِ گُل، دیارِ یاسمن میرا وطن
انتخابِ دو جہاں میرا وطن میرا وطن

کھیلتی ہیں اس کے سبزے میں بہاریں خُلد کی
خار اُڑاتے ہیں یہاں گلہائے جنّت کی ہنسی
اس کے ہر منظر سے پیدا ہے جہانِ دلکشی
گُل تو کیا، کانٹوں میں بھی بکھری پڑی ہے زندگی
جلوۂ گُل سے چمن اندر چمن میرا وطن

یہ چمن، یہ بوستاں، یہ گلکدہ، یہ لالہ زار
یہ حسیں چشمے، یہ پیاری ندیاں، یہ آبشار
یہ فضائے رُوح پرور، یہ ہوائے مُشکبار
چاہتا ہے جی کہ پہروں لُوٹیے ان کی بہار
موردِ لُطفِ خدائے ذو المنن میرا وطن

قیس یہ خاکِ وطن۔ یہ خطۂ مینو بدوش
یہ ہوائے وجد آور، یہ نسیمِ گُل فروش
دامنِ کہسار میں بہتے ہوئے پانی کا جوش
ہر طرف سے دعوتِ نغماتِ بہرِ گوشِ ہوش
جانتا ہے دلنوازی کے چلن میرا وطن

آؤ سب مِل جُل کے ایسے مُلک کی خدمت کریں
آؤ اِس جنّت سے رنجِ مفلسی رخصت کریں
ایک جیسی قوم کے ہر فرد سے اُلفت کریں
آؤ! ارضِ ہند میں پیدا نئی مِلّت کریں
چھوڑ دے تفریقِ شیخ و برہمن میرا وطن

قیس شروانی

ہیروں کا سوداگر

"میری تعلیم ایک خالص انگریزی سکول کی ایسی فضا میں ہوئی ہے جہاں اُردو زبان سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں لی جاتی لیکن چونکہ میں ایک ہندوستانی لڑکی ہوں مجھے ہمیشہ اپنی مادری زبان سے دلچسپی رہی ہے اور میں نے اپنی کوشش سے تھوڑی بہت اُردو سیکھی ہے میں اپنی ناقابلیت سے واقف ہوں لیکن جو تھوڑا بہت میں نے سیکھا ہے اس کا اندازہ آپ کو میرے اس ترجمے سے ہوگا۔ اُردو کی تعلیم کے حاصل کرنے میں مجھے ہمیشہ رکاوٹوں کا سامنا ہوا ہے ...... اس لئے میں آپ سے حوصلہ افزائی کی توقع رکھتی ہوں۔" (راقمہ)

ٹیلیفون کی گھنٹی کرخت آواز سے بجتی ہوئی سنائی دی۔

لانگ فیلو ڈریو چڑ گیا۔ وُہ نہایت سکون کے ساتھ تاش کے ایک کھیل میں مشغول ہو کر شام کے کھانے کی گھنٹی کا انتظار کر رہا تھا اس لئے ٹیلیفون کی مداخلت اُسے ناگوار ہوئی۔

برقی لیمپ کو ایک طرف ہٹا کر اُس نے بیزاری سے رسیور اُٹھایا اور بولا "ہلو!"

جیسے ہی اُس نے بات سُنی ایک خفیف مُسکراہٹ سے اُس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

"ہاں براہِ مہربانی ...... ان کو بھیج دیجئے۔" اُس نے رسیور رکھ دیا لیکن ابھی تک وُہی مُسکراہٹ اُس کے چہرے پر نمایاں تھی اور وُہ بے پروائی سے میز پر بکھرے ہوئے پتّوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے شانوں کو حرکت دیتے ہوئے دوبارہ کھیل شروع کر دیا۔ حساس اُنگلیاں تیزی سے تاش کے پتوں کو پھینک رہی تھیں۔

اس اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے سامنے میز پر بکھرے ہوئے پتوں پر سے نظر اُٹھائے بغیر کہا "آئیے۔"

دروازہ کھُلا اور ایک دراز قد آدمی اوورکوٹ اور فلیٹ ہیٹ پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک پتے کو دوسرے پر رکھتے ہوئے ڈریو نے اپنے ملاقاتی کی طرف دیکھ کر کہا "بیٹھو بیٹس" پھر اپنی کرسی پر گھوم کر اُس کا جائزہ اُن آنکھوں سے لیا جو اُسے غور سے ٹکٹکی لگائے گھور رہی تھیں۔

اُس نے کچھ طنزیہ انداز سے کہا "فرمایئے! اس وقت شام کو خفیہ انسپکٹر ہیری بیٹس نے اپنی آمد سے میری عزت افزائی کیوں کی ہے؟"

انسپکٹر ہیری بیٹس نے اپنی ٹوپی میز پر رکھ دی اور بیٹھتے ہوئے سوال کیا "تم اس کو عزت افزائی سمجھتے ہو ڈریو؟"

"بیشک! میرے عزیز دوست عزت افزائی! خواہ تمہاری آمد ملازمت سے تعلق رکھتی ہو۔ لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ میں عین اس وقت جبکہ میں ہندوستان کو روانہ ہو رہا ہوں تمہاری اس ملاقات سے متعجب ہو گیا ہوں"۔

"بیشک! یہی بات ہے۔ کیا میں ہندوستان کی اس اچانک سیر کا سبب دریافت کر سکتا ہوں؟"

صرف پل بھر کے لئے ڈریو پریشان معلوم ہوا۔ اُس نے پتّوں کے مجموعہ کو اپنے ہاتھوں میں درہم برہم کیا اور پھر میز پر رکھ دیا۔ "بیٹس، میں اس کو ایک نازیبا سوال سمجھتا ہوں"۔ پھر اُس کے سوال سے خوش ہو کر کہنے لگا "لیکن یہ خاص قسم کی دلچسپی کیوں؟ درحقیقت میرے افعال صرف اُنہیں لوگوں سے مطلب رکھتے ہیں جن سے اُن کا تعلق ہے"۔

"لیکن بات یہ ہے کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ (خفیہ پولیس کا محکمہ) بھی اُن سے تعلق رکھتا ہے، چھپاتے کیوں ہو ڈریو؟ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا ارادہ ایک لاکھ پونڈ کی قیمت کے ہیرے بلامحصول ہندوستان لے جانے کا ہے۔ سرکارِ ہند نے اس کے تدارک کی درخواست دی ہے"۔

لانگ فیلو ڈریو نے اپنا سر معنی خیز طور پر ہلایا "تو پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں دوبارہ اسکاٹلینڈ یارڈ کی نظروں میں کھٹک رہا ہوں۔ اچھا! میں خوش ہوں کہ اس مرتبہ تم ہو بیٹس۔ اور اس محکمہ کا کوئی اور بیہودہ شخص نہیں ہے جس سے مجھے نبرد آزما ہونا پڑے۔ ایک قابل حریف سے مقابلہ زندگی کو پُرلطف بنا دیتا ہے"۔

بیٹس نے دریافت کیا "تو تم اس الزام سے انکار نہیں کرتے؟"

ڈریو نے اپنے شانوں کو حرکت دے کر جواب دیا "میں کیوں کروں؛ اس وقت ہماری دوستانہ گفتگو کو سُننے والا کوئی گواہ تو ہے نہیں۔ شاذ و نادر ہی اہم معاملات اسکاٹلینڈ یارڈ والوں کی تیز نظروں سے بچتے ہیں، خواہ وہ بعض اوقات ناکام ہی کیوں نہ رہیں جیسا کہ وُہ اس مرتبہ رہیں گے۔ یقین کرو! میرے دل میں اسکاٹلینڈ یارڈ کی بہت قدر ہے"۔ پھر بھی اُس نے ماضی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا "پانچ سال گزرے اس محکمہ سے میرا جھگڑا ہوا تھا"۔

کچھ دیر تک اِن دونوں کے درمیان جو ظاہرًا ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے لیکن اپنی زندگی کے احوال میں بہت مختلف تھے خاموشی رہی۔ آتشدان پر گھڑی ایک ہی آواز میں مسلسل ٹِک ٹِک کرتی رہی۔

ہیری بیٹس نے قسمت کے اُس پیچ کو یاد کیا جس نے ایک کامیاب کاروبار کو تباہ کر دیا تھا۔ اُسے آپس کی دوستی کے وہ سال یاد آ گئے جو اُن دونوں نے پبلک سکول اور یونیورسٹی میں باہم گزارے تھے۔

اس کے بعد بھی یہ دوستی اس وقت تک قائم رہی تھی جب لانگ فیلو ڈریو جسے جواہرات کی تجارت میں عالمگیر شہرت حاصل

ہو چکی تھی ایک غلط الزام کی وجہ سے جھوٹی لیکن نہایت زبردست شہادت کی بنا پر کچھ عرصے تک قید رہا تھا۔ بیٹس کے سامنے وہ نظارہ آ گیا جب ڈریو نے عدالت میں علانیہ طور پر یہ کہہ کر سنسنی پیدا کر دی تھی کہ جس طاقت نے ایک بےگناہ معصوم شخص کی توہین کی اجازت دی ہے اس کو نقصان پہنچایا جائے گا۔

اس کی رہائی کے بعد اسکاٹلینڈ یارڈ والے برابر اس کی عقلمندی اور بہت جرأت کی بدولت دھوکا کھاتے رہے۔ وہ بار بار قیمتی جواہرات بغیر محصول ادا کئے لاتا اور لے جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود لانگ فیلو ڈریو نے ایک پائی بھی اپنے ذاتی عیش و عشرت پر صرف نہ کی تھی۔ ہر کامیابی کے بعد وہ تمام حاصل شدہ رقوم کسی غریب خانے یا ہسپتال یا کسی اور کارِ خیر میں دے دیتا تھا۔ لیکن حکام کی مطلق خواہش نہ تھی کہ اس روبن ہڈ کی سی زندگی سے چشم پوشی کی جائے۔ اگرچہ حملہ صرف مالگزاری پر ہوتا تھا مگر اس چابکدستی اور صفائی سے کہ وہ حیران رہ جاتے تھے۔

ڈریو تنہا کام کیا کرتا تھا۔ اس کا کوئی مددگار نہ تھا اور نہ اس کے طریقوں میں کسی قسم کی ناشائستگی یا بھدا پن تھا۔ ہر مشکل میں اس کی خوش طبعی برقرار رہتی تھی۔ اب اِس وقت جبکہ اسے سخت خطرہ درپیش تھا وہ بڑے سکون کے ساتھ اپنے ارادوں کا اقرار کر رہا تھا۔ خفیہ انسپکٹر ہیری بیٹس کو اس کے مضبوط ارادے پر بہت تعجب ہوا۔ اُس نے اپنے فرض کے خلاف اپنے ایک ایسے قریبی دوست کی مخالفت پر اپنے آپ کو ملامت کی۔ وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا لیکن آخر کار فرض دوستی پر غالب آ گیا۔ وہ اپنی کرسی پر آگے کی طرف جھکا۔

اُس نے متانت سے مشورہ دیا "یہ ارادہ ترک کر دو ڈریو۔ تم خواہ ننانوے بار کامیاب ہو جاؤ لیکن سوویں بار تمہاری قسمت..."

ڈریو نے بیقراری سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "قسمت! میرے عزیز دوست قسمت تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ یہ محض سخت محنت اور اپنے مخالف سے دو قدم آگے عقل دوڑانے کا سوال ہے۔"

چند لمحوں تک دونوں میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ کھانے کی گھنٹی کی ہلکی آواز نے کمرے میں گونجتے ہوئے اُس خاموشی کو توڑا جو ان دونوں پر طاری تھی۔

بیٹس نے جواب دیا "مان لیا۔ لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب تم اپنے آپ کو دو قدم پیچھے پاؤ گے۔" اُس نے اُسی جوشیلی آواز میں کہا "ہماری پرانی دوستی کی خاطر اپنی زندگی کا موجودہ باب بند کر دو اور دوسرا شروع کرو۔"

اُس نے پتّوں کا مجموعہ اُٹھا کر درہم برہم کرتے ہوئے کہا "میرے عزیز بیٹس، تم بالکل درست کہتے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میری کامیابی ہمیشہ قائم رہنے والی نہیں ہے لیکن پھر بھی میں نے "انصاف کی غلطی" کے عوض ایک رقم خیرات میں دینے کا

وعدہ کیا ہے جب تک یہ موعودہ رقم حاصل نہ ہو جائے، میں اِس مہم کو جاری رکھوں گا۔ خواہ گرفتار ہو جاؤں"۔

اُس نے آخری الفاظ نہایت آہستگی سے کہے۔ پھر گویا اپنے دماغ پر سے ایک بوجھ اُتارتے ہوئے کہنا شروع کیا " پتوں کو فیصلہ کرنے دو۔ حالانکہ میں نے ایک یتیم خانے کو پانچ ہزار پونڈ جو لازمی چندہ ہے دینے کا وعدہ کیا ہے اگر یہ پتے میرے خلاف ہو جائیں تو میں اپنی جیب سے یہ رقم ادا کر دوں گا۔ اگر نہیں تو محکمۂ مالگذاری کو یہ چندہ دینا چاہئے"۔

اُس نے پتوں کو پنکھے کی شکل میں میز پر بکھیر دیا اور بیٹس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " میرے مخالفین تین بمقابلہ ایک کے ہیں۔ اگر اینٹ کا یکہ نکل آیا تو میں اپنی ابتدائی تدبیر کی پیروی کروں گا ورنہ پھر میں دوبارہ ایک ایماندار شخص بن جاؤں گا"۔

جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی انگلیاں بکھرے ہوئے پتوں کی طرف اُٹھیں، اُس نے ایک پتہ کھینچا اور اُس کا رُخ نیچے کی طرف کئے ہوئے میز پر رکھ کر مسکرایا۔ اُس نے دوبارہ کہا " میرے خلاف بمقابلہ ایک کے تین مخالفین ہیں بیٹس۔ اہا! اچھا! اُس نے پتے کو پلٹ کر اینٹ کا یکہ دکھایا۔

بیٹس نے ہنس کر کہا " کوئی فائدہ نہیں ہے ڈریو!"

خفیہ انسپکٹر بیٹس نے ایک آہِ سرد بھری۔ اُس کے تمام ارادے ایک پتہ کے تیج پر ناکام ہو گئے۔ وُہ کھڑا ہو گیا۔

اُس نے اپنی ٹوپی اُٹھاتے ہوئے کہا " حالانکہ مجھے یہ پسند نہیں ہے ڈریو، لیکن مجھے اپنے فرض کو انجام دینا ہے میں حتے المقدور تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش کروں گا"۔

" اور میرے عزیز دوست اگر تم اس میں کامیاب ہوئے تو میں تم سے کسی قسم کی عداوت نہیں رکھوں گا۔ میں مجبور ہوں۔ ایک قابل محکمہ کو زک دینا میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے"۔

وہ خفیہ انسپکٹر کو کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک لمحے کے لئے بھی بیٹس کی عقل کی تحقیر نہ کی بلکہ وہ خیال کرتا رہا کہ خدا جانے اس کو کتنا کچھ معلوم ہے۔ وہ خیالات کے سمندر میں غرق ہو کر اپنی صُورت کو آتشدان کے اُوپر آئینہ میں دیکھتا رہا۔ اُس نے فیصلہ کیا " میں اپنے ارادہ کو ہرگز تبدیل نہ کروں گا بلکہ اس تدبیر کو انجام دوں گا"۔ اُس نے بتی بجھائی اور کمرے سے نکل گیا۔

ڈنر کے بعد ڈریو نے کھانے کے کمرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ دُور کی میز پر ایک خاتون اپنی قہوہ کی پیالی سے کھیل رہی تھی

ڈریو کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے زیرِ لب کہا " ادھو میں تو بھول ہی گیا تھا!"

تیزی کے ساتھ قہوہ پی کر وہ اپنے کمرے میں واپس گیا۔ برقی چراغ روشن کر کے وہ چاندی کے ایک جھنجھنے کی تلاش کرنے لگا۔ اُٹھاتے وقت جھنجھنا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ ڈریو نے جھک کر اُسے اُٹھا لیا اور روشنی میں لے جا کر دیکھا تو اُس کے اُوپر کے حصّہ پر دندانے پڑ گئے تھے۔ ڈریو نے اُسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور کھانے کے کمرے میں آ گیا۔ وُہ ایک خاتون کی طرف بڑھا جو اُسے آتے دیکھ کر مسکرائی۔ اور اُسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ وُہ بیٹھ گیا اور کہا " ٹیڈی کیسا ہے مسز فیلڈ؛ دوسرے افکار کی کثرت کی وجہ سے مَیں اپنے وعدے کو تقریباً بھول گیا تھا۔"

مسز فیلڈ نے جواب دیا " شکریہ! مسٹر ڈریو، ٹیڈی اچھا ہے"

ڈریو نے ہنستے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھنجھنا نکال کر مسز فیلڈ کے سامنے میز پر رکھ دیا۔" یہ موعودہ تحفہ ٹیڈی کے چاہنے والے قدردان کی طرف سے ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ ابھی ابھی میرے ہاتھ سے گر پڑا اور اس کے اوپر کے حصّہ میں دندانے پڑ گئے ہیں لیکن خیر! ہندوستان پہنچنے پر مجھے دے دیجئے گا میں ٹھیک کرا دوں گا۔"

مسز فیلڈ بہت خوش ہوئی اور کھلونا لے لیا۔ اور اس قیمتی کھلونے کے لئے ڈریو کا جس سے واقفیت حاصل کئے اُسے فقط چوبیس گھنٹے ہوئے تھے، بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ وُہ اپنے شوہر کے پاس جو ہندوستان میں ملازم تھا جا رہی تھی۔ اُس صبح ہوٹل میں پہنچنے پر اُس کے ننھے بچّے نے اس اجنبی کی ٹوپی پکڑ کر جب وہ سیاحوں کی کتاب میں اپنا نام وغیرہ درج کر رہا تھا واقفیت پیدا کر لی تھی۔ اجنبی نے مُڑ کر بچّے کی اس حرکت کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ اور اتفاقیہ ملاقات نے بہت جلد دوستی پیدا کر دی۔ خاصکر اس وقت جب انہیں معلوم ہُوا کہ کل وُہ ایک ہی جہاز سے ہندوستان کو روانہ ہونے والے ہیں۔ دوپہر بھر ڈریو اور ٹیڈی ہوٹل کے آرام کمرے میں کھیلتے رہے جس سے یہ ننھا بچہ بہت خوش تھا۔ بچوں کے ساتھ ڈریو کا طرزِ عمل نہایت دوستانہ تھا۔ ڈریو کو جب معلوم ہُوا کہ ٹیڈی کی پہلی سالگرہ اگلے روز ہونے والی ہے تو اُس نے بہت اصرار کر کے مسز فیلڈ سے تحفہ دینے کی اجازت لے لی۔

کچھ دیر تک دونوں میز پر بیٹھے باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ آخر کار مسز فیلڈ علی الصباح سفر کے عذر سے معافی پیش کر کے اس کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ لانگ فیلو ڈریو اُٹھا اور باہر جا کر ٹہلنے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ ایک آدمی اُس کی تمام حرکتوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وُہ خوش ہو کر ہنسا اور ٹہلنے میں مصروف رہا۔ اور جواہرات کو بلا محصول لے جانے کی تدبیر پر غور کرتا رہا۔ پھر ایک آخری سگریٹ پی کر اپنے کمرے کے دروازے میں داخل ہُوا۔

دُوسرے دن علی الصباح لانگ فیلو ڈریو بیدار ہُوا۔ وُہ اطمینان سے تیار ہُوا اور باقی ماندہ سامان کو باندھنے کے بعد ہوٹل کے

ملازم کو اپنا سُوٹ کیس دے کر ایک ہینڈ بیگ اٹھائے ہوائی بندرگاہ کی طرف روانہ ہُوا جہاں سے ڈاک جہاز ہندوستان کو روانہ ہونے والا تھا۔
صبح کے تاروں کی دھندلی روشنی میں ہوائی جہاز کسی عجیب و غریب عفریت کی طرح ہوائی بندرگاہ پر پر پھیلائے آرام کرتا ہُوا معلوم ہو رہا تھا۔
جب عام رسمی باتیں ہو رہی تھیں اُس نے ایک آدھ بات مسز فیلڈ سے کی اور سوتے ہوئے ٹیڈی کے رُخسار کو تھپتھپا کر اُسے ہنسایا۔

پھر وہ اپنا ہینڈ بیگ اُٹھا کر قوی ہیکل جہاز کی جانب روانہ ہُوا۔ وُہ اندر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ اُس نے اپنے شانے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ وُہ مُڑا اور جب بیٹس کو اپنے پیچھے کھڑا پایا تو مسکرایا۔
اُس نے کہا "ہلو! کیا اُسی کام نے تم کو اتنا سویرے بستر سے اُٹھا کر کھڑا کر دیا ہے؟"
"بیشک! میں تمہارے ساتھ ہندوستان جا رہا ہوں۔"
"یہ بہت دلچسپ بات ہے۔ مجھے ایسے موقعے بہت کم میسر ہوتے ہیں جب میں پولیس کی حفاظت میں اپنی کسی مہم کی انجام دہی میں مصروف ہوں۔"
خفیہ انسپکٹر بیٹس نے اس طنزیہ مذاق پر اپنا نیچے کا ہونٹ دانت سے دبایا۔
ہوائی سفر کے یہ تین دن بغیر کسی خاص واقعے کے گزرے سوائے اس کے کہ ڈریو کے سامان کی ایک سے زیادہ مرتبہ تلاشی لی گئی لیکن اس بات نے ڈریو کو پریشان کرنے کے بجائے خوش کر دیا اور یہ خوشی اور بھی دوبالا ہوئی جب راستے کے ہر ہوائی بندرگاہ پر اپنی ہر ایک حرکت کو سخت نگرانی میں پایا۔ ڈریو انسپکٹر بیٹس سے مذاقیہ باتوں کے علاوہ اپنا تمام وقت مسز فیلڈ اور اُن کے ننھے بچے ٹیڈی کے ساتھ گزارتا تھا۔
ہوائی جہاز کراچی کے ہوائی بندر پر اُترا، دوستوں نے ہاتھ ہلائے اور جیسے ہی مسافروں نے زمین پر قدم رکھے، اُن سے ملاقات کی۔ مسز فیلڈ نے اپنے شوہر سے ڈریو کا تعارف کرایا۔ وہ ایک دوستانہ حلقہ بنا کر خوشی سے گفتگو کرنے لگے۔ ننھا ٹیڈی انتہائی مسرت سے اپنے والد کی آغوش میں تھا۔
ڈریو نے ایک طرف گھومنے پر بیٹس کی ہوشیار آنکھوں کا مقابلہ کیا۔ بیٹس نے اس کو اشارہ سے بُلایا، وُہ مسٹر اور مسز فیلڈ سے معافی لے کر ٹہلتا ہُوا اُس طرف پہنچا جہاں بیٹس ایک اجنبی سے گفتگو کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا اجنبی وہاں سے ہٹ گیا۔ ڈریو نے اپنے دل میں خیال کیا کہ یہ ایک اَور پولیس کا آدمی ہے۔
بیٹس نے کہا "چلیے آؤ ڈریو! میں تمہارے ہمراہ ہوٹل میں جا رہا ہوں۔"
"محافظت کے لئے شکریہ! میرے ساتھ کھانا بھی کھاؤ گے؟"
"نہیں! شکریہ!! میں دوسرے کاموں میں مشغول رہوں گا۔"
"اوہو" کہہ کر ڈریو نے اس کو ترچھی نگاہ سے دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ ہوٹل پہنچ کر ڈریو کو یہ معلوم کر کے بیساختہ ہنسی

آگئی کہ گو خود اُس نے ہوٹل میں اپنے رہنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ لیکن ایک کمرہ اس کے لئے لے لیا گیا تھا۔ اور اس کے علاوہ بیٹس نے اصرار کیا کہ وہ وہاں تک اُس کے ہمراہ جائے گا۔ کمرے میں داخل ہونے پر ڈرلیو کو یہ دیکھ کر مطلق حیرت نہ ہوئی کہ وُہ آدمی جس کو اُس نے ہوائی بندرگاہ پر بیٹس کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا تھا مع اُس کے سامان کے کمرے میں موجود تھا۔

جب اُس نے بیٹس کو اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے دیکھا تو اُس نے تمسخر سے پوچھا "کیا میری اور میرے سامان کی تلاشی ہونے والی ہے؟"

پولیس آفیسر نے جواب دیا "ہاں!"

ڈرلیو ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ پاؤں پر پاؤں رکھا اور سگریٹ سُلگایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وُہ اس موقع سے خوش تھا۔ اُس نے خوش مزاجی سے کہا "جانتے ہو بیٹس، تم لوگ جو قانون کے محافظ ہو، سرکاری کارروائی کو کمزور بنا دیتے ہو۔ ایک شخص کی جس پر بلامحصول ہیرے لے جانے کا محض شک ہو تلاشی ہونی چاہئے۔ تلاشی شروع کرو، میرا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں"۔

باوجود اِس ریمارک پر برافروختہ ہونے کے بیٹس نے ڈرلیو کو قدر کی نگاہ سے دیکھا، وہ مظلوم معلوم ہوتا تھا۔

اُس نے کہا "واللہ! ایسے سلیم الطبع شخص سے آج تک میرا سابقہ نہیں پڑا"۔

وہ جانتا تھا کہ اِس کھیل میں ڈرلیو نے اس کی ہر کوشش بیکار کر دی ہے۔ پھر بھی وہ اپنی شکست تسلیم کرنا برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ایک سخت تلاشی کے بعد دونوں افسروں نے شکست تسلیم کر لی۔ بیٹس دنگ تھا۔ اُس نے آخرکار یہ فیصلہ کیا کہ جواہرات ڈرلیو کے ساتھ نہیں ہو سکتے لیکن پھر وہ آخر تھے کہاں؛ جس وقت سے اسکاٹ لینڈ یارڈ کو اس کے ارادوں کی خبر ہوئی تھی ڈرلیو کی سخت نگرانی ہو رہی تھی۔

ایک ہفتہ گزرا اُن کو خبر تھی کہ جواہرات ڈرلیو کے دفتر میں ایک صندوقچی میں مقفل ہیں۔ لیکن ہندوستان کی روانگی سے قبل ایک روز وہ غائب ہو گئے تھے۔ اس وقت سے ایک قابل محکمہ کی متواتر کوششوں کے باوجود ان کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ وہ قطعی غائب ہو گئے تھے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ ڈرلیو کبھی کسی مددگار کو ساتھ نہیں لیتا تھا اور اسی وجہ سے اُسے پولیس کی جاسوسی کو ٹالنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ کیا ڈرلیو نے اس معاملے میں اپنے طریقے تبدیل کر لئے تھے؛ یا اُس نے اُسے بیکار پریشان کرنے کو دوڑایا تھا؛ اُس نے یہی ڈرلیو سے کہا۔ لیکن جواب میں اُس کے چہرے پر وہی شیطانی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ اُس نے ایک مذاقیہ گانا گنگنانا شروع کیا "میں تم کو آسمان کی کُنجیاں دُوں گا!" پھر جیسے ہی وہ اپنی ناکامی پر دل برداشتہ ہو کر کمرے سے باہر جانے کو ہوئے، اُس نے اُن کی طرف تمسخر سے دیکھا اور آہستہ آہستہ ایک ظریفانہ گیت گانا شروع کر دیا۔

بعدازاں اُسی دوپہر کو وہ ہوٹل کے ایک برآمدے میں نکل آیا۔ اور ایک کمرے میں داخل ہوا جس میں ایک ہندوستانی نواب کا سکرٹری فروکش تھا جو خاص اُس سے ملنے کے لئے کراچی آیا تھا۔

اُس نے خندہ پیشانی سے دریافت کیا "مسٹر ڈریو۔ آپ جواہرات لائے ہیں؟"

ڈریو نے جواب میں کہا "بیشک!"

پھر اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چاندی کا ایک جھنجھنا نکال کر ہندوستانی کو متحیر کر دیا۔ اس کے بعد نہایت ہوشیاری سے اس نے کھلونے کا بالائی حصہ زنبور سے کاٹ کر کھولا اور اپنی ہتھیلی میں ایک درجن نہایت نفیس اور درخشاں ہیرے نکال کر گھمائے۔

(انگریزی سے ترجمہ) فلورنس ینگ

اَے خوبصورت پرندے

اَے خوبصورت پرندے!

تو اُسے اپنی سریلی آواز سے جگانے کی کوشش نہ کر

تیرے نغمے ابدی نیند سونے والے کو بیدار نہیں کر سکتے۔

نہ ہمارے آنسو اُسے واپس لا سکتے ہیں!

وہ اس جگہ چلا گیا ہے جہاں اسے ہم سے بہتر دوست اور تجھ سے اچھا گانے والے پرندے مل گئے ہیں

اگر ہم نے اپنی زندگی کو اُس کے غم کے لئے وقف کر دیا تو ہم اپنے آسمانی آقا کی طاقت کو بھول کر اُس راہ سے ہمیشہ کے لئے بھٹک جائیں گے جس پر چل کر ہم جلد ہی اپنے بچھڑے ہوئے دوست سے مل سکتے ہیں۔

خالدہ

زاویۂ نگاہ

کل میرا ننّھا سا بچّہ عقل کا کچّا، بات کا سچّا
پھولوں سے جھولی بھر لایا مجھ سے کہانی سُننے آیا
مَیں نے کہا" اے بھولے بھالے دُنیا کے قصّے ہیں نرالے
" اے میرے معصوم فرشتے جھوٹے ہیں سب ناتے رِشتے
" جھوٹی ہے دُنیا کی یاری پریمی بن بیٹھے بیوپاری
" مایا کے پھندے ہیں سارے پاپی سب بندے بے چارے
" ہر دِل پر مایا کا سایا مایا چلتی پھرتی چھایا
" مجھ سے تجھے کیا آس ہے ننھے سب کچھ تیرے پاس ہے ننّھے
" تو مجھ سے کیا سُننے آیا باسی کلیاں چُننے آیا!"
بچہ پہلے تو گھبرایا کومل آنکھوں کو جھپکایا
پھر بولا "کیا شے ہے مایا؛ مایا کا کیسا ہے سایا؛
" جھوٹ کسے کہتے ہو بابُو؛ کیوں روتے رہتے ہو بابُو؛
" پریم کا رس اب بھی مِلتا ہے پریم کنول اب بھی کھِلتا ہے
" یہ بن میں چڑیوں کی قطاریں پھولوں پر شبنم کی بہاریں

"یہ آکاش پہ کالے بادل — دھرتی جن کے دم سے جل تھل
"دریاؤں کی گاتی لہریں — جھلمل کرتی جاتی لہریں
"یہ سبزے پر اوس کے قطرے — دھوپ میں جھم جھم کرتے ذرّے
"گاگر میں چھلکاتی پانی — پنگھٹ کی البیلی رانی
"یہ ننھے تاروں کی لڑیاں — یعنی فرشتوں کی پھلجھڑیاں
"چاند کی یہ تھرّاتی کرنیں — کرنیں ٹھنڈے نور کے جھرنے[1]
"پریم ہے یہ، مایا تو نہیں ہے — نور ہے یہ، سایا تو نہیں ہے"
بچے کی یہ باتیں سن کر — میں نے کہا "اے میرے رہبر
"تیرے من میں ہے اُجیالا — میں پاپوں میں بسنے والا
"تیری بصیرت پاک ہے ابتک — روح تری بے باک ہے ابتک
"اُف وہ غلامی کی پرچھائیں — آتی ہے کرتی سائیں سائیں

"چھپ جا ورنہ اُس کا سایا
پریم کو کر دیتا ہے مایا"

احمد ندیم قاسمی

[1] اس قسم کی آزادیاں قافیہ کی سخت قیود سے بچنے اور اپنے صحیح خیالات کے اظہار کے لئے میرے خیال میں اُردو شاعری کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ ندیم

محفلِ ادب

کانگرس اور اُردو

تریپوری کانگرس سشن کے متعلق مدینہ بجنور کے خاص نمایندے نے مدینہ کی تازہ اشاعت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے
اُردو کے متعلق اِس نمایندے نے کانگرس کے رویہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ہم اُسے ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ ناظرین کرام اندازہ
کرسکیں کہ کانگرس کا رویہ اُردو کے حق میں کیا ہے۔ ایڈیٹر

زبان کے بارے میں اس کانگرس کا فیصلہ صاف طور سے دیوناگری کے حق میں معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ والنٹیروں کے بلّے، امتیازی نشان، چٹیں، سائن بورڈ، ٹکٹ غرضکہ تمام چیزیں صرف ہندی رسمِ خط میں تھیں، نمائش گاہ میں بھی ہر چیز کا نام وغیرہ صرف ہندی میں تھا اور اس نے جو لوگ ہندی سے ناواقف تھے، وہ اپنے آپ کو اس اجلاس کی فضا میں پردیسی سا محسوس کرتے تھے۔ ہندی کی یہ طرفداری صرف رسمِ خط ہی کی حدتک نہ تھی بلکہ الفاظ بھی وہی استعمال کئے گئے تھے۔ جو آج کل صرف سیاسی دُنیا میں سُنے جاتے ہیں، چنانچہ یہ دلچسپ منظر آپ کے نامہ نگار نے کئی بار خود دیکھا کہ اگر کوئی شخص نمائش کا ٹکٹ لینے کے لئے ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر کھڑا ہو کر یہ کہتا تھا کہ "نمائش کا ٹکٹ دے دو" تو اُس سے یہ کہا جاتا تھا کہ نمائش کا ٹکٹ یہاں نہیں ملتا یہاں "پری درشنی" کے ٹکٹ بکتے ہیں۔

البتہ بعض بعض مقامات پر اُردو رسمِ خط نظر آتا تھا۔ مثلاً دوچار جگہ "ہندوستانی ہوٹل" لکھا تھا۔ ڈیلیگیٹوں کے کمپ میں ہوٹل کے نام اُردو میں بھی تھے۔ اسی طرح دوچار اور جگہوں پر اُردو کی شنوائی کر لی گئی تھی، لیکن اس کے علاوہ کوئی تحریر اُردو میں نہ تھی۔ والنٹیروں اور ڈیلیگیٹوں کو جو بلّے دیئے گئے تھے وُہ صرف ہندی میں تھے، وزیٹروں اور اخبارات کے نمائندوں کو جو ٹکٹ دیئے جاتے تھے اُن کا خط صرف ہندی تھا حتےٰ کہ لاوڈ سپیکر کے جو "بھونپو" جگہ جگہ لگے ہوئے تھے اُن پر بھی صرف ہندی لکھی تھی۔ غرضکہ اس فضا میں آنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے وہ سیاسی لیڈر جو اس نگر میں جمع ہوئے تھے، آئندہ ہندوستان کی زبان کے متعلق ہندی کے سوا اور کسی زبان کو لائق التفات ہی نہیں سمجھتے۔ اُردو رسمِ خط کہیں کہیں استعمال ضرور کیا گیا تھا مگر جس انداز سے استعمال کیا گیا تھا، اُس سے پتہ چلتا تھا، کہ یہ ایک وقتی چیز ہے جو محض "فریب نظر" کے طور پر لے آئی گئی ہے، گزشتہ سال بندے ماترم پر کافی ایجی ٹیشن تھا، اس لئے اُس سال کھلے اجلاس میں بندے ماترم کے بعد اقبال کا ترانہ بھی پڑھوا دیا گیا تھا، لیکن اِس سال یہ ندارد تھا۔ اس سال اس ترانہ کی جگہ گنتی کے چند

اُردو کے بورڈوں نے لے لی تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اُردو کا آگی ٹیشن کچھ سست پڑ گیا تو آئندہ سال اقبال کے ترانہ کی طرح یہ چند بورڈ بھی غائب ہو جائیں گے۔

نمائش گاہ کے سلسلے میں مَیں یہ کہنا بھول گیا کہ یہاں دو بورڈ اُردو خط میں بھی تھے۔ جن میں سے ایک پر "سیو پرانت" لکھا تھا اور دوسرے پر "کیرل" لیکن میں نہ سمجھ سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

مجلسِ استقبالیہ اور کھُلے اجلاس کے صدارتی خُطبے ہندی زبان میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے باوجود عام بول چال کی رائج الوقت زبان کے الفاظ کو بیچ بیچ میں استعمال کر کے اپنی بے تعصبی کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اِس لحاظ سے گزشتہ سال کے صدارتی خطبوں کے مقابلہ میں یہ خطبے بہت بڑی حد تک اطمینان بخش تھے۔ لیکن یہ کہنا کسی صورت سے بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ وُہ اُس زبان میں لکھے گئے تھے، جو شمالی ہند کے عام پڑھے لکھے لوگوں میں رائج ہے۔ چونکہ یہ خطبے ہندی یا اُردو کسی زبان میں بھی نہیں چھاپے گئے (جس کی وجہ غالباً کانگرسی سیاست کی وہ بدنظمی ہے، جو آخر وقت تک باقی رہی) اس لئے افسوس ہے کہ اس دعوے کے ثبوت میں ان کی عبارتیں یہاں نقل نہیں کی جاسکتیں، اخبارات میں جو خطبے شائع ہوئے ہیں، اُن کے الفاظ کی ذمہ داری زیادہ تر رپورٹروں پر ہے۔

مقرروں میں سے بھی ایسے افراد کی تعداد کافی تھی جنہوں نے پُرانے دستور کے خلاف اِس سال رائج الفاظ کے بائیکاٹ کرنے سے ایک حد تک اجتناب کیا مگر پھر بھی ان کے الفاظ کی نشست کچھ اس طرح کی ہوتی تھی جسے ہم اُس زبان کی نشست نہیں کہہ سکتے، جو ہمارے درمیان رائج ہے، یعنی اُن کی زبان میں بے ساختگی نہیں بلکہ ترجمہ پن پایا جاتا تھا جس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں الفاظ کی نشست بالکل مختلف ہے، اِس لئے جب کوئی ہندی پرست اپنی بے تعصبی کو ثابت کرنا چاہتا ہے، تو اُس کی زبان کچھ ٹوٹی پھوٹی سی زبان ہو کر رہ جاتی ہے، جس کے جملے پھیکے پھیکے اور بے ربط سے نظر آتے ہیں، زبان کی چُستی الفاظ کی شوکت اور نشست کی خوبی سے جو فصاحت و بلاغت پیدا ہوتی ہے وہ باقی نہیں رہتی لیکن یہ احتیاط بھی صرف چند افراد ہی کی طرف سے (جن میں راجندر بابو بھی شامل ہیں) عمل میں آئی تھی۔

ایک بات بڑی حیرت انگیز تھی اور وہ یہ کہ ہندی کے نامانوس الفاظ اور نامانوس بندشیں صرف وہی لوگ استعمال کرتے تھے جو یو۔ پی بہار، یا سی پی کے رہنے والے تھے، یعنی جن کی مادری زبان ہندوستانی ہے لیکن وہ لوگ جن کی مادری زبان ہندوستانی نہیں ہے یعنی جو سندھ، میسور، بنگال اور پنجاب وغیرہ سے آئے تھے وہ اگر ہندوستانی بولتے تھے تو اُن کی زبان میں اور مدینہ کی زبان میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر میں یہاں مسٹر جیکم مکرجی (بنگال) کی تقریر کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

"افسوس ہے کہ ہم لوگ سیاسی خیالات کو سامنے رکھ کر بہت کم غور کرتے ہیں اور خاص سیاسی ڈھنگ سے ان باتوں پر روشنی نہیں ڈالتے، لیکن کم از کم ہمارے بزرگ لیڈروں کو تو اتنا سوچنا چاہیئے تھا کہ کیا یہ بات مہاتماجی کی شان

کے خلاف نہیں کہ آپ کچھ لوگوں کو اُن کی ذات کے موافق بنائیں اور کچھ کو مخالف اس لئے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ خدا کے لئے ہمارے سامنے یہ سوال نہ لائیے، ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہو اتفاق سے ہو تا کہ کسی کو رنجش نہ ہو، اگر ایسا نہ ہُوا تو ہمارے لئے کام کرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

اب سندھ کے ایک ڈیلیگیٹ مسٹر آر کے سدھوا کے چند جملے سنئے :۔

"کانگرس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں برٹش شہنشاہیت سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں ہے، اور ہم ہندوستان میں مکمل آزادی لیں گے، ہم ریاستوں میں جوابدہ حکومت چاہتے ہیں، اگر ہمیں جوابدہ حکومت نہ دی گئی تو یاد رکھئے کہ یہ راجہ اور نواب ختم ہو جائینگے"

لیکن تعجب ہے کہ مسٹر جے پرکاش نارائن جو نہ صرف بہار کے رہنے والے ہیں بلکہ جو سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکرٹری ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ آزاد خیال بھی سمجھے جاتے ہیں، اُن کی زبان یہ تھی :۔

"ہمارے پرتاؤ کی کھلی اُڑائی گئی۔ پرنتو اب سمے آگیا ہے کہ ہندوستان اپنے بھاگیہ کا نرنے کرے۔ اس میں کتنی بھلتا ہوگی اس کو میں نہیں جانتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جب آپ جوش میں آتے تھے، تو اس بناوٹی زبان کا خیال دل سے نکل جاتا تھا اور پھر ٹھیک ٹھیک الفاظ آپ کی زبان پر آنے لگتے تھے لیکن آپ کی کوشش یہی تھی کہ وہ زبان بولیں۔ جو آج نہیں بلکہ آج سے ہزاروں سال پہلے بولی جاتی تھی۔ اس سال عملاً کانگرس کے تقریباً ۹۰ فیصدی جلسوں کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد ہی نے کی۔ اگرچہ آپ کے لئے زیادہ دیر تک بولنے کا موقع نہ تھا مگر جب بھی آپ کسی چیز کی توضیح کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک بالکل نئی زبان ہے جو اس پنڈال میں بولی جارہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اکثریت کی وجہ سے اکثر مسلمان مقرر بھی یہاں آکر اپنی زبان بگاڑ لیتے ہیں یا خود بخود اُن کی زبان بگڑ جاتی ہے مگر یہ خصوصیت مولانائے ممدوح کے علاوہ گنتی ہی کے چند دُوسرے لوگوں کے حصہ میں آئی کہ کانگرس کے کسی اجلاس میں بھی اُن کی زبان، وضع قطع غرضکہ کسی ایک چیز سے بھی اُن کی امتیازی شان فنا نہیں ہوئی۔ "حمایت اسلام"

ہماری زبان

دیس بھر کی زبان ہے اُردو ایک قومی نشان ہے اُردو
جس میں ہل مل کے قوم رہتی ہے میل کا وہ مکان ہے اُردو
جس کو کہتے ہیں تیغ اسلامی وہی ارجن کا بان ہے اُردو
جی بہلتا ہے اس سے دکھ سکھ میں پریم کی داستان ہے اُردو

گھر بناتے ہیں دل میں اس کے تیر — کیسی دل کش کمان ہے اُردو
ہوئے مسحور سپرو و چکبست — ایسی جادو بیان ہے اُردو
وہ رتن ناتھ یہ جواہر لال — جوہری کی دکان ہے اُردو
گندگی سے الگ غبار سے دُور — صاف ستھری زبان ہے اُردو
دل میں رکھیں نہ کیوں ہنود اسے — برج بھاشا کی جان ہے اُردو
جس میں ہندو بھی ہیں مسلماں بھی — ایک وہ خاندان ہے اُردو
بول اُٹھو آج یک زباں ہو کر — کہ ہماری زبان ہے اُردو
مرا ہر شعر کہہ رہا ہے شمیم — کیسی میٹھی زبان ہے اُردو

رسالہ "راہنما" مدراس

عصبی المزاجی کا نفسیاتی مطالعہ

ہم میں بعض اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو لوگوں سے ملنے جلنے یا کسی جلسہ میں شریک ہونے سے سخت گھبراتے ہیں اور پریشان خاطر ہوتے ہیں، خصوصاً جب ان کو کوئی پبلک کام کرنا یا کسی اسٹیج پر تقریر کرنی ہوتی ہے، تو ان کا ذہنی خلجان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ بظاہر یہ عصبی المزاج ہونے کا اثر ہے، مگر یہ غور کرنے کی بات ہے کہ سوسائٹی اور معاشرت میں اس عصبی المزاجی کے اسباب کیا ہیں؛ ماہرین نفسیات یہ بتاتے ہیں کہ جس شخص کو اپنی ذات کا احساس جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ عصبی المزاج ہوگا، بعض اشخاص محض اس وجہ سے خوش نہیں رہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی تعریف و تحسین سے محروم ہیں، لوگ ان کی ذات سے دلچسپی نہیں لیتے ہیں۔ اور وہ جو کچھ کرتے یا کہتے ہیں، اس کی طرف لوگ توجہ نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے، کہ وہ کسی غیر معمولی شخصیت کے مالک نہیں ہیں۔ جو لوگوں کی توجہ کے قابل اور ان کی تعریف کی مستحق ہو۔

اس قسم کے احساسات اس غلط خیال کا نتیجہ ہیں کہ معاشرت کی کامیابی لوگوں کی تعریف و توصیف ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں کی مدح و ستائش مقبولیت کی دلیل ہے، جو بہت ہی خوشگوار اور خوش آیند پہلو رکھتی ہے، مگر اس کو اپنی خوشی کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، معاشرت کی کامیابی تو خود افراد ہی پر منحصر ہے کہ وہ زندگی، اور ملنے جلنے والے لوگوں کے متعلق خود ایک خاص نقطۂ نظر سے چلیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کو پسند کریں، اور ان کی یہ خواہش اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتے ہیں کہ پہلے انہیں خود دوسروں کو پسند کرنا سیکھنا ہے۔ ان پر یہی خیال چھایا رہتا ہے کہ فلاں بات کے سلسلہ میں انہوں نے لوگوں پر کیسا اثر قائم کیا؛ ان کی رائے کا وزن کیا رہا؛ انہوں نے تعریف کی یا نہیں، بعض اوقات تو وہ محض نکتہ چینی کے خوف سے ان ہی چیزوں کو پسند کرتے ہیں، جن کی طرف عوام

کا میلان ہوتا ہے، خواہ اُنہیں وہ باتیں پسند ہوں یا نہ ہوں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نظری طبیعت سے الگ ہو کر شعوری انتشار اور تحت الشعوری بے اطمینانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جو انہیں عصبی المزاج بنا دیتی ہے۔

ہر شخص کی نظروں میں مقبول ہونا ممکن نہیں، اور اگر ممکن ہے تو پھر ہماری شخصیت مفلس اور قلاش رہے گی، اس میں شک نہیں کہ ایماندار بننا اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈالنا ہے لیکن قلبی طمانیت اور ذہنی سکون ایمانداری ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اپنی ذات کے احساس اور نکتہ چینی کے خوف کی وجہ سے ہماری ساری توجہ اپنی ذات ہی کی طرف منعطف ہو جاتی ہے جس سے اپنے کردار کا ہر نقص بڑا معلوم ہونے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے کو دُنیا کی نسبت سے دیکھنے کے بجائے دُنیا کو اپنی نسبت سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور جب ساری توجہ اپنی ذات، اپنے خیالات اور اپنے تفکرات کی طرف مائل رہتی ہے تو ہمارا نقطۂ نظر بھی بدل کر بگڑ جاتا ہے، اور پھر ہماری آنکھیں دُنیا اور دُنیا کے لوگوں کی زندگی کو دیکھنے کے بجائے صرف اپنی ذات اور انا کو دیکھتی ہیں۔

عام طور سے یہ مرض لڑکپن ہی سے پیدا ہو جاتا ہے، خصوصاً جب لڑکوں پر والدین کی نگاہ سخت رہتی ہے، ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے ان کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ نسبتہً اور لڑکوں سے گھٹیا اور کمتر ہیں، اور بزرگوں کی شفقت حاصل کرنے کے لئے ان کو خاص جدوجہد کرنی پڑے گی، اس کے لئے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ وہ کوئی ایسی بات یا کام کریں کہ ان کی تعریف ہو، اور ان کے بزرگ ان کو اپنی شفقت اور محبت کا مرکز بنائیں، اگر ان کو اس میں ناکامیابی ہوتی ہے۔ تو وہ بیٹھے بیٹھے خیالات کی ایسی دلفریب دُنیا تعمیر کرتے ہیں جس میں لوگ ان کے تخیل کے تعمیر کردہ کمالات اور کارناموں پر رطب اللسان ہیں، پھر وہ اسی خیالی دُنیا میں مگن رہنا چاہتے ہیں، اور لوگوں سے ملنے جلنے میں ان کو پریشانی ہوتی ہے۔

معاشرتی عصبی المزاجی سے بچنے کی آسان صورت صرف یہ ہے کہ ہم کو اپنی ذات کا احساس زیادہ نہ ہو، ہر عمل میں اپنی برتری کی خواہش انسان کو بہت ہی غمگین بنا دیتی ہے۔ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو تھوڑی کامیابی سے خوش اور مطمئن نہیں ہوتے، بلکہ وہ غیر معمولی کامیابی اور مقبولیت ہی حاصل کر کے مطمئن ہونا چاہتے ہیں، وہ کھیلتے ہیں تو ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سب سے اچھا کھیلیں، جب تقریر کرتے ہیں تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تقریر فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہو، اس خبط کی وجہ سے ان کو ذہنی انتشار و مایوسی اور عصبی اختلال و پریشانی کا شکار رہنا پڑتا ہے، جس کے ذمہ دار وُہ خود ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ لوگ ان کی ہر کامیابی سے دلچسپی لیتے ہیں، اور ان کی ہر ناکامی پر دوسروں کو افسوس ہوتا ہے، حالانکہ لوگ اپنے مشاغل کی اُلجھنوں میں خود اس قدر پریشان خاطر رہتے ہیں، کہ ان کو دوسروں کی کامیابی اور ناکامی سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے۔

سلامت روی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہرگز یہ نہ سوچیں، کہ ہم کو اپنے ہر کھیل اور کام میں دوسروں سے بازی لے جا کر اور برتر بن کر معاشرت میں کامیابی حاصل کرنا ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم اپنی گفتگو میں بہت ہی زیادہ دلچسپ اور ظریف ہوں مگر گفتگو

کو سنجیدگی سے سننا ظریفانہ اور دلچسپ گفتگو کرنے سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ ہماری تقریر مختصر ہی سہی لیکن وہ موضوع کے مطابق ہو، تو وہ ضرور پسند کی جائے گی، بشرطیکہ حاضرین پر ہم اپنی ذات اور اہمیت کا خاطر خواہ اثر ڈالنے کے لئے پریشان نہ ہوں۔

کامیابی کا بڑا راز دوسروں کی ذات سے دلچسپی لینے میں ہے، نہ کہ لوگوں کی تعریف اور مذمت کرنے کے خوف میں غلطاں و پیچاں رہنے میں۔ اگر لوگ ہماری ذات سے دلچسپی نہیں لیتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم افسردہ اور مغموم ہوں۔ معاشرت میں کامیابی محض وقت اور موقع سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا سابقہ جن لوگوں سے ہو ممکن ہے کہ وہ بہت محتاط، قدامت پسند اور ہماری ہی طرح عصبی المزاج ہوں، لیکن اگر ہم اپنے ذوق کے اظہار میں سلامتی کو راہ دیں، تو وہ ضرور رفتہ رفتہ ہماری طرف مائل ہوں گے۔ اگر ہم میں لطف، کرم اور اخلاق کے صفات موجود ہیں، تو ان کا میلان ہماری طرف تیزی سے بڑھ سکتا ہے۔

جب ہم کسی اجنبی سے ملیں یا کوئی پبلک کام کریں، یا کسی جلسہ میں شریک ہوں تو ہم کو محض اشتیاق اور دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، ہم کو تازہ واقعات جاننے اور لوگوں سے واقف ہونے کا مشتاق ہونا چاہئے۔ تاکہ ہماری معلومات میں غیر محدود طریقہ پر اضافہ ہوتا رہے، اور ہم اپنی توجہ کو اپنی ذات اور اپنے خیالات سے ہٹا کر دوسرے لوگوں اور ان کے خیالات کی طرف مائل کر سکیں، اس وقت ہم عصبی المزاج ہونا، اور محض اپنی ذات سے دلچسپی لینا بھول جائیں گے۔ اور یہی عادت آگے چل کر غیر محسوس ذہنی رجحان بن جائے گی۔

ہمیں چاہئے کہ لوگوں کی نکتہ چینیوں کی طرف توجہ کرنے کے بجائے لوگوں کو پسند کرنا سیکھیں ناممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ہم پسند نہ کرتے ہوں، لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہ کریں، ہمارا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے، کہ ہم اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک ہمدردانہ لگاؤ پیدا کریں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم کسی سے ملیں، تو اس طرح کہ اس کو یہ احساس ہو کہ ہم کو اس سے مل کر واقعی دلچسپی اور خوشی ہوئی ہے۔

جو لوگ محض لوگوں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے کوشاں رہتے ہیں، ان کو وقتی کامیابی تو ہو سکتی ہے، مگر وہ ان کو آگے نہیں لے جا سکتی، اصلی معنوں میں معاشرتی کامیابی وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے کے بجائے خود ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں، اور ان سے اچھی اچھی باتوں کو اخذ کر کے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم جتنا زیادہ نظری ہوں گے، اتنا ہی کم عصبی المزاج ہوں گے، اور اپنے کاموں اور دلچسپیوں میں اپنی ذات کو بھلا دیں تو پھر معاشرت میں کامیابی حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں۔

"معارف"

مطبوعات

کانگریس یا مُسلم لیگ - مصنفہ حکیم انصاری۔ یہ مختصر رسالہ مسلمانوں کو سیاسیاتِ ہند کے اہم مسائل سے واقف کرنے اور اُنہیں سیدھی راہ دکھانے کے لئے نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ زبان سادہ اور اندازِ بیان دلکش ہے۔ مکالمے کی صُورت میں پیچیدہ مسائل کو خوبی سے سلجھا دیا گیا ہے۔ قیمت صرف دو آنے۔ ملنے کا پتہ: ناظم دارالاشاعتِ سیاسیاتِ مشرقیہ۔ آفندی لاج۔ قرول باغ۔ نئی دہلی +

ہماری زبان - یہ انجمنِ ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کا پندرہ روزہ اخبار ہے جو یکم اپریل ۱۹۳۹ء سے جاری کیا گیا ہے۔ اس کے سرپرست جناب مولانا عبدالحق صاحب بی اے (علیگ) اسکرٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) ہیں۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس اخبار کا مقصد اُردو زبان کے متعلق ہر قسم کی معلومات کو یکجا بہم پہنچانا اور اُردو کی ترقی کے وسائل سوچنا ہے۔ ان مقاصد کو یہ اخبار بدرجۂ احسن پورا کرتا ہے۔ شروع میں افکار و واقعات کے عنوان کے تحت اُردو زبان کے متعلق مختلف خبریں اور اُن پر تبصرے جمع کئے جاتے ہیں۔ افتتاحی مضامین میں اُردو کے متعلق اہم مسائل سُلجھائے جاتے ہیں۔ دوسرے مضامین کے عنوانات سے رسالے کی ترتیب کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو یہ ہیں: بنگال اور اُردو۔ اُردو ہندی کا جھگڑا۔ صوبہ بمبئی اور اُردو۔ ہندوستانی کیا ہے۔ میرا بمبئی گجرات اور خاندیس کا دَورہ (از مولانا عبدالحق صاحب) پریم چند رکیم کا راز وارانہ سمجھوتا وغیرہ یہ اخبار ہر اُس شخص کے لئے بغایت مفید ہے جو اپنی زبان، اس کی حیثیت، اس کے حالات و کیفیات اور اس کی دشواریوں اور ترقیوں کی خبروں سے آگاہ رہنا چاہتا ہے۔ حجم ۱۶ یا ۲۰ صفحات چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ۔ منیجر "ہماری زبان" نئی دہلی سے طلب فرمائیے۔

فرہنگِ آمرہ - یہ چالیس ہزار عربی فارسی ترکی الفاظ کا ایک لُغت ہے جو محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی نے بڑی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ معانی کے ساتھ ہر لفظ کا صحیح تلفظ بھی درج کیا گیا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اب تک ہمارے ہاں کوئی ایسا لُغت موجود نہیں جس میں یکجا ان زبانوں کے الفاظ مل سکیں۔ خویشگی صاحب نے زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اہلِ علم کو اس کی پوری پوری قدر کرنی چاہئے۔ فرہنگ کا حجم ۵۸۲ صفحات ہے لیکن چونکہ خط باریک ہے اس لئے اس میں بہت سا مواد سما گیا ہے۔ قیمت مجلّد دو روپے۔ پتہ: محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی فیروز منزل متصل جامع مسجد۔ خورجہ (یو۔پی)

حیا (سالگرہ نمبر) خواتین کا یہ ماہوار رسالہ محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ حیا کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ زیرِ نظر سالگرہ نمبر سے اس کی عمر کے تیسرے سال کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس پرچے کی ترتیب قابلِ تعریف ہے اور مضامین دلچسپ ہیں۔ متعدد سہ رنگ و یک رنگ تصاویر بھی شامل ہیں۔ حجم ۸۰ صفحات۔ قیمت فی پرچہ ۲؍ چندہ سالانہ للعہ۔ پتہ: منیجر رسالہ "حیا" نعمت اللہ روڈ۔ لکھنؤ۔

اُردو کی دو زندۂ جاوید کتابیں

۱- انارکلی

سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے کا وہ معرکتہ الآرا علمیہ تاریخی ڈرامہ جس کے محاسن کی بنا پر

۱- گورنمنٹ پنجاب نے مصنف کو ادبیات کا بیش بہا انعام دیا۔

۲- اردو کے طالب علم جاپانیوں نے جاپان میں اسٹیج کیا۔

۳- اخبارات اور رسائل اور ریڈیو پر اتنے بہت مضامین نکلے جو موجودہ عہد کی کسی دوسری کتاب پر نہیں نکلے۔

۴- نقادوں اور ایکٹروں اور ڈائرکٹروں نے مصنف کو ڈراما کے ایک عہدِ نو کا بانی قرار دیا۔

۵- مرزا محمد سعید ایم۔ اے دہلوی تحریر فرماتے ہیں "انارکلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے"

۶- سید سجاد حیدر یلدرم۔ بی۔ اے "ایک کتاب کہ جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں ہمدردی عاشق مہجور پیدا ہوتی ہے"

۷- اے۔ ایس بخاری۔ ایم۔ اے ڈائرکٹر ڈپٹی کنٹرولر براڈکاسٹنگ دہلی۔ "انارکلی اردو ڈراما کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا"

۸- منشی پریم چند مرحوم "جیسے متبنی کشش انارکلی میں ہوئی۔ اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی"

۹- عنایت اللہ خاں صاحب مہتمم تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔ "یہ ان کتابوں میں سے ہے جو ایسی کتابیں شاذ و نادر ہیں جنکو دیکھ کر پڑھ کر اور اپنے پاس رکھ کر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے۔ اور انکو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے ہر عمر اور ہر مذاق کا شخص اسے پڑھتا اور بے اختیار سر دھنتا ہے۔" کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ آرٹ کی رنگین تصاویر اور رنگین نقش، تیسرا ایڈیشن قریب الختم قیمت فی جلد عہ۔ مجلد ۔ مع دستخط شدہ مصنف عے ر

۲- چچا چھکن

سید امتیاز علی صاحب تاج کے ظرافت نگار قلم کا وہ کامیاب کردار۔

۱- جس کے نام سے تعلیم یافتہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے

۲- جس کی کامیابی سے متاثر ہو کر اکثر ادیب اسی موضوع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں

۳- جس کے متعلق ایک علمی یا نقلی مضمون شایع کرنا اکثر ادبی رسائل کے نزدیک ان کے خاص نمبروں کی کامیابی کا ضامن ہے۔

شُستہ ظرافت جسے پڑھ کر بچے، بوڑھے، عورت، مرد، لڑکے، لڑکیاں سب قہقہے لگا سکتی ہیں۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- **دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور**

طلسمِ زندگی

نصف قیمت پر

میاں بشیر احمد صاحب کی مشہور کتاب "طلسمِ زندگی" جس پر ملک کے اخبار اور جرائد و رسائل نے نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں۔ اور جو اپنے بیش قیمت کاغذ، اعلیٰ کتابت و طباعت، اگرانمایہ رنگین تصاویر، صفحات جمیل اور مطلا جلد کے لحاظ سے ہندوستانی مطبوعات کیا یورپ کی حسین ترین کتابوں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اس مہینے اس کی بقیہ جلدیں نصف قیمت پر فروخت ہوں گی

اصل قیمت پانچ روپے ہے۔

ڈھائی روپے اس کتاب کی اصل لاگت سے بھی کم ہیں

امید ہے

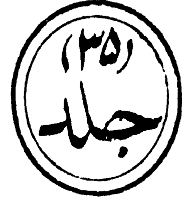
کہ شائقین اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

المشتہر

مینیجر رسالہ ہمایوں۔ ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

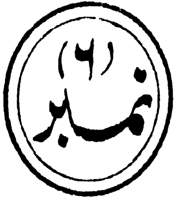
مقامی ایجنٹ

اردو اکیڈیمی، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور



فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جون ۱۹۳۹ء



تصویر:۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غم

چندہ سالانہ صہ۔ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

والدۂ مرحومہ کی یاد میں

میری والدۂ ماجدہ کرم آباد میں ۲۴ گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کی شب کو ساڑھے نو بجے انتقال فرما گئیں۔ زندگی اِس سے بڑے نقصان کا تصوّر کرنے سے قاصر ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رحمت و شفقت کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ہے۔ ماں کی محبت کا بے مثال ہونا یوں بھی مسلّم ہے لیکن والدۂ محترمہ تو یقیناً بے مثال ماؤں میں سے تھیں۔ اُن کی عظیم الشان محبت کی موجودگی میں ہمیں کسی شفیق سے شفیق ماں کو دیکھ کر بھی رشک نہ آسکتا تھا کیونکہ اِس باب میں خود اُن کا مرتبہ کہیں اعلیٰ و ارفع تھا۔ اگر ایسی ماں کے اُٹھ جانے کے بعد مجھے اپنا اِس دنیا میں زندہ رہنا ایک جرم معلوم ہوتا ہے تو یہ بالکل قدرتی بات ہے۔

اُن کا وجود اپنی اولاد ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام خاندان کے لئے اور کرم آباد اور اُس کے نواحی علاقے کے لئے باعثِ رحمت تھا۔ دُور و نزدیک کے تمام متعلّقین کے لئے اُن کا دامنِ شفقت یکساں وسیع تھا۔ اُنھوں نے ایک سچی خدا پرست مسلمان خاتون کی زندگی گزاری۔ کرم آباد کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھی ہوئی وہ اپنے بچوں اور عزیزوں کے لئے دُنیوی و اُخروی فلاح کی دلی دعائیں مانگتی رہتی تھیں، اور بذریعۂ خط و کتابت سب کے حالات سے ہر وقت باخبر رہتی تھیں۔ خود ہمیں بھی وہ اپنے مفصل خطوں کے ذریعہ سے باقاعدگی کے ساتھ اپنے حالات کی اطلاع دیتی رہتیں۔ اُن کا آخری خط جو انھوں نے اپنے انتقال سے دو دن پہلے میرے نام لکھا تھا مجھے چودہ دن بعد لاہور واپس آنے پر ملا۔ کم از کم اُن چند لمحوں کے لئے جب میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس خط کو اٹھایا اور پڑھا موت بھی مجھے والدۂ محترمہ کی شفقت سے محروم نہ رکھ سکی۔

وہ مہینے بھر میں اپنے بچوں اور عزیزوں کے نام معمول کے طور پر بیسیوں خط لکھ ڈالا کرتی تھیں اور دونوں وقت بیتابی سے عزیزوں کے خطوں کی منتظر رہا کرتیں۔ وزیر آباد سے دن میں دو مرتبہ اپنی ڈاک منگانے کا انہیں خاص اہتمام رہتا تھا۔ دراصل یہ خط و کتابت اور کرم آباد میں ہر ہفتے ہماری آمد کا انتظار ہی تنہائی میں اُن کی زندگی کا سہارا تھا۔

بسترِ مرگ پر آخر وقت تک ہم نے اُن کی زندگی کے متعلق امید کا دامن نہ چھوڑا۔ اُس وقت میرا ہاتھ اُن کی نبض پر، اور دھڑکتا ہوا دل امید و بیم کی کشمکش کے نرغے میں تھا جب یکایک سانس اکھڑنے کی علامات ظاہر ہوئیں تو میرے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب نے بھرے ہوئے دل کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے کے لئے کہا۔ پڑھنے والے کو جب گھبراہٹ میں کچھ دیر تک سورۂ یٰسین نہ ملی تو میں نے کہا کہیں سے پڑھنا شروع کر دو۔ عمر بھر والدۂ محترمہ کو قرآن مجید سے نہایت گہری وابستگی رہی تھی اس لئے میں مضطرب تھا کہ کہیں اُن کی

حیاتِ مستعار کی یہ آخری ساعت اِس سعادت سے محروم نہ رہ جائے۔ اگرچہ اُن پر گزشتہ شب سے بیہوشی طاری ہو چکی تھی اور اُن کی زبان بند تھی لیکن اُن کے چھوٹے نواسے نے انہیں سنانے کے لئے کسی قسم کا انتخاب کئے بغیر سورۂ مریم کی تلاوت شروع کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب والدۂ محترمہ نے آخری سانس لی، اُس وقت یہ آیت پڑھی جا رہی تھی:۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ؕ

اُس وقت ہمیں یُوں محسوس ہُوا کہ خود خالقِ ہست و بُود ہمارے غم میں شریک ہے۔ اور اُن کی پیدائش، اُن کی موت اور اُن کے دوبارہ جی اُٹھنے کے دن، اُن پر سلام بھیج کر ہمارے بے قرار دلوں کو تسلی دے رہا ہے +

اِس ماتم کے بعد جلد ہی ایک اور ماتم بھی ہماری قسمت میں لکھا تھا۔ والدۂ محترمہ کے انتقال کی خبر سنتے ہی اُن کے بڑے بھائی اور "ہمایوں" کے سابق جائنٹ ایڈیٹر منصور احمد مرحوم کے والدِ ماجد جناب محمد حسین صاحب صادق جو اپنی خداداد قابلیت اور گوناگوں اخلاقی خوبیوں کے لئے احباب میں ضرب المثل تھے، کرم آباد تشریف لائے۔ وہ ہمیں بار بار تسلّی دیتے تھے، لیکن شدتِ غم سے خود اُن کی حالت خطرناک ہو رہی تھی۔ والدِ مرحوم و مغفور کے مزار کے پہلو میں معمار کی آخری اینٹ نے جب والدۂ مرحومہ کے تابوت کا تعلق اِس دنیا سے منقطع کیا تو ہمارے ماموں جان کے حواس مختل ہونے لگے اور گھنٹے بھر کے بعد وہ بے ہوش ہو گئے۔ یہ بیہوشی بہت دنوں تک رہی۔ دراصل اُن پر فالج کا شدید حملہ ہو چکا تھا۔ اِس دوران میں جب کبھی چند لمحوں کے لئے بھی اُن کے حواس کچھ برقرار ہوئے، اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ آخر تقریباً ایک ہفتہ بے ہوش پڑے رہنے کے بعد ۲۱ رمئی ۱۹۳۹ء کو صبح کے چھ بجے وہ بھی اِس دنیا کو چھوڑ کر اپنی بچپن کی رفیق بہن سے جا ملے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ

اے زندگی بہار کے دن اب گزر گئے — وہ زندہ ولولے بھی مرے ساتھ مر گئے
گھڑیاں تری طویل، ترے روز و شب دراز — اک بینوا ہے اور یہ جینے کا برگ و ساز
جھوٹی مسرّتوں کے فریب آہ! اب نہ دے — اے زندگی گزر بھی چکے دن بہار کے

یہ نغمۂ مسرّتِ بے جا —— نہیں نہیں
بہتر کہیں ہے اِس سے مرا نالۂ حزیں

حامد علی خاں

زندگی اور موت کے دوراہے پر

تیرہ سال کے مسلسل قلمی تعارف کے بعد آج "ہمایوں" کے ناظرین کی محفل میں اپنے مفلوج دل و دماغ کو لئے ہوئے میں اپنی والدۂ ماجدہ کا ماتم کرنے آیا ہوں۔ موت اور زندگی کا مسئلہ میرے لئے ہمیشہ باعثِ کشش رہا تھا بارہا میں نے اس راز کو اپنے طریق پر حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے خوفِ مرگ کی بنیاد صرف یہی ہے کہ ہم اپنے انفرادی وجود کو غیر متناسب اہمیت دیتے ہیں۔ اگر انسان نظامِ کائنات کے ساتھ اپنے صحیح تعلق سے باخبر ہو جائے تو پھر مرگ و زیست کی ردّ و بدل کے باوجود وہ ہر قسم کے خوف سے بلند رہتا ہے۔ لیکن ہر والدۂ ماجدہ کی ناگہانی رحلت نے میرے لئے کائنات کے چہرے سے ایک اور پردہ پھاڑ کر پھینک دیا ہے، ۱۲ مئی کی شام کو جب میری روح زندگی کے شدید ترین زلزلے کی گرفت میں تڑپ رہی تھی، مجھ پر یہ حقیقت پہلی مرتبہ پوری وضاحت سے روشن ہوئی کہ عقل کی بڑی سے بڑی تاویل ہمارے عمیق جذبات کی ٹکر کے سامنے نہیں ٹھیر سکتی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ ہم زندگی کا صرف ایک فلسفہ جانتے ہیں، وہ جو ہم نے اپنی ماؤں کی گود میں سیکھا۔

دنیا شاید کہے گی کہ ان کا وقت اب آپہنچا تھا۔ ان کی عمر ساٹھ برس سے متجاوز تھی لیکن ہماری محفلِ حیات کے بہت سے ہنگامے ان کی جواں ہمتی اور بلند حوصلگی سے قائم تھے۔ آج زندگی اپنے پہلے مفہوم سے بیگانہ معلوم ہوتی ہے۔ ہم نوجوان ہر مصیبت میں ان کے بوڑھے بازوؤں کی قوت کا سہارا ڈھونڈتے تھے اور یہ سہارا ہم کو ہمیشہ ملتا تھا۔ آج ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری آدھی زندگی کٹ کر ہم سے الگ جا پڑی ہے۔ اس ایک ستارے کے ٹوٹنے سے رات اندھیری، آسمان سیاہ ہو گیا ہے۔ ہماری حالت یوں ہے جیسے کوئی ستون اپنے مرکزِ ثقل کو کھو کر ہوا میں معلق ہو گیا ہو اور اُسے کوئی نقطہ اپنے قرار کے لئے نہ ملتا ہو۔ خود میری مثال اُس راہرو کی ہے جو ٹھوکریں کھاتا، لڑکھڑاتا، طوفانِ برق و باراں کے تھپیڑوں کی زد میں کسی اندھیرے راستے پر چلا جاتا ہو۔ پھر بھی میں زندہ ہوں۔ آہ اے زندگی!

اُن کے لئے زندگی کا مقصد صرف ایک تھا، خدمت۔ وہ ہر سوال کرنے والے، مسافر، یتیم اور بیکس کا آسرا تھیں۔ خدا نے اپنی صفات میں سے ایک صفت رزاقی میں عورت کو بھی اپنا شریک کر لیا ہے۔ کوئی بھوکا پیاسا قریب ہو اور عورت آرام سے بیٹھی رہے یہ ناممکن ہے۔ والدۂ ماجدہ نسائیت کے اس جوہر کا مظہرِ اتم تھیں۔ جب تک بستر سے بے بستر نہ ہوئیں اپنے ہاتھ سے تیار کر کے اپنے متعلقین کو بہ اصرار کھلا نہ لیتیں ان کے لئے آرام سے بیٹھنا حرام تھا۔ بارہا کوئی سائل بے وقت پہنچا اور اس کے لئے انہوں نے خود اُٹھ کر از سرِ نو کھانا پکایا۔ تحریکِ کشمیر کے دنوں میں رضا کاروں کا کوئی جیش کرم آباد سے نہیں گزر سکتا تھا جب تک والدۂ ماجدہ کے ہاتھ سے تیار کی ہوئی ماحضر خانی اور چائے اور دودھ سے اس کی تواضع نہ ہو جاتی۔ والدِ مرحوم کی وفات کے بعد انتہائی نکبت و افلاس کے زمانے میں بھی انہوں نے بیکسوں کی مصیبت سے متاثر ہو کر بعض دفعہ ایسی ایسی ہمدردی اور فیاضی کا ثبوت دیا کہ اُن کے ایثار کے منظر سے خود سائل کا جگر پگھل جاتا اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتیں۔

مگر اُن کا اخلاقی کمال ہی اُن کی شخصیت کا تنہا کمال نہ تھا۔ اپنی اولاد کے ذہنی نشو و نما میں وہ قدم بہ قدم ہمارے ساتھ شریک رہیں۔ تصوف اور

مذہب تو خیر اُن کا خاص مضمون تھا لیکن تاریخ فلسفے یا ادب کا ہر وہ مسئلہ جس سے مجھے شغف ہوا اُن کے لئے بھی گہری دلچسپی کا باعث ہوتا تھا۔ اُنہیں فارسی اور اُردو شاعری کا نہایت سلجھا ہوا مذاق تھا گر انگریزی زبان سے واقف نہ تھیں۔ اس کے باوجود میرے ساتھ اُن کی ادبی رفاقت کا ثبوت اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا کہ گزشتہ پندرہ برس میں مغربی ادب کے بیسیوں شاہکار، یہاں تک کہ شیکسپیئر کے چند ڈرامے بھی انہوں نے مجھ سے ترجمہ کرا کے سُنے۔ میرے لڑکپن میں اُنہیں کے ذوقِ سلیم نے غالب کی طرف میری رہنمائی کی جب مغربی فلسفہ و تنقید کے اُصولوں کے ماتحت میں آگے بڑھا تو اُن کا وجدانِ صحیح بھی ترقی کرتا ہوا میرے ساتھ ہو لیا۔ غالب پر میری مجوزہ کتاب کی تمام اہم تفصیلات سے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ پچھلے دنوں غالب کے متعلق پنجاب سے جو چند اچھی کتابیں شائع ہوئیں اُن کو انہوں نے بھی اُسی شوق سے پڑھا جس سے میں نے۔ تحقیقِ غالب کی ہر منزل میں وہ گویا میری ہم سفر تھیں۔ یہاں تک کہ بڑی بحث و تمحیص کے بعد میری مجوزہ تصنیف کے لئے انہوں نے خود نام تجویز کیا۔ گزشتہ سال علامہ اقبالؒ کی وفات پر مرحوم کے مقبرے کی تعمیر، اُن کی شاعری کے مستقبل، اُن کے چھوٹے بچوں کے حالات سے انہوں نے ایسی دلچسپی کا اظہار کیا جیسے اِس سلسلے میں اُن پر کوئی ذاتی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری چند مہینوں میں اقبالؒ کے فارسی کلام کو انہوں نے کثرت اور تسلسل سے پڑھا۔ انتقال سے ایک آدھ مہینہ پہلے کا واقعہ ہے کہ اپنے ایک نواسے کو تلاوتِ قرآن میں مصروف دیکھ کر فرمایا: "تم کلامِ پاک کی تلاوت کے تو بہت پابند ہو مگر کبھی کبھی اقبال کے کلام کو بھی پڑھ لیا کرو۔ اس میں بھی وہی قرآن موجود ہے"۔

والدِ مرحوم و مغفور سراج الدین احمد خاں جنت مکاں کے انتقال کے وقت والدۂ ماجدہ نے عمر کی صرف تین منزلیں طے کی تھیں اور اُن کا زندگی کا تجربہ محدود تھا۔ ہم تینوں چھوٹے بچے اتنے چھوٹے تھے کہ ہمیں اپنے ناقابلِ تلافی نقصان کا بھی کوئی اندازہ نہ تھا۔ اُس وقت والدۂ ماجدہ کمالِ مردانگی سے کام لیکر باپ بھی بنیں اور ماں بھی۔ اُنہیں اپنے گزشتہ عروج و اقبال کے بعد بدرجۂ مجبوری ایک دم بے مائگی و تہی دستی کی منزل میں داخل ہونا پڑا تھا۔ مگر اس سے اُن کے ماتھے پر بل نہیں آیا۔ ہمیں ترکۂ پدری اور اُس کی آمدنی میں سے ایک حقیر سی رقم جسم و رُوح کا تعلق برقرار رکھنے کے لئے مل جاتی تھی۔ جہاں تک والدۂ ماجدہ کی اپنی ذات کا تعلق تھا بیوگی کے پہلے دن سے انہوں نے اپنے لئے درویشانہ زندگی پسند کرلی۔ تہجد اور قیام اللّیل اُن کا معمول بن گیا۔ دنیوی نعمتوں کی کشش اُن کے لئے یک بہ یک ختم ہوگئی۔ بایں ہمہ ہمارے لئے وہ ایسے ایسے آرام مہیا کرنے کی کبھی کامیاب اور کبھی ناکام کوشش کرتی تھیں۔ گویا ہماری پیشانی یتیمی کی گرد سے کبھی داغدار نہیں ہوئی +

برسات کی وہ دہشتناک راتیں مجھے اب تک یاد ہیں جب ہم تینوں بہن بھائی اپنی بیوہ ماں کے آس پاس دبک کر لیٹے ہوئے ہوتے تھے۔ نہ ہمارے پاس کوئی ملازم تھا نہ سرپرست۔ وہ بڑا مکان جس کے ہم وارث تھے جگہ جگہ سے بوسیدہ اور شکستہ ہو رہا تھا۔ مگر اتنی بڑی عمارت کی مرمت کرانے کی توفیق ہمیں کہاں میسر تھی۔ موسلا دھار بارش کے وقت اُس کی چھتوں میں شگاف پڑ جاتے اور کمروں کے اندر پانی کے پرنالے چھوٹ پڑتے تھے۔ اُس وقت والدۂ ماجدہ گھر کی ایک ہی لالٹین کو لے کر چھت پر جاتیں اور ہم اندھیرے میں قرآن کی آیتیں پڑھ پڑھ کر اپنے دلوں کی ڈھارس بندھاتے۔ کبھی ایسے موقعوں پر گاؤں سے کوئی پرانا نمک حلال مدد کو آنکلتا۔ لالٹین تو چھت پر چلی جاتی مگر والدۂ ماجدہ ہمارے پاس رہتیں۔ اس سے ہمیں بڑی خوشی ہوتی۔ مجھے اپنے حافظے کے تاریک کونوں میں برسات کی اندھیری راتوں کا خوف اب تک کبھی کبھی گھات لگائے ملتا ہے۔ اس خوف کا تعلق بچپن کے اُنہیں دنوں سے ہے۔ چونکہ

تیل کی بہت کفایت ملحوظ رہتی تھی اس لئے لالٹین سونے سے پہلے ضرور بجھا دی جاتی بچپن کا تخیّل ہیبت ناک تصویریں کھینچنے میں بہت مستعد تھا۔ یہ ڈراؤنی شکلیں کبھی چھت پر طرح طرح کے چکر کاٹتیں اور کبھی دروازے میں سے اندر داخل ہوتی ہوئی نظر آتیں۔ برسات کی راتوں میں بجلی کی کڑک، درختوں میں ہوا کی سائیں سائیں اور خدا کے خیال کے سوا ہمارے پاس کوئی نہیں ہوتا تھا ؛

اب اس عمر کو پہنچ کر بھی میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں کہ وہ کیسی طاقت تھی جس نے والدۂ ماجدہ کی ہمّت کو قائم رکھا؟ کس طرح ان تمام نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے کرم آباد کو نہ چھوڑا؟ وہ اپنی مصیبتوں پر روتی ضرور تھیں مگر ہم سے چھپ کر کہ مبادا اس کمسنی کے عالم میں ہمارے حوصلوں کو ان کا رنج و غم ہمیشہ کے لئے پست کردے۔ خدا کا شکر ہے کہ کم از کم اپنے ایک بیٹے کو انہوں نے اسی مرتبے پر فائز دیکھا جس پر وہ اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو دیکھنے کی آرزومند تھیں۔ میرے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب کو (جنہیں میں اپنی عمر کے گیارھویں برس سے باپ اور بھائی کی دہری حیثیت سے پہچانتا ہوں) دنیوی وجاہت اور دماغی قابلیت کے ساتھ اخلاق و عمل کی وہ تمام صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں جن سے ایک صاحبِ ایمان شخص کی فطرت کا خمیر اٹھتا ہے۔ اُن کی ذات والدِ مرحوم کی اولوالعزمی و حق گوئی اور والدۂ مرحومہ کی ہمدردی و پاکیزگیٔ نفس کی روشن تصویر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف اُن کے وجود سے والدۂ ماجدہ کی زندگی کی درمیانی منزل کے آلام و مصائب کی پوری تلافی ہوگئی ؛

ہماری اخلاقی تربیت اور دنیوی تعلیم کے لئے وہ سب سے زیادہ مضطرب تھیں۔ میں صرف اپنی ممنونیت کے اظہار کے لئے کہتا ہوں کہ انہوں نے ہم کو اپنے قائم کئے ہوئے نصب العین سے بہت قریب نہیں تو بہت زیادہ دُور بھی نہیں چھوڑا۔ خاکساری کے ساتھ خودداری، وسیع المشربی اور رواداری کے ساتھ اُصول کی خاطر کٹ مرنے کی تڑپ، یہ دونوں دولتیں ہمیں والدۂ ماجدہ نے ترکے میں چھوڑی ہیں ؛

کہتے ہیں زمانہ گہرے سے گہرے زخم پر آخر کار مرہم رکھ دیتا ہے۔ شاید یہ دُرست ہو لیکن میری ایک ایک سانس، میرے جسم کا ایک ایک رُواں، مجھ سے پکار کر کہتا ہے کہ تیرے دل و جگر کے ناسور برسوں لہُو ٹپکائیں گے۔ جس طرح ہوا کے ہلکے جھونکوں سے سبزۂ نورستہ کی کونپل ذرا سی تھرتھرا جاتی ہے جس طرح نسیمِ صبح کی چھیڑ سے پھُول کی پتی آہستہ سے نیچے گھاس پر آرہتی ہے۔ اُسی طرح دمِ واپسیں نے دو تین دفعہ اُن کے ہونٹوں کو لرزش دی اور شمعِ حیات گُل ہوگئی کئی برس سے وہ جب کبھی اپنی زندگی کے انجام کا ذکر فرماتیں تو اپنے لئے ایسی ہی مرگِ ناگہاں کی آرزو کا اظہار کیا کرتی تھیں ؛

اے زندگی کی شمعوں کو جلانے اور بجھانے والے! ٹمٹماتے ہوئے دیئے تیرے قدموں کی دھمک سے لرز رہے ہیں، تو آتا ہے کسی چراغ کو بجھاتا اور کسی کو جلاتا ہوا گزر جاتا ہے۔ یہ کیسا کھیل ہے اور اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے؟ پروانوں کے ننھے ننھے دل خوف سے دھڑک رہے ہیں۔ تاریکی اُن کیلئے موت ہے شمع کی روشنی کو ایک دم یوں جھپٹ کر نہ لے جا۔ جگر سوختہ پروانوں کو صرف ایک پل کے لئے اپنی آخری حسرت پوری کر لینے دے۔ بجھتی ہوئی شمع کو جلانا ضرور دشوار ہے لیکن تُو اسے ناگہاں بجھا دینے پر تو مجبور نہیں ہے۔ ابھی اس کے گرد پروانوں کا ہجوم باقی ہے، ان کے سینے غم سے پھٹ رہے ہیں اگر تُو مہلت دے تو وہ اس ناتواں شعلے کا آخری طواف کرلیں۔ صبح قریب ہے۔ چراغ کا تیل ختم ہو چکا۔ اس کی لَو ٹمٹما رہی ہے۔ اس کی آخری جھلملاہٹ کو خود بخود ختم ہو جانے دے۔ تو سمجھتا ہے کہ تیری بساط جگمگا رہی ہے اور جگمگاتی رہے گی۔ تیری محفل کا نور ایک شمع کے بجھنے سے ماند نہیں پڑے گا۔ پھر بھی ہر شمع کے گرد ایک الگ جہان آباد ہے، چھوٹا سہی، حقیر سہی لیکن اس جہان کے دل میں بھی وہی سوز ہے جس سے تیرے لاکھوں کروڑ دلوں کی رونقیں

دنیائیں روشن ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب تو شمعوں کو گُل کرتا ہُوا گزرتا ہے تو اپنی ایک ایک سانس کے ساتھ صُورِ اسرافیل پھونکتا چلا جاتا ہے؟ تیری ہر پھُونک سے ایک عالم تباہ، ایک پوری کائنات زیروزبر ہو جاتی ہے۔ اے کاش تجھے معلوم ہوتا! کاش تجھے کوئی سمجھا سکتا کہ زمان ومکان کی انتہائی وسعتوں تک زندگی ایک ہے، غیر منقسم، ایک رنگ، ایک جان۔ جب تو اس کو میری حقیر سی، محدود سی دنیا میں ٹیس لگاتا ہے تو فضائے لامکاں کے جگر میں ٹیس اٹھتی ہے سنگین پہاڑوں کی زمیں دوز رگوں سے خون ٹپکتا ہے اور بعید ترین ستارہ درد سے کراہنے لگتا ہے۔ اے کاش۔ اے کاش تجھے معلوم ہوتا!

جس شام قدرت نے والدہ ماجدہ کو اِس عالمِ مرگ وزیست سے دُور پہنچا دیا۔ اُس سے دوسری صبح کو میرے بڑے ماموں، اُن کے بچپن کے ہمجولی جوانی کے غمخوار اور بڑھاپے کے مُونس، اپنی پیرانہ سری اور ضعفِ قوا کو ساتھ لئے بچوں کی طرح روتے ہوئے کرم آباد پہنچے۔ یہ اُن کی زندگی کا سب سے المناک سانحہ تھا۔ اُسی دن اُن پر فالج کا حملہ ہُوا۔ آٹھ دن اِسی طرح گزر گئے اور پھر مئی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو میں اُن کی میّت لئے ہوئے لاہور آ رہا تھا تاکہ اُن کے مرحوم فرزند منصور احمد کے ساتھ اُن کی مٹھی بھر خاک بھی ہمیشہ کی نیند سو سکے ؛

شاید بچھڑے ہوؤں کے ملاپ کا صرف یہی ایک طریقہ قدرت کے نزدیک جائز ہے ؛

اکثر راتوں کو میرا ماؤف دماغ اور بُجھا ہُوا دل اِس سوچ میں رہتا ہے کہ کیا پھر کبھی یہ آنکھیں والدہ ماجدہ کی صورت کو دیکھیں اور پہچانیں گی؟ پہلے دس دن تک میں ہر صبح اپنے بستر سے چونک کر اُٹھتا تھا اور اُسی طرح آنکھیں ملتے ہوئے ایک مجنونانہ کیفیت کشاں کشاں مجھے اُن کی لحد پر لے جاتی تھی۔ شاید میں سمجھتا تھا کہ قبر کے دروازے میری خاطر کھل جائینگے اور محبتِ مادری کے نُور سے جگمگاتا ہُوا وہ چہرہ ایک بار پھر مسکرا کر میرے خیر مقدم کو نکلے گا لیکن وہاں مٹی کے ایک ڈھیر اور نسیمِ صبح کے جھونکوں کے سوا مجھے اور کیا مل سکتا تھا۔ بیری کا وہ پرانا درخت جس کے نیچے کھڑے ہو کر اُنہوں نے ہزاروں دفعہ والدِ مرحوم پر فاتحہ پڑھی، اب خود اُن کی آخری خوابگاہ پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ پچھلی رات کی ہواؤں کے اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے سبک رو قدم، پرندوں کا چہچہا، صبح کی قرآن خوانی، یہ چیزیں اُس ہلکی نیند سونے والی کو اب کبھی بیدار نہیں کریں گی۔ میں اُن کی قبر سے مڑتا ہوں۔ تو گھر کے دروازے کے سامنے کا سبزۂ بیدار اُن پاک قدموں کو چھُونے کے لئے مضطرب نظر آتا ہے۔ پھولوں کے اُداس چہرے روزمرّہ کی گزرگاہوں پر اُس سراپا رحمت وجود کو ڈھونڈتے ہیں جس کا پاس سے ہو کر نکلنا نسیمِ بہار کے جھونکوں سے کم نہ تھا۔ یہ باغ، یہ پھول پھل، یہ سبزہ ہر چیز اُن کی اپنی توجہ اور محبت کی تخلیق ہے۔ اِس خاک کے ذرّے ذرّے کو، اِس گھاس کی پتی پتی کو وہ پہچانتی تھیں، اب جامن کے نئے پیڑوں میں اُن کے جانے کے بعد اِس سال پہلی مرتبہ بور آیا ہے مگر کوئی نہیں جو اُن کو بتائے۔ گھر کے صحن میں کدو کی ایک بیل انہوں نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھی۔ پچھلی مرتبہ میں لاہور سے آیا تو مجھے ہاتھ سے پکڑ کر خود وہاں لے گئیں۔ تاکہ میں اُس کے پہلے پھل کو دیکھ کر اُن کی خوشی میں شریک ہو سکوں۔ اُن کے جانے کے بعد اس بیل میں اور بھی پھل آئے ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اُن کو ہاتھ سے پکڑ کر یہاں تک لاؤں۔ مگر نہیں لا سکتا۔ وہ شریر کوا جس سے وہ بیزار تھیں، جو ہمارے اونچے سرو کی چوٹی کی کونپل پر بیٹھ کر اُسے ضرور ٹیڑھا کر دیتا تھا۔ اب بھی آ کر وہیں بیٹھتا ہے۔ کبھی ہم اپنی غفلت میں مُڑتے ہیں کہ ہنس کر والدہ صاحبہ سے اس کی شکایت کریں لیکن

صرف اپنے ہی بھیانک اور غمزدہ چہروں سے دوچار ہوتے ہیں۔ کرم آباد کے تمام انتظامی معاملات اُن کی اجازت اور مشورے سے طے پاتے تھے۔ اُن کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں، پرانی عادت سے مجبور ہو کر کئی تفصیلات کے متعلق ہم اُن سے رائے لینے کو اُٹھتے تھے، جنازہ کس راستے سے جائے؟ نمازِ جنازہ کہاں پڑھی جائے؟ تابوت کے لئے کتنی رُوئی کافی ہوگی؟ اب اِس ماتمی تحریر کو سپردِ قلم کرتے ہوئے خدا جانے کتنی مرتبہ میں نے سوچا ہے کہ اِسے ذرا صاف کرلوں اور پھر جا کر اُنہیں سناؤں؟

اب وہ پہلے جنون کی کیفیت نہیں رہی۔ میں موت کی سرحد سے واپس روانہ ہُوا ہوں۔ اب شاید طبیعت کو رفتہ رفتہ سکون ہو جائے گا۔ اب تدریجاً یہ راز دل و دماغ پر کُھل رہا ہے کہ والدۂ محترمہ کی حیاتِ مستعار ختم ہو گئی +

مجھے یقین ہے کہ اگر والدۂ ماجدہ کی مشتِ خاکستر میں زندگی کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چنگاری بھی ہوتی اور میرا اضطراب اِس سے ہزار درجہ کم بھی ہوتا۔ تب بھی وہ قبر کے تہ بہ تہ تودوں کو ہٹا کر مجھے تسلّی دینے کے لئے باہر نکل آتیں۔ وہ مر چکی ہیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میرے اضطراب کے منظر کو کبھی نہ دیکھیں گی۔ تسلّی کا لفظ مہمل، سکونِ طبیعت کی کوششیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ جب اُن کی دائمی رخصت کا نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اُن کی رحلت کے بعد جو پہلا ہفتہ گزرا، اُس کی تصویر میرے خونِ حیات سے میرے حافظے پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو چکی ہے۔ اِس ہفتے میں اُن کے تصوّر کے سوا دنیا کے کسی اور احساس کے لئے میری رُوح بیدار نہ تھی۔ مجھے اب بھی معلوم نہیں کہ میں اُس وقت زندہ تھا یا مُردہ۔ ہائے وہ پہلا ہفتہ

دن ہو کہ رات تیرے سوا دوسرا خیال ۔۔۔ جانِ حزیں کے واسطے بارِ گناہ تھا

ہر صبح تیری یاد تھی ہر شام تیرا ذکر ۔۔۔ یوں زندگی سے موت سے ملا ہوا تھا

سو بار چھوٹ چھوٹ گیا دامنِ حیات ۔۔۔ پہلو میں دل ضرور تھا پر گاہ گاہ تھا

سو بار زندگی نے کیا موت کو سلام ۔۔۔ لیکن عبث کہ موت کا گھر خود تباہ تھا

میں جانتا تھا تو بھی لحد میں ہے بے قرار
ہر ذرّہ میری خاک کا اِس پر گواہ تھا

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

حمید احمد خاں

فیڈرل حکومت میں ہندوستان کی حیثیت

فیڈریشن میں ریاستوں کی نمائندگی، اُن کی قوت اور برطانوی ہند پر اُن کے اثرات کا مختصر ذکر ہم "ہمایوں" کے کسی گزشتہ پرچے میں کر چکے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ فیڈرل یا مرکزی حکومت میں ہندوستانیوں کو کتنا اختیار دیا گیا ہے۔ صُوبجاتی حکومت صرف مقامی مسائل کا انتظام کر سکتی ہے ملکی معاملات میں اُس کو کچھ دخل نہیں۔ اور ملکی معاملات میں سارے ہندوستان کی دفاعی پالیسی، مالی اور اقتصادی پروگرام، ریلوے کا انتظام، بیرونی ممالک سے تعلقات وغیرہ اہم مسائل شامل ہیں۔

آئین نو مرکزی معاملات کے انتظام کے لئے دو عملی حکومت تجویز کرتا ہے۔ تمام امُور کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

(۱) ایسے امور جن کا انتظام گورنر جنرل کے سپرد ہوگا: یہ امور فیڈریشن کی دفاعی پالیسی، خارجی تعلقات، مذہبی امور اور قبائلی معاملات ہیں۔

(۲) دیگر امور، جن کا انتظام ایسے کابینہ کے مشورہ سے کیا جائے گا جو فیڈرل ایوان کے اراکین ہونگے اور جو ایوان (Legislature) کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔

اوّل الذکر میں فیڈریشن کی دفاعی پالیسی، خارجی تعلقات، مذہبی امُور اور قبائلی معاملات شامل ہیں۔ اِن امُور کے انتظام کے لئے آئین گورنر جنرل کو اختیار دیتا ہے کہ وہ چند مشیر جن کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہو، مقرر کر سکتا ہے۔ یہ مشیران سلطنت ایوان کے سامنے جوابدہ نہ ہوں گے۔ ان کو صرف گورنر جنرل مقرر کرے گا اور اُن کی تنخواہ اور شرائطِ ملازمت کا فیصلہ شہنشاہِ معظم اور اُن کی کونسل کرے گی۔

آئین کی یہ دفعہ گورنر جنرل کو مذکورہ بالا امور پر ایسا اختیار دیتی ہے جس میں عوام کے نمائندوں یا وزراء کو رائے تک دینے کا حق نہیں۔ گورنر جنرل صرف ایسے مشیروں کی رائے طلب کرے گا جو کسی طرح ایوان سے متعلق نہیں۔ جو عوام کے نمائندہ نہیں، جن پر ایوان کا کوئی اختیار نہیں۔ اگر گورنر جنرل چاہے تو اِن مشیروں کی رائے بھی رد کر سکتا ہے کیونکہ آئین اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ اُن کے انتظام کا ذمہ دار صرف گورنر جنرل ہے۔ واضح رہے کہ یہ گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری نہیں بلکہ اِن امُور کے انتظام کو آئین کلیۃً گورنر جنرل کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ خصوصی ذمہ داری میں آئینی نکتہ یہ ہے کہ اُن کے انتظام میں کابینہ کو رائے دینے کا کچھ نہ کچھ حق حاصل ہوجاتا ہے اور پھر یہ گورنر جنرل کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مخصوص حالات کے پیشِ نظر اپنے وزراء سے اختلاف رکھے اور اپنے فہم و دانش کے مطابق عمل کرے... مگر یہاں آئینی پوزیشن بالکل مختلف ہے۔ آئین ان امور کو وزراء کے اختیار سے بالکل خارج کرتا ہے اور گورنر جنرل

کی مدد کے لئے نہیں یا اُس سے کم شیروں کے تقرر کی اجازت دیتا ہے۔

اِن امُور میں سب سے زیادہ بحث طلب معاملہ دفاعی پالیسی کا ہے۔ اب تک حکومتِ ہند کی یہ کوشش رہی ہے کہ دفاع پر تمام آمدنی کا ایک بڑا حصّہ صرف کیا جائے۔ اگر گزشتہ مصارف کا اوسط نکالا جائے تو ۵۰ فی صدی سے زیادہ خرچ دفاعی پالیسی پر ہوتا ہے ہندوستانی اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ وُہ اتنی بڑی فوج کو ہندوستان کے امن وحفاظت کے لئے بےکار سمجھتے ہیں، اندرونی انتظام کے لئے پولیس کافی ہے اور خاص موقعوں پر تھوڑی سی فوج کام دے سکتی ہے۔ بیرونی حملوں کا چُونکہ زیادہ خطرہ نہیں، لہٰذا صرف سرحدی قبائل کی جارحانہ کارروائیوں کی روک تھام کے لئے فوج کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور اس کے لئے موجودہ فوج کافی سے بہت زیادہ ہے۔ ہندوستانی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ فوج صرف برطانوی سلطنت کی ملوکانہ اغراض کے لئے رکھی گئی ہے، اور اِس اعتراض کو برطانوی سیاستدانوں کے گزشتہ اعمال سے بڑی تقویت پہنچتی ہے، کیونکہ ہندوستانی افواج اُن جنگوں میں لڑتی رہی ہیں جو صرف سلطنتِ برطانیہ کی توسیع کے لئے لڑی گئیں ـــــ اِن تمام اعتراضات کا حکومتِ ہند پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اُس کا خیال ہے کہ ہندوستان دُنیا کی موجودہ پُرشورش حالت میں غیر محفوظ ہے، نہ معلوم کب اور کس طرف سے اِس پر حملہ ہو جائے۔ دُنیا کی ہر بڑی قوّت جنگ کے لئے تیار بیٹھی ہے سب کے پاس جدید ترین آلاتِ حرب موجود ہیں، تیز رفتار جنگی ہوائی جہاز، زہریلی گیسیں وغیرہ ہندوستان جیسے غیر محفوظ ملک کا چند ساعتوں میں خاتمہ کر دیں گی ـــــ لہٰذا ان حالات میں حکومت کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کو بھی ہر طرح سے ہر ممکن خطرے کے دفاع کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ہندوستانی اس اعتراض کو صحیح مان کر ایک نیا مطالبہ پیش کر دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بیشک دُنیا میں بد امنی اور بے اطمینانی پھیل رہی ہے، زہریلی گیسیں اور فضائی قوّت ایسے خطرات ہیں جن سے بچنے کے لئے ہر ممکن کوشش لازمی ہے، لہٰذا حکومت کو چاہیئے کہ وہ ہندوستانیوں کو فوجی تعلیم دے، اُن کو متوقع خطرات سے محفوظ رہنے کے طریقے بتائے۔ اور سب سے اہم یہ کہ فوج میں ہندوستانی عنصر بڑھائے تاکہ ایک قومی عسکری قوّت تیار ہو سکے۔ اس مطالبہ کو بھی حکومت یہ کہہ کر کہ فوجی تعلیم وغیرہ پر بہت خرچ ہوگا اور ہندوستان کے مالی حالات اِن مصارف کے متحمل نہیں ہوں گے، رد کر دیتی ہے ـــــ اور اب نیا آئین بھی آئندہ کے لئے وُہی پالیسی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ گزشتہ آئین میں تو ایوان حکومت کی فوجی پالیسی پر نکتہ چینی کر بھی سکتا تھا مگر اب یہ حق بھی جاتا رہا، مطالباتِ زر کے پیش ہونے پر ہندوستانی اپنے شکوے بیان کرتے تھے، وہ اُن مطالبات میں تخفیف کر کے اظہارِ ناراضی کرتے تھے مگر اب ایسا بھی نہیں کر سکتے۔ پچھلے دنوں اپنی اسی قوّت کے غصب کئے جانے پر اسمبلی کے تمام منتخب شدہ اراکین نے "واک آوٹ" کیا تھا ـــ اِس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ برطانیہ کی نو آبادیوں مثلاً کینیڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ کو اپنی دفاعی پالیسی پر پُورا اختیار حاصل ہے۔ جدید آئین میں فوجی امُور کو گورنر جنرل کے ماتحت کرنا ہندوستانیوں کے ایک بہت پُرانے اور اہم مطالبہ کو ٹھکرا دینا ہے۔ اگر حالات ایسے نہیں تھے کہ یہ دفاع ایوان کے ماتحت کر دیا جاتا تب بھی یہ بہت ضروری

اور قرینِ مصلحت تھا کہ ہندوستانیوں کے کچھ نمایندوں (وزراء) کو اِس پر رائے زنی کا حق دیا جاتا تاکہ وُہ ایوان کی نکتہ چینی کے پیشِ نظر اپنے خیالات کا اظہار کرسکتے۔ یہ بھی بہت ضروری تھا کہ آیندہ فوج میں ہندوستانی عنصر کو زیادہ کیا جاتا۔ ہندوستانیوں کو غیر ملکی قوتوں سے ڈرا کر فوجی طاقت کو برطانوی عنصر کی مدد سے بڑھانا، ہندوستانیوں پر اُن کی بے بسی اور جنگ کے زمانے میں اُن کی بے چارگی ظاہر کرتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہندوستانی آئین کی اس دفعہ کے خلاف احتجاج کریں ؟

خارجی پالیسی: یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی ابھی تک بیرونی ممالک کی سیاست میں پُوری دلچسپی نہیں لیتے۔ اِس لئے وُہ بین المُلکی حالات کا اثر اپنے ملک پر اور اپنے ملک کا اثر بیرونی ممالک پر قومی نقطۂ نظر سے جانچنے کے ناقابل ہیں۔ ابھی تک حکومتِ ہند کی خارجی پالیسی "سلطنت" کی اغراض کے ماتحت رہی ہے۔ لیکن اب ہندوستانیوں میں بیداری پیدا ہورہی ہے اور وُہ بھی صرف اِس لئے کہ دُوسرے ملکوں میں اُن کے آئینی حقوق غصب کئے جا رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے تجارتی حقوق بڑی حدتک ختم کردیئے گئے ہیں، انہیں اس کی اجازت نہیں کہ وہ کسی "یورپین" کو ملازم رکھ سکیں، وہ کسی یورپین عورت سے شادی نہیں کر سکتے اور اگر کریں تو عورت اپنے حقوقِ جائداد کھو دیتی ہے۔ اس طرح زنجبار کے لوگوں کے مسئلہ نے غیر ملکی حالات میں دلچسپی پیدا کردی تھی۔ اورکم ازکم ایک سیاسی جماعت (کانگرس) میں اپنی غیر ملکی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوچکا ہے۔ اِن حالات کے پیشِ نظر یہ بہت ضروری ہے کہ حکومتِ ہند صرف ہندوستانی اغراض سے متأثر ہوکر اپنی خارجی پالیسی کو ترتیب دے۔ مگر ایسا نہیں کیا جاتا۔ لوگوں کے معاملہ میں حکومتِ ہند کچھ نہ کرسکی۔ صرف محکمۂ نو آبادیات سے خط وکتابت کرتی رہی، مگر کانگرس نے اپنی قوت اور تنظیم سے کام لے کر زنجبار کے ہندوستانیوں کی شرائط منوادیں ــــ اس طرح یہ کتنی ذلّت کی بات ہے کہ انگلستان میں ابھی تک ہندوستانیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ اُن کو بعض ہوٹلوں میں کھانا کھانے، تھیٹروں میں جانے اور تفریحی مجلسوں میں شرکت کی اجازت نہیں۔ حکومتِ ہند اس معاملہ میں ابھی تک کچھ نہیں کرسکی ــــ گو یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بغیر خارجی معاملات پر قبضہ ناممکن ہے تاہم یہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت پوری طرح ہو سکے۔

مذہبی امور: اس دفعہ سے مراد عیسائی مذہب کے متعلقات سے ہے۔ گرجاؤں کا قیام، اُن کے پادریوں کا تقرر، اُن کی تنخواہوں وغیرہ کا گورنر جنرل انتظام کرے گا۔ ہندوستانی تمدّن پر اِن گرجاؤں کے قیام کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑتا اور نہ وہ صحیح احساسِ قومیت کی نشوو ارتقا میں اعانت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہندوستان کا روپیہ اس مد پر صرف ہونا قطعاً ملکی مفاد کے منافی ہے۔

قبائلی معاملات: سرحدی قبائل کا مسئلہ ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ سخت سے سخت قوم پرست بھی اس سے انکار نہ کرے گا کہ ایک غیر مطمئن، بھوکی اور لُوٹ مار پر گزارہ کرنے والی قوم ہندوستان کی ہمسایہ ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ناقابلِ برداشت ہے کہ کسی آزاد قوم کو اُس کے منشا کے خلاف غلام بنایا جائے۔ قبائلی معاملہ ایک معاشی مسئلہ ہے۔ جب تک قبائل کو مستقل ذریعۂ معیشت مہیّا

نہیں آئے گا، وُہ اِسی طرح لُوٹ مار کرتے رہیں گے اور اُن کو کسی قانون کے ماتحت کر کے "مہذب" بنانے کی کوشش کرنا اُن کی آزادی پر ایک ایسی ضرب ہے جس کو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے —— جب کبھی وہاں شورش ہوتی ہے ہندوستان کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے، جانی نقصان کے علاوہ وُہ بے اطمینانی اور ہراس جو ملحقہ علاقوں میں پھیل جاتا ہے، تجارت اور پُرامن زندگی کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ قبائل کی عسکری رُوح نہیں کُچلی جا سکتی۔ قوت اُن کو نہیں دبا سکتی، اُس کا صرف ایک علاج ہے اور وُہ ہے اُن کے لئے اُن کے حسب منشا ایک مستقل ذریعہ معیشت پیدا کرنا۔ اِس کے لئے چاہیے کاشتکاری کو ترقی دی جائے یا اُن کو افغانستان اور ہندوستان کی تجارت کا دلّال را ایجنٹ بنایا جائے —— ورنہ آئے دن کے جھگڑے، مالی نقصان کے علاوہ قبائل ایک مسلسل خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ گورنر جنرل دہلی سے ان علاقوں پر حکومت کریں گے لیکن یہ کتنا صحیح اقدام ہوتا اگر ان میں رہنے والوں اور ان کے ساتھ میل جول رکھنے والوں کو اِن مسائل کے متعلق رائے دینے کا حق دے دیا جاتا۔ یہی نہیں فیڈرل ایوان کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وُہ اِس پالیسی پر نکتہ چینی کرے، اور وائسرائے کو رائے دے۔

یہ فیڈرل امُور کا ایک حِصّہ ہے جس پر گورنر جنرل حکومت کرے گا۔ یہاں خصوصی ذمہ داری یا خصوصی اختیارات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس برطانوی پارلیمنٹ نے اپنے نمایندہ کو اِن معاملات پر کامل اختیار دے دیا ہے، وہ جس طرح چاہے اِن پر حکومت کرے ...... لیکن دُوسرے فیڈرل امور پر ہندوستانیوں کو اختیار دے دیا گیا ہے۔ آئین تجویز کرتا ہے کہ گورنر جنرل اِن امور کے انتظام کے لئے ایک کابینہ مرتب کرے گا، اُس کی کوشش ہوگی کہ یہ کابینہ، ایوان کی اکثریت کا نمایندہ ہو۔ اِسی کابینہ کے مشورہ سے اِن "دوسرے امور" کا انتظام کیا جائے گا۔ اَور یہ اپنے انتظامات وغیرہ کے لئے اپنے ایوان کے سامنے جوابدہ ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایوان چاہے، کابینہ کو توڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اُمید کی جاتی ہے کہ اِس طرح سے اِن "دوسرے اُمور" پر ہندوستانی رائے دہندہ کی حکومت ہوگی —— مگر کیا حقیقت یہی ہے؟

ریاستوں کے قدامت پسند عنصر اور اُن کے برطانوی ہند کے ترقی پسندوں سے عدم تعاون کی بابت پہلے لکھا جا چکا ہے یہ ایک قدرتی امر ہے کہ وحدتِ مقصد کے بغیر اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا۔ تاہم اگر ایسا ہو جائے کہ فیڈرل کابینہ ایسے وزراء پر مشتمل ہو جو ہر طرح سے ترقی پسندوں اور قوم پرستوں کے حسبِ منشا ہوں تو کیا یہ کابینہ ہندوستان کے لئے کچھ تعمیری کام کر سکتا ہے؟ کیا اُس کو اتنا اختیار ہے کہ وہ قانون و آئین کی حدود میں رہ کر اپنے ملک کی ترقی اور آزادی کے لئے جدوجہد کر سکے؟

اِن معاملات کو چھوڑ کر جن پر آئین گورنر جنرل کو کامل اختیارات دیتا ہے ہم دُوسرے فیڈرل اُمور پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم ہندوستان کے مالی حالات اور اقتصادی و تجارتی اُمور ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان امور پر ہندوستان کو کتنا اختیار دیا گیا ہے۔ آئین ہندوستان کی مالی پالیسی کو ایوان کے زیرِ اثر ظاہر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزراء کو اس میں ردّ و بدل کا اختیار ہے مگر

حقیقت میں ایسا نہیں۔ کیونکہ گورنر کی طرح گورنر جنرل کی بھی کچھ خصوصی ذمہ داریاں ہیں اور ہندوستان کی مالی حالت کو استوار رکھنا بھی گورنر جنرل کی ایک خصوصی ذمہ داری ہے۔ آئین گورنر جنرل کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اس ذمہ داری کی تعمیل میں ایک مالی مشیر مقرر کر سکتا ہے۔ خیال رہے کہ یہ مالی مشیر پہلے "مشیران سلطنت" سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس کا تعلق براہ راست گورنر جنرل سے ہوگا، وہی اس کا تقرر کرے گا اور یہ اُسی کے ماتحت ہوگا . . . . آئین مالی پالیسی کو ایوان کے اختیار میں دیتا ہے اور اُس کے انتظام کے لئے کابینہ میں ایک وزیر مالیات بھی ہوگا۔ مگر اس کے باوجود کابینہ سے الگ ایوان کے اثر و اختیار سے بالا ایک اور مالی مشیر مقرر کیا جائے گا۔ ظاہر ہے "مالیات" پر آخری فیصلہ گورنر جنرل کی ذمہ داری ہے اور اُس کا مشیر اُس کا مقرر کردہ مشیر مالیات ہے لہٰذا ایوان کا منتخب کردہ وزیر مالیات ایک بے حقیقت سیاسی پُرزہ ہوگا جس کی رائے کی کچھ وقعت نہیں ہوگی اور فیصلہ ہمیشہ "مشیر مالیات" کے مشورہ کے مطابق کیا جائے گا۔ ایوان کی قوت اور مالی حالات پر اُس کا اثر اِس دفعہ سے پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ اب بھی یہی حالات ہیں۔ وزیر مالیات فیصلہ کرتا ہے اور گورنر جنرل تسلیم کر کے جاری کر دیتا ہے۔ فیڈرل نظام میں یہ فرق ہو جائے گا کہ فیصلہ کرنے والا اور فیصلہ جاری کرنے والا بدستور باقی رہے گا مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک "بے دست و پا" ہندوستانی وزیر مالیات کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

مالی حالات حکومت کا سب سے اہم جزو ہوا کرتے ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ ذرائع آمد و رفت اس قدر وسیع ہیں کہ تمام دُنیا ایک تجارتی منڈی معلوم ہوتی ہے۔ تجارتِ درآمد و برآمد میں شرح مبادلہ ایک بہت ضروری عنصر ہے، جب تک کسی ملک کی شرح مبادلہ ایک "مناسب جگہ" پر قائم ہے اُس ملک کی ساکھ دُوسرے ممالک میں قائم رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے "اراکین پیداوار" مزدور اور کسان کی فلاح بہت بڑی حد تک اسی شرح مبادلہ پر منحصر ہے۔ آج کل قوم پرست موجودہ شرح کو بدلنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے کم شرح مبادلہ مُلکی کسانوں اور مزدوروں اور تجارتِ درآمد پر خوشگوار اثر ڈالے گی۔ حکومت اس رائے سے اتفاق نہیں کرتی لہٰذا قوم پرست سوائے احتجاج کے کچھ نہیں کر سکتے، یہی حالت فیڈرل حکومت کے نفاذ کے بعد بھی رہے گی۔ ممکن ہے کبھی یہ اختلافِ رائے کابینہ اور حکومت یعنی گورنر جنرل میں ہو جائے۔ اُس وقت بھی حکومت کا فیصلہ گورنر جنرل کی مرضی اور مشیر مالیات کے مشورہ کے مطابق ہوگا۔

گورنر جنرل کی دُوسری ذمہ داری امتیازی سلوک کا انسداد کرنا ہے۔ ایوان ایسے تجارتی قانون پاس نہیں کر سکتا جن کا اثر برطانوی تجارتی مفاد پر بُرا پڑے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ برطانوی مال پر محصولِ درآمد بڑھا دیں یا تجارتِ برآمد پر اس قسم کی پابندیاں عائد کر دیں جو لنکا شائر وغیرہ کے مفاد کے خلاف ہوں۔ اِس قسم کے قوانین کو گورنر جنرل ردّ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی خصوصی ذمہ داری ہے کہ وہ ہندوستان اور برطانیہ کے تجارتی تعلقات میں مساویانہ حقوق قائم رکھے۔ ہندوستان ایک زرخیز صنعتی ملک ہے، اس کی صنعت و زراعت کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کے تیار شدہ مال کو بیرونی مسابقت سے محفوظ کیا جائے، مُلکی منڈی دیسی مال کے لئے وقف کر دی جائے، خام

Sec, 15 ملاحظہ

اشیا کی برآمد ایسی شرائط پر اور ایسے ممالک کو کی جائے جہاں اُسے سب سے زیادہ فائدہ ہو۔ یہ سب حکومت کی مدد سے ہوسکتا ہے۔ تامینی محاصل عائد کئے جائیں۔ خام و پختہ اشیا کی تیاری پر مالی مدد دی جائے۔ ذرائع آمد و رفت زیادہ وسیع کئے جائیں۔ غرضکہ ایک ایسی تجارتی پالیسی پر عمل کیا جائے جو قومی مصالح کے زیر اثر ہو لیکن فیڈریشن میں ایسا ہونا غیر ممکن ہے۔ آئین واضح طور پر اس کی تصریح کرتا ہے کہ فیڈرل قانون انگریزی مال پر تامینی محاصل عائد نہیں کرسکتا۔ ملک کی منڈی انگریزی مال کے لئے اسی طرح کھلی ہوگی جس طرح ملکی مال کے لئے۔ اور اگر کسی ملکی کارخانے یا صنعت کو مالی امداد دی جائے گی تو اس قسم کے انگریزی کارخانے یا صنعت کو بھی حق ہوگا کہ وُہ یہی سہولتیں حاصل کرلیں ــــ موجودہ دُنیا میں جب کہ معاشی بے چینی ہر ملک میں معاشی قومیت پیدا کر رہی ہے ہندوستان کی نئی پیدا شدہ صنعت کو اس طرح بے بس کرنا یہاں کی معاشی صلاحیتوں کو ختم کر دینا ہے۔

آئین ملک کے لئے کوئی منظم اور ہمہ گیر معاشی پالیسی تجویز نہیں کرتا، صرف یہی نہیں بلکہ معاشی قوت اس طرح تقسیم کی گئی ہے کہ کوئی منظم معاشی پالیسی تجویز کی ہی نہیں جاسکتی ــــ سب سے اول آئین چند مخصوص ادارے قائم کرتا ہے مثلاً ریزرو بنک، ریلوے کی انتظامیہ کمیٹی، اور صوبجاتی و فیڈرل معاشی امُور کی تقسیم۔ دُوسرے حصّہ میں گورنر جنرل اور گورنر کے وُہ اختیارات آتے ہیں جن کی بدولت وہ امتیازی سلوک کا انسداد کریں گے۔

ریزرو بنک کو سکہ جاری کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، یہی بنک ملک کی مالی حالت کی دیکھ بھال کرے گا، اسی کی بدولت شرح مبادلہ وغیرہ پر اثر ڈالا جائے گا۔ اور گو یہ بنک "حصّہ داروں" کے سرمایہ سے قائم کیا گیا ہے، تاہم اس پر آخری اختیار گورنر جنرل کا ہے، گورنر جنرل کو اس کے تمام شعبوں پر پُورا اختیار ہوگا۔ اِتنے بڑے ادارہ کو جس کے متعلق ایک وسیع ملک کی معاشی و مالی اہم ذمہ داریاں ہوں ایک شخص کی ذاتی رائے پر منحصر کر دینا ایک ایسا فعل ہے جس سے گورنر جنرل کی سیاسی حیثیت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ کسی مخصوص قابلیت کے آدمی کی نگرانی اور ہدایت قابلِ قبول ہوسکتی ہے مگر اس کو سیاسی قوت کے زیر اثر کرنا بہت مشکوک ہے۔ اسی طرح ریلوے کا انتظام ایک ایسی کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے جس پر گورنر جنرل کو پُورا اختیار ہے۔ ایوان اس کمیٹی کے کسی فعل پر نکتہ چینی نہیں کرسکتا۔ کسی ملک کی ترقی میں ذرائع آمد و رفت کی جو اہمیت ہوتی ہے وہ محتاج تشریح نہیں اور پھر ہندوستان کے لئے جو ابھی ایک نوخیز صنعتی مُلک ہے۔ ریلوے پالیسی کا اور اس کے کرایہ کا قومی مفاد کے مطابق ہونا ازبس ضروری ہے اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ ریلوے کا انتظام ایک ایسے ادارہ کے سپرد ہو جو پبلک کی رائے اور مُلکی مفاد کو پیشِ نظر رکھے۔ مگر یہ دونوں باتیں موجودہ آئین میں نہیں ملتیں۔

موجودہ زمانے میں کوئی ملکی حکومت ملک کی معاشی حالت کے انتظام اور نگرانی کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتی کسی ترقی یافتہ ملک کو دیکھ لیجئے، وہاں کی حکومت ملک کی فلاح میں ذمہ دارانہ دلچسپی لیتی ہے، وہاں اقتصادی ترقی کے لئے پروگرام تجویز کئے جاتے ہیں، غیر ملکی تجارت پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، ملکی کارخانوں کو مصنوعی مدد دی جاتی ہے تاکہ وہ بیرونی مسابقت کا مقابلہ کر

سکیں، لیکن ہندوستان میں آئینِ نَو کوئی ایسی صورت پیدا نہیں کرتا جو تمام ملک کے معاشی حالات کو ایک ہمہ گیر معاشی نظام کے زیرِ نگرانی ترقی دے۔

آئین کم از کم چار ایسے اِدارے قائم کرتا ہے جو کسی نہ کسی صُورت سے ملک کے تجارتی و اقتصادی معاملات پر اثر انداز ہونگے

(۱) گورنر جنرل، جس کے ماتحت ریزرو بنک اور ریلوے کی انتظامیہ کمیٹی ہے، اور گورنر جنرل اور گورنر جن کی خصوصی ذمہ داری ہے کہ وہ امتیازی قوانین پاس نہ ہونے دیں۔

(۲) صوبجاتی حکومتیں، جن کے سپرد کافی اہم معاشی ذمہ داریاں ہیں مثلاً زراعت صنعتی ترقی ......

(۳) فیڈرل حکومت، جو ملک کے مالی حالات، ذرائع آمدورفت اور اقتصادی پالیسی وغیرہ کی ذمہ وار ہے۔

(۴) ریاستیں، یہ بھی اتنا اثر رکھتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ملک کے معاشی نظام پر اثر ڈال سکیں۔

تقسیمِ کار کا یہ اصُول کچھ بُرا نہ تھا۔ مگر اِس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اِن مختلف کوششوں کو ایک متفقہ پروگرام کے ماتحت کرنے والا کوئی اِدارہ نہیں۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ معاشی منصوبہ[1] بندی پر عمل کیا جا سکے۔

مثال کے طور پر زراعت کو لیجئے۔ زراعتی ترقی صوبجاتی امور میں داخل ہے لیکن ہندوستان کی زراعتی پیداوار ایک اہم تجارتی پہلو بھی رکھتی ہے، ہم خام اجناس دوسرے ملکوں کو روانہ کرتے ہیں، اس لئے غیر مُلکی تجارت کا ہماری زراعت پر بہت اثر پڑتا ہے۔ مگر غیر ملکی تجارت فیڈرل حکومت کے ماتحت ہے، اب اگر فیڈرل حکومت تامینی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ ہماری زراعت پر ناخوشگوار اثر پڑے گا۔ نتیجۃً کسان اور زمیندار زراعتی ترقی سے اتنا فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے جتنا وُہ اُس صُورت میں اُٹھا سکتے تھے جبکہ زراعت اور غیر ملکی تجارت ایک ایسے ادارہ کی نگرانی میں کام کرتے جو ان دونوں کو ملکی مفاد کے مطابق ترقی دیتا۔

فیڈرل[2] ایوان کے رائے دینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاص تجارتی "جائدادی" حقوق رکھتے ہوں۔ ان لوگوں کے نمایندے بھی ایسے ہی اشخاص ہوں گے جن کا ملکی تجارت میں اور یہاں کی زمین وجائداد میں خاص حصّہ ہوگا۔ ایسے لوگ ہمیشہ قدامت پرست ہوتے ہیں۔ یہ نمایندے ریاستوں کے نمایندوں سے مِل کر ایک ایسا معاشی پروگرام تیار کریں گے جو اُن کے اغراض کے مطابق ہو اور جو ہر ترقی یافتہ لائحہ عمل کے خلاف ہو۔ اِن حالات میں ہندوستان کہاں تک معاشی ترقی کر سکتا ہے اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے ــــ بظاہر معاشی حالات وزراء کے سپرد کئے گئے ہیں۔ مگر ریزرو بنک، ریلوے

---

[1] Economic planning

[2] مضمون کے اس حصّہ میں مَیں نے اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر بی۔ این۔ کول کے رسالہ "آئینِ نَو میں معاشی فلاح" سے کافی مدد لی ہے۔

انتظامیہ کمیٹی اور گورنر جنرل کی امتیازی سلوک والی خصوصی ذمہ داری بہت کچھ قوت سلب کر لیتی ہے۔ اور رہی سہی قوت کو گورنر جنرل کی وُہ ذمّہ داری جو فیڈریشن کی مالی پالیسی سے متعلق ہے اور جس کے طفیل وُہ مالی مشیر مقرر کر سکتا ہے، ختم کر دیتی ہے۔ لہٰذا معاشی و مالی پالیسی بہت کم وزراء کے زیرِ اثر ہے، ورنہ ساری قوت وہیں رہے گی جہاں اب ہے اور نئے آئین میں ہندوستان کی معاشی حالت اتنی ہی رفتار سے ترقی کرے گی جتنی سے اب، بلکہ اُس سے بھی کچھ کم!

گورنر جنرل کی باقی خصوصی ذمہ داریاں تقریباً وہی ہیں جو گورنر کی، اسی طرح آئین سازی کے اختیارات بھی اتنے ہی وسیع ہیں جتنے گورنر کے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ فیڈریشن میں کچھ اُمور (فوجی مسائل، غیر ملکی پالیسی وغیرہ) ایسے ہیں جو وزراء اور ایوان کے اختیار سے قطعاً باہر ہیں اور وُہ رائے تک دینے کے مجاز نہیں —— دُوسرے اُمور کا انتظام گورنر جنرل وزراء کے مشورہ سے کرے گا یعنی صرف یہ اُمور ایسے ہوں گے جن پر گورنر کے منتخب کردہ اور ایوان کے نمائندہ کابینہ کا اختیار ہوگا مگر یہاں بھی گورنر جنرل اپنی خصوصی ذمہ داریوں کی بدولت مداخلت کر سکے گا۔ علاوہ ازیں ان اُمور میں سے بھی زیادہ اہم ذمہ داریاں گورنر جنرل ہی کے سپرد ہیں، اُسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وزیرِ مالیات کی موجودگی میں ایک مالی مشیر مقرر کر دے، وہ ریزرو بنک اور ریلوے پر پُورا اختیار رکھتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ فیڈریشن میں نہ ذمّہ داری ہے اور نہ اختیار —— اور صُوبوں میں ذمہ داری ہے، اختیار نہیں۔

محمّد صدیق تاؤنی

نقّاد سے!

تو اہلِ نظر ہے تو مرا حُسنِ نظر دیکھ
بکھرے ہیں ترے سامنے کیا لعل و گہر دیکھ!

ہشیار ہو، کبتک یونہی ذرّوں کو تکیگا
لِللہ! ذرا جلوہ گہِ شمس و قمر دیکھ!

دربارِ محبّت میں ہیں مقبول یہ نالے
ہر آہ کے ماتھے پہ چمکتا ہے اثر دیکھ!

یہ منظرِ دلکش کہیں دیکھا بھی نہ ہوگا
الفاظ کی نبضوں میں رواں خونِ جگر دیکھ!

اس گلشنِ معنی کی اچھوتی ہیں بہاریں
دُنیا تو پُرانی ہے، اُدھر کیا ہے اِدھر دیکھ!

ہر شعر میں بھر دی ہے دلِ وقت کی دھڑکن
ہر نظم میں کیفیّتِ صد شام و سحر دیکھ!

گلزار ہو بے خار، یہ ممکن نہیں ناداں،
کانٹوں میں اُلجھنا نہیں اچھا، گُلِ تر دیکھ!

سکندر علی وجد

لیڈر

افرادِ تمثیل

گھنشام داس ۔ ایک روزانہ اخبار کا مالک اور اسمبلی کا اُمیدوار

رام لکھن ۔ اُس کا چپراسی

بھگوتی ۔ اُس کا نوکر

کالج کے دو لڑکے ــــــ ایڈیٹر ــــــ مسز گھنشام داس

وقت : صبح آٹھ بجے

جگہ : گھنشام داس کے مکان کا ڈرائنگ رُوم

سامنے بائیں طرف دیوار کے ساتھ ایک بڑی میز لگی ہے جس پر کتابیں اخبارات اور کاغذات اس طرح قرینے سے رکھے ہیں کہ سامنے رَیک میں کتابیں چُنی ہیں ۔ اور دائیں بائیں لوہے کے ٹرے رکھے ہیں جن میں سے ایک میں ضروری کاغذات اور دُوسرے میں اخبارات پڑے ہیں ۔

میز کے ساتھ ایک گدّے دار کُرسی ہے جس کے پاس ہی دائیں طرف ایک اُونچا سٹول ہے جس پر ٹیلیفون رکھا ہے سٹول کے دائیں طرف کو ایک تخت ہے جس پر نفاست سے بستر بچھا ہے ۔ کُرسی اور تخت کے درمیان سٹول اس طرح رکھا ہُوا ہے کہ اس پر پڑا ہُوا ٹیلیفون دونوں جگہوں سے بہ آسانی اُٹھایا جا سکتا ہے ۔ تخت کے ساتھ ایک آرام کُرسی پڑی ہے ، بائیں دیوار کے ساتھ ایک کوچ کا سیٹ ہے ۔

بائیں دیوار میں دو کھڑکیاں اور روشندان ہیں ۔ دائیں دیوار میں ایک دروازہ ہے جو گھر کے برآمدے میں کھلتا ہے ۔

گھنشام داس کرسی پر بیٹھے کوئی اخبار دیکھ رہے ہیں ــــ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے ــــ گھنشام داس اخبار ٹرے میں پھینک کر "چونگا" اُٹھاتے ہیں ۔

ــــ ہیلو !

—— (ذرا اُور بلند آواز سے) ہیلو!

—— ہاں ہاں میں ہی بول رہا ہوں گھنشام داس۔ آپ . . . . ؟ اچھا اچھا۔ لالا رام جی منتری ہریجن سبھا ہیں!۔ نمستے۔ نمستے۔ (ذرا ہنستا ہے) سنائیے مہاراج کل کے جلسے کی کیسی رہی؟

—— اچھا آپ کے لیکچر کے بعد ہوا پلٹ گئی۔ سب ہریجن میرے حق میں پروپیگنڈا کرنے کو تیار ہو گئے؛

—— ٹھیک ٹھیک! آپ نے خوب کیا۔ خوب کیا آپ نے۔ دراصل میں نے اپنی زندگی گرے ہوئے مظلوم اور پچھڑے ہوئے طبقہ کو اوپر اُٹھانے کے لئے وقف کر دی ہے۔ بچّوں ہی کو لیجئے، ہمارے گھروں میں ان کی حالت کتنی بُری ہے۔ ان کی تربیت کے طریقے کتنے پُرانے اُور دقیانوسی ہیں۔ ان کی صحت کی طرف کتنی کم توجہ دی جاتی ہے۔ اور ناجائز دباؤ میں رکھ کر اُنہیں کتنا ڈرپوک اُور بُزدِل بنایا جاتا ہے۔ اُنہیں . . . .

(چھوٹا بچہ بلرام داخل ہوتا ہے)

بلرام۔ بابوجی۔ بابوجی ہمیں بسنت کے میلے . . . . .

گھنشام۔ (بدستور ٹیلیفون پر باتیں کر رہا ہے۔ پر آواز ذرا اُونچی ہو جاتی ہے) ہاں ہاں میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے بچّوں کی خاطر۔ ان کی تعلیم اور تربیت کی خاطر، ان کی صحت . . . . . .

بلرام۔ (اور نزدیک آکر) بابوجی . . . . . .

گھنشام۔ (”چونگے“ سے مُنہ ہٹا کر خشمناک لہجہ میں) ٹھہر، ٹھہر، کمبخت۔ دیکھتا نہیں میں ٹیلیفون پر بات - - - - -

(بچہ رونے لگتا ہے)

گھنشام (ٹیلیفون پر) میں آپ سے ابھی ایک سیکنڈ میں بات کرتا ہوں، اِدھر ذرا شور ہو رہا ہے۔

(”چونگا“ میز پر رکھ دیتا ہے)

(بچے سے) چل۔ نکل یہاں سے۔ سُؤر۔ بدبخت

(کان پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹتا ہے۔ بچہ روتا ہُوا بیٹھ جاتا ہے)

(نوکر کو آواز دیتا ہے) او رام مکھن! او رام مکھن!!

(نوکر دوڑا آتا ہے)

(دُور سے) آئے رہے بابوجی۔ (نزدیک آکر۔ سانس پھُولی ہوئی ہے) ہاں بابوجی

(گھنشام نوکر کو پیٹتا ہے)

۔۔۔ سُور ۔ حرام خور ۔۔ پاجی ۔ کیوں اسے اِدھر آنے دیا ۔ کیوں اِدھر آنے دیا اسے ؟

رام لکھن ۔ اب بابوجی کا مارت ہو ۔ لیٹے توجات رہے ۔

(لڑکے کا بازو تھام کر اسے باہر لے جاتا ہے ۔)

گھنشام ۔ اور سنو ۔ کسی کو اِدھر مت آنے دینا ۔ اور کوئی باہر سے آئے تو پہلے آکر اطلاع دینا ۔ سمجھے ۔ ورنہ مار مار کر کھال اُدھیڑ دوں گا ۔

(نوکر اور لڑکے کو باہر نکال کر زور سے دروازہ بند کر دیتا ہے)

۔۔۔ ہوں ! بیوقوف ۔ خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کر دیا ۔

("چونگا" اُٹھاتا ہے)

(قدرے خشمناک لہجہ میں) ہیلو . . . . . (آواز میں حلیمی لاکر) اچھا اچھا ۔ آپ ہیں ابھی (لہجہ کو سنوار کر اور ذرا سا ہنس کر) تو میں کہہ رہا تھا کہ صوبے میں میں ہی ایسا شخص ہوں، جس نے اس ظلم کے خلاف جو گھروں اور مدرسوں میں چھوٹے بچوں پر روا رکھا جاتا ہے، آواز بلند کی ۔ سکولوں میں جسمانی اذیت اور سزا کے طریق کو فوراً بند کر دینے پر زور دیا ۔ دُوسرے ظلم رسیدہ لوگ گھروں میں کام کرنے والے سادہ لوح نوکر ہیں ۔ جو ظالم مالکوں کے جور و ستم کا شکار بنتے ہیں ۔ اس ظلم کا سدِ باب کرنے کے لئے "نوکر یونین" قائم کی ۔ تیسرا پسماندہ طبقہ ہریجنوں کا ہے ۔ اور اُن کے حقوق کی حمایت برہمن ہوتے ہوئے بھی مَیں نے کی ہے ، اور اگر میں اسمبلی میں گیا تو . . . .

(دروازہ کھُلتا ہے)

رام لکھن ۔ (دروازے سے جھانک کر) بابوجی بھنگن . . . .

گھنشام ۔ (سنا اَن سنا کر کے) مَیں وہاں بھی ہریجنوں کی سیوا کروں گا ۔ آپ اپنی ہریجن سبھا میں اس بات کا اعلان کر دیجئے ۔

رام لکھن ۔ (ذرا اندر آکر) بابوجی

گھنشام ۔ (غصہ کے ساتھ رام لکھن سے مخاطب ہو کر) ٹھہر پاجی (ٹیلیفون میں) نہیں نہیں مَیں نوکر سے کہہ رہا تھا (خفیف سا ہو کر ہنستا ہے) ہاں تو آپ اعلان کر دیجئے کہ میں اسمبلی میں ہریجنوں کے پکش کی حمایت کروں گا اور وہ میرے حق میں پراپیگنڈا کریں ۔

۔۔۔ ہیں . . . کیا ؟ اچھا اچھا ۔ مَیں ضرور جلسہ میں شامل ہونگا ۔ کیا کروں مرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی ۔

۔۔۔ اچھا نمستے

(ٹیلیفون کا "چونگا" رکھ دیتا ہے)

(نوکر سے) تم سے تو کہا تھا اِدھر مت آنا ۔

رام لکھن ۔ آپ اسی تو کہا دیت کہ کنو آئے تو اطلاکر دئی مُدا اسی بھنگن آوا اور اپنو ایک مہینہ کا مجوری ......
گھنشام (غصہ سے) چلے جاؤ۔ کہہ دو بھنگن سے اگلے مہینے آئے ۔ میرے پاس وقت نہیں ۔ چلے جاؤ اور کسی کو مت آنے دو۔
بھنگن (دروازہ کے باہر سے نہایت باریک آواز میں) مہاراج دُودھوں نہاؤ ۔ پوتوں پھلو ۔ دو مہینے ہو گئے ہیں ......
گھنشام ۔ (قطع کلام کر کے) کہہ جو دیا پھر آنا ۔ جاؤ اب وقت نہیں ۔

(بھگوتی کا داخلہ)

بھگوتی ۔ جے رام جی کی بابوجی
گھنشام ۔ تم اس وقت کیوں آئے ہو بھگوتی ؛
بھگوتی ۔ بابوجی ہمارا حساب کر دو ۔
گھنشام ۔ (بے پروائی سے) تم دیکھتے نہیں، آج کل انتخاب کی وجہ سے کچھ نہیں سُوجھتا ۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ ۔
بھگوتی ۔ اب اور بابُوجی میں ایک گھڑی بھی نہیں ٹھہر سکتا ۔ آپ میرا حساب چُکا ہی دیجئے ۔
گھنشام ۔ (ذرا بلند آواز سے) کہا جو ہے کچھ دن ٹھہر جاؤ ۔ یہاں اپنا تو ہوش نہیں اور تم حساب حساب چلّائے جا رہے ہو ۔
بھگوتی ۔ جب آپ کی نوکری کریں گے بابوجی تو کھانے کے لئے اور کہاں مانگنے جائیں گے ۔
گھنشام ۔ ابھی چار دن ہوئے دو روپے لے گئے تھے ۔
بھگوتی ۔ وہ کہاں بیٹھے ہیں بابوجی ۔ ایک تو راستہ ہی میں بنئے کی بھینٹ ہو گیا اور ایک سے مشکل سے آج تک کام چلا ہے ۔

(گھنشام جیب سے روپیہ نکال کر فرش پر پھینکتا ہے ۔)

گھنشام ۔ تو لو ابھی یہ ایک روپیہ لے جاؤ
بھگوتی ۔ نہیں بابوجی ۔ ایک ایک نہیں ۔ آپ میرا سب حساب چُکا دیجئے ۔ تنخواہ ملے تین مہینے ہو گئے ہیں ۔ ایک ایک دو دو سے کتنے دِن کام چلے گا ۔ ہمارے بھی آخر بیوی بچے ہیں ۔ انہیں بھی کھانے اوڑھنے کو چاہیے ۔ آپ ایک دِن میں جائے پانی پر جتنا خرچ کر دیتے ہیں ۔ اتنا ہمارے ایک مہینے ......
گھنشام ۔ (غصے سے) کیا بک بک لگا رکھی ہے ۔ کہہ جو دیا ۔ ابھی یہ لے جاؤ ۔ باقی پھر لے جانا ۔
بھگوتی ۔ ہم تو آج ہی سب لے کر جائیں گے ۔
گھنشام ۔ (غضبناک حالت میں اُٹھ کر) کیا کہا ۔ آج ہی لو گے ۔ ابھی لو گے ۔ جاؤ نہیں دیتے ۔ ایک پیسہ بھی نہیں دیتے ۔ نکل جاؤ یہاں سے ۔ جاؤ جا کر پولیس میں رپورٹ کر دو ۔ پاجی ۔ حرام خور ۔ آج تک سبزی میں دال میں سودا سلف میں بازار سے آنے

والی ہر چیز میں سے پیسے رکھتا رہا ہم نے ایک بات نہ کی۔ اور اب یوں اکڑتا ہے۔ جاؤ۔ نکل جاؤ۔ عدالت میں دعوےٰ کر دو۔ دیکھو
چار مہینے کے لئے جیل بھجوا دیتا ہوں یا نہیں۔

بھگوتی۔ سچ ہے غریب دیانتدار ہو تو بھی چور ہے ڈاکو ہے۔ اور امیر آنکھوں میں دھول جھونک ہزاروں پر ہاتھ صاف کرے۔ تو بھی
دیانتدار۔ قوم کا مکھیا ....

گھنشام۔ (غصّہ سے پاگل ہو کر) تو جائے گا یا نہیں۔ (نوکر کو آواز دیتا ہے) رام مکھن، رام مکھن!

رام مکھن۔ جی بابو جی۔ جی بابو جی (دوڑتا آتا ہے)

گھنشام۔ اس کو باہر نکال دو۔

رام مکھن۔ (بھگوتی کے مضبوط لمبے چوڑے جسم کو سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے) ای کو باہر نکالی دیں۔ ای ہم تو کب نکست۔ ای تو
ہمیں نکاری دیت ....

گھنشام (بازو سے رام مکھن کو پرے جھٹک کر) ہٹ تجھ سے کیا ہوگا۔

(بھگوتی کو پکڑ کر زبردستی باہر نکالتا ہے)

گھنشام۔ نکلو۔ نکلو (مارتا ہے)

بھگوتی۔ مار لیجئے۔ مار لیجئے۔ ہمارے چار پیسے رکھ کر آپ لکھ پتی نہ بن جائیں گے۔

(گھنشام داس اسے باہر دھکا دے کر دروازہ زور سے بند کر لیتا ہے)

—— (رام مکھن سے) تم یہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ نکلو۔

(رام مکھن ڈر کر نکل جاتا ہے)

گھنشام۔ (تخت پر لیٹتا ہے) نامعقول۔ بیوقوف۔ (پھر اُٹھ کر کمرے میں ادھر اُدھر گھومتا ہے۔ پھر سیٹی بجاتا ہے اور گھومتا ہے۔
پھر نوکر کو آواز دیتا ہے)

—— رام مکھن۔ رام مکھن!

رام مکھن۔ آیا بابو جی۔ (داخل ہوتا ہے)

گھنشام۔ اخبار ابھی آیا ہے یا نہیں؟

رام مکھن۔ آ گیا بابو جی۔ چھوٹے کاکا پڑھی رہن۔ ابھی لا دیت۔

گھنشام۔ پہلے اِدھر کیوں نہیں لائے۔ تمہیں لاکھ دفعہ کہا ہے۔ اخبار پہلے اِدھر لایا کرو۔ لاؤ جلدی۔

(رام لکھن دوڑا ہُوا جاتا ہے)

گمنام (جیسے اپنے آپ) کل کا میرا بیان کتنا معرکہ خیز ہے۔ طلبہ میں ہلچل پڑ گئی ہو گی۔ سب کی ہمدردی میرے ساتھ ہو جائیگی۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

—— (آہستہ سے) ہیلو

—— (ذرا اونچی) ہیلو ۔ ۔ ۔ ۔ کون صاحب؟ سکرٹری ہوزری یونین! اچھا اچھا۔ نمسکار نمسکار! سنایئے۔ آپ کے حلقۂ انتخاب کا کیا حال ہے؟

—— کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب میرے حق میں ووٹ دینے کو تیار ہیں۔ میں آپ کا بے حد احسانمند ہوں۔

—— اس طرف سے آپ بالکل تسلی رکھیں۔ میں اُن آدمیوں میں سے نہیں جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ مَیں جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں اور جو کرتا ہوں وہی کہتا ہوں۔ آپ نے میرا الیکشن مینی فیسٹو، میرا مطلب ہے انتخابی اعلان نہیں پڑھا۔ میں اسمبلی میں جاتے ہی مزدوروں کی حالت سُدھارنے کی کوشش کروں گا۔ مزدوروں کی صحت، تعلیم و تربیت اور آرام و آسائش کے لئے خاص بل پیش کروں گا۔

کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ہاں ہاں۔ اِس طرف سے بھی مَیں بے پروا نہیں۔ میں جانتا ہوں اس سلسلہ میں مزدوروں کو کس مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سرمایہ دار غریب مزدوروں کی کئی کئی مہینے کی تنخواہیں روک کر ان پر انتہائی ظلم کرتے ہیں۔ خود موٹروں پر سیر کرتے ہیں، عظیم الشان ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں اور انہیں فاقوں سے مرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ میں اسمبلی میں جاتے ہی ایک ایسا بل پیش کروں گا، جس سے تنخواہ کے بارے میں مزدوروں کی تمام شکایات سرکاری طور پر سُنی جائیں اور جو لوگ غریب مزدوروں کی تنخواہیں تین مہینے سے زیادہ عرصے تک دبا رکھیں اُن کے خلاف سرکاری طور پر کارروائی کی جائے۔

—— ہاں آپ کا یہ مطالبہ بھی سولہ آنے جائز ہے۔ میں اسمبلی میں اس کی حمایت کروں گا۔ ہفتہ میں ۴۴ گھنٹے کام کا مطالبہ کیا بے جا ہے۔ آخر انسان اور حیوان میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ تیرہ تیرہ گھنٹے کی ڈیوٹی! بھلا کام کی کوئی حد بھی ہے۔

(آہستہ آہستہ دروازہ کھلتا ہے اور ایڈیٹر داخل ہوتا ہے)

—— (ایڈیٹر سے) آپ بیٹھئے۔

(ایڈیٹر کھڑا رہتا ہے)

(ٹیلیفون پر) یہ ہمارے ایڈیٹر صاحب آئے ہیں۔ اچھا تو پرسوں شام کو تو آپ کا جلسہ ہو رہا ہے۔ میں ضرور آنے کی کوشش کروں گا کوئی اور بات ہو تو کہئے۔ نمسکار! (چونگا رکھ دیتا ہے)

— (ایڈیٹر سے) بیٹھ جائیے آپ کھڑے کیوں ہیں۔

ایڈیٹر۔ نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ (تکلف کے ساتھ کرسی پر بیٹھتا ہے۔)

(رام لکھن اخبار لئے داخل ہوتا ہے۔)

رام لکھن۔ چھوٹے کاکا تو دیت نہیں رہن۔ مُدا ہم جبرجستی لے آئے۔

گھنشام۔ (اخبار لے کر) جا جا باہر بیٹھ۔

(کرسی کو تخت کے قریب کھینچ کر اس پر بیٹھتا ہے۔ پاؤں تخت پر ٹکا لیتا ہے۔ اور اخبار کے صفحات پلٹتا ہے۔)

ایڈیٹر۔ میں ...... میں!

گھنشام۔ (اخبار بند کر کے) ہاں ہاں پہلے آپ ہی فرمائیے۔

ایڈیٹر۔ (ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے) بات یہ ہے کہ میری ..... میرا مطلب ہے کہ میری آنکھیں بہت خراب ہو رہی ہیں۔

گھنشام۔ آپ کو ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہئے تھا۔ کہئے ڈاکٹر گردھاری لال کے نام رقعہ لکھ دوں۔

ایڈیٹر۔ نہیں یہ بات نہیں (تھوک نگل کر) بات یہ ہے کہ میری آنکھیں اتنا بوجھ برداشت نہیں کرتیں۔ آپ جانتے ہیں مجھے دن کے بارہ بجے آنا پڑتا ہے۔ بلکہ آج کل تو ساڑھے گیارہ ہی آتا ہوں۔ شام کو چھ سات بج جاتے ہیں۔ پھر رات کو نو بجے آتا ہوں اور پھر ایک بھی بج جاتا ہے۔ دو بھی بج جاتے ہیں۔ تین بھی بج جاتے ہیں۔

گھنشام۔ تو آپ اتنی دیر نہ بیٹھا کیجئے۔ بس ذرا جلدی کام نپٹا دیا۔

ایڈیٹر۔ جلدی کیسے نپٹ سکتا ہے؛ ایک میں ہوں اور دو دوسرے آدمی ہیں۔ جو نہ ٹھیک ترجمہ کر سکتے ہیں۔ نہ ٹھیک مضمون لکھ سکتے ہیں۔ اور اخبار سولہ صفحوں کا نکالنا ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر چاہوں تو کام کچھ جلدی ختم کر دوں لیکن کوئی خبر رہ جائے تو آپ ناراض ....

گھنشام۔ ہاں خبر تو نہ رہنی چاہئے۔

ایڈیٹر۔ پھر یہی نہیں۔ آپ کی تقاریر کی رپورٹ کا بھی انتظار کرنا ہوتا ہے۔ انہیں ٹھیک کرتے کراتے ڈیڑھ بج جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے پہلے کیسے جا سکتے ہیں۔

گھنشام۔ (بیزاری سے) تو آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

ایڈیٹر۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اگر ایک اور آدمی رکھ دیا جائے تو اچھا ہو۔ دن کو وہ آ جایا کرے۔ رات کو میں ......

گھنشام۔ میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن ہے۔ اخبار کوئی بہت نفع پر نہیں چل رہا ہے۔ اس پر ایک اور ایڈیٹر کی تنخواہ کا بوجھ کیسے ڈالا جا سکتا ہے۔

ایڈیٹر۔ میری صحت اجازت نہیں دیتی۔آنکھیں کب تک بارہ بارہ تیرہ تیرہ گھنٹے کام کرسکتی ہیں۔
گھنشام۔ کیسی مُورکھوں کی باتیں کرتے ہو۔چھ ماہ میں پانچ روپیہ ترقی تو سرکار کے گھر بھی نہیں ملتی۔ ویسے آپ کام چھوڑنا چاہیں تو شوق سے چھوڑ سکتے ہیں۔ایک نہیں دس آدمی مل جائیں گے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(رام لکھن داخل ہوتا ہے)

رام لکھن۔ باہر دو ٹھو لڑکا آپ سے ملنے لنی کہے رہت۔
گھنشام۔ کون ہیں؟
رام لکھن۔ اب ای ہم کا جانت مُدا کوئی سکٹری کہے رہت۔
گھنشام۔ جاؤ بلا لاؤ۔ (ایڈیٹر سے) آج کے اخبار میں جو میرا بیان نکلا ہے معلوم ہوتا ہے اس کا کالج کے لڑکوں پر اچھا اثر پڑا ہے۔
ایڈیٹر۔ (بے اعتنائی سے) ہاں پڑا ہوگا۔
گھنشام۔ میں نے طلبہ کے حقوق کی حمایت بھی تو خوب کی ہے۔سٹوڈنٹ فیڈریشن نے جو مطالبات یونیورسٹی کے سامنے پیش کئے ہیں ان سب کو درست گردانا ہے۔

(دو لڑکے داخل ہوتے ہیں۔ دونوں سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ایک نے ٹائی لگا رکھی ہے۔ دوسرا کھلے گلے کی قمیص پہنے ہے)

دونوں۔ نمستے
گھنشام۔ نمستے

(دونوں کوچ پر بیٹھتے ہیں)

گھنشام۔ کہئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟
کھلے کالر والا لڑکا۔ ہم نے آج آپ کا بیان پڑھا ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
گھنشام۔ آپ نے پسند کیا؟
وہی لڑکا۔ طلبہ میں ہر طرف اُسی کا چرچا ہے۔ لڑکوں میں بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔
گھنشام۔ آپ کے کالج کے طلبہ کدھر ووٹ دے رہے ہیں؟
وہی لڑکا۔ کل تک کی تو کچھ نہ پُوچھئے۔لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اس بیان کے بعد ۷۵ فیصدی آپ کی طرف ہو گئے۔ابھی ہمارا جلسہ ہُوا۔طلبہ کی اکثریت آپ ہی کی طرف تھی۔
گھنشام۔ (ذرا خوشی سے) اور میں نے غلط بھی کیا لکھا ہے۔جن لوگوں کا دِل بوڑھا ہو چکا ہے، وُہ نوجوانوں کی نمائندگی کیا کریں گے؟

نوجوانوں کو تو اس لیڈر کی ضرورت ہے جو جسم سے چاہے بوڑھا ہو چکا ہو لیکن جس کے خیالات بوڑھے نہ ہوں۔ جو اصلاح سے
خوف نہ کھائے، ترقی سے کنی نہ کترائے۔

وہی لڑکا۔ ہم اپنے کالج کے انتظام میں بھی کچھ اصلاح چاہتے تھے لیکن کالج کے منتظمین نے ہمارے مطالبات کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔

گھنشام۔ آپ کو احتجاج کرنا چاہئے تھا۔

وہی لڑکا۔ ہم نے ہڑتال کر دی ہے

گھنشام۔ آپ کے مطالبات کیا ہیں؟

وہی لڑکا۔ ہم موجودہ پرنسپل نہیں چاہتے۔ نہ وہ ٹھیک طرح پڑھا سکتا ہے، نہ کالج کا ٹھیک انتظام ہی کر سکتا ہے۔ کوئی چھینکے تو
جرمانہ کر دیتا ہے۔ طلبہ سے اس کا سلوک نہایت برا ہے اور طلبہ کے رشتے داروں سے قابل ملامت۔

گھنشام۔ (بے حوصلگی سے) تو آپ کیا چاہتے ہیں؟

دونوں۔ ہم لائق پرنسپل چاہتے ہیں۔

گھنشام۔ (مری ہوئی آواز سے) آپ کا مطالبہ ٹھیک ہے لیکن اس کے لئے ہڑتال کرنے کے بجائے آئینی طریقہ کیوں استعمال نہیں کیا۔

وہی لڑکا۔ ہم کر چکے ہیں۔

گھنشام۔ ہوں۔

دوسرا لڑکا۔ بات یہ ہے جناب! طلبہ کئی سال سے موجودہ پرنسپل کے خلاف شکایت کر رہے تھے۔ لیکن کمیٹی بالکل پروا نہ کرتی تھی طلبہ
نے کئی دفعہ تحریری درخواستیں دیں لیکن کمیٹی کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ الٹے لڑکوں پر جرمانے کئے گئے۔ ہار کر ہم نے ہڑتال کر
دی لیکن مصیبت یہ ہے کہ مینجنگ کمیٹی کافی مضبوط ہے۔ پریس پر اس کا قبضہ ہے۔ ہمارے خلاف سچے جھوٹے ہر طرح کے
بیان شائع کرائے جا رہے ہیں اور ہماری خبر تک بھی کوئی نہیں چھاپتا۔ آپ نے طلبہ کی امداد کا۔ ان کے حقوق کی حفاظت کا
بیڑا اٹھایا ہے۔ اسی لئے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

گھنشام۔ (رکھائی سے) میں آپ کا سیوک ہوں۔ یہ ہمارے ایڈیٹر صاحب ہیں۔ آپ کل دفتر میں ان کو اپنا بیان دے دیجئے
یہ جتنا مناسب سمجھیں گے چھاپ دیں گے۔

دونوں۔ بہت خوب! ہم کل ایڈیٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ نمسکار!

گھنشام اور ایڈیٹر۔ نمسکار

(چلے جاتے ہیں ــــــ دروازہ بند ہوتا ہے)

گمنام۔ (ایڈیٹر سے) اگر یہ کل آئیں تو ان کا بیان ہرگز نہ چھاپنا۔ پرنسپل بائے مہربان ہیں اور کمیٹی کے ممبر ہمارے دوست۔

ایڈیٹر۔ (منہ پھلائے ہوئے) بہت خوب!

گمنام۔ آپ گھبرائیے نہیں، اگر آپ کو کچھ دن زیادہ کام کرنا ہی پڑ گیا تو کیا آفت آ گئی۔ جب میں نے اخبار شروع کیا تھا تو چودہ چودہ پندرہ پندرہ گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔ یہ مہینہ آپ کسی نہ کسی طرح نکال لیجئے۔ انتخابات ہو لیں پھر کوئی انتظام کردوں گا۔

ایڈیٹر۔ (گہری سانس لے کر) بہت خوب! (چلا جاتا ہے)

(گمنام اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ دروازہ زور سے کھلتا ہے اور ایک ہاتھ سے بڑا کم کا بازو تھامے مسز گمنام داخل ہوتی ہیں)

مسز گمنام۔ میں کہتی ہوں آپ بچوں سے کبھی محبت کرنا بھی سیکھیں گے۔ بھلا کیا ہو گیا آج جو بچے پر صبح صبح برس پڑے۔ جب دیکھو گھورتے، جھڑکتے، ڈانٹتے نظر آتے ہیں جیسے بچے اپنے نہ ہوں، پرائے ہوں۔ بھلا آج اس بیچارے سے کیا قصور ہو گیا کہ پیٹنے لگے۔ دیکھو تو سہی اس کا کان اب تک کتنا سرخ ہے۔

گمنام۔ (اخبار ہی پر نظریں جمائے ہوئے) تمہیں کبھی بات کرنے کی تمیز بھی آئے گی۔ جاؤ اس وقت مجھے فرصت نہیں۔

مسز گمنام۔ آپ کے پاس ہماری بات سننے کے لئے کبھی وقت ہوتا بھی ہے؟ مارنے اور پیٹنے کے لئے جانے کہاں سے وقت نکل آتا ہے۔ اتنی دیر سے ڈھونڈ رہی تھی اسے۔ ناشتہ کب سے تیار رکھا تھا۔ بیسیوں آوازیں دیں۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ آخر دیکھا کہ بھُس کی کوٹھڑی میں بیٹھا سِسک رہا ہے۔ آخر کیا بات ہو گئی تھی۔

گمنام۔ (اخبار کو تخت پر پٹک کر) کیا بکے جا رہی ہو۔ بیس دفعہ کہا ہے کہ ان کو سنبھال کر رکھا کرو۔ صبح صبح دماغ چاٹنے کے لئے بھیج دیتی ہو۔

(مسز گمنام بچے کے تھپڑ لگاتی ہے۔ بچہ روتا ہے)

مسز گمنام۔ تجھ سے کتنی بار کہا ہے۔ اس کمرے میں نہ آیا کر۔ یہ باپ نہیں دشمن ہیں۔ لوگوں کے بچوں کو پیار کریں گے۔ ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیریں گے۔ ان کی صحت کے لئے بل پاس کرائیں گے۔ ان کی بہتری کے لئے لکچر جھاڑتے پھریں گے۔ اور اپنے بچوں کے لئے بھول کر بھی پیار کا ایک لفظ زبان پر نہ لائیں گے۔

گمنام۔ (غصہ سے کھڑا ہو جاتا ہے) میں کہتا ہوں تم جاؤ گی یا نہیں؟

(مسز گمنام بچے کے ایک تھپڑ اور لگا دیتی ہے)

مسز گمنام۔ کتنی بار کہا ہے نہ آیا کر اس کمرے میں۔ میں تجھے نوکر کے ساتھ میلہ دیکھنے بھیج دیتی (آواز بلند ہوتے ہوتے رونے کی حد تک چلی جاتی ہے) تو کیوں آیا یہاں۔ مار کھانے کے لئے۔ کان کھنچوانے کے لئے۔

گھنشام۔ (غضب ناک ہوکر بازو سے بیوی کو دھکیل کر) میں کہتا ہوں اسے پیٹنا ہے تو اُدھر جاکر پیٹو۔ یہاں اِس کمرے میں آکر کیوں شور مچادیا۔ ابھی کوئی آجائے تو کیا ہو۔ کتنی دفعہ کہا ہے۔ اس کمرے میں نہ آیا کرو۔ گھر کے اندر جاکر بیٹھا کرو۔

(مسز گھنشام تن کر کھڑی ہوجاتی ہے)

مسز گھنشام۔ آپ کبھی گھر کے اندر آئیں بھی۔ آپ کے لئے تو جیسے اندر آنا گناہ کرنے کے برابر ہے۔ کھانا اس کمرے میں کھاؤ۔ ٹیلیفون سرہانے رکھ کر اسی کمرے میں سوؤ۔ سارا دن ملنے والوں کا تانتا لگا رہے۔ اور نہیں تو کچھ نہ کچھ لکھتے رہو۔ لکھو نہیں تو پڑھتے رہو۔ اور پڑھو بھی نہیں تو بیٹھے سوچتے رہو۔ آخر ہمیں کچھ کہنا ہو تو کس وقت کہیں۔

گھنشام۔ تو میں نے کونسا اس کا سر پھوڑ دیا ہے جو مجھ سے کچھ کہنے کی نوبت آگئی۔ ذرا سا اس کا کان پکڑا تھا بس قیامت آگئی۔

مسز گھنشام۔ سر پھوڑنے کا ارمان رہتا ہو تو وہ بھی نکال ڈالئے۔ کہو تو میں اِس کا سر پھوڑ دوں۔

(غصہ سے پاگل سی ہوکر بچے کا سر پکڑ کر تخت پر مارتی ہے گھنشام اسے تڑاتڑ پیٹتا ہے)

گھنشام۔ (پوری آواز سے) میں کہتا ہوں تم پاگل ہوگئی ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ اسے مارنا ہے تو اُدھر جاکر مارو۔ پیٹنا ہے تو اُدھر جاکر پیٹو۔ سر پھوڑنا ہے تو اُدھر جاکر پھوڑو۔ تمہاری بک بک سے تنگ آکر میں اِدھر تنہائی میں آگیا ہوں۔ اب یہاں آکر بھی تم نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ کیا چاہتی ہو۔ یہاں سے بھی چلا جاؤں۔

مسز گھنشام۔ (روتے ہوئے اور سہمے ہوئے لڑکے کا بازو تھام کر دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) آپ کیوں جائیں ہم ہی چلے جائیں گے۔

(بھرائی ہوئی آواز میں نوکر کو آواز دیتی ہے)

— رام مکھن۔ رام مکھن

رام مکھن۔ آیا بی بی جی

مسز گھنشام۔ جاؤ جاکر تانگا لے آؤ۔ میں میکے جاؤں گی۔

(تیزی سے بچے کو لے کر چلی جاتی ہے)

(دروازہ کھٹک سے بند ہوتا ہے۔)

گھنشام۔ بیوقوف

(کرسی پر بیٹھتا ہے) ——— (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔)

گھنشام۔ (جلدی جلدی قدرے کرخت لہجہ میں) ہیلو۔ ہیلو

نہیں یہ ۳۸۱۲ ہے۔ غلط نمبر ہے۔

(بیزاری سے "چونگا" رکھ دیتا ہے)

—— نامعقول

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے۔ بے صبری سے "چونگا" اُٹھاتا ہے)

(اور بھی کرخت لہجہ میں) ہیلو ہیلو۔

کون؛ شریمتی سرلا دیوی۔ (چہرے پر ملائمت اور آواز میں حلم آجاتا ہے) معاف کیجئے گا۔ مَیں ذرا پریشان ہوں۔ سنائیے طبیعت تو اچھی ہے نا؛

(لمبی سانس لے کر) میں بھی آپ کی دُعا سے اچھا ہوں۔ سنائیے آپ کی 'استری سماج' نے کیا فیصلہ کیا۔ میں بھی کچھ اُمید رکھوں یا نہیں۔

—— میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ بے حد ممنون ہوں۔ میں جی جان سے اِستریوں کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ مستورات کے حقوق کا مجھ سے زیادہ محافظ چودہ اُمیدواروں میں آپ کو کوئی نظر نہ آئے گا۔ میں اپنی تعریف نہیں کرتا۔ لیکن عورتوں کو غلامی سے آزاد کرانے کے لئے جتنی کوشش میں نے کی اتنی کم مردوں نے کی ہوگی۔ کتنی ودھوا سبھائیں میں نے کھولی ہیں۔ کتنی استری پاٹھ شالائیں میں نے قائم کی ہیں۔ صدیوں سے مردوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی، ان کے جور و استبداد کا شکار بننے والی عورت ذات کو آزاد کرانے کے لئے مَیں نے اپنی زندگی وقف کردی ہے۔ عورتوں کے ووٹ کا مجھ سے زیادہ حقدار کوئی نہیں۔"

(پردہ گرتا ہے)

اوپندر ناتھ اشک

*

غزل

عشقِ رسوا ابھی کسی کا نازِ معشوقانہ تھا
اس محبت کا فسانہ حُسن کا افسانہ تھا

قہر کی حد تک بھی تھا دُشوار جن کا اِلتفات
مہر کی اُن سے توقع میں کوئی دیوانہ تھا

اُن کے آگے کھُل گیا تھا شمع کا سارا فریب
رات بزمِ دوست میں پروانہ ہی پروانہ تھا

عشق اور مایوسیاں، مایوسیاں کہنے کو ہیں
عہدِ ترکِ آرزو خود آرزومندانہ تھا

آپ کے غم کی بدولت دونوں عالم جمع ہیں
ورنہ دِل کچھ بھی نہ تھا لے دے کے اک ویرانہ تھا

وُہ بھی تھی کتنی مذاقِ دید کی منزل سے دُور
جس نظر میں امتیازِ کعبہ و بُتخانہ تھا

ہم قیامت کو قیامت ہی نہ سمجھے صبحِ حشر
حشر تک آنکھوں میں شاید جلوۂ جانانہ تھا

ہم نے پوچھا حالِ فانی اور یہ سمجھے کچھ کہا
بات تو کچھ بھی نہ تھی اک نالہ بیمارانہ تھا

فانی بدایونی

میری کہانی کا ایک ورق

یوں جُدائی کے گیت میں نے اکثر سُنے تھے۔ پنجابی ہی میں نہیں، ہندوستان کی دُوسری زبانوں میں بھی۔ بہتوں کو مَیں نے بے حد پسند کیا تھا۔ پھر میری شادی ہو گئی اور وہ بھی ایک ترکیب سے، تو نہ جانے کیوں میرا رجحان بدل گیا۔ جُدائی کے گیت مجھے بہت زیادہ پسند نہ آتے تھے، اُن کی پہلی کشش کہیں کھوئی گئی ہو جیسے۔

ہاں، وُہ ترکیب بھی بتا دوں جس سے میری شادی ہو گئی۔ جگہ جگہ کی مسافرت کے بعد ــــ تین چار سال گھر سے باہر خانہ بدوشی کی سی زندگی گزار کر ــــ مَیں گھر پہنچا تھا۔ مَیں تو اِسے مسافرت ہی سمجھتا تھا، دُوسری بات ہے کہ پتا جی اِسے نِری آوارہ گردی کا نام دے رہے تھے۔ شادی کا سوال اس لئے اُٹھا کہ مَیں گھر سے بندھ جاؤں، خانہ بدوشی سے مُنہ موڑ لوں، دل کی طنابیں اور محبت کی ڈور اپنے گاؤں کے ساتھ باندھ لوں۔ پتا جی کے اس چھپے خیال کو مَیں نے شروع ہی میں بھانپ لیا تھا۔ میں نے شادی کے لئے ہاں کہہ دی تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دَوڑ گئی۔ یہ مَیں جانتا تھا کہ شادی کے بعد میری ذمّہ داری بڑھ جائے گی۔ محبت کتنی بھی اہم ذمّہ داری کی بات نہ چھیڑو، مالی سوال سے جیسے محبت کا کوئی تعلّق ہی نہ تھا۔ لمبی مسافرت میں مَیں کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کیا کرتا تھا، محبت کے جذبہ نے مجھے جُوا کھیلنے کے لئے تیار کر دیا۔ جس لڑکی سے میری شادی ہونی قرار پائی اُسے میری ماں دیکھ آئی تھی۔ میں جان لینا چاہتا تھا اُس لڑکی کے دِل کا حال۔ جب وہ مسکراتی ہے اُس کی آنکھوں میں کونسی کرن دَوڑ جاتی ہے، یہ بھی مَیں جان لینا چاہتا تھا۔ اُسے کس طرح کے خواب آیا کرتے ہیں؟ یہ سوال بار بار اُٹھا مگر بس دِل کی گہرائیوں میں ہی بند رہا۔ ماں سے تو یہ سب باتیں پوچھی نہ جا سکتی تھیں۔ اور یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ ماں اِن سوالات کا جواب دے بھی سکتی ہے یا نہیں۔ ایک فکر ایک دِن بادل کی طرح اُٹھا اور دِھیرے دِھیرے دِل کے کونوں تک پھیلنے لگا۔ کیا وہ اجنبی لڑکی یہاں آتے ہی مجھ پر ایسا جادُو ڈال سکے گی کہ میں باہر نہ جا سکوں گا، خانہ بدوشی کو خیر باد کہہ دُوں گا؟ پیچھے ہٹنا بھی تو ممکن نہ تھا۔ آخر میں نے یہ سوچ کر کچھ تسلّی پائی کہ شاید وہ تتلی کی طرح پنکھ پھیلا پھیلا کر میرے ساتھ ساتھ اُڑا کرے گی، میرے ساتھ وُہ بھی خانہ بدوشی اختیار کرے گی۔

ہاں، تو جُدائی کے گیت کی بات تو مَیں بھول ہی رہا ہوں۔ شادی کے بعد ایک دِن میں نے سُسرال میں نوجوان لڑکیوں کو ایک گیت گاتے سُنا: "بے رحم پریتم! تم آتے ہی نہیں۔ رات بھر میرا دیا جلتا رہتا ہے۔ مَیں کتنی ہی بتّیاں تیار کر رکھتی ہوں، ایک کے بعد دوسری، دُوسری کے بعد تیسری، نہ جانے کتنی بتیاں جل جاتی ہیں۔ تم آتے ہی نہیں۔ انتظار بے چارہ مُنہ بسُور بسُور کر رہ

جاتا ہے اِتم آتے ہی نہیں، بے رحم پریتم!" گیت کی لَے میں ایک خاص سوز بھرا تھا۔ ترنّم بھی موجود تھا۔ مٹی کے ٹمٹماتے دیئے کی طرح ہی جیسے خود جُدائی ٹمٹا رہی تھی۔ ٹیپ کے گیت پر پہنچتے ہی سب لڑکیاں عجب زوردار ڈھنگ سے آواز مِلا کر گاتی تھیں۔

دُور سے میں نے یہ گیت سُنا تو سوچا کہ کیا اُدھر توجّہ نہ دوں۔ مگر میں نہ رہ سکا۔ مجھے نزدیک آتے دیکھ کر لڑکیوں نے گیت بند کر دیا۔ اُن میں میری نئی نویلی بیوی بھی تھی۔ گیت بند کرنے کی صلاح رانو نے دی تھی، یہ معلوم ہوتے دیر نہ لگی۔ سبھی سہیلیاں ایک دُوسری سے اُلجھنے لگیں۔ پرستی نے کہا "کیوں ری رانو، اب گاتی کیوں نہیں ری؛ کیا تو چاہتی ہے کہ جیجاجی تیری منّت کریں؟" پاس سے سوشیلا بول اُٹھی "ہاں ہاں، تو کیا سمجھتی ہے پرستی؛ ہمارے گیت کیا مُفت میں آتے ہیں؟" میرا جی چاہتا تھا گیت شروع ہو۔ سوچا تھا؛ دُور سے ہی کیوں نہ سُنتا رہا؛ اب منّت نہ کرتا، تعریف کے دو لفظ کہہ دیتا تو بھی شاید لڑکیاں اپنا گیت پھر چھیڑ دیتیں۔ مگر میں اتنی جراُت بھی تو نہ کر سکا۔

جلد گیت محفل برخاست ہو گئی۔ کالی کالی آنکھیں مڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اوجھل ہو گئیں۔ اب نہ رانو تھی، نہ پرستی جن کی آنکھوں میں اُن کے دِل دیکھے جا سکتے تھے۔ پرستی سے بھی زیادہ مجھے رانو سے اُلفت تھی۔ اِسی لئے نہیں کہ وہ گیت گانے میں کوئل تھی، اِس سے بھی زیادہ اِس لئے کہ وُہ بھولی تھی اور آنکھ میں دل رکھ کر مسکرانا جانتی تھی، عین بے نیازی کے انداز سے۔ نئے پکّے بیر کی طرح اُس میں ایک تازگی تھی، خاص اپناپن لئے ہوئے۔

یہ گیت میں نے پہلے بھی سُنا تھا مگر کبھی مجھ پر اِتنا اثر نہ ہُوا تھا۔ ایک بار میں نے اِسے انگریزی جامہ پہنانے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ اب معلوم ہُوا کہ اُس وقت مجھ پر اِس کی رُوح ظاہر نہ ہوئی تھی۔ گیت کیا ترجمہ کی چیز ہو سکتی ہے؟ اور پھر برہن کے دیئے والا یہ گیت!

رانو نے اسے کسی اچھوتی طرز میں گایا ہو، یہ بات نہیں۔ اُس سے کہیں اچھا تو میں خود گا لیتا ہوں، اور اکثر گایا کرتا ہوں پھر بھی نہ جانے اُس روز رانو اور اُس کی سہیلیوں کی زبان سے یہ گیت سُن کر مجھ پر اس کا اتنا اثر کیوں ہُوا؟

سُسرال سے واپس آکر جیسے مَیں اور سب گیت بھُول گیا۔ میری پسند کا ایک ہی مضمون تھا اور وُہ تھا "برہن کا دیا اور اُس کا گیت" جُدائی کا یہ گیت میری ساری زندگی پر چھا جانے کے لئے تیار دکھائی دیتا تھا۔

اپنی بیوی کو یہ گیت سنانے کے لئے میں بہت کہتا۔ وہ شرما جاتی۔ اُس کی آنکھیں اُوپر نہ اُٹھتیں۔ نہ ہاں، نہ نہیں۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وُہ کس شرط پر گیت سُنانے کے لئے تیار ہو سکتی ہے؛ مجھے ہلکا سا غصّہ بھی آجاتا۔ بنگال، گجرات اور مہاراشٹر میں مَیں ایک دم اجنبی لڑکے لڑکیوں سے گیت سُن آیا تھا۔ اور یہاں میں اپنے گھر میں گیت سننے میں ناکام ہو رہا تھا۔

پھر ایک دِن مجھے وُہ گیت پاس آتا محسوس ہُوا۔ ایسے موقع پر میری آنکھیں للچا جاتی ہیں، چاہتا ہوں اپنا دِل چھاتی سے نکال کر

آنکھوں میں رکھ لوں۔" "اب چھوڑو یہ شرم کی رسم!" مَیں نے اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ جھجک کر بولی "میں تو خود چاہتی ہوں کہ نہ شرماؤں۔"

میں سمجھ گیا کہ اب کامیابی دُور نہیں۔ بولا "تو پھر ہل جائے سُننے کو وہی برہن کے دِیے والا گیت" مگر وہ کوئی دوسرا ہی گیت سنانے کے لئے تیار ہوئی تھی۔ تھا وہ بھی برہن کا گیت۔ میں نے کہا "اچھا وہی سناؤ"

گیت شروع کرتے کرتے وہ شرما چلی تھی۔ کافی گہرا گیت تھا۔ پانچ دریاؤں کے وطن کی — پنجاب کی — کسی سوہنی یا ہیر کا پُرسوز گیت تھا: "ہائے پریتم چلا جا رہا ہے۔ دُور، بہت دُور، پردیس کو جا رہا ہے وہ! دیکھو وہ آنکھوں سے اوجھل ہونے کو ہے وُہ! لو دریا کے اُس پار چلا گیا وُہ۔ نہ ہم نے جی بھر کر باتیں کیں، نہ ہمارے دِل کا شوق پُورا ہُوا۔" یہ عورت کا گیت تھا اور عورت ہی ایسا اثر پیدا کر سکتی تھی۔ یہ وُہ بھی جانتی تھی کہ مَیں برہن کے دِیے والا گیت نہ چھوڑوں گا، نہ اُس کی جگہ کوئی دُوسرا گیت لے سکے گا۔

پھر کئی کئی دن تک مَیں نے گیتوں کی بات چھیڑنی ہی بند کر دی۔ گاؤں سے لاہور آ کر بھی میں نے یہی طریقہ جاری رکھا۔ اُمید کہتی تھی کبھی نہ کبھی میری بیوی ضرور برہن کے دِیے والا گیت گانے لگے گی۔ انتظار کو یُوں ہی تھک جانا پڑا۔

پھر لاہور سے گاؤں واپس آ کر بھی مجھے وہ گیت سُننے کو نہ مِلا۔ اب مجھے بہت جلد باہر مسافرت پر جانا تھا۔ پتاجی نے لاہور میں چند ماہ گزارنے کی منظوری بھی بڑی مشکل سے دی تھی، اِس لئے میں نے کسی دن چوری سے لمبے سفر پر بھاگ جانے کی ٹھان لی تھی۔ پتاجی نے سوچا تھا کہ لاہور میں چند ماہ بیوی سمیت رہ کر اب میں گھر پر آرام سے رہنے کا فیصلہ کر لُوں گا۔ اور پھر دھیرے دھیرے وُہ مجھے اپنے ساتھ نہر ٹھیکیداری کا کام سپرد کر دیں گے۔ اُن کو شاید معلوم نہ تھا کہ لاہور میں اِن چند ماہ کی اقامت کے دَوران میں پیش آنے والی مالی دِقت کو میں نے خوشی خوشی جھیل لیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ کٹھن دن تو میں اپنی پہلی مسافرتوں میں دیکھ چکا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ایک بار کالج سے واپس آ کر جب میں نے کشمیر جانے کی ٹھان لی تھی اور گھر سے اجازت نہیں مِلی تھی تو میں چوری ہی کشمیر کے لئے چل پڑا تھا۔ اِن دِنوں بلاٹکٹ سفر کرنے کا حوصلہ کتنا زوردار تھا! اور پھر تین ماہ تک جو سیر کی تھی، اُدھر کے گیت سُننے کیلئے جو فقیری دھارن کی تھی وہ لاہور میں ان تازہ غریبی کے دنوں سے کہیں زیادہ سخت تھی۔

پہلی مسافرتوں میں مَیں اکیلا ہی تھا۔ جیسی زندگی خود چُنی تھی اُس میں پیش آنے والے سُکھ دُکھ کو اپنی چیز سمجھ کر مست رہتا تھا۔ مگر اب تو میری شادی ہو چکی تھی۔ اگر میں چاہتا بھی کہ اپنی بیوی کو سفر پر ساتھ لے جاؤں تو پتاجی کبھی اِجازت نہ دیتے، اور اگر وہ ناراض ہو کر کہہ بھی دیتے کہ جا کر لے اپنی من مانی تو بھی شاید میں اُسے باہر لے جانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ نئی نویلی بیوی سے بچھڑنا میرے لئے ایک کڑا سوال تھا۔

.. مگر پاؤں کا چکر زور مار رہا تھا۔ "تمہارے بیٹے کے پاؤں میں چکّر ہے، وہ کہیں ایک جگہ ٹِک کر نہ بیٹھ سکے گا۔ پاؤں کا چکر بڑا زبردست ہوتا ہے اور جس کے پاؤں میں قدرت نے چکّر ڈال دیا ہو اُسے بس بے پر کا پرندہ سمجھو۔ وہ اُڑتا ہے اور دُور دُور جانا چاہتا ہے"
اِن الفاظ کے ساتھ بچپن ہی میں ایک جیوتشی نے میری ماں کو فکرمند بنا دیا تھا۔ گو وہ جیوتشی یہ پیشین گوئی نہ کر سکا تھا کہ مجھے دیہاتی

گیتوں کے لئے پرندہ بننا پڑے گا مگر ماں دِل ہی دل میں اُس جیوتشی کی جادُو بیانی کا سِکّہ مان رہی تھی۔

میں نے سوچا تھا اِس مسافرت کے دوران میں کوئی ایسی ترکیب ضرور نکال لوں گا جس سے میں ہمیشہ بیوی سمیت سفر کرنے کا وسیلہ کرسکوں۔ شادی نے میرا نقطۂ نگاہ بدل دیا تھا "پیسہ چاہئے پیسہ" یہ آواز تھی جو اکثر میرے دِل پر اپنا اثر کر رہی تھی۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے کی بات کبھی کی ختم ہوگئی تھی۔ اب تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا سوال تھا۔ نوکری نہ کرنے کی میں نے قسم کھا رکھی تھی۔ پھر پیسہ کہاں سے آئے؟ مضمون نویسی کی جائے، دِل نے جھٹ کہہ دیا۔ اخباروں اور رسالوں میں دیہاتی گیتوں پر مضمون لکھ کر زیادہ روپیہ پیدا کرنا مشکل ہے، یہ میں جانتا تھا۔ اور اب تک مجھے کبھی یہ بھی تو نہ سُوجھی تھی کہ میں گیت کیوں جمع کر رہا ہوں۔ بچپن ہی میں یہ شوق لگ گیا تھا۔ ہائی سکول کے ایام میں یہ دبنے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ کالج کی زندگی بھی اس شوق کا کچھ مرمر نہ نکال سکی اور یوں ہی میں نے دیکھا کہ کالج کی آب و ہوا میری فطرت کے خلاف ہے میں بھاگ نکلا اور لگا گھومنے اور گیت جمع کرنے۔ اب جب گیتوں پر لکھنے کا خیال گیہوں کے پودے کی طرح دِل کی سرزمین میں روز بروز ہرا ہونے لگا تو جیسے گیتوں کے متعلق میرا شوق اور بھی جوان ہوگیا۔ مضمون نویسی سے زیادہ پیسہ نہ آئے نہ سہی۔ جتنا آئے اُسی سے گزارہ کریں گے۔ آخر پیسہ ہی تو زندگی کا مقصد نہیں۔ وطن کے رسائل میں لکھنا چاہئے اور ولایت کے رسائل میں بھی، یہ تصفیہ دھیرے دھیرے جڑ پکڑتا گیا۔

اور ایک بات اُور بھی تو تھی۔ چند ماہ اپنی بیوی کے ساتھ گزار کر میں نے ابھی وہ بات پیدا نہ کی تھی کہ وُہ لمبی مسافرت پر میری فقیری میں شامل ہوسکتی۔ نہ میں پُوری طرح اُس کا دِل پڑھ سکا تھا اور نہ وہی میرے کام کی اہمیت سے واقف ہوسکی تھی۔ جُدائی کا آنے والا زمانہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چوری سے ایک دن بھاگ نکلنے کی بات میں نے مارے ڈر کے اُسے نہیں بتائی تھی۔ اِن دنوں خاص کر بِرہن کے دِیئے والا گیت سُننے کے لئے مَیں ترس رہا تھا اور صرف للچا کر رہ جاتا تھا۔

جس دن صبح سے دو تین گھنٹے پہلے ہی میں نے جانے کی ٹھان رکھی تھی اُس سے پہلی رات چوبارہ میں بیٹھ کر میری بھولی بیوی نے مجھے ایک دُوسرا ہی گیت سُنا دیا۔ یہ گیت پنجاب کی عورت نے میدانِ جنگ میں جانے والے اپنے سپاہی خاوند کو مخاطب کرکے گایا تھا،

"اگر تو جنگی نوکری کے لئے چل پڑا ہے تو اے نیلے گھوڑے کے سوار مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چل۔ مجھے تو اپنی جیب میں ڈال کر لے چل، پریتم! جہاں کہیں راستہ میں رات اپنے سیاہ پنکھ پھیلا دیا کرے گی تُو مجھے جیب سے نکال کر اپنے سینہ سے لگا لیا کرے گا، لے چل، مجھے اپنے ہمراہ لے چل، نیلے گھوڑے کے سوار!" نہ میں کہیں جنگ پر چلا تھا، نہ میرے نیچے نیلا گھوڑا ہی تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہُوا کہ یہ گیت میرے لئے ہی بنا تھا۔ مگر میرا دِل تو للچا رہا تھا بِرہن کے دِیئے والا گیت سننے کو۔

ڈلہوزی کے پہاڑی گاؤں مجھے بہت پسند آئے۔ یہاں کے چہرے پر جو رونق اور جو محبت کی پُر از یقین رنگینی ہوتی ہے، وہ سب پہاڑ کے ایک ایک جھونپڑے میں دیکھنے کو مِلی۔ پہاڑی آبادی میدانی علاقوں سے کتنی مختلف تھی۔ چمبہ کے گدّی چرواہے جو ترانے چھیڑتے تھے وُہ صرف پہاڑوں اور وادیوں ہیں گونج کر ہی رہ جاتے ہوں، یہ بات نہ تھی: اُن کے گیت کھیتوں کی طرح سادہ اُور گھر کی روٹی کی طرح اچھے تھے۔ اور گدّیوں کی

حب الوطنی کا تو میں جھٹ قایل ہو گیا۔ "بھگوان مجھے اگلے جنم میں بھیڑ یا بکری بھی بنانے تو وہ مجھے چمبہ کے علاقہ میں دھولی دھار کی پہاڑیوں کے قریب ہی جنم دے تو بہتر ہو۔" اِن الفاظ کے ساتھ گدیوں کا ترنم دِلوں تک پہنچ سکنے کا عادی تھا۔ دھرم سالہ اور پالم پور کی سیر بھی کافی دلچسپ رہی۔ پھر منڈی ہوتا ہوا کلو پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرا قلم ذرا زور سے چل رہا ہے، فوٹوگرافی کا شوق الگ اُبھر رہا تھا۔ کلو سے میں پیدل شملہ پہنچا اور پھر شانتی نکیتن ہوتا ہوا سیدھا آسام پہنچ کر دم لیا۔

آسام میں میری توجہ کھینچنے کے لئے کافی سامان تھے مگر تھا تو میں ایک ہجر رسیدہ خاوند ہی۔ گیت لکھتے لکھتے کبھی گھر کا خیال آجاتا تو دل پیچھے ہٹتا نظر آتا۔

پتا جی کا خط آتا تو دل کی مضبوطی اور بھی ہاتھ سے نکل جاتی۔ بیوی کا خط الگ آتا۔ شروع شروع میں اِن خطوط کا لہجہ اُداس کرنے والا تھا، بعد میں ان کا پُرسوز انداز برداشت کی چیز نہ رہی، میں نے جواب دینا چھوڑ دیا۔

میری ڈاک پہلے گوہاٹی میں سدانند کے پاس پہنچتی اور پھر جہاں کہیں میں ہوتا مجھ تک لَوٹائی جاتی۔ میں نے سدانند کو لکھ بھیجا کہ وہ پورے ایک ماہ تک میری ڈاک اپنے پاس روک کر پھر میرے پاس بھیجا کرے۔ پتا جی نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ بیوی برابر لکھتی رہی اور میں اُس کے چار چار خطوط کا جواب ایک ساتھ ہی بھیجتا۔

پھر میں نے دیکھا کہ میری بیوی خط کے ساتھ لفافہ میں کچھ گیت بھی لکھ بھیجنے لگی ہے۔ میں نے سوچا، یہ اچھی بات ہوئی۔ اب برہن کے دیئے والا گیت وہ اپنے قلم سے ایک دِن ضرور لکھ بھیجے گی۔ مگر دوسرے گیت پہنچتے رہے، وہ گیت جس کا انتظار تھا، جس کے لئے دِل بےقرار تھا، نہ پہنچا۔

آخر بہت انتظار کے بعد برہن کے دیئے والا گیت بھی آپہنچا۔ پہلے کی طرح اس کے لفافہ میں خط نہ تھا، صرف گیت ہی لکھ کر ڈال دیا گیا تھا۔

اگلی صبح ہی میں منی پور ریاست کو خیرباد کہہ کر گوہاٹی کے لئے چل پڑا۔ سدانند کو میں نے برہن کے دیئے سے متعلق گیت والی بات سنائی وہ شاید اسے سمجھ ہی نہ سکا، یوں ہی مسکرا دیا۔ اُسے مسکراتے دیکھ کر مجھے بھی ہنس دینا پڑا۔

پورے ڈیڑھ برس بعد میں گھر لوٹا۔ مجھے اُمید تھی کہ اب میری بیوی مجھے اپنی زبان سے برہن کے دیئے والا گیت ضرور سُنا دے گی۔

مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا " اِس پورے ڈیڑھ سال میں برہن کا دِیا جلا کر پریتم کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ اب پریتم گھر آیا ہے۔ اب جب برہ ہی نہیں رہا تو اُس گیت کا کیا کام؟" بات اُس کی ٹھیک تھی۔ اور میں اگر سوال جواب پر اُترتا بھی تو کس برتے پر؟

× × ×

پچھلے ہفتہ میں ایک دوست کے ساتھ سیر کرنے نکلا تو مجھے اپنی کہانی کا یہ ورق یاد آ گیا" دِیا جلے ساری رات " یہ ٹیپ کا مصرع میرے دِل پر چھا گیا ..... بے رحم پریتم! تم آتے ہی نہیں، رات بھر میرا دِیا جلتا رہتا ہے! ..... نہ جانے کتنی بتیاں جل جاتی ہیں! ..... تم

آتے ہی نہیں، بے رحم پریتم! ..... میں نے سوچا "مٹی کا ٹمٹماتا دیا کسی بڑی محبت کا پیغام لئے رہتا ہے"۔ میرے دوست کو یہ گیت بہت پسند آیا۔ میں نے کہا "مٹی کے دیئے کو حقیر نہ سمجھنا"۔ مجھے رابندرناتھ ٹیگور کی ایک نظم یاد آ گئی، "غروب ہوتے ہوئے آفتاب نے کہا۔ کیا کوئی ہے جو میرے بعد میرا کام کر سکے؟ مٹی کا دیا سر اٹھا کر کہنے لگا۔ میں کوشش کروں گا"۔ اور میں نے سوچا کہ برہن کا دیا ضرور کسی آفتاب محبت کا پیغام لئے رہتا ہے۔

کل رات جب میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ میں اپنی کہانی کا یہ ورق سپردِ قلم کرنے چلا ہوں تو وہ بول اٹھا۔ "دیکھنا، یہ ظلم نہ کرنا میں تو خود برہن کے دیئے کا سہارا پا کر ایک نظم لکھ رہا ہوں"۔

میں نے زور دے کر کہا "تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ تم بھی لکھو۔ میں بھی لکھوں گا"۔

"تم لکھو گے تو میں اپنی ادھوری نظم تمہارے روبرو ہی پھاڑ دوں گا"۔

"میں لکھوں بھی تو تمہاری نظم کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے کا دوست۔ الٹا مقابلہ میں آ کر تمہاری نظم اور بھی چمک اٹھے گی"۔

"نہیں بھائی نہیں۔ میں یوں نہیں ماننے کا"

میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا "اچھا میں نہیں لکھوں گا"۔

خوش ہو کر وہ برہن کے دیئے والے گیت پر پورے آدھ گھنٹہ تک تقریر کرتا رہا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کالج میں کوئی پروفیسر نظم پڑھا رہا ہو ..... یہ اس عورت کا گیت ہے جس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی انتظار کی گھڑی ہے ..... وہ کہہ رہا تھا اور میں بغور سن رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، کیا کوئی گیت لیکچر کا محتاج ہو سکتا ہے؟

مگر اور تو اور میرے دوست کی نظم کا اب کیا حال ہوگا؟ میں نے تو اپنا دیا جلا ہی دیا ہے۔ اچھا ہو اگر میرے دوست کا دیا بھی جلے میں ڈرتا ضرور ہوں کہیں وہ مجھے اپنے وعدے سے پھرا دیکھ کر یہ نہ کہہ دے۔ "لو بھئی یہ ہے میری نظم۔ اسے میں ابھی تمہارے روبرو پھاڑ دیتا ہوں"۔

× × ×

آسام کے سفر کے بعد بھی میں وہی پرانا مسافر ہوں۔ پنکھ نہیں تو نہ سہی، دل تو ہے: اور پاؤں میں چکر کا زور بھی ہے۔ اب میری بیوی میرے ساتھ رہتی ہے۔ خانہ بدوشی ہی میں ہمیں ایک تیسرا ساتھی بھی مل گیا ہے: وہ ہے "کویتا" ہماری لڑکی۔

برہن کے دیئے والے گیت سے کہیں اچھے گیت سننے کو مل چکے ہیں۔ پھر بھی دل ہے کہ اسی مٹی کے ٹمٹماتے دیئے کی طرف دوڑتا ہے۔ نہ میں ہجر رسیدہ ہوں، نہ میری بیوی۔ پھر بھی ہم دونوں نہ جانے کیوں اسی گیت کو گایا کرتے ہیں؟

عرصے سے سدانند نہیں ملا۔ بہت تلاش کی ہے، وہ مل جائے تو اسے ہم دونوں یہ گیت گا کر سنائیں۔ تب میں اس سے پوچھوں، کہ آسام میں وہ برہن کے دیئے سے متعلق میری کہانی سن کر مورکھ کی مانند کیوں ہنس دیا تھا؟

دیوِندر ستیارتھی

گلکاریٔ تصوّر

نقش ہے عہدِ محبت دل پر
فرصتِ ہجر میں اکثر اکثر
میں ترے پاس پہنچ جاتا ہوں
ذہن میں شمعِ تصور لے کر
تُو مرے پاس چلا آتا ہے

شانہ و زلفِ معنبر کی قسم
تیری آنکھوں کی ترے سر کی قسم
مَیں ترے پاس پہنچ جاتا ہوں
چاندنی رات کے منظر کی قسم
تُو مرے پاس چلا آتا ہے

سُن کے اربابِ طرب کے قصّے
قُرب و تسکینِ نظر کے چرچے
مَیں ترے پاس پہنچ جاتا ہوں
شہپرِ فکرِ رسا کے صدقے
تُو مرے پاس چلا آتا ہے

دوست گلزار میں لاتے ہیں مجھے
پھول ہنس ہنس کے رلاتے ہیں مجھے
میں ترے پاس پہنچ جاتا ہوں
لوگ دیوانہ بتاتے ہیں مجھے

تو مرے پاس چلا آتا ہے

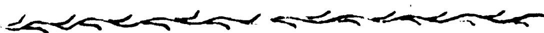
دل بہلتا ہی کتابوں سے کہیں
سر پٹکتے ہیں مضامینِ حسیں
میں ترے پاس پہنچ جاتا ہوں
فلسفہ مانعِ تخئیل نہیں

تو مرے پاس چلا آتا ہے

اس سے زائد بھی محبت کیا ہو
نہ ہو یہ نقصِ شریعت یا ہو
میں ترے پاس پہنچ جاتا ہوں
کوئی مندر میں بھجن گاتا ہو

تو مرے پاس چلا آتا ہے

شاد عارفی



حضرت میاں میر

عہدِ مغلیہ کے ایک پیر

حضرت میاں میر ہندوستان کے ان صوفیائے کرام میں سے ہیں جن کی ذات جامع الکمالات تھی اور وجودِ حق آگاہ کے مالک تھے۔ قصبہ سیواں (واقع صوبۂ سندھ) کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے[1]۔ ۱۵۵۰-۵۱ء کا مبارک سال تھا جب آپ عالمِ وجود میں آئے۔ والد کا نام قاضی سائیں دتّا تھا اور والدہ بی بی فاطمہ کے نام سے موسوم تھیں جو قاضی قادان کی دختر تھیں ماں باپ کا رکھا ہوا نام میر محمد ہے۔ والدین کو سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ میر محمد کسی زمانہ میں حضرت میاں میر کے نام سے یاد کئے جائیں گے، خدا کے لاکھوں بندے ان کے آستاں پر سجدے کریں گے، پھول چڑھائیں گے اور بامُراد لوٹیں گے یہی نہیں بلکہ جہانگیر و شاہجہاں جیسے تاجورانِ باشان ان کی قدمبوسی اپنے لئے باعثِ عزت و سعادت سمجھیں گے۔

میر محمد نے ابھی عمر کی بارہ منزلیں ہی طے کی تھیں کہ قادری گروہ میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد اپنی والدہ کی اجازت سے مرشدِ کامل کی تلاش میں پڑ گئے تاکہ اس کی رہنمائی میں مراحلِ سلوک طے کر کے تصوّف میں دستگاہِ خاص حاصل کریں۔ اس جستجو میں آپ نے سیئستان کا تمام کوہستانی علاقہ چھان مارا۔ بمصداق اس کے کہ جوئندہ یابندہ، ایک دن آپ کو ایک گرم تنور نظر آیا۔ سوچا کہ گرم تنور کا اس لق و دق بیابان میں کیا کام؟ ہو نہ ہو یہ ضرور کسی فقیرِ کامل کا مسکن ہے، بس وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ آس پاس بہت تلاش کی، کسی انسان کا کچھ سُراغ نہ ملا۔ اس پر بھی آپ نے دامنِ ہمّت ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تین دن تک اُسی جگہ قیام کیا۔ گرمی سہی، سردی سہی، بھوک سہی، پیاس سہی، آخر آپ کی محنت بارور ہوئی اور چوتھے دن ایک سفید ریش بزرگ وہاں تشریف لائے۔ آتے ہی اُنہوں نے آپ کو خرقۂ ارادت عطا فرمایا۔ یہاں پیہم ۱۲ سال تک آپ اپنے مرشد کی خدمت کرتے رہے[2]۔

۱۵۷۵ء[3] میں جب آپ نے شباب کی پچیسویں منزل میں قدم رکھا تو آپ کو مرشد کے حکم کی تعمیل میں لاہور کو اپنا قیام گاہ بنانا پڑا۔ یہاں آپ کا وقت زیادہ تر مسجدوں میں گزرتا تھا۔ عہدِ اکبری کے مشہور و معروف اُستاد مولانا سعد اللہ سے بھی آپ علمی

---

[1] عملِ صالح قلمی نسخہ (ل) ۳۱، ۷ (ب) ۶۱۳؛ امپیریل گزیٹر XXII صفحہ ۳۴۴؛ بادشاہنامہ II (بی-آئی) ۳۳۰

[2] سکینۃ الاولیا ۲۱، سفینۃ الاولیا قلمی نسخہ ۴۴

[3] سکینۃ الاولیاء ۲۳، تحقیقاتِ چشتی ۲۵۱

فیض اُٹھاتے تھے[1]۔ روحانی شغل وعبادت کے لئے آپ عموماً شہر کے اِرد گرد سرسبز و شاداب باغوں اور جنگلوں میں گوشہ گزین ہوتے تھے[2]۔
آپ کی عمر کے چالیس سال اِسی طرح عبادت میں بحالتِ گم نامی گزر گئے۔ مگر آخر کب تک، کہیں عشق و مشک بھی چھپے رہتے ہیں؛ بالآخر اس بلند پایہ صوفی کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ ریاضت و روحانیت کے علاوہ دیگر علوم پر آپ کو اتنا عبور تھا کہ چوٹی کے عُلما مشکل مسائل حل کرنے میں آپ کی مدد لیتے تھے۔ فتوحاتِ مکّی آپ کو لفظ بہ لفظ یاد تھی۔ جامی کی شرح فصوص الحکم آپ کو اس قدر نوکِ زبان تھی کہ بلا کتاب دیکھے شروع سے اخیر تک دُہرادیا کرتے تھے[3]۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ کسی سے نذر قطعاً قبول نہ کرتے تھے۔ خواہ تحفہ ہی کیوں نہ ہو۔ صرف چند گنے چُنے اشخاص ہی آپ کی روزمرّہ ضروریات کے لئے لکڑی اور پھل مہیا کیا کرتے تھے[4]۔
آپ مُرید بنانے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ صرف اسی شخص کو اپنے مریدوں کے زُمرے میں داخل کرتے تھے جس نے دُنیاوی خواہشوں اور عیش و کامرانی سے مُنہ موڑ لیا ہو[5]۔ شہزادہ داراشکوہ رقمطراز ہے: "وہ شاذ و نادر ہی کسی کو مُرید بناتے تھے حقیقی طالبانِ حق کی تعداد بہت کم ہے۔ اِس لئے سچے طلبگار چُن لئے جاتے تھے۔ آپ کا منشا اپنے مریدوں کو روحانی دولت سے مالامال کرنا اور طالب کو مطلوب تک پہنچانا تھا[6]۔" آپ کے معتقدین آپ سے حد درجہ محبت رکھتے تھے۔ حضرت کے ایک نامی شاگرد مُلا شاہ اپنی مثنویات میں لکھتے ہیں:؎

من از ادبش نہ نام گیرم   لیک از قدمش میان و تیرم[7]

دیکھیئے مُلا صاحب نے کس خوبی سے اپنے پیرِ طریقت کا نام ظاہر بھی کر دیا اور ساتھ ہی احترام و عزت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔
میاں جی کی شہرت لاہور کے گرد و نواح میں خوب پھیل چُکی تھی اور آئے دِن لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا[8]۔ ذکرِ خدا اور اسمِ اعظم کے وِرد کے لئے تنہائی تو درکنار، اِک لمحہ فرصت میسر نہ ہو سکتی تھی۔ آخر تنگ آکر آپ نے لاہور کو خیرباد کہی اور سرہند میں بود و باش اختیار کی۔ یہاں آپ بیمار ہو گئے۔ علالت کے ایام میں حاجی نعمت اللہ نامی ایک شریف آدمی نے آپ کی تیمارداری اس تندہی سے کی کہ آپ نے صحت یاب ہونے پر اُس کو رموزِ معرفت سے آگاہ کر دیا[9]۔ اور اُس روحانی سرور سے مالامال کیا جس کی نسبت حافظِ شیراز کہتا ہے:؎

غلام نرگسِ مستِ تو تاجدارانند   خرابِ بادۂ عشقِ تو ہوشیارانند

---

1. سکینۃ الاولیاء ۲۵ ۔ 2. سکینۃ الاولیاء ۲۶ ۔ 3. عملِ صالح (را) ۳۱، (ب) ۶۱۳
4. عملِ صالح (را) ۳۲، (ب) ۶۱۴ ۔ 5. عملِ صالح (را) ۳۲، (ب) ۶۱۴ ۔ 6. سکینۃ الاولیاء ۲۸ ۔
7. مثنویاتِ مُلا شاہ (قلمی) ۲۹ — میں پاسِ ادب سے اُن کا نام زباں پر نہیں لاتا۔ لیکن اُن کے قدموں کی برکت سے میں پیامبر و رہنما ہوں۔
8. سکینۃ الاولیاء ۲۵ ۔ 9. سکینۃ الاولیاء ۲۶ ۔

کچھ عرصہ بعد آپ پھر لاہور تشریف لے آئے اور اس مرتبہ محلہ باغبانان میں سکونت اختیار کی۔

مشہور تھا کہ حضرت میاں میر سوتے بالکل نہیں[1]۔ اور منقول ایک کھیل کا دانہ بھی مُنہ میں نہیں پہنچتا۔ دُنیا داروں سے ربط ضبط نہ رکھتے تھے[2]۔ تسبیح سے آپ کو ایک نفرت سی تھی۔ جب کسی کے ہاتھ میں دیکھ لیتے تو فرماتے ؎

تسبیح بہ من عجب در آمد بزباں — گفتا کہ مرا چرا کنی سرگرداں
گر دل بعوض ہمی بگردانی تو — دانی کہ برائے چیست خلق انساں[3]

قوالوں سے روحانی نغمے سُن کر بڑے مسرور ہوتے تھے۔ موسیقی میں آپ کو ہندی راگ از حد مرغوب تھا[4]۔

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے[5] "جب مجھے معلوم ہوا کہ لاہور میں ایک تارک الدنیا سندھی درویش میاں محمد میر ہیں جو نہایت ریاضت کش و راضی برضا ہیں، تو میری متلاشیِ حق طبیعت اُن کا نیاز حاصل کرنے کے لئے بہت بے چین ہو گئی اور میرا شوقِ دیدار بیش از بیش ہوتا گیا۔ چونکہ میرا لاہور جانا غیر ممکن تھا، اس لئے میں نے ایک پُر از آرزو عریضہ بھیجا۔ اُنہوں نے اپنی عمر اور ضعیفی کا خیال نہ کر کے آنے کی تکلیف گوارا کی۔" یہ ۱۶۱۹ء کا واقعہ ہے جب کہ جہانگیر ضلع گورداسپور (پنجاب) میں تھا۔ اغلب ہے کہ ان کی ملاقات کلانور کے آس پاس کسی پڑاؤ میں ہوئی۔ اس موقع پر جہانگیر نے آپ سے روحانی تعلیم کے لئے درخواست کی اور آپ کا مرید بننے کی خواہش ظاہر کی[6]۔ آپ نے بجائے مرید بنانے کے یہ تلقین کی: "مناسب ہے کہ پہلے آپ سلطنت کے انتظام کے لئے کوئی اپنی سی قابل ہستی تلاش کر لیں پھر اس طرف رجوع ہوں"۔ جہانگیر اس سے از حد خوش ہوا اور کہنے لگا۔ "آپ کچھ مانگئے تاکہ میں آپ کی خدمت بجا لاؤں"۔ آپ نے فوراً جواب دیا "صرف اجازتِ رخصت درکار ہے[7]"۔ جہانگیر نے آپ کو رخصت کے وقت مجبور کیا کہ ایک مرگ چھال تو ضرور قبول کر لیں"۔ آپ کی نسبت اس کی یہ رائے ہے" حقیقتہً آپ ایک بزرگ ہستی ہیں اور اس زمانے کے لئے آپ کی شخصیت سُود مند اور انمول ہے[8]"۔

شاہجہاں بھی ہمیشہ ایسے فقرائے کامل کی تلاش میں رہتا تھا۔ جن کو قُربِ حق حاصل ہو گیا ہو[9]۔ جہانگیر کی وفات کے بعد دو مرتبہ شاہجہاں نے آپ کا نیاز حاصل کیا۔ پہلی دفعہ ۵ مارچ ۱۶۳۴ء کو جب کہ وہ کشمیر جا رہا تھا۔ اور دوسری مرتبہ اسی سال

---

۱ سکینۃ الاولیاء ۲۵
۲ " " ۳۷
۳ " " ۵۳
۴ " " ۵۶
۵ تزکِ جہانگیری II ۱۱۹ ــ سکینۃ الاولیاء ۳۸
۶ سکینۃ الاولیاء ۳۷ ۔ ۳۸
۷ " " ۳۸
۸ تزکِ جہانگیری II ۱۱۹
۹ عمل صالح (ا) ۳۲ ، (ب) ۶۱۴

ماہِ دسمبر میں کشمیر سے واپسی پر[۱] دونوں دفعہ شہزادہ داراشکوہ ہمرکاب تھا۔ پہلی مرتبہ دارا بیمار تھا۔ اور اُس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ حکیم اُس کی زندگی کی آس چھوڑ بیٹھے تھے۔ صحت کی اُمید عنقا ہو چکی تھی۔ موت کا انتظار تھا۔ شہزادہ اپنی تصنیف سفینۃ الاولیاء میں بیان کرتا ہے' اُسے حضرت میاں میر نے پانی کا ایک پیالہ دم کرکے دیا، جس کو پینے کے کچھ مُدت بعد وہ تندرست ہوگیا[۲]۔ دوسری بار ملاقات پر شاہجہاں نے عرض کی "حضرت میرے لئے بارگاہِ الٰہی میں دُعاگو ہوں کہ میرا نفس پاکیزہ ہوجائے اور مجھے بھی اللہ پاک کا قُرب حاصل ہو" حضرت میاں میر نے برجستہ جواب دیا ؎

"ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں[۳]"

شاہجہاں نے ایک کشمیری شال، ایک تسبیح اور ایک سفید دستار حضرت کی خدمت میں پیش کی[۴]۔ آپ نے شال و دستار تو واپس کردی۔ اور تسبیح داراشکوہ کو دے دی[۵]۔ شہزادہ آپ کا مُرید تھا۔ وہ مختلف قسم کے کشف و کرامات آپ کی ذات سے وابستہ کرتا ہے[۶]۔

لاہور میں ساٹھ سال تک قیام کے بعد ۱۶۳۵ء کے ماہِ اگست میں منگل کے دن آپ اس جہانِ فانی سے رحلت فرما کر واصل بحق ہوگئے[۷]۔ اور موضع غیاث پور میں جو اب میاں میر کے نام سے مشہور ہے دفن کئے گئے۔ تا حال آپ کا مزار زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ او

ایشور چندر بھٹناگر

---

[۱] پادشاہنامہ II (بی آئی) ۳۲۰ + سکینۃ الاولیاء ۲۹ + عملِ صالح (بی۔آئی) II، ۱۰۷، ۲۰۷ + عملِ صالح (ق) ۳۲۲ (ب) ۶۱۴ +

[۲] سفینۃ الاولیاء (قلمی) ۴۵ + [۳] سکینۃ الاولیاء ۲۹ +

[۴] عملِ صالح (بی۔آئی) II ۱۰۷ + پادشاہنامہ II ۱۲ + سکینۃ الاولیاء ۱۴ +

[۵] سکینۃ الاولیاء ۱۴ +

[۶] سکینۃ الاولیاء ۴۷، ۳۲، ۸۲ + تحقیقاتِ چشتی ۲۵۲ +

[۷] سکینۃ الاولیاء ۴۷ + سفینۃ الاولیاء ۴۵ + تحریر بر مزار ۱۰۴۵ھ

قطعات

غم نصیب

دشمن ایسا ستم نصیب نہ ہو
غیر اس درجہ کم نصیب نہ ہو
مجھ کو غم ہے غموں کے چھننے کا
کوئی مجھ سا بھی غم نصیب نہ ہو

کاوش

صبح کاوش ہے شام کاوش ہے
شغل میرا مدام کاوش ہے
مجھ کو اختر بھی کہتے ہیں لیکن
اصل میں میرا نام کاوش ہے

یاد

دل ابھی تک ہے آرزو آباد
کم نہیں ہوئی لذتِ فریاد
مجھ کو اس حافظے نے مارا آہ
بھولتی ہی نہیں کسی کی یاد

تمنائے ناکام

دل تو روئے میں گنگنائے جاؤں
روح تڑپے میں مسکرائے جاؤں
شعر کہتا رہوں یونہی اختر
بات بگڑی ہوئی بنائے جاؤں

اختر انصاری

ننھے نے سلیٹ خریدی

ننھا عزیز سر پر ایک غلیظ سا بستہ رکھے تھکے تھکے قدم اٹھاتے ہولے ہولے گنگناتا جا رہا تھا ؎

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

اُس نے اچانک اپنے قدم روک لئے اور زمین کو بڑی سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ پھر بستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر دیکھا ــــ ہلکا نیلا آسمان جس پر دو چار چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ پر حیرت نے فتح پالی ع

کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبائے کچھ سوچتا ہوا قدم اٹھانے لگا۔ ایک دو بار مویشیوں کے گلوں نے اُسے تکلیف دی اور وہ ایک طرف دیوار سے چمٹ کر ہر بیل کو خوف سے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اچانک اُس کی نگاہیں ایک جوان بیل کے سنگ مرمر ایسے سفید سُموں پر جم گئیں اور پھر اُس نے اپنے مَیلے کچیلے پاؤں کی طرف دیکھا جو پرانی چپل میں مُردہ چوہوں کی طرح پڑے تھے ــــ مَیل سے بھرے ہوئے، بے جان، اور بدصورت! اُس کے ذرا سے دماغ نے ایک بہت بڑی تجویز سوچی ــــ "اگر مجھے اللہ میاں کہیں ملیں تو میں پہلے اُنہیں سلام کر کے (کیونکہ ماسٹر جی نے بڑوں کو سلام کرنے کی زبردست تلقین کر رکھی تھی) یہ عرض کروں گا۔ 'اچھے اللہ! اِنسان کے پاؤں بڑے ناقص ہیں۔ اِنسان چلتا پھرتا ہے، بھاگتا دوڑتا ہے، تو اُس کے پاؤں میں کنکر کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ مَیل جم جاتا ہے! کئی بار زخمی ہو جاتے ہیں پاؤں ــــ اگر یہ بیلوں کے سُموں کی طرح ہڈی کے بنے ہوئے ہوتے تو کیا مضائقہ تھا!'" ــــ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ سامنے سے اُسے گاؤں کا سب سے بڑا رئیس سیاہ گھوڑے پر سوار آتا ہوا نظر آیا۔ اُس کی گرگابی سُورج کی شعاعوں میں شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ اور جب وہ عزیز کے پاس سے گزرا تو آپ سے آپ عزیز کی نگاہیں اُس کے پاؤں پر جم گئیں جو دُودھ کی طرح سفید تھے۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے خدا سے اپنی غلط دُعا واپس مانگ رہا ہے ــــ اتنے اچھے ایسے صاف پاؤں! اُسم کیا شے ہے ان کے مقابلے میں! مگر میں بھی تو ایک انسان کا بیٹا ہوں۔ میرے پاؤں اتنے غلیظ کیوں ہیں! یہ الٹی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

وہ اس سوچ میں غرق آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ اچانک اُسے رستے میں اُبھرے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی۔ بستہ اُچھل کر

دُور کنکروں پر جا گرا۔ اور اُس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے لہو جاری ہو گیا۔ اُسے پھر ایک ثانیہ کے لئے بیل کے سموں کے فوائد کا خیال آیا۔ مگر درد کی شدت نے اُس کے دماغ میں ہلچل مچا دی۔ اُس نے چیخ کر رونا چاہا۔ مگر سامنے اسکول کے برآمدے میں ماسٹر جی کھڑے ہاتھوں میں کھڑیا مٹی کا ایک ٹکڑا اُچھال رہے تھے۔ اُس کی چیخ حلق تک آئی۔ اور وُہ اُسے کڑوی دوا کی طرح آنکھیں بند کر کے پی گیا۔ زخم پر مٹی ڈال کر اُٹھا۔ بستہ اُٹھایا تو اُس کا دِل دھک سے اُس کی ایڑیوں میں جا گرا ——— اُس کی سلیٹ ٹوٹ گئی تھی!

وُہ ضبط نہ کر سکا۔ اور پورے زور سے رونے لگا۔ ماسٹر جی کوئی رحمدل انسان تھے۔ دوڑے دوڑے آئے۔ ننھے کو تسلی دیتے ہوئے کہا "چھچھے! اُٹھ۔ میں آج تجھے کچھ نہ کہوں گا۔ آج کاغذ پر سوال نکال لینا۔ کل سلیٹ خرید لینا۔ اور ہاں۔ اب لوہے کی سلیٹ خریدنا جیسے اصغر کی ہے۔"

——— اصغر کی! عزیز نے سوچا۔ مگر اصغر کا باپ تو پٹواریوں کا بڑا افسر ہے اور میرا باپ پٹواری اور جنگل کے داروغے کی گائے بکریوں کے لئے چارہ کاٹنے والا! لوہے کی سلیٹ پر تو بڑے پیسے خرچ آئیں گے۔ اور کل رات ہم لوگ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے مہینے کا گوشت نہ خرید سکے! ——— اب کیا ہو گا!

اُس نے بستہ سر پر اُٹھا لیا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی اُنگلیاں بستے کے اندر کھڑکھڑاتے ہوئے سلیٹ کے ٹکڑوں کو ٹٹولنے لگیں اور جب وہ لڑکوں کے جمگھٹ میں داخل ہوا جو اُس کی چیخیں سُن کر اسکول کے احاطے سے باہر اکٹھے ہو گئے تھے تو اُس کا چہرہ فخر سے لال ہو گیا۔ ماسٹر جی اُس کی اُنگلی تھامے ہوئے تھے!!! اور لڑکے بھی اُس کی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، کیونکہ ماسٹر جی نے اُس سے ہمدردی کی تھی!

چٹائی پر بیٹھ کر اُس نے بستے سے سلیٹ کے ٹکڑے یوں نکالے، جیسے اپنے سینے سے دِل کے ٹکڑے نکال رہا ہے۔ ایک بڑا ٹکڑا اپنے پاس رکھ لیا۔ اور باقی دُور ایک جھاڑی میں پھینک آیا۔ ماسٹر جی سوال لکھانے لگے تو پہلے تو اُس نے اپنی سلیٹ کی طرف دیکھا جس کے بے شمار کنارے چاقو کی دھار کی طرح تیز تھے۔ پھر پیچھے مُڑ کر قطار کے آخری سرے پر اصغر کی سلیٹ کی طرف دیکھا، نئی سلیٹ جس کے ساتھ ایک مُٹھی بھر اسفنج لٹک رہا تھا۔ اُس نے نفرت سے اپنی ننھی سی ناک چڑھا کر اپنی سلیٹ پر زور سے تھوکا اور ہتھیلی سے مل کر سوال حل کرنے لگا!

چھٹی کے بعد وُہ گھر واپس آ رہا تھا کہ رستے میں اُسے اپنا باپ مِل گیا۔ جو پٹواری کی گائے کے لئے چارہ کاٹ کر لا رہا تھا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور پھر ہر رونگٹے سے پسینہ پھوٹ نکلا ——— سلیٹ کے ٹکڑے کے تیز کنارے اُس کے دماغ کو چیرنے لگے۔ باپ نے پوچھا "بیٹا۔ چھٹی ہو گئی؟"

"ہاں ابا" ——— ابا کہتے وقت اُس کا حلق گھُٹ گیا۔ لیکن کھانسی کا بہانہ کر لیا۔ اور پھر اپنی اس غیر متوقع کامیابی پر جی ہی جی

میں خوش ہونے لگا۔

"گھر جا کر سلیٹ پر خوب سوال نکالنا۔"

"سلیٹ تو ٹوٹ گئی ہے" —— اُس نے یہ جواب دینا چاہا۔ لیکن اُس کی نظر باپ کے بھاری اور کھردرے ہاتھ پر پڑ گئی۔ جو اُس کے گال پر پڑتا تھا تو اُسے دن کے وقت بھی نیلے پیلے تارے نظر آنے لگتے تھے۔ وہ خاموش رہا۔

اُس کے باپ نے پیچھے مُڑتے ہوئے کہا "سُنا؟"

"ہاں"

اُس کا باپ پٹواری کے گھر کی طرف چلا گیا اور وہ اپنے گھر آیا۔ ماں کو دیکھ کر اُس کا جی بھر آیا۔ آنسو اُمڈ آئے اور وہ زار زار رونے لگا۔

"کیوں۔ میرے بچے۔ تیرے دشمن روئیں۔ تُو کبھی نہ روئے۔ تو کبھی نہ روئے میرے بچے۔ کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ماں بڑی محبت سے اُس کے سر اور گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"ماں۔ میری سلیٹ ٹوٹ گئی۔"

اُس کی ماں دھم سے دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی۔ جیسے اُس کا نالائق بیٹا عمر بھر کی کمائی دریا میں بہا آیا ہے۔

عزیز نے روتے ہوئے اپنی باچھوں کو پوری قوت سے ٹھوڑی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا "ماں۔ ابّا کو نہ بتانا۔"

ماں نے اپنے لنگن کو مضطربانہ اپنی کلائی میں گھماتے ہوئے پوچھا "تو پھر کیا سر پر نکالے گا سوال؟"

اور عزیز سوچنے لگا کہ اگر سر پر سوال نکالے جا سکتے تو وہ روتا ہی کیوں! اُس کی ماں کتنی بھولی ہے! آخر ان پڑھ ہے نا! پڑھی لکھی ہوتی تو اُسے معلوم ہوتا کہ سوال سر پر نہیں صرف سلیٹ پر نکالے جاتے ہیں!

اُس دن نہ اُس نے ماں سے گُڑ مانگا نہ جوار کے ہلکے پھلکے مُرنڈے! نہ کبڈی کھیلی نہ آنکھ مچولی! اُس کے ہمجولی اُس کے پاس اکٹھے ہو گئے اور مجبور کرنے لگے کہ باہر چلو۔ لیکن ایک سیانا لڑکا پیچھے سے مجمع کو چیرتا ہوا آیا اور بولا "ارے یار۔ بیچے کو مت چھیڑو۔ اس کی سلیٹ ٹوٹ گئی ہے!" —— عزیز کے دل پر جیسے کسی نے من بھر ہتھوڑا جما دیا۔ کانپ کر اُٹھا کہ کہیں باپ تو نہیں آ گیا۔ لیکن بیل چارے کے انتظار میں کان کھڑے کئے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے اور ماں چولھے کے پاس بیٹھی مین کے پتے سے ساگ کتر رہی تھی۔

بس وہ چارپائی پر پڑا رہا اور کچھوے خرگوش کی کہانی پڑھتا رہا۔ اُسے خرگوش پر کئی بار بڑا غصہ آیا "کتنا غافل تھا خرگوش! ٹھیک اس طرح جیسے —— جیسے ——" اُسے کوئی مثال نہ مل سکی۔ اچانک اُس کی اُداس آنکھیں چمک اُٹھیں —— "جیسے

مَیں!" ــــ اور پھر اُسے اپنے آپ پر اتنا غصہ آیا کہ جی میں آئی ابھی اپنے آپ کو قبر میں دفن کر دے۔ اور اپنی موت پر ایک آنسو تک نہ بہائے۔ اور پھر خوشی خوشی اسکول ــــ اُس کا دماغ گھومنے لگا۔ جتنا خیالات کا سلسلہ بڑھتا جاتا تھا اُس کی وحشت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور جب اندھیرا بڑھنے لگا اور اُس کی ماں پکاری "نیچے اِدھر آ۔ روٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے"۔ تو بے اختیار اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے " ماں۔ میری سلیٹ ٹوٹ گئی!"

"کب؟" مگر یہ ماں کی آواز نہ تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ اُس کا باپ بڑی بڑی آنکھیں نکالے اُس کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ "کب توڑی؟"

اُس نے اپنے آپ کو قبر میں دفن کر دینے کی تجویز پر پھر غور کرنا چاہا۔ مگر باپ کے تھپڑ نے اُس کا سلسلۂ خیالات بُری طرح منتشر کر دیا۔ اور وہ اتنا رویا ــــ اِتنا رویا کہ آخر اُسے رونے میں لُطف آنے لگا۔ وہ اپنا رونا بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ماں کی تسلیوں اور منّتوں کے رُک جانے کا اندیشہ تھا۔

"چپ کرتا ہے یا لگاؤں ایک اَور؟" ــــ اور اُس کی آواز یوں رُک گئی جیسے ریڈیو سے کسی "میم" کا گانا سُنتے سُنتے تنگ آکر ہندوستانی لوگ پیچ گھما دیتے ہیں!

"سلیٹ بھی توڑ آیا اور ریں ریں بھی کیے جاتا ہے ــــ اندھا! ــــ اندھے تو سامنے دیکھ کر کیوں نہیں چلتا؟ ــ ہیں؟ ــــ یہ ہمیشہ تیری نظر آسمانوں پر کیوں رہتی ہے؟ جیسے اللہ میاں سے باتیں ہو رہی ہیں! ــــ اندھا ــــ تُو تو مجذوب ہے!"

مجذوب! ــــ کتنی بڑی گالی دی ہے ابا نے۔ ابا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اُسے اٹھارہ بار مجذوب کہہ ڈالتا۔

اَور جب اُس کا باپ اُٹھ کر چوپال کو چلا گیا تو اُس نے ماں سے نہایت رازدارانہ لہجے میں پوچھا "ماں مجذوب کسے کہتے ہیں؟"

"جسے اللہ میاں کے سوا کسی کا خیال نہ ہو، ــــ یعنی اللہ میاں کا دوست"

اَور عزیز سوچنے لگا کہ کیا اللہ میاں کا دوست ہونا بہت نفرت انگیز بات ہے؟

وُہ صبح اُٹھا تو باپ اُس کے سرہانے کھڑا تھا "اُٹھتا بھی ہے اب۔ کہ جماؤں ایک؟ ــــ بے فکرا ــــ لے یہ چونّی۔ تیری خاطر دس آدمیوں کی داڑھیوں کو ہاتھ لگانا پڑا۔ ابھی قصبے سے جا کر سلیٹ خرید لا۔ اسکول کے وقت آ جائیو! سمجھے؟"

عزیز نے چارپائی سے اُٹھ کر زمین پر قدم دھرا تو اُسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اُس کا دِل اُس کی پسلیوں تلے ناچ رہا ہے اور اُس کی آواز کے ساتھ اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ آنکھیں آپ ہی آپ جھپکی جا رہی ہیں۔ نتھنے پھڑک رہے ہیں، رگ رگ دھڑک رہی ہے، وہ باپ سے چونّی چھین کر دوڑا ہی تھا کہ اُسے ایک آواز سُنائی دی "اے مجذوب! جوتا تو پہنتا جا۔ تیرا تو سر پھر

گیا ہے!" اُس نے مُڑنے سے پہلے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کا خیال تھا اُس کا چہرہ پیٹھ کی طرف ہو گیا ہے ـــــ باپ کے تھپڑ کی وجہ سے! آخر سر پھرنے کا اَور کیا مطلب ہے؛ اور جب اُسے تسلی ہو گئی کہ وُہ اپنی پُرانی حالت پر قائم ہے تو اُسے تعجب ہونے لگا کہ اُس کا باپ اتنے جھوٹ کیوں بولتا ہے!

وُہ جوتا پہن کر بھاگا۔ قصبہ وہاں سے ایک میل دُور تھا۔ چونّی اُس کی قمیص تلے پہنی ہوئی پُرانی سیاہ صوف کی واسکٹ کی جیب میں تھی۔ جسے اُس نے مضبوطی سے ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔ ایک دو بار اُس نے چونّی کے گول گول کونوں کو ٹٹولا ـــــ چونّی اُس کی جیب میں موجود تھی! اور نئی سلیٹ قصبے کی ایک دُکان میں اُس کی منتظر! ایک جگہ وہ قدرے سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ اچانک سامنے جھاڑی سے اصغر نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں اپنی نئی سلیٹ تھی جس کے ساتھ مٹھی بھر اسفنج لٹک رہا تھا۔ اصغر نے اپنی سلیٹ کو فخریہ انداز سے ہوا میں گھمایا۔ اور عزیز نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ میں بھی نئی سلیٹ ہے جو ٹین کی طرح بجتی ہے، اور جس کے ساتھ ماسٹر جی کی ناک جتنا موٹا اسفنج لٹک رہا ہے۔ (ماسٹر جی کی ناک عزیز کی مٹھی سے بڑی تھی!) اصغر کی آنکھیں جھُک گئیں اَور وُہ پلٹ کر پھر جھاڑی میں گم ہو گیا! ـــ کتنا پیارا خیال! کیسا سُندر سپنا! وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور پھر دَوڑنا شروع کر دیا۔ قصبے کے تنگ و تاریک بازار کی دُکانیں کھُل چکی تھیں۔ وہ سلیٹوں والی دُکان کو خُوب پہچانتا تھا۔

دُکاندار ایک موٹا سا سیٹھ تھا جس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی توند اپنے گھٹنوں پر پھیلا رکھی تھی۔ وہ صرف ایک دھوتی باندھے ہوئے تھا۔

عزیز ہانپتے ہانپتے اُس کے پاس گیا۔

"سلیٹیں ہیں؟" یہ سوال اُس نے اس انداز سے پوچھا گویا وُہ ساری دُکان خریدنے آیا ہے۔

دُکاندار نے اپنی ناف پر سے بھنبھناتی مکھیاں اُڑاتے ہوئے جواب دیا "ہاں"

"دکھاؤ"

" دُکاندار نے اپنے بازو زمین پر ٹیک کر اُٹھنے کی کوشش کی اور بہت دیر تک اسی حالت میں ہانپتا رہا۔ عزیز نے سمجھا سیٹھ سو گیا ہے، پکارا:

"لالہ جی"

"ہاں بھائی ہاں" دُکاندار اُٹھ کھڑا ہُوا اور عزیز کے سامنے دس پندرہ سلیٹیں رکھ دیں۔

"لوہے کی ہیں؟"

"سب لوہے کی ہیں۔"

"کیا قیمت ؟"

"تین آنے !"

ــــ ایک آنہ بچ گیا۔ عزیز کے گال تمتمانے لگے۔ اُس کی ننھی سی ناک پر، اُس کے کھلے سفید ماتھے پر، اُس کے قدرے موٹے سے بنچلے ہونٹ کے تلے پسینہ پھوٹ آیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی یہاں سے دُکان سمیت ہوا میں اُڑ جائے گا۔

"اسفنج ہیں ؟"

"ہاں"

"سب سے بڑے اسفنج کے کتے پیسے ؟"

"چار !"

عزیز خوشی سے ناچنا چاہتا تھا۔ ایک بار تو اُس کے جی میں آئی کہ دُکاندار سے لپٹ کر گاؤں ؎

تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا

لیکن اُس کی توند دیکھ کر اُس کی نظر اپنے پیٹ پر جا پڑی، جو پیٹھ سے چمٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ مسکرانا تک بھول گیا۔

"تو لا یہ سلیٹ اور ایک بڑا اسفنج !"

دونوں چیزیں اپنے گھٹنے کے پاس رکھ کر اُس نے قمیص اُٹھا کر واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی دو اُنگلیاں جیب سے باہر نکل گئیں۔ چونّی رستے میں گر گئی تھی!

سلیٹ اور اسفنج اندر رکھ لئے گئے۔ اُس نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

احمد ندیم قاسمی

*

کیفیات

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرّت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنا کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش، کبھی فکرِ آشیانہ

مرے قہقہوں کی زد پر، کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رَو میں کبھی تلخیٔ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اَوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں کبھی تُو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد، جسے چھُو سکا نہ صُوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوزِ شاعرانہ

معین احسن جذبی

ناخواندہ مہمان

بمبئی کے مشہور ڈاکٹر شاد صاحب ابھی ابھی سو کر اُٹھے تھے کہ اُن کا خدمتگار احمد طشتری میں ایک ملاقاتی کارڈ رکھے ہوئے اندر آیا۔

"یہ کون صاحب ہیں، نواب سلطان احمد خاں؛ میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔ اور دیکھو تو بھلا مانس صبح صبح ہی آدھمکا ہے۔ اچھا بٹھاؤ انہیں۔ میں ابھی کپڑے پہن کر آیا۔"

"السلام علیکم! فرمایئے مزاج بخیر؟"

"مہربانی، آپ سنایئے! معاف فرمایئے، آپ کو صبح صبح ہی تکلیف دے رہا ہوں۔"

"نوازش، آپ کا اپنا گھر ہے حضرت۔ تکلیف کیوں؟"

"آپ اس بچے کو نہیں جانتے، بیٹا ارشاد، آپ بمبئی کے بہت بڑے آدمی ہیں اور نہایت سربرآوردہ ڈاکٹر"

"آداب حضرت!"

"تشریف رکھئے صاحبزادے"۔ نواب صاحب کی طرف مخاطب ہو کر "حسنِ ظن کا شکریہ! اچھا تو یہ آپ کے صاحبزادے ہیں؟"

"جی ہاں! آپ کے چچا جان نے میرا آپ سے غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ میں سیلانی انسان ہوں۔ میں نے ایک کتاب لکھی تھی "امریکہ اور امریکہ والے"۔ اب پبلشر کا تقاضا ہے کہ میں ہندوستان کے جیل خانوں کے حالات پر ایک پُرمغز اور مبسوط کتاب لکھوں۔ اب مجھے ہندوستان کی سیاحت کرنی ہے۔ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ براہِ کرم برخوردار ارشاد کو اپنے یہاں مقیم ہونے کی اجازت دیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کا کسی ہوٹل میں قیام ہو۔ شہروں کی ترغیبات سے ابھی تک اس کا دل و دماغ محفوظ ہے! آپ اسے بالکل بے ضرر بچہ پایئے گا۔ اسے کوئی نفیس سی کتاب دے دیجئے۔ پھر کیا مجال جو دخل در معقولات دے!"

شاد کے خرمنِ صبر و شکیب پہ جیسے بجلی گر گئی۔ انکار کرے تو چچا جان تک معاملہ پہنچنے پر جن تلخ لمحات سے دوچار ہونا پڑتا تھا، وہی خوب جانتا تھا اور اگر اس ننھی نواب زادے کو ساتھ رکھے تو گویا زندہ درگور، نہ دن کو آرام نہ رات کو چین۔

"میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کا شکریہ بجا لاؤں۔ مجھے شام کی گاڑی سے کلکتہ جانا ہے۔ اس لئے اب ہم اِدھر اُدھر کے مناظر کی سیر کرتے ہیں۔ سرِ شام ہی یہ آپ کے پاس حاضر ہو جائے گا! اور ہاں ارشاد! ذرا آنکھیں کھول کر بمبئی کی سیر کرنا کہ میں تم کو یہاں کی معلومات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں!"

"اچھا عزیزم! السلام علیکم۔"

"السلام علیکم۔ خدا حافظ!"

"احمد!"

"جی حضور!"

"ارے تم نے دیکھا یہ بلائے ناگہانی کہاں سے مجھ پر آنازل ہوئی۔ اس شریف زادے کا کھانا تیار رکھنا۔ میں شام کا کھانا باہر ہی کھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر شاد چھڑی گھماتا ہوا باہر چلا گیا اور تقریباً رات کے گیارہ بجے واپس آیا۔

"کہو احمد، ارشاد آگیا ہے یا نہیں؟"

"نہیں تو حضور! ساڑھے چھ بجے آئے تھے۔ کپڑے پہن کر پھر کہیں باہر نکل گئے ہیں گھومنے کو!"

رات کے بارہ بجے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی دیوار پھاندنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاد اور احمد دونوں باہر نکل کر کیا دیکھتے ہیں کہ برآمدہ میں ارشاد اوندھے منہ پڑا ہے۔

"ارے یہ کیا؟ جلدی سے ڈاکٹر کو بلالاؤ!"

"تشویش کی بات نہیں حضور، آپ ٹانگیں پکڑیئے اور میں سر۔ اور بستر پر لٹا دیجئے!"

شاد صبح کے وقت ارشاد کے کمرے میں گیا تو اُسے بھلا چنگا پا کر حیران رہ گیا۔

"کیوں صاحبزادے؟ رات گئی تک کہاں رہے! اور یہ مدہوشیاں۔ اگر آپ کے والد صاحب نے سن پایا تو دونوں کی درگت ہوگی!"

"اُفوہ صاحب! آپ نہ جانے کیا فرما رہے ہیں۔ ایسے بھلے چنگے اور دلچسپ ہو کر زاہدِ فریب کار بن بیٹھے! اجی گاؤں نما شہر میں عمر کے ۱۸ سال تو بسر کر چکے ہیں اب کہیں جا کر اس امتداد زمانی کے بعد چند زندگی پرور لمحے نصیب ہوئے ہیں۔ ان سے بھی بہرہ اندوز نہ ہوں تو پھر مجھ سا پاجی آپ کو کہیں نہیں ملے گا! حضرت! انہی دنوں کی سہانی یاد عمر بھر کی خشک زندگی پر سایہ فگن ہوگی۔ اگر یہ یاد بھی سہانی نہ ہوئی تو پھر آپ ہی فرمایئے ہم کیا کریں گے جی کے! — اور ہم تو ہر روز یوں ہی کریں گے۔ آپ چاہے ناراض ہوں یا خوش! بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔"

شاد بات کرے تو کیا اور نصیحت کرے تو کسے؟ چنانچہ اِدھر اُدھر کی ہانک کر کمرے سے باہر نکل آیا اور احمد سے کہنے لگا "ہم — آج شام کا کھانا باہر ہی کھائیں گے۔"

رات کو شاد نے احمد سے پوچھا:-

"وہ نواب زادہ؟"

"حضور شام کو آئے تھے۔ کپڑے پہن کر پھر چلے گئے"

شاد نے کمرے میں قدم رکھتے ہی بجلی کا بٹن دبانا چاہا تھا کہ آناً فاناً کسی نے لپک کر اُس کی ٹانگوں کو آدبوچا!

"ارے رے!" اور ساتھ ہی اس زور کی چیخ ماری کہ احمد دوڑا دوڑا آیا اور بجلی روشن کر کے کہنے لگا۔

"حضور! فکر کی بات نہیں۔ نواب زادے نے یہ شکاری کتا جوئے میں جیتا ہے اور یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ چونکہ حضور کو پہچانتا نہیں، غیر سمجھا اور ایسی حرکت کر بیٹھا!

"احمد! میں صبح اپنے دوست کے یہاں جا رہا ہوں۔ نہیں معلوم کب واپس آؤں؛ تم میری ڈاک وہیں بھیج دیا کرنا!"

"بہت اچھا حضور!"

اس روز روز کے غل غپاڑے سے نجات حاصل کرنے کے لئے شاد اپنے ایک دیہاتی دوست کے ہاں قیام پذیر ہُوا۔ ایک ہفتہ ٹھہر کر واپس گھر آیا۔

"احمد! وُہ کتا اور نواب زادہ؟"

"حضور! کتے کو بیچ دیا نواب صاحب نے!"

"وہ خود کہاں ہے۔ باہر کہیں؟"

"نہیں حضور!"

"کسی کلب میں؟"

"نہیں حضور!"

"پھر کہاں ہے آخر؟"

"جیل میں حضور!"

"ہیں، جیل میں؟"

"جی حضور! کل رات اُنہوں نے ایک سپاہی سے تُو تُو میں میں جو کی تو ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی اور وہ فوراً حوالات میں دے دیئے گئے!"

"یہ تو غضب ہُوا۔ اگر نواب صاحب آگئے تو پھر؟"

"معمولی بات ہے حضور! کہہ دیں گے دہلی سیر کرنے کے لئے گئے ہیں۔"

خدا کا کرنا کیا ہوا۔ نواب صاحب دوسرے روز علی الصباح آموجود ہوئے۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد نواب صاحب کہنے لگے۔

"کہیئے حضرت! ارشاد کہاں ہے؟"

"وہ دہلی سیر کرنے گئے ہیں۔ کیوں احمد دہلی ہی گئے ہیں نا!"

"جی حضور"

"دہلی بہت قابلِ دید قدیم شہر ہے۔ اُمید ہے کہ بہت محظوظ ہوں گے۔ میں ابھی عرض کرنے کو تھا کہ آپ نے خود ذکر چھیڑ دیا۔ ہم خوب شیر و شکر رہے اور ہمیشہ اکٹھے آیا جایا کرتے تھے، خوب پُرلطف وقت کٹا ہے! مجھے وہ زندگی کی گھڑیاں جو اُن کی صحبت میں کٹی ہیں عمر بھر یاد رہیں گی۔ بہت دلچسپ واقع ہوئے ہیں ارشاد صاحب!"

اتنے میں احمد ناشتہ لے کر آ گیا۔

"لیکن یہ کیا بات۔ جب میں کل بمبئی کے قیدخانوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ اپنی کتاب کے لئے مواد بہم پہنچاؤں تو میں نے ارشاد کو بڑی جیل میں چکی پیستے دیکھا اور وہیں دل پکڑ کر رہ گیا۔

شاد کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اُس نے ملتجیانہ نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھا۔

"حضور! مداخلتِ بیجا معاف!"

نواب صاحب نے گرج کر کہا "چپ رہو خدمتگار! میں تم سے بات نہیں کر رہا ہوں۔"

بھلا احمد ان گیدڑ بھبکیوں کو کیا جانے۔ اپنی ڈھٹائی سے کام لے کر کہنے لگا۔

"حضور میں عرض کرتا ہوں۔ جاتے ہوئے آپ اُن سے ارشاد فرما گئے تھے کہ تم بمبئی کی معلومات کے ذمہ دار ہو! اور چونکہ انہیں معلوم تھا کہ آپ 'ہندوستان کے جیل خانوں کے حالات' پر کتاب لکھنے والے ہیں۔ اس لئے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے والدِ محترم کے ارشاد کے مطابق ذاتی تجربہ اور معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ جان بوجھ کر ایک سپاہی سے اُلجھ پڑے۔ اور اب وہاں بخیر و خوبی تجربہ حاصل کر رہے ہیں۔ حضور! میں مبارکباد عرض کرتا ہوں کہ آپ کے صاحبزادے نہایت فرمانبردار، مطیع اور سعادتمند واقع ہوئے ہیں!"

عبدالرحیم

*

انتظار

چاند کی آنکھ کھلی نور کا سیلاب آیا
سحر زا منظرِ خوابیدہ منظر پر چھایا

آسماں تخ ہے زمیں تخ ہی فضائیں یخ ہیں
چاندنی تخ ہے سراسیمہ ہوائیں تخ ہیں

آہ سوتے ہوئے غمناک نظاروں کا سماں
چمنستاں میں جدھر جاؤ ہواؤں کی فغاں

گوشۂ باغ میں اک بُت کی طرح ہوں خاموش
رُوح ہے تیری محبت کے نشے میں مدہوش

قافلے تیرے خیالوں کے چلے آتے ہیں
دیئے اُمید کے جلتے ہیں بجھے جاتے ہیں

تجھ سے ملنے کی اُمیدیں نہیں سونے دیتیں
آہ مایوس بھی مجھ کو نہیں ہونے دیتیں

مہدی علی خاں

اُردو زبان کی حفاظت

اُردو زبان کی حفاظت کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے، کہ اُردو کو ہندوستان بھر کے عوام کم وبیش بولتے اور سمجھتے ہیں صوبجاتی زبانیں تو اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں، لیکن وہ زبان جسے مختلف صوبوں کے رہنے والے ہندوستانی عوام ایک دُوسرے سے بات چیت کرنے کے لئے استعمال میں لاتے ہیں، اُردو ہے۔ عوام کے لئے اُردو، اور پڑھے لکھے بُورژوا قسم کے لوگوں کے لئے انگریزی زبان، انگریزی زبان کی حیثیت آج وہی ہے جو مغلوں کے وقت فارسی زبان کی تھی، فارسی کو عوام اپنا نہ سکے، اس لئے وہ ہندوستان میں بطور ایک زبان کے زندہ نہ رہ سکی، انگریزی زبان بھی یقیناً ایک دِن مغلوں کی شاہی زبان کی طرح چلی جائے گی، اور باقی رہے گی یہی بے چاری، غریب، نادار اُردو کیونکہ بقولِ شاعر

یہ ہماری زبان ہے پیارے

دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان اس وقت ایک نئے دَور سے گزر رہا ہے، عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو غدر کی آگ نہ مٹا سکی، نہ چوراچوری کے واقعات، تشدد یا عدم تشدد، کوئی طاقت یا فلسفہ چاہے وہ کتنا ہی بڑا، مہیب اور عظیم الشان کیوں نہ ہو، اسے نہیں مٹا سکتا، عام اصطلاح میں اسے "پیٹ کی بھُوک" کہتے ہیں، یہ ایک خالصتہً مادی چیز ہے، اور مادی ہی چیز سے مٹائی جا سکتی ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ ہندوستان ہے، ہندوستان جو ابدالآباد سے روحانیت کا مرکز رہا ہے، اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے، کہ جب کبھی عوام اپنے سماجی اور اقتصادی مسائل کو لے کر آگے بڑھے ہیں، وہ ہمیشہ ہر جگہ، دنیا کے ہر کونے اور گوشے میں کامیاب رہے ہیں، لیکن کبھی آخر میں کبھی درمیان کے وقفے میں اور اکثر ساتھ ساتھ ہی پُرانے دَور کو برقرار رکھنے کے لئے عوام کی مخالف جماعتیں اُسے نئی صُورت میں پیش کر کے عوام کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ ملمع سازی ہمیشہ قائم نہیں رہتی، لیکن ایک عرصہ تک ضرور قائم رہتی ہے، اور اکثر دیر تک بھی قائم رہتی ہے، ہندوستان کی تاریخ میں جب کبھی ہندوستانی سماج نے اپنا قدم آگے بڑھایا ہے، پرانے خیال کے راستباز بزرگوں نے روحانیت کی مناسبت سے مذہبیت کا ایک نیا چکر چلا دیا ہے، اور عوام کی توجہ کو صحیح مسائل اور صحیح نقطۂ نظر سے دُور لے جا کر دُور از کار اور شاید موہوم مسائل میں پھنسانے کی کوشش کی ہے، نام لینے کی ضرورت نہیں، لیکن تاریخ دان حضرات جانتے ہیں کہ ہندوستان میں وہ طبقے جو سماج کی ترقی کے وقت سدِ راہ ثابت ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے سماجی اور معاشرتی طور پر رجعت پسند تھے، ہمیشہ مذہبیت کی پناہ لیتے رہے ہیں اور اکثر کافی لمبے عرصوں تک عوام کی جدوجہد کو روکنے میں کامیاب رہے ہیں۔

آج بھی صورتِ حال وہی ہے، ہندوستان کا قدم ترقی کی طرف ہے، ہندوستان کے عوام اپنے مادّی مسائل کو حل کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں، یہ مادّی مسائل نہایت سادہ ہیں۔ مثلاً روٹی، پانی، کپڑا اور جسمانی آرام اور صحت، اور بدنی صفائی کے لئے صابون اور کھیلنے کے لئے فرصت اور جگہ۔ اس قسم کی معمولی، چھوٹی اور نکمّی باتیں آج کل کے ہندوستانی عوام کا شغل ہیں لیکن وہ ہندوستانی طبقے جو آج سے سَو سال پہلے یقیناً ترقی پسند اور باغی تھے اور اب سماجی اور اقتصادی حالات سے رجعت پسند ہیں، عوام کے اس شغل کو پسند نہیں کرتے، عوام کے اس عمل کو روکنے کے لئے اور اسے مٹانے کے لئے ساتھ ہی ساتھ ایک مذہبی اور فلسفیانی ردِّ عمل کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس فلسفیانی ردِّ عمل کو اگر برہمن مت (Renaissance) کی نشأۃ الثانیہ کہا جائے تو میرے خیال میں بے جا بات نہ ہوگی۔ اور یہاں ہمارے متعلق صرف یہ بات ہے کہ اس نشأۃ الثانیہ کا اثر و رسوخ اُردو زبان کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ اُردو تمام ہندوستانی عوام کی مشترکہ زبان ہے جس سے وُہ اپنی سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور کلچرل مسائل سے ایک دوسرے کو آگاہ کر سکتے ہیں، انگریزی نہیں کیونکہ وہ تو محض پڑھے لکھے بُورژوا طبقوں کی زبان ہے، فارسی نہیں، عربی نہیں، سنسکرت نہیں، بلکہ محض اُردو، جو ہندوستان ہی میں مختلف صوبوں کے لوگوں کے میل جول سے بنی، بڑھی اور پروان چڑھی، جس کے متعلق آج سے آٹھ دس سال پہلے اور شاید اب بھی، یہ خیال تھا کہ آزاد ہندوستان کی لنگوا فرینکا کہلائے گی۔ اور آج اس قدامت پرستی کی نشأۃ الثانیہ کے طفیل یہ حالت ہے کہ اکثر لوگ علی الاعلان کہہ رہے ہیں، کہ اُردو محض مسلمانوں کی زبان ہے۔ درحالیکہ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے، زبان کی اساس مذہب پر نہیں ہوتی، بلکہ سماجی اور اقتصادی ضروریات پر مبنی ہوتی ہے، اور جب زبان عوام کی سماجی اور اقتصادی ضروریات کا ساتھ نہیں دیتی تو مر جاتی ہے، سنسکرت کی مثال آپ کے سامنے ہے، اُردو اس لحاظ سے عوام کی زبان ہے جسے لاکھوں کروڑوں ہندو بولتے، لکھتے اور سمجھتے ہیں، اس زبان میں سینکڑوں اخبارات اور رسائل شائع کئے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کی تعداد اشاعت کئی اچھے اچھے انگریزی اخباروں سے دُگنی تگنی ہے، اگر اُردو مسلمانوں کی زبان ہوتی تو ملاپ، پرتاپ، تیج اُردو زبان میں شائع نہ ہوتے، جو ہندوؤں میں آریہ سماجی مذہبی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اگر دوسری طرف مسلمان حضرات کو زبان کے معاملے میں بھی اپنے مذہب کو مقدم رکھنا مقصود ہوتا تو وہ محض عربی زبان کو فروغ دیتے، اس لئے یہ کہنا کہ اُردو ہندوؤں یا مسلمانوں یا کسی اور مخصوص مذہبی طبقے کی زبان ہے قطعاً صحیح نہیں ہے۔ لیکن بد قسمتی سے مذہبیت کے اس نئے چکر میں پڑ کر جو عوام کی بیداری کے ساتھ ساتھ ہی پیدا کر دیا گیا ہے، بہت سے لوگ اس سوال کے حسن و قبح پر صحیح نقطۂ نظر سے غور و فکر کرنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں، اور جہاں زبان کو ایک طرف سنسکرت آمیز بنایا جا رہا ہے، وہاں دوسری طرف اُسے مفرّس و معرّب بنانے کا رجحان بھی موجود ہے، دونوں طریقوں سے زبان عوام سے دُور ہوتی جا رہی ہے، اور مصنوعی اور غیر قدرتی بن رہی ہے، اُردو زبان کی حفاظت ضروری ہے اس لئے اُردو کے ہر ایک حامی کا یہ فرضِ اوّلین ہے کہ وُہ اس مسئلہ کے متعلق نہایت غور و فکر سے کام لے اور پھر جو نتائج اس کی سمجھ میں آئیں انہیں تجاویز کی صُورت میں مُلک کے سامنے پیش کرے۔

اس سلسلہ میں میری ذاتی تجاویز یہ ہیں جنہیں میں مختصراً آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں:۔

(۱) ان تمام کوششوں کو جو زبان کو سنسکرت آمیز یا مفرس و معرب بنانے میں صرف ہو رہی ہیں، روکا جائے، زبان کی فطرت کی مناسبت سے اس امر کی خاص کوشش ہو کہ اس کا تعلق ہمیشہ کے لئے عوام سے وابستہ ہو جائے۔ یہ دو صورتوں میں ہو سکتا ہے، سب سے پہلے تو یہ کہ صوبجاتی زبانوں سے زیادہ سے زیادہ الفاظ جذب کر لئے جائیں، اس کے لئے اُردو کے وُہ ادیب جو اُردو اور کسی اَور صوبائی زبان میں لکھتے ہوں، زیادہ موزوں ثابت ہوں گے، وہ اپنی تحریروں میں صوبائی زبانوں کے وہ الفاظ جو صوتی اور دیگر پہلوؤں سے اُردو میں جذب ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں استعمال کریں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اُردو ادب کو ہندوستانی عوام کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار بنایا جائے۔ دُنیا میں سب سے ضروری بات صرف یہی نہیں کہ عشق کس طرح کیا جاتا ہے، گو چند بورژوا طبقے جن کے پاس روپے پیسے کی فراوانی ہے یا متوسط طبقہ کے مُفلس فاقہ زدہ نوجوان ضرور ان چیزوں میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کے عوام نہایت شدید طور پر ان امُور کے متعلق بھی جاننا چاہتے ہیں، کہ روٹی کس طرح کمائی جاتی ہے، سرمایہ کیا ہے، سٹیم انجن کس طرح چلتا ہے، ٹریکٹر کسے کہتے ہیں، جمہوری نظام کسے کہتے ہیں وہ مذہب اور سائنس کے جدید انکشافات، اور وہ بہت سی علمی، کاروباری، تجرباتی باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ ان تمام چیزوں کو اپنے ادب میں لے آیئے کہ ہمارا ادب صحیح معنوں میں ترقی کرے۔

(۲) اُردو زبان کی حفاظت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُردو کے ادیبوں کی حفاظت کی جائے، وہ مغلئی دَور کا جاگیردارانہ نظام گزر گیا جب شاعروں اور ادیبوں کی پرورش کا فرض نوابوں، راجاؤں اور مہاراجاؤں کے سپرد تھا اب عوام کا زمانہ ہے، راجا اور نواب اور امراء کا طبقہ کسی ایسی تحریک کا جو زبان کو عوام کے جذبات کا آئینہ دار بنا دے خیر مقدم نہیں کر سکتا، اب یہ فرض پریس کے سر آن پڑا ہے، رسائل اور اخبارات، خاص کر اخبارات کے ذمہ یہ فرض ہے کہ وُہ اُردو کے ادیبوں کو ان کی محنت کا صلہ دیں، انگریزی زبان کی ترویج و اشاعت میں انگریزی پریس اور پیشہ ور انگریزی ادیبوں کا بہت بڑا حصہ ہے: اور آج کل مادیت پرستی کے زمانہ میں اُردو کے ادیبوں سے یہ توقع رکھنا کہ وُہ ساری عمر کوئلوں کی دکان پر بیٹھ کر خدا واسطے کی خدمت کرتے جائیں گے، ایک خطرناک بھول ہے۔ اس کا تدارک بہت جلد ہونا چاہیئے۔

(۳) پانچ سات ہزار روپے کا ایک چھوٹا انعام نوبل پرائیز کی طرح مقرر کر دیا جائے، جو ہر سال یا ہر دوسرے سال کسی مستحق ادیب کو عطا کیا جایا کرے اس کے لئے راجاؤں، نوابوں اور امراء کا طبقہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۴) سستے ایڈیشنوں کی کتابیں شائع کی جائیں، انگریز لوگ چونکہ دُنیا کے دوسرے لوگوں سے نسبتاً متموّل ہیں، اس لئے انگریزی صحافت میں گراں پایہ ایڈیشنوں کا عام رواج ہے، ہم لوگوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی مہنگے ایڈیشن شائع کرنے شروع کر دیئے ہیں، اس سے نہ تو عوام کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے، نہ مصنف کو، ہندوستانی عوام اوسطاً چھ پیسہ فی کس کماتے ہیں، اس لئے اقبال کا پیغام جو تین روپے فی کتاب کے حساب سے بکتا ہے اُن کے قریب تک بھی نہیں پہنچ سکتا، انگلستان کو چھوڑ کر باقی یورپی ممالک میں مثلاً فرانس، جرمنی اور روس میں بیشتر کتابیں سستے ایڈیشنوں پر ہی شائع ہوتی ہیں، اور اسی لئے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔

کرشن چندر

غزل

تری یاد سے ہو مجھے غرض، ترے ذکر سے مجھے کام ہو
مری زندگی کا نظام بھی، تری زندگی کا نظام ہو

مری خاک سے گزر اس طرح کہ ہر ایک ذرہ تڑپ اُٹھے
مَیں قدم قدم پہ نثار ہوں اس ادا سے مشقِ خرام ہو

مجھے بزمِ عیش سے کیا غرض مَیں ترے خیال میں مست ہوں
نہ سرودِ سازِ نشاط ہو، نہ صدائے گردشِ جام ہو

نہ وُہ شوقِ عشوۂ دلبری، نہ وہ ذوقِ شیوۂ کافری
مری صبحِ حسرت و غم کہیں مری زندگی کی نہ شام ہو

شبِ ہجر کاوشِ بے نوا، مرا دل چراغ سحر ہُوا
یہ لکھا تھا میرے نصیب کا، کہ سلام ہو نہ پیام ہو

کاوش

غزل

دلِ بے مُدعا دیا تُو نے
دینے والے یہ کیا دیا تُو نے

مُسکراتا ہُوا فروغِ جمال
بادہ میں جھلملا دیا تُو نے

بجلیوں میں بسا ہے جامِ شراب
ہائے یہ کیا پلا دیا تُو نے

حسن کو فرصتِ نظر نہ ملی
عشق کو کیا صلا دیا تُو نے

دل میں روشن تھی آرزو تیری
یہ دیا بھی بجھا دیا تُو نے

بیخودی کو میں کیا کہوں ثاقبؔ
بیخودی میں بھلا دیا تُو نے

ثاقبؔ سلمانی بی۔اے

حضرت شاد عظیم آبادی کا ایک خط

(بہ نام سیّد ہمایوں مرزا صاحب مرحوم و مغفور)

ترا چہ غم کہ ترا ہر کسے بجائے من است
مرا است غم کہ مرا ہیچ کس بجائے تو نیست

اخوی محترم فدایت شوم تسلیم۔ کیا سبب کہ آپ نے میرے اخیر نیاز نامہ کا جواب اور مثنوی دلستان اخلاق کی اب تک رسید نہیں لکھی۔ بھائی آپ کی اتنی سی غفلت بھی میرے سے بڈھے کے حق میں ستم ہے۔ للہ جلد بتائیے کہ مثنوی بخیریت پہنچی۔ میں خود کو ملامت کر رہا ہوں کہ رجسٹری کیوں نہ کر دی واضح رہے کہ یہ مثنوی اب نایاب ہے۔ خدا بخش خان مجھ سے ناراض ہو گئے تھے مگر مَیں نے اُن کو نہ دی سے چہ داند بُزنہ لذّاتِ ادرک' یہی مصرعہ میں نے جوابِ طلب میں پڑھا تھا۔

بہرام الدولہ صاحب نے معذرتیں اور بیحد ترغیبیں دیں چونکہ میں کہہ چکا کہ مَیں ذاکر نہیں ہوں، اگر اس ذریعہ سے بیس ہزار بھی دینگے تو مجھ کو لینا حرام ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ میرے محترم جناب سیّد امداد امام صاحب مدظلہٗ نے مجھ پر حد سے زیادہ اصرار فرمایا تھا کہ جلد حیدر آباد جانے کا سامان کروں، میں نے جناب ممدوح کو جواب میں لکھا تھا کہ جناب کو میرے علائق کی پوری خبر نہیں ہے اس سفر میں کم سے کم میرے ایک ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے بغیر خاص گاڑی کے میں جا ہی نہیں سکتا اور ان دنوں بعض وجوہ سے اتنا جلد میں سامان سفر نہیں کر سکتا۔ سامان مرتب کر لوں تو جناب کو خبر دوں گا میرا یہی خط حضور ممدوح نے بہرام الدولہ صاحب کے پاس بھیج دیا۔ بہرام الدولہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے غلطی سے اس کو حسنِ طلب سمجھا یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں نے آپ کا خط بجز بھائی علی امام صاحب اور سالار جنگ بہادر کے کسی کو نہیں دکھایا خیر بات تیر از کمان جستہ ہے وہ اب تین ہزار تو کیا بیس ہزار بھی دیں تو برخلاف وضع نہیں کر سکتا۔ مگر بڑا غضب یہ ہے کہ میرے محترم مدظلہٗ میرے انکار سے کبیدہ خاطر ہو گئے خیر میں پاؤں پر گر کر منا لوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے نور چشم نصیر میاں سلمہٗ کا کیا بگاڑا ہے اگر نقصان کیا یا کر رہا ہوں تو اپنا کیا۔ پہلے تو خواجہ اسمٰعیل صاحب وکیل اور مسٹر سلطان احمد صاحب کو لکھ لکھ بھیجتے تھے کہ ستر برس کی عمر میں بڈھے کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی باتوں کا اعتبار کر رہا ہے اب سلطان نہیں ہیں تو محلّہ کے لوگوں کو میری نسبت مضحکہ آمیز و طنز و تشنیع لکھا کرتے ہیں یہ خبر مجھ کو برابر پہنچتی رہتی ہے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کی خط و کتابت کا حال کیونکر مل گیا . . . . میں نے بمشکل تمام مثنوی مادرِ ہند کو پھر مرتب کر کے کاتب کو دے دیا نصف لکھی جا چکی اس کے ساتھ ایک تعلیمی کتاب بھی لکھوا رہا ہوں کیا کہوں وقت کم ہے ورنہ جو نصابِ تعلیم اُردو و فارسی و عربی کا میں نے لکھا ہے

اور جس سے آسانی کے ساتھ فقط تین برس میں لڑکا ان تینوں زبانوں پر تحریراً و تقریراً قادر ہوجاتا ہے صاف کرواتا یہ سات کتابیں ہیں۔ پٹنہ کالج کے پروفیسروں نے مسودہ جانچ کر لکھا ہے کہ مصنف نے علمی راستہ میں ریل ایجاد کی ہے ایک ضخیم کتاب فکرِ بلیغ ہے اگر موقع ہوا تو تھوڑی تھوڑی نقل اس کی لکھ لکھ کر آپ کو بھیجوں گا۔ اب میں صاف عرض کرتا ہوں کہ میں ایمان کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ لوگ جو چاہے کہیں مگر میں نے سید علی امام صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ سے بہتر عمدہ بہمہ صفات موصوف نہیں دیکھا اور شاید آخر تک میرا یہی عقیدہ رہے گا۔ میرے سے کس نپرس آدمی کے ساتھ وہ جیسی محبت کرتے ہیں ایسی بیر یا محبت شاید ہی کسی کو ہو خدا گواہ ہے کہ اگر ذرا بھی اُن کو موقع ملتا تو اب تک نہیں معلوم وہ کیا کر گزرتے میں تین برس گزرنے پر ذرا بھی مایوس نہیں ہوں اگر موقع مل گیا تو میں لوگوں کو سلام کروں گا کہ دیکھو علی امام ایسے ہیں، ابھی میں خاموش ہوں جس کا جو دل چاہے کہے میاں.... نے لوگوں کو لکھا ہے کہ حیدرآباد میں بجز کشن پرشاد کے علی محمد شاد کے اعلےٰ مضامین کو سمجھتا کون ہے نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی اور ذریعہ سے ...... دکن گئے بھی تو ان کا کمال مٹی میں مل جائے گا وغیرہ وغیرہ، خیر وہ وقت اگر آگیا تو دیکھا جائے گا یہ بھی (میرے جی چھڑانے کے لئے) لکھتے ہیں کہ خود بدولت (حضور) بجز اپنے کسی کی ہستی نہیں سمجھتے عین مجمع میں یہ کہہ کہہ کر کہ یہ مصرع یا یہ شعر یا یہ مضمون لغو ہے اور پھر اپنی صحبت میں مضحکہ کرتے ہیں لوگوں حتّٰے صدرِ اعظم کو خوشامدانہ تصدیق کرنی ہوتی ہے۔ مجھ کو یقین نہیں کہ ایک والیِ ملک خصوصاً اہلِ فن ہو کر یہ ایسا کرے۔

اب میں آپ سے مستدعی ہوں کہ خدا کے لئے جس طرح ہو آپ حضور (صدرِ اعظم سلمہ اللہ) کی خدمت میں جائیے اور کہئے کہ جس طرح ممکن ہو اگر اعلےٰ پیمانہ پر نہ ہو تو نہ ہو لیکن کچھ کیجئے ضرور، میری زندگی اب بہت کم ہے جو بات ہو جائے غنیمت ہے خدا جانے سچ یا جھوٹ میاں.... نے لوگوں کو لکھا ہے کہ صدرِ اعظم کو دو سو روپیہ ماہانہ منصب دینے کا اختیار ہے دو سو یہ اور دو سو سرکاری طریقہ سے وہ چاہتے تو گھر بیٹھے دلوا دیتے نہیں معلوم اس کی حقیقت کیا ہے لیکن یہ سچ ہے حافظ محب الحق نے ایک معمولی کتاب کسی معمولی شخص کے ذریعہ سے پیش کر کے دو سو ماہانہ کا منصب حاصل کر لیا۔ بہرحال میرے اس نیازنامہ کا جواب مفصل بعد دریافت جملہ امور از راہ ہمدردی عنایت کیجئے اور یہ بھی دریافت کر کے لکھئے کہ میرے دونوں قطعے ایک اُردو ایک فارسی اور وہ تختۂ زریں جو نذرِ بارگاہ کے لئے طیار کر کے حاضر کیا تھا محفوظ ہے یا کشاکشِ سفر و علالتِ مزاج کے سبب سے کہیں گم ہوگیا اگر خدا ناکردہ تختۂ زریں گم ہو گیا تو اب اس کا سامان بہت دُشوار ہے، بہرحال مجھ کو معلوم تو ہو جائے۔

اس دفعہ عزیزی مولوی احمد علی خاں سلمہ نے یہ چاہا ہے کہ صوبہ بہار کے چاروں ضلعوں سے قدرشناسوں کا مجمع کریں اور میں مرثیہ پڑھوں، میں نے خوشی سے منظور کر لیا۔ مرحوم مغفور ہادی علی خاں یاد آتے ہیں کہ اپنے ماموں کا کفش بردار سمجھ کر مجلسوں میں منبر کے پاس گھنٹوں کھڑے ہو کر پنکھا جھلا کرتے تھے اور میری ترقی پر خوشی کا رونا رویا کرتے تھے خدا مدارج عالی کرے، لڑکے بھی کچھ کم مجھ سے محبت نہیں کرتے اور میرے بارہ میں تعصب حد سے زیادہ ہے، ستاج خاتونانِ ہند[1] کو میری دلی دُعائیں پہونچا دیئے لڑکے آداب خلوصانہ پیش کرتے ہیں والسلام والدّعا والتسلیم

پٹنہ ۳؍ستمبر ۱۹۲۲ء

تمہارے باپ کا کفش بردار
سید علی محمد شاد

[1] صغرا ہمایوں مرزا

محفلِ ادب

ہی یا۔ ہی یا

بھوکے مزدوروں کے گیت

(ایک راجہ جی کے محل میں ایک گرڈر (شہتیر) مزدور چڑھا رہے ہیں۔ اور ہر زور پر ایک نقرہ کہتے ہیں۔ پہلا فقرہ میٹ کہتا ہے دوسرا نقرہ مزدور مِل کر کہتے ہیں اور زور لگاتے ہیں)

میٹ	سب مزدور
گاڑلینا	کیسے بھائی
ایسے بھائی	ہیا ہیا
بوجھ اُٹھالو	بوجھ اُٹھایا
محل سرا کا	ہاں ہاں بھائی
محل سرا کا	ہاں ہاں بھائی
بوجھ اٹھالو	بوجھ اُٹھایا
اُونچا کرلو	ہیا ہیا
بوجھ اُٹھالو	ہیا ہیا
بوجھ اُٹھایا	ہیا ہیا

میٹ	سب مزدور
ہاتھ بچا کے	ہاں ہاں بھائی
پیر بچا کے	ہاں ہاں بھائی
بوجھ اُٹھالو	بوجھ اُٹھایا

میٹ	سب مزدور
اُونچا کرلو	ہیا ہیا
شیر بہادر	ہیا ہیا
اُونچا کرلو	محل سرا
بوجھ اُٹھالو	بوجھ اُٹھایا
کیسے بھائی	ہیا ہیا
شیر بہادر	ہیا ہیا
آگے سرکے	ہیا ہیا
شیر بہادر	ہیا ہیا
ہاں ہاں بھائی	ہیا ہیا
پیٹ پلے گا	ہمارا تمہارا

میٹ	سب مزدور
باغ بنے گا	ہاں ہاں بھائی
پھول کھلیں گے	ہاں ہاں بھائی

میٹ	سب مزدور
جشن اڑیں گے	ہاں ہاں بھائی
پیٹ پلے گا	چار مہینے
پیٹ پلے گا	ہمارا تمہارا
ہمارا تمہارا	ہمارا تمہارا
ہاں ہاں بھائی	ہمارا تمہارا
پیٹ پلے گا	چار مہینے
ہاں ہاں بھائی	ہیّا ہیّا
شیر بہادر	ہیّا ہیّا
کیسے بھائی	ہیّا ہیّا
پیٹ پلے گا	ہیّا ہیّا

میٹ	سب مزدور
اور اُٹھاؤ	ہیّا ہیّا
آگے سرکے	ہیّا ہیّا
آٹھ مہینے	بھوک لگے گی
شیر بہادر	بھوک لگے گی
بن کپڑے کے	بن لتّے کے
آٹھ مہینے	بن روٹی کے

میٹ	سب مزدور
زور لگاؤ	ہیّا ہیّا
بھوک لگے گی	بھوک لگے گی
کیسے بھائی	ہیّا ہیّا
شیر بہادر	ہیّا ہیّا
ہاں ہاں بھائی	ہیّا ہیّا
پیٹ بھرے گا	ہیّا ہیّا

میٹ	سب مزدور
اور اُبھارو	ہیّا ہیّا
ہاتھ بچا کے	ہیّا ہیّا
شیر بہادر	ہیّا ہیّا
دام ملیں گے	ہیّا ہیّا
سود بھریں گے	ہیّا ہیّا
قرض ملے گا	ہیّا ہیّا
شیر بہادر	ہیّا ہیّا
اور اُبھارو	ہیّا ہیّا
پیر بچا کے	ہیّا ہیّا

(سیّد مطلبی فرید آبادی) "چنگاری"

بیوی بڑے آدمیوں کی نظر میں

سب جانتے ہیں کہ بیوی کسے کہتے ہیں لیکن بہت کم انسان ہیں جو بیوی کے حقیقی معنی سمجھتے ہوں۔ بیوی وہ خوشنما شمع ہے جو تاریکی میں بھٹکنے والے مرد کو کامیابی، ترقی اور پاکبازی کا راستہ دکھاتی ہے۔ بیوی کی ہستی دلکش بھی ہے اور مقدس بھی۔ اس قدر مقدس کہ اس کے

تقدس کا مقابلہ شاید ہی دُنیا کی کوئی دُوسری چیز کر سکے۔ بیوی درحقیقت مرد کی زندگی کی رُوح ہے جو مرد سے جس طرح چاہے کام لیتی ہے۔
ایک اچھی بیوی اپنے شوہر کو فرشتہ بنا سکتی ہے اور خراب بیوی شوہر کو شیطان میں بھی بدل دیتی ہے۔ (الیف۔ اوسبرن)

جب قدرت کسی انسان پر مہربان ہوتی ہے اور اُسے بہترین عطیہ دینا چاہتی ہے تو وہ اس خوش نصیب انسان کو اچھی بیوی دے ڈالتی ہے۔ اچھی بیوی جواہرات کا ایک ایسا خزانہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کی آواز دُنیا کی بہترین موسیقی ہے۔ اس کا تبسم زندگی کا اُجالا ہے، اس کی محبت معصومیت کا شاہکار ہے۔ اس کا نرم و نازک جسم زندگی کا سچا کیف ہے۔ اس کی کفایت شعاری ایک شوہر کا بہترین سرمایہ ہے جس کو اچھی بیوی مل گئی اسے دُنیا کی کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ ایک اچھی بیوی دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔ (ٹیلر)

بیوی ایک ایسا سچا اور وفا شعار دوست ہے جس کی مثال آج تک دُنیا نہیں دریافت کر سکی ہے۔ بیوی وہ دوست ہے جو اپنے آرام کو شوہر کے آرام پر قربان کر دیتی ہے۔ بیوی ہی کو خدا نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ شوہر کی خاطر اپنے باپ بھائی اور تمام اعزا کو بھول جاتی ہے بیوی ہی کا یہ ایثار ہے کہ وہ تکلیف اور تنگدستی میں اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیتی ہے۔ وہ تمہاری زندگی کی کشتی کی ناخدا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب تمہاری زندگی کی کشتی بھنور میں پھنس کر ڈوبنے لگتی ہے۔ وہ تمہاری زندگی کی کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیتی ہے اور تم کو پریشانیوں سے نکال کر پھر عشرت کی زندگی کی جانب لے جاتی ہے۔ وہ حُور ہے، وہ فرشتہ ہے۔ (سپیرو)

سب سے ہوشمند اور عقلمند بیوی وُہ ہے جس نے اپنے سوا دُنیا کی تمام عورتوں کو دل سے بُھلا دیا ہو۔ جب ایک ہوشمند بیوی اپنے شوہر کے دِل میں بس جاتی ہے تو اس شوہر کو دُنیا کی کوئی عورت عورت نظر نہیں آتی۔
اگر بیوی چاہے تو ایک مرد کو نہ صرف مقدس بلکہ فرشتہ بنا سکتی ہے لیکن اس کے لئے بڑی ہوشمندی اور سمجھداری کی ضرورت ہے۔ (ویبسٹر)

جس طرح ہوا اور روشنی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح بیوی کے بغیر بھی زندہ رہنا ناممکن ہے۔ جو لوگ بیوی کے بغیر زندگی گزارتے ہیں وہ بظاہر زندوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگیاں مُردوں سے بدتر ہیں۔
بیوی زندگی کا دُوسرا نام ہے اِسی لئے بیوی کے بغیر ہمیشہ زندگی ناکام رہتی ہے۔ (ایڈیسن)

"دین و دُنیا"

مقصودِ اقبال

کہا اقبال سے اِک ہمنشیں نے ۔۔۔ سخن تیرا شرابِ آتشیں ہے
کچھ اس انداز سے گرما دیئے دِل ۔۔۔ کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے
حرارت ہے ترے سوزِ نوا کی ۔۔۔ کہ بجلی سی دِلوں میں جاگزیں ہے
کلامِ شاعراں پروردۂ عصر ۔۔۔ مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے
اثر میں ہے یہ صُورِ محشر انگیز ۔۔۔ کشش میں نغمۂ خلدِ بریں ہے
بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا ۔۔۔ دل اب طرزِ کہن پہ نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے

یہ سُن کر حضرتِ اقبال بولے ۔۔۔ فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے
زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا ۔۔۔ فلک وہ ڈھونڈ جسکی یہ زمیں ہے
مرے فکرِ فلک پیما کی پرواز ۔۔۔ ادب پروردۂ روح الامیں ہے
فروغِ عشق و سوزِ آرزو سے ۔۔۔ سخن میرا تب و تاب آفریں ہے
مگر میرے سخن کی روشنی بھی ۔۔۔ چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
مرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا ۔۔۔ اگر تو سالکِ راہِ یقیں ہے
تری نظروں میں ہیں میری تصانیف ۔۔۔ مری نظروں میں قرآنِ مبیں ہے
گزر جانا مری بزمِ سخن سے ۔۔۔ رہِ قرآں میں گامِ اولیں ہے
جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے ۔۔۔ تو حاصل دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائنات دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

(اسد ملتانی)

"طلوعِ اسلام"

ایک دیہاتی گیت

یہ ایک دیہاتی گیت کا ترجمہ ہے۔ دیہاتی ہی نہیں بلکہ تھارو لوگوں کی مخصوص زبان ہے اگر الفاظ ترجمہ لکھتی ہوں تو مضمون بہت طویل ہُوا جاتا ہے اور خالی الفاظ بہت سخت ہیں لہٰذا مختصر ترجمہ پیش کرتی ہوں۔

بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی اور دوستوں سے پوچھا۔ شکار چلو گے۔ سب راضی ہو گئے۔

چھوٹا بھائی بیوی سے بولا میں شکار جا رہا ہوں روٹی پکا دو۔ میں گھوڑا کس لوں۔

بیوی نے جواب دیا۔ "میری داہنی آنکھ پھڑک رہی ہے تم شکار نہ جاؤ خدا معلوم کیا مصیبت درپیش ہو"۔ اس نے کہا "گھبراؤ نہیں ہم تیسرے روز آ جائیں گے"۔ جب شوہر رخصت ہو کر چلا گیا تو یہ کوٹھے پر چڑھ گئی۔ جب تک شوہر کا گھوڑا آنکھ سے اوجھل نہ ہُوا دیکھتی رہی۔

رات بڑی کرب و بے چینی سے گزاری۔ صبح ہوتے سو گئی۔ جب اُٹھی تو ساس سے کہا میں نے خواب دیکھا کہ میرے ہاتھ کی چوڑیاں ٹوٹ گئی ہیں، ساس نے جواب دیا کہ "مریں تیرے بھائی بھتیجے، تُو ہمیشہ بُرا ہی سوچا کرتی ہے"۔ بہو رو کر چپ ہو رہی۔

دوسری رات کو اس سے زیادہ بے چین رہی۔ جب صبح کو اُٹھی تو ساس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا میں ماتھے پر سیندور کی بندی لگاتی ہوں وہ چھوٹ جاتی ہے"۔ ساس نے جواب دیا "کم بخت تو ہمیشہ بدشگونی منایا کرتی ہے دُور ہو نگاہ کے سامنے سے"۔ یہ روتی ہوئی کوٹھے پر چڑھ گئی اس نے دیکھا کہ جنگل کی طرف چیلیں منڈلا رہی ہیں، تھوڑی دیر میں اُس نے دیکھا کہ سب پلٹ کر آ رہے ہیں۔ شوہر کے خیر مقدم کے لئے دوڑ کر نیچے آئی مگر اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب جیٹھ آیا اور شوہر نہ آیا۔

ماں نے پُوچھا "بیٹا تمہارا چھوٹا بھائی کہاں ہے" تو اُس نے کہا کہ وہ کل آئے گا اُدھر ہی سے سسرال چلا گیا۔ ماں کو یقین آ گیا۔ وہ چپ ہو رہی مگر بیوی بہت پریشان ہوئی اس کا دِل رو رہا تھا۔ رات کو یہ پڑی کروٹیں بدل رہی تھی کہ اس کو اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھلتا معلوم ہُوا۔ اس نے کہا "کون سیاں تو نہیں۔ نہیں کتا ہوگا یا بلی۔"

جیٹھ نے جواب دیا کہ نہ کتا ہے نہ بلی میں ہوں تمہارا پجاری۔

یہ سُن کر بھاوج گھونگٹ نکال کر کھڑی ہو گئی۔ بولی "بھائی تم کو اپنے چھوٹے بھائی کی بھی لاج نہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ، وُہ اب آتے ہوں گے"۔

جیٹھ ہنسا۔ بولا "وہ اب کبھی نہ آئیں گے۔ تُم تو اب ہماری ہو۔ اس کا نام ہی نہ لینا۔ اس کو بھول جاؤ"۔

جب اس نے دیکھا کہ معاملہ بڑھا ہے، تو بولی "اچھا جب میرا شوہر ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا تو میں ہر حالت میں تمہاری ہوں۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم نے اس کو کیا کیا"۔ جیٹھ نے جواب دیا "اس کو مار کر میں نے جنگل میں ڈال دیا ہے جھاڑیوں کے اندر"۔ جب اس نے

سنا تو اپنے کو بہت سنبھالا اور بہانے سے باہر نکلی اور کہاروں کے پاس گئی اور کہا" جو کچھ تم مانگو گے میں دوں گی تم مجھ کو کجلی کے بن میں لے چلو جہاں چیلیں منڈلا رہی ہیں۔" غرض یہ اسی جنگل میں پہنچی دیکھا تو شوہر کا جسم اور منہ ایسی بُری حالت میں پڑا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ یہ اس جسم سے لپٹ کر خوب روئی اور پھر جسم کو اُٹھا کر ڈولی میں رکھا۔ لے کر گھر واپس آئی۔ ساس کے سامنے لاکر ڈال دیا اور کہا:" یہ تمہارے بڑے بیٹے کی کارگزاری ہے۔"

لاش جلانے کے لئے چتا تیار ہوئی۔ لاش رکھی گئی تو بہو نے ساس سے ہاتھ جوڑ کر اجازت لی کہ میں یہ آخری خدمت اپنے شوہر کی اور کروں یعنی چتا میں آگ اپنے ہاتھ سے لگاؤں۔ ساس نے روتے ہوئے اجازت دی۔ اس نے جاکر آگ لگادی اور سورج کی جانب ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوئی اور کہا" اے سورج دیوتا اگر تم سچے ہو تو میری مُراد پوری کرو کہ جیٹھ نے بچپن کے ساتھی میرے شوہر کو مارا ہے۔ یہ زندہ رہے مگر اندھا اور کوڑھی ہو کر اور اس کا کوئی نام تک لینے والا نہ ہو" یہ کہہ کر اس نے ایک چھلانگ چتا میں لگائی اور شوہر کا سر اپنی گود میں رکھ کر جل گئی۔

جیٹھ کی جب تلاش ہوئی تو بھاوج کی کوٹھڑی میں بند تھا جس کو جنگل چلتے وقت بھاوج نے بند کر دیا تھا۔ جب وہ نکالا گیا تو اندھا اور کوڑھی تھا۔"

یہ گیت دیہاتی عورتیں اور خاص طور پر ٹھاکر قوم کی عورتیں خاص لُطف سے گاتی ہیں اور الفاظ بڑے بروگ سے ادا کرتی ہیں۔

"عصمت" (مسز حمید)

آئندہ زمانہ کے نام نیویارک کے سائنسدانوں کا خط

۲۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کو نیویارک میں اس زمانہ کی طرف سے آنے والے زمانہ کے نام ایک عجیب خط بھیجا گیا ہے، یہ خط ان لوگوں کے لئے ہے جو آج سے پانچ ہزار سال بعد اس دُنیا میں موجود ہوں گے۔ یہ معمولی خط نہ تھا جو ناظرینِ کرام آئے دِن لکھتے رہتے ہیں، بلکہ ساڑھے سات فٹ لمبا دھات کا ایک خول تھا جس کا نصف قُطر آٹھ اِنچ اور وزن آٹھ پونڈ تھا۔ اب ناظرین کرام کا خیال ہوتا ہوگا کہ آخر یہ خط کون سے ڈاک خانہ میں ڈالا گیا ہوگا اور ۶۹۳۸ء کے لوگوں کو کس طرح ملے گا؛ نیویارک کی ایک کمپنی کی عمارت میں جس کا نام" ویسٹنگ ہوس" ہے، پچاس فٹ گہرا گڑھا کھود کر اس عجیب خط کو اس میں دفن کر دیا گیا ہے۔ گویا" ویسٹنگ ہاؤس" اس کا ڈاک خانہ اور یہ گڑھا اس کا لیٹر بکس تھا۔ یہ خول ایسی دھات سے بنایا گیا ہے جس میں تانبے، کرومیم اور چاندی کی ملاوٹ ہے، یہ دھات ہزاروں سال خراب نہ ہوگی۔ اس پر گرمی، ہوا، پانی اور بھونچال کے جھٹکوں کا بھی کوئی اثر نہ ہوگا۔ اور یہ اس قدر مضبوط اور سخت ہے کہ گلنے بھی نہ پائے گی، یہ بھی سائنسدانوں کے دماغ کی ایک اختراع ہے۔ جو عجیب خط اور خول کی شکل میں آنے والے لوگوں کو ملے گی۔ اور اس وقت کے لوگ سُن کر متحیر اور متعجب ہونگے۔

غور فرمائیے۔ خول کے چھ حصے تھے۔ جو پیچوں کے ذریعے ایک دوسرے سے اس طرح ملا دیئے گئے تھے کہ باہر کی سطح سے ایک ہی ٹکڑا دکھلائی دیتا تھا۔ خول کے اندر ایسے شیشے کی ایک نلی رکھ دی گئی ہے جس پر گرمی کا کوئی اثر نہ ہوگا، یہ نلی گویا اس خط کا "اصلی لفافہ" ہے۔ نلی رکھنے سے پہلے تمام ہوا نکال کر اس کی جگہ نائٹروجن گلاس گیس بھر دی گئی ہے، تاکہ زنگ نہ لگ سکے"۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انوکھے "لفافے" کے اندر کیا چیز بند کی گئی؟ ویسٹنگ ہاؤس کمپنی نے دُنیا کے ہر قسم کے بڑے بڑے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد ٹین کے ڈبے کھولنے کے اوزار سے لے کر چھوٹے سے کیمرے تک کئی قسم کی چیزیں اس میں بند کی ہیں۔ سنہ ۱۹۹۸ء کے فیشن کی ایک زنانہ ہیٹ، دھاگے کی ریل، بجلی کی روشنی کا بلب، کپڑوں کے نمونے اور فلموں کی ریلیں رکھی گئی ہیں، عام استعمال کی چیزوں کے چالیس کے قریب نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کے اناجوں، سبزیوں، پھلوں کے بیج، شیشے کی چھوٹی چھوٹی نلیوں میں بند کر کے اس اُمید پر اس کے اندر داخل کئے گئے ہیں کہ آج سے پانچ ہزار سال بعد یہ پھولیں پھلیں گے۔ ان میں گندم، جئی، جو، چاول، لوبیا، شکر قند، گاجر، لہسن، کپاس اور تمباکو کے بیجوں کی نلیاں بھی ہیں لیکن سب سے ضروری چیزیں جنہیں اس لفافے کی جان کہنا چاہیئے تین خبروں کی اور چار فلموں کی ریلیں ہیں۔ فلموں کی لمبائی گیارہ سو فٹ ہے۔ ان میں ایک کروڑ لفظ اور ایک ہزار تصویریں ہیں۔ ہر ایک فلم باریک لکھائی کی موٹی موٹی سو کتابوں سے زیادہ ہے۔ انہیں پڑھنے کے لئے شیشے کے لفافے میں ایک چھوٹی سی خوردبین اور فلمیں دیکھنے کے لئے ایک مشین رکھ دی گئی ہے مشین کو چلانے کا طریقہ بھی ریلوں پر درج ہے۔ لیکن سنہ ۶۹۳۸ء کے سائنس دان سنہ ۱۹۳۸ء کی زبان کس طرح سمجھیں گے؟ یہ کام اُن کے لئے مشکل نہ ہوگا۔ کیونکہ فلموں کی اس ننھی سی لائبریری میں جو المونیم کے خولوں میں بند ہے، انگریزی زبان کو بولنے، پڑھنے اور اس کا ترجمہ کرنے کا طریقہ درج ہے۔ انگریزی زبان اور اس کے بول چال کی ایک ڈکشنری بھی ہے۔ ایک کہانی دُنیا کی بیس زبانوں میں لکھی ہے اور ایک دُعا تین سو زبانوں میں، کئی کتابیں پوری کی پوری نقل کر دی گئی ہیں۔ تجارتی کمپنیوں کی فہرستیں دُنیا کی مختلف تاریخوں کی جنتری اور کلنڈر اور تین مشہور ناول بھی اس چھوٹی سی لائبریری میں شامل ہیں۔ سائنس کے متعلق بڑے بڑے سائنسدانوں کے مضمون بھی ہیں، مشہور مصوّروں کی تصویریں، گانوں کی کتابیں اسی کے قریب رسالے اور اخبار اور ریلوے اور ہوائی جہازوں کے ٹائم ٹیبل فلموں کی شکل میں ہیں۔ آج کل کی سائنس، مذہب، فلسفے، تعلیم، دستکاری، رسم و رواج، رہنے سہنے کے طریقوں، تفریح کی چیزوں، گھروں، دفتروں، کارخانوں، فوجوں اور ہوائی لڑائیوں کے حالات ہیں۔ یہ سب کچھ فلموں کی شکل میں ہیں۔ لیکن دو اصلی کتابیں بھی ہیں۔ جن میں سے ایک بائبل ہے، دُوسری کتاب میں بتایا گیا ہے کہ یہ خط کس جگہ دفن ہے؛ اس جگہ کا پُورا نشان اور خط کو کھود کر نکالنے کا طریقہ لکھ دیا ہے۔ اس کتاب کی کاپیاں دُنیا بھر کی بڑی بڑی لائبریریوں اور عجائب گھروں میں بھیج دی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ آج سے پانچ ہزار سال بعد کسی لائبریری یا عجائب گھر میں سے یہ کتاب صحیح سلامت نکل آئے، اور اس زمانے کے لوگوں کو بتا دے کہ فلاں جگہ ایک خط دفن ہے۔ جو سنہ ۱۹۳۸ء نے سنہ ۶۹۳۸ء کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں سنہ ۱۹۳۸ء کے

لوگوں کے نام ہمارے زمانے کے مشہور لوگوں کے پیغام بھی ہیں۔ ان میں سے ایک پیغام میں آنے والی نسلوں سے پوچھا گیا ہے کہ تمہارے زمانے میں دُنیا کی ترقی رُک تو نہیں گئی؛ سائنس کو نقصان تو نہیں پہنچا؟" لیکن اس زمانے کا سائنسدان جب ۱۹۳۸ء کی خبروں کی فلم کو مشین سے چلا کر دیکھے گا تو لڑائیوں کی تباہی کا حال دیکھ کر اسے بیسویں صدی کی دُنیا پر بہت افسوس ہوگا۔ بلکہ سفّاکی بربریت اور وحشیانہ پن پر ہنسی آئے گی، کیونکہ اور راور تصویروں کے ساتھ اسے کینٹن پر جاپانی ہوائی جہازوں سے بم گرنے کی تصویر بھی نظر آئے گی۔ کیا ۶۹۳۸ء کے لوگوں کو اس سے حیرانی نہ ہوگی؛ کیا اس وقت سائنس ہمارے زمانے کی سائنس سے بہت آگے نہ بڑھ چکی ہوگی ۱۹۳۸ء کی اس ننھی سی لائبریری اور عجائب گھر کو کھودنے کے بعد ان لوگوں کو ہماری باتوں پر ہنسی تو نہ آئے گی؛ اور وہ یہ تو نہیں کہیں گے "پچھلے زمانے کے لوگ بیوقوف تھے۔ وُہ کچھ نہ جانتے تھے اور انہوں نے کوئی ترقی نہ کی تھی؟ بہت ممکن ہے ایسا ہو لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے؛ مختصر یہ کہ اس خط سے پانچ ہزار سال بعد کے لوگوں کو ہمارے زمانہ کا پُورا حال معلوم ہو جائے گا۔ پچھلے زمانے کے لوگوں کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ ہمارے لئے وہ کوئی پیغام چھوڑ جائیں۔ لیکن اگر وہ کوئی ایسی چیز چھوڑ بھی جاتے تو اس کا ہم تک پہنچنا مشکل تھا۔ کیونکہ انہیں ایسے طریقے معلوم نہ تھے جو ہمیں معلوم ہیں، ہمارے پیغام آنے والے زمانے تک صحیح و سالم پہنچیں گے یا نہیں؛ اس سوال کا جواب تو صرف وقت ہی دے سکتا ہے۔

(ترجمہ) "حمایت اسلام"

نوائے زندگی

پہاڑی کی گھاٹیوں میں جب دُور دُور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی، میری محبوبہ اکیلی سیر کے لئے باہر آئی۔ وہ تھک کر راستہ میں ایک پتھر پر بیٹھ گئی، اس کا آنچل اس کے کاندھوں سے سرک کر ہوا میں اُڑ رہا تھا۔

میں ایک پودے کے پیچھے چھُپا ہُوا، اس مجسمۂ حیات کو دیکھ رہا تھا، چاندنی کی زرد زرد کرنیں اس کے برہنہ سینہ پر پڑ رہی تھیں، اور وہاں سے نور حاصل کر کے واپس چاندنی کی طرف اڑی جا رہی تھیں۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو . . . . . میں ایک حسینہ کے لئے جنگلوں اور ویرانوں میں سرگرداں رہا لیکن اس نے میری محبت اور عہد و پیمان کو ٹھکرا دیا، کیونکہ وہ ایک اور مرد سے محبت کرنے لگی تھی، لیکن اس مرد نے بھی ایک اور لڑکی سے محبت کر کے اسے خوب ہی دھوکا دیا۔ وہ لڑکی میری پرستش کرنے لگی، گناہ نے محبت کے چار متوالوں کو خوب احمق بنایا، اور اس طرح مجھے بلندیوں سے ایک پست ترین غار میں پھینک دیا۔

عورت کے دل کو جکڑنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا آئینہ میں عکس کو باندھ دینا، عورت کے راستے پہاڑیوں کی بلندیوں پر چھوٹی چھوٹی

پگڈنڈیوں کی طرح دشوار گزار ہوتے ہیں، اس کے جذبات ان شبنم کے قطروں کی طرح ہیں جو صبح کے وقت پھولوں کی پتیوں کے ساتھ لٹک رہے ہوں، اور اس کی غلط فہمیاں اس کے ساتھ اس طریقہ سے چمٹی رہتی ہیں جیسے انگور کی بیل کے ساتھ زہریلی بوٹی۔

اس کا برہنہ جسم اس قدر لطیف ہے جیسے دُور اُفق کے قریب کوئی تہ دار دریا بہہ رہا ہو اور اس پر کانپتی ہوئی چاند کی شعاعیں گر رہی ہوں اور اس کی لہروں پر برفانی سپید پروں والے دو ہنس گردنیں سیدھی کئے ہوئے آہستہ آہستہ تیر رہے ہوں، اور کنول کے پھول اِدھر اُدھر حرکت کر رہے ہوں۔

اس دریائے زندگی میں ڈوبنے کی خواہش کرنے والے خبردار ہو جا، یہ رنگینی اور دلآویزی صرف ساحل پر کھڑے ہونے سے نظر آتی ہے ...... اس دریا کی گہرائیوں میں خوفناک بلائیں پوشیدہ ہیں۔

شفق اور صبح کی روشنی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ اچھے اور بُرے آدمی کی دوستی میں ہے، ایک وقت گزرنے پر تیز اور روشن ہوتی ہے دوسری زائل ہو ہو کر اندھیرے میں پھنساتی ہے۔

زمین میں جکڑے ہوئے درخت چلنے کی خواہش کرتے ہیں، جانور کئی صدیوں سے نطق کی تمنا میں ابھی تک گونگے ہیں، ...... اور انسان ایک ایسے بہشت کی آرزو میں سرگرداں ہے جہاں سے تاجدار دیوتا بھی رہا ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔

وقت اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا، بلکہ ہم روز بروز لمحہ بہ لمحہ ایک طرف سے دوسری طرف جا رہے ہیں اور ہماری خواہشات ابھی تک جوان ہیں، گو ہمارے جسم بھی بڑھاپے کی وجہ سے ٹھٹھر چکے ہیں۔

ایک سانپ پٹاری میں قید تھا، بھوک کے باعث مرنے کے قریب پہنچ گیا، ایک رات ایک بیوقوف چوہا شکار کی تلاش میں کودتا ہوا پٹاری پر آبیٹھا اور اُس میں سوراخ کر کے اندر چلا گیا، سانپ میں از سرِ نو زندگی عود کر آئی .... قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔

میں نے ایک کُتا دیکھا لیکن میرے نزدیک کوئی پتھر نہ تھا جو اُس پر اُٹھا کر پھینکوں، جب پتھر پاس تھا، تو کتا نظر نہ آتا تھا جب کُتا اور پتھر دونوں نظر آئے، تو یہ معلوم ہُوا کہ وہ راجہ کا کُتا ہے ...... اب کوئی کیا کرے؟

رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کر کے راجہ کو مسحور کر دیتی ہے اور جب وہ مطمئن ہو جاتا ہے تو پس پردہ چلی جاتی ہے۔

قدرت کی نیرنگیاں رُوح پر چھائی ہوئی ہیں، اس کے گیت اور حُسن کا جادُو ہمیں مبہوت کر دیتا ہے۔ وقت آنے پر وہ بھی پس پردہ چلی جاتی ہے اور تماشائی مطمئن ہو جاتا ہے۔ . . . . اور قدرت صرف یہی چاہتی ہے۔

اگر زندگی کی میعاد سَو سال بھی تصوّر کر لیں، تو آدھی نیند کے سپرد ہو جاتی ہے اور اس سے آدھی بچپن کی حماقتوں اور بڑھاپے کی لغزشوں میں صرف ہوتی ہے۔

باقی ماندہ زندگی میں خوف، غم اور آنسوؤں کا انعام ملتا ہے۔

افسوس ہے اُس بندے پر جو زندگی کو حباب سے زیادہ جانتا ہے۔

(بھرتری ہری) "نیّرِ اعظم"

لال قلعہ کی عیدیں

(۱)

رات کو توپیں۔ ڈیرے خیمے فرش فروش عیدگاہ روانہ ہؤا۔ سواری کا حکم ہوا۔ ہاتھی رنگے گئے۔ صبح کو بادشاہ نے حمام کیا۔ پوشاک بدلی، جواہر لگایا۔ خاصے والیوں نے جلدی سے دسترخوان بچھایا۔ سوّیاں، دودھ اولے، بتاشے، چھوارے، خُشکا، کھڑی مسور کی دال اُس پر لگا دی۔ بادشاہ نے نیاز دی۔ ذرا ذرا سا چکھ کے کُلّی کی، باہر برآمد ہوئے۔ چوبدار نے خبرداری بولی۔ باہر تُرئی ہوئی۔ سب جلوس قاعدے سے کھڑا ہو گیا۔ فوجدار خاں نے ہاتھی بٹھایا، کہاروں نے ہوادار تلووں کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ ہودے میں سوار ہوئے۔ دیوانِ عام میں سواری آئی۔ اہتمام توپخانے کی توپوں کی اکیس آوازیں ہوئیں۔ قلعہ کے دروازے پر پلٹنوں نے سلامی اُتاری، اکیس توپیں چلیں۔ عیدگاہ کے دروازے پر سواری پہنچی، جلوس دو طرفہ کھڑا ہو گیا۔ سلامی اُتاری، دروازے پر سے بادشاہ ہوادار میں اور ولیعہد نالکی میں اور سب پیدل عیدگاہ کے اندر آئے۔ چبوترے پر سے اُتر کر خیمے میں بیٹھے۔ مُصلّوں پر کھڑے ہو گئے۔ مکبّر پر تکبیر ہوئی۔ سب نمازیوں نے صفیں درست کیں۔ امام جی کے ساتھ سب نے نیّت باندھ لی۔ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا۔ سب کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ، ولیعہد، شاہزادے اپنے مُصلّوں پر بیٹھے رہے۔ امام جی کو خطبہ کا حکم ہؤا۔ قور خانے کے داروغہ نے امام جی کے گلے میں کلابتونی پرتلہ اور تلوار ڈالی۔ امام جی نے کھڑے ہو کر تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر خطبہ پڑھا۔ جب بادشاہ کا نام آیا، توشہ خانہ کے داروغہ نے امام جی کو خلعت پہنایا۔ دُعا مانگی۔ خطبہ کی ایک توپ چلی۔ سات دھوپ چڑھ گئی تھی۔ بادشاہ نگدمبر میں سوار ہوئے۔ دیوانِ خاص میں آئے۔ تختِ طاؤس پر بیٹھ کر دربار کیا۔ نذریں لیں۔ پھولوں کے طُرّے اور ہار سب کو مرحمت ہوئے۔

"مؤلف فرہنگِ آصفیہ"

(۲)

صبح کے وقت جب شہنشاہِ اورنگ زیب عالمگیر ہلالِ عید کی طرح بارگاہِ معلّیٰ میں جلوہ ریز ہوتا تو تمام خدّام اور وابستگانِ سلطنت تسلیمات بجا لاتے۔ بادشاہ

ان کے سلام کا جواب نہایت خندہ پیشانی سے دیتا اور نماز عید کے لئے ہاتھی پر سوار ہوتا۔ بادشاہ ایک تخت پر جلوس فرما ہوتا، اور شہزادہ محمد معظم اس کے پیچھے کھڑا ہوجاتا۔ اُمرائے دربار حسب مراتب و مناصب ایک جلوس مرتب کرتے، جو خراماں خراماں عیدگاہ کی طرف روانہ ہوتا، مؤذن بلند آواز سے تکبیر کہتے، نقاروں کی غلغلہ انداز صدائیں کانوں کے پردے پھاڑتیں۔ جب یہ جلوس عیدگاہ پہنچ جاتا تو نہایت سکون اور فروتنی کے ساتھ نماز عید ادا کی جاتی۔

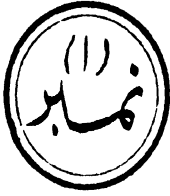
خطبہ کے بعد جلوس اسی شان سے واپس لوٹتا۔ بادشاہ دیوان عام میں دربار منعقد کرتا، اور درباری بہت اخلاص سے مراحم خسروانہ اور مواہب شاہانہ سے سرفراز ہوتے۔ دربار عام کے بعد بادشاہ محل سرا میں تشریف لے جاتا اور اُمرائے دربار عیش و عشرت میں مشغول ہوجاتے، رعایا خوشی کے شادیانے بجاتی اور جشن شاہی میں شریک ہوتی۔ یہ جشن عید کے دو دن بعد تک جاری رہتا۔ ان دنوں میں اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ رعایا اسراف اور فضول خرچی سے بچی رہے، اور اُسے اس جشن سے کوئی ایسا اسلامی سبق حاصل ہوجوا ...... اسلامی جوش و خروش کی جیتی جاگتی مورت بنادے۔

(۳)

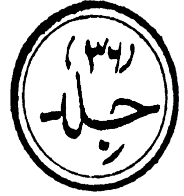
شوال کی عید جس شان اور جاہ و حشم کے ساتھ لال قلعہ میں آتی تھی اُس کی گہما گہمی اور تیاری شاہ عالم اور اکبر ثانی کے عہد تک بالکل ٹھنڈی پڑگئی تھی، کیونکہ ان بادشاہوں کی حکومت اور سطوت برائے نام رہ گئی تھی، اور مغلیہ سلطنت کا چراغ بجھنے والا تھا اور بہادر شاہ کا زمانہ تو ایسا زمانہ تھا کہ مریض حکومت دم توڑ رہا تھا۔ کوہ نور ہیرا شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ سے چھین کر حضور کوئین وکٹوریہ آنجہانی کے پاس لندن پہنچ گیا اور ہندوستان تاریک رہ گیا۔ انگریزوں کی طرف سے جو نذر عید، بقر عید اور جشن سالگرہ اور جشن نوروز کو دربار کے اندر بہادر شاہ کی خدمت میں پیش کی جاتی تھی، وہ عبث سمجھ کر بند کردی گئی۔ فدوی خاص جو بادشاہ کے ساتھ منسوب کیے جاتے تھے موقوف ہوئے، بہادر شاہ کا سکہ بننا برطرف ہوا۔ سٹرٹامس مٹکاف صاحب کو بادشاہ فرزند ارجمند شقوں میں لکھا کرتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد ہاروے صاحب ایجنٹ ہوکر دلی میں آئے تو بادشاہ کو لکھ دیا کہ ہمیں آپ کا فرزند بننا منظور نہیں۔ جب بادشاہ کی سواری نکلتی تھی تو کوئی انگریز جلوس کی قطار کو کاٹ کر اپنی سواری نکال جاتا تھا، اور ترک ادب سمجھتا تھا مگر ابوظفر بادشاہ کے عہد میں یہ پاس بھی اُٹھ گیا تھا، عید بقر عید کو بادشاہ کی سواری کا اہتمام ہوتا تھا، بچھیرہ پلٹنیں آگے پیچھے ہوتی تھیں، بیچ میں حضور والا کا ہاتھی مولا بخش اور اس کے اُوپر عماری اور عماری میں حضور والا رونق افروز ہوتے تھے۔ بچھیرہ پلٹن کے کندھوں پر باناتی غلافوں میں بندوقیں ہوتی تھیں مگر اہل راز جانتے تھے کہ بندوقیں ناداری کے مارے سپاہیوں نے بیچ کھائی تھیں کیونکہ خزانہ شاہی میں اتنا روپیہ بھی نہ تھا جو وہ تنخواہ پاتے، اس لئے وہ سواری کے روز بندوقوں کے غلافوں میں بانس کے ٹوٹے رکھ لیتے تھے۔ عیدگاہ کے صحن میں چھوٹا سا خیمہ قائم ہوتا، اس کے اندر جانمازیں بچھائی جاتی تھیں اس خیمہ کے اندر حضور والا مع بادشاہ زادوں کے دوگانہ ادا کرتے تھے، اہل منصب کو خلعت عطا ہوتا تھا، پھر قلعہ معلٰے میں پہنچ کر دربار گرم ہوتا تھا، ۱۸۵۶ء کی عید بھی ایسی ہی روکھی پھیکی عید ہوئی اور ۱۸۵۷ء کے بعد بہادر شاہ نے عیدیں رنگون میں کیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

(فراق دہلوی)

نیّرِ اعظم



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہ جولائی ۱۹۳۹ء

تصاویر:- (۱) ایک دہاتی ترک لڑکا - (۲) ایک دہاتی ترک لڑکی

چندۂ سالانہ ۵ر - ششماہی ۳ر (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید

گر مرغِ . . . .

ایک سیاسی دَورے کی سرگرمی اور ہفتے بھر کے بخار کی گرمی سے تھکا ماندہ جب ۲۸ رمئی کو میں کشمیر کی حد میں داخل ہُوا تو یہ مشہور مصرع میری زبان پر آیا۔ میں کچھ مُسکرایا لیکن یہ ایک طعنہ آمیز مُسکراہٹ تھی چنانچہ دُوسرا مصرع بشکل میں جی ہی جی میں ادا کر سکا۔ زندگی ایک مدت سے نثر زدہ ہو چکی ہے، چند نام نہاد عملی کام بھی ذمے لے لئے، اور بھی ناس ہو گیا، حسّاس ہونا ہی ایک گناہ ٹھہرا کم ازکم ایک جہالت۔ روز و شب کچھ نہ کچھ کئے جاؤ، زیادہ سوچو مت، اور تخیّل اور شاعرانہ تخیّل تو ہُوا ہی لغو کہ قوموں کی ترقی کی راہ میں محض ایک رُکاوٹ ہے۔

اِن خیالات کے ساتھ جب کچھ کام کرنے کے بعد ایک نیم بیمار جسم و دِل لے کر میں کشمیرِ جنّت نظیر میں داخل ہُوا تو اس کے جنّت بن پر مجھے غصہ سا آیا، سو ایسے حال میں ہر قسم کا شعر بے محل اور بے موقع تھا۔

لیکن چند ہی روز میں مجھے پھر وہ شعر یاد آ گیا اور اب کی بار میں نے اُسے گنگنایا اور اُس سے لُطف اُٹھایا۔ خیال آیا کہ جس شاعر نے جب یہ شعر کہا ہو گا تو اُس غریب کی بھی ہمیں جیسی حالت ہو گی اور پھر اُس کے دِل کے بھی کچھ ایسے ہی "بال و پر" "بر" آئے ہوں گے۔ مجھے کچھ نہ کچھ محسوس ہُوا کہ شعر کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے؛ عملی دُنیا کی دُوری سے کچھ ہوش ٹھکانے ہوئے۔ مُدت کے بعد پہلی بار بیچارے "الحمدللہ" کا تصوّر دماغ میں آیا!

سب سے پہلی دفعہ میں کشمیر میں اگست ۱۹۰۷ء میں آیا جب میری عمر چودہ برس کے قریب تھی۔ میری "طلسمِ زندگی" کا ایک مضمون جو دس سال بعد ڈل میں لکھا گیا فی الحقیقت اُسی زمانے کی یادگار ہے:-

"چاندنی رات میں "دامنِ پاک" کے کنارے، جب چاند بکھرے ہوئے بادلوں کی جھلملیوں سے سوتی دُنیا کو اپنی سرد و سیمیں کرنوں کے ساتھ جھانک رہا ہو، بچپن کے گزرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

برسوں گزر گئے، اسی جھیل کے کنارے تاروں بھری رات میں، مجھے دُنیا میں اُس کی موجودگی کے ساتھ زندگی کا لُطف حاصل تھا جو اب چاند کی شکل میں میری تاریک راتوں کو اپنے نت نئے جلووں سے منوّر کئے ہوئے ہے۔

کتنے حسین و سادہ تھے طفلی کے وہ دِن جب بہتی ندیوں کے کنارے تُو اور میں اے دوست! اپنے معصوم کھیل کھیلتے تھے۔

کاغذ کی ناویں بہاتے تھے، جب نسیمِ سحر کے مَس پر یا چڑیوں کے چہچہوں کو سُن کر ہم ایک دُوسرے کو دیکھتے تھے اور مُسکراتے تھے، ہم نہ جانتے تھے کیوں؛ ہم جاننا نہ چاہتے تھے کس لئے؛"

اور پھر "آہ" اور ـــ "اُف" اور پھر ـــ "آہ" اور اخیر میں:ـ

"اے یادِ طفلی کے چاند! تُو سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپ جا؛ اے مہیب رات! تُو اپنی تاریکی کا آنچل مجھ پر ڈال دے کہ میں خود فراموشی کی نیند سو جاؤں۔"

اور اب تیئیس اور بائیس سال کے بعد کیا حالت ہے؛ اب اِس "آہ" اور "اُف" اور پھر "آہ" پر سیانی سی ہنسی آتی ہے۔ بچوں کا کھیل! بچوں کے سے خیال! بلکہ بچے نہیں ایک غلط بین نوجوان کی فضول حسن پرستی اور بے معنی غم پسندی! اصل شئے ہے علم طبیعیات، معاشیات اور عمل، سیاسیات، ربط و ضبط، ملک، ملّت یا ایک نیا نظام، اشتراکیت، آزادی، آزادگی، مزدوروں کی شورش، نوجوانوں کی بغاوت، ہر پُرانی چیز کی بیخ کنی، ایک نت نیا ذوق ـــ یہ ہے اصلی زندگی!

چنانچہ اپنے قابلِ دوست خواجہ غلام السیدین ڈائرکٹر آف ایجوکیشن پر کارڈ چھوڑا، شام کو "بند" پر جناب اثر صہبائی سے ملنا ہُوا، صبح کو سیدین صاحب کی معیت میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب تشریف لائے، لیلائے کشمیر کے قیس شروانی بزمِ اُردو جمّوں و کشمیر کے منکسر مزاج سکرٹری نے ایک ادبی جلسے اور مشاعرے کی صدارت کے لئے گھسیٹا، کشمیر مسلم لیگ کے سکرٹری آئے اور دو گھنٹے تک مقامی سیاست پر خوب باتیں ہوئیں، تصویر کا دُوسرا رُخ دیکھنے کے لئے میں دُوسرے روز شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور تین ساڑھے تین گھنٹے تک مذاکرہ اور مباحثہ ہوتا رہا ـــ کچھ ایسا محسوس ہُوا کہ میں بھی آج کل کی تازہ بہ تازہ نَو بہ نَو زندگی کا ایک کارکن نہ سہی اُس میں شریک نہ سہی ایک نظارہ باز اور مدّاح ضرور ہوں اور گویا اُس سے فیضیاب ہو رہا ہوں۔

میرے اِس احساس پر "دامنِ پاک" نے، چاندنی رات میں بکھرے ہوئے بادلوں نے، ڈل میں تیرنے والے میرے ہی دو بچوں نے، نسیمِ سحر نے، شام و شفق کی خوبصورت خاموشی میں نشاط و شالا مار نے کیا کہا اس کا ذکر پھر کبھی سہی!

بشیر احمد

جہاں نما

ہندوستان میں یہودیوں کا داخلہ

ہندوستان کے بعض سیاسی حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یورپ کے ملک بدر یہودیوں کو ہندوستان میں آکر رہنے کی اجازت دے دینی چاہیے یعنی جن لوگوں پر عرصۂ آفاق تنگ ہو چکا ہے ہندوستان اُن کا مامن بن جائے۔ اس کے برعکس بعض لوگ ہندوستان میں یہودیوں کے داخلے کو تشویش کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سدھندر بوس نے "ماڈرن ریویو" میں ایک مضمون لکھ کر اس گروہ کی نمائندگی کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ہندوستان میں یہودیوں کو پناہ دینا سخت غلطی ہے اور اس کے نتائج وعواقب کبھی ہمارے ملک کے لئے اچھے نہیں ہو سکتے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اخبارات میں یہ اطلاعات شائع ہو رہی ہیں کہ ہندوستان کا ایک طبقہ بدل وجان یہودیوں کو ہندوستان میں آباد کرنے کا خواہاں ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کے خیال میں ہندوستان کی موجودہ داخلی مشکلات بہت ناکافی ہیں اور ان میں ابھی اور اضافے کی گنجائش ہے۔ اِس مسئلہ کے متعلق خیر خواہیٔ بنی نوعِ انسان کے جذبہ کی تبلیغ کے لئے خطیبانہ فصاحت و بلاغت کے کمالات کی وہ نمائش ہو رہی ہے کہ عقل دنگ ہے۔

ہندوستان کے نیک نہاد باشندوں کے دِل دوسروں کے مصائب کو دیکھ کر بہت جلد بھر آتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وُہ اپنے ہم وطنوں کے درد سے اتنے متاثر نہیں ہوتے جس قدر دُور دراز ملکوں کے اجنبی لوگوں کی تکلیف سے۔ کیا یہ ذکی الحسی کی ایک بگڑی ہوئی صُورت نہیں۔ جب تک ہم اپنے گھر کو اپنے لئے پُر امن نہیں بنا سکتے ہم غیر ملکوں کے مظلوموں کو کیونکر امن بخش سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر بوس کا خیال ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی پناہ گزینوں اور جلاوطنوں کی درآمد کبھی اس ملک کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئی۔ فرقہ پرستی کے زہرلے ہندوستان میں قومی زندگی کی فضا کو مسموم کر رکھا ہے۔ اگر ہم نے یہودیوں کو اپنے ملک میں پناہ دی تو ہم اپنے لئے ایک نیا عقدۂ دشوار پیدا کرلیں گے۔ یہودی کبھی اس بات پر آمادہ نہ ہوں گے کہ اہلِ ہندوستان سے گھل مل کر ہندوستانی قومیت کے ارتقا میں ہمارے ممدّ ومعاون ہوں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"اپنے نسلی اور مذہبی تعصبات کے باعث وہ ہمیشہ ہم سے الگ تھلگ رہ کر خاص حقوق و مراعات کا مطالبہ کریں گے۔

وُہ اپنے آپ کو اِس دُنیا میں حق و صداقت کا عَلَم بردار گردانتے ہیں اور اپنی قوم کو" برگزیدہ قوم" کا لقب دیتے ہیں۔ نسلی تفوق کا گھمنڈ یہودیوں میں بھی تقریباً ویسا ہی قوی ہے جیسا نازیوں میں۔ یہودی جو اپنے آپ کو یہووا کا برگزیدہ بندہ سمجھتا ہے کبھی اپنے آپ کو ہندوستانی قوم میں خلط ملط نہ ہونے دے گا۔ ہم میں اُس کی حیثیت ہمیشہ ایک الگ تھلگ رہنے والے فساد انگیز عنصر کی سی رہے گی۔ یہودی چالاک عملی، موقع کی تاک میں رہنے والا ذہنی ترقی کا بھوکا اور سب سے بڑھ کر روپے کا بے انتہا حریص ہوتا ہے۔ اِن خصوصیات کے ساتھ اُس سے یہ توقع رکھنا کہ اُسے ہندوستانیوں کی سیاسی، اقتصادی اور رُوحانی ضروریات سے ہمدردی ہوگی، پرلے درجے کی سادگی ہے۔ یہودی کی کوشش تو اس کے برعکس یہ ہوگی کہ وہ "ہندوستانی غلام" کو پھر "اُس کی جگہ" کی طرف واپس دھکیل دے"۔

آخر میں ڈاکٹر بوس نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں پہلے ہی نہایت خطرناک مصائب موجود ہیں۔ کاروبار کا حال بُرا ہے۔ روپیہ نہیں ملتا۔ ہزاروں گریجوایٹ بیکار اور مایوس پھر رہے ہیں۔ ہندوستانی جو کُل نسلِ انسانی کا ایک خمس ہیں، دُنیا کی ایک مظلوم اور ستائی ہوئی قوم ہیں۔

" انہیں پہلے ہی یہ مصیبت درپیش ہے کہ ایک فرقہ کو دُوسرے فرقے سے، ایک زبان کو دوسری زبان سے اور ایک مذہب کو دُوسرے مذہب سے متصادم کرنے کی مذموم کوششیں کی جارہی ہیں۔ اب وہ اِس قابل نہیں کہ یہودیوں کو یا دُنیا کی کسی دُوسری غیر مُلکی قوم کو پناہ دے سکیں۔ صاف طور پر یہ کہنا چاہئے کہ وہ "خدا کے نمائندوں" کو کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتے۔ اُن کا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی قوم کو بچائیں، اُس کے لئے روزی کے وسائل مہیا کریں اور اپنی قومیت کو نشوونما دیں۔ اِسی کام میں کافی نیکی موجود ہے۔ اس سے زیادہ نیکی کی فی الحال ضرورت نہیں۔ ذاتی مفاد کا اصُول امریکا اور یورپ کی ہر قوم کا رہنما ہے۔ ہندوستانی قوم کے رہنما کو بھی سیاسی اور اقتصادی حقائق کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہئے اور کچھ دیر کے لئے بین الاقوامی خیرسگالی کے جذبے کو بھُول جانا چاہئے۔ ہمارے لئے ہندوستان کی بہتری کا خیال سب سے مقدم ہے۔ بین الاقوامی فلاح اور خیرخواہئ بنی نوعِ انسان کے جذبات خواہ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں فی الحال عملی دُنیا میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمیں چاند کی کرنوں کے پیچھے دوڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا"۔

فنِ خطابت

خطابت کا فن بہت وسیع ہے۔ مختلف خطیبوں یا مقرروں کے پیشِ نظر مختلف مقاصد ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی مقرر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو کسی بات کا معتقد بنا دے۔ کوئی مقرر لوگوں کو کسی خاص کام کے لئے اُبھارنا چاہتا ہے۔ بعض مقرر لوگوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ بعض مقرر لوگوں میں کسی چیز کے متعلق دلچسپی اور جوش پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بعض مقرروں کا مقصد محض لوگوں کو تفریح

بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ ایسی تقریریں عموماً ضیافت کے موقعوں پر کی جاتی ہیں۔ مسٹر پی سی مانک نے "ہندوستان ریویو" میں ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مختلف بڑے بڑے مقرروں کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے چند بڑے بڑے مقرروں کی تعلیمی، جسمانی اور دماغی حالت کا جائزہ بھی لیا ہے۔ لینن کے متعلق جس نے تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب پیدا کیا وُہ لکھتے ہیں:-

"لینن پڑھنے سے زیادہ سوچنے والا آدمی تھا۔ اس کی عمر زاریت کی تباہی کی تجاویز سوچنے کی طویل اور مسلسل سازش میں گزری تھی۔ مارکس کی تعلیمات اور سیاسی فلسفے کا اُس پر بہت اثر تھا۔ مارکس کی تعلیم نے اُس کے دل میں مذہب کا سا تقدس حاصل کر لیا تھا اور وُہ اُس کو دُنیا کی ہر مصیبت کا علاج تصور کرتا تھا۔ اُس کا تعلق ادنیٰ طبقہ سے تھا اور اُس کو زار کی مستبدانہ حکومت کے مظالم کا ذاتی تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ اسی بات نے اُسے مقرر بنا دیا۔ حالانکہ درحقیقت وُہ کوئی اعلےٰ درجہ کا خطیب نہ تھا۔ وُہ عوام کے دماغوں پر شاندار اور آراستہ الفاظ اور فقروں کے بجائے اُن سے اپنے شخصی تعلق کے ذریعہ سے حکومت کرتا تھا۔ عوام پر اُس کے اثر کا باعث کسی قسم کی فصاحت و بلاغت نہ تھی۔ اُس کے سوانح نگار عموماً اُسے ایک بہت بڑا مقرر اور خطیب سمجھتے ہیں لیکن اپنی تمام کامیابیوں کے باوجود وُہ یقیناً کوئی ڈیما ستھنیز یا برک نہ تھا۔

اِس سلسلے میں مسولینی کا ذکر بھی ہو سکتا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محض اُس کی تحریروں نے اُسے عظمت کی منزل تک پہنچا دیا۔ یورپی اخبارات میں اُس کی جو تقریریں چھپتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں جوش و خروش اور ہیجان کے سوا اَور کچھ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جذبات پرست لاطینی نسل کے سوا اور کسی قوم پر بھی اِن تقریروں کا وُہ اثر نہ ہوتا جو مسولینی کے ہم وطنوں پر ہُوا ہے۔ اٹلی کی تاریخ کے پس منظر میں رومۃ الکبریٰ کی عظمت جھلک رہی ہے اس لئے "رومی سلطنت" کی نشاۃ الثانیہ کے چرچے نے مسولینی کا بازار بہت آسانی سے گرم کر دیا ہے۔ مسولینی کو غالباً اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ اُس کے جسم میں سیزر کی شہنشاہانہ رُوح حلول کئے ہوئے ہے۔ مسولینی کا تعلق بھی ادنیٰ طبقے سے تھا لیکن غیر معمولی قوتِ عمل اور محنت کے ذریعہ سے اُس نے اتنا علم حاصل کر لیا ہے جو ایک عام آدمی کالج اور یونیورسٹی میں اعلےٰ تعلیم پا کر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

ہٹلر کا مطالعہ اس باب میں اَور بھی زیادہ دلچسپ ہے کیونکہ اس کی کامیابی کا سب سے بڑا ظاہری راز اُس کی تقریریں سمجھی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس کی تقریروں ہی نے اُسے طاقتور بنایا۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہٹلر اچھا مقرر نہیں ہے۔ وہ چیختا ہے۔ اُس کے پسندیدہ جُملے نہایت بے ڈھب معلوم ہوتے ہیں اور ہر فقرے کے

آخر میں اُس کی آواز دب جاتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں رُکنا چاہیے، حالانکہ یہ بات ایک مقرر کے لئے بے حد ضروری ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ میز کے سامنے بیٹھے ہوئے اُس کی شخصیت انسان کو بالکل متاثر نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود تعجب ہے کہ یہی شخص ایک مجمع کے دلوں میں آگ لگا سکتا ہے۔ مسولینی کی طرح وہ بھی عوام کے دلوں کو متاثر کرنے کا فن جانتا ہے۔ مسولینی کی "رومی سلطنت" کے نعرے کے مقابلے میں اُس کے پاس یہ چلتے ہوئے فقرے ہیں "ہم جرمن معاہدۂ ورسائی کے باعث فلاں چیز سے محروم ہو گئے۔ ہم اس معاہدہ کے باعث یہ نہ کر سکے اور وہ نہ کر سکے وغیرہ۔" "ہم" کے لفظ پر ہٹلر ابتدا ہی میں بہت زور دیا کرتا تھا۔ وہ عموماً اپنی تقریروں کے آخر میں کہا کرتا تھا کہ افسوس ہم اب "ہم" نہیں رہے۔ ہم غیر متحد ہیں۔ ہم "ہم" نہیں بلکہ ہر شخص الگ الگ "مَیں" ہے اور ہم ذلیل ہو رہے ہیں۔" ان فقروں سے ہٹلر نے ایک ایسی قوم کو متحد کر دیا جس میں سے وُہ خود بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ہٹلر آسٹروی ہے، جرمن نہیں۔ ہٹلر کا تعلق بھی ادنیٰ طبقے سے تھا لیکن اُس نے مسولینی کی طرح اعلیٰ علمی قابلیت حاصل نہیں کی۔"

بھوپال میں مکانات کی تجدید کا منصوبہ

ہندوستان کی ریاستیں اپنی پسماندگی کے لئے مشہور ہیں اس لئے جب کسی ریاست میں ترقی کے آثار نظر آتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے۔ بھوپال کی حکومت قابلِ مبارکباد ہے کہ اُس نے حال ہی میں شہر کو خوبصورت بنانے اور عوام کو بہتر مکانات مہیا کرنے کے لئے ایک نئے منصوبے کی منظوری دی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی بدصورت اور مضرِ صحت عمارات گرا دی جائیں گی۔ نئی عمارتیں چار قسموں پر منقسم ہوں گی جن کی تعمیر پر علی الترتیب پندرہ ہزار، دس ہزار، پانچ ہزار اور اڑھائی ہزار روپے صرف ہوں گے۔ حکومتِ بھوپال مکانات بنانے کے لئے عوام کی مالی امداد بھی کرے گی۔ چنانچہ جو شخص مکان بنانے کے لئے مدد کی درخواست کرے گا۔ اُسے مکان کی لاگت کا چوتھائی حصہ درخواست کے ساتھ ادا کرنا ہوگا بقیہ رقم حکومت اُسے چار فیصدی سالانہ سُود پر دے گی۔ شرط صرف یہ ہوگی کہ جب تک کُل قرضہ ادا نہ ہو جائے مکان حکومت کی ملکیت متصوّر ہوگا۔ ان عمارات کے لئے قطعاتِ زمین کا تعین ہو چکا ہے۔

حامد علی خاں

مٹنا

باغ میں ایک رات جنگلی سؤر گھس آئے اور چمن میں خوبصورت گھاس کو اپنی بدنما تھوتھنیوں سے اکھیڑ کر چلتے بنے۔ سؤروں پر بہت غصہ آیا۔

کبھی کبھی ہموار تروتازہ زمرّدیں خیال دماغ میں اُگتے ہیں مگر غم و غصہ کے سؤر انہیں الٹ پلٹ کر کے ستیاناس کر دیتے ہیں۔ غصہ پر کبھی غصہ نہیں آتا۔

باغ میں گرمی سے، کمروں میں سردی سے پھول مرتے رہتے ہیں اور اِس ممات حُسن پر نہ کوئی فاتحہ کہتا ہے نہ کوئی مرثیہ لکھتا ہے۔

زمانہ کی سردی گرمی سے دل میں جذبات کے پھول، دماغ میں تخیل کے پھول مرجھاتے رہتے ہیں مرتے رہتے ہیں کوئی نہیں دیکھتا کوئی نہیں پوچھتا کوئی نہیں روتا۔

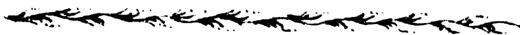
فضائے عالم کی قتل گاہ کھلی ہے۔ سبز گھاس ہو کہ سُرخ پھول ہوں سب بربسر دار ہیں۔ فضائے انسانی کی قتل گاہ پس پردہ ہے۔ اچھے ارادے، حسین آرزوئیں سب تہ تیغ ہیں۔

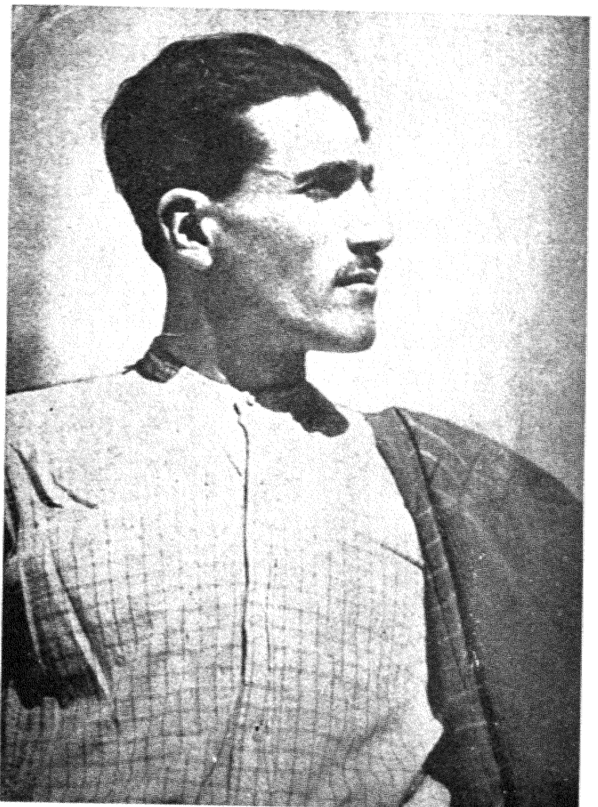
فطرت انسان کے لئے اور انسان فطرت کے لئے آئینہ ہیں مگر عکس صرف ایک ہے یعنی جو کچھ کہ ہے کٹ رہا ہے، کھایا جا رہا ہے، مرجھا رہا ہے، مر رہا ہے۔ مٹنا عام ہے مٹانے والے کو . . . .

صُورت ہو کہ کیف، سیرت ہو کہ رُوحانی معانی سب غلط ترجمانی کا شکار ہیں۔ روک ٹوک کا نام نشان نہیں لُطف یہ ہے کہ ترجمان بہتے جا رہے ہیں مگر دعوے یہ کرتے ہیں کہ دریا کو ہم چلا رہے ہیں۔ بہاؤ میں بےبس ہاتھ پیر مار نہیں سکتے مگر زبانی شیخی قائم ہے کہ کائنات کا منشا، اور راز ہمیں معلوم ہے۔

مٹنا عام ہے۔ کاش یہ مٹنا قدرے حسین ہو۔

"فلک پیما"





ایک دیہاتی ترک لڑکا



ایک دیہاتی ترک لڑکی

"یہواہ ـــــ خدائے یہود کا ارتقاء"

(اسپنسر کے نقطۂ نظر سے)

بنی اسرائیل دنیا کی وہ پہلی قوم ہے جس نے توحید کامل (Monotheism) کا عقیدہ من حیث القوم مرتب اور پیش کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ہند، ایران، مصر اور یونان کے بعض بلند پایہ مفکروں نے ذاتی تفکر اور تفلسف کی بدولت اپنی قوموں کو توحید کے تصور سے آشنا کیا۔ لیکن ان کی کوششیں زیادہ تر توحید ناقص (Henotheism) کی صورت میں مشکور ہوئیں۔ اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو سکا۔ یوں اقوام عالم پر بنی اسرائیل کی فضیلت ایک امر واقع ہے کیونکہ بقول کینن کے "توحید ہی خدا کا بہترین تصور پیش کرتی ہے۔"

لیکن اسفار یہود کا مطالعہ انتہائی احتیاط طلب ہے۔ کیونکہ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ ہم تک اپنی اصلی حالت میں نہیں پہنچے ان میں تبدیلی ہوئی ہے اور بہت ہوئی ہے۔ بابل کی قید سے پہلے یہودی قوم نہ زیادہ مہذب تھی اور نہ متمدن۔ لکھنا پڑھنا چند ہی کو آتا تھا۔ بنو خد نذر نے اسے بابل لے جا کر تہذیب، تمدن، وحدت قومی اور قومی ادبیات سے آشنا کیا۔ اور موجودہ یہودی مقدس ادب اسی قید سے واپسی کے بعد یعنی پانچویں صدی ق م میں مرتب ہوا۔ اسی لئے ابتدائی عبرانی مذہب کے متعلق مغالطہ کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ کیونکہ موجودہ صحف مقدسہ کی تدوین ان اشخاص کے ہاتھوں ہوئی ہے جن کا فکر قدیم فکر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ تاہم کوئے نن، ایڈمس، مارٹی، اور رابرٹسن سمتھ کی تحقیقات کی روشنی میں اگر ہم اسفار یہود کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مذہب یہود نے ارباب پرستی سے توحید پرستی کی طرف بتدریج ترقی کی ہے اور یہ کہ ابتدائی ارباب پرستی کی باقیات اب بھی صحف مقدسہ کے صفحات پر ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔

اسرائیلی مذہب مبنی اسلاف پرستی پر ہے: بیشتر علمائے سامیات یہ کہتے ہیں کہ اقوام سامیہ میں حقیقی اسلاف پرستی نہیں پائی جاتی۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت سامی رقبہ میں باقی دنیا سے بالکل مختلف واقع ہوئی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو یہ ماننا ناگزیر ہے کہ انسانی ذہن کے بنیادی اعمال ہر جگہ یکساں ہیں اختلافات صرف تبعی اور مکانی ہیں۔ اس کے علاوہ مین اور عسیر کے اثری اکتشافات سے بھی جو ناہبوہر، ڈونی، شدوف، تمیہ، ازد وغیرہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ خفتگان خاک سے ان کے ورثا دیوتاؤں کی طرح مخاطب اور مستدعی ہوتے تھے۔ بنابریں وہ "لاجرم خدائی یافتہ اشخاص اور خاندانی دیوتا ہیں"

قدیم مصریوں کے متعلق آج کل عام خیال یہ ہے کہ وہ نسلاً حامی تھے لیکن ہمارے ہی زمانہ کا ایک مشہور مؤرخ دلیری کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خود مصری اصلاً شاید سامی عرب تھے[1]۔ اگر یہ قول صحیح ہو تو سامیوں کی اسلاف پرستی کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں رہتی لیکن اگر اسے محلِ نظر مانا جائے تب بھی یہ مساوی طور پر یقینی ہے کہ اُمم سامیہ اسلاف پرست تھیں۔ یہودیوں کے گھریلو دیوتا یعنی Teraphim ایک وسیع انسیاتی نقطۂ نظر سے اسلاف کے بُت تھے۔ کوئے نن لکھتا ہے کہ "Teraphim چھوٹی بڑی شبیہیں تھیں۔ ان کو گھریلو دیوتاؤں کی حیثیت سے پُوجا جاتا تھا اور ان کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ خاندانی خوش حالی کا انحصار تمام تر انہی پر ہے" اور یہ کہ "ان کا استعمال بے حد عام تھا"۔ یعقوب جب اپنے ماموں لابان کے پاس سے اپنی بیویوں اور لونڈیوں اور اولاد کو لے کر بھاگ نکلتے ہیں تو ان کی چھوٹی بیوی راحیل چلتے وقت اپنے باپ کے Teraphim چُرا لیتی ہیں (تکوین ۳۱ : ۱۹) یہ حال جب باپ کو معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے گھریلو دیوتا واپس لینے کے لئے مفروروں کے پیچھے دوڑتا ہے اور بڑی دوڑ دھوپ کے بعد جب انہیں پکڑ لیتا ہے تو غضب ناک انداز میں یعقوب سے پُوچھتا ہے "تُو نے کیوں میرے دیوتا چُرائے"۔ (تکوین ۳۱ : ۳۰) یعقوب اس واقعہ سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اور اپنی اس لاعلمی کا اظہار اپنے خسر پر کر دیتے ہیں جس پر وہ خیموں کی تلاشی لیتا ہے۔ آخر میں جب باری راحیل کے خیمہ کی آتی ہے تو وہ بتوں کو اونٹ کے کجاوہ میں چھپا دیتی ہیں اور اس پر بیٹھ جاتی ہیں (تکوین ۳۱ : ۳۴) باپ ناکام رہتا ہے اور بیٹی کی چال چل جاتی ہے۔ لابان داماد سے معاہدہ کرنے کے بعد گھر لوٹ پڑتا ہے اور یعقوب بیویوں اور ساتھیوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ Teraphim پھینک دیں اور کپڑے بدل لیں۔ (تکوین ۳۵ : ۲ و ۴) سفر قضاۃ (۱۷) میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ میکاہ نامی ایک شخص کی ماں نے دو سو شیکل[2] چاندی سنار کو دی اور یہ کہا کہ وہ اس سے چند بت بنا دے۔ جب فرمائش کی تکمیل ہوگئی تو میکاہ نے ان بُتوں کو اپنے گھر کے ایک حصہ میں جگہ دی جو دیوتاؤں کے لئے مخصوص تھی۔ اس نے Teraphim بھی تیار کئے اور احبار جیسا ایک جُبّہ بھی بنایا۔ یہ اس کے ایک بیٹے کے لئے تھا جس کے سپرد گھریلو پروہتائی کی خدمت تھی (۴ و ۵) بعد میں (یعنی ۱۳، ۱۷، ۲۳، ۲۴، ۲۶ اور ۲۷ میں) یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح بنی دان نے ان Teraphim کو بتوں کو اور جُبّہ کو چرایا اور کس طرح میکاہ ان سے ان چیزوں کے لینے میں ناکام رہا۔ اس قصہ سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گھریلو دیوتاؤں کے لئے پروہت بھی مقرر کئے جاتے تھے اور یہ پروہت بیشتر خاندان ہی کے ارکان ہوتے تھے۔ Teraphim کی یہ پرستش یوشیہ کے عہد تک جاری رہی۔ شاؤل (قرآن کے طالوت) کی بیٹی میکال اپنے شوہر داؤد کے بستر پر جب کہ وہ گھر سے بھاگ نکلتے ہیں اپنا Teraphim لٹا دیتی ہیں (صموئیل اوّل ۱۹ : ۱۳) حوشیا نبی ان Teraphim کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "کاریگروں کی صنعت" (۱۳ : ۲) اور زکریا نبی انہیں ایسے بُت بتلاتے ہیں جو لوگوں سے جھوٹ بولتے ہیں (۱۰ : ۲) واضح رہے کہ انفرادی اور خاندانی فوز و فلاح کے لئے بتوں سے مشورہ کرنا دنیا

---

[1] مصر قدیم کی تاریخ از جی رالنسن۔ [2] ایک قدیم عبرانی وزن۔

بھر میں عام ہے متمدن اور غیر متمدن دونوں سماجوں میں اس قسم کے اعمال کی کثیر مثالیں ملتی ہیں۔ اتنی تفصیل سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ (۱) ہر گھر میں Teraphim ہوتے تھے (۲) اہلِ خاندان ان پر مختلف چڑھاوے چڑھاتے تھے اور (۳) گھریلو پروہت ان سے خاندانی امور میں رائے لیتے تھے بنابریں اگر ہم ان امور پر بقیہ دُنیا کے مماثل اعمال و شعائر کے ساتھ نظر ڈالیں تو یہ نتیجہ بلاخوف و خطر اخذ کر سکتے ہیں کہ اسرائیلی مذہب مبنی اسلاف پرستی پر ہے۔

گھریلو دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ سامیوں میں قبر پرستی بھی رائج تھی۔ رابرٹسن سمتھ لکھتا ہے کہ "اُمم سامیہ کا پورا شمالی علاقہ قبروں سے معمور تھا اور ایسی ہر قبر کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایک دیوتا اس میں رہتا ہے"۔ یہ اگر حقیقی اسلاف پرستی نہیں تو پھر کیا ہے"؛

بنی اسرائیل کی فیٹش پرستی۔ لیکن اسلاف پرستی مقدمہ ہے ارباب پرستی کا لہٰذا اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا اصنام بنی اسرائیل میں ملتے بھی ہیں یا نہیں ؛

سفر تکوین (۲۸) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ یعقوب اپنے بڑے بھائی عیس (یا عیسو جن کا عرف ادوم یعنی سرخ تھا) کے ڈر سے حران کی طرف بھاگ نکلتے ہیں راستہ میں رات کی وجہ سے بمقام لُوص انہیں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ صبح میں وہ بہت جلد نیند سے جاگ پڑتے ہیں کیونکہ ایک خواب اُنہوں نے دیکھا تھا۔ اور اس پتھر کو جس نے بالش کی خدمت انجام دی تھی وُہ کھڑا کر دیتے ہیں اور اس پر تیل ڈالتے ہیں اس کا نام بیت ایل (دیوتا کا گھر) رکھتے ہیں (آیات ۱۸، ۱۹) اور جائداد کا دسواں حصّہ اس پر نذر گزراننے کا عہد کرتے ہیں (آیت ۲۲) اسی طرح ماموں کے گھر سے جب یعقوب اہل و عیال کو لے کر فرار ہوجاتے ہیں اور غضب ناک سرداران کا تعاقب کرکے انہیں پکڑ لیتا ہے تو اُن کا آپس میں معاہدہ ہوتا ہے "اور یعقوب نے ایک پتھر لیا اور اسے بطور ستون کے کھڑا کر دیا پھر اپنے اخوان سے کہا پتھر جمع کرو اور اُنہوں نے پتھر جمع کئے یہاں تک کہ ایک ڈھیر سا لگ گیا تب سبھوں نے مل کر اس ڈھیر پر بیٹھ کر کھانا کھایا" (تکوین ۳۱: ۴۵، ۴۶)" اور لابان نے کہا اس ستون اور اس ڈھیر کو دیکھ . . . . یہ دونوں گواہ ہیں" (تکوین ۳۱: ۴۹، ۵۰) مزید براں سلم کے مقام پر بھی یعقوب ایک قربان گاہ یعنی ایک سنگی ستون کھڑا کرتے ہیں اور اس کا نام رکھتے ہیں ایل الوہے اسرائیل (تکوین ۳۳: ۲۰) سفر یوشع (۴: ۲ و ۳) میں لکھا ہے کہ "جملہ اسباط میں سے ایک ایک آدمی ایسے کل بارہ آدمی چُن اور انہیں یہ کہہ کہ دریائے اردن میں سے . . . . بارہ پتھر چنیں اور تو ان پتھروں کو لے اور انہیں اس مقام پر نصب کر جہاں تو آج شام میں قیام کرے گا"۔ ان پتھروں کو بنی اسرائیل نے کھڑی حالت میں ایک مقام پر نصب کیا اور اس کا نام رکھا جل جل (۴: ۲۰) اس کے ماسوا جب یوشع کا آخری وقت آپہنچتا ہے تو وہ ایک بڑا سا پتھر لیتے ہیں اور اسے بلوط کے ایک درخت کے نیچے جو "خداوند کی عبادت گاہ" کے پاس تھا گاڑ دیتے ہیں۔ (۲۴: ۲۶) علیٰ ہذا القیاس سفر صموئیل اوّل (۷: ۱۲) میں مرقوم ہے کہ "تب صموئیل نے ایک پتھر لیا

---

[1] یہ ایک نہایت اہم چیز ہے تفصیل آگے آتی ہے۔

اور ا سے مصفہ اور سیم کے درمیان نصب کیا اور اس کا نام رکھا ابن عزر "ابن عزر" اب ثالوم کا ستون، بیت شمس کا بڑا پتھر، جبعون کا بڑا پتھر اور طوملیث بھی اسی قسم کے مقدس پتھر ہیں۔ ان تمام پتھروں کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ وہ جداگانہ بت اور سنگِ مزار ہیں جب یہواہ کی پرستش بنی اسرائیل میں لازمی قرار پائی تو اس کے پجاریوں نے ہر مقدس پتھر کو مرسلین کے کسی نہ کسی قصہ سے نتھی کر کے اس میں یہواہ ئی رنگ بھر دیا۔ یوں لوض کا بیت ایل یہواہ کی نمود کا یادگاری پتھر ٹھہرایا۔ جلیہ کا پتھر معاہدہ کی علامت مقرر ہوا، جل جل کے بارہ پتھروں کے متعلق کہا گیا کہ وہ یادگار ہیں اس بات کی کہ "دریائے اردن کا پانی خداوند کے تابوت سکینہ کے سامنے پھٹ گیا" (یشوع ۴: ۷) اور ابن عزر کی توجیہہ یہ کی گئی کہ "اب تک خدا نے ہماری مدد کی"۔ (صموئیل اول ۷: ۱۲) حالانکہ بیت ایل کے نام سے خود ظاہر ہے کہ اسے کسی دیوتا یا بھوت کا مسکن سمجھا جاتا تھا[1] اور جل جل کے بارہ پتھروں کو خود اسفارِ یہود میں بعض اوقات "مورتیوں" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے[2] اور ابن عزر۔ ابن عزر کے معنی ہیں "مدد دینے والا پتھر" غالباً اسے جنگ وجدل سے پہلے فتح وکامرانی کے لئے پوجا جاتا تھا۔ اسی طرح طوملیث "سنگِ مار" سے عبارت تھا۔ بہت ممکن ہے مار پرستی سے اسے تعلق ہو یعنی سانپ وغیرہ اس پر کندہ ہو جیسا کہ ہندوستان میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔

بنا بریں ان پتھروں کے متعلق ان کے یہوائی پلستر کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ وہ فیٹش یا بت تھے یعنی اجتماعی پرستش کی اشیاء۔ یعقوب جب بال بچوں سمیت سسرال سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور بیت ایل پہنچتے ہیں تو وہاں کے سنگی ستون پر تیل اور مشروبات انڈیلتے ہیں (تکوین ۳۵: ۱۴) صموئیل ہر سال بیت ایل، جل جل اور مصفہ جاتے اور احکام سناتے ہیں (صموئیل اول ۷: ۱۶) شاؤل اپنے باپ کے گم شدہ گدھوں کو جب ڈھونڈنے نکلتے ہیں (صموئیل اول ۹: ۳) اور صموئیل کے پاس جاتے ہیں (۹: ۱۷) تو موضر الذکر انہیں طابور کے میدان میں جانے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ ان تین آدمیوں سے ملیں جو بیت ایل جا رہے تھے "خدا کے پاس" اور جن میں سے ایک کے نزدیک تین مینے تھے دوسرے کے نزدیک تین روٹیاں تھیں اور تیسرے کے نزدیک شراب کی ایک بوتل تھی (۱۰: ۳) ظاہر ہے کہ یہ جماعت پوجا کے لئے جا رہی تھی، پھر "خدا کے پاس" کا جملہ بھی نہایت پُر معنی ہے

---

[1] پروفیسر چے نی لکھتے ہیں کہ "لمبے چکنے پتھر قدیم سامی ملل کے بت تھے، وہ ان پر تیل ڈال کر ان کی پوجا کرتے تھے اور یہ ایک عام رسم تھی۔ یعقوب نے ایک ایسے ہی پتھر کو اپنا سرہانہ بنایا اور بعد میں اس پر تیل ڈال کر اسے تقدس عطا کیا تھا۔ قدیم سامی اقوام اور بت پرست بنی اسرائیل ایسے پتھروں کو بیت الایل... یعنی ایل کے گھر کہتے تھے ... لیکن یہواہ پرست کی اس کوشش کے باوجود کہ وہ ان تمام فیٹشوں کو انبیاء کی تاریخ سے ملا دے ان کا قدیم استعمال بدستور جاری رہا۔ خاصکر ایسے مقامات میں جو ذرا الگ تھلگ تھے"۔ ایل ایک قدیم سامی لفظ ہے اور اس کا ترجمہ قدیم مفہوم کے اعتبار سے دیوتا ہونا چاہئے نہ کہ خدا جیسا کہ آج کل رواج ہے۔

[2] اور یہ تعبیر اہم اس لئے ہے کہ یہ پتھر ندیوں میں سے چنے گئے تھے اور ندی میں کے پتھروں کو عام طور پر پوجا جاتا ہے۔

کیونکہ وہ صرف یہواہ کا مفہوم ادا نہیں کرتا بلکہ بہت وسیع المعنی واقع ہُوا ہے۔ اس کے بعد شاؤل یوشع کے بارہ پتھروں کے پاس جاتے ہیں (۱۰ : ۸) علاوہ بر آں جب عمرانیوں پر شاؤل کو فتح نصیب ہوتی ہے تو شاہی کی تجدید کے لئے جُملہ اسباط جِل جَل کے مقام پر بلائے جاتے ہیں (۱۱ : ۱۴) یہ اقتباسات اور حوالہ جات مقدس پتھروں کی پوجا کی ایجابی شہادتیں ہیں۔ بہرحال بنی اسرائیل کی فیٹش پرستی ایک مبرہن حقیقت ہے اشعیا (۵۷ : ۶) عہدِ گزشتہ کے بُت پرست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص پُرشکوہ لہجہ میں کہتے ہیں "ندی کے چکنے پتھر تیری قسمت میں ہیں تو ہی ان پر پینے کی چیزیں انڈیلتا ہے اور تو ہی ان پر گوشت کی نذریں چڑھاتا ہے"۔ اسی طرح ارمیا کہتے ہیں "کہاں ہیں تیرے دیوتا جنہیں تُو نے خود بنایا" (۲ : ۲۸) اب ذرا شمالی عرب کی طرف چلیئے۔ بنو اسماعیل کے متعلق سید سلیمان ندوی بحوالہ سیرۃ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ "جو پتھر اچھا سا چکنا پڑا مل جاتا اسی کو اُٹھا لیتے اور اپنے گھر کا دیوتا بنا لیتے"۔ پھر "عربوں کی جہالت کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلتے چلتے جو اچھا سا پتھر بھی ان کو مل جاتا اس کو دیوتا بنا لیتے تھے۔ اگر کبھی اس سے اچھا پتھر مل گیا تو پہلے کو چھوڑ کر اس کے آگے سر جُھکا دیتے تھے اگر بدقسمتی سے کوئی پتھر ہاتھ نہ آتا تو مٹی کا گول ہنڈا بنا کر بکری کا دُودھ اس پر ڈالتے تھے اور پھر وُہ دیوتا بن جاتا تھا"۔ یوں بھی بنی اسرائیل کا فیٹش پرست ہونا ضروری ہے کیونکہ بقول ہومل کے "شمالی عرب میں مکہ سے پیٹرا بلکہ اس سے آگے صحرائے شام تک ایک ہی تخیل ... پھیلا ہُوا تھا"۔ اب جو سید صاحب موصوف نے اچھے سے چکنے سے گول پتھر کی پوجا کو "عربوں کی جہالت" سے تعبیر کیا ہے اور جو ہومل نے اُممِ سامیہ کے صرف ایک حصہ کے تخیل اور عمل کی وحدت پر زور دیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو میں بوجوہِ شائستہ غلط سمجھتا ہوں کیونکہ مذہبی شعور کے ارتقاء کے دوران میں ایک مرحلہ فیٹش پرستی کا بھی آتا ہے۔ ٹرنر جزائر سالون کے متعلق لکھتا ہے کہ "چکنے پتھروں کو جو غالباً ندیوں میں سے چُنے جاتے ہوں گے دیوتاؤں کا قائم مقام خیال کیا جاتا ہے اور جہاں کوئی پتھر چکنا ہوتا ہے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی دیوتا وہاں ہے ضرور"۔ ٹائیلر کہتا ہے کہ "ناروے کے کہستانی علاقہ میں گذشتہ صدی کے اختتام تک کسان لوگ گول پتھروں کی حفاظت کرتے تھے۔ ان کو ہر جمعرات کے دن شام میں دھوتے تھے ..... ان پر آگ کے سامنے مکھن ملتے تھے ان کو تازہ بھوسی پر بٹھاتے تھے اور سال میں چند مرتبہ انہیں شراب سے نہلاتے تھے مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے سیوکوں کے گھرانوں کو برکت اور آسائش دیں"۔ اور ہندوستان میں تو ہم اس قسم کے اعمال کو روزمرہ اپنے چاروں طرف انجام پاتے ہوئے دیکھتے ہیں یہ سب نرے اتفاق سے زیادہ اور کچھ ہے اور اسی لئے بنی اسرائیل کی فیٹش پرستی ایک بالکل واضح صداقت ہے[1]۔

---

[1] پتھروں کے ماسوا بنی اسرائیل میں لکڑی کے کندوں اور درختوں کی پرستش بھی عام تھی۔ ہوشیا (۴ : ۱۲) کہتے ہیں "میرے ہم قوم اپنے کندوں (لکڑی کے) سے مشورہ کرتے ہیں اور وُہ انہیں جواب دیتے ہیں" اور تثنیہ کا ایک حکم یہ ہے کہ "تجھے چاہئے کہ یہواہ کی قربان گاہ کے پاس کسی قسم کی لکڑی کا اشیرا نصب نہ کرے"۔ یہ امتناعی حکم کسی رواج کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ مخالفت بے معنی ہو جاتی ہے، اب یہ دیکھئے کہ یہ اشیرا خود کیا تھا۔ روبرٹسن سمتھ لکھتا ہے کہ وہ ایک "مقدس رمز" اور "دیوتا کا مسکن" تھا ــــ یعنی مدفن کی چوبی علامت۔ لکڑی کا ایسا ستون ہر قربان گاہ کے پاس ہوتا تھا۔ خود یہواہ کی

فیٹش انسانوں کے نمائندے تھے۔ اب میں اگر یہ کہوں کہ جملہ فیٹشوں کو نشانات قبر سے گہرا تعلق ہے تو باور کرنا چاہیئے کہ میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا اس دعویٰ کی تائید اسفارِ یہود سے ہوتی ہے یا نہیں؟ اور میرا جواب ایک بڑے اثبات کی صورت میں ہے۔ راحیل جب بنیامین کی ولادت کے بعد مرجاتی ہیں تو یعقوب ایک ستون (ایک بڑا کھڑا پتھر کھئیے) ان کی قبر پر نصب کرتے ہیں (تکوین ۳۵: ۲۰) غالباً وبورہ کی تدفین بھی "بیت ایل کے نیچے بلوط کے درخت کے تلے" (تکوین ۳۵: ۸) اسی طرح عمل میں آئی۔ حوالہ کی عبارت نہایت معنی خیز ہے کیونکہ اس کا مطلب صریحاً یہ ہے کہ مرنے والی کو مقدس درخت کے سایہ میں دفنایا گیا اور اس کے مدفن پر ایک پتھر نصب کیا گیا۔ پتھر اور درخت عالمگیر پرستش کی دو اہم چیزیں ہیں جو ہمیں یکجا ملتی ہیں۔ درخت کا تقدس تو ناقابلِ انکار ہے البتہ پتھر کے متعلق شبہات ناشی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیت ایل سے شہر کیوں نہ مراد لیا جائے، جبکہ وہ بڑے حرف سے لکھا بھی گیا ہے مگر میرا خیال ہے کہ واقعہ کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ اسفارِ یہود کے یہواہ پرست مرتب نے (Beth - el) کو (Bethel) بنا کر اسے یعقوب کے قصہ سے متعلق کرنا چاہا ہے۔ اس قیاس کی تائید میں پروفیسر چے نی کے اقتباس کو پھر سے پڑھیئے "لمبے چکنے پتھر قدیم سامی اقوام کے بت تھے . . . . . . اور (وہ) . . . . . ایسے پتھروں کو بیتِ ایل (Beth-el) کہتے تھے"۔ آخر میں ابشالوم کے ستون (صموئیل دوم ۱۸: ۴۸) کو لیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نوعیت بالکل یہی ہے اور پھر اس کا "مقام ابشالوم" کہلانا خود اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل ہے اب ان قبری آثار کی پرستش پر غور کیجئے اس عمل کی سب سے زیادہ واضح مثال صموئیل اول (۱۰: ۲) میں ملتی ہے صموئیل شاؤل کو راحیل کی قبر پر بھیجتے ہیں جہاں دو آدمی پہلے سے موجود ہوتے ہیں غالباً وہ بھی پرستش ہی کے لئے آئے ہوں گے۔ عرب کے مشہور بت لات اور منات بھی علی الترتیب گول سپید پتھر اور چٹان کی شکل میں تھے۔ ان کے متعلق صحیح بخاری میں عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ "عرب کے مشہور بُت لات، ودّ، یغوث وغیرہ پہلے زمانہ

بسلسلہ صفحہ گذشتہ:۔ قربانگاہیں اس اُصول سے معرا یا مستثنیٰ نہ تھیں (رابرٹسن سمتھ) قدیم عبرانیوں کی قربان گاہیں معمولاً "ہرے درختوں کے نیچے" ہوتی تھیں۔ وہ دیوتاؤں کو ہرے درختوں کے نیچے پوجتے تھے اسرائیلی صحفِ مقدس میں اس رواج کی بکثرت نظیریں ملتی ہیں موجودہ نابلوس کے قریب بلوط کا ایک درخت تھا اور اس کے نیچے ایک پتھر تھا جسے کبھی تو ابراہیم کی قربان گاہ کہا گیا کبھی اسحاق کی قربان گاہ اور کبھی یوشع کی یادگار۔ حبرون (الخلیل) کے پاس ایک اور درخت تھا بلوط کا جس کے نیچے ایک مقدس پتھر تھا، یہ پتھر ابراہیم کی قربان گاہ کہلاتا تھا اور اس پر داؤد کے زمانہ تک مذہبی رسمیں ادا ہوتی تھیں۔ بیرشبع کے نزدیک اثل کا ایک مقدس درخت تھا اور اس کے نیچے ایک پتھر تھا اسحاق سے منسوب۔ پتھر اور درخت کے اس تلازم اور ان کی اصلیت پر غور کرتے وقت ہمیں ہندوستان کی متناظر مثالوں کو نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہیئے پھر ہمیں وبورہ کی تدفین کے واقعہ (تکوین ۳۵: ۸) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے جسے میں آئندہ موقع و محل سے بیان کروں گا اور اس سلسلہ میں یہ بتلانا نامناسب نہیں کہ بلوط فلسطین میں مقدس تھا ارزہ اور صنوبر لبنان میں اثل شام میں اور اقاقیا اور نخل عرب میں ان مقدس درختوں کو بحیثیت ارباب کے پوجا جاتا تھا (رابرٹسن سمتھ) عرب کی مشہور دیوی عُزّیٰ ببول کے ایک درخت میں سمائی ہوئی تھی۔

کے بزرگوں کے نام ہیں بعد میں اہلِ عرب ان کی مُورتیں بنا کر پُوجنے لگے"۔ ایک اور صاحب ابن خلدون، ابنِ اثیر، طبری، اور صحاح ستّہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "وُدّ اور یغوث اور یعوق اور نسر ایامِ جاہلیت کے مشہور لوگوں میں سے ہیں جن کی تصویریں پتھروں پر منقوش کر کے بطورِ یادگار کعبہ کے اندر رکھ دی تھی۔ ایک مدت کے بعد ان کو رتبۂ معبودیت دے کر ان کی پرستش کرنے لگے"۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ قرآن نے اعراف کی اس آیت میں اسی اسلاف پرستی کی طرف اشارہ کیا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ اور اس کا ترجمہ اُنھوں نے کیا ہے "خدا کے سوا اور جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح مخلوق ہیں"۔ لیکن مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ ہے "واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں" اور میرا خیال ہے کہ یہ ترجمہ زیادہ صحیح ہے یوں جن بتوں کو لات اور منات کے نام سے پُوجا جاتا تھا وُہ ضرور ہے کہ لات اور منات نام کے اشخاص کی قبروں کے نشانات ہوں اور جب عرب مستعربہ کا حال یہ ہو تو بنی اسرائیل میں جو ان کے بنی اعمام تھے ایسے اعمال کا مروّج ہونا کیوں تعجب انگیز امر ہے لیکن ہر پُجنے والا فیٹش لازمًا نشانِ مزار نہیں جب بھُوت کے تصوّر میں کافی بلندی آگئی تو یہ یقین کرنا مستبعد نہ رہا کہ وہ ہر نرالی یا نمایاں شے میں سما سکتا ہے لہٰذا اہم چیز وہ ائتلاف ہے جو انسانی ذہن نے اسلاف کی ارواح اور سنگی یا چوبی فیٹشوں کے درمیان قائم کیا، سفر ارمیا (۲ : ۲۶ و ۲۷) میں اس خیال کی ایک بڑی دلچسپ مثال ملتی ہے " اسرائیل کا گھرانہ اس کے بادشاہ اس کے حکام اس کے پجاری اور اس کے انبیاء لکڑی کے کندہ سے یہ کہتے ہیں کہ تُو میرا باپ ہے اور پتھر سے یہ کہ تو نے مجھے جنا"۔ ٹائیلر کی کتاب سے اس قبیل کی ایک اور مثال نقل کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے کہ " امریکہ کی ڈاکوٹا قوم ایک گول پتھر چُنتی ہے اس کو رنگتی ہے اس کو دردرکہہ کر پکارتی ہے اس پر پیرھاوے چڑھاتی ہے اور اس سے التجا کرتی ہے کہ وہ انہیں خطرہ سے بچائے"۔

اسرائیلی ارباب کا تعدّد۔ آیئے اس پس منظر میں بنی اسرائیل کی بُت پرستی کی چند مزید اور وسیع شہادتوں پر غور کریں خروج (۲۲ : ۲۸) میں موسےٰ حکم دیتے ہیں کہ " دیوتاؤں کو بُرا بھلا مت کہہ اور نہ اپنے حاکم کو بد دُعا دے"۔ سفر یوشع (۲۴ : ۲۳) میں لکھا ہے کہ " یوشع نے کہا پھینک دو غیر معبودوں کو جو تم میں ہیں اور اپنا دِل خدائے اسرائیل کی طرف رجوع کرو"۔ ارمیا کہتے ہیں (۲ : ۲۸) " اے ارض الیہود! جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے دیوتا ہیں"۔ اور " تب ارض الیہود کے حماۃ شہر اور یروشلم کے تمام باشندے جائیں گے (عبادت گاہوں میں) اور پکاریں گے ان دیوتاؤں کو جن پر وہ عود و بخور جلاتے ہیں لیکن وہ مصیبت کے وقت میں ان کے کام نہیں آئیں گے" (۱۱ : ۱۲) " کیونکہ اے ارض الیہود! جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے دیوتا تھے" (۱۱ : ۱۳) ہوشیا (۴ : ۱۳) بنی اسرائیل کو ان کی بُت پرستی کی وجہ سے ایسی عورت سے تشبیہ دیتے ہیں جو باوجود ایک شخص کی محبوبہ ہونے کے اغیار سے دِل لگانے سے نہیں چُوکتی۔ عموص آلِ یعقوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں " اور وہ ان کپڑوں پر جو ہر قربان گاہ کے پاس عہد و پیمان کے لئے بچھے ہوتے ہیں (اوندھے مُنہ) لمبے لمبے لیٹ جاتے ہیں" (۲ : ۸) اور ناحوم اسی قوم کے فرد سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ " میں تیرے

دیوتاؤں کے گھر میں کے ہر بُت کو توڑ دوں گا" (۱ : ۱۴) مزید براں" افرائیم کی سیاہ کاری" اور "سامریہ کی بداعمالی" کے تذکروں سے صحفِ یہود کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

یہ چند شہادتیں رجن پر اور چند کا اضافہ ممکن تھا اگر خوفِ طوالت دامنگیر نہ ہوتا) ایجابی ہیں اور نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں چند سلبی شہادتوں پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ تثنیہ (۱۶ : ۲۲) میں مرقوم ہے کہ" اور نہ تجھے کوئی ایسی مورت گھڑنی چاہئے جس سے خداوند خدا نفرت کرتا ہے" ہوشیا کہتے ہیں کہ ہم اب" چاندی اور سونے کے اصنام" (۸ : ۴) سے یعنی" . . . . اپنے ہاتھ کی صنعت سے یہ نہیں کہینگے کہ تم ہمارے دیوتا ہو" (۱۴ : ۳) اور تثنیہ (۴ : ۱۶ تا ۱۹) میں نہایت سختی اور صراحت کے ساتھ محکوم ہے کہ کسی قسم کے دیوتاؤں اور سماوی جرموں کو نہ پُوجا جائے۔ ان سلبی شہادتوں کے متعلق ایک بات جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہاں پر پھر دُہرائے دیتا ہوں اور وہ یہ کہ ممانعت سدا کسی موجودہ عمل یا رواج کی ہوتی ہے کسی آئندہ یا احتمالی عمل یا رواج کی نہیں ہُوا کرتی۔ بنی اسرائیل کی یہ بُت پرستی ان کے قومی ذہنی بروز کا ایک ناگزیر لمحہ ہونے کے علاوہ ان کا ایک نسلی ورثہ بھی تھی۔ سفرِ یوشع میں مذکور ہے (۲۴ : ۲) کہ" تمہارے اسلاف یعنی ابراہیم کے باپ دادا قدیم زمانہ میں نہر (فرات) کے اُدھر رہتے تھے اور دُوسرے دیوتاؤں کو پُوجتے تھے"[1]۔

اور ان کی تفصیل ۔ لیکن دیوتاؤں کی اس متیقن کثرت کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے اسماء اور افعال کیا تھے کیونکہ ان کے بارے میں ہماری معلومات کا واحد منبع اسفارِ یہود ہیں اور ان اسفار کا حال یہ ہے کہ ان کے یہواہ پرست مرتبوں نے ان میں یہواہ کے سوا باقی تمام دیوتاؤں کی نشانیوں کو مٹانے اور ان کی جُملہ متمائز اور مخصوص صفات کو یہواہ میں منتقل اور جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ بریں ہم چند مٹے مٹے نقوش پر سے اسرائیلی بین تھی ان کا ایک دھندلا سا خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہمارے علمائے سامیات اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

تورات، کتبیم، نبییم اور یہود کی دوسری مقدس کتابوں میں دو دیوتاؤں کا بار بار تذکرہ ہُوا ہے (۱) بعل اور (۲) مولک یا مولوک اور اسی لئے ہمارے بہت سے علماء ان کو مفرد اور مستقل دیوتا شمار کرتے ہیں۔

مگر یہ خیال اُن کا غلط ہے۔

پہلے بعل کو لیجئے، یہ لفظ جملہ سامی السنہ میں پایا جاتا ہے اور اسی بنا پر عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاید وہ کوئی نہایت مقبول دیوتا تھا لیکن یہ ایک نہایت عالمانہ گمراہی ہے۔ بعل بذاتہ کوئی دیوتا نہیں تھا۔ وُہ تو کوئی اسم ذات بھی نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے ہم ایک اسم صفت کہہ سکتے ہیں جس کے لغوی معنی جملہ سامی زبانوں میں خداوند، مالک، اور آقا کے ہوتے ہیں[2]۔ اب اسے آپ احترام آمیز

---

[1] یعقوب کی اولاد بدستور دیوتاؤں اور اجرامِ سماوی کو بھی پوجتی تھی۔ لیکن یہ اس وقت کی باتیں ہیں جبکہ اُن کے سیاسی تعلقات اشور اور بابل کے ساتھ قائم ہوئے۔

[2] کلدانی اسی لئے اپنے مردوک در انلیل کو تعظیماً بیل مردوک اور بیل انلیل کہتے تھے اور اس سے خود ظاہر ہے کہ سامی اذہان میں بعل کی حیثیت کیا تھی۔ واضح رہے کہ بیل بعل کی ایک شکل ہے۔

خوف کہئے یا قومی خصوصیت بہرحال یہ ایک واقعہ ہے اور ناقابلِ انکار کہ بنی اسرائیل کبھی اپنے دیوتاؤں کے نام زبان پر نہیں لاتے تھے خود ان کے قومی "غیور" دیوتا کا نام اسفارِ یہود میں گنتی کی چند بار سے زیادہ کہیں مذکور نہیں۔ تثنیہ میں صاف لکھا ہے کہ "خداوند خدا کا نام عبث زبان پر مت لا کیونکہ جو شخص خداوند کا نام بے فائدہ زبان پر لاتا ہے اسے خداوند کبھی معاف نہیں کرتا" (۵: ۱۱) لیکن غلطی ہو گی اگر ہم اس حکم کو صرف یہواہ سے متعلق سمجھیں کیونکہ وہ تو اسرائیلی ذہنیت کو مثالی طور پر ہم پر منکشوف کرتا ہے۔ لہٰذا جہاں صورتِ حال یہ ہو وہاں ضرور ہے کہ عوام اور خواص دیوتاؤں کے تذکرہ کا کوئی اور طریقہ ایجاد کریں۔ "خداوند خدا یا صرف "خداوند" کہہ کر یہواہ مراد لینے کی مثالیں تورات وغیرہ کے ہر صفحہ پر بڑی تعداد میں بکھری پڑی ہیں "بعل" کے استعمال کی تقریب یہی ہے یوں جبل حرمون کے بعل اور جبل لبنان کے بعل سے مراد وہ دیوتا ہیں جو ان مقامات پر پُجتے تھے۔ بعل بریشاہ، بعل فغور، اور بعل صبوب چند مزید بعل ہیں جو ہمارے لئے تورات میں محفوظ ہیں۔ یہ تینوں مقامی دیوتا تھے اور بعض بعلوں کے نام مقامات کی صُورت میں ہم تک پہنچے ہیں، مثلاً بعل تمر، بعل معون، بعل جاد، بعل صفون، بعل فراصیم وغیرہ، پہلی آبادی وُہ ہے جہاں بعل تمر کی پرستش ہوتی تھی غالباً کھجور کے درخت تلے کوئی سنگی ستون یا چوبی کھمبا مرجع ہر خاص و عام تھا۔ اور موقع کی رعایت سے بعلِ تمر کہلاتا تھا، اسی پر سے بقیہ کو قیاس کرنا چاہئے۔ بہرحال ہر آبادی اور ہر مقام کا ایک دیوتا تھا اور وہ یا تو اس آبادی یا مقام کا بعل کہلاتا تھا یا پھر اس جگہ کا بعل جہاں اسے پُوجا جاتا تھا، بہ الفاظِ دیگر یہ کہ سامی رقبہ کا ہر ایک خدائی یافتہ سردار ایک بعل تھا۔ لہٰذا بعل کوئی ایک دیوتا نہیں بلکہ ہر ایک مقامی دیوتا ایک بعل تھا: مع کسی ایک لاحقہ کے، اور وہ اصل میں وہی کھڑا پتھر یا لکڑی کا کُندہ تھا۔ جسے لوگ مقامی طور پر مجموعاً پُوجتے تھے۔ اس استاج کی بداہت واضح خود اسفارِ یہود کے مطالعہ سے ہوتی ہے جن کے صفحات بعلوں کی پرستش کے شکوؤں سے بھرے پڑے ہیں[1]۔ مثالاً سفرِ ارمیا سے ایک عبارت نقل کرتا ہوں، نبی موصوف آلِ یعقوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "بلکہ اُنہوں نے دل میں جو آیا سو کیا اور بعلوں کو پوجا اور یہ سبق انہیں ان کے اسلاف نے سکھایا ہے" (۹: ۱۴) یوں بنی اسرائیل میں بے شمار مقامی دیوتا تھے جیسا کہ دُنیا میں ہر جگہ ہوتا آیا ہے اور وُہ آبادی یا موقع و محل کی مناسبت سے بعل فلاں یا بعل فلاں کہلاتے تھے تو پھر وہ کون بعل ہے جس کا ذکر غیر متعین طور پر یہود کی مقدس کتابوں میں جابجا[2] اور قرآن میں ایک جگہ ہُوا ہے[3]۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی مقامی بعل ہوگا جو پہلے تو یہواہ کا حلیف تھا مگر بعد میں حریف ــــ ایک ناکام حریف ــــ بنا۔ اور اس قسم کی مثالیں تو ہمارے ہاں کمیاب یا مفقود نہیں جب کہ ہم ایک عام لفظ کو خاص معنوں میں استعمال کر جاتے ہیں مثلاً آنحضرت یا شارع

---

[1] ملاحظہ ہو قضاۃ ۲: ۱۱، ۸: ۳۳۔ صموئیل اول ۱۲: ۱۰۔ ارمیا ۲: ۲۳ وغیرہ وغیرہ

[2] قضاۃ ۲: ۳۳۔ تکوین دوم ۱: ۲۔ ارمیا ۱۱: ۱۳، ۱۹: ۵۔ ۲۳: ۱۳: ۳۲: ۳۵ وغیرہ وغیرہ

[3] اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ سورۂ صافات ؎

کہہ کر توحید کا فرزندِ جلیل مراد لیتے ہیں، بڑے پیر کہہ کر عبدالقادر جیلانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، خواجہ کے لفظ سے اجمیر کے مشہور بزرگ کا مفہوم اخذ کرتے ہیں اور مہاتما کا مصداق گاندھی جی کو جانتے ہیں۔

بعل کی طرح مولک بھی کوئی خاص اور مستقل دیوتا نہیں بلکہ ایک لقب[1] تھا جس سے مختلف اور متعدد دیوتاؤں کو یاد کیا گیا۔ ملوک اوّل ۱۱: ۷ میں مولک کو عمونیوں کا دیوتا ظاہر کہا گیا ہے لیکن اسی سفر اور اسی باب کی آیات ۵ اور ۳۳ میں اور ملوک دوم ۲۳: ۱۳ میں عمونیوں کے دیوتا کا نام ملکم بتایا گیا ہے۔ یہ اگر کوئی لفظی تحریف نہیں تو مولک بلاشبہ ملکم کی بجائے بطور صفت کے استعمال ہوا ہے۔ ارمیا بنی اسرائیل کے متعلق کہتے ہیں "اور انہوں نے وادیٔ بنی ہنام میں بعل کی پرستش گاہیں تعمیر کیں تاکہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو مولک کی خاطر آگ میں جلائیں" (۳۲: ۳۵) اور پھر یہ کہ "انہوں نے بعل کی پرستش گاہیں تیار کیں تاکہ اس کے لئے اپنے بچوں کو آگ میں جلائیں" (۱۹: ۵) یہاں پر بعل اور مولک کی وحدت بالکل واضح ہے، سید سلیمان ندوی غالباً اسی لئے کہتے ہیں کہ "مولک اور بعل تو قطعاً ایک ہیں"[2] اب ذرا سفرِ احبار (۲۰: ۳) کا مطالعہ کیجئے "یہواہ کہتا ہے" اور میں اس آدمی کے خلاف ہو جاؤں گا اور اس کے بھائی بندوں سے اسے توڑ دوں گا کیونکہ اس نے مولک پر اپنی اولاد کی قربانی چڑھائی اور یوں میرے معبد کو ناپاک اور میرے مقدس نام کو ذلیل کیا"

طوفت یا چتا کے معبدِ یہواہ سے قریب ہونے کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ وہ خاص مولک جس پر یہود قیدِ بابل سے پہلے اپنے بچوں کو قربان کرتے تھے کہیں خود یہواہ نہ ہو، رابرٹسن سمتھ کا خیال یہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بچوں کو آگ میں جلانے کی خون آشام رسمیں یہود کے قومی دیوتا کی پرستش کا ایک جزو تھیں۔ بہرحال تیقّن کے ساتھ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ان گنت مقامی دیوتا تھے اور وہ ایسے سیدھے کھڑے پتھر تھے جو لکڑی کے کھمبوں کے بازو ہرے درختوں کے نیچے پجتے تھے۔ اس قیاس سے اس نتیجہ کی اصابت واضح ہو جاتی ہے جب ہم بقایائے آلِ ابراہیم کو لات، منات، عزّیٰ، ہبل، قیش، عمی ند، ذوالشّریٰ، یغوث، یعوق، نسر، ودّ، نکرہ، سواع، سعد، اساف، نائلہ، ذوالکفین، باجر، جبّار، مناف، روال، خریش، اقیصر، عائم، ذوالکعبات، محرق، یالیل، ذوالخلصہ، سعیر، فراص، کعد، جبہ، جریش، شارق، عوف، بجد، دوار، عبعب وغیرہ جیسے مختلف الاسماء اور غالباً مختلف الاشکال ارباب کو پوجتے دیکھتے ہیں۔

علاوہ ان بے شمار اور گمنام دیوتاؤں کے چند اور دیوتاؤں کے وجود کا بعض محققین نے بنی اسرائیل میں سراغ لگایا ہے ان میں سرِ فہرست بیسرات کا نام ہے جو ایک دیوی تھی اس کی مورتیوں کو حزقیاہ اور یوشیاہ نے تباہ کیا (ملوک دوم ۱۸: ۴ و ۲۳: ۶) دوسرا نمبر گوسالہ (خروج ۳۲: ۱ و ۴ اور ملوک اوّل ۱۲: ۲۹) کا ہے لیکن غلطی ہوگی اگر ہم اسے یہواہ سے علیحدہ کوئی دیوتا سمجھیں

---

[1] لغوی معنی شاہ یا مالک کے ہیں۔

[2] یہ تفصیل ارض القرآن کی جلد دوم سے ماخوذ ہے۔

کیونکہ اسفارِ یہود کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ گوسالہ پرست خود کو یہواہ پرست سمجھتے تھے اور آج بہت سے فضلائے سامیات کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ کوئے نن جو اس جماعت کا قائد و سالار ہے بالاعلان یہ کہتا ہے کہ گوسالہ کی پرستش عین یہواہ کی پرستش تھی۔ یہی طرح "برنجی سانپ" (اعداد ۲۱: ۹) بھی جو بطریق استہزا "نخوشتن" (پارۂ برنج ملوک اول ۱۸: ۴) کہلایا۔ اصل میں کوئی دیوتا نہ تھا بلکہ وہ خود یہواہ تھا ایک اور شکل یا لباس میں۔ آخر میں ستارہ پرستی کا ذکر ضروری ہے جو میرا خیال ہے کہ ارضِ بابل کی برآمد اور قطعاً ایک بعد کی چیز ہے۔ چاند، سورج، سیارات اور منازل کی پرستش پورے یہودی رقبہ میں بہت دنوں تک بڑے زور و شور سے ہوتی رہی۔

یہ ہے بنی اسرائیل کا وہ پینتھی اِن جس کا ایک رُکن یہواہ تھا۔ قدیم الایام سے لے کر آٹھویں صدی ق م کے پہلے تک یہواہ ان تمام دیوتاؤں کے ساتھ سجتا رہا۔ اس طویل زمانہ کے نسبتہً آخری حصّہ میں اسے مختلف عوامل کے تحت دوسرے دیوتاؤں میں وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو کہ مصر کے پینتھی اِن میں اوسیریز کو، یونان کے پینتھی اِن میں زیوس کو اور روم کے پینتھی اِن میں جوپیٹر کو حاصل تھی۔ لیکن اس کے بعد کے زمانہ میں اس نے اپنے کم رتبہ ساتھیوں یا حریفوں کو بڑی بیدردی سے کچلا اور نگلا اور یوں آخر میں پوری یہودی دُنیا کا خدائے لاشریک بن گیا۔ آیئے یہود کے اس بڑے قومی دیوتا کے ارتقاء پر ایک تفصیلی نظر ڈالیں۔

یہواہ اصل میں افزائشِ نسل و فصل کا دیوتا تھا۔ لیکن اسفارِ یہود میں یہواہ کا ایک نہایت تکمیل یافتہ تصور ہمیں ملتا ہے اور غلطی ہو گی اگر ہم اسے ایک ابتدائی تصور خیال کریں، بایں ہمہ یہواہ کے اصلی کردار اور ابتدائی خدوخال کا ادراک ناممکن نہیں ضرورت فقط اس کی ہے کہ ہم کچھ دقتِ نظر سے کام لیں۔

تورات میں جہاں حضرت ابراہیم وغیرہ کے اُور سے نکلنے اور حران میں بسنے کا ذکر آیا ہے وہیں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ سارہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور یہ کہ یہواہ ابراہیم پر ظاہر ہوا اور یہ وعدہ اُس نے ان سے کیا کہ "میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا" (تکوین ۱۲: ۲) پھر جب یہواہ خواب میں ابراہیم سے ملتا ہے اور انہیں بہت بڑے صِلہ کا یقین دلاتا ہے تو ابراہیم شکایت آمیز لہجہ میں جواب دیتے ہیں کہ "خداوندا تو مجھے کیا دے گا کہ میں لاولد ہوں" (تکوین ۱۵: ۲) اور یہ کہ "تو نے مجھے کوئی اولاد نہیں دی" (تکوین ۱۵: ۳) اس پر یہواہ انہیں باہر لاتا ہے اور کہتا ہے "اب آسمان کی طرف دیکھ اور کہہ کہ ستارے کتنے ہیں اگر تو گن سکے . . . اتنی ہی تیرے اولاد ہو گی" (تکوین ۱۵: ۵) ابراہیم کی طرح سارہ بھی بچوں کے نہ ہونے سے دل گرفتہ تھیں ایک بار وہ ابراہیم سے متأسفانہ کہہ اُٹھتی ہیں کہ "مجھے تو خداوند نے اولاد سے منع کر دیا ہے لہٰذا میں التجا کرتی ہوں کہ تم میری خادمہ سے رجوع کرو۔ شاید کہ اس سے ہمیں بچے حاصل ہوں" ابراہیم اس درخواست کو منظور کرتے ہیں (تکوین ۱۶: ۲) اور ہاجرہ حمل سے رہتی ہیں لیکن عورت کی

۱؎ اشعیا کہتے ہیں "اے خداوند خدا اور خداوند بھی تیرے پہلو بہ پہلو ہم پر مسلّط رہ چکے ہیں لیکن ہم اب صرف تیرے نام کی ملاجپیں گے" (۲۶: ۱۳) اور تثنیہ کا ایک سلبی حکم ہے "میرے سامنے تجھے اور دیوتا نہیں رکھنے چاہئیں" (۵: ۷) ۲؎ ہاجرہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہود ان کو سارہ کی خادمہ بتلاتے ہیں مگر مسلمانوں کا خیال ہے کہ وہ آزاد تھیں۔

فطرت، سارہ ہاجرہ سے جلنے لگتی ہیں اور انہیں پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتیں ہاجرہ تاب نہ لا کر جنگل کی راہ لیتی ہیں اور گھر سے دُور ایک چشمہ پر ٹھہرتی ہیں یہاں "یہواہ کا فرشتہ" (یا خود یہواہ) ان پر ظاہر ہوتا ہے اور ان سے کہتا ہے" ہاجرہ ۔۔۔۔ اپنی بی بی کے گھر واپس جا ۔۔۔۔ میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہیں جا سکے گی" (تکوین ۱۶: ۱۰) اولاد کے متعلق اس قسم کے وعدے ابراہیم سے بہت ہوتے ہیں "میں تجھے بے حد بڑھاؤں گا" (تکوین ۱۷: ۲) "تو بہت سی قوموں کا باپ ہوگا" (تکوین ۱۷: ۴)۔" تجھ سے قومیں پیدا ہوں گی اور تیری نسل سے بادشاہ اُٹھیں گے" (تکوین ۱۷: ۶) "اور اسماعیل کے متعلق میں نے تیری سُن لی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اسے برومند کروں گا اسے بہت بڑھاؤں گا، بارہ سردار اس کی نسل سے ہوں گے اور میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا (تکوین ۱۷: ۲۰) پھر یہ کہ" میں تیری اولاد کو اس قدر بڑھاؤں گا جس قدر کہ یہ ستارے ہیں آسمان میں اور جس قدر کہ یہ ریت ہے سمندر کے کنارے پر" (تکوین ۲۲: ۱۷) سارہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ" وہ بہت سی قوموں کی ماں ہوگی اور عوام پر حکومت کرنے والے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے" (تکوین ۱۷: ۱۶) اسحاق کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ" تیری اولاد تعداد میں ستاروں کے لگ بھگ ہوگی۔" (تکوین ۲۶: ۴) اور یہ کہ" میں ابراہیم کی خاطر تیری نسل کو بڑھاؤں گا" (تکوین ۲۶: ۲۴) اسی طرح اسماعیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ" اس کو بھی میں ایک قوم بناؤں گا" (تکوین ۲۱: ۱۳) پھر ان کی نسبت ہاجرہ کو حکم ہوتا ہے کہ" اُٹھ بچہ کو لے اور سنبھال کہ میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا" (تکوین ۲۱: ۱۸) یعقوب سے بھی اس قسم کے وعدے بہت سے ہوتے ہیں" تیری نسل مٹی کے ذرات کی طرح بے شمار ہوگی اور تو حدود اربعہ کی وسعتوں میں پھیل جائیگا۔" (تکوین ۲۸: ۱۴)" ایک بلکہ کئی اقوام تجھ سے پیدا ہوں گی اور تیری نسل سے بہت سے بادشاہ ہوں گے" (تکوین ۳۵: ۱۱)" مصر جانے سے مت ڈر کہ میں وہاں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا" (تکوین ۴۶: ۳)" اور یعقوب نے یوسف سے کہا خدا مجھ پر کنعان میں بمقام لُوص مکشوف ہوا اور اُس نے مجھے برکت دی اور پھر مجھ سے یہ فرمایا کہ میں تجھے برومند کروں گا اور تجھے بڑھاؤں گا اور تجھ سے بے شمار افراد پیدا ہوں گے"۔ (تکوین ۴۸: ۳، ۴) علیٰ ہذا القیاس موسیٰ کو بھی بشارت دی جاتی ہے کہ" میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا (خروج ۳۲: ۱۰) مزید بریں احبار میں لکھا ہے کہ" اگر تو میرے کہنے پر عمل کرے تو ۔۔۔۔ میں وقت پر پانی برساؤں گا اور زمین فصل لائے گی اور درخت پھل دیں گے" (۲۶: ۳، ۴) اور تثنیہ میں تفصیل کے ساتھ مرقوم ہے کہ" ۔۔۔۔ اگر تو ان احکام کی پابندی کرے تو خداوند خدا ۔۔۔۔ تجھ سے محبت کرے گا تجھے برکت دے گا تجھے بڑھائے گا، تیری اولاد کو برومند کرے گا تیری زراعت میں اضافہ کا موجب ہوگا۔ تیری اجناس اور شراب میں فراوانی پیدا کرے گا تیرے تیل کی مقدار کو زیادہ کرے گا اور تیرے مویشیوں اور تیری بکریوں کو دن دُونی اور رات چوگنی رفتار سے بڑھائے گا" (۷: ۱۲، ۱۳) ورنہ" تیری اولاد پر تیری زراعت پر تیری گایوں اور بکریوں پر لعنت ہوگی" (۲۸: ۱۸)۔

ان چند موٹی مثالوں پر جو بطور نمونہ چُنی گئی ہیں اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا ان میں یہواہ کو خاص کر افزائش نسل و فصل کے دیوتا کی حیثیت میں متحضر کیا گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اصلی کردار یہی ہے کیونکہ یہ اور اس قسم کی اور بہت سی مثالیں معنی خیز طور پر توراتِ یعنی موسیٰ کے اسفارِ خمسہ ہی میں زیادہ ملتی ہیں بنا بریں میرا خیال ہے کہ یہواہ شروع میں ایک ایسا دیوتا تھا جس سے بانجھ عورتیں بچوں کی مُرادیں مانگتی تھیں تاکہ وہ سنسان گھروں کی زینت اور خاندان کی بقا کے موجب ہوں سارہ بانجھ تھیں یہواہ نے ان پر مہر کی نظر کی اور وہ حمل سے رہیں (تکوین ۲۱ : ۱ و ۲) اسی طرح اسحاق نے خداوند سے اپنی بیوی کے متعلق التجا کی کیونکہ وہ بانجھ تھی اور خداوند نے اس کی سُنی اور اس کی بیوی کے حمل ٹھہرا" (تکوین ۲۵ : ۲۱) یعقوب کی دونوں بیویاں بھی بانجھ تھیں "اور جب خداوند نے دیکھا کہ لیاہ سے نفرت کی جاتی ہے تو اس نے اس کے رحم کا مُنہ کھول دیا . . . . اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے ایک بیٹا ہُوا" (تکوین ۲۹ : ۳۱ و ۳۲) - پھر "خدا نے راخیل کو یاد کیا اس کی زاری نالی سُنی اور اس کے رحم کا مُنہ کھول دیا۔ یوں وُہ پیٹ سے رہی اور اس کے ایک لڑکا ہُوا" (تکوین ۳۰ : ۲۲، ۲۳) منوعہ کی بیوی کے متعلق بھی قضاۃ (۱۳ : ۳) میں لکھا ہے کہ وُہ بانجھ تھی لیکن "خداوند کا فرشتہ" اس پر ظاہر ہوتا ہے اور اسے "حمل" کی بشارت دیتا ہے شمشون اسی بچہ کا نام تھا اور صموئیل کی ماں حنّہ کے بارے میں یہ قصہ بیان ہُوا ہے کہ یہواہ نے "اس کے رحم کا مُنہ بند کر دیا تھا" (صموئیل اوّل ۱ : ۵) لہٰذا وُہ اور اس کا شوہر علقمہ دونوں شیلوہ گئے اور وہاں انہوں نے "خداوند کے سامنے پُوجا کی رسمیں ادا کیں" اور اپنے گھر لوٹے خداوند نے حنّہ کی طرف توجّہ کی اور وہ حاملہ ہوئی (صموئیل اوّل ۱ : ۱۹ و ۲۰) اس کے ماسوا "خداوند نے حنّہ پر اور مہربانی کی اور . . . . اُس کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہُوئیں" (صموئیل اوّل ۲ : ۲۱)۔

یوں یہواہ نبوت عورتوں کی اُمیدوں کا ملجا تھا خالی گود والیاں اس کے سامنے جا کر روح کی انتہائی بےبسی اور مایوسی کے ساتھ پھُوٹ پھُوٹ کر روتی تھیں (مثلاً صموئیل اوّل ۱ : ۱۰) ٹوٹے ہوئے دل اس سے مداوا طلب کرتے تھے اور بچوں کو ترسنے والی بیبیاں اسے رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور یہ سب اس لئے کہ عام خیال یہ تھا کہ یہواہ ہی عورتوں کو بچوں کی نعمت سے محروم رکھتا ہے۔ مثلاً تکوین (۳۰ : ۲) "اور وہی ان کے رحموں کا مُنہ بند کرتا" (مثلاً تکوین ۲۰ : ۱۸) "اور کھولتا ہے" (مثلاً خروج ۱۳ : ۱۲ و ۱۵ اور ۳۴ : ۱۹) یہواہ کی یہ ابتدائی خصوصیت اسرائیلی فکر کے ترقی یافتہ دَور میں بھی ہمیں محفوظ نظر آتی ہے۔ "بچے یہواہ کا ورثہ اور اس کی دین ہیں" (زبور ۱۲۷ : ۳)۔

اور بنا بریں (۱) خاصیت لنگ کی رکھتا تھا۔ بہرکیف یہ واقعہ ہے اور مسلّمہ کہ یہواہ ابتدا میں افزائش نسل و فصل کا دیوتا تھا اور اگر آپ سامی رقبہ سے نکل کر باقی دُنیا پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ غیر متمدن سماجوں سے لے کر متمدن سماجوں تک افزائش نسل و فصل کے دیوتاؤں کو پوجتی آئی اور پُوجتی ہیں مصری خیم یونانی بکوس اور رومی پریاپس یہواہ کی طرح افزائش، توفیر اغنام اور سرسبزی کے دیوتا تھے اور یہی حال ہندوؤں کے مہادیو کا ہے بچوں کی خواہشمند عورتیں اور اچھی فصلوں کے طلبگار کسان ان دیوتاؤں

پر نذریں چڑھاتے تھے اور ان کی منت سماجت کرتے تھے اور راسخ العقیدہ ہندو آج یہ سب کرتے ہیں۔

اب اگر میں یہ کہوں کہ افزائش نسل وفصل کے جملہ دیوتا اپنے میں لنگ کی خاصیت یا قدر (Phallic Value) رکھتے ہیں تو یہ بات نہ لائق تعجب ہوگی نہ قابل شرم۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری تہذیب ہمیں جذبۂ جنسی اور اس کے متعلقات قریب و لعید کی نسبت گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دیتی لیکن جہاں بحث واقعات سے ہو وہاں کوئی سوال شرم کا پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ واقعات بہرحال واقعات ہیں اور غیر متبدل اور یہی وجہ ہے کہ فقہ کے درس میں یا تشریح کے لکچر روم میں یا طبیہ کالج میں یا عمل جراحی کے کمرہ میں تہذیب یا شرم عموماً دروازہ پر پہرہ دیتی ہے۔

موجودہ غیر متمدن اذہان کے مطالعہ اور غیر شاعر نفوس کے کھوج سے پتہ چلا ہے کہ انسان کی طبعی اور اصلی زندگی یکسر جذباتی ہوتی ہے، وحشی انسان کو شعور صرف اندھی جبلتوں کا ہوتا ہے وہ فقط لڑنا، مارنا، کھانا اور پینا جانتا ہے تو می جنسی میلان رکھتا ہے اور اپنے آپ کو اور اپنی بیوی، اولاد اور جائداد کو بچانا چاہتا ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ یہ تمام خواہشیں جذبۂ جنسی کی مختلف شکلیں ہیں یوں جنسیت کے متعلق تحلیل نفسی کا زاویۂ نظر غیر معمولی طور پر وسیع ہے، وہ بہت سے ایسے اعمال کو مقولۂ شہوت کے تحت جگہ دیتی ہے جنہیں تولید کے عمل سے راست کوئی علاقہ نہیں، غالباً فرائڈ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہمارے جملہ احساسات میں خواہ وہ سطحی ہوں یا عمقی ایک مبہم سی شہوانی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن یہ کیفیت کسی طرح حقیقی جذبۂ جنسی نہیں البتہ فرد کی پیدائش کے بعد جب کوئی احساس یا تہیج (جسے اصطلاحاً ترکیبی جبلت کہا جاتا ہے) تناسلی منطقوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو باقی تمام جبلتیں اس کے زیر اثر مربوط اور منظم ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح تولید کے مقاصد کی تکمیل ہیں بالواسطہ معین اور ممد بنتی ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہ ایک معمولی بالغ انسان کا جذبۂ جنسی ترکیبی جبلتوں کی اساس بھی ہے اور تکمیل بھی یعنی یہ کہ وُہ ہماری حیات نفسی کا مرکزی نقطہ ہے لیکن ایڈورڈ اشپرانگر وغیرہ کی طرح ہمیں اس نظریہ پر کچھ اعتراض ہو بھی تو اتنا ضرور ماننا ہوگا کہ شہوانی جبلت ہماری تمام جبلتوں میں سب سے قوی جبلت ہے کیونکہ بقائے نسل کا انحصار تمام تر اسی پر ہے۔ یوں بہر صورت یہ ضروری ہے کہ جذبۂ جنسی مذہب پر اثر انداز ہو یعنی اس میں مثالی اور تمثیری شکل میں پایا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ لنگ اور لنگ کی قدر رکھنے والی علامات ذہن انسانی کے لئے واضح یا مخفی طور پر واقعتہً زیادہ قابل فہم اور جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ ثبوت میں تخلیق کائنات کے عام افسانوں کو لیجئے جو فرد کی پیدائش کے حیاتیاتی عمل کی مرموز نقول ہیں۔ دراصل مذہب میں جذبۂ جنسی کی ایک خاص اور اہم حیثیت ہے اور فرد لنگ یا لنگ کی قدر رکھنے والی علامات کو پوج کر بیہودہ قسم کی حیوانیت میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے۔ ہمیں زندگی کو اس کے اپنے اصلی رنگ میں دیکھنے سے شرمانا یا گھبرانا نہیں چاہیئے۔

---

[1] دنیا کی تقریباً ہر قدیم کونیات نے ہستی کا مبدا یا تو غار اور تاریکی کو قرار دیا ہے جو رحم کے بدل ہیں یا پھر سمندر کو جو رحم اور غلاف جنین کی رطوبت والعل کا قائم مقام ہے۔

انسانی فطرت کا جنسی پہلو ہر لحاظ سے اتنا ہی مفید اور جمیل ہے جتنا کہ اس کا کوئی اور پہلو ہو سکتا ہے اس کے ماسوا صریح واقعات کا اظہار گندہ خیالی نہیں بلکہ وہ انسان گندہ خیال ہے جسے ہر چیز میں گندگی نظر آتی ہے۔

الحاصل مذہب میں شہوانیت کی نکاسی ایک امر مسلّمہ ہے اور اس نکاسی نے ہر جگہ افزائش نسل و فصل کے دیوتاؤں کی شکل اختیار کی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ یہ دیوتا اپنے میں لنگ کی خاصیت رکھیں۔ چنانچہ مصریوں کے خیم، یونانیوں کے بیکوس اور دیونیوس کے پریاپس میں یہی خصوصیت پائی جاتی تھی۔ ہندوؤں کا مہادیو اسی قدر کا حامل ہے اور یہواہ بھی ابتداءً اسی صفت سے متصف تھا۔ فرعون کے دربار میں ہارون کا عصا یہواہ کے اعجاز سے سانپ بن جاتا ہے (خروج ۷: ۱۰) اور موسیٰ مصر سے واپسی میں یہواہ کے حکم پر پیتل کا سانپ بناتے ہیں (اعداد ۲۱: ۸) یہواہ کے ساتھ سانپ کا یہ اقتران معنی سے خالی نہیں کیونکہ مؤخر الذکر تحلیل نفسی کی تحقیق کے مطابق ہر حالت میں مرموز لنگ ہے، فلیوگل کہتا ہے "سانپ لنگ کا بدل ہے" اور ینسٹر لکھتا ہے کہ "سانپ کا بہ اعتبار قدر لنگ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی قطعیت مذہب کی تاریخ کے ہر ہر صفحہ سے ہویدا ہے، ڈائیٹرچ بیان کرتا ہے کہ یونان میں بعض خاص عیدوں کے مواقع پر روکا کے صندوقوں میں لنگ یا سانپ رکھے جاتے تھے۔ ہیٹی[1] اور لوئی سیانا[2] کے زنگیوں کی مارپرستی لنگ پرستی کی حیثیت رکھتی تھی۔۔۔۔ آگسٹس (سیسرز) کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ اپالو دیوتا سانپ کی شکل میں اس سے ہم بستر ہو کر اسے حاملہ کر گیا۔ اور اس واقعہ کے بعد ہی سانپ کی شکل اس کی ران پر اُبھر آئی۔" اس کے ماسوا عصبی مریضوں کو خوابوں میں کثرت سے سانپ دکھائی دیتے ہیں اور وہ دلیل ہیں اس واقعہ کی کہ مریضوں کی حیاتِ جنسی بے طرح کچلی گئی ہے آخر میں متوازی نظائر کے ایک اور مجموعہ کی طرف میں ناظرین کی توجہ مبذول کراتا ہوں، بنی اسرائیل جب موسیٰ کی قیادت میں مصر سے واپس ہوتے ہیں تو یہواہ دن میں بادل کے ستون کی شکل میں اور رات میں آگ کے ستون کی شکل میں (خروج ۱۳: ۲۱ و ۲۲ وغیرہ) ان کے آگے چلتا ہے پھر وہ جب کبھی اپنے آدمیوں سے بات چیت کرنی چاہتا ہے تو عموماً مظلہ (tabernacle) کے دروازہ پر بادل کے ستون کی شکل میں کھڑا ہو جاتا ہے (مثلاً خروج ۳۳: ۱۰، اعداد ۱۲: ۵، تثنیہ ۳۱: ۱۵ وغیرہ) اسرائیلی بادشاہ اس کے سامنے عہد کرتے وقت ستون سے متّصل کھڑے ہوتے ہیں (ملوک دوم ۲۳: ۳) اور ایک شاعر اسے داؤد کی زبان سے کہلواتا ہے "میرا بلند مینار" (صموئیل دوم ۲۲: ۳ و زبور ۱۸: ۲ وغیرہ) اسی طرح سلیمان جب معبد یہواہ تیار کرتے ہیں تو اس کے آگے دو اونچے ستون تعمیر کراتے ہیں (ملوک اول ۷: ۲۱، ایام دوم ۴: ۱۲) یہ تمام چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ یہواہ خاصیت لنگ کی رکھتا تھا کیونکہ تحلیل نفسی کے مستند علماء کی یہ متفقہ رائے ہے کہ لمبی، نکیلی اور اسطوانہ نما چیزیں خواہ وہ ہمیں خوابوں میں نظر آئیں یا قصوں میں ملیں یا مذاہب میں دکھائی دیں ہر جگہ لنگ کی علامات ہیں مرموز لنگ ہیں[4]۔

[ا] قصوں میں سانپ کو عموماً خزانوں کا محافظ بتلایا جاتا ہے مگر اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اساسی حیثیت تخم ریز کے عامل کی ہے حفاظت خالباً ثانوی یا اکتسابی صفت ہے۔ [2] جزائر غرب الہند میں سے ایک جزیرہ [3] ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست۔ [4] فرائڈ نے جب اپنی مشہور کتاب الہام تعبیر خواب ...

اور (۲) شکل مخروطہ کی۔ اس نقطہ پر تحلیل نفسی کے نظریۂ علائم (Symbolism) کی تلخیص مناسب بھی ہے اور ضروری

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) تعبیرِ خواب میں یہ خیال ظاہر کیا کہ مینار اور ستون جیسی چیزیں مرموز لنگ ہیں تو ابتدا میں اُس کا بڑا مذاق اُڑایا گیا لیکن حقیقت چونکہ طنز و طعن کے باوجود بھی حقیقت ہی رہتی ہے لہٰذا آج اُس کا یہ قیاس مسلمات میں داخل ہے۔ بشپ ولبرفورس نے اسی طرح ہکسلے کا مذاق اُڑایا تھا مگر نتیجہ کیا نکلا وہی ہکسلے کی جیت! ذیل میں ایک قدیم یونانی گیت کا آزاد ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے ناظرین پر فرائیڈ کے نظریہ کی اصابت آشکارا ہو جائیگی۔ ایک الہڑ دوشیزہ جو کسی کی محبت میں گرفتار ہے اپنا ایک خواب یوں بیان کرتی ہے :-

۱۔ "کل رات جب میں سو رہی تھی تو
خوابوں کی سرزمین سے ہوا کا ایک جھونکا آیا
میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں ہوں جو گہرا ہے اور دیواروں سے محیط
پھر میں نے دو نہریں اس میں بہتی دیکھیں
اور ایک مینار بھی جو سونے اور ہاتھی دانت سے بنا تھا
امی! کیا تم مجھے اس خواب کی تعبیر بتا سکتی ہو؟"

۲۔ "میری بچی تو باغ ہے
مینار تیری قبر ہے
اور پانی کی دو نہریں جو مسلسل بہہ رہی ہیں
میرے وہ آنسو ہیں جو میں تیرے لئے بہاؤں گی
کیوں کہ محبت بے تاثیر ہے

۳۔ "امی! رو رو نہیں
تمہیں خوابوں کی تعبیر نہیں آتی
باغ ہمارا مکان ہے
دونوں نہریں میرے بچے ہیں
اور وہ خوبصورت مینار؛ وہ میرا شوہر ہے
جس کی آغوش میں میں پھر کوئی خواب نہیں دیکھونگی"

کیا فرائڈ کے نظریہ کی اس سے بہتر ترجمانی اور کوئی ہو سکتی ہے؟

بھی۔ فرائڈ کہتا ہے کہ سماج میں فرد کو اپنی بہت سی فطری خواہشیں کچلنی اور دبانی پڑتی ہیں کیونکہ جب تک ایسا نہ ہو سماج کا وجود ممکن نہیں لیکن یہ خواہشیں بیشتر شہوانی الاصل ہوتی ہیں ـــــ کیونکہ جذبۂ جنسی فرد کی زندگی کا مرکز و محور ہے ـــــ دباؤ یا ضبط سے فنا نہیں ہوتیں بلکہ نفس کے غیر شعوری حصّہ میں اُتر جاتی ہیں اور پھر وہاں سے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی خود اظہاری کی قوت کے طفیل بصورتِ علائم اُبھرتی ہیں علامیت یہی ہے لیکن یہ چیز صرف مشرق یا غیر متمدن اقوام سے مخصوص نہیں برخلاف اس کے وہ انسانی ذہن کی ایک عام خصوصیت ہے۔

علائم مختلف اور متعدد ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر پردہ (۱) حیات و ممات کو (۲) ماں باپ کو (۳) جسمی فضلات کو اور (۴) تناسلی منطقوں کو مستحضر کرتے ہیں پانی میں یا سوراخ میں یا سرنگ میں یا گھر میں داخل ہونا یا پھر اس میں سے نکلنا پیدائش کے حیاتیاتی عمل کی مرکوز شکل [لہ] ہے اسی طرح سفر پر روانگی موت کی علامت ہے ماں باپ زیادہ تر پادشاہ اور ملکہ جیسی بلند رتبہ ہستیوں کی شکل میں اور کمتر جانوروں کی صورت میں پیش ہوتے ہیں نمک مادۂ منویہ کی نشانی ہے آگ اور پانی پیشاب کی علامات ہیں اور کاغذ اور پیسے براز کی رموز ہیں آخر میں اور زیادہ اہم تناسلی منطقوں کے علائم ہیں، مردانہ عضو عموماً لمبی اور نکیلی چیزوں کی شکل میں مرموز ہوتا ہے (مثلاً چاقو، سانپ، مچھلی، نلکی، بیلن، مخروط، ستون، مینار وغیرہ) اور زنانہ عضو کھلی اور گول چیزوں کی شکل میں (مثلاً باغ، جواہر، پھول وغیرہ) یوں علائم اعلےٰ درجہ کی جذباتی قدر اپنے میں رکھتے ہیں اور پھر وہ جن چیزوں کی نمائندگی کرتے ہیں وہ نسبتہً بہت چھوٹی اور معمولی ہوتی ہیں مزید براں علائم ہر جگہ ایک ہی مفہوم ایک ہی معنی اور ایک ہی تعبیر رکھتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

مرزا محبوب بیگ

(لہ) خوابوں میں عام طور پر افراد یا تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک کشتی پر سوار ہیں اور یہ کشتی ایک نہر سے گزر رہی ہے جو کیچڑ سے بھری ہوئی ہے پھر ایک چکنی اور نمناک دیوار انہیں ملتی ہے جس پر وہ کسی مرشد کی مدد سے چڑھتے ہیں (رینسٹر) یا یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کسی نمناک سرنگ سے گزر رہے ہیں جو انہیں غیر مستقیم طور پر روشنی میں لے جاتی ہے (کوریٹ) یا پھر یہ دیکھتے ہیں کہ وہ پانی میں اترتے ہیں ایک اندھیری کھوہ میں پہنچتے ہیں اور وہاں سے ترچھے ترچھے روشنی میں آتے ہیں (فرائڈ، یونگ، ایڈلر، لبرل وغیرہ) ان تمام صورتوں میں رطوبت اور پانی غلاف جنین کی رطوبت کے قائم مقام ہیں، سرنگ اور نہر اور کھوہ رحم کی رموز ہیں دیوار کی چڑھائی یا غیر مستقیم حرکت اندام نہانی سے گزرنے کو مستحضر کرتی ہے اور مرشد قابلہ کا بدل ہے، یہ تعبیرات من مانی نہیں بلکہ خود عصبی بیماروں نے ان کی صحت کی تصدیق کی ہے۔

نروان

("ذکر و فکر" کا ایک ورق)

میری دُنیا میں نہیں اب آرزوؤں کا گزر
میرے پہلو میں نہیں اب جستجو کا نیشتر

اب سکونِ زندگی میرا نہیں زیر و زبر
اب مرا سینہ نہیں ہے رزمگاہِ خیر و شر

اب خوشی میرے لئے ہے اور نہ غم میرے لئے
سازِ ہستی کا فقط ہے زیر و بم میرے لئے

اب نہیں میری نگاہوں میں جہانِ رنگ و بُو
چھا گیا ہے ایک ہی بے رنگ جلوہ سُو بہ سُو

اب مری نظروں میں پتھر اور گوہر ایک ہیں
ذرۂ تاریک و خورشیدِ منوّر ایک ہیں

میرے گُلشن میں نہیں اب خار و گُل کا امتیاز
میرے خُم میں اب نہیں زہراب و مُل کا امتیاز

نُور و ظلمت رفعت و پستی نہیں میرے لئے
اب طلسمِ نیستی، ہستی نہیں میرے لئے

اب نہیں ہوں میں اسیرِ حلقۂ شام و سحر
میرے گردوں میں نہیں اب انجمِ شمس و قمر

تھا جو احساسِ من و تو وہ بھی اب جاتا رہا
یعنی باطل کا اندھیرا سب کا سب جاتا رہا

اب 'مقام' و 'وقت' کی زنجیر سے آزاد ہوں
اک جہانِ بے 'جہات' و 'وقت' میں آباد ہوں

ہو گیا ہے بحرِ حق میں غرق یوں میرا وجود
حق میں ہے میری نمود اور مجھ میں ہے حق کی نمود

ایک کیفِ سرمدی ہے اک سُرورِ جاوداں
اِک تجلائے حقیقت کا ہے نُورِ جاوداں

اثر صہبائی

ٹائم پیس

سُلطانہ کی بہُو کے گھر پہلونٹھی کا لڑکا ہُوا ہے۔ آج چھٹا دن ہے۔ گھر میں چہل پہل مچی ہے، ڈولی پر ڈولی چو بیسے پر چو پہلا آ رہا ہے۔ سواریوں پر سواریاں اُتر رہی ہیں۔ مہمان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے خوب خوب بناؤ سنگھار کیے آتی جاتی ہیں۔ کبھی کہار پکارتے ہیں: منتی گنج کی سواری اُتروا لیجیئے۔ کبھی کہتے ہیں نخاس سے سواری آئی ہے، کبھی ڈیوڑھی دار کہتا ہے۔ تین سواری کے نو آنے بھجوا لیے۔ اور ایک سواری بگھی پر آئی ہے۔ حضرت گنج کی سواری آئی ہے، کوچبان بارہ آنے مانگتا ہے۔ بُوا نصیبن جلدی سب کرایوں کے پیسے دے جاؤ۔ ایک طرف بغل والے مکان سے باورچی پکار رہا ہے اجی دو سیر گھی اور بھجوا لیئے، پکہلا دوں کا گھی کم پڑ گیا ہے۔ ادھر مالن کھڑی کہہ رہی ہے بی بی میری ٹانگیں کھڑی کھڑی لکڑی ہو گئیں گجرے اور گلدستے للہ گنوا لیجیے اور دیکھیے چھٹی کی دُلہن کا گہنا میں نے بڑی محنت سے بنایا ہے چوکھا انعام دلوا دیئے۔ کبھی بی گمانی خانم دوڑی چلی آتی ہیں کہ بی بی زچہ کے واسطے للہ اچھوانی تیار کرائی ہے تو دیجئے بچاری بچّی کا دل گھٹا جا رہا ہے۔ شُہدے صدر دروازے پر شور مچا رہے ہیں۔ اللہ سلامتیاں رکھے۔ زچہ بچہ کی خیر ہو۔ اللہ نے بیٹا دیا ہے شُہدے بغیر انعام لئے نہ جائیں گے جلدی بھجوا لیئے۔ اتنے میں کمو مراثن مع سازندوں کے آ دھمکیں۔ گھر کی مالکہ کو جھُک کے سلام کیا۔ ایک بولی پوتا جگ جگ جئے۔ ایک بولی اللہ کرے پوتا جئے خدا پروان چڑھائے اُس کی دُلھن سونے کے سہرے بیاہ لائے۔

سلطانہ۔ ارے گمانی خانم خدا کا واسطہ ذرا اِدھر آؤ۔ باورچی کے مینڈھ نے میرا سر کا بھیجا کھا لیا ہے۔ ذرا مودی خانے کی کُنجی مجھ سے لو اور دو سیر گھی تول کر اس موئے کو دو کہ ایک بلا تو سر سے ٹلے۔

گمانی خانم۔ لائیے کُنجی لائیے۔ مَیں ابھی گھی تول کر لائی۔ سچ تو ہے۔ کیا اُدھم مچا رکھا ہے۔

سلطانہ۔ اری او مالن اِدھر آ۔ جا وہ دالان میں موٹی سی بی بی کھمبے سے لگی کھڑی ہیں اُن کو گجرے وجرے گنوا دے اور انعام کل آ کر لے جانا۔ چل تو بھی میرے سامنے سے دفع ہو۔ (میراثن سے مخاطب ہو کر) کمو جاؤ محفل میں بیٹھو ساز ملاؤ۔ اور گانا شروع کر دو۔

بُوا نصیبن:۔ بی بی ڈیوڑھی دار نے جان کھا لی ہے کرایوں کے پیسے دیجئے تو اس کے سر مار آؤں۔

سلطانہ۔ لو یہ تین روپے اُس کو دے دو اور کہہ دینا کہ جتنے باقی بچیں اپنے پاس رکھے۔ اور اُس کو روپے دے کر آؤ تو تم کو کچھ

اور کہنا ہے اب غائب نہ ہو جانا۔

بوانصیبن۔ سرکار ابھی ابھی ہنڈا منڈی میں آئی۔ دو تین منٹ آپ ذرا ادھر ہی بیٹھ جائیے۔ کھڑے کھڑے دیکھئے تو آپ کا کیا حال ہوگیا ہے اور نہ معلوم یہ موئی بُندہ (بوانصیبن کی لڑکی) کدھر مرگئی ہے۔ میں نے صبح ہی اس سے کہا تھا کہ بی بی کے ساتھ ساتھ رہنا۔ کوئی کام کاج کہیں تو جھٹ سے کرلینا۔ دکھائی نہیں دیتی ہے۔ موئی کو کوئی سہیلی چمٹ گئی ہوگی۔

سُلطانہ۔ ارے کوئی ذرا چھمّو کو تو بُلا لاؤ۔ دیکھو زچہ خانے میں ہوگی۔ کسی نے بہو کو اچھوانی یا سٹھورا کچھ دیا یا نہیں۔ میں تو یہاں مر رہی ہوں، اور نہ معلوم اِن موئی گھوڑیوں کو زمین تو نہیں کھا گئی۔ ہائے انہی وقتوں پر مجھے اللہ بخشے اپنی پیش خدمت محبوبن یاد آتی ہے۔ اس وقت وہ ہوتی تو میرا ہاتھ بٹاتی۔

چھمّو۔ بیگم صاحب۔ میں ننھے کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور بُندہ پوتڑے دھو رہی ہے۔

سلطانہ۔ ذرا چھمّو تو جا سلطان کے ابّا کو پردے کے پاس بُلا۔ جب آ جائیں تو مجھے بُلا لینا۔

چھمّو۔ "بہت اچھا بی بی" کہتی ہوئی دروازہ پر جا کر پکارتی ہے۔ "اجی خان صاحب خان صاحب ذرا پردہ کے پاس آیئے گا۔"

برکت خان۔ (سلطانہ کے شوہر) چھمّو کیا کہتی ہے۔ کیوں مجھے بُلایا ہے۔

چھمّو۔ ذرا پردے کے پاس کھڑے رہیئے بی بی آتی ہیں اُن کو آپ سے کچھ کہنا ہے (یہ کہتی ہوئی پکارتی ہے) بی بی آیئے خاں صاحب پردے کے پاس آ گئے ہیں۔

سلطانہ خانم۔ (پردے کے پاس پہنچ کر) اسے اے سُنتے ہو۔ تم نے جو کل مجھے سو روپے دیئے تھے، وہ کوڑیوں کی طرح بھُن گئے۔ ۳۱ روپے فقط سواریوں کا صبح سے کرایہ دے چُکی ہوں۔ تیس روپے مراسن کو دینے ہیں۔ کچھ انعام دینے باقی ہیں اس پر کہ میں کوئی چھبیس روپے انعام اکرام بانٹ چکی ہوں۔ چند روپے فقط میرے پاس رہ گئے بتاؤ میں کیا کروں ابھی بہت سے خرچ باقی ہیں۔ للہ جہاں سے ہو ساٹھ روپے کی اور فکر کرکے مجھے دو ورنہ اس بھری محفل میں ناک کٹ جائے گی۔ تمہیں کیا پروا۔ تم کو تو بس حینڈو کا مُنہ سے لگائے پڑے رہنے سے کام ہے۔ یہاں میری جان پر بنی ہے۔

برکت خان۔ ساٹھ روپے گردھر لال سے ابھی منگوا کے بھیج دیتا ہوں۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔ خانم صاحب آپ کے حکم کی دیر ہے اور سُنو تو ذرا اپنے ہاتھ کی اِک گلوری تو کھلواؤ۔ واللہ مُنہ خشک ہو کے لکڑی ہوگیا ہے، مجھے تم جانتی ہو تمہارے ہاتھ کی گلوری کے بغیر میری زندگی محال ہے۔ جانِ من اتنا رحم کرو۔ فکر نہ کرو روپے تو میں منگوا کر بھجوائے دیتا ہوں۔ اور سنو تو ہائے۔ ہائے یہ آسمانی رنگ کی ساڑھی تو لاکھ لاکھ جوبن دے رہی ہے۔ واللہ خانم تو ہوئی خوبصورت کوئی میری آنکھ سے دیکھے۔

سلطانہ۔ اب لگے چوچلے بگھارنے (ڈبیہ سے نکال کر) لو یہ دو گلوریاں ہیں۔ اور رہاں سلطان کے ابّا مہمانوں کا کھانا کب تک

تیار ہو جائے گا۔

برکت خاں ۔ اسے یہی کوئی بارہ ساڑھے بارہ تک۔

میاں سے یہ باتیں کر کے سلطانہ جُھک جُھک کے کبھی اپنی زردوزی سلیپر کو دیکھتی کبھی ساری کو دیکھتی۔ خاں صاحب کی تعریف سے دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوئی جونہی صحنِ خانہ کی طرف پلٹیں سامنے سے برفی خانم آتی دکھائی دیں ۔

برفی خانم ۔ بہن تسلیم ۔ پوتا مبارک ۔ اللہ کرے جیتا رہے ۔ سلطان جیئے ۔ تمہاری بہو جیئے ۔

سلطانہ ۔ دُور دفع ہو آج دن کے دن تم گیارہ بجے آئی ہو۔ سچ ہے ہرجائی عورت کسی کام کی نہیں ۔ اوہو یہ مشرّع کا چوڑی دار پیجامہ تو تمہارا میں نے دیکھا ہی نہیں ۔ اور یہ قوس قزح دوپٹہ ۔ برفی خانم آج تو تم پر جوبن پھٹا پڑتا ہے ۔ اچھا سُنو اب آئی ہو تو کچھ کام کرو۔ اسے لو یہ کنجی ۔ میرا کمرہ کھولو۔ لو ڈبیہ اس میں آٹھ گلوریاں خوب مزیدار بنا لاؤ ۔ سُنو ذرا ذرا زردہ ڈالنا اور ذرا ذرا قوام بھی پانوں کے اندر لگا دینا ۔ سنتی ہو۔

برفی خانم ۔ لائیے کنجی ۔ ابھی بنا کر لائی ۔ بھئی میں اپنے لئے بھی دو تین گلوریاں بنا لوں گی ۔ تم سے کہے دیتی ہوں ۔ یہ کہتی ہوئی برفی خانم چلیں، جا کر کمرہ کھولا، پاندان لے کر بیٹھ گئیں گلوریاں لگانی شروع کر دیں ۔ سب سے پہلے ایک موٹی گلوری بنا کر گال میں دبالی۔ پھر سلطانہ کی ڈبیہ میں آٹھ گلوریاں بنا کر رکھیں ، چار گلوریاں بنا کر اپنی ڈبیہ میں رکھ دیں ۔ برفی خانم تھیں ذرا ہاتھ چالاک جب پان لگاتی جاتی تھیں نظر چاروں طرف دوڑا کر اس تجویز میں بھی تھیں کہ کوئی مالیت کی چیز مل جائے تو ہاتھ صاف کروں اور تو کچھ نظر نہیں آیا۔ اِک چھوٹی نائم پیس تھی اسی کو غنیمت سمجھا ، اُٹھا کر غائب کر گئیں ۔ پاندان اپنی جگہ پر رکھ کر کمرہ سے باہر آئیں ۔ ڈبیہ پانوں کی لے جا کر سلطانہ کے حوالے کی اور آ کر محفل میں بیٹھ گئیں ، لّکو کا گانا سُننے لگیں ۔

گمانی خانم ۔ (سلطانہ سے) بی بی خدا کا واسطہ اچھوانی منگوائیے ، زچہ کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا ہے ۔ صبح سے بچّی کے پیٹ میں کچھ نہیں پڑا۔ بلکہ آپ ہی سب کام چھوڑ کر جلدی آئیے ، بہو کو غش سا آ رہا ہے ۔

سلطانہ خانم ۔ ہے ہے میری بچی ۔ کہتی اچھوانی (جو اسی وقت خاں صاحب نے باورچی خانہ سے بنوا کر بھجوائی تھی) ہاتھ میں لے کر زچہ خانہ کے اندر پہنچیں ۔ بہو کو خوشامد در آمد کر کے اچھوانی (ایک بدمزہ چیز ہے جو زچہ کو پلائی جاتی ہے) پلائی ۔ صدقے قربان ہوئیں کہا اب ذرا تم خیر صلاح سے نہا دھو لو تو تھال سے جی بھر کے کھانا نوش جان کرنا ۔ پھر پوتے کو گود میں لے کر خوب پیار کیا ۔ پانچ پیسہ اُس پر سے اُتار کر دائی جنائی کو دے دیا اور زچہ خانے سے یہ کہتی باہر آئیں ، ابھی سب سے بڑا کام مہمانوں کو کھانا کھلوانا باقی ہے ۔ ادھر لّکو میراسن پکاری ، ذرا بیگم صاحب دو چار منٹ محفل میں تو بیٹھئے ۔ اُدھر مہمان عورتوں نے اصرار کیا ۔ ذرا دیر کے لئے سب کی خاطر سے بیٹھ گئیں ۔ اِن کے بیٹھتے ہی میراسن نے یہ گانا شروع کر دیا :۔

بترے ہاتھوں کا جھنجھنا باجنا

اِدھر تین مرتبہ اسی فقرہ کی میراسن نے تکرار کی تھی جونہی جھنجھنا باجنا سارنگی سے نکلا یہ وہی وقت اور وہی گھنٹہ تھا جس پر ٹائم پیس کا الارم لگایا تھا۔ سارنگی سے باجنا نکلنا ہی تھا اِدھر برفی خانم کی میانی سے الارم بجنے کی آواز ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن شروع ہوئی۔ الارم کی آواز آتے ہی میراسن کا گانا بند ہوگیا۔ کمو میراسن ایک چھٹی چرِ بانک عورت تھی جھٹ اپنی جگہ سے اُٹھی اور برفی خانم سے پُوچھنے لگی" وی برفی خانم کیا تمہاری میانی میں الارم لگی ہے" یہ یہ کہتے ہاتھ میانی پر ڈالتے ہی ٹائم پیس پکڑلی۔ پھر کیا تھا ایک عورت نے پیچھے سے شانوں پر زور دے کر برفی خانم کو چت کیا اور سلطانہ نے ٹائم پیس نکال لی۔

مرزا ابو محمد طالب اشک عظیم آبادی

زندگی!

زندگی بھی کتنی دلکش چیز تھی اگر غمِ حیات نہ ہوتا۔

لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد نمودِ صبح کی ضیا پاشیوں میں باغِ ہستی کا ہر ننھا پھول مسکرا پڑتا ہے۔ ریت کا ہر ذرّہ جھلملا اُٹھتا ہے۔ اسی طرح، غم! جانسوز و درد انگیز غم، ہماری آئندہ آنے والی خوشیوں کو بھی دو چند نہ کر دے گا؟؟

اے۔ ایف سلطان

از جالندھر

غزل

جان بھی مضطرب ملی، دل بھی غم آشنا دیا
مجھ کو ملا تو کیا ملا مجھ کو دیا تو کیا دیا

پیکِ اجل کو عشق نے خضر کا مرتبہ دیا
زہرِ فنا کے جام میں آبِ بقا ملا دیا

میکش و میفروش میں شرم و تکلّفات کیا
ساغر ادھر اُٹھا لیا، شیشہ اُدھر جھکا دیا

اُس دلِ بے مُراد کا حال و مآل کیا جسے
کوئی نہ آرزو ملی کوئی نہ مدّعا دیا

حُسن کی دیکھ کر جھلک ایک سکون و صبر کیا
دِل کی گرہ میں تھا جو کچھ ہم نے وہ سب لُٹا دیا

تیرِ نگاہِ ناز کو صید نہ کوئی جب ملا
کھیل کے ہم نے جان پر دل کو ہدف بنا دیا

ہمّتِ عشق کے نثار جس کی مدد سے پیشِ یار
حسرتِ دل نکال لی قصّۂ غم سُنا دیا

اور نہ کچھ مجھے سنا بس یہ پیامبر بتا
تُو نے سوال کیا کیا اُس نے جواب کیا دیا

تہمتِ عشق مَیں نے لی زحمتِ درد تُو نے دی
حاصلِ زندگی ہُوا میرا ترا لیا دیا

ناصحِ بد مذاق سُن، لذّتِ عشق ہے وُہ شے
تلخیٔ زندگی میں بھی جس نے ہمیں مزا دیا

جان گئی کہ دل گیا احسن اب اُس کا ذکر کیا
اُس نے جو کچھ لیا لیا، ہم نے جو کچھ دیا دیا

احسن مارہروی

جرمنی کے مدارس

ایک جمہوریت پسند مفکّر نے سیاسیاتِ یورپ پر تقریر کرتے ہوئے ایک بڑے مزے کا فقرہ کہا تھا۔

"اگر میرا بس چلے تو میں تمام نیلگوں آسمان پر جلی اور خونیں حروف میں صرف ایک لفظ **نازیت** لکھ دوں"۔

اس جملہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نازیت کا مسلک دُنیا کے امن وسکون کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہاں اس کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آج اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اِس نے جرمنی میں ایک نیا صُور پھونک دیا ہے، اِس کے بچے بچے میں قوم پرستی اور جانفروشی کی لہر دوڑا دی ہے اور اس کے ایک ایک فرد میں جرأت وعمل کا ایسا جوش بھر دیا ہے کہ آج جرمنی حقیقت و صداقت ہے، دُنیا اُس کی کمزور آواز پر ہنستی نہیں، بلکہ اس کے طنطنہ اور دبدبہ کے آگے لرزہ براندام ہوجاتی ہے اور بعض اوقات تو اس طرح سرِ عجز خم کر دیتی ہے کہ رائن، آسٹریا اور سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ ہوجاتا ہے لیکن کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی یہ امر تاریخی قانون کا درجہ رکھتا ہے کہ ہر شکست خوردہ قوم اپنی ہار کے بعد چودہ یا پندرہ سال کے زمانے میں بہت زیادہ وطن پرست ہوجاتی ہے۔ یہی جرمنی کے ساتھ ہوا، وہاں اشتراکیتِ قومی کا قیام اسی بنا پر ہے اور ہٹلر کی عظیم الشان کامیابی کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے کہ اُس نے جرمنی کی اُن حسیات کو بیدار کرنا چاہا جو جنگِ عظیم میں بُری طرح پامال ہو چکی تھیں۔ ہٹلر کی منتقمانہ ذہنیت اور معاندانہ اندازِ تقریر کا اگر کوئی نفسیاتی جواز پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ بھی یہی ہے۔

ہکسلے نے کہا ہے کہ انسان کی "بُت پرستانہ" ذہنیت بدستور باقی ہے۔ آج بھی وہ اپنے ذوقِ نیاز مندی سے مجبور ہو کر مختلف سیاسی مذاہب و مسالک کے آگے سراپا عبودیت بنا ہوا ہے۔ جرمنی اس کی زندہ مثال ہے۔ وہاں قومیت اور وطنیت کی پرستش و نمائش بڑے مذہبی جوش وخروش کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جرمنی کی تمام سرگرمیوں پر انہیں چیزوں کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور اُس کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو ان اصُولوں کے اثر سے بے نیاز ہو حتیٰ کہ وہاں کے کالجوں اور اسکولوں کی بنیادیں بھی انہیں عقائد پر قائم ہیں۔

جرمنی کے نورر (Ordensburgen) اسکولوں میں ہر سال ایک ایک ہزار طالب علم اس غرض سے داخل کیے جاتے ہیں کہ جب وُہ چار سال کے بعد تعلیم حاصل کر کے نکلیں تو نازی عقائد اُن کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوں اور ہٹلر ازم کے اصُول

اُن کے عروق میں خون کی طرح موجزن ہوں۔ یہ شاید دُنیا میں سب سے زیادہ خوفناک تعلیمی تجربہ ہے جو جرمنی کی سرزمین پر عمل میں آیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جرمنی ہر سال ایک ہزار ایسے نوجوان ہٹلر پیدا کرے گا جن کا (Mein Kampf) جرمنی کے نظریۂ عالم اور نازیت پر راسخ ایمان ہوگا اور جو یہودیوں اور سامی النّسل لوگوں کے سخت مخالف ہوں گے۔

حکومتِ مستبدہ میں تعلیمی اداروں پر تصرّف حاصل کرنا کوئی نئی اور حیرت کی بات نہیں ہے۔ نپولین کے فوجی استبداد نے فرانس کے اسکولوں پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ایسا ہی رومیوں کے زمانے میں بھی ہُوا۔ اطالیہ کے تعلیمی اداروں کی بے چارگی کا بھی تقریباً یہی عالم ہے۔ موجودہ آمر پرست ممالک در اصل یہ چاہتے ہیں کہ جہاں وہ ملک کے لئے فوجی سازوسامان مہیا کریں وہاں پیشوائی اور رہنمائی کا سامان" بھی مہیا کردیں اور ظاہر ہے کہ ان کے اسکولوں کے نکلے ہوئے طالب علم ایسے رستم رزم ہوں گے جو بہت سے لوگوں پر بھاری پڑینگے۔

فورر اسکولوں میں جرمنی کے مایۂ ناز طلبہ دس سال کی عمر سے داخل کئے جاتے ہیں۔ اُن کی صحت و تندرستی تمام طالب علموں میں سب سے اچھی ہوتی ہے، وہ خالص آریا اور نارڈی نژاد ہوتے ہیں۔ اُن کے حسب نسب میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتا اور اُن کا شجرہ اٹھارھویں صدی سے جا کر ملتا ہے۔ ان کو زمانۂ طالب علمی ہی میں شادی کرنا پڑتی ہے ان لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اٹھارہ برس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔ اور انہیں چھ مہینے کی محنت پر بھیج دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں انہیں دو سال تک فوج میں جبری خدمت انجام دینا ہوتی ہے، اس کے بعد ہر طالب علم کو اختیار ہے کہ وہ بحری یا برّی فوج میں کام کرے، کوئی پیشہ اختیار کرلے، سول سروس میں داخل ہو جائے یا کسی یونیورسٹی میں نام لکھا کر اپنی تعلیم جاری رکھے۔

اس قسم کے تین فورر سکول نہایت مستعدی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ چوتھے اسکول کی اور تجویز ہے۔ ایک اسکول علاقۂ پامرینیا میں دُوسرا رائن لینڈ میں، اور تیسرا بوریرین الپ کے نزدیک واقع ہے، چوتھا اسکول مغربی پرشیا میں بن رہا ہے۔ طالب علم ایک سال ایک اسکول میں گزارتا ہے، دوسرا دوسرے میں، اور اسی طریقہ سے ایک ایک سال ہر اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس تبادلہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے، کہ طالب علم جرمنی کے چاروں حصّوں کے لوگوں کی ذہنیت اور اُن کے رجحانات سے واقف ہوجاتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ڈیوک آف ونڈزر نے پامرینیا کے اسکول کا معائنہ کیا اور اِسی وقت دُنیا کو اِن اسکولوں کا علم ہُوا ورنہ اس سے پہلے لوگوں کو اِن مدارس کے متعلق بہت کم علم تھا۔ رائن لینڈ کا اسکول کولون (Cologne) کے قریب واقع ہے۔ اس کی عمارت پتھر کی بنی ہوئی ہے اور بالکل جدید طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے جس کے گردوپیش کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ اس کا ہال اتنا بڑا ہے کہ اس میں ایک ہزار طالب علم بخوبی آسکتے ہیں۔ اس کا صوتی انتظام بھی اتنا اعلیٰ ہے کہ ڈائس کی معمولی آواز بھی اچھی طرح سنائی دیتی ہے۔ پلیٹ فارم کے پیچھے ایک عریاں مرد کا مجسمہ ہے جس میں جسمانی صحت و تندرستی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ مجسمہ ہر وقت سامعین کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے رات کے وقت بجلی کے قمقموں کے ذریعے سے اس کی مرمریں چمک کو اور بڑھا دیا جاتا ہے۔

ان مدارس کے کورس بھی بڑے دلچسپ ہیں۔ پہلے سال میں تھوڑا سا حیاتیات کا درس دیا جاتا ہے اور وہ صرف اس لئے کہ لڑکوں کو آریا قوم کی عظمت و رفعت کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ اور نسلی برتری کا خیال اُن کے لوحِ دل پر ہمیشہ کے لئے مرتسم ہو جائے۔ قرونِ وسطیٰ تک جرمن تاریخ بھی اسی مقصدِ وحید کے لئے پڑھائی جاتی ہے، دوسرا تمام سال جدید یورپ کی تاریخ پر صرف کیا جاتا ہے لیکن اس کے نقطۂ نظر سے ایک غیر نازی مؤرخ کسی طرح بھی متفق نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ "سیاسی عیسائیت" کا ایک کورس ہے جس میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ موجودہ قومی چرچ جمہوری سلطنتوں کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہیں اور اس سے زیادہ اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ فورر اسکولوں میں کوئی خاص مذہب نہیں سکھایا جاتا لیکن طالب علم ضمناً کچھ باتیں مثلاً بعل پرستی وغیرہ سیکھ لیتے ہیں۔

تیسرے سال تمام تر توجہ جسمانی تربیت کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ طالب علموں کو تیراکی، باکسنگ اور مختلف کھیلوں میں خاص مہارت حاصل کرنا ہوتی ہے بعض اَور کاموں میں بھی اُن کی قابلیت کو جانچا جاتا ہے مثلاً یہ کہ وہ محافظ چھتری کی مدد سے ہوائی جہاز سے کود کر بحفاظت زمین پر پہنچ جائیں۔ چوتھا سال سیاسیاتِ جدیدہ، جرمن قوم کی افزائش، پروپیگنڈے اور نشر و اشاعت کے اصول سکھانے پر صرف کیا جاتا ہے۔

ہر فورر اسکول کے قریب ایک ایسا ہوٹل ہوتا ہے جہاں طالب علموں کی بیویاں اور بچے آ کر ٹھہر سکتے ہیں۔ اِن ہوٹلوں میں "طاقت بذریعہ مسرت تحریک (Strength - Through - Joy movement) کے ممبر بھی آ کر قیام کر سکتے ہیں۔ یہ انتظام اس لئے ہے کہ لڑکے زندگی کی عام دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ طالب علموں کو عملی سیاست میں بھی حصہ لینے کی اجازت ہے۔ اس کے لئے وہ ہر سال میں تین مہینے کے لئے "کام کی چھٹی" لیتے ہیں۔

جرمنی کا یہ عجیب و غریب تعلیمی نظام پہلی نظر میں نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں تعلیم کے بنیادی اصول پر ضرب کاری لگائی گئی ہے۔ اور انفرادی آزادی کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ برنارڈ شا نے لکھا ہے کہ وہ تعلیمی ادارے جو علم کو قطعیتِ غیر فانی اور صداقتِ لازوال سمجھ کر سکھاتے ہیں اور تنقید و تنقیح کے جذبہ کو بیدار نہیں کرتے وہ صد درجہ ناقص ہیں اس لئے کہ وہ ترقی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ فورر اسکولوں میں نازی اصول بالکل "لفظِ آخر" کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن پر بالکل اسی طرح ایمان لانا پڑتا ہے جس طرح کلامِ ربانی پر۔ اِن اسکولوں میں طالب علموں کی فطری صلاحیتوں کو بیدار نہیں کیا جاتا بلکہ دماغ کو ایک خلا تصور کر کے اس میں پہلے سے تیار کئے ہوئے خیالات ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس محدود وطنیت کی کارفرمائی ہے جس کے متعلق ہوورڈ ویل نے کہا ہے کہ وہ کبھی ذہنی آزادی کی پرورش کے لئے سازگار ماحول فراہم نہیں کر سکتی۔ برنارڈ شا نے اسی وجہ سے اُسے بیوقوفی کی انتہائی کریہہ صورت سے تعبیر کیا ہے۔ نازی خداوند صرف جسم ہی کو اپنے قبضہ میں نہیں رکھنا چاہتا بلکہ ذہن و دماغ پر بھی تصرف چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جرمنوں کا کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں ہے جو اُس کی مضبوط گرفت سے آزاد ہو۔ مسز لاری مر نے تھوڑا سا مبالغہ کیا ہے لیکن اپنی جدید کتاب[1] میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے کہ ہر شخص کی موت کا دن معین ہے اور لفافہ نازی دیوتا کو اس کے اوپر کوئی تصرف حاصل نہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اُس کا موت کے خون سے اپنے ناخن و چنگال کو رنگین کرنا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے صرف افسرانِ اعلےٰ کی ایک جنبشِ قلم کی ضرورت ہے!

[1] What Hitler wants by E.O. Lorimer

حفظِ نفس انسان کی فطری جبلتوں میں سے ہے۔ اسی قسم کی ذاتی سلامتی کی کوشش حکومتیں بھی کرتی ہیں اور اس سعی میں وہ بعض اوقات وہ وہ کام کرجاتی ہیں جو ترقی پسند حکومتوں کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طاقت کے زور پر ایک تبلیغی لائحہ عمل تیار کرتی ہیں اور اس کو تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے دلفریب عنوانات سے اسکول، ریڈیو اور سینما کے ذریعہ سے تمام لوگوں تک پہنچاتی ہیں۔ جرمنی میں بالکل یہی ہو رہا ہے۔ اس کے عام اسکولوں پر حکومت کی جتنی سخت گرفت ہے اس کا اندازہ حسبِ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے (یہ ایک انگریز کا بیان ہے جو تین سال تک جرمنی کے ایک اسکول میں کام کر چکا ہے):-

"بہت سے افسر درجوں میں جا کر مدرسین کے خیالات اور اعتقادات کی تحقیق کرتے ہیں۔ اگر وہ مناسب سمجھتے ہیں تو بعض اُستادوں کو گرفتار بھی کر لیتے ہیں۔ بچوں سے والدین کے خیالات بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ... مذہب کی تعلیم میں سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جرمنی اور اس کا چانسلر عدیم النظیر عظمت و برتری کا مالک ہے۔ حضرت مسیح کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو آمرِ اعظم کا، اور کسی کا نہیں لیکن بعض باتوں میں وہ پیمبرِ مصلوب سے بھی ارفع و اعلےٰ ہے۔ کورس میں کوئی کتاب ایسی داخل نہیں ہے جو بین الاقوامی نقطۂ نگاہ پیش کرتی ہو۔ وطنیت کے مسلک کو مذہبی حیثیت دے دی گئی ہے۔ تمام درسی کتابیں اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ہفتہ میں ایک روز تمام بچوں کو صلحنامہ ورسائی کا سبق دیا جاتا ہے، اس میں اتحادیوں کے مظالم بیان کئے جاتے ہیں۔ یہودیوں اور اشتراکیوں کے خلاف نفرت پیدا کی جاتی ہے۔ باربروسہ، فریڈرک اور بسمارک کی بطلِ قوم کی حیثیت سے ستائش و نیائش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اُستاد کچھ رہنمایانہ سوالات کرتا ہے مثلاً آج کون شخص ہے جو اپنے ایثار اور محبت کی وجہ سے مسیح کی یاد تازہ کرتا ہے؟ تمام لڑکے یک زبان ہو کر کہتے ہیں "ہر ہٹلر" اس کے بعد وُہ دریافت کرتے ہیں کہ "وُہ کون لوگ ہیں جو اپنی وفاشعاری کے باعث حواریانِ مسیح کی یاد دلاتے ہیں؟" اس کا جواب بھی تمام لڑکے ایک آواز میں دیتے ہیں "جنرل گوئرنگ، ڈاکٹر گوبلز اور ہاپ ماں رہم (*Hauptman Roehm*)"۔

آج ایک حکومت کے ترقی پسند ہونے کا اگر کوئی معیار ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس میں ذہن و ضمیر کی آزادی کہاں تک حاصل ہے پھر یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ نفسی اور ذاتی خود غرضی کی بنا پر تعلیمی اداروں کی "علمی جمہوریت" میں تو مداخلت نہیں کرتی۔ جرمنی میں قوتِ تمیز و تنقید پر حکومت کو پُورا تصرف حاصل ہے لیکن اس کی "قیادتِ اعلےٰ" کے اس فعل کو آسانی کے ساتھ خود غرضی پر محمول نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ یہ سب کچھ وطن اور قوم کی خاطر کیا جا رہا ہے! بقول پروفیسر میک کن "حکمرانِ اکثریت کا وہ ظلم سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے جو وطن کی خاطر اور اس راسخ عقیدہ کے ساتھ عمل میں آئے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وُہ انتہائی نیک نیتی، ایمانداری اور تدین پر محمول ہے اور باقی تمام لوگ ملک کی ترقی میں سدِ راہ ہیں"۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

تازیانہ

روایت ہے کسی اُلّو نے چاہا — کرے شاہیں سے پیدا دوستانہ
لگا کہنے "سُن اے شہکارِ قدرت! — تری ہر بات ہے پیغمبرانہ
طبیعت تیغِ جوہردار تیری — تری سیرت کمالوں کا خزانہ
سدا تیری جلو میں کامرانی — خطا ہوتا نہیں تیرا نشانہ
فلک پیمائیاں تیری مسلّم — تری ہمّت کا قائل ہے زمانہ
مجھے تُو کیا سمجھتا ہے بتا دے! — ترا ذوقِ نظر ہے عارفانہ!"
کہا شاہیں نے "اے مکّار، اندھے! — تری یہ چاپلوسی شاطرانہ
مری آنکھوں پہ کیا ڈالے گی پردے — سمجھتا ہوں تجھے دُزدِ شبانہ
حقیقت بیں سمجھتے ہیں حقیقت — یہاں بیکار ہے حیلہ بہانہ
خوشامد سے کہیں رُکتا ہے ناداں — زبانِ مردِ حق کا تازیانہ ؟
غلط ڈالی پہ پھینکا جال تُو نے — بہت اُونچا ہے میرا آشیانہ
کسی احمق پہ ڈال اپنی کمندیں!" — یہ کہہ کر اُڑ گیا مرغِ شہانہ

زمانہ روز دُہراتا رہے گا
جہاں میں بوم و شاہیں کا فسانہ

سکندر علی وجد

بجٹ

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

افراد

مسٹر شاہد : ایک علی گڑھ کے گریجوایٹ ۔ ۶۰ روپے کے کلرک

ثریا بیگم : بیگم شاہد

زاہد : مسٹر شاہد کا چھوٹا بھائی

قدسیہ : مسٹر شاہد کی چار سالہ بچی ۔

رحیم ۔ ملازم لڑکا ۔

پہلا سین

(۳۱ ر تاریخ کو شام کے کھانے کے بعد)

ثریا بیگم ۔ خدا خدا کرکے آج مہینہ ختم ہوا ہے ۔ ایک ایک دِن مشکل سے کٹا ہے ۔

شاہد ۔ تمہیں ہر وقت یہی خیال رہتا ہے ۔ تنخواہ آنے کے بعد تین چار روز تک تو خیر کچھ خاموشی رہتی ہے پھر جب دیکھو یہی ذکر ۔ اور مجھ سے تو جب کوئی بات ہوگی تو اُس میں روپے کی کمی کی شکایت ضرور ہوگی ۔

ثریا ۔ اِس کا حال ہم سے پوچھئے ۔ آپ کی ذمہ داری تو بس یہاں ختم ہوجاتی ہے کہ تنخواہ لائے اور گھر میں دے دی ۔ جو خرچ کرتا ہے وہی جانتا ہے کہ کس قدر مشکل سے گزر کرنی پڑتی ہے ۔ مہینے بھر تک لوٹیاں بجتی رہتی ہیں ۔

شاہد ۔ تو یہ تمہارا اپنا ہی قصور تو ہے ۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ہماری آمدنی بہت ہی قلیل ہے لیکن جو کچھ بھی ہے ہے ۔ کتنا ہی رُود اور جھینکو یہ اتنی ہی رہے گی ۔ بڑھ نہیں سکتی ، اب صرف یہی صورت ہوسکتی ہے کہ مصارف کو کم اور قرینہ میں کیا جائے ۔ یہی ساٹھ روپے مسٹر بھٹناگر کو بھی ملتے ہیں ۔ لیکن وُہ کتنی اچھی طرح گزر کر لیتے ہیں ۔ مکان دیکھو تو صاف ۔ خود اچھے صاف کپڑے پہنتے ہیں اور بچے صاف . . . . .

ثریا ۔ مسٹر بھٹناگر کی ایک ہی کہی ۔ اوّل تو ان کے خرچ میں اور ہمارے خرچ میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ دونوں وقت بے گھی

کی اُبلی ہوئی دال پک گئی۔ سب نے کھالی۔ یہاں یہ حال ہے کہ اگر کبھی ایک ہفتہ میں بھی دال پک جائے تو گھر بھر کا فاقہ ہو جائے، پھر باہر ہی صاف دکھائی دیتے ہوں گے۔ بیوی کو دیکھو تو میلی چکٹ ساڑھی باندھے ہوئے۔ کپڑے بھی گھر ہی میں دھلتے ہیں ......

شاہد۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مَیں خود کئی دفعہ ان کے ساتھ کھانا کھا چکا ہوں۔ گوشت تو البتہ ان کے گھر نہیں پکتا مگر دال میں گھی خوب ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی سبزی بھی ضرور ہوتی ہے۔ دودھ ان کے یہاں سیر بھر سے کم نہیں لیا جاتا۔ دفتر سے گھر آتے ہوئے پھل بھی ضرور خریدتے ہیں ......

ثریا۔ تو ایسے انہیں کے ساٹھ روپیوں میں سرخاب کے پر لگ گئے۔ روپے ربڑ کے ہوتے ہوں گے۔ جتنے چاہے بڑھا لئے مَیں یہ ہرگز نہیں مان سکتی کہ یہ سب ساٹھ روپیوں میں ہوجاتا ہوگا۔ خدا دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہی کوئی نہ کوئی اوپر کی آمدنی بھی ضرور ہوگی۔

شاہد۔ یہ سب تمہارا خیال ہے۔ ہمارے دفتر میں اوپر کی آمدنی کی کوئی صُورت ہی نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اپنے اپنے خرچ کرنے کا قرینہ ہوتا ہے۔ ان کے گھر میں خرچ قاعدہ سے ہوتا ہے۔ وُہ پہلے ہی تمام مہینے کا بجٹ بنا لیتے ہیں۔ اور اسی حساب سے خرچ کرتے ہیں۔ اگر گنجائش ہوئی تو روپے خرچ کر دیئے اور اگر دیکھا گنجائش نہیں ہے تو پیسہ بھی خرچ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر میں مہینے کی ۲۹۔۳۰ تاریخ کو بھی روپے رہتے ہیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ پانچویں تاریخ آئی اور پہلی کا انتظار شروع ہوگیا۔ سب کچھ قرض ہی آتا ہے۔ دام بھی زیادہ خرچ ہوتے ہیں اور بنیئے کے نخرے بھی اُٹھانے پڑتے ہیں۔ گھر کی حالت الگ خراب رہتی ہے۔ اگر کوئی ملنے والا آجاتا ہے تو میں تو شرم سے پانی پانی ہوجاتا ہوں، ویسے بھی یہ حالت ہے کہ کسی کے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں۔ جوتا دیکھو، بالکل پھٹ گیا ہے مگر اتنی گنجائش نہیں کہ جُوتا خرید لوں۔

ثریا۔ تو میں نے تو آپ سے ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ خرچ اپنے پاس رکھئے۔ جس طرح جی چاہے خرچ کیجئے۔ مگر یہ بھی نہیں ہوتا۔ فقط دوسروں کو ہی عقل بتانی آتی ہے۔ خود خرچ کر کے دیکھیں تو قدرِ عافیت معلوم ہوجائے۔ نا بابا میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اب ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔ چاہے جیسے خرچ کرنا۔ جو منگا دو گے پکا دوں گی۔ نہیں منگاؤ گے، سب کا فاقہ ہوگا میرا بھی۔ تم سمجھتے ہو گے میں روپے اپنے گھر بھیج دیتی ہوں (رونے لگتی ہے)

شاہد۔ لاحول ولا قوۃ۔ میرا مقصد یہ کب تھا کہ تم روپے چُراتی ہو۔ مَیں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے گھر خرچ قاعدہ میں نہیں ہوتا۔ قرینے سے ہونا چاہئے۔

ثریا۔ تو مَیں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں کہ اگر مجھ سے قاعدہ میں خرچ نہیں ہوتا تو اب آپ کر کے دیکھئے۔

شاہد۔ پھر وُہی بات۔ بڑی مشکل سے اگر کوئی بات سمجھانے کی بھی کہوں تو اُلٹی لے لیتی ہو۔ اس طعن تشنیع سے کیا مطلب۔ تم ہی اپنے ایمان سے کہہ دو کہ میں نے کبھی تم سے حساب لیا ہے۔ جیسے چاہو خرچ کرو میں نہیں بولتا۔ اس وقت نہ معلوم کیوں اتنا کہہ دیا جس پر تمہیں طیش آگیا۔ اب کے غلطی ہوئی آیندہ کچھ نہ کہوں گا۔ (جانے کے لئے اُٹھنے لگتا ہے)

ثریا۔ آپ کہہ مجھے رہے تھے۔ خفا خود ہو گئے۔ اچھا جیسے کہئیے گا خرچ کروں گی۔

شاہد۔ اگر یہ پہلے ہی کہہ دیتیں تو کیا حرج تھا۔ میرے کہنے کا بھی تو یہی مطلب تھا کہ گھر میں جو کچھ خرچ ہو وُہ سب کی رائے سے ہو اور قرینے سے ہو۔

ثریا۔ اچھا تو اب بتائیے کیا کیا جائے۔ پہلی بھی کل ہی آرہی ہے۔

شاہد۔ اس کا انتظام وہی ہونا چاہئیے کہ پہلے تمام ضروری مصارف کی ایک فہرست بنا لی جائے۔ پھر دیکھیں کہ کیا بچتا ہے جو کم ضروری باتوں پر خرچ کیا جائے۔

ثریا۔ تو پھر ایسا ہی کیجئے۔

شاہد۔ ارے رحیم۔ ذرا کاغذ قلم دوات تو لانا۔ (خاموشی)

(رحیم کاغذ قلم دوات لاتا ہے)

اچھا تو سب سے مقدم تو کھانا ہے۔ یہ بتائیے کہ پچھلا قرض کتنا ہوگا؟

ثریا۔ پچیس روپے تو بنئے کے اُدھار ہیں۔

شاہد۔ پچھلے مہینے میں کچھ دیئے نہیں تھے کیا؟

ثریا۔ دیئے کیوں نہیں۔ اگر نہ دیتے تو پچیس ہی ہوتے۔ سامان ماشاءاللہ کچھ کم آتا ہے۔

شاہد۔ (کاغذ پر کچھ لکھتا ہے) اچھا اور بتاؤ۔

ثریا۔ قصائی کے دو روپے۔ سبزی والے کا ڈیڑھ روپیہ۔ دودھ والی کے پانچ روپے۔

شاہد۔۔۔۔ اور؟

ثریا۔ ہاں! پچھلے مہینے کپڑے والا بھی تقاضا کر رہا تھا۔

شاہد۔ اچھا اُس کے کتنے ہیں؟

ثریا۔ بائیس روپے ہوں گے۔

شاہد۔ لیکن یہ سب تو بہت ہو جاتا ہے۔ کس طرح کام چلے گا۔

ثریا۔ یہی تو میں بھی کہہ رہی تھی کہ لکھنے ہی سے کیا ہوتا ہے۔ جتنا خرچ ہے وُہ آمدنی سے کہیں زیادہ ہے۔ . . . .
شاہد۔ (سوچتے ہوئے) پھر وہی بات۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن تم دیکھو گی کہ اسی طرح دوچار مہینے میں خرچ قاعدہ میں آجائیگا۔
ثریا۔ تو پھر جو چاہے کیجئے نا۔
شاہد۔ (سوچ کر) اچھا تو یوں کرو۔ دس روپے تو بنئے کو دے دو۔
ثریا۔ دس میں وُہ ضرور مان جائے گا۔
شاہد۔ سنو تو۔ دس روپے بنئے کو۔ دس کپڑے والے کو۔ سبزی والی کو ایک روپیہ، دودھ والی کو تین روپے۔ یہ کُل چوبیس روپے ہوگئے۔
ثریا۔ اور سارے مہینے کا خرچ۔
شاہد۔ بتاتا ہوں۔ سوچنے تو دو۔ ۲۰ روپے کا سامان منگا لینا۔ پھر جو ضرورت ہوگی دیکھا جائے گا۔ ۱۰ روپے اوپر کے خرچ کو رکھ لو۔
ثریا۔ دس روپے میں ضرور گزارہ ہوگا۔
شاہد۔ یہی تو کہتا ہوں کہ کرنا ہوگا۔ گوشت کوئی ڈاکٹر نے نہیں بتایا ہے۔ سبزی دال، چٹنی، روٹی جیسے ہو دس میں گزر کرنا ہوگا۔
ثریا۔ میرا کیا ہے۔ کل تم ہی مُنہ بناؤ گے۔ کہ دال نہیں کھائی جاتی۔
شاہد۔ اچھا یہ بھی دیکھ لینا۔ (تھوڑے سے وقفے کے بعد) تو یہ کُل ہوگئے چوّن ۵۴ روپے۔ آگے چھ روپے بچے۔ میرا جُوتا بالکل پھٹتا جارہا ہے۔ کم از کم ڈیڑھ روپے کا ایک کریپ سول ہی ہو۔ تمہارے پاس دوپٹے نہیں ہیں۔ کم از کم دو دوپٹے سوا روپے کے آنے چاہئیں۔ زاہد ایک کتاب آٹھ آنے کی خریدنے کو کہتا ہے۔ قدسیہ کے لئے ایک ٹوپا اُونی اور گرم موزے ہونے چاہئیں۔ اتنی چیزیں اشد ضروری ہیں۔ اور ہاں مجھے اپنے لئے کچھ صابون، بلیڈ وغیرہ خریدنے ہوں گے۔ تمہیں تو اَور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔
ثریا۔ نہیں، مجھے تو نہیں ہے لیکن قدسیہ کی فراکیں بھی پھٹ گئی ہیں۔
شاہد۔ اچھا یہ بھی دیکھا جائے گا۔

(سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔)

دُوسرا سین

(پہلی تاریخ کو شام کے کھانے سے پہلے۔ کمرہ میں شاہد اور ثریا بیٹھے ہیں۔)

میز پر کچھ نوٹ، کچھ روپے اور کچھ ریزگاری رکھی ہوئی ہے۔ شاہد کے ہاتھ
میں کل کا بنایا ہُوا بجٹ ہے۔)

شاہد۔ اسے رحیم کو تو بلاؤ، باورچی خانے میں ہی جا کر بیٹھ گیا۔

(ثریا اُٹھتی ہے۔ مگر رحیم خود ہی آ جاتا ہے۔)

رحیم۔ بابوجی۔ وُہ باہر لالہ جی کھڑے ہوئے ہیں جن کی دُکان سے سودا آتا ہے۔

شاہد۔ اُن سے کہہ دو میں ابھی آیا (اپنے چھوٹے بھائی زاہد کو آتے ہوئے دیکھ کر) اچھا ٹھہرو۔ لو زاہد انہیں یہ دس روپے دے دو اور کہہ دینا کہ بقایا
اگلے مہینہ پر ضرور مِل جائے گا۔ (دس روپے کا نوٹ دیتا ہے) ——— (زاہد باہر جاتا ہے مگر جلدہی واپس آ جاتا ہے)

زاہد۔ بھائی صاحب وہ دس روپے نہیں لیتے۔

شاہد۔ بڑی مشکل ہے۔

ثریا۔ میں تو کہتی ہی تھی۔

شاہد۔ میاں انہیں سمجھا دو کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اگلے مہینے لے لینا۔ ذرا خوشامد سے کہنا۔

زاہد باہر جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آتا ہے)

شاہد۔ لے لئے۔

زاہد۔ جی ہاں بڑی مشکل سے لئے ہیں۔ مگر یہ کہہ رہے تھے کہ آئندہ مہینہ میں ضرور بے باق کر دیں۔

شاہد۔ دیکھا جائے گا۔ (رحیم آتا ہے)

رحیم۔ حضور، وہ کپڑے والا آیا ہے۔

شاہد۔ اچھا میاں زاہد اس مشکل کو بھی آسان کرو۔ دس روپے انہیں بھی دو۔ حجت تو بہت کریں گے۔ مگر کہہ دینا اس سے زیادہ گنجائش
ہی نہیں ہے۔ اگلے مہینہ پر انشاء اللہ ان کا حساب بھی بے باق کر دوں گا۔

(زاہد باہر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آتا ہے)

شاہد۔ گئے۔

زاہد۔ گئے مگر بڑی مشکل سے راضی ہوئے ہیں۔

شاہد۔ اچھا یہ مہم بھی ختم ہوئی۔ لیجئے بیگم صاحبہ یہ بیس سامان کے اور دس روزمرہ کے آپ بھی رکھئے۔

(ثریا ناک بھوں سکیڑ کر لے لیتی ہے۔ اتنے میں رحیم آتا ہے)

شاہد۔ اب کون آیا؟

رحیم ۔ کوئی نہیں بابوجی۔۔۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ (کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

شاہد ۔ کہو۔ کیا کہہ رہے ہو۔

رحیم ۔ بابوجی ۔ اس مہینے میں مجھے بھی دو روپے دے دیجئے ۔ پچھلے مہینہ بھی بی بی جی نے نہیں دیئے تھے ۔

شاہد ۔ مگر (پرچہ دیکھتے ہوئے) اس میں تو کہیں ذکر نہیں ۔کل یہ تو بھول ہی گئے تھے ۔ اچھا بھائی لو تم بھی دو روپے لو۔ (دو روپے دے دیتا ہے) کسی طرح گزر کرنی ہی پڑے گی۔

زاہد ۔ (جو اس اثنا میں رات کا بنایا ہوا بجٹ دیکھتا رہتا ہے) لیکن بھائی صاحب اس میں آپ نے میری فیس تو لکھی ہی نہیں ۔

شاہد ۔ لاحول ولا قوۃ ۔کیسی حماقت ہوئی ہے ۔فیس تو بہر حال دینی ہی پڑے گی ۔ اچھا یوں کرو ۔تم دو روپے اپنی فیس کے بھی لو۔ بھائی ہم اپنے جُوتے کی پھر مرمت کرا لیں گے ۔ بیگم تم اپنے ریشمیں دوپٹے ہی نکال لو ۔ جب خُدا دے گا تو پھر نئے ہی بن جائیں گے ۔

ثریا ۔ میں تو کہتی ہی تھی نہ کہ یوں گزارہ نہیں ہوگا ۔ شاہد ۔ یہ تو کرنی ہی پڑے گی ۔

ثریا ۔ (کچھ سوچ کر) اور ابھی تو اور لو ۔ دھوبی ،بھنگی ،نائی کسی کا حساب ہی نہیں لگایا ۔

شاہد ۔ (اب واقعی چکر میں آجاتا ہے) یہ تو واقعی بڑی مشکل ہے ۔ ایک کام ہو تو خیر ابھی تو خرچ پہ خرچ نکلا چلا آ رہا ہے ۔

ثریا ۔ میں جب ہی تو کہتی تھی کہ خرچ کرنے میں اور کہنے میں بہت فرق ہے ۔ انسان کو اپنی عقل اور پرائی دولت ہمیشہ زیادہ نظر آتی ہے ۔

شاہد ۔ (کھسیانا ہو کر) تو حساب بگڑا ہوا تو پہلے ہی کا ہے ۔ اب ٹھیک ہوتے ہی ہوتے ہوگا ۔

ثریا ۔ یہ بھی دیکھا جائے گا ! (طنزاً)

شاہد ۔ تو لڑنے سے کیا فائدہ ۔ کوئی ترکیب سوچو (پھر سوچ کر) اچھا تو یوں کرو ۔ تمہیں جو بیس روپے دیئے ہیں ، ان میں سے پانچ مجھے دے دو دھوبی وغیرہ اس میں نبٹ جائیں گے ۔تم پندرہ روپے کا سودا منگا لو ۔کمی پڑے گی تو بنیئے کے یہاں سے اُدھار آ جائیگا یا میں مسٹر بھٹناگر سے لیکر دے دوں گا ۔

قدسیہ ۔ (جو اتنے میں رحیم کے ساتھ آ جاتی ہے) اور ڈیڈی میلی فلاک کا پیچھیں پیچھیں کیلا ۔

شاہد ۔ (جو قدسیہ کی آواز سُن کر چونک پڑتا ہے اور ہنس کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیتا ہے) اچھا بھائی تمہارا کپڑا ابھی لا دیں گے ۔ ہم اپنا تیل صابون وغیرہ بھی ملتوی کر دیں گے ۔بلیڈ شاید ہمارے پاس ہوں گے ہی ۔صابون بھی شاید ہے ۔تیل ختم ہو گیا ہے ۔خیر اب اس مہینے تو گزر کرنا ہی ہوگا ۔ اگلے مہینہ دیکھا جائے گا ۔

رحیم ۔ بیگم صاحبہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے ۔

شاہد ۔ اچھا چلو ۔ (سب کھانا کھانے چلے جاتے ہیں ۔)

ایم وائی کرمانی ۔ بی اے

نقاب کشائی

پردہ اُٹھا کے دہر میں فتنہ اُٹھا گیا
ہر شے میں اضطراب سا بن کر سما گیا

آیا تو اِک خمار سا آنکھوں پہ چھا گیا
محفل سے اُٹھ گیا تو مجھے ہوش آ گیا

نظروں میں میری حُسن کی جنّت بسا گیا
سینے میں میرے ایک شرر سا چھپا گیا

ذرّوں میں دیکھتا ہوں ہیں اب شانِ ماہتاب
باتوں میں مجھ کو طُور کا عالم دکھا گیا

وہ شب کو میرے خانۂ برباد کے قریب
دھیمے سُروں میں گیت کوئی گنگنا گیا

ترچھی نظر سے رُوح میں نشتر چبھو دیئے
نازک لبوں سے قلب میں جادُو جگا گیا

اِک سانس سے نیاز کی شمعیں بھڑک اٹھیں
اِک پھُونک سے چراغِ خرد کے بجھا گیا

انوارِ حسن سے مرے دِن جگمگا دیئے
خوشبوئے زُلف سے مِری راتیں بسا گیا

بخشا مرے نیاز کو جب ذوقِ بندگی
قدموں پہ میرے عشق کے تارے گرا گیا

قلب و نظر میں پھُونک دیا شوقِ جستجو
معصُوم آرزُوؤں کی کلیاں کھِلا گیا

بس مسکرا کے میرا مقدّر بدل دیا
دُنیائے بے ثبات کو جنّت بنا گیا

مایوسیوں کی راکھ سے مجھ نا اُمید کو
اُمید کے کھِلونے بنانا سکھا گیا

اٹھلا کے میری آنکھوں سے پونچھے سرشکِ غم
لہرا کے میرا بگڑا مقدّر بنا گیا

المختصر ندیم سے کافر کو آن میں
اپنی حسین جادُوگری سے لبھا گیا

چلتی ہیں جب ہوائیں تو ہوتا ہے یہ گماں
اب پھر وہ میرے اُجڑے نشیمن میں آ گیا

احمد ندیم قاسمی

بُندوں کا سودا

دفتر سے واپس آنے پر میں نے "بیگم صاحبہ" کو خلافِ معمول نہایت خوش خوش پایا۔ کیونکہ پلنگ کی پٹی پر جوتا رکھ کر ڈوری کھولنے کی تقصیر نظرانداز کر دی گئی۔ مزید عنایت یہ ہوئی کہ میرے ہاتھ سے شیروانی اور ٹوپی لے کر قرینہ سے کھونٹی پر ٹانگ دی گئی۔ ہماری شادی کو چار برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں میں نے بیوی کی مزاج دانی میں گریجویٹ کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے "بیگم صاحبہ" کی یہ غیر معمولی مہربانی مجھے گھبرا دینے کے لئے کافی ثابت ہوئی۔

جب میں نہا دھو کے فرصت پا چکا تو بیگم صاحبہ بولیں: "اے ہاں! خوب یاد آیا۔ تمہیں شکرقند کی کھیر بہت بھاتی ہے۔ آج میں نے پکائی ہے، بڑی مزیدار ہے۔ کھاؤ گے؟"

میں نے کہا "لاؤ، لاؤ، نیکی اور پُوچھ پُوچھ!"

"ابھی لائی"

کھیر واقعی نہایت لذیذ تھی۔ مگر مجھے یقین ہو گیا کہ بیگم کی یہ پیہم مہربانیاں بے سبب نہیں ہو سکتیں۔ سبب کیا ہے؟ اس فکر نے کھیر کا مزا ابھی ذرا کرکرا کر دیا۔ تاہم از خود پُوچھنا میری مصلحت کے خلاف تھا۔ اس لئے چُپ ہی رہا۔

کھیر کھا چکنے کے بعد کمر سیدھی کرنے کے ارادہ سے جب پلنگ پر لیٹا تو بیگم صاحبہ بھی سب کاموں سے فراغت کر کے پائنتی آ بیٹھیں اور کہنے لگیں: "سُنا تم نے؟ آج بہن رحمہ ملنے آئی تھیں۔"

میں نے پُوچھا "کون بہن رحمہ؟" کیونکہ میری دانست میں بیگم صاحبہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہیں۔

"اے وہی ـــــ سُلطان دُلہن!"

میں نے بھویں سکیڑ کر پھر دریافت کیا "کون سُلطان دُلہن؟"

"سُلطان دُولہا کی بیوی"

میں نے عاجز ہو کر کہا "لاحول ولا قوۃ۔ پُورا نام لو تو سمجھ میں آئے۔"

"ارے تم سلطان دولہا کو نہیں جانتے؟" بیگم صاحبہ نے عورتوں کے خاص لہجے میں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "وہی بُدھن صاحب کے چھوٹے بھائی جو وثیقہ کے دفتر میں نوکر ہیں۔"

" تو لڈن صاحب کیوں نہیں کہتیں ؛ خواہ مخواہ پہیلیاں بُجھواتی ہو۔"

" اُونہہ! ہوگا۔ تمہیں تو تقریر کی عادت ہے۔"

" خیر ــــ تو اُن کی بیوی تمہاری بہن کب سے ہوئیں ؟"

" اِسی نوچندی کو تو دوپٹہ بدلا ہے۔"

" اچھا! اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی ؟"

" تم ان نگوڑے اخباروں کے سوا کسی کی خبر لیتے بھی ہو ؟"

" خیر ــــ تو بہن رحمہ سے کیا باتیں ہوئیں ؟"

میرے تجربہ نے سکھا دیا ہے کہ بیگم صاحبہ کے حملوں اور اعتراضوں کو ٹال دینا ہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔

بیگم صاحبہ نے جواب دیا "کچھ نہیں! بے چاری بڑی نیک بخت ہے۔ اللہ نے میاں بھی محبت والا دیا ہے۔ کچھ تم سے زیادہ تنخواہ نہیں، مگر مہینے پیچھے بیوی کو کچھ نہ کچھ ضرور لا دیتا ہے۔ کبھی ساری ہے، تو کبھی شلوکے کا کپڑا۔ اب کی کچھ نہ تھا تو ایک جوڑی بُندے ہی لا دیئے۔ آج رحمہ پہنے تھی۔ کیا اچھے بُندے ہیں۔ بس میرا جی لہلوٹ ہو گیا۔ جاتے وقت مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے رحمہ سے یہ کہہ کر مانگ لئے کہ بازار میں دکھلوا کر میں بھی ایسے ہی منگاؤں گی۔ اب کل جب تم دفتر جانا تو بُندے لیتے جانا۔ اور واپسی پر بازار میں دکھا کر ایک جوڑی مجھے بھی ویسے ہی لا دینا۔"

یہ تھی بیگم صاحبہ کی مہربانیوں کی اصلی غرض۔

مَیں نے احتجاجاً کہا "مگر عید کے لئے جو خریدے تھے۔ وہ تو ہوں گے نا ؟"

" ہیں تو، مگر ایسے کہاں ہیں ؟"

" ایسے نہ سہی، مگر ہیں تو خاصے اچھے بُندے! اگر نہ ہوتے تو ایک بات تھی۔"

" بس یہی تو مجھے ناگوار گزرتا ہے۔" بیگم صاحبہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا " ایک تو میری کچھ مانگنے کی عادت ہی نہیں، اور برس پیچھے کسی چیز کو مُنہ پھاڑ کر کہا بھی تو لگے تو اس میں مین میخ نکالنے اور کون بہت ہزار پانسو کے ہوں گے یہ نگوڑے بُندے اُشکل سے چار پانچ روپلی کا خرچ ہے۔"

مَیں نے صُلح جوئی کے انداز میں کہا "خفا نہ ہو بیگم"۔ کیونکہ متعدد خانہ جنگیوں میں مجھے شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا ہے " پانچ کے تو ہی اپنے عید والے بُندے آئے تھے (حالانکہ وہ صرف دو روپے کے تھے) اور جب یہ اتنے اچھے ہیں تو بارہ پندرہ سے کیا کم

لے اسلامی مہینہ کی پہلی جمعرات۔

کے ہوں گے ؟

بیگم صاحبہ کو بھی اُس وقت لڑنا منظور نہ تھا۔ بلکہ محض لڑائی کی دھمکی دے کر بُندے منگوانا مقصود تھا۔ چنانچہ فیصلہ کُن انداز میں بولیں "اچھا اگر اتنے مہنگے ہوں تو نہ لانا، اور اگر دس یا اس سے کم کے ہوں تو لا دینا۔ اور اب بقر عید بھی تو سر پر ہے۔ زیادہ سے زیادہ بقرعید میں جو ساری لانے کا وعدہ کیا تھا وُہ نہ سہی !"

دُوسرے دن دفتر سے واپس آتے وقت میں نے امین آباد میں بُندے دکھا کر قیمت دریافت کی۔ وُہ کچھ ایسے قیمتی نہ تھے۔ صرف ساڑھے چار کے۔ مگر یہ رقم بھی مجھے کھلی۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر چکر کاٹ کر گھر پہنچا اور بیگم صاحبہ سے کہہ دیا کہ "خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی بیس جگہ دکھائے کہیں ساڑھے پندرہ سے کم نہیں ملتے"۔

چند روز گزر گئے ــــ ایک دن دفتر سے واپس آکر ابھی اچکن اُتاری ہی تھی کہ بیگم صاحبہ فاتحانہ انداز سے مُسکراتی ہوئی آئیں اور ہتیلی پر بُندوں کی نئی جوڑی دکھا کر کہنے لگیں :"دیکھا، میں نہ کہتی تھی کہ مردوں کو سودا کرنے کی تمیز نہیں۔ ہمیشہ ایک کی جگہ دو خرچ کرتے ہیں۔ مگر تم بھلا حق بات کب ماننے والے تھے۔ آخر اللہ نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر ہی دکھایا۔ تمہیں کہیں ساڑھے پندرہ سے کم کے نہ ملتے تھے اور میں نے کلّو کی ماں کو اٹھنّی انعام دے کر آج ساڑھے نَو کے منگا لئے"۔

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ "کیا کہا تم نے ؟" میں نے غصہ سے پُوچھا :" کلّو کی ماں ساڑھے نَو کے لائی ؟"

"اور کیا، دیکھ لو نا، بالکل ویسے ہی ہیں کہ نہیں۔"

"میں نے تمہیں ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ خبردار کلّو کی ماں سے کوئی چیز نہ منگایا کرو۔ وہ پرلے سرے کی چوٹّی ہے۔ اُٹھائی گیری کہیں کی ! روپیہ میں روپیہ کھاتی ہے۔ آئے تو سہی، دیکھو کیسا مزا چکھاتا ہوں ــــ"

"کیوں مفت میں کسی پر تُہمت لگاتے ہو ؟" بیگم صاحبہ نے میری بات کاٹ کر کہا :"خدا سے ڈرو ــــ روپیہ میں روپیہ کھاتی تو ساڑھے پندرہ کا مال ساڑھے نَو روپیہ میں کہاں سے لاتی ؟"

اس کا میرے پاس کیا جواب تھا ؟ میں کیسے بتاتا کہ بُندے دراصل صرف ساڑھے چار کے تھے اور میں نے ساڑھے پندرہ کے جھوٹ بتائے ؟

بیگم صاحبہ نے کہا " دام جنس کے روپوں میں سے دیئے ہیں۔ اب تم دو گے تو پُورے کئے جائیں گے"۔

میں نے چُپکے سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر بیگم صاحبہ کے ہاتھ پر رکھا اور دل ہی دل میں کلّو کی ماں کو صلواتیں سُناتا ہُوا پلنگ پر پڑ رہا۔

مرزا یاور علی

قطعات

عرضِ تمنا

آنسوؤں میں جھلک ہے ارماں کی
سوزِ حسرت بھرا ہے آہوں میں
کیوں اُٹھاؤں میں منتِ الفاظ
جب مرا دل ہے دیکھ لو نگاہوں میں

گذشتہ شب سی تھی اختر
کیں قیامت سے کسی کی گھڑیاں تھیں
ہم سے کیا پوچھیے کہ کیسے ہوئی
ہم فلک پر ستارے گنتے رہے
گود میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں

حوصلۂ دل

میرے دل کے شکستہ رباب میں
ابھی باقی ہیں چند سالم تار
ابھی مضرابِ حسن آکے لگ جائے
میں بنا دوں جہاں کو نغمہ زار

مجموعۂ کلام

میرا اظہارِ فن نرالا ہے
میں نے نالوں کو نغمہ میں ڈھالا ہے
میرا مجموعۂ کلام اختر
میرے خوں کے آنسوؤں کی مالا ہے

اختر انصاری

ناچاقی

بمبئی کے مشہور ڈاکٹر شاد چند روز سے کلکتہ میں اپنے چچا جان کے یہاں مقیم تھے۔ ایک دن اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے کہ احمد آیا۔

"حضور کو بیگم صاحبہ یاد کر رہی ہیں"

"چلو، میں ابھی آیا"

"ارشاد چچی جان!"

"ہاں بیٹا شاد! میں تمہیں ایک نہایت اہم کام کے لئے تکلیف دینا چاہتی ہوں۔ آج کل تمہارے چچا جان ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔ کتاب کیا ہے لغویت کا پلندہ اور خرافات کا دفتر ہے! ستّرے بہتّرے ہیں اور اب خیر سے زندگی کی بے شمار یادداشتوں کو ضبطِ تحریر میں لا رہے ہیں، تمہیں کیا بتاؤں کیسی کیسی باتوں کی بھرمار ہے! تم جانتے ہو نواب ارشاد صدر یارجنگ کو! اُن کے متعلق لکھا ہے: "ہم نے جب بورڈنگ ہاؤس میں رہائش اختیار کی تو دیوار بیچ ناظم صاحب کا کمرہ تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت، ناظم صاحب آرام سے پڑے سوتے تھے۔ میری صلاح پر نواب صاحب چپکے سے اُن کے کمرے میں گئے اور تکیہ پر نہایت احتیاط سے کول ٹار مل آئے۔ اس غریب نے جو پہلو بدلا تو کول ٹار اُن کے چہرے پر چپک گئی۔ گھبرا کر اُٹھے اور سیدھی غسل خانہ کی راہ لی۔ نواب صاحب پہلے ہی سے منتظر تھے۔ دوڑے ہوئے آکر اُن سے کہنے لگے "کیوں حضرت یہ کیا؟" ابھی وُہ جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ آپ نے پرشور قہقہوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا جسے سُن کر آس پاس کے کمروں میں سے دُوسرے لڑکے بھی آگئے۔ گھڑی بھر میں صحن قہقہہ زار بن رہا تھا اور ناظم صاحب کھسیانی بلی!" اور پھر لکھتے ہیں: "یہ ہیں وہ حضرت جن کی سنجیدگی کا ہر چھوٹا بڑا قائل ہے۔ آپ فتنے تھے اِک قیامت کے!"

"داروغۂ جیل کو تو تم جانتے ہی ہو گے۔ وُہ بھی ان کے بچپن کے ساتھ کھیلے ہیں۔ ان کے متعلق لکھا ہے: "میری صلاح پر انہوں نے ناظم صاحب کے کمرے میں جا کر میز سے ان کی وہی گھڑی اُٹھا لی اور دبے پاؤں نکل آئے۔ اتفاق کی بات، ناظم صاحب ابھی اچھی طرح سوئے نہیں تھے۔ چنانچہ نیم وا آنکھوں سے ان کی کارستانی دیکھ لی اور فوراً ہی آپ کو آدبوچا! یہ ہیں وُہ حضرت جو چوروں کے محافظ ہیں اور اخلاق کے اُستاد!" تمہیں کہو بھلے مانسوں کی سی باتیں ہیں یہ کیا! ناحق بچاروں کی عزّت برباد کر رہے ہیں۔ میں تو

ایسی ایسی باتیں پڑھ کر لرزہ براندام ہوں۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ 'دارالادب' کے سرپھرے مالک نے اسے شائع کرنا اور معاوضہ دینا بھی منظور کر لیا ہے۔ اب تم ہی خدا لگتی کہنا کہ ان بڑے بڑے سربرآوردہ لوگوں کی کس قدر بے عزتی ہے کہ ناسمجھی کے زمانے کے گڑے ہوئے واقعات کو کھود کھود کر سب کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ تم کسی نہ کسی طرح ان مسودات کو تلف کر دو! کل انہیں مکمل ہو کر 'دارالادب' میں پہنچ بھی جانا ہے۔ میرا بیٹا اپنی چچی کی خاطر یہ کام تو ضرور کرے گا، کرے گا نا؟"

"چچی جان، مجھے عذر تو قطعاً نہیں۔ لیکن وہ مسودات کو نہایت عزیز سمجھتے ہوں گے۔ اُنہیں پل بھر کے لئے بھی اُن سے جُدائی گوارا نہ ہوگی۔ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے!"

"واہ میرے چاند! اچھے مرد ہو کہ یہ ننھا سا کام بھی نہیں کر سکتے۔ مَیں اُنہیں خود یوں غائب کرتی کہ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔ مگر مجھے آج ہی ایک سہیلی کے یہاں دہلی جانا ہے۔ جس طرح بھی بنے۔ ضرور یہ کام کرو! نہیں نہیں میں حیل وحجت سُننے کو تیار نہیں ہوں، اچھے ڈاکٹر ہو کہ ذرا سے معاملہ سے گھبرا گئے!"

"لیکن!"

"لیکن کیا؛ کل وہ پارسل کی صُورت میں اور خطوط کے ساتھ خدمت گار کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے چچا جان بڑے کمرے کی میز پر خطوط وغیرہ رکھ آتے ہیں اور خدمتگار وہاں سے اُٹھا کر ڈاک خانے لے جاتا ہے، کیا تم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ وہاں سے اُٹھا کر اُنہیں سپردِ خاک کر دو! دیکھو، دیکھو! خبردار! بھولنا نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر واقعے میں تمہارے چچا جان خود آ دھمکتے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ، یہ کتاب چھپ گئی تو تم جانو کہ خاندان کے نام کو بٹہ لگے گا اور مدتوں کا بنا بنایا وقار جہنم میں گیا اور کیا؟"

شاد نے تمام رات نہایت بے چینی سے گزاری۔ اگر چچا جان نے دیکھ لیا یا سُن پایا تو پھر؟ اگر کسی اَور نے عین موقع پر آ دبایا تو پھر؟ غرض اس قسم کے بھیانک خیالات کے ہجوم نے دماغ پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ پل بھر کو آنکھ نہ لگی۔

شاد صبح صبح ہی بڑے کمرے میں چلا گیا اور الماری کے کونے کی پشت پر بیٹھ کر زحمتِ انتظار کھینچنے لگا۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد چچا جان خراماں خراماں آئے اور میز پر پارسل رکھ کر چلے گئے۔ اُن کے چہرے پر اُس قسم کے اثرات تھے، جو کسی فاتح کے چہرے پر اس وقت نمودار ہوں جب وہ ایک عظیم، ناقابلِ تسخیر قلعہ کو بڑی جدّوجہد اور انتہائی تگ و دَو کے بعد فتح کر چکا ہو! وہ باہر گئے ہی تھے کہ شاد نے لپک کر پارسل اُٹھا لیا، اور دوڑ کر اپنے کمرے میں گھس آیا۔ اسی دوڑ بھاگ میں اُس کا پاؤں چچا جان کے پنج سالہ بچے پر جا پڑا جو مزے سے جوتی کے روغن کو شاد کی ترکی ٹوپی پر مَل رہا تھا۔

"ارے یہ کیا؟"

اُس نے نہایت اطمینان سے جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں جواب دیا "نیک کام! ہمیں اُستاد صاحب نے کہا تھا کہ ہر روز ایک نیک کام ضرور کیا کرو!"

شاد جس نے پارسل لئے ہوئے ہاتھ پُشت پر باندھ رکھے تھے بولا "تو اچھا! ہم اس سے بڑھ کر اور نیک کام بتاتے ہیں، جاؤ یہ ردی کی ٹوکری کی چیزیں نیچے خاک انداز میں پھینک آؤ!" ـــــ وُہ ٹوکری لے کر نیچے گیا اور اس نے آندھی کی طرح دوڑ کر پارسل کو الماری کی دراز میں رکھ کر چابی لگا دی اور چابی کو پتلون کی جیب میں محفوظ کر لیا۔

دُوسرے روز چچا جان نے شاد کو اپنی لائبریری میں بُلا بھیجا۔

"دیکھو شاد! میں نے کل اپنی کتاب کے مسوّدات پارسل کی صُورت میں دارالادب کے مالک کے پاس بھیجے تھے۔ آج ٹیلیفون کیا تو اس نے جواب دیا کہ ہمیں ابھی تک آپ کا کوئی پارسل نہیں ملا۔ خدمت گار کو بُلا کر پُوچھا۔ وہ کہتا ہے "حضور! خط تو وہاں ضرور تھے۔ مگر پارسل کہیں نام کو بھی نظر نہیں آیا۔" میرا خیال ہے کوئی چُرا کر لے گیا ہے۔ زندگی کا عزیز ترین سرمایہ یہی کتاب تھی۔ جس کے ضائع ہو جانے کا مجھے سخت قلق ہے!"

"مجھے خود بہت افسوس ہے چچا جان! کوئی نوکر تو نہیں لے گیا؟"

"بھولے بچّے! کاغذ انہیں چاٹنے تھے۔ سونا چاندی تو تھا نہیں کہ اُن کے کام آتا!"

چچا جان کا جیسے سارا اثاثہ برباد ہو گیا ہو! سخت مضمحل اور متفکّر نظر آتے تھے، کچھ دیر تو دونوں بیکار سوچتے رہے۔ پھر شاد کمرے سے باہر نکل آیا کہ ذرا پائیں باغ میں چل کر تنفس کو درست کرے وہ رازداری کی دشواریوں سے سخت گھبرایا ہُوا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مضطرب رُوح کو چین بخشتے ہیں۔

"ابا جان! وُہ پارسل شاید شاد صاحب نے اُڑا لیا ہو!"

"ناممکن! میرے بچے ناممکن! بھلا اُسے کیا ضرورت تھی؟"

"مجھے یقین ہے! ابا جان ضرور اُنہی کی کارستانی ہے! آپ میری بات مانئیے! اُن کے کمرے میں جا کر اُن سے کہئے، کچھ روز ہوئے میں نے دراز میں اپنا بٹوہ رکھا تھا۔ ذرا تم چابی تو دینا، ممکن ہے وہیں پڑا ہو، اس طرح آپ کو وہ پارسل ضرور مل جائے گا!"

"ہاں، یہ ممکن ہے، میں ـــــ"

اِدھر لائبریری میں باپ بیٹا یہ باتیں کر رہے تھے اُدھر شاد اتفاق سے لائبریری کے قریب کھڑا سب کچھ کان دھر کر سُن رہا تھا۔ دل میں کہا "اُس پاجی مردُود نے سب کچھ تاڑ لیا تھا اور مَیں یہ سمجھا کہ بچہ ہے بھلا اتنا باریک بیں کہاں کا ہے جو سب کچھ سمجھ جائیگا"

شاد دوڑ کر کمرے میں آیا اور چابی کی تلاش کرنے لگا۔ معاً خیال آیا کہ جس پتلون میں چابی تھی اُسے احمد نے برش کر کے صندوق میں رکھ دیا ہوگا۔

"احمد!" ابھی آواز ہوا میں گونج ہی رہی تھی کہ چچاجان اندر آگئے!

"بیٹا شاد! چند روز ہوئے، میں کہیں اپنا بٹوہ رکھ کر بھول گیا ہوں، نیچے اوپر تلاش کی۔ ہر ایک کونا کھدرا چھان مارا مگر کہیں نہیں ملا۔ خیال ہے ــــ ممکن ہے تمہاری درازہی میں پڑا ہو۔ ذرا ــــ چابی تو دینا!"

یہ منظر نہایت مکروہ تھا۔ ان بزرگ اور معمر چچاجان کو چاہئے تو تھا آخرت کا دھیان، لیکن یہ صاف کھرے ایکٹر کی طرح اپنے لائق بیٹے کے تصنیف شدہ جھوٹ کی مشق فرما رہے تھے!

"میں نے تو اسے کہیں نہیں پایا"

"لیکن پھر بھی ــــ مجھے اس کی تلاش کرنا چاہئے"

"قبلہ! اگر ہوتا تو ضرور دکھائی دیتا!"

"لیکن کیا معلوم تمہاری نظر سے اِدھر اُدھر ہو رہا ہو! ممکن ہے ــــ ہیں۔ ہونہہ ــــ تمہاری دراز میں ہو!"

اِدھر اُنھوں نے ایک ایک کر کے درازیں کھینچنی شروع کیں۔ اور ادھر شاد کا کلیجہ مُنہ کو آرہا تھا۔ ہر لحظہ دم گھٹا جاتا تھا۔ آخر اس دراز کی بھی باری آگئی جس میں پارسل پڑا تھا! دستے کو ہلا ہلا کر چچاجان کہنے لگے" یہ شاید مقفل ہے لیکن چابی نہیں ہے تمہارے پاس؟"

"مگر مجھے اس کی تشویش نہیں۔ یونہی ــــ ہاں۔ چچاجان۔ چیزیں ہیں۔ ہیں؟" لاحول ولا۔ کس قدر بے ہنگم فقرہ تھا۔

پیچھے سے کسی نے نہایت نرم اور مؤدبانہ لہجہ میں کہا: "کہیں حضور اس چابی کی تلاش میں تو نہیں ہیں۔ حضور کی پتلون کی جیب میں پڑی تھی۔ حاضرِ خدمت ہے!"

یہ احمد تھا۔ شاد کا بس چلتا تو احمد کو وہیں ڈھیر کر دیتا!

چچاجان نے کہا" مہربانی!"

"نوازش حضور!"

ایک ہی لمحہ میں دراز کھل گئی۔ شاد نے آنکھیں بند کر لیں۔

"نہیں، یہاں بھی تو نہیں ہے بٹوہ! تمہیں ناحق تکلیف ہوئی شاد، کہیں گم ہی ہو گیا کم بخت!"

چچاجان کے جانے پر دروازہ احتیاط سے بند کر کے شاد احمد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"کیوں احمد؟"

"جی حضور ؟"

"نہیں کچھ نہیں"

تھوڑی دیر کے بعد پھر

"احمد !"

"جی حضور !"

"کیا تم نے ___ وہاں، دھرا ___ کیا تم نے اتفاقیہ ___"

"جی حضور ! آج صبح ہی میں نے پارسل وہاں سے نکال لیا تھا"

"اوہ ___ ہا ___ کیوں ؟"

"میری دانست میں یہی بات معقول تھی حضور !"

"تو پھر معاملہ تمہارے ہاتھوں رہا۔ اسے جلد ہی تلف کر دینا، ہوئی نا بات !"

"جی حضور !"

اگلے روز چچی جان بھی آگئیں۔ سب سہ پہر کی چائے پی رہے تھے کہ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے اور کمرے میں صرف شاد اور شاد کی چچی جان رہ گئے۔

"کیوں بیٹا شاد ! وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا نا !"

"نہیں چچی جان ! ابھی مکمل طور پر نہیں"

"مکمل طور پر نہیں ___ یعنی مطلب ؟"

ابھی اس بات کی تشریح ہونے کو ہی تھی کہ چچا جان پھدک کر کمرے میں آ گئے۔ اُن سے دو سال کے بچے کی سی حرکتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا۔

"تمہیں نہایت نفیس بات سنانے کو آیا ہوں شاد ! وہ پارسل، یاد ہے نہ تمہیں۔ ابھی ابھی دارالادب والوں نے مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی ہے کہ اُنہیں پارسل موصول ہو گیا ہے۔ لیکن غضب ہے کہ اتنی تعویق ہو اور وہ بھی رجسٹرڈ پارسل کے پہنچنے میں۔ میں ابھی جا کر پوسٹ ماسٹر کے نام تہدید آمیز خط لکھتا ہوں کہ ڈاکخانہ کے معاملات میں یہ گڑبڑ کیا معنی !"

چچا جان تو یہ کہہ کر تشریف لے گئے، اور چچی جان لال پیلی ہو رہی تھیں۔ شاد نے چچی جان کو کنکھیوں سے دیکھا جو نظر تھی یا زہر میں بجھا ہوا تیر۔ جس کی تلخی کو دل و جگر ہی جانتا ہے۔ چند ساعتوں کے بعد چچی جان ایک لفظ تک کہے بغیر

چلی گئیں!

"احمد"

"جی حضور!"

"آج سے تم برخاست کئے جاتے ہو! نالائق، پاجی!"

"چونکہ حضور، میں نوکری سے برطرف ہو رہا ہوں، اس لئے آپ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے حضور کے چچا جان کے خدمت گار نے رازدارانہ بتایا تھا کہ وُہ اپنی نصف جائداد آپ کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی چچی جان بُری طرح سدِّ راہ ہیں۔ لیکن وہ ان کی ایک نہیں سُنتے! اس لئے آپ کی چچی جان نے آپ کو اُن کی نظر سے گرانے کے لئے یہ تجویز سوچی۔ جو میں نے حضور کی خیر خواہی کی خاطر رائیگاں کردی! اب یقیناً نصف جائداد آپ کے نام ہوگی اور نصف اُن ماں بیٹوں کے نام۔ اچھا حضور آداب!"

"ٹھہرو احمد"

"جی حضور؟"

"واقعی سچ کہہ رہے ہو تم؟"

"جی حضور! مجھے کہاں طاقت کہ آپ کے حضور میں جھوٹی بات کہوں!"

"تو اچھا! آج سے تمہاری تنخواہ میں پانچ گنا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی بمبئی چلنے کی تیاری کرو!"

"نوازش حضور۔ بہت بہتر حضور!"

عبدالرحیم

نوزائیدہ بچّہ

اے معصوم بچے جب تُو پیدا ہؤا
لوگوں نے پُرمسرت قہقہوں سے تیرا خیرمقدم کیا
تُو رونے اور چلّانے لگا
لیکن جب تُو مَوت سے ہم آغوش ہؤا
اس وقت دُوسروں نے تیرے لئے آنسو بہائے
مگر تیرے لبوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی

میرا دِل

میرا دِل دو حِصّوں میں منقسم ہے
ایک حِصّے میں مسرت جاگ رہی ہے اور دوسرے میں غم چَین کی نیند سو رہا ہے۔
اے مسرّت
اپنے رُوح پرور نغمے آہستہ الاپ
اَیسا نہ ہو کہ انہیں سُن کر
میرا غم جاگ اُٹھے

(انگریزی) مترجم
شاھد الھاشمی ناگپوری

ایک نوجوان کی ڈائری کے چند اوراق

(خوش قسمتی سے ایک نوجوان دوست کی ڈائری میرے ہاتھ آگئی ہے۔ میں نے سوچا مجنوں کی فرضی ڈائری یا لیلےٰ کے مصنوعی روزنامچہ کی بجائے اسے کیوں نہ شائع کر دیا جائے۔ میں نے کسی جگہ بھی کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا۔ نام ضرور کاٹ دیئے ہیں کیونکہ اس طرح یہ پتہ چل جانے کا اندیشہ تھا کہ منصور کے پردہ میں کون بول رہا ہے؛ ڈائری کے محرر کو یہ اُمید نہ تھی کہ کبھی اس کے چھپنے کی بھی نوبت آئے گی، اس لئے اُنہوں نے نہایت بے تکلفی اور بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ زیادہ متین طبیعتوں کو شاید کہیں عریانی بھی نظر آئے لیکن میں نے قطع و برید مناسب نہیں سمجھی ——— ان اوراق کے مطالعہ سے اس ذہنی و قلبی اضطراب کا پتہ چلتا ہے جس سے آجکل کے نوجوان دوچار ہو رہے ہیں۔)

حمید نظامی

۱۰ر جولائی ۱۹۳۸ء

میرا خیال ہے کہ لغت کا کوئی لفظ "اشتراکیت" سے زیادہ مظلوم نہیں۔ اور اشتراکیت پر اس ظلم کے سب سے زیادہ ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو اس کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔ بعض آشفتہ اور پریشاں حال نوجواں واقعی خلوصِ دِل کے ساتھ اشتراکی نظام پر اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن ان کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ وُہ اشتراکیت کی مبادیات سے بھی بے خبر ہیں۔ اُنہوں نے اشتراکیت کا لفظ سُن رکھا ہے اور اسے سُن کر گرہ میں باندھ لیا ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ بس اتنا ہی کافی ہے۔ ان کے نزدیک اشتراکی ہونے کا دعویٰ ہی ان کی دنیوی نجات کی ضمانت ہے۔ دین پر تو انہیں یقین ہی نہیں ——— اشتراکیوں کی دوسری ——— اور زیادہ مکروہ قسم ——— ان لوگوں پر مشتمل ہے جو خود سرمایہ دار ہیں، کوٹھیوں میں رہتے ہیں، موٹروں میں سیر کرتے ہیں۔ گرمیوں میں اکثر یورپ چلے جاتے ہیں۔ گھر کے باہر کھدر پہنتے ہیں اور گھر کے اندر ریشم ——— سٹیج پر دولت کی مساویانہ تقسیم کی حمایت میں دھؤاں دھار تقریریں کرتے ہیں اور خود ——— اپنے مزارعوں، مزدوروں اور ملازموں کا خون تک چوس لینا روا سمجھتے ہیں ——— دُنیا انہیں پھر بھی اشتراکی ہی سمجھتی ہے!

آہ! مظلوم اشتراکیت! تیرے حامیوں کی کوئی تیسری قسم ہی نہیں۔ جاہل، آوارہ اور بے سمجھ نوجوان یا منافق اور ریاکار لیڈر۔ خدا تجھے تیرے دوستوں سے بچائے ——— لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ تُو خدا کے وجُود سے ہی مُنکر ہے!

۷ر اگست ۱۹۳۸ء

ـــــ کا خط آیا۔ میری بے دینی پر بہت زجر و توبیخ کی گئی ہے "خط کیا ہے" قیامت نامہ ہے۔ کھولتے ہوئے پانی، دہکتے ہوئے انگاروں اور لپکتے ہوئے شعلوں سے ایک کمزور اور مجبور انسان کو ڈرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی مولوی کا خط ہوتا تو میں آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ لیکن میرا "نذیر" وہ شخص ہے جو مجھے بے حد عزیز اور بے حد محترم ہے ـــــ مجھے بیچارے سے ہمدردی ہے ـــ اس کے نزدیک خدا صرف قاہر ہی ہے اور بس! خدا کا یہ تصور تو یہودیوں کے لئے مخصوص ہے مسلمان کا خدا تو سراسر رحمت ہے محبت کرنے والا اور محبوب! ـــــ لیکن جہنم سے ڈرانے کی کوشش کامیاب بھی ہوگی؟ کیا ہماری موجودہ زندگی جہنم سے بہتر ہے؟ ـــ مجھے تم سے اس مسئلہ میں بے حد اختلاف ہے ـ یہی دُنیا ہمارے لئے جہنم ہے بلکہ جس جہنم سے تم مجھے ڈرانا چاہتے ہو اُس سے بدتر! وہاں صرف جسمانی تکالیف ہوں گی اور یہاں ـــ ہماری رُوح ہر وقت، ہر لحظہ ناقابلِ برداشت اذیتوں میں مبتلا ہے ـــ مجھے اس دُنیا سے نکال کر کہیں لے جاؤ۔ کوئی جگہ اس ناپاک دُنیا سے زیادہ تکلیف دِہ نہ ہوگی ـــ خواہ وہ جگہ تمہارا جہنم ہی کیوں نہ ہو؟

۱۸ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

قوم ـ قوم ـ قوم ـ میں یہ الفاظ سنتے سنتے تنگ آ گیا ہوں۔ ہر شخص قوم کے غم میں گھُلا جا رہا ہے۔ جسے دیکھو قوم کی خدمت کا مدعی ہے جس سے ملو قوم کا رونا روتا نظر آتا ہے۔ آخر اس فریب کا کیا مطلب؟ جو لوگ بظاہر قوم کے لئے سب سے زیادہ روتے ہیں، وُہی قوم کی تباہی کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ اور یہ آنسو مگر مچھ کے آنسو نہیں بلکہ ٹکسال ہیں ٹکسال۔ لٹو سے بہا بہا کر غریب مسلمانوں کی جیب سے چندہ نکالنا اور پھر اس سے عیش و عشرت کرنا ان لوگوں کا دلفریب شغلہ ہے لیکن یہ قوم اسی لائق ہے اس سے یہی سلوک ہونا چاہئے۔ آنکھیں بند کر کے ہر جاہل کو رہنما ماننے والی قوم جس قدر جلد مِٹ جائے، اُسی قدر اچھا ہے۔

۲۷ر نومبر ۱۹۳۸ء

ـــــ آج ایک دلچسپ بیوقوف کو لے آئے میں نے اکثر احمق دیکھے ہیں لیکن یہ شخص سب سے بڑھا ہُوا تھا بچپن میں کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ چمگادڑ ہمیشہ اپنی ٹانگیں اس خیال سے آسمان کی طرف کئے رکھتی ہے کہ اس کے سہارے بغیر آسمان فوراً گر پڑے گا۔ اُس وقت یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ پھر کئی ایسے آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہُوا جن کی باتوں سے معلوم ہُوا کہ ان کا ارتقا بندر سے نہیں ہُوا بلکہ کئی پشتوں کے بعد ان کا سلسلۂ نسب اسی چمگادڑ سے جا ملتا ہے۔ اپنے آپ کو ہندوستان کا آئندہ وزیرِ اعظم، ملک کا بہترین ادیب اور دُنیا کا سب سے بڑا انگریزی دان سمجھنے والوں سے مجھے اِس سے پہلے شرفِ ملاقات حاصل ہو چکا ہے۔

لیکن یہ تو کسی اور چیز کو ہی وجہ افتخار سمجھے بیٹھا ہے۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا شاید ۔۔۔ اپنی بیوی کے قصے سنانے لگے۔ داستان کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھی۔ اس لئے ہم بھی سنتے رہے۔ پھر اپنی شان میں ایک لامتناہی قصیدہ شروع کیا۔ "مجھ سے اچھا خاوند ۔۔۔ آئیڈیل خاوند ۔۔۔ آپ کو کہیں نہ ملے گا!" سبحان اللہ! "آپ کو کہیں نہ ملے گا" گویا میں خاوند کی تلاش میں ہوں ۔۔۔ اور آپ کے آئیڈیل ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ جس بیوی کی قسمت میں آپ سا احمق لکھا گیا ہے اس کی خوش نصیبی پر کسے رشک نہ آئے گا؟

---

۲۴ دسمبر ۱۹۳۸ء

آج کل "مذہب خطرہ میں" کا نعرہ زیادہ سننے میں نہیں آتا۔ اس کی جگہ ایک اور نعرہ نے لے لی ہے۔ اور وہ ہے "کلچر خطرہ میں"۔۔۔ روٹی اور کلچر ۔۔۔ آج سے ایک سال قبل میں کلچر کے پُر زور حامیوں میں سے تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا، روٹی تو کتے کو بھی مل جاتی ہے انسان اور کتے میں کوئی چیز تو مابہ الامتیاز ہونی چاہئے۔ آج ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ اب میں روٹی کے چاہنے والوں کی صف میں ہوں۔ جہاں تک پیٹ کے دوزخ کا تعلق ہے ایک کتے اور ایک انسان میں کوئی چیز مابہ الامتیاز نہیں ہونی چاہئے ۔۔۔ کوئی چیز مابہ الامتیاز نہیں ہو سکتی! ۔۔۔

آخر کلچر سے مراد کیا ہے؟ اگر کلچر اسی چیز کا نام ہے جس کا مظاہرہ ہمارے اُمراء کر رہے ہیں تو ہمیں خود اس کلچر کو جلد از جلد مٹانے کی کوشش کرنی چاہئے ۔۔۔ اور غریبوں کا کلچر ہی کیا ہے؟ فاقہ کش مزدور کو کلچر سے کیا تعلق؟ خواہ مخواہ ریاکاری کی کیا ضرورت ہے؟ دنیا کو دھوکا دینا تو خیر سمجھ میں آ بھی سکتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ ۔۔۔ صاحب کہتے ہیں میرا یہ تسفّل قابلِ افسوس ہے۔ یہ تسفّل ہے یا احساسِ حماقت لیکن میں اسی حال میں خوش ہوں۔ بابا ہمیں روٹی دے دو اور ہمارا کلچر لے جاؤ۔ جب قوت ہوگی تم سے کلچر بھی واپس چھین لیں گے۔

---

۱۳ جنوری ۱۹۳۹ء

سرمایہ دارانہ سماجی نظام کو تباہ کرنے کے لئے اگر کسی دلیل کی ضرورت ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اس نظام میں ایک انسان جھوٹ بولنے پر مجبور رہتا ہے ۔۔۔ اس کے بغیر وہ ایک دن بھی نہیں گزار سکتا۔ یا گوشہ نشین ہو جائے یا جھوٹ بولے۔ گوشہ نشین ہونا ناممکن ہے اور جھوٹ بولنا کمینگی ۔۔۔ ہمیں کمینہ بننا پڑتا ہے۔ ہم کمینگی اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

۱۸ر جنوری ۱۹۳۹ء

آج ــــ کہنے لگے کہ مجھے کسی نے کہا ہے کہ ــــ ایسا ہے۔ ویسا ہے۔ بہت جھوٹا ہے ــــ وہی فرسودہ اور پرانی باتیں۔ پروپیگنڈے کا خالص پنجابی طریقہ ــــ میں نے پوچھا پھر تم نے کیا کہا؟ کہنے لگے میں نے کہا مجھے صرف دوست کی دوستی سے غرض ہے اور بس! کبھی کبھی سوچتا ہوں ہمارے پنجابی دوست مخالفت کے جوش میں کمینگی کی حد تک کیوں جا پہنچتے ہیں؟

مخالف کو بدنام ہی کرنا ہو تو اس کے لئے کچھ اور ذرائع بھی ہیں لیکن ــــ

۲۱ر جنوری ۱۹۳۹ء

آج ہارڈی کا ناول پڑھتے پڑھتے بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، میرا دل کبھی کسی چیز سے متاثر نہ ہوا تھا۔ مگر اب اس قدر رقیق القلب ہو گیا ہوں ــــ

ہماری زندگی اندھیری رات ہے ــــ خوشی کے لمحات اس جگنو کی طرح جو کبھی کبھی اپنی چمک سے ہولناک تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے ــــ ان لمحات کا ہماری اصل زندگی سے کوئی تعلق نہیں ــــ یہ زندگی تو تاریک رات ہے مسلسل اور لامتناہی رات!

۲۲ر جنوری ۱۹۳۹ء

ــــ صاحب مجھے سیاسیات میں گھسیٹنا چاہتے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس میدان میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ پالیٹکس صرف دو قسم کے لوگوں کے لئے موزوں ہے۔ اول تو وہ جو لکھ پتی ہیں جو پیسے کے زور پر لیڈر بن سکتے ہیں۔ جو خود سرمایہ دار ہیں لیکن سرمایہ داری کو ہر وقت کوستے رہتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو ــــ کی طرح بھوکے ننگے ہیں، جن کا کوئی گھر بار نہیں۔ جو لیڈری کو بطور ایک پیشہ کے اختیار کئے ہوئے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے گھر میں رہنے کی نسبت جیل میں رہنا زیادہ آرام دہ ہے کیونکہ ان کا گھر تو ہوتا ہی نہیں ــــ میں نہ سرمایہ دار ہوں نہ ــــ کی طرح خانماں برباد۔ پھر خواہ مخواہ یہ دردِ سر کیوں مول لوں؟ مسلمانوں کو مجھ جیسے نوجوانوں کی خدمات کی ضرورت نہیں۔ میری طرح کے عافیت پسند، مصلحت بیں اور خود غرض رہنما تو ان کے پاس پہلے ہی ضرورت سے زیادہ ہیں۔ انہیں تو کسی رندِ بیباک کی ضرورت ہے۔ جو صرف اللہ سے ڈرتا ہو اور جس کا سرچشمۂ ہدایت قرآن اور صرف قرآن ہو ــــ تعزیراتِ ہند ــــ ڈاس کیپیٹل یا میکاویلی کی خرافات کو الہام سمجھنے والے مسلمانوں کی کیا خاک رہنمائی کریں گے؟

---

۲۵ جنوری ۱۹۲۹ء

ہماری زندگی زندگی نہیں ایک ظلم ہے۔ ایک سلسلہ ہے ان معصوم اُمیدوں کا جنہیں ہمیشہ فریب دیا گیا ہے۔ ایک مجموعہ ہے ان حسین آرزوؤں کا جنہیں ہمیشہ کچلا جاتا رہا ــــ اور کچلنے والے کون ہیں ــ ہمارے عزیز۔ ہمارے دوست۔ ہماری محبت کا دم بھرنے والے مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ بروٹس نے سچ مچ سیزر کو اتنی بے دردی کے ساتھ قتل کیا ہوگا ــ بروٹس سا دوست سیزر ایسے دوست کے پیٹ میں چھُری گھونپے، یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا شیکسپیئر نے زیبِ داستان کے لئے غریب بروٹس کو اتنے مکروہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ اس دُنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ بروٹس آجکل بھی پائے جاتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے بروٹس دُوسری صفات کے علاوہ حماقت سے بھی پُوری طرح بہرہ ور ہیں۔

---

۲۷ جنوری ۱۹۲۹ء

آج ــــ صاحب تشریف لائے، اکثر تشریف لایا کرتے ہیں۔ دماغی توازن تو خیر پہلے بھی کبھی درست نہ ہُوا تھا مگر آج مزاج میں بھی کچھ گرمی نظر آتی تھی ــــ مسلمانوں کی بدحالی کا رونا رونے لگے۔ میں ان سے سیاسی امور پر بحث کرتے ہوئے بہت گھبراتا ہوں، یہ ہر دلیل کا جواب شور مچا کر دینا چاہتے ہیں اور وہ جواب کیا ہوتا ہے یہی شور اور بس! مسلمانوں کا نوحہ پڑھتے پڑھتے مجھ پر برس پڑے۔ آج سے ایک سال پہلے تم اچھے خاصے مسلمان تھے اب ــــ ہوگئے ہو۔ میں نے کہا حضرت اگر ایک سال پہلے یہ گنہگار اچھا خاصہ مسلمان تھا تو اب بھی ہے کیونکہ سال بھر میں اس نے عقاید نہیں بدلے۔ میز پر مُکّا مار کر کہنے لگے" بدل لئے ہیں ضرور بدل لئے ہیں۔ اور جس شخص کی تبلیغ اور اثر سے بدلے ہیں میں اسے بھی جانتا ہوں۔ خدا مسلمانوں کو اس قسم کے نوجوانوں سے بچائے"۔ ان ارشادات کا کیا جواب دیتا؟ جس غریب کی طرف ان کا روئے سخن تھا وہ عملی زندگی میں ان سے زیادہ متعصب مسلمان ہے۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ شریف، زیادہ خوش اخلاق اور زیادہ نیک سیرت نوجوان نہیں دیکھا۔ اگر ہم میں سو پچاس ایسے نوجوان ہوں تو ہماری مشکلات کے حل ہونے کی اُمید بندھ جاتی ہے۔ لیکن سوءِ ظن کا کیا علاج! اپنے بھائی کے متعلق بدگمانی تو مسلمان کی گھٹی میں پڑ چکی ہے۔

حمید نظامی

منتخبات

تمہید

جو شخص خوبصورت چیزوں کے تاثرات کو ایک نئے طریقے سے بیان کرسکے یا ایک نئی صورت میں منتقل کرسکے وہ نقاد ہے۔
آسکر وائیلڈ

بقول میرے ایک مرحوم دوست کے "پھولوں کا چن لینا زیادہ مشکل نہیں مگر انہیں قرینے سے سجانا، ان کے لئے موقع و محل کا انتخاب کرنا، ان کے بہار آفریں نظاروں کے لئے ایک باقاعدہ جلوہ گاہ بنانا ایک تجربہ کار گلچیں کے ذوقِ سلیم پر منحصر ہے۔"

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ "جب ایک چیز کو سادگی اور اعلےٰ طریقے سے آراستہ کیا جائے تو وہ چیز کسی صورت میں غلط واقع نہیں ہوسکتی"۔
ایک اور صاحب فرماتے ہیں "شاعر اور مصور کی آنکھ حسن کے پرکھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی"۔

راحل

شوق ہے دادِ خدا، ذوق ہے امدادِ خدا!
(داغ)

شوقِ نظارہ

پیشِ تو جانے دارم و میرم از آرزوئے تو — شرم نمی گزاردم تا نگرم بہ سوئے تو
بسکہ نظارہ دشمنی، منتظرم کہ یک زماں — ملتفتِ کسے شوی تا نگرم بہ سوئے تو
(میرزا نظام)

ذوقِ نظر

میری نگہِ شوق ہے اور وہ رخِ انور — میں اُن کو بہ اُمیدِ وفا دیکھ رہا ہوں
قربان ہیں اِس دیکھنے پر میری نگاہیں — وُہ دیکھ رہے ہیں کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں
(حفیظ ہوشیارپوری)

حسن و عشق

سوچنے لگے گی کچھ تیری خوش نگاہی بھی — رائگاں نہ جائے گا یونہی "دیکھنا" میرا
میں نے جب کبھی دیکھا سر جھکا لیا تو نے — تُو نے جب کبھی دیکھا۔ دل تڑپ گیا میرا
(علی منظور حیدرآبادی)

دل

می دہد راہرواں را خبر از دل "راحل"
بارک اللہ! رسیداست بہ منزل "راحل"

(گرامیؒ)

(۱)

دل چیست؛ رفیقِ ازلی با اسلام — در حلقۂ تسبیحِ وجود است امام
برخویش بسانِ دائرہ ہست محیط — انجام آغازِ اوست، آغازِ انجام

(گرامیؒ)

(۲)

گفتند دل آزاد کہ پربستہ نکوتر؟ — گفتم کہ زبندِ دو جہاں رستہ نکوتر
گفتند زخلوت کدۂ خویش بروں تاخت — گفتم شررِ جستہ زناجستہ نکوتر
گفتند کہ دربارۂ او چیزِ دگر گوئے — گفتم چو گُل از بادِ صبا خستہ نکوتر

(اقبالؒ)

(۳)

نگاہِ مے فروش ہے شباب کے خمار میں — قبا مسکتی جاتی ہے تنِ ستارہ بار میں
پسینے کی شمیم ہے ہوائے خوشگوار میں — چلے ہیں سیرِ باغ کو وہ موسمِ بہار میں
بجائے گل گندھے ہوئے ہیں دل گلے کے ہار میں

مرزا عزیز لکھنوی مرحوم

(۴)

نگہِ شوق کی تھی غمازی — یا اُن آنکھوں کی فتنہ پردازی
اپنی قسمت میں تھی سرفرازی — جیت لی ہم نے عشق کی بازی
ایک دِل تھا سو وہ بھی ہار آئے

حفیظ ہوشیارپوری

راحل ہوشیارپوری

جُدائی

(۱)

بہار ـــــ

کلیاں اُداس ہیں،
وہ روشنی جو فاطمہ کی آنکھوں میں تھی اُنہیں کہیں نظر نہیں آتی

(۲)

چہرے کے گرد سُرخ گلاب کی پتیوں کی بیل،
سینہ پر موتیا پریشان،
سفید، نکھرے ہوئے کفن میں دُلہن سی بنی ہوئی ـــــ
کیسے یقین آئے کہ اُس آخری نیند سے وہ نہ اُٹھی ہوگی ؟

(۳)

اُس نے دُنیا ویران کر دی
اندھیری رات میں درختوں کے موہوم سائے کی طرح زندگی اپنا نشہ ہار چُکی ہے

"ابنِ مریم"

آوازیں

صبح کا سہانا وقت ہے، محل کے تمام دروازے بند ہیں اور اس کے پاسباں، نظر کی پہنچ سے دُور، کسی غیر معلوم جگہ، خوابیدہ۔ ایک ملاقاتی برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے اِس انتظار میں کہ دروازے کھلیں اور کوئی ملازم نظر آئے تو وہ اپنا کارڈ بھیج کر اطلاع کرائے۔ اسے یوں انتظار کرتے کرتے نصف گھنٹہ ہو چکا ہے کہ دو رویہ کمروں کی درمیانی گیلری میں کسی کے چلنے کی آواز آتی ہے، کمروں کی داہنی قطار کے آخری یا آخری سے اوّل کے کمرے سے کوئی آ رہا ہے۔ قدموں کی چاپ قریب ہوتی جا رہی ہے۔ چٹخنی کے نیچے گرانے کی آواز آتی ہے۔ باریک سِکوں کے بنے ہوئے پردے کے پیچھے، گیلری کے دروازہ کا ایک پٹ کھلتا ہے اور یہاں تک آنے والا واپس چلا جاتا ہے —— غالباً حیرت زدہ —— دو منٹ بعد اک ملازم آ کر دروازے کے دونوں پٹ کھول دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے قبل جو ہستی دروازہ تک آئی تھی اُس نے اِس ملازم سے جا کر یہ کہا "دیکھنا ذرا، یہ برآمدے میں کون بیٹھا ہے"۔ ملازم یہ دیکھ کر کہ ایک نوجوان بے تکلفی سے بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے، اور یہ سمجھ کر کہ کوئی ملاقاتی ہوگا، واپس چلا جاتا ہے، اور اِدھر اُدھر کے کمروں کو کھول کر ان کی صفائی میں مشغول ہو جاتا ہے۔

نوجوان کو اس کی یہ بے اعتنائی ناگوار گزرتی ہے، آخر اسے یہ پوچھنا ضروری تھا "آپ کا کیا نام ہے، آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں"۔ وہ یہ سوچ کر کہ شاید ابھی تک کوئی بھی بستر سے نہیں اُٹھا، خاموشی سے اپنا مطالعہ جاری رکھتا ہے۔ کیا بڑے آدمی کے خادم بھی بڑے ہو جاتے ہیں۔ اب گیلری سے بچوں کی مِلی جُلی بے ہنگم آوازیں اُٹھ رہی ہیں، آخر اس سکوت کو توڑا جا رہا ہے زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اِک ننھی گڑیا گنگناتی ہوئی، آ رہی ہے، کھانے کے کمرہ سے ہوتی، اس کے برآمدے میں کھلنے والے دروازہ سے باہر آ جاتی ہے، اس کے لئے ملازم دری ڈال گیا تھا، یہ بچی اس پر بیٹھ جاتی ہے، اس نے اس پر پڑی ہوئی چیزیں اُٹھالی ہیں، اس کے ایک ہاتھ میں ا ب ت کی کتاب نظر آتی ہے، دُوسرے میں اس نے پنسل پکڑ رکھی ہے۔ نوجوان، اخبار سے نظریں ہٹائے، اس کی ان حرکات کو دیکھ رہا ہے، بچوں کی معصومیت کا وہ بہت دلدادہ معلوم ہوتا ہے، وہ ڈرائینگ روم کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہے، ورنہ وہ بچی کو گود میں اُٹھا کر پیار کر لیتا۔ ممکن ہے کھانے کے کمرے میں عورتیں ناشتہ کے لئے آ گئی ہوں اس لئے اس سمت وہ جانا نہیں چاہتا۔

بچی ایک ہلکا پھلکا گیت گاتی، جس میں 'کلیاں' سمجھ میں آتا ہے، غالباً اس میں پھولوں اور ان سے گندھے ہوئے ہار کا

ذکر ہے ـــــ واپس جا چکی، البتہ ایک لحیم شحیم انسان، سُرخ و سفید چہرہ، تاؤ دی ہوئی سیاہ مونچھیں، صورت سے "پٹھانیت" ٹپکتی، آ دھمکے ہیں، غالباً ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

برآمدے کے دُور کے کمرے سے کوئی گیلری کے پختہ فرش پر، تیز تیز قدم رکھتا اس سمت آ رہا ہے، اُونچی ایڑی کی چپل کی آواز معلوم ہوتی ہے، اس کی سبک خرامی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی نوجوان الھڑ دوشیزہ ہے، غالباً کھانے کے کمرے میں چائے تیار کرنے جائے گی، اس کی لغزشِ قدم سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وُہ ابھی تک خوابوں کی دُنیا میں کھوئی ہوئی ہے، پریشان و حیرت زدہ۔

چینی کے برتنوں کے ٹکرانے کی آواز آتی ہے، چائے کی پیالیاں اور طشتریاں میز پر لگائی جا رہی ہیں، وہ لڑکی واپس جا رہی ہے، تیز تیز قدم آہستہ آہستہ پڑ رہے ہیں۔

نوجوان اپنے ذہن میں ہونے والی گفتگو کا خاکہ کھینچ رہا ہے، وہ سوچ رہا ہے کہ یوں آغاز کروں گا " میں آپ کے لئے بالکل اجنبی کی حیثیت رکھتا ہوں، اس لئے مجھے آپ سے متعارف ہونے کے لئے کچھ کہنا پڑے گا۔ میں جمال ہوں، انٹرمیڈیٹ کا کامرس میں امتحان دیا ہے، آپ کے یہاں سٹیر ذاتی کی جگہ کے لئے درخواست دی تھی، اس لئے آپ سے ملنے حاضر ہوا تھا۔"

" امی ـــــ شکر " کی سریلی آواز نے اس کا خیال بٹا دیا۔ صبح کے وقت چڑیوں کی چہچہاہٹ سننے کے بعد جس طرح کنواریاں مرجھائے ہوئے پھولوں کا ملگجا ہار اپنی گردن سے توڑ کر اُتار پھینکتی ہیں، اسی طرح نوجوان کے تخیل کا ہار، جو وہ اِک متوقع محسن کی خدمت میں نذر دینے کے لئے پرو رہا تھا، کسی نے جھنجھلا کر توڑ دیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس کے بعد اشاروں میں یہ کہا گیا ہوگا " یہ رہا شکردان! اس وقت کے لئے پوری نہ ہوگی، اس میں بھر لاؤں نا۔"

جمال سوچنے لگا " اگر انہوں نے کہا کہ اس جگہ کا انتظام ہو گیا ہے تو میں ان سے پُوچھوں گا کہ کیا آپ کو اپنے بچوں کے لئے ایک اتالیق چاہیئے، یقیناً انہیں ضرورت ہوگی، بس میں اپنی خدمات پیش کر دوں گا۔ سامنے کے اس کمرہ میں آ رہوں گا۔ بیس پچیس روپیہ جیب خرچ کے لئے کافی ہُوا کریں گے (ایک لڑکی ڈرائینگ روم کے پردہ میں سے جھانک رہی ہے) بیگم صاحبہ سے کچھ دن میں ہی اجازت لے لوں گا کہ ان کو امی کہا کروں، ان کے خاندان کا ایک فرد ہو جاؤں گا۔ شاید ان کا کوئی لڑکا نہ ہو۔ وہ مجھ سے ایک ماں کا سا برتاؤ کرنے لگیں۔ ممکن ہے نیا سال شروع ہونے پر وہ مجھے کالج بھیج دیں کہ میں اپنی تعلیم پوری کر سکوں جو اپنی غربت کی وجہ سے میں جاری نہیں رکھ سکا، لیکن میں نوجوان ہوں کیوں دوسروں کا احسان قبول کرنے لگا۔

" رابعہ ـــــ رابعہ" ڈرائینگ روم کے پردہ سے جھانکنے والی کم عمر لڑکی غائب ہو جاتی ہے۔ کھانے کے کمرہ میں سب لوگ جمع ہیں، ایک سیانی بچی، اس گانے والی گڑیا کے پیچھے برآمدے میں نکل آئی ہے، اس کی خوشامد کر رہی ہے کہ چلو کھیر کھا لو، وُہ

خود کھا آئی ہے، امی کی خواہش ہے کہ اس کی چھوٹی بہن بھی کھا لے اگرمی میں صبح ہی صبح بچوں کو ضرور کچھ کھا لینا چاہئے۔ بچی ایک نام لے کر کسی کو پکار رہی ہے، غالباً اس کے ساتھ ناشتہ کرنا چاہتی ہے، لڑکی اپنا مُنہ کھول کر اس کو یقین دلاتی ہے کہ کھیر پکی رکھی ہے —— خان قسم کے انسان یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وُہ بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہیں، برآمدے کے صحن میں ٹہل رہے ہیں، مقصد یہ ہے کہ کوئی جھلک دیکھ پائیں ——

"دیکھو" (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کے کمرہ کے دروازہ پر کوئی ٹھہر گیا ہے)" خانساماں سے کہہ دینا کہ کباب اچھی طرح تل دیا کرے،" اندر سے کچھ رہ جاتے ہیں: اس آواز سے سنجیدگی ٹپک رہی ہے، اس میں کوئی لوچ نہیں، یقیناً امی ہدایات دے رہی ہیں۔ اس کے بعد قدموں کی آواز آتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ امّی کی بڑی لڑکی ہدایات دینے جا رہی ہے۔

اس وقت جمال کا تخیّل، سامنے کے کھُلے میدان میں ہوا کھا رہا ہے۔ اس کے خیال میں اس میدان کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ یہاں بہت سے مکانات بنا دیئے جائیں، جن میں ان لوگوں کو مُفت رہنے دیا جائے جو غریب ہیں، جن کی جھونپڑیوں کے قریب سے اک نالہ گزرتا ہے جس میں شہر کا تمام گندہ پانی جمع ہوتا ہے، اور یہ جو محل کے غیر آباد حصّے ہیں اِن میں ایسے متوسّط الحال باشندوں کو (غالباً اِس لئے کہ وہ خود ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہے) رکھا جائے جن کے خرچ ان کی آمدنی سے زیادہ رہتے ہیں، اور جو قرض کے بوجھ تلے اتنے دبے ہوئے ہیں کہ اپنا ذاتی مکان بھی نہیں بنا پاتے۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنی ناانصافی کیوں روا رکھی جاتی ہے، آخر خدا اپنے سب بندوں کو ایک سی مراعات کیوں نہیں دیتا۔ کاش، اس وقت وہ غریب ہوتا، یا پھر اتنا امیر کہ یہ تمام محل نہیں تو وہی حصّہ جس کے برآمدے میں وہ بیٹھا ہے، اس کے قبضہ میں ہوتا اور وہ آزادانہ چل پھر سکتا۔ بیچ کے طبقہ میں رہنا تو ایسا ہی ہے جیسے موت سے قبل تختۂ دار پر لٹکا دیا جانا۔ یہ زندگی اسے پسند نہیں جہاں آرزوئیں حبس دوام کی سزا پاتی ہیں، وہ ایک غریب کی طرح یہ کہہ کر کہ یہ عیش و عشرت اس کے نصیب میں نہیں، صبر کرنا نہیں جانتا، اس کے اس عالمِ بےصبری نے اس کا سکون چھین رکھا ہے اور وہ ایک طائرِ آوارہ کی طرح اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔

یکایک اسے خیال آتا ہے کہ یہاں بیٹھے بیٹھے یہ وقت ہو گیا۔ اس نے دوسرے ستم رسیدہ منتظر سے وقت معلوم کیا۔ سات بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں گویا اُس کو یہاں آئے سوا گھنٹہ ہو گیا، کیا ایک بیکار آدمی کے وقت کی کوئی قیمت بھی نہیں ہوتی؛ ملازم ڈرائینگ روم کے صوفوں کو جھاڑ رہا ہے —— کتنی بیکار چیزیں ہوتی ہیں ان امیروں کے یہاں، غالباً ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہُوا کرتے ہیں۔ ان کو فروخت کر کے یہ روپیہ غریبوں کے کام میں لایا جائے تو کتنا اچھا ہو —— وہ اس کو بُلا کر اپنا کارڈ دے دیتا ہے کم از کم صاحب کو معلوم تو ہو جائے کہ ان کا باہر انتظار ہو رہا ہے۔ ادھر سے لڑکی کے کھانے کے کمرہ کی طرف آنے کی آواز آتی ہے گیلری میں داخل ہوتے ہوئے خادم کے ہاتھ میں وہ کارڈ دیکھ کر ٹھہر جاتی ہے، جمال کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کو پڑھتی ہے

اور پھر کمرہ سے نکلتے ہوئے ــــ جہاں چائے پینے کے لئے وہ تنہا رہ گئی تھی ــــ اس کی آواز آتی ہے "شرم نہیں آتی تمہیں چھوٹی بہن کی شکایت کرتے" وہ اپنے کسی بھائی یا بہن پر خفا ہو رہی ہے۔

اتنے میں کھیر کھا کر اپنا مُنہ دکھانے والی لڑکی، ڈرائینگ روم کے دروازہ سے برآمدہ میں آکر اخبار اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ گیلری کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے میں سے جمال کو اِک چہرہ جھانکتا دکھائی دیتا ہے، اس کے خدوخال صاف نظر نہیں آتے البتہ سفید شلوار، ہلکے گلابی رنگ کا دوپٹہ اب اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

صاحب تیار ہو کر باہر نکل آئے ہیں، انہوں نے جمال کو یہ بتانے کے بعد کہ خالی جگہ کا انتظام کر دیا گیا، اس سے دریافت کیا کہ "کیا تم حساب دان کا کام کر سکو گے"۔ اس کے بغیر سوچے سمجھے جواب پر "مجھے کوئی تجربہ تو نہیں، البتہ اُمید ہے کہ میں کام چلا سکوں گا" وہ اُسے دفتر میں دس بجے آنے کی دعوت دیتے ہیں، اور وہ اُن کا شکریہ ادا کر کے اُٹھ جاتا ہے۔ کہیں پردہ کے پیچھے سے دو آنکھیں تو اُس کا تعاقب نہیں کر رہی ہیں؟

اب جمال سائیکل پر سوار مکان واپس جا رہا ہے ــــ اس نے قصداً طویل راستہ کا انتخاب کیا ہے کہ سوچتا جائے، اس کے کانوں میں رسیلی آوازیں گونج رہی ہیں ــــ البتہ اس کا ایوانِ خیال تعمیر ہوتے ہی ہوتے بیٹھ گیا ہے، وہ خیال کرتا جا رہا ہے "عجیب اخلاق ہے جس کے لوگ اتنے مداح ہو جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے عقل تو انہیں چھو کر نہیں گئی، پہلی ہی ملاقات میں، جناب نے ایک جگہ تجویز کر دی، انہیں تو لوگ خوب بیوقوف بناتے ہوں گے، آخر کچھ تو حالات پوچھتے، کسی سفارشی چٹھی کا انتظار کرتے، کئی بار اپنے پاس بُلانے کی زحمت دیتے ــــ لیکن انصاف کا تقاضا تو یہی تھا کہ ذاتی صفات پر معاملہ طے کر دیا جائے اس کی طرف تو میں خود ان کو توجہ دلاتا اگر وہ بڑے آدمی کی طرح ملتے۔ تیس روپیہ ملیں گے، لیکن اس سے تو وہ بیس اچھے ہوتے جو اس محل میں سکونت اور کھانے کے ساتھ ملا کرتے۔ شہر کے ہنگاموں سے دُور آزادی کی زندگی نصیب ہوتی۔ اور موٹر کی سواری بھی جو شہر کی شاہراہوں پر فراٹے بھرتی اِدھر سے اُدھر گزرتی اور امارت کی اُڑائی ہوئی خاک غریبوں کی آنکھوں میں جھونکا کرتی ہے۔ اور پھر صاحب کے ساتھ مختلف جگہوں کا دورہ، ہم تعلیم یافتوں سے تو وہ آٹھ دس روپیہ کے نوکر ہی اچھے جو صاحب کے ساتھ گرمیاں پہاڑ پر گزارتے ہیں۔

ایک راہ گیر سے ٹکر کھاتے ہی وہ سنبھل گیا اور دس بجے دفتر گیا جہاں بارہ بجے تک صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی، جو افسر اپنے اوقات کا پابند نہیں اس کے پاس اس نے دوبارہ جانا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی تک اس کے کانوں میں وہ آوازیں آتی ہیں کہیں وہ لڑکی ــــ گیلری کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر، ہر صبح اُس کی آمد کا انتظار تو نہیں کرتی ہے؟

دیوانہ مصطفےٰ آبادی

محفلِ ادب

تقدیر و تدبیر

(مولانا سالک اور پروفیسر ہاشمی کا مباحثہ)

یکم مئی کو لاہور کی نشرگاہ پر مولانا عبد المجید سالک ایڈیٹر "انقلاب" اور پروفیسر بشیر احمد ہاشمی ایم۔ اے (ٹریننگ کالج لاہور) کے درمیان "تقدیر و تدبیر" کے مسئلہ پر نہایت پُرلطف مباحثہ ہوا۔ جو ہر جگہ بے حد دلچسپی سے سُنا گیا۔ یہ مباحثہ ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے :-

"اخاہ! ہاشمی صاحب ہیں؛ کہئے حضرت! اتنے دن کہاں رہے؟"

"اجی سالک صاحب! کچھ نہ پوچھئے۔ زندگی کی مصروفیتیں کہیں چین نہیں لینے دیتیں۔ بہت دفعہ جی چاہا کسی وقت آپ کی طرف آؤں اور کچھ گپ شپ رہے۔ لیکن کچھ ایسی ہی پریشانیوں میں اُلجھا رہا۔"

"خیر باشد۔ آخر وہ کیا پریشانیاں تھیں؛ ذرا ایک آدھ میں بھی تو سُنوں۔"

"اجی! وہ آپ نے سُنا ہوگا۔ میرے دوست جلیل احمد صاحب ہیں نا؟"

"ہاں ہاں، وہی مرزا نصیر احمد کے بڑے صاحبزادے۔"

"جی ہاں وُہی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ہمارے اُن کے نہایت گہرے تعلقات بزرگوں کے وقت سے چلے آتے ہیں۔ میں نے ان کی نوکری کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ اس دفعہ وہ ای، اے، سی کے امتحان میں بیٹھے لیکن تقدیر کی بات ہے لڑھک گئے۔"

"جی یہ تو قاعدہ ہی ہے۔ فیل ہوگئے تو تقدیر کی بات۔ پاس ہو جاتے تو اپنی تدبیر پر نازاں ہوتے۔"

"نہیں بھائی جان۔ سچ مچ تقدیر ہی سے ایسا پانسا پلٹا کہ بیچارے رہ گئے۔ ورنہ پڑھنے لکھنے میں بے حد طاق تھے۔ تیاری بہت اچھی تھی۔ ہمیں تو اُن کی کامیابی کا سو فیصدی یقین تھا۔ لیکن تقدیر کی بات"

"پھر وہی تقدیر کی بات! ارے بھئی جب تیاری اچھی تھی، پڑھتے لکھتے بھی رہے۔ تو فیل کیونکر ہوگئے؟"

"سُن لیجئے، دو دن تک تو امتحان میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ بیٹھے۔ پرچے بہت شاندار کئے۔ تیسرے دن جا کر امتحان

کے کمرے میں بیٹھے ہی تھے کہ دفعتہً خدا جانے کیا ہؤا۔ طبیعت مالش کرنے لگی۔ باہر آئے متلی ہوئی اور ایسے نڈھال ہوگئے کہ پرچہ نہ لکھ سکے۔ اب اس کو تقدیر کا معاملہ نہ کہا جائے تو اَور کیا کہا جائے؟"

"اِس میں تقدیر کی کون سی بات ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھتے تو متلی کیوں ہوتی۔ خود تو حفظِ صحت کی تدبیر نہ کی اور سارا الزام تقدیر کے سر پر رکھ دیا۔"

"واہ کمال کر دیا آپ نے۔ اجی وہ کوئی غیب دان تو نہیں تھے کہ اُنہیں متلی کی اطلاع پہلے ہی سے ہو جاتی۔ دفعتہً طبیعت خراب ہوگئی۔"

"اجی حضرت! چھوڑیئے ان باتوں کو۔ صبح ناشتے میں اندھا دُھند بہت سا کھا گئے ہوں گے۔ اِس خیال سے کہ امتحان کے دَوران میں بھُوک نہ لگے۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ کھٹّا ہؤا معدہ بھاری غذا کو ہضم نہ کر سکا۔ بھلا اس میں تقدیر کی بات کیا ہے۔ اپنی بے تدبیری کے نتیجے ہیں۔"

"تو کیا آپ تقدیر کو بالکل نہیں مانتے؟"

"اوّل تو میں تقدیر کو مانتا ہی نہیں۔ اور اگر اس لفظ کے کچھ معنی ہیں تو ہر شخص کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ آپ تو کہہ دینگے کہ ہٹلر، مسولینی اور مصطفےٰ کمال محض تقدیر سے اتنے بڑے آدمی بن گئے۔ حالانکہ وہ صرف اپنی ذاتی محنت اور تدبیر سے اس مرتبے کو پہنچے ہیں۔"

"لیکن کیا قیصر ولیم محنتی نہ تھا؟ تدبیر کا بادشاہ نہ تھا؟ کیا جرمنی کے پاس یورپ کی تمام سلطنتوں سے بہتر ساز و سامان نہ تھا؟ کیا جرمنی کی فوج یورپ میں بہترین نہ تھی۔ پھر اُس نے شکست کیوں کھائی؟ ارے میاں! یہ محض تقدیر کے کھیل ہیں۔ اس میں انسانی تدبیر کا کیا بس چلتا ہے!"

"لیکن میرے نزدیک تو قیصر نے محض بے تدبیری سے شکست کھائی۔ اتحادیوں نے تدبیر سے کام لے کر امریکہ کو جنگ میں اپنی طرف شریک کر لیا۔ قیصر کی تدبیر یہاں ناکام رہی۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ بہتر تدبیر کرنے والے فتحیاب ہوگئے اور قیصر صاحب مُنہ کے بل گرے۔"

"میرے نزدیک تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں یُونہی لکھا تھا کہ امریکہ جنگ میں شامل ہو اور اتحادیوں کی مدد کرے۔"

"اس سے بہتر آپ اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جہاں کہیں کسی سے تدبیر میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ناکامی کو تقدیر ہی کے سر تھوپ دیا کرتا ہے۔"

"اچھا سُنئے، ایک شخص یورپ سے تجارت کے لئے مال خریدنا چاہتا ہے۔ بازار کا رنگ دیکھتا ہے۔ منافع کا اندازہ کرتا ہے۔ بین الاقوامی حالات اور نرخوں کی اُونچ نیچ پر خوب غور کر لیتا ہے، اس کے بعد مال کا آرڈر دے دیتا ہے۔ دس دن کے بعد خبر آتی ہے کہ جس جہاز میں مال آ رہا تھا۔ وہ بحرِ ہند میں غرق ہوگیا۔ بیچارہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کیا یہ خالص تقدیری معاملہ نہیں؟"

"بھائی میاں۔ یہ تقدیر نہیں اتّفاقات ہیں۔ اگر وہ شخص اپنے مال کا بحری بیمہ کرا لیتا تو بات کچھ بھی نہ تھی۔ جہاز کے غرق ہونے سے اُسے ذرا بھی نقصان نہ پہنچتا۔ سارا روپیہ نقد مل جاتا۔ تدبیر نہ کی۔ للٰہذا تباہ ہوگیا۔"

"اچھا، یہ تو بتایئے انسان جو کچھ کرتا ہے، گناہ ہو یا ثواب، نیکی ہو یا بدی۔ یہ تمام افعال تقدیر ہی سے سرزد ہوتے ہیں یا نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ انسان فاعلِ مختار ہے۔ اگر نیکی اور بدی تقدیری باتیں ہوتیں تو سزا و جزا کا جھگڑا کیوں ہوتا۔ مذہب کیوں اعلان کرتا کہ نیکی کرو گے تو جزا ملے گی اور بدی کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے۔ قانون کیوں پکار پکار کر کہتا کہ چوری کرو گے تو جیل خانے جاؤ گے۔ قتل کرو گے، تو پھانسی پاؤ گے۔ اگر یہ تقدیری معاملے ہوتے اور انسان کی تدبیر کا ان میں کوئی دخل نہ ہوتا تو بدی کرنے والا یہ کہہ کر صاف چھوٹ جاتا کہ صاحب مجھ سے گناہ سرزد ہُوا تو یہ تقدیر کی بات تھی۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ بھلا خدا کی مرضی کے آگے کسی بندے کی پیش ہی کیونکر چل سکتی ہے؟"

"گویا آپ کے نزدیک خدا بھی دُنیا کے مجازی بادشاہوں کی طرح ہے جو ڈاکوؤں اور چوروں کا بہتیرا بندوبست کرتے ہیں۔ لیکن وہ ڈاکے اور چوری سے باز نہیں آتے۔ کیا آپ نے خدا کو اتنا ہی بےبس سمجھ رکھا ہے؟ یا تو خدا کو قادرِ مطلق نہ مانیئے یا یہ تسلیم کیجیے کہ دُنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اسی کی تقدیر سے ہوتا ہے اور اُس کی اجازت کے بغیر ایک ذرّہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"افسوس کہ آپ اچھے خاصے فلسفیانہ مسئلے اور منطقیانہ بحث کو کھینچ کر مذہب کی طرف لے گئے اور اتنے مذہبی آدمی ہونے کے باوجود آپ خدا کی شان میں بےادبی کر گئے۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں سے گناہ بھی خدا ہی کراتا ہے۔"

"توبہ توبہ! میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ تقدیر میں پہلے ہی سے درج ہے، خدا کے علم میں ہے کہ فلاں انسان فلاں گناہ کرے گا۔ گناہ انسان ہی کرتا ہے۔ لیکن خدا کو اِس کا پہلے سے علم ہوتا ہے۔"

"تو گویا اب یہ بحث تقدیر کی نہ رہی، بلکہ علمِ الٰہی کا مسئلہ سامنے آگیا۔ اجی حضرت! تدبیر و تقدیر کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ آپ زمین پر کھڑے کھڑے اُوپر کی طرف اُچھلتے ہیں۔ یہ آپ کی تدبیر ہے۔ اس کے بعد آپ دھڑام سے زمین پر گر پڑتے ہیں۔ یہ تقدیر ہے لیکن آپ اُوپر کو نہ اُچھلتے تو گرتے ہی کیوں؟ آپ تدبیر نہ فرماتے تو یہ تقدیر کیوں پیش آتی؟"

"اچھا آپ یہ فرمایئے کہ جب میں اپنے کمرے کا لیمپ گُل کر دیتا ہوں تو اندھیرا کیوں ہو جاتا ہے؟ کیا یہ خالص تقدیر نہیں؟"

"سبحان اللہ! کیا باریک بات فرمائی جناب نے! جب آپ اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیتے ہیں تو وہ جل کیوں جاتا ہے؟ یہ بھی تقدیر ہی ہوگی۔ لیکن میرے بھائی یہ تقدیر نہیں ہے، یہ آپ کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ آپ لیمپ گُل نہ کرتے تو اندھیرے والی تقدیر ہرگز پیش نہ آتی، آگ میں ہاتھ ڈالنے کی تدبیر نہ فرماتے تو جلنے کی تقدیر سے بچ جاتے۔"

"لیکن میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ میرا لیمپ گُل کرنا بھی تقدیر ہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں لیمپ گُل کرنا چاہوں اور اُسے گُل کرنے کے لئے اُٹھوں تو اُٹھتے ہی اُٹھتے ہارٹ فیل ہو جائے اور لیمپ بدستور روشن رہے۔ اگر لیمپ گُل کرنا میری تقدیر میں لکھا ہوگا تو مجھے اس کی توفیق ہوگی۔ ورنہ ہرگز نہ ہوگی۔ اور کوئی نہ کوئی وجہ مانع پیش آ جائے گی۔"

"لیکن آپ پھر تقدیر اور اتفاقات کو خلط ملط کر رہے ہیں۔ دُنیا ہزارہا سال سے اِسی طرح چل رہی ہے۔ لوگ لاکھوں قسم کے کام کر رہے ہیں۔ واقعات اور علّت و معلول کے سلسلے ہر وقت جاری ہیں اور حادثات کبھی کبھی پیش آتے ہیں لیکن ان حادثات کی ذمہ دار بھی اکثر

بے تدبیری ہی ہوتی ہے۔ اگر آپ کا قلب اتنا کمزور ہے کہ اُٹھتے اُٹھتے اس کی حرکت بند ہو جانے کا خطرہ ہے تو تدبیر یہ ہے کہ لیٹے رہئے اور کسی اور کو لیمپ گُل کرنے کا حکم دیجئے۔"

"ابھی پچھلے دنوں ایک اخبار میں خبر چھپی کہ بحرالکاہل میں ایک جہاز کے اندر آگ لگ گئی۔ کچھ مسافر تو جان بچانے والی کشتیوں میں سوار ہو کر بچ گئے۔ اور کچھ آگ کے شعلوں سے گھبرا کر اندھا دُھند سمندر میں کُود پڑے۔ جو تیرنا نہ جانتے تھے وہ تو سمندر کی تہ میں ایسے ڈُوبے کہ پھر نہ اُبھرے۔ لیکن جو تیرنا جانتے تھے وُہ بھی اس ناپیدا کنار سمندر میں تھوڑی دُور تک تیر کر تھک گئے اور دم لوٹ جانے سے غرق ہو گئے۔ اُن میں سے ایک شخص نے سمندر میں کیا دیکھا کہ کسی درخت کا تنا بہتا ہُوا جا رہا ہے۔ اس نے تیر کر اُس کو جا لیا اور اس تنے پر سوار ہو کر دو دِن کے بعد بھُوکا پیاسا ایک جزیرے کے کنارے جا پہنچا۔ جہاں اہلِ جزیرہ نے اس کی خاطر مدارات کی اور کچھ مُدت کے بعد وُہ پھر دُنیائے تہذیب میں جیتا جاگتا واپس آ گیا۔ انصاف فرمائیے کیا یہ خالص تقدیری معاملہ نہیں؛ اس کی تقدیر میں بچ جانا لکھا ہوگا۔ لہٰذا ایسے اسباب مہیا ہو گئے۔"

"اسباب کا مہیا ہو جانا خالص اتّفاق ہے۔ لیکن اگر درخت کا تنا نظر آ جانے کے بعد وہ شخص اُس تنے تک پہنچنے کی تدبیر نہ کرتا اور اپنے آپ کو تن بہ تقدیر سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیتا تو غرق ہو جاتا۔ یا کوئی شارک یا ویل مچھلی اس کو اپنا لقمہ بنا لیتی۔ اس نے محنت اور کوشش سے کام لیا۔ تیر کر تنے تک جا پہنچا۔ بحرالکاہل میں بے شمار جزیرے ہیں اور خود اُس تنے کا بہتا ہُوا آنا اس امر کا ثبوت تھا کہ زمین کہیں نزدیک ہی ہے۔ لہٰذا اُس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی ہو گی۔ جس طرف خشکی کے آثار نظر آئے ہوں گے اُسی طرف اس تنے کو کھیتا ہُوا چلا گیا ہوگا۔ اگر اِس واقعہ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں پانچ فیصدی اتّفاقات اور پچانوے فیصدی تدبیر اور محنت کا دخل ثابت ہو گا۔"

"توبہ توبہ۔ آپ تو بڑے ہی کٹر تدبیری ہیں۔"

"کیا کروں صاحب۔ میرا اس میں کیا اختیار ہے۔ تقدیری معاملہ ہے۔ لیکن آپ بھی تو تقدیر کو اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ اس غریب کا پیچھا ہی چھوڑنے میں نہیں آتے۔ کیا آپ نے رُوبنسن کروسو کی کہانی پڑھی ہے؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جزیرے میں جو کارہائے نمایاں کئے اُن میں تقدیر کو بھی کوئی دخل ہے۔ صرف ایک انسان، بے سروسامان، لیکن اُس نے اپنی ضرورت کی ساری چیزیں محض تدبیر سے مہیا کر لیں۔"

"لیکن حضرت۔ اگر جزیرے پر اسے ابتدائی اشیا تقدیر سے مہیا نہ ہو جاتیں تو ہم دیکھتے کہ وُہ تدبیر سے نیست کو ہست کیونکر کر لیتا۔"

"حضورِ والا، غور فرمایئے۔ انسان جب پہلے پہل اس دُنیا میں آیا ہے تو جن چیزوں کو آپ ابتدائی اشیاء کہتے ہیں یعنی پانی، لکڑی، مٹّی، سبزی، پھل وغیرہ، اُن کی ماہیت تک اُسے معلوم نہ تھی۔ اُس نے محض تدبیر سے ان چیزوں کے فائدے معلوم کئے۔ اور

یہ عظیم الشان دُنیا پیدا کر دی۔ تہذیب و تمدن، بڑی بڑی عمارتیں، عالیشان مشینیں۔ بھاپ اور بجلی اور ریڈیو اور موٹر کار اور ہوائی جہاز اور تمام دوسری ایجادیں کیا تقدیر نے تیار کر کے آدمی کو مہیا کر دی تھیں؟ یہ سب کچھ انسانی تدبیر کا کرشمہ ہے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ تقدیر میں لکھا تھا کہ ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ہو کر رہا۔"

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تقدیر اتنی قطعی چیز ہے تو لوگ چُپ چاپ اپنے گھروں میں کیوں نہیں بیٹھے رہتے؛ اگر تقدیر میں بھوکوں مرنا ہے تو خواہ کتنی ہی جدوجہد کی جائے روٹی نہ ملے گی۔ لیکن اگر تقدیر میں سب کچھ ہے تو گھر بیٹھے روٹی بھی پہنچ جائے گی۔ کپڑا بھی مل جائے گا، دوسرے مصارف بھی کسی نہ کسی طرح پورے ہو جائیں گے۔ لیکن انسانی فطرت اور انسان کا عمل خود تقدیر کو غلط اور بے اصل ثابت کر رہا ہے۔ بڑے بڑے نبی، ولی، رشی مُنی اور آپ جیسے تقدیر پرست دُنیا میں موجود ہیں لیکن جس کو دیکھو بھاگا پھرتا ہے۔ کوئی روٹی کے پیچھے ہلکان ہو رہا ہے، کوئی اچھا کپڑا پہننے کی خواہش سے بیتاب ہے، کسی کو اسمبلی کی ممبری ستا رہی ہے۔ کوئی وزیر بننے کی کوشش میں رات دن غلطان و پیچاں ہو رہا ہے۔ کوئی اخبار نکال رہا ہے، کوئی کالج میں پروفیسری کر رہا ہے، کوئی صاحب ریڈیو پر تقریر کر رہے ہیں، کوئی تقدیر و تدبیر پر مباحثہ فرما رہے ہیں۔ غرض دُنیا کو تقدیر کا نہیں بلکہ محض تدبیر کا ہنگامہ کہا جا سکتا ہے جو ہزاروں سال سے برپا ہے اور ہمیشہ برپا رہے گا۔"

"لیکن میں تو عرض کر چکا ہوں۔ انسان کی تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ وُہ سود و زیاں کے چکر میں پڑا رہے گا۔"

"یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تقدیر میں صرف تدبیر لکھی ہے تو میرا دعویٰ بالکل صحیح ثابت ہو گیا کہ اصل چیز تدبیر ہی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ تقدیر میں یہ بھی لکھا ہو گا کہ انسان نیکی بھی کرے گا اور بدی بھی کرے گا یعنی انسان کا کچھ نہ کچھ کرنا ہی تدبیر میں لکھا ہے۔ اسی "کرنے" کو تو میں تدبیر کہتا ہوں۔ اور پھر لُطف یہ ہے کہ نیکی اور بدی کی جزا اور سزا خدا کے ہاں بھی ہے اور دُنیاوی حُکام کے ہاں بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تقدیر ہو یا نہ ہو۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا جواب دہ آپ ہی ہے۔"

"کیا آپ نے خواجہ حافظ کا وُہ شعر نہیں سُنا؟

گُناہ اگرچہ نبود اختیارِ ما حافظ — تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

افعال کا مصدر ارادہ ہے اور ارادۂ الٰہی انسانی ارادے پر غالب ہے، ہم سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو ارادے سے ہوتا ہے لیکن ارادے کی باگ کسی بڑی ہستی کے ہاتھ میں ہے اسلئے ہماری بے اختیاری ظاہر ہے۔ پس ادب کا تقاضا یہ ہے کہ اپنا قصور مانو۔ ورنہ حقیقت میں ہمارا کچھ قصور نہیں۔"

"پھر آپ حق پرستی کی پٹڑی پر سے اُتر گئے۔ کوئی خدا پرست سُن لے گا تو کیا کہے گا میرے بھائی۔ خدا پر الزام نہ رکھو۔ اُس نے تمہیں نیکی اور بدی کا رستہ الگ الگ بتا دیا ہے۔ نیکی کے رستے پر چلو گے تو نتیجہ تمہارے حق میں اچھا ہو گا۔ بُرے کام کرو گے تو مار کھاؤ گے۔ خواہ

حافظ کے شعر کی لغویت تو اسی سے ظاہر ہے کہ محض گناہ کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ نیکی کا ذکر ہی نہیں۔ گویا نیکیاں تمام خواجہ صاحب کے اپنے اختیار سے صادر ہوتی ہیں۔ اور گناہ اُن سے کوئی اور کراتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ"

"آپ بار بار مجھ پر الزام دھرتے ہیں کہ میں نعوذ باللہ خدا کی شان میں بے ادبی کرتا ہوں۔ اجی حضرت! میں تو خدا کو قادر مطلق سمجھتا ہوں۔ اس کی تقدیر کو تمام کائنات پر حاوی مانتا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ انسان کے فعل تو ایک طرف رہے۔ اُس کے حکم کے بغیر پتا تک نہیں ہل سکتا۔ نیکی ہو یا بدی۔ ہر چیز اُسی کے اشارے سے ہوتی ہے۔ انسان بالکل بے بس ہے۔ ارادہ ہے تو صرف خدا کا، اور اختیار ہے تو صرف اُسی کا۔ ہماری تدبیر کوئی شے نہیں۔ اس کی تقدیر سب کچھ ہے۔"

"لیکن بھائی جان۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ انسان کی فطرت اور اس کا روزمرہ کا عمل اس بات کا گواہ ہے کہ اصل شے تدبیر ہے۔ ہر شخص ہر وقت کسی نہ کسی اُدھیڑ بُن میں لگا ہوا ہے۔ کوئی شخص پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھتا کہ تقدیر میں ہوگا تو کچھ ہل جائے گا۔ نہ ہوگا تو خیر۔ باقی رہا سزا اور جزا کا مسئلہ۔ اس میں انسانی فطرت پر غور کر لیجئے۔ اگر آپ کو کوئی شخص گالی دے، مار بیٹھے۔ آنکھ پھوڑ دے۔ سر توڑ دے تو آپ اُس کو بُرا بھلا کیوں کہتے ہیں۔ اس کو مارنے کیوں دوڑتے ہیں۔ عدالت کچہری کیوں بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ اُس وقت آپ کا یہ فلسفہ کہاں فوت ہوجاتا ہے کہ جو فعل صادر ہوتا ہے خدا اور تقدیر کی طرف سے ہوتا ہے اور جس بندے نے تشدد کیا وہ معذور تھا۔ کیونکہ اُس کا ارادہ بہرحال خدا کے ارادے کے تابع تھا۔

انسانی فطرت خود تقدیر کے عقیدے سے بغاوت کرتی ہے۔ اور تدبیر کے سوا کسی چیز کو معتبر نہیں سمجھتی۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ تقدیر کے معنی نہیں سمجھتے۔ گستاخی معاف۔ اس میں بُرا ماننے کی بات نہیں۔ آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری اتنی مغز زنی کے باوجود تقدیر کے معنی آپ کے ذہن میں نہیں اُترے۔"

"اگر آپ لاجواب ہو گئے ہیں۔ اور مجھے جاہل کہہ کر اپنا جی خوش کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ اپنا جی خوش کر لیجئے۔ ع

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

لیکن ہم نے تو یہی سُنا ہے کہ لوگ جب بحث میں عاجز رہ جاتے ہیں۔ تو پھر لفظوں کے معانی اور اصطلاحوں کی تعریفوں سے مدِ مقابل کو زیر کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ چونکہ آپ بھی میرے نزدیک خیالات کے اعتبار سے مولوی ہی ہیں۔ اس لئے آپ نے بھی یہی تدبیر اختیار فرمائی۔ نہ تو یہ "تقدیر" ایجاد فرمائی۔"

"میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ گستاخی معاف۔ لیکن آپ بُرا مان گئے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ تقدیر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اندازہ۔ اس کا ماخذ "قدر" ہے۔

"جی۔ اتنی عربی تو میں بھی جانتا ہوں۔ گو آپ کی طرح علامہ ہونے کا دعوٰے نہیں رکھتا"۔

"تو اندازے سے مراد یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اندازہ خدا کے علم میں پہلے ہی سے ہے کہ یہ ہوگا اور یہ نہ ہوگا یہ تقدیرِ الٰہی تھی کہ زمین کا ایک چوتھائی حصہ آباد ہو، باقی سمندر رہو۔ بہار اور کوئٹہ کے زلزلے، یورپ کی جنگ اور اسی قسم کے اور تغیرات سب تقدیر کی لوح پر روزِ ازل سے لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ اندازہ برابر درست ہے"۔

"لیکن بہرحال یہ بھی تو مفروضہ ہی ہے۔ عقل کی بات کیجئے، ہم اس قسم کی اُڑن گھائیوں میں نہیں آنے کا۔ اگر وُہ اندازہ کوئی حقیقی چیز ہے۔ تو کیا آپ اس کی لوح کو پڑھ کر مجھے بتا سکتے ہیں کہ یورپ کی آئندہ جنگ کب ہوگی؛ اس میں پہل کون کرے گا؛ ظالم کون ہوگا اور مظلوم کون؛ آپ فوج میں بھرتی ہونگے یا نہیں اور وہاں سے جیتے جاگتے واپس آئیں گے یا نہیں؛"

"لیجئے۔ آپ اب کج بحثی پر اُتر آئے۔ میری پوری بات تو آپ نے سُنی ہی نہیں۔ مستقبل کا علم تو خدا ہی کو ہے مجھے کیونکر ہو سکتا ہے، یہ آسمانی کُروں کی گردش، صبح و شام۔ دن اور رات، چاند اور سُورج کا گرہن، گرمی اور جاڑا، بہار اور خزاں، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندی۔ خاص قسم کے پھولوں کا ایک خاص موسم میں کھلنا، خاص پھلوں کا خاص موسم میں پیدا ہونا یہ سب تقدیرِ الٰہی کے کرشمے ہیں، اور ان کا جو اندازہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اسی اندازے پر چل رہے ہیں"۔

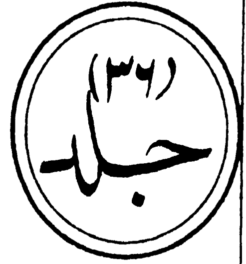
"سبحان اللہ۔ اس وقت تو کمال کر گئے۔ معلوم ہوا کہ آپ منطقی اور مناظر ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ یعنی ماشاء اللہ کیا سماں باندھا ہے لیکن جنابِ والا۔ آپ نے جمادات و نباتات کا ذکر بے کار فرمایا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اور تمام مخلوقات میں اس کا شرف یہ ہے کہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ فاعلِ مختار ہے، پتھر اور درخت نہ نیکی کر سکتے ہیں نہ بدی۔ کیا آپ نے انسان کو بھی پتھر سمجھا ہے؛ کائنات میں کوئی ہستی خدا کی نافرمانی نہیں کرتی اِلّا انسان۔ کوئی ہستی خدا کے حکم کے مطابق نیکی نہیں کرتی سوائے انسان کے۔ نبی انسانوں ہی میں بھیجے گئے تاکہ اس فاعلِ مختار کو بدی سے روکیں اور نیکی کی ہدایت دیں۔ پتھروں اور درختوں اور آبشاروں اور دریاؤں میں آج تک کوئی نبی نہیں آیا۔ تقدیر جن معنوں میں آپ کے نزدیک تقدیر ہے وُہ بے معنی ہے، انسان کی تقدیر اس کی اپنی تدبیر میں پوشیدہ ہے۔ وہ جو کرے گا بھرے گا، جو بوئے گا کاٹے گا"۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ایمان خدا کے متعلق بہت ناقص ہے، آپ اپنے ایمان کی فکر کیجئے"۔

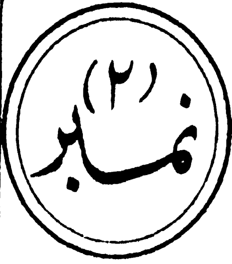
"جی بہت خوب۔ آپ میری فکر نہ کیجئے۔ قاضی جی تم کیوں دُبلے، شہر کے اندیشے سے۔ آپ اپنے ذہن کا علاج کرائیے"۔

"اجی رہنے دیجئے۔ بڑے آئے کہیں سے۔ اِن کا ذہن بہت اچھا ہے اور ہم کُند ذہن ہیں۔ اللہ تیری قدرت!"

'شیرازہ'



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ اگست سنہ ۱۹۳۹ء

تصویر:- بادبانی کشتی

چندہ سالانہ صہ ششماہی ہے (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

لاہور سے تقاضا آتا ہے کہ بزمِ ہمایوں جلد بھیجو، فلاں تاریخ تک پہنچ جائے، کاتب کو چند دنوں کے لئے چھٹی پر جانا ہے۔ معمولی بات ہے کسی طرح دو صفحے گھسیٹ دیئے جائیں گے۔ ہزاروں مسائل ہیں لاکھوں باتیں ہیں ہٹلر اور مسولینی کی، لیگ اور کانگرس کی، نوجوانوں کی بغاوت کی، پرانی عورتوں کی غلامی کی، نئی عورتوں کی آزادی کی، گاندھی جی اور شری بوس کی، جناح صاحب اور سر سکندر کی، یا پھر دُور نہ جایئے تو یہیں اسی سری نگر میں، اسی نیڈو ہوٹل میں بدھ کی راتوں کو باجے کے ساتھ ناچ کی، ناچ کے ساتھ اداؤں کی، یا کشمیر کی نئی سیاسی تحریکات کی، کشمیریوں کی تب اور اب کی زندگی کی۔ یہ ہیں ترقیات: آج کل کے واقعات، تازہ بہ تازہ، نَو بہ نَو، اِن میں سے کسی ایک کا بھی ذکر ہونے لگے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو سکتے ہیں!

لیکن دقت یہ ہے کہ یہاں آج کل سیاہی سے گریز ہے اور سفیدی کی طرف رجوع۔ کاغذ کو سیاہ نہ کیا جائے سفید سادہ چھوڑ دیا جائے۔ کشمیر میں آئے ہیں اک یہاں تو فراغت ہو قطعی، جب جو جی میں آئے کئے جایئے، نہ وقت کی پابندی نہ کام کی قید، یوں تو پہلے بھی آزادی حاصل ہے آبائی ورثے کی بدولت، لیکن یہ آزادی پوری اور بے دھڑک ہو تب جانیں کہ ہم واقعی آزاد ہیں!

اُدھر سے پھر وہی تقاضا ہے کہ بزمِ ہمایوں پہنچ جائے جلد۔ ہمایوں کوئی کاروباری شے تو تھی نہیں۔ کسی قسم کے شوق سے جاری کیا، کسی قسم کے شوق کے بل پر جاری ہے، ادبی خدمت بھی کہلاتی ہے، پھر کیا ضرور ہے کہ اس میں بھی پابندی ہو؛ "ریاست" کا ایک حصہ اسے سمجھ لیا جائے۔

یہ نہیں کہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا، ہر روز منشیوں اور کرایہ داروں کے، عزیزوں اور دوستوں کے، انجمنوں اور اُور بعض ہستیوں کے خطوں کا، بعض کا وقت پر بعض کا جان بوجھ کر دیر سے جواب دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک خاصا لکھنا پڑھنا ہے، قلم دوات کی ایک خاصی صحبت ہے، لکھنے کی تختی پر صفحات سے ایک خاصی دُوبدو ہے، اس "بے ادبی" لکھنے سے گریز نہیں تو اس ادبی لکھت پر کیوں ناک بھوں چڑھائی جائے؛

حقیقت یہ ہے کہ قدیمی "بلبلِ ہزار داستان" اور "عندلیبِ زار" کا ابھی تک اثر ہے۔ جی کہتا ہے کہ ادب وہ ہے جو بجائے انجمنوں اور بازاروں اور سیاست اور معیشت کی زندگی کے تخیل اور علیحدگی اور آزادگی میں پنپے۔ اس پر چیمبرلین اور ہٹلر اور برطانوی سلطنت اور کانگرسی سطوت بلکہ روزمرہ کے معاشری لطف و کشمکش کا بھی کچھ اثر نہ ہو۔ یہ محض جھگڑے ہیں، بے معنی ہیں، بنائے ہوئے واقعات ہیں عارضی اور فانی۔ ادب کا دامن چاہیئے کہ بند رہے خالص ادبیت اور ازلی ابدیت سے بلکہ یہ تعلق بھی اک بندش کی صورت میں نہ ہو، آزاد ہو آزاد، آزاد اُس سادھو کی طرح جو اپنا ۳ × ۴ فٹ کا سائبان پھیلائے چشمہ شاہی کے باہر پہاڑ کے دامن میں دُھونی رمائے

بیٹھا تھا اور جب مدیرِ ہمایوں نے اُس کا فوٹو لینا چاہا تو اُس نے کہا "بابا! ہمارا تسبیر نہ لو ہم سادھو لوگ ہیں۔" ہاں یہ ضرور ہے کہ جب "تسبیر" کھینچی جا چکی تو اُس نے کہا "ارے بابا! ہمیں بھی کچھ مل جائے"۔

"کچھ مِل جائے"، یہ ہیں آزادی اور آزادگی کی بیڑیاں! اسی لئے ہمایوں کا تقاضا ہے مضمون کے لئے فلاں تاریخ تک، بندش عینِ حیات ہے، اپنے آپ سے بھی چھٹکارا نہیں، بندھے ہوئے ہیں، متعلق ہیں، منسوب ہیں اُس محبوبہ سے جسے خودی کہتے ہیں، وہ چنار جس کی ایک طرف جڑیں دُور تک پھیلی ہوئی ہیں اور دوسری طرف شاخیں، شاخوں پر پتے "ہاتھ نما" کھلا پھیلا ہُوا ہاتھ کسی اور ہاتھ سے ملنے کے لئے چمن کی ہواؤں میں بیقرار و مضطرب! آزادی بیقرار ہے بندش کے لئے، بندش مضطرب ہے آزادی کے لئے۔ اِسی ازلی کشمکش کا نام حیاتِ ابدی ہے۔ یہ نہیں کہ زندگی میں قرار نہیں، قرار ہے لیکن اُس کا وجود بیقراری سے قائم ہے جیسے بیقراری بھی صرف قرار سے زندہ و تابندہ ہے۔

بات اتنی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ ایک تخیل کا مضمون لکھوں آزاد ہو کر یعنی عام روزمرہ کی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک تھوڑی دیر کے لئے خاص بلکہ خاص الخاص بندشوں سے لپٹ کر اپنے قلم کو آزاد چھوڑ دوں کہ وہ لکھے جب لکھے اور جو لکھے۔

خدا جانے یہ مضمون کیسا ہوگا؟ اس مسئلے کی دِقتوں نے اس امن اور چین کی سرزمین میں اِس آرام اور ذرا سی بے تعلقی کے اوقات میں مجھے بعض دفعہ راتوں کو جگا جگا دیا، کیا لکھا جائے، یہ! کس طرح لکھا جائے، یوں!

شکر ہے کہ میں اس اینچا تانی میں تھا "آزادگی کی اس قید میں تھا کہ کاتب اور مینیجر کی مہربانی سے مجھے اس مصیبت سے نجات ملی۔ میں ہوا میں ہاتھ پاؤں مار کر فضول اُڑنے کی کوشش کر رہا تھا، کاروباری تقاضے کی برکت سے میں زمین پر آ رہا ——

فرمایئے مزاج اچھا ہے؟

بشیر احمد

جہاں نما

زندگی کا بلند معیار

مسٹر ونٹ نے بین الاقوامی مجلس عمال جنیوا میں مختلف ملکوں کے معیارِ زندگی پر ایک سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ اکثر حکومتیں اب عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی طرف متوجہ ہو رہی ہیں ۔ معاشرتی فلاح کے ہر کام میں عوام اور حکومت کا اشتراکِ عمل ضروری ہے ۔ اس قسم کے اصلاحی منصوبوں میں عوام کی صحت کا خیال سب سے زیادہ اہم ہے ، کیونکہ صحت سے استعدادِ عمل میں اضافہ ہوتا ہے اور استعدادِ عمل دولت کی ترقی کا موجب ہوتی ہے جس سے زندگی کا معیار خود بخود بلند ہو جاتا ہے ۔ ملکی اور قومی فلاح کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے زچگی میں ماؤں کی امداد ، شیر خوارگی میں بچوں کی موت کی روک تھام ، بیماروں کا علاج اور صحت کے لئے حفظِ ماتقدم کی تدابیر پر عمل درآمد بے انتہا ضروری ہے ۔

ملکی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے کسانوں کی فلاح کی تدابیر سب سے مقدم ہیں ۔ چنانچہ اکثر حکومتیں اس طرف متوجہ ہوئی ہیں ۔ ہنگری میں کسانوں کو ہر قسم کی ضروری مدد دی جاتی ہے ۔ اُن کے بڑھاپے کے لئے لازمی طور پر بیمہ کیا جاتا ہے ، لتھونیا میں کاشتکاروں کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور انہیں مفت طبی امداد دی جاتی ہے ۔ اٹلی میں سل اور دِق کا علاج حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے اور کسانوں کو زچگی کے موقع پر امداد دی جاتی ہے ۔ جاپان میں بھی بیماری کے ایام کے لئے کسانوں کا بیمہ کیا جاتا ہے ۔

کام کرنے والوں کی طاقت کو بحال رکھنے کے لئے حکومتیں غذا کی عمدگی کی طرف بھی متوجہ ہو رہی ہیں ۔ سویڈن اور ممالک متحدہ امریکا میں حکومت زائد اشیائے خوردنی خود خرید کر غربا میں رعایتی قیمت پر فروخت کرتی ہے ۔ چنانچہ ناروے ، نیدرلینڈز اور لیتھونیا میں غریبوں کو عمدہ غذا کم قیمت پر بہم پہنچائی جاتی ہے ۔ اسی طرح بعض ممالک میں دودھ اور دوسری طاقت بخش اشیا کی خرید کے لئے عوام کو مالی مدد دی جاتی ہے ۔ بعض ممالک میں تعلیم کے ذریعہ سے عوام کو طاقت بخش غذا کے استعمال کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے ۔ مثلاً ناروے میں عوام کو خانہ داری کی تعلیم دینے کے لئے حکومت کی طرف سے بیس معلم مقرر ہیں جو غذا اور دوسری خانگی ضروریات میں لوگوں کی صحیح رہنمائی کرنے کے لئے ملک کا دورہ کرتے رہتے ہیں ۔ یہی کام بعض ممالک میں ریڈیو اور سینما سے لیا جاتا ہے ۔ بعض حکومتیں اشیائے خوردنی کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے بھی قوانین نافذ کر رہی ہیں ۔

یہ خیال کہ خوراک پر زیادہ خرچ کسانوں کی استعدادِ عمل میں اضافہ کر کے ملکی دولت کی ترقی کا موجب ہوگا ہندوستان کے سے عظیم الشان زراعتی ملک کے لئے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہاں کی حکومتوں کو اپنے اس فرض سے غافل نہ رہنا چاہئے۔

مسز رُوزویلٹ کی حیرت انگیز قوتِ عمل

صدر جمہوریۂ امریکا کی بیگم مسز رُوزویلٹ کی اَن تھک ہمت اہلِ امریکا کے لئے روز بروز باعثِ حیرت بن رہی ہے۔ وہ سال بھر میں اوسطاً چالیس ہزار میل کا سفر کر لیتی ہیں۔ یہ اوسط اکثر بڑے بڑے سوداگروں کے سفر کے اوسط سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر تاجر متفق ہیں کہ اتنا سفر بھی بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مسز رُوزویلٹ عموماً موٹر میں سفر کرتی ہیں۔ اپنے اس طوفانی گشت میں ہر تیسرے دِن بیگم رُوزویلٹ ایک لیکچر دیتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ سامعین کے ہر گروہ کے لئے وہ کسی نئے موضوع کا انتخاب کرتی ہیں۔ سالانہ سَو سے زائد لیکچروں کے لئے نئے نئے موضوعوں کا انتخاب مسز روزویلٹ کی ہمہ گیر قابلیت اور حیرت انگیز عملی قابلیت کا گواہ ہے کیونکہ اتنے مختلف النوع لیکچروں کی تیاری کے لئے بہت محنت درکار ہے۔

وہ ایک سنڈیکیٹ کے لئے ہر ہفتے اخبارات میں چھ مضامین لکھتی ہیں۔ اس کام کا آغاز ۱۹۳۶ء کے نوروز سے ہوا پیشہ ور اخبار نویسوں نے شروع میں اُن کے اعلان کو شک کی نظروں سے دیکھا تھا کیونکہ اُن کے خیال میں یہ بات ناممکن تھی کہ مسز رُوزویلٹ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود پابندی کے ساتھ تقریباً ایک ہزار لفظ روزانہ لکھنے کا وقت نکال سکیں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اعلان کے بعد اُن کے مضامین نہایت باقاعدگی سے چھپتے رہے ہیں۔ اِن مضامین کی حیثیت بالعموم ڈائری کی سی ہوتی ہے لیکن مسز رُوزویلٹ اس میں سیاسیات پر جرح و نقد کی بھی مناسب آمیزش کر دیتی ہیں۔ یہ تنقید ہمیشہ لازماً اُن کے شوہر کی سیاسیات کی تائید و حمایت ہی میں نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ مخالفانہ تنقید بھی ہوتی ہے۔ یہ مضامین وہ ریل ملاقات کے وقت کے انتظار کے وقفوں میں ہوٹلوں میں بیٹھ کر بلکہ ٹیکسیوں میں بھی ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھتی ہیں۔ اور پھر یہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو جاتے ہیں۔

ریڈیو کی تصاویر

گلاسگو کے ایک اخبار نے پچھلے دنوں واشنگٹن میں شاہ جارج ششم کے خیر مقدم کی ایک تصویر شائع کی تھی۔ تصویر کے رنگ نہایت وضاحت کے ساتھ نمایاں تھے۔ یہ تصویر بذریعۂ ریڈیو تین ہزار میل سے زاید فاصلے پر نشر کی گئی تھی۔ مغربی اخباروں میں تار کے ذریعے سے تصاویر کی اشاعت اب تقریباً ایک عام بات ہے۔ یورپ اور امریکا کے اکثر اخبارات تصویری خبریں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اب رنگین تصاویر کے نشر سے ریڈیو انسان کو تفریح کا ایک اور بہت بڑا ذریعہ بہم پہنچائے گا۔

دُنیا کے مصارفِ جنگ

جمعیتِ اقوام کی تازہ شائع کردہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں اقوامِ عالم نے سامانِ جنگ پر تقریباً ۹،۵۰۰ ملین طلائی ڈالر صرف کئے۔ ۱۹۳۷ء میں ان مصارف کا اندازہ ۸،۰۰۰ ملین طلائی ڈالر کیا گیا تھا۔ ۹۵۰۰ ملین طلائی ڈالر کی یہ رقم ۱۹۳۸ء میں چونسٹھ ممالک نے اسلحہ پر صرف کی۔ اِس رقم میں سے ۷،۴۰۰ ملین ڈالر (یعنی اسّی فیصدی) صرف سات بڑے بڑے ممالک نے صرف کئے۔ اب سے دس سال پہلے یعنی ۱۹۲۹ء میں انہیں سات ممالک نے ۲،۸۰۰ ملین ڈالر اسلحہ پر صرف کئے تھے۔ یہ رقم اس وقت کے کل مصارفِ جنگ (۴،۲۰۰ ملین طلائی ڈالر) کا ۶۷ فیصدی تھی۔

ہندوستانی کسان کے وقت کا استعمال

ہندوستان کے کسان زیادہ تر گندم بوتے ہیں۔ اس فصل کے بعد اُن کا بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے اور زمین بیکار پڑی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گرمی کے موسم کی فصلوں کے لئے بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے جس کا ملک میں کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ اگر کسانوں کو بہتر آلاتِ زراعت اور بہتر وسائلِ آبپاشی مہیا کئے جائیں تو اُن کا وقت اس طرح بیکار ضائع نہ ہو، اور مُلک کی دولت میں نمایاں اضافہ ہو جائے۔ گندم کے علاوہ دوسری مختلف قسم کی اشیاء کی کاشت سے کسان اپنے پُورے وقت سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اگر کسان اپنے فارغ وقت کو دودھ انڈوں اور مرغیوں کی تجارت میں صرف کریں تو فارغ وقت کے دوسرے مشاغل کے مقابلے میں یہ اُن کے لئے اور ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو۔ حکومتِ ہند کو آب پاشی کے وسائل کی توسیع کی طرف توجہ کرنی چاہئے کیونکہ ان تمام تجاویز پر عمل کرنے کے لئے پانی کے مسئلہ کا حل اشد ضروری ہے۔

ہندوستان میں سینما کی ترقّی

فلم بنانے، تقسیم کرنے، اور تماشا دکھانے والی تینوں جماعتوں نے اب تک جو سرمایہ اس کام میں لگایا ہے۔ اس کا اندازہ ۱۷ کروڑ روپے کیا گیا ہے۔ اس وقت سینما کا کام چالیس ہزار اشخاص کے لئے ذریعۂ آمدنی بنا ہُوا ہے۔ فلم بنانے والی کمپنیوں کی کل تعداد آج کل پچھتّر ہے۔ یہ کمپنیاں سالانہ تقریباً دوسو ایسی فلمیں تیار کرتی ہیں جن کا طول اوسطاً ۴،۰۰۰ فٹ ہوتا ہے۔ فلمیں پیدا کرنے کے بڑے بڑے مرکز بمبئی، پونا، کولہاپور، کلکتہ اور مدراس میں ہیں۔ فلمیں تقسیم کرنے والی کمپنیوں کی کُل تعداد تقریباً دوسو پچاس ہے۔ ان میں سے بڑی بڑی کمپنیاں بمبئی، کلکتہ، دِلّی، مدراس، لاہور، بنگلور، کراچی اور بھساول میں ہیں۔ سینما کی تماشا گاہوں کی کُل تعداد اب نوسو چھیانوے تک پہنچ گئی ہے۔ ان میں سے ۵۳۲ تو خالص ہندوستانی فلموں کی نمائش کرتی ہیں اور ۲۶۶ بِدیسی فلمیں دکھاتی ہیں

باقی ۱۰۸ صرف غیر ملکی فلموں کے لئے وقف ہیں۔ ان ۹۹۶ تماشا گاہوں کے علاوہ پانسو سفری سینما بھی ہیں جو مختلف چھوٹے چھوٹے شہروں میں دَورہ کرکے تماشا دکھاتے ہیں۔

ہڑتالیں

گذشتہ بیس سال میں ۱۹۳۸ء کو کاروباری مناقشات کی کثرت تعداد کے لحاظ سے خاص امتیاز حاصل ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ۳۹۹ کاروباری مناقشات ہوئے۔ ان میں مجموعی طور پر ۴۰۱۰۰۰ اشخاص شریک تھے۔ ۱۹۳۷ء میں مناقشات کی تعداد ۳۸۹ اور شرکاء کی تعداد ۶۴۸۰۰۰ تھی۔ ۱۹۳۸ء میں کام کے ضائع شدہ دنوں کی مجموعی تعداد ۹۱۹۹۰۰۰ تھی۔ ۱۹۳۷ء کے ضائع شدہ کام کے دنوں کی مجموعی تعداد ۹۰۸۲۰۰۰ تھی۔ روئی اور سن کے کارخانوں کی ہڑتالیں کُل میں سے ۳۹ فیصدی شمار کی گئی ہیں۔

ہڑتال کرنے والوں میں سے ۷۰ء۸ فیصدی کا تعلق روئی اور سن کے کارخانوں سے تھا۔ کل ضائع شدہ دنوں میں ان کارخانوں کے ضائع شدہ دنوں کی تعداد ۷۱ء۱ فیصدی تھی۔

اِن ہڑتالوں میں سے دوسو بارہ یعنی ۵۳ فیصدی صرف مزدوری اور بونس کے جھگڑے سے پیدا ہوئیں۔

اُن ہڑتالوں کی تعداد جن میں کارکن کامیاب ہوئے ۱۸۱ ہے۔ یعنی تقریباً ۴۶ فیصدی ہڑتالوں میں کارکنوں کے مطالبات منظور کرلئے گئے۔

جیلوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام

بہت سی اخلاقی اور معاشری خرابیاں جہالت سے پیدا ہوتی ہیں۔ حکومتِ پنجاب اس لحاظ سے قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے پنجاب کے جیلوں میں قیدیوں کی ابتدائی تعلیم کے انتظام کا فیصلہ کیا ہے۔ فی الحال صرف چند جیلوں میں اس کا تجربہ کیا جائے گا۔ اس کام کے لئے تین سنٹرل اور تین ڈسٹرکٹ جیلوں کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ چند سال گزرے بعض جیلوں میں تعلیم کا کچھ تجربہ کیا گیا تھا۔ اس سے خاطر خواہ نتائج پیدا ہوئے۔ چنانچہ اس قسم کا معمولی انتظام اب مزید دس جیلوں میں کر دیا گیا ہے۔ ابتدائی حالت میں ہر جیل کو سینیئر ورنیکیولر گریڈ کا ایک مدرس بہم پہنچایا جائے گا۔ جو پرائمری مدارس کے عام مضامین کی تعلیم دے گا۔ اس کے علاوہ وُہ ایسی اور تعلیمی جماعتوں کا انتظام بھی کرے گا جن میں تعلیم یافتہ قیدیوں سے مدرس کا کام لیا جائے گا۔

حامد علی خاں

خیالات

فلک پیما نے کسی کی طرف خط میں یہ شرمیلے خیالات لکھے ہیں میں نے "ہمایوں" کے لئے چُرا لئے۔ ب ل

رات اندھیری ہے اور میں سُنہری کرن کے انتظار میں ہوں۔

خدائی کارخانوں میں اصل بھی ہے نقل بھی ہے۔ اصلی آسمان، ستارے، بادل اُوپر ہیں۔ نقلی آسمان، ستارے، بادل شفاف جھیلوں کی تہ میں مزے لیتے ہیں۔ اصلی بادلوں کو برسنے کی زحمت ہے۔ جھیلوں کی تہ میں رہنے والے بادل اس مشقت سے بالاتر ہیں اور انہیں میں اپنے دل میں جمع کرتا رہتا ہوں۔

اصل مال خدا کا ہے مگر وہ خوبصورت ستاروں اور بادلوں کی دُنیا جو ندیوں اور جھیلوں میں شرمیلی دُلہن کی طرح الگ سر جھکائے مسکراتی رہتی ہے تمام تر میری ہے۔ خدا اس سے کوئی کام نہیں لیتا میں ہزاروں کام لیتا ہوں۔

عقل والے کہتے ہیں کہ یہ محض عکس ہیں اور عکس کسی قسم کا ہو محض بے جان ہے۔ عقل والے جو جی میں آئے بکیں۔ میں عکس میں جان ڈال کر رہوں گا۔

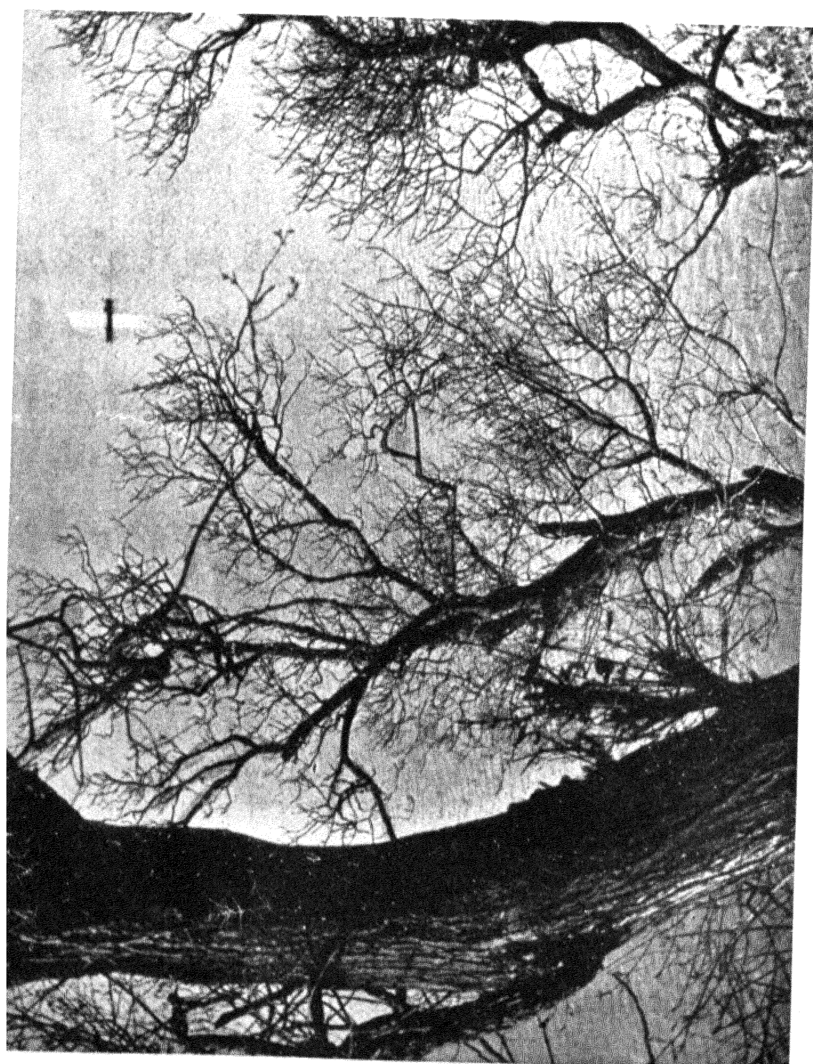
لوگ گلاب کا عرق کھینچتے ہیں کہ آنکھ کے لئے مفید ہوتا ہے۔ میں اپنا عرق کشید کرتا ہوں کہ اِس سے دِل کی آنکھیں کھلتی ہیں۔

ہر طرف تنزل ہے۔ جو نزاکت کی پُتلیاں تِلّا نہیں بن سکتیں وہ وفا کی دیویاں بن جاتی ہیں۔ بلائیں کم ہیں دیویاں بہت ہیں۔ ہندوستان میں کوئی جیے تو کس لئے۔

تُو تو منہ موڑے جا رہی تھی مگر اس کا کیا کرے گی کہ تیرا تبسم آئینے کے رستے مجھ تک پہنچ ہی گیا۔

روشنی کے گلاس لنڈھاتا ہوں۔

"فلک پیما"



یہواہ ـــــ خدائے یہود کا ارتقا

(اسپنسر کے نقطۂ نظر سے)

(۲)

اب افزائش نسل وفصل کے دیوتاؤں کو لیجئے وہ چونکہ لنگ کی خاصیت اپنے میں رکھتے ہیں لہٰذا انہیں علامیت کے مذکورہ بالا نظریہ کے بموجب لازمًا پتھر یا لکڑی کے اسطوانوں اور مخروطوں کی شکل میں سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ یُوا اور ہوتا ایسا ہی ہے تو یقینًا غلط نہ ہوگا۔ علاوہ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک سنگی اسطوانہ ہے خیم، ہکوس اور پر یا پس بھی ایسے ہی مخروط نما پتھر تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ یہواہ بھی اسی قسم کا ایک سنگی مخروطہ تھا لیکن کسی ایسے دعویٰ سے پہلے مجھے دو باتیں بتا دینی ضرور ہیں، ایک یہ کہ مخروطہ یا اسطوانہ ترقی یافتہ سنگِ مزار ہے، میجر کونڈر فینیقیوں کے مذہب کے متعلق لکھتا ہے کہ ان کے معبدوں میں "پرستش ستون نما پتھروں یا سنگی مخروطوں کی ہوتی تھی جو بلاشبہ اُن اَن گھڑ یادگاری پتھروں کی اولاد تھے جنہیں دراوڑ، عرب، کیلٹ اور ہوٹن ٹاٹ پوجتے تھے" اور واقعہ یہ ہے کہ سنگِ مزار نہایت آسانی کے ساتھ لنگ کی وضع اختیار کر سکتا ہے کھڑا اور لمبوترا پتھر تو وہ ہوتا ہی ہے بس ذرا سی تراش اسے تکبیر یافتہ لنگ میں تبدیل کر سکتی ہے، دوسری بات جس کا اظہار ضروری ہے یہ ہے کہ سامی اقوام سنگی یا چوبی مخروطوں کو واقعۃً لنگ کی حیثیت سے پوجتی تھیں، میجر کونڈر کی رائے کو میں یہاں پھر استنادًا پیش کرتا ہوں، اثریات کا یہ امام ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ "سنگِ یادگار یا مخروطہ نما پتھر پورے ملک شام[1] میں افزائش اور توفیر کے دیوتاؤں کی علامت تھا" یعنی لنگ اور درواقع میں میجر موصوف ان پتھروں کو اور ہندوستان کے لنگوں کو ایک سمجھتا ہے، یوں یہ امر بالکل متیقن ہے کہ یہواہ ابتدائً ایک سنگی مخروطہ تھا۔

مگر اس دعویٰ کی تائید کیا تورات سے ممکن ہے؟ میں کہوں گا کہ ہاں! کیونکہ مجھے یہ علم ہے کہ جو نسل یا قوم اپنے دیوتاؤں کو عام طور پر محسوس یا مقرون اشکال میں پوجنے کی عادی ہو اُس سے یہ کسی طرح توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ برخلاف اپنی تمام ذہنی عادات کے اپنے صرف ایک دیوتا کو ایک تصورِ مجرد کی حیثیت میں پوجیگی اور کیونکہ میں یہ جانتا ہوں کہ جب یہواہ مظلّہ اور معبدیں بتوں کی شان کے ساتھ سجا ہوا اپنی خدمت میں ہر وقت پجاریوں کی ایک مخصوص اور بڑی جماعت (لاوی) رکھتا ہو اور انسان اور

---

[1] شام میں فلسطین بھی داخل ہے جنگِ عظیم کے بعد سے فلسطین شام سے جُدا ہو گیا ہے ورنہ وہ پہلے شام کا ایک جزو تھا۔

حیوان دونوں کے پہلوٹھی کے بچوں اور گایوں اور بیلوں اور بچھڑوں اور مینڈھوں اور بکریوں اور بھیڑوں اور میمنوں اور قمریوں اور کبوتروں اور پکے پھلوں اور فطیری روٹیوں اور تیل اور شراب اور خون اور بخورات کی نذریں قربان گاہ کی ہمیشہ سلگتی رہنے والی آگ کے ذریعہ قبول اور وصول کرتا ہو تو ضروری ہے کہ وُہ کوئی مادی شے ہو یعنی ایک سنگی مخروطہ اس لئے کہ ارباب پرست دُنیا میں ہر جگہ معبد، پجاری اور نذور کا وجود بُت کے وجود کو مستلزم ہے لیکن یہ پھر بھی ایک سرسری جواب ہے اور ناکافی لہٰذا ہمیں زیادہ تشفی بخش براہین کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

یہواہ کے مادی شے ہونے کے تورانی ثبوت:۔ مصر کی سرزمین میں بنی اسرائیل جب مُوسیٰ کی بات نہیں سُنتے تو وہ جھنجھلا کر "خداوند کے سامنے" ان کی شکایت کرتے ہیں (خروج ۶ : ۱۲) اسی طرح جب موسیٰ کو فرعون کی ہدایت کا حکم ملتا ہے تو وُہ "خداوند کے سامنے" کچھ عذر کرتے ہیں (خروج ۶ : ۳۰) پھر مصر سے واپس ہوتے ہوئے وہ جب بیابان (قرآنی مَدیَن) کی سرزمین میں جبلِ الٰہی[1] کے پاس خیمہ زن ہوتے ہیں اور یہ اطلاع ان کے خسر یترو[2] (قرآن کے شعیب) کو ملتی ہے تو وہ اپنی بیٹی سفورا اور اس کے دو بچوں جیرشوم اور الیعذر کو لے کر ان سے ملنے آتے ہیں، داماد خسر کا بہت پُرتپاک استقبال کرتے ہیں اور انہیں مصر کے واقعات سُناتے ہیں جن کی سماعت کے بعد وہ خداوند کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اور پھر سب مل کر "خداوند کے سامنے" کھانا کھاتے ہیں (خروج ۱۸ : ۱۲) کچھ ایسا ہی قصہ موسیٰ، ہارون، ابی ہو، ندب، اور مزید ستر اکابر بنی اسرائیل کے متعلق بیان کیا گیا ہے، خلاصہ یہ کہ یہ اصحاب خدا کو دیکھتے ہیں اور کھاتے اور پیتے ہیں (خروج ۲۴ : ۱۱)[3] مزید بریں آلِ یعقوب جب بنیامین کے گھرانہ کو میدانِ جنگ میں بے طرح ہراتے ہیں تو مصفاح میں خدا کے پاس جاتے ہیں اور اس کے سامنے شام تک بیٹھتے ہیں اور بلند آواز سے روتے ہیں (قضاۃ ۲۱ : ۲) اور سفر احبار میں تو ایسے جملوں کی کوئی کمی نہیں جن میں مرقوم ہے کہ بیل یا بھیڑ یا بکری کا ذبیحہ خداوند کے سامنے انجام پائے (۱ : ۵ و ۱۱، ۴ : ۲۴ اور ۹ : ۴) یا یہ کہ مُوسیٰ اور ہارون نے خداوند کے سامنے نذریں گزرانیں (۸ : ۲۹، ۹ : ۲۱) یا یہ کہ قربانی کے جانوروں کو خداوند کے سامنے لایا اور جلایا جائے (۴ : ۴، ۹ : ۲، ۱۰ : ۱۹) یا یہ کہ پجاری قربانی کا خون خداوند کے

---

[1] واضح رہے کہ متقدمین بنی اسرائیل اپنے تمام دیوتاؤں کو عموماً پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا پہاڑیوں کے اوپر یا ہرے درختوں کے تلے یا High places میں پوجتے تھے (یسعیاہ ۵۷ : ۵، ۷، ہوسیع ۴ : ۱۳، ملوک اول ۳ : ۲ اور ۱۴ : ۲۳ وغیرہ) یہواہ کیسے مستثنیٰ رہتا (خروج ۲۴، سموئیل دوم ۵ : ۳۲ وغیرہ) اسی لئے شامیوں نے اسے خداوندِ جبال کہا (ملوک اول ۲۰ : ۲۸) اور اسی لئے سلیمان جبعون گئے (ملوک اول ۳ : ۴)۔

[2] ان کا ایک نام تورات میں حوباب بھی مذکور ہے سید سلیمان ندوی نے مؤرخ ایوانڈ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یترو لقب اور حوباب نام تھا اور یہ کہ مسلمان انہیں شعیب سے تعبیر کرتے ہیں [3] ایسے اعمال اخوت ارباب (fellowship of gods) کی دلیل ہیں۔

سامنے سات مرتبہ چھڑکے گا (۱۴ : ۶ و ۱۷) یا یہ کہ اکابرِ قوم خداوند کے سامنے بیل پر ہاتھ رکھیں گے (۴ : ۱۵) یا یہ کہ ہارون کے دو بیٹوں نے خداوند کے سامنے غیر آگ جلائی اور وہیں ڈھیر ہو گئے (۱۰ : ۱ و ۲)[1]

اب اگر یہواہ واقعۃً خداوندِ بے جہات تھا تو پھر اس کے لئے جہت کا یہ تعین کیوں ؛ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ وہ ایک مادّی وجود تھا ؛ لیکن اس کے مادّی ہونے کی یہی ایک دلیل نہیں متقدمینِ بنی اسرائیل کے نزدیک وہ ایک انتقال پذیر شے بھی تھا سفرِ یوشع ، سفرِ قضاۃ ، سفرِ سموئیل اوّل ، سفرِ سموئیل دوم ، سفرِ ملوک اوّل اور سفرِ ملوک دوم کا ہر سرگرم ناظر میرے بیان کی تصدیق کرے گا کیونکہ یہواہ بنی اسرائیل کے درمیان رہتا تھا (مثلاً تثنیہ ۱ : ۴۲) اور ان کے سامنے چلتا تھا (مثلاً تثنیہ ۱ : ۳۰ ؛ سموئیل دوم ۵ : ۲۴ وغیرہ) علاوہ اس کے وہ چل چل کے بارہ پتھروں کے درمیان اپنے مظلّہ میں ایک زمانہ تک رہا۔ وہاں سے وہ شیلوہ گیا۔ شیلوہ سے غالباً مصفاح میں منتقل ہوا کیونکہ یفتاح مصفاح میں خداوند کے سامنے دِل کی باتیں بیان کرتا ہے (قضاۃ ۱۱ : ۱۱) مصفاح سے وہ مظلّہ جس میں یہواہ رہتا تھا پھر شیلوہ آیا کیونکہ قضاۃ (۱۸ : ۳۱) میں مرقوم ہے کہ ۔۔۔ حادثۂ میکاہ[2] کے وقت یہواہ شیلوہ میں مقیم تھا اس جگہ اس کا قیام بہت دنوں رہا کیونکہ بنی اسرائیل کو جب فلسطینیوں کے مقابلہ میں شکست ہوتی ہے تو وہ اسے Eben Ezer - Meedeh کے پڑاؤ میں یہیں سے منتقل کرتے ہیں۔ (سموئیل اوّل ۴ : ۳) لیکن دیوتا کے پڑاؤ میں آنے اور فلسطینیوں کے اس سے ڈر جانے کے باوجود بھی بنی اسرائیل کو شکست ہوتی ہے اور "خداوند کا تابوت" دشمنوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے (سموئیل اوّل ۴ : ۱۱) سات مہینوں تک یہ صندوق یہواہ کا فلسطینیوں کی سرزمین میں رہتا ہے اور اس کے بعد وہ بنی اسرائیل کو مِل جاتا ہے۔ اس واپسی کو ہر چند اسفارِ یہود یہواہ کے خوارق سے منسوب کرتے ہیں لیکن ایک ذہین انسان مغلوب دشمنوں کے اس بیان میں تلافی (Compensation) کے گہرے آثار ملاحظہ کر سکتا ہے۔ بہرحال جب تابوت سکینہ کسی وجہ سے واپس مِل گیا تو اسے قریات مریم میں بسایا گیا۔ یہاں پر یہواہ اس وقت تک رہا جب تک کہ یروشلم فتح نہ ہوا اور داؤد اس کے لینے کے لئے نئی گاڑی لے کر نہ آئے پھر جب وہ گاڑی پر لد کر چلا تو داؤد اور جملہ بنی اسرائیل نے اس کے سامنے ہر قسم کے باجے بجائے لیکن عُزّاہ کی مَوت کی وجہ سے یہواہ یروشلم نہ آکر عوبید ادوم کے گھر میں تین مہینہ تک رہا۔ اس کے بعد داؤد نے اسے اپنے بسائے ہوئے شہر (صیہون) میں منتقل کیا۔ جلوس میں داؤد "خداوند کے سامنے اپنی پوری قوت سے ناچے" (سموئیل دوم ۶ : ۱۴) اور بنی اسرائیل کے ساتھ قرنے پھونک کر اور خوشی کے نعرے لگا کر انہوں نے یہواہ کو مظلّہ میں آباد کیا (سموئیل دوم ۶ : ۱۷) اس

---

[1] اس قبیل کی چند مزید مثالیں یہ ہیں۔ احبار ۴ : ۷ ، ۱۸ ' ۹ : ۲۴ ' ۱۰ : ۱۵ ، ۲۷ ' اعداد ۷ : ۳ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جستجو پر اور بہت سی مثالیں نہیں پیش کی جا سکتیں۔ [2] اس کا مجمل تذکرہ ابتدائی صفحات میں ہو چکا ہے۔

حال میں یہود کا یہ بڑا قومی دیوتا سلیمان کے زمانہ تک رہا۔ سلیمان نے اس کے لئے پہلا معبد[1] (یا مکان جیسا کہ تورات میں کہا گیا ہے) تیار کیا اور وہ مع اپنے روایتی صندوق کے اس میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگیا۔

ممکن ہے یہاں پر یہ کہا جائے کہ تابوت سکینہ میں یہواہ کا بت بند نہ تھا بلکہ احکام عشرہ کی الواح رکھی تھیں جیسا کہ متاخرین بنی اسرائیل نے سمجھنا اور سمجھانا چاہا ہے لیکن یہ اعتراض جو خلافِ توقع نہیں اہم اس لئے نہیں ہے کہ اسفار یوشع، سموئیل اوّل و دوم اور ملوکِ اوّل میں یہواہ کو واضح طور پر تابوت کا مکین ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ اسفار تابوتِ سکینہ کو زیادہ تر "خداوند کا تابوت[2]" کہتے ہیں۔ اور یہ تسمیہ ایک واقعہ کا اظہار کرتا ہے[3]۔ اب اگر یہ پوچھا جائے کہ بنی اسرائیل نے اپنے صرف ایک دیوتا کو اس طرح کیوں صندوق میں

---

[1] سلیمان اور ان کے معبد کے متعلق عام طور پر بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ اسفار ملوک و ایام کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے اور سطحی باتوں سے متاثر نہ ہوا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں میں کوئی چیز غیر معمولی یا فوق العادت نظر نہیں آئے گی۔ یہ عمارت جو اپنے ابعادِ ثلاثہ کے اعتبار سے ایک معمولی سی عبارت سے بڑھ کر نہ تھی سات سال کے طویل عرصہ میں تیار ہوئی اور اس کی تیاری میں اگر حیرام والیٔ صُور کا ہاتھ نہ ہوتا تو شاید ہی عبرانی مصنفوں کو وطنی غرور کی نمائش کا اتنا موقعہ ملتا۔ یہ اصل میں داؤد کی کامیاب سیاست تھی جس نے یہودیوں کے دن پلٹ دیئے۔ اُنہوں نے حیرام سے دوستی پیدا کی اور اس دوستی نے ان دونوں کو فائدہ پہنچایا۔ حیرام نے عبرانیوں کے کہستانی علاقہ سے بحیرۂ قلزم تک سڑک نکال کر بحرِ ہند میں تجارتی جہاز چلائے اور داؤد اور سلیمان نے اس کے معاوضہ میں اس سے قومی تعمیر کا کام لیا۔ علاوہ اس کے فلسطین کا محلِ وقوع کچھ ایسا ہے کہ وہ ماضی میں بابل اور اشور اور مصر کے درمیان ایک حدِ اوسط کی حیثیت رکھتا تھا۔ یوں تو کچھ محلِ وقوع کی بدولت اور زیادہ تر حیرام کی امداد سے سلیمان نے وہ عروج پایا جس سے یہود بالکل نابلد تھے اور جس نے ان کا دماغ خراب کر دیا۔ حیرام کا ان کی قومی تعمیر میں کتنا حصہ تھا وہ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب حیرام نے وفات پائی تو یروشلم کمزور ہوگیا اور شیشاک نے جو بیسویں خاندان کا پہلا فرعون تھا اسے اچھی طرح لوٹ لیا۔ بہر حال سلیمان اپنے عروج کے زمانہ میں بھی ایک معمولی درجہ کی دیسی ریاست کے والی سے زیادہ نہ تھے اور بحیثیت انسان کے ان میں نمود و نمائش کا جذبہ بے حد قوی تھا چنانچہ اس ذوق کی تکمیل میں اُنہوں نے اپنی رعایا پر بھاری بھاری محصول عائد کئے اور اس سے سخت محنتیں لیں۔ پھر ان کی فوجی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد جب رحبعام تخت نشین ہوا تو اُسے شاہ اشور کو ایک لڑائی میں فوجی مدد دینی پڑی۔ آپ یہ معلوم کر کے غالباً حیرت کریں گے کہ سلیمان کے اس جانشین نے صرف دو ہزار سپاہیوں سے مدد کی۔ یہ ایک اشوری کتبہ کا بیان ہے۔

[2] یوشع ۶: ۶و۷، ۱۲، ۱۳، ۷: ۶ وغیرہ۔ سموئیل اوّل ۴: ۱۱، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۲ اور ۵: ۱، ۳، ۴، ۷ وغیرہ۔ سموئیل دوم ۶: ۳، ۹، ۴ وغیرہ۔ ملوک اوّل ۸: ۳ وغیرہ ایام دوم ۱: ۴ وغیرہ۔

[3] اس میں شک نہیں کہ یہواہ کے تابوت کو جا بجا توضیحاً عہد نامہ کا تابوت یا احکامِ عشرہ کا تابوت یا صندوق الشہادۃ بھی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ اضافے بعد کے ہیں۔ اور اس لئے ان کا وزن زیادہ نہیں۔ پھر اس کثیر التکرار ادعا کے باوجود کہ "تابوت میں سوائے ان دو سنگی لوحوں کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

بند کیا؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ اُنہوں نے یہ چیز مصریوں سے لی۔ سرزمینِ مصر کا ایک بڑا دیوتا خیم جولنگ کی وضع اور خاصیت رکھتا تھا اور بنی اسرائیل کی غلامی کے زمانہ میں مصر میں عام طور پر پجتا تھا۔ ایک صندوق میں بند تھا، مزید بریں تابوتِ سکینہ اپنی وضع و قطع کے اعتبار سے مصر کے مقدس صندوق سے بالکل مشابہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب دو یا کئی اقوام باہم کسی حیثیت سے ملتی ہیں تو ان میں عموماً تصورات کا تبادلہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ایک سوال اور یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تابوت میں سنگی مخروطہ بند تھا تو متأخرین بنی اسرائیل نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ احکامِ عشرہ کا نسخہ تھا۔ جواب اس سوال کا آسان نہیں تاہم قیاس ہے کہ جب یہودیوں میں یہواہ کا تصور کافی لطیف، بلند اور مجرد ہو گیا تو وہ اپنی پچھلی سنگ پرستی پر شرما گئے اور اس احساسِ خفت کے تحت اُنہوں نے تابوت میں کے سنگی مخروطہ کو یہواہ کے کلماتِ عشرہ سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ میرا خیال ہے کہ ایسے حالات میں اس قسم کا رَدّ نہ غیر متوقع ہے اور نہ خلافِ فطرت۔

بہرحال یہواہ ایک سنگی مخروطہ تھا اور ہمارے پاس ایسی ادبی دستاویزیں بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں سے اسے کمال دیانت کے ساتھ اسی حیثیت میں مستحضر کیا گیا ہے۔ میں یہاں پر اس قسم کی چند دستاویزیں نمونۃً نقل کرتا ہوں۔ تثنیہ (۳۲) میں ایک جگہ شاعر یہواہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "وہ چٹان ہے اور اس کا کام کامل ہے" (۴) پھر یہ کہ "اُس نے خدا کو چھوڑ دیا اپنے بنانے والے کو چھوڑ دیا اور اپنی نجات کی چٹان کی توہین کی" (۱۵) اور یہ کہ "ان کی چٹان ہماری

(بسلسلہ صفحۂ ماسبق) جنہیں موسیٰ نے بمقام حوریب اس میں بند کیا تھا اور کچھ نہ تھا۔" (ملوک اول ۸: ۹) یہ بالکل ظاہر ہے کہ تابوت میں یہواہ کے سوا اور کوئی شے نہ تھی، اول تو الواح کا سنگی ہونا ہی خود ایک نہایت اہم چیز ہے اور پھر تابوتِ سکینہ کے سامنے جملہ مذہبی رسوم اور قربانیاں اور دوسری چیزیں اسی طرح ادا ہوتی تھیں جس طرح کہ بتوں کے سامنے ادا ہوتی ہیں۔ ہارون پوجا کے وقت اس کے سامنے گھنٹیاں بجاتے تھے (خروج ۲۸: ۳۳، ۳۴) چرند اور پرند اس کے سامنے ذبح کئے جاتے تھے خون اس کے سامنے چھڑکا جاتا تھا اور جملہ نذریں بشمول گوشت، شراب، میدہ، تیل، روئی، عود وغیرہ وغیرہ اس کے سامنے قربانگاہ میں جلائی جاتی تھیں تاکہ ان کی خوشبو خداوند کو پہنچے (مثلاً خروج ۲۹، ۳۰ و احبار ۱ تا ۹) یوشع اس کے سامنے قرعے پھینکتے ہیں (یوشع ۱۸: ۸) سموئیل اس کے کان میں عوام کے الفاظ دُہراتے ہیں (سموئیل اول ۸: ۲۱) اور داؤد اس کے سامنے ناچتے، چیختے اور باجے بجواتے ہیں۔ کیا یہ اور اس قسم کی اور بہت سی چیزیں بالاعلان یہ نہیں کہتیں کہ تابوت میں یہواہ تھا اور صرف یہواہ تھا؟

علاوہ اس کے تابوتِ سکینہ کی oraculum حیثیت بھی (تکوین ۵: ۲۲، قضاۃ ۲۰: ۱۸، ۲۳/۲۶، ۲۷۔ سموئیل اول ۱۴: ۳۷۔ ۲۳: ۲، ۱۰۔ ۳۰: ۱۹۔ سموئیل دوم ۵: ۱۹، ۲۳ وغیرہ) اسے ایک دیوتا کا مسکن ثابت کرتی ہے کیونکہ یہ حیثیت دُنیا میں عام طور پر بتوں کو حاصل رہی ہے، اور بریں وجہ کہ ان کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا تھا اور ہے کہ ان میں ارواح سمائی ہوئی ہیں لیکن احکام عشرہ کی مفروضہ الواح کو اگر کبھی اور کسی قبر سے تعلق نہیں رہا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے oracle کیسے فرض کر لیا گیا۔

چٹان کی طرح نہیں، حالانکہ ہمارے دشمن خود قضاۃ ہیں" (۳۱) اسی طرح سموئیل دوم میں ایک شاعر داؤد کی زبان سے کہلواتا ہے "خداوند میری چٹان میرا قلعہ اور میرا نجات دہندہ ہے" (۲۲: ۲[۱]) نیز یہ کہ "خداوند کے سوا خدا کون ہے اور ہمارے خدا کے سوا چٹان کون ہے"، (۲۲: ۳۲[۲]) اور یہ کہ "خدائے اسرائیل نے کہا، اسرائیل کی چٹان نے کہا" (۲۳: ۳) اور زبور میں مرقوم ہے" میں تجھ کو پکاروں گا اے خداوند میری چٹان"، (۲۸: ۱، ۴۲: ۹) مزید برآں یہواہ کو اسفارِ یہود میں بیشتر "پناہ کی چٹان" (مثلاً زبور ۹۴: ۲۲) "نجات کی چٹان" (مثلاً زبور ۹۵: ۱) اور "طاقت کی چٹان" (مثلاً زبور ۶۲: ۷، یسعیاہ ۱۷: ۱۰) کہا گیا ہے اور یہ عام اندازِ گفتگو شعراً ایک حقیقت کا غیر شعوری طور پر اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ چٹان صرف تکبیر یافتہ سنگی مخروطہ ہے[۲]۔

یوں یہواہ بالاتفاق ایک سنگی مخروطہ تھا یعنی ایک سنگِ مزار اغلب کہ عبرانیوں کے کسی قدیم ترین قبیلہ کے کسی متوفی سردار کا اور جب ہم اس ریمارک کی روشنی میں تکوین کے ان الفاظ پر غور کرتے ہیں کہ یہواہ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا (۱: ۲۶، ۲۷ و ۹: ۶) تو ہمارے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ خود یہواہ انسان تھا چنانچہ عدن کے افسانہ (تکوین ۲) اور ابراہیم اور تین آدمیوں کے قصہ (تکوین ۱۸) سے اس قیاس کی پوری تائید ہوتی ہے۔

یہاں تک کی بحث کا خلاصہ: مختصر یہ کہ بنی اسرائیل کا اصلی مذہب بت پرستی تھا، یہ بت شخصی اور قبائلی اسلاف کے نمائندے اور عبارت پتھر یا لکڑی کے کندوں، اور درختوں سے تھے اور نگیِ مصر سے پہلے تک ان دیوتاؤں میں باہم کوئی چپقلش چشمک یا رقابت نہ تھی سب نہایت آزادی کے ساتھ مل جُل کر رہتے تھے لیکن مصریوں کی صحبت میں بنی اسرائیل کو یہ معلوم ہوا کہ بعض دیوتا بعض پر فوقیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کے ارباب میں یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہ ان ارباب کے پجاریوں میں مسابقت شروع ہوئی بالآخر (اور یہ واقعہ غالباً خروجِ مصر کے وقت کا ہے) یہواہ نام کے ایک دیوتا کو مقابلتہً زیادہ قبول نصیب ہوا۔ یہ چیز کچھ تو بنی اسرائیل کے قومی تجربات کا نچوڑ تھی اور کچھ مصریوں کے اثر کا۔ قیامِ مصر کے زمانہ میں خیم دیوتا جو عمون کے ساتھ مل کر عمون خیم کہلایا' بعود آزار فرعون کے خاندانی اثرات سے پورے ملک میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ اس انتاج کی توثیق اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ یہواہ مصر سے واپس ہوتے ہوئے خیم کی طرح تابوت میں بند ہوگیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مصری اسرار کی دُھند میں لپٹ گیا کیونکہ اس کے بعد نہ کسی آنکھ نے اس کا مشاہدہ کیا اور نہ اس کی کسی کو اجازت تھی۔ یوں یہواہ اپنے ہمسروں میں ممتاز ہوا لیکن ساتھ ہی اس کے اس نے ان سے علیحدگی بھی اختیار کی جو ابتدا میں تو امتیاز کی علامت تھی لیکن بعد میں وجہِ دشمنی بن گئی۔

یہ دیوتا پتھر کا تھا۔ کیونکہ یہ سب کو تسلیم ہے کہ تابوتِ سکینہ میں پتھر تھے علاوہ اس کے جب نبو خدنذر کے ہاتھوں اس کی

---

[۱] زبور ۱۸: ۲، ۳۱: ۳ میں اسی خیال کو انہی لفظوں میں دُہرایا گیا ہے ۱۲ [۲] زبور ۱۸: ۳۱ میں یہی کہا گیا ہے۔

[۲] اس قبیل کی چند مزید مثالیں یہ ہیں تثنیہ ۳۲: ۱۸، سموئیل اول ۲: ۲، سموئیل دوم ۲۲: ۳ و ۴۷ و زبور ۶۲: ۲ و ۶۔

ارضی زندگی کا خاتمہ ہوا تب بھی اس کی ابتدائی حجریت باقی رہی، اس کی قربان گاہیں ہمیشہ اَن گھڑ پتھروں سے بنتی تھیں (خروج ۲۰: ۲۵ وغیرہ) اور اسے زبانِ شعر میں عموماً چٹان کہا جاتا تھا۔

اس دیوتا کا اصلی فعل نسل وفصل کی افزائش تھا۔ ممکن ہے بعضوں کو نسل کے ساتھ فصل کا یہ پیوند بے جوڑ سا معلوم ہو لیکن میں کہوں گا کہ ارادی زرعی دیوتا کا یادگاری پتھر بہ آسانی لنگ میں تبدیل ہو سکتا ہے اور پھر جب تدر اس کی لنگ کی ہو جائے تو اضافۂ نسل کے دیوتا کے ساتھ جو لازماً لنگ کی شکل اور خاصیت رکھتا ہے اس کی تطبیق کچھ مشکل نہیں پھر یوں بھی چونکہ کاشتکاری عمل توالد و تناسل سے تقریباً مشابہ ہے لہٰذا اگر ذہنی ارتقا کے کسی مرحلہ میں انسان نے ان دونوں دیوتاؤں کو ایک کر دیا ہو تو تعجب کا کوئی محل نہیں[1] بہر حال یہواہ افزائشِ نسل و فصل کا دیوتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس پر پہلے پکے پھلوں شراب کی پہلی بوتلوں اور پہلوٹھی کے بچوں کی نذریں چڑھتی تھیں (خروج ۲۲: ۲۹) اور سال میں تین بار اس کی عیدیں منائی جاتی تھیں (خروج ۲۳: ۱۴ تا ۱۶) جو خاصیتۂ فصلی ہوتی تھیں۔ علاوہ اس کے خونیں قربانیاں بھی یہواہ کو افزائشِ نسل وفصل کا دیوتا ثابت کرتی ہیں میتھ کونڈر لکھتا ہے کہ "سنگِ یادگار یا مخروطی وضع کا پتھر پورے ملک شام میں افزائشِ نسل وفصل کے دیوتا کی علامت تھا اور پیالی کی شکل کا جوف جو اس میں پایا گیا ہے وہ بھینٹوں کے لئے ہے جو عموماً انسانی خون کی ہوتی تھیں اور قدماء نے ایسے پتھر پر اس قسم کی بھینٹیں واقعتہً چڑھائی ہیں"۔ اب ابراہیم اور اسحاق کے واقعہ پر (تکوین ۲۲) یفتاح قاضی اور اس کی بیٹی کے قصہ پر (قضاۃ ۱۱: ۳۹) سموئیل اور اجاج کے افسانہ پر (سموئیل اول ۱۵: ۳۲) اور میکاہ نبی کے اس استفسار پر کہ "کیا خداوند مینڈھوں اور تیل کی ندیوں سے خوش ہوتا ہے کیا مجھے اپنی خطا اپنی روح کے گناہ کے عوض اپنا پہلوٹھی کا بچہ اپنے جسم کا پھل ذبح کرنا چاہئے" (۶: ۷) اگر آپ غور کریں تو یقیناً یہی کہیں گے کہ یہواہ کو افزائشِ نسل وفصل کا دیوتا ہونا چاہئے پھر مصر و فلسطین کے متینہ عجائب بھی ہمیں اس نتیجہ کی طرف لے جاتے ہیں، چولھے کی راکھ اور اس سے پھنسیوں کی نمود (خروج ۹: ۹) اور پہلوٹھوں کی موت (خروج ۱۲: ۳) اور خونی بواسیر کے مستوں کی مصیبت (سموئیل اول ۵: ۶، ۷) یہ ایسے افسانے ہیں جو ایک الٰہ النسل ہی سے موزوں طور پر منسوب ہو سکتے ہیں اور ایک الٰہ النسل ہی سے ایسے انتقاموں کی توقع کی جا سکتی ہے[2]۔

---

[1] اور اگر فرائڈ کا اعتبار کیجئے تو جملہ زرعی اعمال شہوانی ہیجانات کی تسکین کا ذریعہ ٹھہرتے ہیں کیونکہ اوڈی پس کمپلیکس کی بدولت فرد کو اپنی ماں کے ساتھ ایک قسم کا جنسی لگاؤ ہوتا ہے اور وہ زمین میں ہل دھنسا کر اور یوں اسے بارآور (یا انسانی اصطلاح میں حاملہ) کر کے اس جبلت کو روکش تسکین کرتا ہے۔ لائق ذکر اس سلسلہ کا یہ ہے کہ زمین کو اکثر و بیشتر ماں کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

[2] معجزات سے تفصیلی بحث کا یقیناً یہ کوئی محل نہیں تاہم گفتگو کا رخ جب پھر اس طرف گیا ہے تو ضرور ہے کہ چند کلمات اس موضوع پر کہہ ڈالے جائیں خرق الفطری یا غیر معمولی حادثہ یا منظر کی حیثیت سے معجزہ پر اس کے نقادوں نے دو مختلف زاویوں سے نظر ڈالی ہے، ایک اعتراض (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

یہواہ کا ارتقا، اور اس کے اسباب:۔ سوال یہ ہے کہ ایک ایسے معمولی دیوتا سے وہ یہواہ کیسے حاصل ہوا۔ جو ہمیں آج کل اسفارِ یہود میں ملتا ہے؛ ـــــ یعنی ایک برترین قوت، ایک قدسی وسرمدی وجود، ایک ہمہ توان ہستی، ایک یکتا و بےہمتا

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) تو یہ ہے کہ ہمارا تجربہ یہ کہتا ہے کہ قوانینِ قدرت بالکل غیر متبدل ہیں اور یہ ہم کسی طرح تصور نہیں کر سکتے کہ انہیں کسی فرد یا جماعت کی خاطر توڑا گیا یا جا سکتا ہو، اس اعتراض کو رفع کرنے کی بہتیری کوششیں کی گئیں۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکیں، البتہ شراڈنگر، ہائزن برگ اور ڈیرک کے اصول عدم تعیین (Principle of indeterminacy) سے بعض سائنسدانوں نے ایک وسیع ترکلیہ عدم تعیین کا (Law of uncertainty) مستنبط کیا ہے (ایڈنگٹن جینس وغیرہ) اور آج عام طور پر الہیاتی مفکرین یہ کہنے لگے ہیں کہ اختیار اور معجزات کی حیثیت حقائقِ ثابتہ کی ہے لیکن بیشتر اکابر محققین (مثلاً آئن شٹائن وغیرہ) یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ اصول "لاعلمی کا ایک عارضی ملجا" ہے یعنی یہ کہ علّیت (Causality) کا سابقہ اصول دنیائے طبیعیات میں پھر سے عنقریب بحال ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ذرہ کی وضع اور اس کے معیارِ حرکت کو ایک وقت میں صحت کے ساتھ متعین نہیں کیا جا سکتا تو یہ خرابی پیمائش کی ہے یعنی یہ کہ وہ طبیعی حقیقت نہیں اِلّا اس وقت جب کہ ذرّہ وضع اور معیارِ حرکت دونوں سے عاری ہو یوں تعیین ناممکن ہے تو ذرّات کی نہ کہ ان کے مجموعوں کی اور ہمارا تجربہ مجموعوں سے متعلق ہے نہ کہ ذرات سے، دوسرا اعتراض جسے ہیوم اور ہکسلے نے فروغ بخشا ہے رواۃ وشہود سے متعلق ہے، کہا گیا ہے کہ ہر معجزہ کی شہادت اتنی قوی اور کافی ہونی چاہئے کہ اس کی تردید خود ایک معجزہ ہو، اس شرط کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ معجزات کے عینی گواہ ایسے ہوں جن کی نیت پر کسی طرح کوئی شبہ نہ کیا جا سکے یعنی جو اپنے فہم، تعلیم، فراست اور تربیت کے اعتبار سے بالکل کسی ماہر سائنس یا فلسفی کی طرح بے لوث اور بےغرض ہوں ظاہر ہے کہ یہ شرط کبھی پوری نہیں ہو سکتی اور اسی لئے جان ہنری نیومن ایک جگہ یہ لکھتا ہے کہ "بعض ملحد اہلِ قلم یہ کہتے ہیں کہ معجزات کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جب تک کہ عدالت سے ان کی تصدیق نہ ہو۔ . . . . گویا ان کا خیال یہ ہے کہ اخلاقی اور مذہبی مسائل کے لئے ضرورت قانونی ثبوت کی ہے اور یہ کہ شہادت معیارِ حق ہے" لیکن افسوس اس کا ہے کہ معجزات طبیعی حقائق ہیں نہ کہ روحانی، اگر وہ روحانی ہوتے جیسا کہ اوراجن، ولسٹن وغیرہ کا خیال ہے تو ان کے لئے بےشک نتائجی (Pragmatic) معیارِ حق کافی تھا لیکن جب انہیں طبیعی حقائق تسلیم کیا جاتا ہے تو ضرور ہے کہ وہ Realistic شرائط کی پابندی کریں۔ ایک ضمنی اعتراض شہادت کے سلسلہ میں یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ معجزات کی تصدیق کرنے والے عموماً ان کے قایل ہوتے ہیں اور قائلین کی شہادت ناقابلِ قبول ہے، اس لئے کہ وہ جذباتی ہے عقلی نہیں ماننے والوں کو اپنے اسناد پر بلحاظ ان کے مذہبی تقدس کے کتنا ہی اعتبار کیوں نہ ہو گبن جیسا شخص بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ "فوق الفطرت حقایق کا قبول عاملانہ تصدیق نہیں" یعنی یہ کہ اسناد کی نیتوں اور غایتوں پر شبہ ہو سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بہتیرے معجزات ایسے ہیں جن کے متعلق بیرونی شہادتیں ملتی ہی نہیں ہیں؛ مثلاً مسیحی عہد کے یونانی اور رومی عقلاء اپنی کتابوں میں اس وقت کے جملہ بڑے بڑے مظاہرِ قدرت کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں لیکن ذکر نہیں کرتے تو یسوعی معجزات کا، گبن اپنے چبھنے والے طنز کے معمولی لہجہ میں کہتا ہے کہ "ہم کافروں اور فلسفیوں کی اس مجرمانہ خاموشی کو کبھی معاف نہیں کر سکتے جن کا ارتکاب انہوں نے ان جلی آیاتِ قدرت کو قلم بند نہ کر کے کیا جو ان کی عقل پر نہیں بلکہ حواس پر پیش ہوئی تھیں۔" بہر کیف معجزات تمام تر بے بنیاد ہیں لیکن اگر وہ (بقیہ برصفحۂ آئندہ)

ذات، اور ایک نیکی پسند شخصیت۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہ قدیم یہودیوں کی بُت پرستی وحدانیت کاملہ میں تبدیل کیسے ہوئی، جواب اس کا آسان نہیں کیونکہ ایک ایسے فرد کے لئے جو بالکل مختلف عقلی و تہذیبی ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہو کسی طرح یہود کی قدیم قبائلی نفسیات میں نفوذ ممکن نہیں تاہم چند مٹے مٹے نقوش پا سے ہم ان راہوں کی تعیین کر سکتے ہیں جن پر سے ہو کر یہودیوں کا ذہنی کارواں گزرا ہے۔

۱۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اصلی آل سام کی حسِ جمال (*Aesthetic sense*) حد درجہ کمزور اور کند واقع ہوئی ہے ممکن ہے یہ کوئی نقص ہو مگر فلسطین میں اس سے وحدانیت کے بروز میں بڑی مدد ملی کیونکہ عام طور پر دیوتاؤں کی شبیہیں بنائی نہیں گئیں بلکہ انہیں لکڑی یا پتھر کے کندوں اور درختوں کی شکل میں پُوجا گیا۔ قدیم یونانی اور رومی سیاحوں کے بیانات اس دعویٰ کی روشن اور محکم دلیل ہیں یوں جب مختلف اور متعدد دیوتا ملتی جلتی یا ایک ہی شکل کے ہوں تو ایک زمانہ کے بعد ان کی صفات کا باہم گھل مل جانا چنداں حیرت انگیز یا مستبعد نہیں۔

۲۔ علاوہ اس کے بنی اسرائیل واپسی مصر کے بعد سے اپنے دیوتاؤں کو زیادہ تر مظلوں اور معبدوں کے اندر تاریکیوں میں چھپا کر رکھنے لگے تھے اور پھر فرطِ احترام سے انہیں نظر بھر کر دیکھنا بھی انہوں نے چھوڑ دیا تھا لہٰذا کوئی تعجب نہیں جو ان کے دیوتاؤں کی صفات زیادہ سے زیادہ غیر متعین یعنی مخلوط ہوتی گئی ہوں۔

۳۔ حد سے بڑھے ہوئے احترام کا ایک اور مظاہرہ جیسا کہ اُوپر گزر چکا ہے اس شکل میں بھی ہُوا کہ یہود اپنے دیوتاؤں کے اسمائے ذات زبان پر نہیں لاتے تھے بلکہ ان کی بجائے اپنا کام وہ توصیفی اسماء سے نکال لیتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس طرح مختلف ارباب

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) بے بنیاد نہیں تو کم از کم ایسے واقعات ضرور ہیں جن کی اصلی وضع اور شکل کو بدل دیا گیا ہے یعنی جو بذاتہا معجزات نہیں مثلاً خروج مصر کے سلسلہ کے معجزات میں پوچھتا ہوں کہ ہمارے اپنے زمانہ میں کیا بارش میں مکھیاں زیادہ نہیں ہو جاتیں؛ کیا مویشیوں کے امراض ختم ہو چکے ہیں؛ کیا ژالہ باری رُک گئی ہے؟ کیا ٹڈیاں ناپید ہو چکی ہیں؛ کیا سُورج نے گہن ناچھوڑ دیا ہے؛ اور کیا سمندروں میں جوار بھاٹے نہیں آتے؛ پھر جب یہ سب کچھ آج بھی ہوتا ہے تو انہیں عجائب و معجزات کیوں شمار نہیں کیا جاتا؛ حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہبی فرقہ ابتدا میں چھوٹی تعداد میں ہوتا ہے اور شدید مذہبی جنون اپنے میں رکھتا ہے یہ مذہبی جنون طبیعی دُنیا کی رفتار کو تو بدلتا نہیں البتہ جماعت کی نفسیات میں بڑے تغیرات برپا کر دیتا ہے یوں ہر مذہبی جماعت خود کو خدا کا برگزیدہ یا خیر الائمّہ اور ہر بڑے یا نمایاں فطری حادثہ کو (جس کی کوئی مذہبی قدر نہیں ہوتی اس لئے کہ مذہب انسانی تخئیل اور عمرانیت کی پیداوار ہے) اپنی تائید کی علامت سمجھتی ہے، یا پھر مقابل کی بڑی جماعتوں کی ناانصافیوں کا بدلہ لینے کے لئے بطور تلافی بعض واقعات کو بالکل غلط رنگ میں پیش کرنے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ ترقی پا جاتی اور قوت حاصل کر لیتی ہے تو معجزات بند ہو جاتے ہیں علاوہ اس کے وُہ بعض اوقات دو یکسر غیر مربوط اور بے تعلق واقعات میں علّی ربط بھی قائم کر دیتی ہے حالانکہ ہم وقت یا متعارن واقعات ہمیشہ ربطِ علّیت اپنے میں نہیں رکھتے مثلاً بندرگاہ قلزم اور فلسطین اور مریم و موسٰے کے واقعات وغیرہ مختصر یہ کہ معجزات، کرامات، خوارق عادات، انسان کی اساطیر آفرینی کے شاہکار ہیں یعنی بالکل بے اصل چیزیں ہیں اور عقلِ سلیم انہیں کبھی باور نہیں کر سکتی۔

کی صفات کا ایک زمانہ میں باہم خلط ملط ہو جانا نہ خلافِ توقع ہے اور نہ خلافِ فطرت کیونکہ ہر مقامی دیوتا جب بعل اور مولک کہلاتا ہو۔ تو ضرور ہے کہ کسی وقت ان بعلوں اور مولکوں کی صفات کا اسمی اشتراک کی وجہ سے باہم تبادلہ ہو جائے، علاوہ اس کے اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ جنگ وصلح کے ذریعہ جن قبائل اور اقوام سے سابقہ ہوا ان کے دیوتاؤں کے اسمار اور افعال کو اپنے پرانے مقدس پتھروں اور لکڑی کے کندوں کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ یوں بھی مختلف دیوتاؤں کی صفات مختلف دیوتاؤں میں جذب اور ضم ہوئیں۔

۴۔ مصر کے طویل قیام اور بابل کی مسلسل تاختوں کا ایک اثر یہودیوں کے مذہب پر یہ بھی مترتب ہوا کہ ان کا ہر دیوتا خاصیتۂ شمسی بن گیا۔ مصر میں وہاں کا رع دیوتا ایک زمانہ میں تقریباً ہر مصری دیوتا میں شامل ہو گیا تھا۔ اوسیریز، ہورس، عمون وغیرہ کے ساتھ اس کا امتزاج بہت معروف ہے "رع اوسیریز کی روح ہے اور اوسیریز رع کی"۔ ہورس یا ہُور بھی ثانوی حیثیت سے سورج دیوتا تھا اور عمون تو عمون رع کی شکل میں ایک وقت پوری مملکت کا سب سے بڑا دیوتا تھا، بابلیوں کی نجوم پرستی تو کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کا مردوک بھی سُورج تھا، نرگال بھی سُورج تھا اور شمش بھی سورج تھا۔ یہود نے یہ آفتاب پرستی مع متعلقہ شمسی اساطیر کے اپنے مذہب میں ضروری کاٹ چھانٹ کے بعد جوں کی توں منتقل کر لی۔ اب بعل بھی سُورج دیوتا بن گیا اور مولک بھی اور یہواہ بھی[ا]، یوں جب تمامی دیوتا خاصیتۂ شمسی بن گئے تو ان کی باہمی تطبیق و توفیق کچھ مشکل نہیں رہی۔

[ا] زبور ۱۸: ۸ میں شاعر یہواہ کی شان میں کہتا ہے "اس کے نتھنوں سے دُھواں نکلا اور اس کے مُنہ سے آگ . . . " یسعیاہ کہتے ہیں "دیکھو خداوند کا نام دُور سے سُنائی دے رہا ہے اس کے غصہ کے شعلے پیچ وتاب کھا رہے ہیں اور دُھواں بہت بلند اُٹھ رہا ہے اُس کے ہونٹ جوشِ غضب سے کانپ رہے ہیں اور اس کی زبان بھسم کر دینے والی آگ کی طرح ہے" (۳۰: ۲۷) عموص کہتے ہیں "اس کو ڈھونڈو جو . . . . موت کی سی تاریکی کو صبح میں تبدیل کرتا ہے اور دن کو رات بنا تا ہے . . . . وہ خداوند ہے اور یہواہ اس کا نام ہے" (۵: ۸) اور میکاہ کہتے ہیں جب یہواہ زمین پر اُتر آئے گا تو "پہاڑ پگھل جائیں گے . . . . ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ موم آگ کے سامنے پگھلتا ہے" (۱: ۴) علاوہ اس کے اسفارِ یہود میں متعدد مقامات پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہواہ نے آگ بھیجی یا سُلگائی (مثلاً عموص ۱: ۴ و ۷ و ۱۰ و ۱۲ و ۱۴، ۲: ۲ و ۵ وغیرہ) اور یہ کہ اس کا فرشتہ آگ کے شعلہ کی صُورت میں نمودار ہوا (مثلاً خروج ۳: ۲ وغیرہ) ان جملوں میں اور ان کے علاوہ اور بہت سے جملوں میں جنہیں میں یہاں بخوفِ طوالت چھوڑ دیتا ہوں یہواہ علانیہ ایک سورج دیوتا ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ محروطی وضع کا وہ پتھر جو صندوق میں بند تھا اور اغلب کہ کسی متوفی سردار کا سنگِ مزار تھا سُورج کیسے بن گیا کیسے بن سکا؛ اس جگہ گوسالہ پرستی دریافت کر دی بہم پہنچاتی ہے، یہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ یہواہ کی پرستش گوسالہ کی شکل میں بھی ہوتی ہے کیوں؛ اس لئے کہ یہواہ پر بیل بکثرت قربان کئے جاتے تھے اور فریزر کہتا ہے کہ جو جانور معمولاً جس دیوتا پر قربان کیا جاتا ہے وہ اکثر و بیشتر اس دیوتا کا نمائندہ یا اوتار مقرر ہوتا ہے یا پھر ممکن ہے اس لئے کہ یہواہ بھی فطرت کی قوتِ مُولدہ کا مظہر تھا اور بیل بھی زراعت کا ایک اہم اور فعلی عنصر ہونے کی وجہ سے یہی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا دونوں میں تطبیق پیدا کی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں مصر اور بابل کی گوسالہ پرستی کے اثرات کو بھولنا نہیں چاہیے مصر میں اپیس بیل کی بمقام میمفس اور منیویس بیل کی بمقام عون (ہیلیوپولس) (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

غالباً کچھ اس طرح یہودیوں نے اپنے دیوتاؤں کو خلط ملط کر دیا اور یہ اختلاط دیوتاؤں کا اس درجہ پیچیدہ تھا کہ سوائے ان کے چند ناموں کو اور کوئی چیز ان کی لائق امتیاز باقی نہیں رہی۔ یوں وحدانیت کے لئے زمین تیار ہوئی۔ اور اب ضرورت صرف اس کی تھی کہ چند سبقت خواہ دیوتاؤں میں سے کسی ایک کو بقیہ پر فضیلت حاصل ہو اور اس کا تصور گہرائی میں سب سے بڑھ جائے۔ ایک عرصہ تک رائے عامہ ایک مقامی بعل اور یہواہ کی دو انتہاؤں کے بیچ میں جھولتی رہی لیکن آخر میں یہواہ کا پلہ بھاری رہا کیونکہ:۔

۱۔ ایک تو یہ کہ وہ افزائش نسل و فصل کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس قسم کے دیوتا ان اقوام کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو اتفاق سے چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور جنگجو بھی۔ قدیم عبرانیوں کی یہی حالت تھی۔ وہ مصر و فلسطین میں نہایت پُرخطر زندگی بسر کر رہے تھے انہیں اپنی قومی بقا کے لئے بے شمار دشمنوں سے نپٹنا تھا۔ ظاہر ہے کہ جنگ کس قدر انسان طلب ہوتی ہے اور اسی لئے ضرورت تھی کہ قوم کی مائیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بچے پیدا کریں تاکہ خداوند کے یہ سپاہی اس کے عہد کی تکمیل کا ذریعہ بنیں۔ زبور میں آیا ہے "خوش قسمت ہے وہ انسان جس کا ترکش بچوں کے تیروں سے بھرا ہوا ہے وہ دشمنوں سے درہ میں سمجھ لیں گے" (زبور ۱۲۷: ۵) اس زمانہ میں ایک اسرائیلی عورت کی سب سے بڑی سعادت یہ تھی کہ وہ ماں بنے اور بانجھ عورتوں سے بہت نفرت کی جاتی تھی آج جرمنی، اٹلی اور ترکی میں یہی ہو رہا ہے جنگ کا ایندھن زیادہ سے زیادہ وافر مقدار میں مہیا کرنے کے لئے کنواروں پر بھاری بھاری محصول عاید کئے جاتے ہیں اور بڑی تعداد میں بچے پیدا کرنے پر مختلف قسم کے انعامات اور وظائف ملتے ہیں اور

۲۔ دوسرے یہ کہ وہ خداوند افواج و رب الجدال تھا۔ بنی اسرائیل نہایت قدیم زمانہ سے اسے جنگ و جدل کے ہر موقعہ پر اپنے ساتھ رکھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہواہ ان کی طرف سے ان کے دشمنوں سے لڑتا ہے اور انہیں شکست دیتا ہے چنانچہ کنعان کی قسمت(؟) اور موعود سرزمین جب تک پورے طور پر فتح نہ ہولی تب تک یہواہ ہر کیمپ میں بنی اسرائیل کے ساتھ رہا۔ اُحد مجاہدین کی مٹھی بھر جماعت کے لئے جو موسیٰ اور یوشع جیسے بلند حوصلہ افراد کی قیادت میں استقرار ملی کی خاطر دیوانہ وار جدّ و جہد کر رہی تھی۔ کسی ایسے ہی یقین کی شدید ضرورت تھی اور آج اگرچہ یہ ہمیں بالکل بے سروپا معلوم ہوتا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس نے خوب کام کیا[۱]۔

لیکن یہ توحید ناقص تھی کیونکہ بعل کی (Shadow Cabinet) پوری سرگرمی کے ساتھ مصروفِ عمل تھی۔ تاہم تکمیل توحید

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پرستش ہوتی تھی اور بابل میں مردوک جو یہواہ کی طرح افزائش نسل و فصل کا دیوتا تھا ایک گوسالہ کی شکل میں پوجا جاتا تھا لیکن یہواہ کے اسی گوسالہ شکل ہونے نے اسے ایک سورج دیوتا بنا دیا کیونکہ مصر میں اپیس بیل اوسیریز کا اوتار تھا اور مینولیس بیل رع کا اور اوسیریز اور رع دونوں بنی اسرائیل کے قیام مصر کے زمانہ میں سورج دیوتا تھے۔ اسی طرح مردوک بھی سورج دیوتا تھے علاوہ اس کے گوسالہ کو عموماً سورج کی علامت سمجھا گیا ہے غالباً کسی نجومیاتی وجہ کی بنا پر لیکن یہ بتلانا یہاں ضروری متصور ہے کہ یہواہ کا ایک خداوند فطرت ہونا کوئی مستقل اور قدیم حیثیت نہیں۔ وہ اصل میں ایک قومی دیوتا تھا — خداوند افواج و رب الجدال — جو اپنی پسندیدہ قوم سے معاہدے کرتا تھا (مثلاً تکوین ۹: ۹، ۱۷، ۱۲: ۲، ۱۵: ۸، ۱۷: ۲ - خروج ۶: ۵ وغیرہ) اور اس کی طرف سے اس کے دشمنوں سے لڑتا تھا (مثلاً خروج ۱۴: ۱۴، ۲۵، ۱۵: ۳، ۱۷: ۱۶ - یوشع ۳: ۱۰ وغیرہ)

[۱] بر صفحہ آئندہ

کے امکانات پیدا ہو گئے کیونکہ یہواہ کے متعلق اسفارِ یہود میں بہ تکرار اور بہ اصرار یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ غیور (Jealous) ہے یعنی اپنے سامنے کسی دیوتا کا وجود و احترام برداشت نہیں کر سکتا۔ ابتدا میں اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ وہ جس جگہ رہے تنہا رہے۔ چنانچہ داغون کا قصہ (سموئیل اول ۵) مشہور ہے۔ اور پھر یسعیاہ اور یرمیاہ کے اسفار میں متعدد آیات ہمیں ایسی ملتی ہیں جن میں یہواہ نے غیر دیوتاؤں کے اپنے معبد میں داخل ہونے پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا ہے لیکن جب یہواہ کے تصور میں کافی گہرائی پیدا ہو گئی تو غیرت کا مفہوم یہ متعین ہوا کہ یہواہ کا ہر نذیر (اعداد ۶) صرف یہواہ کو پوجے۔ یوں خالص یہواہ پرستوں کی ایک جماعت پیدا ہوئی جو حد درجہ متعصب اور متشدد تھی۔ چنانچہ بعل پرستوں کے ساتھ اس کے کئی معرکے کے رن پڑے جن میں سیاسی قوت کو آلۂ کار بنا کر کبھی تو اول الذکر نے کامیابی حاصل کی اور کبھی مؤخر الذکر نے۔ لیکن آنکھ مچولی کا یہ کھیل زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا۔ یوسیاہ کے عہد میں یہواہ پرستوں نے ایک بڑی گہری سازش کی (ایام دوم ۳۴ و ۳۵) تثنیۃ الاشتراع کو بالکل بدل دیا، بادشاہ نو عمر تھا اور زود یقین، وہ ان کے جھانسے میں آ گیا اور اس نے معبدِ یہواہ میں وہاں کے کاہنوں اور قوم کے بڑے بوڑھوں کے سامنے قلبِ صمیم کے ساتھ یہ عہد کیا کہ وہ یہواہ کے یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہ اس کے پجاریوں کے احکام و اوامر کی دل و جان سے پابندی کرے گا اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی مختصر ترین تفصیل یہ ہے کہ پورے اسرائیلی رقبہ کے تمام بت خانے ڈھا دیئے گئے ان کے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا گیا، ان کے پجاری قتل کر دیئے گئے۔ اور پوری رعایا کو محض یہواہ پرستی پر مجبور کیا گیا اس طرح یہواہ پرستی کی اشاعت اور توسیع انجام پائی۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کسی مذہبی عقیدہ کی پشت پر مملکت کی سیاسی قوت کار فرما ہوتی ہے تو اس کا وجوب اور حق (Truth) بہت بڑھ جاتا ہے — اتنا کہ اس کی مخالفت حکومت کی مخالفت شمار ہوتی ہے اور حکومت کی مخالفت کا نتیجہ یا تو ہمیشہ کی خاموشی ہوتا ہے یا پھر ہم آہنگی۔ علاوہ اس کے یہ ایک اصول ہے اور مسلمہ کہ جب کسی دیوتا کا بت، معبد اور پجاری یہ تینوں چیزیں فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں تو وہ دیوتا مر جاتا ہے، یوں بھی جب مملکتِ یہود کے جملہ دیوتا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے تو رعایا کے لئے یہواہ پرستی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔

لیکن اس یہواہ پرستی کو توحیدِ کاملہ کے مترادف نہیں سمجھنا چاہئے کچھ تو اس لئے کہ اسے پوری یہودی قوم کی قلبی تائید حاصل نہ تھی[1] اور کچھ اس لئے کہ یہواہ کی ارضی زندگی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہمسایہ ملکوں کی پیہم سامراجی تاختوں نے ان شرائط کی بہت جلد تکمیل کر دی۔ یہودیوں کا چھوٹا سا ملک جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے مصرِ قدیم اور بابل و نینوا کے درمیان ایک ناگزیر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) یہواہ اپنی اس حیثیت میں واضح طور پر ایک بادشاہ ہے جو میدانِ جنگ میں اپنی فوج کے قلب میں رہتا اور اس کی تقویت اور ہمت افزائی کا باعث ہوتا تھا۔

[1] ثبوت میں یوسیاہ کے بعد کے بادشاہوں کی روایات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

شاہراہ تھا اور اسی لئے ہمیشہ پامال رہتا تھا۔ اکثر اس کے حکمرانوں نے یہ کوشش بھی کی کہ طاقتور پڑوسیوں کو اپنے فائدہ کے لئے باہم لڑا دیا جائے لیکن بساطِ سیاست کی یہ پرانی چالیں زیادہ دن نہیں چل سکیں، ۷۲۱ ق م میں نینوا کے شرغون دوم نے سلطنت اسرائیل کو ختم کر دیا اور ساتھ ہی یعقوب کے دس اسباط جو مذکورہ سلطنت میں بستے تھے ہمیشہ کے لئے نابود ہو گئے۔ یہ ایک بہت بڑا قومی حادثہ تھا اور اس سے یہود کے جسد قومی کی ریڑھ میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ موقع غنیمت تھا اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہواہ پرستوں نے اپنا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہواہ بنی اسرائیل کے سامنے چلتا تھا یعنی ان کی قیادت کرتا تھا تو دشمنوں کی فوج کسی شمار قطار میں نہ تھی۔ اور اب بھی اگر وہ اس کے ہو رہیں (اور مصر اور اشور اور بابل کی طرف مدد طلب نگاہوں سے تکنا چھوڑ دیں تو وہ سب کو فنا کر دے گا، یہ خیال اگرچہ بظاہر خام معلوم ہوتا ہے مگر وہ یہودی رقبہ میں مستقل رفتار کے ساتھ پھیلتا گیا۔ اور جب ۶۰۴ ق م میں یعنی فرعون نیکو دوم کی تاخت کے بعد جس میں یوشیا مارا گیا (۶۰۸ ق م) بابل سے بنوخد نذر (یا بنوخدرزّر جسے عرب بخت نصر کہتے ہیں) کا طوفان اُٹھا اور اپنی رَو میں یروشلم، معبدِ یروشلم۔ اور بنی اسرائیل کے بقیہ دو اسباط کو بہا لے گیا[1] تو پوری قوم یکلخت اس جنون میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے محسوس کر لیا اور اچھی طرح کہ یہ خیال بالکل درست تھا یوں یہودیوں نے اپنا سب کچھ کھو کر وہ چیز پالی جس نے انہیں اقوامِ عالم میں سب سے سربلند کر دیا ـــــــ "عقیدۂ توحید!"

لیکن بنوخد نذر کے اس تباہ کن حملہ کی یہاں پر تھوڑی سی تفصیل ضروری ہے بابل کا یہ مشہور نوجوان نمرود ایک بھوکے اور غضبناک بھیڑیے کی طرح یہود کے باڑے پر آ پڑا۔ یروشلم کا مقدس شہر لوٹ لیا گیا۔ اس کی فصیل گرا دی گئی۔ اس میں جابجا آگ لگا دی گئی اس کے مشہور معبد کو قیمتی اشیا سے محروم کرنے کے بعد زمین کے برابر کر دیا گیا اور بنی اسرائیل کی بچی کھچی مگر پوری قوم مع زن و فرزند کے پابجولاں بابل لائی گئی سفر الایام کے مصنف[2] نے ان تباہیوں اور غارت گریوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتلاتا کہ کہ تابوتِ سکینہ کا کیا ہوا " اسرائیل کی چٹان " پر کیا بیتی؛ ممکن ہے وہ کسی خیال سے چپ ہو لیکن ہم بجا طور پر یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اکھڑ فاتحوں نے اسے زمین پر پٹک کر چور چور کر دیا ہو گا جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ یوں یہواہ کی ارضی زندگی ختم ہوئی مگر وہ مرا نہیں۔ (کیونکہ قدیم الایام سے اسے صندوق میں بند کر دیا گیا تھا تاریکی میں چھپا کر رکھا جاتا تھا اور کوئی دیکھتا نہ تھا۔ اس طرح یہواہ مادی شکل میں موجود ہوتے ہوئے بھی غیر مرئی تھا اور اس کا تصور اس کی محسوس ہستی سے بے نیاز یہود کے اذہان میں ترقی پاتا گیا یہی وجہ ہے کہ جب اس کا معبد اور بُت دونوں ختم ہو گئے تو اس کے تصور کو ذرا سا دھکا نہ لگا) بلکہ اپنے تابوت کے اوپر کے کروبیوں

---

[1] قرآن نے اس تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے وجاسوا خلال الدیار (وہ ان کے ملک میں طاقتور قوم گھس پڑیں۔

[2] غالباً عزرا الکاہن۔ قرآن کے عزیر۔

پر بیٹھا اور اڑ گیا (مثلاً زبور ۱۸: ۱۰) اب اس نے آسمانوں میں سکونت اختیار کی[1] اسے دُنیا میں بھی تاریکی پسند تھی اور اوپر بھی تاریکی ہی ملی۔

اب یہواہ پرستی واقع میں توحید کا ملہ بن گئی کیونکہ ایک طرف تو اسے قیدِ بابل کی وجہ سے پوری قوم کا دلی تعلق اور قبول حاصل ہوگیا اور دوسری طرف اس قدیم حکم کی بدولت کہ یہواہ کی اشباہ تیار نہ کی جائیں اس میں زیادہ روحانیت اور اثیریت پیدا ہوگئی چنانچہ سروشِ اعظم (یا کورش الفارسی) کے طفیل جب یہودیوں نے پچھلے کھنڈرات پر دُوسرا معبد (ہیکل زیر و بابل) تعمیر کیا تو اس میں بُت پرستی کی کوئی علامت موجود نہ تھی بابل سے پلٹنے والے یہودیوں کا یہواہ ایک نہایت لطیف وجود تھا۔ وہ آسمانوں میں رہتا تھا۔ چاند، سورج، نجوم، شہب، کواکب اور زمین پر حکومت کرتا تھا۔ قادرِ مطلق، ہمہ دان اور ہمہ بین تھا اور نیکی سے خوش ہوتا اور بدی پر سزا دیتا تھا، خدا کا یہ بلند ترین تصورِ دُنیا کا ایک عجیب تجربہ تھا اور یہود نے اپنی جُملہ مقدس کتابیں پھر سے اس تصور کے زیرِ اثر مدوّن و مرتب کیں اور اسی لئے جس یہواہ سے ہم تورات کے اسفار میں ملاقی ہوتے ہیں۔ وہ چھٹی صدی ق م کی پیداوار ہے۔

اپنی اس بے بہا دریافت کو ایک متاعِ عزیز کی طرح سینہ سے لگائے یہودی یونانیوں اور رومیوں کے عہدِ حکومت میں مغربی ایشیا عرب، شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ میں پھیل گئے۔ قیدِ بابل کے بعد سے وہ چونکہ ایک ازبس خود آگاہ اور سیاسی قوم بن چکے تھے اور پھر ان کا خیال یہ تھا کہ شخصی و قومی سعادت کا انحصار تمام تر مذہب کی مثالی پاکیزگی پر ہے۔ لہٰذا ہر جگہ انہوں نے اپنے عبادت خانے (Synagogues) تعمیر کئے اور ان میں اپنے آسمان پائے گاہ خدا کو پُوجا۔

لیکن یہواہ یہود کا قومی خدا ہے وہ لاریب کہ گناہ کو ہر جگہ ناپسند کرتا اور ہر ایک کو اس کی سزا دیتا ہے مگر انہیں وہ زیادہ سخت سزا دیتا ہے جو اسے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں ــــ یہودی۔ علاوہ اس کے وہ عادات و اطوار کے اعتبار سے بالکل ایک بدوی عرب کی طرح ہے جس کا ہاتھ ہمیشہ بیش قبض پر ہوتا ہے اور جو باپ کا بدلہ بیٹوں اور پوتوں سے لیتا ہے۔

یہواہ کی منطقی ترقیاں۔ انطاکیہ میں یہواہ کے ساتھ اوسیریز، ادونیس، متھرا، اعطیس اور ڈایونی سوس ملے اور عیسائیت کا واحد فی التثلیث (Triune) خدا تیار ہُوا۔ یہود نے کئی صدیوں کی مسلسل کوشش کے بعد ایک خدا کا تصور پیدا کیا تھا لیکن عیسائیوں نے غیر یہودی (Gentile) اثرات کے تحت اس کے تین ٹکڑے کر ڈالے۔ اور اس کے مزاج کی خشونت اور سخت گیری کو اس حد تک کم کر دیا کہ وہ باپ کے بجائے ماں بن کر رہ گیا، علاوہ اس کے عیسائیت کا یہ عجیب و غریب خدا عقلِ انسانی کے لئے ایک معما ہے منطق کی ایک کھلی توہین ہے، پروفیسر ہیزلی نے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ اشخاصِ ثلیث لفظی معنوں میں اشخاص نہیں بلکہ وہ تین مختلف پارٹ ہیں جو ایک ہستی نے انجام دیئے، لیکن اس اعتبار سے تو خدا کے کئی پارٹ

---

[1] شمسی اساطیر کی بدولت آسمان نہایت آسانی کے ساتھ یہواہ کے تقدس کا معبد بن گیا۔

ہو سکتے ہیں، پھر وہ تین ہی تک کیوں محدود ہوں، بہر حال تثلیث موجودہ زمانہ کے روشن خیال فرد کے لئے قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ حیاتی اقدار کی ضامن نہیں اور اخلاقی و مذہبی زندگی میں انتشار پیدا کر دیتی ہے۔

عیسائیت کے اس پیوندی ([illegible]) خدا کے مقابلے میں اسلام کا اللہؐ دراصل یہواہ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ وہ نہایت سختی کے ساتھ واحد ہے اور یہ وحدت اس کی اس درجہ مکمل ہے کہ ہر قسم کی دوئی اس میں غرق ہو گئی ہے یوں اخلاقی شعور کے مطالبات اور روحِ انسانی کی اعلیٰ اخلاقی اُمنگوں کی تکمیل متیقن ہو گئی۔ پھر وہ نہ مستبد حاکم ہے یہواہ کے جیسا اور نہ عیسائیت کے خدا کی طرح اتنا رحم دل ہے کہ بندوں کی خطاکاری پر خود گھُلتا جاتا ہو۔ اس کے برعکس اس میں دونوں قسم کی صفات غالباً متوازن ہیں اور ایمان کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے مزید بریں وہ قومی و ارضی حدود کے ماوراء ہے یعنی ربّ العالمین۔

مرزا محبوب بیگ

یا رب یہ بازیٔ جلوہ گاہ ہیں
ذرے حسن غیب سے بیتابیٔ اظہار ہے

پروانے سے یہ پوچھ کہ ترا ہے شمع پر
بلبل سے یہ لالہ کہ گلشن پہ نثار ہے

لے مارگولیتھ لکھتا ہے کہ اللہ ابتداءً قریش کا خاندانی دیوتا تھا۔ لہٰذا اسلامی توحید کے معنی یہ ہوئے کہ بانیٔ اسلام نے دوسرے قبیلوں کے دیوتاؤں کی پرستش کو مٹا کر اپنے دیوتا کو منوایا۔ لیکن یہ ایک کھوکھلی تحقیق ایک مکروہ جھوٹ ہے "پیغمبرِ صحرا" کو اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ دادیٔ غیر ذی زرع میں خدائے واحد کا تصور یہودیوں کی وجہ سے اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ شارع نے اسی تصور کو لیا اور اس میں وہ گہرائی پیدا کی جو یہواہ میں نہ تھی۔

شادکامِ محبّت

("ذکر و فکر" کا ایک ورق)

طرب انگیز ہے دُنیائے محبّت کی فضا ❊ دِل نے ہر رنگ میں لُوٹے ہیں قیامت کے مزے

اپنے محبوب کی نظروں میں جو محبوب رہے ❊ ہیچ ہیں اس کے لئے کوثر و جنّت کے مزے

اپنی خوش بختی پہ نازاں ہوں میں اے رُوحِ نشاط! ❊ مجُھ سے پُوچھے کوئی فردوسِ محبت کے مزے

مَیں نے چاہا تجھے، اور تُو نے بھی چاہا مجُھ کو!

ڈال کر دل پہ مرے ایک محبت کی نظر ❊ رشکِ صد ساغرِ جم اس کو بنایا تُو نے

مُسکرا کر، دلِ برباد کو اَے رشکِ بہار! ❊ بُوئے گلہائے تمنّا سے بسایا تُو نے

جس میں ہے مستیٔ جاوید و سرورِ ابدی ❊ اپنے متوالے کو وہ جام پلایا تُو نے

خاک سے عرش کی مسند پہ بٹھایا مجھ کو!

مرے نغموں میں ہے رنگینیٔ اُلفت کی بہار ❊ مری مستی میں ہے طوفانِ محبّت کا خروش

نُور کا ایک تلاطم ہے بپا آنکھوں میں ❊ مری ہر موجِ نظر ہو گئی خورشید بدوش

اہلِ حکمت تو مرے پہلے ہی دیوانے تھے ❊ آج اربابِ جنوں بھی ہیں مرے حلقہ بگوش

کچُھ اِس انداز کا دیوانہ بنایا مجھ کو!

آثر صہبائی

حمید اور حمیدہ

(یہ حمید اور حمیدہ کا افسانہ ہے۔ یہ دونوں آپس میں چچیرے بھائی بہن تھے۔ دونوں کی عمریں برابر۔ رنگ اور قد دونوں کے ملتے جلتے تھے، ایک ہی سال، ایک ہی مہینے، ایک ہی تاریخ کو دونوں پیدا ہوئے۔ اب عجیب اتفاق یہ تھا کہ دونوں کا نام بھی قریب قریب ایک تھا۔ فقط تانیث کی ہائے ہوز حمیدہ کے نام میں زیادہ تھی۔ باپ کبھی پیار سے حمید بھی کہہ کر پکار لیا کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ میری بیٹی نہیں بیٹا ہے۔)

ناہید بیگم :- (حمیدہ کی والدہ) تم حمیدہ کو مجسٹریٹ کیا گورنر بنانا۔ یہ بھی خبر ہے کہ جب اس نے بی۔ اے کی ڈگری لی ہے پوری بیس سال کی ہو گئی تھی اور اب ماشاءاللہ اکیسویں سال میں قدم رکھا ہے۔ میرے خیال میں حمیدہ کا جوڑ حمید سے بہتر نہیں ہو سکتا، ڈبل ایم اے ہے اس کے علاوہ گورنر نے اُسے سول سکرٹریٹ میں لے لیا ہے۔ ابھی تین سَو ہے، آٹھ سو تک جائے گا۔ ممکن ہے اس سے اور بھی زیادہ ترقی کرے۔ سُن رہے ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں، سمجھے بھی؟

اختر حسین :- (حمیدہ کے والد) میں تو کچھ نہ سمجھا، تم کیا کہہ رہی ہو۔

ناہید بیگم :- سُنو، حمید تمہارے بھائی کی اکیلی نشانی ہے۔ لائق اور خوبصورت۔ اِن دونوں کا جوڑا لاجواب ہے۔ بچپنے ہی سے ایک دُوسرے سے مانوس بھی ہیں۔ میں ڈرتی ہوں، اب لڑکا برسرِ روزگار بھی ہو گیا ہے، پروین بیگم کہیں اُس کی بات چیت نہ کر لیں۔ اور ہم مُنہ دیکھتے نہ رہ جائیں۔ تم آج ہی اپنی بھاوج کے پاس چلے جاؤ اور ذکر چھیڑ دو۔ ذکر چھیڑنا کیا اُن سے صاف صاف کہہ دو کہ حمید میرا بیٹا ہے، اس کی شادی میں کروں گا۔

اختر حسین :- تم یہ بتاؤ، میری تمہاری نسبت کس نے ٹھیرائی تھی۔ میرے والد تمہاری طلب کو گئے تھے یا تمہارے والد نے مجھے آ کر اپنی دامادی میں لیا تھا۔ جب میں نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگا تو اُس کے دو کیا ڈھائی سال کے بعد تمہارا عقد مجھ سے ہُوا۔ جلدی کیا ہے۔ ذرا سوچ اور سمجھ کے جواب دو، ٹھیک کہہ رہا ہوں یا غلط؟

ناہید بیگم :- حمیدہ کے ابا۔ تمہاری جہالت ہوتی ہے، اُس میں قانونی ہونگی ہوتی ہے۔ وہ زمانہ اور تھا، یہ زمانہ اور ہے۔ میں روپے والے باپ کی بیٹی تھی اور تم غریب باپ کے بیٹے۔ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ اُن کی آمدنی اس وقت تیس ہزار سال کی ہے۔ یہ بتاؤ حمیدہ کے ماں باپ کے پاس کیا جائداد ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہزار بارہ سو کی تمہاری پریکٹس۔ اگر سچ پوچھو حمید کو تو نوکری کی بھی کوئی ضرورت نہیں دیکھو دیر مت لگاؤ، ورنہ ایسا اچھا لڑکا ہاتھ سے جاتا رہے گا اور سُنو، میں صاف صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں، حمیدہ کی کیسی کیسی جگہ

سے بات آئی۔ جب بھی اُس کے کان تک خبر پہنچی، مُنہ اُس کا کُپّا سا پھُول گیا۔ جہاں حمید کا نام آیا، وہ خوش خوش دکھائی دینے لگی۔ تم اپنے حسبِ عادت اس وقت میری بات ٹال کے چلتے نہ بنو۔ آج ہی پروین بیگم کے ہاں جاؤ ـــ بولو، جاؤ گے؟

اختر حسین۔ اب بولو۔ تم قانون چھانٹ رہی ہو یا میں۔ کیوں نہ ہو آخر وکیل کی بیوی ہو نا، صبر سے کام لو۔ اتنی جلدی کیا پڑی ہے، سمجھی جائے گی۔

ناہید بیگم۔ دیکھو بات نہ بڑھاؤ۔ حمیدہ کالج سے آ چکی ہے۔ وُہ آ جائے گی تو پھر اُس کے سامنے یہ باتیں نہ ہو سکیں گی۔ بسم اللہ کر کے تم اس کارِ خیر کو جلد سے جلد انجام دو۔ اور جس طرح مَیں کہتی ہوں، کپڑے پہن کر سیدھے پروین بیگم کے ہاں جا کر اس بات کو طے کر آؤ۔ اگر لڑکا ہاتھ سے نکل گیا تو پھر چراغ لے کر دُنیا جہان مارو گے تو ایسا لڑکا نہیں ملے گا ـــ نہیں ملے گا۔

× × × × × × ×

دوسرے کمرے میں:۔

مسٹر حمید سر جھکائے اپنی چچی کی طرف جا رہے تھے کہ اتنے میں حمیدہ کسی کام سے اپنے کمرے سے باہر آئی۔ اُس کی نظر حمید پر جا پڑی۔

حمیدہ۔ بھائی جان تسلیم۔ آج تو بہت دن کے بعد آپ دکھائی دیئے۔ مزاج تو اچھا ہے؟

حمید۔ جی درست، بجا ارشاد ہُوا۔ میں پرسوں ہی پانچ بجے شام کو آیا ہُوا تھا۔ کم سے کم دو گھنٹے چچی جان کے پاس بیٹھا رہا بلکہ چچی جان نے آپ کو بُلوایا بھی تھا۔ مگر آپ نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ کہلا بھیجا۔ میں تھیسس لکھ رہی ہوں، نہیں آ سکتی۔

حمیدہ۔ لیکن مجھ سے یہ کسی نے نہیں کہا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔

حمید۔ دیکھو، میدہ، اب بات نہ بناؤ۔ چچی اماں نے یہ خاص طور سے کہلوا بھیجا تھا کہ حمید آیا ہے۔

حمیدہ۔ (فوراً بات کاٹ کر) دیکھئے، پھر مجھے آپ نے میدہ کہہ کر پکارا، میری آپ کی ایک دن اسی بات پر لڑائی ہو جائے گی، آپ میرا سیدھا نام کیوں نہیں لے کر پکارتے۔ یہ میدہ میدہ کیا ہُوا؟

حمید۔ یہ حمیدہ کا اسمِ تصغیر ہے۔ ابھی تھوڑا سا اور پڑھو۔ اور سچ پوچھو تو جتنا تم چڑتی ہو، اُتنا ہی زیادہ تم کو اسی نام سے پکارنے کو جی چاہتا ہے۔ (یہ کہتے کہتے اور مسکراتے ہوئے مسٹر حمید اپنی چچی کے کمرے کی طرف چلے جاتے ہیں۔ حمیدہ غصّے کی ترچھی نگاہ سے دیکھتی ہوئی اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے اور دبی زبان میں کہتی ہے "تو بھی، میں بھی ان کی کوئی چڑ ڈھونڈ ہی نکالوں گی"۔)

× × × × × × ×

مسٹر حمید اپنی چچی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں:۔

حمید۔ چچی جان، تسلیم!

ناہید بیگم ۔ جیتے رہو، عمر دراز، تمہاری عمر بہت ہو گی، میں تمہیں ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ اچھا پہلے یہ بتاؤ، بہن پروین بیگم اچھی ہیں؟ اور گھر میں سب خیریت ہے نا؟

حمید ۔ آپ کی دُعا سے سب اچھے ہیں۔ چچی جان آپ تو کبھی آتیں بھی نہیں۔ ہاں، ہم غریبوں کے یہاں اب کیوں آنے لگیں۔

ناہید بیگم ۔ خدا شاہد ہے بیٹا، روز میں خیال کرتی ہوں، آج ضرور جاؤں گی، پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات نکل آتی ہے کہ جانا نہیں ہوتا۔ ہاں خوب یاد آیا یہ موئی ٹھیسی ٹھیسی کیا ہوئی آج آٹھ روز سے نہ حمیدہ کو کھانے کا ہوش نہ پینے کا، بس وہی ٹھیسی ٹھیسی لکھی جا رہی ہے۔ ماشاء اللہ اس نے بی اے تو چٹکی بجاتے میں پاس کر لیا تھا اور اب ہے کہ چوبیس گھنٹے پڑھتی ہی رہتی ہے۔

(اتنے میں وکیل صاحب کپڑے پہن کر آجاتے ہیں)

حمید ۔ (چچا کو مؤدبانہ جھک کر سلام کرتا ہے۔)

اختر حسین ۔ جیتے رہو، حمید بیٹے تم کب آئے؟

حمید ۔ چچا جان کوئی دس منٹ ہوئے ہوں گے۔

ناہید بیگم ۔ (بات کاٹ کر) سُنا تم نے ناشتہ پڑا جھک مار رہا ہے۔ نو بجنے کو آئے ہیں۔ کالج سے آکر پانچ بجے سے حمیدہ کتابیں لے کر بیٹھی ہے اور پڑھ رہی ہے، یہ ایم اے کا امتحان کیا ہوا وبالِ جان ہوا، بچی میری سُوکھ کے کانٹا ہو گئی ہے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ جان ہے تو جہان ہے اور ہاں سُنو تو خوب یاد آیا۔ ماشاء اللہ میرا حمید تو ایم اے پاس کر چکا ہے۔ میں ان سے کہنے کو تھی کہ ذرا حمیدہ کی مدد کرو، تمہیں یاد ہو گا کہ جب حمیدہ میٹرک میں تھی، اس کا حساب کمزور تھا۔ حمید ہی نے ایک مہینہ لگا کر اس کا سارا حساب نکلوا دیا تھا۔ ایسا کہ آخر اس نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، تو کیا اب یہ اس کی مدد نہیں کر سکتے؟

اختر حسین ۔ بے شک اگر یہ چاہیں اور ان کو فرصت بھی ہو تو حمیدہ کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں۔

حمید ۔ میں بدل و جان اُن کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ اگرچہ ایم اے میں کسی کی مدد و دد کی ضرورت تو ہوتی نہیں۔ رہا تھیس، یہ تو معلومات بہم پہنچانا اور اُن کو اپنے خیالات کے موافق لکھ ڈالنا ہے۔ اور حمیدہ تو ماشاء اللہ بڑی ذہین ہیں اور مزاج میں ضد بھی ہے۔ جس کام کے پیچھے پڑتی ہیں، پُورا ہی کر کے چھوڑتی ہیں۔

(سامنے سے حمیدہ آتی دکھائی دی۔ اُس نے حمید کی بات سُن لی تھی)

حمیدہ ۔ دیکھئے امی جان، آپ ان کو (ذرا رُک کر) حمید بھائی جان کو منع کر دیجئے کہ یہ مجھے آج سے میدہ میدہ کہہ کر نہ پکاریں۔ واہ یہ کیا ہوا۔ جب دیکھو یہ مجھے میدہ میدہ کہتے ہیں۔

اختر حسین ۔ (حمیدہ کو اپنی طرف مخاطب کر کے) ارے لڑکی، یہ لڑائی جھگڑے کی بات جانے دے، یہ بتا حمید تجھ کو تھیس لکھنے میں مدد

دے سکتے ہیں تو ان سے کہا جائے۔

حمیدہ ۔ اگر یہ دل سے میری مدد کرنا چاہیں۔ لیکن یہ میری مدد کیوں کرنے لگے، آج کل تو اپنی خالہ جان کی لڑکی زکیہ بیگم کو منشی فاضل کے لئے تیار کرا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پھر اس کو انگلش میں میٹرک، ایف اے، بی اے بھی کرا دوں گا۔ سُنا ہے انہوں نے اپنی تمام فرصت اُسی کو پڑھانے میں لگا دینے کا تہیہ کر لیا ہے (ذرا ترچھی نگاہ سے حمید کو دیکھتے ہوئے) کیوں، بھائی جان، ٹھیک ہے نا!

حمید ۔ چچا جان ــــ بےچاری غریب ماں باپ کی لڑکی ہے، جیسا میں ہوں۔ علاوہ اس کے میری حقیقی خالہ کی لڑکی ہے اور اُس کو بےانتہا پڑھنے کا شوق ہے۔

حمیدہ ۔ ہاں بھائی جان۔ میں تو سوتیلے چچا کی لڑکی ہوں، میں آپ کی کیا لگتی ہوں۔ بھلا اُس سے بڑھ کر میرا حق تھوڑی ہو سکتا ہے۔

حمید ۔ چچا جان۔ دیکھئے اِن کی زبردستی کی باتیں۔ میں نے کب کہا کہ یہ میرے حقیقی چچا کی لڑکی نہیں، یا یہ میری کوئی نہیں لگتیں یا میں ان کی مدد نہیں کر سکتا۔

ناہید بیگم ۔ (بیچ میں بول اُٹھتی ہے) لڑکی تُو تو ناحق ناحق جھیڑخانی کی باتیں کر رہی ہے۔ ابھی ابھی کا ذکر ہے کہ تیرے باپ نے پوچھا کہ آیا تم حمیدہ کی کچھ مدد کر سکتے ہو تو اس پر حمید نے کہا "میں بدل وجان ان کی مدد کرنے کو تیار ہوں" ــــ تجھے خبر بھی ہے یہ آج پر کیا تیری عمر بھر مدد کرتا رہے گا۔

حمیدہ (تھوڑی دیر کے لئے بالکل چُپ ہو جاتی ہے۔ پھر ایکا ایکی کہتی ہے) یہ امّی جان آپ نے کیا کہا کہ یہ میری عمر بھر مدد کرتے رہینگے ہاں، شاید یہ اشارہ اس طرف تھا کہ جب میں میٹرک میں تھی تو حساب میں بہت کمزور تھی اور اُنہوں نے ایک مہینہ لگا کر میرے تمام حسابات نکلوا دیئے تھے۔ بس اور کیا۔ ہاں بھُولی۔ جب ابا جان بیمار ہوئے تھے۔ اب سے دَور قرآن درمیان، تو یہ رات رات بھر میرے ساتھ جاگا کرتے تھے۔ تو اس سے مجھے کیا تعلق، اپنے چچا کی خدمت کی، ہاں یہ میں ضرور کہوں گی کہ بچپنے میں سوائے میرے یہ اور کسی لڑکی کے ساتھ نہیں کھیلتے تھے۔ زکیہ، ثریا، اختری، لیلیٰ، میں خود۔ ہم پانچ لڑکیاں اِن کے ساتھ کھیلتی تھیں اور یہ اپنی گُڑیاں مجھی کو بناتے تھے۔ تو اس سے کیا ہُوا۔ میں بھی تو فقط اِن ہی کے ساتھ کھیلنا پسند کرتی تھی اور وہ بھی اس لئے کہ پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے اور مجھے بھی ان کی طرح تعلیم پانے کا دِلی شوق تھا (دزدیدہ نگاہوں سے حمید کو دیکھتے ہوئے) ..... زکیہ کے بارے میں اتنی بات جو میں نے کہی ہے تو کیسے کھنچے بیٹھے ہیں۔ اِن کی خلیری بہن ہے۔ خوبصورت ہے حسین ہے، خوش مذاق ہے، عجب کیا جو اُس سے اِن کی شادی بھی ہو۔ اُونہہ مجھے کیا ..... کسی سے بھی ہو۔

اختر حسین ۔ جو تم ہو وہ زکیہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اگر خلیری ہے تو تم حقیقی چچیری بہن ہو۔ تم ایک خُون ہو۔ وُہ بھر ہے تو غیر۔ اُن کے خالو جان اِک غیر خاندان کے آدمی تھے۔ تمہارا ددھیالی اور اس کا ننھیالی رشتہ ہے۔ باقی پاکیزہ خیال کے لوگ انسانی ہمدردی کو اپنا فرض

جانتے ہیں، اسی بنا پر یہ زکیہ کو پڑھاتے ہوں گے — اچھا تو اُٹھو، جاؤ، حمید کی مدد سے اپنا تھیس تیار کر لو (حمید کو مخاطب کرکے) حمید بیٹے جاؤ، ذرا دیکھو، حمیدہ نے جو کچھ لکھا ہے کچھ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔

حمید: (اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے) اُٹھئے چلئے، دیکھوں آپ نے تھیس لکھنے کے لئے کیا کیا مواد جمع کیا ہے۔ کچھ کیا بھی ہے یا یوں ہی وقت ضائع کیا ہے (حمیدہ کو چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر) اٹھو میدہ بہن — اب دیکھئے چچا جان اُٹھتی نہیں ہیں؛

حمیدہ۔ میں میدہ ہوں تو اُٹھوں بھی اور بولوں بھی!

(ناہید بیگم اور اختر حسین دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑتے ہیں)

ناہید بیگم۔ ارے پگلی، وہ تو تیرے ستانے کے واسطے میدہ میدہ کہتا ہے۔

اختر حسین۔ اچھا بھئی، اب وہ تم کو حمیدہ بیگم ہی کہہ کر پکارا کرے گا۔ تم خواہ مخواہ تو نہ بگڑو۔

حمیدہ۔ (منہ بسور کر) آپ دونوں انہیں کی طرفداری کرتے ہیں۔ آگ لگے میدہ کی جان کو! (یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جلد جلد قدم اُٹھاتی ہوئی چلی گئی۔)

ناہید بیگم۔ (حمید سے مخاطب ہو کر) خدا کے واسطے بیٹا! اب اس کو میدہ میدہ نہ کہا کرو۔ یہ بڑی کینہ ور ہے، پھر اس کے دل سے عمر بھر یہ بات نہ نکلے گی۔

(حمید "بہت اچھا، بہت اچھا" کہتا حمیدہ کے کمرے کی طرف بڑھتا ہے)

× × × × × × ×

حمیدہ کا کمرہ:-

حمید۔ (دروازے کی دہلیز میں کھڑا رہ کر) مَیں حاضر ہو سکتا ہوں۔

حمیدہ۔ (چپ بیٹھی رہتی ہے)

حمید۔ اجی جناب، حمیدہ بیگم صاحبہ، کیا مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؛

حمیدہ۔ اب آپ آ سکتے ہیں۔

حمید۔ (کمرے کے اندر آتا ہے، دیکھتا ہے کہ حمیدہ کا منہ پھول کے کُپا ہو رہا ہے۔ آنکھیں نیچی کئے، آرام کرسی پر آڑی ہو کر بیٹھی دانتوں سے داہنے ہاتھ کی چھنگلیا کا ناخن کُتر رہی ہے) یہ کیا؛ — یہ کیا؛ — یہ دانتوں سے چھنگلیا کیوں کھائی جا رہی ہے، کیا بھوکی ہو — اچھا — (جیب سے دو پیپرمنٹ کی گولیاں نکال کر، ہاتھ پر رکھ کر سامنے لے جاتا ہے) لیجئے اس سے کچھ تو تسکین ہو جائے گی۔

حمیدہ۔ یہ اپنی بہن زکیہ بیگم صاحبہ کو دیجئے جو آپ کی وُہ ہیں!

حمید۔ زکیہ اگر میری وُہ ہے تو آپ میری یہ ہیں یعنی وُہ، وُہ اور آپ یہ — اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تعلیم کا اثر صنفِ نازک پر ایسا

نہیں پڑ سکتا کہ وہ بچپنے کی عادتیں چھوڑ دیں۔

حمیدہ ۔ (چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے ۔ کبھی پیپر ویٹ میز پر سے اُٹھا کر اُچھالتی ہے ۔ کبھی پھر ناخن کُترنے لگتی ہے ۔ کبھی آرام کُرسی کے بازوؤں پر سے پیر لٹکا کر زور زور سے ہلاتی ہے ۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد) بیٹھتے کیوں نہیں، تشریف رکھئے (حمید کے مُنہ کو غور سے دیکھتے ہوئے) عجب جالوں ہیں کہ آپ اپنی زکیہ بیگم کو کہتے کہتے کہہ کر پکاریں اور اُن کے ایک دفعہ منع کر دینے پر دوبارہ تو آپ اُن کو کہتے کہتے کہہ کر پکار لیجئے ۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے ؟ ۔۔۔ لیکن شرط یہ کہ میں بھی وہاں موجود ہوں ۔۔۔ اُونہہ ہوگا ۔۔۔ بھئی نہ معلوم میں کیا ایک گئی، یہ مجھے ہو کیا گیا ہے ؟

حمید ۔ (ہنستا ہے) آپ ہی پھاڑتی ہو، آپ ہی رفو کرتی ہو، آپ ہی یوں کہتی ہو، آپ ہی وُوں کہتی ہو ۔ کیا آج بلی نانگ کے بیٹھی ہو، یا صبح اُٹھتے ہی جِک بکیا کا مُنہ دیکھا ہے ۔

حمیدہ (ذرا اپنی کُرسی کو آگے بڑھاتے ہوئے) میری سمجھ میں آج تک یہ نہ آیا کہ ستائیس اٹھائیس برس کی عمر میں، مجھ سے آپ سے سات برس بڑی، یہ اب منشی فاضل پاس کر کے بقول شخصے کیا تیل بیچیں گی ؟ ۔۔۔ پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ نیا تماشا نیا کھیل ۔۔۔ واللہ قابلِ تعریف بات ہے ۔

حمید ۔ (خاموش رہتا ہے)

حمیدہ ۔ دیکھا نا میاں صاحب کو کیسا بُرا لگا ۔ وہ تو میں جانتی ہی تھی، اچھا توبہ ہوئی، معاف کیجئے گا، مجھ سے غلطی ہوئی ۔ (ادھر دیکھنے لگا لوں پر ہلکے ہلکے دو طمانچے لگاتے ہوئے) میری زبان جلے جو اب کبھی آپ کی چہیتی زکیہ کا نام بھی لُوں ۔

حمید ۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ تم آج فضول باتیں بنا کر خواہ مخواہ کی لڑائی مجھ سے لڑو گی تو میں کیوں آتا ۔ نہ معلوم کس کے پیر سے آج یہاں آنا ہُوا ہے ۔

حمیدہ ۔ اچھا، سچ بتائیے گا ۔ ایک بات آپ سے پُوچھیں (ذرا اپنی کُرسی آگے کھسکاتے ہوئے) کہئے بتائیے گا ؟ پر سچ سچ بتانا ہوگا، بولئے بتائیے گا ؟

حمید ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے عمر بھر جان کے کبھی جھُوٹ نہیں بولا ۔ پُوچھئے جو پُوچھنا ہو ۔ سچ ہی کہوں گا ۔

حمیدہ ۔ دیکھئے نمبروار پُوچھتی ہوں اور اسی طرح نمبروار آپ سے جواب چاہتی ہوں ۔

نمبر ایک : آپ کو زکیہ سے محبت ہے یا زکیہ آپ کو چاہتی ہے ؟

نمبر دو : خالہ جان زکیہ سے آپ کی یا آپ کی زکیہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں ؟

نمبر تین : آپ کیا زکیہ سے بطیبِ خاطر شادی کریں گے ؟

نمبر چار : شادی کب تک ہوگی ؟

نمبر پانچ : زکیہ کے چچا زاد بھائی سلیم کو سُنا ہے وہ بھی زکیہ کو مانگ رہے ہیں ۔ آپ کی خالہ نے کیا جواب دیا ؟

حمید : نمبر ایک : میں زکیہ سے ایسی محبت کرتا ہوں جیسے ایک بھائی بہن سے، باقی اُن کے دل کا حال خدا جانے، میں کوئی غیب دان نہیں ۔

نمبر دو : ایسا کبھی کوئی ذکر میں نے نہ اُن کے ہاں سُنا نہ اپنے گھر میں۔

نمبر تین : میرا تو ایک اَور ہی لڑکی سے شادی کرنے کا خیال ہے، اگر وُہ خود بھی مجھ سے شادی کرنا پسند کرے اور اُس کے ماں باپ بھی۔

نمبر چار : یہ سوال مہمل سا ہو کے رہ گیا، اس کا جواب ندارد۔

نمبر پانچ : سلیم کے ماں باپ نے تو ضرور زکیّہ کو سلیم کے واسطے مانگا ہے، پر خالہ جان نے کیا جواب دیا، مجھے معلوم نہیں، غالبًا وہ قبول کر لیں، اس لئے کہ سلیم دو ڈھائی سو تو تنخواہ لیتا ہی ہوگا اور ابھی اور ترقّی کرے گا۔

حمیدہ۔ اچھا یہ بتایئے کہ جس لڑکی سے آپ شادی کرنے کا خیال رکھتے ہیں، اُن بیگم صاحبہ کا کیا نام ہے؛

حمید۔ یہ نہیں بتاؤں گا۔

حمیدہ۔ (کچھ سوچ کر) ہوں اُوں اُوں . . . لکھ کر بھی نہیں بتا سکتے؛

حمید۔ جی نہیں۔

حمیدہ۔ یہ بھی نہیں بتایئے گا کہ وُہ کس محلّے میں رہتی ہے؛

حمید۔ نہیں بتاؤں گا۔

حمیدہ۔ اچھا جناآآآب . . . . . یہ بتایئے کہ وہ آپ کی رشتہ دار ہے یا غیر؛

حمید۔ اچھی جناب یہ بھی نہیں بتاؤں گا۔

حمیدہ۔ اچھا بتاآآ آیئے . . . اُس کے نام کا پہلا حرف کیا ہے؛

حمید۔ یہ تو بالکل نہیں بتا سکتا۔

حمیدہ۔ اچھا یہ تو بتایئے گا کہ اُس کی تعلیم کہاں تک ہے، یا یہ بھی نہ بتایئے گا؛

حمید۔ یہ بھی نہ بتاؤں گا —— اَور پوچھیئے؛

حمیدہ۔ اچھا یہ بتایئے کہ وہ زکیّہ قطعًا نہیں؛

حمید۔ اب اتنا تم پُوچھ رہی ہو، چلو یہ بتلائے دیتا ہوں، تم بھی کیا یاد کرو گی۔ زکیّہ قطعًا نہیں کوئی اور ہے۔

حمیدہ۔ ہائے اللہ! پھر کون ہے۔ اچھا لیجئے! ان میری پانچ اُنگلیوں سے دل ہی میں نے پانچ لڑکیاں فرض کی ہیں۔ یوں سمجھئے ہر اُنگلی سے ایک لڑکی مُراد ہے۔ ان میں سے آپ کوئی میری اُنگلی پکڑ لیجئے (دل ہی دل میں انگوٹھا زکیّہ۔ کلمے کی اُنگلی میں حمیدہ۔ بیچ کی اُنگلی ثریّا، بیچ کی بغل والی اختری، چھنگلیا ہمں لیلی۔ اللہ دیکھیں یہ کون سی اُنگلی پکڑتے ہیں۔) لیجئے پکڑیئے، سوچئے مت جلدی سے پکڑ لیجئے!

حمید۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی بھی نہ ہو تو میں خواہ مخواہ پکڑاوں۔ تم پانچوں کا نام مجھے بتا دو۔

حمیدہ۔ اللہ، پکڑیئے بھی! انہیں میں کوئی ہوگی؛ مجھے یقین ہے۔ یہ تو میری ایک فال اپنے من سمجھوتے کے لئے ہے، آپ کو اس سے

کیا مطلب ؟ — پکڑیئے بھی۔

حمید۔ اپنے من سمجھوتے کی بھی ایک کہی اور یہ بھی خوب کہ آپ کو اس سے کیا مطلب آپ صاحب مطلب ہوئیں اور مجھے کوئی غرض ہی نہیں۔

حمیدہ۔ آپ کو میری جان کی قسم پکڑیئے، نہیں پکڑیئے گا، دیکھئے میں نے اپنی جان کی قسم دی ہے۔ اب بھی آپ نے کوئی اُنگلی نہ پکڑی تو میں سمجھوں گی میری جان آپ کے آگے چیونٹی کے برابر بھی نہیں (مُنہ بنا کر) پھر میں آپ سے کبھی کبھی بھی نہ بولوں گی — عمر بھر نہ بولوں گی۔

حمید۔ اچھا لیجئے پکڑتا ہوں۔ اے اللہ تجھ پر بھروسا کرکے پکڑتا ہوں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (جھٹ سے اتفاقاً کلمے کی اُنگلی زور سے پکڑ لیتا ہے) دیکھئے اب میں جب تک اس اُنگلی کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ صاف صاف اُس کا نام نہ بتلایئے۔

حمیدہ۔ (شرمائی اور لجائی) چھوڑیئے بھی۔ یہ کیا ہُوا کہ مجھے نام بتایئے۔ جایئے میں نہیں بتاتی۔

حمید۔ نہ بتایئے، جایئے میں بھی اُنگلی نہیں چھوڑتا۔

حمیدہ۔ (حمید کے پشتِ دست پر اِک چٹکی لے کر) چھوڑیئے بھی (ذرا سوچ کر) اچھا آپ چھوڑ دیجئے تو میں بتا دُوں گی!

حمید۔ پہلے آپ بتایئے، پیچھے میں چھوڑ دوں گا۔

حمیدہ۔ پہلے آپ چھوڑ دیجئے۔ پھر میں بتا دوں گی۔

حمید۔ یہ سبق کسی اَور کو سکھایئے۔ میں نے کچّی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔

حمیدہ۔ (ذرا ہاتھ کو جھٹکا دے کر) اللہ۔ حمید بھائی چھوڑیئے بھی۔ کہتی تو ہوں بتا دُوں گی۔

حمید۔ دیکھئے جس کی جان کی قسم آپ نے مجھے دی ہے اور جس پر میں نے اُنگلی مجبور ہو کر پکڑی ہے۔ اُس کی جانِ عزیز کی قسم جب تک آپ نام نہ بتایئے گا۔ میں نے اُنگلی نہ چھوڑی ہے نہ چھوڑوں گا۔

حمیدہ۔ (بائیں ہاتھ سے اپنے مُنہ کے چاروں طرف دوپٹہ لپیٹ کر اپنا مُنہ اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان ڈال کر سسکیاں لے کر آہستہ آہستہ) وُہی . . . . حمید ! اللہ کرے وُہ مر جائے۔ نہ رہے اس دُنیا کے پردے پر . . . . ہائے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایسی بے شرمی . . . . ایسی بے حیائی (یہ کہہ کر زار زار رونا شروع کر دیتی ہے)

حمید۔ ارے یہ رونا کیسا ؟ . . . . پیاری حمیدہ تمہیں میری جان کی واحد مالک ہو . . . . تمہیں میرے گھر کی ملکہ بننے والی ہو . . . . . . یہ رونا کیسا ؟

* * * * * * * *

بیگم منٹو

علی ساگر[1]

علی ساگر میں بحرِ زندگانی موجزن دیکھا
تمنّا کا گلستاں، آرزوؤں کا چمن دیکھا
زمیں کے چپے چپے کو فلک پر خندہ زن دیکھا
دلِ شاعر تڑپ جاتا ہے ایسا بانکپن دیکھا

عیاں ہر موج سے ہے پیچ و خم جوشِ جوانی کا
دکھاتی ہے شعاعِ مہر منظر آگ پانی کا

فضا کی کیف باری، اور مناظر کی فراوانی
پگھل کر بہ رہے ہیں سیم و زر اس رنگ کا پانی
یہاں فطرت سے چشمک کر رہی ہے عقلِ انسانی
پریشانی یہ ساحل کی ہے خود پانی کو حیرانی

مصائب لاکھ ہوں اہلِ بصیرت غم نہیں کرتے
جو عالی ظرف ہیں تکلیف میں ماتم نہیں کرتے

نشے میں حُسن کے سرشار ہے مدہوش ہی ساگر
لہکتا اِک چمن ہے اور چمن بردوش ہی ساگر
پیامِ صبح سُننے کو سراپا گوش ہی ساگر
سراسر جلوہ گاہِ نغمۂ خاموش ہی ساگر

عجب عالم ہے سیمائے سحر گویا پُر افشاں ہے
پڑی ہے اوس وادی گوہرِ مقصد بداماں ہے

کس اہلِ دل نے یہ رحمت کا دریا کر دیا جاری
یدِ قدرت ہمیشہ ہے یہاں مصروفِ گلکاری

[1] ضلع نظام آباد (دکن) کی مشہور خوش منظر مصنوعی جھیل۔

عروسِ ماہ کے جلوے کی جب ہوتی ہے تنّاری شفق پانی میں حل کرتا ہے جھُک کر چرخِ زنگاری

کنارِ آب دامِ موج یوں گُلبار رہتا ہے

گلے میں سبزۂ ساحل کے گلوں کا ہار رہتا ہے

شبِ مہتاب میں جنّت نظر ہوتے ہیں نظّارے ہوا گلبن پہ دہکاتی ہے ہر جا لال انگارے

چمن میں پھول بن جاتی ہیں کلیاں جوش کے مارے لُٹاتے ہیں خوشی سے چاندنی حوضوں میں فوّارے

محبت کے فرشتے گوش بر آواز رہتے ہیں

اس ارضِ پاک پر حسن اور نغمہ مل کے بہتے ہیں

شبِ تاریک میں ہر ذرہ ہیبت بار ہوتا ہے اجل کی گود گویا دامنِ کہسار ہوتا ہے

نظر کو آنکھ سے باہر نکلنا بار ہوتا ہے "نفس سینے میں اک چلتی ہوئی تلوار ہوتا ہے"

سیہ پانی پہ موجیں مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں

گھٹائیں تلملاتی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں

تری خاکِ چمن کو مَیں نے پلکوں سے اُٹھایا ہے گُل وریحاں کو تیرے اپنی آنکھوں سے لگایا ہے

تری رعنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے تری تعریف کا نغمہ تجھے پہروں سُنایا ہے

مری آواز کی تجھکو رہے گی آرزو برسوں،

مجھے بھی اے علی ساگر کرے گا یاد تُو برسوں!

سکندر علی وجد

جرمن مزدور کی جنگ نہیں ۔ یہ استعمار پرستوں اور سرمایہ داروں کی جنگ ہے اور استعمار پرستوں اور سرمایہ داروں ہی کو اس کے لئے قربانیاں کرنی چاہئیں ۔ مزدوروں کو اس جنگ سے نہ کچھ حاصل ہے اور نہ ان سے اس کے لئے ایثار کی توقع رکھنا چاہئے ۔

اس تلخ حقیقت نے دُنیا بھر کے مزدوروں کی آنکھیں کھول دیں اور اُنہوں نے بین الاقوامی جنگ کو گناہ اور جماعتی جنگ کو اپنا فرض جان کر سیاسی اور معاشرتی نظام کی بیخکنی کرنی شروع کر دی ۔ اس سے ملک ملک اور شہر شہر آگ لگ گئی اور یہ اندیشہ ہُوا کہ تہذیب کہن کی عزیز ترین متاع اس آگ کی نذر ہو جائے گی ، اسے بچانے کے لئے مذہب اور اخلاق کے اجارہ دار اور مشرق و مغرب کے سرمایہ دار متحد ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ آگ جہاں سے اُٹھی تھی وہیں محدود کر دی گئی لیکن اس آگ کی چنگاریاں جہاں جہاں پہنچیں ، اپنا نشان چھوڑ گئیں ۔

بالشویک تحریک نے جہاں مذہب پرست روس کو الحاد کا مرکز بنا دیا اور شخصی آزادی کو سلب کر لیا اور سرمایہ داروں کے جسم سے کپڑے اور مردہ بادشاہوں کے کفن اُتار لئے ، وہاں مردہ قوموں کو ایک نیا درسِ حیات بھی دیا ۔ لینن نے زار کے خفیہ معاہدوں کو شائع کر کے ان سے بیزاری کا اظہار کیا ۔ ایران کی تقسیم اور ترکی کی تخریب کے منصوبوں سے براءت ظاہر کی اور اعلان کیا کہ ہر قوم کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے اور کسی قوم کو دوسری قوموں کو غلام بنانے کا حق حاصل نہیں ۔

لینن کے نعرۂ انقلاب کی گونج مشرق و مغرب میں سنائی دی اور چین سے مراکش تک ہر کوہ و دشت سے یہ صدا آئی انقلاب! انقلاب ! انقلاب ! چین میں چیانگ کائی شیک ، افغانستان میں امان اللہ خاں ، ایران میں رضا خاں ، شام میں امیر شکیب ارسلان اور سلطان الاطرش ، فلسطین میں امین الحسینی ، مصر میں سعد زاغلول اور نحاس پاشا ، طرابلس میں عمر مختار سنوسی اور مراکش میں عبدالکریم ریفی نے علمِ آزادی بلند کیا ۔ اگرچہ ان میں سے بعض کو کامیابی حاصل نہ ہوئی لیکن مشرقِ خوابیدہ اور عالمِ اسلام کا طویل جمود و سکوت جس پر موت کا گماں ہوتا تھا یکسر ٹوٹ گیا ۔

۱۹۲۴ء میں جو لینن کی موت کا سال ہے بالشویک تحریک اور اس کے مخالفین کو ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا بالشویکوں کو احساس ہُوا کہ استعمار کو دُنیا سے یکسر مٹانا ان کے بس کی بات نہیں ۔ اور ان کے مخالفین پر بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ بالشویک تحریک کو نہیں دبا سکتے ۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بالشویک تحریک جو ابتدا میں تخریبی تحریک تھی تعمیری تحریک بن گئی اور اس کی زیادہ سے زیادہ توجہ روس کی اصلاح پر صرف ہونے لگی ۔ اور استعماری حکومتوں کو دوسرے معاملات کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا ۔

(۵)

اِدھر برطانیہ اور فرانس کے مشترک حریفوں کا زور گھٹا اُدھر ان دونوں میں اختلافات ظاہر ہونے شروع ہوئے ۔ برطانیہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کا حلیف فرانس اتنا قوی ہو جائے کہ اس کا دشمن بن کر اسے نقصان پہنچا سکے اور اس کا حریف جرمنی اتنا کمزور ہو جائے کہ اس کا

دوست بن کر اسے فایدہ نہ پہنچا سکے۔ اس صُورت کو مدِ نظر رکھ کر اس نے جرمنی کو تھپکنا شروع کر دیا۔

جنگ کے بعد فرانس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ۱۹۱۴ء کے واقعات کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ اس لئے کبھی وہ رائن کے ناکوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور کبھی روہر کی کانوں کو اپنے مستقل تصرف میں لانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے ان مقاصد کے لئے برطانیہ کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اس نے یہ چاہا کہ امریکہ اور برطانیہ اس کی مشرقی سرحد کی حفاظت کا وعدہ کریں لیکن امریکہ اور برطانیہ دونوں نے انکار کر دیا۔ اس پر فرانس نے اپنے ذرائع اختیار کرنے شروع کئے۔ جرمنی کی ہمسایہ ریاستوں سے تعلقات استوار کئے۔ اپنی مشرقی سرحد کی قلعہ بندی کی اور جرمنی کے گرد ایک آہنی فصیل کھڑی کر دی۔

۱۹۲۵ء میں برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے میثاقِ لوکارنو پر دستخط کئے جس کی رُو سے تینوں نے جرمنی اور فرانس کی سرحد کو مستقل طور پر تسلیم کیا اور برطانیہ نے وعدہ کیا کہ فرانس یا جرمنی جس پر حملہ ہوگا وہ اُسی کا ساتھ دے گا۔ فرانس اس وعدہ سے ایک حد تک مطمئن ہو گیا اور جرمنی نے وعدہ کیا کہ میثاقِ ورسائی کی ترمیم کے لئے صرف پُرامن ذرائع کا استعمال کیا جائے گا۔ موسیو بریاں نے معاہدہ کی تکمیل پر خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آج سے ہم اپنے تعصبات چھوڑ کر صحیح معنوں میں یورپین بن گئے ہیں"۔

لوکارنو کے بعد جرمنی کو جمعیتہ اقوام کی مقدس حدود میں قدم رکھنے کی اجازت مل گئی اور بظاہر اقوام میں اس کی حیثیت "اچھوت" کی نہ رہی لیکن چند سال بعد اسے معلوم ہُوا کہ جمعیتہ اقوام کے "برہمن" اُسے دُور سے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

۱۹۲۹ء میں ساٹھ حکومتوں کے نمائندوں نے پیرس میں "میثاقِ امن" پر دستخط کئے اور ہر جنگ کا اقدام کرنے والی طاقت کے خلاف متحدہ کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تو بڑی بڑی طاقتوں نے متحدہ طور پر اپنے فرائض سے پہلوتہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی نمائندہ سرجان سائمن کے رویّہ سے قول و فعل کا فرق ظاہر ہو گیا۔ اس قابل وزیر نے جو انگلستان کے ممتاز ترین وکلا میں سے تھا اپنے پیشہ کی لاج رکھ لی اور دلائل سے ثابت کیا کہ جاپان ایسی زبردست طاقت کو معاہدہ کے احترام پر مجبور کرنا خطرہ سے خالی نہیں اور خطرہ کی صُورت میں دُوسری حکومتوں کو اپنے فرائض کا احساس دلانا دانشمندی نہیں۔ ان حالات میں باوقار خاموشی ہی بہترین پالیسی ہے اور اس سے دوسرے درجہ پر "اخلاقی دباؤ"۔۔۔ یعنی بے عملی کا مظاہرہ!

جمعیتہ اقوام نے "اخلاقی دباؤ" کی تجویز قبول کی اور لٹن رپورٹ جس میں جاپان کی مذمت کی گئی تھی منظور کر لی۔ گویا جاپان اتنی بات کہنے کے لئے ڈھائی لاکھ الفاظ استعمال کئے "تم نے بہت بُرا کام کیا لیکن ہم تمہارے خلاف کارروائی کرنے کی جرأت اپنے میں نہیں پاتے۔ خیر جو ہُوا سو ہُوا ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا"۔ جاپان نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ جمعیت کی رُکنیت چھوڑ دی گویا جتا دیا کہ نامردوں کی محفل میرے شایانِ شان نہیں۔

۳۲ء میں جب تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس ہوئی تو جرمنی نے جاپان کے رویہ سے دلیر ہو کر مساوات کا مطالبہ کیا لیکن برطانیہ!

فرانس نے انکار کر دیا۔ اس پر جرمنی نے کانفرنس سے قطعِ تعلق کر لیا۔ چند ماہ کی حیل و حجت کے بعد یہ مطالبہ منظور ہؤا اور جرمنی کانفرنس میں دوبارہ شامل ہؤا۔ گفت و شنید از سرِ نو شروع ہوئی اور "مساوات" کی یہ انوکھی شرح کی گئی کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جرمنی اتنے اسلحہ جمع کرے جتنے برطانیہ، فرانس یا اطالیہ کے پاس ہیں۔ یا برطانیہ، فرانس اور اطالیہ فی الفور ان تمام اسلحہ کو تخفیف میں لے آئیں جو جرمنی کے پاس نہیں ہیں"۔ اس پر جرمنی نے کہا "پھر مساوات کا کیا مطلب ہے؟" اور یہ کہہ کر وہ بھی "نامردوں کی مجلس" سے نکل گیا۔

(۶)

جمعیتہ اقوام نے جرمنی اور جاپان سے مختلف برتاؤ کر کے ثابت کر دیا کہ وہ طاقت کے سامنے جھک جاتی ہے چاہے وہ ناحق ہی استعمال ہوا اور حق کو تسلیم نہیں کرتی۔ جب تک طاقت اس کے ساتھ نہ ہو! جرمنی نے اس نکتہ کو کما حقہٗ سمجھ کر اس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا اور معاہدہ کے خلاف درپردہ سامانِ جنگ جمع کرنا شروع کر دیا۔ فرانس نے اس کی بھنک پا کر پیچ و تاب کھایا لیکن برطانیہ نے پروا نہ کی۔ اس لئے مایوس ہو کر روس، پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ سے تعلقات استوار کئے۔

۱۹۳۴ء میں نازی جماعت کی سازش سے جو ایک برس پہلے جرمنی میں برسرِاقتدار آ چکی تھی۔ آسٹریا میں بغاوت رُونما ہوئی اور چانسلر ڈالفس قتل کر دیا گیا لیکن فرانس اور اطالیہ کی بروقت کوششوں سے جرمنی کو مداخلت کی جرأت نہ ہوئی اور بغاوت دبا دی گئی۔

۱۹۳۵ء میں سار کا علاقہ استصوابِ رائے عامہ کے بعد جرمنی کو واپس مل گیا۔ یہ ہٹلر کی پہلی عظیم فتح تھی۔ اسی سال جب فرانس اور روس کا معاہدہ مشتہر ہؤا تو اس نے اسے میثاقِ لوکارنو کی خلاف ورزی کے مترادف قرار دیا اور علانیہ ممنوع اسلحہ کی ساخت کا حکم دے دیا۔ اس سال برطانیہ اور فرانس کے اختلافات شدید صورت اختیار کر گئے۔ برطانیہ نے فرانس کے جذبات اور مفاد کی پروا نہ کرتے ہوئے جرمنی سے بحری معاہدہ کیا اور اگرچہ میثاقِ ورسائی کی رُو سے جرمنی کو بحری بیڑہ رکھنے کی اجازت نہ تھی لیکن اس معاہدہ سے اس کے لئے بحری بیڑہ رکھنا جائز ہو گیا اور برطانیہ نے اس کا یہ حق تسلیم کر لیا۔ فرانس نے اس کا انتقام قضیۂ حبش کے دَوران میں لیا۔

دسمبر ۳۴ء میں اطالیہ نے افریقہ کی واحد آزاد ریاست حبش پر دندانِ آز تیز کئے اور اطالوی سپاہیوں نے سرحد عبور کر کے وال وال کے کنوؤں پر قبضہ کر لیا۔ حبشی سپاہیوں نے خفیف سی مزاحمت کی اور نجاشی نے معاملہ جمعیتہ اقوام کے سپرد کیا۔ جمعیتہ اقوام نے کمال "فرض شناسی" سے تنازعہ کے دوران میں فریقین کو سامانِ جنگ کی ترسیل بند کر دی اور برطانیہ اور فرانس مسولینی کو سمجھانے لگے۔ اس اثناء میں اطالیہ کے بھرے جہاز نہر سویز سے گزر کر افریقہ میں اطالوی فوجوں کو کمک اور گولہ بارود پہنچاتے رہے اور حبش کو ایک رائفل اور ایک گولی خریدنے کی اجازت نہ ملی۔ اکتوبر ۳۵ء میں مسولینی نے کوئی عذر اور دلیل پیش کئے بغیر مصالحت کی ہر پیشکش رد کرتے ہوئے حبش پر حملہ بول دیا۔ جمعیتِ اقوام نے دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر "تعزیرات" کا کھیل کھیلا۔ چھ مہینے تک سرمایہ داروں کی جنگ زرگری جاری رہی اور اس اثنا میں نجاشی کا ملک اور تخت و تاج اطالیہ کی سینہ زوری اور فرانس کی غداری کی نذر ہو گیا!

جنگِ حبش سے پہلے ہی فرانس اطالیہ کو "حبش" بخش چکا تھا۔ جنگ کے دوران میں وہ برطانیہ سے روٹھا رہا۔ مسٹر ایڈن وزیر خارجۂ برطانیہ نے ہر چند ناز برداری کی لیکن فرانس نے جرمنی سے بحری معاہدہ کرنے کی خطا معاف نہ کی۔ اِدھر برطانیہ اور فرانس کے گلے شکوے ہوتے رہے، اُدھر نجاشی کا تخت و تاج جاتا رہا۔

جن دنوں نجاشی اور اس کا خاندان بے سروسامانی کی حالت میں انگلستان میں پناہ گزیں ہوئے۔ برطانی کابینہ کے ایک متقدر رکن مسٹر نیول چیمبرلین نے ایک فصیح تقریر کے دوران میں کہا "تعزیرات کی پالیسی جنون ہے ہم سے اس قربانی کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟" گویا شاہِ حبش کی قربانی ان کے ایثار کے مقابلہ میں ہیچ تھی!

جمعیتِ اقوام کے اجلاس میں جب تعزیرات کو منسوخ کرنے کا مسئلہ پیش ہوا تو حبش کے مظلوم بادشاہ نے رقت بھری آواز میں پوچھا "تمہاری دفعہ ۱۶[1] کیا ہوئی؟" آئندہ تین سال کے عرصے میں یہ سوال کئی بار دہرایا گیا۔

اسی سال جرمنی نے رائن کے علاقہ میں اپنی فوجیں بھیج کر میثاقِ ورسائی کا آخری ورق بھی پارہ پارہ کر دیا۔ برطانیہ نے اس حرکت کی وجہ دریافت کی لیکن جرمنی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

اسی سال برطانیہ نے ایک فوجِ کثیر فلسطین میں بھیجی۔ جس شجاعت کا اظہار حبش میں اطالوی ملک گیری کی روک تھام میں ہونا چاہئے تھا اس کا مظاہرہ تہیدست عربوں کو یہودیوں کا غلام بنانے کے لئے ہُوا۔ اس پر مزید یہ کہ حاکم و محکوم کی یہ "جنگ" اب تک سر نہیں ہوئی!

اسی سال جرمنی اور اطالیہ کی سازش سے ہسپانیہ میں بغاوت ہوئی۔ جرمنی اور اطالیہ باغیوں کی ہر ممکن مدد کرتے رہے اور برطانیہ اور فرانس سختی سے عدمِ مداخلت کی حکمتِ عملی پر کاربند رہے۔ جمہوریہ ہسپانیہ تین سال تک دشمنوں کی سرگرمیوں اور دوستوں کی غیر جانبداری کا تختۂ مشق بنی رہی اور اس کے بعد ع "وہی آخر کو پیش آیا کہ تھا جس بات کا کھٹکا" جمعیتِ اقوام کی دفعہ ۱۶ ہسپانیہ کے کام بھی نہ آئی!

جرمنی اور اطالیہ کا زرد فام مشرقی حلیف بھی بیکار نہ بیٹھا!

۱۹۳۷ء میں جاپان نے چین کو متحد اور منظم ہوتے دیکھ کر یہ جان لیا کہ اگر چین کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو جاپان کو اس کی سرکوبی کا موقع کبھی نہیں ملے گا۔ یہ سوچ کر اس نے چین کے قائدِ اعظم چیانگ کائی شیک پر بالشویک تحریک کی حمایت کا الزام لگا کر اس پر فوج کشی کر دی۔ چین نے جمعیتِ اقوام سے امداد کی درخواست کی۔ اسے بھی وہی جواب ملا جو اس سے پہلے حبش اور ہسپانیہ کو ملا تھا!

"جرمنی بیچارہ چند سال سے "مکھن" کی بجائے توپوں پر گزر کر رہا تھا۔ مسٹر چیمبرلین کو اس کی "شکم سیری" کی فکر دامنگیر ہوئی لیکن اس نے خود انتظام کر لیا۔ ۱۹۳۸ء کے موسمِ بہار میں ہٹلر نے مکرر وعدوں اور قسموں کے باوجود آسٹریا پر قبضہ کر لیا۔ فرانس، برطانیہ اور اطالیہ

[1] دفعہ ۱۶ کی رو سے جمعیتِ اقوام کے اراکین پر مظلوم رکن کی عسکری حمایت کا فرض عاید ہوتا ہے۔

نے ۱۹۳۴ء میں آسٹریا کی آزادی کے تحفظ کی قسم کھائی تھی لیکن اب اطالیہ کے مکر جانے پر برطانیہ اور فرانس بھی یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے کہ آسٹریا تو خیر مضے ما مضے البتہ فرانس چیکوسلواکیہ پر حملہ کی صورت میں اس کی مدد کرے گا۔ برطانیہ نے بھی اعلان کیا کہ وہ چیکوسلواکیہ کے خطرہ سے غافل نہیں رہے گا۔ اس پر ہٹلر نے کہا۔ آپ مطمئن رہئے، جرمنی کبھی چیکوسلواکیہ کو نظر بد سے نہیں دیکھے گا!

اس کے دو مہینے بعد ہی جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں چیکوسلواکیہ پر پڑیں لیکن چیکوسلواکیہ ہوشیار ہو گیا اور اس نے برطانیہ اور فرانس کو بھی خطرہ سے آگاہ کر دیا۔ اس پر جرمنی نے دوبارہ انہیں اپنی نیک نیتی اور نیک چلنی کا یقین دلایا لیکن ابھی تین مہینے ہی گزرے تھے کہ اس نے سوڈیٹن جرمنوں پر چیک حکومت کے مظالم کی داستانوں سے آسمانوں کو سر پر اٹھا لیا۔ ہٹلر نے بال بکھیر کر اور منہ میں کف بھر کر اور آنکھیں نکال کر چیکوسلواکیہ پر اپنا مسمریزم کرنا شروع کر دیا۔ چیکوسلواکیہ پر یہ جادو ہرگز نہ چلتا لیکن برطانیہ کے سفیر خاص لارڈ رنسی مین نے لطائف الحیل سے اس کی ہمت کو پست اور ارادہ کو کمزور کر دیا۔

روایت ہے کہ نجاشی نے اس موقع پر چیکوسلواکیہ کے صدر ڈاکٹر بینش کو اس مضمون کا تار دیا۔ میں نے سنا ہے کہ برطانیہ اور فرانس تمہاری حمایت کر رہے ہیں مجھے اس مصیبت میں تم سے دلی ہمدردی ہے۔ لارڈ رنسی مین نے ڈاکٹر بینش کو برطانیہ کی دوستی اور حمایت کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ اگر جرمنی اور چیکوسلواکیہ میں جنگ چھڑ گئی تو برطانیہ اور فرانس کو اس میں شامل ہونا پڑے گا لیکن برطانیہ جنگ میں شامل ہونے سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ جنگ واقعی ناگزیر ہے اور امن کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے سوڈیٹن جرمنوں کو ہر ممکن رعایت دے کر جنگ کو روکنا چاہئے۔ ڈاکٹر بینش نے لارڈ رنسی مین کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے سوڈیٹن جرمنوں سے انتہائی رعایت برتی اور انہیں حکومتِ خود اختیاری دے دی لیکن انہوں نے کامل آزادی اور جرمنی سے اتحاد پر اصرار کیا، چونکہ سوڈیٹن علاقہ پر چیکوسلواکیہ کی حفاظت کا انحصار تھا اس لئے چیکوسلواکیہ یہ مطالبہ منظور نہ کر سکتا تھا۔ اس پر جرمنی نے سرحد پر فوجیں جمع کر دیں۔ اس کے جواب میں چیکوسلواکیہ نے بھی اپنی فوجیں جمع کیں اور فرانس نے بھی تیاریاں کیں اور روس نے بھی جنگ کی صورت میں فرانس اور چیکوسلواکیہ کی امداد پر آمادگی ظاہر کی۔

اب یہ صورت پیدا ہوئی کہ جرمنی سوڈیٹن علاقہ کی حوالگی پر اصرار کر رہا تھا اور چیکوسلواکیہ انکار کر رہا تھا۔ اس اصرار و انکار کا نتیجہ جنگ ہوتا جس میں فرانس اور فرانس کے ساتھ برطانیہ اور روس کو شامل ہونا پڑتا۔ برطانیہ ہر حالت میں جنگ کو روکنا چاہتا تھا۔ جب جنگ کا خطرہ بڑھا تو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہٹلر کے در دولت پر پہنچے اور امن کی بھیک مانگی۔ ہٹلر نے اپنے مطالبات دہرائے، مسٹر چیمبرلین نے سر تسلیم خم کیا اور سوڈیٹن علاقہ نذر کر کے چلے آئے اور پھر آنے کا وعدہ کر گئے۔ دوسری ملاقات میں ہٹلر نے درشت تر لہجہ اختیار کیا۔ مسٹر چیمبرلین ناراض ہو کر چلے آئے اور مسولینی سے ہٹلر کی سرد مہری کی شکایت کی۔ مسولینی نے کہا۔ کوئی فکر کی بات نہیں تم جلد میونک پہنچو اور مسیو دلادیہ کو بھی وہاں بلا لو۔ میں تم دونوں کی ہٹلر سے صلح کرادوں گا۔ لیکن

شرط یہ ہے کہ روس کو نہ بلاؤ کیونکہ اس کے ساتھ مل بیٹھنا ہمیں گوارا نہیں ؎

ہم اور غیر دونوں ہرگز بہم نہ ہونگے ہم ہونگے وہ نہ ہونگے، وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

مسٹر چیمبرلین نے یہ شرط منظور کرلی۔ اُن کے نزدیک ہٹلر اور مسولینی "شریف" اور روس بدمعاش تھا اگرچہ روس نے نہ حبش اور ہسپانیہ کے خون سے ہاتھ رنگے اور نہ یہودیوں کی دولت سے جیبیں بھریں لیکن مسٹر چیمبرلین ہٹلر اور مسولینی کے جنگی کارناموں سے زیادہ بالشویک روس کی دوستی سے خائف تھے کیونکہ وہ چیکوسلواکیہ کو "امن" کی قربان گاہ پر ذبح نہ ہونے دیتا!

میونک میں ایک "مجلس شرفا" منعقد ہوئی جس میں ہٹلر کو باقاعدہ طور پر سوڈیٹن علاقہ پیش کیا گیا اور اس نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ اس "ایجاب" و "قبول" کے دوران میں غریب چیکوسلواکیہ کے نمائندوں کو شمولیت کا شرف حاصل نہ ہُوا۔ وہ بیچارے باہر اپنی قسمت کے فیصلہ کے منتظر رہے، جب راز و نیاز ختم ہو چکے تو انہیں فیصلہ سُنا دیا گیا اور انہیں اس پر تنقید کی اجازت بھی نہ ملی۔ ان کے سر بارِ غم سے جھک گئے میونک کے اکابر نے کہا یہ رضامندی کی علامت ہے!

چیکوسلواکیہ ہٹلر کی ہوس پر قربان ہو چکا۔ مسٹر چیمبرلین تسلیم و رضا کے اس عظیم مظاہرہ کے بعد فاتحانہ شوکت سے انگلستان لوٹے اور فخریہ انداز میں کہنے لگے ہم نے چیکوسلواکیہ کا تھوڑا سا علاقہ جرمنی کو دلا کر چیک قوم کو تباہی اور دُنیا کو جنگ کے مصائب سے بچا لیا۔ اس پر کسی دردمند دل رکھنے والے نے کہا ع

وُہی ذبح بھی کرے ہے وُہی لے ثواب اُلٹا

ابھی میثاقِ میونک کی سیاہی خشک ہونے نہ پائی تھی اور مسٹر چیمبرلین برطانوی عامۃ الناس کو اپنے اور ہٹلر کے دستخطوں والا کاغذ دکھا دکھا کر خراجِ تحسین وصول کر رہے تھے کہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس تاریخی دستاویز کی قیمت کاغذ کے اس پرزے سے زیادہ نہیں جس پر کسی طفلِ مکتب نے املا کی مشق کی ہو۔

ایک صبح جب مسٹر چیمبرلین آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے تو دیکھا کہ یورپ کا نقشہ بدل چکا ہے اور جہاں چیکوسلواکیہ تھا وہاں جرمنی لکھا ہوا ہے۔ وہ اپنی تاریخی چھتری بغل میں دبائے دارالعوام کی طرف بھاگے اور وہاں ہانپتے ہوئے کہنے لگے۔ چیکوسلواکیہ ختم ہو گیا اس سانحۂ عظیم کا تقاضا ہے کہ ایک عظیم الشان مباحثہ منعقد کیا جائے جس میں ہم خود بھی تقریر کریں گے اور ہٹلر کی عہد شکنی کی پُرزور مذمت کریں گے۔

اس واقعہ کے بیس بائیس دن بعد مسولینی نے البانیہ پر قبضہ کر کے اپنی "شرافت" اور "عہد پروری" کا ثبوت دیا اور مسٹر چیمبرلین کے حسنِ ظن کا پُورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ انگریزی اطالوی معاہدہ کی حقیقت آشکار ہو گئی۔ مسٹر چیمبرلین نے دارالعوام میں ایک اور عظیم الشان مباحثہ کی اجازت دی جس میں بہت فصیح و بلیغ تقریریں کی گئیں۔ مسولینی کی عہد شکنی کی شدید مذمت کی گئی اور البانیہ کی پُرزور" اخلاقی

حمایت کی گئی۔ فردوسی مرحوم ایسے موقعوں کے لئے کہہ گئے ہیں ع

نشستند و گفتند و برخاستند

ایک جرمن اخبار نے برطانیہ اور فرانس کے قول و فعل کے تضاد پر ایک چبھتا تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے " پہلے برطانیہ نے نجاشی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، پھر آسٹریا کے شسنگ کی سرپرستی کی، پھر ہسپانیہ کے نگرین کی حمایت کی، پھر چیکوسلواکیہ کے بینش کی دوستی کا دم بھرا۔ اب وہ سب بدنصیب دستِ حسرت مل کر کہہ رہے ہیں ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!

اب برطانیہ اور فرانس کی دوستی صرف ایک دوسرے کے لئے ہے!

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر چیمبرلین نے جس طرح ان چند سالوں میں انسانیت کبریٰ اور برطانیہ کے مفاد کو جماعتی تعصبات پر قربان کیا ہے اور چھوٹی ریاستوں کو بڑی ریاستوں کا شکار ہوتے دیکھ کر ٹس سے مس نہیں ہوئے اس وطیرہ سے امن عالم خطرہ میں پڑگیا ہے اور برطانیہ کے وقار کو شدید صدمہ پہنچا ہے۔ چھوٹی ریاستوں کی تباہی برطانیہ اور فرانس کے خطرہ کا اشتہار ہے۔ ظاہر ہے کہ جب چھوٹی ریاستیں نہ رہیں گی تو بڑی ریاستیں آپس میں ٹکرائیں گی۔ جب حبش، آسٹریا، چیکوسلواکیہ اور البانیہ مکمل طور پر مطیع ہو جائیں گے تو فرانس اور برطانیہ کی باری آئے گی۔ اس کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔ "تونس، جبوتی، سویز" اور "نوآبادیات" کے نعرے لگ رہے ہیں اور اگر یہی لیل و نہار ہیں تو وہ دن دور نہیں جب جرمن طیارے برطانیہ پر حملہ آور ہوں گے اور مسٹر چیمبرلین اپنے چھاتے سمیت کسی آہنی کمین گاہ میں دبکے ہوئے گنگنا رہے ہوں گے ع

شامتِ اعمالِ ما صورتِ "ہٹلر" گرفت!

خدا وہ دن نہ لائے!

موسیٰ

جب تو نہیں تو پھر یہ غم جاوداں ہے کیا

غالب سے زندگی کی توقع ہے تیری یاد

برادرِ نسبتی

مَیں شاد ہوں اپنے بھائیوں سے، تو مجھ سے رضی ہیں میرے بھائی
پھپھیرے بھائی خلیرے بھائی، ممیرے بھائی چچیرے بھائی
پھپھیرے بھائی کو دیکھتا ہوں، پھوپھی کی آتی ہے یاد صُورت
وُہی تکلّم وُہی تبسّم ، وُہی محبّت وہی عنایت
خلیرے بھائی نے یاد مجھ کو دلایا گزرا ہُوا زمانہ
وہ میری خالہ کا آ کے ہنسنا ، وُہ میری امّاں کا مُسکرانا
میں جیسا ہوں دادھیال سے خوش، اُسی طرح نانہیال سے خوش
چچیرے بھائی کے حال سے خوش، ممیرے بھائی کی چال سے خوش
کشیدہ خاطر نہیں ہے کوئی، مَیں اُن کا شیدا ، وُہ مجھ پہ مائل
جو سب کے سب رشتہ دار خوش ہیں شگفتہ ہیں باہمی وسائل
کیا ہے قانون اور شریعت نے قایم اور ایک تازہ رِشتہ
جدید یہ رشتہ دار میرے لئے محبّت کا ہے فرشتہ

یہ نیک انساں حقیقی بھائی مری شریکِ حیات کا ہے
برادرِ نسبتی کا دلکش اضافہ کس درجہ جاں فزا ہے
برادرِ نسبتی ادھر خوش مری شریکِ حیات اُدھر خوش
خوش ان سے ہنس بول کر ہوں میں بھی غرض ہے اس وقت گھر کا گھر خوش
جدید یہ ارتباط ہوگا نئے نئے رابطوں کا حامل
اسی طرح پھیلتے رہے ہیں جہاں میں چھوٹے بڑے قبائل
وسیع ہوں گے اس اشتراکِ لطیف سے دونوں خانداں بھی
ریاضِ ہستی کی ہونگے زینت نئے مکیں بھی نئے مکاں بھی
برادرِ نسبتی کے تیور بتا رہے ہیں کہ باوفا ہے
ابھی بہت رسم و رہ بڑھے گی ابھی محبّت کی ابتدا ہے
برادرِ نسبتی میں مجھ میں بڑھے نہ آئندہ کیوں صفائی
کہ ہونگے میرے اور اُس کے بچّے پھپھیرے بھائی ممیرے بھائی

علی منظور

یہ لاہور ہے!

لاہور دو حصوں میں منقسم ہے - ایک وہ جو سرکلر روڈ کے اندر اندر آباد ہے یعنی شہر۔ دوسرا وہ جو اس سے باہر واقع ہے یعنی سول سٹیشن شہر اور سول سٹیشن میں امتیاز کرنا بہت آسان ہے، جہاں کہیں آپ کا راستہ ایسی پچاس ساٹھ گائے بھینسیں روک لیں جو نہایت متانت اور سنجیدگی سے قدم اُٹھا رہی ہوں جنہیں موٹر گاڑیوں کے ہارن اور تانگے والوں کے چابک کا کوئی خوف نہ ہو اور جو ایک شانِ استغنا سے اپنے اُداس چہرے جھکائے اس مسئلہ پر غور و فکر کرتی جا رہی ہوں کہ جب لاہور کے اِرد گرد ہمارے لئے میلوں تک سبز چارہ موجود نہیں تو پھر ہمارے مالک ہمیں ہر روز کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر منہ مارنے کے لئے کیوں تکلیف دیتے ہیں اور جب ہم دودھ اتنا خالص دیتی ہیں کہ اُس میں پانی ملانے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تو پھر ہمارے مالک ناک بھوں کیوں چڑھائے رکھتے ہیں: سمجھ لیجئے شہر ہے ۔۔۔ بفرضِ محال آپ کو "علم حیوانات" سے شوق نہیں تو ایک اور پہچان اس سے بھی آسان ہے یعنی جہاں کہیں آپ کو ولائتی فوج کا کوئی گورا سپاہی لٹو می، گھبرایا اور بوکھلایا ہوا نظر آ جائے سمجھ لیجئے شہر ہے اور جہاں کہیں آپ کو خوبصورت، برق رفتار، اجلے موٹر کاروں کے تعاقب میں انگریز اور دیسی لڑکیاں بائیسکل دوڑاتی نظر آئیں سمجھ لیجئے سول سٹیشن ہے۔

شہر کے اندرونی حصے میں زیادہ تر وہ لوگ آباد ہیں جو صحیح معنوں میں لاہور کے باشندے کہلانے کے مستحق ہیں اور جن کا وطن لاہور ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً ۵ لاکھ ہے۔ گزشتہ مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے اور کتے بہت زیادہ ہیں۔ اگر آپ گرم مزاج واقع ہوئے ہیں تو لاہور تشریف لائیے۔ ریلوے اسٹیشن پر اُترتے ہی آپ کی مزاج پُرسی کی جائے گی۔ اگر آپ نے سامان اُٹھانے والے قلی کو ایک آنہ دیا تو وہ دونی مانگے گا۔ اگر دونی دی تو وہ چونی مانگے گا اور اگر چونی دی ہے تو وہ اٹھنی کا مطالبہ کرے گا۔ غرضکہ آپ اُسے جتنے پیسے بھی دیں گے وہ اُن کو اپنی ہتھیلی پر پڑا رہنے دے گا۔ انہیں صرف ایک مرتبہ بھانپ کر اپنی قہر آلود نگاہیں آپ کے چہرے پر گاڑ دے گا۔ اُس کے لب یوں ہلیں گے گویا اُس کے اندرونی ارادہ کا اس میں کوئی دخل نہیں بلکہ معلوم ہوگا کہ اس کو ایسا کرنے کے لئے سدھایا گیا ہے۔ وہ ایسی آواز جس میں غیر شعوری طور پر غصہ، حیرت اور تعجب کی آمیزش ہوگی کہے گا "بابوجی۔ یہ آپ مجھے کیا دے رہے ہیں؟" آپ کہیں گے "چونی ہے، دیکھتا نہیں"۔ اگر آپ کے پاس اسباب کچھ زیادہ ہے اور آپ کا حلیہ بتا رہا ہے کہ آپ کسی دُور دراز شہر سے آئے ہیں تو آپ سے ذرا کڑک کر کہے گا " واہ بابوجی! یہ بھی لے لو"۔ یہ غیر متوقع الفاظ سُن کر ایک لمحہ کے لئے آپ کے دل میں خیال آئے گا "ہے تو قلی مگر ظالم نے بڑی سیر طبیعت پائی ہے"۔ آپ کہیں گے "نہیں جو کچھ دیا ہے ٹھیک ہے، جاؤ" ۔۔۔ وہ

اور زیادہ کڑک کر جواب دے گا " نہیں جی، یہ بھی لے جاؤ - آپ کی بچت ہو جائے گی " ——— آپ کی چونی آپ کے ہاتھ میں ہوگی - آپ کوچوان کو حکم دیں گے " تانگا چلاؤ - نہیں لینا تو جائے بھاڑ میں "- قلی آپ کے تانگے کو روک لے گا - فوراً درجن بھر لوگ آپ کے تانگے کو حراست میں لے لیں گے - آپ فرمائیں گے " میں نے پچھلے اسٹیشنوں پر دو جگہ اتنے ہی پیسے دیئے ہیں - تم کہاں کے آئے ہو چونی نہیں لیتے "- اس کی بھویں تن جائیں گی اور وہ غضبیلی آواز میں کہے گا " دیتے آئے ہوں گے آپ - یہ لاہور ہے "- آپ درجن بھر لوگوں کی طرف دیکھیں گے جن میں آپ کو ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے افراد نظر آئیں گے - اُن کی آنکھیں قلی کے الفاظ کی تائید میں زبانِ حال سے کہہ رہی ہوں گی " یہ لاہور ہے "-

آپ یہاں سے چھٹکارا پائیں گے تو چنگی آجائے گی - اگر آپ کے پاس محصول والی کوئی چیز ہے تو تانگے والا محصول لینے والے منشی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بتا دیگا - اگر اُس نے آپ پر رحم کھا کر اجازت دے دی تو آپ کو تانگے والا آپ کی منزلِ مقصود تک کسی قریبی راستہ سے نہیں پہنچائے گا بلکہ آپ کو کئی عمدہ عمدہ سڑکوں پر پہنچاتا، گھوڑا کُداتا اور جھٹکے کھلاتا ہُوا مختلف بازاروں میں پھراتا رہے گا - اسی دوران میں کئی بیکار لوگ، کئی فالتو بچے، کئی بائیسکل چور جو بائیسکل لے کر بازار میں جلدی جلدی نکل جانے کی کوشش میں ہوں گے اور کئی ایسے کُتے جن کے باقی ساتھیوں کو میونسپلٹی نے ہلاک کر دیا ہوگا " میونسپل موت " پر خود کشی کو ترجیح دیتے ہوئے آپ کے تانگے کے نیچے آنے کی کوشش کریں گے - آپ کو باغاتِ بلدیہ کے جنگلے پر بہت سے پُرانے گرم کوٹ پڑے ہوئے نظر آئیں گے ان میں کوئی کوٹ کولمبس کا ہے، کوئی مارکو پولو کا اور کوئی نانا فرنویس کا - یہ سب کے سب تاریخی ہیں - پہلے یہ کوٹ عجائب گھر میں ہوتے تھے لیکن اُس طرف عوام کا رجوع کم ہونے کے باعث اب انہیں کھلی فضا میں رکھا جاتا ہے - آپ دیکھیں گے کئی لوگ چلتے چلتے ٹھہر جائیں گے، ایک کوٹ کو اُٹھائیں گے اُلٹ پلٹ کر دیکھیں گے، دریافت کریں گے کس کا ہے؛ جواب ملنے پر اُسے زیادہ غور سے دیکھیں گے اور اگلے وقتوں کے بخیئے اور بٹنوں پر غور کرنے کے بعد اُسے وہیں رکھ کر اپنی راہ لیں گے - آپ کو ایک دو مسجدوں کے قرب میں مولویانہ شکل کے لوگ چلتے بازار کی جانب بے تکلف مُنہ کر کے کھڑے استنجا کرتے نظر آئیں گے - پہلے آپ نہیں سمجھیں گے کہ وہ کیا کر رہے ہیں - آپ تانگہ میں سے جھک کر دیکھیں گے، وُہ بھی آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں گے اور زبانِ حال سے پُکار کر کہیں گے " یہ لاہور ہے - انگریز کے راج میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کوئی کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتا "- آخر کار آپ کا تانگہ ایک گلی کے سرے پر جا کر کھڑا ہو جائے گا - آپ تانگے والے کو جتنے پیسے دیں گے وُہ یہ کہتا ہُوا اس سے دُگنے طلب کرے گا " بابو جی یہ آپ کیا دیتے ہیں - آپ کو اسٹیشن سے لایا ہوں - آپ خود انصاف کیجئے کتنا فاصلہ طے کیا ہے (اور کس خوبی سے کہ آپ کو بھُوک محسوس ہو رہی ہے) اگر آپ نے اگر مگر کی تو تانگے والا تاؤ میں آجائے گا ——— آخر کار اس موقع پر بھی آپ کو شکست ہوگی - غرضیکہ یہاں بات بات پر پگڑی اُچھلتی ہے - اپنی عزت کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے - ابھی آپ کو اپنے میزبان کے مکان تک پہنچنے میں ایک دو

تنگ و تاریک بدبودار گلیوں میں سے گزرنا باقی ہے۔ اگر ہندوؤں کا محلہ ہوگا تو دو رویہ گدرائے بدن کی عورتیں ململ کی باریک سے باریک دھوتیاں باندھے مکانات کی ڈیوڑھیوں میں بیٹھی ایک دوسری سے تُو تُو مَیں مَیں کرتی نظر آئیں گی۔ اگر مسلمانوں کا محلہ ہُوا تو آپ کو دو رویہ مسلمان عورتیں ململ کے باریک باریک کرتے پہنے ایک دوسری سے ہاتھ نچا نچا کر اُونچی آواز میں باتیں کرتی نظر آئیں گی۔ دونوں محلّوں میں بچّے بالے گلی کے عین وسط میں سے گزرنے والی نالی پر رفعِ حاجت کے لئے بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ آپ کی طرّے دار پگڑی اور صاف ستھرے لباس کو دیکھ کر یا آپ کی ہیٹ اور سُوٹ سے مرعوب ہو کر اور آپ کے ناآشنا چہرے پر نظر ڈال کر نالی پر بیٹھے ہوئے بچے گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنی قمیصیں اُٹھائے ہوئے اپنی ماں کا رُخ کریں گے۔ اتنے میں اُن عورتوں میں سے ایک عورت کرخت آواز میں اُن بچوں سے کہے گی "جاؤ، اُٹھ کیوں کھڑے ہوئے۔ جاؤ بیٹھو!" آپ اُس عورت کی طرف دیکھیں گے وہ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بزبان بے زبانی کہے گی "کیا تیورا کے دیکھ رہا ہے میری طرف۔ تیرے جیسے کئی آتے ہیں یہاں۔ یہ لاہور ہے!!!" مگر آپ چونکہ بالکل اجنبی ہیں اس لئے آپ کا لحاظ کرتے ہوئے وُہ قدرے مسکرا کر کہے گی "بچوں نے سمجھا شاید صفائی کا داروغہ ہے"۔ آپ دل میں کہیں گے مَیں اتنا گھٹیا ہوں۔ صفائی کا داروغہ یعنی مہتروں کا جمعدار۔ آپ مُنہ سے ہزار بولنا چاہیں مگر نہ بول سکیں گے۔ آپ سوچیں گے کیا میری شکل وصورت اور میرا لباس ان عورتوں کی نگاہ میں داروغۂ صفائی کی شکل وصُورت اور لباس سے مُشابہ ہے؟

اِس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیجئے کہ شہر سے باہر سول سٹیشن کی نالیوں پر بھی بچے رفعِ حاجت کے لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ نہیں وہاں صفائی کا بڑا لحاظ ہے۔ ایک ادنیٰ سی مثال سے آپ کو وہاں کی صفائی کا اندازہ ہو جائے گا یعنی ٹھنڈی سڑک پر گرم پیشاب کرنے والے شخص کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ خیر! اتنے میں آپ اپنے میزبان کے مکان پر آ پہنچیں گے۔ دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لکڑی کا بنا ہُوا ایک لیٹر بکس لٹکا ہوگا جس پر جلی حروف میں لکھا ہوگا "لیٹر بکس"۔ آپ ایک لمحہ کے لئے سوچیں گے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ لیٹر بکس ہے مگر اس پر "لیٹر بکس" لکھنے سے کیا مطلب۔ خیر! آپ ڈیوڑھی میں داخل ہوں گے وہاں سیڑھیوں کے قریب پانی کا نل لگا ہُوا ہوگا جس کے اِردگرد چار چار فٹ تک فرش بھیگا ہُوا ہوگا قریب ہی منجھے ہوئے برتنوں سے بچی ہوئی راکھ پڑی ہوگی۔ آپ دل میں سوچیں گے ڈیوڑھی میں نل لگانے کا کیا مطلب، مگر آپ کیا جانیں۔ یہ لاہور ہے۔ آپ کو مکان کی بالائی منزل کے ایک آدھ کمرے میں بھی نل لگا ہُوا نظر آئے گا مگر اُس سے محض آرائش مقصود ہے۔ سُنا ہے سال بھر میں ایک آدھ بار ایسے نلوں میں سے ہزار صبر و ضبط کے باوجود بھی اپنی سوگوار تنہائی اور منتظمینِ بلدیہ کی غفلت کیشی پر پہلے دو چار لمبی لمبی آہیں نکلتی ہیں اور پھر دو چار آنسو ٹپک پڑتے ہیں جن کا رنگ بدلا ہُوا ہوتا ہے یعنی وہ آنسو صحیح معنوں میں "اشک پیازی" ہوتے ہیں۔

لاہور اور لاہوریت دو مختلف المعانی الفاظ ہیں۔ لاہوریت ایک کنایہ ہے جس سے مُراد ایک خاص قسم کی معاشرت خاص قسم کی زبان خاص قسم کے رسم ورواج اور خاص قسم کا ماحول ہے۔ لاہور کی سیر کیجئے۔ آپ کو جگہ جگہ لاہوریت کے لاجواب نمونے نظر آئیں گے

چڑیا کو چڑی، سرور کو سروٹر، سرفراز کو سرد فرداز اور سڑک کو سرک کہنا یہاں کے فصحا کی زبان ہے اور اس میں جاہل اور تعلیم یافتہ، مہذب اور غیر مہذب کی کوئی تمیز نہیں۔ بات بات پر ہنسی ہنسی میں دو دو من کی گالی استعمال کرنا یا گفتگو کے دوران میں زیبِ داستاں کے طور پر مقفیٰ اور مسجع مغلظات کی بارش کر دینا یہاں کی معاشرت کا ایک محبوب و مرغوب پہلو ہے۔ بلدیہ کے باغات میں صبح سے شام تک لٹو گھما گھما کر ہاؤ ہو برپا کرنا یا کباب فروش اور فالودہ بیچنے والے کی دکان پر دھمی سے بیٹھ کر نہایت کرخت آواز میں ناٹک کے گیت الاپتے رہنا یہاں کے دلچسپ مشاغلِ حیات ہیں۔ یہاں ہر شخص جو لباس میں زیادہ آشفتہ حال زبان میں زیادہ بے احتیاط اور کردار میں زیادہ فحش ہو خلیفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے محفل میں ہر شخص بیتاب نظر آتا ہے کہ اپنا ڈیل ڈول دکھانے کے لئے دوسرے کی پگڑی اچھالے چنانچہ اس غرض کے لئے بات بات پر آستینیں چڑھائی جاتی ہیں اور سب و شتم کے سلسلہ میں زبان قینچی کی طرح استعمال کی جاتی ہے۔ جو شخص ثقاہت و متانت کا جامہ زیادہ تندی سے تار تار کرتا ہے وہی محفل کی سواری کا زیادہ اہل تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں پندرہ سال سے اوپر کی عمر کا ہر لڑکا اپنے اچھے بھلے صافے کو کانوں کی طرف جھکا کر اور تہمد کے پلو کو دائیں ہاتھ سے اٹھا کر اپنی چال ڈھال اور وضع قطع میں عمداً ایسا رنگ پیدا کرتا ہے جو اُسے معقول اور سنجیدہ انسانوں کی صف سے خارج کر دے۔ کیونکہ جب تک لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار کے انداز میں سنجیدگی و معقولیت کا شمہ بھی باقی ہے اُسے "خلفا" کے حلقے میں شریک ہونے کی توقع نہیں ہو سکتی اور آپ جانتے ہیں کہ لاہور میں ہر نوخیز و نوعمر نوجوان کا منتہائے نظر یہ ہے کہ وہ جلد از جلد خلیفہ بن جائے۔

بمبئی کے چور بازار کی طرح یہاں بھی ایک بازار ہے جسے لنڈا بازار کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے بالکل قریب ہے تاکہ مسافروں پر آتے ہی ہاتھ صاف کیا جائے۔ سننے میں آیا ہے کہ اس بازار کو حکومت کی طرف سے ایک رقم کثیر بطور زر اعانت دی جاتی ہے تاکہ اس بازار کی شان و شوکت میں فرق نہ آنے پائے اور لاہور میں وارد ہونے والے لوگوں کی نظروں میں یہ نظر بٹو بازار ہمیشہ خار بن کر کھٹکتا رہے آپ اس بازار میں سے گزر جائیے شاید ہی کسی دکان پر آپ کو زندگی کی جھلک نظر آئے سارے بازار پر مردنی سی چھائی رہتی ہے۔ دوسرے بازاروں میں جو رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے وہ اس بازار میں قطعاً موجود نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی شگفتگی اور رونق اس بازار سے چھین لی گئی ہے اور یہ لنڈورا رہ گیا ہے۔ اگر اس بازار کا نام لنڈا بازار کی بجائے لنڈورا بازار ہوتا تو بہت مناسب تھا یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس بازار پر خدا کی لعنت اور پھٹکار برس رہی ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے یہ بازار بہت جوبن پر تھا۔ یہاں حسن فروخت ہوتا تھا۔ حسن بیچنے والیوں میں یہودی، مصری، فرانسیسی اور پارسی عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ اُن دنوں اس بازار میں بہت گہما گہمی ہوتی تھی۔ بالاخانوں پر کئی بے گناہ انسانوں کے قتل کی وارداتیں ہوئیں کئی لوگوں کی جوانیاں اس بازار کی نذر ہو گئیں۔ اور کئی لوگوں نے گناہ کا پہلا سبق اسی بازار سے سیکھا۔ اب بھی اس گئے گزرے زمانے کے آثار اس بازار سے نہیں مٹے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُن بے گناہ انسانوں کی روحیں اس بازار کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اس بازار کی مٹی

سے اب بھی جرم و معصیت کی بو آتی ہے۔ اب بھی یہ بازار شہر کے جیب تراشوں، چوروں، اچکوں اور قمار بازوں کا رمنا ہے۔ ہر تین چار دکانوں کے بعد ایک دکان ایسی ہے جس پر چانڈو پیا جاتا ہے۔ کئی دکانیں ایسی ہیں جن پر دن کے وقت مٹی کے بنے ہوئے خاص ساخت کے لمبے سبز رنگ کے پشاوری حقے نظر آتے ہیں۔ اندر اور کچھ نہیں صرف بوسیدہ سی چٹائی بچھی ہوئی ہے اور ادھر اُدھر جلے ہوئے تمباکو کے گل پڑے ہیں مگر رات کے وقت وہاں شہر کے شہدے اکٹھے ہو کر چرس کا وُہ دم لگاتے ہیں کہ الامان۔ اس بازار میں کئی دکانیں ایسی ہیں جہاں شراب، چرس، افیون، پوست اور چانڈو بکتا ہے۔ ان دکانوں پر ہر وقت لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بالخصوص سہ پہر کے وقت توان دکانوں پر اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ مزدور، فقیر، کوچوان، گداگر، تانگے والے اور اسی قسم کے اور لوگ جنہیں اللہ نے توفیق دے رکھی ہے افیون خریدنے کے لئے بھاگم بھاگ ان دکانوں کی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں۔ سُنا ہے آج سے دس بارہ سال پہلے ایک افیون فروش نے ایک بندریا پال رکھی تھی۔ اُس نے اس بندریا کو اس طرح سدھایا تھا کہ وہ ایک ایک آنے کی افیون پڑیوں میں بند کر کے اُس کے آگے ایک لکڑی میں ڈال دیتا تھا اور وہ گاہک جنہیں صرف ایک آنہ کی افیون درکار ہوتی تھی اس بندریا کو ایک آنہ دے کر اُس سے ایک پڑیا لے لیتے تھے۔ اس طرح دکاندار کا کام بٹ جاتا تھا اور وہ اُن گاہکوں کی طرف سے مطمئن اور بے فکر رہتا تھا جنہیں ایک آنے کی افیون خریدنی ہوتی تھی۔ بدقسمتی سے کچھ عرصہ کے بعد اس بندریا کو بھی افیون کھانے کی عادت پڑ گئی اور رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ دکاندار نے افیون بیچنے کا کام جو اس کے سپرد کر رکھا تھا اپنے ہاتھوں میں لے لیا کیونکہ بندریا اب سارا سارا دن نشے میں مگن رہنے لگی تھی۔ آخر کار دکاندار نے اس بندریا کو نکال دیا۔ بازار کے اکثر لوگ اُس بندریا سے آشنا ہو چکے تھے اور بندریا بھی بازار کے کئی افیونیوں سے واقف ہو چکی تھی، وہ اب بازار میں آوارہ پھرنے لگی اور جب نشہ ٹوٹتا بازار کے کسی افیونی دکاندار کے پاس جا کر چیخیں مارتی اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر پیسہ مانگتی۔ دکاندار اس کی ضرورت سمجھ کر اُسے پیسہ دے دیتے اور وُہ وہاں سے سیدھی افیون فروش کی دُکان پر پہنچ کر افیون کھا لیتی اور کسی "افیونی بھائی" کی دُکان کے باہر سارا دن اُونگھتی رہتی۔ بازار کے لوگ اُسے "پھینے" (افیون کھانے والی) کے نام سے پکارتے تھے۔ سُنا ہے جب وہ بندریا مرگئی تو لاہور شہر کے افیونیوں میں بہت دیر تک اس کی موت کا چرچا رہا۔

اِس بازار میں زیادہ دُکانیں ایسی ہیں جہاں مختلف سائز کے سِلے ہوئے سیکنڈ ہینڈ کپڑے فروخت ہوتے ہیں۔ یہاں چند کباڑیے بھی بیٹھتے ہیں مگر اُن کی دُکانوں پر سامان ویسے کا ویسا ہی پڑا رہتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس بازار کی ہر دکان بجائے خود کباڑیے کی دُکان ہے کیونکہ آپ کو ہر دکان پر سیکنڈ ہینڈ مال مل سکتا ہے۔ دروغ برگردنِ راوی اس بازار کے موچی بھی استعمال شدہ جوتوں کی مرمت کرنے کے بعد انہیں سستے داموں پر فروخت کر دیتے ہیں اور طُرّہ یہ کہ اس بازار کے نان بائیوں کی دُکانوں اور ہوٹلوں پر کھانا بھی سیکنڈ ہینڈ ملتا ہے۔

یہاں کے لوگ خوش قسمتی سے بہت چٹورے واقع ہوئے ہیں۔ لاہور کے گرد و نواح کے کھیتوں میں کام کرنے والے زمینداروں سے سنا گیا ہے کہ کبھی کبھی شہری دکاندار کھیتوں میں جال بچھا کر کوّے پکڑتے دیکھے گئے ہیں۔ اُن سے دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ کسی دوا میں ڈالے جائیں گے لیکن کچھ عرصہ کے بعد بھید کھُلا کہ اُن کوّوں کو مصالح دار بیسن لگا کر تلا جاتا ہے اور وہ بٹیر کے نام سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں کیونکہ لاہور کے لوگ خوش قسمتی سے چٹورے واقع ہوئے ہیں۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ لاہور میں بہت سے کارخانے ہیں جو دھُواں پیدا کرنے میں دُنیا بھر میں مشہور ہیں اور جن کا بنایا ہُوا دھُواں ساکنانِ شہر کو بہم پہنچانے کے بعد دساور کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ چراغ جلنے کے وقت اندرون اور بیرون شہر میں دھُواں اس کثرت سے پھیلا دیا جاتا ہے کہ وہ مکانات کی آخری کوٹھڑیوں میں بھی داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے جہاں مکانوں میں رہنے والے وقتِ ضرورت کے لئے مدتِ مدید سے ٹھنڈی تازہ ہوا محفوظ کر رکھتے ہیں۔ سُنا ہے لاہور کے لئے یہ دھُواں آئندہ جنگ کے موقع پر بہت مفید ثابت ہوگا۔ اُوپر سے بم نہیں گرائے جا سکیں گے کیونکہ اس دھوئیں سے گیس سکرین کا کام لیا جائے گا۔ اسی واسطے گوبر کے اُپلوں کی تجارت یہاں دِن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ ایک دوست نے جو حال ہی میں انگلستان سے وارد ہوئے ہیں ہمیں بتایا ہے کہ پچھلے دنوں جب دُنیا کے اُفق پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے لنڈن میں گیس ماسک درسٹریچر تقسیم کئے گئے تھے اور مسٹر چیمبرلین نے دارالسلطنت پنجاب کو ہوائی حملوں سے بچانے کے لئے لاہور میں مُفت اُپلے تقسیم کرنے کی تجویز کی تھی۔

لاہور میں جب بارش ہوتی ہے تو بلدیہ کے ارباب بست وکشاد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا کیونکہ اندرونِ شہر کی کیچڑ شعاع آفتاب سے خشک تو ہو نہیں سکتی اس لئے راہگیروں کے جُوتوں، پائجاموں، تانگوں اور موٹروں کے پہیّوں سے چپٹ چپٹ کر "آمد" اور "برآمد" ہوتی رہتی ہے۔ اندرونِ شہر کے تنگ بازاروں اور گلیوں میں بالعموم اور بیرونِ شہر کے حصّوں میں بالخصوص کیچڑ اور دلدل میں جنگ چھڑ جاتی ہے اور جنگ وجدال کے دَوران میں بلدیہ کے باغات کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں کیونکہ وہاں مُفت کھاد فراہم ہو جاتی ہے۔

لاہور کے فقیر اپنی قسم کے آپ ہیں۔ کچھ سڑکوں پر پڑے ہوئے مصنوعی طور پر کراہ رہے ہیں۔ بعض نے اپنے بازوؤں اور ہاتھوں پر اس خوبی سے زخم بنا رکھے ہیں کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ اس قسم کے فقیر آپ کو دیکھتے ہی اپنے زخم آپ کے سامنے کر دیں گے۔ اور آپ کو انہیں پیسہ دینا ہی پڑے گا۔ ایک کُبڑا فقیر صرف دسمبر جنوری کی ٹھٹھرنے والی یخ بار راتوں میں نمودار ہوتا ہے جب آسمان ابر آلود ہو کبھی کبھی بجلی چمکتی ہو اور آپ نے کھڑکیاں بند کر کے پردے چھوڑ رکھے ہوں اس وقت ایک نحیف آواز آپ کے کانوں تک پہنچے گی "اس جاڑے میں کوئی لکڑی دلواؤ گے بابا!" آپ کو کبھی شہر کے ایک کونے میں اور کبھی دُوسرے میں راستہ سے ذرا ہٹ کر زمین پر اوندھے مُنہ پڑا ہُوا ایک فقیر نظر آئے گا۔ جس کے مُنہ سے جھاگ بہہ رہا ہوگا اور وہ بڑی دردناک آواز میں کہہ رہا ہوگا "مجھ غریب پر ترس کھا

جاؤ رے بابا"۔ سُنا ہے یہ بھی مصنوعی فقیر ہے۔ یہ تو اُن فقیروں کا ذکر ہے جن کی زبان پنجابی نہیں اور جو پیشۂ گداگری کے سلسلے میں لاہور میں آکر رونق افروز ہوئے ہیں اور در اصل بیرون پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ اب ذرا پنجابی فقیروں کی سنئے۔ انہیں محلوں اور گلیوں میں بھیک مانگنے کا بڑا لپکا ہے۔ وہ چاہے کتنے ہٹے کٹے کتنے جوان کیوں نہ ہوں اندرون محلہ میں کھلم کھلا جا سکتے ہیں۔ آپ کو کئی فقیر ایسے نظر آئیں گے جن کے قد چھ چھ فٹ کے قریب ہوں گے اور جن کے ہاتھ میں لوہے کا ایک بڑا دست پناہ یا موٹا سا چوبی ڈنڈا ہوگا آنکھوں میں ایک فقیرانہ شان کا نشہ ہوگا جس میں آورد کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی، سر کو بظاہر کچھ جھکائے رکھتے ہیں اور گلی کوچوں میں بالخصوص جہاں عورتوں کا جمگھٹا ہو دل کھول کر دادِ فقر دیتے ہیں۔ اُن کا خانۂ چشم میں آنکھوں کو اِدھر اُدھر پھرانے کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کہیں قریب ہی کوئی مرد تو موجود نہیں کیونکہ اُن کے پیرو مرشد نے انہیں سب سے پہلے یہ سبق دیا تھا ؎

ہر کوچہ گماں مبر کہ خالیست ہُشدار کہ مرد خفتہ باشد

وہ کبھی کبھی کنکھیوں سے کھڑکیوں کی طرف بھی بے نیازانہ انداز میں اسی غرض سے دیکھتے ہیں اور اگر قریب ہی کی کھڑکی یا ڈیوڑھی میں کوئی تنہا لڑکی یا عورت نظر پڑ جائے تو اپنی دھیمی مگر پُرشکوہ آواز میں سوز پیدا کرتے ہوئے ایک رازدارانہ انداز میں ترنم سے کہیں گے۔ "چل تُر چلیئے" اتنا کہہ کر اُس عورت یا جوان لڑکی کے چہرے پر اس دعوتِ فقر کے تأثرات تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اس لڑکی یا عورت کے چہرے پر غضبناک قسم کی لہریں اُٹھنے لگیں تو فوراً کیفیتِ مزاج بھانپ کر اُونچی آواز میں گا دیں گے "شہر مدینے لوں"۔

یہ ڈراما وقت کے بہت قلیل عرصہ میں ختم ہو جاتا ہے "چل تُر چلیئے" ——— (وقفہ) "شہر مدینے لوں"۔

علاوہ ازیں گلی محلوں میں کئی اچھے خاصے "سفید پوش" فقیر بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ پاؤں میں لال چمڑے کا جوتا لمبی سفید قمیص لٹھے کا پاجامہ، سر پر سفید یا سبز دستار۔ گلے میں بڑے بڑے دانوں کی تسبیح اور مقطع داڑھی۔ بعض فقیروں کی پوشش تو اتنی اچھی ہوتی ہے کہ آدمی کو اُن پر کسی سمال ٹاؤن کمیٹی کے ممبر کا گماں ہونے لگتا ہے۔ اس ضمن میں مجھے ایک فقیر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ جس محلے کا میں ذکر کر رہا ہوں وہاں وہ فقیر ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو تشریف ارزانی فرماتے ہیں۔ سر پر کبھی سرخ ٹوپی، کبھی سفید پگڑی، لٹھے کی قمیص، نیچے تہمد، پاؤں میں دیسی جُوتا، شکل و صُورت مولویانہ، ہاتھ میں آٹے سے بھرا ہُوا نصف تھیلا۔ صدا لگاتے ہیں "میں بخاری سید ہوں۔ آج چاند کی پہلی جمعرات ہے جو مجھے خیرات دے گا ثواب پائے گا۔ میں اُس خیرات پر ختم پڑھ کر اُن کے بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچاؤں گا میں بخاری سید ہوں۔ ۔ ۔ ۔" یہ گردان اسی طرح جاری رہتی ہے اور گلی محلے کی عورتوں میں سے کوئی توے پر سے اُترتی ہوئی گرما گرم چپاتی لے آتی ہے کوئی آٹا دیتی ہے اور کوئی پیسہ اور وہ سید صاحب سبھی کچھ سمیٹتے جاتے ہیں۔

کبھی آپ سڑک پر ایک کمسن لڑکے کو بے دردی سے پٹتا دیکھیں گے۔ وہ زور زور سے چیخ رہا ہوگا اور ایک شخص زد و کوب میں مصروف ہوگا۔ آپ پوچھیں گے کیا بات ہے؛ وہ شخص جواب دے گا "میں درزی ہوں۔ یہ لڑکا میرے پاس شاگرد ہے۔ اسے

کل صبح بٹن لانے کے لئے اٹھنی دی گئی تھی۔ یہ اٹھنی لے کر ایسا چمپت ہُوا کہ آج چوبیس گھنٹوں کے بعد میری نظر پڑا ہے"۔ اتنے میں وُہ لڑکا زور زور سے روئے گا۔ قسمیں کھائے گا اور بڑی معصومانہ آواز میں کہے گا" وُہ اٹھنی مجھ سے گم گئی تھی۔ میں خوف کے مارے دُکان پر نہیں گیا!" اتنے میں وہ ہٹا کٹا شخص اُس لڑکے کی رُخسار پر اس زور سے طمانچہ مارے گا کہ آپ کے اور مجمع میں سے چند آپ جیسے نرم دل لوگوں کو اس بچے پر ترس آ جائے گا اور آپ میں سے ایک شخص جو دل کا سخی ہوگا اور جس کی جیب بھاری ہوگی کہے گا" خدا کے لئے بچے کو یُوں نہ مارو۔ یہ لو آٹھ آنے اور بچے کو چھوڑ دو۔" اُس کی گرفت ڈھیلی ہو جائے گی۔ بچہ احسان مندانہ نگاہوں سے آٹھ آنے دینے والے شخص کی طرف دیکھے گا اور آنکھیں چار ہوتے ہی آنسو پُونچھ کر اُس کے پاؤں پکڑ کر کہے گا" خدا آپ کا بھلا کرے آپ نے مجھ پر رحم کھایا ہے"۔ اتنے میں وہ شخص جو اپنے آپ کو درزی بتاتا ہے کڑک کر کہے گا" چل میرے آگے ہو۔ چل دکان پر" لوگ اٹھنی دینے والے شخص کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دیتے ہوئے منتشر ہو جائیں گے اور اٹھنی دینے والا شخص اپنے دل ہی دل میں اس سچی خوشی اور اصل خیرات پر اس وقت تک نازاں و فرحاں رہے گا جب تک اُسے شہر کے کسی اور حصے میں اُسی شخص کے ہاتھوں اُسی قصور پر اُسی بچے کو پٹتے دیکھنے کا اتفاق نہ ہو۔

لاہور کی سیر کرتے وقت اگر کوئی 'برقع پوش' آپ کو دیکھتے ہی 'نقاب پوش' بھی ہو جائے تو سمجھئے کوئی جان پہچان ہے کیونکہ لاہور میں مسلمان عورتوں کا یہی دستور ہے کہ جہاں کہیں بیگانوں کو دیکھیں گی نقاب اُلٹ دیں گی اور جُونہی کوئی اپنا نظر آیا نقاب جھٹ سے نیچے آ رہی۔ یوں تو لاہور میں کئی قسم کے برقع نظر آتے ہیں مگر اُن میں سے بعض خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک وہ برقع ہے جو آپ کو بلدیہ کے باغات میں نظر آئے گا۔ آپ اس برقع کو کبھی "نقاب پوش" نہیں دیکھیں گے۔ ایک وہ برقع ہے جو صرف دُکاندار کے سامنے اُٹھایا جاتا ہے اگر آپ یا میں کوئی چیز خریدنے کے لئے اس دُکان پر کھڑے ہو جائیں تو برقع اُس طرف سے جس طرف آپ یا میں کھڑے ہیں اپنے چہرے کو نقاب کی آڑ میں چھپانے کی ناکام کوشش کرے گا — ہے اس سے یہ مُراد کہ ہم آشنا نہیں۔ ایک برقع وہ ہے جو آپ کو دیکھ دیکھ کر چھپنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک وہ جو آپ کو چھپ چھپ کر دیکھتا ہے۔ ایک برقع کی نقاب کچھ اس طرح گرائی جاتی ہے کہ وہ ہوا کے لطیف سے لطیف جھونکے سے اُٹھ اُٹھ جاتی ہے اور نقاب کی اوٹ میں سے چہرے کا ایک چوتھائی حصہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے برقع عام طور پر تانگے میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ایک برقع ایسا بھی ہے جس کا تعلق غروبِ آفتاب سے ہے۔ اُدھر سُورج نے مُنہ پر سیاہ نقاب ڈالی اور ادھر یہ بُرقع ظہور میں آیا۔ اور ایک برقع نصف شب کو جب آپ سینما دیکھنے کے بعد اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہے ہوں نظر پڑتا ہے۔ اور آخری برقع وہ ہے جو ایک عاشقِ نارسا کو اوڑھ کر چندیا کی تواضع کرانی پڑتی ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ لاہور میں لیڈروں کی بہتات ہے۔ ہر محلے میں ایک لیڈر رہتا ہے مگر اتنے لیڈر ہونے کے باوجود یہاں

کوئی لیڈر نہیں۔ جب آپ سیر کے لئے گھر سے نکلیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی باغ میں ایک "عظیم الشان" جلسہ ہو رہا ہے۔ سٹیج کے اردگرد کچھ ہونّق مُنہ کھولے بیٹھے ہیں اور لیڈر اسٹیج پر کھڑا سامعین کے سامنے بڑی دھُواں دھار تقریر کر رہا ہے۔

کئی دوستوں نے ہندوستان کے چپّے چپّے کی سیر کی ہے مگر جب لاہور پہنچے ہیں تو اُن کی زبان سے بیساختہ نکلا ہے "یار لاہور لاہور ہی ہے"۔ تحقیقات کرنے پر معلوم ہُوا ہے کہ فیشن اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے لاہور اوّل درجہ پر ہے۔ گو راقم الحروف کو اس امر سے کُلّی اتفاق نہیں۔ دولت، حسن اور فیشن دوسرے شہروں میں بھی موجود ہے۔ صبح بنارس اور شام اودھ اب تک مشہور ہے۔ کلکتہ اور بمبئی کے ساحلوں پر ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا میں رنگین آنچل اب تک اُڑ رہے ہیں۔ وہاں کی سیم تن اور مرمریں بدن عورتیں اِسی ہوا میں سانس لے رہی ہیں مگر سیر و سیاحت کرنے والے دوست اس امر پر مُصر ہیں کہ نہیں جو لاہور ہے وہ لاہور ہی ہے۔ جو پاٹی اور اپالو بندر پر حسن ہزار محوِ خرام ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں کے بعض بدن چاندی اور مرمر کے بنے ہوئے ہیں مگر لاہور کا حسن؛ ارے رے رے!!! یوں معلوم ہوتا ہے قلاقند کی بنی ہیں۔ یوں تو یہاں سُوٹ اور ساڑھی بہت ہی عام ہے۔ مگر گزشتہ چند برسوں سے سال کے آخری مہینوں میں سُوٹوں اور ساڑھیوں کی نمائش بڑے التزام سے منعقد کی جاتی ہے۔ نمائش میں ہندوستان بھر کے اچھے سے اچھے سُوٹ اور ساڑھیاں نمودار ہوتی ہیں۔ دُکانیں بھی لگتی ہیں مگر دکاندار سارا دن سوئے رہتے ہیں اور قرینے سے سجائی ہوئی چیزوں پر گرد پڑتی رہتی ہے۔

یہ سننے میں آیا ہے کہ اکثر ساڑھیوں کا لہجہ اچھا نہیں ہوتا بات کرتی ہیں تو کٹکن پھاڑتی ہیں۔ ایک واقعہ سنئے اور اندازہ کیجئے۔ مثلاً گزشتہ نمائش ہی کو لیجئے۔ شام ہو چکی ہے۔ بجلی کی تیز روشنی میں ہر طرف بچے، بوڑھے، مرد، عورتیں پھر رہے ہیں۔ کالج کے چند نوجوان بھی گھوم رہے ہیں۔ اُن کے عین قریب سے لڑکیوں کا ایک جھُرمٹ گزرتا ہے۔ گدرائے ہوئے سفید جسموں سے چمٹی ہوئی بیش قیمت ساڑھیاں اور بجلی کی تیز روشنی میں اُن کے مچلتے ہوئے رنگین پلّو اور تڑپتے ہوئے آتشیں آنچل نوجوانوں کے دلوں میں آگ لگا دیتے ہیں اور اُن کے قدم ساڑھیوں کے پیچھے پیچھے از خود اُٹھتے ہیں۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد ایک ساڑھی دوسری سے پُوچھتی ہے "اوہنیں کِتنے دَبے شال مارنی اے"

ایک لڑکا۔ "ارے لاحول۔ سارا رومان خراب ہو گیا۔ لعنت بھیجو یار"۔

دُوسرا ″ ۔ "یار قبر تو جیُو نے گچ کی تھی۔ مُردہ بے ایمان نکلا"

تیسرا ″ ۔ "ذرا ان کی ٹیپ ٹاپ دیکھو اور زبان ملاحظہ ہو۔ بجے کو وجے سبحان اللہ!"

چوتھا ″ ۔ "گنوار و زبان ہے۔ گاؤں کی ہیں شاید، مگر ساڑھیوں کی بندش تو دیکھو۔ آہا ہا!"

پہلا ″ ۔ "چلو کسی دوسری طرف چلیں۔ مجھے ان سے نفرت ہو گئی ہے۔ دُور کے ڈھول سُہانے ہُوا کرتے ہیں"۔

چوتھا ″ ۔ "میاں، مایا کے کھیل ہیں یہ۔ ساڑھیاں دیکھو سو سو روپے کی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پہلا ۔ "دولت اندھی ہوتی ہے واقعی"
تیسرا ۔ "اشتہائے حسن کتنی بڑی چیز ہے"۔
دوسرا ۔ "مگر کیا کریں۔ ہمارے اندر شیلے اور کیٹس ہے ۔ بائرن ہے"
راستہ بدلتے ہیں۔ ایک ساڑھی پیچھے دیکھ کر کہتی ہے ۔ "ہو گئے ہیں دفع ؟"
دوسری کہتی ہے "آئے سے بڑے پڑھے لکھے کہیں کے! خواہ ساری عمر میں ہزار روپے کا نوٹ بھی دیکھنا نصیب نہ ہو"۔
تیسری ساڑھی جو کم عمر کی ہے کہتی ہے "مایا مایا کہتے تھے بار بار"۔
چوتھی کہتی ہے "نظر لگ جائے انہیں آپ ۔ ہماری مایا وہ کیوں گننے لگے"۔
آپ حیران نہ ہوں ۔ یہ لاہور ہے ایسے واقعات لاہور میں ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ لاہور کو طالب علموں کا شہر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں سے ہر سال ہزارہا طلبہ کو گریجوایٹ بنا کر سرکاری ملازمت کی شان میں مدحیہ قصائد کہنے کے لئے مختلف شہروں میں بھیج دیا جاتا ہے ۔ یوں تو طلبہ اپنی خوش پوشی، البیلی طبیعت، فیشن پرستی اور رومانوی میلانِ طبع کے اعتبار سے ہزاروں میں چھپے نہیں رہتے مگر بعض لوگ انہیں خوب پہچان لیتے ہیں مثلاً اندھیرا ہو چکا ہے مگر لارنس گارڈن میں ابھی تک ساڑھیاں اور سُوٹ خراماں ہیں ۔ ایک ساڑھی اور ایک سُوٹ موٹر کار سے اُترتے ہیں اور سمٹتے سمٹاتے ایک سنسان پلاٹ کی طرف جاتے ہیں۔ پہلے پلاٹ میں سے جہاں ابھی کافی چہل پہل ہے دو نوجوان آنکھیں اُن کا تعاقب کرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ سوٹ ساڑھی کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ ڈال دیتا ہے اور دونوں کہیں اونچی اونچی سبز جھاڑیوں میں کھو جاتے ہیں ۔ دو نوجوان ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اُٹھتے ہیں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لارنس گارڈن کے اسی سنسان حصّہ کی طرف جاتے ہیں۔ چاند کی ناکافی روشنی میں دُور، بنچ پر ایک جوڑا بیٹھا ہُوا نظر آتا ہے ۔ ایک نوجوان دوسرے سے کہتا ہے "میرا خیال ہے وہی ہیں"۔
دوسرا کہتا ہے "ہاں ساڑھی تو وہی ہے ذرا پیچھے سے چلیں"۔
وُہ دونوں اپنا راستہ بدل کے بنچ کے پیچھے جو جھاڑیاں ہیں وہاں سے چھپ کر دیکھتے ہیں ۔ ساڑھی کا ہاتھ سُوٹ کے ہاتھ میں ہے ۔ سُوٹ کی عمر تیس سال سے زیادہ معلوم ہوتی ہے ۔
ساڑھی کہتی ہے "نو بج گئے ہوں گے؟"
سوٹ کلائی پر سے وقت دیکھ کر کہتا ہے "ابھی تو ساڑھے آٹھ بھی نہیں ہوئے ۔ تمہیں جلدی کیوں ہے آج؟"
ساڑھی ۔ "میرا جی گھبرا رہا ہے ۔ شاید آج فادر آ گئے ہوں"۔
سُوٹ ۔ "انہیں تو کل آنا ہے"۔

ساڑھی:۔ شاید آ گئے ہوں ۔جی یہی کہتا ہے ۔ اُٹھو چلیں۔

سوٹ اُس کا ہاتھ چوم کر کہتا ہے "نہیں پیاری شانتا میں نہیں جاؤں گا۔ ابھی تو آ کر بیٹھے ہیں"

اتنے میں جھاڑیوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوتی ہے اور دونوں لڑکے ظاہر ہوتے ہیں، ایک ذرا اُونچی آواز میں ترنم سے پڑھتا ہے "مجھ سے کہاں چھپیں گے وُہ ایسے کہاں کے ہیں۔ جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں"

ساڑھی اپنا ہاتھ کھینچتی ہے ۔سوٹ چھوڑ دیتا ہے ۔ لڑکے بنچ کے قریب ٹہلنے لگتے ہیں۔ ایک کہتا ہے "کتنی خوبصورت ہیں یہ راتیں"۔

دُوسرا۔" ہُوا کریں ہمیں کیا ۔ فریب زلیست سے قدرت کا مُدعا معلوم - یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے"

پہلا کہتا ہے " خاک گزرتی ہے رلے سے) سینہ خالی آنکھیں ویراں"

بنچ پر چند منٹ کبھی سوٹ ساڑھی سے کبھی ساڑھی سوٹ سے سرگوشیاں کرتی ہے ۔ نوجوان ٹہلتے رہتے ہیں ۔

ساڑھی آہستہ سے کہتی ہے " یہ تو نہیں جانے کے اب"

سُوٹ کہتا ہے " چلو کسی اَور جگہ چلیں"

ساڑھی اور سُوٹ اُٹھ کر باغ کے اُس سنسان حصّہ سے باہر نکلتے ہیں ۔ دونوں لڑکے سائے کی طرح پیچھے پیچھے ہیں ۔ ساڑھی اور سُوٹ کسی جگہ نہیں بیٹھ سکتے ۔ مجبوراً کار میں آ بیٹھتے ہیں اور کار پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔۔۔ عقبی فضا میں ایک آواز گونجتی ہے " سینہ خالی آنکھیں ویراں"۔

سوٹ مایوسانہ نظروں سے ساڑھی کی طرف دیکھ کر کہتا ہے" کم بختوں نے ایک بات بھی تو نہیں کرنے دی"

لڑکی پوچھتی ہے " کون تھے وہ ؛ بڑے دُکھڑے رو رہے تھے"

"ہوں گے کوئی سٹوڈنٹ"

یہاں کی چہل پہل اور جنرل مرچنٹوں کی فینسی اشیا رکی فروخت کا دارومدار بڑی حد تک طلبہ کی چہرہ افروزی پر ہے ۔ آپ کو یہاں جتنے " پری چہرہ لوگ " یا " حسینانِ بالجبر " نظر آئیں سمجھ لیجئے طلبہ ہیں ۔ اُن کا دل ہر حسینہ پر مچل جاتا ہے، خواہ وُہ فرنٹیئر میل ہی میں سوار ہو ۔ مثلاً دریائے راوی کے پُل پر سے ایک ریل گاڑی گزر رہی ہے نیچے سطح آب پر چند کشتیاں تیر رہی ہیں ۔ ایک میں ایک ہجوم پڑا ہے ایک کشتی کے لڑکے دُوسری کشتی والوں پر کیلے کے چھلکے پھینک رہے ہیں ۔ گاڑی فرّاٹے بھرتی گزرتی جا رہی ہے ۔ لڑکوں کی نظریں مسافروں سے چار ہوتی ہیں ۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ایک نیا بیاہا ہُوا جوڑا ایک ہی دریچہ میں سے نیچے جھانک رہا ہے لڑکوں کی نظریں اُن پر پڑتی ہیں وہ شور مچاتے ہیں ۔ ایک لڑکا اُن کو سنگترہ دکھا کر ترساتا ہے ۔ باقی لڑکے ہنستے ہیں ۔ سیکنڈ کلاس

کا درجہ اُن پر سے گزر جاتا ہے۔ کسی کشتی میں سے خالی ہاتھ ہوا میں گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کسی میں سے انگریزی ٹوپیاں سلام کرنے کے انداز میں ہل رہی ہیں۔ دریا پیچھے رہ گیا ہے۔ لڑکا اور لڑکی مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں لڑکی دوگی سے پوچھتی ہے" یہ کون تھے ؟؟؟" ـــــــ

" یہ تھے کالج کے بانکے پیاری۔ !!!"

آپ کالجوں کے ہوسٹلوں میں چلے جایئے۔ کئی نوجوان چھت پر کئی برآمدے میں بیٹھے مصروفِ مطالعہ نظر آئیں گے۔ کسی کے ہاتھ میں ورڈز ورتھ ہوگا کسی کے ہاتھ میں شیکسپیئر۔ مگر جب گنگنائیں گے تو کیا؛ "بن کی چڑیا بن میں بولے"۔ یا " دلدار کنداں والے دا ـــــــ دلدار"۔ ایک کمرے کا کواڑ کھلے گا اور ایک نوجوان سر پر تولیہ ڈالے ہاتھ میں صابن دانی پکڑے" اِک بنگلہ بنے گا نیارا" گاتا ہوا آپ کے پاس سے گزر جائے گا۔ آپ حیران نہ ہوں اِن ہوسٹلوں میں ایسے ہی عمیق اور پُرمعنی اشعار شبابی کیف میں مزے لے لے کر گائے جاتے ہیں یہاں تک کہ "چل چل چنبیلی باغ میں میوہ کھلائیں گے" بھی جھوم جھوم کر گایا جاتا ہے۔ بعض کالجوں میں مخلوط تعلیم بھی ہے۔ مگر وہاں کی طالبات مخلوط تعلیم حاصل کرتے ہوئے بھی جداگانہ تعلیم کی حامی ہیں کیونکہ انہیں اس امر کا یقین دلا دیا گیا ہے کہ طلبہ کے پاس بیٹھنے سے چھوت چھات کی بیماری لاحق ہونے کا سو فیصدی امکان ہے اس لئے وُہ قدرتی طور پر یوں رہتی ہیں جیسے بتیس دانتوں میں زبان۔

یہاں لاہور میں سنبھل کر چلیئے۔ ٹریفک بہت زیادہ ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ سڑکوں پر لاریاں رات دِن چلتی ہیں۔ بہت سے تجارت پیشہ لوگوں نے ریل سے مُنہ موڑ کر لاریوں میں سفر کرنا شروع کر دیا ہے کیونکہ لاریوں میں گھنٹوں کا سفر دنوں میں طے ہوتا ہے۔ یہاں کے لاری والے بڑے باذاق واقع ہوئے ہیں۔ ایک لاری ڈرائیور نے اپنی گاڑی پر لکھوا رکھا ہے:۔

ــــــ قدم رنجہ فرمایئے بے تکلف سرِ راہ آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں

اب آپ ہی کہئے کس بھلے مانس کا دل ریل میں سوار ہونے کو چاہے گا، جب ایک طرف یہ عجز ہو اور دوسری طرف وہ بے نیازی کہ ایک منٹ دیر سے جاؤ اور گاڑی آپ کا مُنہ چڑاتی ہوئی بھاگی جا رہی ہوگی۔ ایک لاری ہی پر موقوف نہیں اب جونئی لاری بھی اڈے میں آتی ہے اُس پر لاری والے کے ادبی مذاق کی مہر ثبت ہوتی ہے مثلاً ایک لاری پر لکھا ہے ؎

ــــ ہر صبح سفر ہر شام سفر اس دُنیا کا ہے کام سفر

جب یہ لدی پھندی لاری ہوا کو چیرتی ہوئی پاس سے گزر جاتی ہے اور آنکھیں اس شعر پر جا پڑتی ہیں تو آنکھوں کے سامنے ایک عجیب سا سماں کھنچ جاتا ہے اور اس شعر کی حقیقت آپ ہی آپ واضح ہو جاتی ہے۔ ایک اور متین طبیعت لاری ڈرائیور نے جس کے متعلق مجھے شک ہے کہ وُہ ریڈ کراس سوسائٹی کا رُکن ہے اپنی لاری پر مسافروں کو ایک مفید سبق دینے کی غرض سے یہ شعر لکھوا

رکھا ہے ــ "ہر بشر کو ہے یہ لازم صبر کرنا چاہئے ۔ جب کھڑی ہوجائے لاری تب اُترنا چاہئے"۔ آپ کو کئی لاریوں کی پیشانی پر "خدا حافظ" لکھا ہُوا نظر آئے گا۔ ایک ظریف ڈرائیور نے جس کی طبیعت بہت جدت پسند واقع ہوئی ہے اپنی لاری پر یہ عبارت لکھوا رکھی ہے "انسان کو مَوت سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہئے"۔ اس لاری میں سُنا ہے وہ لوگ سفر کرتے ہیں جو اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں مثلاً ہم ہوئے، تُم ہوئے کہ میر ہوئے۔

کچھ دن ہوئے میری نظر سے ایک لاری ٹرک گزرا۔ یہی ٹرک جس میں بھٹے سے اینٹیں اور سیمنٹ لاد کر ادھر اُدھر پہنچایا جاتا ہے، اُس پر ایک ایسی عبارت جلی حروف میں لکھی تھی جسے پڑھ کر آپ ہنس پڑتے یا رو دیتے یعنی "غریب عاشق دا گڈ"۔ کتنی معنی خیز عبارت ہے۔

کئی دُکانداروں نے اپنی دُکانوں پر اپنے نام کے آگے "دی ہٹی" لکھوا رکھا ہے مثلاً "کپور دی ہٹی"۔ "بھلے دی ہٹی" یہ "دی ہٹی" میں جو "دی" ہے اُسے انگریزی کی THE نہ سمجھئے۔ ایک شخص نے جسے تذکیر و تانیث کا مرض لاحق ہے اپنی دُکان کے بورڈ پر لکھوا رکھا ہے "سبحان دا ہٹ"۔ یعنی "ہٹی کا گھروالا!" ہٹ بڑی دُکان کو کہتے ہیں۔

آل انڈیا نمائش میں ایک دُکاندار نے اپنی دُکان پر لکھوا رکھا تھا "غریب دی ہٹی"۔ اُس کے پاس صرف کھجور کی بُنی ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں اور پٹاریاں تھیں۔ سُننے میں آیا ہے کہ تقریباً ہر عورت نے اس سے کم از کم ایک ٹوکری ضرور خریدی تھی۔ اکثر عورتیں اس کے عجز و انکسار میں ڈوبے ہوئے بورڈ کے الفاظ پڑھ کر اس کی دُکان پر ضرور جاتی تھیں۔ اسی طرح یہاں کئی پھیری والے اس قسم کی جاذبِ توجہ صدا لگاتے ہیں کہ انسان کا دل خواہ مخواہ کھنچا جاتا ہے۔ سردیوں کی راتوں میں چراغ جلنے کے بعد گلی کوچوں میں ایک شخص گیس کی بتی جلائے لہک لہک کر سوہن حلوہ بیچتا پھرتا ہے۔ اُس کی آواز میں ایسا لوچ ہے کہ دل کے پار ہوجاتی ہے اور وہ رُک رُک کر کچھ اس طرح کہتا ہے "سوہنے حلوہ ـــ کھان والیو" ایک اور شخص میکلوڈ روڈ پر کبھی کبھی ملتا ہے۔ اُونچی آواز میں پکارتا ہے "ریوڑی ریوڑی میں گلاب"۔ وُہ کچھ اس مزے سے لہکتا ہے کہ بے ضرورت خرید لینے کو جی چاہتا ہے۔ پربھات ٹاکیز کے سامنے شام کے وقت ایک کبابی بیٹھتا ہے، دِلّی کا معلوم ہوتا ہے، آواز اُس نے بھی خُوب پائی ہے۔ جب وُہ بلند آواز میں کہتا ہے "یاد کروگے میرے کبابوں کو بھائی" تو مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ان رسیلی آوازوں کے علاوہ یہاں ایسی آوازیں بھی ہیں جن کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ راشد الخیری مرحوم تو "چاندنی چوک کا جنازہ" اُٹھنے کے بعد دہلی میں یہ آوازیں سُن کر "بینگن لے لو بینگن" یا "فالسے ہیں جی فالسے" گھبرا گئے تھے، وہ اگر آج لاہور کی آوازیں سنتے تو مجھے یقین ہے کانوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھے دہلی کو بھاگتے۔ مثلاً ایک کنجڑا ٹوکرے میں مختلف پھل رکھے بازاروں اور محلّوں میں یہ آواز لگاتا ہُوا پھر رہا ہے "سفری امرود، شربتی انار، کچی گری زیل" یہ الفاظ بجائے خود اتنے بُرے نہیں مگر اس لہجے میں ادا کئے جاتے ہیں کہ کانوں کو بھلے معلوم نہیں ہوتے۔ کنجڑا اپنے مال کی تعریف اور تفصیل مختصر الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ یعنی سفر کر جانے والے امرود، شربتی انار اور کچے ناریل کی گری

ایک شخص کسی پھل والے سے بچا کھچا گلا سڑا اسردہ ٹوکرے میں رکھ کر محلوں میں پکارتا پھرتا ہے "لے کابل دا میوہ"۔ کوئی اَور اُسی کابُلی بند ایک غلیظ سے خوانچے میں نکمی سی کھجوریں ڈالے جن کا اصلی رنگ مکھیوں کی زیادتی سے نظر نہیں آتا، پکارتا ہے "لے بصرے دے چھوہارے" اور سنئے ایک سبزی فروش بڑے سے ٹوکرے میں یہاں لاہور ہی کی گلی سڑی بدبُودار پیاز ڈال کر اپنی خاص لَے میں الاپ رہا ہے "لے کراچی دا پیاز"۔ قصہ مختصر یہ کہ" یہ لاہور ہے "ٹھگوں کی ایک بہت بڑی بستی ہے جہاں بہت دُور دُور سے قسم قسم کے ٹھگ اپنا اپنا بازار گرم کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اب آپ دیکھئے چند لڑکوں کی ایک قطار جا رہی ہے۔ ہاتھوں میں سر سے اونچا اشتہار ہے۔ سر پر میلی کچیلی گاندھی ٹوپیاں اور ٹانگوں میں نیلے اور سفید رنگ کے سخروں جیسے پاجامے اور سب کی زبان پر ترنم کے ساتھ اس مصرعے کی تکرار" مدراس کی بیڑی پیا کرو۔ پیسے کی چھ لیا کرو۔"

قصہ مختصر لاہور کے پھیری والے بہت چاق چوبند واقع ہوئے ہیں۔ اتنے چُست مشقت پسند اور آرام دشمن کہ موسم گرما میں لاہور کی چلچلاتی دُھوپ اور آتش بار گرمی میں مجال ہے جو اُن کی آنکھ لگے یا کسی کی لگنے دیں۔ اگر آپ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹ کر آرام کرنا چاہیں اور آپ کی آنکھ لگ جائے تو فوراً تین شخص اُونچی اُونچی دھوتیاں اور لمبے لمبے ململ کے مَیلے کُرتے پہنے ایک چھوٹی سی ہتھ گاڑی پر لکڑی کا ایک بکس رکھے آپ کی کھڑکی کے عین نیچے آکھڑے ہوں گے۔ اور تینوں کے تینوں ایک بلند سمع خراش آواز میں ایک مختصر سی" میٹھی" لوری الاپنی شروع کر دیں گے" ملائی والی اے --- کھوئے والی اے --- بمبئی والی اسے"۔

یہ لاہور ہے!

آغا بابر بٹالوی

حاصلِ مطالعہ

تنازع للبقا کا فلسفہ ایک شیطانی تحفہ ہے، جو یورپ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔ میں الحمدللہ اس دعوت کو رد کر چکا ہوں۔ میرا فلسفہ تنازع للبقا کا نہیں تعاون للبقا کا ہے۔ اجزائے فطرت باہم جنگ و جدل میں نہیں، ایک دوسرے کی اعانت میں مشغول ہیں۔ ڈارون، اسپنسر کے فلسفے نے برسوں مجھے افتراق، بیگانگی، مغائرت، تنازع کا سبق پڑھایا۔ جب رومی قدس سرہٗ کی خانقاہ میں پہنچا تو ذرّے ذرّے سے وصال، یگانگت، وحدت، تعاون کے پیام سُن رہا ہوں ......

(عبدالماجد بی۔ اے)

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف (اقبال)

راحل

واردات

حُسن کو جب مائلِ لُطف و کرم پاتا ہوں مَیں
ساری دُنیا پر محبّت بن کے چھا جاتا ہوں مَیں

وجد میں ہیں اہلِ عالم، دم بخود ہے کائنات
شوق کے نغمے کچھ اس انداز سے گاتا ہوں مَیں

جب کوئی تسکین کی صُورت نظر آتی نہیں
یادِ ماضی سے دِلِ محزوں کو بہلاتا ہوں مَیں

کر کے روشن پھر کسی کے عشق کی چنگاریاں
اپنے سینے کی پُرانی آگ بھڑکاتا ہوں مَیں

شہر سے کچھ دُور، اِک بستی کی جانب بار بار
کیا بتاؤں کس لئے آتا ہوں میں جاتا ہوں مَیں

بے خبر ہو کر زمانے کے فراز و پست سے
ایک ہی دُھن میں کسی جانب چلا جاتا ہوں مَیں

مَیں تصوّر میں ترے سرشار رہتا ہوں مدام
تجھ کو بھی لیکن کبھی بھولے سے یاد آتا ہوں مَیں

جب شبِ غم کی سیاہی حد سے بڑھ جانے لگے
تجھ کو بزمِ کہکشاں سے ڈھونڈ کر لاتا ہوں مَیں

شب کے سنّاٹے میں یہ کون آ رہا ہے میرے پاس
اَے تصوّر! کس کو اپنے روبرو پاتا ہوں مَیں

تیرے جاتے ہی مرا صبر و سکوں رخصت ہوا
تیرے ہی دردِ محبّت کی قسم کھاتا ہوں مَیں

آفتابِ صبحگاہی سر پہ آ پہنچا حمید
مَیں ابھی سوتا ہوں، ایسا نیند کا ماتا ہوں مَیں

حمید
(ایم اے، علیگ)

سنگریزہ

خودرو گھاس میں جو سڑک کے کنارے دُور تک چلی گئی تھی ایک چھوٹا سا سیاہی مائل گول سنگریزہ پڑا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اُسے کون وہاں چھوڑ گیا ہے کیونکہ وہ ایک اس قدر حقیر شے تھی کہ کوئی شخص بھی اُس کے متعلق اِس قسم کی باتیں سوچنے میں اپنا وقت صرف کر سکتا تھا۔ لوگ اُس سڑک پر سے اکثر گزرتے اور اُن میں سے بعض کبھی کبھی اس پر بھی یونہی ایک آدھ نظر ڈال لیتے اور بس۔ اور اس کے سوا وہ اَور کر ہی کیا سکتے تھے؟

اس طرح وہ بے چارہ ننھا سا سنگریزہ مدت تک تنہا اُسی جگہ پڑا رہا۔ بارشیں اور آندھیاں بھی اُسے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں ہاں اُس پر ہر روز گرد کی ایک نہایت باریک تہ ضرور چڑھ جاتی جو یا تو صبح ہی صبح خاکروب کے جھاڑو دینے سے اُڑا کرتی یا جسے کوئی تیز رفتار موٹر اپنے پیچھے چھوڑتی گزر جاتی۔ اب وہ گرد سے بالکل اَٹ گیا تھا اور لوگوں کی نگاہوں سے بالکل پوشیدہ ہو چلا تھا کہ ایک دن سہ پہر کے وقت بڑے زور کی بارش ہوئی، جس سے پھول پتوں اور گھاس کا تمام غبار دُھل گیا اور ان کے ساتھ ہی وہ سنگریزہ بھی دُھل کر پھر زیادہ نمایاں ہو گیا۔ سبز سبز گھاس میں سے اُس کا سیاہی مائل رنگ جسے بارش کی نمی نے اَور بھی زیادہ گہرا کر دیا تھا بہت بھلا لگتا تھا۔ لیکن اُس کو کوئی بھی نہ سراہ سکتا تھا کیونکہ لوگوں کے نزدیک تو وہ ایک بےحقیقت شے تھی اور سبز گھاس جس کے آغوش میں وہ مدت سے پڑا تھا ویسی ہی خاموش تھی جیسی کہ وہ ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔

بارش تھم چکی تھی اور اب لوگ باہر سیر کے لئے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا پاس کی ایک کوٹھی سے دوڑتا ہوا نکلا آگے آگے اُس کا کتا تھا اور پیچھے پیچھے وہ بین کی ایک سیٹی زور زور سے بجاتا ہوا آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بچپن کی مسرت سے چمک رہا تھا اور اُس کا کتا بھی کچھ کم مسرور نہ تھا۔ بچہ تو اس لئے خوش تھا کہ وہ ابھی ایک بچہ تھا اُس کی عمر دس برس کے قریب ہو گی۔ اور کتا اس لئے خوش تھا کہ اُسے کافی عرصے کے بعد بھاری زنجیر سے چھٹکارا ملا تھا۔ وہ زبان باہر نکالے ہر شے کو بے پروائی سے دیکھتا یا سونگھتا ہوا جا رہا تھا۔ اُس کا رنگ بھورا اور بال لمبے لمبے تھے اور اُس کی ملائم بالوں کی دُم خوب پھولی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ پیچھے مڑ کر اپنے ننھے مالک کو بھی دیکھ لیتا تھا اور پھر دوڑتا ہوا کبھی سڑک کے اِس کنارے کی طرف جاتا اور کبھی اُس کنارے کی طرف۔ وہ لڑکے سے کافی آگے نکل چکا تھا۔ باغ کی سبز گھاس پر لیٹنے کا خوشگوار تصور اُسے کشاں کشاں منزلِ مقصود کی طرف لئے جا رہا تھا۔ لیکن لڑکا آہستہ آہستہ آ رہا تھا کیونکہ سڑک پر ابھی تک جگہ جگہ بارش کا تھوڑا بہت پانی کھڑا تھا جو اُس کے تیز دوڑنے میں حائل تھا۔

اُس نے اپنے کتے کو آواز دی "ٹیگر! ٹیگر! ذرا ٹھہرو میں اپنے بوٹ کا تسمہ باندھ لوں!"

کتے نے فوراً مڑ کر اپنے مالک کی طرف دیکھا اور پھر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اُس کی باہر نکلی ہوئی زبان سے لعابِ دہن کے دو تین قطرے ٹپکے اور اُس نے اپنا منہ سڑک کے کنارے اُگی ہوئی گھاس میں ڈال دیا۔ لڑکا تھوڑی دیر کے لئے اپنے بوٹ کا تسمہ باندھنے کے لئے رُکا۔ اور پھر دفعتہ اُس نے اپنے سامنے گھاس میں پڑے ہوئے سیاہی مائل بھوری کے گول سنگریزے کو دیکھ لیا۔ فوراً ہی اُس کے دل میں اُس کو اٹھا لینے کا خیال آیا، اور

دوسرے لمحے میں وہ پتھر اُس کے کوٹ کی جیب میں تھا۔ اُس نے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے دل میں کہا" میں یہ سنگریزہ نینی کو دکھاؤں گا، وہ کتنی خوش ہوگی جب وُہ اس چھوٹے سے خوبصورت پتھر کو دیکھے گی لیکن میں اُسے یہ کبھی نہ دُوں گا۔

یہ سوچ کر وہ آگے چل پڑا۔ شام کے وقت جب وہ سیر سے واپس آکر اپنے گھر والوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو اُسے اچانک اُس پتھر کا خیال آگیا۔ چنانچہ اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے باہر نکال لیا اور پھر اپنی بہن نینی کو دکھایا۔ نینی اپنے بھائی سے دو برس چھوٹی تھی اور بڑی خوبصورت بچی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بچپن کی شرارت آمیز معصومیت جھانکتی تھی اور اسی وجہ سے گھر کے لوگ اُسے پیار سے نینی نینی کہا کرتے تھے۔

ننھی نینی کا دِل اُس سنگریزے کو حاصل کرنے کے لئے للچایا اور اُس نے اپنے بھائی سے مانگا بھی لیکن بھائی نے آہستہ سے کہا" نینی یہ نہیں ہو سکتا میں تمہیں یہ کبھی نہ دُوں گا۔"

نینی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر اُس سے کہنے لگی" میرے پاس اس سے بھی اچھی اچھی کئی چیزیں ہیں۔" اور اُس نے اُن چیزوں کا ایک ایک کرکے نام لیا۔ اُس کے بھائی نے جواب دیا" سنو نینی یہ پتھر میں نے سڑک کے کنارے گھاس میں پڑا ہُوا پایا تھا، آہ! ذرا سوچو تو سہی اگر میں اُسے نہ اُٹھاتا تو اُسے کوئی اور لے جاتا۔"

اُسے بالکل معلوم نہ تھا کہ اس سنگریزے کو کوئی بھی نہ اُٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگوں کے لئے ایک بالکل نکمی شے تھی اور اُن چیزوں میں سے تھا جو اپنے ڈھیر سے علیحدہ ہوکر کسی قدر و قیمت کی مستحق نہیں رہتیں۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک وہ دونوں بہن بھائی اسی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ لڑکے نے نینی کو بتایا کہ میں اور لیگر دونوں آج باغ میں اس سے کھیلتے رہے ہیں۔ میں اس پتھر کو زور سے پھینکتا تھا اور لیگر دوڑ کر اُس کو گھاس میں سے دوبارہ تلاش کرکے لے آتا تھا اور اس طرح ہم بہت عرصہ کھیلتے رہے۔ اِن باتوں کو سُن سُن کر ننھی نینی کا دل بہت چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ بھی اس پتھر سے کھیلے اور جب اُس نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے بھائی سے کیا تو اُس نے کہا" اچھا کل دوبارہ میں اور لیگر اس سے پھر کھیلیں گے تم ہمارا کھیل دیکھنا۔" نہ جانے ان کی باتوں کا سلسلہ کب تک جاری رہتا اگر نوکر کمرے میں آکر اُن کو سونے کے لئے نہ کہتا۔ وُہ دونوں اُس سنگریزے سے کھیلنے کے نئے نئے منصوبے باندھتے ہوئے اپنے اپنے بستروں میں جا لیٹے اور جلد ہی نیند نے اُن کو آغوش میں لے لیا۔

ابھی اُن کو سوئے ہوئے آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ اُن کا باپ اُن کے کمرے میں داخل ہُوا، وُہ لڑکے کے کوٹ کی جو کھونٹی سے لٹک رہا تھا تلاشی لینے کے لئے آیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی کسی کھوئی ہوئی شے کی جستجو میں تھا۔ اُس نے سوتے ہوئے بچوں پر ایک پیار کی نگاہ ڈالی اور پھر کوٹ کی تلاشی لینے لگا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور اُن کی ماں یہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہر کھوئی ہوئی شے اسی شریر کی جیب سے نکلتی ہے۔ شاید وہ بھی اس کی جیب میں ہو۔" پھر اُس نے اپنے شوہر کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا جو ابھی تک کوٹ کی تلاشی لینے میں مصروف تھا۔ تلاشی لیتے لیتے یکایک اُس کے ہاتھ میں وہی سنگریزہ آگیا۔ اُس نے اُس کو ایک لمحہ غور سے دیکھا اور پھر بے پروائی سے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

م مبین الرحمٰن خاں

حسرتِ کشمیر

بہارِ جنّت الفردوس کی تصویر دیکھیں گے
بشرطِ زندگی ہم ایک دن کشمیر دیکھیں گے

وہ شعر و نغمہ و اُلفت کا وجد انگیز گہوارہ
جہاں ہم حُسن کو اُلفت کا دامنگیر دیکھیں گے

جھلائیں گے دلِ محزوں کو جھولا عیش و راحت کا
شبِ مہتاب میں چمکی ہوئی تقدیر دیکھیں گے

سُنی ہے آج تک کانوں نے شہرت حسن کے جلووں کی
نگاہِ شوق سے وہ حُسنِ عالمگیر دیکھیں گے

مرے خوابِ جوانی میں جو اکثر جھلملایا ہے
کسی دن تاجور وہ پیکرِ تنویر دیکھیں گے

تاجور سامری

محفلِ ادب

جہاں میں تھا

شب آغوشِ چمن میں صبح خنداں تھی، جہاں میں تھا
ہوائے سرد، موجِ آبِ حیواں تھی، جہاں میں تھا

زمیں کے چہرۂ رنگیں سے ایسی لَو نکلتی تھی
فلک کی شمع، رہنِ طاقِ نسیاں تھی، جہاں میں تھا

چمن کے صحنِ رنگیں پر، حقائق یوں برستے تھے
لبِ ہر برگ پر تفسیرِ قرآں تھی، جہاں میں تھا

سحر تک شمعِ کافوری کے غم رفتار اشکوں میں
تبسم ریز روحِ شبنمستاں تھی، جہاں میں تھا

فرازِ ذہن کے رومان پرور ابر پاروں میں
نظر افروز برقِ روئے تاباں تھی، جہاں میں تھا

شعاعِ عارضِ افسانۂ روئے مجازی سے
حقیقت مضطر و سر در گریباں تھی، جہاں میں تھا

صنم بر دوش و کفر انگیز محرابِ کلیسا میں
حرم کی شمعِ ایمانی فروزاں تھی، جہاں میں تھا

حقائق کے معطر جامعِ اضداد بستر پر
بہم خوابیدہ روحِ کفر و ایماں تھی، جہاں میں تھا

سرشتِ آدم و ابلیس تھی یوں محوِ سرگوشی
خجل آویزشِ یزدان و شیطاں تھی، جہاں میں تھا

چمن کے سر دو آوارہ خس و خاشاک کے اندر
جہندہ نبضِ رعد و برق و باراں تھی، جہاں میں تھا

ستارے نقش بر دیوار تھے، مہتاب سکتے میں
مشیت گوش بر آوازِ رنداں تھی، جہاں میں تھا

سرشکِ گریۂ پنہاں کی ظلمت خیز تابش میں
نگارِ خندۂ عشرت غزلخواں تھی، جہاں میں تھا

عروسِ وقت کی خواب آفریں آسودہ گامی سے
سبک رفتار نبضِ چرخِ گرداں تھی، جہاں میں تھا

کبھی چہرے چمکتے تھے کبھی زلفیں بکھرتی تھیں
حقیقت نیم پیدا نیم پنہاں تھی، جہاں میں تھا

کسی چشمِ سیہ کے بزم آرا مست پرتو سے
ہر اک ذرے میں اک روحِ شبستاں تھی، جہاں میں تھا

مہکتے مسکراتے نیم وا غنچوں کے جھرمٹ میں
جوانی کی سکر خوابی پر افشاں تھی، جہاں میں تھا

قریبِ آبِ جو میدان کے دھندلے کناروں پر
محبت کاکلیں کھولے خراماں تھی، جہاں میں تھا

ملایک ہی نہ تھے سجدے میں پیشِ آدمِ خاکی
الوہیت بھی زیرِ دامِ انساں تھی، جہاں میں تھا

"کلیم"

([illegible] ملیح آبادی)

ایڈیٹر

میں نے ایک زراعتی اخبار کی عارضی طور پر ایڈیٹری منظور کر لی۔ میری حالت اس وقت بالکل ویسی تھی جیسی اُس شخص کی ہو سکتی تھی جو زندگی بھر کشتی میں نہ بیٹھا ہو اور اچانک اُسے جہاز کا ناخدا بنا دیا جائے۔ لیکن میں مجبور تھا۔ سخت تنگی میں تھا۔ بے روزگار تھا۔ معقول تنخواہ سامنے تھی۔ مجھے خدمت قبول کر لینا پڑی۔ اصلی ایڈیٹر کو تبدیل آب وہوا کے لئے جانا تھا اس نے مجھ سے درخواست کی کہ واپسی تک اُس کی جگہ پر کام کروں۔ میں نے کسی قدر کانپتی ہوئی آواز میں کہا "بہتر"۔

مدت سے میں بیکار تھا۔ اس لئے کام میں ایک خاص مسرت محسوس ہوئی۔ بڑی ہی چُستی و چالاکی، بیدار مغزی اور ہمت سے میں نے قلم اُٹھایا اور اخبار لکھ ڈالا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب مجھے اپنی تحریر کا نتیجہ معلوم کرنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پبلک میرے پُرمغز اور بلیغ مضامین پر ضرور عش عش کر رہی ہوگی۔ ہر کوئی میری تعریف میں رطب اللسان ہوگا۔

ایک دن میں مغرب کے قریب دفتر سے اُتر رہا تھا سیڑھیوں پر مجھے آدمیوں کی ایک بھیڑ دکھائی دی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لوگ دائیں بائیں ہو گئے اور راستہ صاف کر دیا۔ میرے لبوں پر خفیف سا تبسم تھا۔ نگاہیں نیچی کئے اُترا چلا گیا۔ میرے آگے بڑھتے ہی بھیڑ میں سے ایک آواز سنائی دی "یہی صاحب ہیں!" اس ریمارک پر میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ رات بھر میں انتہائی خوشی کے ساتھ اس جملے کے معانی پر غور کرتا رہا۔

دوسرے دن جب میں دفتر پہنچا تو کل سے بھی زیادہ بھیڑ نظر آئی۔ ہر طرف ہجوم تھا۔ جوق جوق آدمی کھڑے تھے۔ کچھ سڑک پر کچھ دروازے پر کچھ سیڑھیوں پر۔ سب کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ ہر کوئی اشارے کرتا تھا۔ میرے پہنچتے ہی ان میں کھلبلی پڑ گئی۔ فوراً راستہ صاف ہو گیا۔ میں فخر سے پھولا ہوا مضبوط قدموں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اتنے میں ایک آواز میرے کان میں آئی "یہی صاحب ہیں! تم نے صورت دیکھی؟" میں اُسی انداز سے بدستور چڑھتا رہا۔ گویا میں نے کچھ سُنا ہی نہیں، لیکن اس صدا نے میرے دل کی عجیب حالت کر دی تھی۔ مارے خوشی کے جامے سے باہر ہوا جاتا تھا۔ اُسی وقت میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنی بوڑھی پھوپھی کو آج ہی خط لکھوں گا اور اپنی شاندار کامیابی کی پُر فخر و مباہات سے اطلاع دوں گا۔ اس خیال سے مجھے دوگنی مسرت تھی کہ میری پھوپھی اپنے حلقے میں بیٹھ کر میرا ذکر کرے گی اور سب کو بتلائے گی میری تحریریں کس درجہ مقبولِ عام و خاص ہوتی ہیں اور قوم میں میری کس طرح شہرت پھیل رہی ہے۔

جونہی میں بالائی منزل پر پہنچا، بلند قہقہوں کی آواز سُنی۔ دفتر کے کمرے میں داخل ہوا تو دو شخص اندر سے ہنستے نکلے اور تیزی سے بھاگ گئے۔ مجھے تعجب ہوا، لیکن فرطِ مسرت سے میرا دماغ اس قابل نہیں رہا تھا کہ ان لوگوں کی حرکت پر غور کرتا۔ میں خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹیک لگا کر دم لینے لگا۔

مشکل سے ایک یا دو منٹ اُدھر گزرے ہوں گے کہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ قیمتی پوشاک پہنے تھا۔ گھنی داڑھی مُنہ پر تھی بال

سفید تھے۔ میں نے اُسے بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ بالکل چُپ تھا اُس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ہمت نہیں پڑتی۔ میں نے خیال کیا غریب مجھ سے مرعوب ہے۔ ڈرتا ہے کہ اتنے بڑے ایڈیٹر سے کیسے باتیں کرے؟

دیر کے بعد اُس نے اپنی ٹوپی اُتار کر زمین پر ڈال دی۔ ٹوپی کے اندر سے رُومال نکالا اور پیشانی پر سے پسینہ پونچھا۔ پھر اپنے گنجے سر پر اُسے زور سے رگڑا اور پہلو بدل کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے دیکھا اُس نے وُہی اخبار نکالا ہے جس کا میں عارضی ایڈیٹر مقرر ہُوا تھا۔ پھر اُس نے اخبار اپنی رانوں پر کھول کے بچھا لیا اور رومال کے کونے سے عینک صاف کرنے لگا۔

"جناب ہی نئے ایڈیٹر ہیں؟" اُس نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔

"جی ہاں!" مَیں نے ایک حد تک نمایاں افتخار سے جواب دیا۔

"اب سے پہلے بھی آپ کو زراعتی اخبار یا رسالہ لکھنے کا اتفاق ہُوا ہے؟" اُس نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں" مَیں نے جواب دیا "یہ پہلا موقع ہے کہ ایک زراعتی اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دینے پر مجبور ہُوا ہوں"۔

"یہی میرا بھی خیال تھا" اُس نے غور سے مجھے دیکھ کر کہا "کیا جناب کو زراعت کے فن میں کوئی عملی تجربہ ہے؟"

"غالباً نہیں" میں نے سادگی سے کہا۔

"میں نے یہی خیال کیا تھا" اُس نے عینک آنکھوں پر رکھتے ہُوئے کہا۔ پھر عینک کے اُوپر سے مجھے متعجبانہ مگر تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا "مَیں آپ کو ایک عجیب چیز سُنانے آیا ہوں۔ کیا یہ تحریر آپ ہی نے لکھی ہے؟"

یہ کہہ کر اُس نے اخبار میں سے حسبِ ذیل عبارت پڑھی:۔

"گاجر کو اُس کی شاخیں پکڑ کر نہیں اُکھاڑنا چاہئے، بلکہ کسی آدمی کو درخت پر چڑھا دینا چاہئے کہ شاخیں ہلا دے۔ اِس طرح گاجریں خود بخود گر پڑیں گی"۔

اتنا پڑھ کر وُہ چُپ ہُوا اور عینک کے اُوپر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"جناب! کچھ دیر کے بعد اُس نے کہا "آپ اس عبارت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ ضرور یہ پُرمغز تحریر آپ ہی کے قلم سے نکلی ہو گی"۔

"ہاں" مَیں نے کسی قدر غصّے سے کہا "آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس میں رائے پُوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ عبارت نہایت بامعنی اور معقول ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سالانہ لاکھوں گاجروں کی بربادی صرف اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ شاخیں پکڑ کر انہیں اُکھاڑ لیا جاتا ہے حالانکہ اگر ہم اس طریقے کو چھوڑ دیں اور درخت پر آدمی چڑھا کر اُس کی شاخیں ہلوائیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"سبحان اللہ ہلوائیں!" وہ میرا قطع کلام کر کے چلایا۔

"خدا آپ پر رحم کرے، کیا گاجر کوئی تناور درخت ہے؟" میں نے نرمی کے ساتھ جواب دیا "حضرت، یہ صرف ایک استعارہ ہے آپ،

تشبیہ اور کنایہ کی اصطلاحوں سے ناواقف ہیں۔ جس آدمی کے سر میں عقل کا ایک ذرہ بھی موجود ہے وہ عبارت پڑھتے ہی سمجھ جائے گا کہ شاخیں ہلانے سے مقصد دگا جڑ کی جڑ آہستہ سے ہلا کر نکال لینا ہے۔"

یہ سنتے ہی آدمی غصہ سے بے خود ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اخبار پھاڑ کر زمین پر دے مارا اور یہ کہتا چلا گیا "خدا تمہاری جڑ ہلا ڈالے! احمق، کندۂ ناتراش!"

اس عجیب انسان سے چھٹکارا ملا ہی تھا کہ دروازے پر ایک اور انوکھی مخلوق نظر آئی۔ ایک لمبا دُبلا پتلا آدمی کھڑا تھا ایسا دُبلا تھا کہ ہڈیوں کا ڈھانچا معلوم ہوتا ہے، برہنہ سر، بال اُلجھے ہوئے، گویا ابھی جنگل سے لایا گیا ہے۔ پھر اس میں جنبش ہوئی اور دیوانہ وار کمرے میں گھُس آیا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ دانتوں میں اُنگلی دبا کر، سر جھکا کر، کمر خم کر کے اِس طرح میرے سامنے ایستادہ ہو گیا گویا کوئی سحر یا راز سُننا یا سُنانا چاہتا ہے۔ دیر تک چُپ کھڑا رہا۔ پھر سر اُٹھایا۔ خوفناک نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ چند انچ اور آگے بڑھا اور جیب سے وہی پیرے والا اخبار باہر نکالا۔ میں متحیّر تھا کہ الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؛ بلکہ سچ پوچھئے تو اس شخص کی صُورت نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔

"تم ہی نے یہ لکھا ہے؟" اُس نے دیوانوں کی سی آواز میں کہا "یہ مجھے پڑھ کر سناؤ، جلدی کرو، جلدی کرو، ہاں ہاں، پڑھو، پڑھو۔ قریب ہے میں گر پڑوں گا، میرا دماغ پھٹا جاتا ہے، جلدی کرو، جلدی کرو۔"

مَیں گھبرا گیا۔ جلدی سے اخبار اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور جس عبارت کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا اُسے پڑھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہر جملے پر اُس کا چہرہ روشن ہوتا جاتا ہے۔ ایک عجیب فرحت اس پر طاری ہوتی جاتی ہے۔ عبارت یہ تھی :-

"۔ ۔ ۔ کدو کا درخت شہ تُوت کے مشابہ ہوتا ہے۔ دیہات کے باشندے اس کے پھل اُبال کر اور پیس کر اپنی روغنی ڈبیوں میں بھرتے اور کھاتے ہیں۔ شہری باشندے اپنے مویشیوں کو اس کے پھل کھلاتے ہیں۔ کدو کے پھل کھانے سے گائے بھینس کا دُودھ زیادہ اور گاڑھا ہو جاتا ہے۔ قدیم زمانے سے دستور چلا آ رہا ہے کہ کدو کا درخت، گھر کے پچھواڑے نصب کرتے ہیں کیونکہ یہ درخت نہایت گھنا، تناور اور سایہ دار ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں یہاں تک پڑھنے پایا تھا کہ وہ شخص دیوانہ وار لپکا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہت زور سے مصافحہ کیا۔

"بس بس،" اُس نے چلا کر کہا "اب مجھے یقین آ گیا کہ الحمد للہ میرا دماغ درست ہے۔ میں پاگل نہیں ہُوا ہوں کیونکہ تم نے بھی یہ عبارت بالکل اُسی طرح پڑھی جس طرح میں نے صبح مجھے اپنی عقل پر شُبہ ہو گیا تھا۔ فرطِ اضطراب سے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میرے گھر والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ دیوانہ ہو گیا ہوں اس لئے وہ میری حرکات و سکنات کی نگرانی کرنے لگے تھے۔ لیکن میں گھر سے بھاگ نکلا اور سڑک پر کھڑے ہو کر پھر یہ عبارت پڑھی۔ میرا جوش اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ میں بے تحاشا دوڑنے لگا۔ کئی آدمی ٹکر کھا کر گر پڑے اور کئی آدمیوں کو میں نے بدحواسی میں مارا پیٹا بھی، خدا کا ہزار ہزار شکر کہ میرے ہاتھ سے کوئی قتل نہیں ہو گیا۔ میرا شکریہ قبول کیجئے۔ جزاک اللہ۔ آپ نے بھی وُہی پڑھ دیا جو میں نے پڑھا تھا، میرے سر سے ایک بڑی بلا ٹل گئی۔ اچھا خدا حافظ!"

میں مبہوت ہوکر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس دیوانے کے سیڑھیوں سے اُترنے کی کھٹ پٹ سُن رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا جنون یہاں آتے آتے ذرا کم ہوگیا تھا، ورنہ نہیں معلوم میری کیا حالت کر دیتا! یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خلافِ توقع اصلی ایڈیٹر کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ نہایت اُداس، پیشانی پر بل پڑے ہوئے، غصہ سے مُنہ لال۔ اُس نے علیک سلیک کچھ نہیں کی بلکہ ہانپتے ہوئے کہنے لگا:۔

"الحمد للہ کہ میں سفر پر روانہ نہیں ہُوا تھا، ورنہ قیامت ہی برپا ہو جاتی۔ اخبار کی شہرت برباد ہوگئی۔ میں سمجھتا ہوں ہمیشہ کے لئے برباد ہو گئی۔ بلاشبہ اخبار کی فروخت بہت زیادہ ہوگئی ہے، کبھی اتنے پرچے نہیں بکے تھے جتنے اِس ہفتے بکے ہیں، لیکن کیا کوئی آدمی بھی اسے گوارا کر سکتا ہے کہ دیوانہ بن کر شہرت حاصل کرے اور پاگلوں کی سی بڑ ہانک کر روپیہ پیدا کرے؛ خدارا مجھے بتاؤ کس شیطان نے تمہیں میرے اخبار کی ادارت قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا؛ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ زراعت کی الف، ب بھی تم نے نہیں پڑھی ہے؛ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ گاجر کا پودا کیسا ہوتا ہے اور کدو کس جگہ بویا جاتا ہے؛ اس منحوس ساعت پر ہزار لعنت جب تم سے میں نے یہ کام قبول کرنے کی درخواست کی تھی! براہِ عنایت آپ ابھی تشریف لے جائیے۔ میں نے سفر ملتوی کر دیا۔ سفر پر اور سفر کرنے والے پر لعنت! لیکن تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ زراعت سے اس درجہ جاہل ہو؛"

قارئینِ کرام! میں آپ سے اقرار کرتا ہوں کہ ایڈیٹر کے اس آخری جملے سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میں غصے سے بدحواس ہوگیا اور بڑی تلخی سے کہنے لگا:۔

"کرم کلّے کے چچا! تم مجھ سے کیا جواب چاہتے ہو؛ ساری عمر میں آج پہلی مرتبہ ایسی نامعقول گفتگو میرے کانوں نے سُنی ہے بینگن اور لوبیے پر لمبے چوڑے مضمون لکھنے والے! کیا تجھے نہیں معلوم کہ اخبار نویسی کی دُنیا میں چودہ برس سے کام کر رہا ہوں؛ اس تمام مدت میں آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں سُنا کہ اخبار نویسی کے لئے بھی کسی علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخبار نویسی کے لئے اتنی قابلیت کافی سے زیادہ ہے کہ کاغذ پر قلم گھسیٹنا آجائے۔

"تمہارے اخبار کی حقیقت ہی کیا ہے؛ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا! دُنیا کے بڑے بڑے اخبارات و رسائل کو ذرا آنکھ کھول کر دیکھو۔ ان میں مختلف اہم موضوعوں پر کون مضامین لکھتے ہیں؛ ناٹک اور ڈراموں پر تنقید کن قلموں سے نکلتی ہے؛ یہ وُہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اس فن سے اُتنی بھی واقفیت نہیں ہوتی جتنی مجھے فنِ زراعت سے حاصل ہے . . . . تجارتی و اقتصادی معاملات پر لمبی چوڑی بحثیں وہ لوگ لکھتے ہیں جو یا تو دیوالئے ہوکر مفلس و قلاش ہو چکے ہیں یا مسرف و فضول خرچ ہوتے ہیں۔ عقلمند! تم جانتے ہو شراب کے خلاف اخلاقی مضامین کون لوگ لکھتے ہیں؛ یہ وہ ہوتے ہیں جن کے مُنہ سے کبھی شیشہ جُدا نہیں ہوتا جنہیں ایک سطر لکھنے کے لئے ایک گلاس چڑھانے کی پہلے ضرورت ہوتی ہے!

پھر زراعتی جرائد و رسائل کی ایڈیٹری کون لوگ کرتے ہیں؛ معاف کیجئے گا آپ ہی جیسے حضرات! تم اب مجھے اخبار نویسی کے گُر سکھانے آئے ہو۔ حالانکہ میں نے مدتوں اس راہ میں پاپڑ بیلے ہیں۔ مجھ سے اس کا کوئی راز بھی مخفی نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ جو اخبار نویس جتنا زیادہ جاہل اور

لونولیس ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ شہرت حاصل کرتا ہے۔ روپیہ کماتا ہے، عزت پیدا کرتا ہے۔ قسم خدا کی اگر میں عالم کے بجائے جاہل محض نا اہل ہونے کے بجائے بے حیا ہوتا، خاکسار ہونے کے بجائے فقار و لستان ہوتا تو میرے لئے اس سے زیادہ آسان کوئی بات نہ تھی کہ اس ملک میں لازوال شہرت اور عظیم دولت حاصل کر لیتا۔ لیکن ہر کسی کو الگ طبیعت ملی ہے۔ چونکہ تم نے مجھ سے یہ توہین آمیز برتاؤ کیا ہے اس لئے میں تمہارے کام سے ابھی دست بردار ہوا جاتا ہوں۔ لیکن تم پر یہ واضح ہو جانا چاہئیے کہ میں نے اپنا فرض باحسن وجوہ انجام دیا ہے۔ خود تمہیں اعتراف ہے کہ اخبار کی اشاعت اس ہفتہ بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اگر ایک ہفتہ میں اور رہ جاتا تو بیس ہزار تک بکری ضرور پہنچ جاتی تم ہی نے اپنا نقصان کیا ہے میرا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا۔ اچھا خدا حافظ!"

یہ کہہ کر میں نے چھڑی اٹھائی اور دفتر سے رخصت ہو گیا۔

(مارک ٹوین) "مصوّر"

بادشاہِ دہلی کے حضور میں انگریزوں کی آخری نذر

مسٹر ولیم ایڈورڈ نے ایک کتاب (ایک بنگالی سول افسر کے مشاہدات) تحریر کی تھی جس میں دربارِ دہلی اور غدر کے بہت سے دلچسپ واقعات ہیں۔ اس میں ایک قدیم دستاویز "بادشاہِ دہلی کے حضور میں آخری نذر" کے عنوان سے بھی بطور ضمیمہ شامل ہے۔ اس نذر کے حالات جو انگریز افسروں نے "یادداشت" کے طور پر مرتب کر کے ولایت بھیجے تھے اور جن سے اس عہد کے دربارِ دہلی پر کافی روشنی پڑتی ہے اس قابل ہیں کہ قارئین کے لئے بطریق نمونہ یہاں پیش کئے جائیں یادداشت حسبِ ذیل ہے۔ اگرچہ طرزِ بیان معاندانہ ہے (اور جو قدرتی ہے) لیکن پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

جس روز ہمارا کیمپ دہلی میں ہوا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اعلیٰحضرت شہنشاہِ ہند بیمار ہیں۔ اور قدیم رواج کے مطابق گورنر جنرل ہندیا اس کے نمائندوں کو مزاج پرسی کے لئے حاضر ہونا اور کچھ مبلغات بطریقِ "نذرانہ" پیش کرنا ضروری ہے۔ کمپنی کے پرانے ریکارڈ نکال کر دیکھے گئے اور ان میں مختلف حالات پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا ثبوت مل گیا کہ اگرچہ گورنر جنرل ہند اور بادشاہ دہلی کے درمیان اعلیٰ و ادنیٰ کا رابطہ نہیں تھا لیکن پھر بھی گورنر جنرل ہند کو سال بہ سال بادشاہِ دہلی کے حضور میں ایک نذر پیش کرنی ضروری ہوتی تھی۔ نذر پیش کرنا اور اعلیٰحضرت مغل شہنشاہ کی مزاج پرسی کرنا دراصل اس بات کا ثبوت اور نشان تھا کہ ہم ہندوستان کے حصص و اقطاع پر بادشاہ کے کارندے اور باجگزار کی حیثیت سے حکومت کرتے ہیں اور بادشاہ کے سامنے اپنی عقیدت و محکومیت کا ثبوت پیش کرنا ہمارے لئے از حد ضروری تھا۔ نیز کچھ طلائی مُہروں کا "نذرانہ" بھی رواج کے مطابق ضروری تھا۔

چونکہ یہ ایک قدیم رواج اور ہماری اطاعت گزاری ایک مانی ہوئی بات تھی اس لئے گورنر جنرل سے استفسار کرنے کی کوئی ضرورت

نہیں سمجھی گئی اور میں اور مسٹر ٹامسن بادشاہ عالی جاہ مغل شہنشاہِ ہند کے حضور میں طلائی مہروں کی ریشمی تھیلیاں اور دیگر تحائف لے کر بعد آداب وخصوصیاتِ مشرقی اپنے کیمپ سے روانہ ہوئے۔

جلوس کی روانگی کی صورت یہ قرار پائی کہ اعلیٰ افسرانِ وفد اور طلائی مہروں کی تھیلیاں ہاتھیوں پر بار کی جائیں۔ ان کے آگے اور پیچھے گورہ دستہ اور نشانِ انگلشیہ ہو۔ ہم کو یہ بھی ہدایت ہوئی تھی کہ بادشاہ کے حضور میں جوتے اُتار کر اور جھک کر پہنچنا چاہئے اور مشرقی دربار میں اس ادب کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ ہمارے کیمپ کے لوگ بے دست وپا بادشاہ کے سامنے اپنی اس تذلیل کو قطعی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس وقت تک جو رواج قائم تھا اُسے دُور کرنا یا ایک دم بغاوت کر کے اُسے پسِ پُشت ڈال دینا بھی ہمارے بس کی بات نہ تھی اِس لئے بادلِ ناخواستہ میں نے اور سب نے یہ بات منظور کر لی اور نذر پیش کرنے والا جلوس قلعۂ دہلی کی جانب بڑھنا شروع ہُوا۔

ہم نے اپنے جُوتوں پر ریشمی غلاف پہن لئے لیکن "دربارِ عام" میں جھک کر پہنچنے اور "کورنش" ادا کرنے کے لوازم سے تب بھی مفر نہ ہُوا۔

جب ہم شہ نشین کے نیچے پہنچے تو دربار لگا ہُوا تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی ایک پردہ ہٹا اور اس کے پیچھے ایک اونچا تخت رکھا ہُوا دیکھا، اگرچہ تختِ طاؤس جا چکا تھا لیکن تیموری خاندان کی سُبکی ہوتی اگر دار الحکومت دہلی میں کوئی شاہی تخت نہ ہوتا اس لئے ہم نے جو تخت دیکھا وُہ بھی آن بان میں کچھ کم نہ تھا۔ بادشاہ دہلی ایک نہایت بوڑھا اور نحیف وضعیف انسان تھا۔ آلتی پالتی مارے گاؤ تکیوں سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے زوال وانحطاط کے آثار نمایاں تھے جو شاید آنے والے واقعات کا عکس تھے مگر اس وقت ہمیں صرف جسمانی کمزوری اور طوالتِ عمر کے طبعی نشانات محسوس ہوتے تھے۔

ہم نے تخت کے قریب پہنچ کر ایک ایک دفعہ بوسہ دیا اور اپنے اپنے ہاتھوں سے تھیلیاں، جن میں کافی طلائی مہریں تھیں، گزرانیں اور اعلیحضرت سے مزاج کے متعلق مشرقی طریق پر ہاتھ جوڑ کر دریافت کیا۔

چونکہ یہ آخری نذر تھی جو کسی باقاعدہ خراج دہندہ اور ماتحت نے آلِ تیمور کے سامنے پیش کی اس لئے بہت زیادہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میں جس وقت نذر لے کر اُوپر چڑھا، میرے دل میں عجیب وغریب خیالات تھے۔ میرے سامنے قدیم مغل بادشاہوں کی وسیع سلطنت دبدبہ اور حیرت انگیز طاقتوں کا منظر تھا اور جب اس بادشاہ کو دیکھتا تھا تو انقلابِ زمانہ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہ مبادا کوئی غلطی ہو جائے، آداب عرض کیا اور نذر پیش کی جسے بکمال مہربانی قبول کر لیا گیا۔ برطانوی سلطنت کی جانب سے مغل بادشاہ کے حضور میں یہ آخری نذر تھی، اس کے بعد مغلوں کو ہم سے ایک پائی بھی لینی نصیب نہ ہوئی۔

مغل بادشاہ نے ہماری نذروں کو قبول فرما کر ہمیں خلعت اور طلائی صافے پہنائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ پُورے آدابِ مغلیہ کے

ساتھ ان احکام پر عمل کیا گیا اور دربار کے اس آخری منظر سے متاثر ہو کر ہم نے پھر آداب اور کورنش بہ اندازِ متقرر ادا کیا اور رخصتی جملے جن میں اپنی اطاعت گزاری کا یقین اور ان کے اقبال و دولت کی ترقی کے الفاظ تھے پھر دُہرائے اور قلعہ سے رخصت ہوئے۔

ہم اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوئے اور جلوس پھر آراستہ کیا گیا۔ بادشاہِ دہلی کی خوشی اور حکم کے مطابق ہمارا جلوس دہلی کے بڑے بڑے بازاروں میں سے نکلا جس کے ہمراہ شاہی فوج اور انتظام کرنے والے بھی تھے اور ہر جگہ یہ چرچا تھا کہ "بادشاہِ غازی نے ان کو شرفِ باریابی بخشا ہے" اس لئے ان کی نمائش و جلوس اہلِ دہلی کے علم و خوشنودی کے لئے بازاروں میں سے گزر رہا ہے۔

ہمارے جسموں پر شرقی طریق کے جو زرباار اور قیمتی لباس پڑے ہوئے تھے اُنہوں نے ہمیں ایک عجیب مضحکہ خیز چیز بنا دیا تھا اور ہمارے دل میں سنجیدگی اور متانت کے کوئی جذبات نہ تھے لیکن لوگ شاید ہمیں قدر کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں مجھے تو اس لباس سے اس قدر شرم آئی کہ میں نے اپنے ہاتھی کو کیمپ کی جانب کر دیا اور کیمپ میں پہنچ کر ان کپڑوں کو فوراً اتار دیا۔ اس اثنا میں کرنل براڈفٹ اور دوسرے ساتھی بھی آ گئے۔ اور ہم سب نے یہ لباس اُتارا اور آدمی کی صُورت بنے۔

اس کے بعد ہم سب گورنر جنرل کے خیمہ میں گئے اور وہاں جا کر آج کے تمام حالات سنائے۔ لیکن گورنر جنرل صاحب ہم سے بہت ناراض ہوئے کہ بغیر اُن کی مرضی کے بادشاہ دہلی کو کیوں نذر پیش کی گئی۔

انہوں نے بیان کیا کہ اِس نذر کی پیشی اور دیگر رسوم کی ادائیگی سے ہم نے یہ بات ظاہر کر دی کہ ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت مغل بادشاہ کی باجگذار اور اطاعت گزار و ماتحت سلطنت ہے اور ہم ہندوستان پر مغل بادشاہ کی مرضی اور رعایت کی وجہ سے حکومت کر رہے ہیں۔ چونکہ ایسا کرنے سے حکومتِ انگلشیہ کی توہین ہوتی تھی اور نذر دینا اب ضروری نہیں تھا اس لئے ہم تینوں افسروں کا یہ اقدام غیر مآل اندیشانہ قرار پایا۔

گورنر جنرل نے بتایا کہ اب حکومت انگلشیہ کی پالیسی یہ نہیں ہے کہ اطاعت گزاری کی جائے اور نذریں پیش کی جائیں۔

گورنر جنرل نے اُسی وقت احکام جاری کئے کہ ہندوستان کے کسی حصّہ سے کوئی برطانوی باشندہ یا باشندے کسی حیثیت سے بھی بادشاہ دہلی کو نذر یا خراج پیش نہ کریں۔ نیز اس بات کی تحقیق کرائی گئی کہ اس سال میں کس قدر روپیہ بطور نذرانہ اعلیحضرت بادشاہ دہلی نے وصول کیا تھا۔ اس روپے کے موازی روپے بادشاہ کے وظیفہ میں برطانوی خزانہ سے دیا جانا منظور کیا گیا لیکن آئندہ نذریں دینی بند کرائی گئیں اور کوئی رسمی بات نہیں ہوئی۔ ہاں زرِ نقد بادشاہ کو مدت تک دیا جاتا رہا جس کی شکل وظیفہ کی سی رہی اور جس کی کمی بیشی کا حکام انگلشیہ کو اختیار رہا۔ لیکن نذر اس واقعہ کے بعد ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی۔ یہ آخری دربار تھا جو تیمور کی اولاد میں سے کسی نے کیا اور جس میں فرنگیوں نے ماتحت ہونے کی حیثیت سے شرکت کی اور نذر گزرانی۔ یہ بادشاہ دہلی کی آخری نذر تھی۔

"دین و دُنیا"

مطبوعات

عطرِ عروض ۔ فنِ عروض کے متعلق ۳۲ صفحات کا مختصر رسالہ نواب احسان علی بہادر صاحب آف باندہ نے تالیف کیا ہے۔ فاضل مؤلف نے مسائلِ عروض کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ رسالہ ہر طرح جامع و مانع ہے۔ ہماری رائے میں عطرِ عروض نہ صرف مدارس کی کتبِ درسیہ میں شامل ہونے کے قابل ہے بلکہ عام شائقین کی واقفیت میں بھی بہت اضافہ کرسکتا ہے۔ قیمت ۴ر۔

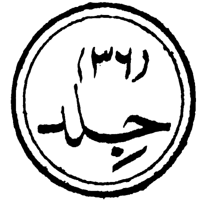
پتہ: نواب احسان علی بہادر صاحب ۔ منوریا گنج ۔ اندور

وصلی کی دستکاری ۔ مؤلفہ سید رضا احمد صاحب جعفری۔ اس کتاب میں وصلی یعنی گتّے سے مختلف کھلونے ڈبّے اور ضرورت کی چیزیں بنانے کی ترکیبیں درج کی گئی ہیں۔ یہ دستکاری محض ایک دلچسپ مشغلہ ہی نہیں بلکہ بچّوں کے لئے ذہنی ریاضت کا بھی ایک بہترین ذریعہ ہے۔ قابل مؤلف نے جگہ جگہ تصویریں دے کر اس فن کو بہت اچھی طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اُردو میں اس فن پر شاید یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی معمولی سے معمولی بات کا فنی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں کتنی باریکیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حجم ۵۶ صفحات۔ قیمت ۸ر۔ پتہ: عصمت بک ڈپو دہلی۔

لکڑی کا باریک کام ۔ مؤلفہ سید رضا احمد صاحب جعفری۔ یہ کتاب بھی سید صاحب کی پہلی کتاب "وصلی کی دستکاری" کی طرح نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس میں لکڑی کے فریم، ڈبّے اور مختلف آرائشی اشیا بنانے کی ترکیبیں درج کی گئی ہیں۔ یہ فن ایک تفریحی مشغلے کے طور پر بھی اختیار کیا جا سکتا ہے اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ عصمت بک ڈپو دہلی اس قسم کی کتابوں کی اشاعت کے لئے قابلِ مبارکباد ہے۔ قیمت ۸ر۔

انشائے سلمیٰ ۔ یہ کتاب بچیوں کو اُردو خط نویسی کی تعلیم دینے کی غرض سے لکھی گئی ہے، کتاب اچھی ہے لیکن خطوط کی عبارت میں سادگی نہیں۔ مثلاً میرے پیارے ابّا جان وغیرہ القاب کے بجائے حضرت ابوی صاحب لکھا ہے۔ یہ غالباً عام ہندوستانیوں کی زبان نہیں۔ اسی طرح "جواب عنایت فرمادیں" اور "آپ کو خدا جلد گھر لادے" وغیرہ مذاقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کے معانی درج کئے گئے ہیں۔ کتاب کے مفید ہونے میں شبہ نہیں۔ قیمت ۶ر

پتہ: عصمت بکڈپو ۔ دہلی۔



فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء

تصویر:- محبت

جہاں نما

جرمنی کی مفسدانہ جنگ اور برطانیہ کا جہادِ امن

۱۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو جرمنی نے آسٹریا کا الحاق کیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو سڈیٹن لینڈ بھی جرمنی کے علاقے میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو سلوویکیا، ۱۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو بوہیمیا اور موریویا اور ۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء کو میمل پر بھی جرمنی کا قبضہ ہو گیا۔

اس کے نو دن بعد (۳۱ مارچ کو) برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کی آزادی برقرار رکھنے کا ذمہ لیا اور دو ہفتے کے بعد (۱۳ اپریل کو) رومانیہ اور یونان کی آزادی برقرار رکھنے کا ذمّہ بھی لے لیا۔ مزید دو ہفتے کے بعد (۲۷ اپریل کو) برطانیہ کے دارالعوام نے جبری فوجی تعلیم کا قانون منظور کیا۔ تقریباً اور دو ہفتے گزرنے کے بعد (۱۲ مئی کو) برطانیہ اور فرانس نے ٹرکی سے معاہدۂ اتحاد استوار کیا۔ اسی سلسلے میں برطانیہ روس سے بھی معاہدہ کرنا چاہتا تھا لیکن غالباً برطانوی وزرا کی سوداگرانہ ذہنیت نے نفع ونقصان کی جانچ تول میں اتنا وقت ضائع کر دیا کہ روس بدظن ہو گیا اور ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو اپنی عظیم الشان طاقت کے ساتھ جرمنی سے جا ملا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور اب تک (۱۶ ستمبر) اس کا خاصا علاقہ فتح کر چکا ہے۔

ہٹلر کے اقدامات پر پہلے تو انگریزی اور فرانسیسی حکومتوں نے بڑا راہبانہ صبر دکھایا لیکن جب اُس کے حد سے بڑھتے ہوئے اقتدار نے خود برطانیہ اور فرانس کے شہنشاہانہ مفاد کو خطرے میں ڈال دیا تو اپنے بچاؤ کے لئے اِن دونوں حلیفوں کو بھی بادلِ ناخواستہ آتشِ جنگ میں کُودنا پڑا۔ کہتے ہیں کہ اِس جنگ میں شامل ہونے سے اِن کا کوئی خودغرضانہ مُدّعا وابستہ نہیں بلکہ ان کا مقصد تو محض یہ ہے کہ پولینڈ اور دوسری چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی آزادی کے لئے فی سبیل اللہ جہاد کر کے ثوابِ دارین حاصل کیا جائے کیونکہ ان چھوٹی سلطنتوں کے غلام بن جانے سے دُنیا کی تہذیب کو سخت گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مگر یہ اندیشہ جو بجائے برطانیہ اور فرانس کے دل میں محض اپنی نیکی اور سادگی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی غلامی سے تو دُنیا کی تہذیب کو اب تک غالباً کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا۔

ہندوستان کے چند دیسی شرفا بھی اِس اعلان پر اپنے اسرافیلی گلوں کی پوری طاقت صرف کر رہے ہیں کہ یہ جنگ جمہوریت اور آزادیٔ اقوام کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔ برطانیہ اور فرانس بالکل بے غرض اور معصوم ہیں اور محض ہمدردیٔ بنی نوعِ انسان کی خاطر پرائی آفت اپنے سر لے

رہے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کو بھی مادرانہ ایثار سے کام لے کر دل و جان سے ان کی مدد کرنی چاہئے۔ بعض دیسی امرا، عوام سے کہہ رہے ہیں کہ خبردار اس وقت انگریزوں کے سامنے اپنی آزادی وغیرہ کی کوئی شرط پیش کرنے کا خیال تک دل میں نہ لانا، کیونکہ ایسا کرنا "سوداگرانہ ذہنیت" کا ثبوت دینا ہے جس سے انگریزوں نے کبھی کچھ سروکار ہی نہیں رکھا۔ تم اللہ کا نام لے کر لولینڈ کی راہ میں جان و مال قربان کردو اور ضرورت پڑے تو چھ ہزار میل کا سفر طے کر کے دیارِ غیر میں دوسروں کی آزادی کی سلامتی کے لئے فنا ہو جاؤ۔ اللہ تعالےٰ اجر دے گا۔ غیر سوداگرانہ ذہنیت اسی روش کی متقاضی ہے۔ للہ مشرق کی روایتی شرافت کی شرم رکھ لو۔

لیکن انگلستان کا اخبار "مارننگ پوسٹ" ہندوستان کے دیسی اُمراء کے ان شریفانہ خیالات کا کچھ زیادہ قائل معلوم نہیں ہوتا اُس نے برطانیہ کو صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا ہے کہ:۔

"اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کو سلطنتِ برطانیہ میں ایک مساوی حیثیت کے رُکن کا درجہ دے دیا جائے۔ اگر ہندوستان کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ موجودہ جنگ میں جرمنی کی فتح اُس کے لئے باعثِ نقصان ہوگی تو اُسے یہ اطمینان بھی دلا دینا چاہئے کہ اس جنگ میں برطانیہ کی فتح سے اُسے فائدہ پہنچے گا۔"

ہندوستان کے لئے دیسی شرفا کی شریفانہ ذہنیت کے مقابلے میں "مارننگ پوسٹ" کی یہ غیر شریفانہ اور سوداگرانہ لیکن قابلِ فہم اور ہمدردانہ ذہنیت زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے جس کے لئے ہندوستان اُس کا شکر گزار ہے۔

جو خود آزاد اور "مہذب" نہ ہو اُس کا دوسروں کی آزادی اور "تہذیب" کی حفاظت کے لئے لڑنا بڑی پُرلطف شرافت ہے۔ پہلے کسی کو آزادی دو۔ پھر اُس سے اپنی اور دوسروں کی آزادی کی خاطر لڑنے مرنے کی توقع رکھو۔

ایشیا کے چند بڑے آدمی

"انسائیڈ یورپ" کے مصنف جان گنتھر نے ایک اور کتاب "انسائیڈ ایشیا" لکھی ہے۔ اس کتاب میں اُس نے ایشیا کے اکثر مشاہیر کے دلچسپ مرقعے پیش کئے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

جنرل چیانگ کائی شیک

"چیانگ کائی شیک کوئی بہت عظیم الشان تاریخی شخصیت نہیں۔ نہ وہ کوئی لنکن ہے نہ سکندرِ اعظم۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تیسری صدی قبل مسیح کے زمانے سے جب دیوارِ عظیم تعمیر ہوئی تھی اب تک چین نے اُس سے زیادہ زبردست اور کوئی فرد پیدا نہیں کیا کیونکہ وہ اب ایک اور "دیوارِ عظیم" کی تعمیر میں مصروف ہے جو چین کو جاپانیوں کے حملوں سے محفوظ رکھ سکے گی۔"

مہاتما گاندھی

"مُبدھ کے زمانے کے بعد اب تک گاندھی سے بڑا کوئی ہندوستانی پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اُس کی سیرت سے زیادہ مشکل سے سمجھ میں آنے والی اور پُرپیچ سیرت کا تصوّر کرنا مشکل ہے۔ اُس میں بڑا تلوّن ہے۔ میری نیّت اہانت کی نہیں، لیکن ذرا اِن اضداد پر نظر ڈالیئے:۔

"گاندھی خالص اخلاقی وجوہ کی بنا پر روزے رکھتا تھا لیکن یہ روزے کافی عملی سہولت پیدا کرنے کا باعث ہوتے، کیونکہ اگر وہ جیل میں روزہ رکھتا تو انگریز اُسے رہا کرنے پر مجبور ہو جاتے . . . . . وُہی گاندھی جو اس سے پہلے ہندوستان میں برطانی سلطنت کا زبردست حریف رہ چکا ہے ۱۹۳۹ء میں انگریزوں کا اس ملک میں تقریباً بہترین دوست ہے . . . . . گاندھی جدید سائنس کو ایک لعنت سمجھتا ہے لیکن وہ تھرمامیٹر استعمال کرتا ہے اور عینک لگاتا ہے"۔

شاہ رضا پہلوی

"تمام ایران رضا شاہ کے جوشیلے مزاج سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ حکومت کی مجالس میں وہ وزرار کو اپنے غیظ وغضب کا نشانہ بناتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اُن کے دل ودماغ میں بھی اپنی ہی سی قوّتِ عمل پیدا کر دے تاکہ وہ کام کرنا سیکھیں، کام کرنے پر فخر کرنا سیکھیں اور اپنے مُلک کو قابلِ فخر بنا ڈالیں"۔

سُلطان ابنِ سعُود

"ابنِ سعود کی سَو سوا سَو بیبیاں اور بیسیوں بیٹے اور بے شمار بیٹیاں ہیں۔ شادی اس کے نزدیک "اتحادِ عرب کا ایک ذریعہ" ہے۔ کچھ عرصہ قبل اُس نے کہا تھا کہ "مَیں نے اپنے لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں ایک قوم بنائی۔ اب مَیں اپنے زمانۂ کہولت میں اُس کے لئے آدمی بنا رہا ہوں"۔

ہندوستان میں تعلیمِ عوام کی تحریکیں

ہندوستان کے بعض صُوبوں میں بالغوں کی تعلیم کے لئے جو منصوبہ بندیاں کی گئی ہیں وہ قابلِ مبارکباد ہیں۔ صوبجاتِ متحدہ میں اصلاحِ دیہات کے محکمہ نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لیا ہے کہ اشتہاروں کے ذریعہ سے اُن پڑھے لکھے بالغوں کو جنہیں حال میں کانگریسی حکومت نے تعلیم دلوائی ہے اور کتابیں پڑھنے کی طرف متوجّہ کیا جائے۔ ان اشتہاروں کے ذریعہ سے یہ کوشش بھی کی جائے گی کہ عوام میں تعلیم کا زیادہ سے زیادہ چرچا کیا جائے یہاں تک کہ اَن پڑھ ناپید ہو جائیں۔ عوام کے لئے ادبی کتابیں مہیا کرنے کے لئے بہترین کتابیں لکھنے والوں کو ایک ہزار روپے سالانہ کے انعامات بھی دیئے جایا کریں گے۔ انعامات

کی تقسیم سال میں چار مرتبہ یعنی ہر سہ ماہی کے بعد ہُوا کرے گی۔ یہ کتابیں مضامین افسانوں ڈراموں اور نظموں پر مشتمل ہونی چاہئیں۔ اس خیال سے کہ نو تعلیم یافتہ بالغ پڑھا لکھا بھُول نہ جائیں اُن کے لئے ایک نیم ماہی رسالہ بھی جاری کر دیا گیا ہے۔ ہندی اور اُردو کی نظموں کے دو مجموعے بھی ان لوگوں میں مفت تقسیم کرنے کے لئے زیرِ ترتیب ہیں۔ یو پی کے امرا بھی اس سلسلے میں مدد دے رہے ہیں۔ راجہ صاحب تمکوہی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دس سال تک رامائن کے ایک ہزار نسخے عوام میں تقسیم کرنے کے لئے ہر سال دیتے رہیں گے۔ مسٹر جی ڈی برلا اور نواب صاحب چھتاری نے بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔

صوبۂ بہار بالغوں کی تعلیم کے لئے جو کوشش کر رہا ہے اس کا کچھ ذکر گزشتہ مہینے کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں اربابِ تحریک کو سب سے بڑی دِقّت یہ پیش آتی ہے کہ عوام کو پڑھانے کے بعد اُن کو پڑھنے لکھنے کی عادت کس طرح ڈالی جائے تاکہ وہ پڑھا لکھا بھُول نہ جائیں۔ اس غرض کو پیشِ نظر رکھ کر ڈاکٹر سیّد محمود وزیرِ تعلیم بہار نے فیصلہ کیا ہے کہ صوبے میں عوام کے لئے چار ہزار چھوٹے چھوٹے کتب خانے کھول دیئے جائیں۔ ہر کتب خانے میں ہندی اور اُردو کی سَو سَو کتابیں اور کچھ اخبار رکھے جائیں گے۔ ۱۵ اکتوبر کو یہ کتب خانے بہار کے چار ہزار منتخب دیہات میں بیک وقت کھُل جائیں گے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیّد محمود نے عوام کے نام ایک پیغام لکھا ہے جو درجِ ذیل ہے:۔

پڑھو اور پڑھاؤ

"پڑھنے لکھنے سے آدمی کی عقل بڑھتی ہے اور اُس کی کمائی میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ ایک پڑھا لکھا مزدور زیادہ مزدوری پاتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا کسان کھیتی کی نئی نئی باتیں جان کر زیادہ پیسہ کما سکتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا کاریگر اپنے کام کو زیادہ اچھی طرح کرے گا اور اس طرح زیادہ پیسہ کمائے گا۔ ایک پڑھا لکھا غریب دیہاتی پڑھ لکھ کر جب قرض لے گا تو وہ مہاجن کے سادہ کاغذ پر انگوٹھے کا نشان نہ بنائے گا اور اس طرح دھوکے سے بچے گا۔ ایک پڑھا لکھا گاڑیبان جب اپنی اوکھ لے کر مِل میں جائے گا تو مِل والے اُسے کم تول کر دھوکا نہیں دے سکتے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی بیماریوں کی بہت سی باتیں جان کر اپنے بال بچّوں کو طرح طرح کی بیماریوں سے بچا سکتا ہے۔

"تم کو نا اُمید نہ ہونا چاہئے کہ اب تمہاری عمر بہت ہوگئی ہے اور تم پڑھ نہیں سکتے۔ اگر تم روزانہ ایک گھنٹہ بھی شام کے وقت چھ مہینے تک پڑھ لوگے تو تم کو زندگی بھر اُوپر لکھی ہوئی باتوں کا فائدہ پہنچتا رہے گا۔ لوگ تمہاری عزت کریں گے۔ پڑھ لکھ کر تم مزے سے اخبار پڑھ لیا کروگے اور اس طرح اپنے گاؤں میں بیٹھے ہی بیٹھے ساری دُنیا کی خبریں تمہیں ملتی رہیں گی۔

"کانگریس سرکار نے یہ طے کیا ہے کہ اس صوبہ میں چند برسوں کے اندر ہر بالغ آدمی پڑھا لکھا ہو جائے۔ اس کام میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ بس تم اتنی مدد کرو کہ چھ مہینے تک ہر روز ایک گھنٹہ پڑھ لیا کرو۔ اس کے بعد یہ کتابیں جو کانگریس سرکار کی طرف سے تمہارے گاؤں میں رکھی گئی ہیں۔ اُن کو پڑھ لو۔ تمہیں پڑھتے لکھتے دیکھ کر تمہارے بچوں کو بھی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوگا۔ اگر تم ایسا کروگے تو اُونچی نیچی ذات کا فرق

مٹ جائے گا اور تمہاری گنتی انسانوں میں ہوگی "

یہ پیغام جس طرح دردِ دل سے لکھا گیا ہے اُمید ہے کہ اسی طرح اس کا اثر ہوگا۔ کاش ہندوستان کے ہر صوبے کو اس انسانی قومی اور مُلکی خدمت کی توفیق ہو۔

سادگی و پُرکاری

"انڈین ریویو" نے "نسیم کی عجیب و غریب خواہش" کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں ہندوستان کی ایک فلمی اداکارہ مس نسیم کے اس اعلان پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ "خوبصورت ہونا اداکاروں کی ترقی کے راستے میں ایک رُکاوٹ ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں اتنی خوبصورت نہ ہوتی "

مس نسیم لکھتی ہیں :-

" اخبارات اور میرے دیگر مدّاح میری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔ لیکن مَیں نے اِس مدح و ثنا کا تجربہ کرکے دیکھا ہے کہ اس کی محرک میرے اداکارانہ کمال سے زیادہ میری خوبصورتی ہے۔

"میری ظاہری دلکشی میری اس خواہش کی تکمیل کے راستے میں ایک رُکاوٹ ثابت ہو رہی ہے کہ میں ایک حقیقی باکمال فلمی اداکار تسلیم کی جاؤں۔

"میں نے اداکاری کا پیشہ کسی قسم کی مجبوری یا جذباتی اشتعال کی وجہ سے نہیں اختیار کیا تھا بلکہ اس کی بنا میری یہ فطری خواہش تھی کہ میں ایک کامیاب اداکار کی حیثیت سے ترقی کرسکوں۔

" میں ابھی کوئی پختہ کار ایکٹریس نہیں ہوں۔ میرا تجربہ ہی کتنے سال کا ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ ضرور کہوں گی کہ مجھے اپنے اداکارانہ کمالات کو تسلیم کرانے میں بہت دِقّت پیش آرہی ہے کیونکہ میرے مدّاحوں کی بھُوکی آنکھیں میری اداکاری کے بجائے برابر میری فضول دلربائیوں کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔

"شاید کچھ معمّر ہو جانے کے بعد جب میرے چہرے اور قد و قامت کی دلکشی میں کمی پیدا ہو جائے گی میرے مدّاحوں کو آخرکار میرے فنی کمال کا احساس ہونے لگے۔ لیکن اِس طرح کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے ابھی سالہا سال درکار ہیں اُس وقت تک میں بجز اِس خواہش کے اور کیا کرسکتی ہوں کہ کاش میں خوبصورت نہ ہوتی "

وٹامنز کے متعلق ایک جدید تحقیق

برسوں سے یہ خیال عام ہو چکا تھا کہ غذا میں وٹامنز (حیاتین) کی کمی یا غیر موجودگی جسمانی صحت کے لئے تباہ کُن ہے اور

اکثر لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ وٹامنز کی کوئی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی صحت کے لئے زاید از ضرورت نہیں قرار دی جا سکتی۔ لیکن اب ڈاکٹر جیکو برز سپیناڈیل نے یہ انکشاف کیا ہے کہ وٹامنز کی زیادتی بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس ڈاکٹر نے اپنے اس دعوے کی تصدیق میں بہت قوی دلیلیں پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر سپیناڈیل اے، بی، سی، ڈی چاروں وٹامنز کو زیر بحث لایا ہے۔

یہ بات تو عام طور پر معلوم ہے کہ وٹامن اے کی کمی سے جسمانی نشو ونما رک جاتی ہے اور جسم دُبلا ہو جاتا ہے اس کے علاوہ جلدی بیماریاں بھی لاحق ہو جاتی ہیں اور بال بھی گرنے لگتے ہیں لیکن لوگ عموماً یہ نہیں جانتے کہ وٹامن اے کی زیادتی بھی ایسی ہی شکایات پیدا کر دیتی ہے۔

باقی تمام وٹامنز کی زیادتی بھی اسی طرح تکلیف دہ نتائج پیدا کرتی ہے مثلاً وٹامن بی کی زیادتی خون میں شکر کے اجزا کو گھٹا دیتی ہے اور یہ ایک عجیب حیرت انگیز بات ہے کہ اس سے پدرانہ اور مادرانہ احساس میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

موجودہ ہندوستانی طلبہ

پبلک سروس کمیشن کے ایک رکن نے حال ہی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ہندوستانی طلبہ سے عموماً سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں طلبہ کی حالت امید افزا نہیں۔ عام ہندوستانی طلبہ معمولی سوالات کا صحیح جواب بھی نہیں دے سکتے۔ سب سے زیادہ دُہرایا ہوا جواب یہ ہے کہ "یہ ہمارے مقررہ نصاب کی کتاب میں درج نہیں" یا "یہ میرا خاص مضمون نہیں"۔ آجکل کے طلبہ کتابوں کے غلام ہیں، اُن کے لئے علم حاصل کرنے کا ذریعہ محض کتابیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی واقفیت بہت محدود اور تنگ نظرانہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک کے طلبہ اپنے معلّموں، اپنے ماں باپ اور اپنے ہم جماعتوں سے گفتگو اور سوالات کر کے بھی معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔

مقرر نے کہا کہ میرے زمانۂ تعلیم میں بی۔ اے تک پہنچنے سے پہلے طلبہ کے لئے کسی ایک مضمون کی "تخصیص" ضروری نہ سمجھی جاتی تھی۔ کتابوں پر ضرورت سے زیادہ انحصار اور مضامین کے اختصاص نے طلبہ کی معلوماتِ عامہ کا دائرہ نہایت محدود کر دیا ہے۔ تاریخ کا طالب علم سائنس سے ناواقف ہوتا ہے اور سائنس کے طالب علم کو تاریخ کے معمولی واقعات سے بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ ایسی تعلیم جو طلبہ کی دماغی ترقی کی ضامن نہیں اور جو اُن کے خیالات میں وسعت پیدا نہیں کر سکتی بیکار ہے۔ آجکل کے نوجوان تعلیم یافتہ نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ نیم تعلیم یافتہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ طلبہ کو چاہیئے کہ ہر بات سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور پیدا کریں اور حد سے زیادہ "اختصاصیت" کے عیوب سے بچ کر کم از کم ایک شعبۂ علم میں پوری پوری مہارت بھی حاصل کر لیں۔

ریاست بڑودہ میں تعلیمی اصلاحات

ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں کہیں کہیں ترقی کے جو آثار نظر آرہے ہیں وہ اگرچہ وطن پرست ہندوستانیوں کے لئے موجبِ اطمینان ہونے چاہئیں لیکن افسوس کہ اس ترقی کی رفتار بہت سُست ہے۔ بہرحال جو ریاستیں اپنی رعایا کی فلاح وبہبود کا کوئی کام کر رہی ہیں قابلِ مبارک باد ہیں + بڑودہ کی ریاست بھی ہندوستان کی ترقی یافتہ ریاستوں میں سے ہے۔ حال ہی میں اس ریاست کے حکام نے فیصلہ کیا ہے کہ ریاست کا کوئی فرد پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے عاری نہ رہنا چاہئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں منظم منصوبہ بندی ہو رہی ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ ریاست کے ادنیٰ طبقوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ صرف کی جائے گی۔

پروہتوں کی تعلیم

اس سلسلے میں حُکام بڑودہ نے ایک اور قابلِ تعریف قدم اُٹھایا ہے یعنی یکم اگست ۱۹۳۹ء سے انہوں نے ریاست کے مختلف شہروں میں ہندو پروہتوں کے لئے تعلیم گاہیں کھول دی ہیں۔ ریاست نے "ہندو پروہت ایکٹ" کے نام سے ایک قانون نافذ کیا ہے جس کا منشاً یہ ہے کہ ریاست میں صرف سند یافتہ پروہتوں ہی کو ہندوؤں کے مذہبی امور کی سربراہی کا اختیار رہوگا۔ پروہتوں کی تعلیم گاہیں اسی قانون کا منشا پورا کرنے کے لئے کھولی گئی ہیں۔ ہندوستان میں عوام کی ترقی کے لئے یہ بات اشد ضروری ہے کہ انہیں توہمات پھیلانے والے جاہل اور گمراہ کُن مذہبی پیشواؤں کے پھندے سے نجات دلائی جائے۔ اس مقصد کی اہمیت مبالغے کی ہر انتہا کی متحمل ہو سکتی ہے۔ ریاست بڑودہ نے اس قانون سے رعایا کی سچی بہی خواہی کی جو مثال قائم کی ہے اس کی تقلید دیگر ہندو اور مسلمان ریاستوں کے علاوہ برطانی ہندوستان کے صوبوں کی حکومتوں کو بھی کرنی چاہئے۔ مُلک کی عام جہالت کے باعث ہر مذہب و ملت کے جاہل عیار یا خود غرض پیشوا عوام کی سادگی سے جس قدر ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں اس کی حد نہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ عوام کی ذہنی ترقی اور آزاد خیالی کی راہ میں ایک سنگلاخ چٹان کی طرح حائل ہیں۔ ان لوگوں نے عوام کو اپنے من مانے مقاصد کے لئے جس نفرت انگیز ذہنی غلامی اور غلط مذہبی تعصب میں مبتلا کر رکھا ہے اس کی وجہ سے یہ ملک مہذب دنیا کی نظروں میں بے انتہا ذلیل ہو چکا ہے۔

پُونا کی نسوانی یونیورسٹی

یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی عورتوں کی بیداری کے سامان بھی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ پونا میں ایک نسوانی یونیورسٹی قائم تھی لیکن اب تک حکومت نے اس کی ڈگریوں کو تسلیم نہ کیا تھا۔ یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے کہ اب صوبۂ بمبئی اور صوبجاتِ متوسط کی حکومتوں نے اس یونیورسٹی کی ڈگریاں بھی تسلیم کر لی ہیں۔ گویا ان صُوبوں کی حکومتوں کے نزدیک اس یونیورسٹی کی گریجوایٹ لڑکیوں کی بھی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں وہی حیثیت ہے جو دوسری ہندوستانی یونیورسٹیوں کی گریجویٹوں کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "انڈین ومنز یونیورسٹی" پونا میں تعلیم حاصل کرنے پر اب تک جو اعتراض عائد ہوتا تھا وہ رفع ہو چکا ہے + اس یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم ہندوستانی عورتوں کی ضروریات اور مشکلات کو پیشِ نظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے۔ اس لئے یہاں کی فارغ التحصیل طالبات سوسائٹی کے لئے زیادہ مفید کام کر سکتی ہیں۔

حامد علی خاں

عبداللہ بیگم

۸ار اگست ۱۹۳۹ءئہ تین بجے بعد دوپہر علی گڑھ سے دنیا کو رخصت کر گئیں۔ پیدائش دہلی کی تھی۔ ماں باپ نے نام وحید جہاں بیگم رکھا تھا۔ ایک تتلانے والی بھانجی خالہ کہنے کے بجائے

اعلےٰ

کہتی تھی۔ تھی واقعی اعلےٰ۔ بڑی بہنیں، شوہر، خود اپنے بچے یہی کہنے لگے اور اسی نام سے مشہور ہوگئیں۔ علی گڑھ مسلم گرلز کالج اور اس کے متعلق سکول کی ہزارہا لڑکیوں میں

اعلےٰ بی

وہ کام کر گئیں جو لڑکوں کے لئے سرسید احمد خاں نے کیا تھا۔ مسلم گرلز سکول (جو اب کالج ہے) خان بہادر شیخ عبداللہ کی محنت سے بنا۔ اعلےٰ بی کی محبت سے پلا، بڑھا اور کامیاب ہوا۔

عبداللہ بیگم کو نمود اور شہرت سے دلچسپی نہ تھی، کام کا شوق تھا۔ اگر مفید کام عظمت کا معیار ہے تو عبداللہ بیگم کی عظیم الشان خدمات کی قوم جتنی قدر کرے کم ہے۔ سینکڑوں سے زیادہ لڑکیاں ہوں گی، جن کو عبداللہ بیگم کی شفقت نے خود اپنے گھروں کی آرام کی زندگی کو بھلا دیا۔ کام میں اَن تھک تھیں، خلوص میں اس سے زیادہ اَن تھک تھیں۔ پرائے بچوں کو اپنے بچوں سے بڑھ چڑھ کر پالتی تھیں۔ عبداللہ لاج سے بورڈنگ ہاؤس تک روزانہ بیسیوں چکر کر ڈالتیں اور کبھی احسان نہ دھرتیں۔ نہ یہ جتلاتیں کہ کام زیادہ ہے وقت کم ہے۔ سبک خرام اس بلا کی تھیں کہ جو فاصلہ اور بیویوں سے دس منٹ میں طے نہ ہو اعلےٰ اسے تین منٹ میں بغیر ہانپے ختم کر دیتیں۔

لکھنے کو انسان بہت کچھ لکھ سکتا ہے مگر کم سے کم جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس بلند مرتبہ عالی ہمت خاتون کی زندگی ایک

مقدس سفر

تھی۔ سفر ختم ہوگیا۔ اب وہ آرام فرما رہی ہیں۔

عبدالعزیز

آسماں اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

(اقبالؒ)

(عزیزہ[1] خورشید جہاں مرحومہ کی یاد میں)

ابھی کل تک تو اُس کے قہقہوں کی گُونج سنتے تھے
وہ بلبل تھی ہم اُس کے چہچہوں کی گونج سنتے تھے

ابھی کل تک تو اُس کی نیک گفتاری کے چرچے تھے
محبت، خندہ پیشانی، حیاداری کے چرچے تھے

ابھی کل تک حریمِ زندگی میں تھا قیام اُس کا
ابھی کل تک کتابِ ہست میں لکھا تھا نام اُس کا

ابھی تک ہے لباسِ نوعروسی عطر بیز اُس کا
وہ رکھا ہے قرینے سے ابھی سارا جہیز اُس کا

پڑا ہے وہ پلنگ، یہ کرسیاں ہیں اور وہ صوفے ہیں
اور اس صندوق میں ہیں اُس کے گہنے اس میں کپڑے ہیں

یہ وہ گلدان ہیں جن کو وہ پھُولوں سے سجاتی تھی
خود اپنے ہاتھ سے رنگین گلدستے بناتی تھی

انگیٹھی پر پڑا ہے جو غلاف اُس نے بنایا تھا
لگا کر موتیوں کی جھالریں سب کو دکھایا تھا

مگر یہ کیا کہ ماتم کر رہی ہے کائنات اُس کا
نظر آتے ہی ڈوبا ہائے خورشیدِ حیات اُس کا

وہ اُس کے ہونٹ جن پر برگِ گُل کو رشک آتا تھا
تبسم بن کے جن پر کیفِ ہستی پھیل جاتا تھا

وہ ہونٹ اب اس طرح ہیں جس طرح مرمر کے ٹکڑے ہوں
کسی ٹوٹے ہوئے بے آب سے خنجر کے ٹکڑے ہوں

نہ اُن میں زندگی باقی، نہ اُن میں تازگی باقی
اُڑا سب رنگ اور اک ماتمی زردی رہی باقی

وُہ آنکھیں جن میں احساسِ مروت مسکراتا تھا
وہ آنکھیں جن میں نُورِ پاکبازی جگمگاتا تھا

وہ آنکھیں اُس کے چہرے پر برائے نام باقی ہیں
مے گلرنگِ ہستی بہ گئی ہے جام باقی ہیں

جھکا ہے اُس کے ابا جان کا سر شدّتِ غم سے
وہ اُس کا بھائی روتا ہے درو دیوار سے لگ کے

کسی کو کب وُہ یوں افسردہ خاطر دیکھ سکتی تھی
وہ اپنوں اور بیگانوں کے درد و غم کی ساجھی تھی

مگر اب نالہ و فریاد کی پروا نہیں اُس کو
عزیزوں کے دلِ ناشاد کی پروا نہیں اُس کو

اُسے لمسِ فنا نے کر دیا احساس سے خالی
وہ ہے اس پھول کی صُورت جو ہو بُوباس سے خالی

جگایا[2] تھا جہاں کے شور نے پھر سو گئی ہے وُہ
عدم کی وادیٔ پُرخواب میں پھر کھو گئی ہے وُہ

عطاء اللہ سجاد

[1] میری بنتِ عم جو گزشتہ فروری میں اپنی شادی کے دس ماہ بعد اُنیس سال کی عمر میں وفات پاگئیں۔ [2] شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم۔ دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم (علی حزیںؒ)

گناہ کا احساس

گناہ کی ایک روایتی مذہبی نفسیات ہے، لیکن زمانۂ حال کا کوئی ماہرِ نفسیات اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ عام عیسائیوں اور خصوصاً پروٹسٹنٹوں کا خیال یہ تھا کہ ہمارا ضمیر بتلاتا ہے کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں، وہ بُرا ہے، اور یہ کہ اس کام کے کرنے کے بعد اس کو دو دردناک حسیات میں سے ایک کا تجربہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک تو تاسف کہلاتی ہے، اور اس میں کوئی چیز قابلِ تعریف نہیں، دوسری کو توبہ کہتے ہیں، اور اس کی وجہ سے گناہ دُھل جا سکتا ہے۔ جن ملکوں کے باشندے پروٹسٹنٹ ہیں، اُن میں وہ لوگ بھی ہیں، جو بہت آزاد خیال ہونے کی وجہ سے مذہبی قیدوں کے پابند نہیں رہے ہیں، لیکن یہ لوگ بھی عرصے تک گناہ کے اسی عقیدے کو، کم و بیش ترمیم کے ساتھ مانتے رہے۔ لیکن خود ہمارے زمانے میں گناہ کا جو عقیدہ مقبول ہے، وہ اوپر بیان کیے ہوئے عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔ یہ نیا عقیدہ ایک حد تک نفسی تحلیل کے اثر سے پیدا ہوا ہے۔ اب نہ صرف آزاد خیال لوگوں نے گناہ کے پُرانے عقیدے کو ترک کر دیا ہے، بلکہ جو لوگ کہ اپنے آپ کو کٹّا سمجھتے ہیں، وہ بھی اس سے کنارہ کر رہے ہیں۔ اب ضمیر وہ پُراسرار چیز نہیں رہا۔ جو پُراسرار ہونے کی وجہ سے، خدا کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ ہم کو معلوم ہے کہ مختلف ملکوں میں ضمیر کا حکم مختلف ہوتا ہے، اور یہ کہ عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہر جگہ قبائلی قانون کی پیروی کرتا ہے۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ جب کسی کا ضمیر چٹکیاں لیتا ہے، تو حقیقت میں کیا ہوتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ لفظ "ضمیر" بہت سی مختلف حسیات کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور پکڑے جانے کا خوف ان میں سے سب سے زیادہ سادہ ہے۔ ایک شخص ایسا کام کرتا ہے کہ اگر وہ پکڑا جائے، تو بہت سخت سزا کا مستوجب قرار دیا جائے۔ ایسے شخص سے اگر دریافت کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ جب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ضرور پکڑا جائے گا، تو وہ اپنی حرکت پر نادم ہوتا ہے، اور اس سے توبہ کرتا ہے۔ لیکن اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میرا یہ بیان اس پیشہ ور چور کے لیے بھی صحیح ہے، جو ہر وقت قید خانے جانے کا منتظر رہتا ہے۔ لیکن یہ ایک عزت دار مجرم، مثلاً کسی بنک کے اُس منیجر کے لیے تو ضرور صحیح ہے جس نے تنگ دستی کے وقت روپیہ غبن کیا ہے، اور اس پادری کے لیے بھی صحیح ہے، جو گرمی کے وقت کسی جنسی بے قاعدگی کا مرتکب ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر پکڑے جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا، تو پھر یہ اپنے گناہ بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ پکڑ لیے جاتے ہیں، یا ان کو پکڑے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو یہ سوچتے ہیں کہ ان کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ اسی خواہش سے ان کو اپنے گناہ کی بڑائی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ پھر

"ذات باہر کئے جانے کا خوف بھی اسی احساس سے قریب کا تعلق رکھتا ہے۔ ایک شخص تاش کی بازی میں بے ایمانی کرتا ہے، یا اپنا قرض حسنہ ادا نہیں کرتا۔ خود اس شخص میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس سے وہ پکڑے جانے کی صورت میں اپنے قبیلے کا مقابلہ کرے۔ اس کا حال مذہبی بدعتی، سیاسی فسادی اور باغی سے مختلف ہے۔ ان لوگوں کو معلوم رہتا ہے کہ خود ان کے ہم عصر اُن کے ساتھ کیسا بھی سلوک کریں، اگلی نسل اُن کا ساتھ دے گی، اور اُن کی اتنی ہی عزت کرے گی، جتنا کہ ہم عصر نسل ان کی بے عزتی کر رہی ہے۔ قبیلے کی مخالفت اور دشمنی کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو گناہ گار نہیں سمجھتے۔ لیکن جو شخص کہ اپنے قبیلے کے اخلاقی ضابطے کو پوری طرح تسلیم کر چکا ہے، وہ اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں، جب "ذات باہر" کر دیا جاتا ہے تو اُس کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اب وہ "ذات باہر کئے جانے کے خوف، اور "ذات باہر" ہو جانے کے بعد اس کے دُکھ کی وجہ سے اپنے کاموں کو گناہ گارانہ سمجھنے لگتا ہے۔

لیکن گناہ کے احساس کی بعض اہم صورتیں اس سے بھی زیادہ گہری جاتی ہیں۔ ان کی جڑیں لاشعور میں ہوتی ہیں، اور یہ دوسرے لوگوں کی ناپسندیدگی کی شکل میں شعور میں نمودار نہیں ہوتیں۔ شعور میں بعض کاموں کو گناہ قرار دیا جاتا ہے، لیکن مطالعۂ باطن اس کی کوئی وجہ مہیا نہیں کر سکتا۔ جب کوئی شخص یہ کام کرتا ہے، تو وہ مضطرب ہو جاتا ہے، لیکن خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اضطراب کی وجہ کیا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اُن لوگوں میں سے ہوتا، جو اُس چیز سے بچ سکتے ہیں، جس کو وہ گناہ سمجھتا ہے۔ وہ اخلاقی حیثیت سے قابل تعریف صرف اس شخص کو قرار دیتا ہے، جو دل کا صاف ہو۔ وہ کم و بیش افسوس کے ساتھ یقین کر لیتا ہے کہ ولی بننا اس کی تقدیر میں نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ولی کا جو نقشہ اس کے ذہن میں ہوتا ہے، اُس کے مقابلے کا روزمرہ زندگی میں کوئی شخص نہیں ملتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تمام عمر گناہ کے احساس ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دُنیا کی بہترین چیزیں اس کے لئے نہیں ہیں، اور یہ کہ اس کی زندگی کے بہترین لمحے وہ ہیں، جو وہ توبہ استغفار میں گزارتا ہے۔

قریب قریب ہر مثال میں اُس کے اِس وہم کی ابتدا اُس اخلاقی تعلیم سے ہوتی ہے جو اُس کے ماں باپ نے اُس کی چھ برس کی عمر سے پہلے اُس کو دی تھی۔ اس عمر پر پہنچنے سے پہلے اس کو بتایا گیا تھا کہ گالی دینا بُری بات ہے۔ اور شریفوں کی سی گفتگو کے علاوہ ہر بات چیت اچھی نہیں۔ صرف بُرے آدمی شراب پیتے ہیں، اور تمباکو بہترین نیکیوں کے لئے زہر ہے۔ اس کو سکھایا گیا تھا کہ اس کو کسی حالت میں بھی جھوٹ نہ بولنا چاہئے، اور آلاتِ تناسل کے ساتھ دلچسپی کا اظہار سب سے بڑی بُری بات ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام عقیدے اس کی ماں کے ہیں، لہٰذا وہ گویا خدائی احکام ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوشی یہ ہوتی ہے کہ اُس کی ماں اُس سے محبت کرے، اور اِس کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ترکیب ہے کہ وہ اِن اخلاقی ضابطوں کی

خلاف ورزی نہ کرے۔ اس طرح پر وہ کام جو اس کی ماں کو ناپسند ہے، بے انتہا خوفناک بن گیا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے
وُہ یہ تو بھولتا جاتا ہے کہ ان اخلاقی احکام کا سرچشمہ کہاں ہے اور ان کی خلاف ورزی کی اصلی سزا کیا تھی۔ لیکن وہ نہ تو ان اخلاقی
احکام کو بھولتا ہے، نہ اس کا یہ احساس مٹتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کو بدترین سزا ملنے والی ہے۔

بچپن کی اس اخلاقی تعلیم کا بہت بڑا حصّہ عقلی حیثیت سے بے بنیاد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک معمولی آدمی اپنی معمولی
زندگی میں اس کو استعمال بھی نہیں کر سکتا۔ ایک شخص مثلاً بدزبانی کرتا ہے، عقلی لحاظ سے وہ اس شخص سے بُرا نہیں، جو ایسا نہیں
کرتا۔ تاہم گالیوں سے بچنا ولی کے تخیّل کا لازمی جزو ہے۔ عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ خیال لغو ہے۔ یہی حال شراب پینے
اور تمباکو استعمال کرنے کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جنوبی ملکوں میں شراب پینے کو نہیں، بلکہ نہ پینے کو بُرا سمجھا جاتا ہے، کیونکہ حضرت عیسےٰ
اور ان کے حواریوں نے شراب پی تھی۔ رہ گیا تمباکو، سو اس کے متعلق آسانی کے ساتھ سلبی نقطۂ نظر اختیار کیا جا سکتا ہے، کیونکہ
تمام بڑے بڑے اولیا، اس وقت گزرے ہیں جب تمباکو کا نام بھی سننے میں نہ آتا تھا۔ لیکن یہاں بھی کوئی عقلی اعتراض سُجھائی
نہیں دیتا، یہ خیال کہ کوئی ولی تمباکو استعمال نہ کرے گا، آخر کار اس خیال پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کوئی کام بھی محض لذت
حاصل کرنے کی خاطر نہ کرے گا۔ معمولی روزمرہ اخلاق کا یہ زاہدانہ حصّہ تقریباً لاشعوری ہو چکا ہے، لیکن یہ ان تمام طریقوں میں عمل
کرتا ہے، جن سے ہمارا اخلاقی ضابطہ غیر اخلاقی ہو جاتا ہے۔ عقلی اخلاقیات میں دوسرے لوگوں، بلکہ خود اپنے آپ کو بھی، خوش
کرنا قابلِ تعریف کہا جائے گا۔ بہ شرطیکہ اس کے بعد پھر اتنی ہی تکلیف نہ پہنچے۔ اگر ہم اپنے زہد کو چھوڑ دیں، تو مثالی نیک شخص
وہ ہوگا، جو اچھی چیزوں سے لذت حاصل کرنے سے منع نہیں کرتا، بہ شرطیکہ اس کے بعد کوئی ایسے بُرے اثرات پیدا نہ ہوں،
جن سے یہ لذّت ملیامیٹ ہو جائے۔ جھوٹ بولنے کے مسئلہ پر پھر غور کرو۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ دُنیا میں بہت جھوٹ
بولا جا رہا ہے، اور یہ کہ اگر دُنیا میں اتنا ہی سچ بولا جاتا، تو ہم سب کے لئے اچھا ہوتا۔ لیکن مجھے اس سے یقیناً انکار ہے اور میرا
خیال ہے کہ ہر معقول آدمی میرے ساتھ اتفاق کرے گا، کہ جھوٹ بولنا ہر حالت میں ناجائز ہے۔ ایک دفعہ میں جنگل کی طرف سیر
کرنے گیا۔ راستے میں میری نظر ایک لومڑی پر پڑی، جو تکان کے مارے بے دم ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی برابر بھاگی چلی جا رہی تھی۔
اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شکاری دکھائی دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "کیا تم نے لومڑی دیکھی ہے؟" میں نے کہا "ہاں"۔
جب اُس نے پوچھا کہ وہ کس طرف گئی ہے، تو میں نے جھوٹ بول دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں سچ بول دیتا، تو میں دُنیا کا
سب سے بُرا آدمی ہوتا۔

لیکن بچپن کی اخلاقی تعلیم کا بدترین اثر جنسی معاملات پر پڑتا ہے۔ اگر کسی بچے کی رسمی تعلیم کسی سخت گیر ماں باپ، یا آیا کے
ہاتھوں ہوئی ہے تو چھ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے گناہ اور آلاتِ تناسل کا تعلق اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ وہ تمام عمر توڑا نہیں

جاسکتا۔ پھر اوڈی پس مؤلف[۱] سے اس احساس کی اور تقویت ہوتی ہے، کیونکہ بچپن میں سب سے زیادہ محبوب وہ عورت ہوتی ہے جس سے ہم جنسی حیثیت سے آزادی کے ساتھ مل جُل نہیں سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر جوان آدمی عورت کو صرف اس لئے ذلیل سمجھتے ہیں کہ وہ عورت ہے، اور یہ اپنی بیویوں کی اس وقت تک عزت نہیں کرتے، جب تک کہ وہ وظیفۂ جنسی سے نفرت نہ کریں۔ لیکن جس مرد کی بیوی میں نفسانی خواہشات نہیں ہوتیں، وہ کسی دوسری جگہ جاکر اپنی جبلی خواہشات پوری کرلیتا ہے۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کی خواہشات کی تشفی ہوجاتی ہے، تب بھی گناہ کا احساس اس تشفی کو زہر آلود کردیتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ شخص کسی عورت کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکتا، یہ عورت منکوحہ بیوی ہو یا غیر منکوحہ داشتہ، دوسری طرف اگر عورت کو "باعصمت" رہنے کی سختی کے ساتھ تعلیم دی جائے۔ تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ عورت اپنے خاوند کے ساتھ جنسی تعلقات پیدا کرنے سے کتراتی ہے اور ان تعلقات سے خوشی حاصل کرنے سے ڈرتی ہے۔ لیکن اب ہمارے زمانے میں عورت کا وہ حال نہیں، جو پچاس برس پہلے تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت مرد کی جنسی زندگی کے مقابلے میں عورت کی جنسی زندگی گناہ کے احساس کی زہر آلودگی کی وجہ سے بہت کم بدلی[۲] ہے۔

اب عام طور پر یہ احساس ہونا شروع ہوگیا ہے کہ بچوں کو جو روایتی جنسی تعلیم دی جاتی رہی ہے، وہ اچھی نہیں، گو یہ احساس ابھی تک ان لوگوں کو نہیں ہوا، جو عوام کی ہر طرح کی صحت کے ذمہ دار ہیں۔ جنسی تعلیم کا صحیح اصول بالکل سادہ ہے، یعنی یہ کہ جب تک کہ بچہ یا بچی جوان ہونے کے قریب نہ ہو، اُس وقت تک اس کو کسی قسم کی جنسی تعلیم نہ دی جائے اور اس کے دل میں یہ خیال جمنے نہ دیا جائے کہ طبعی جسمانی وظیفوں میں کوئی چیز نفرت کے قابل ہے۔ جس عمر میں اخلاقی تعلیم بالکل لازمی ہوجائے تو کوشش ہونی چاہئے کہ یہ تعلیم معقول اور عقلی ہو، اور قدم قدم پر اخلاقی احکام کی بنا واضح کی جائے۔ لیکن اس وقت میں تعلیمات کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتا، یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک جوان شخص گناہ کے غیر معقول احساس کو پیدا کرنے میں غیر عاقلانہ تعلیم کے بُرے اثرات کو کس طرح کم کرسکتا ہے۔

یہاں زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ لاشعور کو اُن معقول عقیدوں کا خیال رکھنے پر مجبور کیا جائے، جو ہمارے شعوری فکر پر مسلط ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے جذبات کے ہاتھوں میں نہ دے، اور ایک وقت ایک عقیدہ اور دوسرے وقت دوسرا عقیدہ رکھے۔ گناہ کا احساس اس وقت خاص طور پر بہت اُجاگر ہوجاتا ہے، جب تکان، بیماری، نشے، یا کسی اور وجہ سے شعوری ارادہ کمزور ہوجاتا ہے۔ ایسے وقتوں میں جو خیال بھی کسی کے دل میں آتا ہے (بہ شرطیکہ یہ نشے کی وجہ سے نہ آئے) وہ کسی برتر ذات

---

[۱] Oedipus Complex۔ "لڑکے کی (عموماً لاشعوری) خواہش کہ باپ کو قتل کرکے ماں کو اپنی بیوی بنالے۔" یا بقول بعض "ماں کے ساتھ بیٹے کی حد سے زیادہ محبت جس کے ساتھ شہوانی عنصر بھی ہو۔" (مترجم)

[۲] مترجم کے لئے مصنف کا ہم خیال ہونا ضروری نہیں۔

کی طرف سے الہام سمجھا جاتا ہے۔ "شیطان بیمار تھا" اور "شیطان ولی بن گیا"۔ لیکن یہ فرض کرنا ہی بے معنی ہے کہ جتنی بصیرت کمزوری کے لمحوں سے حاصل ہوتی ہے، وہ قوت کے لمحوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ کمزوری کے لمحوں میں بچپن کے خیالات کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ان کو ایک صحیح اور تندرست قویٰ والے جوان آدمی کے عقیدوں کے مقابلے میں بہتر سمجھنے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ برخلاف اس کے ہونا یہ چاہئے کہ قوت کے لمحوں میں جو خیالات اور عقیدے بھی کوئی شخص اپنے ارادے سے اور پختہ دلیلوں کی بنا پر قائم کرے، وہ اُن خیالات اور عقیدوں کا معیار بن جائیں، جن پر ہر وقت اس کا یقین ہونا چاہئے۔ صحیح قسم کے طریق عمل سے دودھ پینے کے زمانے کے لاشعوری خیالات کو زیر کر لینا، بلکہ لاشعور کی ترکیب ہی کو بدل دینا بالکل ممکن ہے۔ جب کبھی تم کو اپنے کسی ایسے کام پر افسوس ہو، جس کے متعلق تمہاری عقل کہتی ہے کہ وہ بُرا نہیں، تو تم کو چاہئے کہ اپنے افسوس کے احساس کے وجوہ پر غور کرو اور اس کی لغویت کا اپنے آپ کو اطمینان دلا دو۔ تمہارے شعوری عقیدے اتنے واضح اور زوردار ہونے چاہئیں کہ تمہارے لاشعور پر ان کا ایسا اثر پڑے کہ بچپن کے زمانے میں تمہاری ماں یا آیا نے جو خیالات تمہارے دل میں ڈالے تھے، وہ دب جائیں۔ معقولیت اور عدم معقولیت کے لمحوں کے درمیان ڈانواں ڈول ہونے پر قناعت مت کرو۔ عدم معقولیت پر گہری نظر ڈالو، اور پکا ارادہ کر لو کہ تم اس کا احترام نہ کروگے، اور نہ اس کو اپنے اوپر غالب آنے دوگے۔ جب کبھی یہ احمقانہ خیالات اور حسیات تمہارا شعور تم میں ٹھونسے، تو ان خیالات وحسیات کو جڑ سے اُکھاڑ دو، ان پر غور کرو، اور ان کو دُور پھینک دو، اپنے آپ کو ایسا ڈانواں ڈول ہونے والا جانور مت بننے دو، جس کو کبھی عقل ایک طرف جُھکاتی ہے، اور کبھی بچپن کی بے وقوفی دوسری طرف۔ جو لوگ تمہارے بچپن میں تمہیں راستہ بتانے والے تھے، اُن کو تحقیر کے ساتھ یاد کرنے سے مت ڈرو۔ اُس زمانے میں وہ تمہارے نزدیک زوردار اور عقلمند اس لئے تھے کہ تم کمزور اور بے وقوف تھے۔ اب تم نہ کمزور ہو، نہ بے وقوف، لہٰذا اب تمہارا کام یہ ہونا چاہئے کہ تم اُن کی ظاہری قوت اور عقل کو پرکھو، اور سوچو کہ واقعی وہ اس عزت کے مستحق ہیں، جو تم محض عادت کی وجہ سے، ان کی کرتے ہو؟ اپنے آپ سے پوچھو کہ جو اخلاقی تعلیم رسمی طور پر بچوں کو دی جاتی ہے، اس سے دنیا کا واقعی کوئی بھلا ہوا۔ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ جس شخص کو رسمی طور پر نیک کہا جاتا ہے، اس کی بناوٹ میں کس قدر خالص توہمات شامل ہیں۔ اس بات پر غور کرو کہ احمقانہ روک تھام نے اخلاق کے ذہنی خطروں کی روک تھام کے لئے ہر قسم کا بندوبست کیا لیکن جن حقیقی اخلاقی خطروں سے جوان آدمی کو سابقہ پڑتا ہے، ان کا نام بھی نہ لیا گیا۔ وہ کون سے نقصان پہنچانے والے کام ہیں، جن کے کرنے کا ہر جوان میں میلان پایا جاتا ہے؛ تجارتی کاروبار میں وہ تمام بے قاعدگیاں جن کے لئے قانون میں کوئی سزا نہیں، ملازموں کے ساتھ سختی، بیوی بچوں کے ساتھ بے رحمی، اپنے آپ سے مقابلہ کرنے والوں سے دشمنی، ملک کے جھگڑوں میں تیزی اور تندی ——— یہی وہ گناہ ہیں، جو سچ مچ نقصان پہنچانے والے ہیں، اور جو اُن لوگوں میں بہت عام ہیں، جو عزت کے قابل ہیں، اور جن کی عزت

کی جاتی ہے۔ ان گناہوں کی وجہ سے ایک شخص اپنے ملنے جلنے والوں میں مصیبت پھیلاتا ہے، اور تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے میں
مدد دیتا ہے، لیکن جب یہ شخص بیمار پڑتا ہے، تو ان گناہوں کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے محروم رہنے کا مستحق نہیں سمجھتا۔
یہ وہ باتیں ہیں، جن کی وجہ سے وہ ڈراؤنے خوابوں میں یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی ماں ملامت کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ
رہی ہے۔ اس کے تحت شعوری اخلاق عقل سے بیگانہ کیوں ہو جاتے ہیں؟ صرف اس سبب سے کہ بچپن میں اس کی نگہداشت
کرنے والے جن اخلاق کے قائل تھے، وہ احمقانہ اور بے معنی تھے، اور اس وجہ سے کہ یہ اخلاق فرد پر قوم کے فرائض کے مطالعے
کا نتیجہ نہ تھے، بلکہ یہ غیر معقول طور پر منع کی ہوئی باتوں کے فرسودہ ٹکڑوں کا مجموعہ تھے، اور یہ کہ خود ان میں اُس خرابی اور فساد کے
حصے پائے جاتے تھے، جو روما کی دم توڑنے والی سلطنت کی روحانی بیماری کا نتیجہ تھے۔ ہماری نام کی اخلاقیات پادریوں اور ذہنی
حیثیت سے غلام عورتوں کی بنائی ہوئی ہے۔ دُنیا کی معمولی زندگی میں مرد کو حصہ لینا پڑتا ہے، لہٰذا اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ اس
بیماری پیدا کرنے والی لغویت کے خلاف بغاوت کرنا سیکھے۔

لیکن فرد کی خوشی کو پیدا کرنے، اور آدمی کو دو مختلف معیاروں کے درمیان ٹھوکریں کھانے کی بجائے ایک ہی معیار
کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے میں اس بغاوت کو اگر کامیابی ہو سکتی ہے، تو صرف اس طرح کہ وہ اُن باتوں کو سوچے اور
پرکھے جو اس کی عقل اس کے دل میں ڈالتی ہے۔ اکثر لوگ اپنے بچپن کے توہمات کو بہ ظاہر ترک کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ
ان کی مہم سر ہو گئی۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کی ظاہری زندگی کی تہ میں یہ توہمات اب بھی زندہ ہیں۔ جب تم کسی معقول
عقیدے تک پہنچ جاؤ، تو ضروری بات یہ ہے کہ اس پر غور کرو، اس کے نتیجوں کو سمجھو، اور اُن عقیدوں کا کھوج لگاؤ، جو اس نئے
عقیدے کے بعد بھی باقی رہنے والے ہیں۔ پھر اگر کسی وقت گناہ کا احساس زوردار ہو جائے، اور یقین مانو کہ یہ کبھی کبھی زوردار ضرور
ہوگا، تو اس کو نہ الہام سمجھو، اور نہ برتر چیزوں کی طرف بلاوا مانو۔ اگر یہ کسی ایسے کام کا نتیجہ نہ ہو جس کو معقول اخلاقیات بُرا کہتی ہو،
تو اس کو ایک بیماری اور ایک کمزوری خیال کرو۔ اس تمام گفتگو سے میرا یہ مطلب نہیں کہ انسان اخلاقیات کو بالکل چھوڑ بیٹھے میرا
مطلب صرف یہ ہے کہ اس کو متوہمانہ اخلاق سے بچنا چاہئے۔ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص خود اپنے معقول اخلاقی ضابطے کی خلاف ورزی بھی کرے، تب بھی میرے نزدیک زندگی کو بہتر بنانے
کے لئے گناہ کو محسوس کرنا کوئی اچھا طریقہ نہیں، گناہ کے احساس میں ایک طرح کی ذلت ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود
اپنی عزت کرنے کے قابل نہیں۔ اس بات سے آج تک کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ معقول آدمی خود اپنے ناپسندیدہ کاموں
کے متعلق بالکل وہی رائے رکھتا ہے، جو وہ اوروں کے ایسے ہی کاموں کے متعلق رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ایسے کام ہیں
جو بعض خاص حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور اس قابل ہیں کہ ان کی ناپسندیدگی روشن ہو جانے کے بعد ان سے بچا جائے، یا اگر

ممکن ہو تو ان حالات سے کنارہ کیا جائے، جن میں یہ پیدا ہوتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گناہ کا احساس بہتر زندگی کو پیدا کرنے کی بجائے آدمی سے اس کی خوشی کو چھین لیتا ہے، اور وہ خود اپنے آپ کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح ناخوش ہوجانے کے بعد وہ اور لوگوں سے بہت زیادہ باتوں کی اُمید رکھتا ہے، اور اس کی یہ امید اوروں کے ساتھ اس کے تعلقات کو خوش آیند نہیں بننے دیتی۔ جب وہ اپنے آپ کو ذلیل اور کمتر سمجھنے لگتا ہے، تو اس کو ہر اُس شخص سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جس کو وہ اپنے آپ سے برتر سمجھتا ہے۔ تعریف کرنا اُس کے لئے مشکل ہوجاتا ہے اور حسد کرنا آسان۔ اس کو ہمیشہ وہ شخص ملتا ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتا، لہٰذا وہ ہمیشہ تنہا رہ جاتا ہے۔ دوسروں سے کھلے دل اور خلوص کے ساتھ ملنے سے نہ صرف دوسروں کو خوشی حاصل ہوتی ہے، بلکہ اس طرح ملنے والا بھی خوش رہتا ہے، کیونکہ دوسرے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جس شخص کے سر پر گناہ کے احساس کا بھوت سوار رہتا ہے، اس کے لئے دوسروں سے اس طرح ملنا بہ مشکل ممکن ہوتا ہے۔ اس طرح ملنے کے لئے خود اپنی ذات پر اعتماد اور ذہنی تکمّل ہونا چاہئے۔ ذہنی تکمّل سے میری مُراد یہ ہے کہ انسانی فطرت کی تمام پرتیں، یعنی شعوری، تحت شعوری اور لاشعوری مل کر کام کریں، نہ یہ کہ یہ ہمیشہ آپس میں لڑتی رہیں۔ اکثر صورتوں میں تو یہ حالت معقول تعلیم سے پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن تعلیم اگر غیر معقول ہو، تو اس کو پیدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے، نفسی تحلیل کے ماہر اسی حالت کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اکثر مثالوں میں تو مریض یہ کام خود کر سکتے ہیں۔ ہاں معاملہ جب بہت ہی بگڑ جاتا ہے تو ماہر علاج کرنے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم یہ نفسیاتی محنت کریں۔ ہمیں اپنی زندگی میں بہت مصروفیت رہتی ہے۔ ہمارا لاشعور جو کچھ چاہتا ہے کرلے۔ جو ذات کہ خود اپنے آپ سے لڑتی رہتی ہے، اس کی نہ صرف خوشی کم ہوجاتی ہے، بلکہ اس کے کام کرنے کی طاقت بھی کمزور پڑجاتی ہے۔ اپنی ذات کے مختلف حصّوں میں اتحاد پیدا کرنے میں جو وقت ہم صرف کرتے ہیں، وہ بے کار نہیں جاتا۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں اپنی ذات کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ہر روز کوئی وقت، مثلاً ایک گھنٹہ مقرر کرلینا چاہئے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ اچھا نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے ہم اپنے آپ میں بہت زیادہ محو ہوجاتے ہیں، اور اس طرح محو ہوجانا اُس بیماری کا ایک حصّہ ہے، جس کا ہم علاج تجویز کررہے ہیں، جس ذات کے تمام حصّے مل کر کام کرتے ہیں، وہ خود اپنے اندر کی طرف نہیں بلکہ باہر کی طرف دیکھتی ہے۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہم کو قطعی طور پر یہ فیصلہ کرلینا چاہئے کہ ہم کن کن باتوں پر معقولیت کے ساتھ یقین رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ان عقیدوں کے خلاف کوئی ایسا غیر معقول خیال ہمارے دل میں نہ آنا چاہئے جس کی ہم جانچ پرتال نہ کرلیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ یہ غیر معقول خیال ہم پر قبضہ نہ جمالے، یہ قبضہ خواہ کتنی ہی تھوڑی دیر کے لئے ہو۔ یہ اُن موقعوں پر خود اپنے آپ سے سوال کرنے کا مسئلہ ہے، جب ہم بچّہ بن جانے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر یہ

تمام سوال وجواب کافی زوردار ہیں تو پھر یہ بہت مختصر ہوتے ہیں، لہٰذا ان میں جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ قابلِ لحاظ نہیں۔

اکثر لوگ عقلیت کو پسند نہیں کرتے، لہٰذا جو کچھ کہ میں نے اب تک کہا ہے، وہ ان لوگوں کو نامناسب اور غیر ضروری معلوم ہوگا۔ ایک خیال یہ ہے کہ عقلیت کو آزاد چھوڑ دینے سے تمام گہرے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عقیدہ انسانی زندگی میں عقل کے وظیفے کے متعلق بالکل غلط عقیدے کا نتیجہ ہے، جذبات کو پیدا کرنا عقل کا کام نہیں، گو اُن جذبات کو روکنے کے طریقوں کو دریافت کرنا اس کے کام میں شامل ہو سکتا ہے، جو انسانی خوش حالی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفرت اور حسد کو کمترین بنانے کے طریقوں کو معلوم کرنا عقلی نفسیات کے کاموں میں سے ایک کام ہے لیکن یہ فرض کر لینا غلط ہے کہ ان جذبات کو کمترین کرنے سے ہم اُن جذبات کی قوت کو بھی کم کر دیں گے، جو عقل کے نزدیک بُرے نہیں۔ عشق، والدین کی محبت، دوستی، سخاوت اور علم یا فن میں محویت، میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کو عقل کم کرنا چاہیے گی عقل مند آدمی جب ان جذبات کو محسوس کرتا ہے، تو اس کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ انہیں محسوس کر رہا ہے۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جس سے ان کا زور ٹوٹ جائے، کیونکہ یہ تمام جذبات اچھی زندگی کا حصہ ہیں۔ اچھی زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو خود ہم میں اور اوروں میں خوشی کو پیدا کرتی ہے۔ خود ان جذبات میں کوئی چیز غیر معقول نہیں، اور اکثر غیر معقول آدمی صرف خفیف ترین جذبات کو محسوس کرتے ہیں۔ کسی شخص کو یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیئے کہ اگر وہ معقول آدمی بن جائے گا تو اس کی زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ معقولیت بہت بڑی حد تک اس بات کا دوسرا نام ہے کہ ذات کے تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں۔ لہٰذا جس شخص کی ذات کو یہ بات نصیب ہے یعنی جو شخص معقول ہے، وہ دنیا پر غور و فکر اور بیرونی عقیدوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنی قوتوں کے استعمال میں اُس شخص کی بہ نسبت زیادہ آزاد ہے، جس کی ذات کی اندرونی لڑائیاں قدم قدم پر روڑے اٹکاتی ہیں۔ خود اپنی ذات کے ساتھ لپٹے رہنے سے زیادہ کوئی اور چیز دُنیا میں بے لُطف نہیں اور اپنی قوت اور توجہ کو باہر کی طرف پھیلانے سے زیادہ کوئی اور چیز خوشی اور لطف کو پیدا کرنے والی نہیں۔

ہماری رسمی اخلاقیات کو ذات کے ساتھ ضرورت سے زیادہ تعلق ہے، اور گناہ کا خیال ذات کی طرف اس غیر عاقلانہ توجہ کا ایک حصہ ہے۔ جن لوگوں کو اس ناقص اخلاقیات کی پیدا کی ہوئی ذاتی حالتوں سے سابقہ نہیں پڑا، اُن کو عقل غیر ضروری معلوم ہوگی۔ لیکن جن لوگوں لوگوں کو یہ روگ لگ چکا ہے، اُن کے علاج کے لئے عقل ضروری ہے، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ذہنی ترقی میں یہ بیماری ضرور پیدا ہوتی ہے۔ میرا خیال تو کچھ ایسا ہے کہ جو شخص عقل کی مدد سے اس بیماری کے درجے سے آگے بڑھ گیا ہے، وہ ذہنی ترقی میں اس شخص کے مقابلے میں اعلےٰ رتبے پر ہے، جس کو نہ تو کبھی یہ بیماری ہوئی، اور نہ جس نے عقل سے اس بیماری کا علاج کیا۔ ہمارے زمانے میں لوگ عام طور پر عقل سے نفرت کرتے ہیں۔ بڑی حد تک اس کی

وجہ یہ ہے کہ عقل کے کاموں کا کسی بنیادی طریقے سے خیال قائم نہیں کیا جاتا۔ جس شخص کی ذات کے مختلف حصّے آپس میں ہی لڑمرتے ہیں، وہ جوش اور ہنگامے کی تلاش کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ خود اپنے آپ سے الگ ہو جائے۔ وہ زوردار جذبات کو کسی مضبوط دلیل کی بنا پر پسند نہیں کرتا، وہ ان کو صرف اس لئے پسند کرتا ہے کہ ان کی بدولت وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے، اور اس کو سوچنے کے تکلیف دہ عمل سے نجات مِل جاتی ہے۔ اس کے لئے ہر جذبہ ایک نشہ بن جاتا ہے اور چونکہ وہ بنیادی خوشی کا کوئی خیال قائم نہیں کر سکتا، لہٰذا وہ سمجھتا ہے کہ تکلیف صرف نشے ہی سے رفع کی جا سکتی ہے لیکن اس کا یہ خیال ایک بہت بڑی بیماری کی علامت ہے۔ جس شخص کو یہ بیماری نہیں ہوتی، اس کو سب سے بڑی خوشی اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کا پوری طرح مالک ہو۔ جن لمحوں میں ذہن بہت زیادہ کام کرتا ہے اور بہت کم چیزیں ذہن سے مٹتی ہیں، انہیں لمحوں میں سب سے زیادہ زوردار خوشیاں محسوس ہوتی ہیں۔ یہی خوشی کی سب سے اچھی کسوٹی ہے جس خوشی کو نشے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ نشہ کسی قسم کا ہو، وہ بے کار ہوتی ہے، اور اس سے تسلّی نہیں ہو سکتی۔ جس خوشی سے واقعی ہماری تسلّی ہو سکتی ہے، وہ ہماری قوّتوں کے پورے عمل، اور جس دُنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کے پورے پورے علم کے ساتھ ساتھ آتی ہے۔

(برٹرینڈ رسل) ـــــــ معتضد ولی الرحمٰن

دل جس سے خوش نہیں ہوا اُس نے بہشت کے غم تج

منصبِ ناصح رہا تسلّی نام رکھ دیا

دل جس سے پھر گیا اُسے شیطاں بنا دیا

مردودِ بارگاہ جسے انا نام رکھ دیا

شملہ نے شاعر سے کہا

گھلے تھے سرمدی نغمے یہاں کی آبشاروں میں
چٹانوں پر یہاں پھرتے تھے نغمے رقص فرماتے
یہاں رنگین و سیمیں مچھلیاں تھیں جوئباروں میں
ہوا کی موج پر بہتے تھے طائر جھومتے گاتے

یہاں چشموں پہ کنواری لڑکیاں آکر نہاتی تھیں
بدن کی چاندنی باریک کپڑوں سے جھلکتی تھی
یہاں رنگیں ہوائیں وادیوں میں گنگناتی تھیں
گلستاں جھومنے لگتے تھے جب پُروا سنکتی تھی

چھڑکتی تھیں جب افشاں چوٹیوں پر چاندنی راتیں
ہر اِک دوشیزہ رشکِ حُوریاں معلوم ہوتی تھی
لٹاتی تھیں گُہر جب بوندیوں کے مست برساتیں
یہاں ہر راہ موجِ کہکشاں معلوم ہوتی تھی

انھیں پگڈنڈیوں پر چھاگلیں اکثر جھنکتی تھیں
چٹانوں پر جب آکر لڑکیاں دھومیں مچاتی تھیں
حسیں باہوں کی رنگیں چوڑیاں باہم کھنکتی تھیں
جو مل کر سبزۂ گل ریز پر وہ لڑکھڑاتی تھیں

یہاں پتھر تھے یاقوتی چٹانیں ارغوانی تھیں
گلابی دامنِ صحرا تھا ندیاں آسمانی تھیں

یہاں کے پھول تھے زرپوش کلیاں زعفرانی تھیں
یہاں کی وادیاں سبزے کے قالینوں سے دھانی تھیں

یہاں پگھلی ہوئی چاندی سے بڑھ کر صاف تھا پانی
ندی کی تہ میں افشاں کی طرح ذرّے دمکتے تھے
حسیں موجوں میں ہر اک سیپ تھی لعلِ بدخشانی
سحر کی ضَو میں تاروں کی طرح پتھر چمکتے تھے

کلی کی شام کو جب نیند سے پلکیں جھپکتی تھیں
ہوائیں شام کی آ کر اُسے لوری سناتی تھیں
محبت سے اُسے کنجِ گلستاں میں تھپکتی تھیں
تھپک کر رات کو شاخوں کے جھولوں میں سلاتی تھیں

یہاں جب بانسری کی تان چرواہے سناتے تھے
یہاں کی کہکشاں سی چھوٹتی تھیں شب کو پھلجھڑیاں
چراگاہوں سے چرواہے جب آ کر گیت گاتے تھے
فلک پر ناچتی تھیں شب کو تاروں کی سُبک لڑیاں

مگر سنگیں تمدّن نے مرے شیشے کچل ڈالے
مجھے آ کر یہاں انسان نے آباد کر ڈالا
فضا کا خون کر کے سینکڑوں منظر بدل ڈالے
اسی خونی درندے نے مجھے برباد کر ڈالا

جلال ملیح آبادی

نجات

"گناہ سے توبہ کرنے والا اُس کی مانند ہو جاتا ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔"

(قرآن مجید)

عرس ہو رہا تھا۔ دور دراز کی طوائفیں قوالی گانے اور عرس میں شریک ہونے آئی تھیں۔ ہزاروں آدمیوں کا جم غفیر تھا، ان میں وہ صوفیا بھی تھے جو ہر عشقیہ شعر کو اپنے محبوب حقیقی کی جانب منسوب کر کے عالم وجد میں رقص کرنے لگتے، اور وہ دنیادار بھی تھے جو پیاری صورتوں، خوبصورت لباس اور جادو بھری آواز میں موسیقی کا مظاہرہ کرنے والیوں پر فریفتہ ہو جاتے تھے۔

مزار کو پہلے ہی گلاب اور کیوڑے کے عرق سے غسل دیا جا چکا تھا۔ سبز حریر کے مخملوں سے ڈھانک دیا گیا تھا، برقی قمقموں سے جو مختلف اللون نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں ان سے پورا قوالی خانہ جگمگا رہا تھا۔ وسط میں جو تخت رکھا تھا اُس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ یہی تخت اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ جس کی باری آتی وہی طوائف مع اپنے سازندوں کے آتی اہل محلس کو جھک کر آداب بجا لاتی، اور پھر مزار کی جانب رُخ کر کے اس تخت پر جلوہ افروز ہوتی اگاتی اور ناچتی تھی۔ جتنا وقت دیا جاتا اسی میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی۔ خراج تحسین کے ساتھ ساتھ برسنے والے روپے بھی اُٹھا لیتی، پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاتی۔

سب کی نگاہیں زیادہ تر آفتاب کی جانب مرکوز ہوتی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنی ہم عصروں میں سب سے کم عمر اور سب سے حسین تھی اس کی ریشمی ساری سب سے قیمتی تھی۔ اس کی کلائی میں گھڑی بھی بندھی تھی۔ گلے میں جڑاؤ چندن ہار تھا اور سفید اور عریاں بازوؤں میں جو بازوبند بندھے تھے ان میں بڑے بڑے چمکدار زمرد جڑے تھے جن کی چمک کے سبب نگاہیں کام نہیں کرتی تھیں۔ آفتاب کا ننھا بچہ بھی ہمراہ تھا۔ جس کے گلے میں درجنوں تعویذ پڑے ہوئے تھے، شاید بڑی منتوں مرادوں کی اولاد ہو گی۔ آفتاب جان کی بوڑھی ماں جس کے گالوں پر دونوں جانب پانچ پانچ جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اپنی بیٹی کو تمام جلسے کی توجہات کا مرکز دیکھ کر شاید خوشی کے مارے پھولے نہ سماتی ہو گی۔ کیونکہ بار بار وہ پہلے تمام مجمع پر غلط انداز نگاہ ڈال کر اپنی بیٹی آفتاب جان کی ایک نہ ایک خدمت انجام دے دیتی تھی۔ اگر بچہ روئے تو اسے اپنے ہاتھوں میں چت لٹا کر "نہیں نہیں" کا ترانہ گاتے ہوئے اپنی بیٹی آفتاب جان کو دے کر کہتی تھی ― "ذری دودھ پلا لو بیٹا!" اور پھر ایک سفید چادر لے کر دوڑی آتی اور دودھ پیتے بچے اور اس کی ماں کے گرد اسے اس وقت تک لپیٹے کھڑی رہتی کہ بچہ پوری طرح دودھ نہ پی لیتا، کبھی دم بدم گلوریاں بنا کر چاندی کی تھالی میں رکھ کر اپنی خوبصورت

بیٹی آفتاب جان کو پیش کرتی، کبھی عرس کے منتظم اصحاب کو بآوازِ بلند متوجہ کرتی "حضرات! بچی کا مُنہ خشک ہو رہا ہے۔ ازرائے خدا سوڈا اور برف اور صاف گلاس منگائیے!" اس کے رویے پر شاید آفتاب جان کڑھتی ہوگی، کیونکہ وہ ملامت آمیز لہجے میں اپنی اماں کو "اماں!" کہہ کر گھورتی تھی، اور پھر نگاہیں زمین کی طرف گرا دیتی تھی۔ لیکن اس کی ماں کا جی بھلا کیسے مان سکتا تھا۔ ماں کی چاہیتی جائی کو تکلیف ہو اور بوڑھی اماں مُنہ باندھے کیسے بیٹھی رہیں؟

آفتاب کے بازو سے موتی جان لکھنؤ والی بیٹھی ہوئی تھی۔ موتی آفتاب کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ وہ بھی ہزاروں میں ایک تھی۔ موتی کا حسن پختگی کے حدود سے بھی تجاوز کرتا جا رہا تھا، جبکہ آفتاب ہنوز ایک ایسی کلی تھی جس نے ابھی عالم شگفتگی میں قدم رکھا ہو، جس نے بہار کی صرف چند صبحیں دیکھی ہوں، جس نے نسیم چمن کے ساتھ ابھی ابھی اٹکھیلیاں شروع کی ہوں۔ موتی جان ایسا کِھلا ہُوا پھول تھی، جو کئی بہاریں دیکھنے کے بعد خزاں کے مرجھا دینے والے جھونکوں کا منتظر ہو۔

موتی جان بجز ایک حبابی ساری کے کچھ نہیں پہنے تھی۔ اس کے کان میں آویزے بھی نہیں تھے گلے میں کچھ بھی نہیں تھا، پیروں میں وہ گھنگرو بھی نہ تھے جو ہر ایک رقاصہ کو اپنے کمال فن کی داد حاصل کرنے کے لئے ضرور باندھنے پڑتے ہیں البتہ صرف دو پتلی طرار طلائی چوڑیاں، ایک ایک ہاتھ میں ایک ایک، وہ پہنے تھی۔ حالت بتا رہی تھی کہ زمانے کی گرم و سرد چشیدہ عورت یعنی اس موتی جان کا اب کوئی ولولہ، کوئی شوق، اور کوئی ارمان ایسا نہ تھا جو اسے زندہ رہنے کے لئے ترغیب دلائے۔

یکے بعد دیگرے طوائفیں گاتی رہیں۔ دو بجے کا عمل تھا جب آفتاب کی باری آئی۔ سب کا خیال تھا کہ خوبصورت اور فیشن ایبل مغنیہ کا گانا ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن آفتاب کی وجد آفریں آواز اور بہترین موسیقی نے تمام مجلس پر اپنا سکہ جما لیا۔ گو اسے پندرہ منٹ کا وقت دیا ہی گیا تھا تاہم لوگوں کے اصرار پر کامل دو گھنٹے تک اسے گانا پڑا۔ صوفیا آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے "ہَل مِن مَّزِید! ہَل مِن مَّزِید! واہ! ہائے!" کے نعروں میں بڑی بڑی کلاہوں اور دستاروں کے ساتھ، عباؤں اور قباؤں کے ساتھ سرِ محفل رقص کرنے لگتے تھے۔ روپوں کی بھی خاصی بارش ہوئی، جو آفتاب کی اماں جان جلدی جلدی سمیٹتی جاتی تھیں۔

آفتاب کا گانا بجائے خود ایک پیغام ہوتا، سرور و نشاط کا اور عشرت و انبساط کا، اور یہی پیغام سامعین کو اسے بار بار اسٹیج پر طلب کرنے کا محرک ہوتا تھا۔

اس کے بعد اجودھیا، الہ آباد، بمبئی، بیجاپور اور احمد نگر کی طوائفیں گاتی رہیں۔ پھر موتی جان کی باری آئی۔

جب موتی جان نے اپنی پُرسوز لے میں:۔

میں وہ شامِ غریبی ہوں کہ غربت مجھ پہ روتی ہے   وہ صبحِ دشتِ وحشت ہوں کہ وحشت مجھ پہ روتی ہے

گایا تو ایک سماں بندھ گیا۔ صورتوں پر سیاہی چھاگئی۔ سناٹا طاری ہوگیا۔ قنوطیت نے رجائیت کی جگہ چھین لی۔ سننے والوں کی روحیں کانپ اُٹھیں۔ یہی محسوس ہونے لگا کہ تمام مجمع تیرہ و تار غار میں دھکیل دیا گیا ہے اور ہر شخص ہاتھ آگے بڑھا بڑھا کر غار میں اپنا رستہ ٹٹول رہا ہے۔

یاس انگیزی کا سماں بندھ جانے کے بعد پھر اور بھی کئی گانے والیاں اسٹیج پر آئیں لیکن ان تاثرات کو نہ مٹایا جاسکا جو موتی جان کی المیہ موسیقی نے پیدا کئے تھے۔

جب وہ دوبارہ آفتاب کے پہلو میں آکر بیٹھی تو آفتاب نے سب سے پہلی بار کھلائے ہوئے منہ سے موتی کو دیکھا اور کہا ـــ "تشریف لائیے"ـــ پھر کہا ـــ "بہن! آج میں مانتی ہوں کہ آپ جیسی باکمال گانے والیاں بہت کم ہوں گی، کیا میں اعزاز حاصل کرسکتی ہوں کہ آپ سے چند گھنٹے فرصت کے وقت بات چیت کرسکوں۔ آج آپ نے میرے دل کو غمگین دل، اور میری روح کو غمگین روح بنا کے چھوڑا ہے۔"

موتی جان نے مسکرا کر جواب دیا (لیکن اس کی مسکراہٹ میں تلخی تھی) ـــ "بسر وچشم حاضر ہوں"۔

پھر آفتاب نے پوچھا ـــ "احمد آباد میں کب تک قیام رہے گا؟"

موتی نے کہا ـــ "یہی ایک دو ہفتے۔"

(۲)

سُورج کی کرنیں آدھے کھلے ہوئے دریچے میں سے گزر کر آفتاب جان کے دلفریب گالوں کو مس کر رہی تھی۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں سرخی تھی اور خمار تھا۔ پھر اس نے پلنگ پر لیٹے لیٹے انگڑائی لی۔ دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ "اُفوہ!" کہتی ہوئی اُٹھی اور غسل خانہ کی جانب چلی گئی۔

اس نے اپنے تمام زیور اُتار کر صندوقچے میں رکھ دیئے۔ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ گیلے بالوں میں بغیر خوشبودار تیل لگائے کنگھی کی، بال کانوں پر لاکر نہیں جمائے۔ سیدھی کھڑی مانگ نکالی۔ سادہ چوٹی اپنے ہاتھوں سے گوندھ لی۔ ہلکے بادامی رنگ کی ساری پہنی، بادامی جمپر پہنا۔ ساری میں کوئی چمکدار جڑاؤ پن نہ لگایا۔ بالوں میں بھی پن نہیں لگائے۔ ریشمی رومال بھی تہ کرکے رکھ دیا۔ صرف ایک سفید سوتی رومال ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا سا سینٹ البتہ لگایا لیکن مُنہ پر نہ غازہ ملا، نہ سُرخی لگائی، اور پھر بغیر ناشتہ کئے، بغیر کچھ کھائے پیئے کوٹھے سے نیچے اُتر گئی۔

اس کی ماں نے دروازے تک تعاقب کیا تھا۔ لیکن وہ نہ لوٹی تو بڑبڑاتی ہوئی واپس آکر ہانپتے ہانپتے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اب استاد جی کے آنے کا وقت ہے۔ یہ کم بخت نصیبوں جلی تھوڑا سا ریاض اور بڑھالے تو اس کا کیا بگڑ جائے۔ ہزار کہتی ہوں، بیٹا ریاض کر، پھر دیکھ جانکی بائی اور گوہر جان کا نام بھی کوئی بھولے سے نہ لیگا۔ مگر وہ ادھر بھی دھیان نہیں دیتی۔ روز بروز اپنی مرضی کی مختا

ہوتی جارہی ہے۔ نا بی یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔" اس نے اپنے آپ سے یہ بھی کہا —— "وہ کم بخت مردار موتی جان کو خدا غارت ہی کردے۔ جیسی وہ بوڑھی ہوتی جاتی ہے ایسا ہی میری بچی کو بنارہی ہے۔ نہ جانے کیا کرنے والی ہے۔ لکھنو والوں نے منہ پر تھوک دیا تو اب یہاں آئی ہیں، نہ جانے کیا کرنے والی ہیں، اب میری بچی کے درپے ہیں۔ خوب بہکا رہی ہیں، آج دس بارہ دن ہونے کو آئے، ادن نکلا اور یہ ناشدنی اسی کی ڈیوڑھی کی طرف چلی۔ آخر یہ ہے کیا، ہمیں بھی تو پیٹ لگا ہے۔ کل نواب وزیرالدولہ کا بیٹا آیا۔ اس کی طرف بھی مطلق التفات نہیں کیا۔ وہ بمبئی والا سیٹھ شام کو کتنا گھورتا ہوا نکلا تھا، اس نے اپنا موڑ کتنا آہستہ کردیا تھا اور یہی ہوتی ذرا مسکرادیتی، وہ فوراً آجاتا، کچھ مل ہی رہتا۔ دے کے جاتا، لے کے تھوڑا ہی جاتا، مردار کو کس قدر سمجھاتی ہوں کہ دیکھو بیٹا! پہاڑ سی زندگی پڑی ہے۔ کاٹنا ہی پڑے گا۔ خدا نے ہمیں بسوا بنایا ہے، یہ تو ہمارا پیشہ ہی ہے کہ کسی کو بہلائیں کسی کو پھسلائیں، کسی کو منہ لگائیں، کسی سے غیر ملتفت ہو جائیں۔"

جب سازندے آئے، ان سے بھی بڑھیا نے شکوے کئے، امامن میراثن کے کان سے کان لگا کر سرگوشیاں کرتی رہی، پھر آفتاب کے ننھے بچے جمیل کو کھلانے لگی۔

(۳)

وہ دونوں سابرمتی ندی کے کنارے ریت اور سنگریزوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

موتی جان نے جواب دیا —— میری خوبصورت چھوٹی بہن، تم غلط سمجھ رہی ہو۔ دُنیا کا ہر ایک گنہگار اپنے ضمیر کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کے لئے ایسے اسباب تلاش کرتا ہے جو گناہ کو ثواب ثابت کرسکیں۔ چنانچہ پرانی کہاوت ہے کہ ہم بُرے فعل خود کرتے ہیں مگر لعنت شیطان پر بھیجتے ہیں۔ اگر میں اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتی اور قابو نہ رکھ سکنے کی صورت میں کوئی جائز سبیل بھی نکالنا چاہتی ہوں لامحالہ موردِ الزام قرار دوں گی سماج کو، اور کہوں گی کہ بازاری کسی کی زندگی بسر کرنے پر مجھے سماج ہی نے مجبور کیا ہے، حالانکہ نہ کبھی سماج مجبور کرتا ہے نہ سماج کی خاطر کوئی طوائف کا ذلیل ترین پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دراصل سماج کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ قصور خود اپنے نفس کا ہوتا ہے لیکن چونکہ لوگوں کا تکیہ کلام سماج اور اس کی بندشیں ہوگئی ہیں اس لئے ہم لوگ بھی ایسا ہی کہہ کر اپنا من سمجھانے کی سعی کرتے ہیں۔ درحقیقت اس ناگفتنی حالت تک پہنچنے میں ہماری رہبری کرتا ہے ہمارا نفسِ خبیث اور ہماری آرزوئے انبساط و نشاط۔ نوجوانوں سے ہمکنار ہونے کا شوق، اور عمرانی بندشوں سے ہمیشہ آزاد رہنے کی آرزو۔ اچھا آفتاب مان لو کہ ایک دھرم یا ایک ذات بیوہ عورتوں کی شادی کو خلافِ دستور قرار دے کر چاہتی ہے کہ ایسی ہزاروں لاکھوں بیچاریاں زندہ در گور بیٹھی رہیں اور مُنہ سے اُف نہ کریں۔ اور وہ ایسا نہیں کرسکتیں تو وہ کیوں نہ اس برادری، اس ذات، اس دھرم سے الگ ہٹ جائیں اور دوسرے سماج میں جا کر اپنا عقد کرالیں۔ کیا دُوسرا سماج انہیں قبول نہیں کرے گا؟ ضرور کریگا۔

اور کیا اس طرح شریفانہ اور باعصمت زندگی بسر کرنے کو ہماری جیسی بدترین اور ندامت انگیز زندگی پر لاکھ درجہ برتری اور فضیلت حاصل نہیں ہے؟"۔۔۔ (وہ پھر خاموش رہ کر کہنے لگی) "یہ میں اُور مذاہب کا ذکر کر رہی ہوں، جن کے ہاں سماج کی سخت گیری ہے، ورنہ ہمارے دین میں نہ کوئی سماج ہے، نہ یہ کہ گنہگار ہونے کے بعد وہ چاہے کچھ کرے انسان گنہگار ہی رہے گا، اس دن مَیں قرآن مجید کی تفسیر پڑھ رہی تھی۔ ایک آیت ہے، اس کا ترجمہ ہے کہ "گنہگار توبہ کرلے تو ایسا ہوجاتا ہے گویا وہ بالکل معصوم ہو اور اس نے کبھی کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو"۔ دیکھو کتنا فطری مذہب ہے ہمارا۔ کیوں آفتاب تم نے قرآن مجید بھی پڑھا ہے؟"

اس کے جواب میں آفتاب نے شرمندگی کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا، اور آہ سرد بھرنے لگی۔

موتی نے کہا۔۔۔ "نہیں تم ضرور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرو، پھر اس کے معانی پر غور کرو"۔

آفتاب نے کہا۔۔۔ "انشاء اللہ میں ضرور ایسا کروں گی"۔

موتی کہنے لگی۔۔۔ "اگر تم بھی میرے ساتھ تیار ہو تو آؤ ایک دن ہم جامع مسجد میں چلیں۔ تائب ہوجائیں، پھر اپنی زندگی کسی ایسے کام کے لئے وقف کردیں، جو ہماری تمام بداعمالیوں کا کفارہ ہوجائے"۔

آفتاب بولی۔۔۔ "پیاری اور عزیز موتی بہن، مَیں نے تو پہلے ہی اپنا ارادہ ظاہر کردیا ہے۔ میں کس طرح یقین دلاؤں کہ جس پگڈنڈی پر تم مجھے چلاؤ گی میں کمال ثابت قدمی سے چلوں گی۔ تم نے مجھے نیند سے جگا دیا ہے۔ تم میری محسن ہو، اب مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔ اماں جان اگرچہ خلاف جائیں گی۔ لیکن مَیں ان سے بھی بالکل قطع تعلق کرلوں گی"۔

اتنے میں آفتاب کا ننھا بچہ جمیل جو ایک طرف محوِ خواب تھا جاگ اُٹھا اور چلّا چلّا کر رونے لگا۔ آفتاب نے دوڑ کر اسے اُٹھا لیا اور سینے سے لگالیا، دودھ پلانے لگی اور کہا۔۔۔ "جی میں تو ایسی بدی آتی ہے کہ اسے سابرمتی ماں کی لہروں میں جھونک دوں تاکہ میری معصیت اور سیہ کاریوں کی یادگار ہمیشہ کے لئے نابود ہوجائے!"

موتی جان نے چونک کر کہا۔۔۔ "ہائیں! یہ کیا بزدلانہ خیال ہے! نہیں جانتی ہو کہ اس بچاری ننھی سی جان نے کسی کا کیا بگاڑا ہے، وہ معصوم ہے اور خدا کی نظروں میں بھی بے جرم ہے۔ کیونکہ ماں اور باپ کی خطاؤں کا ذمہ دار بچہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ آفتاب پیاری مَیں تمہیں بصد منّت کہتی ہوں کہ یہ جذبات اب اپنے جی میں نہ آنے دینا۔ لو! میرے سامنے اس کا بوسہ لو۔۔۔ جمیل! میاں جمیل! خدا کرے ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہو تم!"

آفتاب نے جھک کر جمیل کا منہ چوم لیا۔ اور اپنے دو گرم آنسوؤں کی بوندیں بھی اس کے معصوم رخساروں پر ٹپکا دیں۔

(۴)

کپڑا بننے والے ملوں کے مزدوروں کی ہڑتال کی آگ بمبئی سے سلگنی شروع ہوئی۔ اس کے شعلے احمد آباد تک پہنچ گئے، یکے بعد

دیگرے تمام مل بند ہو گئے۔ صرف اِکّا دُکّا مل جاری تھے۔ مزدور چاہتے تھے کہ ہماری شرح اُجرت بڑھادی جائے، اور کام کے اوقات کم کئے جائیں۔ کارخانوں کے مالک رضامند نہیں ہوتے تھے، چنانچہ محنت اور سرمائے کی رسہ کشی بڑے زور شور سے ہو رہی تھی۔

کوئی دن ناغہ نہیں جاتا تھا جب میلے کچیلے اور خوش وضع اور خوش تراش ہر قسم کے لباسوں میں ملبوس مزدوروں کا جلوس نہ نکلتا ہو۔ ان کے ساتھ علَم رہتے تھے جن پر ہتھوڑی، کُدال، پھاؤڑے اور درانتی کے نقشے بنے رہتے تھے اور "مزدور آزاد! سرمایہ برباد! انقلاب زندہ باد!" کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ہر ایک چالاک مزدور ماہر خطابیات اور بلند بانگ مقرر بن گیا تھا۔ جا بجا جلسے منعقد ہوتے اور تقریریں کی جاتیں۔ پندرہ دن ہونے کو آئے، مزدوروں کی زبردست جماعت جو ہزاروں پر مشتمل تھی محض بیکار تھی۔ ان کا نظام اوقات یہ تھا کہ صبح گھر سے آنا اور تمام دن سڑکوں پر، میدانوں میں، اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر محنت و سرمایہ سے متعلق بحث کرنا اور بحث سُننا اور آوازے کسنا اور شام کو گھر چلے جانا۔

لیکن خرابی ان بیچاریوں کی تھی، جو چھوٹی چھوٹی تاریک اور کثیف کوٹھڑیوں میں دھوا زے کپڑے اور مَل گجے کپڑے پہنے ہوئے، سر کو ہاتھ لگائے بیٹھی رہتی تھیں۔ ان میں سے کسی کے ہاں مسور کی دال نہیں ہوتی تھی تو کسی کے ہاں نمک منگانے کے لئے ایک پیسہ تک نہ ہوتا تھا۔ کوئی پان، سپاری، چائے، شکر اور دودھ پیسہ نہ ہونے کے باعث مول نہیں منگا سکتی تھی اور اُدھار مانگتی پھرتی تھی۔ ان میں کی ہر ایک عورت یہی مناتی تھی کہ ہڑتال جلدی ختم ہو جائے۔ وہ اس لئے مناتی تھیں کہ ہڑتال کے سبب ہاتھ میں پیسہ بالکل نہیں تھا۔ میاں باہر سے جب شام کو آتے ہیں تو کھانا مانگتے ہیں۔ چائے، شکر، دودھ اور پان سپاری اور بیڑی ماچس مانگتے ہیں، پھر جب ذراسی کمی ہوتی ہے تو تمام کوٹھڑی سر پر اُٹھا لیتے ہیں، پورا محلہ جگاتے ہیں۔ ڈنڈے، جوتے، لاتیں اپنی عورت کو، اپنی بہن کو، اور اپنی بوڑھی ماں تک کو مارتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان سے زبان درازی کرتی تھیں!

دُوسری جانب کارخانوں کے مالک اور مہتمم اور گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام گفت و شنید کر رہے تھے۔ ٹریڈ یونین کے عمال مصالحت کی سعی میں مصروف تھے۔ لیکن مصالحت ہوتی نظر نہیں آتی تھی، کیونکہ مزدوروں کی طرح کارخانے دار بھی سوچتے تھے "اچھا ہے، دیکھیں کب تک اپنے مطالبات پر مصر رہتے ہیں، جب کھانے کو نہیں ملے گا جب بھوکے مریں گے خود ہی جھک جائیں گے"۔

افلاس اور بدنصیبی کے دردناک مناظر کی جب انتہا ہو چکی تو ٹریڈ یونین کے کارکن موٹر لاریوں میں آٹا، چاول، دال، دودھ اور دوسری اشیائے خوردنی و نوشیدنی لے لے کر مزدوروں کے احاطے میں جاتے اور روزمرہ کوئلہ، جلانے کی لکڑی اور یہ سب سامان تھوڑا تھوڑا ہر ایک کے گھر میں بانٹ آتے۔ اس طرزِ عمل سے ہڑتال کو اور تقویت پہنچی، اور انجام کار سرمایہ داروں کو صلح کرنے کے لئے خود اقدام کرنا پڑا۔

✧ ✧ ✧ ✧ ✧ ✧ ✧ ✧ ✧ ✧

(۵)

پھر ایک روشن اور تابناک صبح آئی جب تمام کارخانوں کی چمنیوں سے دھوئیں کے کالے کالے بادل اُٹھ کر فضائے شہر پر چھا گئے۔ انجن بائلروں کی سیٹیاں اندھا دھند بجنے اور گونجنے لگیں۔ لوگوں نے انہی سیٹیوں کے حساب سے اپنی کلائی اور جیب کی گھڑیوں کا وقت درست کرنا شروع کیا۔ اور مزدوروں کے جتھے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں جوق در جوق اپنے دھوارے میلے اور اُترے ہوئے پُرانے کپڑوں کے پھاڑ کر بنائے ہوئے دسترخوانوں میں روٹیاں باندھ باندھ کر کارخانوں کا رُخ کرنے لگے مزدوروں کی فاتحانہ گفتگو، اپنے افسروں کا لحاظ کئے بغیر ایک ساتھ مل کر گیت گانا بے باکانہ جواب دے دینا سرمایہ دار انسانوں کے لئے ضرور زہر کے گھونٹ پی جانے سے کم نہ تھا۔ وہ اگرچہ بظاہر مسکراتے تھے، لیکن ان کا دل نہیں مسکراتا تھا، اس پر تو انتقامی جذبہ طاری تھا۔ وہ سوچتے تھے کاش آج ٹریڈ یونین نہ ہوتی، تو ان کی فتح اور مزدور جماعت کی ہار بدیہی امر تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ دنیا کے زبردست کارخانے کے اندر جس میں وہ اپنے کارخانے لئے بیٹھے تھے، ہمیشہ زمانہ منقلب ہوتا رہتا ہے۔ مگر سرمایہ اپنی جیت اور محنت کی ہار کے سوا کبھی کچھ اور جاننا نہیں چاہتا۔

پھر ٹریڈ یونین کی طرف سے بڑے بڑے پوسٹر شائع کئے گئے کہ اس کے زیر اہتمام اتوار کی شام کو زبردست جلسہ سابرمتی کے کنارے منعقد ہوگا۔ چنانچہ وہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد پچاس ہزار سے متجاوز تھی۔ اس میں سرکاری حکام بھی تھے۔ غریب مزدور بھی تھے، عام شہری بھی تھے، اور سرمایہ دار جماعت کے ارکان بھی تھے۔

صدارت کے لئے مسٹر احمد ٹریڈ یونین کانگرس کے صدر کی تجویز باتفاق رائے منظور ہوئی۔ درجنوں مقررین نے ہڑتال اور اس کے اسباب پر بحث کی۔

اس کے بعد مسٹر احمد نے ایک پُرمغز اور پُرجوش تقریر کی جس کے دوران میں بتایا کہ ابتلا اور آزمائش کے وہ پندرہ دن ہماری جیت اور سرمایہ داروں کی ہار کا باعث ہوئے ہیں جن میں ہمارے قدم ڈگمگا رہے تھے، ہمیں کھانے کے لئے روٹی اور پینے کے واسطے ایک پیالی چائے بھی میسر نہ آسکتی تھی لیکن دو فیاض، اور نیکدل خاتونیں اُٹھیں اور ٹریڈ یونین کی آڑ لے کر اپنی متاع عزیز جو ساٹھ ہزار روپے کے قریب تھی اس جدوجہد کی راہ میں قربان کردی۔ چالیس پچاس ہزار مزدور، ان کے بال بچے پندرہ دن تک انہی کے عطیے کی بدولت روٹی کے ٹکڑوں سے محروم نہ رہ سکے، ورنہ آج ہماری شکست اتنی شرمناک اتنی ذلت انگیز اور اتنی بری ہوتی کہ تمام ہندوستان اور ماورائے ہندوستان کے سرمایہ داروں کے لئے وجہ فخر و مباہات ہوتی، تمام ہندوستان اور ماورائے ہندوستان کا میں اس لئے ذکر کررہا ہوں کہ ہمارے تمام کارخانوں میں جو سرمایہ لگا ہے اس کے لگانے والے ایشیا اور یورپ اور امریکہ کے تمام اقطاع میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان سب کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس واسطے میں آپ

لوگوں سے استدعا کرتا ہوں کہ ان دو خاتونوں کا شکریہ ادا کرنے اور ہدیہ تہنیت پیش کرنے اور ان کی بہت بڑی قربانی کے لئے بصد خلوص اظہار عقیدت کرنے کا ریزولیوشن باتفاق رائے منظور فرمایئے ۔۔۔۔۔۔"

لوگوں نے مسٹر احمد کو آگے تقریر نہ کرنے دی اور مجمع میں ہر جانب سے صدائیں آنے لگیں کہ وہ دونوں شریف فیاض طبیعت خاتونیں کون ہیں۔ بیان کیجئے اور انہیں ہمیں بتایئے۔

موتی بیگم اور آفتاب بیگم کو ڈائس پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ کھڑا نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ لیکن مسٹر احمد اور دوسرے کارکنوں کے اصرار پر دونوں کھڑی ہوگئیں۔ موتی بیگم سفید موٹی ساری پہنے تھیں اور آفتاب بھی اسی قسم کی ساری میں ملبوس تھیں۔ آفتاب کی گود میں ان کا بچہ جمیل بھی تھا جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمام مجمع کو دیکھ رہا تھا۔ پُر جوش نعرہائے مسرت اور "زندہ باد" کی آوازوں اور جوش کے ساتھ مسلسل کئی منٹ تک بجنے والی تالیوں کے شور کے مابین ان دونوں کا خیر مقدم کیا گیا۔

مسٹر احمد کی استدعا پر حاضرین جلسہ نے باتفاق رائے یہ ریزولیوشن منظور کیا اور فوراً ایک تھیلی جس میں دو سو اشرفیاں تھیں جنہیں پہلے ہی چندے کے ذریعہ فراہم کر لیا گیا تھا، ان دونوں کو پیش کرتے ہوئے مسٹر احمد کہنے لگے ۔۔۔۔ " اے غیور اور نیکدل خواتین! آپ نے پچاس ہزار انسانوں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی جو سعادت حاصل کی ہے اس پر ہر شخص کو رشک ہوگا، آج اس جلسے میں شریک ہونے والا بچہ بچہ آپ کو متشکرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ آپ دونوں کا نام مزدور اور سرمایہ دار کی تاریخ لکھنے والے مؤرخ اور ہماری آئندہ نسلیں کبھی فراموش نہیں کریں گی۔ میں اہل جلسہ کی جانب سے یہ ناچیز ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں۔ اور یہ جان کر میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ ہماری خاکستر میں ابھی ایسی چنگاریاں بھی موجود ہیں۔"

مسلسل تالیاں بجنے لگیں۔ آفتاب بیگم نے اشارہ کیا کہ موتی بیگم تم تھیلی لے لو۔ موتی نے آفتاب کو اشارہ کیا کہ نہیں تم لو۔ مسٹر احمد اتنی دیر تک تھیلی دونوں ہاتھوں میں لئے کھڑے رہے۔ انجام کار آفتاب بیگم نے تھیلی لے لی۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد وہ دونوں بیٹھ کر کچھ سرگوشیاں کرتی رہیں۔ پھر آفتاب بیگم نے کھڑے ہو کر مجمع کو مخاطب کر کے کہا ۔۔۔۔ "ہم دونوں آپ سے ایک درخواست کرتے ہیں۔"

مجمع میں سے آوازیں آئیں ۔۔۔۔ "فرمایئے۔ ضرور کہیئے۔"

آفتاب بیگم نے کہا ۔۔۔۔ "ہم نے بچارے مزدوروں کے گھر اندر سے دیکھے ہیں۔ ان کا نقشہ تو نہیں کھینچ سکتے، لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصول حفظانِ صحت سے گھر کی عورتیں بالکل بے بہرہ ہیں۔ بچوں کا رکھ رکھاؤ نہیں جانتیں، کپڑے اس قدر میلے اور بدبودار پہنتی ہیں جو مضر صحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ کی ایسوسی ایشن کو اپنی جانب سے یہ سب اشرفیاں دیتی ہیں کہ اصول حفظانِ صحت اور صفائی کی تعلیم میں یہ خرچ کی جائیں اور اگر سنیما کی مشین منگا کر عینی مشاہدات کے ذریعہ سے یہ تعلیم دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اس تجویز پر حاضرینِ جلسہ نے پُرجوش نعرہائے مسرت بلند کئے۔ ان دونوں خواتین کے مخلصانہ جذبات کی قدر کی گئی۔
ٹریڈ یونین کانگرس کے عمال کو معلوم تھا کہ موتی اور آفتاب نے اپنا تمام اندوختہ مزدوروں کی نجات کی خاطر قربان کر دیا ہے۔
لہٰذا اسی جلسے میں پھر یہ تجویز پیش ہوئی کہ انہی دونوں کو اس کام پر مامور کیا جائے کہ وہ ہفتے میں ایک بار مزدور احاطے میں عورتوں کو جمع کر کے میجک لالٹین کے ذریعہ حفظانِ صحت پر لکچر دیا کریں۔ مقامی ہیلتھ آفیسر مسٹر مکرجی نے اسی جلسے میں وعدہ کیا کہ وہ اِن دونوں کو صحت کے سائنس کی تربیت دیں گے۔ اور ریڈ کراس سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر بنگ نے کہا کہ ان کے لئے بہترین فلم سلائیڈ اور ضروری سامان مہیا کرادیں گے اور کچھ الاؤنس کا بھی میونسپلٹی کی جانب سے بندوبست کردیں گے، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مقامی میونسپلٹی کی جانب سے ان دونوں مخیر عورتوں کو ایڈریس دیا جائے۔ لیکن موتی اور آفتاب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ انہیں نام و نمود کی مطلق خواہش نہیں ہے۔ وہ ایڈریس کی تجویز کو ناپسند کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ انہیں صرف انسانیت کی دو خادمائیں تصور کیا جائے اُنہوں نے میونسپلٹی سے الاؤنس لینے کی تجویز کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ ہم گراموفون کمپنی لمیٹڈ کو جو دو تین گیت ہر ماہ دے دیتے ہیں اس سے ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق مل جاتا ہے۔ اب ہمیں زیادہ کی آرزو نہیں ہے۔

پرجوش مجمع نے ان کی سادہ تقریر کو بہت غور سے سُنا، خوب تالیاں بجائیں اور "زندہ باد" کے نعرے لگائے۔
جب جلسہ برخاست ہوگیا اور ہزاروں پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی ان دونوں عورتوں کو زبردستی موٹر میں سوار کرا کے ایک جلوس نکالا گیا تو بے شمار گجراتی خواتین ان کے گرد و پیش تھیں۔ ان کے بعد مرد تھے، لڑکے تھے۔ سب ان کی "جے" کے نعرے لگاتے جارہے تھے۔ مسز جمنا مزدور عورتوں کی مشہور کارکن ان کے ساتھ موٹر میں سوار تھیں۔ اس وقت نہ جانے کیا بات تھی کہ ان دونوں کی آنکھیں بار بار گرم آنسوؤں سے تر ہوجاتی تھیں۔ شاید ان کے جذبات میں تلاطم برپا ہو رہا تھا، یہ خیال کر کے کہ ان کی زندگی کا ایک دَور وہ بھی تھا جب شریف انسان ان کے کوٹھے کے سائے میں سے نکل جانا بھی باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے، یا شاید وہ اپنے خدا سے التجا کر رہی ہوں کہ "ہمارے اگلے دنوں کی یاد ہمیں نہ آنے دے!"
شاید مسز جمنا نے رات کے باعث ان کی بھرائی ہوئی آواز اور جوشِ گریہ کا مطلق خیال نہ کیا ہوگا اسی لئے وہ اپنی صنف کی دو ہستیوں کی عزت افزائی پر اظہارِ مسرت کر رہی تھیں اور بار بار انہیں مبارکباد دیتی تھیں۔ کبھی جمیل کو محبت آلود نگاہوں سے دیکھ کر چمکارتی تھیں اور کہتی تھیں "بتاؤ جمیل تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ اپنی اماں کے نقشِ قدم پر چلو گے کہ نہیں؟"
بچہ مسز جمنا کی تقریر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن "غوں غوں" کر کے کھلکھلا کر ہنس دیتا تھا۔ اور لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ "بولو آفتاب بائی کی جے!"

حسن عزیز جاوید

تنہائی

تعلقاتِ جہاں میں مصیبتیں ہیں ہزار
ہر ایک ذرّۂ ہستی ہے صد بلا بکنار

نہ عافیت کا پتہ ہے نہ ہے نشانِ سکوں
نہ روح کو ہے مسرّت نہ دل کو صبر و قرار

تُو میرے گوشۂ خلوت کی قدر کیا جانے
کہ میرا گوشۂ خلوت ہے محفلِ افکار

مرے خیال کی دُنیا الگ ہے اے واعظ
نہ اُس میں علم کا فتویٰ نہ جہل کی تلوار

نہ احتساب کا ڈر ہے نہ خوفِ رُسوائی
ہزار انجمنیں، میری ایک تنہائی

تضمین

(برشعر حامد علی خاں)

مت پوچھ مجھ سے ہمنشیں وجہِ سکوتِ دائمی
مَیں نوحہ خوانِ مرگ ہوں، مَیں نوحہ خوانِ زندگی

گزرا وہ سیلِ بے پنہ اُتری وہ موجِ خودسری
"اب جوئبارِ زندگی چپ چاپ سی ہے، ہاں کبھی

اُٹھی صدائے درد جب کوئی کنارہ گر گیا" (حامد)

دیس راج شرما

بی۔سی۔ڈی (فرسٹ)

خیالات

وقت!

وقت بھی کتنا تیز رفتار ہے!

خوشی کے لمحے ایک ہلکے سے لطیف و معطر جھونکے کی طرح فوراً گزر جاتے ہیں۔

لیکن غم اور پریشانی کی گھڑیاں؛ اُف!

وقت بھی کتنا سُست رفتار ہے!

بالکل چیونٹی کی طرح رینگتا معلوم ہوتا ہے نہ ختم ہونے والا! دائمی!!

یوں ہی قہقہہ فوراً ختم ہو جاتا ہے

مگر آنسو آہستہ آہستہ بہتے ہیں اور بہتے رہتے ہیں!! ترجمہ (اے۔ ایف سلطان)

دِیا سلائی

کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اُس نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیا نکالی۔ کچھ کھٹ پٹ سنائی دی اور پھر کھُس کی سی آواز کے ساتھ ایک چھوٹا سا شعلہ بھڑکا۔

کمرہ زرد اور تھرتھراتی ہوئی روشنی سے منوّر ہو گیا۔

اس کے بعد پھر وہی گہری تاریکی تھی۔

کیا یہی ہے زندگی؛ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔ (محمّد ایوب)

مِعیار

مخفی نماند کہ وقتے در لکھنؤ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی با من گفتند کہ خواجہ حالی امروز در ہندوستان در سخن سنجی نظیر خود نمیدانند واکثر اتفاق اُفتادہ کہ شعرِ استادے کہ خوبی و حُسنِ آں دل نشینِ من بودہ، چوں بر مولانا حالی خواندم و ایشاں متوجہ نشدند ہماں ساعت آں شعر از نظرم اُفتاد۔ (مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب اکبر آبادی)

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بایں زورش کہ او ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ[۱] خاں خوش نکرد

(مرزا اسداللہ خاں غالب)

رحل

[۱] نواب مصطفےٰ خاں حسرتی و شیفتہ مرحوم

غزل

تم بھی میری لاش پر ہو نوحہ خواں
شمع پروانے کو روئے! الاماں

روز و شب بچھتا ہی یارب فرشِ گل
منتظر کس کی ہے چشمِ خوں فشاں

کہکشاں سے دُور، کون اُڑتا پھرے
کھینچ لاؤں گا مکاں میں لامکاں

اس طرف آ، اے اسیرِ مرگ و زیست
یہ مری مُٹھی میں ہیں دونوں جہاں

یہ ترے پندار کی توہین ہے
کون کہتا ہے تجھے آرامِ جاں

دو جہاں ٹکرا کے غائب ہو گئے
اُف مری رندی، مری مے نوشیاں

یہ محبت، یہ عذابِ زندگی،
مَیں اُٹھا لیتا ہوں ہر بارِ گراں

قعرِ دریا سے اُٹھی اور مٹ گئی
زندگی ہے موجۂ آبِ رواں

فصلِ گل آئی، نشیمن جل گئے
ہائے دیوانوں کی دُور اندیشیاں

تُو ہے شمعِ محفلِ خواب و خیال
تُو چراغِ مجلسِ رُوحانیاں

تیری چشمِ ناز کی مرہُون ہیں
میرے رخشِ فکر کی جولانیاں

تیری ٹھوکر ہے مدارِ زندگی
تیرے ٹھکرائے ہوئے جائیں کہاں

میرے دردانگیز نغموں سے ندیمؔ
گونجتا ہے کشورِ ہندوستاں

احمد ندیم قاسمی

گورکن کا ہیرو

سہ پہر کا وقت تھا آفتاب اپنی چمکیلی خوبصورت شعاعیں گرجا کے صحن پر ڈال رہا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے سائے جن میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے لحہ بہ لحہ گھنے ہو رہے تھے، اور موسم گرما کے بیشمار کیڑے مکوڑے اپنی ختم نہ ہونے والی بھنبھناہٹ سے لوری دے رہے تھے۔

نگاہ کے سامنے جو دلکش منظر تھا اُس کی تصویر کھینچنا میرے لئے ناممکن ہے۔ سامنے فاختئی رنگ کے پتھر کی ایک دیوار تھی جس میں جا بجا کائی جمی ہوئی تھی اور جس پر ہلکے سبز اور گہرے سُرخ رنگ کے ننھے ننھے پودے اُگے ہوئے تھے۔ دیوار کے اوپر انگور کی نازک بیل اور پھول سے لدے ہوئے گلاب کے درخت کی شاخیں مستانہ وار حرکت کر رہی تھیں۔ دُور کچھ فاصلے پر ایک سبزہ زار تھا اور بھورے رنگ کا ایک پہاڑ، پھر ذرا اور فاصلے پر نیلے رنگ کی ایک ندی چمک رہی تھی۔

کچھ دیر ہم لوگ منظر کی دلکشی اور آواز کے ترنم میں کھوئے ہوئے خاموش رہے۔ پھر جرمی نے گفتگو کا سلسلہ وہاں سے شروع کیا جہاں ہم لوگ تھک کر سایہ دار بیٹھنے کی جگہ دیکھتے ہی پندرہ منٹ ہوئے چپ ہو گئے تھے۔

غور و فکر کے لئے فرصت کے دن کتنے قیمتی ہوتے ہیں، کیونکہ خیالات اور جذبات زندگی کی روزانہ مصروفیتوں اور اس کے ہنگاموں سے متاثر نہیں ہوتے اور زبان سے جو بات نکلتی ہے سچتہ ہو کر نکلتی ہے۔

میں نے دریافت کیا۔ "تو تمہارے نزدیک ہیرو کی کیا تعریف ہو گی؟"

جواب ملنے میں طویل وقفہ ہوا، اور میں اس درمیان میں دُور پہاڑی پر بادل کے متحرک سائے کو دیکھنے میں اپنا سوال تقریباً بھول گیا۔ اتنے میں جرمی نے جواب دیا:۔

"میرے خیال میں ہیرو وہ شخص ہے جو اپنے اُس فرض کی انجام دہی کے لئے جسے اس نے اپنی اہلیت کے مطابق اپنے اوپر عائد کیا ہے خواہ اسے کتنی ہی بڑی قربانی کرنی پڑے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دے۔ اس تعریف کی رو سے ہم ہر قسم کے کیرکٹر کو اس میں شامل کر سکتے ہیں حتٰے کہ عہدِ قدیم کے ان بہادروں کو بھی جن کی بہادری کا تعلق صرف جسمانی طاقت سے تھا۔"

میں نے پوچھا "تو تم فوج کے سپاہیوں کو بھی ہیرو کی تعریف میں شامل کرو گے؟"

"ہاں ضرور، یہ اَور بات ہے کہ میں ان کی حالت پر افسوس کروں گا، کہ صُورتِ حالات نے انہیں اپنے لئے اس سے بہتر

فرض انتخاب کرنے کا موقع نہ دیا۔ تاہم اگر ان لوگوں نے ایک ایسے مقصد کے لئے جسے وہ حق تصور کرتے تھے اپنی جانیں قربان کیں تو میں کسی طرح بھی ہیرو کے لقب سے انہیں محروم نہ کروں گا۔"

"بہادری کی یہ قسم جس کا اظہار صرف اس طرح ہوتا ہے کہ دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے حد درجہ معیوب اور مذہب کے آئین کے خلاف ہے۔"

ایک تیسری آواز نے ہم لوگوں کو گھبرا دیا۔

"اگر بے ادبی معاف کیجئے حضور"——— اور پھر بولنے والا خاموش ہو گیا۔

یہ گورکن تھا جسے ہم لوگوں نے قبرستان میں داخل ہوتے ہی دیکھا تھا مگر جسے کائی سے ڈھکے ہوئے پتھر کی چٹانوں کی طرح ایک بے جان چیز سمجھ کر ہم لوگ بھول گئے تھے۔

"اگر بے ادبی معاف کیجئے"۔ اس نے پھر کہا اور بولنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔ جرمی اس کے کھلے ہوئے سفید سر کا احترام کرتے ہوئے جھک گیا۔ اسے ذرا ہمت ہوئی تو اُس نے میری آخری گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا:۔

"ان صاحب نے ابھی جو کچھ فرمایا اس نے میرے دل میں ایک ایسے شخص کی یاد تازہ کر دی جو کئی سال ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ حضور، ممکن ہے میں نے آپ لوگوں کی گفتگو کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ دونوں صاحبوں کو گلبرٹ ڈاسن کے ہیرو ہونے میں اتفاق ہوگا۔" اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اسے ایسا سمجھنے کی وجہ بھی ہے۔"

جرمی نے کھڑے ہو کر اس سے کہا۔" مہربانی کر کے بیٹھ جایئے اور اس کے حالات ہم لوگوں کو سنایئے۔" اور جب تک گورکن بیٹھ نہ گیا وہ کھڑا رہا۔ میں خود بھی سننے کے لئے بیتاب تھا۔

گورکن ہم لوگوں کے سامنے گھاس سے ڈھکے ہوئے ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا اور اس نے کہنا شروع کیا۔

"آئندہ نومبر کی گیارھویں کو پورے ۴۵ سال ہوں گے جب میں نے کام سیکھنا ختم کیا اور لنڈل میں مستقل طور پر رہنے لگا۔ آپ لوگ یہاں کھڑے ہو کر ندی کے اس پار لنڈل کو دیکھ سکتے ہیں، اگر بیچ سے ذرا داہنی طرف۔ کم از کم میں تو اپنی بینائی میں فرق آنے سے پہلے اسے اکثر یہاں سے دیکھا کرتا تھا؛ اور نہ معلوم میں نے کتنے گھنٹے اس پر نظر جمائے ہوئے اُن گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں جب میں وہاں رہتا تھا صرف کئے ہیں۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں اور پھر میں کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں اس کی طرف پھر کبھی نہیں دیکھوں گا، نہ قریب سے اور نہ دور سے۔ لیکن آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت خوبصورت گاؤں ہے۔

اپنی جوانی کے دنوں میں جب میں وہاں رہتا تھا، یہ آوارہ بدمعاش نوجوانوں سے بھرا ہُوا تھا جن کے لئے لڑنے جھگڑنے دوسروں کے گھر میں گھس جانے اور اسی طرح کی دوسری شرارتوں کے سوا کوئی شغلہ نہ تھا۔ ان لوگوں کی صحبت میں اپنے آپ کو پاکر پہلے پہل میری طبیعت بہت گھبرائی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد میں ان کے کاموں میں شریک ہوگیا اور انہی لوگوں کی طرح پکّا بدمعاش بن گیا۔ دو سال کے بعد جب میں اپنی نوجوان پارٹی کا لیڈر شمار کیا جانے لگا تھا تو گلبرٹ جس کا میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں لنڈل میں رہنے کے لئے آیا۔ وہ مجھ سا تندرست اور قدآور جوان تھا۔ ہم لوگوں کا پیشہ بھی ایک تھا، اس لئے گلبرٹ سے میری گہری دوستی ہو گئی۔ میں گلبرٹ سے برابری کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی تھی گو لنڈل میں آکر ساری اچھی باتیں میں نے بھلادی تھیں۔ کچھ دنوں تک میں اپنے بُرے اخلاق و عادات پر پردہ ڈالے رہا۔ مجھے اس خیال سے کہ یہ باتیں گلبرٹ پر ظاہر ہو جائیں گی، بڑی شرمندگی ہوتی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اُسے اُس لڑکی سے محبّت ہوگئی جس پر میں دل و جان سے فدا تھا اور جو مجھ سے ہمیشہ دُور رہتی تھی۔ اُف اُن دنوں وہ بڑی حسین تھی۔ اب اس کی طرح خوبصورت لڑکی وہاں کوئی نہیں ہے مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں دیکھ رہا ہوں وہ سڑک کے کنارے اٹھلاتی ہوئی چل رہی ہے اور اس کے گھنگریالے بال ہوا میں حرکت کر رہے ہیں۔ جب مجھے معلوم ہُوا کہ لَتی خود بھی اس سے محبّت کرتی ہے تو میرا خون کھولنے لگا۔ میں گلبرٹ کی ہر بات سے نفرت کرنے لگا۔ پہلے میں اس کے بغل میں کھڑے ہوکر اسے کودتے ہوئے، یا کشتی لڑتے ہوئے یا کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھتا تو اس کی بہت تعریف کرتا۔ مگر اب جب کبھی اسے کوئی ایسی بات کرتے دیکھتا جسے لَتی دیکھ کر خوش ہوتی تو میں دانت پیسنے لگتا۔ وہ اور لوگوں کی طرح گلبرٹ کو بھی بظاہر حقیر سمجھتی لیکن اس کی نگاہ یہ کہتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ الہٰی توبہ۔ میں کیا کہوں مجھے اُس شخص سے کتنی نفرت تھی۔"

وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے یہ سب کل کی باتیں ہوں۔ ایامِ جوانی کے جذبات اور حرکات اس کے دماغ میں بالکل محفوظ تھے۔ اس کی آواز پست ہوگئی اور اُس نے کہا:

"ہاں تو میں اس سے لڑنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کرنے لگا۔ میں ان دنوں بہت اچھا پہلوان تھا۔ میں نے سوچا اگر میں اسے شکست دے دوں گا تو لَتی اس سے محبّت کرنا ترک کر دے گی۔ چنانچہ ایک دن شام کے وقت اکھاڑے میں نہیں معلوم کس طرح اور کیوں اس سے جھگڑ پڑا اور اسے کشتی کا چیلنج دے دیا۔ میں نے دیکھا غصّہ سے اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ وہ بہت تندرست اور طاقتور جوان تھا مگر دفعتہً اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور کہا کہ میں نہیں لڑوں گا۔ اس پر لنڈل کے لونڈوں نے قیامت کا شور برپا کر دیا۔ یہ آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس طرح ذلیل ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے اس پر رحم آگیا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید اس نے میرا مطلب نہیں سمجھا اس لئے میں اسے ایک بار اور موقع دوں گا۔ جہاں تک ممکن تھا، میں نے صاف صاف الفاظ میں اسے پھر کشتی کا چیلنج دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ رہا یہ کہ میں نے

نہیں کوئی تکلیف دی ہے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اگر واقعی مجھ سے تم کو کچھ رنج پہنچا ہے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں لیکن میں لڑنے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہیں ہوں۔

اس کی اس بزدلی پر مجھے اس سے بہت نفرت ہوگئی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ اسے دوبارہ موقع دیا۔ میں خود بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا جو اس پر آوازے کس رہے تھے بلکہ میں ان سے دُگنی بلند آواز میں چیخنے لگا۔ وہ مُنہ بند کئے ہوئے چُپ چاپ سب کچھ سنتا رہا۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا۔ جب ہم لوگ سانس لینے کے لئے رُکے تو اس نے بلند لیکن بھرّائی ہوئی غیر مانوس آواز میں کہا۔

"میں نہیں لڑ سکتا ہوں اس لئے کہ لڑائی جھگڑے کو میں گناہ سمجھتا ہوں۔"

پھر وہ جانے کے لئے مُڑا۔ میں نفرت اور حقارت کے جذبات سے بھرا ہوا آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ میں نے اسے پکار کر کہا:۔

"کم از کم سچ بولنے کی کوشش کرو میاں! اگر تم میں لڑنے کی ہمت نہیں ہے تو جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ اور جا کیوں رہے ہو؟"

لوگ ہنسنے لگے مگر میں نہ ہنس سکا۔ ایسے طاقتور جوان کے لئے لڑنے سے ڈر جانا اور بُزدل کہلانا بڑے لئے بڑی تعجب خیز بات تھی۔

آفتاب غروب ہونے سے پہلے پورے لنڈل میں یہ خبر پھیل گئی۔ ہر جگہ یہ چرچا ہو رہا تھا کہ میں نے گلبرٹ کو لڑنے کا چیلنج دیا اور اس نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ جب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا لوگ اپنے اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے اس کی طرف تعجب سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ بندر سے ملتا جُلتا کوئی جانور تھا یا کوئی دور دراز ملک کا باشندہ! لڑنے سے انکار کر دینا لنڈل میں ایک نئی بات تھی۔ دوسرے دن مرد اسے سُنا سُنا کر "نامرد" کہہ رہے تھے۔ عورتیں اسے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھتیں تو کھلکھلا کر ہنس دیتیں۔ شوخ و شریر لڑکیاں اور لڑکے اسے مخاطب کر کے کہتے "صوفی کب سے ہو گئے ہو!" "ملا جی سلام"۔

اسی دن شام کے وقت میں نے لِنّی کو گلبرٹ کے ساتھ ندی کے کنارے سے واپس آتے ہوئے دیکھا۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ قریب تھا کہ وہ رو دے۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کچھ مانگ رہی ہو۔ واقعہ بھی یہی تھا جیسا کہ بعد میں اس نے مجھ سے کہا۔ حقیقت میں اسے گلبرٹ سے بڑی محبت تھی۔ اسے کسی طرح یہ گوارا نہ تھا کہ لوگ گلبرٹ کو نامرد اور بزدل کہہ کر رُسوا کریں۔ وہ بڑی شرمیلی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اس رات اپنی زبان سے کہہ دیا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس نے گلبرٹ کی بڑی خوشامد کی کہ وہ کسی طرح میرا چیلنج قبول کر لے۔ جب وہ اپنے ارادے پر سختی سے قائم رہا تو اسے بڑی ندامت ہوئی۔ اس نے گلبرٹ کی پست ہمتی پر اس قدر تکلیف دہ الفاظ استعمال کئے کہ پوری بستی نے مل کر بھی نہ کئے ہوں گے۔ پھر یہ کہہ کر خاموش ہو گئی کہ آئندہ میں عمر بھر کبھی تم سے بات نہ کروں گی۔ ہاں ایک بار اور اس نے اس سے گفتگو کی مگر یہ مرنے سے پہلے آخری انسانی آواز تھی جو گلبرٹ کے کانوں میں اس وقت پہنچی جب وہ موت کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔

اس حادثہ سے پہلے اور بہت سی قابلِ ذکر باتیں پیش آئیں جس روز میں نے لِلّی اور گلبرٹ کو آخری مرتبہ ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا اسی روز سے وہ میری طرف مائل ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ لِلّی میں یہ اچانک تبدیلی زیادہ تر گلبرٹ سے انتقام لینے کے لئے ہوئی تھی کیونکہ میں نے دیکھا جب وہ ہم لوگوں کے قریب ہوتا یا اتنے فاصلہ پر ہوتا کہ ہم لوگوں کی گفتگو سن سکے تو وہ مجھ پر اور زیادہ مہربان ہوجاتی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ مجھ سے واقعی محبت کرنے لگی اور آخر ہم لوگوں کی شادی طے پاگئی۔ گلبرٹ بستی کے سب لوگوں سے علیحدہ رہنے لگا۔ وہ بہت غمگین اور افسردہ نظر آتا۔ حتٰے کہ اس کی رفتار میں بھی فرق آگیا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے کا عادی تھا لیکن اب اس کے قدم بوجھل ہوگئے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چلتا۔ میں ہمیشہ اُسے تیکھی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن وہ بیچارہ ہمیشہ اس کا جواب خاموشی سے دیتا کیونکہ اب اُس کی دُنیا بدل چکی تھی۔ لنڈل کے نوجوانوں نے اس کے ساتھ کھیلنا موقوف کردیا۔ وہ جب کبھی اکھاڑے یا کرکٹ کے میدان میں جاتا لوگ اسے حقارت سے دیکھتے اس لئے اس نے یہاں آنا یک قلم ترک کردیا۔

جب لِلّی سے میری شادی ہوگئی تو میں نے گلبرٹ سے نفرت کرنا ترک کردیا ——— بلکہ اب مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ مگر اس قدر ذلیل اور رسوا ہونے کے باوجود اس نے کبھی اپنا سر نیچا نہیں کیا۔ اُسے اپنے کئے پر ذرا بھی ندامت نہ تھی البتہ وہ روز بروز سوکھتا جارہا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں سے الگ رہنا کس قدر روح فرسا ہوتا ہے۔ غریب گلبرٹ نے اسے بُری طرح محسوس کیا۔ اس نے اپنا دل بہلانے کے لئے ایک دوسری صورت اختیار کی۔ اب چھوٹے چھوٹے بچے شہد کی مکھیوں کی طرح اس سے لپٹے رہتے۔ وہ بیچارے کیا جانیں کہ "بزدل" کس کو کہتے ہیں۔ ان کو صرف یہ معلوم تھا کہ گلبرٹ ہمیشہ ان لوگوں کو پیار کرنے اور ان لوگوں کو مدد دینے کے لئے تیار رہتا ہے اور وہ لوگ کتنی ہی شرارت کریں وہ نہ خفا ہوتا ہے اور نہ اُن کی شکایت کرتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد لِلّی کے ایک بچہ پیدا ہوا یہ ہم لوگوں کے لئے ایک رحمت تھا۔ ہم دونوں اس سے بڑی محبت کرتے تھے۔ لِلّی جو پہلے اکثر کھوئی ہوئی سی رہتی تھی اب بچے کی پرورش اور دیکھ بھال میں مصروف نظر آنے لگی۔

میرے سب رشتہ دار ندی کے اس پار کلات میں رہا کرتے تھے۔ جین جس کی قبر اس سفید گلاب کے درخت کے قریب دکھائی دے رہی ہے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اور لِلّی اس تقریب میں ضرور شرکت کریں۔ نہ معلوم لِلّی میں کیا خوبی تھی کہ میری سب بہنیں اسے چاہتی تھیں۔ لِلّی اپنے بچے کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتی تھی اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے لے کر جائے۔ آخر یہ طے پایا کہ ایک دن کے لئے بچے کو لِلّی کی ماں کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ اس نے اب تک کبھی اپنے بچے کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے اُسے دلی صدمہ ہوا۔ میں نے ایک تانگہ عاریتاً لیا۔ اپنی بوڑھی گھوڑی کو اس میں جوتا اور تین بجے کے قریب ہم دونوں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ راستے میں جو ندی پڑتی تھی اس کا پانی رات اور دن میں بارہ بجے بہت بڑھ جاتا تھا اور دوسرے وقتوں میں بہت کم ہوجاتا تھا۔ ارادہ تھا کہ بارہ بجے باڑھ آنے سے پہلے ہی ہم لوگ واپس آجائیں گے۔ کیونکہ لِلّی زیادہ دیر تک ننھے سے جدا رہنا گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ یہ بڑی دلکش شام تھی۔ میں نے یہاں آخری بار لِلّی کو دل سے ہنستے ہوئے دیکھا اور اسی بنا پر خود بھی آخری مرتبہ دل سے ہنس سکا۔ ندی پار ہونے کے لئے

آخری وقت ۹ بجے کا تھا۔ مگر ہم لوگوں کو بہن کے ہاں سے رخصت ہونے میں بڑی دیر ہو گئی۔ اتفاق سے گھڑی غلط تھی۔ ابا نے ایک کتا لٹی کے ساتھ کر دیا۔ اس نے الگ بھونک بھونک کر شور مچانا شروع کیا۔ غرض راستے ہی میں آفتاب غروب ہو گیا۔ میں نے غریب گھوڑی کو چابک سے مارنا شروع کیا، لیکن وہ بہت تھک گئی تھی۔ کلات اور ندی کے درمیان جو بیشمار ٹیلے تھے ان پر یہ نہ چڑھ سکتی تھی اور نہ اُتر سکتی تھی۔ ریت میں پہنچنے کے بعد تو اُس کی حالت اور خراب ہو گئی۔ اللہ اللہ میں کس بیدردی سے اس غریب جانور کو تیز چلنے کے لئے مار رہا تھا۔ ندی کے اس پار ہونے میں دو بڑے بڑے نالے ملتے تھے۔ پہلے نالے سے گزر کر دو میل بھی ہم لوگ چلنے نہ پائے تھے کہ ہر چہار طرف تاریکی پھیل گئی۔ صرف پہاڑ کے اوپر اب تک سُرخ روشنی کی ایک لکیر نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا ایک خوفناک سیلاب بڑی تیزی کے ساتھ ہم لوگوں کی طرف آ رہا ہے۔ یہ ایک میل سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ اور ایسی حالت میں آن کی آن میں اس کا پہنچ جانا یقینی تھا۔ میری زبان سے بے اختیار نکل گیا "خداوندا ہم لوگوں کی مدد کر"۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ کہہ کر لٹی کو اور خوفزدہ کر دیا۔ وہ میرا کوٹ تھامے ہوئے اور مجھ سے چمٹے ہوئے کانپ رہی تھی۔ اب گھوڑی پسینہ سے شرابور ہو گئی تھی۔ وہ ڈر کے مارے تھرتھر کر کانپ رہی تھی اور لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ دوسرے نالہ پر پہنچ کر وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ وہ آگے چلے لیکن اس نے ذرا بھی حرکت نہیں کی۔ اب تک لٹی میرے کوٹ کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے بالکل چُپ چاپ تھی۔ اب وہ ضبط نہ کر سکی اور اُس نے کہا۔

"خیال ہے ناپ —— میرا خیال ہے کہ میں ننھے کو اب نہیں دیکھ سکوں گی"۔

پھر اس نے اتنے زور سے اور ایسی دردناک چیخ ماری کہ میں بدحواس ہو گیا۔ میں نے ایک چاقو نکال کر گھوڑی کو مارنا چاہا کہ یا تو یہ یہیں ڈھیر ہو جائے یا تیز چل کر کنارے تک پہنچا دے کیونکہ اب پانی تانگے کے چکے تک پہنچ چکا تھا۔ سیلاب برابر بڑھتا چلا آ رہا تھا اور سفید جھاگ سے بھری ہوئی موجیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ حضور یہ مختصر لمحے میری ساری زندگی سے بھی زیادہ طویل معلوم ہو رہے تھے۔

میں نے اپنا چاقو نکالا ہی تھا کہ پانی کی گڑگڑاہٹ اور گرج میں ملی ہوئی ایک آواز ہم لوگوں کے کان میں آئی۔ ہم لوگ پہچان نہیں سکے لیکن ہم لوگوں نے دیکھا کوئی سیاہ چیز سیاہ رنگ کی موجوں، بادل اور آسمان کے درمیان حرکت کر رہی تھی۔ یہ لحظہ بہ لحظہ ہم لوگوں سے قریب ہوتی جا رہی تھی اور آہستہ مگر بڑی مستعدی کے ساتھ نالے کو پار کر کے ہم لوگوں کی طرف چلی آ رہی تھی ——— "میرے اللہ! یہ اپنے مضبوط بادامی رنگ کے گھوڑے پر گلبرٹ ڈاسن تھا"۔

گلبرٹ سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور اس کا وقت بھی نہ تھا۔ اس وقت مجھے نہ ماضی کی خبر تھی اور نہ مستقبل کی فکر۔ مجھے صرف ایک خیال تھا مال کا —— یعنی کسی طرح لٹی کو ڈوبنے سے بچایا جائے اور اگر ممکن ہو تو اپنے آپ کو بھی۔ مجھے بعد میں یاد آیا کہ گلبرٹ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز نے میری رہنمائی کی ورنہ مجھے بڑی دقت ہوتی۔ اس کے مرنے کے بعد میں نے سنا کہ جب اسے ندی میں وقت سے پہلے سیلاب آنے کی خبر ملی تو اسے ہم لوگوں کی واپسی کے متعلق بڑی فکر ہوئی۔ اس نے عورتوں کے لئے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کی ایک گدی اپنے کسی دوست سے عاریتاً لی، اور اُسے اپنے گھوڑے پر کس کر وہ شام ہی سے ندی کے کنارے ہم لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ اگر کوئی حادثہ پیش نہ آتا تو یہ سب باتیں مجھے

معلوم نہ تھا۔ اس کا پُرانا دوست جونس جب یہ بیان کر رہا تھا تو اُس کے زرد رخسار پر آنسوؤں کے قطرے بہ رہے تھے۔

ہم دونوں نے مل کر لِٹی کو گدی پر بٹھایا۔ پانی ہر لمحہ بڑھتا جارہا تھا، اور تانگہ قریب قریب ڈوب چکا تھا۔ لِٹی گھوڑے کی زین میں جو دستہ لگا ہُوا تھا اس سے چمٹ گئی۔ وہ سر جھکائے ہوئے بالکل خاموش تھی۔ اسے اب تک اپنی زیست کی کوئی اُمید نہ تھی۔

گلبرٹ بغیر کچھ سوچے ہوئے تانگہ پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اسے یہ سوچنے کا کافی موقع تھا کہ اگر وہ لِٹی کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر خود چلا جائے تو وہ ضرور زندہ رہے گا اور میں مر جاؤں گا۔ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے بلند آواز سے کہا" جلدی کرو، لِٹی کے آگے بیٹھ جاؤ اور اسے سنبھالے رہو۔ گھوڑا اطمینان سے تیر سکتا ہے۔ خدا نے مدد کی تو میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ میں اس تسمہ کو کاٹنے کی کوشش کروں گا جس کے ذریعہ گھوڑی تانگے سے بندھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ تانگے کے بوجھ سے ہلکی ہو کر مجھے بحفاظتِ تمام کنارے تک پہنچا دے۔ بہرحال تمہاری زندگی زیادہ قیمتی ہے کیونکہ تم ایک عورت کے شوہر ہو اور ایک بچے کے باپ۔ میرا دُنیا میں کون ہے؟"

میری اس خود غرضی پر نفرت نہ کیجئے حضور! میں نے بارہا آرزو کی کہ یہ رات ایک خواب ہوتی۔ گو اس واقعہ نے ایک خوفناک خواب کی طرح نہ معلوم کتنی راتیں مجھ پر نیند حرام کر دی ہے لیکن درحقیقت یہ خواب نہیں ہے میں گلبرٹ کی جگہ گھوڑے پر بیٹھ گیا اور میں نے لِٹی کے دونوں ہاتھوں کو اپنے بدن پر رکھ لیا۔ وہ میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ خدا کی قسم میں نے گلبرٹ کو مخاطب کر کے شکریہ کے چند الفاظ ادا کئے لیکن مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا۔ ہاں یہ یاد ہے کہ لِٹی نے اپنا سر اُٹھایا اور بلند آواز میں بولی:۔

"گلبرٹ ڈاسن! آج کی رات میرے لال کو یتیم ہونے سے بچا لینے پر خدا تمہیں اجر دے"۔

اتنا کہہ کر وہ نیم بیہوشی کی حالت میں پھر مجھ پر گر گئی۔

میں اسے سنبھالے ہوئے کنارے تک لے آیا یا یوں کہئے کہ مضبوط گھوڑا ہم دونوں کو لے کر خوفناک موجوں کے درمیان تیرتا ہُوا ندی کے پار ہُوا۔ ہم لوگ جب کنارے پہنچے تو بالکل بھیگ گئے تھے لیکن بس صرف ایک خیال تھا ـــــ گلبرٹ کہاں ہے؟ بڑی بڑی موجیں اور گہرے بادل حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ آخر گلبرٹ کہاں ہے؟ ہم لوگوں نے چلّانا شروع کیا کہ شاید وہ ہم لوگوں کی آواز سن کر کچھ بولے۔ لِٹی کا دل بیٹھا جا رہا تھا مگر پھر بھی وہ بلند آواز سے چلّا رہی تھی۔ ندی کے شور کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں چوکیدار کے کمرے میں گیا وہ بے خبر سویا ہُوا تھا اور اصرار کے باوجود نہ اُٹھا۔ میں نے اسے اپنی حیثیت سے بہت زیادہ انعام دینے کا وعدہ کیا لیکن وہ اس پر بھی نہ جاگا۔ اس نے کہا کہ اگر تم چاہو تو میرا بگل لے کر بجا سکتے ہو اور اُسے بُلا سکتے ہو۔ ناچار میں نے بگل لیا اور اسے خود بجانے لگا۔ میں نے اسے اپنی پوری طاقت سے بجایا لیکن اس تاریک رات میں میرے باجے کی صدائے بازگشت کے سوا اور کوئی انسانی آواز سنائی نہ دی۔ آہ، وہ بگل ایک مردہ کو بیدار نہ کرسکا۔

میں لِٹی کو ساتھ لے کر مکان میں واپس آیا جہاں وہ اپنے بچے کے قریب بیٹھ کر ساری رات روتی رہی۔ میں خود پھر ندی کے کنارے واپس چلا آیا اور گلبرٹ کی تلاش میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفہ پر چلّا چلّا کر اُسے بُلانے کی ناکام کوشش کی۔ پانی کم ہو گیا لیکن اس پر بھی اس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ دو دن کے بعد دو تین میل کے فاصلے پر ندی کے کنارے اس کی لاش پڑی ہوئی ملی۔ پھر

کچھ ادر فاصلے پر میری گھوڑی اور میرا تانگہ نصف سے زیادہ ریت میں دفن پڑا ہوا ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گلبرٹ تانگے کا تسمہ ابھی کاٹنے نہ پایا تھا کہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پھر اس کی زندگی کی ساری اُمید جاتی رہی۔

اس کے دوستوں نے جو ایک دوسرے گاؤں میں رہتے تھے اس کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا۔ میری دلی خواہش تھی کہ اس کے ماتم کے تمام فرائض میں انجام دوں مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ گو میں آج تک ایک دن بھی اس کے ماتم سے غافل نہیں رہا ہوں۔ جب اس کی بہن اس کی پسماندہ چیزوں کو ایک جگہ رکھ رہی تھی تو میں نے اس کی بہت خوشامد کی کہ وہ گلبرٹ کی کوئی چیز مجھے یادگار کے لئے دے دے۔ وہ بڑی منتظم عورت تھی اس نے مجھے اس کا کوئی کپڑا نہیں دیا' اس کا خیال تھا کہ جب اس کے بچے بڑے ہوں گے تو اسے پہنیں گے۔ البتہ اس نے ایک بوسیدہ بائبل میری طرف پھینک دی۔ چونکہ یہ گلبرٹ کی تھی اس لئے میں نے اس کی بڑی قدر کی۔ اس چمڑے کی سیاہ جلد تھی جس کے دونوں طرف پرانے طرز کی جیب لگی ہوئی تھی۔ ایک جیب میں مجھے چند بکھرے ہوئے زرد پھول ملے۔ لیٹی نے یقین کے ساتھ کہا کہ یہ پھول غالباً اسی نے اس کو دیئے تھے۔

میں نے دیکھا اس بائبل کی بہت سی ایسی آیتوں پر پنسل کے نشانات لگے ہوئے تھے جن سے گلبرٹ کے اس خیال کی تائید ہوتی تھی کہ لڑنا جھگڑنا بہت بری بات ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑنے کے لئے بڑی بہادری کی ضرورت ہے لیکن گلبرٹ کی بے مثل قربانی نے مجھے بتایا کہ لڑنے کے تمام اسباب پیدا ہو جانے کے باوجود لڑائی سے باز رہنا بڑے بہادر اور سورما کا کام ہے۔

میری طویل داستان کو آپ لوگوں نے غور سے سنا، اس کا شکریہ۔ آپ لوگوں کی گفتگو نے گلبرٹ کی یاد تازہ کردی، اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس شہیدِ محبت کی کہانی آپ لوگوں کو سنا دوں۔ معاف کیجئے گا میں نے آپ لوگوں کا بہت سا وقت ضائع کیا۔ اس وقت مجھے ایک کمسن بچے کی قبر کھودنا ہے جو کل صبح ٹھیک اس وقت جب اس کے ساتھ کھیلنے والے بچے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے اپنے اسکول کی طرف جا رہے ہوں گے یہاں دفن کیا جائے گا، اس لئے اب رخصت ہوتا ہوں"۔

جرمی نے کہا "لیکن لیٹی کے متعلق کچھ کہتے جایئے، کیا وہ اب تک زندہ ہے؟"

بوڑھے گورکن نے اپنا سر ہلایا' پھر اس نے ایک سرد آہ کو روکنے کی کوشش کی اور ایک منٹ کے وقفہ کے بعد بولا:۔

"اس یادگار رات کے بعد وہ دو سال بھی زندہ نہ رہ سکی اور اس کا انتقال ہوگیا۔ اس میں حیرت انگیز تبدیلی ہوگئی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ہمیشہ گلبرٹ کی یاد میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچتی رہتی۔ میں اس پر کچھ اعتراض نہیں کرتا تھا۔ اس کے دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا، جس کا نام ہم دونوں نے گلبرٹ ڈاسن نائپ رکھا، وہ آج کل لندن ریلوے میں فائرمین کا کام کرتا ہے۔ اور ایک لڑکی جو دانت نکلنے میں فوت ہوگئی۔ اس کے بعد چھ ہفتے کے اندر ہی لیٹی مجھے ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی۔ یہ ماں اور بیٹی دونوں یہیں اسی قبرستان میں دفن ہوئی ہیں۔ میں اس خیال سے کہ ان لوگوں کے قریب ہوں گا لنڈل کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر یہاں رہنے لگا۔ آہ۔ لنڈل میں جہاں سے لیٹی رخصت ہو چکی ہے میرے لئے رہنا ناممکن تھا"۔

یہ کہہ کر گورکن اپنے کام کی طرف چلا گیا۔ ہم لوگ بھی چونکہ کافی آرام کر چکے تھے اس لئے وہاں سے روانہ ہوگئے۔

(الزابیتھ گیسکل)
مترجمہ
مسعود حسن شمسی
دانا پوری

غزل

عیاں دیکھتا ہوں نہاں دیکھتا ہوں
تجھے دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں

جو دیدار سے تیرے رشکِ جناں تھیں
اُن آنکھوں کو اب خونچکاں دیکھتا ہوں

نہیں مطمئن دو جہاں سے چھڑا کر
مَیں اب بھی نئے امتحاں دیکھتا ہوں

ارادہ کیا اُس نے شاید وفا کا
زمانے کو پھر بدگماں دیکھتا ہوں

گیا وقت آزاد تھیں جب نگاہیں
نگاہوں کو اب پاسباں دیکھتا ہوں

اجازت اب اَے ذوقِ نغمہ طرازی
بہت دن سے محمل گراں دیکھتا ہوں

نہ جا میرے ظاہر پہ نادان واعظ
میں رازِ حقیقت عیاں دیکھتا ہوں

جہاں تیری تحقیق کی انتہا ہے
مَیں اُس سے پرے اِک جہاں دیکھتا ہوں

کہاں وہ طبیعت، پہ سیفی کو اب بھی
غبارِ رہِ کارواں دیکھتا ہوں

سیفی نوگانوی

میری کتاب

میں اس وقت سات سال کا تھا۔

میرے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی تھی' اس کا نام نیلوفر تھا۔ مارپیٹ، کھیل کود اور شرارت میں وہ میری شریک ہوتی تھی۔ نیلوفر خوبصورت بھی تھی۔

عمر میں اس سے دو سال بڑا ہونے کے باعث میں اس پر رعب بھی گانٹھتا تھا۔ اپنی قابلیت جتانے کی غرض سے میں اس کے سامنے اپنی انگریزی کی تیسری کتاب پڑھا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ تو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ میں غلط پڑھتا ہوں یا صحیح میں ہمیشہ اس سے کہا کرتا تھا کہ اسکول میں میری اتنی عزت ہوتی ہے۔ ماسٹر صاحب مجھے ایسا چاہتے ہیں۔ لڑکوں پر میرا ایسا رعب ہے۔

نیلوفر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی اور میری باتیں بڑے غور سے سنتی۔

ہاں تو اس روز میں جغرافیہ کی کتاب لایا تھا اور دل میں یہ طے کرکے آیا تھا کہ اسے نئی نئی تصاویر اور نقشے دکھا کر چڑاؤں گا۔ اُسے کبھی نہیں دکھاؤں گا۔ وہ میری خوشامدیں کرے گی لیکن میں ایک نہیں سنوں گا۔

مجھے آج بھی وہ شام یاد ہے۔

نیلوفر نے کتاب دیکھی

میری طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔

"مجھے بھی دکھاؤنا!"

میں نے ڈانٹ کر جواب دیا "نہیں خراب ہو جائے گی۔"

نیلوفر کی آنکھیں بھر آئیں، میری جیت ہوئی نا آخر!

اس دن شام کو میں جلد ہی ہاکی کھیل کر لوٹ آیا سب سے پہلے جا کر کتاب کو دیکھا۔ وہ موجود نہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ ایک کونے میں بیٹھ کر نیلوفر کتاب کی تصاویر بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پا کر اس نے میری جانب چونک کر دیکھا اور خوف سے کانپ اُٹھی۔

مجھے بے حد غصہ آیا کہ باوجود میرے انکار کے اُس نے کتاب دیکھ ہی لی۔

میں نے اسے پیٹ ڈالا اور چپ چاپ وہ پٹ گئی۔

برسوں گزر گئے

کھیل کود کر، لڑ جھگڑ کر۔ نیلوفر پردے میں بٹھادی گئی۔ بچپن کی شرارتیں ختم ہو گئیں۔

ایک رات میں کالج کی کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میری طبیعت پڑھنے کو نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی ورق گردانی کر رہا تھا۔

آہستہ سے دبے پاؤں کوئی کمرے میں داخل ہوا۔

نیلوفر — لیکن وہ پہلی نیلوفر نہیں بلکہ مجسم شباب نیلوفر

حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معصوم نیلوفر۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری عمر اس وقت ۱۹ سال کی تھی اور نیلوفر کی ۱۷ سال کی۔

گھبراہٹ کی وجہ سے میری پیشانی پر پسینہ کے قطرات نمودار ہو گئے۔

اُف وہ کتنی خوبصورت تھی۔

شرم سے اس کی نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے کہا۔ "کیا آپ کے پاس مسدسِ حالی ہے؟"

"جی ہاں!" یہ دو الفاظ میری زبان سے بہ مشکل ادا ہوئے۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے اسے مسدسِ حالی کی جلد دی۔

وہ چلی گئی۔ میں اس رات کچھ نہ پڑھ سکا۔ بلکہ سو بھی نہ سکا۔ رات بھر نیلوفر کی تصویر میری آنکھوں میں پھرتی رہی۔

ان دنوں گھر میں میری شادی کا ذکر ہو رہا تھا۔ شاید نیلوفر کی شادی کا مسئلہ بھی اُن کے ہاں درپیش ہو۔

زندگی کے چند سال اور گزر گئے۔

دور و نزدیک میری ادبی قابلیت کا چرچا ہونے لگا تھا۔

میں کمرے میں بیٹھا ہوا کسی مسئلہ کو حل کر رہا تھا۔ دانتوں میں قلم دبایا، سر کے تمام بال بکھیر ڈالے۔ سگریٹوں کے کئی پیکیٹ ختم کر ڈالے۔ مگر بے سود۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی داخل ہوا۔ میں نے جھنجھلا کر دیکھا۔ او وہ نیلوفر، میری نیلوفر، سامنے کھڑی میری اس حالت کو دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ نیلوفر اب میری شریکِ حیات بن چکی تھی۔

"ذرا دیوانِ غالب تو دیجیے!"

میں نے غصہ سے جواب دیا "اسی وقت تمہیں ضرورت محسوس ہوئی۔ اس الماری میں رکھا ہے۔"

اس نے کتاب نکال لی اور چپ چاپ وہیں کھڑی ہو گئی۔ نیلوفر اب بھی مسکرا رہی تھی۔

میں نے دریافت کیا "جاتیں کیوں نہیں۔ اور کیا چاہیے؟"

"یاد ہے وہ جغرافیہ کی کتاب؟" میرا غصہ ہنسی میں تبدیل ہو گیا۔

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا "ہاں یاد ہے۔"

پھر اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور وہ مسدسِ حالی، کہاں گئے وہ دن!"

"کیا پھر پٹنے کا ارادہ ہے؟"

نیلوفر محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

شاہد الہاشمی ناگپور

قطعات

نشاطِ عشق

ہو کے بے فکر تان اُڑائے جا
راگنی اپنے من کی گائے جا
غم نہ کر روزگار کا پیارے
عشق کی بانسری بجائے جا

دل کی آگ

جیسے شعلوں سے کوئی کھیلے پھاگ
جیسے گاتا ہو کوئی دیپک راگ
جل رہا ہوں تمہاری جان سے دور
بھڑک اُٹھی ہے میرے دل کی آگ

رقاصہ

حسن کی داستاں بنا ڈالا
عشق کا ترجماں بنا ڈالا
بھر کے اعضا میں رقص کا جادو
تم نے ان کو زباں بنا ڈالا

چاندنی رات

اُٹھ کہ تھوڑی سی رات باقی ہے
چاندنی مے ہے، چاند ساقی ہے
ایسے لمحوں کو نیند میں کھونا
ارے ناداں! بدمذاقی ہے

اختر انصاری

تخیّلات

مرثیہ

تم سے محبت نہ سہی،
اُس چاہت کی یاد میں جو تم مجھ سے چھپا نہ سکیں،
تمہاری موت سے روح ماتم میں ہے
وہ مسکراتی آنکھیں، حیا کی سُرخ سُرخ لہریں، دبی ہوئی مگر بے تابانہ ہنسی،
زہرہ ٹوٹ کر موہوم فضاؤں میں تحلیل ہو جائے ـــــــ

وہ لمحہ

اُن شبنم سے بھیگی ہوئی نرم و نازک گلابی پتیوں کو شرمانے والی آنکھوں نے ایک ہلکی سی آرزو کا پیغام دیا
شاید وہ مَوج طوفان بن جاتی
میری آنکھیں اُسے بتا نہ سکیں کہ وہ برسوں سے انتظار میں تھیں

آنسو

"تم نہ جاؤ"
"مجھے بھی ساتھ لے چلو"
"اور جانا ہی ہے، تو آج کیوں جاتے ہو؟ کل چلے جانا"
پہلی عورت جس نے میرے لئے آنسو بہائے گیارہ برس کی ایک کالی سی لڑکی تھی
سارے کشمیر کی رنگینیاں اُس پر نثار ہوں!

توبہ

مَیں نے اُس کے ہونٹوں کو چُوم چُوم لیا
اُس کے سینہ کی لرزشیں میرے بدن میں جذب ہو کے رہ گئیں
وہ بات جو روح کی ایک سادہ نگاہ میں تھی گناہ کی گہرائیوں میں نظر نہ آئی
میں نے توبہ کر لی۔

"ابنِ مریم"

محفلِ ادب

شکستِ نایاب

کیرم کی ایک بازی کے دلچسپ تأثرات

سچ ہے کہ بہت رات گئی بج چکے بارا
کیا کیجئے کیرم کا' ہے کچھ کھیل ہی پیارا

تم کھیل میں ہو، کچھ سے ہے کچھ حال ہمارا
خیرہ نگہِ شوق ہے حیراں ہے نظارا

رکھوں نہ اگر پاؤں زمیں پر تو بجا ہے
ذرّے کو ہے مہتاب نے کرنوں سے سنوارا

رہ رہ کے ہمیں تہنیتِ عشق و وفا میں
پرویز نے آواز دی، زہرہ نے پُکارا

کِس بات میں ہم کم ہیں فلک سر نہ اُٹھائے
اک چاند ہے اُس کا، تو ہے اک چاند ہمارا

لیکن یہ قیامت ہے کہ پہلو میں بٹھا کر
دشوار نگاہوں کو ہے نظّارہ تمہارا

اب تک تو بڑے ضبط سے ہم کھیلے ہیں لیکن
کیا کہیئے کہ اب کھیل کی ہمّت ہے نہ یارا

مہروں کی جگہ گرتا ہے ہر ہاتھ میں ضارب
بیتاب ہے جب دل ہی تو کیا کھیل ہمارا

اُف تم ہو کہ ہر وار میں پہلے سے بھی ہشیار
ملتا ہے تمہیں میری شکستوں کا سہارا

جس جیب کی جانب اُٹھی انگشتِ حنائی
اُس جیب میں آہستہ سے اِک مہرہ اُتارا

رُخ کھیل کا بدلا ہے عجب لُطف سے تم نے
جو چال ہے اِک سحر ہے جو ہاتھ ہے پیارا

ہر آن میں ضربوں کا نیا رنگ ہے کیا خُوب
ہر لحظہ میں ہے کھیل ترقی پہ تمہارا

جس جیب کو دیکھا وہی پھُولی نہ سمائی
اِک آن میں بازی کا ہُوا وارا نیارا

افلاک کی گردش بھی اگر سچ ہے تو ہے جھُوٹ
اعجاز ہے مہروں کا یہ رقصِ نظر آرا

اُڑتے ہوئے مہروں کا یہ اُٹھنا ہُوا طُوفاں
جیبوں کی طرف میرا یہ حسرت سے نظارا

سچ پوچھو تو یہ بات کی اک بات ہے ورنہ
بچتا ہے کہیں ہار سے بھی عشق کا مارا

کیرم ہی پہ موقوف ہے کیا میری تباہی
سچ یہ ہے کہ تم سے تو مَیں ہر کھیل میں ہارا

اس ہار پہ بھی دِل کو بہت ناز ہے فطرتؔ
یہ ہار بھی شاید ہی، ہو قسمت کو گوارا
(فطرتؔ واسطی) "نگار"

ہندوستانی کیا ہے؟

حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے "ہندوستانی کیا ہے؟" کے موضوع پر چھ تقریریں نشر ہوئیں۔ ان چھ حضرات میں سے تین ہندو تھے یعنی ڈاکٹر تارا چند صاحب، بابو راجندر پرشاد صاحب اور پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی اور تین مسلمان تھے یعنی مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور مسٹر آصف علی۔

پہلی تقریر ڈاکٹر تارا چند صاحب کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کا تو ابتدا ہی میں اعتراف کر لیا ہے، کہ:۔

"ہندوستانی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے"۔ اور "ہندوستانی کوئی من گھڑت بھاشا نہیں"۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:۔ "ہندوستانی آدھے ہندوستان کے سینے پر کھیلتی ہے"۔

لیکن وہ کونسی ہندوستانی ہے؛ اس کا نہ تو ڈاکٹر تارا چند نے کوئی جواب دیا ہے اور نہ کوئی مثال ہی پیش کی ہے۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ:۔ "یہ جدید ہندوستانی ہندی اور اُردو کے درمیان پُل بنا چاہتی ہے"۔

لیکن عرض یہ ہے کہ اگر یہ پُل بنانے والی وہی ہندوستانی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی ہے تو پھر میرا خیال ہے کہ اس پُل پر سے گزرنے والوں میں سے ۸۰ فی صدی کو دوسرا کنارہ دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے جس زبان میں تقریر کی ہے اُسے ہندوستانی کہنا ہندوستانی کی توہین ہے۔ اور یہ غالباً وہی زبان ہے جس کی جھلکیاں ہمیں وقتاً فوقتاً بعض مقامات سے نظر آنے لگتی ہیں۔ اگر جدید ہندوستانی اسی زبان کا نام ہے جس میں ہندی اور سنسکرت کے ناقابلِ فہم الفاظ کی بھرمار ہو تو یہ زبان ہندو دوستوں کو ہی مبارک ہو۔ اُردو بولنے والوں میں سے شاید پانچ فیصدی بھی اسے قبول نہ کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی جدید ہندوستانی کی فصاحت اور سلاست کی تو داد نہیں دی جا سکتی۔ "بازار و بولی"، "کوتا ہو رہی ہے"، "یورپ کی ودیا ئیں"، "ودیاؤں کی پری بھاشائیں"، "کھوج کرنے والے"، "ودیا اور ساہت"، "اُدھار لئے شبد"، "امت سنگھٹن"۔ اور ایسے ہی کم از کم چالیس فیصدی ہندی کے اور الفاظ آپ کی تقریر کی زیب زینت بنے ہوئے ہیں جنہیں مسلمان تو رہے ایک طرف ہندوؤں کی اکثریت بھی نہ سمجھ سکتی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ محقق کے لئے "کھوجو"! اصطلاح کے لئے "پری بھاشا" فقرے کے لئے "شبد" اور ایسے ہی سینکڑوں ہندی کے الفاظ مسلمانوں کو کیا پڑی ہے کہ قبول کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمیں سوراج کی یاد ستاتی ہے"

اور میرے خیال میں سوراج حاصل کرنے کے لئے ہی آپ نے جدید ہندوستانی کا یہ نسخہ تجویز فرمایا ہے کہ جہاں تک بن آئے عربی فارسی کے عام فہم اور شگفتہ الفاظ نکال کر ایک ایسی کھچڑی تیار کر لو جسے ہضم کرنا تو رہا ایک طرف حلق سے اُتارنا بھی مشکل ہو جائے۔

دوسری تقریر مولوی عبدالحق صاحب کی ہے۔ مولوی صاحب قبلہ اس بات کے حامی ہیں کہ زبان ایسی ہونی چاہئے جو پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی نہ ہو۔ یعنی جسے عوام الناس سمجھ سکیں۔ آپ کو ان اُردو والے حضرات سے بھی شکایت ہے جنہوں نے محض جدت نوازی کے طور پر ایسی زبان "گھڑنی اور ڈھالنی" شروع کی ہے جسے عوام النّاس سمجھ نہیں سکتے۔ اس زبان سے مولوی صاحب کا مطلب وہ اُردو ہو گی، جس میں بعض لکھنے والے عربی اور فارسی کے الفاظ ضرورت سے زیادہ ٹھونس دیتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کی اُردو نہ تو دلپذیر ہو سکتی ہے اور نہ عام فہم کہلا سکتی ہے۔ مولوی صاحب چاہتے ہیں کہ "زبان سادہ ہو اور اس میں لطافت بھی ہو"۔ لیکن اس کے ساتھ آپ کا یہ ارشاد ہے کہ:- "ہم کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ یوں نہیں یوں لکھو"۔

اور "آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ یہ ذوق کی بات ہے، اور ادب میں یہی منزل کٹھن ہے"۔

اور حقیقت میں ہے بھی اسی طرح نہ تو ہم کوئی حد مقرر کر سکتے ہیں، نہ کسی کا مذاق بدل سکتے ہیں۔ ہر شخص کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے کوشش سب کی یہی ہوتی ہے کہ زبان شگفتہ اور دلپذیر ہو۔ کوئی سادہ الفاظ میں لطافت پیدا کرتا ہے، کوئی دوسری زبان کے الفاظ لے کر اُسے مرصع بناتا ہے لیکن اگر مطلب و معنی سمجھنے میں کسی کو دقت محسوس نہ ہو تو اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔

ایک مقام پر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"گاندھی اور بابو راجندر پرشاد صاحب نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ ملانے کی بنگال والوں کیلئے ضرورت ہے۔ بنگال والوں کی ضرورت تو سر آنکھوں پر لیکن پنجاب و سرحد والوں کی ضرورت کا بھی آپ نے کوئی علاج سوچا ہے جس ہندوستانی کا ہمارے ہندو دوست پرچار کر رہے ہیں، ہندوستان کی اکثریت کے لئے یہ بھی ایک چیستاں سے کم نہیں۔ اگر گاندھی اور بابو صاحب محض بنگال والوں کو خوش کرنے کے لئے ایسی زبان بنانا چاہتے ہیں تو پھر اسے ہندوستان کی مشترکہ زبان کون کہے گا اور زبان بھی جس سے بقول مولوی صاحب

"کانوں کے پردے پھٹنے لگیں"

مولوی صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ ہندوستان کی زبان وہ ہے "جسے اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی"۔

اور اگر تعصب کا پردہ اُٹھا کر دیکھا جائے تو موجودہ اُردو میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایک مقام پر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"غیر زبان کے ایسے محاورے جو ہماری زبان میں کھپ سکیں اس سے زبان کی وسعت ہوتی ہے"۔

لیکن یہ مشورہ تو صرف وہ لوگ قبول کریں گے جنہیں اُردو زبان سے محبت ہے، جن کے دل میں اُردو کی عزت ہے، اور جو اُردو

کی وسعت کے لئے کوشاں ہیں۔ جو اُردو کو ملک کی مشترکہ زبان سمجھتے ہیں۔

مولوی صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل صحیح ہے کہ:۔

"اگر ہماری زبان زندہ ہے تو اس میں نت نئے اور روز نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے"

لیکن عرض یہ ہے کہ اگر آپ کی زبان کو یارانِ وطن کو زندہ رکھنا ہوتا تو ودیا مندر سکیم کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ہندو تو اُس زبان کو رائج کرنا چاہتا ہے جس کی مثالیں آئے دن اخبارات میں دیکھنے میں آتی ہیں اور جس کا سمجھنا تو رہا درکنار پڑھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

مولوی صاحب نے یہ خوب پتے کی کہی کہ "سب سے پہلے ہمارے ملک کی زبان کو انگریزوں نے ہندوستانی کہا"۔

اور غالباً گاندھی جی نے محض اسی لئے ہندوستانی کے ساتھ ہندی کا لفظ بھی جوڑ دیا تھا، جو بقول مولوی صاحب مقبول نہ ہوا۔

اب رہا یہ کہ ہندوستانی کیا ہے؛ تو اس کا جواب مولوی عبدالحق صاحب نے یہ دیا ہے:۔

"ہندوستانی وہ زبان ہے جس میں میں تقریر کر رہا ہوں"۔

اور اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہی وہ زبان ہے جسے آج اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی۔

تیسری تقریر بابو راجندر پرشاد صاحب کی ہے۔ بابو صاحب فرماتے ہیں:۔

"فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کی بھرمار کی وجہ سے ہندی اور اُردو ایک دوسری سے بھاگتی جارہی ہیں۔ ہندوستانی بیچ کا راستہ لیتی ہے"۔

مجھے خوف ہے کہ بہت کم لوگ بابو صاحب کے اس بارے میں ہم خیال ہوں گے۔ کیونکہ اُردو زبان تو ابھی تک اسی جگہ کھڑی ہے جہاں اُسے دونوں قوموں کے بزرگوں نے کھڑا کر دیا تھا۔ لیکن ہندی ضرور اس سے دُور دُور ہو رہی ہے۔ اور اس کے بھاگنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایک تو اُسے پالنے پوسنے والے ہی اُسے ایک مدت تک بھولے رہے، دوسرے اس زبان میں نہ لطافت ہے نہ فصاحت، رہا ہندوستانی کا بیچ کا راستہ لینا تو عرض یہ ہے کہ وہ بیچ کا راستہ لینے والی ہندوستانی ہے کہاں۔ اگر یہ وہی ہندوستانی ہے جس میں ڈاکٹر تاراچند نے تقریر کی ہے تو پھر بیچ کا راستہ لینا تو رہا ایک طرف، دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہو جانے کا امکان ہے جس کا پاٹنا ناممکن ہو جائے گا۔

ایک مقام پر بابو صاحب فرماتے ہیں:۔

"کانگرس نے اس کو (جدید ہندوستانی کو) قومی زبان یا راشٹر بھاشا مان لیا ہے۔ اس لئے اس کی عزت اور بھی بڑھ گئی"۔

لیکن عرض یہ ہے کہ وہ لوگ جو سرے سے کانگرس سے ہی برگشتہ یا بیزار ہیں ان کے لئے کانگرس کا ماننا یا نہ ماننا کیا وقعت رکھ سکتا ہے۔ وہ کانگرس جو ودیا مندر سکیم تیار کر رہی ہے اُسے کوئی حق نہیں کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ کہلائے۔ وہ کانگرس جسے مسلمانوں کے جذبات اور احساسات کی پروا نہیں اس کانگرس کی کوئی بات مسلمانوں کے لئے سند نہیں ہو سکتی۔ جس کانگرس کو مسلمانوں کا اعتماد ہی حاصل نہیں اُس کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی مسلمانوں کے لئے ایک مہمل چیز ہے۔

ہاں! کیا اچھا ہوتا جو بابو صاحب ذرا اس نیچ کا راستہ لینے والی زبان کی ایک دو مثالیں بھی بیان فرما دیتے جسے کانگریس نے "راشٹر بھاشا" مان لیا ہے۔

بابو صاحب فرماتے ہیں:۔

"ہندوستانی کے دو رُوپ کیے جاتے ہیں، ایک ہندی جس میں سنسکرت شبد بہت آتے ہیں، دوسرا اُردو جس میں فارسی اور عربی شبد آتے ہیں۔"

نہ جانے آپ کس ہندوستانی کا ذکر کر رہے ہیں۔ آج سے تھوڑا عرصہ پیشتر تو ہندوستانی یعنی اُردو کا ایک ہی رُوپ تھا۔ اور اس رُوپ میں عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے الفاظ بھی موجود ہیں اور اُردو لکھنے والوں نے خواہ وہ ہندو اہلِ قلم ہوں یا مسلمان اُسے دو "رُوپوں" میں کبھی تقسیم نہیں کیا۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ کانگریس نے اس میں ایک ناقابلِ معافی تفرقہ ڈال دیا ہے، اور اب اس کے واقعی دو رُوپ ہو گئے ہیں۔ ایک اس کا اصلی روپ جس سے مُلک کی ایک بہت بڑی اکثریت بخوبی واقف ہے، اور دوسرا کانگرسی رُوپ جس سے ایک نہایت قلیل اقلیت آشنا ہو رہی ہے۔

اُردو ہندی کا جھگڑا خالص کانگرسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ اور اسی سے متاثر ہو کر اکثر ہندو اہلِ قلم کاوش سے ہندی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن مسلمان لکھنے والے ابھی تک اس تنگ ظرفی کا شکار نہیں ہوئے کہ محض قومی یا مذہبی کاوش سے ہندی یا سنسکرت کے وہ مانوس اور عام فہم الفاظ جو ایک مدت سے اُردو میں رچ گئے ہیں لکھنا ترک کر دیں۔

بابو صاحب نے مثال کے طور پر انگریزی کے دو جملے لئے ہیں، ایک کا اُردو میں ترجمہ ہے، دوسرے کا ہندی میں۔ پہلا فقرہ ہے:

The preliminary step to be taken in connection with the preparation of electoral rolls for the Federal Legislature were indicated by Sir Nripindra Nath Sirkar, the Law Member in the Central Assembly today.

اس کا چلتی اُردو میں یہ ترجمہ ہے:۔

"فیڈرل لیجیلیچر کے لئے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلہ میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی، اُس کے بارے میں سر این این سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی ہے۔"

دوسرا فقرہ ہے:۔

Replying to a question in the United Provinces Legislative Assembly to-day, Dr. Katju, Minister for Justice, gave a list of the grants-in-aid which the Government had sanctioned for the purpose of experiments in new fields of manufacture.

اب اس کا ہندی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :-

"سنیکت پرانتیہ پکا پریشد میں ایک پرشن کا اُتّر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے ان اُدیوگ دھندوں کی سُوچی دی۔ جن کی اُنتی کے لئے سرکار نے سہایتا دینا سویکار کیا ہے"۔

بابو راجندر پرشاد صاحب کو اُردو کے ترجمے میں "رائے دہندگان" پر اعتراض ہے۔ ان کے خیال میں "رائے دینے والے" ہونا چاہئے۔ اسی طرح وہ "ابتدائی کارروائی" کو بھی قابلِ اعتراض قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہندی ترجمے کے متعلق اُن کی رائے ایسی سخت ہرگز نہیں۔ اور غالباً یہ وہی ہندوستانی ہوگی جو بقول بابو صاحب "بیچ کا راستہ لیتی ہے"۔ اگر یہی وہ راشٹر بھاشا ہے جو کانگرس پسند کرچکی ہے تو اب آپ ہی ذرا انصاف سے کہہ دیں کہ وہ لوگ جو دل سے اُردو کے بہی خواہ ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اس زبان کو کبھی قبول کریں گے؟ اِس کے سمجھنے والے ملک میں مشکل سے بیس فیصدی یا اس سے بھی کچھ کم ہی ہوں گے۔

اپنی تقریر میں بابو صاحب نے اپنی فراخدلی کا یہ کہہ کر ثبوت دینا چاہا ہے کہ :-

"جتنے فارسی اور عربی لفظوں کو اچھا لکھنے والوں نے اختیار کیا ہے اور سنسکرت کے وہ الفاظ بھی جو ادیبوں نے استعمال کئے ہیں سب کو ہندوستانی میں لینا چاہئے"۔

لیکن عرض یہ ہے کہ اُردو تو اسی زبان کا نام ہے جس کو اچھا لکھنے والوں نے بنایا ہے اور اس مرحلہ پر پہنچایا ہے اور اس میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش محنت کرتے ہیں۔ آپ اسے ہی ہندوستانی کہہ لیجئے، اس میں فارسی عربی کے ہی الفاظ ہیں جنہیں اچھا لکھنے والوں نے اختیار کیا ہے اور سنسکرت اور ہندی کے بھی وہی الفاظ موجود ہیں جو ادیبوں نے استعمال کئے ہیں، اس زبان کے ہوتے ہوئے پھر ہندی اور اُردو کا جھگڑا کیسا۔

اور پھر آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ :-

"نئے نئے الفاظ عربی، فارسی اور سنسکرت سے ہی بنائے جا سکتے ہیں کہیں کہیں انگریزی شبد بھی استعمال کرنے پڑیں گے"۔

اور جب آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ :-

"لفظوں کو نکالنے کی کوشش ٹھیک نہیں"۔

تو بندہ پرور! پھر "بیچ کا راستہ" لینے والی اور کون سی زبان ہوگی۔ اگر یہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور والی بات نہیں، تو وہ خوفناک اختلاف جو ملک میں زبان کے مسئلہ پر ہو رہا ہے اسے ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ پھر آپ کا یہ ارشاد کہ

"ہندوستانی جو سب لوگوں کی زبان ہونے کا دعویٰ کرتی ہے ایسی ہو گی جسے سب سمجھ سکیں"۔

اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو آپ یُوپی کے کانگرسی وزیرِ تعلیم کی اس زبان کے متعلق کیا فرمائیں گے جس کا تھوڑے دن ہوئے اخبارات میں خُوب

پرچار رہا۔ کیا آپ اسی زبان کو راشٹر بھاشا کہیں گے جسے یوپی کے رہنے والوں میں سے بھی پچیس فیصدی سے زیادہ نہیں سمجھ سکتے پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے! پھر ملک کے سامنے اس قسم کی تجویزیں پیش کیجئے

تو خیر ایک اور مقام پر بابو صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان ایک باغ ہے، اس میں طرح طرح کے پودے لگے ہوئے ہیں، اگر ایک دوسرے کی خوراک چھیننے کی کوشش کرے گا تو کچھ سُوکھ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ بعض کو فائدہ بھی پہنچے۔ لیکن باغ کی خوبصورتی میں فرق آجائے گا"

لیکن گستاخی معاف! یہ بھی تو دیکھئے کہ جائز حق چھیننے کی کوشش کس طرف سے ہو رہی ہے۔ اس باغ کی خوبصورتی میں فرق آنے کا الزام آپ ان لوگوں کے سر تو ہرگز نہیں تھوپ سکتے جنہوں نے یہ باغ لگایا اور جو اس وقت تک اس باغ کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ یہ باغ اگر سوکھے گا تو اُس کے ہم قوم لوگوں کی تنگ نظری کی وجہ سے سُوکھے گا۔ آخر آپ نے اس کا بھی کچھ علاج سوچا؟ جس طرح اس باغ کو تر و تازہ دیکھنا آپ کا "دھرم" ہے اسی طرح اس باغ کو ناقدر دانوں کی لُوٹ مار سے بچانا ہمارا بھی اخلاقی فرض ہے۔

چوتھی تقریر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ہے۔ آپ نے "ہندوستانی کیا ہے" کا جواب نہایت کھلے الفاظ میں یہ دیا ہے کہ:۔

"ہندوستانی وہ زبان ہے جس میں مَیں آپ سے باتیں کر رہا ہوں اور آپ اسے سمجھ رہے ہیں"

یہ ایک ایسا جواب ہے جو ہر کس و ناکس کو ماننا ہی پڑے گا۔ ہندوستان میں جہاں کہیں بھی آپ جائیں اُردو سمجھنے اور بولنے والے آپ کو ضرور ملیں گے، خواہ پڑھنے لکھنے والے کم ہی ہوں۔ لیکن ہندی لکھنے پڑھنے والے کا تو ذکر ہی کیا ہندی بولنے یا سمجھنے والے بھی آپ کو خال خال ہی نظر آئیں گے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"اچھی ہندوستانی کی پہچان یہ ہے کہ نہ اُردو والا اُس میں نقص نکال سکے اور نہ ہندی والا اُنگلی رکھ سکے"

اب ڈاکٹر تاراچند اور بابو راجندر پرشاد صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ وہ زبان جس کا ڈھونگ آپ کے ہم نوا رچاتے پھرتے ہیں کہاں تک اس کسوٹی پر پوری اُترتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے صاف صاف الفاظ میں یہ راز کی بات بھی کہہ دی ہے کہ ہندو تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ زبان ——— "سودیشی اور شدھ ہو"

اور اسی تنگ نظری نے ——— "ہندی اُردو کا جھگڑا پیدا کیا ہے"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے اس رازِ درونِ خانہ کی اور بھی وضاحت فرما دی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"جو لوگ ہندوستانی زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکالنا چاہتے ہیں وہ اُسے شُدھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں"

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کانگرس نے اُردو ہندی کا جو جھگڑا پیدا کر رکھا ہے، ایک

طرف تو یہ ایک گہری سیاسی چال ہے اور دوسری طرف مذہب کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ کئی بار ہندو صاحبان کی طرف سے یہ اعلان ہو چکا ہے کہ اُردو زبان پڑھنے سے دھرم کا ناش ہوجاتا ہے۔

زبان کو شُدھ کرنے کا مسئلہ بہت پختہ کار دماغوں کی اختراع ہے۔ آج آپ کی زبان شُدھ ہورہی ہے کل آپ کے تمدن اور تہذیب پر کلہاڑا چلایا جائے گا . . . .

اپنی تقریر میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ فرمانا کہ :۔

"ہماری زبان میں جو لفظ آ گئے سو آ گئے اور یہی وہ الفاظ ہیں جن کو ہم سمجھتے ہیں"۔

اس بات کی دلیل ہے کہ مُلک کو کسی جدید زبان کی ضرورت نہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ :۔

"سائنس کی کتابوں کے لئے یورپ کی زبانوں سے الفاظ لینے چاہئیں۔ عربی و سنسکرت سے بھی الفاظ لینے ہوں گے۔ اس خیال سے نہیں کہ سنسکرت الفاظ سے زبان شُدھ ہوگی۔ اور عربی اُسے مقدس بنا دے گی"۔

ایک حقیقت ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب سے یہ کون کہے کہ حضرت! سنسکرت سے الفاظ لینے سے تو کسی کو بھی انکار نہیں، رونا تو یہاں صرف عربی اور اُردو الفاظ کا ہے جن کے متعلق گاندھی بھی کہہ چکے ہیں کہ :۔

"یہ مسلمانوں کی زبان ہے مسلمان چاہیں اسے رکھیں یا نہ رکھیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے خوب کہا ہے کہ :۔

"زبان ایک سماجی چیز ہے، یہ آدمی سے آدمی کا رشتہ جوڑتی ہے"۔

لیکن جناب جہاں کانگرس حکومت کے زعم میں مسلمانوں کی تخریب کے درپے ہو وہاں رشتہ جوڑ کر رکھنے کی ضرورت ہی کب محسوس ہونے لگی۔

پانچویں تقریر جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب کی ہے۔ اس زمانے میں پنڈت صاحب اُردو کے سرپرست متصور ہوتے ہیں لیکن اس تقریر میں جو آپ نے ریڈیو پر نشر کی ہے ہندی الفاظ کی جو بلاضرورت آمیزش جائز رکھی ہے۔ آپ کی اکثر تحریریں اور تقریریں اس عیب سے پاک نظر آتی ہیں۔ انگریزی کے لس اُردو ترجمے میں جس کا میں نے بابو راجندر پرشاد صاحب کی تقریر میں ذکر کیا ہے آپ کو بھی "رائے دہندگان" پر اعتراض ہے۔ آپ کے خیال میں "رائے دینے والا" ہونا چاہئے۔ اسی طرح "ابتدائی کارروائی" اور "روشنی ڈالی" بھی آپ کے نقطۂ نظر سے اصلاح کے قابل ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ "ابتدائی کارروائی" اور "روشنی ڈالی" ایسے سادہ اور عام فہم الفاظ کی بھی جدید ہندوستانی میں کھپت نہ ہو سکے گی۔ جب اُردو کے ایک گراں پایہ ادیب کا یہ حال ہے تو دوسروں سے شکایت ہی کیا۔

پنڈت صاحب کا یہ خیال ہے کہ "فلمی زبان" جدید ہندوستانی بنانے میں مدد دے سکے گی، ہندو نقطۂ نگاہ سے صحیح ہے۔ کیونکہ اس وقت اکثر فلمی ڈراموں کی زبان میں ہندی کے الفاظ اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ بعض اوقات مکالمہ سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اُردو کے خلاف ہندو

کے پاس فلم ایک ایسا خوفناک حربہ ہے جس کی روک تھام کی ہم لوگوں میں نہ ہمت ہے نہ وسعت۔ ہندو ڈراما نگار جان بوجھ کر اُردو زبان کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ جب سے اُردو ہندی کا جھگڑا پیدا ہوا ہے فلمی ڈراموں کی زبان قریب قریب بالکل ہندوانہ ہوگئی ہے۔ آج مسلمان یہ الفاظ سننے کے خوگر ہو رہے ہیں۔ کل یہی ہندی الفاظ اُن کی زبان پر ہوں گے اور یہی ہندو کی خواہش ہے۔

اپنی تقریر کو جناب کیفی صاحب نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے :۔

"جس زبان میں مَیں نے تقریر کی ہے یہی ہندوستانی ہے۔"

لیکن اس سے پہلے جو آپ تقریریں فرما چکے ہیں وہ کسی اَور ہی "ہندوستانی" کی یاد دلاتی ہیں۔

چھٹی اور آخری تقریر مسٹر آصف علی صاحب کی ہے :۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لاہور میں مسلم لیگ کے اس اجلاس کے موقع پر جس کے صدر جناب محمد علی صاحب جناح تھے کسی قرارداد کی تائید میں اُردو میں ایک ایسی تقریر کی تھی جس کی سلاست اور چٹخارے سے بس مزا ہی آگیا تھا۔ آج "ہندوستانی کیا ہے" کے موضوع پر جو آپ نے تقریر فرمائی ہے اس میں وہی مولوی مدن والی بات کہیں نظر نہیں آتی بلکہ اس کے برعکس بھرتی کے نا ملائم اور غیر مانوس الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ بہرکیف آپ کا یہ ارشاد کہ :۔

"آج ہندی والے ان لفظوں کو جو اُردو میں عربی فارسی سے آکر گھل مل گئے ہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں اور ان کی جگہ مشکل سنسکرت الفاظ شامل کر رہے ہیں۔"

صاف بتلاتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی اپنی مادری زبان کی محبت ابھی تک موجود ہے اور غالباً اسی لئے آپ کو یہ اندیشہ بھی ہے کہ :۔

"اس وقت ہندی اور اُردو جس چال سے بڑھ رہی ہیں ان کا نتیجہ صاف یہ ہے کہ یہ دونوں بالکل علیحدہ ہو جائینگی۔"

علیحدہ تو جناب یہ ایک دوسرے سے اُسی روز ہو چکی تھیں جس روز بقول بابو راجندر پرشاد صاحب کانگرس نے اُسے "راشٹر بھاشا" تسلیم کر لیا تھا۔ یہ راشٹر بھاشا کم از کم مسلمان تو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس زبان کا قبول کرنا اُردو کی ترقی، سلاست اور دلکشی کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

آصف علی صاحب چاہتے ہیں کہ جدید زبان بنانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ اس سے پھر یہ شُبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ بھی اُردو زبان سے کچھ بیزار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یا ممکن ہے کانگرسی نقطۂ نظر سے یہ اظہار فرمایا جا رہا ہے۔ گستاخی معاف! کسی مُلک کی زبان کمیٹیاں نہیں بنایا کرتیں، زبان بنانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اہلِ قلم کہا جاتا ہے۔ اس میں مذہب اور قومیت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ یہاں پوتّر اور شُدھ کا جھگڑا پیدا نہیں ہوتا بلکہ سوال ایک قومی یا مُلکی ضرورت کا ہوتا ہے۔ علم و ادب کی خدمت مدِّنظر ہوتی ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"اُردو، ہندی اور ہندوستانی، تین زبانیں ہیں، اُردو تو بن چکی اور ہندی بھی تقریباً مکمل ہو چکی ہے، ان دونوں

کے سنجوگ سے جو آسان زبان بنے گی وہ ہندوستانی ہے۔"

اِس سے کم ازکم اتنا تو معلوم ہوگیا کہ جس زبان میں آپ نے تقریر کی ہے آپ اُسے ہندوستانی کہنے کے لئے تیار نہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ سر تیج بہادر سپرو کی بھی وہ تقریر پڑھ لیتے جس میں اُنہوں نے زبان کے مسئلہ پر نہایت کھلے الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

سر تیج بہادر سپرو نے جس طرح اُردو کی حمایت کی ہے اُردو کے مخالفین کا مُنہ بند کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اگر اس پر بھی کوئی قائل نہ ہو تو سنئے مسٹر سبھاس چندر بوس کانگرس کے اجلاس کے صدارتی خطبہ میں قومی زبان کے متعلق کیا فرما چکے ہیں:۔

"جہاں تک ہماری قومی زبان کا تعلق ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ ہندی اور اُردو کا فرق مصنوعی ہے۔ ہماری حقیقی اور فطری قومی زبان وہی ہے جسے نہ ہندی کہا جا سکتا ہے اور نہ اُردو۔ بلکہ جو دونوں کا مرکب ہے۔ اور یہ وہی زبان ہے جو ملک کے ایک بڑے حصے میں عام طور پر بولی جاتی ہے۔"

مسٹر آصف علی فرماتے ہیں: "جہاں تک علمی مضامین کا تعلق ہے۔ ہندی اُردو کا جوڑ ہونا ناممکن ہے۔"

لیکن یہ کب سے ناممکن ہوگیا۔ یہ مشکل پیدا کب سے ہوئی۔ میرے خیال میں اگر آپ نے اپنے ملک کے ادب کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لی ہوتی تو شاید آپ اس مشکل کا ذکر نہ کرتے۔

آپ فرماتے ہیں: "تمام ہندوستان کی زبان سے اخذ کرکے ایک ایسی کھچڑی تیار کرنی چاہئے جو سب کی سمجھ میں آئے۔"

کیا اچھا ہوتا کہ آپ اس "کھچڑی زبان" کی دو چار مثالیں بھی پیش کر دیتے تاکہ آپ کی مجوزہ کمیٹی کو کھچڑی بنانے میں سہولت ہوتی۔

آپ کہتے ہیں:۔

ہندوستان تو کئی دیسوں کا مہا دیس ہے۔ رہنے سہنے کے طریقے ایک ہونے کے باوجود زبان ایک نہیں۔

تمام ہندوستان کی زبان نہ تو موجودہ ہندی ہی ہوسکتی ہے اور نہ موجودہ اُردو۔"

یہ تو ٹھیک ہے کہ ہندوستان کئی دیسوں کا مہا دیس ہے۔ لیکن جناب والا یوپی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہنے سہنے کے طریق ایک ہوں تو ہوں یہاں پنجاب و رصوبہ سرحد میں تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ آپ ہندوستان کی ایک زبان ہونے کا دکھڑا تو لے بیٹھے لیکن فرمائیے انگلستان میں کیا حالت ہے۔ ان لوگوں کو آپ کی طرح یہ خیال کیوں پیدا نہیں ہوتا کہ سارے انگلستان میں ایک ہی زبان بولی جائے۔ رہا آپ کا یہ ارشاد کہ "تمام ہندوستان کی زبان نہ تو موجودہ ہندی ہی ہوسکتی ہے اور نہ موجودہ اُردو۔" تو عرض یہ ہے کہ ہندی کے متعلق تو مَیں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا، ہاں اُردو کو ضرور ملیامیٹ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ کانگرس اسے ملک کی زبان تسلیم نہیں کرتی۔

اِن سطور کے پڑھنے سے اتنا تو ظاہر ہے کہ ہندو صاحبان موجودہ اُردو کو مُلکی یا قومی زبان تسلیم کرنے پر نہ صرف آمادہ نہیں، بلکہ اس کی تخریب کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

اس قسم کی نفاق انگیز تحریکوں کا سب سے بڑا باعث کانگرس کا ملک کے نظم ونسق میں اقتدار ہے۔ کانگرس سے مسلمانوں کو کسی قسم کی اُمید رکھنا محض طفلانہ آرزو ہے۔ کانگرس نے ہر گام اور ہر میدان میں مسلمانوں سے مل جل کر کام کرنے سے گریز کیا ہے۔

دُوسرا باعث غالباً یہ ہے کہ ہندو ہندوستان کو خالص ہندوؤں کا ملک سمجھتا ہے۔ جیسے کہ ہندو مہا سبھا کے صدر ستاور کر نے کہیں بنگال میں کسی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ:-

"ہندوستان ہندوؤں کا ہے، اس میں عام قومیں شہریوں کی طرح تو رہ سکتی ہیں لیکن راج ہندوؤں کا ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ اس ملک کے مالک ہیں"

اسی طرح اسی کانفرنس میں مسلمانوں کے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر مونجے نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ:-

"میں ایک مدت تک اس سوال پر غور کرتا رہا ہوں کہ ہندوستان کس کا ہے۔ آخر ایک دن والمیکی رامائن پڑھتے ہوئے ایک جگہ یہ فقرہ نظر پڑا:-

'والمیکی کی موت کے وقت بالی نے اُس سے پوچھا کہ تو اس ملک میں کیونکر آیا۔ اُس نے جواب دیا کہ میں اس ملک میں اجنبی نہیں ہوں۔ میرے باپ دادا نے اس ملک کو فتح کیا تھا'

بس اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ واقعی یہ ملک ہندوؤں کا ہے"

اب فرمائیے جب ملک میں اس قسم کے لال بجھکڑ موجود ہوں تو اُن سے اور توقع کیا ہو سکتی ہے۔ ابھی تو یہ لوگ زبان کی گتھیاں سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ دن بھی کچھ دُور نہیں جب کھدر کی دھوتی اور گاندھی ٹوپی پہننے پر عام ہندوستانیوں کو مجبور کیا جائے گا۔

اُردو کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہ غریب مسلمانوں سے منسوب ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۱۷۹۷ اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ہندی میں چھپنے والوں کی تعداد ۱۰۴ ہے اور اُردو میں ۸۱۳ شائع ہو رہے ہیں۔ ہندی کے ۱۰۶ ہفتہ وار اخبار ہیں اور اُردو کے ۲۴۲۔ ہندی کے ۳۰ روزانہ چھپنے والے پرچے ہیں اور اُردو کے ۵۷۔ باقی ہندوستان کی اور زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اُردو کہاں تک ملک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔

اور لیجئے! ابھی حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی کی طرف سے اپنے سُننے والوں سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کونسی زبان میں پروگرام سُننا پسند کریں گے۔ اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

ہندوستانی	انگریزی	گجراتی	مرہٹی	ہندی
۲۵۶۷	۲۵۳۲	۱۷۴۲	۱۵۵۹	۰

یعنی احاطہ بمبئی کے تقریباً آٹھ ہزار ریڈیو سُننے والوں میں سے باسٹھ فیصدی ہندوستانی کے حق میں ہیں۔ اس کے بعد دوسرا سوال یہ

تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں براڈکاسٹ کیا جائے تو آپ کونسی زبان پسند کریں گے۔ اس کا جواب یہ ملا:۔

ہندوستانی	انگریزی	گجراتی	مرہٹی	ہندی
۳۶۵۰	۱۶۴۶	۹۲۰	۸۴۵	۰

پھر کلکتہ، دہلی اور مدراس کے ریڈیو سننے والوں سے پُوچھا گیا کہ آپ کس زبان کو پسند کرتے ہیں۔ اس کا جواب ملاحظہ کیجئے:۔

	ہندوستانی	انگریزی	بنگالی	
کلکتہ:۔	۳۵۴۹	۱۶۵۴	۳۹۹	
	ہندوستانی	انگریزی	ہندی	
دہلی:۔	۳۸۴۸	۱۶۳۶	۰	
	ہندوستانی	انگریزی	تامل	تلنگی
مدراس:۔	۳۵۲۵	۱۶۸۱	۳۹۴	۲۱۹

ان اعداد و شمار سے بھی صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ملک کا ہر گوشہ کانگرس کی راشٹر بھاشا عرف جدید ہندوستانی کو پسند نہیں کرتا۔

اب ذرا آپ آل انڈیا ریڈیو مدراس کے پروگرام ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں آپ کو ایک فی صدی بھی ہندوستانی پروگرام نظر نہ آئے گا۔ گویا مدراس میں اُردو یا ہندوستانی بولنے، سمجھنے، پڑھنے والے نام کو بھی نہیں۔ یہ سب وہاں کی کانگرسی وزارت کی کرامت ہے کہ اُردو کا سرکاری محکمہ میں سے نام و نشان تک مٹا دیا گیا ہے۔

آپ آل انڈیا ریڈیو دہلی ہی کو لیجئے۔ ہندوستانی میں جب خبریں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ حضرت جو یہ خبریں نشر کرنے پر مقرر ہیں خوب دل کھول کر ہندی کے ایسے الفاظ جنہیں عام لوگ نہیں سمجھ سکتے استعمال کرتے رہتے ہیں، حالانکہ آل انڈیا ریڈیو دہلی بھی سرکاری محکمہ ہی ہے۔ لیکن ہزار آفریں ہے مسلمانوں پر جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اُردو کی حفاظت کے لئے انجمنیں تو کافی بن چکی ہیں لیکن یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان انجمنوں نے کام کیا کیا ہے۔ حالانکہ یہ ان ہی انجمنوں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی غیر آئینی حرکات پر آواز بلند کریں ؎

یہ غفلتیں مبادا کچھ روزِ بد دکھائیں
دُھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ جائیں

(ایم اسلم)   "ساقی"

کانگریس کی مصنوعی "ہندوستانی" زبان



*

مطبوعات

برطانوی ہند کی تاریخ اور اُس کے مؤرخین از ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں۔ حجم ۱۰۳ صفحات۔ مجلد۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ پبلشر کتابستان الہ آباد و لندن۔ قیمت درج نہیں۔

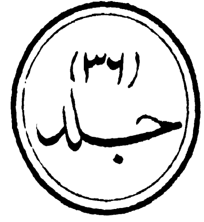
وفاقی مالیات از ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں۔ حجم ۶۵ صفحات۔ مجلد۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲ آنے۔ پبلشر: بڑودہ سٹیٹ پریس۔

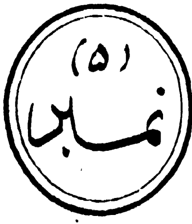
یہ دونوں کتابیں انگریزی میں ہیں اور ان کے نام یہ ہیں:۔

The History and Historians of British ۹ ۱.

Federal Finance.

۱۹۱۰ء اور ۱۹۳۹ء میں





فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ نومبر ۱۹۳۹ء

تصویر:- ماں اور بچہ

اگر "ہمایوں" آپ کے خیالات کا ترجمان ہے تو اپنے دوستوں کو اس کی خریداری کی طرف توجہ دلائیے

قارئینِ ہمایوں!

جنگِ فرنگ نے کاغذ اور دُوسرے سامانِ طباعت کی گرانی سے جرائد و رسائل کے لئے جو مشکلات پیدا کر دی ہیں اُن کا ذکر آپ متواتر سنتے رہے ہیں۔ یہ بارہا دُہرایا ہُوا قصہ ایک بار پھر دُہرا کر ہم نہ "ہمایوں" کا حجم کم کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں، نہ گھٹیا کاغذ استعمال کرنے کی سبیل ڈھونڈتے ہیں اور نہ چندے میں اضافے کی راہ نکالنا چاہتے ہیں ہم تا بہ مقدور ہر شعبے میں "ہمایوں" کا موجودہ نفیس معیار قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔

اگر "ہمایوں" آپ کی زبان، ادب، یا معاشرہ کی کوئی خدمت انجام دے رہا ہے تو یہ بات ہم سے زیادہ آپ پر روشن ہو گی اور اُس کی موجودہ حیثیت کو قائم رکھنے کی آپ کو بھی ویسی ہی آرزو ہو گی جیسی ہمیں ہے۔

آپ سے "ہمایوں" کی ترقیٔ اشاعت کے لئے التجا کی جائے تو یہ اب ایک ایسی پھیکی سیٹھی اور بے مزہ بات ہو گئی ہے جو غالباً درخورِ سماعت بھی نہیں رہی۔

ہم آپ پر کوئی بے جا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ اگر آپ صرف اتنی ہی تکلیف گوارا کریں کہ اپنی میعادِ خریداری کے ختم ہو جانے پر دوبارہ اپنا چندہ بھیج کر سلسلۂ معاونت جاری رکھیں تو بڑی عنایت ہو۔ لیکن یہ درخواست بھی صرف اُسی صُورت میں توجہ کی مستحق ہے کہ "ہمایوں" آپ کی یا آپ کے متعلقین کی ذہنی و روحانی ضروریات کو پُورا کرتا ہو۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ چند حروف سننے والے کانوں تک پہنچ سکیں گے۔

جائنٹ ایڈیٹر "ہمایوں"

جہاں نما

جنگ میں ہندوستان کو امکانی خطرات

ہندوستان کے کمانڈر اِن چیف نے حال ہی میں شملے سے ایک تقریر نشر کی تھی جس میں اُنہوں نے موجودہ بین الاقوامی کشمکش کو پیشِ نظر رکھ کر اُن خطرات پر ایک نظر ڈالی تھی جن کی زد میں اس کشمکش کے نتیجے کے طور پر یہ مُلک بھی آسکتا ہے۔ تقریر کا ملخص حسب ذیل ہے:-

"جن لوگوں کو ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ یاد ہے، وہ جانتے ہیں کہ اگرچہ ہندوستانی فوجیں حدودِ ملک سے باہر جا کر عراق افریقہ اور یورپ میں بھی لڑتی رہیں لیکن ہندوستان جنگ کے مرکز سے بہت دُور رہا اور اس کے لئے کسی قسم کا خطرہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اگر ہم موجودہ جنگ میں بھی ہندوستان کو خطرات سے اتنا ہی ماوراء تصور کریں تو یہ دانشمندی سے بعید ہوگا۔ مشرق کی طرف نظر ڈالو اور سوچو کہ اگر ملّایا اور وہاں کی عظیم الشان چھاؤنی سنگاپور دُشمن کے ہاتھوں میں چلی جائے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ برطانی بحری بیڑے سے اس کا عظیم الشان مشرقی مرکز چھن جائے گا اور کلکتہ سے لے کر مدراس تک ہندوستان کا تمام مشرقی ساحل بحری اور ہوائی حملوں کی زد میں آجائے گا۔ ملّایا کا چھن جانا برما کے لئے بھی خطرات پیدا کردے گا۔ نپولین نے اینٹورپ پر قابض ہونے کے بعد کہا تھا کہ اس کی حیثیت برطانیہ کے لئے ایک پستول کی سی ہے جس کا نشانہ اس کے قلب کی طرف ہے۔ اگر برما دُشمن کے ہاتھوں میں چلا گیا تو یہ بھی بنگال کے قلب کے لئے ایک ویسا ہی پستول بن جائے گا۔

مغرب کی طرف بحیرۂ احمر اور مصر کی طرف ایک نظر ڈالو۔ جب تک ہمارا حلیف مصر آزاد خود مختار اور اغیار کے حملوں کی مدافعت کے قابل ہے اس وقت تک بحرِ ہند اور ہندوستان کے مغربی ساحل خطرات کی زد سے باہر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے یہ بات نہایت اہم ہے کہ مصر اور عدن کبھی دشمنوں کے قبضے میں نہ جائیں۔

گزشتہ چند سال سے دُنیا کے حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس کی وجہ سے یہ مقامات جو میں نے گِنائے ہیں ہندوستان کی حفاظت کے لئے بہت اہم ہوگئے ہیں، یہ گویا ہندوستان کی سرحدی چھاؤنیاں ہیں۔ مشرق کی طرف سنگاپور، ملایا اور برما اور مغرب کی طرف مصر، عدن اور خلیج فارس کے خطّے۔ اگر یہ علاقے دشمن کے ہاتھ میں چلے جائیں تو ہندوستان کی

حکومت خطرے میں پڑ جائے گی۔ خوش قسمتی سے ہمیں ان مقامات کی اہمیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے، اور ایسے انتظامات کئے جا چکے ہیں کہ ان مقامات کا دشمن کے ہاتھ میں جانا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے، بالخصوص اس وقت تک جب تک ہمیں ٹرکی، عراق اور مصر کی حمایت حاصل ہے۔ ہر اس مقام پر جہاں سے ہندوستان کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے، برطانی چھاؤنیاں قائم ہو چکی ہیں اور مصر میں تو مصری فوج بھی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یورپ میں اس قسم کے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ برطانیہ کو وہاں اپنی تمام بری، بحری اور ہوائی طاقت مرتکز کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ وقت کے لئے بحری اور بری ذرائع آمدورفت مسدود ہو جائیں اور سویز کے مشرقی حصے کی طرف برطانیہ بروقت مدد پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان حالات میں اُن ملکوں سے جن کا نام میں پہلے لے چکا ہوں۔ ہندوستان کو بروقت کمک حاصل ہو سکتی ہے۔"

"رہنمائے سیاست"

کارل چیپک نے موجودہ زندگی کے مشاہدے سے چند دلچسپ خیالات اخذ کئے ہیں، گو بظاہر یہ مزاحیہ معلوم ہوں، لیکن دراصل یہ آج کل کی بین الاقوامی زندگی کی اصلی صورت کو بڑی خوبی سے بے نقاب کر کے دکھا رہے ہیں۔

"معاہدے اس لئے کئے جاتے ہیں کہ کمزور قومیں اُن کی پابند رہیں۔

"سیاسی مدبرین کی کوششیں بین الاقوامی عدمِ تحفظ کو کاملاً قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔

"امن قائم رکھنے کے لئے کمزور اور مظلوم قوموں کے خلاف فوری اور قاطع تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

"جنگ کو ایک خاص علاقے تک محدود رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ مظلوم کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

"جنگ کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی مظلوم کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دیئے جائیں۔

"امن قائم رکھنے کے لئے دوسرے جو قربانی بھی کریں کم ہے۔

"کہیں آگ لگے تو بہت سے لوگ اپنی ہنڈیا گرم کرنے لگتے ہیں۔

"چیکوسلوویکیا فروخت نہیں کیا گیا۔ مفت لُٹا دیا گیا ہے۔"

اخبارات کی طاقت

جارج سیلڈز "لارڈز آف دا پریس" میں صحافت کے اثر و اقتدار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اخبار نویس دُنیا میں عموماً بہت

بلند مناصب حاصل کرتے رہے ہیں مثلاً لینن اور ٹراٹسکی نے ابتدا میں انقلابی صحائف جاری کر رکھے تھے اور کرنسکی کے عہدِ اقتدار میں سٹالن بھی پیٹرو گراڈ میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اٹلی میں مسولینی کی اشتراکی صحافت نے ایک زمانے میں غلغلہ برپا کر رکھا تھا۔ آخر فرانسیسی حکومت نے اتحادیوں کی حمایت کے لئے ایک اخبار جاری کیا اور اس کی ادارت بھی مسولینی کے سپرد کی گئی۔ اِسی دَوران میں فاشزم کی ابتدا ہوئی۔ کسی زمانے میں کمال اتاترک بھی ایک باغیانہ پرچہ شائع کیا کرتا تھا۔ ہٹلر کے اخبار کا نام "بیوبیچر" تھا۔ فرانس کے ہر وزیرِ اعظم کا اپنا الگ اخبار ہوتا ہے کیونکہ یورپ میں صحافت ہی وہ حربہ ہے جس سے افراد اور جماعتیں برسرِ اقتدار آنے کے لئے لڑتی ہیں۔"

سینما اور ہندوستان

ہندوستان میں سینما کے کام نے ایک قلیل مدت میں جو ترقی کی ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابھی اس صنعت کی توسیع و ترقی کے لئے اس مُلک میں عظیم الشان امکانات موجود ہیں۔

ممالکِ متحدہ امریکا میں ...... ۱۳۰ کی آبادی کے لئے ...... ۲۰ سینما قائم ہیں اور ان میں ہر ہفتے ...... ۱ تماشائی جاتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ دُنیا بھر میں ...... ۹۶ سینما گھر ہیں اور ان میں ہر ہفتے ...... ۲۳۰ تماشائی جاتے ہیں۔

ہندوستان کی آبادی ...... ۳۷ افراد پر مشتمل ہے اور یہ آبادی دُنیا کی کُل آبادی کا ⅕ حصّہ ہے لیکن اس مُلک میں ابھی تک تقریباً صرف ... ۱ سینما گھر قائم ہوئے ہیں۔ مُلک کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ اس تعداد میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

کچھ عرصہ ہُوا "انڈین پکچر کانگریس" نے اس بات کی سخت شکایت کی تھی کہ ہندوستان میں فلمسازی کی صنعت اقتصادی امداد سے بہت بُری طرح محروم ہے۔ اس شکایت کا ازالہ صرف حکومت ہی کر سکتی ہے۔

امنِ عالم کے لئے آفاقی ذہنیت کی ضرورت

"انڈین ریویو" نے دُنیا کو عالمگیر اخوّت کا ایک نظام قائم کرنے کی دعوت دی ہے اور اس بات پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ دُنیا میں کوئی ایسی قوم موجود نہیں جس کی حکومت کے ارکان یہ آواز بلند کریں کہ ہمیں اپنی ہمسایہ قوم کی فلاح و بہبود کا بھی اُسی طرح خیال رکھنا چاہئے جس طرح ہم اپنی قوم کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہیں۔ وُہ لکھتا ہے:۔

"اگر دُنیا میں ایسی قومیں موجود ہوتیں اور اُن قوموں کی حکومتوں کے ایسے رہنما بھی ہوتے تو حبشہ اور البانیا اٹلی کے قدموں تلے نہ روندے جاتے۔ جاپان چین کی سرزمین پر خدا کا قہر و غضب بن کر نازل نہ ہوتا اور آسٹریا، چیکوسلوویکیا اور پولینڈ جرمنی کی جُوع الارض کا شکار نہ ہوجاتے۔

"دُنیا میں امن قائم کرنے کے لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ قوموں میں "آفاقی" ذہنیت کے رہنما اور سیاسی مدبرین پیدا ہوں جو اقوامِ عالم کی ذہنیت کو بھی اپنی طرح "آفاقی" بنادیں اور امن و صلح کی اس نئی دنیا کے لوگ ہر ایسے موقع پر جب رجعت پسند دنیا میں کوئی جھگڑا پیدا ہو ثالث بالخیر کا فرض انجام دیا کریں۔"

"انڈین ریویو" شاید یہ بھول گیا ہے کہ انگریزی حکومت جو ہر دوسری حکومت کی بھی اپنی ہی طرح خیر خواہ ہے دنیا میں موجود ہے، اور اپنی "آفاقی ذہنیت" کے ساتھ وہ ہر موقع پر صلح و امن کے لئے "ثالث بالخیر" بننے کو تیار ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ نہ اُس کی جاپان سُنتا ہے نہ مسولینی اور نہ کمبخت ہٹلر!

برطانیہ کو "ڈیلی ہیرلڈ" کی تنبیہ

انگلستان کا اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" گاندھی صاحب کے ایک پیغام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

". . . . . . اگر ہمیں جنگ میں ہندوستان کے پورے پورے تعاون کی ضرورت ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہم بُری طرح اس کی ضرورت محسوس کر سکتے ہیں تو یہ تعاون رضا کارانہ ہونا چاہئے۔ اس مرتبہ یہ تعاون ہمیں اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنی نیک نیتی کا ویسا ہی ثبوت پیش نہ کریں جیسے ثبوت کا مطالبہ خود ہم نے ہر ہٹلر سے کیا تھا یعنی "محض لفظ نہیں بلکہ عمل!"

آخر کانگریس کا مطالبہ کیا ہے۔ صرف اس قدر کہ اعلان کر دیا جائے کہ اس جنگ کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ ہندوستان ایک ایسے چارٹر کی دفعات کے مطابق آزاد کر دیا جائے گا جسے خود اس مُلک کے منتخب نمائندے مرتب کریں گے کسی ناقابلِ عمل طور پر فوری ردّ و بدل کا مطالبہ نہیں کیا گیا، ہاں واضح الفاظ میں اس اعلان کا مطالبہ کیا گیا ہے، کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو پوری جمہوری آزادی دے دی جائے گی اور دَورانِ جنگ میں بھی طرزِ حکومت کا رُخ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جمہوریت کی طرف پھیر دیا جائے گا۔"

"ڈیلی ہیرلڈ" کی آواز بلند سہی لیکن انگلستان کے نقار خانے میں اس طوطی کی کون سُنتا ہے۔

رفاہِ عامہ اور ہندوستان کی صوبجاتی حکومتیں

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حکومتیں رفاہِ عامہ کے مختلف شعبوں میں جو کچھ صرف کر رہی ہیں، اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔ ان اعداد و شمار کا تعلق اقتصادی سالِ رواں سے ہے۔

رفاہِ عامہ کے امُور میں تعلیم، حفظانِ صحت، دوا سازی، زراعت، امداد باہمی اور علاجِ حیوانات وغیرہ کے صیغے شامل ہیں۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہو گا کہ ہر صُوبہ کی آمدنی میں سے فی صدی کتنی رقم امورِ رفاہِ عامہ پر صرف کی جاتی ہے:۔

صوبہ		
صوبجاتِ متحدہ	۳۰٫۰۷	فی صدی
پنجاب	۲۹٫۵	″ ″
مدراس	۲۸٫۷	″ ″
بہار	۲۷٫۸	″ ″
بمبئی	۲۶٫۲	″ ″
اُڑیسہ	۲۵٫۸	″ ″
آسام	۲۵٫۵	″ ″
بنگال	۲۴٫۳	″ ″
صوبہ سرحد	۲۲٫۴	″ ″
صوبہ متوسط و برار	۲۱٫۱	″ ″
سندھ	۱۳٫۰۱	″ ″

صوبجاتِ متحدہ کا نمبر اوّل ہے اس کے بعد پنجاب نہایت بلند دُوسرے درجے پر ہے لیکن یہ بلند درجے بھی اُس وقت کچھ زیادہ قابلِ فخر معلوم نہیں ہوتے جب ہم آزاد ممالک اور اُن کے ہاں رفاہِ عامہ کے امُور کے مصارف کی مقدار پر نظر ڈالتے ہیں، اپنے اوّل اور دوم درجے کے صوبوں کے مصارف کی مقدار کو دیکھ کر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ع

جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پُوچھ

حامد علی خاں

جینا

جینا حقیقت ہے۔ مٹنا فریب اور وہم۔

فضائے عالم کی کھلی قتل گاہ میں زندگی ہی کارفرما ہے۔ کچھ بھی محض مٹ جانے کے لئے نہیں مٹتا۔ مٹنے میں جینا ہے۔ عدم میں ہستی۔

خزاں ہیں، موسمی اُلٹ پھیر سے، پھول پھل، پتے مُرجھاتے رہتے ہیں، گرتے رہتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ نئی، ہری بھری خوبصورت کونپلیں اور رنگ برنگ کے پھول کھلیں اور کھلتے رہیں اور فطرت کا حُسن سدا بہار رہے۔

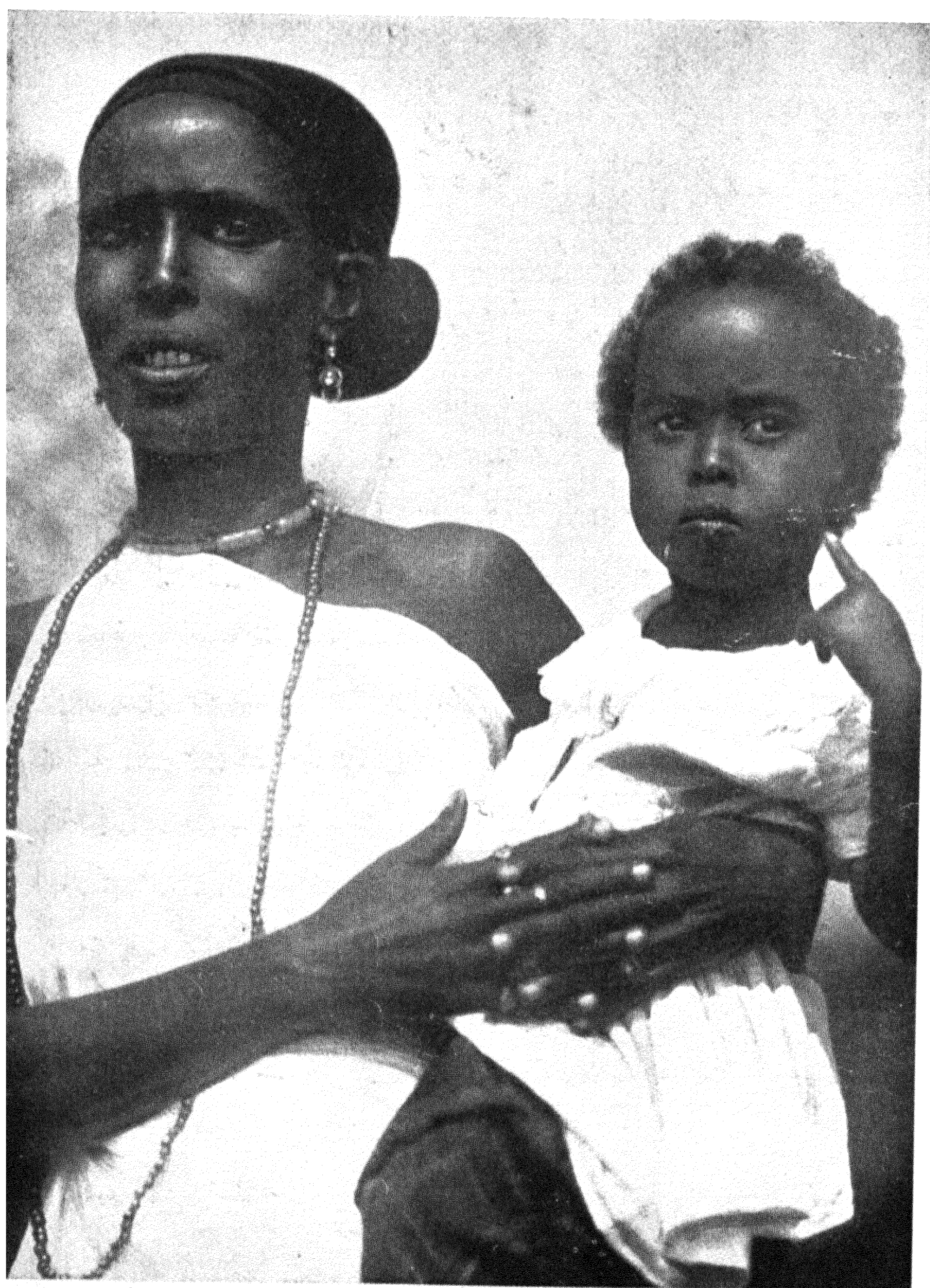
ذہنی اور رُوحانی دُنیا میں کب کچھ کبھی مٹتا ہے؟ ۔ یونہی دم بھر کے لئے دماغ میں اُٹھنے والے برق رفتار خیال، نہ تکمیل پانے والے دلفریب ارادے، تشنہ کام جذبات و تصوّرات ۔ یہ بھی نہیں مٹتے۔ گو شعور کی آنکھ سے اوجھل ہو جائیں لیکن غیر شعوری طور پر دل میں موجود رہتے ہیں۔ شعور نامعلوم طور پر ہمیشہ اُن سے متاثر رہتا ہے۔ زندگی میں تسلسل انہی کے دم سے ہے۔ نہیں یہ نہیں مٹتے۔ ہمیشہ جیتے ہیں۔

حقیقت یوں معلوم ہوتی ہے کہ جو کچھ سب سے زیادہ چھپا ہوا ہے وہ سب سے زیادہ ظاہر بھی ہے اور زندہ بھی۔ انسان مجبورِ محض نہیں۔ یہ قوتِ ارادہ، یہ اختیار، یہ دُنیا و مافیہا کو سمجھنے کی تڑپ، یہ "اللہ میاں سے باتیں"، یہ "فلک پیمائیاں"، ممکن ہے یہ سبھی کچھ "غلط ترجمانی کا شکار ہوں"۔ دیوانگی ہو، خوابِ پریشاں ہو۔ لیکن یہ پگلاپن، یہ خواب، "بیداری" کی بے پناہ بےبسی سے مجھے کہیں عزیز تر ہے۔ اس خواب میں زندگی ہے اور اس "بیداری" میں موت، بےچارگی اور شکست۔ موت کو کیوں تسلیم کروں؟ زندگی، تگ و دَو، محبت ۔ کیا میرے لئے یہ کافی نہیں؟

اب کوئی اور جانے :۔

موت یا زندگی؟ مٹنا یا جینا؟

سعادت علی



ماں اور بچہ

دوست اور میں

میں ۔ تم خواہ مخواہ اُلجھتے ہو، کیا کہا کہ تم بگڑے؛ بس یہی نا کہ انسان غریب کی ایک تنہا جان اور اُس پر دس بیس قسم کی مختلف دُنیاؤں کی بلائیں۔ تم سمجھتے ہو کہ دُنیا محض ایک ہے۔ کہاں ایک ہے؛ لو میرے ساتھ گِننے بیٹھو:۔

اوّل۔ بچّوں والی دُنیا۔ میں گھر سے دُور کسی دفتر میں۔ بیوی کسی کے ہاں جائے پر۔ ایک بھولے بھالے مچھر کی ایک بھولے بھالے بچے سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ نتیجہ۔ دعائیں، دوائیں، بِل، بےخوابی، بدمزاجی، رنج، اسکول سے ناغے، نانی کے ردِّ بلا صدقے۔ نیچر کیوں مچھروں کو تعلیم نہیں دیتی کہ نانیوں کو کاٹیں نواسوں کو نہ چھوئیں؛ اور یہ تو بتاؤ کہ ایک خوراک دوا سے فائدہ کیوں نہیں ہوتا؛ اور دُوسری خوراک پینے پر بچے اس قدر روتے کیوں ہیں اور تیسری خوراک پر تو گویا سارے گھر میں بھونچال سا آجاتا ہے۔ اس دُنیا کا تمہاری نفیس ادبی دُنیا سے کیا تعلق ہے؛ کیا تمہارے دو چار اچھے جملے بچے کے بخار کو گویا باقاعدہ ورزش کا رُتبہ بخش دیں گے اور بچہ پلنگ سے رستمِ ثانی ہو کر اُٹھے گا؛ بھولے دوست اللہ اللہ کرو۔ بچّوں والی دُنیا میں ادبیات محض خرافات ہیں۔ بچے اچھے ہوں تو اور مصیبت ہے۔ جُوتے ہیں کہ ادھر خرید و اُدھر ختم۔ جُرابیں گویا پیدا ہی سُوراخ دار ہوتی ہیں اور بچے کو صاف رکھنے والا صابن تو آج تک ایجاد ہی نہیں ہُوا۔ ذرا اپنے ولیعہد بہادر کے گھٹنے کسی وقت دیکھنا۔ جھانواں ذرا ہی کم کھُردرا اور میلا ہوتا ہے۔ مگر بچے اور صفائی؛ توبہ توبہ۔ اگر پیدا ہوتے ہی بچّوں کی ناک کاٹ دی جائے تو شاید صفائی ممکن ہو۔

دوم ۔ قرض اور سُود والی دُنیا۔ یہ تو سہل ہے کہ قرض لیتے جاؤ سُود دیتے جاؤ۔ قرضدار سے یہ کہہ کر کہ "سپردم بتو مایۂ خویش را" تمسک لکھتے جاؤ ڈگریاں کراتے جاؤ مگر جب مایۂ خویش چھوڑ مایۂ پدرِ خویش بھی نہ رہے تو پھر انسان کونسی راگنی شروع کرے۔ ہر وقت جو تم ادبیات اور موسیقی اور عالمِ حُسن کے گیت گاتے ہو تو ذرا اس دُنیا کو بھی دیکھو۔ بہی کے حساب کے لئے شیکسپیئر کا کونسا Sonnet موزوں ہے؟

سوم ۔ سیاسیات کی دُنیا! بس ابھی سے اُکتا گئے اور لی انگڑائی۔ کیوں حضرت آپ کو بھی تو لیڈری کی ہوس ہے۔ کیا کہنے! بس یہ چاہتے ہو کہ تم تقریریں کرتے جاؤ لوگ چندہ دیتے جائیں۔

چہارم ۔ کارخانوں کی دُنیا۔ صرف ایک ریل کے کارخانے پر لکھنے بیٹھوں تو دس کتابیں لکھ ڈالوں۔ فورمین کو تحفے، مستری کی خوشامد، ہاتھ بھنچنے پر ہسپتال۔ پھر نوکری سے علاحدگی۔ یہ دُنیا تمہیں نہیں بھاتی۔ اچھا اَور لو۔

پنجم ۔ کچہریوں اور وکیلوں کی دُنیا۔ اس سے بھی تم باز آئے۔ اچھا تو وکیلوں کے ایجنٹوں کی دُنیا تو بالکل الگ ہے۔ اس کا ذائقہ

حال سُن لو۔ جاٹ کی دُنیا دیکھو۔ بس ختم کروں، مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لئے صرف ایک ہی دُنیا ہے یعنی صنفِ نازک میں دلچسپیوں کی دُنیا مگر میں اس سے کوسوں دُور ہوں۔

بے بس انسان کی اکیلی اُکتائی ہوئی جان اور اس پر یہ سو سو وبال ! . . . . .

دوست۔ تمہاری بک بک سب سے بڑا وبال ہے۔ اور اب میں قائل ہوں کہ واقعی دو دُنیائیں ہیں۔ ایک جو خدا نے بنائی اور دوسری جو تم اپنی بکواس سے تعمیر کر دکھاتے ہو۔

میں۔ شوخیوں سے تم چڑاؤ، واقعات سے تم بھاگو، انسان تم سے بات کیا کرے ؟

دوست۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم بات ہی نہ کرو۔

مَیں۔ جی ہاں۔ مَیں بات نہ کروں اور آپ اوٹ پٹانگ کام کرتے چلے جائیں۔ ساری عمر میں تم نے دو چار سکولوں کی کمیٹیوں پر جو کام کیا ہے اور جس کی نسبت تمہارا خیال ہے کہ قوم ناقدرشناس ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر تم دو چار قتل کر ڈالتے تو اتنا گناہ نہ ہوتا۔ آپ کی دیانت کے بھروسے پر لوگوں نے چندے دیئے، بچے داخل کرائے مگر نتیجہ یہ ہے کہ اُستاد نالائق، طلبہ "ناکہامان" اور منتظم کمیٹی گاہے ماہے باایمان۔ جو دو چار بچے واقعی ذہین آپ کے سکول میں داخل ہوئے۔ ان کو شعر کا چسکا لگ گیا۔ یہی ذہین لڑکے اگر کسی اچھے سکول میں جاتے تو شاید کچھ بن جاتے۔ قومی مدرسوں کا پہلا اصول یہ ہونا چاہئے کہ ذہین لڑکے داخل نہ کئے جائیں۔

دوست۔ میری قومی حرکات لغو سہی، آپ فرمایئے کہ آپ نے کیا کر دکھایا ؟

مَیں۔ میرا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہر مفروضہ نیکی کی بیدھڑک چھان بین کرتا ہوں۔ بات جہاں سے چلی تھی وہ آپ کا مقولہ تھا کہ ادیب لوگ قوم کی بے انتہا خدمت کرتے ہیں اور مَیں نے خدمتِ والا میں عرض کیا تھا کہ ادیبوں کی دُنیا ایک تنگ و تاریک گوشہ ہے جسے واقعاتی دُنیاؤں سے کوئی تعلق نہیں اور اس لئے ادیب قوم کی خدمت کرنے کے نااہل ہیں۔ ادیبوں کے اعمالِ بد میں سب سے ذلیل ترین یہ ہے کہ وہ طلبہ کی دُنیا میں اپنا چرچا سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر رائی برابر ضمیر بھی کسی ادیب میں ہو تو وہ طالب علم کو مبتلائے شعر دیکھ کر رو دے۔

دوست۔ شعر کو رہنے دو۔ کیا افسانے بھی طالب علموں کے لئے مضر ہیں ؟

مَیں۔ جی ہاں افسانے بالخصوص یعنی وہ جو آجکل شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ جن میں دھانی دوپٹوں کا، سُرخ نکٹائیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اب لڑکیاں بھی افسانے پڑھنے لگی ہیں اور ادیبوں کی ستم ظریفی میں یہ اور اضافہ ہُوا ہے کہ افسانوں میں لڑکیوں کی طرف سے خط لکھے جاتے ہیں۔

دوست ۔ تم سمجھو کہ نہ سمجھو ادیب واقعی ایک نئی دُنیا قائم کر رہے ہیں

مَیں ۔ بجا ارشاد ہوا مگر ادیبوں کی اس نئی دُنیا میں کیا ہوگا؛ زرق برق رسالے جاری ہوں گے۔ شاندار مشاعرے ہوں گے دھواں دھار تقریریں ہوں گی، ٹوپیوں کا اُترنا ساڑھیوں کا لہرانا ہوگا، مگر ہل کون چلائے گا، لکڑی کون کاٹے گا، پانی کون ڈھو کر لائے گا، چولھا کون پھونکے گا، روٹی کون کھائے گا اور تانگوں موٹروں ریلوں کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔

دوست (غصہ سے) ادب اور پیسے! کیا پرواز ہے؟ تم سا غبی فطرت انسان (یعنی اگر تم انسان ہو) ننگ کائنات ہے۔ خیالات میں بلندی ہو تو دولت کا کال نہیں رہتا۔ غریب محض اس لئے غریب ہیں کہ اُن کا تخیل مفلس ہے۔

مَیں ۔ غلط قطعی غلط۔ روز پلاؤ کے خواب دیکھتا ہوں۔ پکتی وہی دال ہے۔

فلک پیما ——

تماشا

زیور نصیب نہ ہونے،

نہ جی بھر کے اچھے کپڑے پہننے کو،

اور کسی نے مجھ سے شفقت کا برتاؤ بھی نہ کیا

اس گھر کی دوزخ سے آزاد ہونے کے لئے میں نے پھول کاڑھنے سیکھے۔

میری راتیں نیند سے محروم رہیں۔

کل مُلازمت کی منظوری آگئی،

اور مَیں کائنات کی اَن جانی پہنائیوں میں ڈوب جانے کو ہوں ——

"ابنِ مریم"

اَے دوست

کل رات عجیب چاندنی تھی — دُنیا اِک مہ جبیں بنی تھی
ہر چیز خوشی میں ہنس رہی تھی — شبنم نہ تھی مے برس رہی تھی
گویا سبد گُل و سمن تھا — رشکِ باغ عدن چمن تھا
چھائی تھی جہاں پہ دلنشینی — بُو دُوب کی آ رہی تھی بھینی
پھُولوں کا نکھار دیدنی تھا — خوش تھے کہ وداعِ کمسنی تھا
دھیمی دھیمی سُلگ رہی تھی — گُلشن میں آگ لگ رہی تھی
کلیوں کی بہار دِلکشا تھی — ذرّوں میں بھی شانِ کبریا تھی
ہلکی ہلکی ہوا میں خُنکی — سمجھا؟ اُن سردیوں کے جیسی!
مَیں خود تری لے میں گا رہا تھا — گانا ترا یاد آ رہا تھا

تھی بزمِ طرب بہشت ساماں نغموں میں بسا ہوا تھا ایواں
لے کا جادو، صدا اثر یلی مُطرب کو بنا گئے پہیلی
دلکش اتنے تھے اہلِ محفل پہلو میں تڑپ کے رہ گیا دِل
گلفام، حسین، ماہ پارے بدمستِ شباب چاند تارے
چہروں سے برس رہے تھے ارماں اہلِ دل کا خدا نگہباں
آنکھوں سے مَے چھلک رہی تھی ساری محفل بہک رہی تھی
رفتار تھی موجِ زندگانی باتوں میں عشق کی کہانی
پھولوں کی بزم سی جمی تھی بس صدرِ چمن تری کمی تھی
تھا ان میں بھی جوشِ زندگانی بے مثل ہے پر تری جوانی
نکلا نہ کوئی جواب تیرا ان کا جلوہ، حجاب تیرا

حُسن اور شباب کیا نہیں تھا
اک تُو جو نہ تھا، مزا نہیں تھا

سکندر علی وجد

امیر و داغ کا مقابلہ و موازنہ

منشی امیر احمد مینائی اور نواب مرزا داغ دہلوی میں ہم عصری، ہم عمری اور ہم فنی کے ساتھ ساتھ واقعات و تعلقات کی یکسانیت ایسی پائی جاتی ہے کہ اس کا سلسلہ ابتدائے عمر سے انتہائے عمر تک نہیں ٹوٹتا جس کی مثال دوسرے نامور معاصرین میں نظر نہیں آتی۔ مثلاً امیر و داغ ایک ایک دو دو برس کے فرق سے پیدا ہوئے اور آٹھ آٹھ نو نو برس کی عمر میں یتیم ہو گئے، دونوں کی جوانی کا زمانہ دہلی اور لکھنؤ کے شاہی درباروں میں گزرا، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں رامپور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں کے عہد سے نواب کلب علی خاں کی وفات تک چالیس برس دونوں یکجا رہے۔ اس کے بعد اگرچہ نو دس برس تک عارضی جدائی رہی مگر پھر حیدرآباد میں ایسی یکجائی ہوئی کہ عارضی زندگی کے دن گزار کر دوامی حیات کے لئے دونوں ایک ہی سرزمین اور ایک ہی قبرستان میں چند گزوں کے فاصلے سے آسودہ نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" مگر امیر و داغ کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان دونوں ہم پیشہ نبرد آزماؤں میں معنوی آویزشوں کے سوا کبھی کسی عنوان سے لفظی نزاع کی آمیزشیں نہیں پائی گئیں۔ یہ تو بارہا سُنا اور دیکھا کہ جس زمین اور جس طرح میں ایک نے غزل کہی تو اس کے جواب میں دوسرے نے بھی طبع آزمائی کی، مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ اپنے کلام میں کھلم کھلا تو کیا اشارے اور کنائے میں بھی کوئی سخن گسترانہ بات کہی ہو بلکہ اس کے برخلاف یہ دیکھا گیا کہ داغ کی غزل پر امیر نے دو غزلہ کہا اور مقطع میں یہ اقرار کیا ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے ۔۔۔۔ بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

شاعری یا مصوری جذباتی چیز ہے طبیعت جس طرف جتنی زیادہ راغب ہوگی اسی قدر اس فن کا کمال ظاہر ہوگا۔ آورد اور آمد کا مفہوم عام ہے، جو بات بے ساختگی سے پیدا ہو جاتی ہے وہ بناوٹ اور کھینچ تان سے ظاہر نہیں ہو سکتی، آمد بے سیکھے آتی ہے اور آورد بغیر سیکھے نہیں آسکتی، امیر مینائی کی فضیلت علمی اور جامعیتِ ادبی محتاج تشریح نہیں۔ اُن کی ثقاہت اور وضع قطع کو دیکھ کر بے تکلف واعظ، مفتی اور صوفی کہا جا سکتا ہے مگر شاعر کہنے میں اجنبی کو بہت تکلف ہوتا ہے۔ واقعی یہ اُن کا بے مثال کمال ہے کہ اس وضع قطع اس رنگ ڈھنگ پر اُن کی ہمہ گیر طبیعت نے شاعری کے میدانوں کو بڑی پامردی سے طے کیا ہے مگر میں بہت آزادی کے ساتھ یہ کہوں گا کہ شاعری کی جس قدر شہرت اُن کے حصے میں آئی ہے وہ اُن کے کلام سے بہت

زیادہ اُن کے چند شاگردوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے داغ جن کی قابلیتِ علمی پنج رقعہ اور مینا بازار سے آگے نہیں، اپنی شاعرانہ نام وری میں کسی ایک شاگرد کے محتاج نہیں ہوئے۔

امیر نے جن کی ولادت ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں ہوئی، جب شاعری شروع کی اُس وقت لکھنؤ میں ناسخ و آتش کا رنگ چھایا ہوا تھا وزیر، صبا، رند، اشک زندہ تھے۔ امیر اسیر کے شاگرد ہوئے، اسیر اگرچہ مصحفی کے شاگرد تھے لیکن اُستاد کی روش سے الگ چلے اور لکھنؤ کے رنگ میں رنگ گئے، اس ماحول میں امیر نے بھی وہی رنگ اختیار کیا، جیسا کہ اُن کے ہزارہا اشعار سے ثابت ہے مثلاً

حلقۂ گیسو میں پائی نقدِ دل دے کر جگہ — دے دیا پہلے کرایہ خانۂ زنجیر کا

مرغِ عصیاں اُڑ کے صیدِ بازِ رحمت ہو گیا — دنگ شاہینِ ترازوئے عدالت ہو گیا

پھر بھی اس طرز میں اُنھوں نے ایک حد تک جدت پیدا کی اور اسی رنگ کو نکھار کر ایسے شعر بھی نکالے ہیں :-

ہٹاؤ آئینہ ہم کو بھی دیکھنے دو گے — کہ خود ہی دیکھو گے حسن اپنی خود نمائی کا

اُن کی ہمہ گیر طبیعت اور اکتسابی شاعری کے جوہر نے حسنِ بندش اور بلندیٔ مضمون کے ساتھ یہ جواہر پارے بھی پیش کئے ہیں ؎

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی — یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

کلیم شکر کرو، حشر تک نہ ہوش آتا — ہوئی یہ خیر کہ وُہ شوخ بے نقاب نہ تھا

امیر کے تمام کلام کو دیکھ کر ان کا کوئی مخصوص رنگ نظر نہیں آتا۔ وہ جب تک رام پور نہیں آئے اور جب تک نواب رام پور کے اُستاد بن کر اور دوسرے تلامذہ کے ذریعہ ملک میں مشہور نہیں ہوئے صرف اُسی قدامت پسندی کے عادی رہے جس کو ناسخ و آتش اور وزیر و صبا وغیرہ بہ طور یادگار چھوڑ گئے تھے، یعنی ایہام گوئی، مراعاۃ النظیر اور رعایتِ لفظی۔

رام پور آنے کے بعد جو کلام کہا گیا اُس میں بیشک ایسے اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں جن سے اُن کی جامعیت و قابلیت کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے لیکن وہ رنگ بھی ایسا نہیں جو مخصوص صرف اُن کا رنگ کہا جا سکے اگر اُن کے کلام کو تخلص نکال کر دوسرے خوش گو شعراء کے کلام میں مخلوط کر دیا جائے تو ایک ایسا مبصر جس کو اُن سے ذاتی واقفیت نہ ہو مگر تنقید و تبصرے کی قابلیت رکھتا ہو، وہ ہرگز ہرگز اُن کے اور دوسرے کے اشعار میں کوئی فرق نہیں بتا سکتا، غزل جس کو جذبات و محاکاتِ حسن و عشق کا مرقع کہنا چاہئے اُس کی اصلی و صحیح تصویر نظر نہیں آتی۔

داغ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے اور قلعۂ دہلی کے شاہی مشاعروں اور وہاں کی رنگینیوں نے بہت جلد اُن کو شاعری کے میدان میں نمایاں کر دیا، شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے اور کم سنی ہی سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اُن کی جبلی طبیعت نے زبان کی لطافت اور طرزِ ادا کی جدت کی بدولت بہت جلد اُن کو قبولِ عام کی شاہراہ تک پہنچا دیا اور وہ اپنی آبائی

عمر کے مشاعروں میں ایسے ایسے شعر پڑھ جاتے تھے کہ مرزا غالب بھی داد دینے کے لئے مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں وہ اِس قسم کے اشعار کہنے کے مشاق ہو چکے تھے:۔

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی　　کسی کا اس طرح یارب نہ دُنیا میں بھرم نکلے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں،　　اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

امیر کا رنگ داغ کے رنگ سے آسان ہے یعنی وہ رنگ جو امیر کے پہلے دیوان پر چھایا ہُوا ہے، رعایتِ لفظی مضمون آفرینی اور خیال آرائی میں ڈوبا ہُوا ہے۔ یہ طرزِ اسلوب ہر شاعر معمولی کوشش اور فکر سے پیدا کر سکتا ہے۔ برخلاف داغ کے کہ داغ کا رنگ جدتِ ادا، شوخیِ بیان اور جذباتِ حقیقی سے مرکب ہے جس میں لفظوں کا طلسم نہیں معنی کا جادو ہے، ساخت نہیں بے ساختگی ہے اور یہ سعادت بزورِ بازو نہیں ملتی۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ ناسخ و وزیر کے انداز میں ایک امیر نہیں سینکڑوں باکمال نظر آتے ہیں مگر داغ اپنے رنگ میں منفرد اور یکتا ہیں، نہ ان سے پہلے اس انداز میں کوئی کامل نظر آیا۔ نہ اب تک کوئی اُن کی پُوری پوری تقلید کر سکا۔ اس خیال کی تائید چند مثالوں سے ہو سکتی ہے مثلاً

۱۔ معشوق کو اپنے قابو میں لانے کے لئے ہر عاشق آرزومند ہوتا ہے۔ امیر اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا　　یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

داغ اس تمنا کا ایک دلچسپ فائدہ بھی بتاتے ہیں ؎

کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا　　ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا

۲۔ اس زمین میں مرزا غالب کی مشہور غزل ہے اور امیر و داغ نے بھی خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ مرزا غالب نے بادہ خواری کا مضمون اپنے مقطع میں یوں لکھا ہے ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

امیر نے اس قافیے کو اپنے رنگ میں یوں کہا ہے ؎

مرے اتّقا کا باعث تو ہے میری ناتوانی　　جو میں توبہ توڑ سکتا تو شراب خوار ہوتا

داغ اپنے شعر میں بادہ خواری کی وجہ بتاتے ہیں۔ اس میں بھی اگرچہ حُسنِ تعلیل سے کام لیا ہے مگر طرزِ ادا میں جو جدت پیدا کی ہے وہ کسی لفظ کے خاص استعمال سے نہیں ہے بلکہ نفسِ مضمون ہی عجیب ہے۔ یہی جدت و شوخی داغ کی خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

گئے ہوش تیرے زاہد جو وہ چشمِ مست دیکھی　　مجھے کیا اُلٹ نہ دیتی جو نہ بادہ خوار ہوتا

۳۔ امیر و داغ کی دو مشہور غزلیں ہیں اُن کو اکثر ارباب نشاط بڑا چکا رہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ہی قافیے کو دونوں نے اس طرح نظم کیا ہے :۔

امیر

مجھ کو گلیوں میں جو دیکھا چھیڑ کر کہنے لگے — کیوں میاں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو بیہ ؟ ارہا

اسی قافیے کو داغ اس طرح کہتے ہیں ؎

دِل چُرا کر آپ تو بیٹھے ہیں اطمینان سے — ڈھونڈنے والے سے پُوچھے کوئی کیا جاتا رہا

یہ دونوں شعر ایک ہی قافیے اور ایک ہی مضمون کے ہیں مگر ارباب ذوق داغ کے تیکھے پن اور امیر کے پھیکے پن کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خصوصاً کیوں میاں کے استعمال سے ، اب چند ہم مضمون شعر دونوں کے بغیر اظہارِ رائے عرض کیے جاتے ہیں ؎

میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو (امیر) بُت ہی سُن لیں اگر خدا نہ سُنے

میری فریاد دوسرا نہ سُنے (داغ) تم سُنو اے بُتو خدا نہ سُنے

ایسے ہنگامے بہت دیکھے ہیں اُس کوچے میں (امیر) حشر کیا فتنہ ہے جس سے میں پریشاں ہوتا

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے (داغ) فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

توبہ بھی کچھ بھروسے کے قابل ہے زاہدو (امیر) پہنچی ہے ہم سے لُوٹ کے اب خانقاہ میں

اُس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر (داغ) جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

ڈراؤں حشر کی فریاد سے تو کہتے ہیں (امیر) ہمارے آگے تمہاری وہاں سُنے گا کون

میں نے جو کہا سیر ہو کل روزِ جزا ہو (داغ) فرماتے ہیں واں بھی ہمیں سچے ہوں تو کیا ہو

گھر سے مرے بلائے شبِ غم کہاں گئی (امیر) بیٹھی ہے چھپ کے پردۂ روزِ سیاہ میں

راتیں مصیبتوں کی جو گزری تھیں آج تک (داغ) ماتم کو آئی ہیں مرے روزِ سیاہ میں

امیر کے کلام میں داغ کی سی شوخ بیانی اور شگفتگی نہیں ہے مگر مضمون آفرینی کی قوت داغ سے بہت زیادہ ہے اور جب اس کے ساتھ وہ لطافتِ تخیل اور سلاستِ بیان کو ملا دیتے ہیں تو ایسے اشعار اور زیادہ پُر لطف ہو جاتے ہیں مثلاً ؎

غفلت میں نہ کھو شباب اے دل — یہ رات ہے جان عمر بھر کی

وُہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے — شمع کی سرگزشت کون سُنے

تکیئے پہ امیر سر کو رکھے — پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں

داغ لطفِ زبان، شوخیٔ بیان، معاملہ[illegible] کے ساتھ جدتِ ادا ایسی عجیب و دلکش رکھتے ہیں جس کو سن کر عوام سر دھنتے اور خواص مزے لیتے [illegible] وہ خاص رنگ ہے جس میں کوئی ان کا حریف و ہم سر نہیں، اُنہوں نے اپنی مخصوص جدتِ بیان کے ساتھ [illegible] لیے ہیں کہ ان سے بڑھ کر کہیں نظر نہیں آتے مثلاً

ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی	فریاد سے ملتی نہیں فریاد کسی کی
آرام طلب ہوں کرمِ عام کے طالب	یوں مفت میں لٹتی نہیں بیداد کسی کی
جنہیں اُس نے لکھا ہے حرفِ تسلّی	وہ کم بخت برسوں تڑپتے رہے ہیں
کہتے ہیں وہ کہو تو سہی دل کا حال کچھ	حیران ہم کھڑے ہیں گھڑی بھر سے کیا کہیں

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نظری اور وہبی شاعری کی جتنی خصوصیتیں ہو سکتی ہیں وُہ سب داغ کے لئے مخصوص ہیں۔ اور اُسی بنا پر ان کو صحیح معنوں میں شاعر کہا جا سکتا ہے اور ان کے کلام کے لئے یہ مصرع صادق آتا ہے ع

لے دل میں چٹکیاں یہ اُسی کا کلام ہے

اور امیر مینائی کی عظمت و ثقاہت اور جامعیت یقیناً داغ سے بہت زیادہ ہے مگر اُن کی اکتسابی سخن گستری داغ کی وہبی شاعری کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس لئے اُن کو ماہر کہا جا سکتا ہے اور ان کی گویائی پر یہ مصرع منطبق ہوتا ہے ؎

قابل درود پڑھنے کے اُن کا کلام ہے

احسن مارہروی

تصحیح

اکتوبر کے "ہمایوں" میں جو افسانہ "نجات" کے عنوان سے صفحہ ۱۳۷۱ پر شائع ہُوا ہے، اُس میں عنوان کے بعد لکھا ہے:

"گناہ سے توبہ کرنے والا اُس کی مانند ہو جاتا ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو" (قرآن مجید)

افسانہ نگار نے اس حدیث: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ، کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ" کے ترجمے کو "قرآن مجید" لکھ کر شدید اور خوفناک غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ مذہب و اخلاق کے علاوہ واقعیت کے اعتبار سے بھی یہ شدید غلطی ہے۔ یہ حدیث جس کا ترجمہ مضمون نگار نے "قرآنِ مجید" کی آیت بتا کر کیا ہے، بہت مشہور حدیث ہے اور "کنز العمال" میں مندرج ہے۔

افسانہ نگاری ہر چند خیالی خاکوں کا نام ہے، مگر افسانہ نگار کی معلومات بہر حال وسیع ہونی چاہئیں۔ اُس کا قلم "ادب" کے سامنے ذمہ دار ہے۔

ماہر القادری

رموزِ محبّت

(ذکر و فکر کا ایک ورق)

جب آنکھ کھول کے دیکھا، تو ہو گیا مستُور
یہ میرا دیدۂ بینا ہی اِک حجاب ہُوا

تُو چھُپ گیا مہ و انجم میں، لالہ و گُل میں
ہر ایک جلوۂ رنگیں ترا نقاب ہُوا

جب آنکھ بند ہوئی، تُو ہی جلوہ آرا تھا!

مری زبان کھُلی شرحِ عاشقی کے لئے
مِرا بیاں تھا مُرقّع مِری خجالت کا

ہر ایک حرف میں تھا غیریت کا افسانہ
مری زباں نے کیا خُوں مِری محبّت کا

مِرے سکُوت میں طوفانِ عشق برپا تھا!

مرے حواس رہے تیرے وصل میں حائل
جو بے خودی میں ہُوا غرق تُو مِلا مجھ کو

عجیب شے ہے محبّت میں خود فراموشی
فنا ہوا تو ملی لذّتِ بقا مجھ کو

مرا وجُود ہی اَے دوست! ایک پردا تھا!

آثؔر صہبائی

بڑے میاں کے ترکے کی تقسیم

(ڈراما)

افراد:- مسز جیکب ۔ مسز جان : دو بہنیں

مسٹر جیکب ۔ مسٹر جان : ان کے خاوند

شیلا جیکب : دس سال کی بچی

مسٹر ایڈورڈ : مسز جیکب اور مسز جان کے بوڑھے والد

مسز جیکب ۔ (غصے اور تیزی سے) شیلا! شیلا! بہری ہوگئی ہو کیا؟ اندر آتی ہو یا نہیں؟ مجھے تو تمہاری حالت پر افسوس آتا ہے ۔ نانا گھر میں مرا پڑا ہے اور تم گلیوں کے چکر کاٹ رہی ہو ۔ جاؤ اُوپر اور اپنی خالہ اور خالو کے آنے سے پہلے کپڑے بدل لو ۔ تمہیں ان بھڑکیلے کپڑوں میں دیکھ کر وہ کیا کچھ نہ کہیں گے!

شیلا ۔ وہ بھلا ہمارے ہاں کیوں آنے لگے! اُنہیں تو یہاں آئے ہوئے مدتیں گزر گئیں ۔

مسز جیکب ۔ تمہارے نانا غریب کے معاملات کے متعلق گفت و شنید کی غرض سے آئیں گے ۔ جُونہی تمہارے نانا نے دم دیا، تمہارے والد نے ان کو تار دے دیا تھا (باہر سے شور سنائی دیتا ہے) ارے! کہیں وہ آ تو نہیں گئے! شکر ہے خدا کا یہ تو تمہارے والد ہیں ۔

مسٹر جیکب (ہاتھ میں ایک پلندہ لئے ہوئے) ابھی تک وہ آئے نہیں؟

مسز جیکب ۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ وہ نہیں آئے؟ خواہ مخواہ دق کرنے سے فائدہ؟ شیلا! فوراً اُوپر جاؤ اور سفید فراک پہن کر اُس پر سیاہ پٹی باندھ آؤ (خاوند سے) یہ انتظام کچھ تسلی بخش تو نہیں لیکن خیر جب تک پورا ماتمی لباس سل کر نہیں آتا ۔ کام چل جائے گا ۔ اور مسٹر اور مسز جان کو تو ماتمی لباس پہننے کا فی الحال خیال بھی نہیں آئے گا ۔ اس معاملے میں ہم ضرور ان سے بازی لے جائیں گے ۔ اپنے جُوتے اُتار دو ہنری ۔ الزبتھ (مسز جان) تو اس بُری عادت کی ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر ناک بھوں چڑھایا کرتی ہے ۔

مسٹر جیکب ۔ مجھے تو اُن کے آنے کا بھی یقین نہیں جب پچھلی دفعہ تم الزبتھ سے لڑی تھیں تو اس وقت غالباً الزبتھ نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ وُہ دوبارہ تمہارا مُنہ تک نہیں دیکھے گی ۔

مسز جیکب ۔ واہ! خوب! وہ تو سر کے بل آئیں اگر ہو سکے تو،

کیا اباجان کی جائداد میں اتنی کشش بھی نہیں ؟ اپنے
حصّے کے لئے تو وُہ پاگل ہو جائے گی۔ خدا معلوم اتنی
حریص طبیعت اس نے کہاں سے پائی !

ہنری (مسٹر جیکب) میرے خیال میں یہ خاندانی ہے !

مسز جیکب۔ کیا مطلب اس سے تمہارا ؟

جیکب۔ میرا اشارہ آپ کے والد کی طرف تھا نہ کہ آپ کی
طرف ! میرے سلیپر کہاں ہیں ؟

مسز جیکب۔ کچن میں۔ لیکن تمہیں تو نئے سلیپروں کی
ضرورت ہے نا ؟ یہ جوڑا تو ازحد بوسیدہ ہو چکا ہے (آنسو
بہاتے ہوئے) تمہیں کیا معلوم کہ میری کیا حالت ہے ؟
جب میں اباجان کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ادرگرد بکھری
پڑی دیکھتی ہوں اور یہ خیال آتا ہے کہ وُہ دوبارہ کبھی
ان کو استعمال نہیں کریں گے تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے ضبط
مشکل ہو جاتا ہے (تیزی سے) یہ لو۔ یہ اباجان کے سلیپر
تم پہن لو۔ کیا اچھا اتفاق ہے کہ یہ ابھی نئے ہی ہیں۔

جیکب۔ لیکن یہ تو میرے ناپ کے نہیں پیاری۔ چھوٹے ہیں

مسز جیکب۔ تو کیا بڑھ نہ جائیں گے ؟ مجھ سے یہ دیکھا نہیں
جاتا کہ ابا کی چیزیں بیکار ضائع ہو جائیں۔ ہنری ! مجھے
اس دراز کا بار بار خیال آتا ہے، جو ابا کے سونے کے کمرے
میں پڑی ہے، کتنی مدت سے میرا جی اُس کے لئے للچا
رہا ہے۔

جیکب۔ تقسیم کے وقت تمہیں الزبتھ سے فیصلہ کر لینا چاہئے۔

مسز جیکب۔ الزبتھ تو اس قدر کنجوس اور بیہودی قسم کی عورت
ہے کہ خدا کی پناہ۔ وہ فوراً یہ کہے گی کہ مجھے بھی اسی
دراز کا شوق ہے ! لالچی ہونا بھی کتنی بُری بات ہے !

جیکب۔ ممکن ہے اُسے بھی درازہی کا شوق ہو !

مسز جیکب۔ جب سے ابا نے یہ دراز خریدی ہے وہ تو
یہاں آئی ہی نہیں۔ اور اگر وہ دراز ابا کے کمرے سے
یہاں آ جائے تو اُسے اس کا شک بھی نہیں گزرے گا۔
وہ یہی سمجھے گی کہ یہ ہماری ہے۔

جیکب۔ (گھبراہٹ اور حیرت سے) بیوی ! بیوی !!

مسز جیکب۔ اگر ہم دراز یہاں لے آئیں تو کیا ہرج ہے ؟
ان کے آنے سے پہلے یہ ہو جانا چاہئے۔

جیکب۔ مَیں یہ نہیں کر سکتا۔

مسز جیکب۔ اتنے مُلّا تو نہ بنو۔ آخر مضائقہ کیا ہے ؟

جیکب۔ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

مسز جیکب۔ یہ اپنی ٹوٹی سی الماری اس کی جگہ رکھی جا
سکتی ہے۔ الزبتھ اسی کو غنیمت سمجھے گی۔ مَیں مُدت
سے اس الماری سے تنگ آ چکی ہوں۔

جیکب۔ فرض کرو جب ہم اس گورکھ دھندے میں مشغول
ہوں وہ آ دھمکیں ! پھر ؟ کرکری ہو گی یا نہیں ؟

مسز جیکب۔ میں دروازے کی کنڈی چڑھائے دیتی ہوں
کوٹ اُتار لو، یہ کام جتنی جلدی سے ہو جائے اچھا ہے
اور میں اس راستے میں سے کرسیاں بھی ہٹائے دے
رہی ہوں۔

شیلا۔ میرا فراک تو پیچھے سے باندھ دیجئے ذرا !

مسز جیکب۔ مجھے فرصت نہیں۔ اپنے باپ سے کہو جا کر۔

شیلا۔ ابا۔ یہ آپ نے کوٹ کیوں اُتار رکھا ہے؟

جیکب۔ تمہاری اماں اور میں تمہارے نانا والی دراز نیچے لا رہے ہیں۔

شیلا۔ (کچھ تذبذب میں) تو خالہ الزبتھ کے آنے سے پہلے پہلے ہم اُسے اُڑا رہے ہیں!

جیکب۔ (گھبرا کر) نہیں بچی۔ بڑے میاں نے مرنے سے پہلے وُہ دراز تمہاری امی کو دے دی تھی۔

شیلا۔ آج صبح؟

جیکب۔ ہاں۔

شیلا۔ خوب۔ وہ تو آج صبح خوب نشے میں تھے۔

جیکب۔ خبردار! تمہیں یہ ذکر تک نہیں کرنا چاہئے کہ بڑے میاں مخمور تھے۔

مسز جیکب۔ (ایک ٹائم پیس بغل میں دبائے نیچے آ رہی ہیں) میں نے سوچا اسے بھی نیچے لیتی چلوں۔ (کارنس پر رکھ کر) ہمارا ٹائم پیس تو پُرانا ٹھیکرا ایک پیسے کا بھی نہیں مدت سے میری نظر اس ٹائم پیس پر تھی۔

شیلا۔ (اُونچی آواز سے) یہ ٹائم پیس تو نانا ابا کا ہے!

مسز جیکب۔ چُپ، خموش، خبردار۔ اب یہ ہمارا ہے۔ ادھر آؤ ہنری، ایک طرف سے تم اُٹھاؤ۔ اور شیلا! خبردار جو تم نے ایک لفظ بھی ٹائم پیس یا دراز کے متعلق اپنی خالہ سے کہا۔

شیلا۔ (دل ہی دل میں) مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ نانا ابا کی چیزیں اُڑائی جائیں گی۔

(کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

مسز جیکب۔ (اوپر سے) شیلا! دیکھو تو، اگر تمہارے خالو اور خالہ ہوں تو دروازہ نہ کھولنا۔

شیلا۔ (کھڑکی میں سے جھانک کر) اماں، یہ تو وہی ہیں۔

مسز جیکب۔ جب تک میں نیچے نہ آؤں۔ دروازہ مت کھولو۔ (کواڑ دوبارہ پٹتے ہیں) خود ہی تنگ آ کر واپس چلے جائیں گے۔ (دراز دیوار میں جا لگتی ہے) ہنری! ذرا خیال سے۔ (دروازہ پھر بجتا ہے) خیر اب تو کام ختم ہو گیا۔ شیلا دروازہ کھول دو۔ ہنری، کوٹ پہن لو، لو میں تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔

جیکب۔ ہم نے دیوار کا پلستر زیادہ تو نہیں اُکھاڑ دیا۔

مسز جیکب۔ پلستر کا خیال نہ کرو۔ کیا میرے کپڑے ٹھیک ہیں؟ (آئینہ دیکھتے ہوئے) دیکھنا ہمیں نیم ماتمی لباس میں دیکھ کر کس طرح الزبتھ کا رنگ فق ہوتا ہے؟ (اس کی طرف اخبار پھینک کر) یہ لو اور بیٹھ جاؤ۔ ایسا مُنہ بناؤ گویا ہم انہیں کا انتظار کر رہے تھے۔

(مسٹر اور مسز جان پورے اور چمکدار ماتمی لباس میں اندر داخل ہوتے ہیں اور مسٹر اور مسز جیکب انہیں یوں بازی لے جاتے دیکھ کر جل ہی تو جاتے ہیں لیکن رسمی طور پر بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوتے ہیں)

مسز جان۔ تو آخر بڑے میاں چلتے ہی بنے۔

مسز جیکب۔ ہاں! چل ہی دیئے۔ پچھلے اتوار اُن کی عمر

اکنتھرسال چودہ دن تو ہو چکی تھی (آنسو بہانے کی کوشش کرتی ہے)

مسٹر جان۔ دیکھو سُوسی (یعنی مسز جیکب) ہمیں یوں جی نہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ رونے چلّانے سے کیا حاصل۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن اسی گھاٹی سے گزرنا ہے۔ ممکن ہے وُہ اگر زندہ رہتے تو اس سے بھی زیادہ تکلیف کے دن دیکھتے۔

مسز جیکب۔ میں نہیں سمجھتی کیسے!

مسٹر جان۔ ممکن ہے ہم میں سے کوئی چل بستا۔

مسٹر جیکب۔ الزبتھ۔ کب چلی تھیں؛ بڑا لمبا سفر ہے کمبخت بڑی دیر میں پہنچیں۔

مسز جان (الزبتھ) مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا تھا، میں نہیں یہ کرسکتی تھی!

مسز جیکب۔ کیا نہیں ہوسکتا تھا، کیا نہیں کرسکتی تھیں۔

مسز جان۔ میرے لئے ماتمی لباس کے بغیر روانہ ہونا بالکل ناممکن تھا۔ میں ایسی غیر مہذب باتیں نہیں کرسکتی۔ (اور اپنی بہن کو کنکھیوں سے دیکھتی ہے)

مسز جیکب۔ آپ کو یقین ہونا چاہئے کہ ہم نے بھی ماتمی لباس کا آرڈر دے رکھا ہے۔ (ذرا غصّے میں) میں بنی بنائی بازاری (ریڈی میڈ) چیزیں خریدنے کی قائل نہیں

مسز جان۔ اچھا! مجھے تو سیاہ لباس پہننے کا کچھ شوق سا معلوم ہوتا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ، یہ سب کچھ ہُوا کیسے؟ ڈاکٹر نے کیا کہا؛

مسز جیکب۔ وُہ ابھی تک پہنچا ہی نہیں تھا۔

مسز جان۔ پہنچا نہیں تھا؛

مسٹر جان۔ تو آپ نے ڈاکٹر تک کو نہیں بُلایا؛

مسز جیکب۔ کیوں نہیں، میں نے بُلایا تو تھا، کیا آپ مجھے احمق سمجھتی ہیں؛ میں نے فوراً ہنری کو ڈاکٹر جیکل کے ہاں دَوڑا دیا تھا، لیکن ڈاکٹر گھر پر تھا ہی نہیں۔

مسٹر جان۔ تو کسی دُوسرے ڈاکٹر کو بُلالیا ہوتا۔ افسوس الزبتھ افسوس۔

مسز جان۔ یہ غلطی تو سخت افسوسناک ہے۔

مسز جیکب۔ جب وہ زندہ تھے تو ڈاکٹر جیکل اُن کا علاج کرتے تھے، اور جب وہ مر رہے تھے تو اُس وقت بھی ڈاکٹر جیکل ہی کو ان کا علاج کرنا چاہئے تھا۔

مسٹر جان۔ خیر آپ اپنے معاملات کو خود بہتر سمجھتے ہیں لیکن . . . . . .

مسز جان۔ لیکن یہ غلطی واقعی سخت افسوسناک تھی۔

مسز جیکب۔ بکو نہیں، الزبتھ۔ ڈاکٹر آخر کیا کرلیتا؛ جب عمر پُوری ہو جائے تو۔

مسز جان۔ ہزاروں واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ بیمار کو تقریباً مُردہ سمجھ لیا گیا۔ لیکن وُہ گھنٹوں بعد نہ صرف ہوش میں آگیا بلکہ بچ گیا۔

مسٹر جیکب۔ یہ تو اس وقت ممکن ہے جب کوئی آدمی ڈوب گیا ہو۔ تمہارا باپ ڈُوبا تو نہیں تھا الزبتھ۔

مسٹر جان۔ اس کا تو کوئی خوف ہی نہ تھا، اگر کسی چیز سے

بڑے میاں ڈرتے تھے تو وہ پانی تھا!

مسز جان۔ (غصّے میں) جان! (اور بچارے جان پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔)

مسز جیکب۔ (طیش میں) میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ اباجان ہر روز باقاعدہ نہاتے تھے۔

مسز جان۔ اگر وہ کسی وقت ایک دو قطرے زائد بھی خرچ کر لیتے تھے تو اس کا اب ذکر ہی کیا۔

مسز جیکب۔ اباجان آج صبح بہت مزے میں تھے۔ ناشتے کے بعد بیمہ کی قسط ادا کرنے گئے تھے۔

مسٹر جان۔ خوب! یہ تو اُنہوں نے بہت ہی اچھا کیا۔

مسز جان۔ اس معاملے میں وہ ہمیشہ محتاط رہے۔ انہیں اپنی عزت کا اس قدر احساس تھا کہ ان کے لئے ناممکن تھا کہ بغیر قسط ادا کئے سدھار جاتے۔

مسز جیکب۔ بیمہ ادا کرنے کے بعد وہ ضرور ہوٹل گئے ہوں گے، کیونکہ وہ جب واپس آئے تو نشے میں چُور تھے جب وُہ اندر آئے تو میں نے کہا کہ کھانا تیار ہے، تو وہ بولے۔ کونسا کھانا؟ مجھے تو ابھی سونا ہے!

مسٹر جان۔ اُف! اُف!

مسٹر جیکب۔ اور جب میں اندر آیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت کپڑے اُتار کر بستر پر لیٹ بھی چکے ہیں۔

مسز جان۔ تو انہیں پہلے ہی پتہ چل گیا تھا اپنے انجام کا۔ کیا اُنہوں نے تمہیں پہچانا بھی؟

جیکب۔ ہاں ہاں، اُنہوں نے تو مجھ سے بات بھی کی!

مسز جان۔ کیا اُنہوں نے اپنے انجام کے متعلق تم سے کچھ کہا؟

جیکب۔ نہیں تو۔ مجھ سے کہا۔ ہنری، ذرا میرے جُوتے تو اُتار دو، بستر میں گھسنے سے پہلے میں انہیں اُتارنا بھول گیا۔

مسز جان۔ بڑا رہے ہوں گے۔

جیکب۔ بالکل نہیں، جُوتے پیروں میں برابر موجود تھے۔

مسز جیکب۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے سوچا کہ لاؤ اباکے لئے بھی کچھ لے چلوں، لہٰذا میں نے تھوڑا سا کھانا ٹرے میں لگایا، اور اُن کے کمرے میں پہنچی۔ ٹرے کو دراز پر ــــ نہ، الماری پر ــــ رکھ کر انہیں جگانے جو لگی تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو اکڑے پڑے ہیں۔

جیکب۔ تو اُس وقت میں نے سُنا کہ کوئی مجھے اُوپر بُلا رہی ہے۔ اور میں دوڑ کر اُوپر گیا۔

مسز جیکب۔ تو ایسے موقع پر ہم کر ہی کیا سکتے تھے!

مسز جان۔ وہ مرے پڑے تھے؟

جیکب۔ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔

مسز جان۔ مجھے تو ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ اباجان کی مَوت آناً فاناً واقع ہو گی۔

(سب لوگ آنکھیں پُونچھتے ہیں۔)

مسز جیکب۔ کیا آپ لوگ ابھی اُن کا مُنہ دیکھیں گے یا پہلے چائے پی لیں؟

مسز جان۔ تمہارا کیا خیال ہے جان؟

جان۔ جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔

مسز جان ۔ اگر چائے تیار ہے تو پہلے چائے سے فارغ ہی کیوں نہ ہو لیں ۔

جیکب ۔ ہاں اس بات کا فیصلہ ابھی کر لینا چاہیئے کہ اخباروں میں اطلاع کیسے دی جائے ۔

مسز جان ۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی ۔ مضمون کیا ہونا چاہیئے ؟

مسز جیکب ۔ اپنی بیٹی کے مکان واقع میورو ڈپر وغیرہ وغیرہ

جیکب ۔ ایک چھوٹی سی نظم بھی کیوں نہ ہو جائے ؟

مسز جان ۔ مجھے تو "یادرفتگاں" بہت پسند ہے ۔

جیکب ۔ وہ نظم تو مناسب معلوم نہیں ہوتی ۔

جان ۔ کیا تم انہیں اتنی جلدی بھول گئیں کہ ابھی سے "یاد" کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی ؟

مسز جیکب ۔ مجھے تو یہ طرز پسند ہے: "محبت کرنے والا خاوند، مہربان باپ، باوفا دوست . . . . . . "

جان ۔ مجھے تو یہ بھی کچھ پسند نہیں ۔

جیکب ۔ مناسب یا غیر مناسب ہونے سے مطلب ؟

مسز جان ۔ نہیں ۔ مطلب تو یہ ہے کہ لکھا ہُوا اچھا معلوم ہو ۔

جیکب ۔ میں نے اخبار میں کل ایک مرثیہ دیکھا تھا ، مجھے تو وہ بہت پسند ہے (اخبار اُٹھا کر مرثیہ پڑھتا ہے)

مسز جان ۔ نہ ، نہ ، نہ ، یہ بھی نہیں ، ہمیں تو ایسی نظم چاہیئے جس میں ان سب باتوں کا ذکر ہو کہ ہم ان سے کس قدر محبت کرتے تھے ۔ وہ کتنی خوبیوں کے مالک تھے اور ان کے چلے جانے سے ہمیں کیسا ناقابلِ تلافی نقصان ہُوا ہے وغیرہ ۔

مسز جیکب ۔ تمہارا خیال ہے کہ ایک پوری نظم اُٹھا کر شائع کرا دی جائے لیکن اس پر تو خرچ بہت ہوگا ۔

مسز جان ۔ خیر اس کے متعلق چائے کے بعد سوچ لیا جائے گا ابھی تو ہمیں اُن کی چیزیں گننی ہیں ، ان کی فہرست بنانی ہے ، ان کا کمرہ تو اسباب سے بھرا پڑا ہوگا ۔

جیکب ۔ اطمینان رکھئے ، ایسے قیمتی ہیرے جواہرات ان کے کمرے میں نہیں ہیں ۔

مسز جان ۔ سوائے ان کی سُنہری گھڑی کے جس کا انہوں نے ننھے ولیم سے وعدہ کر رکھا تھا ۔

مسز جیکب ۔ ولیم سے وعدہ کر رکھا تھا ! ہم نے کبھی اس کا ذکر تک نہ سُنا !!

مسز جان ۔ لیکن انہوں نے وعدہ کیا تھا سُوسی ۔ جب وُہ ہمارے ہاں رہا کرتے تھے ۔ ولیم سے انہیں بہت پیار تھا ۔

مسز جیکب ۔ ممکن ہے ۔ لیکن مجھے تو متعلق علم نہیں ۔

جان ۔ چھوڑو بھی اس معاملے کو ۔ ہاں تو اس قسط کی رسید کہاں ہے جو انہوں نے آج صبح بیمہ کمپنی کو ادا کی تھی ۔ یہ بیمہ کا پیسہ بہت جھگڑے کا معاملہ ہوتا ہے ۔

مسز جیکب ۔ مَیں نے تو دیکھی نہیں ۔

شیلا ۔ امی ۔ میرا خیال ہے کہ نانا ابا بیمے کی قسط دینے نہیں گئے تھے ۔

مسز جیکب ۔ وہ باہر گئے تو تھے ۔

شیلا ۔ جی ہاں ۔ لیکن وُہ شہر نہیں گئے ۔ وہ تو یہاں سے مسٹر ڈیوڈ کے ہاں گئے تھے اور وہ دونوں مِل کر گرجے والی

سڑک پر جاتے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔
مسز جیکب۔ تو وہ ضرور ہوٹل گئے ہوں گے۔
جان۔ ہوٹل؟
مسز جیکب۔ جی ہاں۔ وہی شراب خانہ جو مپیٹر کی بیوہ نے کھول رکھا ہے، ابا وہاں بہت منڈلایا کرتے تھے۔ اب تو مجھے شک ہو رہا ہے کہ اُنھوں نے قسط ادا کی بھی یا نہیں۔
جان۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ انہوں نے ادا نہیں کی؟ کیا میعاد گزر چکی تھی؟
مسز جیکب۔ نہیں، غالباً میعاد تو ابھی تک نہیں گزری تھی۔
مسز جان۔ میرا دل اندر سے کہہ رہا ہے کہ اُنھوں نے قسط ادا نہیں کی۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے، مجھے یقین سا ہے کہ وہ قسط ادا نہیں کی۔
جان۔ آہ بڈھا شرابی!
مسز جان۔ انہوں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے ہمیں ستانے کے لئے۔
مسز جیکب۔ اور میری اس تین سالہ تکلیف کا یہ صلہ؛ یہ تو ٹھگی ہے ٹھگی۔
مسز جان۔ اور مجھے پانچ سال ان کے ساتھ مصیبت جھیلنی پڑی تھی!
مسز جیکب۔ اور تم ہمیشہ کوشش کرتی تھیں کہ انہیں اپنے ہاں سے نکال کر ہمارے سر منڈھ دو۔
جیکب۔ کیوں برس رہی ہو خواہ مخواہ اس غریب پر؛ پہلے یہ تو یقین کر لیا ہوتا کہ اس نے قسط ادا کی ہے یا نہیں؟

مسز جان۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھے یقین ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ انہوں نے ادا نہیں کی۔
مسز جیکب۔ ذرا اُوپر تو جاؤ شیلا۔ اور اپنے نانا کی سنگھار میز پر سے کُنجیوں کا گُچھا اُٹھا لاؤ۔
شیلا۔ (ڈری سی آواز سے) نانا ابا کی میز پر سے؟
مسز جیکب۔ ہاں۔
شیلا۔ میں — میں — میں وہاں نہیں جاؤں گی۔
مسز جیکب۔ بیوقوف، فضول باتیں مت کرو۔ کون کھا جائے گا تمہیں وہاں؛ دیکھیں تو شاید رسید دراز میں بند کر رکھی ہو؟
جان۔ کہاں؛ اس میں؛ (دراز کے پاس جا کر)
مسز جان۔ سُوسی! یہ تم نے کہاں سے اُڑائی؛ جب میں پہلے یہاں آئی تھی، اُس وقت تو یہ دراز یہاں نہیں تھی۔ (اور غور سے دراز کو دیکھتی ہے)
مسز جیکب۔ ہنری خرید لائے تھے ایک دن۔
مسز جان۔ مجھے تو یہ بہت پسند ہے، یہ خوبصورت بھی ہے۔ کسی نیلام میں مل گئی تھی کیا؛
جیکب۔ سُوسی۔ بھلا یہ میں نے کہاں سے خریدی تھی؛
مسز جیکب۔ جی ہاں، ایک نیلام پر۔
جان۔ (ہونٹ نکال کر) تو پُرانی ہے سیکنڈ ہینڈ۔
مسز جان۔ جہالت کا ثبوت تو نہ دو جان، اعلےٰ صنعت کی چیزیں عموماً سیکنڈ ہینڈ ہوتی ہیں۔
شیلا۔ اماں، اماں؛

مسز جیکب۔ کیا ہے، میری بچی؟

شیلا۔ نانا ابا تو ہِل رہے ہیں!

جان۔ کیا؟

مسز جیکب۔ کیا کہا تم نے؟

شیلا۔ نانا ابا اُٹھ رہے ہیں۔

مسز جان۔ بچی تو پگلی ہے۔

مسز جیکب۔ واہی تباہی نہ بکو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے نانا مر چکے ہیں؟

شیلا۔ خواہ کچھ ہو، لیکن میں نے اُنہیں اُٹھتے دیکھا ہے، اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے!

جان۔ خود جا کر کیوں نہیں دیکھتیں سُوسی؟

مسز جیکب۔ میرے ساتھ آؤ ہنری۔ (ہنری ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

جان۔ ہشت! سُنو تو! چُپ!!!

(آہستہ آہستہ کواڑ کھلتا ہے اور بڑے میاں نمودار ہو جاتے ہیں)

مسٹر ایڈورڈ۔ ننھی شیلا کو کیا ہو گیا؟ (جان اور اُس کی بیوی کو دیکھ کر) ہیلو! تم یہاں کیسے؟ کیا حال ہے جان! اچھی تو ہو الزبتھ؟ (سب کے رنگ اُڑ جاتے ہیں! کوئی جواب نہیں دیتا۔)

مسز جیکب۔ (ڈرتی ڈرتی قریب آ کر) کیا آپ ہیں ابا؟ (اور ہاتھ لگا کر دیکھتی ہے کہ سچ مچ وہی ہیں)

مسٹر ایڈورڈ۔ ضرور! میں ایڈورڈ ہی تو ہوں۔ تو جو نہیں سُوسی، یہ کیا فضول حرکت ہے؟

جیکب۔ (دوسروں سے) ابا تو زندہ معلوم ہوتے ہیں!

جان۔ میرا بھی یہی خیال ہوتا جا رہا ہے۔

ایڈورڈ۔ (خفا ہو کر) الزبتھ تم نے مجھے کافی دیر سے اپنے گھر نکال رکھا ہے اور اب بھی مجھے دیکھ کر کچھ خوش نظر نہیں آتیں۔

مسز جان۔ آپ نے تو ہمیں حیران کر دیا ابا! کیا آپ کی صحت تو ٹھیک رہتی ہے؟

ایڈورڈ۔ ہیں! کیا؟

جان۔ آپ اچھے تو ہیں؟

ایڈورڈ۔ ہاں۔ بس ذرا سر میں درد سا ہے۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اس گھر میں سب سے پہلے مرنے والا مَیں نہیں ہُوں گا! ہنری کی صحت مجھ سے اچھی تو نہیں۔

مسز جان۔ نہیں نہیں میں تو کبھی ایسی شرط نہ بدوں۔

ایڈورڈ۔ (آرام کرسی کی طرف جاتے ہوئے) سُوسی! میرے نئے سلیپر کیا ہوئے آخر؟ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے انہیں کہاں پھینکا۔

مسز جیکب۔ (گھبرا کر) انگیٹھی کے پاس تو نہیں ہیں ابا!

ایڈورڈ۔ مجھے تو وہاں نظر نہیں آتے (ہنری کو اُتارتے دیکھ کر) ہوں، تم نے ڈانٹ رکھے ہیں، ہنری!

مسز جیکب۔ آپ کے تنگ تھے نا؟ مَیں نے ہی ہنری سے کہا تھا کہ ذرا پہن لیں تاکہ کچھ کُھل جائیں۔ اب اُتار دو ہنری تاکہ ابا پہن لیں۔

مسز جان۔ اتنی جلدی مُرنے کے جُوتے چڑھا لینا! توبہ۔

میں تو اسے انتہا درجے کی بدتہذیبی کہوں گی!

شیلا۔ نانا ابا، مجھے کتنی خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ آپ ابھی زندہ ہیں۔

مسز جیکب۔ بکو نہیں، شیلا! زبان سنبھال کر بولو۔

ایڈورڈ۔ کیا؛ کون مر گیا آخر؟

مسز جیکب۔ بچی ہے! در اصل وہ آپ کی طبیعت کا حال پوچھنا چاہتی ہے۔

ایڈورڈ۔ میری اچھی بچی! اب سر کے درد کو کچھ افاقہ ہے۔

مسز جیکب۔ ابا کو کتنی محبت ہے شیلا سے۔

مسز جان۔ جی ہاں۔ لیکن انہیں میرے ولیم سے بھی اتنی ہی محبت ہے۔

مسز جیکب۔ اچھا تو اب پوچھ لو کہ انہوں نے ولیم سے گھڑی کا وعدہ کیا تھا یا نہیں؟

مسز جان۔ اوں ہوں! یہ کونسا موقع ہے؟

ایڈورڈ۔ ارے یہ کیا؟ جان تم تو ماتمی لباس میں ہو! اور الزبتھ بھی، سُوسی بھی، ہنری بھی اور ننھی شیلا بھی! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ ہمارے خاندان میں ضرور کوئی موت واقع ہوئی ہے (اور بڑے میاں ایک خوب زور کا قہقہہ مارتے ہیں)

مسز جیکب۔ آپ نہیں جانتے ابا۔ جان کا ایک دُور کا رشتہ دار۔

ایڈورڈ۔ آخر کون سا رشتہ دار؟

مسز جیکب۔ اس کا بھائی۔

جان۔ (مسز جیکب سے) ارے۔ میرا تو کوئی بھائی ہی نہیں تھا

ایڈورڈ۔ اچھا، اچھا۔ تو اس کا نام کیا تھا جان؟

جان۔ اے — اے —

مسز جیکب۔ (دبی زبان سے) کرسٹوفر

مسز جان۔ (دبی زبان سے) مارٹن

جان۔ اے، اے، کرس — مار — جارج —

ایڈورڈ۔ اچھا! جارج۔ تو تمہارا بھائی جارج مرا کہاں تھا؟

جان۔ اے — اے — آسٹریلیا میں۔

ایڈورڈ۔ تم سے بڑا ہوگا؟

جان۔ جی ہاں۔ پانچ سال۔

ایڈورڈ۔ تم پُرسے کو جاؤ گے؟

جان۔ جی ہاں۔

مسز جان } نہیں، نہیں۔
مسز جیکب }

جان۔ جی نہیں۔

ایڈورڈ۔ غالباً چائے پر میرا ہی انتظار تھا، مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔

مسز جیکب۔ میں چائے بناتی ہوں۔

ایڈورڈ۔ آؤ بیٹھو بھی۔ ذرا عیش تو کریں۔

مسز جیکب۔ ہنری، ابا کو زبان کا ٹکڑا دو۔

ایڈورڈ۔ شکریہ۔ میں خود شروع کروں گا۔ (توس اور مکھن کی تواضع شروع کر دیتا ہے)

جان۔ خدا کا شکر ہے کہ اس عمر میں بھی آپ کی بھوک قائم ہے۔ ابا جان۔ اگرچہ آپ کی طبیعت کچھ سُست ہی رہی ہے۔

ایڈورڈ۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ذرا لیٹا ہُوا تھا۔
مسز جیکب۔ کیا سو گئے تھے آپ؛
ایڈورڈ۔ نہیں تو؛
مسز جیکب } اوہ!
جیکب }
ایڈورڈ۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، کچھ خمار سا ضرور تھا۔ اور ہاتھ پیر نہیں ہلتے تھے۔ باقی تو سب معاملہ ٹھیک تھا۔
جان۔ آپ دیکھ اور سُن تو سکتے تھے غالباً؛
ایڈورڈ۔ ہاں۔ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کیا کچھ دیکھا! ذرا مکھن تو ادھر بڑھانا۔
مسز جیکب۔ یہ محض آپ کا خیال ہی ہے ابا، آپ ضرور سو رہے ہوں گے۔
ایڈورڈ۔ ہرگز نہیں سوسی، میں سویا بالکل نہیں۔ کیا مجھے اتنا بھی معلوم نہیں؛
مسز جان۔ کیا آپ نے جیکب یا مسز جیکب کو کمرے میں آتے نہیں دیکھا؛
ایڈورڈ۔ (سر کھجاتے ہوئے) ذرا مجھے سوچ لینے دو ——
مسز جیکب۔ کیوں تنگ کرتی ہو ان کو؛ چھوڑو بھی ان فضول باتوں کو۔
جیکب۔ کیا فائدہ ابا کو تنگ کرنے سے؛
ایڈورڈ۔ (یکایک یاد کرتے ہوئے) ارے ارے رے خدا کی قسم! سوسی؛ ہنری؛ تمہارا کیا مطلب تھا آخر میرے کمرے میں آنے اور میری نئی دراز اُٹھا لے جانے سے؛

کیا بہرے ہو گئے ہو؛ سوسی؛ ہنری؛ جواب کیوں نہیں دیتے؛ دم کیوں سادھ لیا؛
مسز جان۔ کون سی دراز تھی وہ ابا؟
ایڈورڈ۔ وہی دراز! میری دراز! وہی جو میں نے ——
مسز جان۔ (دراز کی طرف اشارہ کر کے) کیا یہی تو نہیں؛
ایڈورڈ۔ یہی، یہی! یہ یہاں کیا کر رہی ہے اس کمرے میں؛
(اتنے میں ٹائم پیس کارنس پر گیارہ بجاتا ہے، اور سب اس کی طرف دیکھتے ہیں)
اور یہ ٹائم پیس بھی تو میرا ہے، اللہ توبہ۔ یہ اس گھر میں آج ہو تا کیا رہا ہے آخر؛
جان۔ میں تو اس چیستاں کو کچھ سمجھ نہیں سکتا۔
مسز جان۔ (اُٹھ کر) ابا جان۔ میں بتاتی ہوں اس گھر میں کیا ہوتا رہا ہے۔ یہاں ڈاکا پڑا ہے ڈاکا!
مسز جیکب۔ چُپ رہو جی۔ بکواس کی ضرورت نہیں۔
مسز جان۔ چُپ کیسے رہوں! میں تو چُپ نہیں رہ سکتی۔ ڈاکا، ٹھگی، دھوکا ——
جیکب۔ بس کافی ہے الزبتھ، زیادہ بڑھو نہیں۔
مسز جان۔ اور تم بھی اس میں حصے دار ہو ہنری؛ کیا اس بیہودہ عورت کے کہنے پر تم بھی اس قسم کی ذلیل حرکتیں کرنے کو تیار ہو جاتے ہو؛
مسز جیکب۔ (اُٹھ کر) الزبتھ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم اس وقت کہاں ہو؛
جیکب۔ خموش۔ خموش۔ لڑائی جھگڑے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جان ۔ میری بیوی کو اپنے خیالات کے اظہار کا پُورا پُورا حق حاصل ہے۔

مسز جیکب ۔ تو گھر سے باہر نکل کر جو چاہے کہیں۔ لیکن یہاں زبان سنبھال کر بولنا ہوگا۔

ایڈورڈ ۔ توبہ توبہ ۔ کیا جہنم ہے یہ؟ خدارا مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

مسز جان ۔ ضرور۔ ضرور۔ میں بتاتی ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ آپ دن دہاڑے لُٹ جائیں۔

ایڈورڈ ۔ تو آخر مجھے لُوٹتا کون ہے؟

مسز جان ۔ ہنری اور سُوسی، اور کون! اُنھوں نے آپ کا ٹائیم پیس اور آپ کی دراز چُرالی ہے۔ وُہ چوروں کی طرح آپ کے کمرے میں گھُس گئے۔ اور جب آپ مرگئے تھے تو اُنھوں نے اپنا داؤ چلالیا۔

جیکب
مسز جیکب } چُپ، خموش، الزبتھ

مسز جان ۔ ہرگز نہیں، مجھے کوئی چُپ نہیں کراسکتا۔ اب تو میں سارے بخیئے اُدھیڑ کر رہوں گی۔ جب آپ مرگئے تھے تو ــــــ

ایڈورڈ ۔ کون مرگیا تھا؟

مسز جان ۔ آپ

ایڈورڈ ۔ لیکن میں تو زندہ ہوں! میں کب مرا تھا؟

مسز جان ۔ نہیں۔ لیکن وہ سمجھے تھے کہ آپ مرچکے ہیں۔

(ایڈورڈ ایک دفعہ پھر سب کو دیکھتا ہے)

ایڈورڈ ۔ ہاں۔ تو اب میری سمجھ میں آیا۔ جبھی آپ سب آج سیاہ پوش ہیں! آپ سمجھے مَیں مرگیا۔ (حضرت ہنستے ہیں) یہ بہت بڑی غلطی تھی۔

مسز جیکب ۔ (روتے ہوئے) ابا!

ایڈورڈ ۔ آپ نے میری چیزیں تقسیم کرنے میں تو ایک منٹ کا توقف بھی نہ کیا!

مسز جان ۔ نہیں ابا، آپ کو میری طرف سے یہ بدگمانی نہیں ہونی چاہئے، سُوسی نے خود ہی گڑبڑ کرنا اور چیزیں ہتھیانا شروع کردیا تھا۔

ایڈورڈ ۔ سُوسی، تم شروع ہی سے حساب کی بہت پکی رہی ہو، غالباً تمہارا خیال یہ تھا کہ میں نے جو وصیت کر رکھی ہے وُہ ٹھیک نہیں۔

جیکب ۔ تو کیا آپ نے وصیت کر رکھی ہے؟

ایڈورڈ ۔ جی ہاں اسی دراز میں بند ہے۔

مسز جان ۔ اس وصیت میں کیا ہے، ابا؟

ایڈورڈ ۔ اب تو اس کا خیال ہی چھوڑدو۔ اب تو میں اُس وصیت کو جلا کر نئی لکھوں گا۔

مسز جیکب ۔ (روکر) ابا، آپ مجھ پر سختی نہ کیجئے گا۔

ایڈورڈ ۔ سُوسی، برائے مہربانی ایک پیالی چائے، خوب دُودھ ڈال کر اور دو ٹکڑے کیک کے تو ذرا پکڑا دینا۔

مسز جیکب ۔ بدل دو جان، ابا۔

ایڈورڈ ۔ مَیں کسی پر بھی سختی نہیں کرنا چاہتا۔ مَیں تمہیں ابھی بتاتا ہوں کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ جب سے تمہاری والدہ

کا انتقال ہُوا ہے کچھ عرصہ میں الزبتھ کے ساتھ رہا ہوں اور کچھ عرصہ سُوسی کے ہاں۔ میں نئی وصیت لکھوں گا اور یہ میری تمام چیزیں اس کی ملکیت سمجھی جائیں گی جس کے ہاں میں مروں گا۔ تمہارا اس وصیت کے متعلق کیا خیال ہے؟

جیکب ۔ یہ تو لاٹری معلوم ہوتی ہے۔

مسز جان ۔ اور آج سے آپ کس کے ہاں رہنا پسند فرمائیں گے؟

ایڈورڈ ۔ ابھی سنو تو ۔ ذرا صبر تو کرو۔ میں ابھی بتاتا ہوں۔

مسز جان ۔ ابا جان، اب تو آپ کو بہت عرصہ ہمارے ہاں سے آئے ہو گیا ہے، آپ اب ہمارے پاس کیوں نہیں چلتے، میں آپ کے ہر آرام کا خیال رکھوں گی۔

مسز جیکب ۔ ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ابھی وہ اتنا عرصہ تو ہمارے ہاں رہ لیں جتنا عرصہ تمہارے ہاں رہے ہیں۔

مسز جان ۔ جو کچھ یہاں آج ہو چکا ہے میرا خیال نہیں کہ اس کے بعد ابا تمہارے ہاں رہنا پسند کریں گے۔

ایڈورڈ ۔ تو الزبتھ، تمہیں یہ شوق ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں؟

مسز جان ۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں تو مدت سے اس کے لئے بے چین ہوں۔

ایڈورڈ ۔ تمہارا کیا خیال ہے سُوسی؟

مسز جیکب ۔ میرا خیال ہے الزبتھ کا ارادہ بدلے تھوڑا ہی عرصہ ہُوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے درمیان جھگڑا کس بات کا تھا؟

مسز جان ۔ سُوسی ۔ بیوقوف نہ بنو۔ بیٹھ جاؤ۔

مسز جیکب ۔ ہرگز نہیں، اگر ابا میرے پاس نہیں رہیں گے تو الزبتھ کے پاس بھی نہیں رہ سکتے۔ دو سال ہوئے ہماری لڑائی اسی لئے ہوئی تھی کہ الزبتھ نے کہا تھا کہ وہ ابا کو کسی شرط اور کسی قیمت پر بھی اپنے ہاں رکھنے کو تیار نہیں۔

ایڈورڈ ۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم دونوں کو اس سلوک پر شرم آنی چاہیئے جو تم نے اپنے اپنے موقع پر مجھ سے کیا۔

مسز جیکب ۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو میں اس کے لئے از حد نادم ہوں اور معافی کی خواستگار۔

مسز جان ۔ اور میں بھی اتنی ہی شرمندہ ہوں اور اُسی طرح معافی چاہتی ہوں۔

ایڈورڈ ۔ تم دونوں کو ہوش ذرا دیر میں آیا۔ معافیوں کا وقت گزر چکا۔ آج سے پہلے دونوں میں سے کسی نے بھی مجھے ساتھ رکھنے کا شوق ظاہر نہیں کیا۔

مسز جان ۔ } نہیں، نہیں، ابا۔
مسز جیکب ۔ }

ایڈورڈ ۔ بالکل نہیں، جو کچھ تم اس وقت کہہ رہی ہو، وہ میرے اس وعدے کا نتیجہ ہے کہ میری جائداد اس کو ملے گی جس کے ہاں میں مروں گا۔ چونکہ تم لوگوں کو میری ضرورت نہیں۔ اس لئے میں ایسے شخص کے ہاں چلا جاؤں گا جس کو میری ضرورت ہو۔

مسز جان ۔ یہ کیا، بڑے میاں؟ آپ کو دونوں میں سے

اپنی ایک بیٹی کے ساتھ رہنا چاہئے۔

ایڈورڈ۔ سنو، میری تجویز یہ ہے۔ مجھے اگلے پیر کو تین کام کرنا ہیں، وکیل کے ہاں جا کر اپنی وصیت تبدیل کرانا ہے، بیمہ کمپنی کے دفتر میں جا کر قسط ادا کرنا ہے اور گرجا گھر جا کر شادی کرانا ہے!

جان۔ } کیا؟
جیکب }

مسز جان۔ شادی؟

مسز جیکب۔ ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اپنے ہوش میں نہیں!

ایڈورڈ۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے شادی کرنا ہے۔

مسز جیکب۔ کس سے؟

ایڈورڈ۔ مسز پیٹر سے جس نے ہوٹل کھول رکھا ہے، ہمارا ارادہ تو بہت مدت سے تھا لیکن مجھے اس راز کو فاش کرنے کے لئے مناسب موقع کا انتظار تھا۔ (اُٹھتا ہے) مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں آپ لوگوں کے لئے بوجھ سا ہوں، لہٰذا میں نے ایسا شخص ڈھونڈا جو خوشی سے میرا خیال رکھے۔ اگر آپ لوگ میری شادی میں شریک ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی (دروازے کی طرف جاتا ہے) پیر کو، گرجا گھر، عین بارہ بجے دوپہر، (دروازہ کھولتا ہے) یہ بہت اچھا ہُوا کہ سُوسی یہ دراز نیچے لے آئی۔ اب یہاں سے ہوٹل پہنچانے میں آسانی ہو گی۔

(باہر چلا جاتا ہے) پردہ

(ہاؤٹن) ف۔م۔افضل

اقوال

بغیر نیکی کی ملاوٹ کے گناہ بھی گناہ نہیں

رُوح اور مشغولیت اصل میں ایک ہی ہیں۔ بے کار رُوح رُوح ہی نہیں۔

کام میں انسان پہلی اخلاقی فتح اور پہلا اخلاقی سبق حاصل کرتا ہے۔

نیکی کی نمائش بدی کے مترادف ہے۔

غرض اور بے غرضی کی ملاوٹ کامیابی کی کلید ہے۔

سعادت علی (از لدھیانہ)

پانچ شعر

نہ لے جا مجھے عشق کی وادیوں میں
مجھے چھوڑ دے او مری بے خیالی!

سراپا عقل بن کر کیوں مجھے برباد کرتے ہو
مَیں دل بن کر سرِ محفل مچل جاؤں تو کیا ہوگا؟

بہکے ہوئے یہ بادل، مہکی ہوئی یہ راتیں
یاد آگئیں پھر مجھ کو بھولی ہوئی برساتیں

وُہ ہجومِ شوق کی بجلیاں، جو نہاں تھیں دل کے قرار میں
وُہی آج جلوہ نما ہوئیں ترے حُسنِ رُخ کی بہار میں!

ابتدائے عشق کی وہ چاندنی راتیں کہاں؟
آہ اُن راتوں کی وُہ لمبی مُلاقاتیں کہاں؟

مظفرؔ حسین شمیم

کاروباری تعلیم

"برعکس نہند نام زنگی کافور" ——— دُنیا کو لوگ دلکش کہتے ہیں، اُن کے نزدیک اس کی نیرنگیاں ہر دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ زندگی کے پیچھے دیوانے ہیں، اُنہیں زندگی میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔ اکثر تو ایسے ہیں جنہوں نے عیش و نشاط کے چند ظاہری نشانات کو دُنیا کی دلکشی سمجھ لیا ہے اور اُن کے نزدیک عیش و نشاط کے تھوڑے سے لمحے بھی زندگی کو اتنا دلکش بنا دیتے ہیں کہ ہزاروں موتیں اس ایک زندگی پر قربان کی جا سکتی ہیں۔ زندگی کی یہ بدمستیاں جن کا تعلق دل اور روح کے 'سرور' سے ذرا بھی نہیں، اگر واقعی سرور و انبساط سمجھی جا سکتی ہیں تو بے شک تھوڑی دیر کے لئے زندگی کو خوشگوار تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی دُنیا کی عام فضا پر رنج، غم اور افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ ظاہری خوشی کے باوجود بھی ہر شخص دل میں افسردہ اور غمگین نظر آتا ہے۔ افسردگی کا شکار ہر شخص ہے ——— فرق صرف کمی اور زیادتی کا ہے۔

لیکن ان میں سے ایسے لوگ سب سے زیادہ قابلِ رحم ہیں جو زندگی کی کسی چیز میں دلچسپی نہیں محسوس کرتے۔ اُنہیں اپنے کام سے نفرت اور دلچسپیوں سے بیزاری ہے۔ دوستوں کی دوستی اور عزیزوں کی محبت اُن کے لئے بالکل بے معنی سی چیز ہے۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا کی فضا سے بالکل الگ محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی اُن کے لئے نہیں۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا کے لئے موزوں نہیں پاتے۔ اس لئے اُن کی زندگی موت سے بدتر ہے۔ بدقسمتی سے روز بروز ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ جو واقعی اپنے ماحول کے لئے بالکل موزوں نہیں ہیں، روز بروز کیوں بڑھ رہے ہیں؛ اس کی ذمہ دار فطرت ہے یا خود انسان۔ اگر فطرت ہے تو اس نے اب تک انسان کا ساتھ کیوں دیا اور اب کیوں وہ اُسے غلط راستے کی طرف لئے جا رہی ہے؛ اس میں غالباً خود انسان ہی کا قصور ہے۔ اس کے لئے فطرت نے جو اصول بنائے، دُنیا اپنے تغیرات کے باوجود بھی، اُنہیں کے راستے پر چل رہی ہے۔ دُنیا کی ترقیاں فطرت کے اصول کو نہیں بدل سکتیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان خود بدلتی ہوئی دُنیا کا ساتھ دے۔ دُنیا کے قدم تیزی سے آگے کو بڑھ رہے ہیں۔ اگر انسان سست قدمی سے کام لےگا تو دُنیا اس کے لئے پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تھوڑے سے سفر کے بعد وہ اپنے آپ کو

مجبور محسوس کرنے لگے گا۔ اُسے ہر طرف نئی چیزیں نظر آئیں گی، جو اُس کے لئے بالکل غیر مانوس ہوں گی۔ ہر طرف اجنبیت، نیاپن اور بے بسی۔ اور اُس کے بعد سے زندگی کی افسردگیوں کی ابتدا۔

استعارے کو ہٹا کر دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ انسانی سوسائٹی کے بالکل ابتدائی دوروں میں فطرت خود انسان کو سبق سکھاتی تھی۔ سوسائٹی محدود تھی، اُس کے تعلقات محدود تھے، رشتوں کی حدیں ایک جنگل کے رہنے والوں سے شروع ہو کر دوسرے جنگل کے رہنے والوں تک ختم ہو جاتی تھیں۔ کھانے اور شاید کچھ مذہبی رسموں کے علاوہ، زندگی ہر قید سے آزاد تھی۔ بڑے شکار کرنے جاتے، بچے اُن کا پیچھا کرتے، اُن کی نقلیں اُتارتے۔ اپنے کھیلوں میں سیر و شکار کی نقلیں کرتے، مذہبی ناچ گانوں میں حصہ لیتے۔ جنگلی جانوروں سے لڑتے بھڑتے اُن سے ہارتے، اُن پر فتح پاتے، قدرت کے مظاہر کا مقابلہ کرنے کی ضرورت پڑتی، سردی سے بچنے کے لئے بڑے جانوروں کی کھالوں کے لباس بناتے، پتوں سے اپنا تن ڈھانکتے، کھالوں کی جھونپڑیاں بنایا کرتے، پہاڑوں کے غاروں میں گھس کر زندگی بسر کرتے۔ اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے ناچتے گاتے، غرض اُن کی زندگیوں میں اس سے زیادہ وسعت نہیں تھی اِس لئے اُن کے بچے ان کے ساتھ رہ کر سب کچھ سیکھتے تھے۔ زندگی خود انہیں سبق سکھاتی تھی، اور اپنے لئے موزوں بناتی تھی۔ زندگی ایک مدرسہ تھی جس میں کسی مصنوعی فن کی مدد کے بغیر ہر بچہ اور بوڑھا زندگی سے سبق لیتا تھا، اور جب تک زندہ رہتا تھا یہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کا ماحول اُس کے لئے، اور وہ اپنے ماحول کے لئے بنا ہے۔ زندگی کا سچا آرام اور سرور، تہذیب و تمدن کی بندشوں سے آزاد رہنے والے اُس وحشی انسان کو حاصل تھا۔

دُنیا نے کروٹ لی، فطرت نے نئی نئی ضرورتیں انسان کے سامنے پیش کیں۔ نئے رشتے قائم ہوئے۔ اُن میں وسعتیں پیدا ہوئیں۔ ان رشتوں کی زنجیریں کھنچ کھنچ کر دُور دُور جانے لگیں، پیدائش و موت، رسم و رواج، مذہب و حکومت، شکست و فتح، صنعت و حرفت، سب چیزیں زندگی کے اجزا بن گئیں۔ ہر آدمی کے لئے ان میں شریک ہونا دشوار ہو گیا۔ سماجی زندگی کے تعلقات کی پیچیدگیوں کا تقاضا ہُوا کہ تقسیم عمل ہو۔ گھر کے بڑے بوڑھوں نے بچوں کو ساتھ رکھنا چھوڑ دیا۔ دونوں کی دلچسپیوں کے مرکز بدل گئے بچوں کے کھیل کود اصل زندگی سے ہٹ کر صرف اُن کی نقلوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ فطرت نے معلمی سے دست برداری حاصل کر لی۔ اور اب ضرورت ہوئی کہ بچوں کو باقاعدہ تعلیم دی جائے۔ سب سے پہلے مذہبی باتیں سکھانے کے لئے الگ آدمی مقرر ہوئے اور اُس کے بعد رفتہ رفتہ دوسری طرح کی تعلیم بھی مدرسوں کے ذمے ہو گئی۔ یہیں سے ابتدا ہوئی "غیر فطری" تعلیم کی، اور یہیں سے آدمی اپنے آپ کو اپنے ماحول میں اجنبی محسوس کرنے لگا۔ زندگی کی پیچیدگیاں زیادہ بڑھیں۔ انسانی تعلقات کے رشتے اور زنجیریں، گھروں سے قبیلوں تک، قبیلوں سے قوموں تک، قوموں سے مُلکوں تک پھیلیں اور رفتہ رفتہ بین الملوکی اور بین الاقوامی بن گئیں۔ مذہب، معاشرت، سیاست، تمدن نے ایک محدود دائرے سے نکل کر دُنیا کی وسعتوں کی طرف قدم بڑھایا اور بڑھتے بڑھتے سب چیزیں اس طرح ایک دوسرے سے مل گئیں کہ اُن کا

سُلجھانا غیر ممکن ہے۔

تعلیم اور مدرسے کی ذمہ داری کم سے زیادہ اور زیادہ سے بہت زیادہ ہو گئی لیکن شروع سے اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا گیا ضرورت اس بات کی تھی کہ مدرسہ فطرت کا ساتھ دیتا جس طرح ابتدائی سوسائٹی میں بچہ اپنے گھر اور باہر کے دھندوں میں شریک ہو کر اُن سے سب کچھ سیکھتا تھا، اُسی طرح مدرسے میں بھی ضرورت تھی کہ حقیقی زندگی کا ماحول پیدا کیا جاتا۔ بچے اُس میں محدود نہ کر دیئے جاتے۔ مدرسہ اُن کے لئے ایک چھوٹی سی دُنیا بن جاتا جہاں وہ زندگی کی کشمکشوں میں ایک مختصر پیمانے پر حصّہ لیتے۔ مدرسہ وسیع ماحول میں سے صرف ضروری چیزوں کو چن لیتا، اور بچوں کو اُس میں رہنے دیتا، اور وہ فطری طریقے پر زندگی کے سبق سیکھتے۔ اور بڑے ہو کر یہ نہ محسوس کرتے کہ اُن کا ماحول اُن کے لئے نہیں بنا۔ وُہ زندگی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ زندگی مصیبتوں اور افسردگیوں کا مجموعہ ہے۔

اگر مدرسے اس بات کو محسوس کرتے کہ انسان ایک ایسا حیوان ہے جسے صرف سوسائٹی میں رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جس کا ہر عمل دوسرے افراد کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ بغیر سوسائٹی کے اُس کی زندگی زندگی نہیں اور بغیر دوسروں سے ملے جلے اور دوسروں کی عملی سرگرمیوں میں حصّہ لئے، وُہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر زندہ رہ بھی سکتا ہے تو زندوں کی طرح نہیں بلکہ مُردوں کی طرح۔ صرف اس چیز کے محسوس کرنے کے بعد مدرسے کا ماحول خود بخود فطری ہو جاتا۔ یہ تو وہ اصول ہے جو عام فطرتِ انسانی پر چھایا ہوا ہے اور جسے عام حیاتِ انسانی کا جوہر سمجھنا چاہئے کہ انسان اپنے گردوپیش کی زندگی میں حصّہ لے، ہر عمل میں خود شریک ہو اور اُس کے تجربے خود اُس کے ذاتی عمل کا نتیجہ ہوں۔ صرف اس قسم کے تجربے زندگی کا جزو بن سکتے ہیں۔

لیکن اس عالمگیر اصول کے علاوہ کچھ نفسیاتی چیزیں ایسی بھی ہیں جو فطرت نے ہر بچّے کو عطا کی ہیں۔ ہر بچّہ صرف انہیں فطری صلاحیتوں کی وجہ سے بچہ ہے۔ اور یہی فطری قوتیں اُس کی نشوونما، ترقی اور تربیت میں مدد دیتی ہیں۔ پہلی جبلت جس کا مختصر طور پر ذکر کر دیا گیا ہے 'عمل کا شوق' ہے۔ ہر بچہ چاہتا ہے کہ وہ برابر کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔ کھانا کھاتے وقت، سونے کے لئے پلنگ پر جاتے وقت، پڑھتے وقت، یا اسی قسم کے کسی ضروری شغل میں مصروف ہونے کے باوجود بھی اُس کا دماغ کسی نئی شرارت کے خیال میں ڈوبا رہتا ہے۔ بچوں کی شرارت اُن کے ذوقِ عمل کی تکمیل کا دُوسرا نام ہے، یہ چیز بچے کی فطرت ہے۔ اگر کوئی اُسے ایسا کرنے سے روکتا ہے تو وہ فطرت کے راستے میں رُکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ اس لئے تعلیم کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ وہ بچے کو جسمانی اور دماغی عمل میں شریک ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع دے۔

دوسری جبلت جس کا تعلق کسی حد تک پہلی سے ہے اُس کا 'ذوقِ تعمیر' ہے۔ ہر بچہ کچھ نہ کچھ بنانا چاہتا ہے۔ مٹی کے گھروندے کیچڑ کے کھلونے، آٹے کی گوریاں، کاغذ کی ناؤ، سیاہ کوئلے کے نقش و نگار، غرض اُس کے لئے کچھ نہ کچھ بنانا بے حد ضروری ہے۔ فطرت اُسے مجبور کرتی ہے تو وہ ایسا کرتا ہے۔ اس لئے معلّم کا فرض ہے کہ بچے کی اس فطرت کو زیادہ سے زیادہ اپنے اظہار کا موقع دے۔

بچہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے، وہ کچھ نہ کچھ بنانا چاہتا ہے لیکن ان دونوں باتوں کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اُس کے ہر عمل میں اُس کی ہر تجویز میں، اُس کی ہر تعمیر میں، اُس کے ہم جنس شریک ہوں، یہ اُس کی فطرت کا تیسرا جزو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وُہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اُسے فکر و عمل میں آزادی ہو۔ وہ جو کچھ سوچے، اور جو کچھ کرنا چاہے اُس میں کوئی شخص رُکاوٹ نہ ڈالے۔

اب تک ہمارے مدرسے نے ان سب باتوں کو اچھی طرح محسوس نہیں کیا ہے۔ وہ فطرت کے راستے سے الگ رہ کر چل رہا ہے اور اسی لئے دُنیا میں روز بروز ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو دنیا سے بیزار نظر آرہے ہیں، جو دُنیا کو اپنے لئے اور اپنے آپ کو دُنیا کے لئے موزوں نہیں پاتے۔ اس لئے اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم مدرسوں کی بنیاد فطرت کے ان چند اصولوں پر رکھیں۔ مدرسے کو ایک ایسا ماحول بنادیں جس میں زیادہ سے زیادہ عمل، تعمیر اور مسرت کے موقع حاصل ہوں۔ جہاں بچہ کھیل سکے، اپنے ہمجولیوں سے اشتراکِ عمل کرسکے، کام کی چیزیں بنا سکے اور اپنی فطری قوتوں کو ترقی دے سکے اور سب سے زیادہ یہ کہ وُہ اُس کی فضا میں آزادی کی لہریں دوڑتی ہوئی دیکھے۔

لیکن یہ کہنا کہ مدرسوں نے اب تک اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا ہے، صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اب سے صدیوں پہلے سے مفکرین تعلیمی اہمیت کو محسوس کرتے رہے ہیں اور اس لئے ہر شخص نے اپنے نظریے کے مطابق تعلیم کے مقاصد بنائے، اور چاہا کہ دُنیا کی تعلیم انہیں مقاصد کے سہارے پر چلے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ تعلیم کا مقصد انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر اور اُس کی نشوونما ہونا چاہئے۔ کسی کے خیال میں تعلیم کا مقصد یہ رہا کہ بچے کو زندگی کی کشمکشوں کے لئے تیار کیا جائے۔ اور شروع سے اب تک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ عموماً مفکرین نے انہیں دو مقاصد پر زیادہ زور دیا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں مقاصد میں سے ایک بھی بجائے خود مکمل نہیں۔ صرف انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر و نشوونما سوسائٹی کے لئے کام کی چیز نہیں۔ انسان فطرۃً معاشرتی ہے اس لئے وہ اپنی ایک دُنیا الگ بنا کر نہیں رہ سکتا دوسرا مقصد بھی بالکل محدود ہے تعلیم اگر انسان کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما میں مدد نہ کرے، بلکہ اُس کا مقصد صرف یہ ہو کہ وہ آدمی کو پیٹ بھرنے کے لائق بنادے۔ تو انسان اور دوسری مخلوقات میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ وحشی درندے بھی تعلیمی نعمتوں سے محروم رہنے کے باوجود پیٹ بھرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، پھر انسان کو ان تعلیمی زنجیروں اور بندشوں میں جکڑنے سے کیا فائدہ؟ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تعلیم کا مقصد نہ صرف انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر و نشوونما ہے اور نہ رزق کی فراہمی بلکہ مشترک طور پر دونوں باتیں۔ نظامِ تعلیم ایسا ہونا چاہئے جو انسانی نشوونما میں بھی مدد دے اور اُسے سوسائٹی کے لئے مفید بھی بنائے، وہ اپنے لئے بھی اچھا بن سکے اور دوسروں کے لئے بھی۔

ان سب مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ہمیں دیکھنا ہے کہ ہماری تعلیم میں کون سی کمی ہے جسے پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلی بات جس کا ہم ذکر کرچکے یہ ہے کہ ہماری تعلیم فطرت سے دُور ہے۔ فطرت انسان کو جو سبق سکھاتی ہے، مدرسے اُس سے بالکل اُلٹے راستے

پر چلتے ہیں۔ فطرت نے بچوں میں جو صلاحیتیں پیدا کی ہیں تعلیم اُن سے فائدہ اُٹھانے کی ضرورت نہیں محسوس کرتی، اور اس لئے اُس کے نتائج مُہلک ہیں۔ نہ بچوں کی فطری قوتوں کی صحیح نشوونما ہوتی ہے اور نہ وہ آئندہ زندگی کی کشمکشوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مدرسوں میں 'دستکاریوں' کی تعلیم ہو۔ ہر بچہ اپنی ضرورت اور دلچسپی کے مطابق جس 'دستکاری' میں چاہے حصّہ لے۔ اور فطرت کے راستے پر چلتا ہوا زندگی کی منزلوں کو آسانی سے طے کرسکنے کے قابل ہو سکے۔

بچوں کی انفرادیت اور شخصیت کو صحیح نشوونما کا موقع صرف اُسی صُورت میں مِل سکتا ہے جب اُنہیں عمل کا موقع دیا جائے جب اُن کی 'فطرتِ تعمیر' سیراب ہوتی رہے۔ جب اُنہیں فکر و عمل کی آزادی حاصل ہو، اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ہمجولیوں سے آزادی کے ساتھ مِل جُل سکیں۔ خود اُن کے کاموں میں شریک ہو سکیں، اُنہیں اپنے کاموں میں حِصّہ لینے کی دعوت دیں۔ عمل کا صحیح جذبہ انسان کے دل میں صرف اسی صُورت میں پیدا ہو سکتا ہے، جب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اُس میں دوسرے بھی شریک ہیں، اُس سے دوسروں کو بھی دلچسپی ہے، اُس میں دوسروں کا بھی فائدہ ہے۔ مِل جُل کر کام کرنے سے آدمی میں اتحاد، ہمدردی، محبت، رواداری، اعتماد کے بلند جذبات کے علاوہ اس بات کا صحیح احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ زندگی "اشتراکِ عمل" اور اس کے ساتھ ساتھ "تقسیمِ عمل" کا دُوسرا نام ہے۔ ہر کام کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی بے حد ضروری چیز ہے۔ اس جذبہ کا صحیح احساس اُس میں اعتمادِ نفس پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ کسی کام کا کونسا جزو ایسا ہے جسے وُہ سب سے زیادہ اچھی طرح کرسکتا ہے۔ اس سے اُسے سوچنے اور اپنی فطری قوتوں، صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی چیز کا نام ہے، انفرادیت کا احساس اور شخصیت کی ترقی۔ انفرادیت یا شخصیت کا پیدا ہونا، اُس کا احساس، ترقی اور نشوونما صرف اشتراکِ عمل کے بعد ممکن ہے۔ پُرانی تعلیم میں اس کے موقعے نہیں تھے اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مدرسوں میں "دستکاری" کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو۔ ہر بچہ جب تک یہ نہیں محسوس کرتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اُس کا مقصد کیا ہے، وہ اس کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکتا۔ "دستکاریوں" کی تعلیم سے ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ بچوں کو اپنی فطری قوتوں کی نشوونما کے ساتھ سوسائٹی میں اپنے صحیح درجے اور حیثیت کا احساس ہوگا۔ وہ یہ محسوس کریں گے کہ دُنیا کے نظام میں اُن کا بھی ایک خاص حصّہ ہے۔ یہ چیز انفرادیت کی ترقی کے لئے سب سے بڑا تازیانہ ہوگی۔

اب تک ہم نے "دستکاری" کی تعلیم کی اہمیت کو نفسیاتی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان دونوں حیثیتوں سے صرف "دستکاری" ہی کی تعلیم حقیقت میں فطری تعلیم ہے۔ لیکن ہر زمانے میں چیزوں کی اہمیت کا اندازہ، صرف فطرت، اخلاق اور النیات کے اصول کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی 'عمل' کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز اُس وقت تک باقی رہنے کا حق نہیں رکھتی جب تک وہ عملی حیثیت سے بھی 'افراد' اور سوسائٹی دونوں کے لئے مفید نہ ہو۔ زمانے کی کشمکش یہ چاہتی ہے کہ ہر شخص کو اُس میں حِصّہ لینے کی صلاحیت اور قوت حاصل ہو، ہر شخص اس قابل ہو سکے کہ نہ صرف وہ دوسروں پر بار نہ ہو، بلکہ دوسروں کو سہارا

بھی دے سکے۔ جن میں زندگی کی تگ ودو میں حصہ لینے کا سکت نہیں، وہ اس کے سہارے پر اس راستے کو طے کرتے رہیں۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ زندگی کی پیچ در پیچ زنجیریں ہر شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ اس کے ہر شعبہ کا ماہر ہو سکے۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور سماجی زندگی کے تعلقات کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتیں بھی بڑھتی اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں اس لئے کوئی شخص اکیلا ان گتھیوں کو نہیں سُلجھا سکتا۔ مختلف لوگوں کو مختلف کام کرنے پڑیں گے۔ ایک کا کیا ہوا کام دوسرے کے کام آئے گا اور اس طرح زندگی ہموار اور آسان بنے گی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے بھی ضروری ہے کہ "دستکاریوں" اور "پیشوں" کو ہماری تعلیم میں اہمیت حاصل ہو۔ انسان خود اپنے لئے بھی کچھ کرے اور اس سے زیادہ دوسروں کے لئے۔ ہر شخص کے دل میں اپنا مخصوص کام کرتے وقت یہ خیال ہو کہ وُہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ اس کا حصہ ہے، جس میں ساری سوسائٹی کو کچھ نہ کچھ ملے گا۔ اُس کے کاموں میں 'خود غرضی' کا نہیں بلکہ "قومیت" کا جذبہ جلوہ فرما ہونا چاہئے۔ یہ جذبہ کام کرنے والوں میں صرف مدرسے پیدا کر سکتے ہیں۔ جہاں اُنہیں اُن کی مخصوص ذہنیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق، آزادی سے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جُل کر کام کرنے کا موقع ملے۔ وہ ہمدردی، محبت، روا داری اور بھروسے کا سبق سیکھ کر مدرسوں سے نکلیں اور آئندہ زندگی کی جدّ وجہد میں شریک ہو کر انسانی خدمت میں حصّہ لیں۔

تعلیم کا سب سے پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر شخص کو اپنی فطری صلاحیت کے مطابق کام کے انتخاب کا موقع دے، تاکہ وہ اپنی فطری قوتوں کو ترقی دے کر اُنہیں مُلک اور قوم کی خدمت میں لگا سکے۔ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ ہماری تعلیم کی تقسیم "دستکاریوں" اور "پیشوں" کی بنا پر ہو۔

اب تک "دستکاریوں" اور "پیشوں" کی اہمیت کے متعلق جو کچھ کہا گیا، ممکن ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ مدرسوں میں ان کے رائج کر دینے کے بعد زندگی 'بےکیف' اور بدمزہ ہو کر رہ جائے گی۔ ہر شخص ایسے کام میں مصروف ہو گا جس میں کسی رومانی جذبہ کو اُبھرنے کا موقع تک نہ مِل سکے گا۔ زندگی کی دلکشیاں مفقود ہو جائیں گی۔ یہ خیال ممکن ہے سوچنے والوں کو صحیح معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقت میں اس سے زیادہ بے بُنیاد خیال کا تصوّر بھی محال ہے۔ اس لئے کہ "دستکاریوں" اور "پیشوں" کی تعلیم دیتے وقت سب سے پہلے تو اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ہر بچے کو فطری طور پر کس کام سے دلچسپی ہے۔ اُس کی فطری دلچسپی کا پتہ چلانے کے بعد جب اُسے کسی کام میں لگایا جائے گا تو پھر "بےکیفی" اور "بدمزگی" کا سوال ہی نہیں ہو گا۔ کوئی کام بجائے خود دلچسپ یا غیر دلچسپ نہیں ہوتا۔ یہ چیز بالکل اضافی ہے اور اس کا تعلق کم و بیش فطرت سے ہے۔ ایک کام مجھے پسند ہے کسی دوسرے کو نہیں تو اس میں نہ میری بدمذاقی ہے اور نہ کام کا کوئی قصور۔ فطرۃً ایک آدمی ایک کام کے لئے موزوں ہے اور دوسرا نہیں۔ فطرت کا تنوع بھی بڑی غنیمت چیز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی ایک عجیب معمّا بن کر رہ جاتی۔ سمجھ ہی میں نہ آتا کہ اسے کس طرح گزارا جائے۔ اس لئے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم فطرت کے اس تنوّع کو محسوس کریں اور ہر شخص سے صرف وہی کام لیں، جس کے لئے وہ فطرۃً سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس کا

ایک نتیجہ تو یہ ہوگا کہ کام کرنے والا اس کام میں کھیل کی سی دلچسپی لے گا۔ اُس کی قوتیں ترقی کریں گی۔ اُس کی مسرتوں میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اس انفرادی، یا شخصی فائدہ کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا نفع یہ ہوگا کہ سوسائٹی کے اشتراکِ عمل میں آسانیاں ہوں گی اُس کی رفتار میں رُکاوٹیں نہیں پیدا ہوں گی۔ سوسائٹی اور تمدن جتنا زیادہ ترقی کرتا جاتا ہے، وقت کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور اس لئے زمانہ کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر کام زیادہ سے زیادہ آسانی سے اور کم سے کم وقت میں ہو سکے۔ یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر شخص کو اُس کی دلچسپی کا کام ملے۔ وُہ اُس میں مہارت حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ آسانی سے اور کم سے کم وقت میں اُسے انجام دے سکے۔ وقت کی اس تیز دَوڑ میں جیتنے کی صرف یہی ایک ترکیب ہے۔

لیکن اب سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آخر اس بات کا پتہ کس طرح چلایا جائے کہ کسے کس کام، دستکاری یا پیشے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے اگر بچوں سے اس کے متعلق پوچھ کر صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے گی تو اکثر صورتوں میں ناکامی ہوگی بچوں کو خود اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ انہیں واقعی کس کام سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔ ان دقتوں کو محسوس کرکے انگلستان جرمنی، امریکا اور آسٹریلیا وغیرہ میں اس طرح کی جماعتیں کافی تعداد میں ہیں جو مختلف طریقوں سے بچوں کی فطری دلچسپیوں کے متعلق صحیح نتائج پر پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بچوں کی گھریلو زندگی، مدرسے کے رجحانات، امتحانوں کے نتائج اور دُوسرے نفسیاتی تجربات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کون سا بچہ کس کام یا پیشے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے اور اس کے بعد اُسے اسی قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور تعلیم کے بعد اُسی طرح کی ملازمت یا پیشے کے حاصل کرنے میں اس کی مدد کی جاتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کی کوششوں کے بعد بچوں کو زندگی کے جن مشاغل کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اکثر صورتوں میں وہ اُن میں امتیازی حیثیت حاصل کرتے ہیں۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مدرسے صرف "کتابی مدرسے" نہ رہیں بلکہ ایسے مرکز بن جائیں جہاں بچے کام کرنا سیکھیں، اُن میں عمل کی قوتیں پیدا ہوں، وہ اپنے ہر عمل کو "سماجی مفہوم" دینے کے قابل ہو جائیں۔ وُہ اپنے ہر کام کو اس نظر سے دیکھیں کہ اس میں قوم، مُلک اور عام انسانوں کی بھلائی ہے۔ مدرسوں کی زندگی بچوں کو فطری معلوم ہو۔ اپنے گھر اور سماج کی زندگی اور مدرسے کی زندگی میں اُنہیں تضاد نظر نہ آئے۔ وُہ یہ سمجھیں کہ جو کچھ اُنہوں نے گھروں میں دیکھا ہے اُسے وہ مدرسے میں سیکھ رہے ہیں اور جو کچھ وہ مدرسے میں سیکھ رہے ہیں وہ سماجی زندگی میں کام آئے گا۔ اُن میں "حکومت" کا نہیں بلکہ "خدمت" کا جذبہ بیدار ہو۔ وہ مل جُل کر کام کرنے کے عادی بنیں۔ جو ایک کام کرے، اس میں دوسرا اُس کی مدد کرے۔ ایک کی غلطی کی اصلاح دوسرا کرے اور غلطی کرنے والا اُسے خوشی سے مان لے۔ خود غرضی کا جذبہ فنا ہو کر قومی اور مُلکی بن جائے۔ ہر شخص یہ محسوس کرے کہ ہر کام میں اس کی غرض عام انسانوں کی دلچسپی اور بہبودی ہے۔ مغرب کے مدرسوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے اور اس سے بچے اور بڑے، قوم اور مُلک ہر ایک کو فائدہ پہنچ رہا ہے کوئی

وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارا ملک بھی اگر ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے نظامِ تعلیم کو ترتیب دے تو اس سے زندگی کی دشواریاں اور افسردگیاں کم نہ ہو جائیں۔

اس قسم کی تعلیم کا نصاب پر، طریقۂ تعلیم پر، امتحانوں پر لازماً گہرا اثر پڑے گا اور ممکن ہے کہ سوچنے والوں کو یہ بات کسی قدر دشوار نظر آتی ہو لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ جن ملکوں میں یہ طریقہ رائج ہے وہاں ہر چیز نہایت کامیابی کے ساتھ اس کے مطابق بنا لی گئی ہے۔ اور کوئی چیز بھی غیر فطری نہیں معلوم ہوتی۔ اِس لئے ہم اس جگہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔

لیکن مضمون ختم کرنے سے پہلے، ایک بات کا اظہار کسی قدر ضروری معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ "دستکاری" یا "پیشوں" کی تعلیم کو اپنا مقصد بنا لینے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مدرسے سے نکلنے والے بچے صرف "دستکار" یا "کاریگر" یا کسی خاص پیشے کے ماہر ہو کر نکلیں ملک کے ہر گوشے میں لوہار، بڑھئی، کپڑا بُننے والے، کسان غرض ہر قسم کے پیشہ ور موجود ہیں جو ہمیشہ سے لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ مدرسے اس بار کو اپنے سر لیں۔ جس طرح یہ کام اب تک ہوتے چلے آئے، اب بھی ہوتے رہیں گے۔ اگر مدرسوں کا مقصد صرف اس قسم کے "دستکار" اور "کاریگر" بنانا ہے تو مدرسوں پر اتنا روپیہ خرچ کرنا فضول ہے۔ اگر واقعی مدرسے صرف ایسے ہی ہو کر رہ جائیں جیسا کہ اعتراض کرنے والوں کا خیال ہے تو اُن کے ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے ایسے مدرسوں کی جو "دستکاریوں" اور "پیشوں" کی تعلیم دینے کے ساتھ بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی کریں۔ اُن میں خدمت کا صحیح جذبہ، رواداری، ہمدردی، محبت اور ایثار پیدا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک وسیع انسانی جماعت کا ایک ایسا فرد سمجھیں، جس کا کام قومی اور ملکی فلاح اور بہبود میں حصّہ لینا ہو۔ اُن میں اپنے ملک کی قدیم روایات کا احترام اور سچی محبت ہو۔ وہ اپنی زندگی کو ملک و ملّت کے قدیم تمدن کی ایک کڑی سمجھیں۔ اُن کا ہر کام اُن کے نزدیک قومی و ملّی خصوصیات اور روایات کا آئینہ دار ہو —— ان سب باتوں کے لئے ضرورت ہے کہ ملکی تاریخ اور ادب کا سرمایہ اُن کی تعلیم کا ایک خاص جزو ہو۔ مادری زبان پر عبور حاصل کر کے وہ اپنے تمدن کے ان آئینہ خانوں کی سیر کر سکیں۔ اسی میں ابدی سُرور اور قومی زندگی کا راز ہے۔

سیّد وقار عظیم ایم۔ اے

چھوٹی سی تُم

(۱)

چھوٹی سی دُنیا
چھوٹا سا سُورج
چھوٹا سا میں
اور چھوٹی سی تم

(۲)

چھوٹی سی جنّت
چھوٹا سا رضواں
چھوٹا سا ئیں
اور چھوٹی سی تُم

الف۔ ایم۔ ساقی



وفاؤں کو میری بُھلا دینے والے

فلک رس تخیّل کا لے کر سہارا
تجھے رات بھر چاند تاروں میں ڈھونڈا

دھڑکتے ہوئے دل کو ہمراہ لے کر
تصوّر کی رنگیں بہاروں میں ڈھونڈا

جھجکتے، جھجکتے، خراماں، خراماں
ہوا کی طرح مرغزاروں میں ڈھونڈا

تڑپ برق نے جس گھڑی دل کو دیدی
اُبھر کر تجھے ابر پاروں میں ڈھونڈا

جنونِ محبّت سے مجبور ہو کر،
بپھرتی ہوئی آبشاروں میں ڈھونڈا

کبھی سر پٹکتا پھرا گلستاں میں
کبھی کہکشانی بہاروں میں ڈھونڈا

غرض اپنی حیران نگاہوں سے ہر سُو
تجھے حُسن کے رہگزاروں میں ڈھونڈا

نظر حیدر آبادی

بُدھ کا سوئمبر

جب کوئی چارہ کارگر ثابت نہ ہُوا تو راجہ نے اپنے تمام وزیروں کو بُلایا اور کہا کہ کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس سے راجکمار سدھارتھ سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لے اور اُن تمام لوازم سے بہرہ اندوز کیا جائے جو ایک راجہ کے شایانِ شان ہیں۔

ایک بوڑھے وزیر نے جواب دیا "جہاں پناہ! اس رُگ کی دوا محبّت ہی ہے۔ اس کے کنوارے دل پر عورت کی محبت کے ڈورے ڈالیئے۔ جسے آپ زنجیروں کے ساتھ نہیں جکڑ سکتے وہ دوشیزہ کے دامِ گیسو میں آسانی سے گرفتار ہو سکے گا۔ ایک جشن کا انتظام کیجئے۔ اس تقریب میں راجدھانی کی تمام پری چہرہ لڑکیاں شامل ہوں۔ شہزادہ ان کے درمیان انعام تقسیم کرے، اور جب وہ تخت کے نزدیک سے گزریں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ کس دوشیزہ کے حُسن نے شہزادے کی اُداس آنکھوں میں چمک پیدا کی ہے اِس طرح ہم محبت کی آنکھوں سے ہی انتخاب کر سکیں گے۔"

راجہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس جشن کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا۔ اور منادی کے ذریعہ سے تمام شہر میں اعلان کر دیا گیا۔

مقررہ دن پر کپل وستو کی راجکماریاں بڑی دھوم دھام سے آئیں۔ اپنے دلفریب ناز و انداز اور حُسن کی تمام رعنائیوں کے ساتھ جب وہ خوش وضع اور خوش قطع لباس میں ملبوس، آنکھیں جھکائے تخت کے نزدیک سے گزرتیں تو شہزادہ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی سوغات پیش کرتا۔ اس طرح ایک کے بعد دُوسری آتی اور سوغات حاصل کر کے واپس چلی جاتی۔ سب سے آخر میں راجکماری یشودھرا کی باری آئی۔ وہ آسمانی حُسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ مست چال، ہرن کی سی آنکھیں، بھولا بھالا چہرہ۔ اُس نے نظر بھر کر شہزادہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پُوچھا "کیا میرے لئے کوئی سوغات ہے؟" جس وقت یہ نیک بخت کماری نزدیک پہنچی تو شہزادہ کی نظروں میں ایک خاص انداز کی تبدیلی نے درباریوں کو چونکا کر دیا۔

شہزادے نے جواب دیا "تحفے تو ختم ہو گئے ہیں مگر پھر بھی پیاری بہن آپ یہ لیجئے" یہ کہتے ہوئے شہزادے نے اپنا ہیروں کا بیش قیمت ہار راجکماری کے گلے میں ڈال دیا۔ راجکماری نے مسکرا کر اپنے محسن کی طرف دیکھا بس ایک ہی نگاہ نے شہزادہ کو بسمل کر دیا۔

دربار برخاست ہونے کے بعد درباریوں نے تمام حالات راجہ کے سامنے بیان کر دیئے اور بتایا کہ کنور نے کماری کو اور کماری نے کنور کو جی بھر کے دیکھا ہے۔ راجہ نہایت خوش ہُوا اور حُکم دیا کہ خاص ایلچی کے ذریعہ سے کماری یشودھرا کے پتا سے شادی کی اجازت حاصل کی جائے۔

اُس زمانے میں سوئمبر کا رواج تھا اور ہر اُمیدوار کو مردانگی کے جوہر دکھانے کی دعوت دی جاتی تھی۔ شہزادی کے پتا نے بھی یہی شرط

پیش کی۔ یہ سُن کر راجہ کچھ غمگین ہُوا کیونکہ وُہ جانتا تھا کہ دیودت تیراندازی میں ارجن شاہسواری میں اور نندا شمشیرزنی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نسکارشی شہزادہ اس مقابلہ میں پورا نہ اُتر سکے گا۔ مگر شہزادہ نے آہستہ سے جواب دیا کہ مَیں ان تمام چیزوں سے واقف ہوں، آپ اعلان کر دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب ہُونگا۔ چنانچہ شہزادہ کی خواہش کے مطابق اعلان کر دیا گیا۔

ساتویں دن دُور اور نزدیک کے شہزادے سوئمبر کے میدان میں جلوہ افروز ہوئے اور راجکماری یشودھرا بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ باندیوں کے جھرمٹ میں، ہاتھوں میں پھولوں کی مالا لئے کر اس کے مقابلہ کو دیکھنے آئی۔ شاہی گھرانوں میں سے دیودت اُمیدوار تھا۔ ارجن اور نندا بھی امیر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تینوں اپنے مُلک کی جوانی کی بہار تھے۔ شہزادہ سدھارتھ اپنے سفید گھوڑے کنتک پر سوار ہو کر آیا۔

وقت ہو گیا اور حاضرین کی پُرشوق نگاہیں شہزادوں پر جم گئیں۔ سب سے پہلے نندا نے تیراندازی کے جوہر دکھانے کے لئے کہا۔ ایک ڈھول چھ کوس دُور رکھا گیا۔ ارجن نے بھی چھ کوس دُور رکھا۔ دیودت نے آٹھ کوس دُور۔ مگر شہزادہ سدھارتھ نے دس کوس دُور رکھنے کے لئے کہا جہاں سے ڈھول ایک چیونٹی کے مانند دکھائی دیتا تھا۔ نندا اور ارجن کے ڈھول چھد گئے مگر دیودت کا تیر آر پار ہو گیا۔ دیودت کے کمال کا شور مچ گیا۔ راجکماری یشودھرا نے اپنی سنہری ساڑھی کا آنچل آنکھوں پر کھینچا تاکہ شہزادہ سدھارتھ کے تیر کا نشانہ خطا ہوتے نہ دیکھ سکے۔

اب سدھارتھ کی باری تھی۔ شہزادہ نے کمان کی طرف جو چاندی کے تاروں سے کسی ہُوئی تھی دیکھا۔ اسے کوئی طاقتور بازو ہی اُٹھا سکتا تھا کنور نے آہستہ آہستہ مسکراتے ہوئے کمان اُٹھائی، اور ڈوری کو ہلکی سی جنبش دی مگر موٹا بید درمیان سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ شہزادے نے کہا "یہ کھیل نہیں کوئی ایسی کمان لاؤ جو بہادر راجاؤں کی شان کے مطابق ہو" ایک بولا "بھانو کی کمان لاؤ جو ایک عرصہ سے مندر میں پڑی ہوئی ہے، اور جسے کوئی بھی کھینچ نہیں سکا" آخر وہ پُرانی کمان لائی گئی۔ یہ سیاہ فولاد کی بنی ہوئی تھی۔ اور اُس کے کناروں پر سونے کے تار چڑھے تھے۔ ہرن کے سینگوں کا ایک نمونہ تھا۔ شہزادہ نے گھٹنوں پر رکھ کر دو دفعہ جانچا اور کہا "اب چلاؤ میرے دوستو!" مگر اس کمان کو نہ تو دیودت، نہ ارجن اور نہ نندا ہی جھکا سکے۔ آخر شہزادہ نے نیچے ہو کر کمان کو دبایا، ڈوری کو کھینچا۔ بالکل اس طرح آواز پیدا ہوئی جس طرح عقاب کے پروں سے ہوا تھرتھراتی ہے۔ پھر کنور نے ایک تیر چلایا جو فضا کو چیرتا ہُوا سب سے دُور رکھے ہوئے ڈھول میں سے گزر کر نظروں سے غایب ہو گیا۔

اس کے بعد دیودت نے تلوار چلانے کی دعوت دی۔ اور اس کے ساتھ ہی چھ انگشت موٹے درخت کو ایک ہی وار میں کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی طرح ارجن نے سات اور نندا نے نو انگشت گہرے وار کئے مگر شہزادہ سدھارتھ نے ایک ساتھ کھڑے دو تنوں کو ایک ہی وار میں اس صفائی سے کاٹ دیا کہ تنے بدستور اپنی جگہ کھڑے رہے۔ نندا نے شور مچا دیا کہ تلوار کی دھار خم کھا گئی ہے۔ شہزادی یشودھرا بھی تو ایک دفعہ تو کودمیں کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ مگر اچانک ہوا آئی اور دونوں کٹے ہوئے تنے نیچے گر پڑے۔

جب شمشیرزنی کا مقابلہ بھی ختم ہو چکا تو گھوڑے میدان میں لائے گئے۔ تین دفعہ میدان کے گرد چکر لگائے گئے۔ اور ہر دفعہ کنتک

تینوں سے بازی لے گیا۔ مگر نندا کی تسلی نہ ہوئی، اور اس نے کہا کہ کوئی ایسا گھوڑا لایا جائے جس پر کبھی سواری نہ کی گئی ہو۔

آخر ایک سیاہ گھوڑا لایا گیا، جو تین زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا، نہایت تُند اور خوفناک۔ اُس کے نتھنے چوڑے چوڑے تھے۔ نہ کوئی زین تھا، نہ رکاب اور نہ اُس پر کبھی سواری کی گئی تھی۔ نندا اور دیودت نے باری باری چڑھنے کی کوشش کی، مگر ہر دفعہ گھوڑے نے نیچے گرا دیا۔ ارجن صرف چند لمحوں کے لئے ہی بیٹھ سکا۔ زنجیریں کھولی گئیں تو جنگلی گھوڑے نے غصب اور غصّے کی حالت میں میدان کے گرد چکر لگایا۔ مگر اچانک پاؤں اُٹھائے اور ارجن کو مٹی میں لٹا دیا۔ اگر سائیس دَوڑ کر گھوڑے کو نہ سنبھال لیتا۔ تو ارجن کی زندگی ختم ہو چکی ہوتی۔ اب سدھارتھ کی باری تھی، لوگوں نے ہر چند منع کیا مگر کنور نے نہایت سنجیدگی سے کہا "اس کی زنجیریں کھول دو، سر کے بال مجھے پکڑا دو۔" کنور نے آہستہ سے بالوں کو پکڑا، سر ماتھے اور گردن پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا۔ جس وقت سدھارتھ سوار ہوا، گھوڑا بُت کی طرح خاموش اور بے حرکت کھڑا رہا۔ لوگ حیران تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سدھارتھ گھوڑے کا دیوتا ہے۔

اب مقابلہ ختم ہو چکا تھا۔ سدھارتھ کی قابلیت اور بہادری کا سکہ ہر خاص و عام کے دل پر بیٹھ گیا۔ کماری کے پتا سپربدھ نے کنور سے کہا "یہ ہماری خواہش تھی کہ آپ ہر طرح بہترین ثابت ہوتے۔ ہماری اُمید بر آئی ہے۔ اب آپ وہ خزانہ قبول کیجئے جو آپ نے حاصل کیا ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک دوشیزہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ ہاتھوں میں ہار لئے ہوئے، ماتھے پر سے سنہری گھونگٹ پرے ہٹایا۔ اس کے پیچھے چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ شہزادی راجکماروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی اُس جگہ پہنچی جہاں سدھارتھ گھوڑے سے اُتر کر قدرتی شان سے کھڑا تھا۔ گھوڑے کی مضبوط گردن اُس کے بازو کے نیچے جھکی ہوئی تھی۔ شہزادی نے کنور کو پرنام کیا۔ اور محبت کے پھولوں کا ہار سدھارتھ کے گلے میں ڈال دیا۔

لوگ بے پناہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اب شہزادی کا چاند سا چہرہ پھر گھونگٹ میں چھُپ گیا۔ اس کے بعد شبھ مہورت اور اچھے لگن دیکھ کر شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ شاہی رسم و رواج کے مطابق شادی کی خوشیاں منائی جانے لگیں۔ سونے کے تخت پر قالینیں بچھیں اور سہرے لٹکائے گئے۔ عطر، چاول قربان کئے گئے۔ دو تنکے زعفران کے دُودھ پر تیرائے گئے۔[1] راجہ نے دان کیا۔ مندروں کو جاگیریں بخشیں۔ پنڈتوں نے منتر پڑھے۔ آگ کے اِرد گرد پر کمّا دی گئی۔[2] تب راجکماری کے پتا نے شہزادہ سدھارتھ کو مخاطب کر کے کہا۔

"پیارے کنور! جو آج تک ہماری تھی، وہ اب تمہاری ہے۔ اس کے لئے نیک ثابت ہونا۔ یشودھرا کی زندگی اب تمہاری زندگی سے وابستہ ہو چکی ہے۔"

دیال سنگھ

---

[1] دو تنکے زعفران کے دودھ پر تیرائے گئے: اس کی تشریح یہ ہے کہ یہ ایک ہندوؤں کی رسم ہے جو شادی کے موقع پر منائی جاتی ہے۔ یعنی دودھ سے بھرے ہوئے برتن میں زعفران تیرایا جاتا ہے۔ دُودھ کو دُنیاوی سمندر اور زعفران کے تنکوں کو خاوند اور بیوی سے بڑا بہت دی جاتی ہے۔

[2] آگ کے ارد گرد پر کمّا دی گئی: اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب شادی ہونے لگتی ہے تو آگ کے ارد گرد چکر لگاتے ہیں۔ اس کو پنجابی میں "لاواں" کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی رسم ہے۔ کوئی ویدی کے اِرد گرد گھومتا ہے اور کوئی آگ کے اِرد گرد۔ مختلف لوگوں کے مختلف رواج ہیں۔

غزل

ہزار عیب نکالے گی عقلِ بیگانہ
متاعِ ہوش نہیں درخورِ صنم خانہ

جنابِ شیخ کی حجت خلافِ میخانہ
جو سعیِ خام میں اُلجھا رہے وہ دیوانہ

کسی کی مست نگاہوں سے لڑ رہی ہے نظر
برس رہا ہے مرے دل پہ کیفِ پیمانہ

جنہیں نصیب نہیں دردِ ہجر اُن میں سے
خدا کسی کو نہ لے جائے سوئے میخانہ

وہ پھر رہا ہے نظر میں، رواں ہیں آنسو بھی
بنا ہے ساحلِ گنگا کے ساتھ بُت خانہ

نہیں ہے عام ابھی رمزِ خود فراموشی
بہت وُہ ہیں جو سمجھتے ہیں مجھ کو دیوانہ

یہ مانتا ہوں کہ ساقی نہیں حسین، مگر
مجھے یہ کہہ نہیں بنتا۔ اِدھر بھی پیمانہ

نظر کو حسنِ ازل سے دوچار ہونے دے
قدم قدم پہ نظر آئے گا پری خانہ

بھرا ہے شادؔ اچھوتے خیال سے عالم
شرابِ ناب سے خالی نہیں ہے مے خانہ

شادؔ عارفی

چند نئے الفاظ

یوں کہنے کو اُردو میں ایک دو نہیں دس بیس زبانوں کے الفاظ داخل ہیں لیکن نظرِ حق بیں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ اردو کی تشکیل و تدوین درحقیقت بھاشا اور فارسی کی رہینِ منت ہے اور یہی وجہ تھی کہ اس عصرِ تراجم میں بھی تھی یا یہ اُردو کی نظریں فطرۃً بھاشا اور فارسی کی طرف اُٹھیں اور ناکام واپس آئیں۔ بھاشا کا دامن جدید مصطلحات سے تقریباً خالی تھا، پھر ستم یہ کہ مترجمین نے دانستہ یا نادانستہ سنسکرت کی ثقیل ترکیبوں کی آڑ لی اور یہ ترکیبیں اُردو والوں کے لئے غیر مانوس تھیں۔ رہی فارسی تو ایرانیوں نے بیسویں صدی کے آغاز تک فرنگی الفاظ کو بجنسہٖ داخلِ زبان کرنا مناسب سمجھا (مثلاً بانک، اسانوبوم، آتومبیل وغیرہ) اور جب انہوں نے جدید الفاظ وضع کئے تو ہندوستانیوں کو یہ سوچنا پڑا کہ انگریزی کے رچے پھدسے گھلے ملے الفاظ کو فارسی لطافت کی قربان گاہ پر قربان کرنا مناسب ہوگا یا نہیں؛ شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا عبدالحق صاحب زادمجدہ نے اپنی لغت میں ان انگریزی الفاظ کے مقابل جو ہماری زبان میں رچ گئے ہیں کوئی مفرد فارسی یا اُردو لفظ نہیں لکھا بلکہ وہی الفاظ اُردو رسمِ خط میں تحریر فرما دیئے لیکن سوال یہ ہے کہ ایشیا کے اس دورِ بیداری میں جبکہ ہر ایشیائی قوم اس سعی میں سرگرم ہے کہ مغربی زبانوں کے الفاظ کے بجائے نئے الفاظ وضع کئے جائیں ہم ادائے مطالب میں کب تک ایک مغربی زبان کے محتاج رہیں گے؛ پھر اگر جلد یا بدیر ہم کو انگریزی الفاظ ترک کرنا ہیں اور بدقسمتی سے کوئی ایسی ادبی انجمن بھی موجود نہیں ہے جس کے وضع کردہ الفاظ سب لوگوں کے لئے قابلِ تسلیم ہوں تو ان الفاظ کے بجائے فارسئ جدیدہ کے مفرد الفاظ کیوں نہ استعمال کئے جائیں جن سے ہمارے کان ناآشنا سہی ہماری زبان کے قواعد ناآشنا نہیں ہیں۔

میں آج کی صحبت میں ۱۳۵۷ھ کے سالنامۂ پارس سے چند ایسے الفاظ کا ترجمہ نقل کرتا ہوں جن کے لئے ہماری زبان میں کوئی مفرد یا مرکب لفظ موجود نہیں ہے اور اُن کے ثقیل یا لطیف ہونے کا فیصلہ سلیم الطبع حضرات کے ذوقِ سلیم کے لئے چھوڑتا ہوں:۔

آب بہا	Water Tax	بانک دار	Banker
آتش نشانی	Fire Brigade	بیمارستانِ شہر	Municipal Hospital
آمار	Statistics	پاسبان[1]	Supdt of Police + Police Commission
آمارشناس	Statistician	پروانہ	License
آئین	Etiquette	تن پیمائی	Anthropometry
اعتبار نامہ	Letter of Credit	دانش جو	Research Scholar
انگشت نگاری	Dactyography	دو فلزی	Bimetalism
انجمن شہرداری[1]	Municipality	شہربانی	Police Department
بارآور	Productive Capital	شہردار	Chairman of Municipal Board
بازبین	Controller	گزرنامہ	Passport
بازرس	Inspector		

طالب صفوی

[1] اُردو میں خواص میونسپلٹی کو بلدیہ کہتے ہیں۔ اب بیرخانۂ فرہنگستانِ ایران کی ہدایت کے مطابق فارسی میں میونسپلٹی کو انجمن بلدی کے بجائے انجمنِ شہرداری کہا جاتا ہے اور یہ یقیناً بہتر ہے۔ انجمنِ بلدی ڈسٹرکٹ بورڈ کو کہا جا سکتا ہے۔

تصوّر

تصوّر اے تصوّر رحم فرما ہم غریبوں پر
اُداسی سی اُداسی چھا رہی ہے غم نصیبوں پر

بس اتنا ہو جوانی لمحہ بھر کو مُنہ دکھا جائے
ہماری جاگتی بے چینیوں کو نیند آ جائے

کہیں شاداب ٹیلوں کے کنارے سو رہے ہوں ہم
فضا میں شعر بہ سُو گیتوں کی کھیتی بو رہے ہوں ہم

جگر کو تھام کر دھیمے سُروں میں گا رہے ہوں وُہ
تمنّاؤں کو ٹھکرا کر مری چھپتا رہے ہوں وُہ

کہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آنسو بہا دیں ہم
کہیں باہوں میں باہیں ڈال دیں اور مُسکرا دیں ہم

کہیں ہم پھول بن کر کھل رہے ہوں لالہ زاروں میں
کہیں بیباکیاں کرتے نظر آئیں بہاروں میں

کہیں ہم لڑکھڑاتے پھر رہے ہوں شاہراہوں پر
نہا کر دھر رہے ہوں وُہ کہیں احسان نگاہوں پر

کہیں زلفوں سے باندھا جا رہا ہو میری باہوں کو
کہیں ہنس ہنس کے روکا جا رہا ہو میری آہوں کو

تصوّر اے تصوّر رحم فرما ہم غریبوں پر
اُداسی سی اُداسی چھا رہی ہے بد نصیبوں پر

الطاف مشہدی

ہندوستان کی قومی زبان

کیا اُردو ہندی کا مسئلہ واقعی ایک فرقہ وارانہ سوال ہے[1]؟

ہندوستان کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ اِس بدنصیب مُلک میں اب ہر چیز پر ہندو یا مُسلم کا لیبل چسپاں ہونے لگا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعت الگ ہندوؤں کی سیاسی جماعت الگ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے جُدا ہندوؤں کے تعلیمی ادارے جُدا کون حسّاس ہندوستانی ہوگا جسے ریلوے سٹیشن پر "ہندو روٹی" اور "مسلمان گوشت" کی دلخراش صدا سُن کر دلی صدمہ نہ پہنچتا ہو؟ سیاست، تعلیم اور معاشرت کو مسخ کرنے کے بعد فرقہ پرستی کے زہریلے سانپ نے اب زبان کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ سیدھے سادھے ہندوؤں کی ایک زبردست اکثریت کو اِس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان نہیں بلکہ محض مسلمانوں کی زبان ہے۔ اور اس لحاظ سے قطعاً بدیشی۔ اِدھر بعض مسلمان اِس وہم میں ہیں کہ ان کا تمدّن اور مذہب اُردو زبان سے وابستہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ جاتی کی نجات اسی بات میں ہے کہ بدیشی اُردو کو بھارت ورش سے نکال کر ہندی کو راشٹریہ بھاشا بنایا جائے اور جب زمانے کی تیز رفتاری کے باعث انہیں اپنے مقصد میں صاف اور صریح ناکامی ہوتی دکھائی دیتی ہے تو وُہ پریشانی اور اضطراب کے عالم میں پُکار اُٹھتے ہیں "اب ہندوؤں کا کیا بنے گا"! اس کے برعکس مسلمانوں کے ایک خوش اعتقاد گروہ کا خیال ہے کہ اگر اُردو میں عربی اور فارسی کے ثقیل اور ناقابلِ فہم الفاظ کی بھرتی نہ کی گئی تو اسلامی تمدّن کو زبردست نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ دونوں اقوام کی اِس ذہنیت نے اُردو ہندی کے مسئلہ کو بھی ایک فرقہ وارانہ سوال بنا کر ہماری قومی اُلجھنوں میں ایک اور پریشان کُن اضافہ کر دیا ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ غلطی پر ہیں۔

اُردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں۔ نہ کبھی ہوئی تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ اسے ہندوؤں پر مسلمانوں سے کہیں زیادہ حق حاصل ہے۔ مسلمان جب اوّل اوّل ہندوستان میں آئے تو ان کی مذہبی زبان عربی اور تمدّنی زبان فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ہندو مسلمانوں کا میل جول شروع ہُوا تو روزمرّہ کے استعمال کے لئے ایک ایسی زبان معرضِ وجود میں آئی جس میں اگرچہ عربی فارسی کے الفاظ بھی شامل تھے لیکن جس کی بُنیاد ہندی پر تھی۔ اس کے قواعد اور اس کے اکثر الفاظ ہندی الاصل تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ آپ کی مزید سمع خراشی کی ضرورت نہیں، کیونکہ اُردو ادب اور زبانِ اُردو کی تاریخ کا معمولی طالب علم بھی نانک، کبیر، تلسی داس، نسیم، سرشار، پیارے لال، سرور، سری رام، چکبست اور پریم چند کے کے ناموں سے

لہ یہ مضمون یومِ اُردو کے لئے (جو ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو انجمنِ اُردو پنجاب کے ماتحت منایا گیا) لکھا گیا تھا لیکن وہاں پڑھا نہ جا سکا۔

واقف ہے اور ان احسانوں کا معترف ہے جو ان بزرگوں نے اُردو زبان پر کئے۔ اس سلسلے میں مَیں اُردو کے ایک جلیل القدر ہند وادیب کی ایک تقریر کا اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری مُراد علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"ہماری اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم وتدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے۔ یہ تنظیم سلطان اور رعایا، حاکم اور محکوم، افسری اور ماتحتی کی لم سے مبرا ہے۔ وُہ ایک مبارک ثمر تھا اُس ادبی کل برکش اور طُوبیٰ کے پیوند کا، جو قدرت نے ہندوستان کی سرزمین پر بھیجے۔ یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا۔ رواداری نے اس کو تہذیب و تمدن کے امرت سے سینچا اور شائستگی نے اس کی ضروری شاخ تراشی کی۔ حسن سلیقہ اور شعور نفسیاتی نے موافق ہوا مہیا کی۔ تب یہ قلمی پودا پروان چڑھا اور پھُولا پھلا۔ اب انہیں باغبانوں کی نسلیں اگر اس سرسبز نونہال کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا چاہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ کیا بات ہے؟"

اُردو سے ہندوؤں کا یہ تعلق کچھ اس زبان کے ابتدائی زمانہ تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندو ہمیشہ اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ منشی شنکر دیال فرحت، منشی رام سہائے تمنا، جناب خوشتر اور کئی دوسرے ہندو شعراء نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم وغیرہ مذہبی کتابیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ بہت سے اُپنشد، سارے کے سارے شاستر اور اُردو سمرتیاں اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں، ابھی تک ہندوؤں کی سب سے زبردست اور دُنیا کی ایک عظیم الشان فلسفیانہ کتاب بھگوت گیتا کے بیسیوں اڈیشن ہر سال اُردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت کہ ہندوؤں نے اپنی بے شمار مذہبی اور اعتقادی کتابیں اُردو میں لکھی ہیں، یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اُردو ہندی کا موجودہ ناخوشگوار قضیہ دراصل ایک ہندو مسلم سوال نہیں اور اہلِ غرض نے بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر اس خالص لسانیاتی مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگت دے دی ہے۔

آج سے پچاس برس اُدھر اُردو کے مقابل میں کسی نے ہندی کا نام بھی نہ سُنا ہوگا۔ اس زمانہ میں بڑے سے بڑے جاہل ہندو کو بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ بے چاری ہندی بھی ہندوستان کی قومی زبان ہوسکتی ہے۔ ہمارے محترم بزرگ پنڈت مدن موہن مالوی جی نے جن کے ہندوستان پر بے شمار احسانات ہیں پہلی بار ہندوؤں کو یہ یاد دلایا کہ ہندو ہونے کی حیثیت سے انہیں اُردو سے جو غیر ملکی اور ملیچھ مسلمانوں کے تعلق کے باعث خود بھی غیر ملکی اور ملیچھ ہے کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہئے۔ ان کی قومی زبان ہندی ہے جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے اور چونکہ ہندوستان کے اصل وارث ہندو ہی ہیں اور اس ملک میں اکثریت بھی انہیں کو حاصل ہے اس لئے انصاف اور جمہوریت کے اصُولوں کے پیشِ نظر ہندوستان کی قومی زبان بھی ہندی بحروفِ ناگری میں ہی ہوسکتی ہے۔ مالوی جی کے عقیدت مندوں نے ان سے یہ بات سُن کر گرہ میں باندھ لی اور اُس وقت سے لے کر اب تک اُردو کو مٹانے اور ہندی کو آگے بڑھانے کے لئے ہر ممکن اور ہر جائز وناجائز کوشش کی گئی ہے اور یہ ناقابلِ تحسین سعی ابھی تک جاری ہے۔ اُردو ہندی کے خود پیدا کردہ قضیہ کو ہندو مسلم سوال بنا دینا بھی اسی مذموم جدّوجہد کی ایک کڑی ہے۔

یہ جدّ وجہد۔ اور یہ کوشش چونکہ غیر فطری ہے اس لئے ہندی کے حامی سرمائے قوت اور پروپیگنڈے کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود اپنے اس مشن میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ایک طرف ہندی کے کارکنوں کا ایک لشکر جرار ہے جس میں گاندھی جی اور بابو راجندر پرشاد ایسے فیلڈ مارشل اور جرنیل سے لے کر مہاشے گلگئی جیسے رنگروٹ تک شامل ہیں۔ سیٹھ جمنا لال بجاج اور سیٹھ برلا ایسے سرمایہ داروں کے خزانے اس لشکر کے لئے وقف ہیں۔ پروپیگنڈے کے لئے ان کے پاس ایک مضبوط پریس موجود ہے۔ اس کے برعکس اردو کی یہ حالت ہے کہ اس کی نہ کوئی تنظیم ہے اور نہ اس کے پاس کوئی کارکن ہیں۔ اردو کی جو ایک آدھ انجمن کسی صوبہ میں کوئی کام کر رہی ہے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ پریس اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو بہت کمزور۔ رہی لیڈروں کی سرپرستی تو وہ مسلمان جنہیں زبردستی اس مشترکہ زبان کا واحد اجارہ دار بنایا جاتا ہے ان کے سب سے بڑے لیڈر جناح صاحب تو اردو جانتے ہی نہیں۔ دوسرے کیمپ میں سب سے مقتدر ترین شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے، وہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے رکن ہونے کی حیثیت سے "ہندی اتھوا ہندوستانی" کی حمایت پر مجبور ہیں۔ لیکن اس بے سروسامانی کے باوجود قدم ہمیشہ اردو ہی کا آگے اٹھتا ہے اور ہندی کو ہر محاذ پر شکست ہو رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اردو واقعی ایک غیر ملکی زبان ہے تو ہندوؤں پر اس کا انکشاف اتنے عرصے تک پہلے کیوں نہ ہوا؟ اگر ہندی کے ساتھ ہندوؤں کا قومی مستقبل وابستہ ہے تو یہ راز ہندوؤں پر آج ہی کیوں ظاہر ہوا ہے؟ اگر راشٹریہ بھاشا کے لئے دیوناگری رسم الخط ہی دھرم کی رکھشا کا ضامن ہے تو ہندوؤں کو پہلے کیوں اس کا پتہ نہ چلا؟ آج سے بیس برس پہلے ہندوؤں کے بڑے بڑے اکابر اردو زبان کو اپنی تقریر و تحریر میں اظہار خیال کا ذریعہ بنایا کرتے تھے۔ مہاتما ہنسراج کا وہ خط پڑھئے جو انہوں نے آج سے پچیس برس پہلے ڈی اے وی کالج لاہور کی مینجنگ کمیٹی کو اپنے استعفا کے ساتھ بھیجا۔ وہ خط ہندی میں نہیں بلکہ صاف و رشستہ اردو میں ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش بھی ہے۔ لالہ لاجپت رائے آنجہانی ہندو سنگھٹن کے زبردست حامیوں میں سے تھے مگر انہوں نے بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں رسالہ زمانہ کانپور میں جو مضامین لکھے ہیں ان کی زبان ملاحظہ فرمائیے۔ اور تو اور خود بھارت بھوشن مالویہ جی اُن دنوں اردو زبان میں شعر کہا کرتے تھے، اپنی فارسی دانی سے تو شاید وہ اب بھی انکار نہ کر سکیں کیونکہ پڑھے ہوئے کو بھلانا بہت مشکل کام ہے اگر اب تو کایاکلپ کی وجہ سے ان کا حافظہ اور زیادہ اچھا ہو گیا ہو گا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ زبان جو آج سے بیس برس پہلے مالویہ جی، لالہ لاجپت رائے اور مہاتما ہنسراج جیسے ہندو سبھائی بزرگوں کو بھی محبوب تھی آج کیا گناہ کر بیٹھی ہے کہ گاندھی جی ایسے قومی رہنما بھی اس میں کیڑے ڈال رہے ہیں۔

مجھے اس سلسلے میں گاندھی جی اور کانگرس کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے دکھ محسوس ہوتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ انہیں قطعاً نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ذاتی طور پر میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں نظری و عملی کسی قسم کی سیاسیات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں لیکن جنہیں یقین ہے کہ اگر مسلمان اس ملک میں باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ملکی و سیاسی جدوجہد میں برادران وطن

سے تعاون کرنا ہوگا لیکن اُردو ہندی کے اس ناخوشگوار قضیئے میں کانگرس خصوصاً گاندھی جی نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر ہم ایسے نیازمند بھی یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ "قوم پرستی" کا اصل مفہوم کیا ہے؟ عرصہ ہوا گاندھی جی نے یہ ارشاد فرما کر ایک دُنیا کو حیران کر دیا تھا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اس لئے صرف مسلمانوں ہی کو اس کی حفاظت کرنی چاہئے تعجب ہے کہ وہ شخص جو پینتیس کروڑ ہندوستانیوں کی نمایندگی کا مدعی ہے اور علی برادران کا صحبت یافتہ ہی نہیں بلکہ ان کی جیب میں رہ چکا ہے اتنا بھی نہیں جانتا کہ اُردو قرآن کے حروف میں نہیں لکھی جاتی اور بالائے تعجب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسے یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اُردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی زبان ہے!

کانگرس کے دربار سے اُردو کو نہیں بلکہ ہندی اتھوا ہندوستانی کو قومی زبان ہونے کی سند بخشی گئی ہے۔ لیکن وُہ زبان جس پر ہندوستان کی قومیت متحدہ کی اساس رکھی جانے والی ہے کس سانچے میں ڈھالی جا رہی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے اس تلخ حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے کہ ہماری "قومیتِ متحدہ" کے علمبردار اُردو زبان کے ان عام فہم الفاظ کو بھی برداشت نہیں کر سکتے جو مدتوں سے عام بول چال اور تحریر و تقریر میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ "ہندی اتھوا ہندوستانی" کے جو نئے الفاظ زبان میں داخل کئے جا رہے ہیں ان کا سمجھنا صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ننانوے فیصدی ہندوؤں کے لئے بھی محال ہے۔ مثال کے لئے چند الفاظ ملاحظہ فرمائیے:۔

صوبہ متحدہ	کی بجائے	جُسٹ پرانت
تعلیم	کی بجائے	شِکشا
آزادی	کی بجائے	سوتنترتا
نافذ	کی بجائے	لاگو
اعلان	کی بجائے	گھوشن
مدعی	کی بجائے	جھگڑا اپیلڑو

ہم نے مانا کہ نافذ، اعلان اور مدعی بدیشی ہیں اور اس لئے ملیچھ۔ لیکن ان بیچاروں کے حق میں کم از کم یہ دلیل تو دی جا سکتی ہے کہ یہ سالہا سال سے آپ کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور رہنے بھی جانے دیجئے، اگر آپ ہندی کی حمایت میں انصاف کا خُون کرنے پر ہی تُلے ہوئے ہیں تو ہم آپ کا ہاتھ روکنے سے تو رہے کیونکہ آپ کو قوت و اقتدار حاصل ہے اور یہ وُہ شراب ہے جس کا نشہ ہر قسم کے نشوں سے زیادہ مدہوش کن ہوتا ہے لیکن ہماری اتنی عرض ضرور سُن لیجئے کہ لاگو، گھوشن اور جھگڑا اپیلڑو ایسے الفاظ سے نہ صرف انصاف کا خون ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ذوقِ سلیم کے گلے پر بھی مفت میں آپ کی "قومی" چھُری پھر جاتی ہے!

اگر اب بھی اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی

کوشش کی جارہی ہے، کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے تو اس زبان کے چند نمونے ملاحظہ ہوں جو ہمارے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال فرمارہے ہیں۔ گاندھی جی نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ناگپور کے اجلاس میں اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں گہر فشانی فرمائی :۔

"اس سبھا کا بنیتو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے۔ اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے لے کر کنیا کماری تک کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری انبادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی تھا لوگیہ سیوا کیوں نہ کریں۔"

اس بھن بھن بھاشا کا ایک ایک لفظ زبانِ حال سے پکار پکار کر اس پریم کا اعلان کر رہا ہے جو گاندھی جی کو ہندوستان کی سب بھاشاؤں سے ہے !

اس قومی حمام میں یوپی کے سوشلسٹ وزیرِ تعلیم بھی ننگے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی تقریر کا اقتباس یوپی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک شبتا ہے کہ شنکتنمر شمسیا کے پت لوگوں کا اگرشٹر بہت وشدھ اور بیاپک ہوگیا ہے۔ یہ بات ادھ کانش بیئے سنسار پرگھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس انتیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا انُ بھو کر رہے ہیں۔"

اگر ایسی جناتی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان ہونا ہے تو ہندوستان اور ہندوستانی ادب کا خدا ہی حافظ ہے !

لیکن اس ستم ظریفی کا کیا کیا جائے کہ شری سمپورنانند جی کے نزدیک یہ زبان بھی "عام فہم" نہیں ہے اور اسے زیادہ "آسان" بنانے کے لئے اس میں سنسکرت کے کافی الفاظ داخل کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ آپ نے ۱۹ اگست ۱۹۴۶ء کو ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے سارے جنوبی ہند کے ہم وطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں۔"

اور اس مقدس مشن میں شری سمپورنانند جی کو ہندوستان کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی کی آشیرواد بھی حاصل ہے کیونکہ اس تقریر کے بعد انہوں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا اور اس میں ہندوستانی زبان کو "زیادہ عام فہم" بنانے کی مذکورہ بالا تجویز کا ذکر کیا۔ اِس

کے جواب میں گاندھی جی نے یہ ارشاد فرمایا:۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ جنوبی ہند کے لوگ ہندوستانی آسانی سے سیکھ لیں تو ہمیں اس میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں"۔

گاندھی جی کے متعلق شاید کہہ دیا جائے کہ وہ تو کانگرس کے چونّی والے ممبر بھی نہیں اس لئے ان کے افعال کی ذمہ داری کانگرس پر کیسے آسکتی ہے۔ لیکن جب خود کانگرس کے صدر اپنی سرکاری حیثیت میں "ہندی اتھوا ہندوستانی کی جے" کے نعرے لگانے شروع کردیں تو ان کے اس طرزِ عمل کی کیا توجیہہ کی جائے گی؛ ہری پورہ کانگرس کے موقع پر کانگرس کے خزانچی سیٹھ جمنالال بجاج کی صدارت میں راشٹر بھاشا سمیلن یعنی قومی زبان کی کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس کو کانگرس کے صدر نے یہ پیغام بھیجا:

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے جو ہندی یا ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہیے۔ کہ یہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہوگی"۔[۵]

مجھے ان بزرگوں کے خلوصِ نیت پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں، ان کے اعمال و افعال مجھ سے کہیں زیادہ فصاحت کے ساتھ ان کی دیانت و اخلاص کا اعلان کر رہے ہیں۔ لیکن میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خدا کے لئے اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی فرمائیے۔ یہ راہ قومیت کے مندر کو نہیں بلکہ تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے مرگھٹ کو جاتی ہے۔ آپ کا فرض تو یہ ہے کہ آپ ہندو مسلم کشیدگی کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں لیکن آپ نادانستہ طور پر اسے وسیع کر رہے ہیں۔ زبان اور ادب کو سیاست کے معبد پر قربان نہ کیجئے۔ یہ آگ چند وطن دشمنوں نے سلگائی ہے اسے بجھانا آپ کا فرض ہے لیکن آپ اسے اپنے دامن سے ہوا دے رہے ہیں۔ ابھی سنبھلنے کا وقت ہے لیکن اگر ایک دفعہ یہ آگ بھڑک اٹھی تو یاد رکھئے کہ آپ کی قومیت متحدہ کی خیالی عمارت اور ہندو مسلم اتحاد کا مثالی قصر اس کی لپیٹ میں آکر خاکِ سیاہ ہو جائیں گے۔

حمید نظامی

[۵] ۔ ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء

"مُفلِس"

کہا جاتا ہے کہ وہ حضرتِ دل جن کے تقاضوں کے مارے ہمارے شاعر نقشِ پا کے سجدے اکوئے جاناں کے طواف کرتے تھے، رقیب سے بر سرِ پرخاش اور اپنے آپ سے بیزار رہتے تھے۔ آجکل بنئیے کے ہاں گروی ہیں۔

بنئیے کی دُکان پہلے سبرمتی میں تھی اب واردھا میں ہے مگر بہی کھاتہ وہی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس حساب کتاب میں سب سے پہلا انگوٹھا خلافت کا ہے اور پھر سُرخ پوشوں اور تنظیم والوں کے بھی انگوٹھے ہیں۔

بہرحال بہی کھاتہ لمبا ہے اور انگوٹھے لگھر والوں کا سرمایہ محدود۔ آخر قرقی ہوکر رہیگی۔ اجرا میں مفلس لیگ کا دِوالہ پٹیگا اور احرار نیلام ہوکر قرضخواہ کے حوالے ہوں گے۔ یہ ہے آئندہ دس بیس سال کی بھارت تاریخ۔ کانگرس وہی رہیگی جو اب ہے یعنی مہا سبھا کے پریم کی متوالی۔

یہ سب کچھ کہا جاتا ہے مگر ہرگز باور کرنے کے قابل نہیں قطعی غلط ہے مُسلم اُبھرا کہ اُبھرا۔ سید احمد خاں فیل ہوئے فضل حسین فیل ہوئے اقبال پاس نہ ہوئے مگر انقلاب والوں کا امتحان باقی ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ انقلاب والے بنئیے کو، کانگرس کو ہضم کرکے ڈکار تک نہ لیں گے۔ اس نئے دعوے کے باور کرنے میں دقت اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ "انقلاب" شاید اُردو ہے اور "زندہ باد" قطعی فارسی مگر اُردو فارسی دونوں "مُردہ باد" ہیں۔

ایک بنگالی بابو "حکومت مُردہ باد" سُن کر فرمانے لگے "ہرگز نہیں حکومت کیوں مُراد آباد جائے"! یہ راز تو مُراد آباد والے یا صبر سر محمد یعقوب اور یا توکل سر رضا علی جانیں مگر مُسلم کا ایمان انقلاب پر محکم ہے۔ یہی سوچتا ہے کہ میں مزدور ہوں، مزدور کی حکومت آئی کہ آئی۔

کسی زمانہ میں مزدور چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا تھا مگر آجکل کے بھوکے مزدور کی نیند سخت بے چین نیند ہے۔ اُسے بچھڑے کے خواب آتے ہیں۔ چونک اُٹھتا ہے کہ دُودھ گیا، گُڑ گیا اور اب بچھڑے سے بھی گھر خالی ہے۔ یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ویسے تو خیر ولایت جاتا ہے بچھڑا تو نہیں جاتا۔ یہ کیا بات ہے کہ بچھڑے سے دُکانیں پُر ہیں گھر خالی۔

انقلاب والے مزدور کو یہ لوری سُناتے ہیں:۔

"بچھڑے سے گھر خالی، روپیہ سے جیب خالی، عقل سے دماغ خالی، انقلاب آیا کہ آیا۔ انقلاب آیا افلاس گیا"۔

کہیں یہ نہ ہو کہ انقلاب آجائے اور مُفلس نکل جائیں۔

"مُردہ زندہ باد"

(نوٹ۔ کہا جاتا ہے کہ کاتب کی غلطی سے بعض جگہ "مُفلس" کی جگہ "مُسلم" اور مُسلم کی جگہ مفلس لکھا گیا ہے۔ چنداں فرق تو نہیں مگر پڑھنے والے ازراہِ کرم صحت فرمالیں۔)

ماں

شادی سے پہلے اُنہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ ہندوستان میں نوّے فیصدی شادیاں یُونہی ہوتی ہیں، بھدّے کالے کلوٹے بدمذاق نوجوانوں کو اکثر حجلۂ عروسی میں خوبصورت گوری گوری سُگھڑ بامذاق لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ اور چڑچڑی، پھوہڑ، بدصُورت لڑکیوں کو اکثر شریف النفس خوبصورت نوجوان مل جاتے ہیں۔ یہ اصُول مسئلہ جنسیات کی صریح طور پر تذلیل ہے۔ لیکن ہندوستان میں وُہ کونسا اصولِ فطرت ہے جس کی خلاف ورزی کو مدّتوں کے رسم و رواج نے مذہبی عقیدوں کا رنگ نہ دے دیا ہو۔

لیکن یہ بے اصُولی کبھی کبھی ایسے نتائج پیدا کرتی ہے، کہ خود فطرت انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

اور گو اُنہوں نے شادی سے پہلے ایک دُوسرے کو نہیں دیکھا تھا تاہم پہلی ملاقات ہی میں اُنہیں معلوم ہو گیا کہ اُن کے احساسات مذاق اور مزاج یکساں ہیں۔ اُن کے دلوں کی دھڑکنیں ہر حال میں ہم آہنگ ہیں۔ خارجی طور پر اُن کے وجود الگ الگ سہی لیکن اُن کا خمیر ایک ہی مادہ سے اُٹھایا گیا تھا!

شادی کے بعد ولی محمد نے اپنی زمین بیچ کر ایک خچر خرید لیا۔ اُس کی زمین کے تمام قطعے ڈھلانوں پر تھے جہاں پانی ایک لمحہ بھی نہیں رُک سکتا۔ اور پھر دو سال سے علاقہ پر خشک سالی کا دیو منڈلا رہا تھا۔ خچر خرید لیا اور چوپال پر جا کر اعلان کر دیا کہ اگر کسی شخص کو یہاں سے اسٹیشن جانا ہو تو وہ اُس سے صرف بارہ آنے لے گا۔ اسباب بھی لادے اور خود بھی سوار ہو لے۔ ایک شخص جسے شاید اُونٹوں کی تکلیف دِہ سواری کا خاص طور پر تجربہ حاصل تھا، بولا "ولی محمد کا یہ کام سارے گاؤں کے لئے باعثِ آرام و آسائش ہے، کہاں اُونٹوں کے تنگ کجاوے، قدم قدم پر ہچکولے۔ اُن کے بیٹھنے اُٹھنے کے بھونڈے انداز، اور پھر کرایہ دو روپیہ، اور کہاں خچر کی پیٹھ۔ سو جاؤ تو اسٹیشن تک آنکھ نہ کُھلے اور پھر کرایہ بارہ آنے!"

ولی محمد کو اپنا مستقبل بہت شاندار دکھائی دینے لگا!

ایک سال میں اُس نے چالیس پچاس روپے جمع کر لئے۔ ننھا پیدا ہُوا، تو پانچ روپوں کا گُڑ تقسیم کیا۔ ننھے کی ماں کے لئے جاپانی ریشم کا ایک سُرخ رنگ کا قمیص تیار کرایا جس پر جگہ جگہ نیلے نیلے گل بوٹے تھے۔ گلابو قمیص پہن کر بولی "ہائیں! کیا میں نے قمیص پہن رکھا ہے؟ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں ابھی ننگی کھڑی ہوں!"

ولی محمد فخریہ انداز میں اکڑ کر بولا "ملائم کپڑا ہے نا۔ اور پھر عورتوں کے لئے تو ایسے ہی کپڑے موزوں ہوتے ہیں۔ تمہیں وُہ کھدر کا جوڑا پہنے دیکھ کر میرا کلیجہ جل جاتا تھا ــــ اب مزے اُڑاؤ!"

لیکن گلابو نے عمر بھر میں جاپانی ریشم کا صرف وہی قمیص پہنا !

دوسرے دن چوپال پر ولی محمد نے سُنا کہ اسٹیشن سے لے کر اُن کے گاؤں تک پکّی سڑک بننے والی ہے۔ اب اس پر ٹانگے چلیں گے اُونٹ خچر کا وقت گیا!

ولی محمد نے چاہا الاؤ سے ایک دہکتا ہُوا کوئلہ اُٹھا کر نگل جائے!

وُہی شخص جس نے ولی محمد کے خچر خریدنے پر پُرزور الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا تھا۔ بولا" اونٹ کے ہچکولوں سے نجات مِل گئی مگر بخدا خچر پر سوار ہوتے وقت بہت شرم محسوس ہوتی تھی۔ آخر گدھے اور خچر میں فرق ہی کیا ہے! وُہی چال ڈھال وُہی تراش خراش۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر تمہیں کسی سے دشمنی ہو تو اُسے خچر پر سوار کرادو!"

اُس دن ولی محمد گھر آیا، تو خچر کو چارہ ڈالنا بھُول گیا۔ خچر کچھ دیر تو خاموش کھڑا ولی محمد کو گھُورتا رہا، جو کھاٹ پر کروٹیں بدل رہا تھا، پھر اپنی دُم اُٹھا کر اور تھوتھنی نکال کر ایسی کرخت آواز بلند کی کہ ولی محمد نے اُٹھ کر پھاوڑے سے اُس کی کمر توڑ ڈالی۔ گلابو جاگ رہی تھی، بولی "ہائے ہائے۔ ایک سال تک تم اس کی آواز ہنس ہنس کر سُنتے رہے، آج اس سے کیا قصُور ہُوا کہ بیچارے کی پیٹھ پر پھاوڑے برسا رہے ہو؟ اپنے رزق کو یوں پالتے ہیں کیا؟"

ولی محمد بولا" اری چُپ رہ، تجھے نہیں معلوم۔ اب یہ کمبخت ہمارے کسی کام کا نہیں۔ اسٹیشن سے یہاں تک سڑک بننے والی ہے، اب یہاں لاریاں ٹانگے چلیں گے، اب خچر وچر کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہمارے بُرے دِن آگئے!"

وُہ اپنی بیوی کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا" گلابو۔ بتا اب کیسے گزر ہوگی۔ زمینیں بِک گئیں۔ ورنہ پھر ہل اُٹھا لیتے۔ مَیں تو سمجھا تھا اب مرتے دم تک ہاتھ کبھی تنگ نہ ہوگا۔"

گلابو خاموش رہی۔ ننھا بچہ اُس کی چھاتی سے چمٹا ہُوا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

ولی محمد پھر بولا" گلابو، شکر ہے، تم میرے پاس ہو، ورنہ میں تو آج روتے روتے دیوانہ ہوجاتا۔"

گلابو نے اپنا ہاتھ ولی محمد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے آنسو بہاتے رہے۔ آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک طویل لکیر چھوڑتا اندھیرے میں کھو گیا!

سڑک تیار ہوگئی۔ ٹانگے والوں کی بن آئی، ولی محمد کے خچر کا تھان پر کھڑے ہو کر اپنی میلی دُم سے مکھیاں اُڑانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ولی محمد کی کمائی آہستہ آہستہ برف کے تودے کی طرح پگھلنے لگی۔

اُس کی رفیقۂ حیات اگر گلابو کے علاوہ کوئی اور ہوتی تو وُہ اب تک ضرور خودکشی کرچکا ہوتا۔ لیکن جب باجرے کی موٹی اور بھاری

روٹی توے پر ڈالتے ہوئے گلابو اپلوں کے دھوئیں سے سوجی ہوئی آنکھیں اٹھا کر ولی محمد کی طرف دیکھتی تو ولی محمد کو اپنے پیوند لگے قمیص اور سوکھے بے رونق رخساروں کا خیال تک نہ رہتا۔ گلابو کا جاپانی ریشم والا قمیص بھی کئی جگہ سے گل گیا تھا۔ اور کئی جگہ سے اس کا جسم بھی جھلکنے لگا تھا۔ جسے وہ اپنے بازوؤں سے ہر وقت چھپانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ لیکن اس کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ تک نہ آیا۔ بس ایک نظر ولی محمد کو دیکھ لیتی۔ تو اُسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اطلس اور کمخواب سے اپنی جوتیاں پونچھ رہی ہے!

ایک دن ولی محمد صحن کے ایک کونے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اچانک سے کوئی خیال آیا۔ حقّے کی نال ہونٹوں سے الگ ہو گئی اُٹھ کر گلابو کے پاس آیا۔ کہنے لگا "گلابو تیری جوتی تو اب بہت پرانی ہو گئی ہے"۔

گلابو مسکرا دی!

وہ بولا "گلیوں میں چلتے وقت تجھے پتھر چبھتے ہوں گے۔ تو ضرور دل میں کہتی ہو گی کہ مجھے کس کنگلے سے پالا پڑا۔ کہ پاؤں میں پہننے کے لئے جوتی تک نہیں خرید کر دیتا"۔

گلابو کو جیسے کسی ناگ نے ڈس لیا۔ بولی "میں شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں اور مجھے اپنے آرام سے زیادہ اپنے ماں باپ کی عزت کا پاس ہے۔ میں تمہاری لونڈی ہوں، کیا میں دیکھ نہیں رہی کہ تمہارے جوتے کو جگہ جگہ پیوند لگے ہیں۔ انسان کو وقت کا ساتھ مجبوراً دینا پڑتا ہے۔ خدا جس حال میں رکھے اُس کا شکر ہے۔ اس سے بدتر نہ کرے"۔

ولی محمد دیوار کا سہارا لے کر بولا "مگر گلابو۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ خچر بیچ ڈالوں! مگر کون خریدے گا اسے؛ ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے۔ دس بارہ روپے ہی ملیں گے۔ چالیس روپے کے خچر کے دس بارہ روپے!"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ ننھا گلابو کی گود میں غوں غوں کر رہا تھا۔ خچر اپنے تھان پر آنکھیں کھولے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی تھوتھنی اور آنکھوں پر مکھیوں کی فوجیں بھنبھنا رہی تھیں۔

ناگاہ ولی محمد دو چار قدم آگے ہو کر بولا "گلابو! ایک تجویز میرے دماغ میں آئی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو آج ہی سے اس پر عمل شروع کر دوں، اسٹیشن پر ہر وقت مزدوروں کی ضرورت رہتی ہے۔ ہمارا پڑوسی تاج محمد بھی تو اسٹیشن پر کام کرتا ہے۔ اچھلے دنوں میں نے اس کی بیوی کے پاؤں میں نئے سلیپر دیکھے تھے۔ آخر کچھ تو بچاتا ہو گا۔ تم سے الگ رہنا میرے لئے عذاب ہو گا۔ لیکن پیٹ کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ کہو تو کل اسٹیشن چلا جاؤں"؟

گلابو نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ لیکن بے حد دھیمی اور قدرے بھرائی ہوئی آواز میں" شاید اس طرح گزری گھڑیاں پھر لوٹ آئیں تم اسٹیشن چلے جانا، میں یہیں رہوں گی۔ جب کبھی وقت بے وقت کسی مسافر کو خچر کی ضرورت پڑ گئی، میں اُسے اسٹیشن تک پہنچا آؤں گی اور تم سے بھی مل لوں گی۔ اندھیرے اُجالے اس راہ پر کئی بار سفر کیا ہے۔ بھولوں گی نہیں"۔

ولی محمد نے دُوسرے دن ایک چھوٹا سا بستر کاندھے پر رکھا اور آنسو بہاتا روتی ہوئی گلابو سے رُخصت ہو کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔
گلابو نے اُس کے بعد دو وقت کھانا نہ کھایا۔ اُس کا دُودھ کم ہُوا۔ تو بچہ بلکنے لگا۔ مجبوراً دوسرے روز کچھ لقمے زہرمار کئے، اور تمام دن کھاٹ پر پڑی رہی۔ ایک دوبار پڑوس کی عورتوں میں جا بیٹھی، لیکن جی نہ لگا۔ واپس آ کر اسی کھاٹ پر پڑی رہی جس پر ولی محمد سویا کرتا تھا۔ ننھے سے تادیر باتیں کرتی رہی "ننھے، تمہارا باپ جانے اسٹیشن پر کیا کر رہا ہوگا۔ جب وہ اپنی پیٹھ پر بھاری بھاری بوریاں اُٹھائے گا، تو تم اُسے بہت یاد آؤ گے۔ جب آیا تو تمہارے لئے قسم قسم کے کھلونے، قسم قسم کی مٹھائیاں لے کر آئے گا۔ ارے مُنہ کیوں بسور رہا ہے؟ کیا تجھے مٹھائیاں پسند نہیں؛ دُودھ پیئے گا؛ لے!"

اس طرح وہ ساری ساری رات بچے سے باتیں کرتی رہتی، اور جب سو جاتا، تو گھٹنوں میں سر چھپا کر دیر تک روتی رہتی!
ایک رات وہ بچے کو سُلا کر دیا بُجھانے کے لئے اُٹھی کہ باہر کسی نے اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز آئی "کیا ولی محمد خچر والے کا مکان یہی ہے؟"

"جی یہی ہے۔"

"کیا اس وقت اسٹیشن پر خچر لے جا سکو گے؟"

"جی وُہ خود تو گھر نہیں۔"

"اوہ! مجھے تو اسٹیشن پر آج رات ضرور پہنچنا تھا۔ اور اس وقت ٹانگہ ملتا نہیں۔"

گلابو نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک نوجوان بہت قیمتی کپڑوں میں ملبوس، ہاتھ میں بجلی کی ٹارچ لئے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔

گلابو بولی "آپ کیا دیں گے اسٹیشن تک؟"

"مگر خچر کے ساتھ کون جائے گا؟"

"مَیں!"

"تُم؟"

"جی ہاں۔"

"مگر کیا تُم راستہ جانتی ہو: اس قدر اندھیرا ہے اور ......؟"

"آپ کے پاس چور بتی جو ہے!"

"مَیں اٹھنی دُوں گا۔"

"اٹھنی؛ اسباب ہے؟"

"نہیں"

"تو میں تیار ہوں، چلیے"

گلابو نے جھٹ خچر پر زین رکھا، خچر کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ مڑ مڑ کر گلابو کی طرف دیکھنے لگا۔ مدت سے اُس کی پیٹھ زین سے آزاد رہی تھی، اس لئے ایک دوبار اس نے ضِد بھی کی، دولتیاں بھی جھاڑیں۔ مگر جب دیکھا کہ گلابو زین کس کر ہی دم لے گی تو چُپکا ہو رہا۔

گلابو نے ننھے کو سینے سے لگا لیا۔ دروازے کو قفل کیا، نوجوان خچر پر سوار ہو گیا۔ اور دونوں اندھیری گلیوں سے نکل کر باہر کھلے آسمان پر آ گئے۔

اندھیری رات میں ایک اجنبی نوجوان کی ہمراہی میں صرف ایک اٹھنی کے لئے بارہ میل کا پہاڑی سفر کرنا گلابو کی فطرت کے خلاف تھا۔ لیکن وہ سوچتی جارہی تھی کہ جب ولی محمد اُسے صبح کو دیکھے گا تو خوشی سے یقیناً ناچنے لگے گا۔ ولی محمد کو گاؤں سے گئے صرف آٹھ دن گذرے تھے۔ مگر گلابو سمجھ رہی تھی، جیسے آٹھ سال بلکہ آٹھ صدیاں گزر گئی ہیں!

دو میل بڑی سڑک پر چل کر وہ ایک پگ ڈنڈی پر ہو لئے۔ خچروں اور پیدل چلنے والے لوگوں کے لئے یہ رستہ تھا جو بڑی سڑک سے تین میل کم تھا۔ گنجان جھاڑیوں، ننھے جھرنوں اور تاریک دروں سے گزر کر وہ ایک گہری کھائی میں پہنچ گئے، جہاں سے آگے اسٹیشن تک دو ڈھائی فٹ کی ایک ایسی پگڈنڈی تھی۔ جس کے دونوں طرف گہرے بھیانک کھڈ تھے، اور کناروں پر گول گول پتھر تھے، جو ذرا سے دباؤ سے نیچے لڑھک جاتے تھے۔ یہاں سے گلابو نے خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب نوجوان کی چور بتی بڑا کام دے رہی تھی۔

وُہ کچھ دُور گئے تھے کہ نوجوان بولا "تمہارا نام کیا ہے؟"

گلابو کو پسینہ آ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ وُہ ڈرنے لگی۔ کہ کہیں بچہ اُس کے دل کی دھک دھک سے جاگ نہ اُٹھے۔

"تمہارا نام پُوچھا تھا میں نے؟"

"گلابو" گلابو نے یہ لفظ بے حد کوشش سے ادا کیا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

"گلابو! تم نے بڑی مہربانی کی۔ ایسی اندھیری رات میں تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ تم نے بڑی مہربانی کی"

گلابو نے سوچا "کیا شکریہ ادا کرنے کا یہی موقع تھا؟ اور یہ نام پوچھنے سے کیا مطلب!"

نوجوان پھر بولا "لو اب تم خچر پر سوار ہو لو۔ میں پیدل چلوں گا ―― تمہارے لئے"

گلابو نے چاہا۔ نیچے کھڈ میں چھلانگ لگا دے۔ لیکن چھاتی سے چمٹے ہوئے بچے نے نیند میں کہا "مم۔مم" اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

فضا بالکل خاموش تھی۔ صرف کبھی کبھی کوئی پتھر خچر کے سم سے ٹکرا کر نیچے کھڈ میں لڑھک جاتا تھا۔ نوجوان کی چور بتی گلابو کے سر کو

پڑ رہی تھی۔ اور گلابو کا لمبا سایہ سامنے تنگ پگڈنڈی پر بہت دُور تک بچھا ہُوا تھا! اُس نے زندگی میں پہلی بار ایک غیر شخص کی زبانی یہ الفاظ سُنے تھے۔ اُس کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی۔

ہمت کر کے بولی۔" ذرا سنبھل کر بیٹھئے۔ راستہ بڑا پُرپیچ اور خطرناک ہے۔ جان کا ڈر ہے یہاں"۔

نوجوان زیرک تھا سنبھل گیا۔ اسٹیشن تک اُس نے کوئی بات نہ کی۔

لیکن گلابو کو اسٹیشن پہنچنے تک بخار سا ہو گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے خاوند کو کیسے مُنہ دکھائے گی۔ کیا وہ اُس کی گھبرائی ہوئی آنکھوں اور اُڑے ہوئے رنگ سے رات کے واقعہ کا مطالعہ نہ کر لے گا؟

اسٹیشن پر نوجوان سے اٹھنی لے کر وہ ایک طرف ایک شیشم کے درخت سے خچر باندھ کر بیٹھ گئی۔ پو پھٹ رہی تھی تو اُس کے قریب سے ایک شخص گزرا۔ گلابو نے اُٹھ کر پُوچھا "بھائی کیا تم اسٹیشن پر رہتے ہو؟"

وہ رُک گیا۔ اور بولا "ہاں"

"یہاں ایک نیا نیا مزدُور آیا ہے۔ ولی محمد۔ کیا تم اُسے جانتے ہو؟"

"ہاں"

"وُہ اس وقت کہاں ہو گا؟"

"سامنے مسافر خانے میں۔ وہ اُس تختے پر سو رہا ہے۔ وُہ!"

خچر وہیں چھوڑ کر وُہ مسافر خانے میں گئی۔ مدھم روشنی میں اُس نے ولی محمد کو پہچان لیا۔ اُس نے اپنے گھٹنے سینے سے چمٹا رکھے تھے اور اُس کے خشک بال اُس کے بے رونق چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وُہ پہلے تو جھجکی کہ کہیں آنکھ کھولتے ہی وہ اُس کے چہرے سے رات کا دلخراش واقعہ نہ پڑھ لے لیکن آخر زبان کو دانتوں تلے دبا کر لرزتے ڈرتے اُس نے ولی محمد کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے ہلایا۔

"کون؟"

"میں۔ گلابو۔"

وُہ آنکھیں ملے بغیر اُٹھ بیٹھا۔" اری۔ کیسے آئیں۔ ننھا تو اچھا ہے نا!"

"اچھا ہے۔ یہ سو رہا ہے۔ ایک مسافر لائی ہوں۔"

"تھک گئی ہو گی تم؟"

"نہیں آہستہ آہستہ چلتی آئی ـــــ کوئی کام بنا؟"

"ہفتے میں تین آنے کمائے۔ اُن کی روٹی کھالی۔ آج بھوکا سو رہا ہوں۔"

دروازے سے لوگ آ جا رہے تھے۔ ورنہ گلابو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اُس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

ولی محمد بولا "لیکن اُمید ہے کچھ دنوں میں کام بن جائے گا۔ ایک بابو نے وعدہ تو کیا ہے۔"

گلابو نے اُسے اٹھنّی دینا چاہی لیکن ولی محمد نے انکار کر دیا اور بولا "خچر کے لئے چارہ خرید لینا تیل نمک کی بھی ضرورت ہوگی۔ میری فکر نہ کرو"۔ لیکن آخر گلابو نے اُسے چونّی لینے پر مجبور کر دیا۔ ننھے کو ولی محمد کی گود میں رکھ کر روتی رہی اور پھر خچر پر سوار ہو کر گاؤں لوٹ آئی۔

اُسے مہینے میں دوبار پھر اسٹیشن جانا پڑا۔ ابھی ولی محمد کا مستقل کام نہیں بنا تھا۔ مستقل اسامی کا انتظار کھینچنا بجائے خود ایک بیماری ہے اِس پر مستزاد متواتر فاقے! ولی محمد کی صحت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اُسے واپس گاؤں لانے کی گلابو نے بہت کوشش کی لیکن وُہ یہی عذر پیش کرتا رہا

"کیا وہاں مجھے قارون کا خزانہ مل جائے گا، یہاں ایک وقت پیٹ بھر لیتا ہوں۔ وہاں بھوکوں مر جاؤں گا۔"

ایک دن اچانک ننھا بیمار پڑ گیا۔ اُس کا گلا سُوج گیا اور سانس رُک رُک کر آنے لگی۔ گلابو اُسے گاؤں کے بوڑھے حکیم کے پاس لے گئی۔ اُس نے کہا "اِس بیماری کا علاج ایک انگریزی دوا ہے جو یہاں نہیں مِل سکتی۔ اُس پر دس آنے خرچ آتے ہیں۔ اگر وہ لا سکو تو ننھا اچھا ہو جائے گا۔"

گلابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے گھر میں ایک کوڑی تک نہ تھی۔ جی میں آئی۔ سر دیوار پر پٹک کر پھوڑ دے اور مر جائے۔ یوں بچّے کو سسکتے ہوئے مرتے دیکھنا تو بہت بڑا عذاب ہے۔ اب اگر اسٹیشن جاتی ہے کہ ننھے کے ابّا سے کچھ پیسے مانگ کر دوا خرید لائے۔ تو ننھا اکیلا رہتا ہے اور اگر ساتھ لے جائے تو حکیم کے کہنے کے مطابق سرد ہوا کی وجہ سے بیماری کے بڑھ جانے کا ڈر ہے! ساتھ نہ لے جائے تو جانے پیچھے کیا ہو جائے! اُس کے دماغ میں شعلے اُٹھنے لگے! وُہ دیوانوں کی طرح گلیوں میں بے مطلب بھاگنے لگی۔

آخر ننھے کو ایک پڑوسن کے حوالے کر کے خچر پر سوار ہوئی اور اسٹیشن کی طرف چل دی۔ آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے سخت ٹھنڈی ہوا نہایت تُندی سے چل رہی تھی۔ برق رفتار جھونکے تلوار کی طرح گلابو کی چھاتی کو چیر رہے تھے۔ بوندیاں پڑنے لگیں۔ بادل اس زور سے گرجا جیسے علاقے کے سارے پہاڑ آپس میں ٹکرا کر زمین میں غرق ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد موسلا دھار مینہ، بجلی، کڑک، آندھی — بیچارے ننھے جھولے خچر کے قدم اُکھڑ اُکھڑ جاتے تھے۔ گلابو کے کپڑے اُس کے جسم سے چمٹ گئے بارش اور ہوا کے تھپیڑوں سے وہ جھک جھک جاتی تھی۔ درختوں کی چوٹیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ پہاڑی نالے بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دہاڑنے لگے۔ جب خچر کسی نالے میں پھنس جاتا تو گلابو مایوس ہو کر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ پگڈنڈی کے نشانات مِٹ گئے۔ گلابو اللہ کے آسرے پر ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی!

اسٹیشن پر پہنچ کر اُسے معلوم ہُوا کہ ولی محمد بعارضۂ نمونیہ سخت بیمار ہے اور تاج محمد قلی کی کوٹھڑی میں پڑا ہے۔ اُس کی نظروں میں کائنات قلابازیاں کھانے لگی۔ ذرّے ذرّے سے ایک مغموم سی مسلسل گونج اُٹھنے لگی۔ ہانپتی ہوئی تاج محمد کی کوٹھڑی میں پہنچی۔ ولی محمد اکیلا کھاٹ پر پڑا چھت پر نظریں گاڑے کراہ رہا تھا! گلابو کو دیکھ کر بولا "تمہیں کس نے بتایا؟"

گلابو دہل گئی۔ نہ اُس کی زبان ہلی۔ نہ اُس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹا۔ مُنہ کھولے ولی محمد کے خشک ہونٹوں کو دیکھتی رہی!

ولی محمد نے پوچھا "خچر لائی ہو؟"

"ہاں" — جیسے خود اپنے آپ سے سرگوشی کر رہی ہے!

"تو مجھے گاؤں لے چلو۔"

وُہ خاموش رہی۔

"لے چلو گی؟"

"ہاں۔ مگر ننھا سخت بیمار ہے۔"

"کیا؟"

"ننھا سخت بیمار ہے۔ میں اُس کی دوا کے لئے تم سے دس آنے مانگنے آئی تھی۔"

"میرے پاس تو ایک کوڑی تک نہیں۔"

گلابو کا جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہے! اُس کی آنکھیں شدتِ غم سے جیسے باہر اُبل پڑیں گی!

یکایک باہر سے آواز آئی۔ "ارے بھئی یہ خچر کس کا ہے؟"

گلابو دوڑ کر باہر گئی۔ "میرا"

مسافر کو گلابو کے گاؤں جانا تھا۔ بارش کی وجہ سے تانگے سب مسافروں سے بھر کر جا چکے تھے۔ اَور کوئی سواری نہیں تھی۔

گلابو نے پوچھا "کیا ملے گا؟"

"آٹھ آنے!"

"دس آنے دے دیں گے آپ؟ میرا ننھا بیمار ہے۔ اُس کے لئے دس آنے کی دوا خریدنی ہے۔"

مسافر کوئی نیک دل انسان تھا۔ دس آنے نکال دیئے۔ حکیم نے اُسے دوائی کا آسان سا نام بتا دیا تھا۔ بازار دوڑی گئی۔ بوتل خریدی اور بھاگی بھاگی واپس آئی۔ مسافر کو خچر پر سوار کیا۔ اور لگام پکڑ کر آگے آگے چل دی۔ وُہ اس قدر تیز چل رہی تھی۔ جیسے اُس کے پاؤں میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

تاج محمد نے مسافر خانے سے مسافر اَور گلابو کو دُور جاتے ہوئے دیکھا۔ تو ولی محمد کے پاس دوڑا آیا۔ "ولی محمد۔ ولی محمد۔ گلابو ملی ہے تمہیں؟"

"ہاں!"

"مگر وہ تو ایک مسافر کو خچر پر سوار کئے گاؤں کو اُڑی جا رہی ہے۔"

"اچھا؟"

ولی محمد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تاج محمد سے پانی مانگا۔

تاج محمد نے پانی ڈالتے ہوئے کہا "مگر گلابو نے یہ کیا کیا؟"

ولی محمد نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "تم نہیں سمجھتے تاج محمد۔ یہ اُس کا فرض تھا۔ عورت پہلے ماں ہے اور پھر بیوی!"

احمد ندیم قاسمی

محفلِ ادب

کشتی کھینچنے والے مزدوروں کا گانا

ایک رانی کی کشتی کو بھادوں کی گرمی میں مزدور پانی کے بہاؤ کے خلاف دور سے کھینچ کر لا رہے ہیں پہلے دور کی آواز کم کم سنائی دیتی ہے وہ جتنے قریب آتے جاتے ہیں آواز بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح جوں جوں وہ آگے بڑھتے اور دور ہوتے جاتے ہیں۔ آواز گھٹتی جاتی ہے ...... (مطلبی)

او . . . . او . . . .

ہو . . . . ہو . . . .

او . . . . ہو . . . او . . . . ہو

او ... او .... او ..... او ہو .... ہو .... ہو ..... ہو

لو ..... لو ..... لو ..... لو ڈھو ... ڈھو ... ڈھو ... ڈھو

لو، ڈھو ، ڈھو ، ڈھو

چلو ، چلو ، چلو ، چلو بڑھو ، بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

چلو بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

(۱)

ناؤ میں بیٹھی راجہ کی نار[۱] پاتر[۲] ناچیں بارم بار[۳]
پائل[۴] دیو[۵] رہی جھنکار ڈھولک بولے گڑ گڑ تار
تالی باجے بولیں تار گونج رہے دریا ، سنسار
رانی کی ناؤ کے کھیون ہار[۶] دھوپ میں بھاری ناؤ منجدھار

چلو ، چلو ، چلو ، چلو

چلو بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

چلو بڑھو ، بڑھو بڑھو

---

[۱] عورت ، زوجہ ، راجہ کی رانی [۲] گانے والیاں [۳] باری باری [۴] پازیب [۵] دے [۶] کھینے والے ، کھینچنے والے۔

(۲)

پیٹ کی آگ سے ناؤ چلے — چلے، چلے، چلو چلے
رسّی کے گھٹوں سے چھاتی جلے — جلے، جلے، چھاتی جلے
منزل ماریں گے ویولے بلے — دیوے بلے، دیوے بلے
کشتی برے، نا کشتی بھلے — ہم برے، وہ بھلے

چلو، چلو، چلو، چلو
بڑھو بڑھو بڑھو بڑھو
چلو بڑھو - بڑھو بڑھو

(۳)

ناؤ میں سوتی کا ٹھن نار — پاتر جاکر بھئیے تیار
بھادوں کی گھام جلے سنسار — پیروں کی دھرتی ہوئی انگار
رکیں تو ہووے مارا مار — رذیل کرے ہیں "ہوئی اوار"
چابک دونوں رہے پھٹکار — آگے ٹنڈیل پاچھے جامادار

چلو، چلو، چلو، چلو
بڑھو، بڑھو، بڑھو، بڑھو
چلو بڑھو، بڑھو بڑھو

(۴)

مزدوری کر کر پچھتائے — پچھتائے پر کرنے آئے
چھاتی کٹائی پیر جلائے — رات ہوئی لٹی مہندی لگائے
دن نکلا پھر چلنے آئے — دو دو آنے سب نے پائے
دن دن پیٹ کی آگ جلائے — اس اگنی کو کون بجھائے

چلو، چلو، چلو، چلو
بڑھو، بڑھو، بڑھو، بڑھو
چلو بڑھو بڑھو بڑھو

(۵)

جگ بیتا یہ جنم گزارا — کوئی نہیں بنتا گن تارا

۱؎ چکی ۲؎ جلے ۳؎ محنت کرنے والے ۴؎ محنت ۵؎ ... ۶؎ بھادوں کی تند گرمی ۷؎ کٹے ۸؎ انگارے ۹؎ مچاتے ہیں ۱۰؎ ... ۱۱؎ مزدوروں کا افسر ۱۲؎ پیچھے ۱۳؎ جمعدار ۱۴؎ ...

نا آیا کوئی آون[1] وارا — کون کرے ہمارا نِستارا
پلٹ پڑے کوئی ایسی دھارا — وار پار ہو ، ہو نہ کنارا
کشتی[2] سِتم[3] کا بجے نگارا — ڈوبتا جیون لیوبے اُبھارا

چلو ، چلو ، چلو ، چلو
بڑھو ، بڑھو ، بڑھو ، بڑھو
چلو بڑھو بڑھو بڑھو

(۶)

کوئی تو ناؤ پڑے سُکھ پاویں — کوئی رات دِنا دکھیا ویں
کوئی من مانی اپنی کھاویں — کوئی بھیک مانگ کر دِن بہلاویں
کوئی لتّا پھاڑ پھاڑ مرجاویں — کوئی مرے بھی کفن نہ پاویں
آؤ اِس دُنیا کو آگ لگاویں — بلّی توڑ دیں، بیڑا ڈبا دیں

چلو ، چلو ، چلو ، چلو
بڑھو ، بڑھو ، بڑھو ، بڑھو
چلو ۔ بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

(کشتی دُور ہوتی جا رہی ہے)

چلو ۔ چلو ۔ چلو ۔ چلو — بڑھو ۔ بڑھو ۔ بڑھو ۔ بڑھو
چلو ۔ ڑھو ۔ ڑھو ۔ ڑھو

لو ـــــ لو ـــــ لو ـــــ لو — ڑھو ۔ ڑھو ۔ ڑھو ۔ ڑھو
او ۔ ہو ۔ ہو ۔ ہو

او . . . . . او . . . . . . ہو . . . . ہو .
او . . . . ہو

او . . . .
ہو . . . .
. . . .

(ستیہ مُطلبی) — "چنگاری"

[1] آنے والا۔ [2] مزدور [3] برادری [4] نقارہ

حضرت اکبر الہ آبادی

(از خان بہادر سید عشرت حسین ریٹائرڈ کلکٹر و مجسٹریٹ)

میرے والد حضرت اکبر الہ آبادی کے انتقال کے وقت میری عمر چالیس سال تھی۔ میری پیدائش اور میرے والد کی تقرری بعہدۂ منصفی قریب قریب ساتھ ساتھ ہوئی۔ گویا ملازمت اور پنشن کا زمانہ سارا میری نظر کے سامنے سے گزرا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میری آنکھ علی گڑھ میں کھلی، جہاں میرے والد ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک منصف رہے۔ میرے والد پر اس قیام کا اثر بلاشبہ بہت زیادہ ہوا۔ علی گڑھ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا مرکز تھا جہاں سر سید، حالی، سمیع اللہ خاں صاحب وغیرہ سے دن رات کی ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات کے مواقع تھے۔ علی گڑھ میں قیام کے زمانہ میں میرے والد نے بلنٹ کی مشہور کتاب "فیوچر آف اسلام" کا اردو میں ترجمہ کیا اور چھپوایا، اور مسٹر بلنٹ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں جن کا ذکر مسٹر بلنٹ نے اپنی کتاب "ہندوستان بعہد لارڈ رپن" (India under Ripon) میں کئی جگہ کیا ہے۔ علیگڑھ ہی میں کنور عبدالغفور خاں صاحب رئیس دھرم پور سے ملاقات ہوئی اور آخر عمر تک اس خاندان سے مراسم قائم رہے۔ کنور عبدالغفور خاں صاحب کے خلوص کی تعریف ممکن نہیں برابر آمد و رفت رہتی تھی۔ کنور عبدالغفور خاں صاحب کو موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ میرے والد بھی اس فن سے ناواقف نہ تھے بیں نے کبھی کبھی اپنے والد کو اشعار گاتے ہوئے سُنا۔ ستار بجانے کا بھی شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کنور عبدالغفور خاں صاحب جب تشریف لاتے تھے تو کبھی ستار بجانے والے ایک اُستاد کو بھی ساتھ لاتے تھے، خوب صحبتیں رہتی تھیں۔ کھماچ اور دیس راگنیاں میرے والد کو خاص طور پر پسند تھیں۔ کبھی کبھی میڈیر یا سُر لگنے پر خاص اثر ہوتا تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ سیارے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں ان میں ہر ایک ہیں اُن کی رفتار کے باعث سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز جب کسی ساز کی آواز سے مل جاتی ہے تو قلب پر غیر معمولی اثر ڈالتی ہے۔

کنور عبدالغفور خاں صاحب کو میں نے اُن کے شباب کے زمانہ میں دیکھا ہے جب اُن کی مونچھیں اور گل مچھے تھے اور پھر اُس زمانہ میں بھی دیکھا جب داڑھی مونچھ وغیرہ سب اُنہوں نے منڈوا ڈالی تھی، میرے والد فرماتے ہیں:

دیکھ عبدالغفور خاں کی طرف — مرد خوش حال اس کو کہتے ہیں

چار ابرو کا یاں صفایا ہے — فارغ البال اس کو کہتے ہیں

کنور عبدالغفور خاں صاحب کو سیر و سفر کا بڑا شوق تھا۔ یورپ اور امریکہ کی سیاحت کے بعد تمام ہندوستان میں گشت کر رہے تھے۔ چنانچہ اسی سفر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

علیگڑھ کے قیام کے زمانہ میں میں چھوٹا تھا۔ تاہم کچھ واقعات یاد ہیں اور قابلِ ذکر ہیں۔ ہم لوگ علیگڈھ میں چھتاری کے مکان میں رہتے تھے۔ کنور لطف علی خاں صاحب اُس وقت رئیس چھتاری تھے، مجھے وُہ بھی اچھی طرح یاد ہیں اور وہ مکان بھی۔ میرے والد مجھ سے فرماتے تھے کہ جب وہ صبح کو فیصلے وغیرہ لکھنے بیٹھتے تھے تو میں میز پر جا کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور کام نہ کرنے دیتا تھا۔ مجھے

یہ بات یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ میرے لئے بکرے کی ایک چھوٹی سی گاڑی بنوادی گئی تھی جس میں اسے دوڑاتا پھرتا تھا۔ ایک مرتبہ راستے کی گہری نالی کے اوپر سے جو زور سے دوڑاتا ہوا گاڑی کو نکلا تو گاڑی بیچ سے ٹوٹ گئی، میں گرا اور کافی چوٹ آئی۔ آدھی گاڑی بکرا کھینچتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔

۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند کی جوبلی تمام ہندوستان میں منائی گئی۔ علیگڈھ میں بھی جلسے اور دربار ہوئے۔ میں چھ سال کا تھا میرے والد نے دو شعر اِس موقع کے لئے کہہ کر مجھے یاد کرا دیئے، اور خود بھی مسٹر ہاول جج علیگڈھ کی فرمائش کے مطابق ایک قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ کلیات اکبر حصۂ اوّل میں چھپا ہوا ہے۔ جس موقع پر یہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اُس کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ اپنی یاد سے کام لیتا ہوں اور کچھ اپنے والد سے سُنی ہوئی بات ہے۔

ایک بہت بڑا شامیانہ ہے۔ پھول پتوں سے اور شیشہ آلات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ہر طرف جگمگاہٹ ہے۔ حکام اور رؤسا اور ضلع کے دیگر معززین اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ صدر کون ہے؛ ایک جگہ سنگ مرمر کی ایک میز ہے۔ وہیں آکر لوگ تقریریں کرتے ہیں، نظمیں پڑھتے ہیں۔ میری باری آئی۔ میرا نام پکارا گیا۔ میں میز کے پاس جاکر کھڑا ہوا لیکن اتنا چھوٹا ہوں کہ لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے میز مجھ سے اُونچی ہے۔ سرسیّد نے اُٹھا کر مجھے میز پر کھڑا دیا اور میں نے دو شعر پڑھ دیئے۔ دربار کا دستور ہے کہ تقریروں اور نظموں کے بعد تالیاں بجتی ہیں۔ تقریروں اور نظموں کے درمیان میں لوگ خاموشی سے سُنتے ہیں۔ میرے والد کی باری آئی۔ اُنہوں نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا لیکن دو ایک اشعار کے بعد لوگوں سے ضبط نہ ہوا۔ مشاعرے کا سا رنگ ہو گیا۔ یعنی لوگ اشعار کو دُہراتے تھے اور تعریفوں کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

علیگڈھ کے حالات تو بہت طولانی ہیں۔ ایک اور واقعہ یہاں ذکر کے قابل ہے۔

میرے دادا صاحب سیّد تفضّل حسین صاحب ایک بڑے بزرگ عابد و عامل تھے۔ ایک دن اُن کا خط میرے والد کے پاس آیا۔ کہ "تم مُنصف درجۂ اوّل ہو گئے۔" میرے والد نے لکھا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے، کئی صاحبوں کا نمبر مجھ سے اُوپر ہے۔ آپ کی اطلاع کا ذریعہ کیا ہے؛ میرے دادا صاحب نے جواب دیا کہ "میں نے خطِ جلی میں یعنی بڑے حروف میں لکھا دیکھا ہے سیّد اکبر حسین منصف درجہ اول"۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد میرے والد کی ترقی درجہ اوّل کی منصفی کا حکم آگیا۔

۱۸۸۸ء میں میرے والد قائمقام سب جج غازی پور مقرر ہوئے۔ تھوڑے دِنوں کے بعد کانپور کا تبادلہ ہو گیا اور چار سال کے قریب کانپور میں قیام رہا۔ کانپور سے چار میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے جس کا نام گوٹیا ہے اُس زمانہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت کا دفتر وغیرہ وہاں تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ بڑے علم دوست اور با مذاق۔ سیّد محمد ہادی صاحب اُن کے اسسٹنٹ تھے۔ وہی سیّد محمد ہادی صاحب جنہوں نے بعد میں شکر بنانے کی مشین ایجاد کی اور ۱۹۱۱ء میں الہ آباد کی نمائش میں یہ مشین دکھلائی۔ میں الہ آباد آیا ہوا تھا۔ نمائش دیکھنے

جا رہا تھا۔ میرے والد نے پوچھا کہ ہادی صاحب سے ملاقات ہو گی؛ میں نے کہا کہ ضرور ہی ملوں گا۔ فرمایا کہ یہ میرا شعر اُن کو سُنا دینا ؎

ہادیٔ دنیا تھے وہ ہل جوتنا سکھلا گئے ہادیٔ دیں تو نمائش میں کوئی تھا ہی نہیں

ذکر تو کچھ اور ہی کر رہا تھا لیکن خان بہادر سید محمد ہادی صاحب کے نام کے سلسلہ میں الہ آباد کی نمائش کا ذکر آ گیا۔ اس نمائش کے موقع کا ایک اور شعر ہے۔ گوہر جان کلکتہ کی مشہور گانے والی نمائش میں بُلائی گئی تھیں۔ ان کی آواز اور ان کے علمِ موسیقی کا شہرہ تمام ہندوستان میں تھا۔ میرے والد فرماتے ہیں ؎

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا

مَیں گونڈہ کا ذکر کر رہا تھا۔ یہاں ایک پبلک ریڈنگ کلب قائم ہُوا۔ ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے علمی اور اخلاقی مضامین اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ کانپور ہی میں رابرٹ سودی کی نظم "لوڈور" میرے والد نے دیکھی اور اپنی نظم "روانیٔ لوڈور" تصنیف کی۔ سودی نے انگریزی کے تمام مصادر جو دریا کی روانی کے متعلق ہیں، بڑی تحقیق اور بڑی قابلیت سے اپنی نظم میں اکٹھے کئے ہیں۔ یہی کام میرے والد نے اُردو میں کیا۔ یہ نظم ریڈنگ کلب گونڈہ میں پڑھی گئی۔ اور اس نظم میں بھائی حسن سے مُراد میرے حقیقی چچا سید اکبر حسن صاحب مرحوم سے ہے۔

کانپور میں دیا نرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ کے جدِ بزرگوار منشی شیو سہائے گورسہائے صاحب، لالہ جگل مل صاحب، شیخ احمد علی صاحب، مولوی احسان اللہ صاحب وغیرہ سے مراسم ہو گئے تھے جو برابر قائم رہے۔ دیا نرائن نگم صاحب کا برادرانہ برتاؤ میرے ساتھ اس وقت تک قائم ہے۔

آج اتنا وقت نہیں کہ میں بقیہ حالات عرض کروں البتہ ایک مشہور نظم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے :-

اک بتِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد

مجھے یہ کہتے ہوئے کسی قدر تکلف ہوتا ہے کہ یہ نظم میرے ولایت جانے سے پہلے تصنیف ہو چکی تھی، تکلف کی وجہ یہ ہے کہ عام خیال ہے کہ یہ نظم میرے متعلق ہے۔ لوگ مجھ سے اس کے متعلق سوالات کرتے ہیں[1]۔

کانپور کے بعد ۱۹۰۳ء تک جب میرے والد کی پنشن ہوئی مسلسل تبادلے ہوتے رہے، اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُسی زمانہ میں گورنمنٹ نے یہ تجویز کی کہ سب جج بھی ڈسٹرکٹ جج مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں میرے والد اس صوبے میں سب سے پہلے سب جج تھے جو قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سیشن جج مقرر ہوئے۔ حالانکہ کئی افسر نمبر میں اُن کے اُوپر تھے لیکن گورنمنٹ نے اُن کا انتخاب کیا۔ اس کے متعلق اُس وقت کی کونسل میں سوال بھی ہُوا لیکن گورنمنٹ نے یہی جواب دیا کہ اس تقرّری میں نمبر کی بحث نہیں ہے بلکہ جس کو ہم نے سب سے زیادہ قابل سمجھا اُس کا تقرر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر سال گرمیوں میں کسی نہ کسی ضلع کی ججی پر اُن کو جانا پڑتا تھا۔ انہیں وقتوں کا شعر ہے ؎

یعنی بس اب سب سے جُدا ہو گئے پہلے تھے سب جج ہوئے اب جج حضور

۱۸۹۶ء میں گونڈہ تعینات کئے گئے۔ آب و ہوا ناموافق ہوئی۔ غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

[1] جیسا کہ اب معلوم ہُوا ہے۔ یہ نظم حضرت اکبر نے ایک دوست کے صاحبزادے کے متعلق لکھی تھی۔ (ا۔ ذ)

اب تلک گونڈے سے اُمیدِ رہائی نہیں کچھ ہوگئی لیجئے ختم آج تو جولائی بھی

آخر ملازمت کے قریب اُن کا نام ہائیکورٹ کی ججی کے لئے بھی بھیجا گیا۔ لیکن چونکہ مسٹر جسٹس آلسپ قائمقامی کر رہے تھے۔ اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ اُن کی پنشن کے بعد تقرری ہو۔ لیکن اُس وقت کے آنے سے پہلے ہی میرے والد کی پنشن ہوگئی اور اُس جگہ پر بعد میں مسٹر جسٹس کرامت حسین کا تقرر ہوا۔

میں کانپور میں چند دنوں کے لئے گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ کانپور کے بعد میری تعلیم کا اہم زمانہ آگیا تھا۔ میرے والد نے دیکھا کہ اُن کے ساتھ رہ کر میری تعلیم ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ اس لئے میری والدہ اور میں الہ آباد میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے۔ عشرت منزل کی بنیاد پڑی۔ میرے والد مجھ سے فرماتے تھے کہ اس مکان کے نام میں میں نے یہ مناسبت خطی رکھی ہے کہ اگر تم زندہ نہ رہتے تو اس کا نام عبرت منزل کر دیتا اور اگر تمہاری حالت خراب و ابتر ہوتی، تو اس کا نام عُسرت منزل ہو جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے والد کی زندگی میں یہ مکان عشرت منزل ہی رہا۔ وہ دن میری نظر کے سامنے ہیں۔ جب یہ مکان زیر تعمیر تھا۔ کبھی مزدوروں اور راجوں میں گھس کر اُن کے ساتھ کام کرتا تھا۔ کبھی مزدوروں کو احاطہ عشرت منزل میں اپنے ساتھ کرکٹ کھیلاتا تھا۔ غُل مچتا تھا کہ دیکھئے چھوٹے میاں کام نہیں کرنے دیتے۔ پھر مکان تکمیل کو پہنچا۔ میرے والد الہ آباد کے مستقل جج خفیفہ مقرر ہوئے اور یہی مستقل جائے قیام قرار پائی۔ یہیں سے ہر سال چند مہینوں کے لئے ججی پر جاتے تھے اور پھر یہیں واپس آجاتے تھے۔ یہیں سے پنشن ہوئی۔ اگر یہاں کی چلتی ہوئی تصویر لی گئی ہوتی، تو کیا کیا منظر اس وقت دکھائی دیتے۔ جلسے، دعوتیں، بزم ہائے سخن، احباب و قدر دانوں کی آمد و رفت کا لا متناہی سلسلہ۔ اگر میں ان سب کے مختصر حالات بھی بیان کرنا شروع کروں تو دفتر ہو جائے۔ البتہ دو نام لیتا ہوں تا کہ کچھ اشعار پڑھ سکوں۔ ایک تو حضرت شبلی۔ علیگڈھ میں میرے والد نے اُن کو یہ اشعار لکھے تھے ؎

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا اُس کو سمجھو پلاؤ قلیا

دوسرے حضرت صفی لکھنوی۔ جس وقت یہ بحث تھی کہ شیعہ کالج کہاں قائم کیا جائے تو الہ آباد کا نام بھی پیش کیا گیا تھا۔ سالہ آباد ہی میں شیعہ کانفرنس کا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں حضرت صفی لکھنوی نے ایک نظم پڑھی تھی۔ اور الہ آباد کی خصوصیات بیان کی تھیں۔ اُس کا ایک بند یہ ہے ؎

جس کی خوشبو منزلوں پھیلی ہے وہ گلشن ہے تُو تازہ رس گلہائے رنگا رنگ کا خرمن ہے تُو
بذلہ سنجی کا جواہر خیز اِک معدن ہے تُو حضرت اکبر لسان العصر کا مسکن ہے تُو

نطق تیرے سکۂ رائج سے مالا مال ہے
ہند میں نقدِ ظرافت کی یہیں ٹکسال ہے

خود حضرتِ اکبر الہ آباد کے متعلق فرماتے ہیں ؎

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے　　　یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ابھی تو اُس زمانہ کا ذکر ہے کہ جب میں اسکول اور کالج میں تعلیم پا رہا ہوں، انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میری شادی کی فکر ہوئی۔ چنانچہ بالآخر نواب شیخ حسین صاحب او۔ بی۔ ای۔ خان بہادر۔ رئیس پریانواں، ضلع پرتاب گڑھ کی بڑی صاحبزادی سے شادی قرار پائی۔

۳۰ مارچ ۱۸۹۹ء کو بڑی دھوم سے شادی ہوئی۔ البتہ ناچ نہ تھا۔ سر اسرار حسن خاں صاحب مدار المہام بھوپال نے ناچ ہونے کے متعلق تحریک کی۔

میرے والد نے جو خط جواب میں لکھا وہ پیش کرتا ہوں:۔

"میرے پیارے عنایت فرما۔ محبت نامہ کے مضامین نے دل کو باغ باغ کر دیا۔ میرے ایک عزیز جو دبی زبان سے اسی بات کے لئے اشارے کر رہے تھے، آپ کے خط کو سُن کر پھڑک گئے۔ فرمانے لگے کہ بس یہ شخص آپ کا سچا محب اور زندہ دل دوست ہے۔ فی الواقع مجھ کو بھی ایسا ہی یقین ہوا۔

"بیس سال سے زیادہ ہوئے مَیں نے عقل اور مصلحت سے فتویٰ حاصل کر کے ناچ مجرا دیکھنا چھوڑ دیا۔ موسیقی کا مذاق رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ لیکن گانے والیوں سے جو دل کے ساتھ گھر بھی برباد کر دیتی ہیں، ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عشرت سلمہ ان خیالات ہی سے ناواقف رہے اور اب اُن کو اس سے کُلّی احتراز ہے۔

"مسلمانوں کو ناچ دیکھنا جائز تو کبھی نہ تھا لیکن اب مصلحت کے بھی خلاف ہے۔ ہم کو مضبوطی کے ساتھ ایسی مثالیں قائم کرنی چاہئیں کہ غربا شادی میں ناچ نہ کرانے کو اپنی ذلت نہ سمجھیں اور قرضدار نہ ہوں۔ درحقیقت شرفا میں ہماری طرف یہ رسم اب کم ہوتی جاتی ہے، سمدھیانے میں کچھ چُون چرا ہوئی تھی لیکن یہ سُن کر کہ لڑکا ناچ نہیں دیکھتا۔ اُن لوگوں کو فخر و مسرت کا موقع ملا۔

"آپ کہیں گے کہ حضور لیکچر دے رہے ہیں یا یارانِ بے تکلف کو خط کا جواب لکھ رہے ہیں، اچھا صاحب لکچر موقوف کان پکڑتا ہوں۔ ہزار بار توبہ، اب کفر نہ پھانکوں گا۔ پوری اندر سبھا پر ایمان لایا۔

"بھائی صاحب! چیت کا مہینہ آغاز بلکہ عین موسمِ بہار ہوگا، کیسے کیسے وضعدار نوجوان ہمارے دوست رونقِ محفل ہوں گے۔ عشرت سلمہٗ زرد جوڑا پہنے ہوئے زینتِ مسندِ عروسی ہوں گے۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ ایک شوخ طرار پرکالۂ آتش یہ گاتی ہوئی سامنے آئے ؎

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی　　　پہنے ہے جو پوشاک مرا یار بسنتی

"آپ گھوڑے سے ایس اجلاس سے، مولوی برکت اللہ صاحب منبر سے گر پڑتے۔ لیکن اس کے انتظام میں بڑی دشواریاں ہیں۔ بیحد صرف اور نہایت کم لُطف۔

"جس قدر مجھ کو اِس بات کی مسرت ہے کہ سمدھی صاحب ایک نہایت ذی علم، اولوالعزم خوش مزاج، خوش اخلاق، بے تکلف رئیس ہیں اُسی قدر اِس بات کا افسوس ہے کہ اُس دارالریاست کی راہ بہت دُور اور دشوار گزار ہے۔ رائے بریلی سے پندرہ کوس، پرتاب گڑھ سے چوبیس کوس، سراتھو اسٹیشن سے جو الہ آباد سے الہ آباد کا اسٹیشن چھوڑ کر تیسرا اسٹیشن ہے۔ آٹھ کوس ہے، ہم لوگ اسی راہ سے جائیں گے۔ سراتھو سے تین میل پختہ سڑک ہے۔ پھر سات میل خام سڑک، ناہموار بیہڑ۔ اونچی، نیچی، نالے، گڑھے، اس کے بعد میل بھر بلکہ زیادہ ریتا، پھر گنگا مائی، پھر بیہڑ۔ اُس کے بعد دو میل عمدہ سڑک بوجہ حُسنِ انتظام خان بہادر صاحب، تب پریاانواں۔

"اگر رائے بریلی سے کوئی شخص قصد کرے تو اگرچہ سڑک خام ہے لیکن چوڑی ہے، ہموار ہے، صاف ہے۔ تیز رَو اِکے ملتے ہیں، پانچ چھ گھنٹے میں پریاانواں پہنچ جائے۔ وہ سڑک مصطفےٰ آباد ہو کر، پریاانواں ہو کر مانکپور کو گئی ہے۔ ۲۰ مارچ کو چار بجے تڑکے ہم لوگ انشاءاللہ یہاں سے چل کر سہ پہر کو پریاانواں پہنچیں گے۔ آپ براہِ رائے بریلی گیارہ بجے دن کو بھی چلیں، تو پانچ بجے ہمارے کیمپ میں پہنچ جائیں۔ سراتھو میں ہماری راہ ہو سکتی ہے اور وہاں پورا شاعرانہ اور گورنمنٹی زور لگا کر بھی تیس اِکّوں اور چند پالکیوں اور دس بارہ ہاتھیوں سے زیادہ کا انتظام ناممکن ہے: بمجبوری خاص خاص اعزہ اور احباب کو ساتھ لوں گا۔

"اگرچہ ہمارے ساتھ یہیں سے آپ ہوں تو زیادہ لُطف ہو۔ اور خواہ مخواہ آپ کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا جائے لیکن بوجہ مذکورہ بالا آپ کو مشورہ دیا گیا کہ رائے بریلی سے تشریف لائیے۔ مقصود تو یہ ہے کہ ہم آپ ساتھ مل کر عشرت کو بیاہنے جائیں، اور یہ حاصل ہو جائے گا۔ ہمارا کیمپ علیحدہ ہو گا۔ بارات رات کو جائے گی۔ آپ اس کو ترتیب دینے والے ہوں گے۔ انشاءاللہ۔

"اب فرمائیے کیا مزا ہے کہ جنّت کی قمریاں پگڈنڈیوں پر پھٹپھٹاتی پھریں۔ ہم لوگ خود سفر کئے ہوئے کچھ آرام کرینگے پھر بارات جائے گی۔ پھر نکاح ہو گا۔ بیچاری گرمیوں کی ماری لیلائے شب کی بساط ہی کیا۔ چار انگڑائیاں لیں اور بھور۔ صبح سے طعامِ دعوت کا اہتمام ہو گا۔ پھر رخصتی کی جلدی ہو گی۔ پھر اگر دو بجے وہاں سے نہ چلیں گے تو گیارہ بجے شب کو الہ آباد نہ پہنچ سکیں گے، جہاں کُنبہ کی ساری بیبیاں مُنتظرِ واپسی بارات ہوں گی۔

"بتائیے کیا وقت ملے گا کہ اطمینان سے خنجرِ نگاہ کے زخمی ہوں؟ اور قاتل کو داد دیں۔

" آپ کارگزار افسر ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کام کی فرصت نکال لیں۔ لیکن جب تک مرگِ انبوہ نہ ہو کیا مزا ہے۔

" اِن خیالات دشواریِ منزل اور دِقتِ راہ وفقدانِ سواری وضیق وقت کے سبب سے مَیں نے تو باجے گاجے سے بھی کنارہ کشی چاہی تھی۔ لیکن ناممکن ہُوا۔ عشرت میاں کو آتش بازی کا بہت شوق ہے۔ خود بھی خوب بناتے ہیں۔ اور صرف اسی پر تو مین چھچھوندروں کو مُنہ لگاتے ہیں۔ لہٰذا باجے، آرائش، آتش بازی کا انتظام جہاں تک ہو سکے گا کیا جائے گا۔

" لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ نوشہ میاں تو رسم رسوم اور خیالِ عروس اور سہرے کے سائے میں بسر کریں گے باراتی بیچارے کیا کر کے رات گزاریں گے؟ میں یہ کہوں گا کہ نفلیں پڑھو، تہجد ادا کرو، اور اس میں بدشگونی سمجھو تو گپ اُڑاؤ اور شعر خوانی کرو۔

" آپ کے ولولے حق بجانب، آپ کی محبت کا میں معترف، لیکن اس کو دوسرے وقت پر اُٹھا رکھئے۔ بہت سے مواقع ہیں۔ ہم سے آپ سے اس باب میں گفتگو ہو جائے گی۔

" اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو بارات کے ساتھ الہ آباد تشریف لایئے گا۔ اور یہاں سے یکم خواہ دوم اپریل کو تشریف لے جایئے گا۔

" مولوی برکت اللہ صاحب کی مجھ کو کچھ خبر نہیں۔ آپ اِس خط کی نقل اُن کے پاس بھیج دیجئے گا۔

" ۳۰ مارچ کو پانچ بجے شام کو ہم آپ کو اپنے کیمپ میں پاویں۔ ساری داستان کا خلاصہ یہ ہے۔

" مَیں خود رخصت اتفاقیہ لُوں گا۔ بنارس جانا جبر ہوگا۔ لیکن کیا کروں۔ باہر سے میں نے معدودے چند خاص احباب کو تکلیف دینے کا ارادہ کیا ہے۔ جیلر صاحب کو کسی طرح نہ چھوڑوں گا۔ مولوی برکت اللہ صاحب ضرور ہی تشریف لائینگے

" مراتب مندرجہ خط پر دانشمندانہ نگاہ ڈالئے۔ پھر جو فیصلہ کیجئے۔ ہم کو عذر نہیں۔ آپ کو خود مختار کرتا ہوں۔ جو انتظام کیجئے۔ بل میں پاس کر دوں گا۔ جہاں تک مقدور ہے۔ باقی کے لئے وعدہ جب آپ کا لپٹا سول سروس ہو۔

اکبر حسین "

"زمانہ"

*

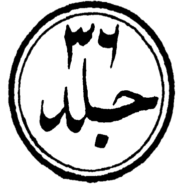
مطبوعات

معارفِ جمیل - یہ حضرتِ آزاد انصاری کا مجموعۂ کلام ہے جو حال ہی میں محمد تراب علی خاں صاحب باز گھانسی بازار حیدرآباد دکن کے اہتمام میں شائع ہوا ہے۔ حضرتِ آزاد عہدِ حاضر کے ایک نغز گو اور صحیح معنوں میں قادر الکلام شاعر ہیں۔ موجودہ شعراء میں جوش ملیح آبادی کے سوا غالباً کوئی شاعر ایسا نہیں جس کو آزاد انصاری کے برابر زبان اور فن پر قدرت حاصل ہو اور جس کا کلام فنی و لغوی اسقام سے اس قدر پاک ہو کہ بہ مشکل ہی کہیں انگلی رکھی جا سکے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ آزاد صاحب اپنے مصرعوں میں بالالتزام حروف کی وہی ترتیب قائم رکھتے ہیں جو نثر میں ہوتی ہے اور ضرورتِ شعری کہیں انہیں اپنی اس ڈگر کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتی۔ یہ قدرتِ کلام کا ایک عدیم النظیر مظاہرہ ہے۔ اس پر کمال یہ ہے کہ زبان اور الفاظ کا یہ رکھ رکھاؤ جذبات کے پُرخلوص اظہار پر اثر انداز نہیں ہوتا اور آزاد صاحب کا کلام سوز و اثر میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ شاعر نے خود لکھا ہے جو ایسا دلچسپ اور نکتہ آموز ہے کہ ایسے بہت کم دیباچے دیکھنے میں آئے ہیں۔ یہ دیباچہ پڑھنے کے بعد آزاد صاحب کے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ غیر مجلد دو روپے۔ پتہ اوپر درج ہے۔

"سائنس" دہلی - یہ انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی کا سہ ماہی علمی رسالہ ہے، جو ایک مدت سے نہایت خاموشی کے ساتھ ملک کی علمی و لسانی خدمات انجام دے رہا ہے۔ رسالے کا معیارِ مضامین انجمن ترقیٔ اردو کے نام کے شایانِ شان ہے۔ مضامین بلند پایہ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ علمی رسالہ ہونے کے باوجود "سائنس" دلچسپ بھی ہے اور اس سے عام پڑھے لکھے لوگ بھی بہ آسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ رسالہ اُردو زبان کے لئے باعثِ ناز ہے۔ مُلک کا فرض ہے کہ اس کی قدر کرے۔ اس سے بے پروائی اپنی کور ذوقی کا ثبوت ہے۔ بعض مضامین کے ساتھ تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ حجم تقریباً ڈیڑھ سو صفحات۔ چندہ سالانہ چھ روپے مع محصول۔ فی پرچہ ؎۔ پتہ: مینیجر "سائنس"۔ دفتر انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی۔

طلوعِ اسلام - یہ قابلِ قدر اسلامی رسالہ پہلے لاہور سے شائع ہوتا رہا ہے اور اب دلی سے نکلتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد علامہ اقبال کی اسلامی تعلیمات اور فلسفۂ عمل کی تبلیغ ہے۔ "طلوعِ اسلام" پاکستان کی تحریک کا علمبردار بھی ہے۔ اس کے ایڈیٹر محمد ظہیر الدین صاحب صدیقی ہیں جو اسے نہایت سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ یہ رسالہ بہت مفید کام کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو اس کی خاص طور پر قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ چندہ سالانہ ؎ ششماہی ؎۔ پتہ: ناظم "طلوعِ اسلام" بلی ماراں۔ دہلی۔



فہرست مضامین



"ہمایوں" بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۹ء

تصویر:- ہمصفیر

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	جہاں نما	حامد علی خاں	۸۴۲
۲	سیاسیات اور گالیاں	"فلک پیما"	۸۴۷
۳	میلادِ آدم (نظم)	حضرتِ مقبول احمد پوری	۸۴۹
۴	پگلا (افسانہ)	جناب سعادت حسن صاحب منٹو	۸۵۰
۵	غزل	جناب مولانا سید احمد حسین صاحب امجد	۸۵۹
۶	کچھ چہرے کچھ باتیں	جناب ڈاکٹر محمد باقر ملک صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی	۸۶۰
۷	غزل	حضرتِ احسن مارہروی	۸۶۹
۸	مہر (افسانہ)	جناب احمد رشید خاں صاحب سہاوری	۸۷۰
۹	تجلیات (نظم)	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی	۸۷۴
۱۰	جنگل مڑہالہ میں	حضرتِ حمید نظامی	۸۷۵
۱۱	عروسِ قسمت (نظم)	جناب پرنسپل رام پرشاد صاحب ناشاد ایم اے (آکسن)	۸۷۹
۱۲	کھلونا (افسانہ)	جناب احترام اللہ صاحب	۸۸۰
۱۳	غزل	جناب کاوش حیدرآبادی	۸۹۲
۱۴	ایک ایرانی محقق کے دو خط	جناب مولوی فضل حسین صاحب تبسم منشی فاضل ادیب فاضل	۸۹۳
۱۵	محفلِ ادب		۹۰۳
۱۶	مطبوعات		۹۱۰

اگر "ہمایوں" آپ کے خیالات کا ترجمان ہے تو اپنے دوستوں کو اس کی خریداری کی طرف توجہ دلائیے!

قارئینِ "ہمایوں"!

جنگِ فرنگ نے کاغذ اور دوسرے سامانِ طباعت کی گرانی سے جرائد ورسائل کے لئے جو مشکلات پیدا کردی ہیں اُن کا ذکر آپ متواتر سُنتے رہے ہیں۔ یہ بارہا دُہرایا ہُوا قصہ ایک بار پھر دُہرا کر ہم نہ "ہمایوں" کا حجم کم کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں، نہ گھٹیا کاغذ استعمال کرنے کی سبیل ڈھونڈتے ہیں اور نہ چندے میں اضافے کی راہ نکالنا چاہتے ہیں ہم تابمقدور ہر شعبے میں "ہمایوں" کا موجودہ نفیس معیار قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔

اگر "ہمایوں" آپ کی زبان، ادب یا معاشرہ کی کوئی خدمت انجام دے رہا ہے تو یہ بات ہم سے زیادہ آپ پر روشن ہوگی اور اُس کی موجودہ حیثیت کو قائم رکھنے کی آپ کو بھی ویسی ہی آرزو ہوگی جیسی ہمیں ہے۔

آپ سے "ہمایوں" کی ترقیٔ اشاعت کے لئے التجا کی جائے تو یہ اب ایک ایسی پھیکی سیٹھی اور بے مزہ بات ہوگئی ہے جو غالباً درخورِ سماعت بھی نہیں رہی۔

ہم آپ پر کوئی بے جا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ اگر آپ صرف اتنی ہی تکلیف گوارا کریں کہ اپنی میعادِ خریداری کے ختم ہوجانے پر دوبارہ اپنا چندہ بھیج کر سلسلۂ معاونت جاری رکھیں تو بڑی عنایت ہو۔ لیکن یہ درخواست بھی اُسی صورت میں توجہ کی مستحق ہے کہ "ہمایوں" آپ کی یا آپ کے متعلقین کی ذہنی و روحانی ضروریات کو پُورا کرتا ہو۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ چند حروف سننے والے کانوں تک پہنچ سکیں گے۔

آئندہ پرچہ ہمایوں کا اٹھارھواں سالگرہ نمبر ہوگا۔

"ہمایوں"

جہاں نما

اورنگ زیب کا سرکاری اخبار

"ہسٹاریکل ریکرڈ کمیشن" کی پندرھویں جلد سے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے یہ نہایت اہم انکشاف ہوا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کو سلطنت کے حالات سے باخبر رکھنے کے لئے ایک روز نامہ مرتب ہوتا تھا۔ یہ درباری جریدہ بادامی رنگ کے کاغذ پر لکھا جاتا تھا اور اس میں ایک دن کے کل اہم واقعات کا مختصر تذکرہ موجود ہوتا تھا۔ اس میں شہنشاہ کا روزانہ نظام عمل، دربار کے اوقات، اور جدید تقررات کی اطلاعیں درج ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ دربار میں باریاب ہونے والوں اور رخصت حاصل کرنے والوں کا ذکر اور شہنشاہ کے حضور میں پیش ہونے والے تحائف اور شاہی عطیات کا حال بھی درج ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی باہر کی ڈاک کی مختصر روئداد اور اس کے متعلق شاہی احکام کی تفصیل بھی پیش کی جاتی تھی۔ عموماً یہ اخبار کاغذ کے صرف ایک لمبے ورق پر لکھا جاتا تھا، لیکن جب اطلاعات زیادہ ہوں تو اوراق بڑھا دیئے جاتے تھے۔

ریاست جے پور نے ۱۹۲۳ء میں اپنے قدیم فارسی کاغذات کی جانچ پڑتال مشہور مؤرخ اور محقق سر جدو ناتھ سرکار سے کرائی تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسی ریاست جس پر مان سنگھ اور مرزا راجہ جے سنگھ وغیرہ جیسے اہم اشخاص حکمران رہ چکے ہوں، اس میں فارسی اور ہندی کے تاریخی نوشتوں کی کمی نہ ہو سکتی تھی، متذکرۂ صدر اخبار کا انکشاف اس طرح ہوا کہ ایک کمرے میں ایسے کاغذوں کا ایک انبار پڑا دکھائی دیا جن کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا کہ ان میں کیا ہے۔ جب صدیوں کی گرد جھاڑ کر یہ کاغذات کھولے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ فارسی میں لکھے ہوئے بادامی کاغذ کے لمبے لمبے ورق ہیں، اور ہر ورق کا عنوان "اخبار دربار مُعلّٰی" ہے۔ ان اوراق میں اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کے عہد کی خبریں درج تھیں۔ سر جدو ناتھ نے ابتدا میں ان پرچوں کی سات جلدیں مرتب کی تھیں۔ اس سے قبل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے پاس بھی "اخبار دربار مُعلّٰی" کا ایک مجموعہ موجود تھا اور یہ مجموعہ بھی اس سے قبل جے پور ہی سے دستیاب ہوا تھا۔ دونوں مجموعے صُورت، حجم اور موضوعات کے لحاظ سے بالکل مشابہ ہیں۔ تاہم مجموعے میں اورنگ زیب کے عہد کے ۴۰-۳۶ تک کے حالات ملتے ہیں اور لندن کے مجموعے میں بعض جگہ جو خلا نظر آتا تھا وہ اس سے پُر ہو گیا ہے۔

جے پور کے تاریخی دفتروں میں اورنگ زیب کے تین اوّلیں جانشینوں کے عہد کے پرچے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ اب لندن کا مجموعہ مکمّل ہو کر بیس جلدوں پر مشتمل ہو چکا ہے۔

جے پور کا مجموعہ اورنگ زیب کے عہد کے ۱۶۶۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ پچیسویں سال میں بادشاہ دکن کی مہم سرکرنے کے لئے چلا گیا۔ وہاں بھی شہنشاہ کو اپنی سلطنت کی تمام خبریں مرتب ہوکر پہنچ جاتی تھیں۔ اس اخبار سے دکن کی مہم کے متعلق بہت سی نئی اور مستند اطلاعات بہم پہنچتی ہیں۔ شمالی ہند کے دُور دراز صوبوں کی خبریں بھی باقاعدگی کے ساتھ فراہم کی جاتی تھیں۔

اٹھارہ جلدوں کا تازہ مجموعہ چھ ہزار سے زاید صفحات پر مشتمل ہے۔ ان میں خطوں، شاہی فرمانوں، "نشانوں"، "حسب الحکموں"، اور وکلا کی پیش کردہ اطلاعوں وغیرہ کے علاوہ شاہی افسروں اور ریاست جے پور کے حکمرانوں کی باہمی خط وکتابت بھی درج ہے۔ پہلی دو جلدوں کا تعلق ۱۶۰۶ء-۱۶۴۰ء تک کے واقعات سے ہے۔ باقی سولہ جلدوں میں ۱۶۸۰ء-۱۷۰۰ء تک کے واقعات ملتے ہیں۔

اس اخبار کے پرچے سلطنت مغلیہ کے آخری حکمرانوں کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے محققین کے علاوہ اُن لوگوں کے لئے بھی مفید ہیں جو مختلف صوبوں کے تاریخی حالات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس اخبار میں تقریباً تمام صوبوں کے حالات کے متعلق جگہ جگہ تذکرے ملتے ہیں۔ بنگال اور کشمیر تک کے حالات بھی فراہم کئے گئے ہیں۔ "اخبار دربارِ معلّا" میں دکن کے واقعات اور مغلوں اور مرہٹوں کی کشمکش کے مستند حالات بھی تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔

فلمی عشق

ڈربن کی ایک لڑکی مس پورٹر کی محبت اور شادی کا قصّہ اس لحاظ سے بڑا پُرلطف ہے کہ اسے فلم کے پردے کی ایک تصویر سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ ایک دن سینما دیکھنے گئی۔ گزشتہ جنگِ عظیم کی ایک فلم دکھائی جا رہی تھی۔ فرانس کے ایک محاذِ جنگ کی تصویر پیشِ نظر تھی جس میں ایک نوجوان انگریز افسر ایک برطانی فوجی دستے کی کمان کر رہا تھا۔ اُس کی صُورت اور شجاعت و مردانگی نے مس پورٹر کے دل پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اسے اس سے محبت ہوگئی۔ اس پر مس پورٹر نے فلم ساز کمپنی کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ اس فلم کا ہیرو کہاں ہے؛ لیکن اُسے وہ کمپنی کچھ نہ بتا سکی۔ آخر اُس نے تمام مشہور فلم ساز کمپنیوں کو خط لکھے لیکن سب کی طرف سے اسے یہی اطلاع ملی کہ اس فلم کا ہیرو اُن کے ہاں موجود نہیں۔ بعض فلم کمپنیوں نے جواب دیا کہ وُہ ایک فوجی افسر تھا۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں ہے۔ جنگ کو ختم ہوئے بھی اب بہت سال گزر چکے ہیں۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

اس کے بعد مس پورٹر نے یہ معمول بنا لیا کہ جہاں کہیں یہ فلم دکھائی جاتی وہ وہاں پہنچ کر اُسے دیکھتی اور اپنے دل کو تسکین دیتی۔ اسے متعدد مرتبہ اس فلم کو دیکھنے کے لئے طویل سفر بھی اختیار کرنا پڑا۔

ایک مُدت کے بعد ڈربن میں پھر یہ فلم دکھائی گئی۔ مس پورٹر حسبِ معمول فلم دیکھنے گئی۔ وہ تصویر دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی

درمیانی وقفے کے وقت اس نے آنسو پونچھ کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو حرماں نصیب لڑکی نے اُسی شکل و صورت کے ایک نوجوان کو قریب کی ایک کرسی پر بیٹھے پایا۔ مس پورٹر نے امید تعجب اور اضطراب کے عالم میں اُس سے پوچھا آپ کون ہیں؟ نوجوان نے جواب دیا "سنا تھا اِس فلم میں میرا ایک ہم صورت نوجوان ہیرو کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ کہیں وہ میرے والد نہ ہوں جو بھرتی ہو کر فرانس گئے تھے اور وہیں لڑکر کام آئے تھے۔ سو میرا خیال درست نکلا"۔ مس پورٹر یہ سُن کر مبہوت ہوگئی۔ اور نوجوان کا نام اور پتا لکھ کر کھیل ختم ہونے سے پہلے ہی گھر چلی گئی۔ اُس نے سوچا میرا محبوب مر چکا ہے اور اگر وہ زندہ بھی ہوتا تو شاید بہت معمّر ہو چکا ہوتا۔ میں نوجوان ہوں اور میرے محبوب کا بیٹا بھی نوجوان ہے۔ بہتر ہے کہ میں اسی سے شادی کر لوں۔ یہ فیصلہ کرکے وہ نوجوان کے پاس گئی اور اپنا تمام قصہ کہہ سنایا۔

نوجوان پر پہلے ہی جادو چل چکا تھا چنانچہ بہت جلد دونوں کی شادی ہوگئی۔

گلاب کا عطر

اگرچہ صحیح طور پر معلوم نہیں کہ گلاب کے پھولوں سے عطر نکالنے کا طریقہ پہلے پہل کس نے دریافت کیا مگر اس سلسلے میں تاریخ ہماری رہنمائی یہاں تک ضرور کرتی ہے کہ یورپ نے عطر کی کشید کا فن عربوں سے سیکھا تھا۔ خلیفہ مامون ۸۱۰ء کے زمانے میں عطر کے علاوہ نہایت نفیس عرقِ گلاب بھی تیار رہتا تھا اور ایران کے ایک صوبے کی طرف سے شاہی محلات میں ہر سال گلاب کے عرق کی تیس ہزار بوتلیں پیش کی جاتی تھیں۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ گلاب کے عطر کی موجد نور جہاں تھی اور اس ضمن میں یہ کہانی بیان کی جاتی ہے کہ جب نور جہاں اور جہانگیر کی نسبت قرار پا چکی تو نوروز بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ نور جہاں اس دن باغ میں کوئی جدت پیدا کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اور اس کی کنیزوں نے مل کر کئی تجویزیں سوچ ڈالیں مگر اتفاق کسی پر نہ ہوا۔ آخر نور جہاں نے تجویز کی کہ جہانگیر کو عرقِ گلاب کا تحفہ پیش کیا جائے لیکن یہ تحفہ چند صراحیوں میں پیش نہ کیا گیا بلکہ آراستہ باغ میں ایک چھوٹی سی ندی بنائی گئی جس میں عرق گلاب کی ایک مقدار کثیر بہادی گئی۔ جہانگیر اور نور جہاں جب ٹہلتے ٹہلتے اس خوشبودار ندی کے پاس پہنچے۔ تو شہنشاہ یہ نفیس نظارہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ندی کے کنارے چلتے چلتے نور جہاں نے دیکھا کہ عرق کی سطح پر ایک چکنی سی نفیس تہ چھا رہی ہے۔ ذرا نزدیک سے دیکھنے کے لئے دونوں وہیں بیٹھ گئے اور پھر عرق کی سطح سے اس تیرتی ہوئی چیز کو ہاتھوں سے اکٹھا کرنے لگے۔ ہاتھوں میں لگنے کے بعد اس چکنی چیز سے ایک ایسی روح افزا خوشبو آنے لگی کہ نور جہاں اور شہنشاہ پر سرور طاری ہوگیا۔ یہی گلاب کا عطر تھا۔

اگرچہ ایران کا عطر ہمیشہ مشہور رہے گا مگر آج کل گلاب کی کاشت کا سب سے بڑا مرکز ریاست ہائے بلقان میں ہے۔ بلقان کی آب و

ہوا میں گلاب کا پودا خوب پھولتا ہے۔ زمین اور آب و ہوا کی موافقت کے علاوہ یہاں کا پانی بھی عطر کشی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے
پھولوں کے موسم میں تو بلقان کی گل پرور زمین پر جس طرف نظر اُٹھائیں پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ یہاں کا اصلی گلاب کا پھول بھی اُن
دنوں اپنی پوری بہار پر ہوتا ہے۔ ان گہرے قرمزی پھولوں کے وسیع کھیتوں کے کناروں پر سفید پھولوں کے پودے لگے ہوتے ہیں
سفید پھولوں کا چوڑا حاشیہ اور اندر کروڑوں قرمزی پھولوں کا متن بہت خوبصورت منظر ہوتا ہے کھیتوں کے اس طریقۂ آرائش کو کسانوں
کے حسنِ مذاق پر محمول نہ کیجئے۔ اُن کے نزدیک ان سفید پھولوں کا مصرف صرف یہ ہے کہ جب کبھی موقع ملے انہیں استعمال میں لاکر
عطر کی گھٹیا مگر ناقابلِ تمیز قسم تیار کر لی جائے۔ لیکن دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ ان سے محض باڑ کا کام لیا جا رہا ہے۔

عطر کی خوبی عام طور پر اس کی خوشبو سے معلوم ہوتی ہے لیکن ماہرین بعض اور طریقوں سے بھی اس کا امتحان کرتے ہیں، جو
زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ محض خوشبو سے عطر کا امتحان اُس وقت تک قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا جب تک مقابلے کے لئے اچھی سے اچھی
قسم کا عطر پہلے اپنے پاس موجود نہ ہو۔

پھولوں کو اکٹھا کر کے جلد از جلد کشید گاہوں میں پہنچا دیا جاتا ہے اور پھر ان سے اسی وقت عطر نکالنا شروع کر دیتے ہیں
کیونکہ پودوں سے علیحدہ ہو کر پھول اگر زیادہ دیر تک پڑے رہیں تو پھر عطر اتنا اچھا نہیں نکلتا۔ بلقان کا نہایت احتیاط سے کشید کردہ
عطر ابتدا میں بے رنگ ہوتا ہے لیکن پھر جلد ہی زردی مائل ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی پھولوں کا عطر سبز رنگ کا ہوتا ہے۔
ہندوستان میں بھی گلاب کا عطر کشید کیا جاتا ہے اور اس کی خوشبو ولایتی عطروں کے مقابلے میں بہت تیز ہوتی ہے۔

پنجاب میں موٹر کار کے حادثات کی ترقی

گزشتہ سہ ماہی کے اندر جو ستمبر ۱۹۳۹ء کے ساتھ ختم ہوئی ہے۔ پنجاب میں موٹر کاروں کے باعث دو سو پچاس حادثات
پیش آئے۔ اِن حادثات میں کل ۵۰۷ آدمی زخمی ہوئے جن میں سے ۵۸ ہلاک ہو گئے۔ ان اٹھاون میں گیارہ بچے تھے۔
مرنے والوں میں سے صرف گیارہ اشخاص ایسے تھے جو موٹر کار میں سفر کر رہے تھے۔ باقی ۴۴ جن میں ۱۱ بچے شامل
ہیں موٹر کار سے زخمی ہو کر مرے۔ کل حادثات میں سے ۹۲ شہری علاقے میں اور ۱۵۸ دیہاتی علاقے میں پیش آئے۔
چھ موٹر سائیکل، ۵۹ پرائیویٹ کاریں، ۵ موٹر کیب، ۱۱۰ بار بردار اور مسافر بسیں، ۴۰ بار بردار ٹرک اور ۱۲ چھوٹی لاریاں ان حادثات
کا موجب ہوئیں +

اِن موٹر گاڑیوں کے ڈرائیوروں میں سے آٹھ غیر سند یافتہ اور پندرہ ۳ سے زیادہ مرتبہ کے سزا یافتہ تھے۔ ایک ڈرائیور شراب

کے نشے میں مدہوش تھا اور اٹھارہ ڈرائیور حادثہ پیش آنے کے بعد وہاں رُکنے کے بجائے اپنی گاڑی بھگا لے گئے۔

حادثات کے اسباب مختلف ہیں۔ بہت سے حادثے موٹروں، تانگوں، چھکڑوں، سائیکلوں، آوارہ جانوروں اور گڑی ہوئی چیزوں کے ساتھ ٹکرانے سے پیش آئے۔ اکثر حادثوں میں ڈرائیوروں نے سامنے سے گزرنے والی گاڑیوں وغیرہ کو وقت پر نظر انداز کر دیا تھا۔

کل حادثات میں سے بائیس، موٹر کاروں کی مشینری کی خرابی کے باعث، اُنہتر تیز رفتاری کی وجہ سے، تین بے قاعدہ بوجھ لادنے کے باعث، ایک سو اُنتیس مجنونانہ غفلت سے چلانے کے لئے، تائیس پیدل چلنے والوں کی بے پروائی کے طفیل، ایک سڑک کی خرابی سے، ایک ڈرائیور کے سو جانے پر اور اُنتیس موٹر کے علاوہ دوسری گاڑیوں وغیرہ کے ڈرائیوروں کی بے پروائی کے سبب سے پیش آئے۔ باقی آٹھ حادثوں کے اسباب متفرق ہیں۔

انجمن ترقی اُردو ہند

جناب مولوی عبدالحق صاحب نے ابتدا سے اپنی زندگی اُردو کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اپنی زبان کی ترقی کے لئے مولوی صاحب نے جو عظیم الشان قربانیاں کی ہیں اور اسے اپنا مقصدِ زندگی بنا کر جس انہماک کی مثال قائم کی ہے اس کی بہت کم نظیریں اس سے پہلے ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ مولوی صاحب اپنے زمانۂ ملازمت میں بھی بہت تن دہی سے اُردو کا کام کرتے رہے ہیں۔ بے شمار نایاب کتابوں کی اشاعت و طباعت کے علاوہ اُسی زمانے میں انجمن ترقیٔ اردو کے دو جلیل القدر رسالے "اُردو" اور "سائنس" کے نام سے جاری ہوئے جو نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں۔ پنشن لینے کے بعد مولوی صاحب نے اپنا تمام وقت اردو کی خدمات کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اگر وہ اب آرام کرنے کے لئے خانہ نشین ہو جاتے تو کوئی شخص اعتراض نہ کر سکتا تھا، اُن کا آرام کا وقت تھا، اور عمر بھر کی محنت کے بعد اب وہ آرام کے مستحق بھی تھے۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اسی زمانے میں ان کی محبوب زبان کو ان کی خدمات کی زیادہ ضرورت پیش آگئی اور مولوی صاحب نے بڑھاپے میں آرام کرنے کے بجائے اپنی سرگرمیوں میں اور اضافہ کر لیا۔ اب وہ "انجمن ترقی اردو" کو اورنگ آباد (دکن) سے دہلی لے آئے ہیں تاکہ ملک کے مرکز میں بیٹھ کر قومی زبان کی تبلیغ و ترقی کے فرض سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہو سکیں۔ پہلے مولوی صاحب ایک گوشے میں بیٹھ کر نہایت خاموشی سے کام کر رہے تھے لیکن موجودہ حالات میں ملک کے ہر گوشے کو انکی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف مقامات کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔

قارئین کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو کے دفاتر کے لئے زمین خرید لی گئی ہے۔ یہاں ڈھائی لاکھ روپے کے صرف سے انجمن کے دفاتر اور اس کا ایک کتب خانہ تعمیر ہوگا۔ جس میں اُردو کی نایاب کتابیں اور قدیم رسائل و جرائد کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع کیا جائیگا۔ اکثر مخیر اصحاب اس مقصد کے لئے اپنی بیش قیمت کتابیں اور دوسری قسم کی امداد پیش کر رہے ہیں۔ اُردو کے ہر بہی خواہ کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

حامد علی خاں

سیاسیات اور گالیاں

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جو اسمبلیاں اس وقت قائم ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ پبلک کی اکثریت کی صحیح نمائندگی کا اہم فرض ادا کر رہی ہیں، ایک خاص شعبہ میں بہت پیچھے ہیں اور اپنی ناقابلیت پر جس قدر اظہارِ شرمساری کریں، کم ہے۔

پبلک کا بہت بڑا حصہ برہنہ الفاظ کے استعمال کا عادی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پبلک دغاباز نہیں۔ دل اور زبان ایک ہیں۔ جو دل میں آتا ہے، وہی مُنہ سے نکلتا ہے۔

یہ مانا کہ اسمبلی والے اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے پبلک کے مروجہ محاورات استعمال نہیں کر سکتے مگر آخر کب تک یہ برائے نام نمائندگی چلے گی؛ گالی ہندوستان کا ایک تبرک ہے جو بلالحاظِ مذہب و ملت گلی کوچوں میں روزانہ تقسیم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ گو عورتوں کو اور ہر قسم کے حقوق سے محروم کیا گیا ہے مگر گالی سے ان کے کان ناآشنا نہیں۔ شادی کے موقع پر سمدھنوں کی تواضع اسی تبرک سے ہوتی تھی، اور اگر اندرونِ خانہ والیاں نااہل ہوتیں تو ڈومنیوں سے گالیاں دلوائی جاتیں۔ اب والی کی یہ حالت ہے کہ گو بازاروں میں فصاحت کا رنگین قلزم برابر جاری ہے مگر اسمبلیوں میں صاف سلیس گالی عنقا ہے۔ ہند کی مرکزی اسمبلی میں ایک آنریبل ممبر کو وزیرِ فنانس پر بہت غصہ آیا تو ممبر صاحب صرف یہ کہہ سکے کہ ان بزرگوار کا چہرہ تو قدسیوں کا سا ہے مگر طرزِ عمل Tank کا۔ (Tank وہ آہنی متحرک قلعہ ہے جس کے اندر مشین گن اور ہمچو قسم دیگر بلیات مستور رہتی ہیں)۔ ان آنریبل ممبر نے کس قدر تصنع سے کام لیا۔ غضب ہے کہ انتخابوں میں ملک کے لاکھوں روپے اُٹھ جائیں اور منتخب شدہ ممبروں کو اپنے ملک کی زبان نہ آئے۔ اب بھی وقت ہے کہ اسمبلیوں میں گالی جیسی خالص سودیشی پیداوار کی حمایت میں کمیٹی قائم کر کے اس کام کو باقاعدہ جاری کیا جائے۔ ابتدا اس طرح ہو سکتی ہے کہ آنریبل ممبر پہلے چند اصطلاحات وضع کریں اور استعمال کریں۔ نمونے درج ہیں:-

اصطلاحات

۱۔ آنریبل گیدڑ۔ اس ممبر کے لئے جو بلند اور کرخت آواز سے تقریر کرے۔

۲۔ آنریبل کودکِ ناداں ۔ اس ممبر کے لئے جو محض اتفاق سے کوئی معقول بات کہہ دے۔

۳۔ آنریبل جُوع الارض / آنریبل خاک بہ دہن } اس ممبر کے لئے جو زمین ملنے کی توقع میں وزرا کی کفش بوسی کرے۔

۴۔ آنریبل ماہی گیر۔ اس ممبر کے لئے جو بیٹے یا بھتیجے یا بھانجے یا سالے کی ملازمت کے لئے دفاتر کی دریوزہ گری کرے، اور اردلیوں کا مربی بنے۔

۵۔ آنریبل صفر مقام۔ اس ممبر کے لئے جو کچھ بھی نہ ہو۔

۶۔ آنریبل بہتان الابیض۔ اس ممبر کے لئے جو جہاندیدہ سفید ریش مردِ معتبر ہو۔

۷۔ آنریبل جل تھل۔ اس ممبر کے لئے جو اپنی زمین کے لئے نہر کا متلاشی ہو۔

۸۔ آنریبل چھچھوڑا۔ اس ممبر کے لئے جو وزارت۔کے خواب دیکھے۔

۹۔ آنریبل زرگیر۔ ہر مخالف وزیر کے لئے۔

۱۰۔ اگر کسی وجہ سے صدر اسمبلی سے بے تکلفی کی ضرورت محسوس ہو تو "جناب عالی" کو اس طرح ادا کیا جائے کہ لوگ سنیں کہ "جناب آلو" کہا گیا، مگر یہ احتیاط رہے کہ زبان سے محض لغزش سے بھی ہرگز جنابِ اُلو کہیں نہ نکل جائے۔ اسمبلیوں میں ہر قسم کا سچ خطرناک ہے۔

۱۱۔ آنریبل گپتی۔ اس ممبر کے لئے جو پروفیسروں کی طرح تقریر کرے۔

ممکن ہے کہ بعض ماہرانِ سیاسیات کا خیال ہو کہ سیاسیات اور گالی لازم ملزوم نہیں مگر یہ محض ناتجربہ کاری ہے۔ صحیح رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ سیاسیات اور گالیاں جسم و جان ہیں۔ جہاں جان کمزور ہے وہاں جسم بھی نحیف و زار ہے۔ ہندوستان اگر شاہراہِ ترقی میں بڑھنا چاہتا ہے تو کشت و خون سے مفر نہیں اور گالی (خالص سودیشی گالی) ہاتھا پائی، مارپیٹ، لوٹ کھسوٹ کشت و خون کا ضروری دیباچہ ہے۔ اسمبلی اگر گالی کی ٹکسال نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ملک کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ درجنوں سہ ہزاری عہدے ہندوستانیوں کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں اور ایک بھی دلپسند گالی کسی اسمبلی میں اختراع نہ کی جائے۔

ہندوستان کا گزارا کسان پر ہے۔ کسان کا گزارا بیل پر ہے۔ بیل کا گزارا گالی پر ہے۔

ہندوستان کے لیڈروں کا گزارا شہروں کے جلسوں پر ہے۔ شہروں کے جلسوں کا گزارا مہتروں پر ہے۔ مہتروں کا گزارا گالی پر ہے۔

"واہ ری بھارت ماتا!"

مذاق ہو چکا۔ با اختیار حکومتیں ہر صوبے میں ہوں اور کسی کا دل یہ محسوس نہ کرے کہ یہ کیا ظلم ہے کہ معصوم بچیاں عصمت مآب بیبیاں بازاروں سے بغیر مغلظات سنے گزر نہ سکیں۔ کوئی تعزیر ایسا نہیں جو اس جرم کی سزا کے لئے بہت سخت ہو۔ جب تک ہماری اسمبلیاں اس ظلم کا انسداد نہ کریں یہ اسمبلیاں خود گالی ہیں۔

"فلک پیما"

میلادِ آدم

(اقبال رح کی ایک نظم کا سلیس ہندی ترجمہ)

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شُد — (۱) پریت نے آہ بھری سینے میں خون کا رونے والا آیا

حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد — کانپ اُٹھی سُندرتا پریم کے بیج کا بونے والا آیا

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — (۲) لرز اُٹھی یہ دیکھ کے فطرت اس بھولی بسری مٹی سے

خودگرے، خود شکنے، خودنگرے پیدا شُد — اپنا سروپ بنانے، توڑنے، کھوجنے، کھونے والا آیا

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل — (۳) بات یہ پھیلی آکاش میں اور پردے سے ازل کے جا کر اُلجھی

حذر اے پردگیان پردہ درے پیدا شُد — ڈرتے رہو اے پردے والو لاج ڈبونے والا آیا

آرزو بیخبر از خویش بہ آغوشِ حیات — (۴) آس نے گودی میں جیون کی آنکھ جو کھولی تو کیا دیکھا

چشم وا کرد و جہانے دگرے پیدا شُد — ایک نیا سنسار بسا ہے، کاٹنے بونے والا آیا

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عُمر — (۵) کہنے لگی یہ جیون شکتی تڑپ تڑپ مٹی میں رہی میں

تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شُد — اب یہ نیا دروازہ کُھلا سنسار سمونے والا آیا

مقبول احمد پوری

"پگلا"

اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اُس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اُترا اور اِن تمام منزلوں کا بوجھ اُس کے چوڑے مگر دُبلے کاندھوں پر سوار ہوتا گیا۔ جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لئے اُوپر چڑھ رہا تھا تو اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اِس لئے کہ اُس نے اپنے دِل میں سوچا تھا کہ مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پکارتے ہیں، اُس کی بپتا ضرور سُنے گا اور کرایہ چکانے کے لئے اُسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا —— بخش دے گا! . . . . یہ سوچتے ہوئے اُس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی لیکن فوراً ہی اُس کو اصلیت بھی معلوم ہو گئی تھی . . . . وہ بھیک مانگنے ہی تو جا رہا تھا اور بھیک ہاتھ پھیلا کر آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر اپنے دُکھ درد سُنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے ——!

اُس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اُس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اُس نے اپنے غرور کو، اُس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رُکاوٹ پیدا کیا کرتی ہے، نکال کر گزرگاہ پر ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دِیا بُجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اُس روشن کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کیا کرتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں، اُس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا۔ دو بڑی بڑی آنکھوں نے اس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدّی سی آواز گونجی۔

"کنیشو لال . . . کھولی پانچویں، دوسرا مالا . . . . دو مہینے کا کرایہ . . . . لے آئے ہو کیا؟"

یہ سُن کر اُس نے اپنا دل، جس کے سارے پُرانے اور نئے گھاؤ، وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کُرید کُرید کر ہرے کر چکا تھا سیٹھ کو دکھانا چاہا۔ اُسے پُورا پُورا یقین تھا کہ اُسے دیکھ کر اُس کے دِل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی، پر . . . سیٹھ جی نے کچھ سُننا نہ چاہا۔ اور اُس کے سینے میں ایک ہنڑ سا مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لئے اُس نے اپنے وُہ تمام دُکھ جو بیت چکے تھے، گئے گزرے دِنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اپنے دِل میں بھر لئے تھے اور اُن تمام زخموں کی جلن جو مدّت ہوئی مِٹ چکے تھے۔ اُس نے بڑی مشکل سے اکٹھی کر کے اپنی چھاتی میں جمع کی تھی، اب اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو وہ کیسے سنبھالے!

اُس کے گھر میں بِن بُلائے مہمان آ گئے ہوتے تو وہ اُن سے بڑے رُوکھے پن کے ساتھ کہہ سکتا تھا "جاؤ بھئی جاؤ۔ میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس روپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارات کر سکوں"۔ لیکن یہاں تو قصّہ ہی اور تھا۔ اُس نے تو اپنے بھولے بھٹکے دُکھوں کو اِدھر اُدھر سے پکڑ کر آپ اپنے سینے میں جمع کیا تھا، اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے۔

افراتفری میں اُسے کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ اُس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی ہیں۔ پر جوں جوں اُس نے سوچنا شروع کیا، وہ پہچاننے لگ گیا کہ فلاں دُکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اُسے فلاں وقت پر ہُوا تھا اور جب یہ سوچ بچار شروع ہوئی تو حافظے نے بڑھ کر وہ دُھند ہٹا دی جو اِن پر لپٹی ہوئی تھی اور کل کے تمام دُکھ درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور وہ اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنے لگ گیا۔

اُس نے سوچا، تھوڑے سے وقت میں اُس نے بہت کچھ سوچا، اُس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اُس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اُوپر مسکرا رہا تھا، کئی بار اُس کے پیوند لگے کپڑے اُن کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اُس کے مَیلے بدن سے چمٹ گئے، جو دیواروں میں گڑی چمک رہی تھیں، کئی بار اُسے اُن داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دُور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے، مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کُرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی ایک جُنبش کچھ کا کچھ کر سکتی تھی۔ وُہ اس بارے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا، کئی بار اُسے خیال آیا اور وُہ سوچنے لگا کہ اُسے کیا خیال آیا تھا مگر وُہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کر سکا۔ وہ سخت گھبرا گیا تھا، اُس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصّے میں آ کر اُسے گالی دی —— گالی . . . یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہُوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اُس کے دل میں اُتر گیا، اور اُس کے سینے کے اندر جو ہُلّڑ مچا اُس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔ جس طرح کسی گرما گرم جلسے میں کسی کی شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے، ٹھیک اُسی طرح اُس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی، اُس نے بہت جتن کئے کہ اُس کے وُہ دُکھ درد جو اُس نے سیٹھ کو دکھانے کے لئے اکٹھے کئے تھے چُپ چاپ رہیں پر کچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے مُنہ سے نکلنا تھا کہ وہ تمام بے چین ہو گئے اور اندھا دُھند ایک دُوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ اب تو وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہہ سکا اور اُس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی سے تپ رہی تھیں، آنسُو آ گئے جس سے اُن کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور اُن سے دھُواں سا نکلنے لگا۔

اُس کے جی میں آئی کہ اس گالی کی جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھُرّیاں پڑے چہرے پر قے کر دے، مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اُس کا غرور تو باہر گزرگاہ پر پڑا تھا: اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور . . . . اُس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور اُن کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اُس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر رکھے کے باعث گیلے ہو

رہے تھے، ناچنے لگ گئے۔

اُس کی آنکھیں ہنسیں، اُس کا دِل بھی ہنسا، یہ سب کچھ ہُوا پر وہ کڑواہٹ دُور نہ ہوئی جو اُس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کردی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وُہ اسے تھوک دیتا۔ مگر وہ تو بہت بُری طرح اُس کے گلے میں اٹک گئی تھی اور نکالے نہ نکلتی تھی، اور پھر ایک عجیب قسم کا دُکھ جو اس گالی نے پیدا کردیا تھا، اُس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا فضول سمجھتی تھیں، اُس کے سینے کے اندر اُتر کر آنسو بہا رہی ہیں، جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اُسے پھر گالی دی، اُتنی ہی موٹی جتنی کہ اُس کی چربی بھری گردن تھی اور اُسے یوں محسوس ہُوا کہ کسی نے اُوپر سے اُس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے، چنانچہ اُس کا ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف حفاظت کے لئے بڑھا پر اُس گالی کی ساری گرد اُس پر پھیل چکی تھی ——— اب اُس نے وہاں ٹھہرنا اچھا نہ سمجھا کیونکہ کیا خبر تھی . . . . کیا خبر تھی . . . . اُسے کچھ خبر نہ تھی . . . . . وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہا کرتی۔

وُہ جب نیچے اُترا تو اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ اُس پتھر کی ساتوں منزلیں اُس کے کندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

ایک نہیں، دو گالیاں ——— بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کی مانند اپنے مُنہ سے اُگل دی تھیں، اُس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اُس . . . . . اُس . . . . . اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس گڑبڑ کا نام کیا رکھے جو اُس کے دل اور دماغ میں اِن گالیوں نے مچا دی تھی۔ وُہ کیسے اُس تپ کو دُور کر سکتا تھا جس میں وُہ پُھنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟ . . . . . پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اُس کا دماغ تو اُس وقت ایک ایسا اکھاڑا بنا ہُوا تھا جس میں بہت سے پہلوان کُشتی لڑ رہے ہوں، جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا کسی دُوسرے خیال سے جو پہلے ہی سے وہاں موجود تھا، بھڑ جاتا تھا اور وُہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا تھا۔

چلتے چلتے جب ایکا ایکی اُس کے دُکھ تُنے کی صُورت میں باہر نکلنے کو تھے اُس کے جی میں آئی، جی میں کیا آئی، مجبوری کی حالت میں وُہ اُس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے پاس سے گزر رہا تھا یہ کہنے ہی والا تھا "بھیا میں رو گی ہوں"! مگر جب اُس نے اُس راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وُہ کھمبا جو اُس کے پاس ہی زمین میں گڑا تھا، اُسے اُس سے کہیں زیادہ حسّاس دکھائی دیا اور جو کچھ وُہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا، ایک ایک گھونٹ کرکے پھر نگل گیا۔

فُٹ پاتھ میں چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، وُہ اِن پتھروں پر چل رہا تھا۔ آج تک اُس نے کبھی ان کی سختی محسوس نہ کی تھی مگر آج اُن کی سختی اُس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فُٹ پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اُس کے قدم پڑ رہے تھے، اُس کے

دل کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی وہ تھوڑی ہی دُور گیا ہوگا کہ اُس کا بند بند ڈھیلا ہوگیا۔ چلتے چلتے اُس کی ایک لڑکے سے ٹکر ہوئی اور اُسے یوں محسوس ہُوا کہ وہ ٹوٹ گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے جھٹ اُس آدمی کی طرح جس کی جھولی سے بیر گر رہے ہوں، اِدھر اُدھر اپنے ہاتھ پھیلائے اور اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے چلنا شروع کردیا۔

اُس کا دماغ اُس کی ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا نچلا دھڑ سارے کا سارا بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اُس کا دماغ بہت آگے نکل گیا ہے۔ کئی بار اُسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوجائیں۔

وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا جس کے اِس طرف سڑک پر پوں پوں کرتی موٹروں کا تانتا بندھا ہُوا تھا۔ گھوڑے گاڑیاں، ٹرامیں، بھاری بھرکم ٹرک لاریاں یہ سب سڑک کی کالی چھاتی پر دندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہُوا تھا، پر اُس کے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا، وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے۔ جیسے ریل گاڑی کا انجن زائد بھاپ باہر نکال رہا ہے۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اُس کی ٹکر ہوئی، کتے نے اس خیال سے کہ شاید اُس کا زخمی سر روند دیا گیا ہے "چاؤں" کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے پھر اسے گالی دی ہے . . . . . گالی . . . . . یہ گالی ٹھیک اُسی طرح اُس سے اُلجھ کے رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اس سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا، اتنی ہی زیادہ اُس کی رُوح زخمی ہوتی جارہی تھی۔

اُسے اُس نمک لگی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا جو اُس کے گھر میں برکھا کے باعث گیلی ہو رہی تھی اور نہ اُسے روٹی کپڑے کا خیال تھا۔ اُس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور ان تیس برسوں میں جن کے پرماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں، وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا اور نہ وہ کبھی ننگا ہی پھرا تھا۔ اُسے صرف اس بات کا دُکھ تھا کہ اُسے ہر مہینے کرایہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے، اُس بکرے جیسی داڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے پیسے دے، شام کو تاڑی کی ایک بوتل کے لئے دونی پیدا کرے یا اُس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ دے۔ مکانوں اور کرایوں کا فلسفہ اُس کی سمجھ سے سدا اُونچا رہا تھا۔ وُہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اُس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تو وہ سمجھتا تھا کہ زبردستی اُس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے۔ اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دینے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چکتا نہ کرسکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہوگیا کہ وہ اُسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو یہی تھی جو اُسے کھائے جارہی تھی۔ اُسے اُن بیس روپوں کی پروا نہ تھی جو اُسے آج نہیں کل ادا کردینے تھے، وہ اُن دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا جو اِن بیس روپوں کے بیچ میں سے نکلی تھیں، نہ وہ بیس روپے کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھالی جیسے مُنہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔

مان لیا وہ دھنوان تھا، اُس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں، جن کے ایک سو چوبیس کمروں کا کرایہ اُس کے پاس آتا تھا، پر ان ایک سو چوبیس کمروں میں جتنے لوگ بھی رہتے تھے، اُس کے غلام تو نہیں تھے، اور اگر غلام بھی ہوتے تو بھی وہ انہیں گالی کیسے دے سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے، اُسے کرایہ چاہئے، پر مَیں کہاں سے لاؤں، پانچ برس تک اُس کو دیتا ہی رہا ہوں، جب ہوگا دے دوں گا۔ پچھلے برس برسات کا سارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا، پر مَیں نے اُسے کبھی گالی نہ دی، حالانکہ مجھے اُس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں' مَیں نے سیٹھ سے ہزار بار کہا کہ سیڑھی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے' اسے بنوا دیجئے' پر میری ایک نہ سُنی گئی۔ میری پھول سی بچی گری، اُس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لئے بے کار ہوگیا، مَیں گالیوں کے بجائے اُسے بددعائیں دے سکتا تھا پر مجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا۔ . . . . .

اور دو مہینے کا کرایہ نہ چکانے پر مَیں گالیوں کے قابل ہوگیا۔ اُس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اُس کے بچے اپولو بندر پر میرے تھیلے سے مٹھیاں بھر کے مونگ پھلی کھاتے ہیں۔"

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے پاس تھی اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اُس سے بھی زیادہ دولت ہوگی، پر وہ غریب کیسے ہوگیا؟ . . . . . اُسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی دی گئی تھی ورنہ اُس کنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ وُہ کرسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اُسے دو گالیاں سُنا دیتا، گویا کسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا بہت بُری بات ہے۔ اب یہ اُس کا قصور نہیں تھا کہ اُس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ سچ پوچھئے تو اُس نے کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے، وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اُس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی، پر پچھلے مہینے ایکا ایکی اُس کی بیوی بیمار پڑ گئی اور اُس کے دوادارو پر وہ تمام روپے خرچ ہوگئے جو کرائے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا لیکن یہاں تو اُس کے ہونے والے بچّے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اُس کو اولاد بہت پیاری تھی، جو پیدا ہو چکی تھی اور جو پیدا ہونے والی تھی، سب کی سب اُسے عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟ —— کیا وہ اُس بچّے کا باپ نہیں تھا —— باپ —— پِتا . . . . . وہ تو صرف دو مہینے کے کرائے کی بات تھی، اگر اُسے اپنے بچّے کے لئے چوری بھی کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چُوکتا. . . . .

چوری۔ نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا . . . . یوں سمجھئے کہ وہ اپنے بچّے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار تھا، مگر وہ چور کبھی نہ بنتا . . . . وہ اپنی چھنی ہوئی چیز واپس لینے کے لئے لڑنے مرنے کو تیار تھا، پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اُس وقت جب سیٹھ نے اُسے گالی دی تھی، آگے بڑھ کر اُس کا ٹینٹوا دبا دیتا اور اُس تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور مٹیرے نوٹ نکال کر بھاگ جاتا جن کو وہ آج تک لاجونتی کے پتے سمجھا کرتا تھا . . . . . نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہ کرتا . . . لیکن پھر سیٹھ نے اُسے گالی کیوں دی؟

پچھلے برس چوپاٹی پر ایک گاہک نے اُسے گالی دی تھی، اس لئے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی میں چار دانے کڑوے چلے گئے تھے اور اُس نے اس کے جواب میں اُس کی گردن پر ایسی دھول جمائی تھی کہ دُور بنچ پر بیٹھے آدمیوں نے بھی اُس کی آواز سُن لی تھی، مگر سیٹھ نے اُسے دو گالیاں دیں اور وہ چُپ رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیشو لال کھاری سینگ والا جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا، سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا — دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا، جیسے وہ مٹی کا پُتلا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر مٹی کا پُتلا کیسے ہُوا، اُس نے اِن دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے مُنہ سے نکلتے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چُوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں، اور وہ جان بُوجھ کر خاموش ہو رہا، اس لئے کہ وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اُس نے اپنا غرور اپنے سے کیوں الگ کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیٹھ سے گالیاں سننے کے لئے؟

یہ سوچتے ہوئے اُسے ایکا ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اُسے نہیں کسی اَور کو گالیاں دی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں نہیں، گالیاں اُسے ہی دی گئی تھیں، اس لئے کہ دو مہینے کا کرایہ اُسی کی طرف نکلتا تھا۔ اگر اُسے گالیاں نہ دی گئی ہوتیں تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی، اور یہ جو اُس کے سینے میں ہلڑ سا مچ رہا تھا کیا بغیر کسی وجہ کے اُسے دُکھ دے رہا تھا۔ اُسی کو دو گالیاں دی گئی تھیں۔

جب اُس کے سامنے ایک موڑ نے اپنے ماتھے کی بتّیاں روشن کیں تو اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اُس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں — گالیاں ۔ ۔ ۔ گالیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ جھنجلا گیا — وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ اِن گالیوں کی بابت نہ سوچے، اُتنی ہی شدّت سے اُسے اُن کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اُسے بہت چڑچڑا بنا رہی تھی، چنانچہ اسی چڑچڑے پن میں اُس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اُس کے پاس سے گزر رہے تھے دِل ہی دِل میں گالیاں دیں" — یوں اکڑ کے چل رہے ہیں جیسے اِن کے باوا کا راج ہے۔"

اگر اُس کا راج ہوتا تو وہ اُس سیٹھ کو مزا چکھا دیتا جو اُسے اُوپر تلے دو گالیاں سُنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اُس نے اپنی گدے دار کُرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیئے ہیں — سچ مچ اگر اُس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اُس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپّا مارتا کہ وہ بلبلا اُٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو جی بھر کے ہنسو اور وہ خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اُس کا پیٹ دُکھنے لگ جاتا — پر اس وقت اُسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی — کیوں؟ — وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپّا مار سکتا تھا، اُسے کس بات کی رُکاوٹ تھی؟ — رکاوٹ تھی — رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سُن کر خاموش ہو رہا۔

اُس کے قدم رُک گئے، اُس کا دماغ بھی ایک دو پل کے لئے سستایا اور اُس نے سوچا کہ چلو ابھی اِس جھنجٹ کا فیصلہ ہی کر ڈالوں — بھاگا ہُوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اُس تجوری پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگرمچھ کے مُنہ کی طرح کُھلتا تھا

—— لیکن وہ کھمبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا، سیٹھ کے گھر کی طرف پلٹتا کیوں نہیں تھا؟ —— کیا اُسے جرأت نہ تھی؟
اسے جرأت نہ تھی —— کتنے دُکھ کی بات تھی کہ اُس کی ساری طاقت سرد پڑ گئی تھی —— یہ گالیاں —— وہ اِن گالیوں کو کیا کہتا —— اِن گالیوں نے اُس کی چوڑی چھاتی پر رولر سا پھیر دیا تھا —— صرف دو گالیوں نے —— حالانکہ پچھلے ہندو مسلم فساد میں ایک ہندو نے اُسے مسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور ادھ مُوا کر دیا تھا اور اسے اتنی کمزوری محسوس نہ ہوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی —— کیشو لال کھاری سینگ والا جو اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑا آج یوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے —— اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؛ —— دو گالیوں نے!

گالیاں —— گالیاں —— کہاں تھیں وہ دو گالیاں؛ اُس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ اِن دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اُس کے سامنے آئے اُس کے سر پر دے مارے، پر یہ کیسے ہو سکتا تھا —— اُس کا سینہ مربّے کا مرتبان تھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے لیکن پھر کوئی اَور ترکیب بھی تو سمجھ میں آئے جس سے یہ گالیاں دُور دفان ہوں۔ کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اُسے اس دُکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؛ —— کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؛ —— ہو گا، پر کسی کو اُس کے دِل کے حال کا کیا پتا تھا، وہ کھلی کتاب تھوڑی تھی اور نہ اُس نے اپنا دل باہر لٹکا رکھا تھا، اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؛
نہ معلوم ہو! —— پرماتما کرے کہ کسی کو معلوم نہ ہو —— اگر کسی کو اندر کی بات کا پتا چل گیا تو کیشو لال کھاری سینگ والے کے لئے یہ ڈوب مرنے کی بات تھی —— گالیاں سن کر خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؛

معمولی بات نہیں بہت بڑی بات تھی —— ہمالہ پہاڑ جتنی بڑی بات تھی، اُس سے بھی بڑی بات تھی۔ اُس کا غرور مٹی میں مِل گیا تھا۔ اُس کی ذلّت ہوئی تھی، اُس کی ناک کٹ گئی تھی —— اُس کا سب کچھ لُٹ گیا تھا، چلو بھئی چھٹی ہوئی —— اب تو یہ گالیاں اُس کا پیچھا چھوڑ دیں —— وہ کمینہ تھا، رذیل تھا، نیچ تھا، گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا، کتا تھا، —— اُس کو گالیاں ملنا ہی چاہئے تھیں —— نہیں نہیں کسی کی کیا مجال تھی کہ اُسے گالیاں دے اور پھر بغیر کسی قصور کے، وہ اُسے کچا نہ چبا جاتا - - - - اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں - - - تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سُنیں جیسے وہ میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

"میٹھی میٹھی بولیاں تھیں، بڑے مزے دار گھونٹ تھے، چلو یہی سہی —— اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ سچ کہتا ہوں میں دیوانہ ہو جاؤں گا —— یہ لوگ جو بڑے آرام سے اِدھر اُدھر چل پھر رہے ہیں، مَیں اِن میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا، بھگوان کی قسم مجھے اب زیادہ تاب نہیں رہی، میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا، لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا —— مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں: مر جاؤں گا اور میری رادھا ودھوا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے

. . . یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ میں نے سیٹھ سے دو گالیاں سُنیں اور خاموش رہا جیسے میرے مُنہ میں تالا لگا ہُوا تھا، میں لُولا لنگڑا اپاہج تھا . . . . پرماتما کرے میری ٹانگیں اس موٹر کے نیچے آکر ٹوٹ جائیں، میرے ہاتھ کٹ جائیں . . . . میں مر جاؤں تاکہ یہ بک بک تو ختم ہو . . . . توبہ . . . . کوئی ٹھکانا ہے اس دُکھ کا ــــ کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کردوں ــــ اس ٹریم کے نیچے سر دے دوں، زور زور سے چلّانا شروع کردوں . . . . کیا کروں اور کیا نہ کروں"

یہ سوچتے ہوئے اُسے ایکاایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ میں کھڑا ہو جائے اور سب ٹریفک کو روک کر جو اُس کی زبان پر آئے بکتا چلا جائے حتیٰ کہ اُس کا سینہ سارے کا سارا خالی ہو جائے، یا پھر اُس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلّانا شروع کر دے "مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ!"

اتنے میں ایک آگ بجھانے والا انجن سڑک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور ادھر اس موڑ میں گم ہو گیا۔ اُس کو دیکھ کر وہ اُونچی آواز میں یہ کہنے ہی والا تھا "ٹھہرو ــــ میری آگ بُجھاتے جاؤ" مگر نہ جانے کیوں رُک گیا۔

ایکاایکی اُس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ اُسے ایسا محسوس ہُوا تھا کہ اُس کی سانس رُکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ پھٹ جاتا، لیکن جُونہی اُس کی رفتار بڑھی، اُس کا دماغ آگ کا ایک چکّر سا بن گیا ــــ اس چکّر میں اُس کے سارے پُرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صُورت میں گُندھ گئے ــــ دو مہینے کا کرایہ، اُس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا ــــ سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدّی آواز، اُس کے گنجے سر پر مُسکراتا ہُوا بجلی کا لیمپ اور ــــ یہ موٹی گالی . . . . پھر دوسری . . . اور اُس کی خاموشی . . . . یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکّر میں سے تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔

اُس نے اپنے قدم اور تیز کئے اور آگ کا یہ چکّر اتنی تیزی سے گھومنا شروع ہُوا کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گیا جو اُس کے آگے آگے زمین پر اُچھلنے کُودنے لگی۔

وہ اب دوڑنے لگا، لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں چلّایا "تم کیوں بھاگ رہے ہو، کس سے بھاگ رہے ہو ــــ تم بُزدل ہو۔"

اُس کے قدم آہستہ اُٹھنے لگے، بریک سی لگ گئی اور وہ ہولے ہولے چلنے لگا . . . . وہ سچ مُچ بُزدل تھا . . . . وُہ بھاگ کیوں رہا تھا؟ . . . . اُسے تو انتقام لینا تھا . . . . انتقام . . . . یہ سوچتے ہوئے اُسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہُوا اور اُس کے بدن میں ایک جھُرجھُری سی پیدا ہوئی۔ لہو . . . . لہو . . . . اُسے آسمان زمین سب لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے . . . . لہو . . . . اِس وقت اس میں اتنی قوّت تھی کہ وہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ لے۔

اُس کی آنکھوں میں لال ڈورے اُبھر آئے۔ اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور اُس کے قدموں میں مضبوطی پیدا ہوگئی ــــ اب وہ انتقام پر تُل گیا تھا۔

وہ بڑھا۔

آنے جانے والے لوگوں میں سے وُہ تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا، آگے بڑھتا رہا ــــ آگے ــــ آگے!

جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ دیا کرتی ہے، اِسی طرح وُہ بجلی کے کھمبوں، دُکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا ــــ آگے ــــ آگے ــــ بہت آگے!

راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی۔ اُس نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اُس کے پاس سے بے پرواہوا کے مانند گزر گیا۔

وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اُس نے اپنے ہر ذرّے کو ایک بم بنا لیا تھا تاکہ وقت پر کام آئے۔

مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتا ہُوا وہ اپولو بندر پہنچا ــــ اپولو بندر ــــ گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں، اِن کو دیکھ کر اُس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گِدھ پر جوڑے کسی کی لاش کے اردگرد بیٹھے ہیں۔ جب اُس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا تو اُسے یہ ایک لمبی چوڑی لاش معلوم ہوئی ــــ اِس سمندر کے اِس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالیشان ہوٹل کی پیشانی کا برقی نام تھا جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گُدگدی پیدا کر رہی تھی۔

کیشولال کھاری سینگ والا اُس عالیشان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہوگیا ــــ اُس برقی بورڈ کے عین نیچے۔ قدم گاڑ کر اُس نے اُوپر دیکھا ــــ سنگین عمارت کی طرف جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے، اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے حلق سے ایک نعرہ۔ ۔ ۔ ۔ کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کی مانند نکلا "ہت تیری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اُونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔

نعرہ مار کر جب اُس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کئے اور واپس مُڑا تو اُسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑاڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سُن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سُن کر ڈر گئی تھی، کہا "پگلا ہے!"

x x x x x x x

سعادت حسن منٹو

غزل

چارہ گر کو نظر نہیں آتا
داغِ دل، کیوں اُبھر نہیں آتا

جو نظر آتا ہوں، نہیں ہُوں مَیں
اور جو کچھ ہوں، نظر نہیں آتا

اُس کی آنکھوں میں کچھ جگہ پاؤں
مجھے ایسا ہُنر نہیں آتا

میرے ہمرہ ہے راہبر میرا
پھر بھی میں، راہ پر نہیں آتا

نہ کرو کوئی آرزو امجدؔ
اِس شجر میں ثمر نہیں آتا

سید احمد حسین امجد

کچھ چہرے کچھ باتیں

لندن کی زندگی نام ہے ایک ہنگامے کا اور اس ہنگامے کے عناصر وہ بے پناہ مصروفیات ہیں جن سے صبح سات بجے سے لے کر اگلے دن صبح سات بجے تک فرصت نہیں ملتی۔ لیکن مجھ سے ہندوستانی کے لئے اگر لندن میں مشاغلِ حیات کی اس قدر کثرت نہ ہو تو جینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی ایک شام کو لیجیے۔ برٹش میوزیم میں غیر متوقع طور پر جلد کام ختم ہو گیا۔ تو یہ فکر دامن گیر تھی کہ سہ پہر کا باقی حصّہ اور شام کے کھانے تک وقت کیسے گزارا جائے۔ یہاں کے لوگوں کو جب دن رات بے تحاشا طور پر سُرعت سے حرکت کرتے دیکھتا ہوں تو اکثر حیران ہوتا ہوں کہ قیامت کے دن جب ہندوستان میں "نفسا نفسی" کا مظاہرہ لوگ اسی سُرعتِ رفتار اور اضطراب انگیز حرکات سے کریں گے تو یہاں کے لوگ صُورِ اسرافیل کے پھونکے جانے پر اپنے جذبات کے اظہار کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں گے! کیونکہ یہ تو پہلے ہی حدِ امکان تک "سریع الحرکات" ہیں اور باہمی بیگانہ پن کی وجہ سے یہ اظہارِ اضطراب کو بھی سُودمند نہیں سمجھتے۔ بہر حال مجھے نہ کچھ ایسی جلدی تھی کہ میں یہاں کے لوگوں کی طرح "آثارِ قیامت" میں اضافہ کرتا اور نہ کوئی خاص کام تھا اس لئے ہندوستانی سُست رفتاری کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہوا بلومز بری (Bloomsbury) سے گزر کر آکسفرڈ سٹریٹ میں کھڑا ہو گیا اور پھر ایسے ہی چلتا ہوا کارنر ہاؤس (Corner House) کے سامنے رُک گیا۔ چائے کا وقت قریب تھا اس لئے کارنر ہاؤس (یہ لندن کے مقبول ترین قہوہ خانوں میں سے ایک ہے) میں داخل ہونے کے لئے اپنے آپ کو زیادہ دیر تک آمادہ نہ کرنا پڑا۔ پہلی چھت پر ہزار سے زیادہ کرسیاں میزوں کے گرد لگی ہوئی ہونگی لیکن وردی پوش دربان ہر چند لمحوں کے بعد پکار رہا تھا

"Ground floor for tea please. First floor is full."

یعنی چونکہ پہلی چھت کا ہال پُر تھا اس لئے چائے کے لئے زیریں ہال میں تشریف لے جایئے۔ مَیں اس صدا کو سُن کر اپنے بستے اور برساتی کو سنبھالتا ہُوا زیریں ہال میں اُتر گیا۔ یہاں بھی ہجوم کا وہی عالم تھا لیکن کہیں کہیں کوئی کرسی خالی پڑی ہوئی تھی۔ مَیں اپنے لئے محدود کرسیوں میں سے ایک کرسی منتخب کرنے کے لئے دروازہ پر کچھ دیر کے لئے متامل ہُوا کہ ریستوران کے ایک ملازم نے آلیا:۔

"Only one; this way please."

یعنی اگر تم اکیلے ہو تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ یہ سُن کر مَیں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور اُس نے اپنی سہولت کے مطابق ایک خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ اِس میز کے گرد صرف دو کرسیاں تھیں اور دُوسری خالی پڑی ہوئی تھی۔

جس گوشے میں مجھے بٹھایا گیا اُس طرف کام کرنے والی لڑکی مجھ سے دُور ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے ایک پُورے خاندان کی تواضع میں مصروف تھی اور میری باری جلدی آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہ سوچ کر مَیں نے بستے سے صبح کا اخبار نکال لیا، اور اُسے پڑھنے لگا۔ چند منٹ کی اخبار بینی کے بعد طبیعت اُکتا گئی تو اخبار تہ کر کے رکھ دیا اور بے معنی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ لمحات کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں جب کام کرنے کو جی نہ چاہے اور کوئی کام بھی کرنے کے لئے نہ ہو۔

میرے پہلو والی قطار میں ایک بوڑھا فرنگی اپنی "نصف بہتر" کو ساتھ لئے ہُوئے آکر بیٹھ گیا۔ دونوں نے جلدی جلدی Menu کھانوں کی فہرستیں ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ اور عینکوں میں سے مبہم طور پر دیکھتے ہُوئے پکارا:۔

"Waitress!"

اُس قطار میں خدمت کرنے والی لڑکی فوراً حاضر ہوگئی۔

بوڑھے نے پوچھا "کونسی چیز تازہ اور تیار ہے۔ ہمیں بہت جلدی ہے"۔

لڑکی نے مختلف چیزوں کے نام لئے۔ اِس پر میاں بیوی میں مشورہ ہونے لگا اور کم و بیش پندرہ منٹ کی گفت و شنید کے بعد وہ ابھی تک Menu ہی دیکھ رہے تھے۔ اِتنے میں ایک اَور خادمہ نے منتظر لڑکی کو پکارا اور کہا:۔

"تم بھی کُرسی لے کر ساتھ بیٹھ جاؤ، ممکن ہے آج شام تک وہ کسی فیصلے پر پہنچ جائیں"۔ خادمہ جواب میں صرف مُسکرادی۔

بوڑھے اور بڑھیا سے ہٹ کر میری نگاہیں اب سارے ہال کے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کئی سَو مرد عورتیں اور کچھ بچے میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ تنہا، کچھ بیویوں یا شوہروں یا دوستوں سے مصروفِ گفتگو تھے لیکن اتنے بڑے مجمع کی سب آوازیں مِل کر بھنبھناہٹ سے زیادہ بلند نہ ہوتیں۔ مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر ان آوازوں کو بلند کیا جائے تو شاید مینارِ بابل کا سماں بندھ جائے۔ جہاں تک میں تمیز کرسکتا تھا چینی، جاپانی، مصری، فرانسیسی، ایرانی، حبشی اور جرمن چہرے تو مجھے کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ میرے قریب ہی ایک چینی لڑکی تین فرنگی لڑکوں سے محوِ گفتگو تھی۔ سیاساتِ حاضرہ پر لے دے ہو رہی تھی۔

فرنگی نے کہا "مِس ایو! آخر تم لوگ کب تک جاپانیوں کا مقابلہ کرو گے؟"

"کب تک!" چینی لڑکی نے دُہرایا "جب تک سرزمین چین کا ایک ایک اِنچ جاپان سے واپس نہ لے لیا جائے گا"

"لیکن یہ تو ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لئے تو تمہیں بہت خُون بہانا پڑے گا"

"اگر خون بہانے سے تمہاری یہ مُراد ہے کہ چینیوں کو اپنا خون بہانا پڑے گا۔ تو میں تمہیں یقین دِلا سکتی ہوں کہ چینی اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔ چین کی تاریخ مستقبل میں وہ دن نہیں آئے گا جب چینی کسی اَور مُلک کا محکوم ہو۔ وہ جب تک زندہ رہے گا بہر حال آزاد رہے گا"

ایک پتلی دُبلی ایشیائی لڑکی چینی ریشم اور تراش کا سایہ پہنے ہوئے اپنی قوم کے جذبات کی نمایندگی اور ترجمانی کر رہی تھی۔ اُس کے رخسار نہ رہینِ غازہ تھے نہ ہونٹوں پر سُرخی تھی۔ چوڑے چہرے پر ایک چھوٹی سی ناک رکھی ہوئی تھی اور آنکھیں نیم کشادگی سے مغلئی مصوری کی تصویروں کی یاد دِلا رہی تھیں۔ لیکن جب وُہ اپنے ملک اور قوم کی باتیں کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے دُنیا کے بہادروں کی شجاعت سمٹ کر اُس سینے میں سما گئی ہے جس نے ابھی جوانی کی محدود بہاریں ہی دیکھی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے اُس کی آواز کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ جب اُس کے زرد رُخسار تمتما اُٹھتے اور جب اُس کا ہاتھ بار بار سینے کے اُس حصّے پر آ کر لگتا جہاں سایہ غیر معمولی طور پر چُست تھا تو فرنگی لڑکے نجانے کس خیال سے زیرِ لب مسکرا دیتے۔ مگر چائے کے دوران میں ایک لمحے کے لئے بھی چینی لڑکی متبسم نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ جب لڑکوں نے کالج کی باتیں شروع کر دیں تو وہ اُس وقت بھی ہوں ہاں کہنے کے سوا زیادہ متوجہ نہ ہوئی۔ اُس کا تصوّر خدا جانے کیا کیا مناظر اُس کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ جنگ، ہولناک تباہی، عزیز و اقارب کی موت، ہموطنوں کی خانہ بربادی، لاوارث اور یتیم بچوں کے آفت زدہ چہرے، معصوم اور بے گناہ لوگوں کی مصیبت، کتنے خوفناک مناظر تھے، لیکن آزاد مُلک میں پیدا ہونا کتنی نعمت ہے۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی یہ نوجوان لڑکی اپنی قوم کی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ اپنے ملک کو آزاد رکھنے کے لئے اپنے ملکیوں کے خون کا آخری قطرہ تک قربان کرنے کے لئے آمادہ تھی۔ مَیں حیران ہو رہا تھا کیا آزادی سچ مچ اِس قدر عزیز شے ہے کہ اُس کے لئے خُون کا آخری قطرہ تک قربان کر دینا چاہیئے۔ اور کیا فرنگی لڑکے کا یہ خیال درست تھا کہ آزادی کے لئے بہت خُون بہانا پڑے گا۔ کیا ہندوستان کو بھی یہ سبق سیکھنا پڑے گا۔ اگر یہ حقیقت واقعیت پر مبنی تھی تو فرنگی اور فرنگی کے خودغرض ہندوستانی چیلے سوا سو سال سے ہندوستانیوں کو امن پسندی اور اس کے بعد عدم تشدّد کی تلقین کیوں کر رہے ہیں۔ اقبال مرحوم نے کن قوموں کے متعلّق کہا تھا: ؎

دِگرگوں جہاں اِن کے زورِ عمل سے بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

ہم سے تو عرصے سے اپنی قسمت ہی نہیں بدل سکی۔ جہان کو کیا دگرگوں کریں گے اور یہ ممکن ہی کب ہے۔ جب بڑے چھوڑ کر چھوٹے معرکوں سے بھی باز رہنے کی ہدایت ہمیں ہر روز ملتی ہے ’زورِ عمل‘ تو ہندوستان میں ایک بے معنی لفظ بن کر رہ گیا ہے۔

”Yes please?“ کہہ کر ہماری قطار کی خادمہ نے مجھے اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ مَیں نے چونک کر چائے اور دو توس لانے کے لئے کہا۔

”Bill did you see those refuge girls?“ (بِل تم نے جرمنی کی وہ پناہ گزین لڑکیاں دیکھیں؟)

یہ الفاظ میرے قریب ہی بیٹھتے ہوئے ایک لڑکے نے اپنے ساتھی سے کہے۔ معاً میری توجہ بھی اِن لڑکیوں کی طرف منعطف ہو گئی۔ ہٹلر نے جب سے یہودیوں کو جرمنی اور وسطی یورپ کے دیگر ممالک سے نکالنا شروع کیا ہے، اُس وقت سے لندن میں کثرت سے غیر ملکی یہودیوں کے

چہرے نظر آتے ہیں۔ اِن کی اجنبی وضع قطع، زبان اور لباس سے یہ لوگ فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔ یہ دو لڑکیاں بھی لمبی ناکوں، سیاہ بالوں اور سر پر بندھے ہوئے رومالوں سے اپنی اجنبیت کا اعلان کر رہی تھیں۔ جرمن ریفیوجی کمیٹی (جرمن کے پناہ گزینوں کی مدد کرنے والی مجلس) کے اعلان کے باوجود یہ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے جرمن زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ مذکورہ مجلس آفت زدہ جرمنی کے یہودیوں کی مدد کرنے کے لئے لندن میں فرنگیوں نے قائم کی ہے اور جہاں یہ مجلس مالی طور پر یہودیوں کی مدد کرتی ہے وہاں یہاں کی طرزِ معاشرت کے متعلق بھی اُن کے لئے وقتاً فوقتاً ہدایات شائع کرتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں اس مجلس نے پناہ گزینوں کو ہدایت کی تھی کہ چونکہ فرنگی کو ہر نمائش اور تعجب انگیز چیز سے نفرت ہے اس لئے قہوہ خانوں اور عام اجتماعات میں پناہ گزینوں کو جرمن زبان بولنے سے اجتناب کرنا چاہئے لیکن اس ہدایت پر بہت کم پناہ گزینوں کو عمل پیرا دیکھا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے آفت رسیدہ لوگ اپنی زبان کے سوا اور کوئی زبان جانتے ہی نہ ہوں۔

بِل نے دوست کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا "Aint they pretty?"۔ اب دونوں دوست نہایت دلچسپی سے ان دو جرمن چہروں کو دیکھ رہے تھے جن کی حمایت میں یہاں کے اخبار ہر روز کئی صفحات سیاہ کر ڈالتے ہیں۔ جرمنی سے نکالے ہوئے ان یہودیوں کی مدد کرنے کے لئے یہاں جا بجا ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ اور ہزاروں پونڈ ہر روز ان آفت زدوں کی مدد کے لئے جمع کئے جاتے ہیں۔ فرنگی لڑکے پناہ گزینوں کے متعلق گفتگو کرنے میں مشغول ہو گئے میں ابھی تک اُن دو چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا جن کو یہاں کے پریس میں اور ریڈیو پر دن رات مصیبت زدہ، معصوم، بے گناہ، لاوارث، غریب مظلوم اور نہ جانے کن کن الفاظ سے موسوم کیا جاتا ہے اور سوچ رہا تھا کہ پروپیگنڈے کے اِن دو فرنگی آلات سے کس قدر صداقت دُنیا میں منتشر کی جاتی ہے۔ میرے سامنے بھی دو مظلوم چہرے تھے۔ یہ ستم رسیدہ لڑکیاں مُلک بدر کر دی گئی تھیں۔ اور فرنگی اِن لڑکیوں اور اِن جیسی ہزاروں لڑکیوں کی مدد کے لئے دن رات تمام دُنیا کے ہمدرد انسانوں کو اُکسا رہا تھا۔ لیکن قریب سے دیکھنے سے اُس تصویر کے کچھ اور رُخ بھی نظر آ رہے تھے۔ جس کو فرنگی مصور صرف المناک سانحے کی صورت میں پیش کر رہا تھا۔ دو تنومند نوجوان مظلوم لڑکیاں ایک قہوے خانے میں بیٹھ کر ان نعمتوں سے متمتع ہو رہی تھیں جن کے سامنے اوسط درجے کے ہندوستانی گھر کے لذائذ شرمندہ تھے۔ اُن کے بے غازہ چہروں پر اُس گلابی رنگت اور صحت کے آثار تھے جس سے ہندوستانی لڑکیوں کے کم چہرے آشنا ہیں۔ اُن کی گردنوں کے گرد لپٹے ہوئے ریشمیں رومال اور چست سائے ہماری دُلہنوں کے لباس کو شرما رہے تھے۔ یہ آزاد مُلک کے جلاوطن کئے ہوئے باشندے تھے جن کی فلاکت ہماری عشرت پر خندہ زن تھی اور جن کی غربت پر ہمارے متموّل کو رشک آ رہا تھا۔ یہ اُس جماعت کی لڑکیاں تھیں جن کا درجہ ہمارے ہاں بھک منگوں کا سا ہے۔ وہ بھک منگے مفلوک الحال شخص جو جنوری سے لے کر دسمبر تک بھاٹی دروازے اور موچی دروازے کے باہر کی گھاس پر (جسے عرفِ عام میں باغ کہا جاتا ہے) اپنی عمر بسر کرتے ہیں۔ جمعرات کو ان کی عید ہوتی ہے کیونکہ نہ صرف لوگ بچا کھچا کھانا لا کر انہیں دے جاتے ہیں بلکہ سید علی ہجویریؒ

(داتا گنج بخشؒ) کے مزار پر آنے جانے والے زائرین کے تانگوں کے پیچھے دوڑکر بھی وہ دو تین آنے جمع کر لیتے ہیں ۔ گرمیوں میں یہ سڑک کے دو رویہ لگے ہوئے درختوں کے نیچے آکر پناہ لے لیتے ہیں اور سردیوں میں پھٹی ہوئی گدڑیاں اوڑھے ہوئے گھاس کے تختوں پر لیٹے رہتے ہیں ۔ ان کے ایلاق و قشلاق (گرمی یا سردی گزارنے کے مقامات) میں چند قدموں کا تفاوت ہے ۔ اسی ہموار شاہراہ عام پر ان کے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں اور جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو راہروؤں کے دامن پکڑ کر یا اُن کے پیچھے پیچھے دوڑ کر پرانے سُوراخ دار پیالوں میں دو چار پیسے شام تک جمع کر لیتے ہیں ۔ لیکن اِن نسل در نسل بھک منگوں ، محتاجوں کی مصیبت پر نہ کبھی کسی ہندوستانی نے غور کیا ہے نہ کسی فرنگی خداوند نے ۔ یہاں جرمن ریفیوجی کمیٹی پناہ گزینوں کو اس قدر دولت تقسیم کر رہی تھی کہ وہ قہوہ خانوں کی رونق کو دوبالا کریں لیکن بیشتر ہندوستانیوں کو ہندوستان میں اپنے دست و بازو سے پیدا کی ہوئی دولت سے صرف اِتنا حصّہ مِل رہا ہے کہ وہ دو وقت پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھا سکتے ۔ پیشہ ور بھک منگوں اور خاندانی محتاجوں سے ایک لمحہ کے لئے میرا خیال ہٹ کر ہندوستانی سماج کے اِس سے ذرا اوپر کے طبقے تک پہنچا ۔ انہیں ہندوستان میں مزدور، قلی، باربردار، تانگے والے اور ایسے ہی کئی دیگر ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کی آمدنی چار آنے سے بارہ آنے روزانہ تک ہوتی ہے ۔ اس طبقے کے لوگوں کے مختلف چہرے میرے پیشِ نظر تھے ۔ فرنگی کے بنائے ہوئے مظلوموں اور ہندوستان کے اِن کسی شمار میں نہ آنے والے غیر مظلوموں ، میں کتنا فرق ہے ۔ ہندوستان کے مزدوروں کو فرنگی حکومت کی برکات کی وجہ سے جلا وطن ہونے کا خدشہ تک نہیں ۔ اُن کے مُلک میں امن اور خوشحالی ہے لیکن اُن کے چہرے کس قدر مایوس کُن ہیں ۔ گرد و غبار میں لتھڑے ہوئے بال سیاہ ہونے کے باوجود مٹیالے نظر آتے ہیں ۔ پسینے اور جسمانی روغن سے تر پیشانیاں اُس مشقت کا اشتہار دے رہی ہیں جس سے اُنہیں ساری عمر نجات نہیں ملتی ۔ آنکھیں عقابی لیکن بھنوؤں کے نیچے دھنسی ہوئی ۔ ناک اور چہرے کی ہڈیاں زرد زرد جلد کے نیچے یوں اُبھری ہوئی ہیں جیسے ابھی جلد کو پھاڑ کر باہر نکل آئیں گی ۔ جوان ، بوڑھے ، بچے سب اپنی انفرادی صُورت کے سوا یکساں چہروں کے حامل ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ ہندوستانیوں نے کبھی مظلوم کہا ہے اور نہ فرنگی اور فرنگی کے بنائے ہوئے خداوندانِ سیاست نے مظلوم قرار دیا ہے ۔ خالدہ ادیب خانم نے جب ہندوستان کا سفر کیا تو ایک حسین دیہاتی لڑکی کو دیکھ کر معاً اُس کے دل میں خیال آیا کہ خدا جانے اس دوشیزہ کے چہرے پر غبار کی کتنی تہیں جمی ہوئی ہیں ۔ اور کتنے عرصے سے اس نے اپنا مُنہ آئینے میں نہیں دیکھا ۔ کاش کہ وُہ یہ بھی جان سکتی کہ جس لڑکی کو دیکھ کر اُس کے دل میں یہ خیالات موجزن ہوئے ہیں اُس جیسی لاکھوں اور لڑکیاں بھی غلام آباد ہند میں بس رہی ہیں اور اُن کے دست و بازو کی کمائی ہوئی دولت ہندوستان میں اور بیرونِ ہندوستان اُن ایوانات اور عشرت گاہوں پر صرف ہو رہی ہے جن میں فرنگی نے اپنی آسایش اور نگاہوں کی آسودگی کے لئے ہر چہار طرف آئینہ خانے بنا رکھے ہیں ، لیکن اس خدا ناشناس قاہر کو یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ آئینے کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا اُن کی طرف بھی پھینک دے جن کے خون سے اُس کی عشرت گاہوں کی

بنیادیں سینچی جا رہی ہیں - - - - - -

خادمہ نے میری میز پر چائے رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا "Anything else sir" (کچھ اور چاہئے؟)

مَیں نے شکریہ ادا کر کے خادمہ کو رخصت کر دیا (یہاں آپ کو بلا امتیاز ہر کسی کا شکریہ ادا کرنا پڑتا ہے)۔

دو ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے ہندوستانی لڑکے بازوؤں پر برساتیاں ڈالے اور ہاتھوں میں بستے پکڑے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے تھے۔ فرش پر پہنچتے ہی ایک خادم نے انہیں آگے کیا اور ایک میز پر بٹھا دیا۔ ایک نے شرمائی ہوئی نگاہوں سے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے اِرد گرد دیکھا۔ دوسرے نے مضطربانہ انداز اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے خادمہ کو چائے لانے کے لئے کہا۔ جرمن لڑکیوں سے میری نگاہیں اور خیالات ہٹ کر ہندوستانی طلبہ کے چہروں پر مرکوز ہو گئے۔ دونوں Saville Row (سیول رو) کے سلے ہوئے کم وبیش پندرہ پندرہ گنی کے چُست اور جاندار سُوٹ پہنے ہوئے تھے۔ کالروں کی جلا سفید رنگ کو شرما رہی تھی۔ کوٹ کے رنگ اور دھاریوں کے ساتھ قمیص، ٹائی اور بیرونی جیب میں سے سر نکالے ہوئے رومال کا رنگ اور دھاریاں یوں ملی ہوئی تھیں جیسے مختلف کارخانوں میں یہ تمام چیزیں اِن ہندوستانی لڑکوں کے جسم پر موزونیت سے آراستہ کرنے کے لئے بیک وقت تیار کی گئی تھیں یہاں تک کہ جرابوں کا رنگ اور نمونہ بھی پتلون کے پائینچوں کے مناسب تھا۔ مَیں حیران ہو رہا تھا کہ قیمت سے قطعِ نظر اپنے آپ کو اِس آراستگی سے ملبوس کرنے کے لئے اِن لڑکوں نے یہ تمام چیزیں کس قدر وقت صرف کر کے منتخب کی ہوں گی اور تحصیلِ مُراد کے لئے انہیں کس قدر ذہنی کوفت برداشت کرنی پڑی ہو گی۔ اور یہاں تو اِس ذوق کی تسکین کے لئے ہزاروں دُکانیں ہیں، ہندوستان میں ان کا کام کیسے چلے گا۔ لیکن یہ خیال آتے ہی معاً یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ بہت سے دوست جب لندن سے واپس ہندوستان جاتے ہیں تو اپنے آپ سے بیزار کیوں رہتے ہیں۔ کسی نے بھی آج تک گھر جا کر یہ نہیں لکھا کہ میں یہاں خوش ہوں اور حفیظ (جالندھری) تو جانے سے پہلے ہی یہاں کہہ رہے تھے ع

پھر بھی آئے گا اگر چور نے گھر دیکھ لیا

کیوں نہ ہو جب ہندوستان پہنچ کر مذاق کے مطابق کپڑے پہننے بھی میسر نہ آئیں تو وہاں زندگی کیسے بسر ہو۔ لیکن اِن خوش پوشوں اور غریب ہندوستان کی دولت بیدریغ لٹانے والوں کے متعلق ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اور وہ یہ کہ لندن اور لندنی فضا کے ہر اچھے بُرے اثر کو یہ متعدی مرض کی طرح قبول کرنے کے باوجود ایک بات کی اہلیت پیدا نہیں کر سکتے اور وُہ یہ کہ دُنیا میں سربلند ہو کر زندگی کیسے بسر کرنی چاہئے۔ نہ جانے کیوں میں جب یہاں بسنے والے طلبہ کو یونیورسٹی، کلب، سینما، ریستوران یا کسی اور مجمع میں دیکھتا ہوں تو معاً مجھے یہ خیال آتا ہے جیسے یہ ابھی اپنی لینڈ لیڈی سے پِٹ کر باہر نکلے ہیں (ممکن ہے کہ میرا حلیہ بھی ایسا ہی ہوتا ہو لیکن میں سویرے حجامت کرنے کے بعد دُکانوں، غسلخانوں، اسٹیشنوں یا چاکلیٹ کی مشینوں پر لگے ہوئے آئینوں میں سے کہیں بھی

اپنی صُورت نہیں دیکھتا) یہاں تک کہ یونیورسٹی میں میرے ہندوستانی آئی۔سی۔ایس طالب علم جب کمرے میں دبے پاؤں سہمے ہوئے داخل ہوتے ہیں تو چند لمحوں تک اُن کا انداز دیکھ کر میں اپنی آنکھیں فرطِ حیرت سے ملتا رہتا ہوں کہ الٰہی یہ وہی معصوم فرعون ہیں جن کے پاؤں کے نیچے کسی دن ہندوستان کی زمین کانپنے والی ہے۔ آئی۔سی۔ایس ایک طرف رہے یہی دو نوجوان جو اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے داموں سے چائے پینے کے باوجود کسی نامعلوم خوف سے مرعوب ہو رہے تھے، جب ہندوستان کی سڑکوں پر چلیں گے تو نہ صرف ان کے قدم زمین سے ڈیڑھ انچ اُوپر اُٹھیں گے، بلکہ ان کی نگاہیں عام ہندوستانیوں کو دیکھنا بھی قبول نہ کریں گی اِس لئے کہ وُہ بیچارے صرف ہندوستان میں بسنے والے ہندوستانی ہیں اور یہ اُس سرزمین کا طواف کر چُکے ہوں گے جہاں ایک دِن بھی انہیں ان کے طوقِ غلامی نے گردن بلند کر کے چلنے کا موقع نہ دیا . . . .

"السّلام علیکم۔ Do you mind?" ایک سفید رنگ کے نوجوان نے میرے مقابل کی کُرسی پر بیٹھنے کی غرض سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مَیں نے کچھ متعجب ہو کر اور کچھ گھبرا کر انگریزی میں جواب دیا "بخوشی تشریف رکھئے"۔ اِس پر نوجوان میری میز پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

اُس کے سلام سے مجھے شُبہ ہُوا کہ ہم دونوں کہیں مِل چکے ہیں۔لیکن ذہن پر دباؤ ڈالنے کے باوجود یاد نہیں آتا تھا کہ ہم کہاں مِلے ہیں اس لئے چند لمحوں کے شش و پنج کے بعد یہاں کے معمول کے مطابق میں نے پوچھا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے مَیں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے!"

"ہاں اِسی لئے میں نے سلام عرض کیا تھا۔ آپ کو یاد ہے چند دن قبل جب کیکسٹن ہال میں آپ نے امیر فیصل کے سامنے استقبالیہ ایڈریس پڑھا تھا تو مَیں بھی وہاں آیا تھا اور میرے ایک ایرانی ہموطن نے آپ سے تعارف کرایا تھا۔"

"ہاں ہاں خوب یاد آیا۔ تو کہیئے مزاج اچھے ہیں؟"

"شکریہ، آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

رسمی مزاج پُرسی اور موسم پر تبصرے کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں خادمہ آگئی۔ایرانی نوجوان نے بے تکلفی سے پُوچھا:۔

"کیا آپ میرے ساتھ شریک ہوں گے؟"

مَیں نے معذرت کرتے ہوئے کہا "مَیں تو ابھی چائے ختم کر رہا ہوں، اور دُوسرے مَیں شراب پیتا بھی نہیں۔ آپ شوق فرمائیے!"

اس پر ایرانی نوجوان کو صرف ایک بیر (جو کی شراب) لانے کے لئے کہا۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ آپ بلوسے انجنیئرنگ کی تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہاں کھانے پینے کی بے طرح آزادی کو دیکھ دیکھ کر اب ہر ایک منظر کے عادی تو ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی ہندوستانی ہیں متعجب ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کم از کم مشرقی مسلمانوں اور ہندوؤں کو ممنوعات کا استعمال کرتے ہوئے دیکھ کر تو جذبۂ تجسس بے طرح دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ اس لئے مَیں نہ رہ سکا۔ اور مَیں نے پوچھ ہی لیا:۔

"آپ مسلمان ہو کر شراب کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں؟"

ایرانی نوجوان نے پائپ کے ایک لمبا کش لگا کر دھواں چھت کی طرف اڑایا اور چند لمحوں کے لئے متبسم رہا۔ پھر بولا:۔

"یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ مَیں مسلمان ہوں لیکن آپ کو یہ بھی یاد رہے کہ مَیں ایرانی بھی ہوں۔ اور دُنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک عظیم الشان تہذیب کا حامل ہوں۔ اسلام نے مسکرات سے پرہیز رکھنے کے لئے تاکید کی ہے۔ مجھے یہ معلوم ہے لیکن میرا مذہب آج ایران ہے۔ آپ کو مذہب سے دلچسپی ہے تو آپ کو مبارک۔ مَیں ایران کو اپنا مذہب سمجھتا ہوں۔ اور ایران سے زیادہ مجھے کسی چیز سے اُلفت نہیں۔ ایران کی اپنی روایات ہیں، ایران کی اپنی تہذیب ہے ایران کا اپنا تمدن ہے۔ اسلام دُنیا کا بہترین مذہب سہی لیکن میں ذاتی طور پر صحرائیوں کے دیئے ہوئے مذہب کی خاطر اپنی روایات اور اپنے تمدن کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں"

مَیں نے بیتاب ہو کر نوجوان کو روک دیا" معاف فرمائیے آپ تو ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ گئے جن میں سے بہت سی باتوں میں مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ مثلاً میرے خیال میں بیر پینا ایرانی روایات میں داخل نہیں یا اسلام صحرائیوں کا دیا ہُوا مذہب نہیں، نیز کیا مَیں یہ پُوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ آپ کی انفرادی رائے ہے، یا تمام ایرانیوں کی؟"

"آپ کسی طرح سمجھ لیں۔ میرے بیان کو انفرادی ہی کہہ لیں لیکن بیشتر ایرانیوں کو میرے بیان پر اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ ہی کہیں اِن بدوؤں کی طرف ہدایت کی جستجو کے لئے اب کیا دیکھیں۔ جنہوں نے نہ صرف ریت کے ٹیلوں کو مختلف سلطنتوں میں تقسیم کر رکھا ہے بلکہ اُن میں سے کچھ ٹیلے فرنگیوں کے قبضے میں دے رکھے ہیں"۔

مَیں نے کہا" خیر یہ سوال الگ ہے۔ آپ کو معلوم ہے فلسطینی بیچارے گزشتہ اٹھارہ سال یعنی ترکوں کے قبضے سے نکلنے کے بعد آج تک اپنی آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں لیکن اگر وہ ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے تو یہ اُن کی قسمت ہے"۔

اِس پر ایرانی نوجوان نے طنزیہ انداز میں کہا" ہاں اس طرح تو آپ بھی اپنی آزادی کی جنگ کا عرصہ ۱۸۵۷ء سے شمار کر سکتے ہیں لیکن یہ کہئے کہ ۵۷ء کی طرح پھر کب آپ نے اپنے دست و بازو سے اپنی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے یہ صحیح ہے کہ جنگِ عظیم سے لے کر اب تک فلسطینی اپنی آزادی لینے کے لئے آپ کی طرح ہی خواہشمند رہے ہیں لیکن عملی طور پر

تو اب تک اُنھوں نے گزشتہ دو تین سال سے یہی تین چار ہزار آدمیوں کو شہید کرا کے قربانی کا آغاز کیا ہے۔ اب اُمید ہے کہ کچھ ہو رہے گا۔ طرح تو اچھی پڑی ہے۔ خدا کرے کہ سلسلہ جاری رہے۔"

میں نے کہا "ہاں امیر فیصل کا ایک ہمنشیں اُسی مجلس میں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ فرنگی کچھ مزید "گھونسہ بازی" (Boxing) کا خواہشمند ہے۔ اگر اس کو اطمینان ہو گیا تو فلسطین آزاد ہو جائے گا۔"

نوجوان نے کاغذ کی نلی سے بیر کا آخری گھونٹ سفید سفید جھاگ میں سے پیتے ہوئے کہا "وہی تو میں نے آپ سے کہا آزادی حاصل کرنے کے لئے صرف آزادی کی خواہش پیدا کر لینا کافی نہیں۔ اِس کے لئے عملی مظاہرے اور قربانی کی ضرورت ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ پھر ملیں گے۔"

ایرانی اپنا بل لے کر جیب میں سے پیسے ٹٹولتا ہؤا رخصت ہو گیا۔ میری چائے کچھ ختم ہو چکی تھی، کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی میں بھی بل لے کر خزانچی تک پہنچا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مختلف ملکوں کی آوازیں مجھے پھر سُنائی دے رہی تھیں:-

"آزادی کے لئے تمہیں بہت خون بہانا پڑے گا۔"

"چینی اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔"

"ایران سے زیادہ مجھے کسی چیز سے اُلفت نہیں۔"

"فرنگی کچھ اور Boxing (گھونسے بازی) مانگتا ہے۔"

"آزادی حاصل کرنے کے لئے صرف آزادی کی خواہش پیدا کر لینا کافی نہیں۔"

محمد باقر
۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء

ہندوستان میں ادیبوں کی مٹّی پلید

ہندوستان میں اہلِ قلم حضرات کی کس طرح مٹی پلید ہوتی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز فسانہ نگار آنجہانی پریم چند نے ساری زندگی فاقہ کشی میں گزاری۔ حالانکہ اگر آپ کسی دوسرے مُلک میں پیدا ہوتے تو کروڑوں روپیہ پیدا کر لیتے۔

آپ کے مرنے کے بعد اخبارات نے آپ کی موت پر لمبے چوڑے آرٹیکل لکھے اور تجویز پیش کی کہ پریم چند میموریل فنڈ قائم کیا جائے لیکن تازہ ترین اطلاع ہے کہ پریم چند میموریل فنڈ کے لئے ابھی تک ایک پیسہ بھی نہیں ملا ہے۔ یہ ہے ہندوستان کے اس فسانہ نگار کی عزت افزائی جس نے ہندوستان میں فسانہ نگاری کی ایک نئی داغ بیل ڈالی۔ جیسے ہندوستان کا ٹالسٹائی کہا جاتا ہے جس ملک میں اہلِ قلم حضرات کی یہ دقعت ہو اگر وہ مُلک نکبت اور جہالت میں زندگی گزارتا ہے تو کیا تعجب ہے۔

پریم چند آنجہانی کے ساتھ ہندوستانیوں کا یہ افسوسناک سلوک ہندوستانیوں کی بے غیرتی، بےحسی اور احسان ناشناسی کا ایک ایسا شرمناک نمونہ ہے جس کی مثال شاید ہی دُنیا کے کسی حصے میں مل سکے۔ "دین و دُنیا"

غزل

خواب میں ہم نے تجھے رشکِ قمر دیکھ لیا
ڈال کر پردۂ شب روئے سحر دیکھ لیا

اِس نے دل دیکھ لیا اُس نے جگر دیکھ لیا
اپنا اپنا خلش و درد نے گھر دیکھ لیا

شاملِ محفلِ جاناں ہوں یہ تقدیر کہاں
کبھی اُس راہ سے گزرے تو اُدھر دیکھ لیا

دیکھتے اور وہ کیا حالِ مریضِ وحشت
جاں بلب دیکھ لیا خاک بسر دیکھ لیا

سعیِ مشکورِ رہِ شوق میں یوں ختم ہوئی
تم کو پہچان لیا غیر کا گھر دیکھ لیا

عشق کم ہمت و پسپا نظر آیا نہ کہیں
عجز تیرا مگر اے عقلِ بشر دیکھ لیا

اب تک افسانۂ نیرنگِ جہاں سنتے تھے
آکے باتوں میں تری شعبدہ گر دیکھ لیا

دل کے آنے کو نہ کیوں جان کا جانا سمجھوں
درِ اُلفت جو کھلا موت نے گھر دیکھ لیا

پاؤں رکھتے تھے زمیں پر جو نہ مغرور اُنہیں
تیری چوکھٹ پہ رگڑتے ہوئے سر دیکھ لیا

نہ ملی سیلِ حوادث سے کہیں مجھکو پناہ
مَیں نے ساحل کو بھی بادیدۂ تر دیکھ لیا

جب مجھے اک نگہِ ناز سے تسکیں نہ ہوئی
اُس نے پھر مُڑ کے باندازِ دگر دیکھ لیا

کوئی دیکھے یہ تماشائے تکلّف کب تک
ہو چکا پردہ، بس، اب آؤ اِدھر دیکھ لیا

مل گئی دادِ غمِ عشق کہ احسنؔ اُس نے
سُن لیا قصۂ غم زخمِ جگر دیکھ لیا

احسنؔ مارہروی

مہر

"مرزا نصیر بیگ نے اپنی لڑکی شکیلہ بالعوض پانچ ہزار روپیہ مہر مؤجل مع نان و نفقہ کے تمہارے نکاح میں دی، تم نے قبول کی؟" قاضی صاحب نے کسی قدر نیچی آواز میں مختار سے دریافت کیا جو دولہا بنے گاؤ تکیہ کے سہارے سے بیٹھے تھے، اُس پاس کے لوگ جو دولہا کی طرف جھکے بیٹھے تھے گوش برآواز ہو گئے۔ مگر دولہا نے نہ ہوں کی اور نہ ہاں۔ جب ایک منٹ اور گزر گیا تو قاضی صاحب نے پھر اپنا فقرہ دُہرایا اور جواب کے لئے کان قریب لے گئے مگر میاں مختار کچھ ایسا گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھے تھے کہ جیسے اُن کے مُنہ میں زبان ہی نہ تھی۔ اب تو محفل کے بھی کان کھڑے ہوئے اور لگے لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق سرگوشیاں کرنے کسی نے دولہا کے باپ شبتن مرزا کو بھی بڑھ کر پکارا جو ابھی بری کے جوڑا چڑھانے کے سلسلے میں نیگ جوگ ادا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بیٹے کی خموشی کو سُنا تو کس کا نیگ اور کس کا حق، پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ گویا سانپ سا سُونگھ گیا۔ پتھر کی سی مُورت بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اِتنے میں اُن کے ایک لنگوٹیا یار خانصاحب آئے اور بپھر کر بولے "میاں شبتن! بُت بنے کھڑے ہو یا کچھ کرتے دھرتے بھی ہو؛ کیا سوچ رہے ہو؛ استغفراللہ! اولاد کو اتنا سر پر چڑھا لیا کہ آج یہ دن دیکھنا نصیب ہُوا۔ سُسرا بیٹھا باپ کی پگڑی اُچھال رہا ہے، بیٹا نہ ہُوا باپ ہی ہو گیا۔ وہی جو کار مختار کر دیا۔ دُنیا زمانے کا قاعدہ ہے کہ ماں باپ نے جہاں بیاہ طے کر دیا، وہاں ہو گیا، اولاد کو نہ جہیز سے مطلب اور نہ مہر سے۔ یہ نئی روشنی کے چھوکرے کیا ہیں کہ بِس کی گانٹھ ہیں۔ انگریزی کیا پڑھی کہ ماں باوا ہی سے فرنٹ ہو گئے۔ غضب خدا کا مہر تک میں تکرار ہے۔ قسم خدا رسول کی اگر میرا بیٹا ایسا ہوتا تو کب کا حلال کر کے دو گز زمین میں سُلا دیا ہوتا۔ مگر جب اپنا ہی مال کھوٹا ہے تو پرکھن ہارے کو کیا دوس۔ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تمہیں لاکھ سمجھایا کہ دیکھو شبتن عقل کے ناخن لو، ہوش میں آؤ، اولاد کی عقل کچی ٹھہری۔ بھلا بیاہ شادی میں اُن سے مشورہ کیا؟ مگر اولاد کے لاڈ میں تمہاری آنکھوں پر تو ایسی چربی چھا گئی تھی کہ کسی ایک کی بھی نہ سُنی، جو بات دیکھو وہ بیٹے کے مشورے سے۔ جب دیکھو ہر کام میں صاحبزادے شامل۔ لو اب جاؤ، صاحبزادے کو سنبھالو۔ کچھ اور سے اور ہو گیا تو تمام عمر کے لئے اپنی اس سفید داڑھی میں خاک ڈلوا لینا۔" اِتنا کچھ سننے پر بھی مرزا شبتن گم سُم کھڑے معاملے کو سوچ رہے تھے، چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ کوئی بات سمجھ ہی میں نہ آتی تھی کہ کیا کریں۔ خانصاحب کی ایک آدھی بات بھی اُنہوں نے نہیں سُنی۔ وہ چاہتے تو یہ تھے کہ کون سی ایسی صُورت ہو جس سے اُن کی آبروریزی نہ ہو۔ مگر بار بار سپاہیانہ زندگی اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہتی تھی۔ ہر بار غور کرتے تھے اور ہر بار غصہ کی آگ بھڑک اُٹھتی تھی غضب اور غصہ مرزا شبتن کے خمیر میں ضرور شامل تھا مگر اُنہوں نے تحمل اور برداشت کی عادت کے لئے عمر بھر کوشش کی تھی۔ یہاں کا

بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج اُن کی عقل اور فطری طبیعت پسندی میں ایک عجب معرکہ تھا۔

بات یہ تھی کہ انہیں کبھی تو بیٹا بے قصور معلوم ہوتا تھا اور کبھی نافرمان۔ کبھی سمدھیانے والوں کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور کبھی پُرانے رواجوں کو۔ اور سچ پوچھئے تو بیٹا غریب دو برس سے بیاہ کی رسموں کو مٹانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ ماں اور باپ ––– دونوں سے اس کی تحریک میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ ماں سے کہا کہ ساری برادری کو نوتہ بھیجنا اور بُلانا بڑی غلطی ہے۔ کہ لوگ بہت ہی کم شریک ہوتے ہیں۔ جو مالدار ہیں وہ اپنی حیثیت اور دولت کے زُعم میں اپنی آرام گاہوں سے سرکنا اور ہلنا تک زحمت جانتے ہیں اور اگر کبھی دل میں خدا کا خوف اور دُنیا کا خیال کیا بھی تو اپنے کسی ہرکارے سے نیوتے کی رقم بھجوادی اور سوچ لیا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ نیوتہ تو دراصل قرضِ حسنہ ہے کہ ساتھ خوشی کے آج اوروں نے ہماری مدد کی اور کل ہم نے اُن کی۔ عید کو اپنے عزیزوں کے بچوں کو بھی ایک قسم کا قرضِ حسنہ ہی دیا جاتا ہے مگر اس میں زیادہ تر یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ غریب عزیزوں کو اپنی غربت کا احساس بھی نہ ہو اور اُن کے بچوں کی مدد بھی کر دی جائے۔ پھر وہ غریب جب کسی لائق ہو جائیں تو اپنے اور رشتے داروں کی مدد کریں۔ دنیا داری سے بھیجا ہوا نیوتہ کس کی غیرت تقاضا کرے گی کہ لے لے۔ اگر رقم واپس کر دی گئی تو ایسے امیروں کا کیا گیا۔ اب رہے اُن سے کم حیثیت کے لوگ ––– رشتہ دار وہ اپنے کام کاج کا بہانہ کر کے آنکھ بچا جاتے ہیں۔ غرض بہ ضرورت سے کھانے پینے کا انتظام جتنے آدمیوں کا کیا جاتا ہے، سوائے بستی کے عزیزوں اور دوستوں کے ایرا غیرا کے ٹھکانے لگتا ہے! پھر بے طرح لٹتا ہے۔ میں تو کسی صورت میں آپ کو کھانا کرنے کی رائے نہیں دوں گا۔ مختار نے لاکھ سر پٹکا مگر ماں نے اُس کی ایک نہ چلنے دی اور کہہ دیا کہ "بیٹے! خدا تمہارے دموں کو سلامت رکھے۔ آج سے ہزار برس کو۔ تم پھر بھی لڑکے ہو۔ کالج میں کتابیں گرہستی کی باتیں سکھا دیا کریں تو پھر ہم والدین کا کام کیا خاک رہے۔ تم بیچارے معصوم، پنچوں کی لاج کو کیا جانو۔ جب تم اللہ رکھے، اولاد والے ہو گے تب سمجھو گے کہ ماں کیا کہتی تھی۔ اُن کو نہ کھلائیں تو کیا نام رکھائیں؛ عمر بھر جن کا کھیل پھول لیا ہے اُن کو اگر نہ دیں تو خلقت میں تھُو تھُو کرائیں۔ میاں تم اور اور باتیں کرو مگر ہمارے ان نجی کاموں میں ہرگز دخل نہ دو۔ نیچے ہو تو بچوں کی سی باتیں کرو۔ یہی تمہیں زیب دیتا ہے۔" ماں سے سلجھاؤ کی جب میاں مختار کو کوئی آس نہیں رہی تو تلملا کر رہ گئے۔ مگر اُس نے سوچا کہ اپنی سی تو کرنی ہی چاہیئے، لاؤ باوا سے ہی تحریک کرو کہ وہ مرد بچہ ہیں، ایک دُنیا دیکھی ہے، شاید کچھ بہتری کی صورت ہو۔ باوا کے ایک ملنے والے سے کہلوایا کہ مہر کا مرحلہ طے کر لینے سے ہم دل آزاری سے بچ جائیں گے۔ لوگ آئے دن نکاح کی محفلوں میں مہر پہ بحث اور تکرار کئے بغیر نہیں رہتے اور بعض بعض جگہ تو دیکھا گیا ہے کہ مرنے مارنے کے لئے آستینیں تک چڑھا لیتے ہیں۔ یہ معاملہ پہلے سے اگر طے نہ ہوا تو بہت ممکن ہے کہ وہ لوگ وقت پر حیثیت سے اُونچی اُونچی باتیں کریں۔ اُس وقت اگر حجت ہوئی تو بات بھی بڑھے گی اور دل بھی میلے ہوں گے۔ باپ تھے تو پُرانی لکیروں ہی کے فقیر، پہلے تو بہت بگڑے مگر پھر تحمل اور سمجھ سے کام لے کر جواب بھیجا کہ "میاں صاحبزادے تم توقع کے خلاف پاؤں نکالتے ہو۔ انگریزی تہذیب تم پر بھی اثر کئے بغیر نہ رہی؛

نئی نئی باتیں کرتے ہو۔ خود ہی گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو کہ کہیں بھی بیاہ سے پہلے پہلے مہر طے کرنے کا قاعدہ ہے۔ تم تو ماشاءاللہ جوان ہو اور تعلیم یافتہ بھی۔ اچھے بُرے کی خوب تمیز رکھتے ہو۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ تمہارے اس چھچھورے پن سے میری بھی تو جگ ہنسائی ہوتی ہے، بقول کسی کے کہ جب باپ کا جوُتا بیٹے کے پاؤں میں سمانے لگے تو باپ کو طرح دے کر بات کرنی واجب سی ہو جاتی ہے اب اس کے سوا تم سے کیا کہوں کہ اپنے باپ کے چہرے کے نور کا خیال کرو۔" پیامی نے جب میاں مختار کو یہ داستان سنا کر پوچھا کہ بولو میاں اب کیا کہتے ہو۔ مرزا مختار کہنے کو تو نوُعمر تھا مگر زمانے کو آنکھیں کھول کر دیکھتا تھا۔ کہنے لگا۔ ابا صاحب کا اندازہ اتنا درست نہیں جتنا کہ چاہیئے۔ مہر کا طے ہونا تو کوئی جگ ہنسائی کی بات نہیں ہے۔ بیاہ سے پہلے مہر طے ہو جانے کے معنی تو یہ ہیں کہ دو خاندانوں میں شکر رنجی کا امکان ہی باقی نہ رہے۔ یہ تو شیر و شکر ہونے کا اور بھی اچھا طریقہ ہوگا۔ اور دو گھرانوں میں لگاؤ پیدا کرنے سے جو رسم دُور رکھے وہ شیطانی حرکت کے سوا اور کیا ہے۔ بے ادبی نہ سمجھی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ میری حیثیت کے مطابق مہر طے ہو جانا بہتر ہے۔" پیامی بولے کہ میاں، یوں خدانخواستہ میں نیچی نظر سے نہیں کہتا مگر سوچو تو کہ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ ابھی ایک معمولی سی دُکان کی ہے اس میں زیادہ سے زیادہ مال ہوگا تو پانچ سو چھ سو کا۔ حد ہے کہ سات سو کا ہو۔ خان بہادر صاحب تو بیٹی تمہارے باپ کی حیثیت دیکھ کر دے رہے ہیں۔" مختار مرزا مذاقاً چمک کر بولا " اچھا! تو کیا وہ میرے باپ کی جائداد سے اپنی صاحبزادی کی شادی کر رہے ہیں؟"

پھر کہنے لگا " جنابِ والا! آپ ہی سوچیئے کہ اگر میری بیوی نے مجھ سے اپنا مہر طلب کیا جس کا اُس کو ہر وقت حق حاصل ہے اور وہ ہُوا اتنا کہ میں بِک بھی جاؤں تو بھی پورا نہ ہو تو مجھے قانون اور برادری کہاں پناہ دے گی؛ یا اگر مان لیجیئے میرا مہر اُتنا ہی بندھ گیا جتنی میرے باپ کی حیثیت ہے اور اُن کی زندگی ہی میں وُہ بات نہ رہی جیسا کہ آپ بھی آج کل کی زمینداریوں کی غیر حالت دیکھ رہے ہیں تو ادا کرنے کا کس کی ماں نے دھونسا کھایا ہے۔" اس پر پیامبر صاحب ذرا تحقیر سے بولے۔ "اماں باؤلے ہوئے ہو۔ کون کس سے مہر لیتا دیتا ہے، یہ تو سب لڑکے پر دباؤ اور زور کے لئے ہوتا ہے کہ کہیں لڑکی کے مُنہ کو نہ آئے۔ اکثر جاہل شوہروں سے تنگ آ کر بچوں نے یہ ایک تدبیر نکال لی ہے۔ بیوی کو خوش رکھنا، پھر اگر آنکھ بھی ملا جائے تو ہم نے جانی۔ یہ گُر تو ہم جانتے ہیں۔ اور میاں آج یہ مہر وہر کی مینگ مینخ نکال رہے ہو کل جب بیوی آ جائے گی تو بے داموں غلام ہو گے، بے داموں ــــــ سمجھے"۔ مختار نے ترش رُو ہو کر کہا" جی ہاں لوگ جس طرح مالدار بیوی کر کے عمر بھر اُٹھتے بیٹھتے جوتی لات بیوی اور اُس کے میکے والوں کی کھاتے ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ میرے ساتھ بھی یہی ہو اور میں اُف نہ کروں۔ یہ مجھ سے ہرگز ہرگز نہیں ہونے کا۔" پیامی نے مرزا ختن کو بیٹے کے یہ منصوبے سُنائے تو اُن کی آنکھیں کھلیں بہت دنوں تک سوچ بچار میں رہے۔ پھر سپاہیانہ ہمت اور ارادے کے ساتھ بیٹے کو کہلا بھیجا کہ انسان کرتا وہ ہے جو اُس کے سامنے ہوتا ہے اس وقت تمہارے باپ کے پاس چار ہزار کی جائداد نظر آ رہی ہے اور تم چار بھائی ہو۔ اس لئے تم ایک ہزار کے مالک ہو۔ آیندہ کی خبر خدا جانے۔ ایک ہزار کا مہر طے کرائے دیتا ہوں۔ اب تم کو بھی کچھ عذر زیبا نہیں۔

ادھر یہ سُنا دیا اور ادھر مرزا شبن نے بیٹے کی گفتگو کا ایک ایک حرف بیوی کو دُہرا کر سمدھیانے میں یہ مرحلہ طے کر آنے کی تاکید کی۔ مرزا صاحب کی بیوی صاحبہ تھیں ایک ہی خاتون۔ سوچیں کہ بیٹا بن کر سب نے کھایا ہے، باپ بن کر کسی نے بھی نہیں کھایا۔ ہم ماں باپ سے نکل کر مختار رہا کہاں سکتا ہے۔ جبتک لڑکی اپنے گھر ہے ہمارا ہاتھ پتھر کے نیچے دبا ہُوا ہے۔ اس وقت توچُوں کرنا بھی اپنے اُوپر ستم ہے۔ نسبت کے بعد ہی مہر کا طے ہونا انیاؤ نہیں تو اور کیا ہے۔ "جب ذرا دیر ہوئی اور بیوی نے کچھ جواب نہ دیا تو مرزا نے چونکایا۔ بولیں "ہاں، ہاں، میں سب طے کر رکھوں گی۔ اس بات سے تم بالکل بے فکر رہو"۔ باپ بیٹے دونوں بیچارے بے فکر ہو کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور مرزانی اُٹھیں تو نائن کو بُلا کر سمدھیانے میں ایک چلتی ہوئی بات کی طرح سنانے کے لئے بھیج دیا۔ وُہ لوگ بھی تھے ایک چلتی رقم۔ سننے کو تو ایک ہزار کا مہر سُن لیا مگر اس کی اکھیڑ پچھاڑ بالکل نہیں کی کہ وقت پر غرض اٹکی ہو گی، اُس وقت تو دُنیا جہان کے بیٹے والوں کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ آپ ماننا پڑیگا اس وقت بولنا جلتی آگ میں کُودنے کے برابر ہے۔ یوں بات آئی گئی ہوئی۔ غرض مرزا کی بیوی نے طے کرنا چاہا اور نہ لڑکی والوں نے اس مسئلہ کو چھیڑنا مناسب جانا مگر مرزا یہی سمجھے بیٹھے رہے کہ بیوی نے طے کر لیا۔

دو برس کے بعد جب بیاہ کی گھڑی آئی تو لڑکی والوں نے بڑھ بڑھ کے پاؤں مارے پھیلائے اور پانچ ہزار روپے کے مہر سے ایک پائی کم کرنے کی قسم کھائی۔ یہاں دولہا کی دُکان کی مالیت اس مہر کی نہائی قیمت بھی نہ تھی۔

نکاح کے دن مرزا شبن نے جب مہر کی اتنی تعداد اور اُس پر بیٹے کے چُپ سادھنے کا حال سُنا تو حیران رہ گئے کہ خدایا یہ ماجرا کیا ہے۔ مَیں یہ کیا سُن رہا ہوں، کھڑے کھڑے بہت سوچے مگر سمجھ نے کچھ ساتھ نہ دیا تو سمدھی کو الگ لے جا کر کہا کہ "بھئی طے کیا ہُوا مہر کیوں نہیں باندھا جاتا"۔ سمدھی نے سرے سے طے ہونے کی لاعلمی جتائی اور آڑے ہاتھوں لیا کہ کیا عقل چرخ ہو گئی ہے یا سٹھیا گئے ہو۔ بھلا شریف آدمیوں میں کہیں بھی بیاہ سے پہلے مہر طے ہونے کی رسم تم نے سُنی ہے۔ ذلیلوں اور نیچے طبقے کے لوگوں میں بھی یہ رسم نہیں ہے۔ تم میری توہین کرتے ہو۔ لڑکا بیاہنے آئے ہو یا لڑائی مول لینے کے لئے۔ اب مرزا پر خاندانی غضب اور غصہ طاری ہو گیا۔ مچل مچل کے رہ جاتے تھے کہ بات تحقیق کر لوں تو ذرا خان بہادر صاحب کی خان بہادری کو سمجھوں۔ لڑکی والوں کے دروازے پر پہنچکر بیوی سے ماجرا پوچھا اور مقابلہ کے لئے کہا تو وہ بولیں کہ میں نے تو نائن کے ذریعے سے سمدھن کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی تھی، مجھے کیا خبر تھی کہ یہ لوگ کچھ خیال نہ کریں گے اور وہ ظلمی بیٹا یہ گل کھلائے گا۔ اتنا سُننا تھا کہ مرزا آپے سے باہر ہو گئے آنکھیں خون میں ڈوبی ہوئی سی معلوم ہونے لگیں اور گردن کی نسیں پھُول گئیں۔ چیخ مار کر بولے۔ "جا دوزخ کی ٹوٹ! طلاق دی میں نے تجھے اور عاق کیا اُس تیرے سگے کو"۔

رواج اور غفلت کا بُرا ہو کہ آنکھوں دیکھتے دیکھتے اور آن کی آن میں دو گھر بگڑ گئے۔ سُنتے ہیں کہ مختار کو اُس دن سے پھر کبھی کسی بشر نے اس بستی میں آجتک نہیں دیکھا مگر مرزا شبن نے اپنے تینوں بچوں کو پھر بے مہر طے کئے ہوئے بیاہنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ غریب کا نام تمام برادری نے مرزا مہر دار رکھ چھوڑا ہے۔

احمد رشید خاں سہاوری

تجلّیات

ہے چشمِ مست میں تیری شراب خانہ ہنوز
ہے میری لغزشِ پا کو وہی بہانہ ہنوز

بہارِ گلشن و مہتاب و مطرب و ساقی
مری نگاہ میں ہے محفلِ شبانہ ہنوز

مری جبیں میں ہے بیتاب ایک سجدۂ شوق
مگر ملا ہی نہیں اُس کو آستانہ ہنوز

ازل سے لذّتِ پرواز اُٹھائے پھرتی ہے
ترس رہا ہے مجھے میرا آشیانہ ہنوز

کبھی سُنا تھا جو بزمِ الست میں مَیں نے
ہے گوشِ شوق میں رقصاں وہی ترانہ ہنوز

سرور و کیف ابھی جاوداں نہیں اس کا
بہت ہی خام ہے ساقی مئے مغانہ ہنوز

ہُوا تھا حسن و محبت میں کوئی قول و قرار
رواں ہے صبحِ ازل سے وہی فسانہ ہنوز

ہے کھو گیا کہیں مسجودِ ساکنانِ فلک
اسی کے واسطے گردش میں ہے زمانہ ہنوز

ہزار نقش بنے اور مِٹ گئے لیکن
وہی ہے شوخیِ رنگِ نگارخانہ ہنوز

طوافِ کوئے بُتاں ہے، نہ شغلِ بادہ کشی
مگر اثرؔ کے ہیں انداز والہانہ ہنوز

اثرؔ صہبائی

جنگل مڑہالہ میں

تین چار ماہ اِدھر سے میری صحت کچھ خراب سی چلی آ رہی ہے۔ اس کا سبب کثرتِ کار اور دماغی تفکّرات کے علاوہ ایک دوست کی نوازشہائے بے جا بھی تھیں۔ عرصے سے سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لئے لاہور سے بھاگ نکلوں اور کسی ایسی آزاد فضا میں سانس لوں جسے "کلچر خطرے میں ہے" کے نعروں نے مکدّر نہ کر رکھا ہو۔ جہاں خلوص اور حماقت مترادف نہ ہوں۔ جہاں مجبوری کا نام صبر تو ہو لیکن بُزدلی کو اخلاق نہ سمجھا جائے۔ لیکن میں حیران تھا کہ ایسی کونسی جگہ ہو گی جو ہمارے رہنماؤں کے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف اندوز نہ ہو چکی ہو؛

ناصر صاحب نے مجھ سے جنگل مڑہالہ چلنے کو کہا تو میں صاف انکار نہ کر سکا۔ جنگل مڑہالہ ملتان کے قریب ایک گاؤں ہے اور ناصر صاحب وہاں کے زمیندار۔ میں لاہور سے تو ضرور بھاگ نکلنے کا خواہاں تھا لیکن ملتان ——— گرد و گرما والے ملتان ——— جانے سے گھبراتا تھا۔ البتہ کرسمس کی چھٹیوں میں مجھے جالندھر بھی جانا تھا، اس لئے میں نے کوشش یہی کی کہ جنگل مڑہالہ کا سفر ملتوی ہو جائے۔ لیکن ایک دفعہ یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ مڑہالہ جانا ہے ناصر اس پر نظرِ ثانی کیوں کرنے لگے؛

قصّہ مختصر طے یہ ہُوا کہ سندھ اکسپرس کے ذریعہ سے سفر کیا جائے۔ رات کا سفر خوشگوار رہے گا اور نور کے تڑکے منزلِ مقصود پر جا پہنچیں گے لیکن بعض ناگزیر مجبوریوں کے باعث ہمیں دوسرے دن کراچی میل سے جانا پڑا۔ جوگندر صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ ہم سٹیشن پر گاڑی کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ اچھی جگہ بھی مل گئی لیکن پندرہ منٹ کے اندر اندر سارا ڈبہ بھر گیا۔ ساری گاڑی میں انٹر کا یہی ایک مردانہ ڈبہ تھا اور اس میں بھی صرف ۱۲ نشستیں۔ لیکن مسافر ہیں کہ سیڑھیوں سے سیدھے اسی کا رُخ کرتے ہیں۔ ساتھ کا ڈبہ بھی انٹر کا تھا اور بہت بڑا لیکن عورتوں کے لئے مخصوص، گو اس میں عورت ایک بھی نہ تھی۔ ایک موٹی سی عیسائی خاتون بھی اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے ہی کمرے میں گھُس آئی تھیں اور اُنہوں نے بلا مبالغہ تین آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی۔ ہم عورتوں کے کمرے میں نہیں بیٹھ سکتے لیکن عورتوں کو مردوں کے کمرے پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہی پردے والی بات۔ کوئی مرد بھولے سے کسی عورت کو دیکھ لے تو بداخلاق، بے حیا اور نہ جانے کیا کیا ——— لیکن عورت برقع کے اندر سے ساری دُنیا کے مردوں پر تبصرہ کرتی رہے۔ اسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ آخر ناصر صاحب نے گارڈ سے جا کر کہا کہ صاحب ساتھ

کا کمرہ بہت بڑا ہے لیکن آپ نے اس پر عورت کی تصویر چسپاں کرکے ہمارے لئے "علاقہ غیر" بنادیا ہے۔ آپ اتنا کرم کیجئے کہ عورتوں کے لئے یہ چھوٹا کمرہ مخصوص کردیجئے، اور ہم اس کمرے میں جابیٹھیں۔ یہ بات گارڈ کی سمجھ میں آگئی۔ ہم نے چھوٹا کمرہ خالی کردیا اور بڑے کمرے میں جا بیٹھے۔ اس "ہجرت" میں وہ موٹی خاتون بھی ہمارے ساتھ شریک تھیں!

سارا رستہ اخبار کے مطالعہ۔ باتوں اور تاش میں کٹ گیا اور دورانِ سفر میں کوئی قابلِ ذکر بات پیش نہ آئی۔ دو بجے ہم خانیوال پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں گاڑی بدلنی تھی۔ ریفرشمنٹ روم میں کھانا کھایا۔ ایک زمیندار تشریف لے آئے اور سیاسیات پر تبصرہ شروع ہوگیا۔ مگر میں نے بحث میں حصّہ نہیں لیا۔ مجھے تو غصہ آرہا تھا کہ یہ سیاست یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی! چار بجے ہم دوبارہ گاڑی میں سوار ہوئے۔ میرے قریب ہی ایک صاحبزادے بیٹھے تھے۔ اور اس شان سے بیٹھے تھے کہ خواہ مخواہ چھیڑنے کو جی چاہتا تھا۔ کالا کلوٹا رنگ۔ اس پر سیاہ چارخانے کپڑے کی قمیص، ترچھی ٹوپی اور ہاتھ میں چھڑی۔ گردن ۵، درجے کا زاویہ بنارہی تھی۔ میری طرف صرف ایک دفعہ دیکھا اور وہ بھی بڑے حقارت آمیز انداز میں ـــــ مجھے لاہور کے ایک صاحب یاد آگئے۔ وہی رنگ، وہی ڈھنگ، وہی مزاج، وہی نخوت، گردن کا خم تک وہی۔ صرف فیلٹ کی جگہ ترکی ٹوپی نے لے رکھی تھی۔ میں نے ناصر صاحب سے کہا کہ اسے ضرور بنانا چاہئے۔ اگرچہ جوگندر صاحب نے اس کی مخالفت کی، لیکن ہم نے اللہ کا نام لے کر سلسلۂ گفتگو چھیڑ ہی دیا۔ بات کا جواب تو دیتے تھے لیکن تنک کر۔ ہمیں ان کی اسی ادا میں لطف آرہا تھا۔ میں نے کہا "صاحب آپ تو بڑے بھاری 'بور' واقع ہوئے ہیں۔ وہ سمجھے میں نے ان کی بڑی تعریف کردی۔ اور مسکرا کر مجھے داد بھی دی۔ یہ ان کی پہلی اور آخری مسکراہٹ تھی۔

جنگل مڑہالہ پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ بچے بوڑھے جوان سبھی کسان سلام کرنے چلے آرہے ہیں۔ پہلے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں پھر دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرتے ہیں۔ سچی بات ہے مجھے تو شرم آنے لگی۔ آخر اس قدر تعظیم کیوں؟ معلوم ہوا کہ یہ ادب و احترام صرف ذیلداری کی وجہ سے نہیں بلکہ پیری کی وجہ سے ہے۔ ناصر صاحب زمیندار بھی ہیں اور پیر بھی! لیکن ہمیں کیوں گنہگار کیا جا رہا ہے؟ خیر میں تو یوں بھی پیر پرست ہوں۔ حضرت محبوب الٰہی سے (بہت دُور کی) نسبت بھی ہے۔ مجھے پیر بنتے ہوئے زیادہ دِقت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن جوگندر صاحب مفت میں ہی سیّد جوگندر علی شاہ بن گئے!

جنگل مڑہالہ مختصر سی بستی ہے، اس گاؤں کی ساری کائنات گارے اور پھونس کی چند جھونپڑیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن دُور دُور تک روئیدگی نام کو بھی نظر نہ آتی تھی۔ جدھر دیکھو چٹیل میدان قدرت کی بے مہری کا شکوہ کر رہے ہیں۔ مزارعوں نے بتایا کہ دوبارہ ژالہ باری ہوئی ہے اور گندم کی فصل کا بالکل ستیاناس ہوگیا ہے۔ لیکن یہ غریب کسان تقدیر پر شاکر تھے۔ سب کی زبان پر یہی تھا "پیر سائیں جو خدا کی مرضی"۔ صرف ایک شخص نے کہا "ہمارے لئے بیسیوں ژالہ باریاں ہیں۔ پٹواری کا ژالہ۔ تھانیدار کا ژالہ، ضلعدار کا ژالہ، تحصیلدار کا ژالہ (زمیندار کے ژالہ کا شاید اس نے اس لئے ذکر نہ کیا کہ زمیندار سامنے بیٹھا تھا یا شاید اس لئے

کہ وہ سخت گیر نہیں تھا، اور صرف زمیندار ہی نہیں بلکہ پیر بھی تھا)۔ یہ سب ژالہ باریاں گویا کافی نہ تھیں کہ یہ "الٰہی ژالہ" بھیج دیا گیا

ایک اور مزارع پٹواریوں، ضلعداروں اور اسی قسم کے دُوسرے اہل کاروں کی سخت گیریوں کا شکوہ کرنے لگا۔ کہنے لگا۔ "پیر سائیں! ہمیں تو اہلکار جوئوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں۔ کس کس کا شکوہ کریں"۔ اس فقرے میں کس قدر بلاغت ہے!

ہم نے اِدھر اُدھر گاؤں کا چکّر لگایا۔ بچّوں سے ملے۔ ان سے باتیں کیں۔ ایک بچہ ننگے پاؤں تھا۔ ناصر نے پوچھا "تم جوتا کیوں نہیں پہنتے؟" بچے کا جواب تیر بن کر میرے دل میں پیوست ہوگیا "پیر سائیں! جُوتا نہیں ہے"۔ اے کاش! کلچر کے علمبردار دیہات میں آکر دیکھیں کہ ہندوستان کی ستّر فیصدی آبادی ضروریاتِ زندگی کو ترس رہی ہے۔ کلچر کے تحفّظ سے پہلے ان ضروریات کا سامان ہونا چاہئے۔ میری طبیعت بے حد حسّاس واقع ہوئی ہے۔ مجھے سماج کے مظالم پر غصّہ آرہا تھا۔ اگر میرا بس چلے تو سرمایہ دارانہ معاشری و معاشی نظام کی عمارت کو بارود سے اُڑادوں اور اس کے ساتھ ہی تہذیب و تمدّن کے تحفّظ کے جھوٹے مدعیوں ——— اپنے فریب کار لیڈروں ——— کو بھی! ایک کھیت میں دو بچے بکری کا دودھ دوہ رہے تھے۔ ہم نے ان سے باتیں شروع کردیں۔ بڑا لڑکا یتیم تھا۔ اس کے بشرے ——— اس کی باتوں اس کے انداز غرضکہ ہر چیز سے یتیمی آشکار تھی یتیمی کے داغوں کو چھپانا سخت مشکل ہے۔ اس کا علم کچھ انہی لوگوں کو ہے جو یہ زخم کھائے ہوتے ہیں۔ چھوٹا لڑکا بہت کمزور تھا۔ جوگندر صاحب نے اس سے پُوچھا "تم اس قدر کمزور کیوں ہو؟" بچے نے کہا "سائیں میرے! دُودھ نہیں ملتا"

"دُودھ نہیں ملتا" بچے کے یہ الفاظ زہر آلود نشتر کی طرح میرے دِل میں ابھی تک چر کے لگا رہے ہیں۔ اس وقت مجھ پر جو گزری ہوگی، اسے بیان کرنے کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ "دُودھ نہیں ملتا" اور یہ بچہ بکری کا دودھ دوہ رہا ہے اپندرہ بیس بکریاں پاس کھڑی ہیں۔ یہ دُودھ کس کے لئے ہے؟ پھر سوچا غریب فصل بھی تو بوتا ہے۔ گرمی اور سردی کی مشقتیں اُٹھاتا ہے خون پسینہ ایک کرتا ہے لیکن بایں ہمہ اکثر پیٹ پر پتھر باندھ کر سوتا ہے۔ پھر اگر ان بکریوں کا دودھ اس معصوم بچے پر حرام ہے تو کیا تعجب؟

اس واقعہ سے میری طبیعت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ مجھے ہر چیز بے کیف نظر آرہی تھی۔ کھانا آیا، دیہاتی تکلّف ہر چیز سے نمایاں تھا۔ کھانا کھاتے وقت بھی مَیں کچھ غمگین سا رہا۔ میرے سامنے مُرغی کی پلیٹ رکھی تھی لیکن مَیں نے اِسے چھوا تک نہیں۔ مجھے تو جوگندر صاحب کی دال کھاتے ہوئے بھی شرم آرہی تھی۔ اس میں بھی کافی گھی تھا۔ ایک بچے کو بکری کا دودھ بھی میسّر نہیں لیکن ہم . . . . . . خیر کسی نہ کسی طرح کھانا ختم کیا۔

رات کو دیہاتی ناچ دیکھا۔ درمیان میں ڈھول بج رہا تھا اور اِرد گرد نوجوان کسان ناچ رہے تھے۔ اِن کے چہروں سے حقیقی مسرّت مترشح تھی۔ وہ کسان جن کی فصل ژالہ باری کی نذر ہو چکی ہے، جن کے گھر میں بھُونی بھنگ تک نہیں ملتی جن کے

بچے ننگے پاؤں پھر رہے ہیں۔ جن کی اولاد دودھ کو ترس رہی ہے۔ اس وقت سماج، سرمایہ دار، حکومت اور قسمت سب کو پائے استحقار سے ٹھکرا رہے تھے۔ اوپر چودھویں کا چاند انسان ـــ بے بس اور مجبور انسان ـــ کی اس سادگی پر مسکرا رہا تھا۔ ناچ کے ساتھ وہ ایک پنجابی گیت بھی گا رہے تھے۔ یہ گیت نہایت پُرسوز اور دردناک تھا۔ ٹیپ کا شعر یہ تھا ؎

چاہے جانے نہ جانے ———— میرا یار جوانیاں مانے

اس شعر نے مجھ پر بے حد اثر کیا۔

اگر ہندوستان میں کبھی انقلاب برپا ہُوا تو اس کی کامیابی کا سہرا انہی افلاس کے مارے ہوئے لیکن چوڑے چکلے سینے والے مضبوط بازوؤں والے، پھٹے ہوئے کرتوں والے، ننگے پاؤں چلنے والے کسانوں کے سر ہوگا جن کے سینوں میں ابھی تک محبت کا سوز ہے، جن کے دِل ابھی تک خلوص کی دولت سے مالامال ہیں۔ جن کی آنکھوں میں اب بھی ڈھول کی آواز سُن کر زندگی کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ مال روڈ کے ہوٹلوں میں پُرتکلف چائے پینے والے، عظیم الشّان کوٹھیوں میں رہنے والے اور بیش قیمت موٹروں میں سیر کرنے والے (خواہ اِن موٹروں پر کانگرس کا جھنڈا ہی کیوں نہ اُڑ رہا ہو) نام نہاد مساوات پسند جمہور نواز اشتراکی قیامت تک انقلاب نہیں پیدا کر سکتے ـــ پیدا نہیں کرنا چاہتے، کیونکہ اس میں خود اُن کی ہلاکت کے سامان پوشیدہ ہوں گے۔

مجھے سرمایہ داری یا جاگیرداری سے دُور کا تعلق بھی نہیں۔ مَیں اپنے اکثر دوستوں سے کہیں زیادہ سادہ اور جفاکشانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ لیکن اب بھی جب کبھی میں چائے پینے لگتا ہوں تو جنگل مڑھالہ کے اس معصوم بچے کی تصویر میرے سامنے آ جاتی ہے اور اس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے "سائیں میرے! دودھ نہیں ملتا"۔ پیالی مُنہ تک لے جاتے ہوئے میرے ہاتھ ہوا میں رُک جاتے ہیں اور مَیں ایک گہری فکر میں کھو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں دُبلے پتلے، نحیف و نزار بچے میرے کان میں کہہ رہے ہیں "سائیں میرے دُودھ نہیں مِلتا!" "سائیں میرے دودھ نہیں ملتا!" مجھے ڈر ہے کہ یا تو مَیں دیوانہ ہو جاؤں گا یا مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو جائے گی۔ سماج کے اس ظلم میں مَیں کسی طرح بھی شریک نہیں۔ البتہ اسے چُپ چاپ برداشت ضرور کر رہا ہوں۔ ظلم ہوتے دیکھ رہا ہوں لیکن خاموش ہوں!

ظلم ہوتے دیکھنا اور خاموش رہنا گناہ نہیں تو اَور کیا ہے؟

حمید نظامی

(۹ راپریل ۱۹۳۹ء)

تصحیح: گزشتہ مہینے حضرت شاد عارفی کی غزل کے ساتویں شعر میں "خسیس" کے بجائے "حسین" کا لفظ چھپ گیا ہے اس کی تصحیح کرلی جائے۔

عروسِ قسمت

عروسِ قسمت ہمیں جہاں میں عجب کرشمے دکھا رہی ہے
کبھی فلک تک اُبھارتی ہے کبھی زمیں پر گرا رہی ہے
کبھی یہ بنتی ہے بادِ صرصر چمن میں لگتی ہے آگ جس سے
کبھی یہ بادِ بہار بن کر چمن میں غنچے کھلا رہی ہے
جو تشنہ لب ہیں کبھی وُہ مایوس لوٹ جاتے ہیں اس کے در سے
کبھی یہ محفل میں بن کے ساقی سرور کی مے پلا رہی ہے
کبھی یہ محظوظ دل کو کرتی ہے عیش و عشرت کے تذکروں سے
کبھی یہ رو رو کے یاس و حسرت کی داستانیں سُنا رہی ہے
کبھی لگاتی ہے آگ خرمن میں شعلۂ آہِ آتشیں سے
کبھی یہ آبِ کرم سے اپنے لگی ہوئی کو بجھا رہی ہے
کبھی یہ کرتی ہے اپنے ہاتھوں سے چاک دامانِ آرزو کو
کبھی پیامِ اُمید دے کر دلوں کی ڈھارس بندھا رہی ہے
کبھی بٹھاتی ہے تختِ شاہی پہ تاجِ زرّیں ہمیں پنھا کر
گدائے بے آبرو بنا کر کبھی یہ در در پھرا رہی ہے
زمانہ میں اس نے کھیل سمجھا ہے اہلِ دُنیا کی زندگی کو
کبھی کسی کو بگاڑتی ہے، کبھی کسی کو بنا رہی ہے

عروسِ قسمت کا کچھ نہ پوچھو عجب ہیں ناشاد اسکی باتیں
کبھی یہ ہم کو ہنسا رہی ہے، کبھی یہ ہم کو رُلا رہی ہے

رام پرشاد ناشاد

کھلونا

رام سنگھ کھیتوں میں سے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگ ڈنڈی پر چلتا ہوا اسٹیشن کو جا رہا تھا۔ خاصی دُور تک اُسے ماں کے رونے کی آواز آتی رہی تھی۔ اور اُس وقت وہ اس طرح چل رہا تھا گویا ایک رسّی اُسے گاؤں کی طرف کھینچ رہی ہو۔ مگر کل اسی ماں نے سارے گاؤں والوں کے سامنے اُسے ذلیل کیا تھا۔ وہ اُسے دکھائے گا کہ وہ نکما اور کام چور نہیں ہے اور چند مہینوں کے بعد جب وہ شہر سے لوٹے گا تو ماں اسی طرح روئے گی مگر آنسو رنج کے نہیں خوشی کے ہوں گے۔

اُس نے آج تک شہر نہ دیکھا تھا۔ اسی پگڈنڈی سے اُس کے کئی ہمجولی وہاں جا چکے تھے۔ کئی تو آج تک واپس ہی نہیں آئے اور دوسرے جو کبھی کبھی آتے تھے بالکل بدلے ہوئے ہوتے۔ اُنہیں گاؤں کی کوئی بات پسند نہ تھی۔ ہر وقت شہر کی تعریف کرتے اور اپنے پرانے ساتھیوں کو اس طرح دیکھتے جیسے کوئی بلندی سے پستی کی طرف دیکھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ شہر میں اچھی اچھی تنخواہوں پر ملازم ہیں اور ایسی زندگی بسر کرتے ہیں کہ دیہاتی رام سنگھ کبھی قیاس بھی نہیں کر سکتا۔ جب وہ شہر کے حالات سنتے تو رام سنگھ کو ایسا لطف آتا جیسا کبھی بچپن میں پرستان کی کہانیوں میں آتا تھا۔ اور اکثر دوپہر کے وقت جب دھوپ بدن کو جھلسے دیتی تھی وہ کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر ٹکٹکی لگائے افق کی جانب دیکھتا۔ اور سوچتا کہ ان وسیع تپتے ہوئے میدانوں سے پرے کیسی عجیب دُنیا آباد ہوگی جہاں دن رات میلا لگا رہتا ہے اور اندھیری سے اندھیری رات میں بھی دِن جیسا اُجالا ہوتا ہے۔ جہاں گاڑیاں بے بیلوں کے چلتی ہیں اور چراغ بے تیل کے جلتے ہیں۔ جہاں سب خوش ہیں اور رزق راہ چلتے مِل جاتا ہے۔

اب وُہ دیہاتی گیت گاتا ہُوا خوش خوش اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے کوئی ساہوکار کھری اسامی سے قرض وصول کرنے، یا کوئی بیوپاری اچھا مال بیچنے کے لئے جا رہا ہو۔

اور جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی ہوئی بڑھیا ماں کو بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی ایک ناگن معلوم ہو رہی تھی جو اُس کے بیٹے کو نگل گئی۔

سٹیشن سے نکل کر رام سنگھ شہر کے ایک بارونق بازار کے سرے پر کھڑا ہو گیا۔ دُوسرا سرا ایک دُھندلکے میں غائب تھا جس میں سے خوش پوش انسان اور چمکتی ہوئی رنگ برنگ کی موٹریں نکلی چلی آ رہی تھیں، وُہ یہاں روزی کی تلاش میں آیا تھا۔ مگر یہاں تو روزی کو اُس کی تلاش تھی۔ افسوس، عمر کے پچیس سال ایک اُجاڑ گاؤں میں بسر کر دیئے۔

خوش آیند خیالات کی رَو میں بہتا ہُوا وُہ دکانوں کی سیر کرنے لگا۔ رفتار میں اُن انسانوں جیسی تمکنت تھی جو اپنے آپ سے برسرِ پیکار نہیں ہوتے اور اپنے گردوپیش کی ہر شے کو پسند کرتے ہیں۔ جن کا دماغ گزشتہ کامیابیوں کے نشے سے یا آنے والی کامرانیوں کے یقین سے ایک سرور کے عالم میں ہوتا ہے، سوچنے لگا کہ اگر کچھ نہ کیا جائے اور صرف بھیک ہی مانگی جائے تو کیا اِن خوش پوش انسانوں میں سے ہر ایک اُسے ایک ایک پیسہ نہ دے گا۔ ان کے مطمئن چہرے ان کی پُرصحبوں کے مظہر ہیں۔ یہ سب دولتمند ہیں اور کسی فقیر کو ایک پیسہ دے دینا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر وہ ہاتھ پھیلا دے، اور مُنہ سے چند دُعائیہ جُملے کہتا رہے، تو ایک گھنٹے میں اُس کے پاس کئی دن کے گزارے کو رقم جمع ہو سکتی ہے۔ اور رام سنگھ کسی اور خیال سے نہیں، صرف دل بہلانے کے لئے، راہگیروں کو گِننے لگا۔

وُہ اپنے خیالات سے کھیل رہا تھا، یا شاید خیالات اُس سے کھیل رہے تھے۔

اٹھارہ اُنیس برس کا ایک موٹا تازہ لڑکا رام سنگھ کے پاس آیا۔ رام سنگھ اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ لڑکا ایک میلی سی دھوتی باندھے اور ایک بوسیدہ صدری پہنے ہوئے تھا۔ دھوتی اتنی چھوٹی کہ اُس کی رانیں کُھلی ہوئی تھیں، اور صدری کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے، فربہ رخساروں نے ایک مکروہ، ملتجیانہ انداز سے اوپر کی طرف اُٹھ کر اُس کا مُنہ کھول دیا تھا اور آنکھیں قریب قریب بند کر دی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ بھیک کے لئے پھیلائے، دوسرے سے متواتر اپنا کثیف پیٹ کھجائے جا رہا تھا جس سے پیٹ میں سفید سفید دھاریاں پڑ رہی تھیں۔

رام سنگھ اُس سے بات کرنی چاہتا تھا۔ وہ اُس سے پُوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اِن ہزارہا خوش پوش انسانوں نے اُسے اتنے پیسے نہ دیئے تھے کہ وہ نہا دھو کر کپڑوں کا ایک سفید جوڑا پہن لیتا، وہ ملازمت کیوں نہیں کرتا تھا۔ بھیک مانگتے ہوئے اُسے شرم کیوں نہیں آتی تھی۔ مگر تھوڑی دیر تک لڑکے کو غور سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک ہاتھ سے پیٹ کھجانے، دوسرے سے بھیک مانگنے اور مُنہ سے "بابا ایک پیسہ" کہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا، کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ انسانیت کے اس کریہہ المنظر نمونے کو دیکھتے دیکھتے اُسے گھِن آنے لگی اور لڑکے کے غلیظ ہاتھ پر ایک پیسہ رکھ کر وہ آگے چلنے لگا۔

مگر اب فقیروں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ اندھے فقیر جو چھوٹے چھوٹے بچوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے، اپاہج فقیر، جن سے کھڑا بھی نہ ہُوا جاتا تھا اور بڑی دقت سے رینگ رینگ کر اُس کے قریب آ رہے تھے، اور عورتیں، جن کی گود میں سرخ متورم آنکھوں والے بچے تھے، رام سنگھ نے ایک اندھے فقیر کو پیسہ دینا چاہا، مگر ایک چھوٹے سے بچے نے جو اُس کی راہ نمائی کر رہا تھا پیسہ لے کر ایک مجرمانہ انداز سے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنی جیب میں پیسہ ڈالتے ہوئے کہا "چلو بابا، کچھ نہیں ملا۔"

رام سنگھ کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر یہاں سے بھاگ جائے، اور پھر کبھی نہ آئے، مگر ماں کو کیا مُنہ دکھائے گا۔ اُس کے دماغ میں ہزارہا سوالات کا ہجوم تھا اور وہ کسی سے ان کا جواب لینا چاہتا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں

اس جاہ وحشمت کے دوش بدوش ایسی بھیانک عسرت کیوں موجود تھی۔

اچانک وہ کسی چیز سے اُلجھ کر گرتے گرتے بچا۔ مڑ کر دیکھا تو پٹڑی کے کنارے ایک مزدور اپنی جھلّی میں بیٹھا اُونگھتا نظر آیا۔ یہ شخص اُس کے گاؤں کا باشندہ تھا۔ رام سنگھ نے اُسے پہچان لیا، مگر اُس نے رام سنگھ کو نہ پہچانا یا شاید پہچاننا مناسب نہ سمجھا۔ گاؤں میں یہ کیسی شان سے آتا تھا۔ کیا کیا باتیں بناتا تھا، مگر یہاں یہ حالت کہ جھلّی میں بیٹھا اُونگھ رہا ہے، راہ گیر اُس کی ٹانگوں سے اُلجھ کر گالیاں دیتے ہیں۔ وہ ٹانگیں سکیڑ کر نیم باز آنکھوں سے اُنہیں دیکھتا اور معذرت کرتا تھا۔ نیند آنے پر ٹانگیں پھر پھیل جاتی ہیں اور پھر نئی گالیاں۔

اس وسیع شہر کے ایک وسیع بازار کا صرف ایک چوتھائی حصّہ طے کرنے کے بعد رام سنگھ ایک بدلا ہُوا انسان تھا۔ وہ بار بار سراسیمگی سے چاروں طرف اس طرح دیکھتا گویا دشمنوں سے گھرا ہو۔ اور جب اُس نے مرے ہوئے دل سے کئی دُکانداروں سے ملازمت کی درخواست کی تو اُنہوں نے تو بے پروائی سے انکار کر دیا۔

بڑا دھوکا ہُوا۔ وہ یہاں ایک ساہوکار کی طرح آیا تھا کہ اُمید کا قرض روزی کی صُورت میں وصول کرے، مگر یہ لوگ خائن نکلے۔ وہ ایک تاجر کی طرح اپنا زورِ بازو فروخت کرنے آیا تھا، مگر کوئی گاہک نہ ملا۔ روزی جو بازار کے سرے پر اُسے ہر دوکان میں، ہر شخص کی جیب میں نظر آرہی تھی تلاش کرنے پر کہیں نہ ملی۔ اب وُہ دیوانہ وار ہر انسان سے ملازمت کی درخواست کرتا پھر رہا تھا۔ اُس کی آواز فقیروں کی طرح التجا آمیز ہو گئی تھی۔ مگر ناکامی کے سوا اُسے کچھ نہ ملا۔

اور جوں جوں اُس وسیع بازار کو دیکھتا جاتا، یہ اُس کی نگاہ میں چھوٹا ہوتا جاتا تھا۔

چند روز بعد رام سنگھ بھوکا اور سردی سے ٹھٹھرا ہُوا، رات کے وقت ایک نیم تاریک گلی کے مدّھم لیمپ کے نیچے دیوار سے کمر لگائے اپنے مختصر سے سامان کے گم ہو جانے اور چھوٹی سی پُونجی کے ختم ہو جانے پر غور کر رہا تھا۔ اُیسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ مقام شہر کا دُوسرا سرا تھا۔ پہلا سرا سٹیشن تھا جہاں سے نکل کر اُس نے چلنا شروع کیا اور چلتے ہی گیا۔ سجے سجائے روشن بازاروں میں اور تنگ و تاریک پیچدار گلیوں میں۔ اس دوران میں اُس نے کھایا پیا بھی اور آرام بھی کیا مگر اس کے باوجود شہر میں گزارے ہوئے یہ دن ایک ایسا طویل سفر معلوم ہوتے تھے جو اُس نے بے خواب و خور پورا کیا تھا۔ وہ تمام راستے جو اُس نے طے کئے تھے اُس کے ذہن میں ایک سلسلے میں مل کر ایک طویل سڑک بنا چکے تھے جس پر وُہ دن رات کسی شئے کی تلاش میں چلتا رہا تھا۔ اب آگے جانا ناممکن تھا، کیونکہ سڑک ختم ہو گئی تھی۔ اور واپس ہونا عبث کیونکہ اُس حصّے کو وہ خُوب دیکھ چکا تھا۔

وُہ یہاں کے ہر انسان سے واقف تھا۔ اُن کا چہرہ مُہرہ ایک دُوسرے سے مختلف مگر دل یکساں تھا۔ وہ سب اُس کے دشمن اور اُسے مار ڈالنے پر تُلے ہوئے تھے۔ وہ اُن کی ہر حرکت اور اُن کے مُنہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو ایک عجیب معنی دیتا اور سوچتا کہ "یہ لوگ میری

درخواست پر بے پروائی سے سر ہلا دیتے ہیں مگر ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "بھوکا مر، شہر اتنا بڑا صرف اس لئے بنا ہے کہ میں تھک کر گر پڑوں اور مر جاؤں۔ مکانوں کے دروازے اس لئے بند کر دیئے جاتے ہیں کہ میں سردی سے ٹھٹھر جاؤں"۔ قطعاً بلا سبب ہر انسان اُسے اپنے سے بچ کر جاتا ہُوا معلوم ہوتا تھا، اور اس ڈر سے کہیں بیٹھتا بھی نہ تھا کہ کوئی اُٹھا نہ دے۔

اب اُسے غنودگی آ گئی۔ راہ گیر ظلم اور سرد مہری کے متحرک مجسموں کی طرح اُس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اُن کے قدموں کی آواز سخت فرش پر متواتر گرتے ہوئے پتھروں سے مشابہ تھی۔ اُسے ایک غیر یقینی سا احساس تھا کہ وہ تھکا ہُوا اور بھوکا ہے۔ مگر تکان میں ایک عجیب لُطف تھا، اور بھوک میں ایک ناقابلِ فہم اطمینان۔

یکایک کوئی شخص اُس کے بالکل قریب آ کر ٹھہر گیا۔ رام سنگھ نے آنکھیں کھولیں۔ ایک نامعلوم خوف اُس پر مسلّط ہو گیا۔ اُس نے بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر ٹانگیں حرکت نہ کرتی تھیں۔ جس وقت وہ شخص اُس کے پاس سے سامنے زینے کی طرف جا رہا تھا تو رام سنگھ نے دیکھا کہ وہ غیر معمولی طور پر دراز قد تھا، اُس کا ایک شانہ دوسرے سے اُونچا تھا اور سر کو اس قدر جھکا کر چل رہا تھا کہ رام سنگھ کو اُس کی آگے نکلی ہوئی گردن پر سر کا صرف پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ اُس کے زینے پر چڑھ جانے کے بعد رام سنگھ نے پھر بھاگ جانے کا ارادہ کیا مگر پھر اس خیال سے رُک گیا کہ کیوں نہ اُس شخص سے نوکری کی درخواست کرے، اب تک وہ ایک ہی قسم کے انسانوں سے درخواست کرتا رہا تھا مگر یہ اُن سب سے مختلف تھا، شاید اُن سب سے بدتر۔ مگر جب اچھے اُس کے لئے بُرے بن گئے تو ممکن ہے کہ بُرے اچھے بن جائیں۔

زینے کے قریب آیا تو ٹانگوں نے چڑھنے سے جواب دے دیا، دیوار پر ایک رسی میخوں سے بندھی ہوئی نظر آئی۔ اُس کے ذہن نے جو ہر شے کے مخصوص معنی لینے کا عادی ہو چکا تھا، اس میں غیبی اشارہ دیکھا اور اسی میں جھومتا ہُوا وہ اُوپر چلا گیا۔

بہت چھوٹا سا مکان تھا۔ کمرے میں ہر چیز منتشر پڑی تھی، اور وہی آدمی گرد آلود فرش پر بیٹھا ایک دھوئیں سے اَٹی ہوئی لالٹین کی روشنی میں کھلونے بنا رہا تھا۔ نو وارد کو دیکھ کر اُس نے سر اُٹھایا۔ رام سنگھ لڑکھڑا کر آگے بڑھا اور کمرے کے چوبی ستون کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ کمرہ یکایک بہت طویل ہو گیا تھا جس کے دوسرے سرے سے دیوار کا ایک سیاہ دھبا بلند ہو کر اُس کی طرف آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک دراز قد انسان بن گیا۔ اُس کے پیچھے کو کھنچے ہوئے اُونچے نیچے اور تنگ شانوں پر چیچک سے گھرا ہُوا چہرہ تھا جس کے گڑھے نیچے سے روشنی پڑنے کی وجہ سے اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ چہرہ کرم خوردہ سیاہ کپڑے کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ کر ایک زیادہ گہرے سیاہ رنگ کی پتلی لکیر بن گئے تھے۔ جو قدرے خمیدہ ہو کر دو پھولے ہوئے نتھنوں کی طرف اُٹھ گئی تھی، اور دو آنکھیں، بہت چھوٹی چھوٹی، اس سیاہ کپڑے کے دو چھیدوں میں سے جھانکتی ہوئی گھنی پلکوں کے نیچے چمک رہی تھیں۔ وہ کمرے کو بتدریج بڑھتی ہوئی رفتار سے طے کر رہا تھا مگر اُس کا ہر قدم گرد آلود فرش کی بجائے رام سنگھ کی کنپٹیوں پر پڑ رہا تھا۔ جوں جوں وہ قریب آتا جاتا، اس کا قد دراز تر ہوتا جاتا تھا، اور اُس کے بھیانک خدوخال واضح تر، یہاں تک کہ وہ بالکل اُس کے

قریب آگیا اور رام سنگھ کے عرق آلود چہرے پر اُس کا گرم متعفن سانس پڑنے لگا۔ پھر وہ اپنی چمکدار آنکھوں سے رام سنگھ کا جائزہ لینے لگا۔ اُس نے غور سے اُس کے گنواروں جیسے لباس کو، اُس کے مضبوط اور سڈول جسم کو، اور اُس کے سادہ دیہاتی خد و خال کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں رام سنگھ کی دہشت زدہ آنکھوں پر جما دیں۔

اُس نے کرخت آواز میں حقارت سے سوال کیا "بھیک مانگتا ہے؟" رام سنگھ نے آہستہ سے سر ہلایا اور کانپتے ہوئے ہاتھ اپنے خشک ہونٹوں تک لے گیا۔ کھلونے والا کوٹھڑی میں سے ایک میلی ڈکری نکال لایا اور فرش پر رکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا "لے کھا!"

رام سنگھ بیٹھ گیا۔ روٹی کو دیکھتے ہی اُس کی دہشت بھوک سے دب گئی۔ دونوں ہاتھوں سے روٹی کو مروڑ کر اُس نے دو ٹکڑے کئے۔ مُنہ پھاڑ کر اُس کی طرف لپکا، مگر یکایک رُک گیا۔ اس طرح جیسے کسی نے بازو پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا ہو۔ آخر اُس نے بھیک ہی مانگی۔ اس طرح تو وہ پہلے ہی اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ یہ آدمی کھلا پلا کر اُسے گھر سے نکال دے گا اور کل وہ سڑکوں پر ہاتھ پھیلاتا پھرے گا چند ہی روز میں اُس کی دھوتی میلی ہو جائے گی اُس کی صدری کے بٹن ٹوٹ جائیں گے، اُس کا جسم کبھی نہ نہانے سے غلیظ ہو جائے گا۔ اور پھر وہ ایک ہاتھ سے پیٹ کھجاتے ہوئے کہا کرے گا "بابا! ایک پیسہ!"

رام سنگھ نے جھرجھری لی۔ یہ کھانا ایک زہر تھا جو رفتہ رفتہ اُسے ایک نیا انسان بنا دے گا۔ ایک بدتر انسان، ایک بھک منگا بے حیا، بے وقوف، بے کار!

اُسے کھلونے والے پر غصہ آنے لگا۔ چلّا کر بولا "کیا تم مجھے بھکاری سمجھتے ہو؟ بھیک ہی مانگنی ہوتی تو تم سے کیوں مانگتا؟ میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے گھر کو صاف کر دوں گا۔ سارے مکڑی کے جالے اُتار دونگا۔ تمہارا سودا بازار سے لا دونگا۔ مجھے نوکر رکھ لو" کہنا بہت کچھ چاہتا تھا، مگر کہہ نہ گیا۔ مارے نقاہت کے کتے کی طرح ہانپنے لگا۔

ذرا سی دیر کے لئے کئی دن سے دل میں بیٹھی ہوئی گداگری کی نفرت کھلونے والے کے ڈر پر غالب آگئی تھی۔ مگر بھوک نے دونوں کو کچل دیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ یہاں بھی انکار ہوا تو کیا کرے گا۔

کھلونے والا مسکرایا۔ ایک ایسے انداز سے جو کہتا تھا کہ "تو بیوقوف ہے۔ میں تیرا مطلب پہلے ہی سمجھ گیا تھا" اور بولا "کھانا کھا لے۔ آج سے تو میرا نوکر ہے۔"

رام سنگھ کو معلوم نہ تھا کہ اب بھی اُس نے بھیک ہی مانگی تھی۔ اور بھیک بھی روٹی کی نہیں، بلکہ غلامی کی۔ کھانے کے بعد اُس کے خیالات زیادہ باترتیب ہو گئے۔ وہ گزشتہ واقعات کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب وہ فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کا خون تیزی سے دورہ کر رہا تھا اور ٹانگوں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں کھلونے والا کوئی ڈاکو تو نہیں ہے جو انجان دیہاتیوں کو پھانس کر لوٹ لیتا ہے۔ مگر پھر اس خیال سے دل کو تسکین ہو گئی کہ اُس کے پاس رکھا ہی کیا ہے جو کوئی لے گا۔ لیکن اُسے خبر نہ تھی

کہ کھلونے والا ایسا احمق ڈاکو نہ تھا کہ اُس کی جیب خالی کرتا، اُس کی نگاہیں تو رام سنگھ کے بھرے ہوئے بازوؤں پر تھیں جن کی رگیں خُون سے پُر تھیں، کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ جیب کاٹنے پر سزا ملتی ہے مگر خون چوسنے پر کوئی بازپُرس نہیں ہوتی۔

دُوسرے دن رام سنگھ ایک لمبا کُرتہ اور مخروطی ٹوپی پہنے شہر میں کھلونے بیچتا پھر رہا تھا۔ اس اونچی نکیلی ٹوپی پر اور ٹخنوں تک لٹکتے ہوئے سبز رنگ کے کُرتے پر جابجا اُن کھلونوں کی تصویریں تھیں جو اُس کے گلے میں لٹکی ہوئی چوبی کشتی میں رکھے تھے کھلونوں کا لباس ایسا ہی تھا جیسا رام سنگھ کا۔ اُن کا سینہ دبانے سے "تا تا" کی آواز نکلتی تھی جسے بچے بہت پسند کرتے تھے۔ رام سنگھ بچوں کو متوجہ کرنے کے لئے یہی صدا لگاتا۔ "تا تا" ہی ان کھلونوں کا نام تھا اور یہی نام اس کے ننھے خریداروں نے رام سنگھ کو دے دیا، اور وہ اس عجیب و غریب لباس والے انسان کو "تا تا" کہہ کر پکارنے لگے۔ ایک ہی دن میں وہ بچوں میں خوب مقبول ہو گیا۔

جب شام کو رام سنگھ تھک کر چُور کھلونے والے کے پاس آیا، تو کشتی میں چند بچے ہوئے کھلونے دیکھ کر اُس کا مالک طیش میں آ گیا۔ اُس نے رام سنگھ سے بات تک نہ کی اور بے تحاشا اُسے مارنے لگا۔ رام سنگھ تھوڑی دیر تک حیرت سے کھلونے والے کو دیکھتا اور بغیر جنبش کئے مار کھاتا رہا۔ پھر بھاگتا ہُوا زینے سے اُتر گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یونہیں تیزی سے بھاگتا ہُوا اپنے گاؤں پہنچ جائے گا، مگر زینے کے دروازے ہی میں رُک گیا۔ سامنے ہی وہ دیوار تھی جس سے کل رات کو کمر لگائے کھڑا رہ چکا تھا اور دیوار کے پاس ہی وہ لیمپ جو اس وقت بجھا ہُوا تھا مگر جس کی روشنی میں کل وہ گلی کے رہنے والوں کو اپنے سے بچ کر نکلتا ہُوا دیکھتا رہا تھا۔ اس دیوار پر اُسے اپنی آوارہ گردی کی تصویر کھنچی ہوئی نظر آئی اور بجھے ہوئے لیمپ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہُوا کہ ایک مشعل جو اُسے شہر کا دُوسرا اسرا دکھانے کے لئے جلائی گئی تھی، اپنا کام ختم ہو جانے پر گُل کر دی گئی۔ پھر اُسے کل کا کھلونے والا یاد آیا۔ وہ دہشت یاد آئی، جو اُسے دیکھ کر اُس پر طاری ہو گئی تھی۔ اس عجیب انسان نے اُس وقت جب کہ وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا، اُسے روٹی دی، پناہ دی، اور نوکری بھی دی جس کی تلاش میں وہ اپنی ماں کو روتا ہُوا چھوڑ کر شہر میں آ گیا تھا۔

رام سنگھ خاصی دیر تک زینے میں کھڑا رہا، کھلونے والے نے اُس کا تعاقب نہ کیا تھا، نہ اُسے آواز دی تھی۔ رام سنگھ کو محسوس ہُوا کہ اُس کے پاؤں میں ایک وزنی زنجیر پڑی تھی جس کا دُوسرا سرا اُس کے مالک کے ہاتھ میں تھا بھاگنے کی کوشش بیکار تھی کھلونے والا اُسے کھینچ رہا تھا۔ اور اُس کی قوت کا مقابلہ ناممکن تھا آخر اس زنجیر میں کھنچا ہُوا وہ اُس کے پاس چلا گیا۔

اور اُس روز سے رام سنگھ روز مار کھانے لگا۔ کھلونوں کے بچ جانے پر بھی، اور بک جانے پر بھی۔ بچ جاتے تو مالک کو نوکر کی کاہلی پر غصہ آتا، اور بک جاتے تو خود اپنے اُوپر کہ کیوں اور نہ بنا دیئے کہ وہ بھی بک جاتے۔ قصور کبھی خادم کا ہوتا کبھی مخدوم کا۔ مگر سزا دونوں

کی خادم ہی کو ملتی۔ یہاں تک کہ مار کھاتے کھاتے رام سنگھ کی کھال سخت ہو گئی اور احساسات مُردہ ـــــ یا صرف خوابیدہ، اور چند ہی مہینے بعد آقا اور غلام مار کو ایک مختلف زاویۂ نظر سے دیکھنے لگے۔ مار نہ سزا رہی نہ عذاب بلکہ جُوا کھیلنے یا شراب پینے کی طرح، جن کا کھلونے والا عادی تھا، ایک پُر لطف مشغلہ اور کھلونے بیچنے کی طرح ایک فرض بن گئی۔ اور آخر محض عادت۔

اور زنجیر بھی روز بروز ہلکی ہوتی گئی، یہاں تک کہ اُس کا وزن غیر معلوم ہو گیا۔

ـــ

ایک دن رام سنگھ کی کشتی معمول سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ کھلونے والے نے کئی روز تک محنت کر کے اُس کو لبالب بھر دیا تھا۔ کئی روز سے رام سنگھ تمام کھلونے بیچ کر آیا کرتا تھا۔ آج اُس کا مالک دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کتنے کھلونے بیچ رکھتا ہے۔

پھرتے پھرتے رام سنگھ شہر کی ایک ایسی گلی میں پہنچ گیا جو اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہاں کے بچوں نے کھلونوں سے زیادہ اس عجیب لباس والے انسان کو پسند کیا، اور اُس کے پیچھے تالیاں بجانے اور اُچھلتے کُودتے پھرنے لگے۔ رام سنگھ آج بہت خوش تھا ایک عرصے سے بچوں نے اُس کی سرد مہری دیکھ کر اُس میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ وہ کبھی کسی سے بات نہ کرتا اور جب گاؤں کا کوئی آدمی کہیں نظر آ جاتا تو وہ نظر بچا کر نکل جاتا تھا۔ کئی کئی روز تک اُس کے مُنہ سے "تا تا" کی صدا کے سوا ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا اُسے کھلونوں کی قیمت بتانے کی حاجت بھی نہ تھی۔ کیونکہ آئے دن خریدتے رہنے کی وجہ سے اُس کے ننھے خریدار قیمت جانتے تھے۔ اُنھوں نے بیسیوں کھلونے خریدے تھے ـــــ اور توڑ دیئے تھے۔

مگر اس گلی کے بچوں نے جنس سے زیادہ تاجر کو پسند کیا، اور اُس کے کھلونوں میں دلچسپی لی تو صرف اُس کی وجہ سے چنانچہ جب وہ شام تک بچوں کی طرح اُن کے ساتھ کھیلتا، اُنھیں کندھے پر بٹھا کر ناچتا اور اُنھیں پہاڑوں کے بھولے دیہاتی گیت سناتا رہا۔ تو اُنھوں نے اُس مسرت کے معاوضے میں جو رام سنگھ نے انھیں دی تھی، اُس کے کھلونے کچھ تو خود خرید لئے اور کچھ گلی کے مکانوں میں لے جا کر بیچ دیئے۔ اور پھر اُس سے کھیلنے لگے۔ یہاں تک کہ تھک کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کبھی کبھی کوئی بچہ آتا، اور زور سے چٹکی لے کر بھاگ جاتا، مگر رام سنگھ خفا نہ ہوتا ـــــ خفا ہونا تو وہ بھول چکا تھا۔

اُس نے اُن میں سے ہر ایک کا نام پوچھا اور بچوں نے وہ چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے نام بتا دیئے جو ماں باپ نے محبت سے رکھے تھے۔

بچوں نے سوال کیا "اور تمہارا نام؟" بے ساختہ رام سنگھ کے مُنہ سے نکلا "رامو" مگر اپنے ہی مُنہ سے یہ نام سُن کر وہ چونک پڑا۔ رامو؟ کیا یہی اُس کا نام تھا؟ اُس کا زنگ آلود دماغ ایک مدت کے بعد کام کرنے لگا۔ رامو؟ رامو؟ یہ نام اُس نے کہاں سُنا تھا؟ کس سے سُنا تھا؟ گاؤں میں؟ ہاں، وہاں اُس کے ساتھی، اس کے گھر والے، اسی نام سے اُسے پکارتے تھے۔ گاؤں؟ ساتھی؟ گھر کے لوگ!

وہ سر کو ہاتھوں سے پکڑ کر زمین کی طرف دیکھنے لگا اور نہ جانے کیا کیا گزری ہوئی باتیں یاد آگئیں۔

یکایک زنجیر کو جنبش ہوئی۔ رام سنگھ اپنی خالی کشتی اُٹھا کر چلنے لگا۔ بچے جو اُسے خاموش دیکھ کر آپس میں کھیلنے لگے تھے اُسے جاتا دیکھ کر اُداس ہو گئے۔

"رامو! ابھی نہ جاؤ۔ ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔"

"میں نہ گیا تو میرا مالک مارتے مارتے میرا دم نکال دے گا۔"

بچے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ "کیا وہ تمہیں مارتا ہے؟"

رام سنگھ نے آہستہ سے کہا "ہاں" اور شرمسار نگاہوں سے بچوں کے ہمدردانہ چہروں کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

"تم کیوں مار کھاتے ہو؟"

"وُہ مارتا ہے۔"

"اتنے بڑے آدمی بھی پٹتے ہیں!"

رام سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جلد جلد قدم بڑھا کر وہاں سے چلا گیا۔ گھر پہنچا تو خلافِ معمول ہشاش بشاش تھا۔ رام سنگھ کا شگفتہ چہرہ اور خالی کشتی دیکھ کر کھلونے والے کو طیش آ گیا۔ سمجھا کہ وہ فخر کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ تمام کھلونے بیچ کر اُس نے اپنے مالک کو شکست دی تھی۔ اور آج اُس نے رام سنگھ کو اس لئے نہ مارا کہ یہ عادت تھی، بلکہ اس لئے کہ غلام کی گستاخی پر آقا مغلوب الغضب ہو گیا تھا۔

رام سنگھ بلک بلک کر رونے لگا۔ آج اُس نے محسوس کیا کہ ایک تنِ روٹی کھانے، دن بھر کھلونے بیچنے اور شام کو پٹنے کے علاوہ دُنیا میں اَور بھی کام ہیں۔ اُسے وہ بچے یاد آئے اور اُن کے قہقہے کانوں میں گونجنے لگے، اور اپنا گاؤں یاد آیا، جہاں وہ نہایت مطمئن زندگی بسر کرتا تھا۔ اگر وہ وہیں رہتا تو اب تک اُس کی شادی ہو گئی ہوتی۔ اُس کے ایسے ہی پیارے پیارے ہنس مُکھ بچے ہوتے اور وہ اُن سے کھیلا کرتا۔

اور اُس گلی کے بچے اپنے گھروں میں بے خبر سو رہے تھے۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ اُن کے قہقہوں نے اُس مخروطی ٹوپی والے انسان کے احساسات کو بیدار کر کے اُس پر ظلم کیا تھا۔ مگر نادان بچے کیا جانیں کہ بے ہوشی میں نشتر چبھتے نہیں۔

آج زنجیر پاؤں کو چھلے ڈالتی تھی۔ اتنی وزنی تو کبھی معلوم نہ ہوئی تھی۔ آج پھر بھاگ جانے کی خواہش پوری شدت سے رام سنگھ کے دل میں پیدا ہوئی۔ مگر احساسِ گرفتاری نے جس قدر طاقتِ فرار بخشی، اُسی قدر زنجیر کا وزن بھی بڑھا دیا، اور اس توازن سے رام سنگھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

اب وہ روز اُس گلی میں جاتا اور سارا دن بچوں کے ساتھ کھیلنے میں گزار دیتا۔ شام کو وہ اُس کے کھلونے آپس میں بانٹ کر قیمت

اُسے دے دیتے تھے۔

بچے اُسے "تاتا" ہی کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ رامو کہنے سے وہ ہمیشہ اُداس ہو جاتا تھا اور اُن کے کھیل میں فرق پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ بے معنی لفظ اُنہیں اتنا پسند آنے لگا کہ سارے دن گلی میں تاتا تاتا کا شور بپا رہتا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہُوا کہ جب رام سنگھ نے گلی میں جا کر "تاتا" کی صدا لگائی تو ایک بچہ بھی اُس کے پاس نہ آیا۔ رام سنگھ حیران تھا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ بڑی دیر کے بعد ایک بیمار بچے نے اُسے بتایا کہ اُس کے سب ساتھی اپنے اُستادوں کے ساتھ سیر کو گئے ہوئے تھے۔ رام سنگھ نے ارادہ کیا کہ آج کہیں اَور جا کر کھلونے بیچے، مگر شہر کی لاتعداد پیچدار گلیوں کے خیال ہی سے اُسے تھکان محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک مکان کی ڈیوڑھی میں پڑ کر سو گیا۔ اور شام کو جب اپنے مالک کے پاس واپس گیا تو سوائے چند کھلونوں کے جو راستے میں بک گئے تھے اُس کی کشتی کھلونوں سے بھری ہوئی تھی۔

آج کھلونے والا اُسے دیکھ کر غصے سے دیوانہ ہو گیا اور اپنے بازوؤں کی پُوری قوت سے اُسے مارنے لگا۔ رام سنگھ سر جُھکائے بے جان مُورت کی طرح زمین پر بیٹھا رہا۔ کھلونے والا جو خود اس بے حِسی کا باعث تھا آج اس بے حسی پر حیرت زدہ ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے ہاتھ روک کر وُہ انتہائی نفرت سے اُس ذلیل انسان کو دیکھنے لگا جو اتنی مار کھانے کے باوجود نہایت پُرسکون انداز سے سر جُھکائے زمین کریدر رہا تھا۔ اسے رام سنگھ کے اِس پُرسکون طرزِ عمل میں ایک خاموش اعلانِ جنگ اور اُس کی جُھکی ہوئی آنکھوں میں اپنی طاقت کا استحقار نظر آیا، گویا وہ اس بے حسی سے ثابت کر رہا تھا کہ اُس کی تمام قوت اُس کے نوکر کو تکلیف سے نہیں تڑپا سکتی اُس کی خاموش زبان کہہ رہی تھی کہ "دیکھوں تو مجھے کتنا مار سکتا ہے"۔

کھلونے والے کا خون اُبلنے لگا۔ چلّا کر بولا، "ٹھہر جا، ذلیل کتے! خدا کی قسم آج میں تیرا بھیجا نکال دوں گا، اتنا ماروں گا کہ تیری کھال سے خون کے فوارے چھوٹنے لگیں گے" اور وہ جھپٹ کر کمرے کے کونے سے لوہے کا گُرز اُٹھا لایا۔

رام سنگھ نے چونک کر سر اُٹھایا۔ کونے سے کھلونے والا گُرز کو سر سے بلند کئے اُس کی طرف جھپٹتا ہُوا آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ انتہائی غضب کی اذیت سے شکنجے میں جکڑا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ اور جبڑے چرڑ کی آواز کے ساتھ بھنچ گئے تھے۔

رام سنگھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ ایسا معلوم ہُوا کہ اُڑا چلا جا رہا ہے۔ اتنا تیز کہ ایک بجلی بھی جو اُس کے تعاقب میں ہے اُسے پکڑ نہیں سکتی۔ وہ برابر اُڑے چلا جا رہا ہے ـــ تیز، بہت تیز ـــ گاؤں کی سرسبز چراگاہوں پر، شہر کی پیچ دار گلیوں پر، تالیاں بجاتے ہوئے بچوں پر۔ اور آخر بجلی نے اُسے آ لیا۔ روشنی سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور یہ یکایک ایک خوشگوار تاریکی چھا گئی ـــ گاؤں کی چراگاہوں پر، شہر کے گلی کوچوں پر اور تالیاں بجاتے ہوئے بچوں پر۔ ایک دل خراش چیخ کے ساتھ اُس کے منہ سے "تاتا" کی صدا نکلی، اور وہ فرش پر گر پڑا۔

کھلونے والا مبہوت کھڑا رام سنگھ کو دیکھنے لگا جو اُس کے گز کی ایک ضرب سے شاید مر گیا تھا۔ گرنے سے پہلے اُس نے کیا کہا تھا؛ بے معنی سا لفظ تھا مگر کہتے وقت اُس کی آنکھیں چھت کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ مگر اُس وقت وہ چھت کو نہیں بلکہ اُس سے بہت دُور کسی کو دیکھ رہی تھیں کیا وہ کسی کو پکار کر بلا رہا تھا؛ مدد کے لئے یا صرف گواہی کے لئے۔ اپنے کسی ساتھی کو جس کا نام اُسے یاد آ گیا تھا؛ مگر وہ ہے کون جس کا نام ایسا عجیب، ایسا بے معنی ہے۔

اُس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ شاید اس کے ملازم نے اُسے پکارا تھا جسے دُنیا کا ہر انسان مصیبت کے وقت پکارتا ہے۔ جس کے بے شمار نام ہیں اور شاید "تاتا" بھی اُن میں سے ایک ہے۔ کیا وہ ذلیل انسانوں کے جھوٹ کو سچ بنانے والے ایک بے جان آلۂ کار کے سوا اور کچھ بھی ہے؟ کیا وہ غیظ و غضب سے دیوانے انسانوں کو زیادہ پُرغضب ظاہر کرنے والے ایک باجبروت نام کی بجائے کوئی باجبروت ہستی ہے جو اُس کے ملازم کی پکار سُن کر مدد کو آئے گی؟

کھلونے والا خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ بے چینی سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بھری ہوئی کشتی کا ایک ایک کھلونا سامعہ خراش آواز سے "تاتا، تاتا" چلا رہا تھا۔ اُس کے گھر کی چھت پر سے، دیواروں پر سے، زینے سے، گلی میں لوگ دوڑے ہوئے اُسے پکڑنے کو آ رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار کشتی کی طرف جھپٹا اور سر سے بلند کر کے اُسے زمین پر پٹخ دیا۔ پھر اپنے ملازم کے بے حس جسم کو کھینچتا ہوا دروازے تک لایا، اور ٹھوکر مار کر زینے سے نیچے پھینک کر کنڈی لگا لی۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ مگر بچوں نے اُس مخروطی ٹوپی والے آدمی کو نہ دیکھا، وہ اُسے بھولتے ہی جا رہے تھے کہ ایک دن وُہ گلی میں نظر آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بجلی کے ایک کھمبے کو تھامے ہوئے تھا، اور اُس کا جسم اُس کے ہاتھوں میں جھولتا ہوا آگے کو جُھک رہا تھا اُس کے سر پر وُہ نکیلی ٹوپی نہ تھی اور ڈھیلا ڈھالا کرتہ جا بجا سے پھٹ گیا تھا۔ اُس کی ٹانگوں پر کتوں کے کاٹنے سے زخم پڑے ہوئے تھے، جن میں سے بعض میں سے خون بہ رہا تھا۔ اور اُس کی سُرخ آنکھیں اُن کی طرف ہونے کے باوجود کسی دُور کی شے پر جمی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

بچے ڈرتے ڈرتے اُس کے قریب آئے۔ اُس کے لب بار بار حرکت کرتے، مگر اُن میں سے آواز نہ نکلتی تھی۔ بار بار مُسکرانے کی کوشش کرتا مگر ہونٹ لرز کر نیچے گر جاتے تھے۔ پھر نہایت دھیمی آواز سے اُس نے کہا "تاتا"۔ بچے سہم گئے۔ پھر اُن میں سے ایک ڈرتے ڈرتے ہنسا، اور اُس کے ساتھ سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

اب وہ اپنے پُرانے ساتھی کے گرد ناچ رہے تھے اور کئی روز کے بعد گلی میں "تاتا، تاتا" کا شور بپا تھا۔

ایک بچے نے کہا "تاتا بھوکا ہے"۔

"اس سے پُوچھو"

"تاتا، روٹی کھائے گا؟"

ایک بچے کو اپنے سے مخاطب دیکھ کر اُس نے آہستہ سے کہا "تاتا" اور مُسکرانے لگا۔ بچے حیرت میں تھے۔

"شاید تمہارا پیٹ بھرا ہُوا ہے، تاتا"

اُس نے پھر کہا "تاتا"

اور بہت جلد اُنہیں معلوم ہو گیا کہ اس ایک لفظ کے سوا وُہ کچھ نہیں جانتا۔

اب وہ دن رات اس گلی میں پڑا رہتا۔ بچے بہت خوش تھے۔ جب تک جی چاہتا اُس سے کھیلتے رہتے اور تھک جاتے تو اُسے چھوڑ کر چلے جاتے۔ کھلونوں کی آواز سننے کے لئے تو اُن کا سینہ دبانا پڑتا تھا، مگر اُسے اگر مارا جائے، چٹکی لی جائے، پن چبھوئی جائے، بس ذرا سا چھیڑ دیا جائے تو اُن کی دل پسند آواز نکلنے لگتی ہے۔ اور وہ ہر روز ایسے کھیل ایجاد کرتے جن میں اُس کا کام صرف اس ایک بے معنی لفظ کو بار بار کہنا ہوتا تھا۔

کبھی سارا دن بغیر کھائے گزر جاتا، اور کبھی وہ اُسے کھلائے ہی جاتے تھے۔ یہ بھی ایک کھیل تھا۔ ایک بچہ کسی مکان کے برآمدے میں سے روٹی کا ٹکڑا دھاگے میں باندھ کر اتنا اُونچا لٹکاتا کہ تاتا اُچھل کر بھی اُسے نہ پکڑ سکتا۔ پھر کہتے، کہو "تاتا" اور اُس کے کہتے ہی سب گننا شروع کر دیتے "ایک اکن ایک، ایک دونی دو، ایک تیئے تین"۔ قاعدہ یہ تھا کہ سَو بار تاتا کہنے پر ٹکڑا اتنا نیچا کر دیا جائے گا کہ تاتا اُسے لے لے۔ مگر ہمیشہ سَو سے پہلے ہی آپس میں لڑنا شروع کر دیتے۔ کوئی کہتا کہ اُنہتر تک گنا جا چُکا ہے، کوئی کہتا، ابھی صرف ستر ہوئے ہیں۔ بیشتر یہ اختلاف ننانوے پر ہوتا۔ مگر انجام ہمیشہ یہ ہوتا کہ گنتی نئے سرے سے شروع کر دی جاتی اور گنتی کے دَوران میں وہ سر اُوپر اُٹھائے بے حس و حرکت کھڑا ہُوا، روٹی کے ٹکڑے کو اس طرح دیکھتا رہتا، گویا تمام جسم آنکھ بن گیا ہو، اور ساری دُنیا سمٹ کر اس ٹکڑے میں سما گئی ہو۔

جاڑوں کا موسم تھا۔ سردی اتنی شدید تھی کہ بچے سورج غروب ہونے سے بہت پہلے ہی تاتا کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ اُنہوں نے ایک پھٹا پُرانا لحاف اُسے دے دیا تھا جسے وُہ دن رات اوڑھے رہتا تھا۔

ایک دن شام کے وقت سب بچے ایک جگہ جمع ہو کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ تاتا پاس ہی ایک دکان کے تختے پر بیٹھا تھا۔ وہ بار بار اُس کی طرف دیکھ کر مُسکراتے اور پھر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگتے۔

رات گئے ایک بچہ دبے پاؤں آیا۔ تاتا اِس طرح پڑا تھا کہ گودڑ کی بنی ہوئی بہت بڑی گیند معلوم ہوتا تھا۔ بچے نے اُس کا لحاف گھسیٹ لیا اور اُسے لے کر بھاگ گیا۔

پھر بہت دیر تک وہ اپنے گرم بستروں میں دبکے ہوئے اُس کی آواز سنتے رہے۔ وہ کبھی بلند آواز سے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تاتا کہتا، جس طرح شہر کے پیچیدہ گلی کوچوں میں کھلونے بیچتا پھرتا تھا۔ کبھی چیخ کر، جس طرح وہ اپنے مالک کی آخری ضرب پر پیچا تھا۔ اور کبھی بہت دھیمی خوشامد آمیز آواز میں، جس طرح اُن سے روٹی مانگتا تھا۔

اور صبح کو جب بچوں نے اُس کے پاس آکر تاتا، تاتا کا شور مچایا، تو اُس نے جواب میں "تاتا" نہ کہا۔ بچے رونے لگے۔ کھلونا ٹوٹ چکا تھا۔

احترام اللہ

محرومی

ہائے وہ دوشیزہ،

جسے عشق کی فرصت نہ ملی، جو پیار کے ایک لفظ کو ترسے،

جو اپنے اچھوتے گداز جسم کو قبر میں لئے جا رہی ہو!

فلسفہ

وہ اپنی ڈوبنے والے تارے کی مانند خاموش اور ناتواں بہن کی پائینتی بیٹھی سوچ رہی تھی،

زندگی دُکھ سہہ سہہ کے گزر جانے کا نام ہے تو ہم پھول اور سنگریزے کیوں نہ ہوئے!

"ابنِ مریم"

---

*

غزل

دلِ درد آشنا، آسودۂ منزل نہ بن جائے
مجھے ڈر ہے کہیں گرداب ہی ساحل نہ بن جائے

معاذاللہ یہی شیریں نوائی ہے تو اے مطرب!
حقیقت بھی کہیں افسانۂ باطل نہ بن جائے

نہیں اہلِ وفا کے صبر کا اندازہ ظالم کو
کہیں مشقِ ستم اس کے لئے مشکل نہ بن جائے

ہجومِ آرزوئے دید ہے اتنا کہ ڈرتا ہوں
کہیں میری نظر خود پردۂ محمل نہ بن جائے

رہے کاوش یونہی مشقِ تصور رات دن جبتک
جمالِ یار کا آئینہ تیرا دل نہ بن جائے

کاوش حیدرآبادی

ایک ایرانی محقق کے دو خط

ان خطوط کے مصنف مرزا محمد خان بن عبدالوہاب قزوینی ہیں۔ آپ نے یہ خطوط ایڈیٹر رسالہ "علوم مالیہ واقتصاد" طہران کے نام لکھے تھے۔

یہ خطوط اور دیگر مقالات "بست مقالہ قزوینی" کے نام سے باہتمام "پورداؤد" (شاعر مشہور) انجمن زرتشتیاں بمبئی نے شائع کئے ہیں۔ میں نے کتاب مذکور میں ان مکاتیب کو پڑھ کر محسوس کیا کہ گویہ مکاتیب ایرانی اُدبا کے لئے شمع ہدایت ہیں لیکن ہمارے حق میں اس سے بھی زیادہ مفید ہیں۔

مصنف کے مختصر سوانح حیات یہ ہیں: آپ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ کو عبدالوہاب بن عبدالعلی ز یکے از مؤلفین اربعۂ نامۂ دانشوران) کے گھر طہران کے محلے دروازۂ قزوین میں پیدا ہوئے۔

جب آپ کی عمر بارہ سال کی تھی آپ کے والد ماجد وفات پا گئے۔ لیکن اس امر کا اُن کی تعلیم پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ آپ نے علوم متداولہ اسلامی اپنے وقت کے مشہور ترین علماء سے طہران کے اندر ہی حاصل کئے ارران میں کمال حاصل کیا۔

۱۳۲۲ھ میں اپنے بڑے بھائی میرزا احمد خان کے بلانے پر جو ان دنوں لندن میں مقیم تھے، قدیم ونادر مخطوطات عربی و فارسی کے دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی غرض سے روس۔ جرمنی اور ہالینڈ کے راستے انگلستان گئے۔ دو سال کے قریب وہاں رہے۔ وہاں آپ کی آشنائی انگلستان کے بڑے بڑے مستشرقین پروفیسر A.A. Bevan، رنلڈ A. G. Ellis، H. F. Amedroz، ایڈورڈ براؤن مرحوم وغیرہم سے ہوئی۔

پروفیسر براؤن مرحوم نے جو کہ گیب میموریل کے صدر اور ناظم اعلےٰ تھے چند کتب کی تصحیح آپ کے سپرد کی۔ سب سے پہلے آپ نے تاریخ "جہانکشائے جوینی" کی تصحیح کا بیڑا اُٹھایا اور اس کام کی تکمیل کی غرض سے ۱۳۲۴ھ میں پیرس پہنچے۔ اور ۱۳۳۲ھ تک وہاں ٹھہرے رہے۔ وہاں بھی آپ کی بڑے بڑے علماء فرانس اور مستشرقین سے دوستی ہوگئی۔ علاوہ ازیں ایران کے مشہور فضلا جو ان دنوں فرانس یا یورپ کے دوسرے ممالک میں تھے۔ آپ کی قابلیت کا لوہا مان کر آپ کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ جنگ عظیم چھڑ جانے کے باعث اور کئی دوسری ضرورتوں سے مجبور ہو کر آپ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو سوئٹزرلینڈ کے راستے برلن چلے آئے۔ وہاں تقریباً ساڑھے چار سال مقیم رہے۔ ان دنوں ایران کے بہترین دماغ برلن میں جمع تھے

ان لوگوں نے مل کر ایک انجمن ادبی و علمی کی تشکیل کی جس میں ہر رُکن ایک مقالہ پڑھتا تھا۔

۱۶ رجمادی الآخر ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ رجنوری ۱۹۲۰ء کو آپ برلن سے پیرس پہنچے اور اپنے کام کی تکمیل کی۔

آپ نے مندرجہ ذیل کتب کی تصحیح کی، جو بڑے اہتمام سے یورپ میں چھپ چکی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے آپ کی وسعتِ معلومات اور دقتِ نظر کا علم ہوتا ہے۔

(۱) تذکرۃ الشعراء (لب الالباب) عوفی۔ (۲) مرزبان نامہ۔ (۳) المعجم فی معاییر اشعار عجم مؤلفہ شمس قیس رازی۔ (۴) چہار مقالہ نظامی عروضی۔ (۵) تاریخ جہانگشائے جوینی (تین جلدوں میں)

علاوہ ازیں سوانح جامی کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ پھر انگریزی میں کیا۔ یہ دونوں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ سوانح حیات مسعود سعد سلمان جن کا انگریزی ترجمہ پروفیسر براؤن نے شائع کیا۔ دیباچہ تذکرۃ الاولیا شیخ عطار کے علاوہ متعدد مقالات انگریزی فرانسیسی اور ایرانی رسائل میں لکھے جن کی ایک قسط شائع ہو چکی ہے۔

اگرچہ ان مکاتیب کا "اُردو۔ہندی" مسئلہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اگر ان خطوط کو بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو بعض برادرانِ وطن کو جو اُردو سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس کی علتِ حقیقی باحسنِ طریق سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ اِس خط میں بالواسطہ اُردو زبان کے بعض دیگر مابہ النزاع مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

فضل حسین

پہلا خط

پیرس

۲۷ رجولائی ۱۹۲۴ء مطابق ۲۴ رذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

آقائے عزیز محترم

والا نامہ مع "مجلہ علومِ مالیہ و اقتصادیہ" کے دو نمبروں کے ورود فرما ہوا۔ ذرّہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، چونکہ مَیں اقتصادیات کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ اور یہ مسائل میرے دائرۂ معلومات سے بکلّی خارج ہیں، اس لئے آپ کے مقالہ سے متعلق اظہار رائے سے معذور ہوں۔ اندریں حالات اگر اس باب میں کچھ لکھوں گا تو وہ نری آورد، تصنع، رعونت اور ادعائے محض ہوگا۔

ہاں چند جزئی اور غیر اہم ملاحظات جن کا تعلق اس مقالہ کے بیان و انشا سے ہے اپنی ناقص معلومات کے مطابق بطورِ امتثالِ امر پیش کرتا ہوں:۔

سب سے پہلے زبانِ فارسی کے اس عہدِ قحط الرجال میں اِس حسنِ انشاء اور سلاستِ زبان، خصوصاً اسلوبِ بیان، اندازِ کلام، الفاظ، جملوں اور اصطلاحوں کے فارسی ہونے پر صمیمِ قلب سے تبریک و تہنیت عرض کرتا ہوں۔

ہرچند بطورِ مثال کسی جرمن کا جرمن زبان میں، فرانسیسی کا فرینچ میں، یا انگریز کا انگلش میں دادِ سخن دینا اچنبھے کی بات نہیں۔ لیکن اِن دنوں ایران کے اندر فارسی لکھنا خدا کی دین اور اتفاقی امر ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ فارسی، کیمیا اور سیمرغ کے قبیل سے ایک موہومہ اور فرضی چیز بن چکی ہے۔

میری بود و ماند ایرانیوں کے اندر نہیں۔ ایران چھٹے مدتیں بیت گئیں۔ اس لئے میں صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر اُن رسائل و جرائد سے جو آج کل ایران سے نکل رہے ہیں فارسیٔ حالیہ کا اندازہ کیا جائے تو بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دس بیس سال اور اِسی ٹھور نکل گئے اور یہ ادبی ہرج و مرج قائم رہا۔ تو سعدی و حافظ کی فارسی کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اُڑتی دکھائی دیں گی اور ہندوستان کی اُردو یا الجزائر (الجیریا) کی عربی کے مانند ایک جدید مرکب زبان فارسی، عربی، فرینچ، روسی، انگریزی اور ترکی عناصر سے ترکیب پاکر اس کی جگہ لے لے گی۔

مَیں نے ہرچند غور و تفکر سے کام لیا۔ لیکن ادبیاتِ ایران کے اس تنزلِ سریع اور فارسی زبان کے انحطاطِ فجیع کی حقیقی علت معلوم نہ ہوسکی۔ کیونکہ ایک طرف سے تو مَیں محسوس کرتا ہوں کہ ظہورِ مشروطہ کے بعد سے ایرانیوں کا احساسِ وطن پرستی بیدار ہو چکا ہے۔ عام اہلِ ایران بقائے ایران، استقلالِ ایران اور حفظِ ملّت کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ لیکن جب دوسری جانب سے یہ خیال دل میں آتا ہے۔ کہ کسی قوم کی زبان ہی اس کی قومیت کا رُکنِ رکین ہوتی ہے تو سر پکڑ کے بیٹھ جاتا ہوں اور یہ تضاد و تناقض سمجھنے سے معذور ہوجاتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے انشاء پرداز بیک وقت گلا پھاڑ پھاڑ کر وطن پرستی بقائے ملت اور ایرانی قومیت کے نعرے بلند کرتے بھی نظر آتے ہیں، اور اُسی لمحہ اپنے ہاتھوں ایرانی قومیت کی رگِ گردن کاٹتے اور ملتِ ایران کے بقا و تحفظ کے ایک قوی ترین ذریعہ یعنی زبانِ فارسی کو بڑی شدت و سُرعت کے ساتھ فنا کے گھاٹ اُتارتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا اِن پر اُس روایتی شخص کی مثال صادق نہیں آتی جو اُسی ٹہنی کو جس پر بیٹھا تھا، جڑ کی طرف سے کاٹ رہا تھا۔

مَیں کبھی کبھی اپنے ہم وطنوں کے اِس تناقضِ عمل کو اس بات پر محمول کرکے کہ وہ "ملّت" کے مفہومِ حقیقی سے ناواقف ہیں، ٹوٹے دل کو تسلی دے لیتا ہوں۔ کیونکہ از روئے عقل یہ محال ہے کہ ایک شخص عمداً مادرِ وطن کے حق میں ایسی مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہو۔ تمام اقوامِ عالم کے اندر وطن کا حقیقی غدار اور خائن الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے کہ کوئی شخص سچے دل سے اِس بات کا متمنی ہو کہ اپنے وطن کے استقلال کی جڑوں پر اپنے ہاتھوں کلہاڑا چلائے اور مادرِ وطن کا سر اپنے ناپاک ہاتھوں سے کاٹے۔

لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ عمداً یا سہواً بہر حال وحدتِ ملی کے در پئے تخریب ہونا، دونوں کا نتیجہ برابر ہے۔ تاریخ، سہو و خطا اور جہل و غفلت کا عذر نہیں سُنتی، اوراقِ تاریخ اس قسم کی صدہا مثالوں سے بھرے پڑے ہیں، کہ افراد کی جہالت، غفلت، سہل انگاری اور حکام کی سُوءِ تدابیر و اہمال کے باعث بڑی بڑی قوی، باشوکت اور عظیم الشان قومیں فنا و زوال کے گرداب میں ایسی ڈوبیں کہ تا قیامت ان کا ابھرنا معلوم ــــ! ان کا نام ملے تو ملے نشان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملنے کا ــــ

سب سے حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ اس زمانے کے نام نہاد متجددین میں ایسے اشخاص پیدا ہو چکے ہیں، جو فارسی زبان سے عربی الفاظ کو بے دخل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں، بہانہ یہ بناتے ہیں کہ عربی زبان ایک خارجی عنصر ہے، جس نے بعض تاریخی مقتضیات اور ناگزیر حالات کے اندر فارسی زبان پر دھاوا بول دیا۔ اور ہٹینگا دکھا کر زبردستی داخل ہو گئی ــــ وغیرہ وغیرہ ــــ ماشاء اللہ کیا کہنے ہیں ــــ اچشم ما روشن!

لیکن یورپین اصطلاحات والفاظ کے استعمال کے وقت خودداری کا دامن ان حضرات کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور بغیر کسی احساسِ خجالت کے ہمیشہ فرنچ، انگلش، روسی اور جرمن الفاظ اپنی تحریروں میں استعمال کرتے یا بالفاظِ صحیح ٹھونستے رہتے ہیں۔

یہ تناقض اس لحاظ سے اور زیادہ حیران کُن ہے کہ فارسی میں عربی کے عمل دخل کو تو ہزار بارہ سُو سال ہوتے ہیں، اب عربی الفاظ اپنی قدامتِ مہاجرت، کثرتِ استعمال اور زبانِ فارسی کے دیارِ لطیف میں ہزار سالہ اقامت کے باعث اپنی اصلی قومیت کھو کر فارسی کی رعایا بن گئے اور ایک ثانوی حیثیت کے مالک ہو چکے ہیں۔ فارسی زبان سے "ہم شہر" ہونے کے باعث یگانگی کا ناطہ گانٹھ کر "اغیار" کے زمرہ سے نکل چکے ہیں، اس لئے اب انہیں خارجی اور بیرونی عنصر شمار کرنا نادانی ہے جس طرح کوئی ہندوستانی قبیلہ اب سے کئی سو سال قبل ہجرت کر کے ایران میں آ بسا ہو، یہاں کی بود و باش مستقلاً اختیار کر لی ہو۔ اس کا مرنا جینا اسی دیس میں ہو، تو یہ ہندوستانی خاندان مرورِ ایام سے اب ایرانی خانوادہ شمار ہونے لگے گا۔ اس پر ہندوستانی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یا اہلِ عرب جو صدرِ اسلام میں سپاہی، تاجر، کاشتکار یا حاکم کی حیثیت سے ایران میں آکر آباد ہوئے۔ جیسے شیبانی، غفاری، خالدی، انصاری وغیرہم۔ اور سب سے واضح اور روشن مثال ساداتِ کرام کی ہے، جن کا شجرۂ نسب قطعی طور سے عرب سے جا ملتا ہے۔ وہ صدیاں گزریں ترکِ وطن کر کے ایران میں رونق افروز ہوئے۔ اب وُہ اپنے آپ کو ایرانی جانتے ہیں اور ایرانیوں کو ان کی "ایرانیت" میں کوئی کلام نہیں۔ بلاشبہ یہ سادات بزرگ ایرانی ہیں اور ایران کے نفع و نقصان، عروج و زوال اور سُود و زیاں میں برابر کے شریک۔ مادرِ وطن کا جیسا دیگر ایرانیوں پر حق ہے ایسا ان پر بھی ہے۔

مجلسِ شورائے ملی میں چند حضرات سادات ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ فرمایئے؛ کیا رائے ہے اہلِ ایران کی ان ساداتِ صحیح النسب کی بابت؛ یہ ایرانی ہیں یا عرب؛ اگر عرب ہیں تو پھر مجلسِ ملی کے اندر اس خارجی عنصر کا بطورِ نمائندۂ ایران موجود ہونا

—— یعنی چہ —— ؟

اگر یہ سید ایرانی ہیں تو پھر ان کے شجرۂ نسب کی صحت کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے ؟ اس پر تو کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا، کہ ایرانی ملت کے نقطۂ نظر سے یہ سب کے سب سادات عظام خارجی اور بیرونی نژاد ہیں۔

کیا "یک بام و دو ہوا" یہی تو نہیں —— ؟!

شاید اس مغالطہ کا باعث "نژاد و ملت" کے مفہوم سے ناواقفیت ہے۔ اور ان دونوں کا باہمی فرق معلوم نہیں، کیونکہ نژاد ایک طبیعی اور لاینتغیر امر ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ خارجی ہو۔ لیکن "ملت" خود ساختہ، وضعی اور اصطلاحی امر ہے جو ہمیشہ تغیر پذیر اور بدلتا رہتا ہے کوئی فرد کسی حکومت یا سلطنت کی رعایا بن جانے سے (خواہ وہ کسی نسل سے ہو) اس ملک کی ملت و قوم کا جزو شمار ہونے لگتا ہے۔ اہل ملک اُسے اپنے عظیم المرتبت قبیلہ کا فرد تسلیم کر لیتے ہیں۔

بنا بریں ان "متجددین" سے پوچھا جائے کہ آپ ان سادات کو ایرانی تسلیم کرتے ہیں یا خارجی۔ بفرض محال اگر تم ان سیدوں، غفاریوں، خالدیوں، شیبانیوں اور انصاریوں کو "ایران بدر" کر سکو۔ یا کم از کم انہیں اجنبی و بیگانہ ہی کہنا شروع کر دو۔ تو ان عربی الفاظ و محاورات کو بھی جنہیں ہزار سال ہوئے یہ لوگ اپنے ساتھ لائے اور بقول تمہارے تمہاری زبان میں ٹھونس دیا۔ خارجی عنصر کہہ کر فارسی زبان سے خارج کر سکنے کی وجہ تو تمہارے ہاتھ لگ سکتی ہے۔

لیکن اگر تم ان سادات اور عرب اقوام کو ایرانی اور ایران کی رعایا شمار کرتے ہو۔ (اور کوئی وجہ نہیں کہ تم ایسا نہ کرو) تو عربی الفاظ کو بھی فارسی تسلیم کر لو —— دونوں مسئلوں میں سرِ مو تفاوت نہیں۔ اور لیجئے :۔

یہی فرنچ جس کے اصطلاحات و الفاظ کو اپنی تحریروں میں استعمال کر کے تم مونچھوں پر تاؤ دیتے پھرتے ہو۔ اور فخر و غرور سے تمہارے پیر زمین پر نہیں ٹکتے (اور یہی طفلانہ حرکات تمہارے نزدیک اظہار فضل و کمال کے مرادف ہیں) خود ایسی مخلوط زبان ہے جس کے ننانوے فی صدی الفاظ لاطینی اور یونانی ہیں۔

بتایئے۔ اس ملت بزرگ یعنی فرانس کے کسی فرد واحد کے وہم و گمان میں بھی یہ بات گزری ہے کہ لاطینی اور یونانی الفاظ کو "فرنچ سے خارج" کرے۔

تم جو ہر بات میں فرانسیسیوں کو اپنا مقتدا و امام تسلیم کر چکے۔ اس باب میں بھی ان کی سی رواداری کیوں اختیار نہیں کرتے؛ زیادہ نہ سہی۔ کچھ تو پیروی کرو اور اپنی قیمتی عمریں ایسے فضول و لاطائل کاموں میں نہ کھوؤ۔

اپنے سادہ لوح قارئین کو اپنے ترہات و خرافات سے تباہ کرنے پر کیوں اُدھار کھائے بیٹھے ہو۔

ہاں اگر تمہاری غرض فارسی زبان کو ہر قسم کے خارجی عناصر سے پاک کرنے کی ہے (گو اس تمنا کا پورا ہونا محال ہے) کیونکہ تھرمامیٹر

کی قسم کا ایک مقیاس اللسان جو کسی زبان کے حقیقی و خارجی عناصر کو جُدا کر دے ایجاد نہیں ہُوا۔ بہت ممکن ہے جس کو تم فارسی خالص سمجھ رہے ہو، اجنبی اور بیگانہ نکل آئے۔ کیونکہ تم ان الفاظ کو اس لئے فارسی سمجھنے پر مجبور ہو کہ تاریخ السنہ سے عموماً اور اسی طرح زبانِ فارسی کی تاریخ سے تمہیں بہت کم واقفیت ہے۔

حیرت بالائے حیرت۔ ہزار سالہ عربی الفاظ جن سے ہمارے کان، زبان اور ذہن مانوس ہو چکے ہیں اور جو فارسی سے ایسے گھل مل گئے ہیں جیسے شیر و شکر۔ خارج کرنا۔ اور یورپ کے جدید، اجنبی، ثقیل اور نامانوس الفاظ کی بھرمار۔ عجب دو رنگی ہے۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ تاریخِ عالم سے متعلق تمہاری اطلاعات عموماً اور زبانوں کے رجحانات، اصول اور جوڑ توڑ کے باب میں خصوصاً نہایت سطحی ہیں۔ اگر یہ مسئلہ محض فکاہی ہوتا تو از روئے تفریح و مطائبہ گوارا کر لیا جاتا۔ اور اس کو اتنی اہمیت نہ دی جاتی لیکن رونا تو اس بات کا ہے کہ انشا پردازوں کی ہوائے نفس اور غرور کی بدولت روز بروز بلکہ ساعت بساعت ہر مقالہ بلکہ ہر دو سطری الٰہی سبدھی تحریر میں خارجی الفاظ کے ادخال کا سیلاب آ رہا ہے۔ جو استقلالِ ایران پر ایک ضرب کاری ہے۔ اس سے بڑھ کر ایران کے حق میں اور کوئی بُرائی نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ بڑی تاریخی مصیبت ہے، جس نے اپنی سرکشی اور قہرمانی کے طفیل قوموں کو اپنے محورِ اصلی اور مرکزِ ثقل سے ہٹا دیا جس طرح سِل یا طاعون کے جراثیم، ایک معتدل المزاج صحیح، سالم اور تندرست بدن کا نظام اپنی قوتِ قہریہ سے بگاڑ کر اسے فنا کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔

یہ درد ایران میں اس لحاظ سے اَور بھی لادوا ہو جاتا ہے کہ یہاں کی نوّے فیصدی آبادی اَن پڑھ اور جاہل ہے۔ سادہ لوح قاری ان الفاظ و کلماتِ اجنبی کو بسہولتِ تمام قبول کرتے اور اظہارِ کمال کی خاطر اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح زبان میں ایک عجیب و غریب معجونِ مرکب جس کا غالب عنصر خارجی ہے، پلک جھپکنے کی دیر میں اپنے زہریلے اثر پھیلا دیتا ہے۔

اگر قوم کے بزرگ اور عناصرِ صالحہ اس مار دھاڑ کی روک تھام نہ کریں گے۔ فارسی امروزہ کے معائب کھلے بندوں بیان نہ کریں گے، بکثرت جرائد و رسائل جاری کر کے ان خارجی عناصر کے خلاف جو زبردستی داخلِ زبان ہو رہے ہیں، عام جہاد کا اعلان نہ کریں گے، ہر مجلس میں، ہر محفل میں، ہر جگہ، ہر وقت، ہر ذریعہ سے، ہر طریقہ سے، بغیر کسی سستی غفلت اور سہل انگاری کے۔ فساد اور زوال کے اس یاجوجی، ماجوجی لشکر کے روبرو سینہ سپر نہ ہوں گے اور اس پہاڑ کو روکنے کے لئے سدِ سکندری نہ بن جائیں گے تو جیسا کہ عریضہ کی ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، سعدی اور حافظ کی شیریں زبان مختلف الحقائق اور غیر متناسب الاجزا الفاظ سے مرکب ہو کر ایک عجیب و غریب ملغوبہ بن جائے گی۔

میرے عقیدہ میں موجودہ آقایانِ ایران جس طرح زبانِ فارسی کا گلا اپنی تحریروں سے گھونٹ رہے ہیں، عربوں کے خروج اور تاتاریوں کی ترکتازی نے اس کا سواں حصہ بھی نقصان نہ پہنچایا ہو گا۔ کیونکہ عربوں اور تاتاریوں کا خروج اور فارسی پر اس کا اثر

در کفِ شیرِ نرِ خونخوارہ　　　　غیرِ تسلیم و رضا کو چارہ

کا مصداق تھا۔ لیکن اب ——؟ یہ بزرگ کیوں مجبور ہیں۔ نہ کوئی معقول عذر نہ بہانہ۔ نہ جبر نہ زبردستی۔ حقیر سے حقیر سبب کی موجودگی کے بغیر۔ یہ ناخلف اولاد —— اجداد کی زبان (جسے ہزار سال سے زیادہ عرصہ ہوا باوجود تاریخی حادثات اور عظیم انقلابات کے ہم امانت کی طرح بچا بچا کر رکھتے آئے ہیں) بطیبِ خاطر، بلا جبر و اکراہ۔ جان بوجھ کر بگاڑ رہی ہے۔ اور وہ گنجِ شائگاں جو رودکی، عنصری، نظامی، سعدی اور حافظ وغیرہم بے مثل باکمالوں کی فوق العادت استعدادات شبانہ روز مساعی، دردسری اور دماغ سوزیوں سے کہیں ہزار سال میں جاکر فراہم ہوا تھا، مفت میں کمال بے دردی کے ساتھ افرنگیوں کی کورانہ تقلید کی شراب کے نشہ میں چور ہو کر لٹا رہے ہیں۔ جب کبھی ایران کے جرائد و رسائل کے پیکٹ پہنچتے ہیں، تو میری نظر بس ایران کے سیاسی حالات سے باخبر ہونے کے لئے صفحاتِ جرائد پر بے تابانہ دوڑنے لگتی ہیں۔ لیکن صد ہزار افسوس کہ ہمیشہ زوالِ فارسی کے اس ہولناک معرکہ سے دوچار ہوتا ہوں۔ اس سے بچنے کی صورت نظر نہیں آتی لہٰذا صمیمِ قلب سے اپنی موت کی دعائیں مانگتا ہوں۔ اور بے اختیارانہ پکار اٹھتا ہوں۔

خوش قسمت تھے وہ لوگ۔ جو آج سے چند سال قبل فوت ہو گئے۔ اور فارسی زبان کی یہ زبوں حالی، زار نالی، جاں گداز سسکیاں اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جاں بحق تسلیم ہونے کا دردناک منظر نہ دیکھ پائے۔

دوسرا خط

پیرس

۷ ارنومبر ۱۹۲۴ء مطابق ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

دوستِ معظم محترم

مرقومۂ شریفیہ ۱۸ سنبلہ کو اور اس سے کچھ عرصہ بعد "مجلۂ علوم مالیہ و اقتصادیہ" پہنچا۔ آپ نے دوستانہ خط کو شائع کر کے (جو وقعت بخشی (حالانکہ وہ تحریر ہرگز اس قدر و منزلت کے قابل نہ تھی) میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ مجھے افسوس بھی ہوا کیونکہ وہ تحریر تیز و درشت تھی اور شاید فاضل آقایانِ ایران کی خدمت میں بحالتِ موجودہ پیش کرنے کے ناقابل اور اشاعت کے لئے نامناسب بھی۔

اگر مجھے اس کا احتمال ہوتا کہ آپ از روئے لطف و کرم اسے نشر فرمائیں گے تو میں اپنا مطلب نرم الفاظ اور ملائم لب و لہجہ میں ادا کرتا۔ نیز مسئلہ کے تمام شعبوں اور پہلوؤں پر امکان بھر روشنی ڈالتا اور معرضِ بحث میں لے آتا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس مکتوب کو پڑھ کر

قارئینِ کرام کے ذہن میں یہ بات فوری طور پر گھر کرلے کہ بندہ صرف عربی الفاظ کے استعمال کا طرفدار اور یورپین الفاظ کے رواج کا سخت دشمن ہے، حتٰے کہ اپنے قومی فارسی الفاظ کا بھی ذلیل ترین دشمن ہے۔ " العیاذ باللہ! "

امرِ واقع کچھ اور ہے۔ اور بندہ کا مسلک و مشرب یہ نہیں۔ مَیں اس بات کا طرفدار نہیں کہ زَغال کی جگہ فحم استعمال کیا جائے جس طرح تاریخ گزیدہ کے مصنّف ایک شاعر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں : " قطعہ فحم برداشت و بر دیوار زنداں ایں شعر را بنوشت "، یا کنجشک کی جگہ عصفور، بام خانہ کی جگہ سطح بیت۔ جیسے لکھا ہے " اے آنکہ بر سطح بیت صعود نمودہ و عصفورے از عصافیر را طیران می دہی " وغیر ذالک۔ یہ روش عقلا کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ لیکن مَیں اس بات کا طرفدار نہیں ہوں نہ ایسے مستحسن سمجھتا ہوں کہ متروک لااستعمال فارسی الفاظ جو آج سے ہزار سال قبل بھی مستعمل نہ تھے، اور اب کوئی شخص صحیح طور سے ان کا مطلب کتب لغت کی طرف رجوع کئے بغیر نہیں جان سکتا، از سرِ نو استعمال کرکے ایک مصنوعی فارسی اِنشا گھڑلی جائے۔ حالانکہ یہ مصنوعی فارسی اپنے عہد (ایک ہزار سال قبل) میں بھی سمجھی جاتی تھی نہ مستعمل تھی۔ اس کی ایک عمدہ مثال مرحوم فرصت شیرازی کے وہ اشعار ہیں جو شاہنامہ طبع بمبئی کے آخر میں درج ہیں اور بقول مصنّف خالص فارسی میں کہے گئے ہیں۔ چند بیت بطور نمونہ پیش کرتا ہوں ؎

مگر تا چہ داد است دادِ سخن	بستوارہ بنہاد لادِ سخن
فروہیدہ کرزہ سیز نود	ہویداست از گفت او فرزبود
فرے برفرازیں فرومیدہ اش	خجے جامہ ہاے ارخیدہ اش
بفرجودہا ے سخن پروری	سزد گر زند لاف پیغمبری
بہر گوشے زاں چم اندر ہزار	ز دریا کشش زادگاں ابربار

یہ اشعار جو ان کے عقیدہ میں خالص فارسی ہیں ۱۳۱۵ھ میں کہے گئے ہیں، یعنی فردوسی سے نوسو پندرہ سال بعد جس کے اشعار کا نمونہ یہ ہے ؎

جہاں آفریں تا جہاں آفرید	چنوں شہریارے نیامد پدید
زخاور بیاراست تا باختر	پدید آمد از فرّ او کانِ زر
جہاں دار محمود شاہ بزرگ	با بشخور آرد ہمے میش و گرگ
زکشمیر تا پیش دریائے چیں	بروشہر یاراں کنند آفریں
چو کودک لب از شیر مادر بشست	بگہوارہ محمود گوید نخست
زفرش جہاں شد چو باغِ بہار	ہوائیہ زابر و زمیں پرنگار

بارآں ہمہ خوبی از دادِ اوست | جہاں شادماں از دلِ شادِ اوست
بہ تن ژندہ پیل و بجاں جبرئیل | بکف ابرِ بہمن، بدل رودِ نیل

یہ ہے ہزار سال قبل کی زبان ۔ جسے آج بھی طہران کا ہر عامی و جاہل، عالم و فاضل سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے اور وہ ہے فارسیٔ مصنوعی ۱۳۱۵ھ کی جو کسی اصطرلاب یا رمل سے بھی سمجھ میں آنے سے رہی۔ اس کے الفاظ کا غالب حصّہ وضعی ہے، جن کا ماخذ مصنوعی اور نقلی کتاب دساتیر ہے۔ جو نہ فارسی ہے نہ کوئی دوسری زبان ۔

جس طرح بندہ اس قسم کی فارسی جس کی مثال درمت کے اشعار ہیں پسند نہیں کرتا اُسی طرح فراز (Phrase) بجائے جملہ۔ پروژہ ([illegible]) بجائے پیش نہاد۔ پروگرام (Programme) بجائے دستور العمل، لاک (Lake) بجائے دریاچہ۔ انترسان ([illegible]) بجائے خوش مزہ و دلکش وغیرہ یورپی لغات لکھنے اور بولنے کا روادار نہیں، نیز اتومبیل کی جگہ گردونۂ آتشین وگون ([illegible]) کی جگہ اطاقِ مثلث، بجائے تلگراف دُور نویس اور بجائے اکسیژن (Oxygen) و ہیدرژن (Hydrogen) ترش انگیز و آب انگیز لکھنا بھی پسند نہیں کرتا، بندہ اپنے مطلب کو مختصر طور سے عرض کرتا ہے، کہ زبان کیا ہے، کسی قوم کے افراد کے تفہم و تفہیم اور تبادلۂ افکار کا آلہ یا واسطہ، تبادلۂ افکار اور ایک دوسرے کا مطلب سمجھنے سمجھانے میں جو آلہ زیادہ مفید اور کارآمد ہوگا۔ وہی زبان کے وضع کرنے کی غرض و غایت کے زیادہ قریب ہوگا۔ اور جو زیادہ مشکل، زیادہ پیچیدہ اور عسیر الفہم ہو۔ وُہ زبان کی اصلی غرض و غایت کو پُورا کرنے سے رہا۔

پس جس طرح "ان گھڑ" عربی الفاظ۔ فارسیٔ روزمرّہ کے سمجھنے میں مشکلات پیدا کرتے ہیں بعینہٖ اُسی طرح قدیم اور متروک الاستعمال فارسی یا دساتیر کی بناوٹی اور جعلی فارسی یا انگریزی، جرمن اور فرانسیسی کے نامانوس الفاظ، کلام کو مغلق اور عسیر الفہم بناتے ہیں جس سے زبان کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، ورنہ مجھے یورپی زبانوں سے خدا واسطے کا بَیر تھوڑا ہے، اور نہ عربی سے کوئی مخصوص اُلفت اور فارسیٔ قدیم سے نفرت ہے ۔ العیاذ باللہ!

اس مسئلہ میں کسی عداوت، تعصب، تعلقِ خاطر یا عواطف و احساساتِ قلبی کو مطلق دخل نہیں ۔

بلکہ میری اصلی غرض اس شیریں، لطیف اور سلیس فارسی زبان کی محافظت ہے جو ہمارے آبا و اجداد بولتے تھے اور ہمارے اندر دائر و سائر ہے۔ جس میں سعدی و حافظ نے دادِ سخن دی اور جسے خاص و عام سب سمجھتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ مازندرانی و بختیاری دیہاتی جانگلو بھی جو الف کے نام بے نہیں جانتے، شاہنامہ کے اشعار کو سمجھتے ہیں ۔ اور غالباً یہ اشعار اکثر دیہاتیوں کے نوکِ زبان بھی ہوتے ہیں ۔ علاوہ ازیں مطرب، مغنی اور اربابِ نشاط نہ سعدی و حافظ کے اشعار کے بغیر بزمِ عیش و طرب کو گرما سکتے ہیں، نہ محفلوں میں ان کا رنگ جمتا ہے ۔

میرا خیال ہے آقائے جمال زادہ کی کتاب "یکے بود و یکے نبود" نظرِ مبارک سے گزری ہوگی۔ اس کتاب کی پہلی کہانی "فارسی شکر

است" اس کمترین کے عقیدہ بلکہ ہر ایرانی کے مسلک کی کسی حد تک ترجمان ہے۔

یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ خارجی اور بیرونی الفاظ کے استعمال سے بھی خطرناک تر اور مضر ترین چیز بیرونی اندازِ کلام اور اسلوبِ بیان کا اتباع ہے، جس کی مثالیں غارتِ اعمال سے دورِ جدید کے انشاء پردازوں کے یہاں بکثرت ملتی ہیں۔ ایک دو نمونے ذیل میں درج کرتا ہوں۔ بجائے "فلاں شبیہ حضرت قاسم را در آورد۔" "فلاں رُول حضرت قاسم را بازی کرد" کہنا اور "فلاں کاغذے بفلاں نوشت" در مکتوبے کہ باوے نوشت باو می گفت کہ" فرانسیسی اسلوب کی ہوبہو نقل ہے، کیونکہ اس مقام پر کبھی ماضی ناقص (Past Imperfect tense) کا استعمال نہیں کرتے بلکہ ماضی محدود (Past Definite tense) استعمال کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں "در مکتوبے کہ باو نوشت باو چنیں گفت"۔ یا یہ عبارتیں: "زیرا کہ روزنامہ من بر روئے اساس غرض رانی نوشتہ نشدہ" "زیرا کہ من منظوری چیز فلاں نداشتم" "زیرا کہ قلم من فلاں نیست" "زیرا کہ قصدِ من فلاں نیست"۔

یہ صاف اور صریح طور پر فرانسیسی اسلوبِ نگارش کی نقل اُتاری گئی ہے یعنی لکھنے والا اس زبان سے لگاؤ اور اپنی مادری زبان کے اسلوب سے ناآشنا اور قوتِ فیصلہ سے بے بہرہ ہونے کے باعث اپنی محبوب زبان (فرینچ) کے اسلوب کا چربہ اُتار رہا ہے۔

یہ حال صرف تراجم کا نہیں۔ بلکہ ایسے مصنفین جب کوئی اُرتجنل اور مستقل تصنیف یا مقالہ لکھتے ہیں، تو نامعلوم طور سے یورپی انداز میں سوچتے ہیں۔ جس کا لابدی اور لازم نتیجہ اجنبی اسلوبِ نگارش اور خارجی اندازِ کلام کی شکل میں نکلتا ہے۔

خدانخواستہ اگر یہ روش عام ہو جائے اور اس کا اثر ان انشاء پردازوں پر بھی ہو جائے جو زبانِ فارسی کے حقیقی محسن و محافظ ہیں تو پھر فارسی زبان کا فاتحہ پڑھنا اور "مسجدِ شاہ" میں ختم قرآن کا بندوبست کرنا چاہیے۔

اگرچہ کلمات فارسی کی جگہ خارجی الفاظ استعمال کرنا از حد مکروہ اور قابلِ نفرت ہے۔ لیکن کسی حد تک قابلِ برداشت ہے۔ کیونکہ تبدیلی محض الفاظ کی ہے، عبارت کی روح فارسی ہی ہے، گو جسمانی طور سے اس کے اعضا و جوارح کاٹ کر چند مصنوعی و بناوٹی ہاتھ پاؤں لگا دیئے گئے ہیں۔ لیکن اگر تعبیرِ کلام، اندازِ بیان اور صرف و نحو باہر سے مستعار لے لیں تو پھر فارسی زبان کے مٹ جانے اور فنا ہونے میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔

جیسے کوئی شخص پیر، ناک یا کان سے عاری ہو، اور اس کی جگہ مصنوعی اعضا لگا لے تو اگرچہ اس میں جسمانی نقص موجود ہو گا لیکن وہ زندہ رہے گا۔ لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی شخص مصنوعی روح، مصنوعی خون اور مصنوعی حرکت سے زندہ رہ سکے ع

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

مترجمہ فضل حسین

محفلِ ادب

فرعونِ موسیٰ

(پروفیسر محمد فرید ابو حدید کے قلم سے)

حضرتِ موسیٰ کا بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکلنا ایک مشہور واقعہ ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں تینوں قوموں میں تسلیم شدہ ہے۔ لیکن یہ فرعون کون تھا؟ اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے۔ اس کی شخصیت پر چند در چند ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں جن کا رفع کرنا عمیق تحقیق کے بغیر ناممکن ہے۔ آج ہم اس پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

تورات میں خروج کا واقعہ:۔ تورات میں جو پہلی مرتبہ ذکر آیا ہے وہ اسرائیل کے نام کے ساتھ آیا ہے۔ یہ اسرائیل یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم العبرانی ہیں جو مصر میں اپنے صاحبزادے حضرت یوسفؑ کے ہاں آ کر مہمان ہوئے تھے۔ تورات کی روایت کے مطابق حضرتِ یوسفؑ پہلے پہل وزیرِ حکومت تھے پھر فرعون کے بعد بادشاہ ہو گئے۔ حضرتِ یعقوبؑ نے مصر میں قدم رنجہ فرمایا تو ان کا بڑا اکرام کیا گیا اور ان کو اور ان کے ساتھیوں اور صاحبزادوں کو ڈیلٹا کے مشرقی جانب ارضِ جاسان میں بڑی عزت و احترام کے ساتھ اُتارا گیا تاکہ وہ یہاں اہلِ مصر سے دُور رہتے ہوئے اپنے چوپاؤں کو چرا سکیں۔

یہاں رہتے ہوئے عبرانیوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ جاسان کی تمام نشیبی زمینیں اُن سے پُر ہو گئیں۔ یہ لوگ اگرچہ مصر سے دور تھے، لیکن حکومتِ وقت کے معاون اور مددگار تھے۔ کچھ عرصہ بعد موجودہ حکومت میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اور اس کے کھنڈروں پر جونہی حکومت قائم ہوئی، اُس نے حکومتِ سابقہ کے آثارِ باقیہ کو نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جو لوگ حکومتِ رفتہ کے اعوان انصار تھے اُن پر سختیاں شروع ہو گئیں اور اُن پر طرح طرح کے مظالم کئے جانے لگے۔ تورات اس واقعہ سے متعلق بتاتی ہے "پھر ایک دوسرا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا۔ اُس نے اپنے گروہ سے کہا کہ بنو اسرائیل روز بروز طاقتور ہوتے جاتے ہیں، ہمیں اس سے خطرہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کلاں کو یہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کر کے ہم کو نقصان پہنچائیں"۔

تورات میں صرف اتنا ہی مذکور ہے وہ یہ نہیں بتاتی کہ یہ دولتِ جدیدہ کیا تھی، بادشاہ کا نام کیا تھا؟ اس کے علاوہ تورات سے اس واقعہ کی تاریخ بھی معلوم نہیں ہوتی، اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ یہ واقعہ اپنے وقوع کے صدیوں بعد لکھا گیا ہے

صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ نئی حکومت نے بنو اسرائیل پر گوناگوں مظالم کئے وہ عزیب عرصہ تک اُن کو طوعاً و کرہاً برداشت کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ پیدا ہوئے اور اُنہوں نے فرعون کے پنجۂ ظلم سے ان لوگوں کو رہا کرایا، اور اپنی قوم کو لے کر مصر سے چلے گئے۔ فرعون نے ان کا تعاقب کیا جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ دریائے نیل کو عبور کرتے ہوئے اُس کو اور اُس کے لشکر کو چند در چند ہلاکتوں سے دوچار ہونا پڑا جن کی وجہ سے اس لشکر نے ایک وسیع میدان میں پناہ لی"۔ انتہیٰ

مصر سے بنو اسرائیل کے نکلنے کی تاریخ :۔ تورات نے اگرچہ اس موقع پر واقعہ کی تاریخ بیان نہیں کی ہے، لیکن ایک دوسرے موقع پر جو ایک تاریخ بیان کی گئی ہے اُس سے اس واقعہ کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ بنو اسرائیل کی تاریخ کے سلسلہ میں ہی تورات نے ایک عظیم الشان اور اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے، اور وہ بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ ہے۔ یہ تعمیر حضرت سلیمان کی حکومت کے چوتھے سال ہوئی تھی۔ تورات نے اس کی تاریخ یوں بیان کی ہے کہ یہ تعمیر مصر سے بنو اسرائیل کے نکلنے کے چار سو اسّی برس بعد ہوئی تھی۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد کی تاریخ سے متعلق بھی اختلاف ہے لیکن زیادہ قابل قبول یہ رائے ہے کہ آپ کا عہد ۹۷۰ھ اور ۹۳۰ھ قبل مسیح کے درمیان تھا۔ اب اگر ہم ۴۸۰ برس پیچھے اور لوٹ جائیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی تاریخ ۱۴۴۶ھ ق م ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر اور بنو اسرائیل کے خروج عن المصر کے درمیان تورات نے ۴۸۰ برس کی جو مدت بتائی ہے، وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تورات نے بہتیرے اہم تاریخی حوادث مع سنین و تورع کے بیان کئے ہیں اور جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان تاریخی واقعات کی نسبت تورات نے جو سنین بتائے ہیں وہ صحیح ہی ہیں، اس لئے اس خاص معاملہ میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تورات کا بیان صحیح ہوگا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ بنو اسرائیل کی تاریخ میں اُن کا مصر سے نکلنا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ مسلمانوں کا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنا۔ پس جس طرح اسلامی تاریخ کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے، اسی طرح بعید نہیں کہ بنو اسرائیل نے اپنی تاریخ کا آغاز بھی مصر سے نکلنے سے کیا ہو، اور اسی بنا پر تورات نے بیت المقدس کی تعمیر کی تاریخ کا حساب بنو اسرائیل کے خروج عن المصر کے وقت سے لگایا ہو۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ تورات میں اس مدت کا ذکر کہیں ایک آدھ فقرہ میں ضمناً ہی نہیں آیا ہے بلکہ متعدد بار کئی مقام پر قاضیوں اور بادشاہوں کے خطوط میں اُن واقعات و حوادث کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو بنو اسرائیل کو پیش آئے اور اُن نجومیوں، بادشاہوں اور قاضیوں کے نام بھی بتائے گئے ہیں جو اس عہد سے متعلق تھے۔ اگر ہم ان حوادث کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ تاریخی اعتبار سے ملائیں تو یہ بات بخوبی دریافت ہو سکتی ہے کہ بنو اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور بیت المقدس کی تعمیر میں کتنی مدت کا فصل ہے۔ ان مقدمات سے نتیجہ صاف طور پر ہی یہ برآمد ہوتا ہے کہ تورات کے بیان کے مطابق اسرائیلوں کا مصر سے خروج حضرت مسیح کی پیدائش سے قبل پندرھویں صدی کے نصف

میں ہوا تھا۔

مصر کی اس زمانہ میں حالت :- اب ہم کو تاریخی کتابوں سے مدد لے کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس عہد میں مصر کی جو حالت تھی اُس کے پیشِ نظر اسرائیلوں کے خروج کا اہم واقعہ پیش آ بھی سکتا ہے یا نہیں ؛

تاریخ سے ثابت ہے کہ مصر نے تقریباً ڈیڑھ صدی اجنبی شامی بادشاہوں کے زیرِ نگیں گذاری جن کو ہکسوس (Hyksos) یا چرواہے بادشاہ (Shepherd Kings) کہا جاتا ہے ان کی اخیر حکومت کا زمانہ سنہ ۱۶۰۰ ق م ہے۔ اس کے بعد جب اہلِ مصر یا حُبِّ وطن اور قومیت کے جذبات نے ان بادشاہوں کے خلاف زبردست بغاوت پیدا کر دی تو اُنھوں نے اِن اجنبی سامی حکمرانوں کو اپنی زمین سے نکال باہر کیا اور ان کو فلسطین و لبنان کی حدود تک پسپا کرتے چلے گئے۔ اس انقلاب میں احمس کا نام زیادہ نمایاں ہے جو اس تحریک کا بانی تھا اور جس نے عظیم الشان کامیابی حاصل کر کے اہلِ مصر کے دلوں میں ایسی وقعت و عزت حاصل کر لی کہ وہ اس کو دیوتا کا مرتبہ دینے لگے۔

اس کے انتقال پر اس کا بیٹا امنحتب الاوّل بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر اسرائیلیوں کے جو تھوڑے بہت آثار باقی رہ گئے تھے اُن کو بھی بیک قلم مٹا ڈالا۔ امنحتب الاوّل کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لئے اس کے انتقال پر سلطنت مصر کی عنان تھوتمس الاوّل (Thothmes I) کے ہاتھوں میں آگئی جس کو اگرچہ شاہی خاندان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا لیکن احموس شہزادی کے شوہر ہونے کا شرف رکھتا تھا۔ تھوتمس مدت تک حکومت کرتا رہا۔ اتفاق سے اُس کے ہاں شہزادی کے بطن سے ایک لڑکی کے سوا کوئی اولادِ نرینہ نہیں ہوئی۔ البتہ دوسری بیویوں سے جو شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھیں کئی ایک اولادِ ذکور ہوئیں۔

پندرھویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں یہاں ایک عظیم الشان خلفشار پیدا ہو گیا۔ تھوتمس بڈھا ہو چکا تھا اور اُس کے کوئی فرزند ایسا تھا نہیں جس کی رگوں میں احمس کا خون حرکت کرتا ہو صرف ایک لڑکی تھی جو تھوتمس کی شہزادی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی لیکن مصر میں عورتوں کو سریرِ سلطنت پر بٹھانے کا رواج نہیں تھا وہ ایک عورت کی حکمرانی کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر اہلِ مصر میں تین پارٹیاں ہو گئیں، ایک پارٹی کی رائے تھی کہ تھوتمس ثانی کو بادشاہ ہونا چاہیئے۔ دوسری پارٹی تھوتمس سوم کے حق میں تھی اور تیسری پارٹی چاہتی تھی کہ شہزادی حتشبسوت سلطنتِ مصر کے تخت پر متمکن ہو۔ ان پارٹیوں میں بیس سال تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار اس جنگ کا اختتام مصر کے مشہور لائق و قابل اور بہادر بادشاہ تھوتمس لاکبر ثالث (Thothmes III the Great) کی بادشاہت پر ہوا۔

اس بادشاہ کے عہد میں حکومت مصر کے حدود دو شمال میں ایشیائے کوچک اور بلادِ جزیرہ سے جنوب میں سوڈان کے شہروں اور صومال تک وسیع ہو گئے۔ تقریباً تیس برس تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کرنے کے بعد سنہ ۱۴۴۷ ق م میں اس کا انتقال ہو گیا +

بنو اسرائیل مصر میں:- اِن تاریخی حقائق کو بطورِ خلاصہ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ مصر میں ایک اجنبی حکومت (HYKSOS) قائم ہوئی جو سولھویں صدی کے اوائل تک وہاں حکومت کرتی رہی، یہ لوگ بنو اسرائیل کے چچا زاد بھائی تھے۔ اس لئے جب اسرائیلی مصر میں آئے تو اُنہوں نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور انہیں اپنی حکومت کا اعوان و انصار سمجھا۔ لیکن پھر جب مصریوں نے خود اپنی حکومت قائم کر لی تو اس اجنبی حکومت کو شکست دے کر مصر سے باہر نکال دیا اور بنو اسرائیل چونکہ اس حکومت کے معاون تھے اس لئے ان پر بھی مصر کی حکومتِ وطنی کا عتاب بیش از بیش ہوتا رہا۔ اِن غریبوں نے ایک قرن یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ تک ان مصائب پر صبر کیا۔ اور انہیں برداشت کرتے رہے۔ پھر جب پانی سر سے گزرنے لگا تو اللہ تعالےٰ نے اُن کی رستگاری کے لئے حضرت موسیٰؑ کو پیدا کیا جنہوں نے اسّی برس کی عمر میں بنو اسرائیل کو اپنے ساتھ لے کر فرعون کے دار الحکومت سے ہجرت اختیار کی۔ بہرحال یہ ضروری ہے کہ حکومتِ وطنیہ کے اوّل قیام اور اسرائیلیوں کے خروج عن المصر میں ایک قرن کا فصل مانا جائے اور اس میں تعجب کی بات بھی نہیں، کیونکہ ایک مفتوح مظلوم قوم عرصۂ دراز تک ذلت و خواری انگیز کرتی رہتی ہے۔ پھر جب اُس کی حد ہو جاتی ہے تو اُس میں ذلت کے طوق کو توڑ دینے کے لئے حرکت عمل پیدا ہوتی ہے۔

امنحوتب دوم فرعونِ مُوسیٰ تھا:- جب یہ معلوم ہو گیا کہ مصر کی حکومتِ جدیدہ کا قیام سولھویں صدی ق م کے اوائل میں ہوا تھا۔ تو ایک صدی اور کچھ مُدت گزرنے کے بعد بنو اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا واقعہ پندرھویں صدی ق م کے وسط میں ہو گا۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خروج کا سال وہی ہے جس پر تورات دلالت کرتی ہے یعنی ۱۴۴۶ سنہ ق م، اور یہ سال وہی ہے جس کے ایک برس پچھلے یعنی ۱۴۴۷ سنہ ق م میں مصر کے مشہور بادشاہ تھوتمس دی گریٹ کا انتقال ہوا ہے اور یہی سال تھوتمس کے قائم مقام "امنحوتب دوم" کی سلطنت نشینی کا ہے۔ اس بنا پر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مُوسیٰ نے جس فرعون کے مقابلہ میں اعلانِ حق کیا تھا وہ یہی امنحوتب ثانی تھا۔

ہماری اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مینا کے کھنڈرات میں سے چند خطوط کا ایک مجموعہ برآمد ہوا ہے جو شام کے حکام نے تھوتمسِ اعظم کے پوتے امنحوتب سوم اور اُس کے بعد امنحوتب رابع کو تحریر کئے ہیں۔ ان خطوط میں اِن لوگوں نے توقع ظاہر کی ہے کہ یہ دونوں فراعنۂ مصر کی شہنشاہیت کی مدافعت کے لئے آمادۂ عمل ہو جائیں گے اور "خابیری" بادویوں کی طرف سے جنہوں نے ارضِ فلسطین و شام پر تسلط جما لیا ہے، جو خطرہ سلطنتِ مصر کو پیدا ہو گیا ہے یہ مصر کو اس خطرہ سے محفوظ کر لیں گے۔ ان قبائل کا فلسطین پر حملہ پندرھویں صدی ق م کے اخیر اور چودھویں صدی ق. م کے شروع میں ہوا ہے۔ یہ "خابیری" قبائل کون تھے؟ عام علماءِ تاریخ کا قول ہے کہ یہی وہ قبائل ہیں جن کو "عابیری" کہا جاتا ہے یعنی عبرانی "بنو اسرائیل"، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تورات کی روایت کے مطابق بنو اسرائیل نے جب چالیس سال "وادیٔ سینا" میں بسر کر دیئے تو اس کے بعد اُنہوں نے پندرھویں صدی ق. م کے اواخر میں فلسطین کا رُخ کیا ہو گا، اور اُس پر مسلط ہو گئے ہوں گے۔ یہ امر محقق ہے کہ بنو اسرائیل کا وادیٔ سینا میں چالیس

برس گزارنا اُن کے خروج مصر کے بعد کا واقعہ ہے۔

تاریخ کی ان سب کڑیوں کو ملانے کے بعد ہم نہایت اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ بنواسرائیل کا مصر سے خارج ہونا ۱۴۴۶ ق م میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اور یہ سال امنحوتپ دوم کی حکومت کا پہلا سال تھا۔

یہاں یہ بیان کردینا بھی ضروری ہے کہ بعض مؤرخین نے منفتاح بن رمسیس الاکبر کو فرعون مصر کہا ہے، اور اُن کی دلیل یہ ہے کہ منفتاح کے آثار میں یہ پایا جاتا ہے کہ وہ شام گیا تھا اور سلطانِ مصر کے قبضہ سے جو شہر نکل چکے تھے اُن پر اُس نے حملہ کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں بنواسرائیل کا ذکر بھی آتا ہے کہ منفتاح نے ان لوگوں کو ذلیل و خوار کیا تھا" لیکن ظاہر ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بنواسرائیل کا مصر سے خروج بھی منفتاح کے عہد میں ہی ہوا تھا۔ بلکہ اس سے تو ہماری رائے کو ہی تقویت ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ بنواسرائیل نے "امنحوتپ" کے عہد میں مصر سے نکل کر شام کے علاقوں میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ پھر جب منفتاح کا عہد ہوا تو اُس نے ان لوگوں کے خلاف صف آرائی کردی اور سلطانِ مصر کے چھنے ہوئے شہر پھر حاصل کرنے چاہے۔ بہرحال بنواسرائیل کے مصر سے نکلنے کا واقعہ منفتاح کے عہد کا نہیں بلکہ تھوتمس اعظم کے لڑکے" امنحوتپ ثانی" کے عہد کا ہے۔

(الہلال مصر بابت ماہ مئی ۱۹۳۹ء) "بُرہان"

انگریزی باورچی خانہ

(از محترمہ شائستہ اختر سہروردیہ بی۔اے مقیم لندن)

انگلستان کے نئے مکانات کے باورچی خانے بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جنگِ عظیم کے بعد سے نوکر ملنے اتنے مشکل ہیں کہ بیویاں اپنا کام خود کیا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس حصّہ میں وہ سب سے زیادہ وقت گزارتی ہیں اس کو خوش نما اور آرام دہ ہی چاہیں گی۔

گھر کے دوسرے کمروں کی طرح باورچی خانہ میں بھی ایک مقررہ کلر سکیم ' Colour scheme ' ہوتی ہے۔ آسمانی اور سفید ہلکا سبز اور سفید، سُرخ اور سفید اور بعض وقات بالکل ہی سفید، یہ باورچی خانے کی پسندیدہ "کلر سکیم" ہیں۔ بازار سے ان میں سے ہر سکیم کے رنگ کی دیگچیاں، کفگیر، چمچے، بول، پڈنگ ڈش، پائی ڈش، غرض کھانے پینے کے تمام قسم کے برتن مل سکتے ہیں

باورچی خانے کا فرش عموماً لینولیم (linoleum) کا ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کا ربڑ کا فرش ہوتا ہے جو کہ بہت آسانی کے ساتھ دُھل سکتا ہے، اور دُھلنے کے بعد نیا جیسا نکل آتا ہے۔ یہ بھی ہر رنگ کا مل سکتا ہے۔ بلو اور سفید باورچی خانے میں بلو رنگ کا ہوگا۔

باورچی خانے کی دیواریں زمین سے قریباً چھ فٹ تک "ٹائلز TILES" سے منڈھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ٹائلز چینی کے برتن کے قسم کے چوکور پتھر کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں نئے فیشن کے غسلخانے ان سے منڈھے ہوتے ہیں۔ ان سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ پانی یا راکھ وغیرہ کے دھبے سے خراب نہیں ہوتا اور ذرا سے گیلے کپڑے سے پونچھ دینا ان کی صفائی کے لئے کافی ہوتا ہے۔ یہ بھی ہر رنگ کے ملتے ہیں۔

نئے فیشن کے باورچی خانے کا ایک حصّہ دیوارگیر الماریوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ان الماریوں کے دروازے باورچی خانے کے کلر سکیم کے رنگ کے انیمل کے ہوتے ہیں، ان کے طاق ہر سائز کے ہوتے ہیں اور باورچی خانے کے استعمال کی ہر چیز کے لئے علیحدہ جگہ ان میں بنی ہوتی ہے، زمین پونچھنے کی جھاڑو اور بالٹی کے رکھنے کا بھی الگ حصّہ اس الماری میں ہوتا ہے۔ ہر قسم کے مصالحوں کے ڈبوں کے لئے جُدا طاق ہوتے ہیں۔ مصالحوں کے ڈبے بھی رنگین اور ان پر مختلف مصالحوں کے نام لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

(چولھا) باورچی خانے کے ایک کونے میں گیس یا الکٹرک کا ہوتا ہے، دوسرے کونے میں برتن دھونے کا چھوٹا سا حوض۔ اس حوض کے دو طرف لکڑی کے تختے ذرا ڈھلوان لگے ہوتے ہیں کہ برتن دھو کر ان پر رکھنے سے پانی نتھر جائے۔ اوپر ایک ریک RACK یعنی اس قسم کا تختہ جس پر رکابیاں کھڑی رکھی جائیں تاکہ ان کا پانی سُوکھ جائے اور پُونچھ کر سکھانے کی ضرورت نہ ہو۔

نئے باورچی خانوں میں دیوارگیر کی الماری کے نیچے کے حصّے میں ایک چھوٹا سا برف کا بکس بھی لگا ہوتا ہے اور ایک میز بھی جو قیمہ وغیرہ کرنے کے کام آتی ہے اور کھینچ کر نکال اور دھکیل کر بند کر دی جاتی ہے۔

باورچی خانے کے طاقوں اور میزوں پر بچھانے کے لئے ایک خاص قسم کا ربڑ ملتا ہے جس کو آئل کلاتھ کہتے ہیں۔ اس پر چار رنگین خانے بنے ہوتے ہیں اور بالکل کپڑے جیسا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں وہی صفت ہے یعنی صرف بھیگے کپڑے سے پونچھ دینے سے اس کے داغ دھبے دُور ہو جاتے ہیں۔ کھڑکیوں کے لئے باریک رنگین "آئل کلاتھ" کے پردے ملتے ہیں۔ باورچی خانے میں لگانے کی میز کرسیاں رنگین انیمل کی بنی ہوئی ملتی ہیں۔ پالش کی ہوئی نہیں کہ خراب ہو جانے کا ڈر ہو۔

غرض نئے فیشن کا باورچی خانہ اس قدر خوشنما اور آراستہ ہوتا ہے کہ اس میں دن کا بیشتر حصّہ گزارنا ہرگز بارِ خاطر نہیں ہو سکتا۔ اس کا سارا سامان اس لحاظ سے بنایا جاتا ہے کہ اس کی صفائی میں دقت نہ ہو۔ اور نہ پانی کی چھینٹوں مصالحے اور چکناہٹ کے دھوئیں سے خراب ہو سکے۔ وقت اور جگہ بچانے کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اس لئے الماریاں اور کام کرنے کی میز دیوارگیر ہوتی ہے۔

ان باورچی خانوں میں اکثر ایک اور آرام کا انتظام ہوتا ہے یعنی ایک طاق جس کے باہر اور اندر دونوں طرف دروازے ہوتے ہیں۔ یہ اس کام کے لئے ہوتا ہے کہ جب گھر والی باہر ہو اس وقت جو سامان آئے مثلاً دودھ، روٹی، مکھن، وہ اس طاق میں رکھ دیا جائے بلکہ اس طاق میں لانے والا ایک پرچہ پر یہ لکھ کر چھوڑ جاتا ہے کہ دوسرے روز کے لئے آپ کو کتنا دودھ، کتنے انڈے اور کتنی روٹیاں چاہئیں۔ ایک اور طاق دیوار کے نیچے حصّہ میں ہوتا ہے جس کے اندر کوڑے کی بالٹی رکھ دی جاتی ہے۔ سڑک

صاف کرنے والا مہتر صاف کر کے واپس رکھ دیتا ہے۔ ان طاقوں کا یہ فائدہ ہے کہ خانہ دار بیوی کو اس انتظار میں بیٹھنا نہیں پڑتا ہے
کہ جتنے روزانہ سودے والے ہیں وہ آلیں تب وہ باہر باقی چیزوں کے لئے جائے۔ نوکر نہ ہونے کی صورت میں یہ ایک بڑی سہولت ہے
اور یہ نئی وضع کے باورچی خانے ان گھر والیوں کی سہولت کے لئے ہی بنائے گئے ہیں جو نوکر نہیں رکھتیں۔

"عصمت"

"۱۹۴۰ء کی مردم شماری اور اُردو"

"زبان" لکھوانے میں نگرانی کی ضرورت ہے۔

(از مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو ہند)

۱۹۴۰ء کی مردم شماری کے انتظام ابھی سے ہو رہے ہیں۔ مردم شماری کی رپورٹ بہت کارآمد ہوتی ہے۔ اقتصادی، لسانی، معاشرتی امور پر بحث کرتے وقت اسی رپورٹ سے اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں، خاص کر زبان کے اعداد و شمار کا اس کے سوا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ ان اعداد کی صحت پر ہماری بحثوں اور نتیجوں کی صحت مبنی ہے۔ لیکن پچھلی مردم شماریوں کے تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ شمار کنندے بے پروائی یا جانب داری سے اس معاملہ میں صحت کا خیال نہیں کرتے اور اپنی زبان کی تعداد زیادہ دکھانے کی خاطر غلط اندراج کر دیتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر گھاٹے میں وہ قومیں رہتی ہیں جو اقلیت میں ہیں کیونکہ شمار کنندوں کی زیادہ تر تعداد اُس قوم کی ہوتی ہے جو اکثریت میں ہے۔

گزشتہ مردم شماری کا ذکر ہے کہ ہمارے ایک انجنیر دوست جو بہت قابل شخص ہیں مردم شماری کی شب کو سفر میں تھے۔ جب ریل بڑودہ پہنچی تو شمار کنندہ نے مسافروں کا اندراج کرنا شروع کیا۔ انجنیر صاحب کے پاس بھی آیا اور نام وغیرہ پوچھ کر خانہ پُری کرنے لگا، جب زبان کا خانہ آیا تو پوچھا کہ آپ کی مادری زبان کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا، اُردو۔ لیکن اس دیدہ دلیری کو دیکھئے کہ اُس نے بجائے اُردو کے ہندی لکھ دی۔ اتفاق سے انجنیر صاحب گجراتی حروف جانتے تھے۔ اُنہوں نے اعتراض کیا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ میں نے اُردو کہا تھا اور تم نے ہندی لکھ دی۔ کہنے لگا یہ تو معمولی سی بات ہے، آپ اس پر حجت کیوں کرتے ہیں؟ اُنہوں نے کہا، یہ معمولی بات نہیں ہے، جو میں نے کہی ہے، نہیں وہی لکھنا پڑے گی۔ اس نے نہ مانا اور جب انہوں نے بہت اصرار کیا اور سختی برتی تو کہنے لگا، ہمیں ایسی ہی ہدایت ہوئی ہے۔ اس پر انجنیر صاحب نے کہا اگر یہ بات ہے تو آگے میں تمہیں اپنی نسبت کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تمہارا جو جی چاہے لکھ لو۔ اس نے ذرا تیز ہو کر کہا کہ یہ جرم ہے اور اگر آپ نہیں بتائیں گے تو میں پولیس کو اطلاع دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ جرم کا ارتکاب تم نے کیا ہے کہ اندراج میں غلط بیانی کی جب اس نے دیکھا کہ آدمی بیڈب

تو اس نے مجبوراً ہندی کاٹ کر اُردو لکھ دی۔ جب ایک ذی حیثیت اور قابل شخص کے ساتھ یہ برتاؤ ہوا تو آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ دوسروں اور خاص کر اَن پڑھ لوگوں کے حق میں کیسی کچھ نا انصافی نہ ہوتی ہوگی۔ وہ نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔

چونکہ اس زمانہ میں زبان کا مسئلہ بہت اہم ہوگیا ہے اور ہندی اُردو کے جھگڑے کی وجہ سے دلوں میں صفائی نہیں رہی اس لئے ہر ایک سے انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ابھی سے آگاہ کردوں کہ مردم شماری کے وقت اس کی خاص احتیاط کی جائے اور اس امر کی نگرانی رکھی جائے کہ لکھنے والے نے زبان کے خانہ میں وہی لکھا ہے جو آپ نے بتایا تھا، کچھ اور تو نہیں لکھ دیا۔

یہ بھی یاد رہے کہ مردم شماری کے گوشواروں میں زبان کے دو خانے ہوتے ہیں، ایک مادری زبان کا اور دوسرا دوسری زبان کا۔ اگر آپ کی مادری زبان اُردو ہے تو اس خانہ میں اُردو لکھوائی جائے اور اگر آپ کی زبان کچھ اور ہے لیکن آپ اُردو بھی جانتے ہیں تو دوسرے خانہ میں اُردو لکھوا دیئے اور دیکھ لیجئے کہ اُردو لکھی ہے یا نہیں۔

اُردو اخباروں کے ایڈیٹروں سے درخواست ہے کہ وہ براہِ کرم اس تحریر کو اپنے اخباروں میں شائع فرمائیں۔

مطبوعات

حرف وحکایت۔ یہ حضرتِ جوش ملیح آبادی کا تازہ مجموعۂ کلام ہے جو کتب خانۂ رشیدیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب بہت حسنِ اہتمام سے چھپی ہے۔ حجم ۲۴۸ صفحات ہے۔

جوش کی شاعری میں زندگی کے جتنے متنوع اور دلاویز مرقع ملتے ہیں اور کسی موجودہ اُردو شاعر کے کلام میں نہیں ملتے۔ جوش نے مثلِ اکبر آبادی کی طرح بعض ایسے موضوعات پر بھی دلکش اشعار لکھے ہیں جن کو عموماً ہمارے شاعر طبع آزمائی کے قابل نہیں سمجھتے۔ جوش ہندوستان کی موجودہ سیاسی زندگی کے مسائل سے بھی بے پروا نہیں۔ ایک سچے شاعر کی طرح اس کے دل میں بھی آزادی کی تڑپ ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ اسے شاعرِ انقلاب کہتے ہیں۔ موجودہ مجموعے میں دوسری نظموں کے علاوہ بہت سی سیاسی نظمیں بھی ہیں جو نہایت بےباکانہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ خدا ہر شاعر کو ایسی جرأت دے۔ قیمت مجلد ۱۲؍، پتہ اوپر درج ہے۔

اس مجموعے میں سے ایک مختصر نظم ہم اس خیال سے ذیل میں نقل کرتے ہیں کہ آج کل خاص طور پر یہ اہلِ ہندوستان کے سب حال ہے:-

R. L. No. 1363

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہ ما ہے

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی ر خلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیار ادر

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ا ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیج ب

۵۔ خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ا ر کا ٹکٹ یا جو

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتہ

[illegible] Printed at the Half-Tone Press,
Langley Road, Ram Nagar Lahore.